بسم اللہ الرحمن الرحیم

افغانستان

رزمگاہِ حق و باطل

سوویت یونین کی یلغار	(۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)
ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور	(۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۶ء)
طالبان کا پہلا دور	(۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء)
امریکی اتحاد کی یلغار	(۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)
طالبان کا دوسرا دور	(۲۰۲۱ء ـــــ)

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ پاکستان
www.alsharla.org

جملہ حقوق محفوظ

کتاب : افغانستان: رزمگاہِ حق و باطل
تالیف : ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت : اگست ۲۰۲۳ء

فہرست عنوانات

عرضِ مرتب 19

بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان 21

ولی خان، مسٹر بھٹو، افغانستان 21

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور افغان فرمانروا احمد شاہ ابدالیؒ 23

افغان صدر محمد داؤد کا دورۂ پاکستان 25

سوویت یونین کی یلغار (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء) 27

افغانستان میں روسی یلغار اور بھارت کی رائے عامہ 28

مولانا مفتی محمودؒ اور جہادِ افغانستان 28

افغانستان، پولینڈ، اسرائیل 30

روسی جارحیت اور پاکستان کے انتخابات 32

تحریکِ آزادی اور علماء حق 33

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ 35

ریموٹ کنٹرولڈ غلامی کا امریکی منصوبہ؟ 39

جہادِ افغانستان اور عالمِ اسلام 42

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ 47

جہادِ افغانستان فیصلہ کن مرحلہ میں! 47

افغان حریت پسندوں کا جہادِ آزادی: پس منظر، ثمرات، توقعات 48

خوست کے محاذ پر روسی افواج کی مزاحمت: دورۂ افغانستان کی روداد 51

افغان مسئلہ پر ”جنیوا معاہدہ“ 54

جنرل محمد ضیاء الحق شہید 55

افغان جارحیت اور جنیوا معاہدہ 57

حضرت مولانا عبد الحقؒ 57

ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء)............................61

جہادِ افغانستان کو سبوتاژ کرنے کی سازش............................62
متحدہ حزبِ اختلاف کا قیام اور افغان مجاہدین............................63
یاسر عرفات اور جہادِ افغانستان............................64
صدر مملکت غلام اسحاق خان سے معذرت کے ساتھ............................64
کیا افغان مجاہدین کی جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟............................65
الشیخ عبداللہ عزام شہیدؒ............................69
جہادِ افغانستان کے خلاف امریکی سازش............................69
امریکی امداد کی ناقابلِ قبول شرائط............................70
عالمِ اسلام میں جہاد کی نئی لہر............................71
مسلم سربراہ کانفرنس: وقت کا اہم تقاضہ............................72
جہادِ افغانستان اور ہمارے دینی مدارس............................73
امریکہ اور عالمِ اسلام............................74
جہاد افغانستان اور ہماری ذمہ داریاں............................75
جہادِ افغانستان نازک موڑ پر............................82
افغانستان کی تقسیم کے عالمی منصوبہ کا آغاز............................82
نیو ورلڈ آرڈر: عالمِ اسلام کے خلاف سازش............................83
"یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی"............................86
افغانستان میں پانچ دن............................88
پاکستان کے بارے میں امریکی عزائم: وزیراعظم پاکستان کے نام کھلا خط............................98
جہادِ افغانستان اور وسطی ایشیا کی ریاستیں............................102
صومالیہ: مشرقی افریقہ کا افغانستان............................102
افغانستان میں عالمِ اسلام کی آرزوؤں کا خون............................107
دفاعی بجٹ میں کمی: قومی خودکشی کے مترادف............................108
مجاہدین کی عالمی تنظیم "حرکۃ الانصار"............................110

سرد جنگ کے بعد کی صورتحال اور ورلڈ اسلامک فورم 111
چیچنیا کے صدر جوہر داؤد دوفؒ کی شہادت 115

طالبان کا پہلا دور (۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء) 117

افغانستان میں دینی مدراس کے طلبہ کی حکومت 118
افغانستان میں تین حکومتیں اور عالمی قوتوں کی حکمتِ عملی 119
افغانستان میں طالبان کی حکومت اور برطانیہ کے مسلم دانشور 120
اسامہ بن لادن اور سعودی علماء کرام کی جدوجہد 123
اسامہ بن لادن کے ساتھ ملاقات 124
سعودی حکمران خاندان، علماء کرام، اسامہ بن لادن 127
ڈیلی ٹیلی گراف اور دیوبندی مکتبِ فکر 131
امریکہ اور حرکۃ الانصار 132
عالمِ اسلام کے دینی حلقے اور امریکہ بہادر 133
امریکی جرائم اور شہر سدوم 134
طالبان اور داڑھی 137
اسامہ بن لادن: کل کا مجاہد، آج کا دہشت گرد 137
مغربی دانشور اور طالبان کا اسلام 140
دو گھنٹے افغان سفارت خانے میں 142
طالبان کی حکومت اور اقوام متحدہ کا منشور 145
ازبکستان میں مساجد کی بندش 146
حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ اور جہادِ افغانستان 147
اسامہ بن لادن پر امریکی حملہ 149
طالبان کی مزید کامیابیاں 151
ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات 152
وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور طالبان کا اسلام 155
طالبان جیسا نظام اور دینی مدارس 156

نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء اور افغان طالبان 158
مسیحی کمیونٹی: طالبان کے نقشِ قدم پر 162
محترمہ بے نظیر بھٹو! معاملات کو گڈمڈ نہ کریں 162
نظام حکومت کی اصلاح کیلئے سعودی علماء کی تجاویز 164
مسیحی طالبان اور مسلح جدوجہد کی تربیت 167
چیچنیا میں اسلامی قوانین کا نفاذ 168
طالبان کے بارے میں مایوسی کا آغاز؟ 168
اشک آباد کے مذاکرات اور مولانا سمیع الحق کی پیشکش 171
طالبان اور شمالی اتحاد میں مفاہمت 173
مولانا فضل الرحمان کے بیان پر امریکی ردعمل 174
شیخ الہندؒ، طالبان، اسامہ بن لادن 175
مسلم پرسنل لاء اور موجودہ عالمی صورتحال 178
ڈاکٹر محمد المسعری اور افغان طالبان 183
خدیو مصر اور خدیو پنجاب 186
جنرل پرویز مشرف سے دینی جماعتوں کی توقعات 188
عوامی جمہوریہ چین کے حکمرانوں سے ایک گزارش 189
اسامہ بن لادن: اسلام اور مسلمانوں کا غدار؟ 192
طالبان، امریکہ، اقوامِ متحدہ 194
امیر امان اللہ خان اور افغانستان میں مغربی ثقافت کی ترویج 196
افغان طالبان کے خلاف پابندیاں: عالمی استعمار کی نئی صف بندی 199
بھارتی طیارے کا اغوا اور طالبان 201
صوبہ سرحد اور افغانستان 203
جہادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی، قرآن کا حکم 203
امریکی ایجنڈا اور جنرل پرویز مشرف 206
کلہ بہ زئی (واپس کب جاؤ گے؟) 209
چیچنیا کے مشیر سلیم خان کی گرفتاری 211

ملک میں اسلحہ کلچر: وفاقی وزیر داخلہ سے اہم گزارشات 213
چیچنیا کا جہادِ آزادی اور مسلم حکومتیں 215
سقوطِ ڈھاکہ، جہادِ افغانستان، معاشی خود مختاری 216
جہادی تربیتی مراکز اور تحریکِ جعفریہ پاکستان 219
افغان اور چیچن مجاہدین 223
"دہشت گردی" کا امریکی تصور 224
طالبان کی اسلامی حکومت اور ڈاکٹر جاوید اقبال 225
جہادی تربیتی کیمپ: وزیر داخلہ کے نام کھلا خط 227
پاکستان، افغانستان، ایران کی کنفیڈریشن کی تجویز 231
جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورۂ افغانستان کے تاثرات 233
جہاد اور قومی اتفاق رائے 234
صوفیائے کرام اور مجاہدین 236
جنرل پرویز مشرف کا امتحان 238
جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے چند گزارشات 241
افغانستان میں این جی اوز کی سرگرمیاں اور طالبان کا موقف 244
دو دن کابل کی آزاد فضا میں 245
افغان نائب صدر ملا محمد حسن سے ملاقات 247
کابل میں "اکیڈمی آف سائنسز" کا قیام 250
افغانستان کے عدالتی اور تعلیمی نظام پر ایک نظر 252
افغانستان میں این جی اوز کا کردار 254
افغانستان کے اخبارات پر ایک نظر 256
طالبان حکومت کی مشکلات اور عزم 258
حرکۃ المجاہدین کا طلبہ سیمینار 259
وسطی ایشیا کی ریاستیں آزادی کے بعد 261
امریکی نائب وزیر خارجہ کارل انڈر فرتھ کو پاکستان میں "طالبانائزیشن" کا خطرہ 263
ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکی پابندی 264

پاکستان میں افغان طالبان کی تقلید؟ 266
افغانستان کی تعمیرِ نو: ڈاکٹر سلطان بشیر محمود کے تاثرات 267
طالبان حکومت پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی پابندیاں 269
اسامہ بن لادن کی آڑ میں امارتِ اسلامی افغانستان کا نشانہ 271
افغان طالبان کی مشکلات اور سنتِ نبویؐ 271
''نیا جال لائے پرانے شکاری'' 274
غامدی صاحب کا فلسفۂ جہاد 276
افغان طالبان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی 280
جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار 283
''دفاعِ افغانستان کونسل'' کا قیام 286
افغان عوام کی امداد و حمایت کا وقت 287
وزیرِ داخلہ پاکستان اور جہادی تنظیمیں 287
امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے ملاقات 288
افغانستان پر پابندیوں کے عملی اثرات 290
افغانستان میں سرمایہ کاری کی اہمیت اور امکانات 292
چند لمحے احمد شاہ باباؒ کے مزار پر 294
بت شکنی اور طالبان حکومت کا موقف 296
مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق کا قومی مسائل پر اظہارِ یکجہتی 298
امام ولی اللہ دہلویؒ کے خواب کی عملی تعبیر! 300
جہادِ کشمیر اور جہادِ افغانستان کا موازنہ 302
افغانستان کی موجودہ صورتحال کا پس منظر اور جناب حکمت یار کا انتخابی فارمولا 303
جہاد کے بارے میں چند اشکالات کا ازالہ 306
اقوامِ متحدہ کی افغانستان پر پابندیاں اور ''الرشید ٹرسٹ'' کا جرأت مندانہ فیصلہ 309
امریکہ اور برطانیہ کی پاکستان کو طالبان سے فاصلہ رکھنے کی ہدایت 311
امریکی نائب وزیرِ خارجہ کا دورۂ پاکستان 312
افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور طالبان کا موقف 314

پاک افغان سرحد کی نگرانی کیلئے اقوامِ متحدہ کی ٹیمیں..............................315
سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی قیادت کی آزمائش..............................316
سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں امریکی عزائم اور پاکستان کا کردار..............................318
افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کا سیرتِ نبویؐ سے استدلال..............................322
افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کی خود فریبی..............................324
افغانستان اور پاکستان: سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں..............................326
سانحہ گیارہ ستمبر پر ایک امریکی مذہبی راہنما کا تبصرہ..............................327
امریکہ کو روسی کرنل کا مشورہ..............................327
افغانستان پر متوقع امریکی حملہ اور عالمی منظرنامہ..............................328
سانحہ گیارہ ستمبر: لندن میں علماء کا مشترکہ اعلامیہ..............................331
کیا امریکہ عالمی قیادت کا اہل ہے؟..............................333
عالمی ابلاغیاتی گھٹن میں تازہ ہوا کا جھونکا..............................336

امریکی اتحاد کی یلغار (۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)..............................339

افغانستان پر امریکی حملے: مقاصد و اہداف..............................340
امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی حیرت انگیز حیرت..............................341
ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور..............................342
اظہارِ رائے کی آزادی کا مغربی معیار..............................343
افغانستان پر جاری امریکی حملہ: برطانوی رائے عامہ کا ردعمل..............................344
یہ جنگ فراڈ ہے: برطانوی صحافی جان پلجر کا تجزیہ..............................346
افغانستان کی صورتحال پر ایک پینل انٹرویو..............................350
افغانستان کی تباہی: دانشوروں کی سوچ تاریخ کے آئینے میں..............................352
دہشت گردی یا حریت پسندی؟..............................356
افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: پاکستان کیوں مجبور تھا؟..............................358
افغانستان میں طویل جنگ کا ایک نیا دور..............................361
تہذیبی جنگ کا تحفظ: امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کا عندیہ..............................362

دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ 364
وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے 366
سلطان ٹیپو شہیدؒ اور افغان طالبان: تاریخی مماثلت 368
امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمہ اور نئی افغان حکومت کے رجحانات 372
اقوامِ متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کی ضرورت 375
افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت اور وزیر داخلہ کا اعترافِ حقیقت 378
کابل کی نئی حکومت اور اسلامی قوانین 380
اسامہ بن لادن اور ان کی جدوجہد 381
طالبان قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک 386
پاکستان میں مذہبی وجہادی جماعتوں پر پابندی 387
افغان خواتین وکلاء کے خیالات 388
پاکستان کی افغان پالیسی اور عوامی جذبات 389
مغربی اقوام کی بربریت تاریخ کے آئینے میں 389
مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ 394
شاہِ اردن سے ایک سوال 396
افغانستان کے سابق فرمانروا ظاہر شاہ کی واپسی 397
دینی مدارس کے خلاف امریکی کاروائیاں 398
حضرت مولوی محمد نبی محمدیؒ 399
سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم 402
سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم: چند مزید گزارشات 410
دینی مدارس: امداد اور چھاپوں کی زد میں 413
روس، عرب، یورپی ممالک کا فلسطین کی حمایت میں متوقع اتحاد 414
پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی 417
مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال اور مولانا فضل الرحمان کا مستحسن اقدام 419
افغانستان اور عراق کے بارے میں مسلم دنیا کے الگ الگ معیارات 420
”دہشت گردی“ کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ 423

دینی کارکنوں اور علماء کرام سے اپیل 431
مغربی عوام اور حکمران ہم آہنگ نہیں 433
حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ 435
انتخابات میں متحدہ مجلسِ عمل کی کامیابی 437
متحدہ مجلسِ عمل کی کامیابی اور ذمہ داری 440
عالمی اسلامی تحریکات کی متحدہ مجلسِ عمل سے وابستہ توقعات 441
متحدہ مجلس عمل سے ہماری توقعات 443
حضرت عمرؓ کا نظامِ حکومت اور جناب اسفندیار ولی 445
اسامہ بن لادن اور یاسر عرفات 446
خلافتِ اسلامیہ کا اِحیا: روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کا خوف 448
مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری 449
امریکی یلغار۔ سرحد اسمبلی کی قراردادیں 450
متحدہ مجلسِ عمل کی خدمت میں! 451
مسلم دنیا اور جرمنی 452
افغان شہداء کے خون کا ثمرہ 453
افغانستان کے بعد عراق 455
اسامہ بن لادن اور امریکی تحریکِ آزادی کے جنگجو 457
ملتِ اسلامیہ کے بحران اور ہماری دینی قیادت 461
اسامہ انقلابی راہنما ہیں: امریکی کانگریس وومن مارسی کیپٹر 464
امام ولی اللہ دہلویؒ اور امارتِ اسلامی افغانستان 464
افغانستان میں ہیروئن کا کاروبار 467
محترمہ بےنظیر بھٹو اور افغان طالبان 467
طالبان والے نظام کا ہوّا 469
روایتی اسلام اور روشن خیال اسلام 470
کیوبا سے رہائی پانے والے ایک مجاہد کی داستان 474
شدت پسندی: شاہ فہد اور مہاتیر محمد کا اختلافِ نظر 477

کیا خلافت کا نظام ناقابلِ عمل ہے؟ 480
نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم اور عالمی استعمار 481
مولانا شاہ احمدؒ نورانی اور افغان طالبان 482
خود احتسابی اور ناقدانہ جائزہ 484
تحریکاتِ آزادی کا جہاد اور صدر جنرل پرویز مشرف 484
مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ 485
امریکی صدر کا افغان صدر کو مشورہ 491
بات ملّا محمد عمر یا مولوی فضل ہادی شنواری کی نہیں 494
یاسر عرفات مرحوم 495
جارج ڈبلیو بش کی کامیابی اور عالمِ اسلام 498
سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی دھونس 501
گوانتانامو بے اور افغان قیدیوں کیلئے ذہنی اذیت 502
جائے سانحہ گیارہ ستمبر پر چند لمحے 503
دنیائے اسلام میں امریکہ کا تشخص 505
برطانوی وزیر جیری اسٹکلف کے خیالات 506
امریکی مفادات اور اسلام آباد کی کمٹمنٹ 509
ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور مولانا فضل الرحمان خلیل 513
مولوی محمد یونس خالصؒ 515
سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے خیالات 516
حدود آرڈیننس کا قضیہ 526
غلامی آج کے دور میں 527
حدود آرڈیننس: ایک اعتراض کا ازالہ 528
صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ 530
مذہبی انتہا پسندی کے اسباب اور اس کا علاج 532
جامعہ حفصہ اور لال مسجد کا سانحہ 535
آج کے فریڈم فائٹرز، دہشت گرد کیوں؟ 538

افغانستان کیلئے دستوری طرزِ حکومت کی تجویز............ 539
ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کا انٹرویو............ 540
افغانستان میں افیون کی کاشت کا مسئلہ............ 545
طالبان اور القاعدہ پروکالت کی مخالفت کا الزام............ 545
غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری............ 549
افغانستان کا مسئلہ: پارلیمنٹ کے اجلاس سے توقعات............ 550
دہشت گردی کے خلاف جنگ پر بریفنگ............ 553
"دہشت گردی" کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد............ 557
دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کا فیصلہ............ 563
امریکہ سے پاکستانیوں کی نفرت کے اسباب............ 567
صدر بارک اوباما کو امریکی سینیٹر کا حقیقت پسندانہ مشورہ............ 569
دہشت گردی کے خلاف جنگ اور غلط مغربی مفروضے............ 570
"مشرقِ وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک، تلاشِ امن"............ 574
عالمِ اسلام کے خیالات اور امریکہ............ 577
قاہرہ میں صدر اوباما کا خطاب............ 578
افغانستان کی صورتحال اور "ہفتہ نامہ امید"............ 581
صدر قذافی کا جنرل اسمبلی سے خطاب............ 585
دینی مدارس پر دہشت گردی کا الزام............ 585
جہادِ افغانستان اور افغان طالبان کا پس منظر............ 587
دینی مدارس پر دہشت گردی کا الزام............ 592
افغان طالبان اور پاکستانی طالبان............ 593
جہادِ افغانستان اور پاکستان کے مذہبی حلقے............ 595
دینی مدارس پر چھاپوں کا نیا راؤنڈ............ 598
مولانا حمید الرحمان عباسیؒ............ 600
دیوبندی جماعتوں کی خصوصی توجہ کے لیے............ 601
فوجوں کے ذریعے دل جیتنے کا فارمولا............ 604

موجودہ حالات اور جنرل حمید گل 605
افغانستان کی صورتحال: سابق روسی صدر میخائل گورباچوف کا تجزیہ 608
جہاد، دہشت گردی، جدوجہدِ آزادی 609
حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ 610
طالبان کا وجود اور ان کے ساتھ مذاکرات 611
کرنل امیر سلطان تارڑ شہیدؒ 612
مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب 615
الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ 617
اصل دہشت گرد کون؟ 620
ملی مجلس شرعی کی قراردادیں 622
انتہا پسندی اور اس کی خودساختہ تعریف 623
امریکی دھمکیاں اور قومی خود مختاری 626
افغان طالبان کا مختصر پسِ منظر 628
افغان طالبان کی استقامت کو سلام 631
قرآن کریم کی حرمت کے تقاضے 632
حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور نظریۂ عدمِ تشدد 634
امن ضروری ہے اور امن کیلئے انصاف ضروری ہے 637
خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، خود ہی جج 639
حضرت مولانا عبدالحقؒ 641
مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق 642
علماء کرام کی شہادتوں کا سلسلہ 644
طالبان کیلئے امریکی امداد 646
حقانی نیٹ ورک اور دفاعِ پاکستان کونسل 647
افغانستان کی صورتحال اور قاضی حسین احمدؒ 648
اسلامی نظام کی جدوجہد اور اس کی حکمتِ عملی 649
افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: مقاصد و اہداف 650

افغان راہنما مولانا جلال الدین حقانی کی اپیل 652
قطر میں افغان طالبان کا دفتر 655
افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: نئی حکومت کی ذمہ داریاں 657
ملالہ اور ملالئے 660
افغان طالبان کی سرگرمیاں 662
افغانستان میں غیر ملکی تسلط کی مدد کی شرعی حیثیت 665
پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات اور مولانا سمیع الحق 666
اسلام کا نظامِ حکومت: تصنیفی کاوشیں 668
موجودہ صورتحال اور افغان طالبان کا موقف 670
دہشت گردی کے خلاف قومی مہم 673
آج کے مسلم نوجوان کا مقدمہ 675
کل کے مجاہد، آج کے دہشت گرد 679
آرمی پبلک اسکول پشاور کا سانحہ 681
افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات 684
ملا محمد عمر مجاہدؒ 686
جنرل حمید گل مرحوم 688
توبہ، اصلاح، تلافی 690
مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ 692
تین معاصر بزرگوں کے تصنیفی کارنامے 693
پاک امریکہ تعلقات: حقیقت پسندانہ تجزیہ کی ضرورت 695
ملا اختر منصور کی شہادت کے بعد! 697
ٹی وی پروگراموں کے طے شدہ اہداف 699
شدت پسندی، افغانستان، ضیاء دور 702
مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی کاوش 704
پاک امریکہ تعلقات: جبر و مکر کی داستان 705
صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا بیان اور امریکی قیادت کی نفسیات 709

ملالہ دیوی اور قندوز و کشمیر کے شہداء 711
موجودہ صورتحال میں افغان طالبان کا موقف 713
افغان حکومت اور طالبان کے مبینہ مذاکرات: دو اہم موقف 716
خادم الحرمین الشریفین کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش 719
مولانا جلال الدین حقانیؒ 721
افغان تنازعہ کا تاریخی پس منظر اور اس کا نیا راؤنڈ 724
مولانا سمیع الحق شہیدؒ 725
افغان طالبان کو شاہ محمود قریشی کا مشورہ 727
شکریہ مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ! 728
افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی 730
عالمی استعمار کے روبوٹس اور افغان طالبان کا امتحان 732
پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ 735
دنیا کی ضرورت خلفاء راشدین والا اسلام ہے 736
مختلف شعبوں میں علماء اور وکلاء کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت 738
کشمیر، افغانستان، صدر ڈونلڈ ٹرمپ 739
امتِ مسلمہ کی حالتِ زار اور اہلِ دین کی ذمہ داری 740
کشمیر اور افغانستان کی تازہ صورتحال پر ایک نظر 742
"اسلام کا نظامِ سیاست و حکومت": مولانا عبدالباقی حقانی کی علمی کاوش 744
کیا امریکہ مشرقِ وسطیٰ سے نکلنا چاہتا ہے؟ 746
مولانا سمیع الحق شہیدؒ اور جہادِ افغانستان 747
معاہدات: ذمہ داری یا ہتھیار؟ 748
امریکہ کی عالمی چودھراہٹ کا نیا راؤنڈ 750
امریکہ کا پاکستان سے فوجی اڈوں کا تقاضہ 752
سوویت یونین، افغانستان، امریکی اتحاد 753

طالبان کا دوسرا دور (۲۰۲۱ء۔۔۔) 757

افغانستان میں طالبان کا نیا دور: توقعات و خدشات 758

افغانستان کی موجودہ صورتحال اور ہماری ذمہ داری 760

مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام 762

"دہشت گردی" کے خلاف جنگ میں ناکامی 764

افغانستان کا بحران اور ہمارا افسوسناک طرز عمل 765

افغانستان کی صورتحال: دینی حلقوں کی سرگرمیاں 767

۲۴ دسمبر ۲۰۲۱ء کو "یومِ افغانستان" منایا جائے 769

"عشرہ یکجہتی افغانستان" کا لائحہ عمل 771

سودی نظام اور مسلم ممالک 773

افغان عوام کے ساتھ یکجہتی کی مہم 774

امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ 777

مسلم وزرائے خارجہ کو اسلام آباد میں خوش آمدید 779

سلامتی کونسل اور امارتِ اسلامی افغانستان 780

عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

برادر مسلم مُلک افغانستان کے حوالے سے زیرِ نظر مجموعہ حضرت مولانا ابوعمار زاہد الراشدی کی مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں پر مشتمل ہے، جو ۱۹۷۴ء سے ۲۰۲۲ء کے عرصہ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ واقعاتی تسلسل برقرار رکھنے کیلئے مواد کی ترتیب تاریخِ اشاعت کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ بہت سی تحریروں کے عنوانات ان کے مرکزی خیال کی بہتر عکاسی اور کتاب کے موضوع کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مناسبت کی غرض سے تبدیل کیے گئے ہیں۔ جن تحریروں میں متعلقہ مواد جزوی طور پر آیا ہے ان کے صرف وہی حصے شامل کیے گئے ہیں، البتہ بعض تحریریں مجموعی تناظر برقرار رکھنے کیلئے مکمل شامل کر لی گئی ہیں۔ طالبان کی اسلامی حکومت کا تسلسل ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء کے پہلے دور کے بعد ۲۰۲۱ء میں دوبارہ شروع ہوا ہے تو اس سلسلہ کی اگلی تالیف کا عنوان ''امارتِ اسلامی افغانستان'' ہوگا۔ اس اشاعت میں سامنے آنے والی غلطیوں کی تصحیح اور اس موضوع پر دستیاب ہونے والی مزید تحریروں کی شمولیت اگلی اشاعت میں کر دی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

Source:

https://www.geneva.mfa.af/en/about-afghanistan/national-emblem.html

https://en.wikipedia.org/wiki/Emblem_of_Afghanistan

بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۵ اپریل ۱۹۷۴ء

بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے راہنما جناب احمد نواز بگتی گذشتہ روز لاہور تشریف لائے اور پارٹی ورکروں کے اجتماع سے خطاب کے علاوہ ایک مقامی روزنامہ کو انٹرویو بھی دیا جس میں انہوں نے بلوچستان کے سیاسی حل کے بارے میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے متوقع اعلان، بلوچستان کی سیاسی صورتحال اور مسئلہ بلوچستان کے صحیح حل کے سلسلہ میں چند فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ بلوچستان کی نازک صورتحال اور وزیراعظم بھٹو کے متوقع اعلان کے پیش نظر بگتی صاحب کے ان خیالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(انہوں نے کہا کہ) میری رائے میں افغانستان کے صدر داؤد خان جیسے ہی اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے وہ پاکستان کے خلاف اپنی مہم تیز کردیں گے۔ اس ضمن میں وہ سرحد پار بلوچستان میں انتہا پسند عناصر کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ انہیں یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوگی کہ بلوچستان اب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں کے عوام کے سیاسی حقوق غصب کیے جاچکے ہیں اور جنہیں ظلم اور متشددانہ کاروائیوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے خود کہا ہے کہ بلوچستان میں فوج ملک کے دشمنوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ ایسے ماحول میں وہاں کے عوام کا کابل کا حامی اور ایران کا مخالف ہونا قدرتی امر ہے۔ افغانستان کے اس پروپیگنڈا میں شدت آجائے گی کہ بلوچ عوام کو گذشتہ چھبیس برس کے دوران ان کے سیاسی حقوق نہیں ملے، بلوچ عوام اگر افغانستان کے ساتھ ہاتھ ملالیں تو پٹھان اور بلوچوں کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ افغانستان کا یہ پراپیگنڈا کارگر ثابت ہوگا۔ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت کا جیلوں میں بند ہونا اس ملک کیلئے سب سے بڑا المیہ ہے۔ ان راہنماؤں کی عدم موجودگی میں قیادت لازمی طور پر نوجوان اور انتہا پسند عناصر کے ہاتھوں میں چلی جائے گی جن سے سمجھوتہ کرنا یا انہیں راہ راست پر لانا تقریبًا ناممکن ہوگا۔--- افغانستان کے ساتھ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے رابطے کی افواہیں بھی بے سروپا ہیں۔ ہمارا افغانستان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ہمارا مستقبل تو پاکستان اور اس کی سالمیت کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے سوا ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔ (بحوالہ نوائے وقت لاہور۔ ۶ اپریل ۱۹۷۴ء)

ولی خان، مسٹر بھٹو، افغانستان

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء

وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گذشتہ دنوں صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے اپنی تقاریر میں

پاکستان کی سرحدوں پر افغانستان اور بھارت کی افواج کے اجتماع کے انکشاف کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد جناب عبدالولی خان کے خلاف بھی غم و غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی نئی بات کرنے کی بجائے وہی باتیں دہرائی ہیں جو وہ اور ان کے پیشرو حکمران اس سے قبل متعدّد بار کہہ چکے ہیں، لیکن موجودہ ملکی و بین الاقوامی صورتحال کے پیش نظر بھٹو صاحب کی یہ نئی مہم اپنے ما له و ما عليه پر غور و خوض کی دعوت دیتی ہے۔

مسٹر عبدالولی خان کے نظریات و افکار پاکستان کے کسی شہری پر پوشیدہ نہیں، وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے حامل سیاستدان ہیں جس کا اظہار وہ کئی بار کر چکے ہیں۔ اور شاید ولی خان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے اور ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر اپنے موقف میں لچک پیدا کر لینے کی ''صلاحیت'' سے محروم ہیں، ورنہ آج صورتحال اس سے مختلف ہوتی جو دکھائی دے رہی ہے۔ ولی خان کے خلاف آج تک جتنی باتیں بھی کہی جاتی رہی ہیں ان کی تان دو باتوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ ایک یہ کہ ولی خان قیامِ پاکستان کے مخالف تھے، اور دوسری یہ کہ وہ افغانستان جاتے ہیں اور افغان حکمران سے ملتے ہیں۔

جہاں تک قیامِ پاکستان کی مخالفت کا تعلق ہے، یہ کوئی جرم نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے ایک باشعور حلقے نے دلائل کی بنیاد پر دیانتداری کے ساتھ قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور قیامِ پاکستان کی صورت میں کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس حلقے نے جو خدشات پیش کیے تھے وہ غلط ثابت ہوئے یا صحیح، قیامِ پاکستان کے بعد اس حلقے نے ملکی سالمیت کے تحفظ اور پاکستان کی فلاح و بہبود کیلئے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ ۱۹۷۱ء میں جب سالمیتِ پاکستان کے بعض نام نہاد ٹھیکیداروں کی سرگرمیاں پاکستان کو دولخت کرنے کا موجب بن رہی تھیں، قیامِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے حلقہ کے دو ممتاز راہنما مولانا مفتی محمود اور خان عبدالولی خان ڈھاکہ میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے اور تقسیم ملک کو روکنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اور آج بھی دونوں راہنما دوسرے سیاسی قائدین کے شانہ بشانہ ملک میں جمہوری عمل کی بحالی اور سالمیتِ پاکستان کے تحفظ کی خاطر سرگرم عمل ہیں۔

باقی رہی افغانستان کی بات تو اس سلسلہ میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ مسٹر ولی خان کے موقف کو کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ خان موصوف نے گذشتہ روز اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

- وہ محب وطن ہیں اور ان کی حب وطنی ملک کے کسی بھی بڑے شخص سے زیادہ مضبوط ہے۔
- وہ چاہتے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی ختم ہو اور دونوں مسلم پڑوسی ممالک بھائیوں کی طرح امن و آشتی کے ساتھ رہیں۔
- مسٹر بھٹو نے نئی مہم ملک کے داخلی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے شروع کی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ولی خان کا یہ موقف ٹھنڈے دل سے غور و خوض کا طالب ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ دو مسلم پڑوسی ممالک کا معاملہ ہے اور اس سلسلے میں جو شخص یا حلقہ بھی صلح و امن کی بات کرے گا، ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ثانیاً اس لیے کہ ہمارے خیال میں افغانستان اور پاکستان کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کے عوامل اور اس سلسلہ میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور صوبہ سرحد کے بعض اقتدار پسند سیاستدانوں کے طرز عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے خدانخواستہ افغانستان کی افواج بقول بھٹو صاحب پاک سرحدوں کی طرف بڑھ رہی ہیں تو بھی حکومت پاکستان کو صلح و امن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے کشیدگی کو کم کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں مسلم برادری اور اسلامی سیکرٹریٹ سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔ آخر مسلم برادری اگر بھٹو اور مجیب کو ایک میز پر بیٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے تو داؤد اور بھٹو کو ایک اسٹیج پر لانا اس کیلئے کون سا مشکل امر ہے؟

اسی طرح ولی خان کے بار بار افغانستان جانے کے بارے میں بھی بھٹو صاحب کو معقول اور سنجیدہ موقف اختیار کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ولی خان کا بیرون ملک جانا ملک کیلئے نقصان دہ ہے تو انہیں حکومت پاکستان باہر جانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟ ولی خان جب بھی ملک سے باہر گئے، حکومت کی اجازت سے گئے۔ اب اگر حکومت کو ان کی سرگرمیوں پر اعتراض ہے تو بیان بازی کی بجائے سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا جائے اور عدالت کی میز پر ان کے خلاف الزامات کا ثبوت مہیا کر کے آئندہ کیلئے اس صورتحال کا سدباب کر دیا جائے۔ ورنہ اس تاثر کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ بھٹو صاحب بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کی طرح سیاسی مخالفین کو کچلنے کیلئے غدار، وطن دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ جیسے مہمل اور مفہوم و معانی سے عاری الفاظ کا سہارا لے رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور افغان فرمانروا احمد شاہ ابدالیؒ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ طوائف الملوکی ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی اور فرنگی تاجر کمپنیاں دھیرے دھیرے مغل حکمرانوں کی جگہ لینے کیلئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مرہٹے ایک طاقتور سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے تھے اور برصغیر ان کے قبضے میں چلے جانے کا خطرہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت امام ولی اللہؒ نے فوری حکمت عملی کے طور پر مرہٹوں کی سرکوبی اور ان کے خطرہ سے نجات حاصل کرنے کیلئے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالیؒ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے مدد مانگی اور احمد شاہ ابدالیؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور دیگر دردمند ہندی مسلمانوں کی استدعا پر مرہٹوں کے خلاف ان کی امداد کیلئے آگے بڑھا اور پھر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کا وہ تاریخی معرکہ بپا ہوا جس نے عظیم تر مرہٹہ ریاست کے تصور کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاک میں ملا دیا۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا۔ دو لاکھ سے زائد مرہٹہ فوجی میدان جنگ میں کام آئے اور احمد شاہ ابدالیؒ جو خود ہندوستان کی بادشاہت حاصل کر سکتا تھا،

حکومت شاہ عالم ثانی کے سپرد کر کے واپس چلا گیا۔

اس خطرہ سے نجات حاصل کرنے کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا روز افزوں زوال اور فرنگی کمپنیوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ حضرت شاہ صاحب کے سامنے تھا۔ فرنگی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شہید کر کے ۱۷۵۷ء میں بنگال پر قبضہ کر چکے تھے۔ حیدرآباد دکن، اودھ اور میسور پر فرنگی کی للچائی ہوئی نظریں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانیؒ، احمد شاہ ابدالیؒ کی عظیم قربانی اور فراخدلانہ ایثار کے باوجود ہوش میں نہیں آیا تھا، ایسے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے سلطنتِ مغلیہ کے بوسیدہ کھنڈرات کو سہارا دینے کے بجائے فک کل نظام (ہمہ گیر انقلاب) کا نعرہ لگایا۔

شاہ صاحب یہ سمجھ چکے تھے کہ مغلیہ سلطنت کو جب احمد شاہ ابدالیؒ کی قربانی و ایثار سہارا نہیں دے سکی تو اس کے دن گنے جا چکے ہیں، اس کو سہارا دینے یا اس کی اصلاح کی توقع رکھنے کے بجائے اس ترقی پذیر قوت کے مقابلے کی تیاری کرنی چاہیے جو سلطنتِ مغلیہ کی جگہ لینے والی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ فرنگی کے تسلط کو ایک یقینی امر سمجھتے ہوئے اس دور رس نگاہ رکھنے والے مرد درویش نے فرنگی کے مقابلے میں ایک فکری و علمی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔

یکم دسمبر ۲۰۱۲ء کو شاہ ولی اللہ سوسائٹی لاہور کے زیر اہتمام ایک فکری نشست سے خطاب کا کچھ حصہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ اقبالؒ جنوبی ایشیا کے ممتاز مسلمان مفکرین میں سے تھے۔ دونوں کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دور میں ملت اسلامیہ کی بیداری کیلئے نمایاں فکری اور سیاسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا دور وہ ہے جب اورنگزیب عالمگیرؒ کی نصف صدی کی حکمرانی کے بعد مغل اقتدار کے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا تھا اور شاہ ولی اللہؒ کو دکھائی دے رہا تھا کہ ایک طرف برطانوی استعمار اس خطہ میں پیش قدمی کر رہا ہے اور دوسری طرف جنوبی ہند کی مرہٹہ قوت دہلی کے تخت کی طرف بڑھنے لگی ہے، جبکہ علامہ اقبالؒ کو اس دور کا سامنا تھا جب انگریزوں کی غلامی کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد برصغیر کے باشندے اس سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ گویا شاہ ولی اللہؒ غلامی کے امکانات کو دیکھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور علامہ اقبالؒ غلامی کو بھگتتے ہوئے اس سے قوم کو آزادی دلانے کی جدوجہد میں مصروف عمل تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کو یہ خطرہ درپیش تھا کہ جنوبی ہند کے مرہٹے دہلی کے اقتدار کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اس کا سدباب انہوں نے یوں کیا کہ افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ ابدالیؒ کو برصغیر کے مسلمانوں کی مدد کیلئے دعوت دی جس کے نتیجے میں پانی پت کی خوفناک جنگ میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور شمالی ہند مسلمانوں کیلئے محفوظ ہو گیا، جبکہ علامہ اقبالؒ اس پریشانی سے دوچار تھے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کے بعد اس خطے کا مستقبل ووٹ اور سیاسی عمل کے ذریعے تشکیل پائے گا جس میں ہندو کی واضح اکثریت مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو مخدوش کر سکتی ہے، اس کا حل انہوں نے پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی الگ ریاست کی شکل میں نکالا اور برصغیر کی تقسیم کی تجویز پیش کر کے مسلمانوں کو سیاسی

طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ گویا خطرہ دونوں کو ایک ہی طرح کا درپیش تھا لیکن دونوں نے اس کا حل اپنے اپنے دور کے تقاضوں اور حالات کی روشنی میں الگ الگ تجویز کیا۔

افغان صدر محمد داؤد کا دورۂ پاکستان

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء

ہمارے برادر ہمسایہ ملک افغانستان کے سربراہ سردار محمد داؤد پاکستان کا چار روزہ دورہ مکمل کر کے اپنے وطن واپس روانہ ہوگئے ہیں۔ افغان سربراہ کا پاکستان میں جس گرمجوشی اور محبت کے ساتھ خیر مقدم ہوا ہے اس سے ان عناصر کو بہت دکھ ہوا ہوگا جو ایک طویل عرصہ سے ان دو عظیم برادر ملکوں کے درمیان برادرانہ تعلقات کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھنا چاہتے، اور جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد تیس برس تک ان تعلقات میں رخنے ڈالنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ دراصل ہماری بدقسمتی سے پاکستان بننے کے فوراً بعد وزارت خارجہ کا قلمدان سر ظفر اللہ خان کے سپرد ہوا جن کے پیشوا مرزا غلام احمد قادیانی کے قاصدوں کو غیور افغان حکمران کیفر کردار تک پہنچا چکے تھے اور اس کی یاد ظفر اللہ خان اور ان کے رفقاء کے دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ اس لیے افغانستان کے ساتھ تعلقات کا آغاز ہی غلط ہاتھوں سے ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثر یا می رود دیوار کج

کے مصداق پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات میں بھائی چارے اور بے تکلفی کا وہ رنگ پیدا نہ ہو سکا جو دو پڑوسی اور مسلمان ملکوں کے تعلقات میں ہونا چاہیے۔ مفاد پرست لوگوں نے دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کر دی اور اسے بلند سے بلند تر کر دینے کی مساعی جاری رہیں۔ عبوری حکومت کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خارجہ پالیسی کی گھسی پٹی لائنوں پر چلنے کی بجائے افغانستان کے ساتھ تعلقات کو حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دونوں ملکوں کے سربراہ بھائیوں کی طرح مل بیٹھ کر اپنے تعلقات اور تنازعات پر گفت و شنید کر رہے ہیں اور یہ امید ہو چلی ہے کہ غلط فہمیوں کی مصنوعی دیوار رفتہ رفتہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی ہے۔

افغانستان صرف ہمارا پڑوسی اور مسلمان ملک ہی نہیں بلکہ مذہب کے ساتھ والہانہ محبت اور ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کٹ مرنے کے مثالی جذبہ میں بھی وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ شریک ہے۔ اس لیے باہمی تعلقات کے باب میں اس مثبت پیشرفت پر ہر پاکستانی نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور اپنے دل میں مسرت کی لہر محسوس کی ہے۔ اللہ تعالیٰ راہ محبت کے ان دو راہرووں کو نظر بد سے بچائے، آمین یا رب العالمین۔

سوویت یونین کی یلغار

(۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)

افغانستان میں روسی یلغار اور بھارت کی رائے عامہ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء

افغانستان کے مسئلہ پر اندرا حکومت روسی مداخلت کی اصولی مخالفت کے باوجود روس کے خلاف کوئی واضح موقف اختیار کرنے کو تیار نظر نہیں آتی لیکن بھارتی رائے عامہ کا رجحان اس سے مختلف ہے۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتی باشندوں نے افغانستان میں روسی مداخلت کی مذمت کرتے ہوئے روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدّد کنونشن اور جلسے منعقد ہوئے ہیں۔ جمعیت علماء ہند نے اپنے ایک جلسہ میں اسی موقف کا اظہار کیا اور دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر بھی اسی نوعیت کی قرارداد منظور کی گئی۔

کمیونزم کی پیشرفت پر بھارتی رائے عامہ کا ردعمل مثبت نہیں ہے۔ بھارتی معاشرہ بنیادی طور پر مذہبی ہے، مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ اپنے اپنے مذاہب سے اس قدر والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں کہ آپس میں بھی سر پھٹول سے باز نہیں آتے۔ آئے دن فرقہ وارانہ فسادات اس پر واضح ثبوت ہیں۔ ان حالات میں بھارتی معاشرہ کے بارے میں یہ قیاس درست نہیں ہے کہ وہاں کمیونزم قدم جما سکتا ہے یا بھارتی باشندوں کے دل میں کمیونزم کے بارے میں کوئی نرم گوشہ موجود ہے۔ مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی اور بدھ مت آپس میں انتہائی اختلاف رکھنے کے باوجود نفس مذہب کے تحفظ کیلئے ایک ہی جیسا جذبہ رکھتے ہیں اور افغانستان کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں اس کا کھلم کھلا اظہار ہوا ہے۔ اس لیے یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بھارتی معاشرہ کمیونزم کیلئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوگا۔

مولانا مفتی محمودؒ اور جہادِ افغانستان

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء

...... مفتی صاحبؒ کی سیاسی جدوجہد کا چوتھا پہلوان کی حب الوطنی ہے۔ وہ اگرچہ تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے بلکہ جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم پر انہوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ہر دور میں پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جدوجہد میں انہوں نے شاندار کردار ادا کیا۔

افغانستان میں روسی جارحیت کی پرزور مذمت اور افغان عوام کی جدوجہد کی غیر مشروط حمایت کے پیچھے جہاں اسلامی و انسانی ہمدردی کے جذبات کارفرما تھے وہاں مفتی صاحب مرحوم کا یہ احساس بھی اس معاملہ میں کافی حد تک دخیل تھا کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے سامنے سپر انداز ہونے کا مطلب خود پاکستان کی سالمیت سے ہاتھ دھونا ہے۔ اس لیے وہ کہا کرتے تھے کہ افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی کیلئے ہی نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کے تحفظ

کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

......افغانستان میں سوویت یونین کی فوجیں اتریں تو مولانا مفتی محمودؒ اکیلے نہیں بلکہ ان کی ساری جماعت میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ انہوں نے اس کے خلاف افغان عوام کی مسلح مزاحمت کو نہ صرف افغانستان کی آزادی کی جنگ اور شرعی جہاد کہا بلکہ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کی جنگ بھی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوویت یونین کی نظریں اصل میں پاکستان کے ساحل پر ہیں اور افغانستان اس کا صرف راستہ ہے، اور یہ کہہ کر پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے میدان عمل میں کود پڑے تھے۔ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری آج بھی زد میں ہے، اسے آج بھی افغانستان ہی کی جانب سے خطرات لاحق ہیں اور صورتحال جوں کی توں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب سوویت یونین کی افواج تھیں اور اب ان کی جگہ امریکی اتحاد کی فوجوں نے لے لی ہے۔ میدان جنگ وہی ہے، جنگ کے اہداف بھی وہی ہیں، مرنے والے افغان بھی وہی ہیں اور پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو درپیش خطرات کا لیول بھی وہی ہے۔ مگر آج کوئی مفتی محمودؒ نظر نہیں آرہا جو قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کا پرچم اٹھاکر میدان میں آئے اور قوم کو دعوت دے کہ اگر اپنا وطن عزیز ہے اور اس کی وحدت و سالمیت عزیز ہے تو غیر ملکی فوجوں کا راستہ افغانستان میں ہی روک دو، انہیں آگے نہ بڑھنے دو اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے پشتیبان بنو کہ وہ تمہاری ہی جنگ لڑ رہے ہیں اور پاکستان کی وحدت و سالمیت کیلئے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کی خوبیاں ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں اور پاکستان کی قومی سیاست میں ان کا روشن کردار آنے والی نسلوں کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے جس جرأت، حوصلہ، تدبر، عزیمت اور حکمت کے ساتھ قومی سیاست میں اہل دین کی قیادت کی اور دینی جدوجہد کے میدان میں پیشرفت کی ہمارے لیے موجودہ بحرانی حالات میں یقیناً وہ راہنمائی اور حوصلہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اس کیلئے ذہنی طور پر تیار ہوں اور مولانا مفتی محمودؒ کی طرح ملی مقاصد اور دینی تقاضوں کی خاطر وقتی مفادات اور خود ساختہ مصلحتوں کی قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۱۶ء

......اگرچہ اس وقت افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی عسکری مزاحمت منظم نہیں ہوئی تھی مگر اس کی شروعات ہو چکی تھی اور اس کے مسلسل آگے بڑھنے کے رجحانات نمایاں تھے۔ اس کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کا رجحان بالکل واضح تھا کہ وہ اس مزاحمت کے حق میں تھے اور اسے شرعی جہاد سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ اس جہاد اور مزاحمت کو سپورٹ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اسے خطہ میں

امریکی عزائم کی تکمیل میں معاونت تصور کرتے تھے۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ہزارویؒ کے ساتھ میری طویل خط وکتابت ہوئی تھی جس کی میں نے ایک عرصہ تک تاریخی دستاویز سمجھ کر حفاظت کی مگر بدقسمتی سے گذشتہ تین چار سال سے تلاش بسیار اور بار بار تگ و دو کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟ فیا اسفاہ۔......

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۵ اکتوبر ۲۰۲۲ء

......وطنِ عزیز کی سالمیت واستحکام کا محاذ ان کی ترجیحات میں سرفہرست تھا اور عالمی وعلاقائی خطرات سے ملک وقوم کو محفوظ رکھنے میں ان کی سوچ اور محنت کا رخ ہمیشہ واضح رہا۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی اسے بلوچستان کے ساحلوں تک سوویت یونین کی رسائی کی مہم قرار دے کر افغان مجاہدین کی مزاحمت کو پاکستان کے دفاع کی جنگ سے تعبیر کیا، اور جہادِ افغانستان کی نہ صرف کھل کر حمایت کی بلکہ عملی پشت پناہی میں بھی وہ تادمِ آخر متحرک رہے۔ اس پس منظر میں سوویت یونین کی پسپائی کے بعد جب انہی مقاصد اور ایجنڈے کیلئے امریکی اتحاد اور مغربی استعمار کا مکروہ کھیل سامنے آیا ہے تو امارتِ اسلامی افغانستان کی جنگ اور تگ و دو اس خطے میں امریکی کیمپ کے پھیلتے ہوئے اثرورسوخ کا راستہ روکنے کیلئے جو کردار ادا کر رہی ہے اس کی اسی سطح پر اور اسی لہجے میں حمایت وامداد کرنے کی ضرورت ہے جس طرح بلوچستان کے ساحلوں کو سوویت یونین کی رسائی سے محفوظ رکھنے کیلئے مولانا مفتی محمودؒ نے جہادِ افغانستان کی دوٹوک حمایت کی تھی۔......

افغانستان، پولینڈ، اسرائیل

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- جنوری ۱۹۸۲ء

افغانستان میں روسی جارحیت کی شدت میں ابھی کمی نہیں ہوئی تھی کہ مشرقی یورپ کے ملک پولینڈ میں ”کمیونسٹ مارشل لاء“ کا نفاذ اور اسرائیل کی طرف سے جولان کی متنازعہ حیثیت کو ختم کرنے کی کاروائی نے عالمی سیاست کو ایک نیا رخ دے دیا ہے اور پوری دنیا اس نئی کشمکش کے نتائج پر سوچنے پر مجبور ہوگئی ہے۔

افغانستان میں عالمی کمیونزم اپنے فروغ اور پولینڈ میں بقاء کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے لیکن افغانستان میں غیور افغان عوام اور پولینڈ میں آزاد مزدور تنظیم سالیڈیریٹی سوویت یونین کے ارادوں کی تکمیل میں حائل ہیں۔ کمیونسٹ تحریک نے سرمایہ دارانہ وجاگیر دارانہ نظام اور استعماریت کے خلاف مظلوم اقوام و طبقات کے حقوق کے تحفظ کے نعرے کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور مظلوم افراد و طبقات نے اسی جذبہ کے تحت کمیونزم کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ لیکن

زیادہ دیر تک یہ تحریک اپنے استعمار دشمن کردار کو برقرار نہ رکھ سکی اور مفادات کی جنگ نے خود اسے استعماری قوتوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ کمیونزم اصل میں ردعمل تھا استعماریت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کی چیرہ دستیوں کا، لیکن اب خود کمیونزم کی چیرہ دستیوں اور جبر واستبداد کے خلاف ردعمل کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ جسے جبر و قوت کے ذریعے دبانے کیلئے سوویت یونین نے پہلے ہنگری اور چیکوسلواکیہ میں فوجی طاقت استعمال کی اور اب پولینڈ کی صورتحال بھی کم وبیش وہی رخ اختیار کرتی جارہی ہے کہ یا تو روس کو قوت کے ذریعے پولینڈ میں مزدوروں کی آزادروی کو دبانا ہوگا اور یا پھر کمیونزم کیلئے بوریا بستر سمیٹنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جائے گا۔

پولینڈ کی صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قیاس کے خلاف نہیں ہوگا کہ کمیونزم کو "ریورس گیئر" لگ چکا ہے اور اب وہ پیش قدمی کی بجائے دفاع کے مورچوں پر ہے۔ ان حالات میں کسی عنصر کا اس غلط فہمی کا شکار ہوجانا کہ روس افغانستان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد کمیونزم کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوجائے گا، خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ روس کو بالآخر افغانستان سے واپس جانا ہے اور عالمی حالات مستقبل کا جو نقشہ دکھاتے ہیں وہ کچھ یوں ہے کہ جارحیت اور فوجی مداخلت کے ذریعے روس کسی ملک اور قوم کو کتنا ہی نشانہ بنالے لیکن کمیونزم کے نظریاتی تحفظ کی جنگ بالآخر اسے اپنی سرحدوں کے اندر ہی لڑنا ہوگی۔

ادھر پولینڈ کی صورتحال سے فائدہ اٹھانے میں اسرائیل نے جس عجلت اور چابکدستی سے کام لیا ہے اس پر اس کی موقع شناسی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس نے عالمی رائے عامہ کو پولینڈ کی طرف ہمہ تن متوجہ پاکر جولان کے اس علاقہ کو اسرائیل میں ضم کرنے کی کاروائی مکمل کرلی جس پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ اسرائیل کی اس کاروائی کو اگرچہ عالمی رائے عامہ اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے رد کردیا ہے اور بظاہر امریکہ نے بھی خفگی کا اظہار کیا ہے لیکن اسرائیلی کاروائی سے دو باتیں عیاں ہیں:

1. ایک یہ کہ وہ ملتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانے اور اپنے ناجائز قبضہ کے استحکام کیلئے کوئی موقع ہاتھ سے کھونے کیلئے تیار نہیں۔
2. اور دوسری یہ کہ ظاہری خفتگی کے باوجود اسرائیل کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ امریکہ بہادر ہے جس کی پشت پناہی کے بغیر اسرائیل کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

جولان کا علاقہ شام کی ملکیت ہے اور زود یا بدیر شام ہی کے پاس واپس جائے گا۔ لیکن اسرائیل کی اس حرکت نے عالمِ اسلام کو سبق دیا ہے کہ اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کی جنگ میں انہیں ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا اور باہمی اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنا ہوگی۔

روسی جارحیت اور پاکستان کے انتخابات

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۵ مارچ ۱۹۸۲ء

وزیر داخلہ جناب محمود ہارون نے اپنے دورۂ کویت کے دوران کویت کی خبر رساں ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کو علاقائی اور اندرونی طور پر درپیش صورتحال پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے جاری رہنے تک پاکستان میں انتخابات نہیں ہوسکتے اور یہ بھی کہا کہ سیاستدان حکومت کو متفقہ سیاسی لائحہ عمل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

انٹرویو کے دیگر مندرجات سے قطع نظر ہم جناب محمود ہارون کے ان دو نکات سے اختلاف کی جسارت کریں گے کیونکہ:

1. ہمارے خیال میں پاکستان میں عام انتخابات کے انعقاد کو روسی جارحیت کے ساتھ منسلک کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ پاکستان میں حالات انتخابات کیلئے سازگار نہیں ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک ایران نے اپنی چوٹی کی لیڈرشپ کے حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد عراق کے ساتھ جنگ کے دوران انتخابات منعقد کرائے ہیں اور ہماری طرح ایران کو بھی روسی جارحیت کے اثرات کا سامنا ہے۔ ہاں اگر انتخابات کے ضمن میں روسی جارحیت کے حوالے سے انتخابات کے حامی عناصر بات کریں تو زیادہ جچتی ہے کیونکہ ان کا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہوگا کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں انتخابات کے ذریعے منتخب حکومت کا قیام جلد از جلد عمل میں لایا جائے تاکہ نمائندہ حکومت عالمی برادری میں پاکستان کے موقف کو زیادہ اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھا سکے۔
2. اسی طرح جناب محمود ہارون کا یہ کہنا بھی واقعہ کے مطابق نہیں ہے کہ پاکستان کے سیاسی رہنما حکومت کو متفقہ سیاسی لائحہ عمل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ ملک کے تمام قابل ذکر سیاسی رہنما سیاسی عمل کی بحالی، ۱۹۷۳ء کے آئین کی بالادستی، سنسرشپ کے مکمل خاتمہ اور انتخابات کے ذریعے نمائندہ حکومت کے جلد از جلد قیام پر متفق ہیں۔ کوئی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جسے ان نکات سے اختلاف ہو اور یہ چار متفقہ نکات موجودہ سیاسی بحران سے نکلنے کا واحد راستہ ہے جسے اختیار کرنے میں حکومت کو تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔

تحریکِ آزادی اور علماء حق

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۹ اپریل ۱۹۸۲ء

علماء کرام نے بنیادی طور پر پاکستان بنانے کیلئے مندرجہ ذیل شعبوں میں کام کیا:

- برصغیر کے مسلمانوں میں دینی افکار و نظریات اور اقدار و روایات کو اصلی صورت میں زندہ رکھا اور یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دینی اقدار و روایات ہی تحریکِ پاکستان کی کامیابی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی والہانہ عقیدت کا باعث بنیں۔
- انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہدِ آزادی کی قیادت، فرنگی راج کے خلاف شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ جہاد، بالاکوٹ میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہادت، ۱۸۵۷ء کا معرکۂ حریت، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تحریک ریشمی رومال، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرتِ افغانستان، فرنگی فوج میں بھرتی ہونے کی حرمت کا فتویٰ، اور آزادیٔ کامل کیلئے جمعیت علماء ہند کا نمایاں کردار اس کی مختلف کڑیاں ہیں۔
- تحریکِ پاکستان کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمدؒ عثمانی، حضرت مولانا ظفر احمدؒ عثمانی اور دیگر سربرآوردہ علماء کرام کی تائید و حمایت حاصل رہی۔ حکیم الامت تھانویؒ کی حمایت اور سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم میں حضرت مولانا شبیر احمدؒ عثمانی اور حضرت مولانا ظفر احمدؒ عثمانی کی خدمات کا اعتراف خود بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس وقت کے قومی پریس میں واضح طور پر کیا۔ اور ان کی خدمات کے عملی اعتراف کے طور پر پاکستان کا جھنڈا کراچی میں علامہ شبیر احمدؒ عثمانی اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمدؒ عثمانی کے ہاتھوں سب سے پہلے لہرایا گیا۔

جمعیت علماء کا قیام باضابطہ طور پر ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں معرضِ عمل میں آیا۔ اس کا قیام دراصل تحریک ولی اللّٰہی کو اس وقت کے حالات اور تقاضوں کے مطابق از سرِ نو منظم کرنے کیلئے عمل میں آیا تھا۔ اس جگہ تحریک ولی اللّٰہی کے مختلف ادوار کا ذکر ضروری ہے تاکہ جمعیت علماء ہند کے قیام کا بنیادی مقصد سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے برصغیر میں مغلوں کا زوال اور مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالیؒ کو ہندوستان پر حملہ کرنے اور مرہٹوں کا زور توڑنے کی دعوت دی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کے اہلِ حق کی معاونت سے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دے کر ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس کے ساتھ ہی امام ولی اللہؒ نے آنے والے خطرات کو بھانپ کر اسلام کے اقتصادی، سیاسی اور معاشی نظریاتی کی وضاحت کی اور انقلابِ فرانس سے پچاس سال قبل اور کارل مارکس کی پیدائش سے سو سال قبل انسان

کے جمہوری و اقتصادی حقوق قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرما کر ایک فکری و عملی جماعت کی بنیاد رکھ دی، جس جماعت نے برصغیر میں ان مقاصد کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں:

1. جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے برصغیر کو اپنے تسلط میں لے کر فرنگی قوانین کے اجراء کا اعلان کیا تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے جانشین اور تحریک ولی اللّٰہی کے سربراہ شاہ عبد العزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر فرنگی کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اس کیلئے باقاعدہ جماعت کو عملی طور پر تیار کیا۔
2. حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے سید احمد شہیدؒ کے ساتھ مل کر جہاد کا آغاز تحریک ولی اللّٰہی کے سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق پشاور کے علاقہ سے کیا۔ تحریک ولی اللّٰہی کی فوج راجھستان، سندھ اور بلوچستان سے ہوتی ہوئی پشاور پہنچی اور اس علاقہ کو اپنی تحویل میں لے کر تحریک ولی اللّٰہی کے پروگرام کے مطابق اس صوبہ میں، جس کی سرحدیں آزاد کشمیر کے پہاڑوں سے خوشاب کی پہاڑیوں تک وسیع تھیں، قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا۔ سید احمد شہیدؒ نے امیر المومنین کی حیثیت سے چھ ماہ اس خطہ پر حکومت کی لیکن پنجاب کی سکھ حکومت نے اسے اپنے اقتدار کیلئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انگریز کی مدد سے سازشوں کے جال بچھا دیے چنانچہ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شیر سنگھ کی فوج اور اس کی پشت پر فرنگی ڈپلومیسی کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔
3. اس کے بعد ولی اللّٰہی تحریک نے جدوجہد کو نئے سرے سے منظم کیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کا عظیم الشان معرکہ حریت برپا ہوا۔ اس معرکہ حریت میں دہلی کے محاذ کے سپہ سالار جنرل بخت خان روہیلاؒ نے سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ مولوی سرفراز علیؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ اور شاملی کے محاذ پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے علمی و روحانی فرزند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے جہاد کی کمان سنبھالی تھی۔ مگر اپنوں کی غداری کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیابی کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے ناکام ہو گیا۔
4. ۱۸۵۷ء کے جہاد کی وقتی ناکامی، ہزاروں علماء کی شہادت، فرنگی کی طرف سے ہزاروں دینی مدارس کے خاتمہ اور ہندوستان کے سادہ لوح مسلمانوں پر یورپی عیسائی پادریوں کی یکطرفہ فکری یلغار کے بعد تحریک ولی اللّٰہی نے دینی علوم کو زندہ رکھنے کیلئے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور امدادِ باہمی کی بنیاد پر اس عظیم تعلیمی تحریک کا آغاز کیا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس کے بانی ہیں۔ جبکہ عیسائی پادریوں کی فکری یلغار کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا شرف الحق دہلویؒ اور ان کے رفقاء نے روکا اور اس طرح فرنگی کے فکری و علمی حملہ کو ناکام بنا دیا۔
5. دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے والے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے شاگرد مولانا عبید

اللہ سندھیؒ اور دیگر تلامذہ کے ساتھ جمعیۃ الانصار قائم کی جس کا بنیادی مقصد علماء کو انگریز کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا۔ خود حضرت شیخ الہندؒ نے ترکی، افغانستان اور حجاز کی حکومتوں کی مدد سے آزادئ وطن کی تحریک کا خاکہ تیار کیا جس کے تحت ترکی کی فوج نے افغانستان کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرنا تھا اور تحریک ولی اللٰہی نے ملک کے اندر علمِ جہاد و حریت بلند کر کے فرنگی اقتدار کا تختہ الٹنا تھا۔ لیکن تحریک کی دستاویزات قبل از وقت انگریز کے ہاتھ لگ گئیں جس کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا ورنہ خود انگریز کے بقول فرنگی کو سمندر بھی پناہ نہ دیتا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کو ان کے رفقاء مولانا سید احمدؒ مدنی اور مولانا عزیر گل مدظلہ اور دیگر احباب سمیت جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔

6. اس منصوبہ میں شرکت کے جرم میں افغانستان کو بھی فرنگی کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ افغانستان کو فرنگی تسلط سے بچانے اور تحریک آزادی کیلئے پناہ گزین کیمپ کے طور پر محفوظ رکھنے کیلئے تحریک ولی اللٰہی کے رہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کابل میں بیٹھ کر فرنگی کے خلاف افغانستان کی مسلح جنگ کی رہنمائی کی جس کے نتیجے میں افغانستان پر جنگی اقتدار قائم نہ ہو سکا۔ غالباً دنیا کا واحد ملک افغانستان ہے جو فرنگی تسلط سے محفوظ رہا، اس کی مفصل رپورٹ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے رفیق ظفر حسین ایبک نے اپنی آپ بیتی مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور میں درج کی ہے۔

ان مراحل سے گزر جانے کے بعد جب آئینی جدوجہد کا مرحلہ پیش آیا تو جمعیت علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

۱۱ مارچ ۱۹۸۷ء کو شیخ الہند سوسائٹی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ایک سمینار سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے ان عظیم راہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے برطانوی استعمار کی غلامی کے دورِ عروج میں سورج غروب نہ ہونے والی سلطنت کے غلبہ و استعلا کو نہ صرف یہ کہ خود ذہنی اور شعوری طور پر قبول نہ کیا بلکہ فکر و عمل، جہد و استقامت اور عزم و استقلال کی شمع کو اپنے خون سے روشن کر کے برادرانِ وطن کو آزادی اور استقلال کی اس شاہراہ پر گامزن کر دیا جس پر چلتے ہوئے اس خطہ کے عوام نے غلامی کی ہولناک دلدل کو عبور کر کے حریت کے میدان میں قدم رکھا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا تعارف دیوبند کی فکری اور علمی درس گاہ کے پہلے طالب علم کی حیثیت کرایا جاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ دیوبند کے قصبہ کی مسجد چھتہ میں انار کے درخت کے زیر سایہ ۱۸۶۶ء کے دوران قائم ہونے

والے دینی مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے اور اس سبقت کا تاج سعادت آپ کے سر پر حسن و خوبی کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ مگر میرے نزدیک شیخ الہندؒ کا اصل تعارف یہ ہے کہ وہ ان آہوں، تمناؤں، آرزوؤں، سحر خیز دعاؤں اور آنسوؤں کا ثمرۂ طیبہ تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس خطۂ زمین میں دین اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں پریشان و مضطرب ہزاروں کڑھتے جلتے دلوں اور جل تھل آنکھوں سے رواں دواں تھے۔ دیوبند ایک علمی، فکری اور سیاسی تحریک کا عنوان ہے اور اس عنوان کے ساتھ اگر کسی شخصیت کو ایک جامع اور مکمل علامت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔

شیخ الہندؒ نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھول کر اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالی تو یہ وہ دور تھا جب برطانوی سامراج کے غلبہ کا ناقوس دنیا کے کم و بیش ہر خطہ میں بج رہا تھا اور عالم اسلام کے بیشتر ممالک برطانوی، فرانسیسی اور ولندیزی استعمار کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے جا چکے تھے۔ کم و بیش پانچ سو سال تک عالم اسلام کی قیادت و حفاظت کا فریضہ سرانجام دینے والی ترکی کی خلافت عثمانیہ "یورپ کا مرد بیمار" کا لقب پا کر عالمِ نزع میں قدم رکھ رہی تھی اور خلافت عثمانیہ کی گرفت میں کمزوری کے احساس کے ساتھ ہی عالم اسلام کے روحانی مراکز مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت القدس کے خلاف استعماری قوتوں کی سازشوں کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ دیوبند میں چالیس سال سے زائد عرصہ تک تعلیمی خدمات سرانجام دینے کے بعد جب آپ نے اپنی تدریسی و تعلیمی محنت کے ثمرات کو مجتمع کرنے کیلئے "جمعیۃ الانصار" کی تشکیل کی طرف اپنے شاگردوں کی راہنمائی فرمائی تو یہ نقطۂ آغاز تھا آپ کی اس جدوجہد کا جو بہت تھوڑے سے عرصہ میں نہ صرف متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی بلکہ اس کے اثرات افغانستان، ترکی، حجاز مقدس اور عالمِ اسلام کے دیگر حصوں تک وسیع ہو گئے۔ اور آپ نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تحریک کی راہنمائی اور قیادت کی بلکہ آپ کی فکری جدوجہد سے افغانستان، ترکی اور حجاز کی تحریکات نے بھی استفادہ کیا۔ اور اس موقع پر محض جذبات و عقیدت کے حوالے سے نہیں بلکہ واقعات اور شواہد کے تجزیہ کی بنیاد پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے اس ارشاد کی تصویب و تصدیق کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ حضرت مولانا محمود حسنؒ کیلئے شیخ الہند کا لقب ان کی علمی حیثیت اور جدوجہد کی وسعت سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ انہیں شیخ العالم کے لقب سے یاد کر کے ہی ان کی شخصیت اور جدوجہد کے اصل دائرہ کار کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بنیادی طور پر برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے قائد تھے لیکن ان کا دلِ دردمند عالم اسلام کی اجتماعی مشکلات سے بے گانہ نہ تھا اور ان کی تگ و دو کے اہداف میں متحدہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے دیگر ممالک میں استعماری قوتوں کی سازشوں اور استحصال سے مسلمانوں کو نجات دلانا بھی شامل تھا۔

متحدہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا تسلسل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ٹوٹ چکا تھا اور افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ آزاد قبائل کی پٹی پر قبائلی حریت پسندوں کے معرکہ ہائے حریت اس تسلسل کو باقی رکھنے کی ایک کوشش دکھائی دے رہے تھے۔ مگر قومی سطح پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی استعمار کی غلامی کا طوق گردن سے اتار دینے کی

اس جدوجہد کو حضرت شیخ الہندؒ نے ہی منظم کیا جسے دنیا ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے یاد کرتی ہے اور جس کیلئے شیخ الہندؒ نے نہ صرف ملک کے اندر لاکھوں دلوں میں بغاوت اور حریت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا تھا بلکہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے ساتھ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے بیرونی پشت پناہی اور تعاون کے ساتھ بغاوت کی اس عظیم جدوجہد کو منظم کر لیا تھا۔ لیکن عالمی جنگ میں ترکی کے حلیف جرمنی کی شکست کے بعد عالمی حالات ساز گار نہ ہونے کے باعث یہ جدوجہد پروان نہ چڑھ سکی اور اس کا نتیجہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ شیخ الہندؒ کی گرفتاری اور مالٹا جزیرہ میں نظر بندی کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ تحریکات آزادی میں مزاحمت، تشدد اور تصادم کی بنیاد پر منظم کی جانے والی قومی سطح کی آخری تحریک تھی جس کے بعد تحریکاتِ آزادی کا رخ عدم تشدد کی طرف مڑ گیا۔

افغانستان اپنے بہادر عوام کی دینداری اور غیرت و حمیت کی وجہ سے بے سروسامانی کے باوجود ہندوستان کے مجاہدین آزادی کا ایک روایتی پشت پناہ تھا اور اس کی سرحد کے ساتھ ساتھ آزاد قبائل کی پٹی ہندوستان کی آزادی کی جنگوں کا بیس کیمپ بنی ہوئی تھی جہاں حاجی صاحب ترنگزئی کی قیادت میں عملی جہاد کا سلسلہ جاری تھا۔ برطانوی استعمار نے اس پریشانی سے جان چھڑانے کیلئے افغانستان پر قبضہ کرنے کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنالیا اور باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ مگر اس جنگ کے آغاز سے قبل شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تلمیذ خاص مولانا عبید اللہ سندھیؒ کابل پہنچ کر افغانستان میں شیخ الہندؒ کے شاگردوں، خوشہ چینوں اور آزاد قبائل کے حریت پسندوں کے درمیان رابطہ اور اعتماد کا ایک ایسا نظام قائم کر چکے تھے جس کا سامنا برطانوی استعمار کی منظم افواج نہ کر سکیں۔ مولانا سندھیؒ نے کابل میں بیٹھ کر افغانستان اور آزاد قبائل میں شیخ الہندؒ کے علمی و فکری اثرات کو مجتمع کر کے ایک ایسی قوت کی شکل دے دی جس نے افغانستان کی جنگِ استقلال میں بنیادی کردار ادا کیا اور بالآخر برطانوی استعمار اس بات پر مجبور ہو گیا کہ افغانستان کی آزادی اور استقلال کا احترام کرتے ہوئے اس کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد قرار دے کر اسے عبور نہ کرنے کا سمجھوتہ کرے۔

ترکی کی خلافت عثمانیہ پانچ سو سال تک مسلمانوں کی خدمات سرانجام دینے کے بعد اضمحلال کا شکار ہونے کے باوجود ایک حد تک مسلمانوں کی وحدت کی علامت اور قوت و شوکت کے نشان کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھی۔ یورپ کی صلیبی قوتوں کو عثمانی خلفاء بالخصوص سلطان محمد فاتحؒ کی مجاہدانہ یلغار ابھی تک یاد تھی اور قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے دلوں میں لگنے والے گھاؤ مندمل نہیں ہو پائے تھے۔ اس لیے ان صلیبی قوتوں کی تمام تر حکمت عملی اور پالیسیوں کا محور یہ نکتہ قرار دیا گیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو خلافت عثمانیہ کا تیاپانچہ کر کے نہ صرف عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے بلکہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھین کر یہودیوں کے حوالے کیا جا سکے تاکہ اس عظیم احسان کے صلہ میں صیہونی اور صلیبی قوتوں کے درمیان اشتراک و اتحاد کی راہ ہموار ہو اور یہودیوں کی دولت عالمی اثرات اور سازشی ذہن کو مغربی استعمار کے حق میں استعمال کرنے کی صورت پیدا ہو۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کے ایک صوبہ حجاز مقدس کے گورنر شریف مکہ حسین کو انگریزوں نے پورے عرب کی خلافت کا لالچ دے کر بغاوت کیلئے تیار کیا اور ترکوں کی خلافت کے خلاف فتویٰ کی آڑ میں ان کے خلاف عالم اسلام میں نفرت اور غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے کا سامان مہیا کیا۔ شریف مکہ حسین کے ایما پر ترکوں کے خلاف فتویٰ جب مرتب ہوا اور اس کی ترتیب و اشاعت میں

ہندوستان کے بعض علماء بھی شریک کار ہوئے تو حضرت شیخ الہندؒ ان دنوں حجاز میں تھے، آپ کے سامنے یہ فتویٰ پیش ہوا مگر آپ نے کمالِ بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ترکوں کے خلاف یہ فتویٰ شریف مکہ کی بغاوت کی بنیاد بنا جس کے نتائج پر ایک نظر ڈال لیجئے:

- خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں عرب علاقے کئی مستقل عرب حکومتوں میں تبدیل ہو گئے۔
- اسی بندر بانٹ میں استعماری قوتوں نے فلسطین میں یہودیوں کو بسانے اور ان کیلئے الگ اسرائیلی ریاست کے قیام کی راہ نکالی۔
- خود خلافت عثمانیہ یہ وار نہ سہہ سکی اور یورپ کا یہ "مرد بیمار" آخری ہچکی لے کر عالمی نقشے سے غائب ہو گیا۔

مگر اس کے برعکس شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی طرف سے ترکوں کے خلاف فتوٰی پر دستخط سے انکار کے اثرات یہ ظاہر ہوئے کہ پورے ہندوستان میں خلافتِ عثمانیہ کے حق میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور دیگر قومی قائدین کی راہنمائی میں تحریک خلافت کے عنوان سے ایک پر جوش تحریک چلی جو آزادی کی آئندہ جدوجہد کی بنیاد ثابت ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے سامنے دراصل پورے عالم اسلام کی آزادی کا تصور تھا اور وہ استعماری قوتوں کے زیر تسلط تمام مسلم ممالک کی حریت کیلئے مضطرب تھے۔ لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان استعماری قوتوں میں سب سے بڑا استعمار برطانوی سامراج ہے اور اس کی قوت کا اصل سرچشمہ متحدہ ہندوستان ہے۔ اس لیے عالم اسلام کی آزادی کا دارومدار اس پر ہے کہ ہندوستان آزاد ہو تاکہ برطانوی استعمار میں باقی ممالک کو زیر تسلط رکھنے کی سکت باقی نہ رہے اور پھر دوسری استعماری قوتوں کو بھی مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہونا پڑے۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کی جدوجہد کا اصل ہدف متحدہ ہندوستان کی آزادی رہا ہے اور اس مضبوط و مستحکم بنیاد پر انہوں نے عالم اسلام کی تمام تحریکات آزادی کو نہ صرف فکر و نظر کی توانائی عطا فرمائی بلکہ جہد و عمل اور ایثار و استقامت کا حوصلہ بھی بخشا۔

آج شیخ الہندؒ کے اس تصور کی صداقت تاریخ کی ایک روشن حقیقت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی عالم اسلام کے گرد استعماری قوتوں کے غلبہ کا حصار دیکھتے ہی دیکھتے ربع صدی سے بھی کم عرصہ میں ٹوٹ گیا ہے اور میں اسے افغانستان اور آزاد قبائل کے ساتھ شیخ الہندؒ کے گہرے فکری، علمی اور سیاسی روابط ہی کا ثمرہ قرار دوں گا کہ افغانستان پر روسی استعمار کی مسلح یلغار دم توڑتی دکھائی دے رہی ہے۔

آج آپ افغانستان میں روس جیسی عالمی استعمار اور سپر پاور کے خلاف صف آرا افغان مجاہدوں اور حریت پسندوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو ان میں ایک بڑی تعداد ان علماء کی نظر آئے گی جو حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور حضرت مولانا عبد الحقؒ کے صرف دو واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی شاگردی کا شرف رکھتے ہیں۔ اور اس طرح عملاً افغانستان کے جہاد کی کڑیاں بھی شیخ الہندؒ کی اسی تحریک سے جا ملتی ہیں جس کا مقصد عالم اسلام کو ہر قسم کے استعمار اور سامراج سے نجات دلا کر مکمل آزادی اور غلبۂ اسلام کی منزل سے ہمکنار کرنا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کے فکر و عمل اور ایثار و قربانی کے وارث افغان مجاہدین پورے عالم اسلام کے تشکر

کے مستحق ہیں کہ انہوں نے:

- بے سروسامانی کی حالت میں اپنے وطن کی دینی غیرت و تشخص کا تحفظ کیا۔
- پاکستان اور مشرق وسطیٰ کی طرف روسی استعمار کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔
- اپنی جرأت و استقامت اور جذبۂ جہاد کے ساتھ روس کی ان مسلم ریاستوں میں دینی بیداری کی لہر دوڑا دی جو روسی سامراج کے آہنی شکنجہ میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اور آج جب روس جیسی عالمی قوت اپنے زیر تسلط مسلم علاقوں بالخصوص قازقستان اور ازبکستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی دینی بیداری سے خوفزدہ ہو کر افغانستان سے واپسی کی راہیں تلاش کر رہی ہے تو فکر و نظر کی جبینِ نیاز عالمِ تصور میں اس عظیم شخصیت کے سامنے خم ہونے کیلئے بے چین ہے جسے دنیا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ریموٹ کنٹرولڈ غلامی کا امریکی منصوبہ؟

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۶ جون ۱۹۸۷ء

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب استعماری قوتوں کے قویٰ مضمحل ہونے لگے اور نوآبادیاتی مقبوضات پر ان کی گرفت قائم رہنے کے امکانات کم ہو گئے تو ان غلام ملکوں کے رہنے والے عوام کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کے آثار پیدا ہو گئے کہ وہ آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد فضا میں سانس لے سکیں اور استعماری قوتوں کے مقبوضہ ممالک یکے بعد دیگرے آزاد ہونے لگے۔ لیکن سامراجی طاقتوں نے نوآبادیاتی مقبوضات پر تسلط سے مکمل طور پر دستبردار ہونے کی بجائے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ یہ ممالک اور اقوام بظاہر آزاد ہو جائیں مگر ان کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی پالیسیوں پر سامراجی آقاؤں کی چھاپ اور کنٹرول بدستور قائم رہے۔ چنانچہ آزاد ہونے والے بیشتر ممالک ظاہری غلامی سے نجات حاصل کرنے کے باوجود اپنی پالیسیوں کے لحاظ سے ”ریموٹ کنٹرول غلامی“ کا شکار ہیں اور آج تیسری دنیا اور عالمِ اسلام کے بیشتر ممالک کا حال یہ ہے کہ آزاد اور خود مختار ریاستیں کہلانے کے باوجود وہ

- دفاعی خود مختاری اور خود کفالت کے تصور تک سے ناآشنا ہیں۔
- کسی نہ کسی عالمی استعماری قوت کے زیرِ اثر رہنے پر مجبور ہیں۔
- اقتصادی امداد کے خوشنما عنوان کے تحت ان کی معاشی پالیسیاں امداد دینے والی عالمی طاقتوں کے مفادات کے دائرہ میں محصور ہیں۔
- جدید ٹیکنالوجی اور توانائی کے اعلیٰ ترین وسائل ان کیلئے شجرِ ممنوعہ ہیں۔

کم و بیش یہی حال پاکستان کا بھی ہے۔ پاکستان جو برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی اکائی کا ایک حصہ تھا ۱۹۴۷ء میں

تقسیم ہند کے نتیجہ میں وجود میں آیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر ابھرا۔ پاکستان نے آزادی برٹش استعمار سے حاصل کی تھی لیکن اس وقت تک برطانوی استعمار عالمی جنگوں کے نتیجہ میں سمٹ سمٹا کر جزائر برطانیہ تک محصور ہو چکا تھا اور اس کیلئے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ پوری دنیا میں مغرب کے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے تحفظ کیلئے کوئی رول ادا کر سکے۔ اس لیے وہ اپنی یہ ذمہ داریاں تازہ دم اور توانا امریکی استعمار کے سپرد کر کے عالمی کردار سے ریٹائر ہو گیا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد طے شدہ منصوبہ کے مطابق پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے نازک منصب پر چودھری ظفر اللہ خان جیسے شخص کو لایا گیا جو مرزا غلام احمد قادیانی کے مخلص پیروکار کی حیثیت سے اور اپنے ذاتی کردار کے لحاظ سے بھی برطانوی استعمار کا مکمل وفادار تھا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو برطانوی استعمار کے جانشین امریکی استعمار کے مفادات کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے جس محنت، لگن اور خلوص سے کام کیا ہے نتائج و ثمرات کو دیکھتے ہوئے اس کی داد نہ دینا ناانصافی کی بات ہوگی۔ جس وقت پاکستان کی خارجہ پالیسی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہونے والی نئی عالمی صف بندی کے نتیجہ میں امریکہ اور روس نئی عالمی قوتوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے سامنے آ چکے تھے۔ اس وقت پاکستان کی نظریاتی اساس، جنوبی ایشیا کے مخصوص حالات اور عالمِ اسلام کے مجموعی مفادات کا تقاضا تھا کہ پاکستان عزیمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ان دونوں عالمی طاقتوں کی کشمکش اور باہمی محاذ آرائی میں فریق بننے کی بجائے مکمل طور پر غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اختیار کر کے عالمِ اسلام کو متحد کرنے اور ملتِ اسلامیہ کو ایک مضبوط نظریاتی قوت کے طور پر سامنے لانے کی حکمتِ عملی اختیار کرتا۔ لیکن ظفر اللہ خان کی وزارتِ خارجہ نے اس نوتشکیل شدہ ملک کو خارجہ پالیسی کا جو ڈھانچہ مہیا کیا اس نے پاکستان کو بہت جلد امریکی لابی کے ایک وفادار ملک کی حیثیت دے دی اور بالآخر اسے سیٹو اور سینٹو کے معاہدات میں باقاعدہ شریک ہو کر اپنی اس جانبدارانہ حیثیت کا اعلان کرنا پڑا۔

اس خارجہ پالیسی کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں پر امریکی چھاپ گہری ہوگئی۔ چنانچہ ایسا ہوا اور اس حد تک ہوا کہ قومی اسمبلی جیسے ذمہ دار ادارے کے ریکارڈ میں ایک اہم ملکی شخصیت کے یہ ریمارکس آج بھی کسی تردید کے بغیر موجود ہیں کہ پاکستان میں حکومت کی کوئی تبدیلی امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ بات اب کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ پاکستان کے سیاسی مستقبل کو امریکہ کی دو بڑی پارٹیوں ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی کے درمیان اقتدار اور طاقت کے توازن کے پیمانے میں ماپا جاتا ہے اور اقتدار کی سیاست کرنے والے بڑے بڑے پاکستانی سیاستدانوں کو بھی اپنی قسمت کا حال امریکی وزارتِ خارجہ کے جنوبی ایشیا کے ڈیسک کے حکام سے معلوم کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی اور دفاعی و اقتصادی شعبوں پر اس حد تک کنٹرول کے صلہ میں امریکہ نے پاکستان کو کیا دیا ہے؟ وہ آزمائش کے دو سنگین مراحل ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں امریکہ کے کردار کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔

ہماری ان گزارشات کا مقصد یہ تاثر دینا نہیں ہے کہ امریکہ کی بجائے دوسری عالمی طاقت روس کے ساتھ وابستگی کی صورت میں شاید صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی کیونکہ مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان میں ہم روس کا کردار بخوبی دیکھ چکے ہیں کہ وابستہ ممالک کے ساتھ اس کی وفاداری بھی یک طرفہ مفادات تک محدود ہے۔ اور چونکہ امریکہ اور روس دونوں استعماری

قوتیں ہیں اس لیے مفادات کے ٹکراؤ کے باوجود ان کے مزاج، ذہنیت اور طریقِ واردات میں کسی قسم کے فرق اور تفاوت کا تصور کرنا قطعی طور پر ایک غیر منطقی بات ہوگی۔

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا جھگڑا طے شدہ منصوبہ کے مطابق صرف اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ یہ دونوں ملک اپنے وسائل اور توانائیوں کو ترقی پر خرچ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور نفرت انگیزی کیلئے وقف کیے رکھیں اور عالمی قوتوں کا دستِ نگر بننے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کی واضح قراردادوں اور فیصلوں کے باوجود اس مسئلہ کے حل میں عالمی طاقتوں کی عدم دلچسپی ان کی اس خواہش کی آئینہ دار ہے کہ مسئلہ کشمیر کا وجود قائم رہے تاکہ ان دونوں ملکوں کی عالمی قوتوں کے ساتھ وابستگی میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ سابق صدر ایوب خان کے دور میں پاکستان کی سرزمین سے امریکی اڈوں کے خاتمہ، پھر اس کے بعد سیٹو سے پاکستان کی علیحدگی اور اب غیر جانبدار تحریک کے ساتھ عملی وابستگی کے باعث بظاہر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ پاکستان شاید مکمل غیر جانبداری کی شاہراہ پر گامزن ہو رہا ہے مگر ایرانی انقلاب کے بعد جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کے مخدوش مستقبل اور افغانستان میں روس کی مسلح مداخلت سے پاکستان کی سالمیت کو درپیش خدشات نے غیر جانبداری کی طرف پاکستان کی خارجہ پالیسی کی پیش رفت کو نہ صرف بریک لگا دی ہے بلکہ گاڑی ریورس گیئر میں آچکی ہے اور ایکسیلیریٹر پر باہمی مفادات کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس وقت امریکہ پاکستان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی امداد میں بظاہر خاصی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور مبینہ طور پر بعض ناگزیر تحفظات اور مصلحتوں کو بھی نظر انداز کر رہا ہے جس کا مقصد شاید یہ ہے کہ پاکستانی عوام کو اس سلسلہ میں گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کا احساس دلایا جائے۔ پروپیگنڈا کے عالمی اور قومی محاذ پر اس تاثر کو اجاگر کرنے میں امریکہ اور اس کے حواریوں کو ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن صورتِ حال کا حقائق اور واقعات کی بنیاد پر تجزیہ کیا جائے تو امریکہ کی اس بظاہر فراخدلی اور پاکستان دوستی کے پسِ منظر میں باہمی مفادات کے مساویانہ اشتراک یا ایک آزاد اور خود مختار قوم کو اس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے باوقار طور پر مدد دینے کا جذبہ کارفرما دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس ظاہری فراخدلی کی بنیاد بھی اسی مخصوص استعماری ذہنیت اور سامراجی مزاج پر کھڑی نظر آتی ہے جس کا مقصد ضرورت مند ممالک کے گرد اپنے مخصوص استعماری مفادات کے شکنجے کو تنگ سے تنگ کرتے چلے جانا ہے۔

اس وقت امریکہ کی سینٹ اور کانگریس میں پاکستان کی فوجی و اقتصادی امداد کیلئے شرائط کا سلسلہ زیرِ بحث ہے اور امریکی سینٹ کی سترہ رکنی خارجہ تعلقات کمیٹی کی ایک قرارداد پر امریکہ کے قومی حلقے غور کر رہے ہیں جس میں ان شرائط کا تعین کیا گیا ہے جس کے تحت پاکستان کو اواکس طیارے اور دیگر فوجی و اقتصادی امداد دی جانے والی ہے۔

قرارداد کے مندرجات اور شرائط پر گفتگو سے پہلے ہم اس اصولی مسئلہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ آخر پاکستان کو دی جانے والی امداد شرائط کے ساتھ کیوں مشروط ہے؟ شرائط خواہ کچھ بھی ہوں جب اس امداد کا تعلق پاکستان کے یک طرفہ مفادات سے نہیں ہے اور جنوبی ایشیا میں خود امریکی مفادات کا پلڑا اس سودے میں واضح طور پر جھکا ہوا ہے تو پھر یک طرفہ شرائط کا کیا جواز ہے؟ یہ درست ہے کہ افغانستان میں مسلح روسی مداخلت اور فوج کشی اور بھارت کی جنونی قیادت کے

پاکستان دشمن عزائم سے پیدا شدہ صورتِ حال میں پاکستان کیلئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کا سہارا لے کر علاقہ میں دفاعی توازن قائم کرنے کیلئے اس سے امداد حاصل کرے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل اسی طرح درست ہے کہ ایران سے رضا شاہ پہلوی کی رخصتی کے بعد جنوبی ایشیا میں اپنے مفادات کی حفاظت کیلئے امریکہ کے پاس بھی کوئی "گن مین" باقی نہیں رہا اور یہ ایک ایسا خلا ہے جسے پر کیے بغیر اس خطہ میں اپنی موجودگی کا تسلسل برقرار رکھنا امریکہ کیلئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے مفادات صرف پاکستان کے نہیں امریکہ کے بھی ہیں، اور جب مفادات دو طرفہ ہیں تو باہمی مشترکہ مفادات کے تحفظ کا معاملہ طے کرتے ہوئے یک طرفہ شرائط کی بات نہ صرف اصولوں کے منافی ہے بلکہ اس سے خود امریکہ کے خلوص اور ذہنیت کا بھی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کی امداد کیلئے امریکہ کی طرف سے لگائی جانے والی شرائط سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دو آزاد اور خود مختار ملک ایک علاقہ میں باہمی مشترکہ مفادات کی بنیاد پر کوئی آزادانہ معاملہ کر رہے ہیں، بلکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک آقا اپنے نوکر کو کچھ بخشش دے کر ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ پیسے تمہیں اس لیے دے رہا ہوں تاکہ تم فلاں فلاں کام سے باز رہو۔ اور یہ تاثر ایک آزاد اور نظریاتی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کیلئے کسی طرح بھی عزت و وقار کا باعث نہیں ہے۔

جہادِ افغانستان اور عالمِ اسلام

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۱ اگست ۱۹۸۷ء

(یہ مضمون قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا نور محمد شہیدؒ آف وانا کی کتاب "جہادِ افغانستان" کے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیا گیا تھا۔)

جہادِ اسلام کے بنیادی احکام میں سے ایک حکم ہے جس پر ملتِ اسلامیہ کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کا دارومدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جہاد کے احکام و مسائل اسی تفصیل و اہتمام کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں جس تفصیل و اہتمام کے ساتھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر احکام شرعیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرونِ اولیٰ میں اسلام کے احکام کا ذکر جب بھی ہوتا تھا جہاد کا ذکر ان کے ساتھ ہوتا تھا اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد میں فکری یا عملی طور پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ محدثین اور فقہاء نے احادیث اور فقہ کی جتنی کتابیں مرتب کر کے امت کے حوالے کی ہیں ان میں جہاد کے مستقل ابواب قائم کیے ہیں، اس کے مسائل بیان کیے ہیں اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاد کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی کوہان کی بلندی یعنی اس کی برتری اور رفعت کی علامت قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"جب تم کاروبار اور کھیتی باڑی کے پیچھے پڑ جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی

ذلت مسلط کردیں گے جو دین کی طرف واپس آئے بغیر تم سے نہیں ہٹے گی۔"(ابوداؤد)

گویا جہاد مسلمانوں کی عزت و وقار کی علامت ہے اور اس کا ترک کرنا ذلت و رسوائی کا باعث ہے اور یہ ذلت و رسوائی ہم عالم اسلام میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک ارب کے قریب تعداد اور چالیس سے زائد باقاعدہ مسلم حکومتوں کے ہوتے ہوئے بھی اسباب و وسائل کی فراوانی کے باوجود آج ملتِ اسلامیہ غیروں بلکہ دشمنوں کی دستِ نگر ہے۔ نظریات اور نظام سے لے کر دفاع اور ٹیکنالوجی تک ہر معاملہ میں ہم دوسروں کے محتاج ہیں، اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے؟ حافظ ابن حجر الہیثمیؒ نے الزواجر عن اقتراف الکبائر میں امام طبرانیؒ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے جس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ما ترک قوم الجهاد الا عمهم الله تعالیٰ بالعذاب۔(الزواجر ص ۱۶۴ ج ۲)

"کوئی قوم بھی جہاد ترک نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ اسے عمومی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں"۔

اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں آج ہم عالمِ اسلام کی مجموعی صورتِ حال کو دیکھیں تو جہاد جیسے اہم فریضہ کے ترک کر دینے کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا یہ عمومی عذاب باہمی تشتت و افتراق، غیر مسلم اقوام کے فکری اور نظریاتی غلبہ، سائنسی و حربی بالادستی اور دشمنوں کی احتیاج کی صورت میں بالکل واضح اور روشن دکھائی دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ میں جب تک جہاد کا پرچم سربلند رہا ہے مسلمانوں کی بداعمالیوں کے باوجود کفر کی قوتیں ان کے سامنے سرنگوں رہی ہیں اور مسلمانوں کی قوت و شوکت پوری دنیا میں مسلم رہی ہے۔ اور جب سے مسلمانوں نے اپنے شب و روز کے اعمال میں سے جہاد اور اس کی تیاری کو نکال دیا ہے ملتِ اسلامیہ کی حیثیت ایک بے بس اور مقہور قوم کی ہو کر رہ گئی ہے۔ برطانیہ کے ایک سابق وزیراعظم مسٹر گلڈسٹون کے مطابق جہاد کا یہ جذبہ ہی ایک ایسی قوت ہے جو مسلمانوں کو کسی دوسری قوم کا محکوم ہونے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں پر استعماری قوتوں کے غلبہ و تسلط کے بعد ان متسلط قوتوں کا سب سے بڑا ہدف یہی رہا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کے جذبہ کو سرد کیا جائے اور ان کی عملی زندگی سے جہاد کے شرعی حکم کو بے دخل کر دیا جائے۔ خود ہمارے ہاں برصغیر پاکستان، بھارت و بنگلہ دیش میں برطانوی استعمار نے اپنے دورِ تسلط میں مختلف مذہبی طبقوں کو صرف اس لیے جنم دیا کہ وہ جہاد کی مخالفت کریں اور مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کو دور کریں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا تو مقصدِ وحید یہی تھا۔

خلافتِ عثمانیہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا آخری نشان اور علامت تھی جسے ختم کرنے کیلئے استعماری قوتوں نے مسلسل سازشیں کیں اور اب تو واقعات کے تسلسل اور قرائن و شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے مؤرخین کیلئے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا کہ ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ کے خلاف عربوں کو ابھارنے اور خلافت کے زیرِ نگین مختلف علاقوں میں بغاوت پیدا کرنے میں مغربی استعمار کی مسلسل سازشوں کا حصہ ہے۔ اور انہی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں خلافتِ عثمانیہ کا وجود ختم ہوا جس سے استعماری قوتوں کے تین بڑے مقاصد تھے:

1. مسلمانوں میں خلافت کا برائے نام وجود بلکہ اس کا تصور بھی باقی نہ رہے اور مسلمان نظامِ حکومت کے سلسلہ

میں جدید افکار و نظریات کو ذہناً قبول کر لیں۔

2. مسلمانوں میں جہاد کا تصور ختم ہو جائے اور کوئی ایسا ادارہ باقی نہ رہے جو مسلمانوں کو جہاد کیلئے دعوت دے سکے یا انہیں جمع کر سکے۔

3. مسلمانوں کی اجتماعی قوت (خلافتِ عثمانیہ) کو ختم کر کے فلسطین میں یہودیوں کو بسانے اور ان کی ریاست قائم کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔

اب اس کے نتائج کو دیکھ لیں کہ ان تینوں مقاصد میں استعماری قوتوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خلافت کا تصور مسلمانوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور کم و بیش تمام مسلم حکومتوں کی بنیاد جدید افکار مثلاً جمہوریت یا سوشلزم پر ہے۔ سعودی عرب یا ایک دو اور حکومتوں کی اصولی بنیاد اگرچہ مذہب پر بیان کی جاتی ہے مگر وہاں بھی نظامِ حکومت اسلامی خلافت نہیں بلکہ بادشاہت ہے اور ملک کا مکمل نظام بھی پورا اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ جہاد کا ذکر اب صرف حدیث اور فقہ کی کتابوں میں رہ گیا ہے، مسلمانوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ افغانستان میں خالص شرعی بنیادوں پر ہونے والا جہاد بھی اب مسلمانوں کو کوئی عجیب و غریب سا مسئلہ لگ رہا ہے اور عام مسلمان کا ذہن اس جہاد کو اپنے اندر جگہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہے۔ فلسطین میں یہودی سلطنت اسرائیل کے نام سے نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ عالمِ عرب اور پورے عالمِ اسلام کیلئے ایک مصیبت اور چیلنج بنی ہوئی ہے۔

یہی صورتِ حال ہے جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاداتِ گرامی میں (۱) اللہ تعالیٰ کے عمومی عذاب (۲) مسلمانوں کی ذلت (۳) دشمن کے تسلط (۴) اور ملتِ اسلامیہ کی بے بسی سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کی آیت کریمہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکه کی جو تفسیر صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کی ہے اسے سامنے رکھا جائے تو یہ خود اختیاری ہلاکت کی وہ شاہراہ ہے جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں منع فرمایا ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی ص ۱۲۱ ج ۲ میں حضرت ابو عمرانؒ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حدیث حسن غریب صحیح قرار دیا ہے۔

"حضرت ابو عمرانؒ کہتے ہیں کہ ہم غزوۂ روم کے موقع پر روم کے ایک شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک رومیوں کا ایک بڑا لشکر قلعہ سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہمارے لشکر میں سے بھی کم و بیش اتنے ہی لوگ یا ان سے زیادہ ان کے مقابلہ کیلئے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے تنہا آگے بڑھ کر رومیوں پر حملہ کر دیا اور ان کے لشکر میں گھس گیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ شخص تو اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکه) اس پر حضرت ابوایوب انصاریؓ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کریمہ کا یہ مطلب سمجھتے ہو حالانکہ قرآن کریم کی یہ آیت ہم انصارِ مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگوں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ ہمارے اموال اکثر جنگوں میں صرف ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اب اسلام کو غلبہ دے دیا ہے اور اس کے مددگار بہت ہو گئے ہیں اس لیے اب اگر ہم گھروں میں رہ کر اپنے اموال وغیرہ کی اصلاح کر لیں اور نقصانات کی تلافی کی کوئی صورت نکالیں تو بہتر ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر یہ آیت کریمہ نازل کر کے ہماری بات کو رد کر دیا کہ وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو اور خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ تو اس ہلاکت سے مراد اپنے اموال اور کاروبار کی اصلاح کیلئے گھروں میں بیٹھ رہنا اور جہاد کو ترک کر دینا ہے۔"

حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ارشاد کے مطابق جہاد کو ترک کر دینا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم و مقصد بھی یہی ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں بھی ہم اپنے موجودہ حالات کا تجزیہ کریں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کر کے خود کو ہلاکت کی موجودہ دلدل میں دھکیل دیا ہے اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت کے حوالے سے بات گزر چکی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ جہاد کے باعث مسلط ہونے والی اس رسوائی کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ذلت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت دین (یعنی جہاد) کی طرف واپسی کے بغیر نہیں ہوگی۔ اس لیے آج عالمِ اسلام کی اجتماعی مشکلات و مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کو بیدار کیا جائے اور جہاد کی تحریک کو اس انداز میں منظم کیا جائے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور عظمتِ رفتہ کی بحالی کا نقطۂ آغاز بن سکے۔

اس پسِ منظر میں جہادِ افغانستان کو دیکھا جائے تو یہ مایوسیوں کے اس تاریک دور میں امید کی ایک ایسی کرن نظر آتی ہے جس سے ملتِ اسلامیہ کے اس عظیم شاہراہ پر گامزن ہونے کے امکانات محسوس ہو رہے ہیں جو عالمِ اسلام کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کی منزل کی طرف جاتی ہے۔ افغانستان میں روسی استعمار کی جارحانہ فوج کشی اور غلبہ کے خلاف افغانستان کے غیور و جسور حریت پسند مسلمان آزادی کی جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ شرعی نقطۂ نظر سے بلاشبہ جہاد ہے اور دنیائے اسلام کے دینی و علمی حلقے اس کے جہادِ شرعی ہونے پر متفق ہیں۔ راقم الحروف کو خود جہادِ افغانستان کے بعض مورچوں پر جانے کا موقع ملا ہے اور ارگون کے محاذ پر کچھ لمحات گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس موقع پر ایک افغان عالمِ دین کی یہ بات میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے کہ

"ہمیں افغانستان کی موجودہ صورتِ حال کی شکل میں اس جرم کی سزا ملی ہے کہ جب روس نے وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں پر قبضہ کیا اور وہاں کے بعض حریت پسند مسلمانوں نے مزاحمت اور جہاد کا راستہ اختیار کیا تو ہم یعنی افغانستان کے مسلمانوں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان کی مدد نہ کی جس کی وجہ سے وہ پسپا اور مجبور ہو گئے۔ اور وہاں کامیابی کے بعد روس کو افغانستان کی طرف پیش قدمی کا حوصلہ ہوا، اس لیے میں پاکستان کے علماء کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہماری حالت سے عبرت پکڑیں اور اس جرم کا

ارتکاب نہ کریں جس کے نتیجہ میں ہم یہ بڑی سزا بھگت رہے ہیں۔‘‘

جہاد کے شرعی احکام کے مطابق جس ملک پر کافروں کا تسلط ہو جائے وہاں کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے جبکہ ان کے قریب رہنے والے مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس مسئلہ کی رو سے ہم اہلِ پاکستان پر جہادِ افغانستان میں حصہ لینا اگر فرضِ عین نہیں تو فرضِ کفایہ تو بہرحال ضرور ہے اور ہم شرعاً اس کے مکلف ہیں کہ جہاد میں جتنا حصہ ڈال سکیں اس سے گریز نہ کریں۔ جہادِ افغانستان میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے اور اس کے خلاف مختلف حلقوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا ازالہ کر کے جہاد کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے۔

افغان مجاہدین کی مسلسل پیش قدمی اور ڈاکٹر نجیب اللہ کے بقول افغانستان کے ۸۰ فیصد علاقہ پر مجاہدین کے کنٹرول نے روس کے ساتھ امریکہ کو بھی پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ افغانستان میں ایک خالص دینی حکومت کے قیام سے جہاں روس کو بخارا، تاشقند اور روس میں واقع دیگر مسلم ریاستوں میں دینی بیداری اور آزادی کی تحریکات ابھرنے کا خطرہ ہے وہاں یہ صورتِ حال امریکہ کیلئے بھی قابلِ برداشت نہیں ہے کہ افغانستان میں قائم ہونے والی دینی حکومت جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کی مسلم ریاستوں میں غلبۂ اسلام کی تحریکات کیلئے تقویت و تائید کا باعث بنے۔ اور یہ تحریکات افغان حریت پسندوں کے پرجوش جذبات کی تائید سے اپنے ملکوں میں لادینی حکومتوں اور نظاموں کا تختہ الٹ کر دینی حکومتیں قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس اور امریکہ دونوں کی لابیاں جہادِ افغانستان کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ روسی لابی اسے امریکہ اور روس کے مفادات کی جنگ قرار دے کر مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹانے میں مصروف ہے، اور امریکی لابی صرف روسی جارحیت کے مقابلہ کی حد تک اس کی حمایت کر کے اس سے آگے اس کی شرعی حیثیت اور دینی حکومت کے قیام کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہی ہے۔ جبکہ مجاہدینِ افغانستان ان دونوں لابیوں کے اثرات سے بے نیاز ہو کر صرف اس مقصد کیلئے مصروفِ جہاد ہیں کہ افغانستان سے روسی افواج کی مکمل اور غیر مشروط واپسی اور اس کے بعد مکمل شرعی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو۔

جہادِ افغانستان کے خلاف مختلف جہتوں سے پراپیگنڈا میں شدت آ رہی ہے۔ بالخصوص پاکستان کے عوام کو افغان مجاہدین اور مہاجرین سے متنفر اور بے زار کرنے کیلئے بیرونی لابیاں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو پوری طرح استعمال میں لا رہی ہیں۔ ان حالات میں ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی صاحبِ قلم دانشور جہادِ افغانستان کے اہم موضوع پر قلم اٹھائیں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے اس کی شرعی و سیاسی حیثیت کو عوام کے سامنے واضح کریں۔ ۱۹۸۷ء کے آغاز میں افغانستان کے ارگون محاذ سے واپسی پر راقم الحروف کو جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا میں ایک رات قیام کا موقع ملا اور جنوبی وزیرستان کے مجاہد عالمِ دین مولانا نور محمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مولانا موصوف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ کتاب کے مختلف مقامات دیکھے تو دل کو بے حد خوشی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات مولانا موصوف نے بڑی

محنت اور عرق ریزی کے ساتھ دیے ہیں اور گرد و غبار کو خوبصورتی کے ساتھ جھاڑ کر جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت کو بالکل بے غبار انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مولانا موصوف محقق عالم اور بے باک خطیب ہیں مگر ان کے پشتون ہونے کے اثرات کتاب کی زبان پر غالب تھے اس لیے میں نے درخواست کی کہ یہ کتاب نظرِ ثانی اور صحت کیلئے راقم الحروف کے سپرد فرمائیں جو انہوں نے کمالِ شفقت سے قبول فرمائی۔ چنانچہ کتاب کے مسودہ کو از سرِ نو صاف کرنے اور اپنی نگرانی میں کتابت کرانے کی سعادت مجھے حاصل ہوگئی، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

"جہادِ افغانستان" کے نام سے یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، اس امید پر کہ یہ کتاب ان شکوک و شبہات کے خاتمہ کا مؤثر ذریعہ بنے گی جو افغانستان کے جہادِ آزادی کے بارے میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجاہدینِ افغانستان کو ان کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائیں اور غیور افغان قوم کی اس عظیم جدوجہد کو عالمِ اسلام میں جہاد کے احیاء اور اسلام کے غلبہ کا نکتۂ آغاز بنائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک بار پھر افغانستان سے روسی افواج کی مکمل واپسی کا مطالبہ کیا ہے اور اس دفعہ یہ مطالبہ پہلے سے زیادہ اکثریت کے ساتھ کیا گیا ہے جو یقیناً افغان مجاہدین کی عظیم اصولی اور اخلاقی کامیابی ہے۔ روسی حکومت اور کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ نے کچھ عرصہ سے جنگ بندی کی یکطرفہ پیشکش اور قومی افغان مصالحت کے عنوان سے سیاسی حربے اختیار کر کے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش شروع کر رکھی تھی کہ روس اپنی افواج واپس بلانے کیلئے تیار ہے لیکن افغان مجاہدین قومی مصالحت کی طرف پیش رفت نہ کر کے روسی افواج کی واپسی میں تاخیر کا باعث بن رہے ہیں۔ مگر جنرل اسمبلی کی حالیہ قرارداد کی صورت میں عالمی رائے عامہ نے ان حربوں کو مسترد کرتے ہوئے افغان مجاہدین کے اس موقف کی ایک بار پھر مکمل حمایت کر دی ہے کہ روسی افواج غیر مشروط طور پر افغانستان سے واپس چلی جائیں اور افغان عوام کو پوری آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے۔

جہادِ افغانستان فیصلہ کن مرحلہ میں!

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء

افغان عوام کا جہادِ حریت سیاسی اور فوجی دونوں محاذوں پر فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ جہادِ آزادی جو آج سے آٹھ نو برس پہلے چند سو سر فروشوں کے نعرۂ مستانہ کے ساتھ شروع ہوا تھا، قربانی، ایثار اور جہد و استقلال کے کٹھن

مراحل سے گزرتا ہوا آج اس مرحلہ تک پہنچ چکا ہے کہ افغانستان کے اسی فیصد علاقہ پر مجاہدین کا کنٹرول عملاً قائم ہو گیا ہے۔ روس جیسی استعماری قوت اور عالمی طاقت کو افغان مجاہدین کے ہاتھوں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ اب واپسی کے ارادہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے بعد قائم ہونے والی حکومت کے بارے میں تحفظات کی تلاش میں ہے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک سو تئیس ممالک کی حمایت سے منظور ہونے والی قرارداد کے ذریعے عالمی رائے عامہ نے افغان مجاہدین کی جدوجہد اور موقف کی مکمل حمایت کر دی ہے اور وہ افغان زعماء جن کی جرأت قلندرانہ کو آج سے نو سال قبل عقل و دانش سے عاری اور خودکشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا، اب انہیں افغانستان کے مستقبل کے حکمران کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

یہ سب کچھ افغانستان کے غیور علماء اور دیندار عوام کے اس جذبہ و حوصلہ اور عزیمت و استقامت کا صلہ ہے جس کا اظہار انہوں نے روسی استعمار کے تسلط کے خلاف پورے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے اور نصف کروڑ کے لگ بھگ افراد کی جلاوطنی اور ڈیڑھ ملین کے قریب نفوس کی شہادت کے باوجود غیر ملکی استعمار کے تسلط کو قبول نہ کر کے انہوں نے ایک بار پھر واضح کر دیا ہے کہ حق، خلوص اور جہد و استقلال کی طاقت آج بھی اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جسے اس زمین و آسمان کے خالق و مالک کی پشت پناہی حاصل ہے، یہ طاقت ناقابل شکست ہے، ناقابل انکار ہے اور اس کے ناقابل عبور ہونے پر غیور و جسور افغان عوام نے اپنے خون کے ساتھ ایک بار پھر مہر ثبت کر دی ہے۔

ہم دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت افغان عوام کے جہادِ حریت کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچائیں اور افغان مہاجرین و مجاہدین کو ایک آزاد، خودمختار اور اسلامی افغانستان کی تعمیر نو کے ساتھ دنیائے اسلام کی راہنمائی کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

افغان حریت پسندوں کا جہادِ آزادی: پس منظر، ثمرات، توقعات

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء

آج سے آٹھ سال قبل جب روس نے افغانستان کو اپنی مسلح فوجی یلغار کا نشانہ بنایا تو روس کی عظیم فوجی قوت، افغانستان میں کمیونسٹ لابی کے مؤثر اور مسلسل ورک، اور دینی حلقوں کے نمایاں خلفشار و انتشار کو دیکھتے ہوئے یہ بات عام طور پر زبانوں پر آگئی تھی کہ اب بخارا، تاشقند اور سمرقند کی طرح افغانستان کا یہ خطہ بھی روس کے زیر تسلط مسلم ریاستوں کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ کیونکہ بظاہر افغانستان میں کوئی ایسی قوت دکھائی نہیں دے رہی تھی جو کمیونسٹ لابی کے تسلط اور روسی افواج کی مداخلت کا سامنا کر سکے۔ اور یہ تاثر اس قدر عام ہو چکا تھا کہ دریائے خیبر اور دریائے اٹک کے اس پار روسی ٹینکوں کے استقبال اور ان پر پھولوں کے ہار نچھاور کر کے اس خطہ کے مبینہ روایتی کردار کو

دہرانے کی تیاری بھی شروع ہوگئی تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ اس قسم کی خبریں سامنے آنے لگیں کہ افغانستان کے مختلف علاقوں میں روسی افواج کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ مزاحمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ مزاحمت کی ان خبروں پر لوگوں کا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ افغان قوم روایتی طور پر ہتھیار بند ہے اور بعض جذباتی حلقے اپنے قومی مزاج اور روایات کے باعث روسی افواج کی مزاحمت کر رہے ہیں جو چند روز کی بات ہے اور روس جیسی سپر پاور کیلئے اس نوعیت کی مزاحمت کو کنٹرول کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ مگر یہ تمام تاثرات غلط ثابت ہوئے اور افغانستان کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی ہجرت کے ساتھ ساتھ جہاد کے مقدس عنوان پر مزاحمت کی ان کارروائیوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ صرف آٹھ سال کے عرصہ میں نہ صرف روس کی قیادت کو اپنی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے عزم کا اظہار کرنا پڑا بلکہ کابل کے سرکاری حلقوں نے یہ تسلیم کیا کہ افغانستان کا اسی فیصد علاقہ افغان مجاہدین کے کنٹرول میں ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت افغانستان میں اسی ہزار مجاہدین روسی افواج کے تسلط کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں اور ان کی جنگ کا دائرہ نہ صرف یہ کہ افغانستان کے طول و عرض تک پھیلا ہوا ہے بلکہ ان کے پرجوش نعرہ ہائے تکبیر نے روس کے زیر تسلط مسلم علاقوں کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی ہے اور اب روس کیلئے افغانستان پر اپنے اثرات مستحکم کرنے سے زیادہ بخارا، تاشقند اور وسطی ایشیا کی دیگر مسلم ریاستوں میں اپنے نظریاتی تسلط کو برقرار رکھنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

افغانستان کی جنگ آزادی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ جنگ اسلامی احکام کے مطابق جہاد کے شرعی فتویٰ کی بنیاد پر لڑی جا رہی ہے اور اس کی قیادت میں علماء کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی جو قیادت جہادِ افغانستان کے عنوان سے دنیا میں متعارف ہوئی ہے اس میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب مستند علماء کرام ہیں۔ اسی طرح محاذِ جنگ پر روسی افواج سے برسرِپیکار مجاہدین میں بھی ایک بڑی تعداد علماء اور دینی مدارس کے طلباء کی ہے جس سے افغانستان کی جنگِ آزادی کا دینی اور نظریاتی تشخص بالکل واضح اور بے غبار ہو کر سامنے آیا ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ افغانستان کی جنگِ آزادی کا یہ دینی تشخص ہی اس وقت امریکہ اور روس کے درمیان مسئلہ افغانستان پر متوقع مصالحت میں کباب کی ہڈی بن گیا ہے۔

روس افغانستان سے اپنی افواج واپس بلانے کے عندیہ کا اظہار کر چکا ہے لیکن اسے خطرہ یہ ہے کہ اگر اس کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کی حکومت قائم ہوگئی تو مولویوں کی یہ حکومت وسطی ایشیا کے مسلم علاقوں پر روس کے تسلط کیلئے واضح خطرہ ثابت ہوگی اور پھر بخارا اور تاشقند کے علاقوں میں بھی آزادی اور جہاد کے جذبات ابھرنے لگیں گے۔ اس کے برعکس امریکہ اگرچہ سیاسی اور اخلاقی حمایت کے ساتھ افغان مجاہدین کو مادی امداد بھی عملاً فراہم کر رہا ہے لیکن افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کا قیام اس کیلئے قابل قبول نہیں کیونکہ کابل میں مولوی کی حکومت اور اس کے ذریعے شرعی نظام کا عملی نفاذ دراصل نکتۂ آغاز ہوگا جنوبی ایشیا کی مسلم ریاستوں بالخصوص پاکستان اور خلیج کے ممالک میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں عملی پیشرفت کا جسے روکنا ان ممالک میں سامراجی نظام کے روایتی محافظوں کے بس کی بات نہیں ہوگا۔ اور اس طرح

امریکہ کے مفادات اس خطہ میں حفاظت و ضمانت کے سائے سے محروم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کو روکنے میں امریکہ اور روس کے مفادات مشترک ہو گئے ہیں لیکن افغانستان کے اسی فیصد حصے پر مجاہدین کے عملی کنٹرول کی موجودگی میں ان کی مرضی کے بغیر کسی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں رہا اور جنیوا مذاکرات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس اعتماد کی جھلک ہر افغان لیڈر کے چہرے پر بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔

گذشتہ ہفتے مجھے مولانا فداء الرحمان درخواستی امیر جمعیت علماء اسلام صوبہ سندھ کے ہمراہ پشاور میں بعض افغان لیڈروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا میاں عصمت شاہ کاکاخیل اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس موقع پر ہماری ملاقات حزبِ اسلامی کے امیر مولانا محمد یونس خالص، حرکتِ انقلابِ اسلامی کے راہنما مولانا عبد الستار صدیقی، اور اتحادِ اسلامی افغانستان کے شعبہ سیاسی امور کے سربراہ مولانا محمد یاسر خان سے ہوئی۔ مولوی محمد یونس خالص افغانستان کے بزرگ اور مجاہد عالمِ دین ہیں، محاذِ جنگ پر برسرِ پیکار مجاہدین کے ایک بڑے گروپ کی قیادت کر رہے ہیں۔ شہرہ آفاق کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کا تعلق بھی انہی کے گروپ سے ہے۔

مولوی محمد یونس خالص دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں اور دارالعلوم میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدظلہ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانی بھی دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد یونس خالص کو اس سال افغان مجاہدین کی سات جماعتوں نے اپنے مشترکہ محاذ کا سربراہ چنا ہے اور اسی حیثیت سے وہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اس اجلاس میں بھی مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے ہیں جس میں بھاری اکثریت کے ساتھ افغانستان سے روسی افواج کی غیر مشروط واپسی کی قرارداد منظور کی گئی ہے۔ انہوں نے ملاقات کے دوران اس بات کا دبے لفظوں میں شکوہ کیا کہ پاکستان کے علماء اور دینی حلقے جہادِ افغانستان کا صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکے حالانکہ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس خطہ میں امریکہ اور روس کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی ہم کسی کے مفاد کیلئے کام کر رہے ہیں۔ ہماری جنگ کا مقصد افغانستان سے روسی افواج کی واپسی اور مکمل شرعی نظام کا نفاذ ہے اور شریعت اسلامیہ کے عملی نفاذ تک ہماری جنگ جاری رہے گی۔ انہوں نے پاکستان کے علماء اور دینی حلقوں سے اپیل کی ہے کہ وہ جہاد افغانستان کی مقصدیت اور اہمیت کا ادراک کریں اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ میں جذبۂ جہاد کے احیا کیلئے مؤثر اور بھرپور جدوجہد کریں۔

مولانا عبد الستار صدیقی اور مولانا محمد یاسر خان نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا بلکہ مولانا محمد یاسر خان نے افغان مجاہدین اور پاکستان کے دینی حلقوں کے درمیان تعاون و ارتباط کے ایسے امکانات اور گوشوں کی نشاندہی کی کہ ان سے صرف نظر کرنا جہادِ افغانستان اور پاکستان کی دینی جدوجہد دونوں سے ناانصافی کے مترادف ہو گا۔ ان کے جذبات انتہائی قابل قدر اور لائق تقلید ہیں اور ان کی قلبی خواہش ہے کہ پاکستان کے علماء حق جہادِ افغانستان کے ساتھ عملی رابطہ قائم کر کے اس کی تقویت کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ اس آٹھ سالہ جنگ کے تجربات و ثمرات سے بھرپور استفادہ کریں۔ انہوں نے پر عزم لہجے میں کہا کہ ہمارا ہدف صرف افغانستان کی آزادی اور اس میں اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہے بلکہ

اس پہلے ہدف کو حاصل کرنے کے بعد پوری دنیا میں باطل نظریات کا مقابلہ اور مسلم ممالک میں اسلام کی بالادستی ہمارا اصل مشن ہے جس کیلئے ہم ہر دینی قوت کا تعاون حاصل کریں گے اور اپنے تمام تجربات و وسائل کے ساتھ ہر دینی قوت کا دست و بازو بنیں گے۔

خوست کے محاذ پر روسی افواج کی مزاحمت: دورۂ افغانستان کی روداد

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۵ اپریل ۱۹۸۸ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف کو مارچ ۱۹۸۸ء کے تیسرے ہفتہ کے دوران افغانستان کے محاذ جنگ پر جانے کا موقع ملا۔ وفد میں جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد کے سیکرٹری جنرل مولانا حمید اللہ جان، صوبائی سالار قاری حضرت گل شاکر، گوجرانوالہ ڈویژن کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام محمد، ضلع گوجرانوالہ کے امیر مولانا عبد الرؤف فاروقی، ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کے مدیر سید احمد حسین زید، جامعہ حنفیہ قاسمیہ نارووال کے خطیب مولانا محمد یحییٰ محسن، مجلس تحفظ ختم نبوت کے راہنما چوہدری غلام نبی اور ضلع گجرات سے میرے ایک عزیز عبد الرشید شامل تھے۔

یہ دورہ حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمان خلیل کی دعوت پر کیا گیا اور وہ بھی دورہ میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔ اس دورہ کا مقصد محاذ جنگ پر روسی جارحیت کے خلاف برسرپیکار مجاہدین کے ساتھ یکجہتی کے عملی اظہار کے ساتھ ساتھ جہادِ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لینا اور جنیوا مذاکرات کے نتیجہ میں طے پانے والے مبینہ سمجھوتہ کے پس منظر میں مجاہدین کے تاثرات اور آئندہ عزائم معلوم کرنا تھا۔

اس سے قبل گذشتہ سال بھی راقم الحروف کو جمعیت علماء اسلام صوبہ پنجاب کے سیکرٹری جنرل مولانا بشیر احمد شاد کے ہمراہ افغانستان کے ایک اور محاذ جنگ ارگون تک جانے کا موقع ملا تھا اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر کی دعوت پر کیے جانے والے اس دورہ میں کچھ وقت ارگون چھاؤنی کے سامنے ایک اجڑی ہوئی بستی کی جامع مسجد میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن وقت کی کمی اور بعض دیگر رکاوٹوں کے باعث اس وقت مشاہدات و تاثرات کے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ اس دفعہ ہمیں مجاہدین کے آخری مورچوں تک جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور خوست شہر سے متّصل پہاڑ کی بلند چوٹی پر مجاہدین کے مورچہ میں ہم نے دو راتیں گزاریں اور سرکاری فوجوں کے ساتھ مجاہدین کی زمینی اور فضائی لڑائی کا اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

خوست کا شہر وہی عالمی شہرت کا حامل محاذِ جنگ ہے جہاں روسی افواج نے مجاہدین کا محاصرہ توڑنے کیلئے بھرپور قوت استعمال کی اور کئی روز کی اس جنگ نے پوری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے رکھی۔ لیکن محاصرہ توڑنے کے باوجود

روسی افواج دو تین روز سے زیادہ اس کیفیت کو قائم نہ رکھ سکیں اور آج پھر خوست کی چھاؤنی اور شہر مجاہدین کے مکمل محاصرہ میں ہیں۔ خوست کے ارد گرد تمام پہاڑیوں اور راستوں پر مجاہدین کا قبضہ ہے اور انہوں نے بلند و بالا پہاڑیوں پر اپنے مورچے قائم کیے ہوئے ہیں جہاں سے خوست شہر اور چھاؤنی مکمل طور پر ان کے حملوں کی زد میں ہے۔ ہم جس مورچہ میں تھے وہاں سے خوست کے ہوائی اڈہ کا رن وے اور چھاؤنی کی عمارتیں صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اس رن وے پر رات کی تاریکی میں طیارے چھاؤنی کیلئے راشن اور دیگر ضروریات لے کر اترتے ہیں اور پھر اندھیرے میں ہی پرواز کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر اور چھاؤنی کے ساتھ کابل حکومت کا اور کوئی زمینی رابطہ نہیں ہے۔

خوست پہنچنے سے قبل راستہ میں سرکاری فوجوں یا اہل کاروں کا کوئی نشان نہیں ملا اور یہ تمام علاقہ عملاً مجاہدین کے کنٹرول میں تھا جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنی کاروائیاں اور نقل و حرکت جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ سفر گاڑی پر اور پھر تین چار گھنٹے کا سفر پیدل بھی کیا۔ راستہ میں جس بات نے ہمیں سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین رکھا وہ ان ویران بستیوں کا منظر تھا جنہیں روسی افواج نے مسلسل وحشیانہ بمباری کے ذریعے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہمیں راستہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیاں دکھائی دیں لیکن ان میں سے ایک بھی آباد نہیں تھی۔ مکانات گرے ہوئے تھے اور کوئی بھی آبادی ان میں نہیں تھی۔ اکا دکا مکان جو بمباری کی زد سے بچ گئے وہ مجاہدین کے عارضی ٹھکانوں کے طور پر کام آ رہے ہیں۔ ہم نے ایک رات اسی قسم کے مکان میں گزاری جو خدا جانے کس نے اپنی سکونت کیلئے بنایا تھا لیکن کابل حکومت کی مسلسل بمباری کی تاب نہ لاتے ہوئے علاقہ کے دوسرے باشندوں کی طرح وہ بھی ہجرت کر کے پاکستان کے کسی کیمپ میں منتقل ہو گیا تھا اور اب مجاہدین نے اس مکان کو اپنی سرگرمیوں کا ایک مرکز بنایا ہوا تھا۔

نجیب انتظامیہ اور روسی افواج کے پاس افغان مجاہدین پر بالادستی کا ایک ہی محاذ ہے اور وہ ہے فضائی جنگ اور وحشیانہ بمباری جس کا جواب دینے کیلئے مجاہدین کے پاس فضائیہ نہیں ہے ورنہ اب سے کافی عرصہ پہلے اس جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میدانی لڑائی میں مجاہدین مکمل طور پر حاوی ہیں اور انہیں نہ صرف جنگی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی بالادستی حاصل ہے جس کا مشاہدہ ہم نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ جس مورچہ میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے مجاہدین نے ہماری موجودگی میں خوست کی چھاؤنی پر مارٹر توپ سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تک گولہ باری کی، اس کی پیروی میں دوسری اطراف کے مورچوں سے بھی چھاؤنی پر متعدّد گولے پھینکے گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے جواب میں ہم پر شدید گولہ باری ہو گی لیکن مجاہدین نے ہمیں کہا کہ آپ آرام کے ساتھ نماز پڑھ کر سو جائیں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم ساری رات آرام سے سوتے رہے اور خوست چھاؤنی کی طرف سے گولہ باری کا صبح کی نماز تک کوئی جواب نہ آیا۔ مجاہدین نے ہمیں بتایا کہ نجیب انتظامیہ کی افواج اور روسی فوجوں کو حملہ میں پہل کی کبھی جرأت نہیں ہوئی، جب بھی پہل کی ہم نے کی۔ حتیٰ کہ متعدّد بار ایسا بھی ہوا کہ مجاہدین حملہ کر کے ان کا پکا پکایا کھانا اٹھا کر لے آئے لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجاہدین کے خلاف فضائی کارروائیوں میں بھی اسٹنگر مزائیلوں کے استعمال کے بعد وہ پہلا ساز ور اب نہیں رہا تاہم اس کے باوجود ان پر بمباری ہوتی ہے اور نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ جس روز ہم رات راغبیلی کے ایک مرکز میں تھے، دوسرے روز صبح مجاہدین کی تربیتی مشقوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک فضا میں اٹھارہ طیارے نمودار ہوئے۔ ان کے حملہ

سے بچنے کیلئے مجاہدین کے ساتھ ہم بھی الٹے سیدھے زمین پر لیٹ گئے، ان طیاروں نے ہم سے چند میل کے فاصلے پر بمباری کی جس سے ایک مجاہد شہید اور چھ زخمی ہوگئے۔ شہید کے بارے میں بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ وہ نوجوان تھا جس نے رات کو کھانا کھلانے میں ہماری خدمت کی تھی۔ مجاہدین طیاروں کو بھگانے کیلئے طیارہ شکن توپوں اور اسٹنگر مزائیلوں کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے طیارے خاصے فاصلے پر رہتے ہوئے بمباری کرتے ہیں جس سے نقصان کا تناسب بہت کم ہوگیا ہے۔

ژاور پاکستان کی سرحد کے قریب مجاہدین کا ایک مضبوط مرکز ہے جس کے انچارج کیپٹن اکبر شاہ ہیں۔ یہ پہلے افغان فوج میں کیپٹن تھے اور جہاد کے آغاز کے ساتھ ہی مجاہدین سے آملے اور آٹھ سال سے مسلسل مصروف جہاد ہیں۔ ان کے ساتھ جہاد افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کے بارے میں ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی، ہم نے ان سے پوچھا کہ جنیوا مذاکرات میں اگر کسی سمجھوتہ پر دستخط ہوگئے اور کابل میں غیر جانبدار حکومت کے قیام کے بغیر روسی افواج کی واپسی اور مجاہدین کی امداد بند کرنے کا فیصلہ ہوگیا تو اس پر مجاہدین کا ردعمل کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں کیپٹن اکبر شاہ نے کہا کہ محاذِ جنگ پر لڑنے والے مجاہدین کو جنیوا مذاکرات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ جنگ میں ان کا ہدف افغانستان میں ایک مکمل شرعی حکومت کا قیام ہے اور اس ہدف کو حاصل کرنے تک جنگ بند کرنے کا ان کے نزدیک کوئی جواز نہیں ہے۔ جنیوا میں سمجھوتہ کچھ بھی ہو مجاہدین اپنی جنگ جاری رکھیں گے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کابل میں ایک مکمل اسلامی حکومت کا قیام نہیں ہو جاتا۔ باقی رہا ہماری امداد بند کرنے کا سوال تو میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے جہاد کا انحصار اس امداد پر نہیں ہے، نہ ہم نے کسی طاقت کے کہنے پر جہاد شروع کیا ہے اور نہ ہی کسی کی امداد کی شرط کے ساتھ اس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب نو سال قبل جہاد کا آغاز کیا تھا اس وقت امریکہ سمیت کوئی بھی قوت ہماری طرف متوجہ نہیں تھی۔ ہم نے اپنی پرانی بندوقوں کے ساتھ روسی افواج کا مقابلہ کیا اور پھر روسی افواج اور ان کے حمایتیوں سے اسلحہ چھین کر جہاد کو جاری رکھا۔ امریکہ اور دوسری حمایتی قوتیں ہماری طرف اس وقت متوجہ ہوئیں جب ہم روسی افواج کے مقابلہ میں اپنی مزاحمت کا وجود تسلیم کرا چکے تھے۔ اس لیے اگر ہم اس دور میں جہاد کا آغاز کر کے اپنی بوسیدہ اور پرانی بندوقوں کے ساتھ روسی فوجوں کا راستہ روک سکتے ہیں تو آج بھی بیرونی طاقتوں کی امداد کے بغیر لڑ سکتے ہیں اور ہم کسی کی امداد کی پرواہ کیے بغیر مکمل فتح تک جہاد کو جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ افغان مجاہدین کے پاس اسلحہ کے جو موجودہ ذخائر ہیں ان کے ساتھ اس جنگ کو مزید کتنے عرصہ تک جاری رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کیپٹن اکبر شاہ نے کہا کہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ مزید کوئی امداد ملے بغیر موجودہ اسلحہ کے ساتھ پانچ سال تک اس جنگ کو اسی کیفیت میں جاری رکھا جا سکتا ہے جس کیفیت میں یہ جنگ ہو رہی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلحہ کی ایک بڑی مقدار وہ ہوتی ہے جو ہم مقابلہ میں کابل انتظامیہ اور روس کی فوجوں سے چھینتے ہیں اور ہمارے پاس موجود اسلحہ کے ذخائر میں ایک معتدبہ مقدار اسی قسم کے اسلحہ کی ہے۔ اس لیے ہمیں اسلحہ کی فراہمی کے بارے میں کوئی زیادہ پریشانی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے لڑ رہے ہیں، ہمارا انحصار اور بھروسہ اس کی ذات پر ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ وہ قادر مطلق ہمارے لیے اسباب خود فراہم کرے گا

اور مجاہدین کو بالآخر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مکمل فتح حاصل ہو کر رہے گی۔

ہمارا پروگرام خوست کے محاذ کے شہرہ آفاق کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ ملاقات کا بھی تھا لیکن وہ باڑی نام کے ایک اور محاذ پر گئے ہوئے تھے جہاں چند روز قبل مجاہدین نے حملہ کر کے تین مورچے فتح کیے تھے۔ اس معرکہ میں مبینہ طور پر سرکاری فوج کے ساٹھ سے زیادہ فوجی مارے گئے اور کم و بیش اتنی ہی تعداد میں گرفتار ہوئے اور اسلحہ کی ایک اچھی خاصی مقدار مجاہدین کے ہاتھ لگی۔ مولانا حقانی اس محاذ پر مصروف تھے اس لیے اس مرد مجاہد کی زیارت کا شرف ہمیں حاصل نہ ہو سکا اور ہم دو روز راغبیلی کے مرکز جہاد میں گزار کر ۲۴ مارچ کو واپس بنوں پہنچ گئے۔

اس دورہ میں ہمارے تاثرات یہ ہیں کہ مجاہدین کے حوصلے بہت بلند ہیں اور وہ جنیوا مذاکرات کے نتائج سے بے نیاز ہو کر کابل پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے کے عزم کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں حزب اسلامی افغانستان کے امیر مولوی محمد یونس خالص کا یہ مقولہ مجاہدین کے عزم اور موقف کی مکمل ترجمانی کرتا ہے کہ

> ”ایک مکمل اسلامی حکومت کے قیام کے بغیر ہتھیار ڈالنا ہمارے لیے اجتماعی خودکشی کے مترادف ہو گا۔“

یہ مقولہ مختلف کتبوں اور کیلنڈروں کی صورت میں مجاہدین کے مراکز میں آویزاں ہے اور انہیں ہر وقت اپنی جدوجہد کے اصل مقصد کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افغان مجاہدین کی یہ جنگ عالم اسلام میں جہاد کے شرعی فریضہ کے احیاء کا باعث بن رہی ہے اور یہ جہاد اگر کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ بیت المقدس، فلسطین، کشمیر، بخارا، اری ٹیریا اور دیگر مقبوضہ مسلم علاقوں کی آزادی کی راہ ہموار ہو گی بلکہ عالم اسلام میں منافقانہ سیاست کے خاتمہ اور اسلام کے مکمل غلبہ اور نفاذ کی منزل بھی قریب آجائے گی۔

افغان مسئلہ پر "جنیوا معاہدہ"

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۹ اپریل ۱۹۸۸ء

وزیر اعظم جناب محمد خان جونیجو نے گذشتہ روز پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جنیوا معاہدہ پر اپنی حکومت کے موقف کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ

> ”جنیوا معاہدہ نہ تو بہترین ہے اور نہ ہی جامع۔ تاہم موجودہ حالات کے تحت اس سے بہتر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا۔“

اسی موقع پر وزیر مملکت برائے امور خارجہ مسٹر زین نورانی نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> ”دنیا کی کوئی طاقت نئی افغان حکومت میں مجاہدین اور ان کے رفقاء کی بھرپور شرکت کو نہیں روک سکے گی۔“

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ، حکومتِ پاکستان اور جنیوا مذاکرات میں شریک دوسری قوتوں کے پیشِ نظر مذاکرات اور سمجھوتے کا سب سے اہم مقصد اور بنیادی ہدف یہ رہا ہے کہ افغانستان میں کمیونسٹ حکومت اور مجاہدین کو کسی ایک فارمولے پر جمع کر کے مل جل کر افغانستان کا نظام چلانے پر آمادہ کر لیا جائے۔ اور موجودہ جنیوا معاہدہ اسی فکر کا آئینہ دار ہے۔ جبکہ افغان مجاہدین اور ان کی پشت پر پورے عالمِ اسلام کی دینی و نظریاتی قوتوں کا ہدف اور مقصد افغانستان میں کمیونسٹ نظام کا مکمل خاتمہ اور اس کے کھنڈرات پر ایک مکمل اسلامی حکومت کی بلند و بالا عمارت کا قیام ہے۔ اسی لیے افغان مجاہدین نے جنیوا معاہدے کو مسترد کر دیا ہے اور عالمِ اسلام کی دینی و نظریاتی قوتیں اس مسئلہ میں ان کے ساتھ ہیں۔

جمعیت علماء اسلام پاکستان ملتِ اسلامیہ کے اسی نظریاتی اور دینی موقف کے منظم اظہار کیلئے ۲۹ اپریل کو پورے ملک میں جنیوا معاہدہ کے خلاف "یومِ سیاہ" منا رہی ہے۔ افغان مجاہدین کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اقتدار میں شرکت کی پیشکش تو اس سے قبل بھی ڈاکٹر نجیب اللہ کی طرف سے کئی بار ہو چکی ہے جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔

اس لیے مسئلہ افغانستان کا واحد حل آج بھی یہ ہے کہ کمیونسٹ حکمران جس طرح روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر کابل آئے تھے اسی طرح روسی ٹینکوں پر واپس چلے جائیں اور کابل پر مجاہدین کی نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کی جائے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے شعلوں کی تپش سے ارد گرد کے ممالک خود کو محفوظ کرنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔

جنرل محمد ضیاء الحق شہید

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۹ اگست ۱۹۸۸ء

سترہ اگست کی شام کو ریڈیو پاکستان کی اس المناک خبر نے پوری قوم کو سکتہ کی کیفیت سے دوچار کر دیا کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق بہاولپور کے قریب فضائی حادثہ میں دیگر کئی فوجی افسران کے ہمراہ جاں بحق ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق متعدد اعلیٰ فوجی افسران کے ساتھ بہاولپور ڈویژن میں فوجی مشقیں دیکھنے کے بعد بہاولپور سے بذریعہ طیارہ اسلام آباد واپس جا رہے تھے کہ پرواز کے چند منٹ بعد ان کا طیارہ دھماکہ کے ساتھ پھٹ کر زمین سے جا ٹکرایا اور بدقسمت طیارے کے مسافروں میں سے ایک فرد بھی نہ بچ سکا۔ اس المناک حادثہ میں جاں بحق ہونے والوں میں صدر کے ہمراہ اعلیٰ فوجی حکام کے علاوہ پاکستان میں امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافیل اور ان کے فوجی اتاشی بھی شامل ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے نفاذِ اسلام کو اپنی حکومت کا سب سے بڑا مقصد قرار دے کر اس کیلئے وقتاً فوقتاً متعدد اقدامات کیے۔ ان کے اقدامات کی سست روی اور پالیسی ترجیحات سے ملک کے دیگر دینی حلقوں کی طرح ہمیں بھی اختلاف رہا لیکن یہ بات تمام حلقوں میں یکساں مسلم رہی کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور شریف النفس انسان ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے افغانستان میں روسی جارحیت سے پیدا شدہ صورتحال کا جس استقلال کے ساتھ سامنا کیا اور افغان مجاہدین کی جس طرح سیاسی اور اخلاقی پشت پناہی کی اس نے افغانستان کی آزادی کیلئے جنگ لڑنے والے مجاہدین کو حوصلہ بخشا۔ ان کی سیاسی پالیسیوں اور افکار سے ملک کے بیشتر سیاسی حلقوں کو اختلاف رہا مگر پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور ملکی سالمیت و وحدت کے تحفظ کیلئے ان کی مخلصانہ کوششیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ ایک درجن سے زائد اعلیٰ ترین فوجی افسروں کا جاں بحق ہونا بھی ایک بہت بڑا قومی المیہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ طیارہ کا حادثہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور اس خدشہ کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ بدقسمت طیارہ تخریب کاری کا نشانہ بنا اور کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ ہولناک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ سینٹ آف پاکستان میں سینئر وفاقی وزیر جناب محمد اسلم خٹک کی اس تقریر نے ان خدشات کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے کہ کچھ عرصہ سے اس قسم کی سازشوں کی اطلاعات مل رہی تھیں اور انہوں نے صدر مرحوم کو خبردار کر دیا تھا۔ صحیح صورتحال تحقیقات کے بعد ہی سامنے آئے گی تاہم اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط ہونے اور قومی وحدت و یکجہتی کو برقرار رکھتے ہوئے حادثہ کے حقیقی اسباب کو جلد از جلد بے نقاب کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی المناک موت کے بعد یہ بات قومی اور بین الاقوامی حلقوں کیلئے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ آئینی عمل کا تسلسل قائم ہے، سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا ہے اور مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتوں کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ۱۶ نومبر کو پروگرام کے مطابق عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ بات مزید اطمینان کا باعث بنی ہے کہ صدر غلام اسحاق خان کی صدارت میں ہونے والے کابینہ کے ہنگامی اجلاس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں نے شرکت کر کے آئینی عمل کے تسلسل کے ساتھ اپنی موافقت اور ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام خدشات و خطرات سردست ٹل گئے ہیں جو صدر ضیاء کی المناک موت کی خبر سنتے ہی محب وطن اور باشعور شہریوں کیلئے ذہنی پریشانی اور قلبی اضطراب کا باعث بن گئے تھے۔

ہم آئینی عمل کے تسلسل اور عام انتخابات کے پروگرام کے مطابق انعقاد کے اعلان کی حمایت کرتے ہوئے قائم مقام صدر جناب غلام اسحاق خان اور ان کے رفقاء کو یقین دلاتے ہیں کہ قومی وحدت و سالمیت کے تحفظ، آئینی عمل کی بالادستی، اسلامی نظام کے مؤثر نفاذ اور جمہوری عمل کی طرف یقینی پیش رفت کے اقدامات میں انہیں ہماری حمایت اور تعاون حاصل رہے گا۔

ہم دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت صدر محمد ضیاء الحق اور دیگر مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں، ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور وطن عزیز پاکستان کو اندرونی و بیرونی سازشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک صحیح اور مکمل اسلامی ریاست کی منزل کی طرف مؤثر پیش رفت کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

افغان جارحیت اور جنیوا معاہدہ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء

افغان طیاروں نے پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کو تسلسل سے جاری رکھا ہوا ہے مگر پشاور کے قریب اس نے جس طرح شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری کی ہے وہ تمام بین الاقوامی قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی دھجیاں بکھیرنے کے مترادف ہے۔ افغان انتظامیہ کی اس دہشت گردی کے نتیجہ میں ایک پاکستانی شہید اور متعدّد زخمی ہوئے ہیں جنہیں طبی امداد دی جا رہی ہے۔ افغان طیاروں نے یہ سب کچھ اس وقت کیا ہے جب مجاہدین نے پورے افغانستان میں ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اپنی اس اندرونی کشمکش اور پسپائی سے دنیا کی نظریں ہٹانے کیلئے انہوں نے پاکستان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے سلسلہ میں شدت پیدا کر دی ہے۔ افغان طیاروں کی یہ کاروائی جنیوا معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے اور پاکستانی حکمرانوں اور قوموں کے علاوہ جنیوا معاہدے کے دونوں ضامنوں کیلئے باعث تشویش ہے۔ افغان انتظامیہ کی اس متشددانہ دہشت گردی کی بین الاقوامی سطح پر جو مذمت ہوگی وہ اپنی جگہ ہے مگر حکومت پاکستان کو بھی اس معاملہ میں ڈھیلی ڈھالی پالیسی کی بجائے دوٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء

غالباً ۳۰ اگست کی صبح کا قصہ ہے راقم الحروف نیویارک کے علاقہ بروکلین میں ضلع گجرات کے ایک دوست جناب محمد دین کے ہاں قیام پذیر تھا۔ صبح نماز سے پہلے کا وقت تھا، میرے ساتھ کمرہ میں حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی محو خواب تھے۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوں، تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ جناب ظفر علی ڈار میرے کمرہ میں آئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ شریعت بل کے محرک مولانا سمیع الحق انتقال کر گئے ہیں۔ میں نے چونک کر پوچھا کہ مولانا سمیع الحق یا مولانا عبد الحق؟ انہوں نے کہا ہاں مولانا عبد الحق کا انتقال گیا ہے، میں نے ابھی انا للہ وانا الیہ راجعون ہی پڑھا تھا کہ مولانا فداء الرحمان درخواستی کی آواز آئی کہ اٹھو بھئی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نیند سے بیدار ہوا اور مولانا درخواستی کو خواب سنایا۔ انہوں نے کہا کہ خواب تو اچھا ہے، خواب میں کسی کی موت کی خبر اس کی زندگی اور عزت کی علامت ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں مولانا میاں محمد اجمل قادری سے فون پر بات ہوئی تو انہیں یہ خواب بتایا، ان کا جواب بھی وہی تھا جو مولانا فداء الرحمان درخواستی سے سن چکا تھا اور خود میں نے بھی تعبیر رویا کی بعض کتابوں میں یہی کچھ پڑھ رکھا تھا۔ مگر سچی بات ہے کہ ان سب امور کے باوجود حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کی علالت اور نقاہت کی وجہ سے دل کو تردد اور تفکر سے نجات نہیں دلا سکا تھا۔

۸ ستمبر کو مدینہ منورہ پہنچا تو استاذ محترم قاری محمد انور صاحب نے یہ الم ناک خبر سنائی کہ حضرت مولانا عبد الحقؒ کا گذشتہ

روز انتقال ہو گیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ قاری محمد انور صاحب میرے حفظ قرآن کے شفیق استاد ہیں اور آج کل مدینہ منورہ میں جامعہ محمد بن مسعود کے تحت تحفیظ القرآن کے ایک مدرسہ میں پڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ خبر ریڈیو سے سنی تھی جس کے مطابق جنازہ بھی ادا کیا جا چکا تھا۔

خواب پیغمبرؑ کے سوا کسی کا حجت نہیں ہے لیکن یہ درست ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ بسا اوقات آنے والے واقعات کی طرف اشارہ فرما دیتے ہیں۔ میرے ساتھ اسی قسم کا واقعہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے بارے میں بھی رونما ہو چکا ہے۔ مولانا ہزارویؒ کی وفات سے پانچ چھ روز پہلے کا قصہ ہے خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں علماء کا ایک اجلاس ہے اس میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ کرسی پر بیٹھے ہیں جبکہ باقی حضرات ان کے سامنے نیچے بیٹھے ہیں جیسے سب ان کا خطاب سننے کیلئے جمع ہوں اور میں حسب معمول سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اچانک اجتماع میں ایک بزرگ کو دیکھ کر چوک جاتا ہوں، یہ بزرگ مولانا عبد الواسع لدھیانویؒ ہیں جو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے بھانجے تھے اور تقسیمِ ہند سے پہلے مجلس احرار اسلام کے سرگرم راہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، ان کا چند سال قبل انتقال ہو گیا تھا جس کا مجھے خواب میں بھی ادراک تھا اور اسی لیے بار بار غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہیں تو چند سال قبل خود ہم جنازہ پڑھ کے سپرد خاک کر چکے ہیں یہ یہاں کیسے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ بھائی کیوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہو، میں نے کہا کہ حضرت آپ؟ کہنے لگے کہ ہاں یہ میں ہی ہوں اور بابے کو لینے آیا ہوں۔ بابے سے مراد حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ تھے جنہیں جماعتی کارکن محبت سے بابا کہا کرتے تھے۔ صبح ہوئی تو میں نے سب سے پہلے مولانا علامہ محمد احمد لدھیانویؒ کو فون پر خواب سنایا اور کہا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا ہزارویؒ کو لینے آ رہے ہیں اور پھر اس واقعہ کے چار پانچ دن بعد مولانا ہزارویؒ کا انتقال ہو گیا۔

اس پس منظر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کی وفات کی خبر اگرچہ میرے لیے کم از کم غیر متوقع نہیں تھی لیکن خبر سنتے ہی دل کی جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ معاً ذہن جنازہ اور تدفین کے مراحل کی طرف منتقل ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایک منحنی سے وجود اور مٹھی بھر ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں علم و عمل اور خلوص و تواضع کے اس بحرِ ذخار کو آخر کس حوصلہ کے ساتھ لوگ مٹی کے نیچے دبا رہے ہوں گے۔ فوراً مسجد نبویؐ میں حاضری دی، حسن اتفاق سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر شریف کے ساتھ جگہ مل گئی، مسجد نبویؐ کے اس حصہ کو جناب نبی رسالت مآبؐ نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ فرمایا ہے، وہیں بیٹھ کر حضرت مولانا عبد الحقؒ کو ایصال ثواب کیلئے قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کیا اور ان کیلئے دعائے مغفرت کی۔ دوسرے روز مکہ مکرمہ میں اللہ رب العزت نے حضرت شیخ الحدیثؒ کی طرف سے طواف بیت اللہ کے سات چکر لگانے اور ایصال ثواب کیلئے قرآن کریم کا کچھ حصہ مسجد حرام میں تلاوت کرنے کی توفیق بھی دے دی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور حضرت مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کون تھے اور ملک و قوم کیلئے ان کی علمی، دینی و سیاسی خدمات کا دائرہ کس قدر وسیع ہے؟ یہ تذکرہ ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے اور بلاشبہ یہ ان کا حق ہے کہ نئی نسل کو ان کی تگ و تاز، جدوجہد و عمل اور

خلوص وایثار کی تابندہ روایات سے آگاہ کیا جائے کیونکہ تاریخ ایسی ہی شخصیات کا مجموعہ ہوتی ہے بلکہ مولانا عبدالحقؒ کا وجود ایسی ہستیوں میں سے ہے جو خود تاریخ بنایا کرتی ہیں اور جن کی جہد وعمل کی روایات تاریخ کا مایۂ صد افتخار حصہ بنتی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحقؒ کی زندگی بنیادی طور پر ایک مصلح اور استاذ کی زندگی تھی، انہوں نے معاشرہ میں قرآن وسنت کی تعلیم کو عام کیا بلکہ صوبہ سرحد میں دینی تعلیم کو ایک تحریک بنا دیا جو آج عظیم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ کی قیادت میں جاری وساری ہے۔ ان کے بلاواسطہ اور بالواسطہ شاگردوں کو شمار کیا جائے تو ہزاروں میں گنتی مشکل ہو جائے گی۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف براہ راست مصروف جہاد ہے جن میں حزب اسلامی کے امیر مولانا محمد یونس خالص اور پکتیا کے شہرہ آفاق کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحقؒ تین مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں اجمل خٹک جیسے معروف سیاست دان کو مولانا مرحوم کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا، ۱۹۷۷ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ نصر اللہ خٹک اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود شکست کھا گئے، اور ۱۹۸۵ء میں انہیں چارپائی پر پڑے ہوئے ہی علاقہ کے لوگوں نے قومی اسمبلی کا رکن چن لیا۔ قومی اسمبلی میں حضرت مولانا مرحوم کے خطابات علم و دانش، عزم واستقلال اور خلوص وخیر خواہی کا مرقع ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن پاکستان میں اسلامی نظام کا عملی اور مؤثر نفاذ رہا ہے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے کسی ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ شریعت بل کی جدوجہد کے سلسلہ میں قیادت کیلئے ان سے درخواست کی گئی تو فرمانے لگے کہ "بے جان لاشہ ہوں، ہل جل نہیں سکتا لیکن شریعت کیلئے جہاں حکم ہو جانے کیلئے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں چارپائی کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں"۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں ضعف، نقاہت اور علالت ان کے آڑے نہیں آئی، انہیں اسی حالت میں لاہور، بنوں اور راولپنڈی کے اسفار کی زحمت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمائی۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے ساتھ ساتھ افغانستان میں جہاد کی کامیابی اور اسلام کا غلبہ ان کی زندگی کی ایک بڑی تمنا رہی ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے، اپنی جیب سے انہیں سفر خرچ دیتے، ان کے حالات کی خبر رکھتے، مشاورت میں شریک ہوتے اور مجاہدین کی کامیابی کیلئے دعاگو رہتے۔ الغرض حضرت مولانا عبدالحقؒ کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے علماء بلکہ مجاہدینِ افغانستان بھی اپنے ایک عظیم مربی، سرپرست اور دعاگو بزرگ سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے جانشین حضرت مولانا سمیع الحق کو توفیق دیں کہ وہ اپنے عظیم باپ کی تابناک روایات کو زندہ رکھتے ہوئے قافلہ علماء حق کی قیادت کا فریضہ بہتر طور پر سرانجام دے سکیں، آمین یارب العالمین۔

ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور

(۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء)

جہادِ افغانستان کو سبوتاژ کرنے کی سازش

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء

جہادِ افغانستان کے بارے میں پاکستان کا جو متوازن اور جرأت مندانہ موقف گذشتہ گیارہ سال سے چلا آرہا ہے اسے نہ صرف پاکستان کے عوام اور عالم اسلام کی بھرپور تائید حاصل ہے بلکہ عالمی رائے عامہ بھی اقوامِ متحدہ کی متعدّد قراردادوں کی صورت میں اس اصولی موقف کو درست قرار دے چکی ہے۔ پاکستان نے نہ صرف افغان مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دے کر انسانی ہمدردی اور اسلامی بھائی چارے کی بنیاد پر ان کی حتی المقدور خدمت کی بلکہ جہاد افغانستان کی اخلاقی اور سیاسی پشت پناہی کر کے افغان مجاہدین کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ روسی افواج کو اپنے وطن سے دریائے آموں کے دوسری طرف دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔

افغان مجاہدین روسی افواج کو سرحدوں سے باہر دھکیلنے کے بعد روسی جارحیت کے بچے کھچے اثرات اور روس کے چھوڑے ہوئے اسلحہ اور اس کے محافظوں سے نمٹنے میں مصروف ہیں مگر کابل پر افغان مجاہدین کی نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہوجانے کا خوف امریکہ، روس، بھارت اور اسرائیل کو مضطرب کیے ہوئے ہے اور عالمی سطح پر یہ سازشیں ہو رہی ہیں کہ افغان مجاہدین کی جدوجہد کو آخری مرحلہ میں سبوتاژ کر دیا جائے۔ خان عبد الولی خان کی طرف سے عالمی راہنماؤں کے نام خطوط میں افغان مجاہدین کی جدوجہد کے خلاف جو زہر افشانی کی گئی ہے وہ اسی سازش کی ایک کڑی ہے۔ اور اب یہ خبر اخبارات کی زینت بنی ہے کہ پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو افغان پالیسی پر نظر ثانی کی خواہشمند ہیں اور انہوں نے اپنے ایک حالیہ بیان میں خان عبد الولی خان کی مہم کی بالواسطہ حمایت کا عندیہ دیا ہے۔

اگرچہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں کوئی سازش بھی افغان مجاہدین کو کابل کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتی لیکن ہم اس کے باوجود حکومت پاکستان اور دیگر طبقات کو خبردار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے عوام، عالم اسلام اور عالمی رائے عامہ افغان مجاہدین کے ساتھ ہیں اس لیے وہ افغان مجاہدین کی جدوجہد اور پاکستان کے کامیاب اور باوقار موقف کو سبوتاژ کرنے کی ناپاک سازش میں شریک نہ ہوں اور اپنے گروہی مفادات کی خاطر پاکستان کی اصول پسندی اور حق پرستی کو داؤ پر لگانے سے باز رہیں۔

متحدہ حزبِ اختلاف کا قیام اور افغان مجاہدین

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲ جون ۱۹۸۹ء

قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے موقع پر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کی قیادت میں متحدہ حزب اختلاف کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اور جناب جتوئی نے قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ متحدہ حزب اختلاف میں اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ارکان اسمبلی کے علاوہ نوابزادہ نصر اللہ خان، خان عبدالولی خان، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا فضل الرحمان، جناب غلام مصطفیٰ کھر اور ان کی جماعتوں کے ارکان بھی شامل ہیں۔

متحدہ حزب اختلاف کے قیام کا اعلان ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کیا گیا جس میں ان تمام جماعتوں کے پارلیمانی قائد شریک ہوئے۔ اس موقع پر متحدہ حزب اختلاف کے ترجمان کی حیثیت سے نوابزادہ نصر اللہ خان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں متحدہ اپوزیشن کے موقف اور پروگرام کی وضاحت کی کہ

> ”ہم وفاقی پارلیمانی نظام، صوبائی خود مختاری، قوانین شریعت کے نفاذ، اقتصادی اور سماجی انصاف، امن و امان اور حکومتی پالیسیوں پر مثبت اور تعمیری تنقید جیسے بنیادی معاملات میں مشترکہ طور پر جدوجہد کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔“ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۵ جون ۱۹۸۹ء)

جہاں تک قومی اسمبلی میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کے اتحاد کا تعلق ہے ہم اس کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس سے قومی سیاست میں توازن پیدا ہوگا اور ایک مضبوط اور مستحکم متبادل قیادت ابھرے گی۔ ہمیں متحدہ حزب اختلاف کے مذکورہ بالا مقاصد سے بھی کلی اتفاق ہے بالخصوص ان مقاصد میں قوانین شریعت کے نفاذ کے نکتہ کی شمولیت ہمارے نزدیک ملک کے دینی حلقوں کی اصولی کامیابی ہے۔ لیکن ایک بات ہمیں شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ ان مقاصد میں افغان مجاہدین کی عظیم جدوجہد کی حمایت کا اہم مسئلہ غائب ہے جو متحدہ حزب اختلاف میں جہادِ افغانستان کے بعض مخالفین کی شمولیت کے پس منظر میں تکلیف دہ حد تک دینی حلقوں کیلئے پریشانی کا باعث بن رہا ہے۔

اسلامی جمہوری اتحاد کے قیام کے بنیادی مقاصد میں جہادِ افغانستان کی مکمل پشت پناہی شامل ہے لیکن اگر قومی اسمبلی کے پلیٹ فارم پر متحدہ حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت ہوتے ہوئے بھی اسلامی جمہوری اتحاد کو اس اہم اور نازک دینی و قومی مسئلہ پر خاموشی اختیار کرنا پڑ رہی ہے تو یہ کوئی خوش آئند اور اطمینان بخش صورتحال نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی ہائی کمان مسئلہ کے اس پہلو کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے گی اور معاملہ کو اس حد تک نہیں بگڑنے دے گی کہ اس کی سیاسی حکمت عملی پر نظریات سے انحراف اور بے اصولی کا لیبل آسانی کے ساتھ چسپاں کیا جا سکے۔

یاسر عرفات اور جہادِ افغانستان

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۳۰ جون ۱۹۸۹ء

فلسطین کی آزاد حکومت کے سربراہ جناب یاسر عرفات گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے اور پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس سے خطاب کرنے کے علاوہ افغان مجاہدین کی آزاد عبوری حکومت کے راہنماؤں سے بھی ملے۔ قومی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق ان کا یہ دورہ ان عالمی کوششوں کا ایک حصہ تھا جو افغان مجاہدین کو نجیب انتظامیہ کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ کرنے کیلئے کی جا رہی ہیں۔ لیکن افغان مجاہدین کی قیادت نے جناب یاسر عرفات سے معذرت کرتے ہوئے اپنے اس دوٹوک موقف کا پھر اعادہ کیا ہے کہ نجیب حکومت کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت یا گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جناب یاسر عرفات کو تحریک آزادیٔ فلسطین کے مسلمہ راہنما کی حیثیت سے دنیا بھر میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے پاکستان اور افغانستان کے عوام کو یہ توقع تھی کہ ان کی مساعی اور تگ و دو کا رخ فطری طور پر افغان مجاہدین کے عظیم جہادِ آزادی کی حمایت میں واضح ہوگا اور وہ کابل میں نجیب انتظامیہ کے خاتمہ اور ایک نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے۔ لیکن نہ صرف افغان مجاہدین بلکہ پاکستان کے عوام کو بھی یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جناب یاسر عرفات نے اس سفر کی زحمت افغان مجاہدین کو نجیب انتظامیہ کے ساتھ گفتگو اور مفاہمت کا مشورہ دینے کیلئے فرمائی ہے۔

ہم جناب یاسر عرفات کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ گزارش کریں گے کہ اگر وہ جہادِ افغانستان کے اس نازک اور سنگین مرحلہ میں کوئی موثر کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت مناسب اور خوش آئند بات ہوگی لیکن اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ افغان مجاہدین کے اصولی اور نظریاتی موقف کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے روسی قیادت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کابل میں نجیب انتظامیہ کو قائم رکھنے کی ضد ترک کرکے افغانستان کے ۸۵ فیصد علاقہ پر قابض افغان مجاہدین کی عبوری حکومت کو افغانستان کا نظم و نسق سنبھالنے کا موقع دے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب یاسر عرفات کا یہ کردار جہاں افغان مجاہدین کے جہادِ آزادی کی منطقی تکمیل میں مد ثابت ہوگا وہاں تحریک آزادیٔ فلسطین کیلئے بھی ایک نظریاتی اور فیصلہ کن موڑ بن سکے گا جہاں سے وہ شاید بیت المقدس کی بازیابی اور فلسطین کی مکمل آزادی کیلئے نئے سفر کا آغاز کر سکیں۔

صدر مملکت غلام اسحاق خان سے معذرت کے ساتھ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور--- ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء

اسلامی جمہوری اتحاد سے تعلق رکھنے والے سینٹروں کے ایک وفد نے گذشتہ روز صدرِ مملکت جناب غلام اسحاق خان سے ملاقات کی اور ان سے

- جہادِ افغانستان کے بارے میں حکومتی پالیسی میں تبدیلی،
- سندھ میں اسلحہ بھجوانے کے الزامات،
- اور جنرل فضل حق کو قتل کے کیس میں ملوث کرنے کی مہم

کے بارے میں اپنے موقف اور جذبات سے آگاہ کیا۔ وفد میں قائد جمعیت مولانا سمیع الحق کے علاوہ سینیٹر مولانا قاضی عبد اللطیف، سینیٹر قاضی حسین احمد، سینیٹر محمد علی ہوتی، سینیٹر طارق چودھری، سینیٹر احمد میاں سومرو اور سینیٹر ڈاکٹر بشارت الٰہی شامل تھے۔

صدر محترم نے جہادِ افغانستان کے بارے میں حکومتی پالیسی میں تبدیلی کے تاثر کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ جہادِ افغانستان کی حمایت میں پالیسی کا تسلسل قائم ہے۔ ہم صدر محترم سے بصد ادب و احترام گزارش کریں گے کہ ان کا یہ ارشاد ہمارے لیے بہت مسرت اور اطمینان کا باعث ہوتا لیکن موجودہ وفاقی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد

- افغان مجاہدین کی عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے مسلسل گریز،
- حکومتی حلقوں کی طرف سے افغانستان میں ٹیکنوکریٹس کی حکومت قائم کرنے کی تجویز،
- افغان مہاجرین کیلئے افغانستان کے اندر الگ علاقہ مخصوص کی تجویز،
- اور افغان راہنماؤں کی طرف سے حکومتِ پاکستان کی پالیسی میں واضح تبدیلی کے احساس کا اظہار

ہمارے لیے اس خوش آئند یقین دہانی کو قبول کرنے میں ایک منطقی رکاوٹ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر صدر محترم اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں سے ہٹ کر صورتِ حال کی تبدیلی کا خود جائزہ لیں تو انہیں سینیٹروں کے مذکورہ وفد کے موقف سے اتفاق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

کیا افغان مجاہدین کی جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟

۱۲ و ۱۳ نومبر ۱۹۸۹ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں حرکۃ الجہاد الاسلامی کے سالانہ اجتماع سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب صدر، قابل احترام علماء کرام اور میرے مجاہد بھائیو!

میں حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع میں حاضری اور جہاد افغانستان کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وقت مختصر ہے اور علماء کرام کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے آپ سے مخاطب ہونا ہے اس لیے انتہائی اختصار کے ساتھ کسی تمہید کے بغیر جہاد افغانستان کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے دو اہم سوالوں کا جائزہ لوں گا۔

میرے محترم بھائیو! آپ حضرات میں سے بہت سے دوست وہ ہیں جو محاذ جنگ پر جا کر عملاً جہاد میں شریک ہو چکے ہیں اور بہت سے نوجوان ایسے ہیں جن کے دلوں میں جہاد کا جذبہ موجزن ہے اور وہ محاذ جنگ پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جہاد افغانستان کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک کا جائزہ لیا جائے تاکہ ذہنوں میں کسی قسم کا خلجان باقی نہ رہے۔ جہادِ افغانستان کے بارے میں اس وقت جن دو سوالوں پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے ان میں:

1. ایک یہ ہے کہ جب روسی افواج افغانستان سے چلی گئی ہیں تو اب جہاد جاری رکھنے کا شرعی جواز کیا باقی رہ گیا ہے اور کیا افغانستان میں ہونے والی موجودہ جنگ مسلمان کی مسلمان کے ساتھ جنگ نہیں ہے؟
2. دوسرا سوال یہ ہے کہ افغان مجاہدین نے اب تک جو جنگ لڑی ہے اس میں انہیں امریکہ، پاکستان اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی حاصل تھی مگر اب ان ممالک کی پالیسیوں میں تبدیلی نظر آ رہی ہے اور پشت پناہی اور امداد کی پہلی کیفیت باقی نہیں رہی۔ ان حالات میں افغانستان کی جنگ اب کس حال میں ہے، اس کا مستقبل کیا ہے اور اس کے جیتنے کے امکانات کس حد تک ہیں؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جہاد افغانستان کا اصل ہدف کیا تھا۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ افغان مجاہدین نے روسی فوجوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا اس لیے روسی فوجوں کی واپسی کے ساتھ ہی یہ جہاد ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب افغانستان میں جہاد کا آغاز ہوا تھا اور افغان علماء نے جہاد کا فتویٰ دے کر ہتھیار اٹھائے تھے اس وقت افغانستان میں روسی فوجوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ افغان علماء نے کابل میں کمیونسٹ نظام کے تسلط اور اسلامی اقدار و روایات کے خلاف کابل کی کمیونسٹ حکومت کے اقدامات کے علی الرغم علم جہاد بلند کیا تھا۔ روسی فوجیں تو بہت بعد میں آئی ہیں اور اس وقت آئی ہیں جب افغان مجاہدین باقاعدہ عملی جنگ کے ذریعے افغانستان کا ایک اچھا خاصا علاقہ کابل کی کمیونسٹ حکومت کے تسلط سے آزاد کرا چکے تھے۔ روسی فوجیں کابل میں اپنی حکومت اور نظام کو بچانے کیلئے آئی تھیں اور کمیونسٹ انقلاب کو مجاہدین کے ہاتھوں شکست سے بچانے کیلئے جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔

اس پس منظر میں آپ دیکھیں کہ کابل میں جس کمیونسٹ حکومت اور کمیونسٹ نظام کے خلاف افغان مجاہدین نے جہاد کا آغاز کیا تھا، کیا اس کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر کابل کی حکومت موجود ہے اور اپنے نظریاتی موقف اور نظام و انقلاب پر قائم ہے تو اس کے خلاف افغان مجاہدین کا جہاد بھی اپنی مکمل شرعی حیثیت کے ساتھ جاری ہے۔ یہ جس طرح پہلے دن شرعی جہاد تھا آج بھی شرعی جہاد ہے اور اس وقت تک شرعی جہاد رہے گا جب تک کابل پر کمیونسٹ انقلاب کا تسلط ختم نہیں ہو جاتا اور اس کی جگہ ایک خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔

دوسری گزارش سوال کے اس پہلو کے بارے میں ہے کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اور دونوں طرف سے مسلمان ہلاک ہو رہے ہیں۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ جو نام نہاد مسلمان کفر کی حمایت و حفاظت کیلئے

جنگ لڑ رہے ہیں ان کا مسلمان ہونا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں انہی بھائیوں کی زبان میں بات کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اس لیے شرعاً اسے جہاد کہنے کا جواز باقی نہیں رہا۔ دیکھیے! جس نوعیت کی جنگ آج افغان مجاہدین روسی استعمار کے خلاف لڑ رہے ہیں اسی طرح کی جنگ ہمارے اکابر نے برٹش استعمار کے خلاف لڑی تھی۔ برطانوی استعمار نے اسی طرح برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش پر قبضہ کر کے اپنا نظام مسلط کیا تھا اور ہمارے بزرگوں نے، علماء حق نے، اکابر نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اس جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور علماء حق نے مختلف اوقات میں مختلف محاذوں پر انگریزوں سے جنگ لڑی تھی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان جنگوں میں فرنگی کی فوجوں میں مسلمان تھے یا نہیں تھے؟ کئی ریاستوں کے مسلم حکمران اور ان کی فوجیں فرنگی مقاصد کیلئے مجاہدین آزادی کے خلاف جنگ میں شریک ہوئی تھیں یا نہیں؟

شہدائے بالاکوٹ کو دیکھ لیجئے۔ امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ اور امام المجاہدین شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جن سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا کیا ان کے ساتھ مسلمان نہیں تھے؟ کیا کفار کی فوج میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے شریک ہو جانے سے یہ جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ بن گئی تھی اور شرعی جہاد نہیں رہا تھا؟ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کو دیکھ لیجئے۔ ہم آج تک اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ مسلمان کہلانے والے نوابوں، جاگیرداروں، سرداروں، خان بہادروں اور وڈیروں نے اس جنگ میں انگریز کا ساتھ دیا تھا، انگریزی فوج کو سپاہی مہیا کیے تھے۔ ہم مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خاندان کی انگریزی حکومت سے وفاداری ثابت کرنے کیلئے مرزا قادیانی کی کتابوں سے یہ حوالے دیتے ہیں کہ اس کے باپ نے اور دادا نے انگریزی فوج کیلئے ۱۸۵۷ء میں سینکڑوں گھوڑے اور سپاہی مہیا کیے۔ کفر کا فتویٰ تو مرزا غلام احمد قادیانی پر اس کے دعوائے نبوت کی وجہ سے لگا ہے، اس کے باپ اور دادا پر تو کسی نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا تھا۔ کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے فرنگی فوجوں میں شامل ہو جانے سے اس کا جہاد ہونا مشکوک ہو گیا تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ ہم یہ مانتے ہیں کہ شہدائے بالاکوٹ کی جنگ شرعاً جہاد تھی اور ۱۸۵۷ء کا معرکہ شرعاً جہاد تھا تو افغان مجاہدین کی جنگ بھی مسلمان اور مسلمان کی جنگ نہیں بلکہ شرعی جہاد ہے۔

ایک بات میں علماء کرام سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مسلمان کفر کے نظام کا حمایتی بن جائے اور نظامِ کفر میں شامل ہو کر جنگ میں مسلمانوں کے مقابل آجائے تو اس کا حکم شرعاً کیا ہے؟ کیا اس کو گولی مارنے سے اس لیے گریز کریں گے کہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور کیا اس کو گولی مرنے سے اس جنگ کی شرعی حیثیت تبدیل ہو جائے گی؟ میرے محترم بزرگو اور بھائیو! یہ سب پروپیگنڈا ہے اور جہاد افغانستان کو سبوتاژ کرنے کی سازش ہے جس کا مقصد مجاہدین کے حوصلوں کو پست کرنے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کی حمایت سے روکنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اب آئیے دوسرے سوال کی طرف کہ امریکہ اور پاکستان کی افغان پالیسی میں محسوس کی جانے والی منفی تبدیلی کے بعد جہاد افغانستان کس حال میں ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی خلاف واقعہ ہے کہ افغان مجاہدین نے یہ جہاد امریکہ اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی کی وجہ سے شروع کیا تھا۔ کیونکہ جب افغان علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور ان کی قیادت میں مجاہدین پہلے کابل

حکومت اور پھر روسی فوجوں کے خلاف صف آرا ہوئے تھے تو امریکہ اور دوسرے حمایتوں کا کہیں دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ چند بے وقوف مولوی ہیں، روسی فوجوں سے ٹکرانا ان کے بس کی بات نہیں، دو چار ہفتوں میں صاف ہو جائیں گے۔ لیکن جب مجاہدین ڈٹے رہے اور انہوں نے افغانستان کا کم از کم چالیس فیصد علاقہ روسی فوجوں کے تسلط سے محفوظ کر لیا تو امریکہ اور دوسری طاقتیں متوجہ ہوئیں اور انہوں نے افغان مجاہدین کی عملی امداد کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جہاد افغانستان کے آغاز کے بعد کم از کم تین سال تک مجاہدین نے تن تنہا جنگ لڑی ہے، روسی فوجوں کا اسلحہ چھین کر لڑی ہے، بے سروسامانی کی حالت میں لڑی ہے، فقر و فاقہ اور کسمپرسی کے عالم میں لڑی ہے اور ایمانی قوت کے ساتھ میدان میں ڈٹ کر دنیا کو بتایا ہے کہ ایمان اور جذبہ آج بھی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔

دوسری بات یہ ذہن میں رکھیں کہ امریکہ کی امداد کے بارے میں مجاہدین اور ان کے ہمنوا کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں رہے کہ یہ آخر وقت تک جاری رہے گی۔ سب جانتے ہیں کہ یہ امداد اپنے مفادات کیلئے امریکہ نے دی ہے۔ جب تک روسی فوجیں افغانستان میں موجود تھیں امریکہ کا مفاد اس میں تھا کہ مجاہدین کو امداد دی جائے اور انہیں مضبوط کیا جائے۔ اور جب روسی فوجیں چلی گئیں تو امریکہ کا مفاد اس میں ہے کہ مجاہدین کو کمزور کیا جائے اور کابل پر ان کی حکومت کو قائم ہونے سے ہر قیمت پر روکا جائے۔ یہ صرف امریکہ کا مفاد نہیں بلکہ اسلام آباد، ڈھاکہ، انقرہ، قاہرہ، خرطوم، جکارتہ اور دوسرے تمام مسلم دارالحکومتوں کا مشترکہ مفاد ہے کیونکہ اگر کابل میں خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں منافقت کا اسلام کابل کی اسلامی حکومت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، اسے میدان سے ہٹنا پڑتا ہے، دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اور مسلم ممالک میں منافقانہ اور دکھاوے کے اسلام کی شکست امریکہ کی شکست ہے، اس کے مفادات کی شکست ہے اور عالم اسلام پر اس کی بالادستی کی شکست ہے۔ اس لیے سب مل کر اس گٹھ جوڑ میں مصروف ہیں کہ کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم نہ ہونے دی جائے اور ظاہر شاہ یا اس قسم کے کسی اور نام سے دکھاوے کی مسلمان حکومت کابل میں قائم کر دی جائے۔ لیکن میں افغان مجاہدین اور جہاد افغانستان کے زعماء کی بصیرت و جرأت کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے اس گٹھ جوڑ کو مسترد کر دیا ہے، وہ لمبی جنگ لڑنے کیلئے تیار ہیں مگر کفر اور منافقت کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ نہیں ہیں۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ صورتحال کچھ بدل گئی ہے، حالات میں تغیر آیا ہے، مجاہدین کی مشکلات بڑھی ہیں، ان کی جنگ لمبی ہوئی ہے اور آزمائش کا عرصہ طویل ہو گیا ہے۔ لیکن جہاد کی کامیابی کا راستہ یہی ہے، کفر و منافقت کی مکمل شکست اور اسلام کی مکمل بالادستی کا راستہ یہی ہے۔ میں نے مجاہدین کو محاذ جنگ پر دیکھا ہے، ان کے مورچوں میں گیا ہوں اور ان کے عزم و حوصلہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مشکلات ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ جہاد افغانستان اپنی فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، امریکہ اور اسلام آباد کے رویہ میں تبدیلی کے باوجود مجاہدین کے قدم رکے نہیں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور فطری رفتار میں بڑھ رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب مجاہدین کابل پر شریعت اسلامیہ کی بالادستی کا پرچم لہرائیں گے اور میرے نزدیک وہ دن جہاد کے اختتام کا دن نہیں ہوگا بلکہ وہی

دن پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں استعماری نظاموں اور منافقت کے اسلام کے خلاف جہاد کے آغاز کا دن ہوگا۔ خدا ہمیں وہ دن جلدی دکھائے اور اس دن کیلئے خود کو تیار رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الشیخ عبد اللہ عزام شہیدؒ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۸۹ء

گذشتہ روز ایک مجاہد فلسطینی عالم الدکتور الشیخ عبد اللہ عزامؒ پشاور میں اپنے دو بیٹوں سمیت بم کے دھماکہ میں جامِ شہادت نوش کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھ کر گاڑی میں اپنی رہائش گاہ پر واپس جا رہے تھے کہ گاڑی میں نصب کیا ہوا بم پھٹا اور تینوں باپ بیٹے شہید ہو گئے۔

ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہیدؒ سعودی عرب کے رہنے والے تھے، یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، جہادِ افغانستان کے آغاز کے ساتھ ہی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ملازمت سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے محاذِ جنگ پر آ گئے۔ مختلف محاذوں پر جنگ میں حصہ لیا، افغان مجاہدین کی حمایت و امداد کیلئے ادارہ قائم کیا، جہادِ افغانستان پر مقالات اور کتابیں لکھیں، "الجہاد" کے نام سے ایک معیاری عربی جریدے کی اشاعت کا اہتمام کیا اور ان جذبۂ جہاد سے سرشار عرب نوجوانوں کی راہنمائی اور قیادت کی جو مختلف ممالک سے جہادِ افغانستان میں شرکت کیلئے محاذوں پر پہنچے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہیدؒ جہادِ افغانستان کو بجا طور پر ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز سمجھتے ہوئے اس میں شریک تھے اور دنیا بھر کے مسلم علماء کو جہاد میں شریک دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ شہادت کی آرزو ان کے دل میں تھی اور زبان ہر وقت شہادت اور جہاد کے ذکر سے تر رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی منزل پا لی ہے اور اپنے رب کی بارگاہ میں سرخرو جا پہنچے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی یہ قربانی اس دنیا میں بھی رائیگاں نہیں جائے گی، افغان مجاہدین کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوں گے اور جہادِ افغانستان دنیا بھر میں احیائے اسلام کی جدوجہد کا نکتۂ آغاز ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہیدؒ اور ان کے بیٹوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور ان کے عظیم مشن کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

جہادِ افغانستان کے خلاف امریکی سازش

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۰ء

امریکی سینیٹر مسٹر سٹیفن سولارز ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ افغانستان کے مسئلہ پر ایک فارمولا لائے ہیں جس کا بنیادی نکتہ افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ کو افغانستان میں کوئی کردار سونپنا بیان کیا جاتا ہے۔

سٹیفن سولارز وہی صاحب ہیں جو امریکہ کی رائے عامہ کو پاکستان اور اسلامی قوتوں کے خلاف منظم کرنے کی مہم کے سرخیل بنے ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستان میں بالخصوص اسلامی قوتوں کے آگے آنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ و غلبہ سے چڑ ہے اور وہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کو ہر قیمت پر روکنے کی سازش کا ایک اہم کردار ہیں۔

افغانستان میں اس وقت امریکہ اور روس میں اس بات پر کشمکش جاری ہے کہ روس اپنے نجیب اللہ کو کابل کے اقتدار پر مسلط رکھنا چاہتا ہے جبکہ امریکہ ظاہر شاہ کی شکل میں اپنا نجیب اللہ مسلط کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن افغان مجاہدین کے لیے، جو افغانستان کو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست بنانے اور مکمل شرعی نظام نافذ کرنے کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں، یہ دونوں ناقابل قبول ہیں اور وہ ان دونوں کو مسترد کرتے ہوئے مکمل کامیابی کے حصول تک جہاد جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

افغان مجاہدین یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں روسی اثر و نفوذ کا دروازہ ظاہر شاہ نے ہی اپنے اقتدار میں کھولا تھا اور ایسی پالیسیوں کا آغاز کیا تھا جو بالآخر افغانستان پر روسی افواج کے تسلط پر منتج ہوئیں۔ اور جب افغان عوام مسلسل گیارہ سال تک روسی افواج کی جارحیت کے خلاف لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے، ظاہر شاہ نے عسکری، سیاسی یا سفارتی کسی محاذ پر کوئی رول ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اس لیے ظاہر شاہ کو نئی صورتحال میں کوئی کردار سونپنا افغان عوام کی قربانیوں کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے جسے کسی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ افغان مجاہدین کا یہ موقف حقیقت پسندانہ ہے اور ایک غیرت مند قوم کے شایانِ شان بھی ہے۔ اس لیے دنیا بھر کی باغیرت اور حریت پسند اقوام کو اس موقف کی بھرپور حمایت کرنی چاہیے۔

امریکی امداد کی ناقابلِ قبول شرائط

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۰ء

پاکستان کیلئے امریکی امداد کی بندش اس وقت قومی حلقوں میں زیر بحث ہے اور ملکی و بین الاقوامی پریس میں اس حوالے سے خدشات و توقعات کے اظہار اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

پاکستان ایک غریب ملک کی حیثیت سے اپنے معاشی توازن کو قائم رکھنے کیلئے بیرونی امداد حاصل کرنے پر مجبور رہے۔ اور خلیج کے حالیہ بحران نے پاکستان کی معیشت میں عدمِ توازن کے جن نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ان کے پیش نظر بیرونی امداد کی ضرورت و اہمیت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کو عسکری، فنی اور اقتصادی امداد کیلئے زیادہ تر امریکہ پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور امریکہ ایک عالمی استعماری قوت کی حیثیت سے پاکستان کی اس مجبوری سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پاکستان کی امداد کی بحالی کو ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے جن کو پورا کرنے کی صورت میں اس کے پاس ہمیشہ کیلئے امریکہ کا دست نگر اور طفیلی بنے رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ۱۹۸۷ء میں امریکی سینٹ نے پاکستان کی امداد کو جن شرائط کا پابند بنایا تھا ان میں سے چند اہم شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- پاکستان ایٹم بم نہ بنانے کی یقین دہانی کرائے اور ایٹمی تنصیبات کو معائنہ کیلئے کھول دے۔
- پاکستان میں انسانی حقوق کے مغربی تصورات کے منافی کوئی قانون نافذ نہ کیا جائے، یعنی اسلامی حدود کے نفاذ کی طرف پیشرفت نہ کی جائے۔
- قادیانیوں کے خلاف جو آئینی اور قانونی اقدامات اب تک کیے گئے ہیں ان کی واپسی کا یقین دلایا جائے۔

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء۔
روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۵ مئی ۱۹۸۷ء)

افغانستان میں روسی جارحیت سے پیدا شدہ حالات کے باعث امریکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ان شرائط سے صرف نظر کرتا رہا لیکن اب اس کی یہ مجبوری باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے امریکی سینٹروں نے دوبارہ یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور امریکی انتظامیہ پر مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ سینٹ کی طے شدہ مذکورہ بالا شرائط کے بغیر پاکستان کی امداد بحال نہ کی جائے۔ اس پس منظر میں پاکستان کے قومی انتخابات کے نتائج کا شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے جو ان سطور کی اشاعت تک سامنے آچکے ہوں گے۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں ایسی حکومت آئے جو ان شرائط کی پاسداری اس کی توقعات کے مطابق کر سکے، اور اس مقصد کیلئے بعض سیاسی حلقے مختلف ذرائع سے امریکہ کو یقین دہانی کرانے اور اسے اعتماد میں لینے کی کوششوں میں مصروف بھی دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اونٹ خدا جانے کس کروٹ بیٹھتا ہے لیکن اس صورتحال سے قطع نظر یہ بات اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ امریکی سینٹ کی طرف سے پاکستان کی امداد کیلئے عائد کردہ یہ شرائط کسی بھی آزاد، باوقار اور خود مختار ملک کیلئے قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ اور ان شرائط کو قبول کرنے کا مطلب قومی آزادی اور خود مختاری کو اقتصادی امداد کے عوض گروی رکھنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکہ پر یہ واضح کر دیا جائے کہ پاکستانی قوم ایسی کسی امداد پر دلچسپی نہیں رکھتی جس کیلئے اسے اپنے اسلامی تشخص اور قومی خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑے۔ پاکستان کے قومی سیاسی حلقوں اور ان سے زیادہ دینی حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان امریکی شرائط کے خلاف کلمہ حق بلند کریں، اب وقت آگیا ہے کہ امریکی تسلط کے خلاف رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور پوری قوم کو متحد و منظم کر کے امریکی عزائم کے خلاف سدِ سکندری بنا دیا جائے۔ یہ ذمہ داری سب سے زیادہ ملک کے دینی حلقوں پر عائد ہوتی ہے اور انہیں متحد و منظم ہو کر قومی و دینی مہم کی قیادت کیلئے آگے بڑھنا چاہیے۔

عالمِ اسلام میں جہاد کی نئی لہر

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۱۹۹۰ء

جہادِ افغانستان کے منطقی اثرات رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہے ہیں کہ نہ صرف مشرقی یورپ نے روس کی بالادستی کا طوق گلے

سے اتار پھینکا ہے بلکہ وسطی ایشیا کی ریاستیں بھی اپنی آزادی اور تشخص کی بحالی کیلئے قربانی اور جدوجہد کی شاہراہ پر گامزن ہو چکی ہیں اور فلسطین، کشمیر اور آذربائیجان کے حریت پسند مسلمان جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ظلم و استبداد کی قوتوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ جہاد کے اسی جذبہ سے کفر کی قوتیں خائف تھیں اور اسے مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کیلئے استعماری طاقتیں گذشتہ دو سو برس سے فکری، سیاسی اور تہذیبی سازشوں کے جال بن رہی تھیں لیکن اسلام کی زندہ و متحرک قوت اور جہاد کے ناقابل تسخیر جذبے نے افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اس سازش کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ فلسطین میں انتفاضہ کی تحریک فلسطینی مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ کے وجود کا احساس دلا رہی ہے، کشمیری حریت پسندوں کی مسلح جدوجہد نے دنیا کو بھولا بسرا مسئلہ کشمیر پھر سے یاد دلا دیا ہے اور آذربائیجان میں روسی ٹینکوں کا نشانہ بننے والے غیور مسلمانوں نے اپنے خون کے ساتھ تاریخ کی یہ حقیقت ایک بار رقم کر دی ہے کہ مسلمان کو اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ دیر کیلئے مغلوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے زیادہ دیر تک قابو میں رکھنا کسی بڑی سے بڑی طاقت کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔

حریت اور غیرت کے یہ شعلے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں مگر استبداد و استعمار کے علم بردار ان شعلوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا دامن بچانے کی فکر میں جہاد کی اس نئی عالمگیر لہر کے سرچشمہ جہادِ افغانستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور واشنگٹن، ماسکو اور اسلام آباد جہادِ افغانستان کے منطقی اور نظریاتی نتائج کو روکنے کیلئے گٹھ جوڑ کر چکے ہیں لیکن یہ ان کی بھول اور تاریخ کے عمل سے بے خبری ہے۔ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی اثرات پوری دنیا کو حصار میں لے رہے ہیں تو کابل کو مصنوعی سہاروں کے ساتھ "اثر پروف" رکھنا آخر کب تک ممکن ہو گا؟ ماسکو، واشنگٹن اور اسلام آباد کو اس حقیقت کا بالآخر ادراک کرنا ہو گا کیونکہ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

مسلم سربراہ کانفرنس: وقت کا اہم تقاضہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۰ء

گذشتہ ہفتے سعودی مملکت کے فرمانروا شاہ فہد کے ساتھ حکومت پاکستان کے ایک وفد کی ملاقات کے حوالے سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ شاہ فہد مسئلہ کشمیر پر اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے والے ہیں۔ معلوم نہیں اس خبر کی حقیقت کیا ہے لیکن جہاں تک اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس طلب کرنے کی ضرورت ہے اس سے انکار یا صرفِ نظر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کشمیری حریت پسند جس جرأت و استقلال کے ساتھ حصولِ آزادی کیلئے اپنے خون کی قربانی دے رہے ہیں اور افغان مجاہدین کے گیارہ سالہ کامیاب جہادِ آزادی کو آخری مراحل میں جس طرح سازشوں کے ذریعے ناکامی میں بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مسلم سربراہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور افغانستان و کشمیر کے ساتھ ساتھ فلسطین، آذربائیجان، مورو، ایریٹیریا، اراکان (برما) اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں ابھرنے والی آزادی کی تحریکات کے حوالے

سے اپنے اجتماعی کردار کا تعین کریں۔

یہ درست ہے کہ مسلم ممالک کے بیشتر موجودہ حکمرانوں کے شخصی اور گروہی مفادات استعماری قوتوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ اس وقت اس دوراہے پر کھڑے ہیں کہ عالم اسلام میں آزادی، غلبۂ اسلام اور دینی بیداری کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیں یا مسلم ممالک کے موجودہ فرسودہ انتظامی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچوں کے تحفظ کی ناکام تگ و دو میں لگے رہیں۔ لیکن مسلم حکمرانوں کو ایک بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ عالم اسلام اب خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے اور اگر ان حکمرانوں نے بیداری اور آزادی کی ان لہروں کے مخالف سمت چلنے کی کوشش کی تو تاریخ میں ان کا یہ جرم کبھی معاف نہیں ہوگا۔

اس پس منظر میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلم حکمران اگر اپنے مثبت اور مؤثر کردار کا تعین کرتے ہیں تو نہ صرف افغانستان، کشمیر، فلسطین اور دیگر خطوں کے مظلوم مسلمان ان کے شکر گزار ہوں گے بلکہ انہیں اپنی گذشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا راستہ بھی مل جائے گا۔

جہادِ افغانستان اور ہمارے دینی مدارس

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۰ء

دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے اور ملک بھر کے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سالانہ تعطیلات گزارنے کے بعد اپنے تعلیمی سفر کے نئے مرحلہ کا آغاز ماہ گذشتہ کے وسط میں کر چکے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں دینی مدارس کا تعلق مختلف مذہبی مکاتبِ فکر سے ہے اور ہر مذہبی مکتب فکر کے دینی ادارے اپنے اپنے مذہبی گروہ کے تشخص و امتیاز کا پرچم اٹھائے نئی نسل کے ایک معتد بہ حصہ کو اپنے نظریاتی حصار اور فقہی دائروں میں جکڑنے کیلئے شب و روز مصروف عمل ہیں۔

اور اب افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں کمیونزم کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا جائزہ لے لیا جائے جس نے روسی افواج کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کرنے کے علاوہ وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں دینی بیداری کی لہر دوڑا دی ہے اور روسی استعمار کے آہنی پنجے کو ڈھیلا کر کے مشرقی یورپ پر کمیونزم کی گرفت کو کمزور کر دیا ہے۔ افغانستان کے غیور مسلمانوں کے اس عظیم جہاد کی قیادت کا ایک بڑا اور فیصلہ کن حصہ انہی دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے۔ اور اس طرح افغانستان کو روسی کمیونزم کیلئے "پانی پت" کا میدان بنا دینے کا کریڈٹ دینی مدارس کے اسی نظام کے حصہ میں آتا ہے۔

الغرض دینی مدارس کی یہ عظیم جدوجہد اور اس کے نتائج و ثمرات تاریخ کے صفحات پر اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ کوئی ذی شعور اور منصف مزاج شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ فرنگی اقتدار کے تسلط، مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار اور صلیبی عقائد و تعلیم کی ترویج کے دور میں یہ مدارس ملی غیرت اور دینی حمیت کا عنوان بن کر

سامنے آئے اور انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں سیاست، تعلیم، معاشرت، عقائد اور تہذیب و ثقافت کے محاذوں پر فرنگی سازشوں کا جرأت مندانہ مقابلہ کر کے برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کو اسپین بننے سے بچا لیا۔ اور یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج اس خطہ زمین میں مذہب کے ساتھ وابستگی اور اسلام کے ساتھ وفاداری کے جن مظاہر نے کفر کی پوری دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، عالمِ اسباب میں اس کا باعث صرف اور صرف یہ دینی مدارس ہیں۔

امریکہ اور عالمِ اسلام

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۹۰ء

روزنامہ جنگ کراچی نے ۵ نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں اپنے واشنگٹن کے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے جہادِ افغانستان کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امریکہ اور روس کے درمیان اس امر پر ۱۹۸۵ء میں ہی خفیہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کو اسلامی حکومت کے قیام کی منزل تک نہ پہنچنے دیا جائے۔

رپورٹ کے مطابق یہ منصوبہ امریکہ کے ممتاز سفارت کار آنجہانی آرنلڈ رافیل نے تیار کیا تھا جو پاکستان میں امریکہ کے سفیر رہے ہیں اور صدر جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے ساتھ بہاولپور کے سانحہ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس خفیہ مفاہمت کی رو سے روس نے افغانستان سے اپنی فوجوں کی واپسی کیلئے یہ شرط لگائی تھی کہ امریکہ افغان مجاہدین کو اسلامی حکومت قائم نہ کرنے دے، اور اس شرط کو قبول کرتے ہوئے امریکہ نے نہ صرف روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کی امداد بند کر دینے کا وعدہ کیا تھا بلکہ نجیب اللہ کو افغانستان کے صدر کے طور پر قبول کرنے کی یقین دہانی بھی کرا دی تھی۔

رپورٹ کے مطابق اس مفاہمت کیلئے آرنلڈ رافیل نے روسی حکومت کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کی تھی اور ان خفیہ رابطوں اور مفاہمت کے بعد معاہدہ جنیوا وجود میں آیا تھا۔

دوسری طرف روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں سعودی عرب میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر جیمز ایکنز کے ایک اخباری انٹرویو کا خلاصہ شائع کیا ہے جس میں امریکی سفارت کار نے کہا ہے کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں امریکی فوجیں اتارنے کا منصوبہ پندرہ سال قبل تیار کیا گیا تھا، جس کا مقصد تیل کے چشموں پر کنٹرول حاصل کرنا تھا، لیکن اس وقت حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کیا جا سکا۔

امریکی سفارت کار کے بقول پندرہ سال قبل جب شاہ فیصل شہیدؒ نے اسرائیل کی حمایت کرنے والی مغربی قوتوں کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا تو امریکی حکام نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ خلیج میں دو لاکھ کی تعداد میں فوج اتار دی جائے جو تیل کے چشموں پر کنٹرول حاصل کر لے، اور یہ فوج اس وقت تک خلیج میں مقیم رہے جب تک تیل کے چشمے خشک نہ ہو

جائیں، جس کی مدت اس انٹرویو میں پچاس سال بتائی گئی ہے۔

اس پس منظر میں عالمِ اسلام کے ساتھ امریکہ کے روابط اور طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ایک بار پھر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عالمِ اسلام کے ساتھ دوستی کا ڈھونگ رچا کر عالمی سطح پر روس کو شکست دینے کے بعد اب امریکہ بہادر کی تمام تر توجہ اس امر پر مبذول ہو گئی ہے کہ:

1. عالمِ اسلام میں نظریاتی آزادی اور دینی بیداری کی تحریکات کو ہر قیمت پر ناکام بنایا جائے۔
2. اور مسلم ممالک کے معاشی وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے کر عالمِ اسلام کو ان سے آزادانہ استفادہ کے مواقع سے محروم کر دیا جائے۔

یہ صورتحال عالمِ اسلام کے نظریاتی حلقوں بالخصوص دینی تحریکات سے سنجیدہ توجہ اور گہرے غور و خوض کا تقاضا کر رہی ہے، انہیں اسلام کی سربلندی، ملتِ اسلامیہ کی خود مختاری، اور عالمِ اسلام کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے رائے عامہ کی تشکیل کے نئے تقاضوں کو محسوس کرنا ہو گا، اس سلسلہ میں اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور وقتی مصالح و مفادات کے حصار کو توڑ کر پیش قدمی کرنا ہو گی۔ اس کے بغیر اب کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا اور اس میں تاخیر کا جو وقت بھی گزرے گا اسے فرض ناشناسی اور مجرمانہ غفلت کے بغیر اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکے گا۔

جہاد افغانستان اور ہماری ذمہ داریاں

مرکز حضرت عمرؓ، ژاور، افغانستان --- مارچ ۱۹۹۱ء

مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی نے شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ کے آخری ایام میں حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمن خلیل کی دعوت پر افغانستان کے محاذ جنگ کا دورہ کیا اور مرکز حضرت عمرؓ، مرکز حضرت سلمان فارسیؓ، مرکز خلیل اور مرکز رشید میں مجاہدین سے ملاقاتوں کے علاوہ حرکۃ المجاہدین کے تربیتی کیمپوں میں جہاد کی ٹریننگ لینے والے نوجوانوں سے بھی خطاب کیا۔
مدیر الشریعہ کے چھوٹے فرزند حافظ ناصر الدین خان عامر اور بھانجے نبیل عدنان خان بھی سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔ مرکز حضرت عمرؓ (ژاور) میں مدیر الشریعہ کا خطاب ہمارے رفیق محترم مولانا اللہ وسایا قاسم نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مرتب کر کے ارسال کیا ہے جسے ان کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ

بعد الحمد والصلوۃ۔ میرے محترم دوستو اور جذبہ جہاد سے سرشار بھائیو! آپ حضرات مختلف علاقوں سے اپنے معمولات، گھربار، مصروفیات اور مشاغل چھوڑ کر ایک بے آب و گیاہ وادی کی سنگلاخ چٹانوں میں جمع ہیں۔ آپ کے یہاں جمع ہونے کا ایک مقصد ہے، وہ مقصد آپ دلوں میں لیے جوش و جذبہ کے ساتھ اپنے ایمان کو حرارت دے رہے ہیں،

اللہ تعالیٰ آپ کے اس مقصد میں آپ کو اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ وہ مقصد یہ ہے کہ آج کے دور میں جہاد کا فریضہ مسلمانوں کی عملی زندگی سے نکل چکا ہے، وہ فریضہ مسلمانوں کے عملی زندگی میں دوبارہ آجائے۔ ہم دنیا میں مسلمان کہلاتے ہیں، مسلمان سمجھے جاتے ہیں لیکن ہمارا اپنے ہتھیار کے ساتھ، اسلحہ کے ساتھ، زیور کے ساتھ تعلق منقطع ہو چکا تھا، وہ ہمارا تعلق دوبارہ قائم ہو جائے۔ ہم پہلے والے مسلمانوں کی طرح زندگی میں کوئی حرکت پیدا کر سکیں اور عالم اسلام میں جہاد کے عمل کو دوبارہ زندہ کر کے جہاد کی برکات اور اس کے نتائج سے ہم دنیا کو بہرہ ور کر سکیں۔ یہی مقصد ہے نا جی!۔ ہاں، اس کے سوا تو کوئی مقصد نہیں ہے۔

سچی بات یہ ہے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی تھی کہ جب تم جہاد کو ترک کر دو گے اور دنیا کے کاموں میں پڑ جاؤ گے تو تم پر ذلت مسلط ہو گی۔ ایک تو عقیدت و محبت کی بات ہے کہ ہم حضور اکرمؐ کے اس ارشاد کو حقیقت جانیں اور جانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی زبان سے جو بات نکلی ہے وہ سچی ہے اور سچی ہو کر رہے گی۔ یہ عقیدت اور محبت کی بات ہے جو ہر مسلمان کے دل میں اسی درجہ کی عقیدت ہے کہ دنیا بھر کی باتیں غلط ہو سکتی ہیں مگر نبی اکرمؐ کا ارشاد سچا ہے۔ جبکہ عقیدت اور محبت سے تھوڑا سا صرف نظر کرتے ہوئے تاریخ کے میزان پر بھی آنحضرتؐ کا یہ ارشاد حرف بحرف پورا اتر رہا ہے۔ جو نقشہ تاریخ ہمارے سامنے کھینچتی ہے اور جو نقشہ آج دنیا میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، آج دنیا میں مسلمانوں کی حالت اور گزشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کا جو تاریخی سفر رہا ہے، حضورؐ کے اسی ارشاد کی حرف بحرف تائید کرتا ہے۔ آج دنیا میں عالم اسلام پر ایک نظر ڈال لیں، مسلمان دنیا میں جو بستے ہیں ان کی تعداد دنیا میں ایک ارب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور یقیناً ایک ارب سے زیادہ ہے، مگر یہ ایک ارب سے زیادہ مسلمان دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

- ایک حصہ مسلمانوں کا وہ ہے جو بظاہر آزاد ممالک و اقوام کی حیثیت سے رہتا ہے، چالیس چوالیس حکومتیں ہیں مسلمانوں کی جو آزاد کہلاتے ہیں، مسلمان حکمران ہیں، اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، غالب حصہ مسلمانوں کا خود کو آزاد سمجھ کر زندگی بسر کر رہا ہے۔
- لیکن ایک بڑا حصہ مسلمانوں کا وہ بھی ہے جو غیر مسلم ممالک میں غیر مسلم حکومتوں کے نیچے ظالم اور غاصب حکومتوں کے نیچے ایک غلام قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج کی دنیا کی اصطلاح میں وہ دوسری اقوام کے غلام ہیں، دوسری قوموں کے ماتحت ہیں، ان پر دوسری قوموں کا تسلط ہے غلبہ ہے، جبر و ظلم ہے۔ آپ کشمیر کو دیکھ لیں، اراکان، فلپائن اور مورو کو دیکھیں۔ بخارا، سمرقند، آذربائیجان کو دیکھیں، اریٹریا اور فلسطین کو دیکھیں۔ یہ معروف خطے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے مسلمان رہتے ہیں لیکن ان پر حکومت غیر مسلموں کی ہے، ان پر جبر ہے ظلم ہے وہ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جو آزاد ہیں، ان کی حالت بھی یہ ہے کہ کہنے کو آزاد ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ آزاد کہلانے کے باوجود ہماری پالیسیاں اور ہمارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ یہ ایک واضح سی حقیقت ہے ایک زندہ حقیقت ہے۔ ہم اپنی

مرضی سے اپنی پالیسیاں مرتب نہیں کرسکتے، اپنی مرضی سے اپنے معاملات طے نہیں کرسکتے، ریموٹ کنٹرول غلامی ہم پر مسلط ہے۔ ہم بھی کافر قوموں کے غلام ہیں، کافروں کے ماتحت ہیں، ہمارے معاملات بھی وہیں طے ہوتے ہیں جہاں ہمارے مظلوم اور بظاہر غلام نظر آنے والے مسلمانوں کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ آج دیکھیے، دنیا کا کوئی ایک خطہ ہے جہاں ہم مسلمان بحیثیت مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی مکمل طور پر قرآن و سنت کے مطابق بسر کررہے ہوں اور نظام شریعت مکمل طور پر نافذ ہو؟ کوئی ایک خطہ زمین نظر نہیں آتا۔ میں نے مکمل کی شرط لگائی ہے جہاں قرآن و سنت کی حکمرانی مکمل طور پر نافذ ہو، شریعت اسلامیہ کی بالادستی مکمل طور پر۔ ایک ارب سے زیادہ آبادی اور چوالیس ملکوں میں کوئی ایک خطہ نظر آتا ہے؟

اس کیفیت میں ہم مسلمان دنیامیں کس حالت میں زندگی بسر کررہے ہیں؟ دنیامیں وسائل ہمارے پاس ہیں، دولت ہمارے پاس ہے، تیل ہمارے پاس ہے، افرادی قوت ہمارے پاس ہے، ذہنی قوت ہمارے پاس ہے، اسباب کے اعتبار سے کمی نہیں ہے۔ آپ تصور کرسکتے ہیں ہم جو دوسری قوتوں کی ترقی کا رونا روتے ہیں کہ امریکہ نے بڑی ترقی کی، روس نے بڑی ترقی کی، چاند پر جا پہنچے، سب سے بڑی بات یہی کہی جاتی ہے نا کہ امریکہ اور روس کہاں پہنچے ہیں چاند پر ڈیرے لگا لیے، ہوا کو مسخر کرلیا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ کا اپالو الیون جو چاند پر پہنچا تھا، اس اپالو الیون کی منصوبہ بندی کس نے کی تھی، وہ کونسا سائنسدان تھا جس نے اپالو الیون کو تیاری کرائی، اپالو الیون بھجوایا، سارے پروگرام کی پلاننگ کی اور سارے منصوبہ کا انچارج تھا؟ آپ کا کیا خیال ہے وہ کوئی جرمن سائنسدان ہوگا، وہ مسلمان سائنسدان ہے مصر کا ہے، ڈاکٹر فاروق الباز اس کا نام ہے۔ سب سے پہلا جو اپالو چاند پر پہنچا مسلمان سائنسدان کے ہاتھوں پہنچا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اسباب کی کمی نہیں ہے دولت کی کمی نہیں ہے، ذہانت کی کمی نہیں ہے، دولت جتنی مسلمان کے پاس ہے اور کس کے پاس ہے؟ کویت پر جس دن عراق کا قبضہ ہوا تھا دنیامیں سب سے مہنگی کرنسی کویت کی تھی۔ اس دن ایک دینار کی پاکستان کے مطابق ۷۵ روپے قیمت تھی۔ دولت، وسائل، ذہانت، افرادی قوت کس لحاظ سے ہم میں کمی ہے؟ لیکن یہ ساری چیزیں کون استعمال کررہا ہے؟ ہماری افرادی قوت کون استعمال کررہا ہے؟ ہماری دولت کون استعمال کررہا ہے؟ ہمارے وسائل کون استعمال کررہا ہے؟ کافر۔ وجہ؟ آپ سوچ سکتے ہیں دشمن اس حد تک ہوشیار ہے کہ ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہمارے پیسے جیب میں ڈال کر ہمیں ہی مار رہا ہے۔ میں نے غلط بات تو نہیں کی۔ دشمن خلیج میں ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہم سے خرچہ وصول کرکے ہمیں ہی ذبح کرگیا ہے۔ ابھی پتہ نہیں کتنے کرے گا۔ پیسے ہمارے خرچ ہوتے ہیں زمین ہماری برباد ہوئی، قوت ہماری تباہ ہوئی ہے اور ذبح بھی ہم ہی ہوئے ہیں۔ اور دشمن بڑے آرام سے، بڑے سکون سے، بڑے اعتماد سے، بڑے حسن و خوبی سے اپنا پلان مکمل کرکے مطمئن بیٹھا ہے کہ جس کام کیلئے میں آیا تھا وہ پورا ہوگیا ہے۔

یہ ساری بات کس وجہ سے ہے؟ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ گذشتہ دو سو سال میں ہم پر جو غیر ملکی استعمار کی حکمرانی رہی برطانیہ حکمران رہا ہے، فرانس حکمران رہا ہے، ہالینڈ حکمران رہا ہے، کسی کا انڈونیشیا پر تسلط تھا، کسی کا الجزائر پر تھا، کسی کا پاکستان پر تھا۔ انہوں نے دو سو سال کے عرصے میں کیا کیا ہے؟ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دو سو سال یہ کیا کرتے

رہے، اس عرصہ میں ہم میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے؟ دوسری قوم جب آتی ہے، اپنا تسلط قائم کرتی ہے تو مغلوب قوموں میں تبدیلی آتی ہے۔ ہم میں کیا تبدیلی آئی ہے؟ دو مقاصد تھے ان کے اس گذشتہ دو سو سال کے عرصہ میں۔ استعماری قوتیں سامراجی قوتیں دو مقاصد لے کر آئی تھیں۔ ہم یقیناً خوش ہیں کہ ہم نے انہیں نکال دیا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیے کہ ان دونوں مقاصد میں وہ کامیاب ہیں۔ ذرا تجزیہ کیجئے تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے۔ دونوں مقاصد میں وہ کامیاب ہیں۔ وہ مقاصد کیا تھے؟

مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس نے نبوت کا دعوی کیا، نئی امت قائم کی، انگریز نے اس کو کھڑا کیا سپورٹ کیا، مقصد کیا تھا؟ وہ کیا کہتا ہے کہ میرے نبی بننے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کا تصور ختم کیا جائے، مجھے انگریز نے نبی اس لیے بنایا ہے۔ پچاس سے زیادہ الماریاں بھر جاتی ہیں اس کی کتابوں سے، کس بات پر؟ کہ جہاد اب حرام ہو گیا ہے۔ جہاد کا تصور مسلمان اپنے ذہنوں سے نکال دیں، جہاد کی مدت ختم ہو چکی ہے، جہاد کو حرام قرار دینا، جہاد کو مسلمانوں کے ذہنوں سے نکالنا، یہ میری زندگی کا مشن ہے۔ یہاں غلام احمد قادیانی کھڑا ہوا، ایران میں محمد علی باب کھڑا ہوا، مختلف علاقوں میں انگریز نے مختلف لوگ کھڑے کیے جہاد کے تصور کو مجروح کرنے کے لیے، ختم کرنے کے لیے، مسلمانوں کے ذہنوں سے نکالنے کے لیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو ہم نے کافر بھی قرار دے دیا اور اس کی امت کو غیر مسلم اقلیت بھی قرار دلوا دیا۔ ان ساری کامیابیوں کے باوجود میں ذرا تلخ سا سوال کرنے لگا ہوں۔ انگریز اپنے ان گماشتوں کے ذریعے سے مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کا تصور نکالنا چاہتا تھا، اس میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے؟ جو ان جھوٹی نبوتوں کا مقصد تھا، ان کے پیچھے جو فلسفہ تھا، اس کا مشن تھا، اس میں کامیابی ہوئی ہے یا ناکامی ہوئی ہے؟ ہم سو دفعہ اور غیر مسلم اقلیت قرار دے دیں یہ تو عقیدے ایمان کی بات ہے، میں اس فیصلے کی تخفیف نہیں کر رہا، معاذ اللہ، لیکن میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز نے اس قسم کے لوگوں کو کھڑا کر کے جو مشن قائم کیا تھا اس میں انگریز کامیاب ہوا ہے۔ انگریز کا مشن یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے دو باتیں نکالی جائیں ایک خلافت کا اسلامی تصور اور دوسرا جہاد۔

آپ کو تاریخ سے تھوڑا بہت تعلق تو ہو گا، یہ موجودہ عرب جو مختلف ملکوں میں بٹا ہوا ہے، خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کا استنبول مرکز تھا، خلافت عثمانیہ ترکوں نے قائم کی تھی، پانچ سو سال تک ترکوں نے عالم اسلام کی خدمت کی ہے۔ حرمین کی حفاظت کی ہے، خلافت کا نظام قائم رکھا ہے، قرآن و سنت کے قوانین کسی نہ کسی درجے میں قائم رکھے ہیں۔ صدیوں تک مصر، شام، لبنان سعودی عرب، اردن سب اس کے ماتحت صوبے تھے۔ آج سے ستر سال پہلے انگریزوں نے عربوں کو نیشنلزم کے نام پر بھڑکایا، یہ قومیت جو ہے اس درجے کی قومیت جو دوسروں سے نفرت کی بنیاد پر ہو، یہ لعنت ہے۔ تعارف اور تشخص و امتیاز کی قومیت کو قرآن تسلیم کرتا ہے لیکن دوسروں سے نفرت کی بنیاد پر جو قومیت ہو وہ ملعون قومیت ہے۔ انگریز نے عربوں کو بھڑکایا کہ تم عرب ہو اور عجمی تم پر حکمران ہیں۔ تم تو عرب ہو رسول اللہؐ کے خاندان کے ہو۔ عرب بھڑکے ترکی کی خلافت کے خلاف۔ بغاوت کروا کے برطانیہ نے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے: اردن علیحدہ، شام علیحدہ، عراق علیحدہ، سعودی حجاز علیحدہ، مصر علیحدہ۔ اس وقت برطانیہ بڑی طاقت تھی اور برطانیہ نے

اس وقت نیو ورلڈ آرڈر نافذ کیا اور یہ ٹکڑے چھوٹے چھوٹے کر کے درمیان سے اسرائیل نکالا۔ اسرائیل کوئی بڑا لمبا اور پرانا ملک نہیں ہے، یہاں مسلمان تھے۔ اس بندر بانٹ میں جو ترکی کے خلافت بغاوت کروا کے، عربوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر، اس وقت برطانیہ عظمیٰ نے جو اپنی مرضی کے مطابق نقشہ بنایا، اسی نقشے میں سے اسرائیل کی گنجائش نکالی۔

سمجھ میں آئی یہ بات؟ اب اس کی دوسری قسط آرہی ہے۔ پہلی قسط پون صدی پہلے برطانیہ نے دی تھی، دوسری قسط اب آرہی ہے اور امریکہ اس کو پورا کر رہا ہے۔ یہ بش کا جو نیو ورلڈ آرڈر ہے یہ ایسے نہیں ہے۔ بش کا نیو ورلڈ آرڈر برطانیہ کے اسی منصوبے کی تکمیل ہے۔ یہ جو کہتے ہیں خلیج کا سیاسی نقشہ تبدیل کریں گے جیسے برطانیہ نے کیا تھا ویسے ہی یہ کریں گے۔ خلیج میں ایک بڑی فوجی قوت تھی جو سازشی عناصر نے گھیر کر تباہ کر دی۔ اب اسرائیل وہاں کی بڑی قوت ہے، امریکہ کی فوجیں وہاں بیٹھی ہیں، اپنی مرضی سے بندر بانٹ کریں گے، نقشے بن چکے ہیں۔ اور میرے آپ کے جذبات سے یا میرے آپ کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں دکھ تو ہوگا یہ بات کہتے ہوئے سنتے ہوئے کہ یہ ساری مہم یہ سارا کچھ جو بھی ہوا پون صدی پہلے اسرائیل کے قیام کیلئے تھا اور اس کے نتیجہ میں اسرائیل قائم ہوا۔ اور اب یہ اسرائیل کی سرحدوں کو عظیم تر اسرائیل میں تبدیل کرنے کیلئے ہے، خدا میری بات پوری نہ کرے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ یہ ہوگا، حالات اس رخ پر جا رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہ ہوگا۔ عظیم تر اسرائیل کا جو خواب ہے وہ پورا کریں گے۔ مجھے چند دن پہلے ایک دوست نے وہ نقشہ بھجوایا ہے عظیم تر اسرائیل، گریٹر اسرائیل جو ان کا منصوبہ ہے کہ اتنا بڑا اسرائیل ہم نے بنانا ہے۔ پورا مصر اس میں ہے، پورا شام اس میں ہے، پورا عراق اس میں ہے، آدھا سعودی عرب اس میں ہے، خیبر اس میں ہے، مدینہ منورہ اس میں ہے۔ ان کے منصوبہ کے نقشہ میں لکھا ہوا ہے۔ ان کا دعوی یہ ہے کہ مدینہ ہمارا تھا تم نے ہمیں نکالا تھا زبردستی۔ بنو خزرج، بنو مصطلق کو، بنو نضیر کو تم نے ہمیں نکالا تھا یہ ہمارا ہے۔ امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر اس طرح کا منصوبہ ہے جس طرح پون صدی پہلے خلیج کا نقشہ اپنی مرضی سے تبدیل کروا کر اپنا تسلط قائم کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اسباب پیدا ہو جائیں کچھ ہماری غیرت جاگ پڑے، آمین، لیکن بظاہر اس کے اسباب بھی نہیں۔ ہاں اللہ مسبب الاسباب ہے اس کو تو ایک منٹ نہیں لگتا اسباب پیدا کرنے میں، اللہ تعالیٰ کی کوئی تکوینی بات غالب آجائے، ہماری غیرت کہیں سے جاگے، اور شاید ہم اس کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو کوئی رکاوٹ ہو جائے، ورنہ بظاہر اس رخ میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں کہ بش اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے خلیج کا نقشہ تبدیل کر کے اپنی مرضی کا سیاسی نقشہ بنانے میں اور اسرائیل کو علاقے کا بڑا چودھری بنانے میں ناکام ہو۔ اس کی کامیابی کے راستے کھلے ہیں، رکاوٹ بظاہر کوئی نظر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیں، وہ قادر مطلق ہے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دنیا میں اس حالت میں کھڑے ہیں۔ یہ ساری باتیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اپنے بنیادی تصور سے ہٹ گئے ہیں، بنیادی تصور ہمارا کیا ہے؟ اسلام، قرآن و سنت۔ اسے شریعت کا نام دے دیں، اسے خلافت کا نام دے دیں، کوئی نام دے دیں، دین کی بالادستی کا، جہاد کا تصور۔ دنیا میں یہ منظر مسلمانوں کے حالات کا دیکھ کر اب وہ حدیث پڑھیں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا "جب تم جہاد کو چھوڑ دو گے خدا تم پر ذلت مسلط کر دے گا"۔ تاریخ کو سامنے رکھ کر دنیا

میں مسلمانوں کے حالات کو سامنے رکھ کر اب اس حدیث کو پڑھیں اب آپ کو صحیح سمجھ میں آئے گی کہ نبی کریمؐ کے ارشاد کا مقصد کیا تھا۔ اب ایک بات اور دیکھیں کہ آنے والا دور آپ دوستوں کیلئے بالخصوص، جو جہاد کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں، جذبہ تڑپ ہے تو یہاں آئے ہیں، اللہ اس جذبہ کو مکمل فرمائے، اس کی تکمیل کی توفیق دے، اللہ اس شعلے کو اور بھڑکائے آمین۔ آپ دوستوں کیلئے جو آپ آنے والے حالات کیلئے خود کو تیار کرنا چاہتے ہیں، آنے والا دور بڑا سخت دور ہے، آنے والے دس بیس سال نظریاتی لوگوں کے لیے، جو کسی نظریہ اور مشن کی بات کرتے ہیں، ان کیلئے مشکل ترین دور ہے۔ اور وہ وقت آرہا ہے، حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معه متٰی نصر اللہ وہ وقت ابھی نہیں آیا، ابھی آرہا ہے۔ ابھی حالات اس سے برے ہوں گے، حالات اس سے زیادہ خراب ہوں گے۔ وہ کیفیت ابھی نہیں آئی وزلزلوا زلزالاً شدیدا۔ اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر۔ ابھی وہ حالات آنے والے ہیں۔

صورتحال یہ ہے کہ یورپ، امریکہ، روس، جاپان اور چین یہ سارے متحد ہو چکے ہیں، ایک بات پر یہ سارے متفق ہیں کہ مسلمان ملکوں میں سے کسی ملک میں بنیاد پرست حکومت نہیں بننے دیں گے۔ ”بنیاد پرست“ کا لفظ تو آپ سنتے ہیں، ہمارے لیے ہر دور میں ایک نئی گالی گھڑی جاتی ہے، پہلے ”رجعت پسند“ کہا جاتا تھا دقیانوسی رجعت پسند۔ اور آج ہمارے لیے نئی گالی کیا ہے، بنیاد پرست۔ یعنی وہ لوگ جو قرآن و سنت کا مکمل نظام خلافت راشدہ کی طرز پر چاہتے ہیں انہیں بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی ترمیم کیے بغیر، اسلام کو نئے دور کے ساتھ ہم آہنگ کیے بغیر، ہم آہنگ سے مراد یہ ہے ترمیمیں اور تبدیلیاں کیے بغیر، اصلی اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، اس کیلئے محنت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے انہوں نے اصطلاح گھڑی ہے بنیاد پرست۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھیں جب بھی بنیاد پرستی کی بات ہوگی تو مراد آپ ہوں گے اور یہ بات یہ لوگ طے کر چکے ہیں کہ بنیاد پرست حکومت دنیا کے کسی خطہ میں نہیں بننے دیں گے۔ افغانستان کے مسئلہ کے حل میں جو رکاوٹ ہے سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ اور روس دونوں متفق ہو چکے ہیں کہ افغانستان میں مولوی کی حکومت نہ بننے دی جائے۔ یہ بات ایک تو میں کہہ رہا ہوں، میں تو خیر کہوں گا ہی، دنیا کے جو تجزیہ نگار ادارے ہیں، آج بھی ایک کا تجزیہ چھپا ہے، پشاور میں کانفرنس ہو رہی ہے اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کی ہیں، پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم نے بھی تقریر کی ہے، اس نے بھی تجزیہ کی بات کی ہے، بات اس نے صحیح کی ہے کہ افغانستان کے مسئلہ کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کو یہ خدشہ ہے کہ یہاں بنیاد پرست حکومت بنے گی اور بنیاد پرست حکومت ان کو کسی طور پر بھی قبول نہیں۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام نافذ ہو، جہاد کا جذبہ زندہ ہو، خلافت اور جہاد دونوں باتوں سے یہ ساری قوتیں خوفزدہ ہیں اور ساری قوتیں متحد ہو چکی ہیں، آپ کا مقابلہ بیک وقت ان سب قوتوں سے ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حوالے سے ایک بات کا میں ذکر کر رہا تھا کہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کا دور آخری دور تھا، اس کے خلاف پوری ممالک سازش کر رہے تھے، اس زمانہ میں بڑی کمزور حکومت تھی، ترکی کی خلافت ایسی طاقتور نہ تھی، بہرحال نام کی خلافت تھی۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی سب مل کر ترکی کے خلاف سازش کر رہے تھے کہ خلافت ختم ہو، اس کا تیاپانچا ہو، اس کا بیڑا غرق کریں۔ عربوں کو بھڑکا رہے تھے، دوسرے لوگوں کو بھڑکا رہے تھے۔ اس زمانے کی بات

ہے حضرت مدنیؒ مالٹا جزیرے میں نظر بند تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تحریک آزادی کا مسئلہ تھا، حضرت مدنیؒ نظر بند تھے۔ وہاں کہتے ہیں کہ ایک انگریز افسر تھا فوج کا، وہ بھی کسی جرم میں مالٹا جزیرہ میں قید تھا، کوئی اس نے جرم کیا ہو گا اپنی فوج میں، اس جرم میں اس کا کورٹ مارشل ہوا تھا اور وہ بھی مالٹا میں سزا کاٹ رہا تھا۔ وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس سے سوال کیا کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ ایک کمزور سی حکومت ہے، نہ اس کے پاس کوئی طاقت، نہ اس کے پاس کوئی قوت ہے، برائے نام ایک ظاہری خلافت کا نام ہے، اور تم سارے یورپ والے مل کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کا تیا پانچا کر دیں، اس کا بیڑا غرق کر دیں۔ آخر وجہ کیا ہے، اس سے کیا خوف ہے؟ ایک کمزور سی خلافت ہے برائے نام سی، مسلمان اس سے عقیدت رکھتے ہیں، تم سارے یورپ والے اس کے خلاف برطانیہ بھی، فرانس بھی، اٹلی بھی سب مل کر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ جلدی کسی طریقہ سے ختم کر دیں آخر تمہیں کیا خطرہ ہے خلافت عثمانیہ سے؟

اس نے جواب میں کہا کہ مولانا میں اتنا سادہ نہیں سمجھتا تھا آپ کو جتنی سادگی کا آپ مظاہرہ فرما رہے ہیں، یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ خلافت عثمانیہ دیکھنے میں کمزور حکومت ہے، ان کے پاس فوج نہیں ہے، قوت نہیں ہے، لیکن ان کے دو لفظوں میں اتنی طاقت ہے کہ جب تک ہم اس طاقت قوت کو توڑ نہیں لیں گے مطمئن نہیں ہوں گے۔ وہ کون سے لفظ ہیں ایک خلافت اور ایک جہاد۔ اس نے کہا کہ آج دنیا میں قسطنطنیہ میں بیٹھا ہوا خلیفۃ المسلمین دنیا کے کسی کافر ملک کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے، اعلان اس کا ہو گا جہاد کا امیر المومنین کی حیثیت سے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دنیا کی ہر مسلمان بستی میں نوجوانوں میں ایک ہلچل پیدا ہو جائے گی کہ امیر المومنین نے کفر کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے، کفر کا مقابلہ ہے۔ اور سب نوجوان ذہنی طور پر اپنے آپ کو جہاد کیلئے تیار کریں گے۔ اس نے کہا یہ قوت جو ہے اس قوت کو کون ختم کر سکتا ہے؟ اس کے الفاظ یہ تھے کہ ہم دو لفظوں کی قوت ختم کرنا چاہتے ہیں، امیر المومنین نام کی کوئی شے موجود نہ رہے، دنیا میں خلافت نام کا تصور نہ رہے، اور جہاد کا تصور نہ رہے۔

کیا خیال ہے، ان دونوں باتوں میں انگریز کامیاب نہیں ہے؟ کن کن باتوں میں ہمیں ناکام کیا ہے؟ آج ہمیں اسی نقطہ پر واپس جانا ہو گا، ہم جہاد کے تصور کے ساتھ یہ تصور ذہنوں میں زندہ کریں کہ ہم نے دنیا میں اسلام کے غلبہ کیلئے محنت کرنی ہے اور وہی غلبہ جو خلافت کے عنوان سے ہو، اسلام کی بالادستی کے عنوان سے ہو، خلافت راشدہ کی پیروی میں ہو۔ کیونکہ جس دروازہ سے انگریز نے ہمیں ناکام کیا ہے ہم اسی دروازہ پر واپس جائیں گے تو کامیابی ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔ ان گزارشات کے ساتھ آپ حضرات کے جذبات اور جوش و خروش کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہم لوگ اور تو کچھ نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ آپ حضرات کے ساتھ مل بیٹھیں دو چار باتیں کر لیں۔ اللہ تعالیٰ یہی قبول فرما لیں، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم نئی نسل میں آنے والے مسلمانوں میں، آنے والے دور کے اندر جہاد اور اسلام کی بالادستی کے عنوان کو زندہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا ذریعہ بنالیں، سبب بنالیں کہ ہم اس کو ایک منظم قوت اور تحریک کی حیثیت دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے اپنے دین کا غلبہ کیلئے اور جہاد کے احیا کیلئے کوئی کام لے لیں۔ آمین یا رب العالمین۔

جہادِ افغانستان نازک موڑ پر

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اپریل ۱۹۹۱ء

شعبان المعظم کے آخری ایام میں حرکۃ المجاہدین کی دعوت پر خوست جانے کا اتفاق ہوا اور افغان مجاہدین کے فوجی مراکز، (۱) مرکز حضرت عمرؓ (۲) مرکز خلیل (۳) مرکز رشید اور (۴) مرکز حضرت سلمان فارسیؓ دیکھنے کا موقع ملا۔ معروف افغان کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی سے بھی ملاقات ہوئی۔

افغان مجاہدین ان دنوں نجیب حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے فیصلہ کن جدوجہد کے مرحلہ میں ہیں اور خوست شہر کو فتح کرنے کیلئے کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ خوست کا شہر اور چھاؤنی فوجی لحاظ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور اس شہر کو پورے جنوبی افغانستان کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے چاروں طرف سے افغان مجاہدین کے محاصرہ کے باوجود اس شہر کی حفاظت کیلئے نجیب انتظامیہ اپنا پورا زور صرف کر رہی ہے، لیکن افغان مجاہدین پر عزم ہیں کہ وہ بہت جلد اس شہر کو فتح کر کے نجیب انتظامیہ کی فوج کو شکست سے دوچار کریں گے۔

ہم ان صفحات پر اس سے قبل بعض امریکی سفارت کاروں کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں کہ افغانستان کے بارے میں جنیوا معاہدہ روس اور امریکہ کی اس درونِ خانہ مفاہمت کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا کہ کابل پر افغان مجاہدین کی حکومت کسی صورت میں قائم نہ ہونے دی جائے۔ اس لیے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کیلئے نہ صرف امریکی امداد اور دلچسپی میں مسلسل کمی ہو رہی ہے بلکہ افغان مجاہدین کے خلاف سازشوں میں بھی امریکہ پوری طرح شریک ہے۔ اور اس طرح افغان مجاہدین روسی استعمار اور اس کی ایجنٹ حکومت کے خلاف صبر آزما جنگ کے انتہائی مشکل دور سے گزر رہے ہیں، لیکن ان کے عزم و حوصلہ اور موقف کی صداقت کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ مشکلات کا یہ دور بھی زیادہ طویل نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و امداد کے ساتھ وہ کابل پر ایک اسلامی نظریاتی حکومت کا پرچم لہرانے میں بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ ان شاء اللہ العزیز، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

افغانستان کی تقسیم کے عالمی منصوبہ کا آغاز

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- مئی ۱۹۹۱ء

افغان مجاہدین کی خون میں ڈوبی ہوئی چودہ سالہ طویل جدوجہد بالآخر رنگ لائی جس کے نتیجہ میں افغانستان کے عوام آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے اور وہاں پر ایک آزاد اسلامی (عبوری) حکومت قائم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے خلاف امریکہ، روس اور دیگر مغربی ممالک کی سازشیں بھی اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر دنیا بھر کی غیر مسلم استعماری طاقتیں خصوصاً امریکہ بہادر وہاں

ایک آزاد اور خالص اسلامی حکومت کے قیام کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ امریکی سامراج نے اپنی روایتی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کو تقسیم کرنے کے عالمی منصوبے پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی خبروں میں بھی اس بات کی تصدیق ہو رہی ہے کہ افغانستان کی تقسیم کے بین الاقوامی منصوبے جسے امریکہ کے علاوہ دیگر مغربی ممالک اور روس کی حمایت بھی حاصل ہے، کو اب عملی شکل دینے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ منصوبہ کے مطابق اگر افغانستان میں ان کی پسند کی حکومت قائم نہ ہو سکے تو اس کی طاقت کو کمزور اور منتشر کرنے کیلئے اسے شمال اور جنوب کے علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو امریکہ بہادر نے افغانستان کو اپنا دستِ نگر اور طفیلی ملک بنانے کیلئے ایک پانچ نکاتی امن منصوبہ پیش کیا اور عالمی ذرائع ابلاغ سے اس نام نہاد امن منصوبہ کا زبردست پراپیگنڈہ کیا اور میاں نواز شریف اور حکومت پاکستان کے ذریعے اس منصوبہ پر عملدرآمد کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ پھر اس مقصد کیلئے اقوامِ متحدہ کے خصوصی نمائندہ بینن سیون کو پاکستان بھیجا۔ بینن سیون نے افغانستان میں برسراقتدار نجیب انتظامیہ کے علاوہ پاکستان اور ایران کے حکمرانوں کے ذریعے اپنے نام نہاد امن منصوبہ کیلئے جوڑ توڑ شروع کر دی لیکن جب بینن سیون کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی کو بھی ان کی مدد کیلئے پاکستان بھیج دیا۔

لیکن افغان مجاہدین نے باہمی اتفاق و اتحاد سے ان کی کوئی بھی سازش کامیاب نہ ہونے دی۔ اسی دوران نجیب نے استعفیٰ دے دیا۔ ادھر افغان مجاہدین کی تنظیموں نے اقوامِ متحدہ کے اس نام نہاد امن منصوبہ کو ٹھکرا کر باہمی مشاورت سے افغانستان میں ایک مشترکہ عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ لیکن پاکستان میں جماعت اسلامی اور افغانستان میں جماعت کی ذیلی تنظیم حزب اسلامی نے مشترکہ عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ہم حکمت یار سمیت تمام افغان تنظیموں کے سربراہوں سے گزارش کریں گے کہ وہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے معمولی اختلافات کو پس پشت ڈال کر متحد ہو جائیں اور امریکی سازشوں کو ناکام بنا کر افغانستان میں ایک پائیدار اسلامی حکومت قائم کر کے ایک مضبوط اسلامی بلاک کی راہ ہموار کریں۔

نیو ورلڈ آرڈر: عالمِ اسلام کے خلاف سازش

۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں حرکۃ الجہاد الاسلامی
کے سالانہ اجتماع سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ صدر ذی وقار قابل صد احترام دوستو، بھائیو اور مجاہد ساتھیو! میں صرف اجتماع میں شرکت اور آپ حضرات کے ہم نشینوں میں نام لکھوانے کیلئے حاضر ہوا ہوں، وقت مختصر ہے۔ دیگر حضرات علماء کرام بھی تشریف فرما ہیں اور بالخصوص مفتی صاحب دامت برکاتہم تشریف فرما ہیں، اس لیے کسی تمہید کے بغیر صرف دو مختصر باتیں عرض کروں گا۔

ایک تو اس وقت جہاد افغانستان کس پوزیشن میں ہے اس کا نقشہ تھوڑا سا سامنے ہونا چاہیے۔ ایک وقت وہ تھا جب افغانستان کے علماء نے جہاد کا آغاز کیا تو دنیا کے دانشور یہ کہتے تھے۔ یہ پاگل لوگ ہیں روس جیسی سپر پاور چٹان ہے ان سے سر ٹکرا ٹکرا کر تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے، لیکن یہ مجاہدین کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج ماسکو میں روس کا وزیر خارجہ ان ہی مجاہدین سے پوچھتا ہے کہ پرامن مصالحت اور مفاہمت کی بات ہو سکتی ہے لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ ہم نجیب کا کیا کریں۔ مذاکرات کے حوالے سے جو رپورٹ آئی ہے اس میں روس کا وزیر خارجہ مجاہدین کے وفد کے لیڈر سے پوچھتا ہے کہ ہمیں راستہ بتاؤ نجیب کا ہم کیا کریں۔ یہ مجاہدین کی خلوص کی برکات ہیں اور اللہ رب العزت نے ایک بار پھر دنیا میں یہ عملاً دکھایا ہے کہ مسلمان اگر ایمان کی بنیاد پر جہاد کیلئے خلوص دل کے ساتھ میدان عمل میں ہو تو اللہ کی مدد اب بھی مسلمانوں کے ساتھ ہے، مشکلات اگرچہ بہت ہیں اور اس وقت مجاہدین کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجاہدین کی آخری کامیابی کو روکنے کیلئے امریکہ اور روس دونوں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ امریکہ اور روس کے مفادات مشترک ہیں۔ امریکہ اور روس اکٹھے ہو کر دونوں نے کچھ باتوں پر اتفاق کیا ہے۔ آج دنیا میں نیو ورلڈ آرڈر کی بات ہو رہی ہے۔ اس کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا رہا ہے لیکن میں اپنے مجاہد بھائیوں سے عرض کروں گا کہ اس نیو ورلڈ آرڈر کو ہمیں بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ ہے کیا۔ امریکہ اس نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے دنیا کے اندر کیا تبدیلی لانا چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ نوٹ کر لیں کہ یہ نیو ورلڈ آرڈر جو بھی سامنے آیا ہے اس پر امریکہ اور روس دونوں متفق ہیں۔ امریکہ اور روس دونوں مل کر دنیا میں ایک نئی تبدیلی اور ایک نئی صورتحال پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں میں اس پر اتفاق ہے اور بدقسمتی سے ان دونوں کے علاوہ دوسری بڑی طاقتیں بھی جاپان سمیت ان کے ساتھ متفق ہیں۔ صرف چین تھوڑا سا ہٹا ہوا ہے، پتا نہیں ہٹا رہتا ہے یا ساتھ چلتا ہے، لیکن تمام طاقتیں جو بڑی کہلاتی ہیں وہ اس نیو ورلڈ آرڈر پر متفق ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کیا ہے؟ ہمارے سمجھنے کی اس میں دو باتیں ہیں۔

1. پہلی بات تو یہ ہے کہ افغانستان پر مجاہدین کی حکومت (جس کو وہ بنیاد پرست کہتے ہیں) قائم نہ ہو، اس کا پہلا نقطہ ہے۔
2. دوسرا نقطہ یہ ہے مشرق وسطی میں عرب ممالک پر اسرائیل کی بالادستی فوجی اور سیاسی دونوں اعتبار قائم سے کروائی جائے جسے عربوں کو بٹھا کر ان سے تسلیم کروایا جائے۔ اسرائیل کی بالادستی اس طریقے سے قائم کر دی جائے کہ کوئی عرب ممالک اسرائیل کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔
3. اسی نیو ورلڈ آرڈر کی جو تیسری بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں اس وقت جو دینی بیداری کی تحریکات ہیں جس کو وہ بنیاد پرست تحریکات کہتے ہیں، جو پاکستان میں بھی ہے، جو انڈونیشیا میں بھی ہے، ملائیشیا میں بھی ہے، افغانستان میں بھی ہے، الجزائر میں بھی ہے، ترکی میں بھی ہے، جو خالص اسلام کی بنیاد پر، قرآن و سنت کی حکمرانی کی بنیاد پر، کسی آمیزش کے بغیر قرآن و سنت کے خالص نظام کو اپنے ممالک پر رائج کرنا چاہتے ہیں، وہ تحریکات اب بھی موجود ہیں، کہیں طاقتور ہیں اور کہیں کمزور ہیں، اور کہیں درمیانی کیفیت کی ہیں، بنیاد پرستی

کی تحریکات، دینی بیداری کی تحریکات، یہ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جاپان اور جرمنی سارے متفق ہو چکے ہیں کہ ان تحریکات کو ہر قیمت پر دبانا ہے۔ ان تحریکات میں سے کسی تحریک کو اس پوزیشن پر نہیں آنے دینا کہ وہ کسی ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے نظام کو نافذ کر سکیں، اور نظام کو نافذ کرنے کے بعد دنیا کے سامنے اسلامی نظام کو صحیح نمونے پر پیش کر سکیں۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ آج دنیائے انسانیت جن مشکلات سے دوچار ہے، میرا ایمان اور عقیدہ ہے اگر دنیا کے کسی حصہ میں ایک حصہ کی حکومت بھی اسلام کے نظام کو صحیح طور پر نافذ کر کے اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے تو دنیا پیاسی ہے، دنیا ترس رہی ہے کسی اچھے نظام کو، اس نظام کا مقابلہ کرنا پھر کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔ اور یہ بات وہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر اسلام صحیح معنوں میں نافذ ہوا تو ایک نمونہ آئے گا، ایک مثال سامنے آئی گی، اور پھر یہ جتنے جھوٹے نظام ہیں ان کیلئے راستہ چھوڑے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔ کیونکہ روشنی جب آتی ہے تو تاریکی کیلئے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں کر رہ جاتا۔ تو یہ تیسرا نقطہ ہے ان کا کہ دنیائے اسلام میں بنیاد پرستی کی تحریکات کو کچل دیا جائے۔

4. چوتھی بات نیو ورلڈ آرڈر کے تحت، امریکہ اور اس کے حواریوں میں اب روس بھی شامل ہے، یہ چاہتے ہیں کہ دنیائے اسلام کا کوئی ملک بھی فوجی لحاظ سے اس قدر طاقتور نہ ہو کہ وہ کسی غیر مسلم ملک بالخصوص اسرائیل کیلئے خطرہ بن سکے۔ آج ہماری ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ ہے، لیبیا کے ایٹمی مسائل ہیں، عراق کے ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ ہے، جہاں کہیں انہیں تھوڑی سی سن گن ملتی ہے کہ وہ مسلمان ملک ایٹمی توانائی کی طرف بڑھ رہا ہے تو وہاں فوراً پہنچتے ہیں اور قوت کو تباہ کرنے کیلئے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ آج پاکستان اس قدر خطرات میں ہے کہ وہ ابھی باتوں سے کام نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر باتوں سے ہم رام نہ ہوئے تو خدانخواستہ خدانخواستہ اس ملک کو بھی وہ اپنے حملوں کی زد میں لا سکتے ہیں، لیکن یہ برداشت کبھی نہیں کریں گے کہ پاکستان یا کوئی اسلامی ملک فوجی اور دفاعی لحاظ سے خودکفیل ہو۔

آج دیکھیے، اتنی بڑی بات کہ آپ ایٹمی تنصیبات ختم کر دیں، آپ کا ایٹمی دفاع ہم کریں گے، جیسا کہ عربوں کا دفاع کر رہے ہیں اسی طرح ہمارا دفاع بھی کریں گے، جیسے کہ عربوں کو بے بس کر دیا ہے۔ عرب ممالک بے بس ہیں لاچار ہیں مجبور ہیں کہ امریکہ کی فوجیں قبول کریں، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ان کیلئے کہ امریکہ کی فوجیں قبول کریں اور اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیں۔ آج پاکستان کیلئے بھی یہی تجویز لے کر آیا ہے امریکی کمانڈر انچیف کہ جناب آپ فوجی قوت کم کریں اور ایٹمی تنصیبات ختم کر دیں اور فوج کو ایک لاکھ پر لے آئیں۔ آپ کو ایک لاکھ فوج سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے، باقی آپ کا دفاع ہم کریں گے۔ آپ کو ضرورت پیش آئی تو ہماری فوج آئے گی، ہمارا اسلحہ آئے گا، ہم دفاع کریں گے۔ چوتھا نقطہ آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ پالیسی طے شدہ ہے کہ دنیائے اسلام کا کوئی ملک فوجی اعتبار سے خودکفیل نہ ہو سکے، اتنا طاقتور نہ ہو کہ آپ کیلئے خطرہ

بن سکے۔

ان بنیادوں پر دنیا کی طاقتیں آگے بڑھ رہی ہیں، اور ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے اگرچہ مشکل ہے اور میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اسی اسٹیج پر محسوس کر رہا ہوں جس سٹیج پر ہم ۱۸۵۷ء کی ناکامیوں کے بعد تھے۔ ہمیں اپنی دین اور قوت کو مضبوط کرنا ہے، اپنے آپ کو نظریاتی لحاظ سے مضبوط کرنا ہے، اور جذبہ جہاد کو مسلمانوں کے دلوں میں اجاگر کرنا ہے۔ جتنا ہم نظریہ اور فکر کے لحاظ سے اسلام میں پختہ ہوں گے، جتنا ہمارے اندر جہاد کا جذبہ بیدار ہو گا ان شاء اللہ سارے مسائل حل ہوں گے۔ ان ساری قوتوں کا ہم سامنا کریں گے لیکن اسلام کے ساتھ لازوال وابستگی، فکری وابستگی۔ لیکن جب میں آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں تو اس سے میری مراد جذباتی وابستگی نہیں ہوتی، شعوری وابستگی ہوتی ہے۔ میری گستاخی معاف فرمائیں علماء اور طلباء کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ ہم علماء کہلانے والے اور طلبہ کہلانے والے حضرات کی بھی ۹۰ فیصد کی وابستگی اسلام کے ساتھ شعوری نہیں ہے، عقیدہ اور جذبات کی وابستگی ہے۔

- ہمیں نہیں معلوم اسلامی نظام کیا ہے،
- ہمیں نہیں معلوم کہ سود کا متبادل نظام ہمارے پاس کیا ہے،
- ہمیں نہیں معلوم کہ سیاسی نظام کے خدوخال کیا ہیں۔

نوے فیصد کی بات کر رہا ہوں، اکابر کی بات نہیں کر رہا، اپنے جیسوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہمیں نہیں معلوم، ہم نہیں جانتے، نہ ہم پڑھتے ہیں، نہ ہمیں پڑھایا جاتا ہے، نہ ہم مطالعہ کرتے ہیں، نہ ہمیں ترغیب دی جاتی ہے، نہ ہماری ذہن سازی ہوتی ہے۔ ہماری وابستگی اسلام کے ساتھ شعوری نہیں ہے، فکری نہیں ہے، بلکہ عقیدت اور جذبات کی وابستگی ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ سب سے پہلے اسلام کے ساتھ، قرآن اور سنت کے ساتھ، اسلام کے نظام کے ساتھ شعوری وابستگی پیدا کیجئے، اس کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، دنیا کے حالات کا مطالعہ کیجئے، اپنے جذبہ جہاد کو نیو ورلڈ آرڈر، جو عالم اسلام کے خلاف ایک سازش ہے، اجاگر کیجئے، بیدار کیجئے، اس کو وسعت دیجئے، یہی ایک حل ہے ان شاء اللہ، دینی قوتیں بیدار ہوں گی، متحد ہوں گی تو پہلے بھی کفر کو شکست ہوئی ہے، آج بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کفر کو شکست ہوگی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

"یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی"

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۲ء

علامہ محمد اقبالؒ نے افغانستان پر برطانوی استعمار کی یلغار کی ناکامی پر فرنگیوں کے جذبات کی عکاسی ان الفاظ سے کی تھی۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

مگر جب افغانیوں کی غیرتِ ملی کا ترجمان اور محافظ ملّا فرنگی استعمار کے ہاتھوں افغانستان کے کوہ و دمن سے جلاوطن نہ ہو سکا تو یہ دردِ سر روسی استعمار نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ اور یہ سوچ کر افغانستان کو ملّا اور اس کے دین و ثقافت سے نجات دلانے پر کمر باندھ لی کہ برطانوی استعمار کی کامیابی کی راہ میں شاید جغرافیائی فاصلے رکاوٹ بن گئے ہوں اور روس اور افغانستان کے درمیان ان فاصلوں کا فقدان اس مشن میں روس کی کامیابی کی ضمانت بن جائے۔ روحانی اقدار اور اخلاقی روایات کی کارفرمائی کے منکر سوویت حکمرانوں کی نظر اس "ظاہر" سے آگے نہ جا سکی اور ایمان و یقین، عزیمت و استقامت اور وارفتگی و شیدائیت کی وہ ٹھوس رکاوٹیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں، جن سے ٹکرانے کی عبرتناک سزا سوویت یونین کے افغانیوں کے سامنے سپر انداز ہونے اور پھر ریت کی دیوار کی طرح بکھرتے چلے جانے کی صورت میں تاریخ عالم کا ناقابل فراموش حصہ بن چکی ہے۔

مسجد کی چٹائیوں میں مانگے تانگے کی روٹیوں کو الحمد اللہ کہہ کر حلق سے اتار کر قال اللہ و قال الرسولؐ کا درس حاصل کرنے والے اس ملّا کو تہذیب مغرب کے پرستاروں نے کون کونسے طعنے سے نہیں نوازا؟ اسے رجعت پسند، دقیانوسی، بنیاد پرست، کٹ ملا، عقل و شعور سے عاری، ہٹ دھرم، اندھا مقلد، لکیر کا فقیر، اور جمود ذہنی کا شکار جیسے القابات دیے گئے، اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا دروازہ اس پر بند کر کے اسے "اچھوت" بنانے کی اجتماعی مہم چلائی گئی۔ لیکن وقت آنے پر وہی ملّا افغانیوں کی غیرت ملی کا عنوان بن کر ابھرا اور اپنے ایمان و یقین کی قوت کے ساتھ روسی استعمار کی یلغار کے سامنے سد سکندری بن گیا۔ آج افغان مجاہدین کی کامیابی پر بارگاہ ایزدی میں پوری امت اسلامیہ سجدہ ریز ہے اور جہاد افغانستان کے ثمرات و نتائج کی فہرست بن رہی ہے۔ سوویت یونین کا خاتمہ، مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی، افغانستان کی آزادی اور پورے عالم اسلام میں جہاد کے جذبات کا فروغ ان ثمرات میں سرفہرست نظر آ رہے ہیں۔ لیکن ہمیں افغان مجاہدین کے مقدس خون کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ایک اور فیصلہ بھی لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے، ملتِ اسلامیہ کو اقبالؒ کا شاہین مل گیا ہے اور اقبال کا مردِ مومن اپنے چہرے سے تاریخ کی گرد جھاڑ کر قوم کے سامنے آکھڑا ہوا ہے، اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، اور وہ کابل کی پل خشتی کی مسجد کی بوسیدہ چٹائیوں پر کھڑا تہذیب مغرب کے اندھیروں میں سرگرداں امت مسلمہ کو آواز دے رہا ہے کہ ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

افغانستان میں پانچ دن

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۲ء

حرکۃ الجہاد الاسلامی پاکستان کی دعوت پر مجھے ملک کے سرکردہ علماء کرام کے ایک وفد کے ہمراہ ۳۱ مئی سے ۴ جون تک پانچ روز افغانستان کی سرزمین پر گزارنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل بھی چودہ سالہ افغان جہاد کے دوران حرکۃ الجہاد الاسلامی اور حرکۃ المجاہدین کی دعوت اور پروگرام کے مطابق ارگون، باڑی، راغبیلی، ژاور اور خوست کے دیگر محاذوں پر کئی بار گیا ہوں لیکن جہاد افغانستان کی کامیابی اور مجاہدین کی باقاعدہ حکومت کے قیام کے بعد یہ میرا پہلا دورۂ افغانستان تھا۔ حرکۃ الجہاد الاسلامی پاکستان کے غیور نوجوانوں کی تنظیم ہے جس میں زیادہ تر دینی مدارس کے طلبہ اور نوجوان علماء شامل ہیں، اس کے بانی فیصل آباد کے ایک پرجوش نوجوان مولانا ارشاد احمد شہیدؒ تھے جنہوں نے جہاد افغانستان کا آغاز ہوتے ہی پاکستان کے علماء اور دینی مدارس کے طلبہ میں یہ مہم شروع کر دی کہ ہمیں اپنے افغان بھائیوں کی مدد کیلئے ان کے ساتھ عملاً شریک جہاد ہونا چاہیے۔ یہ اس نوجوان کے خلوص کی برکت تھی کہ وہ بہت جلد نوجوان علماء اور طلبہ کو اس مقصد کی طرف توجہ دلانے میں کامیاب ہوگیا اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم وجود میں آگئی۔ اس تنظیم نے ارگون، خوست، جلال آباد اور دیگر محاذوں پر افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیا اور سینکڑوں پاکستانی نوجوان اس جہاد میں عروسِ شہادت سے ہمکنار ہوئے جن میں خود مولانا ارشاد احمد شہیدؒ، حرکۃ الجہاد الاسلامی کے کمانڈر خالد زبیر شہیدؒ اور میرا بھانجا حاجی عدیل عمران شہیدؒ بھی شامل تھے۔

مولانا ارشاد احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد یہ تنظیم دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ حرکۃ الجہاد الاسلامی کے نام سے مولانا قاری سیف اللہ اختر کی قیادت میں مصروف جہاد رہا اور دوسرا حصہ حرکۃ المجاہدین کے نام سے مولانا فضل الرحمن خلیل اور مولانا محمد فاروق کشمیری کی قیادت میں جہاد کے مختلف محاذوں پر سرگرم ہوگیا۔ ان تنظیموں کا جہاد افغانستان میں بلاشبہ بہت بڑا حصہ ہے اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جنگ میں اگلے مورچوں اور مشکل مقامات پر یہ پاکستانی علماء اور طلبہ رہتے تھے اور افغان کمانڈر مشکل مورچے ان کے حوالے کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ اب ان مورچوں پر کسی مزید توجہ کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جہاد افغانستان کے مختلف محاذوں پر ان تنظیموں کے ذریعے شریک جہاد ہونے والے پاکستانی علماء، طلبہ اور نوجوانوں کی تعداد بیس ہزار سے متجاوز ہے جن میں سینکڑوں شہداء اور ہزاروں مجروحین بھی شامل ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جہاد افغانستان کے دوران پہلی بار ارگون کے محاذ پر جانے کا موقع بھی حرکۃ الجہاد الاسلامی کے ذریعے ملا اور مجاہدین کی کامیابی کے بعد آزاد افغانستان کا پہلا سفر بھی حرکۃ الجہاد الاسلامی کی دعوت و اہتمام کے ساتھ ہوا جس کے امیر اس وقت حیدر آباد سندھ کے نوجوان عالم دین مولانا سعادت اللہ خان اور ناظم عمومی مولانا عبد الحمید عباسی ہیں اور دونوں حضرات اس سفر میں ہمارے ہمراہ تھے۔ افغانستان جانے والے پاکستانی علماء کے وفد میں ساٹھ سے زیادہ علماء شامل تھے جن میں مولانا سید انور حسین نفیس رقم، مولانا فداء الرحمن درخواستی، مولانا قاضی عبد الکریم آف کلاچی،

علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا نور محمد آف وانا، مولانا قاضی عصمت اللہ، مولانا قاضی محمد یونس انور، مولانا سجاد بخاری، مولانا حمید الرحمان عباسی، مولانا فیض احمد، مولانا عبد الحمید، مولانا محمد عالم، مولانا قاضی عطاء اللہ، مولانا محمد یعقوب ربانی، مولانا عبد الحمید قریشی، مولانا محمد انور، مفتی فخر الدین عثمانی، مفتی شیر محمد علوی، مولانا مفتی محمد عیسی خان، مولانا شاہ محمد، مولانا لطیف الرحمان، مولانا وکیل احمد شیروانی، مولانا محمد یوسف، مولانا ارشد حسن ثاقب، حاجی امیر نواز خان ایڈووکیٹ، مولانا میاں عبد الرحمان اور حاجی غلام علی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۳۱ مئی اتوار کو ہم تقریباً ایک بجے طور خم سے سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہوئے، ویزے کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی کاغذی کاروائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا البتہ حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا سعادت اللہ خان نے متعلقہ حکام سے ملاقات کر کے انہیں آگاہ کیا کہ پاکستانی علماء کا وفد کابل جا رہا ہے اور وفد کے ارکان کی فہرست بھی انہیں فراہم کر دی۔ طورخم کی سرحد پر اپنے وطن واپس جانے والے افغان مہاجرین کی گہما گہمی تھی جو اپنی ہجرت اور جہاد میں کامیابی پر شاداں و خرماں وطن واپس لوٹ رہے تھے۔ متعلقہ حکام سے معلوم ہوا کہ اس راستے سے روزانہ اوسطاً چار سو خاندان واپس جا رہے ہیں لیکن مہاجرین نے شکایت کی کہ مغرب کے وقت واپسی کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بعد وہاں پہنچنے والے بیسیوں خاندانوں کو روزانہ رات سرحد پر گزارنا پڑتی ہے جو خاصی پریشان کن بات ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ سرحد پر پاکستانی عملہ معمول کے مطابق ہے جو صبح سے شام تک واپس جانے والے خاندانوں کا اندراج کرتا ہے، اگر عملہ ڈبل کر دیا جائے اور دو شفٹوں کی صورت میں اوقات کار بڑھا دیے جائیں تو اس شکایت کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ایسا کیا جا رہا ہو اور مغرب کے بعد قافلوں کا سفر کرنا مصلحت کے خلاف تصور کیا گیا ہو لیکن کابل تک جاتے ہوئے اور واپسی پر راستہ میں اس کی کوئی وجہ ہمیں نظر نہیں آئی۔

قافلہ تقریباً ساڑھے تین بجے جلال آباد پہنچا جو اس راستہ میں افغانستان کا پہلا شہر ہے اور کابل سے پہلے مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا۔ یہاں مولوی محمد یونس خالص کی حزب اسلامی کے حاجی عبد القدیر عبوری حکومت کی طرف سے گورنر ہیں اور یہ صوبہ ننگرہار کا صدر مقام ہے۔ ہم نے سپین غر ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلال آباد سے کابل تک سڑک کے دونوں طرف ٹینکوں اور گاڑیوں کے بے شمار تباہ شدہ ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں جو افغان مجاہدین کی عزیمت و استقامت کا عنوان نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کابل سے جلال آباد کیلئے کمک کے طور پر ہزاروں گاڑیوں پر مشتمل کانوائے کی صورت میں طاقت کے بھرپور مظاہرہ کے ساتھ آتے تھے لیکن راستہ میں مجاہدین سڑک پر بارودی سرنگیں بچھا کر اور پل تباہ کر کے اس کانوائے کے جلال آباد پہنچنے اور کابل واپس جانے کے راستے مسدود کر دیتے اور پھر مزے سے ٹینکوں اور گاڑیوں کا شکار کرتے۔ عام حالات میں پشاور سے کابل کا سفر چھ گھنٹے کا بیان کیا جاتا ہے لیکن سڑک مکمل طور پر تباہ ہے، پل ٹوٹے ہوئے ہیں اور ٹینکوں کے چلنے سے جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے ہیں اس لیے ہم تقریباً ساڑھے چار بجے جلال آباد سے چل کر رات ایک بجے کے قریب کابل میں داخل ہوئے۔ راستہ میں جگہ جگہ ان تباہ شدہ بستیوں کا منظر دیکھا جو کابل حکومت کی وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ جس بستی کے بارے میں یہ پتہ چلتا کہ وہاں کوئی مجاہد موجود ہے بمباری کر کے اس پوری بستی کو تباہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ

سڑک کے دونوں طرف ایسی بستیوں کے کھنڈرات سوویت یونین (آنجہانی) اور اس کے حواریوں کی وحشت و بربریت کا ماتم کر رہی ہیں۔

کابل میں ہم وزارت مذہبی امور کے مہمان تھے اور ہمارے لیے انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا گیا۔ عبوری حکومت کے وزیر مذہبی امور مولانا ارسلان رحمانی ہیں جن کا تعلق افغانستان میں علماء کی سب سے بڑی جماعت حرکت انقلاب اسلامی سے ہے۔ مولانا ارسلان رحمانی صوبہ پکتیا اور ارگون چھاؤنی کے فاتح ہیں اور اپنے علاقے کو کابل کی کمیونسٹ حکومت سے آزاد کرنے کا یہ ہدف انہوں نے دو سال قبل حاصل کر لیا تھا۔ دیکھنے میں سیدھے سادے مولوی لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی دینی مدرسہ میں سبق پڑھا کر آ رہے ہیں لیکن ان کا شمار مجاہدین کے چند جی دار کمانڈروں میں ہوتا ہے اور دشمن کے حلقوں میں انہیں "خونخوار مولوی" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

یکم جون کو ہمیں کابل کے مختلف حصوں کی سیر کرائی گئی۔ سب سے پہلے ہم پل خشتی کی تاریخی مسجد میں گئے اور جہاد افغانستان کی کامیابی پر شکرانہ کے نوافل ادا کیے۔ صحابیِ رسولؐ حضرت تمیم انصاریؓ اور تابعی حضرت لیث بن قیس بن عباسؒ کے مزارات پر گئے۔ کابل میں اسلام حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں پہنچ گیا تھا اور یہاں متعدّد صحابہ کرامؓ کی قبروں کی موجودگی بیان کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے مزارات کے ساتھ مساجد بھی ہیں۔ حضرت لیث بن قیسؒ کو یہاں شاہ دو شمشیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کی مسجد بھی اسی نام سے معروف ہے۔

مغرب کی نماز ہم نے مجددی خاندان کی معروف خانقاہ کی مسجد میں پڑھی اور حضرت نور المشائخ فضل عمر رحمہ اللہ تعالیٰ کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ یہ خاندان جو "ملا شور بازار" کے نام سے متعارف ہے مجاہدانہ اور تاریخی کردار کا حامل خاندان ہے اور مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پنجاب پر سکھوں کے تسلط کے وقت جب سرہند شریف میں جہاں مجدد الف ثانیؒ کی قبر ہے سکھ حکومت کے مظالم حد سے بڑھے تو یہ خاندان وہاں سے ہجرت کر کے کابل آ گیا اور نقشبندی سلسلہ کی خانقاہ آباد کی۔ افغانستان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں میں نقشبندی سلسلہ کے وسیع اثرات ہیں۔ جماعت اسلامی کے امیر جناب قاضی حسین احمد سے ایک مجلس میں یہ سنا کہ وسطی ایشیا کی ریاستوں میں جبر کے ستر سالہ دور میں عام مسلمانوں کا تعلق اسلام کے ساتھ قائم رکھنے میں سب سے اہم اور بنیادی کردار نقشبندی سلسلہ کے صوفیاء نے ادا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ یہ کابل کی اسی نقشبندی خانقاہ کا فیض ہے۔ افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ پروفیسر صبغت اللہ مجددی کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ یہ خاندان ہمیشہ جرأت واستقامت کی علامت رہا ہے اور ہر دور میں حکمران اس کے اثر و رسوخ سے خائف رہے ہیں۔ امان اللہ خان کے دور کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز دربار میں اس نے ایک سے زیادہ بیویوں کی شرعی اجازت پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ کا ذکر اس انداز سے کیا جس سے معاذ اللہ اہانت رسولؐ کا پہلو نکلتا تھا۔ نور المشائخ حضرت فضل عمرؒ جو وہاں موجود تھے فوراً کھڑے ہوئے اور تمام درباری آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ امان اللہ! اگر بقصد گفتی کافر شدی (اے امان اللہ! اگر تو نے یہ جملہ ارادتاً کہا ہے تو کافر ہو گیا ہے)۔ یہ جملہ کہتے ہی حضرت نور المشائخ دربار سے نکلے اور کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔ پھر جب افغانستان پر برطانوی استعمار نے حملہ کیا تو اپنے وطن کو انگریزوں سے

آزاد رکھنے کے عزم کے ساتھ وطن واپس چلے گئے اور جنگ استقلال وطن میں سرگرم کردار ادا کیا۔

اس دور میں دہلی کی برطانوی حکومت نے پورا زور لگایا کہ کسی طرح حضرت نور المشائخ کو کابل جانے سے روکا جائے لیکن وہ کسی نہ کسی طریقہ سے ان کی کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے کابل پہنچ گئے۔ کابل کی اس نقشبندی خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین فضل المشائخ حضرت ابراہیم جان مجددی ہیں جنہیں کمیونسٹ انقلاب (انقلاب ثور) کے پہلے روز ہی خانقاہ میں موجود دو سو افراد سمیت گرفتار کرلیا گیا تھا اور خبر یہ تھی کہ ان سب کو شہید کردیا گیا ہے۔ لیکن اب یہ خوشگوار خبر کابل میں ملی کہ حضرت فضل المشائخ مدظلہ العالی اپنے رفقاء سمیت بحمد اللہ تعالیٰ زندہ ہیں اور وسطی ایشیا کی ریاست ازبکستان میں کسی مقام پر نظر بند ہیں۔ اس خبر نے بلاشبہ ہمارے دورۂ کابل کی خوشیوں کو دوچند کردیا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ حرکت انقلاب اسلامی کے راہنما مولانا نصر اللہ منصور نے بتایا کہ بہت جلد ایک سرکاری وفد ازبکستان جارہا ہے جو ان مجاہدین آزادی کی رہائی اور وطن واپسی کا اہتمام کرے گا۔ اس عظیم خانوادہ کی داستان عزیمت کے حصار سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے کہ یہ رپورٹ اس سے زیادہ تذکرہ کی متحمل نہیں ہے، بہرحال میرے لیے وہ لمحات زندگی کے چند گنے چنے پرمسرت لمحات میں سے ہیں جو اس خانقاہ میں گزرے۔

ہمارے قافلہ نے کابل میں جنگی اسلحہ کا میوزیم بھی دیکھا جہاں برطانوی استعمار کے خلاف جنگ میں استعمال ہونے والا اسلحہ بطور یادگار رکھا گیا ہے اور موجودہ جنگ میں استعمال ہونے والے چند ہوائی جہاز، توپیں، ٹینک اور گاڑیاں بھی ہیں۔ شام کا وقت تھا میوزیم کا گیٹ بند تھا اس لیے اندر رکھا ہوا اسلحہ ہم نہ دیکھ سکے اور باہر کھلی جگہ پڑی ہوئی چیزیں دیکھیں جن میں ”ٹینک ۸۱۵“ بھی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ انقلاب ثور میں جنرل اسلم وطن یار نے صدارتی محل پر قبضہ کرنے کیلئے پہلا گولہ اسی ٹینک سے چلایا تھا اور پھر اس ٹینک کو انقلاب کی یادگار کے طور پر شہر کے ایک چوک میں کھڑا کردیا گیا تھا۔ اب یہ ٹینک میوزیم میں ہے اور انقلاب ثور کی عبرتناک موت پر آنسو بہا رہا ہے۔ ہم نے کابل کا وہ چوک بھی دیکھا جسے خان عبد الولی خان صاحب کی سرگرمیوں کے حوالے سے ”پشتونستان چوک“ کہا جاتا تھا اور وہاں پشتونستان کا پرچم چند روز قبل تک لہراتا رہا ہے لیکن اب وہاں حرکۃ الجہاد الاسلامی کا پرچم پوری آب و تاب کے ساتھ لہرا رہا ہے۔

۲ جون کو مختلف راہنماؤں کے ساتھ ہماری ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ سب سے پہلے مولانا ارسلان رحمانی ہوٹل میں آئے اور مہمان حضرات سے ملاقات کی، ہوٹل کے ہال میں ایک مختصر تقریب ہوئی جس میں وفد کی طرف سے مولانا نور محمد آف وانا نے مولانا ارسلان رحمانی کو جہاد افغانستان کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی اور مولانا رحمانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاد افغانستان میں حرکۃ الجہاد الاسلامی اور پاکستان کے علماء کے کردار کو سراہا اور کہا کہ ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ پاکستانی علماء کی پشت پناہی ہے اور ہم ہمیشہ علماء پاکستان کے احسان مند رہیں گے۔ اس کے بعد یہ قافلہ مولانا ارسلان رحمانی کی راہ نمائی میں حرکت انقلاب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔

حرکت انقلاب اسلامی افغانستان میں علماء کی سب سے بڑی تنظیم ہے جس کے سربراہ مولانا محمد نبی محمدی ہیں۔ مولانا موصوف افغانستان کے سربرآوردہ عالم دین ہیں، ظاہر شاہ کے دور میں پارلیمنٹ کے رکن رہ چکے ہیں، انتہائی مدبر اور زیرک ہیں، باوقار اور سنجیدہ مزاج کے حامل ہیں۔ جہاد افغانستان کے چودہ سالہ دور میں ان کی جماعت تین حصوں میں

بٹ گئی تھی لیکن اب پھر متحد ہو گئی ہے۔ متعدّد صوبوں میں ان کی جماعت کو مکمل کنٹرول حاصل ہے اور عبوری حکومت میں بھی اسے معقول نمائندگی حاصل ہے۔ کمیونسٹ پارٹی جو پہلے خلق پارٹی اور پرچم پارٹی کے نام سے تقسیم تھی اور بعد میں ڈاکٹر نجیب اللہ نے وطن پارٹی کے نام سے اسے متحد کر دیا تھا اس کا ہیڈ کوارٹر مولانا محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی کے حصہ میں آیا ہے، یہ ہیڈ کوارٹر پانچ منزلہ بلڈنگ میں ہے جس میں دو سو کے قریب کمرے ہیں اب وہاں حرکت کا دفتر ہے۔ جس ہال میں ڈاکٹر نجیب اللہ حکمران پارٹی کے اجلاسوں کی صدارت کیا کرتا تھا وہاں اب مولانا محمد نبی حرکت انقلاب اسلامی کے اجلاسوں کی صدارت کرتے ہیں اور ہماری ان سے ملاقات بھی اسی ہال میں ہوئی۔

مولانا محمد نبی سے پہلے ہماری ملاقات ان کے نائب مولانا نصر اللہ منصور سے ہوئی جن سے چودہ سالہ جہاد آزادی کے دوران بھی کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ مجاہد عالم دین اپنے جوش و جذبہ اور انقلابی مزاج کے باعث ”اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش“ کی عملی تصویر بنا رہا ہے۔ امریکہ نے اپنے مفادات کی خاطر افغان مجاہدین کی امداد کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا منصور اس کے کئی تقاضوں کو ہضم نہ کر سکے۔ ان کا دھڑا اس وقت مولانا محمد نبی محمدی سے الگ تھا۔ نصر اللہ منصور کی حرکت انقلاب اسلامی کی امداد بند کر دی گئی اور ان کے ساتھی مجبور ہو کر ان سے الگ ہوتے رہے مگر مصائب و مشکلات کا یہ دور ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ پیدا کر سکا۔ انہوں نے پاکستانی علماء کے قافلہ سے خطاب کیا اور جہاد افغانستان میں پاکستانی علماء اور طلبہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے اسے سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ علماء نے اپنے شاگردوں اور معتقدین کی تربیت اور ذہن سازی کی اور نوجوان ان کے کہنے پر جہاد افغانستان میں شریک ہوئے جس پر پوری افغان قوم علماء پاکستان کی شکر گزار ہے۔

مولانا محمد نبی محمدی اپنے مخصوص باوقار انداز میں ہال میں تشریف لائے اور تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ مولانا نصر اللہ منصور نے مہمانوں کا تعارف کرایا، مولانا نور محمد نے وفد کی طرف سے مبارک باد اور اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے تعاون کے جذبات کا اظہار کیا۔ وفد میں شام کے ایک عالم دین الشیخ احمد الزبیدی بھی تھے جو شام کے سیکولر حکومت کے مظالم کے باعث ہجرت کر کے گذشتہ چودہ سال سے پاکستان میں مقیم ہیں، انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور یہ کہہ کر اہل محفل کے دلی جذبات کی ترجمانی کی کہ آپ حضرات نے چودہ سال تک جو جنگ کی ہے وہ جہاد اصغر تھا، اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی دی ہے وہ مبارک ہو لیکن اب آپ جہاد اکبر کی طرف آ گئے ہیں۔ آپ کا اصل جہاد اب شروع ہوا ہے اور وہ صدیوں کے بعد اسلام کے اپنے نظام حکومت کا احیاء ہے، ایک خالص اسلامی ریاست کا قیام ہے اور خلافت اسلامیہ کی بحالی ہے۔ ہم پہلے جہاد میں بھی آپ کے ساتھ تھے اور اس جہاد میں بھی آپ کے ساتھی ہیں۔
مولانا محمد نبی محمدی نے وفد کا شکریہ ادا کیا، جہاد افغانستان میں پاکستان کے عوام، علماء اور حکومت کے کردار کو سراہا اور یقین دلایا کہ افغانستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ ہو گا اور جہاد افغانستان کا اصلی ہدف پورا کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر، فلسطین، برما اور دیگر علاقوں میں ہمارے جو مسلمان بھائی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں انہیں ہماری مکمل حمایت حاصل ہو گی اور ہم اپنے حالات پر قابو پانے کے بعد اپنے ان مظلوم بھائیوں کی امداد کی طرف سنجیدہ توجہ دیں گے۔

ہمارے وفد کی دوسری ملاقات افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ پروفیسر صبغت اللہ مجددی سے ہوئی۔ وہ

قصر صدارت میں قیام پذیر ہیں، یہ محل ظاہر شاہ کے دور میں بنا جو پہلے "قصر گل خانہ" کہلاتا تھا، پھر بادشاہت کے خاتمہ کے بعد قصر صدارت کے نام سے متعارف ہوا۔ یہ محل ظاہر شاہ، محمد داؤد، نور محمد ترہ کئی، حفیظ اللہ امین، ببرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور دیکھ چکا ہے اور اب مجددی صاحب کے تصرف میں ہے۔ مجددی صاحب ملاقات کیلئے تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے پیشرو حضرات کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کرسی پر پہلے وہ بیٹھا کرتے تھے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "خدا خیر کرے"۔ بہرحال اس تقریب میں بھی مولانا نور محمد نے پاکستانی علماء کے وفد کی ترجمانی کی اور تشکر و تبریک کے بعد علماء پاکستان کی طرف سے ایک عرضداشت صدر افغانستان کے حضور پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ

1. مجاہدین کی مختلف جماعتوں کے درمیان یکجہتی اور اتحاد کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔
2. نسلی، علاقائی اور لسانی تفریق کی سازشوں سے افغانستان کو بچاتے ہوئے قومی وحدت اور ملکی سالمیت کے تحفظ کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔
3. مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور مغرب و مشرق کے اثرات سے محفوظ رہتے ہوئے خالص اسلامی نظام حکومت کی تشکیل و نفاذ کو اولیت دی جائے۔

عرضداشت میں حکومت افغانستان کو یقین دلایا گیا ہے کہ جہاد افغانستان کی طرح نفاذ اسلام میں بھی علماء پاکستان مکمل طور پر افغان بھائیوں کے پشتیبان ہوں گے۔

پروفیسر صبغت اللہ مجددی نے جوابی تقریر میں جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کا ذکر کیا اور بتایا کہ انہوں نے چالیس سال قبل ظاہر شاہ کے دور میں اس مہم کا آغاز کیا تھا کہ افغانستان کو کمیونزم کے اثرات سے بچایا جائے، اس مقصد کیلئے انہوں نے "جمعیت علماء محمدی" قائم کی اور پورے ملک میں علماء کرام کو منظم کیا۔ جس دور میں داؤد خان وزیراعظم تھے روسی وزیراعظم خروشیف کی کابل آمد کے موقع پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور وہ ساڑھے چار سال جیل میں رہے اس دوران ایک سال انہوں نے تہہ خانہ میں گزارا اور پورا سال سورج نہیں دیکھا۔ پھر رہائی کے بعد وہ جلاوطن ہو گئے اور مختلف ممالک میں وقت گزارتے ہوئے کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اسلامی سنٹر قائم کیا اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر جب افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف جہاد کا آغاز ہوا تو وہ پاکستان آ گئے اور جہاد میں شریک ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد افغانستان کا مقصد ہی اسلامی حکومت کا قیام ہے اگر ہم خدانخواستہ ایسا نہ کر سکے تو ہماری چالیس سالہ جدوجہد ضائع ہو جائے گی اس لیے ہم مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی طرف بتدریج بڑھ رہے ہیں اور عبوری حکومت کے قیام کے ساتھ ابتدائی طور پر چند اقدامات کیے گئے ہیں:

1. شراب اور منشیات پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی ہے اور بازاروں میں موجود شراب اور منشیات کے ذخیرے ضائع کر دیے گئے ہیں۔
2. پردے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے، چنانچہ کابل میں جہاں نوجوان عورتیں سکرٹ پہن کر بازاروں میں گھوما کرتی تھیں اب شرعی حجاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ اسی طرح ملازمت کرنے والی خواتین کو بھی

پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ شرعی پردے کے ساتھ کام پر آئیں۔

3. مختلف سطح پر علماء کو قاضی مقرر کیا جا رہا ہے اور عدالتوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کریں۔

4. سکولوں اور کالجوں میں کمیونسٹ حکومت کا نصاب ختم کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ علماء پاکستان کی مشاورت کے ساتھ تعلیم کا اسلامی نصاب مرتب کر لیا گیا ہے جس کے مطابق کتابیں چھپ گئی ہیں اور بہت جلد سکولوں میں تقسیم کی جا رہی ہیں۔

5. روس کے ساتھ کابل حکومت نے جتنے معاہدے کیے تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے ہیں اور ہم نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں حکومتی ڈھانچے کی تشکیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے، ہم اس کیلئے ایک کمیشن قائم کر رہے ہیں جس میں عرب ممالک اور پاکستان کے علماء کو بھی شریک کیا جائے گا اور اسلامی نظام حکومت کا ایک متفقہ ڈھانچہ تشکیل دے کر اس کی بنیاد پر افغانستان کا دستور طے کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مشرق و مغرب کے اثرات سے پاک ایک ایسے نظام حکومت کی تشکیل چاہتے ہیں جو اسلام کے مساوات، معاشرتی انصاف اور جمہوری حقوق کے اصولوں پر مبنی ہو اور ہم بہت جلد ایسا ڈھانچہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پروفیسر صبغت اللہ مجددی کو شکوہ ہے کہ انہیں وقت بہت کم دیا گیا ہے کہ دو ماہ میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی لابی ان کے ارد گرد کام کر رہی ہے جس کا مقصد عبوری حکومت کے سربراہ کو اس بات پر اڑ جانے پر آمادہ کرنا ہے کہ اسلام میں عبوری حکومت کا کوئی تصور نہیں ہے اور جو ایک بار اقتدار پر آجائے اسے شرعی عذر کے بغیر معزول نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بزرگ نے ان سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ امامت کے انعقاد کیلئے تمام گروہوں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت علیؓ کی خلافت تمام گروہوں کے اتفاق کے بغیر ہی منعقد ہو گئی تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے والے افغان مجاہدین کے خیر خواہ نہیں ہیں کیونکہ ان باتوں کا نتیجہ افغان مجاہدین میں اختلاف کو بڑھانے اور نتیجتاً افغان قوم کو ایک طویل خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ جہاد افغانستان میں حضرت پروفیسر صبغت اللہ مجددی کی شخصی اور خاندانی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف کے طور پر کمیونسٹ حکومت سے اقتدار وصول کرنے کا جو اعزاز انہیں ملا ہے اسے تاریخ میں اعزاز کے طور پر ہی محفوظ ہونا چاہیے، اس میں وقت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ چند روز یا چند سال مزید صدر رہنے کی بجائے اقتدار سے اپنے وقت پر معاہدہ کے مطابق عزت و وقار کے ساتھ دستکش ہو جانے سے انہیں جو مقام حاصل ہو گا وہ صدارت کے رسمی منصب سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہو گا اور ہمیں امید ہے کہ جناب مجددی چند لوگوں کے غلط مشورے کو قبول کر کے اپنے اس تاریخی اعزاز کو ضائع نہیں کریں گے۔

پاکستانی علماء کی وفد کی ملاقات عالمی شہرت کے حامل گوریلا کمانڈر اور عبوری حکومت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود

سے بھی ہوئی جو کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ تقریباً ہم سب کو پہلی بار اس مجاہد نوجوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو مسلسل چودہ سال تک روس اور اس کے حواریوں کے اعصاب پر چھایا رہا ہے اور اب یکلخت پینترا بدل کر مغربی میڈیا کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ احمد شاہ مسعود نے جس دھیمے اور منطقی انداز میں علماء کے سامنے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کی اس نے تمام شرکاء محفل کو یکساں متاثر کیا اور اس کی تواضع وانکساری اور علماء کے ساتھ عقیدت و محبت کے بلا تکلف اظہار نے اس کی شخصیت کے بارے میں پائے جانے والے کئی شکوک و شبہات خود بخود تحلیل کر دیے۔ احمد شاہ مسعود کے ساتھ ملاقات کی تقریب وزارت دفاع کے ہیڈ کوارٹر میں ہوئی۔ تقریب میں مولانا نور محمد آف وانا کے علاوہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے نائب امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی نے بھی خطاب کیا جن کے بارے میں اسی محفل میں انکشاف ہوا کہ وہ احمد شاہ مسعود کے استاذ زادہ ہیں۔ احمد شاہ مسعود نے خود بتایا کہ جہاد افغانستان کے آغاز سے قبل انہوں نے رمضان المبارک کے کچھ دن خانپور میں قیام کیا اور حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی دامت برکاتہم کے دورۂ تفسیر قرآن میں شرکت کی۔ چنانچہ اپنے استاذ زادہ کو جس عقیدت کے ساتھ احمد شاہ مسعود نے رخصت کیا وہ ان کی سعادت مندی کی علامت ہے۔ تقریب کے اختتام پر احمد شاہ مسعود نے اپنی سرکاری گاڑی میں مولانا فداء الرحمان درخواستی کو بٹھایا اور سرکاری گارڈ سے کہا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ ہوٹل تک چھوڑ کر آئے۔ یہ گاڑی ڈاکٹر نجیب اللہ کے زیر استعمال رہی ہے، مولانا درخواستی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سارا راستہ نم آلودہ آنکھوں کے ساتھ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرتے رہے۔

احمد شاہ مسعود نے اپنے تقریباً پون گھنٹے کے خطاب میں ان تمام سوالات کا جائزہ لیا جو ان کے بارے میں مغرب و مشرق کا میڈیا مسلسل اٹھا رہا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ہم لوگ جو سوالات کی ایک لمبی قطار ذہنوں میں سجائے اس محفل میں گئے تھے جب اس نوجوان کا خطاب مکمل ہونے پر ہم نے اپنے سوالات کا ترکش دیکھا تو اس میں کوئی تیر بھی قابل استعمال نہیں رہ گیا تھا۔ وزیر دفاع اور عبوری حکومت کے روح رواں انجینئر احمد شاہ مسعود نے کہا کہ اسلامی نظام کا نفاذ اور ایک مکمل اسلامی حکومت کا قیام دنیا کے ہر مسلمان کی خواہش ہے اور ہمارے جہاد کا مقصد بھی صرف اور صرف یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد افغانستان کے دوران انہیں جن علاقوں میں کنٹرول حاصل ہوا ان میں باقاعدہ اسلامی حکومتیں قائم کی گئیں اور شرعی احکام نافذ کیے گئے۔ ان کا اصول یہ رہا ہے کہ معاملات کے فیصلے قرآن و سنت کے ماہر علماء کریں اور انہوں نے ہر معاملہ میں علماء سے ہمیشہ راہنمائی حاصل کی ہے حتیٰ کہ کسی قیدی کی رہائی کا فیصلہ بھی انہوں نے خود کبھی نہیں کیا بلکہ علماء کے فیصلوں پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب روسی فوجیں افغانستان سے چلی گئیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ابھی کابل کی حکومت حاصل کرنے کیلئے دو اڑھائی برس لگیں گے اور گذشتہ سال انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اب نجیب حکومت بے بس ہو چکی ہے اور موسم گرما شروع ہونے کے بعد ہماری پیش قدمی ہو گی تو اس کیلئے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جائے گا۔ دونوں مواقع پر ان کی بات پر یقین نہیں کیا گیا لیکن عملاً وہی ہوا جو انہوں نے کہا تھا۔ پھر جب ہماری فوجی فتح کے آثار نظر آنے لگے تو مغربی طاقتوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور سیاسی حل کی تجویز سامنے آئی، ہم نے اسے مسترد کر دیا اور کہا کہ جو کام ہم نے جہاد کے ذریعے شروع کیا تھا اسے جہاد کے ذریعے ہی مکمل کریں گے۔ کیونکہ

مجھے یقین تھا کہ اسی سال ہماری کامیابی یقینی ہے اور موسم گرما کے شروع ہوتے ہی کابل ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ مجھے تین دفعہ مخلوط حکومت بنانے اور شریک اقتدار ہونے کی پیش کش کی گئی جو میں نے مسترد کر دی۔ پھر مغربی طاقتوں کی یہ سیہ کاریاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے مجاہدین کی بعض جماعتوں کو اقوامِ متحدہ کے فارمولا کے مطابق نام نہاد غیر جانبدار حکومت کیلئے نام دینے پر آمادہ کر لیا اور بعض نے نام بھی دے دیے۔ ہم نے قائدین سے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں ہم کابل کو فتح کریں گے اور کوئی سیاسی حل قبول نہیں کریں گے۔ ان حالات میں شمال کے مرکز مزار شریف میں سرکاری فوجوں میں باہمی اختلاف پیدا ہوا تو ہم نے اس سے فائدہ اٹھانے کی حکمت عملی اختیار کی تاکہ کابل کی طرف پیش قدمی کی صورت میں ہماری توجہ اس طرف سے ہٹائی نہ جا سکے۔ چنانچہ ہم نے سرکاری فوجوں کے باہمی جھگڑے سے فائدہ اٹھایا اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں ہمیں کامیابی ہوئی اور مزار شریف پر ہمارا کنٹرول ہو گیا۔

احمد شاہ مسعود نے کہا کہ پھر ہم نے کابل کی طرف پیش قدمی کی اور یہ بات بتانا ضروری ہے کہ میں نے کابل کی طرف پیش قدمی سے پہلے جناب گلبدین حکمت یار کی طرف نمائندے بھیجے اور ان سے کہا کہ آپ آئیں تاکہ ہم مل کر کابل پر حملہ کریں، وہ نمائندے آج بھی موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیں گے اور جناب حکمت یار بھی انکار نہیں کریں گے کہ ہم نے انہیں کابل پر مشترکہ حملہ کی دعوت دی جو انہوں نے قبول نہیں کی۔ چنانچہ میں نے اکیلے کابل پر چڑھائی کا فیصلہ کیا اور دو طرف سے آگے بڑھتے ہوئے ہم چاریکار اور بگرام کے مقام پر کابل کے دروازے پر آکر بیٹھ گئے۔ یہاں سے کابل میں داخل ہونا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا لیکن میں نے پشاور میں بیٹھے ہوئے قائدین سے کہا کہ آپ حضرات اجتماعی حکومت تشکیل دیں تاکہ ہم سب مل کر کابل میں داخل ہوں۔ چنانچہ میں دس روز تک چاریکار میں انتظار میں بیٹھا رہا اور جب تک پشاور میں عبوری حکومت کا فیصلہ نہیں ہو گیا اس وقت تک اپنا ایک آدمی بھی کابل کی طرف روانہ نہیں کیا۔

احمد شاہ مسعود نے کہا کہ اس دوران کابل انتظامیہ کی طرف سے وزیر خارجہ عبدالوکیل میرے پاس چاریکار میں آئے اور کہا کہ میں ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہو جاؤں۔ میں نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور کہا کہ میں آپ کو دو دن کی مہلت دیتا ہوں کہ آپ مجاہدین کے سامنے ہتھیار ڈال دیں چنانچہ صرف ایک دن کے بعد عبدالوکیل دوبارہ آئے اور تین دفعہ ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ہم ہتھیار ڈالتے ہیں ہم ہتھیار ڈالتے ہیں ہم ہتھیار ڈالتے ہیں۔ میں اس موقع پر بھی کابل میں داخل ہو کر اپنی حکومت کا اعلان کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا رخ پشاور کی طرف تھا میں وہاں کے فیصلے کا منتظر تھا اور اجتماعی قیادت کے انتظار میں تھا۔ چنانچہ جب حضرت صبغت اللہ مجددی کی سربراہی میں عبوری حکومت کا فیصلہ ہوا تو قائدین کے حکم پر میں نے کابل کو جناب حکمت یار کے حملہ آوروں سے خالی کرایا اور اقتدار اجتماعی قیادت کے حوالے ہو گیا۔ لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کمیونسٹوں کے ساتھ اقتدار میں شراکت کر لی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ وہ شراکت کدھر ہے؟ کابل میں حضرت صاحب کی حکومت ہے جو مجاہدین پر مشتمل ہے، تمام صوبوں میں مجاہدین کی حکومتیں ہیں، آپ خود تلاش کریں آپ کو وہ شراکت کہیں نظر آتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شمال اور جنوب کی جنگ ہے یا پشتو اور فارسی کا جھگڑا ہے اگر ایسا ہوتا تو میں کابل میں تنہا داخل ہوتا اور کسی کو قریب نہ آنے دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ یہ نہ علاقہ کی جنگ تھی اور نہ زبان کی یہ تو اسلام کی جنگ تھی اور جہاد تھا جو کفر کے خاتمہ اور اسلام کے نفاذ کیلئے

بے پناہ قربانیوں کے ساتھ منزل تک پہنچا۔ اسی لیے میں نے اجتماعی قیادت کی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اجتماعی قیادت آپ کے سامنے کابل میں موجود ہے اور میں بھی اس کا ایک حصہ ہو۔

انہوں نے کہا کہ دوستم ملیشیا کی بات کی جاتی ہے، آپ نے خود کابل میں گھوم پھر کر دیکھ لیا ہے کہ دوستم ملیشیا کہاں کہاں ہے؟ میں انکار نہیں کرتا کہ دوستم ملیشیا کابل میں موجود ہے لیکن اس کی تعداد پورے کابل میں اڑھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور اس کی الگ کوئی کمان نہیں ہے وہ ہماری کمان میں ہے اور ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ اسے بھی کابل سے نکالا جاسکتا ہے لیکن میں حکمت عملی سے کام لینے کا قائل ہوں پھر میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ دیکھا! ہم نے ملیشیا کو کابل سے نکلوادیا۔ صرف اتنی بات ہے ورنہ دوستم ملیشیا یہاں کابل میں ہمارے لیے سرے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

جناب احمد شاہ مسعود نے پاکستان کے علماء کا جہاد میں پشت پناہی کرنے اور مبارکباد کیلئے کابل تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر مولانا فداء الرحمان درخواستی نے جمعیت علماء اسلام پاکستان اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کی طرف سے جناب احمد شاہ مسعود کو پاکستان کے دورہ کی دعوت دی جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلی اور کہا کہ حالات بہتر ہونے پر وہ پاکستان کے عوام اور علماء کا شکریہ ادا کرنے کیلئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری جنگ صرف اور صرف اسلام کیلئے تھی اور ہم افغانستان کو ایک صحیح اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کا ہدف حاصل کریں گے۔ ہم نے یہ جنگ علاقہ یا زبان کے نام پر نہیں لڑی اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ جنگ شمال جنوب کی ہوتی یا پشتو فارسی کی ہوتی تو میں ایک دن کیلئے بھی اس جنگ میں شریک نہ ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہمیشہ علماء کا احترام کیا ہے اور ان کے فیصلوں کو ترجیح دی ہے بلکہ آخری مرحلہ میں جب پشاور میں اجتماعی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں متفقہ فیصلہ میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی تو میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ قائدین متفقہ حکومت قائم نہ کرسکے تو میں کمانڈروں اور علماء کا اجلاس طلب کرکے ان سے کہوں گا کہ وہ مشترکہ حکومت تشکیل دیں اور میرے ساتھ کابل چل کر اقتدار سنبھالیں لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ قائدین متفق ہوگئے اور کابل میں عبوری حکومت نے اقتدار سنبھال لیا۔

جناب احمد شاہ مسعود نے کشمیر، فلسطین اور برما کے مسلمانوں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں اپنے مظلوم بھائی یاد ہیں اور میں کابل میں وزیر دفاع بن کر بیٹھنے سے ان مظلوم بھائیوں کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک ہونے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن ابھی ہماری مشکلات ہیں، ہم اپنے مسائل پر قابو پالیں تو ان بھائیوں کے ساتھ بھی ضرور شریک ہوں گے۔ ہمارے جذبات اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور حالات سازگار ہونے پر ہماری مدد اور تعاون بھی ان کے ساتھ ہوگا۔

۳جون کو قافلہ کا واپسی کا پروگرام تھا لیکن ہمیں اپنا دورہ کچھ تشنہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم جناب حکمت یار سے نہیں مل سکے تھے، پروفیسر عبد الرب الرسول سیاف سے ہماری ملاقات نہیں ہوسکی تھی، جناب برہان الدین ربانی سے بھی ملاقات نہ کرسکے تھے اور مرد مجاہد مولانا جلال الدین حقانی کی زیارت بھی ابھی باقی تھی۔ اس لیے مولانا فداء الرحمان درخواستی، مولانا نور محمد آف وانا، مولانا سعادت اللہ خان، حاجی امیر نواز خان ایڈووکیٹ، حاجی غلام علی اور راقم الحروف نے مزید دو روز وہاں رکنے کا فیصلہ کیا جبکہ باقی قافلہ واپس روانہ ہوگیا۔ لیکن بدقسمتی سے پروفیسر سیاف کی اتحاد اسلامی کے ساتھ

ایران نواز شیعہ گروپ حزب وحدت کی جھڑپیں شدت اختیار کر گئیں۔ شہر میں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا اور قائدین سے رابطے نہ ہو سکے بلکہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ ان حالات میں ان قائدین سے ملاقاتوں کیلئے آپ کو مزید چند روز تک رکنا پڑے گا جبکہ زیادہ دنوں کیلئے قیام ہمارے لیے مشکل تھا اس لیے ان قائدین سے ملاقاتوں کیلئے دوبارہ کابل آنے کا ارادہ کر کے تشنگی کا احساس باقی رکھتے ہوئے ۴ جون کو صبح سات بجے کابل سے روانہ ہو کر شام سات بجے پشاور واپس پہنچ گئے۔

پاکستان کے بارے میں امریکی عزائم:
وزیراعظم پاکستان کے نام کھلا خط

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بگرامی خدمت جناب بلخ شیر مزاری صاحب، وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ________ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ روزنامہ جنگ لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ آنجناب کے ایک بیان کے حوالے سے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنا اپنی دینی وقومی ذمہ داری سمجھتا ہوں، امید ہے کہ آنجناب ان پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ آپ نے اس بیان میں پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینے کی امریکی دھمکی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> ”ہماری حکومت کوشش کر رہی ہے کہ امریکہ کے اس تاثر کا ازالہ کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ پشاور میں غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی باشندوں کو نکالا جا رہا ہے۔“

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ پشاور میں سالہا سال سے مقیم عرب مجاہدوں کی اچانک گرفتاریاں، حوالات میں ان پر مبینہ تشدد اور انہیں جبراً پاکستان سے نکالنے کی حالیہ کاروائی کا اصل مقصد امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اور اس سے قبل روزنامہ پاکستان لاہور کی ۲۹ اپریل ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ پشاور میں مقیم عرب مجاہدین کے خلاف کاروائی کیلئے ان کی فہرستیں حکومت پاکستان کو امریکی سفارت خانہ کی طرف سے فراہم کی گئی ہے۔

پشاور میں مقیم ان عرب مجاہدین کے بارے میں، جنہیں آپ نے ”غیر قانونی طور پر مقیم“ کا خطاب دیا ہے، آپ کی خدمت میں متعلقہ اداروں کی طرف سے یقیناً کچھ فائلیں پیش کی گئی ہوں گی جو بیوروکریسی کی روایات کے مطابق یکطرفہ اور مخصوص تاثرات پر مبنی ہوں گی، اس لیے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو تصویر کے دوسرے رخ سے بھی آگاہ کیا جائے تاکہ اس معاملہ میں آنجناب کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

جناب وزیراعظم! یہ عرب باشندے دو چار ہفتوں یا چند مہینوں سے پشاور میں قیام پذیر نہیں ہیں بلکہ دس بارہ سال

سے اس علاقہ میں رہ رہے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط اور مسلح جارحیت کے خلاف افغان عوام کے جہاد حریت میں شمولیت کیلئے دنیا کے مختلف ممالک بالخصوص عرب ملکوں سے آئے ہیں اور جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ جہاد افغانستان میں عملاً شریک رہے ہیں۔ یہ عرب نوجوان افغانستان یا حکومت پاکستان پر بوجھ نہیں بنے بلکہ انہوں نے اپنے ممالک سے جہاد افغانستان کیلئے بے پناہ مالی امداد فراہم کی ہے، ان میں سینکڑوں نوجوان مختلف محاذوں پر جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ہزاروں معذور ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد آج بھی تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے درمیان اختلافات کو دور کرانے اور افغانستان کی تعمیر نو میں مؤثر کردار ادا کرنے کیلئے شب و روز مساعی میں مصروف ہیں۔

عرب مجاہدین کے ان گروپوں کا پاکستان کو، عرب حکومتوں کو، اور امریکی حکومت کو شروع سے علم ہے لیکن فرق صرف یہ پڑا ہے کہ جب تک ان مجاہدین کی جدوجہد کے کچھ سیاسی مفادات امریکہ کو بھی حاصل ہو رہے تھے، ان کا وجود گوارا تھا، انہیں عرب مجاہدین کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور ان کی امداد بھی کی جاتی تھی۔ لیکن اب جبکہ ان مجاہدین کے وجود کو امریکہ عالم اسلام میں اپنے عزائم کے حوالے سے نقصان دہ تصور کرتا ہے، اچانک وہ دہشت گرد قرار پا گئے ہیں اور انہیں کچلنے کیلئے امریکی حکومت کے ساتھ عرب حکومتیں اور حکومت پاکستان بھی سرگرم عمل ہو گئی ہے۔

جناب وزیر اعظم! جہاد افغانستان کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ افغانستان کی آزادی اور اسلامی تشخص کے تحفظ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جنگ بھی ہے۔ اس لیے کہ آنجہانی سوویت یونین کا اصل ہدف بلوچستان کے ساحل تک پہنچ کر گرم پانی کے سمندر اور تیل کے چشموں تک رسائی حاصل کرنا تھا، اور بلاشبہ افغان مجاہدین نے اس روسی یلغار کے سامنے لاشوں کی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کر کے پاکستان کی شمال مغربی سرحد کو ہمیشہ کیلئے اس قسم کے خطرات سے محفوظ کر دیا ہے۔ پاکستان کی سالمیت کی اس جنگ میں ان عرب نوجوانوں کا خون بھی شامل ہے اور اس لحاظ سے ان کا شمار ہمارے قومی محسنوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کسی لالچ اور مفاد کے بغیر جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ ہماری ملی سالمیت کی اس جنگ میں اپنے مقدس خون کا نذرانہ پیش کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی جدوجہد میں جہاد کی نئی روح پھونکنے والے اور از سر نو مسلح جہاد فلسطین کا آغاز کرنے والے عرب نوجوان بھی اسی جہاد افغانستان کے فیض یافتہ ہیں، اور بوسنیا کے مظلوم اور بے بس مسلمانوں کو، جو گاجر مولی کی طرح سرب دہشت گردوں کے ہاتھوں کٹ رہے ہیں، اگر کسی نے عملی مدد فراہم کی ہے اور وہاں پہنچ کر کسی حد تک ان کے دفاع کا بندوبست کیا ہے تو وہ یہی عرب نوجوان ہیں جو ایک عرصہ تک پشاور میں ”غیر قانونی طور پر مقیم“ رہے ہیں، اور مختلف حیلوں سے بوسنیا پہنچ کر اپنے مظلوم اور لاچار مسلمان بھائیوں کی ڈھال بنے ہوئے ہیں۔

جناب وزیر اعظم! چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت پاکستان ان عرب مجاہدین کو اعلیٰ فوجی اعزازات سے نوازتی اور ان کی خدمات کو قومی سطح پر خراج تحسین پیش کیا جاتا۔ لیکن ہم احسان فراموشی اور ناقدری کا کس قدر اذیتناک منظر دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ کے تاثر کا ازالہ کرنے کیلئے ان عرب مجاہدین کے سینوں پر ”دہشت گرد“ کا میڈل آویزاں کر دیا گیا ہے، انہیں جبراً پاکستان سے نکال کر ان کے سیاسی مخالفین کی حکومتوں کے حوالے کیا جا رہا ہے، جہاں جیل، تشدد اور اذیت رسانی کا

ایک نیا سلسلہ ان مجاہدین کیلئے اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہوئے ہے۔

جناب وزیر اعظم! مجھے ان عرب مجاہدین سے زیادہ پاکستان کی فکر ہے۔ انہیں آپ مجاہدین کہیں یا دہشت گرد کا خطاب دیں، ان کی خدمات اور مشن میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ جہاں آنجہانی سوویت یونین اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں وہاں امریکہ اور اس کی حواری حکومتوں کی گولیاں بھی ان کے سینوں میں اس سے بڑا سوراخ نہیں کر سکیں گی۔ وہ تو ایمان اور جہاد کے جذبات سے سرشار ہیں، آزمائش کی اس بھٹی میں کندن بن کر نکلیں گے۔ لیکن تاریخ کے اتنے بڑے اسٹیج پر پاکستان کے سینے کو "احسان فراموشی" اور "محسن کشی" کے جن تمغوں سے مزین کیا جارہا ہے، غلاظت کی ان بدنما اور بدبودار داغوں سے ہمارے سینوں کو کون صاف کرے گا؟

جناب وزیر اعظم! آپ نے عرب مجاہدین کے خلاف اس کاروائی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ اس سے امریکی تاثر کا ازالہ ہوگا اور آپ کو یہ بریفنگ بھی شاید متعلقہ اداروں کی رپورٹوں کے ذریعے دی گئی ہے، لیکن اس غلط فہمی سے بھی آپ جس قدر جلد نجات حاصل کر سکیں ملک و قوم کے مفاد میں ہوگا۔ اس لیے کہ امریکی تاثرات اور حکومت کی خواہشات صرف عرب مجاہدین کو پشاور سے نکالنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اب تک پاکستان سے امریکہ کے جو مطالبات اور تقاضے بین الاقوامی پریس کے ریکارڈ میں آچکے ہیں، ان کی فہرست بڑی لمبی ہے جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں مناسب خیال کرتا ہوں:

- امریکہ بہادر کا مطالبہ ہے کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کو امریکہ کی مقرر کردہ حدود میں واپس لے جائے اور دفاعی مقاصد کیلئے ایٹمی توانائی کے حصول کے جائز حق سے کلی طور پر دستبردار ہونے کا اعلان کرے۔
- امریکہ کی مرضی ہے کہ پاکستان اپنی دفاعی افواج میں کمی کرے اور دفاعی اخراجات کو اس دائرہ تک محدود کر دے جہاں اس کیلئے بھارت کی بالادستی کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے۔
- امریکہ چاہتا ہے کہ اسلامی جمہوری پاکستان کا اسلامی تشخص ختم کر کے اسے ایک سیکولر جمہوریہ کی حیثیت دی جائے۔
- امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے عمل کو ختم کر دیا جائے، نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والی جماعتوں کو فرقہ وارانہ قرار دے کر خلاف قانون قرار دے دیا جائے اور قادیانیوں کے بارے میں آئینی اور قانونی اقدامات کو واپس لیا جائے۔
- امریکہ کا پاکستان سے تقاضا ہے کہ وہ کشمیر کے بارے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کرے تاکہ وادی کشمیر کو ایک خود مختار ملک قرار دے کر وہاں امریکہ کا ایک بڑا فوجی اڈہ قائم کیا جا سکے جو چین، جاپان، بھارت، پاکستان اور وسطی ایشیا کے درمیان امریکی مفادات و مقاصد کا نگہبان ہو۔
- امریکہ کی مرضی یہ ہے کہ پاکستان اپنا پورا اثر و رسوخ افغانستان میں ایک مستحکم اور نظریاتی اسلامی حکومت کے

قیام کو روکنے کیلئے استعمال کرے، اور افغانستان میں خانہ جنگی اور انتشار کی فضا قائم رکھنے کیلئے اسلام آباد مسلسل کردار ادا کرتا رہے۔

- امریکہ بہادر کی منشا یہ ہے کہ وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستوں کو امریکہ کے زیر اثر لانے کیلئے پاکستان ایک وفادار ایجنٹ کا کردار ادا کرے۔
- امریکہ بہادر مشرق وسطی کے مختلف ممالک میں ابھرتی ہوئی اسلامی تحریکات کو اس خطہ میں اپنے مفادات اور اسرائیل کے مستقبل کیلئے خطرہ محسوس کرتا ہے، اور اس کی تمنا یہ ہے کہ ان تحریکات کو سبوتاژ کرنے اور کچلنے کیلئے پاکستان اس خطہ کی امریکہ نواز حکومتوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرے۔

جناب وزیر اعظم! یہ امریکی خواہشات اور تاثرات کا ایک سرسری خاکہ ہے اور ان تمام خواہشات کی تکمیل کر کے ہی آپ امریکہ بہادر سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کی دھمکی پر نظر ثانی کرے، ورنہ ان میں سے کسی ایک مسئلہ پر آپ کا اڑ جانا پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کیلئے کافی ہے۔ جبکہ ان تمام تاثرات کے ازالہ کے بعد بھی اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ امریکی وزارت خارجہ کا جنوبی ایشیا ڈیسک اس وقت تک پاکستان کے حوالے سے امریکی خواہشات و تاثرات کی ایک نئی فہرست تیار نہیں کر چکا ہوگا۔

اس لیے اگر آپ کی حکومت نے ”امریکہ کے تاثرات کے ازالہ“ کی مہم کا بیڑا اٹھایا ہے تو میری آپ سے گزارش ہے کہ اس کی آخری حد تک کا بھی ابھی سے تعین کر لیں۔ کیونکہ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ ان حقائق سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باعث ابھی تک گومگو کی کیفیت میں ہے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی اور رائے عامہ کے بیدار ہونے پر آپ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں گے تو آگے جانے کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنے کے دروازے بھی آپ پر بند ہو چکے ہوں گے، اور آپ کی حکومت اپنی امریکہ نواز پالیسیوں کے ساتھ ”عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!“ کا مصداق بن چکی ہوگی۔

جناب وزیر اعظم! مجھے احساس ہے کہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہونے کی وجہ سے انداز بیان کو تلخی کی آمیزش سے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اس پر آنجناب سے معذرت خواہ ہوں اور ایک بار پھر یہ استدعا کرتا ہوں کہ ایک باشعور مسلمان اور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے ان حقائق کا جائزہ لیں اور ایسے کسی اقدام سے گریز کریں جو کہ انجام کار آپ کے لیے، پاکستان کے لیے، اور پاکستانی قوم کے لے بے وقاری اور بدنامی کا باعث ثابت ہو، بے حد شکریہ۔

والسلام

ابو عمار زاہد الراشدی

چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

جہادِ افغانستان اور وسطی ایشیا کی ریاستیں

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۳ء

یہ بات تو بدیہی ہے کہ وسطی ایشیا کی یہ آزادی جہادِ افغانستان کی رہینِ محنت ہے لیکن یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ روس نے اس خطہ میں آزادی کے نام پر وہی کھیل کھیلا ہے جو اس سے قبل برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ اپنے زیر تسلط مسلم ممالک کو آزادی دیتے وقت کھیل چکے ہیں کہ ان ممالک پر آزادی کا لیبل لگ جائے لیکن ان کا نظام اور حکمران طبقے وہی رہیں جو استعماری قبضہ کے دوران تھے۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران آزاد ہونے والے مسلم ممالک پر نظر ڈال لیں آپ کو یہی صورت حال نظر آئے گی۔ ان ممالک میں نہ نظام بدلا ہے، نہ معاشرتی زندگی میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ حکمران طبقے تبدیل ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلم ممالک انقلاب کے ایک ایسے عجیب وغریب تصور سے روشناس ہوئے ہیں کہ قومی اور معاشرتی زندگی میں کوئی عملی تبدیلی آئے بغیر ان پر آزادی اور انقلاب کا خوشنما لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ خدا جانے کہ ایسے موقع پر میرے ذہن میں ”شراب کی بوتل پر زمزم کا لیبل“ کا محاورہ بار بار کیوں گردش کر رہا ہے؟ شاید اس لیے کہ ابھی تک اس کے علاوہ کسی اور عملی تبدیلی کا ادراک نہیں کر پایا۔ بہرحال وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی بھی اس عمل کا تسلسل ہے جس سے اکثر مسلم ممالک گذشتہ نصف صدی کے دوران دوچار ہو چکے ہیں اور یہ بات دن بدن اور زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ افغانستان کے مسئلہ پر جنیوا مذاکرات کے دوران روس اور امریکہ کے درمیان اس بات پر خفیہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ اگر وسطی ایشیا کے معاملات کو کابل میں اسلامی نظریاتی حکومت کے قیام و استحکام کے بعد تک مؤخر کر دیا گیا تو وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں آزادی کا عمل مذہبی اور نظریاتی حوالوں سے منظم ہوگا جو امریکہ اور روس دونوں کیلئے خطرناک ہوگا۔ اس لیے کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی وسطی ایشیا کے مسلم ممالک کے عوام کو آزادی کا ”لولی پاپ“ دے دیا جائے تاکہ سیکولر نظام اور سیکولر حکومتوں کا تسلسل قائم رہ سکے۔

صومالیہ: مشرقی افریقہ کا افغانستان

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۴ء

سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کمیونزم کے تار و پود بکھرے تو اس عمل سے صومالیہ بھی متاثر ہوا جو افریقہ کا ایک مسلمان ملک ہے۔ آبادی ایک کروڑ سے زائد بیان کی جاتی ہے اور یہ ملک کئی اعتبار سے افغانستان سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ صومالیہ مشرقی افریقہ میں داخلہ کا دروازہ ہے اور اس کی بندرگاہ موغادیشو کو علاقہ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اور اس طور پر بھی کہ آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے جس کی اسلام کے ساتھ وابستگی اس قدر گہری ہے کہ مسیحی تبلیغ کے مشنری ادارے اس خطہ کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں واضح ناکامی

محسوس کرتے ہوئے اپنے کئی مشن بند کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ پھر افغانستان کی طرح صومالیہ کا معاشرہ بھی قبائلی طرز کا ہے جس میں باہمی کشمکش بسا اوقات خانہ جنگی کی افسوسناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور سب سے بڑھ کر صومالیہ کے علماء بھی ''ہتھیار آشنا'' ہیں اور حالیہ کشمکش میں ان کے کئی مسلح گروپ برسرپیکار ہیں۔

صومالیہ غلامی کے دور میں تین حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک پر برطانیہ کی عملداری تھی، دوسرا حصہ فرانس کے قبضہ میں تھا، جبکہ تیسرے پر اٹلی کی آقائی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ آزادی کے بعد برطانوی و صومالی لینڈ نے مشترکہ جمہوریت قائم کر لی جبکہ فرانسیسی صومالیہ بدستور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ صومالیہ کا اکثر علاقہ بنجر ہے، کچھ حصہ کاشت ہوتا ہے، کیلا زیادہ پیدا ہوتا ہے، مویشیوں اور کھالوں کی تجارت بھی ہوتی ہے، اور اب کچھ معدنی ذخائر اور تیل کا سراغ لگا ہے جو ابھی تحقیق و تجزیہ کے مراحل میں ہے۔

جہادِ افغانستان کے ہاتھوں سوویت یونین کی پسپائی کے وقت صومالیہ پر سید بارے کی حکومت تھی جو بائیں بازو کے لیڈر اور مشرقی افریقہ میں روسی مفادات کے نگہبان کے طور پر متعارف ہیں۔ کلہ جب تک مضبوط رہا ان کی حکمرانی کا سکہ چلتا رہا مگر سوویت یونین کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد سید بارے کیلئے بھی اقتدار کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا اور صومالیہ خانہ جنگی کی راہ پر چل پڑا۔ خانہ جنگی میں سید بارے کی فوج کے ایک بڑے افسر جنرل محمد فرح عدید اور علی محمد نے قوت پکڑی اور اقتدار کی کشمکش نے قبائلی خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ خانہ جنگی نے ملک کی جو تھوڑی بہت پیداوار تھی اسے بھی متاثر کر دیا جس کے نتیجے میں قحط سالی اور بھوک نے صومالیہ کو لپیٹ میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین لاکھ کے لگ بھگ افراد اس خانہ جنگی اور قحط کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے صومالیہ کے عوام کو خانہ جنگی اور قحط کے اثرات سے بچانے کیلئے مداخلت کا فیصلہ کیا اور مشترکہ فوج وہاں اتاری جس میں پاکستانی فوج کے دستے بھی شامل ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی فوج کو صومالیہ میں جنرل فرح عدید کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جن کا گروپ اس خانہ جنگی میں سب سے بڑے اور طاقتور گروپ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ پاکستان کے فوجی دستوں سے بھی اس گروپ کی جھڑپ ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں طرفین کے متعدّد افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ جنرل عدید نے اقوامِ متحدہ کی فوج کی آمد کو صومالیہ کے معاملات میں امریکی مداخلت قرار دیتے ہوئے اس کی مزاحمت کی اور حالات پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ حتیٰ کہ اب امریکہ ان کا وجود تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات کی میز پر ان سے مفاہمت کیلئے پیش رفت کر رہا ہے۔

اسی دوران صومالیہ کے مذہبی گروپ بھی متحد ہو گئے جو اس سے قبل الگ الگ متحرک تھے۔ یہ بھی مسلح کشمکش میں شریک ہیں اور اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کا ہدف یہ ہے کہ صومالیہ کو ایک اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دے دی جائے جبکہ فرح عدید ایک سیکولر اور قوم پرست راہنما ہیں۔ صومالیہ کے مذہبی گروپوں کا موقف یہ ہے کہ اس صورتحال میں پاکستانی فوج کے دستوں کا وہاں بھیجا جانا درست نہیں ہے بالخصوص ایسے حالات میں کہ پاک فوج کو صومالیہ کے مختلف گروپوں کے ساتھ تصادم کیلئے بقول ان کے ایک ایسی حکمت عملی کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے جس سے پاکستان کے بارے میں صومالیہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا محبت و اعتماد کا رشتہ کمزور ہو رہا ہے اور پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات جنم لے رہے ہیں۔ صومالیہ کے علماء اور دینی راہنماؤں نے اس سلسلہ میں پاکستان کی دینی

جماعتوں کے قائدین کو پیغامات بھجوائے اور خطوط ارسال کیے کہ ان کے موقف سے آگاہی حاصل کی جائے اور ان کی مشکلات کو کم کرنے میں تعاون کیا جائے۔

اس پس منظر میں ۱۹ نومبر ۱۹۹۳ء کو جناب مجیب الرحمان شامی مدیر زندگی لاہور، مولانا عبد الرؤف ملک سیکرٹری جنرل متحدہ علماء کونسل، اور مولانا محمد مسعود اظہر سیکرٹری جنرل حرکۃ الانصار کے ہمراہ نیروبی جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہمارا قیام تین روز تک رہا۔ نیروبی مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کا دارالحکومت ہے جو صومالیہ کے جنوب میں واقع ہے اور صومالیہ کے داخلی حالات مخدوش ہونے کے باعث وہاں سے رابطہ کیلئے قریب ترین مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کینیا ہمارے ہاں چائے کے حوالے سے متعارف ہے کیونکہ وہاں کی سب سے بڑی پیداوار چائے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں استعمال ہونے والی کل چائے کا پچاس فیصد کے لگ بھگ حصہ کینیا سے آتا ہے۔ خط استوا کے قریب ہونے کی وجہ سے دن اور رات کا تناسب تقریباً سارا سال یکساں رہتا ہے اور سورج کے طلوع و غروب کے اوقات میں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ مگر سطح سمندر سے بلندی پر ہونے کے باعث گرمی زیادہ نہیں پڑتی، معتدل موسم رہتا ہے اور بارش بھی اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے نیروبی کا موسم پسند آیا کیونکہ موسم کا سارا سال اعتدال میں رہنا اور دن رات کے اوقات کا توازن بھی قائم رہنا اس سے قبل کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

کینیا کی آبادی دو کروڑ کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کا تناسب تیس فیصد بیان کیا جاتا ہے۔ انڈیا اور پاکستان سے آکر بس جانے والے مسلمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ نیروبی کے وسط میں مغل طرز تعمیر کی جامع مسجد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، یہ وسیع مسجد ۱۹۲۵ء میں تعمیر ہوئی جس کے ساتھ ایک بڑا اسلامک سنٹر ہے جہاں مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے امور کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہیں فیصل آباد کے مولانا مطیع الرسول سے ملاقات ہوئی جو حضرت السید مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے شاگرد ہیں اور ایک عرصہ سے نیروبی میں مقیم ہیں بلکہ اب تو وہاں کے شہری ہیں اور مسلمانوں کی دینی تعلیم، دعوت اسلام اور نوجوانوں کے فلاحی امور کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے ہیں۔ نیروبی سے باہر بھی ایک تعلیمی ادارہ انہوں نے قائم کر رکھا ہے جو اپنے مقاصد کی طرف کامیابی کے ساتھ گامزن ہے۔ وقت کی کمی کے باعث وہ ادارہ نہ دیکھا جا سکا مگر اس کی کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے بے حد مسرت ہوئی۔

کینیا بھی ہماری طرح برطانوی استعمار کی نوآبادی رہا ہے اس لیے بود و باش اور عام طرز زندگی میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا۔ البتہ عام زندگی اور دفتری زندگی میں نظم کی صورتحال ہم سے بہتر نظر آئی۔ کینیا کا سکہ شلنگ کہلاتا ہے۔ جس روز ہم وہاں پہنچے نیروبی ایئرپورٹ پر کرنسی کے تبادلہ میں ایک امریکی ڈالر کے عوض ۶۵ شلنگ ملے۔ گویا پاکستانی روپے کے مقابلہ میں کینیا کا شلنگ تقریباً نصف قیمت کا حامل ہے۔ پہلی رات ہمیں وسط شہر کے ایمبسڈر ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا جس کا کرایہ پینتالیس ڈالر فی کمرہ تھا مگر دوسرے روز اپنے میزبانوں کے ساتھ رابطہ و ملاقات کی سہولت کے پیش نظر ملیمانی روڈ کے ہرن کورٹ ہوٹل میں منتقل ہو گئے جس کا کرایہ ۱۳ ڈالر فی کمرہ تھا۔ ہوٹل کچھ زیادہ معیاری نہ تھا مگر میزبانوں کے ساتھ رابطہ کی سہولت کے باعث ہم بقیہ دو دن وہیں ٹھہرے۔

اس ہوٹل میں ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی جو کافی دنوں سے وہاں قیام پذیر تھا۔ اس نے اپنے قیام کا

مقصد کاروبار بتایا مگر معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ اور پاکستانی نوجوان بھی ہیں جو بہت دنوں سے اس قسم کے ہوٹلوں میں مقیم ہیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو امریکہ اور یورپ جانے کے شوق میں ٹریول ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو انہیں مختلف راستوں سے منزل مقصود تک پہنچانے کیلئے فن کا کمال دکھاتے ہیں۔ میں اس قسم کے نوجوان بڑی تعداد میں استنبول اور تاشقند میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ ان میں سے بہت سے نوجوانوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ایجنٹ اپنے پیسے کھرے کر کے انہیں اسی قسم کے کسی درمیانی منزل پر چھوڑ کر رفوچکر ہو جاتے ہیں اور وہ "پائے رفتن نہ جائے ماندن" کے مصداق اپنی قسمت کو کوستے رہتے ہیں۔

ایمبیسڈر ہوٹل سے ملیمانی ہوٹل منتقل ہوتے وقت جس ٹیکسی سے ہم نے سفر کیا اس نے اپنے وطن کے ساتھ مشابہت کے احساس کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔ ٹیکسی شکل وصورت کے لحاظ سے برطانوی تھی کہ اسی قسم کی ٹیکسیاں وہاں چلتی ہیں۔ اسے دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید اس معاملہ میں کینیا والے ہم سے کچھ آگے ہیں لیکن ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اطمینان کی ایک لہر دل و دماغ پر چھاگئی کہ خیر ہے معاملہ اپنے جیسا ہی ہے۔ یعنی صرف اوپر کا خول اور باڈی انگلش تھا باقی سب کچھ اپنی طرح کا ہی تھا۔ ہمارے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے اردگرد کھڑے کچھ لوگوں کو اشارہ کیا اور وہ گاڑی کو دھکا دینے کیلئے متحرک ہو گئے۔ یہ ٹیکسی ہمارے اجتماعی نظام کی ہو بہو تصویر تھی کہ ظاہری ڈھانچہ مغربی طرز کا لیکن اندر سے پوری مشینری دھکا سٹارٹ۔ جبکہ دھکا لگانے والے بھی ورلڈ بینک کے ڈائریکٹروں کی طرح ہماری بے بسی پر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے، آپس میں اشارے کر رہے تھے اور ہمیں دھکا دے رہے تھے۔ خدا خدا کر کے گاڑی اسٹارٹ ہوئی لیکن چند قدم چلی اور اچانک رک گئی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی میں تیل ہی نہیں تھا اور ڈرائیور کسی طرح اللہ توکل پٹرول پمپ تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر پٹرول پمپ سے چند قدم پیچھے "دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا" گاڑی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ڈرائیور ٹیکسی سے اترا، ڈگی سے ایک خالی ڈبہ نکالا اور پٹرول پمپ کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے پٹرول لاکر گاڑی میں ڈالا اور پھر دھکا سٹارٹ کے مرحلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ دھکا لگانے والے یہاں بھی آسانی سے مل گئے ہمیں نہیں اترنا پڑا۔ مگر اب کیفیت یہ تھی کہ گاڑی میں ہم لوگ تشریف فرما تھے، کچھ لوگ گاڑی کو دھکا دے کر اسٹارٹ کرانے کی کوشش کر رہے تھے اور دونوں طرف چھوٹے چھوٹے افریقی بچے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے جو اپنی زبان میں ہم سے سوال کر رہے تھے اور کچھ نہ ملنے پر ہمارا منہ چڑا رہے تھے، دانت نکوس رہے تھے اور عجیب وغریب اشارے کر رہے تھے۔ اس شان وشوکت کے ساتھ ہمارا جلوس نیروبی کے ایک کھلے بازار میں فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ تو چلا ہی ہو گا مگر جب انگلش گاڑی نے ہم ایشیائیوں کو افریقہ میں ساتھ لے کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تو ڈرائیور نے ایک اور ٹیکسی والے سے ہمارا سودا کر کے ہمیں اس میں منتقل کر دیا اور خدا خدا کر کے ہم ہرن کورٹ ہوٹل پہنچے۔ دوسری ٹیکسی بھی انگلش طرز کی تھی لیکن کچھ شریف النسل لگتی تھی اس نے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد جتنے دن ہم وہاں رہے انگلش ٹیکسی سے واسطہ نہیں پڑا۔ جمعہ کی نماز ہم نے اسی جامع مسجد میں ادا کی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ امام صاحب نے مقامی زبان میں خطاب کیا۔ کینیا کی مقامی زبان سواحلی ہے لیکن انگریزی بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ امام صاحب کی زبان تو ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی البتہ گفتگو کا مفہوم ہم بخوبی سمجھ رہے تھے۔ ان کا

موضوع عالم اسلام کی حالت زار تھا، انہوں نے فلسطین اور افغانستان کا ذکر کیا، عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا اور مغربی ممالک کے تسلط و بالادستی سے نجات کے احساس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مطیع الرسول کے دفتر میں امام صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی، اسلام کی بالادستی اور عالم اسلام کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والے مخلص بزرگ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے احوال پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد کے گیٹ پر کچھ پاکستانی احباب مل گئے۔ جناب مجیب الرحمان شامی ہمارے ملک کے معروف صحافی اور کالم نگار ہیں، روزنامہ جنگ میں "جلسہ عام" کے عنوان سے ان کا کالم قارئین کا وسیع حلقہ رکھتا ہے، نیروبی میں بھی انہیں دیکھ کر پہچاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ اس حوالے سے متعدّد حضرات سے ملاقات ہوئی جن میں پاک فوج کے ایک افسر بھی تھے۔ وہیں ڈاکٹر فاروق صاحب سے ملاقات ہوئی جو گوجرانوالہ میں ہمارے محلہ ایمن آبادی گیٹ کے رہنے والے ہیں اور ایک عرصہ سے نیروبی میں مقیم ہیں۔ ان کے ایک عزیز ریٹائرڈ میجر محمد علی بٹ چند روز قبل نیروبی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہوگئے ہیں۔ یہاں قتل اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہیں، راہ چلتے لوگوں سے سامان اور رقم چھین لینا عام معمول ہے۔ پولیس کے سپاہی بڑے بڑے ڈنڈے اٹھائے ہر وقت گھومتے رہتے ہیں مگر وارداتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ محمد علی بٹ مرحوم نیروبی میں ایک ہوٹل چلا رہے تھے، شام کے وقت ہوٹل سے باہر نکلے تو ڈاکوؤں نے انہیں گولی ماردی اور گاڑی چھین کر فرار ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نیروبی میں ہماری ملاقات راؤ محمد اختر صاحب سے بھی ہوئی۔ یہ پاکستانی بزرگ ہیں جو ایک عرصہ سعودی عرب میں رہے ہیں اور اب نیروبی میں ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی سے بھی تعلق ہے اور نیروبی میں ایک رفاہی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری واپسی کے روز اپنی رہائش گاہ پر پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور پھر ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے بلکہ جہاز پر سوار ہونے تک ساتھ رہے۔ ان کا خصوصی ذوق مساجد کا قیام ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کینیا کی حکومت مسلمانوں کو مسجد کیلئے جگہ بلا معاوضہ دیتی ہے اور اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کینیا کے مختلف حصوں میں مسجدیں بنا چکے ہیں۔ راؤ محمد اختر صاحب کے ساتھ ملاقات بڑی معلومات افزا رہی۔

پاک فوج کے بعض افسروں کے علاوہ صومالیہ کی مسلح تنظیموں کے نمائندوں، جامع مسجد نیروبی کے امام صاحب، اور صومالیہ کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والے بعض عرب راہنماؤں سے بھی ملاقات ہوئی جن کے ساتھ صومالیہ کے حالیہ تنازعہ کے حوالے سے تفصیلی گفت و شنید ہوئی۔ ان ملاقاتوں اور سفر کے دیگر مشاہدات کے حوالے سے کم از کم میرے تاثرات یہی ہیں کہ صومالیہ کے دینی حلقوں کے اس موقف کو بے وزن قرار دینا مشکل ہے کہ امریکہ نے صومالیہ میں اپنے مقاصد کیلئے اقوامِ متحدہ کی چھتری استعمال کی ہے اور پاک فوج کو جان بوجھ کر ایسا کردار دیا جا رہا ہے جس سے پاکستان اور افریقی مسلمانوں کے درمیان محبت کے رشتے کمزور ہوں اور شکوک و منافرت کی فضا قائم ہو۔ ان کے بقول امریکہ صومالیہ کے ذریعے مشرقی افریقہ کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے، سوڈان اور ایتھوپیا کی اسلامی تحریکات کو دبانا چاہتا ہے، صومالیہ کو ایک نظریاتی اسلامی ریاست بننے سے باز رکھنا چاہتا ہے، اور متوقع تیل اور معدنی ذخائر کا کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صومالیہ کے دینی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ پاکستان اور اس کی فوج کو ان امریکی مقاصد کیلئے آلہ کار نہیں بننا چاہیے اور اپنے موجودہ کردار پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ صومالیہ کے دینی راہنماؤں کا یہ موقف سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے اور حکومت پاکستان،

حزب اختلاف اور مذہبی راہنماؤں کو اس صورتحال کا پوری متانت کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

افغانستان میں عالمِ اسلام کی آرزوؤں کا خون

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۱۹۹۴ء

افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف غیور افغانوں نے جہاد کے مقدس عنوان پر علم بغاوت بلند کیا تو دنیائے اسلام کے دینی حلقوں میں جوش و جذبہ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ جہاد کا بابرکت عمل جو ایک عرصہ سے مغربی استعمار کی سازشوں کے باعث ملتِ اسلامیہ کی عملی زندگی سے نکل چکا تھا ایک بار پھر نظریاتی بنیادوں پر سفرِ نو کا آغاز کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد افغانستان کے دوران نہ صرف پورے عالم اسلام کے دل افغان مجاہدین کے ساتھ دھڑکے بلکہ دنیا کے ہر خطہ سے پرجوش مسلم نوجوانوں نے افغانستان کی سرزمین پر پہنچ کر اس جہاد میں عملاً حصہ لیا اور اس طرح جہاد افغانستان عالم اسلام کی نظریاتی یکجہتی اور دینی تحریکات میں وحدت و اشتراک کے عنوان کے طور پر دنیا بھر کی توجہات کا مرکز بن گیا۔

جہاد افغانستان کی کامیابی اور کابل میں مجاہدین کی مشترک حکومت کے قیام کے بعد دنیا بھر کی اسلامی تحریکات کو یہ امید تھی کہ اب افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہوگی اور مجاہدین کی جماعتیں اور قائدین مل جل کر افغانستان کی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اسلام کے عادلانہ نظام کا ایک مثالی عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے جو دیگر مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کی تحریکات کے عزم و حوصلہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بعض افغان راہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی اور ہوسِ اقتدار نے عالم اسلام کی آرزوؤں کا سربازار خون کر دیا ہے اور کابل کی خوفناک خانہ جنگی نے دنیا بھر کی دینی تحریکات کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس خانہ جنگی کے پس منظر میں بیرونی لابیاں کام کر رہی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس وقت دنیا کا واحد ٹھیکیدار امریکہ افغانستان کے مختلف گروپوں کے پاس موجود اسلحہ کی بھاری مقدار کو کابل کی مشترکہ کمان کی تحویل میں نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ اس کے خیال میں اس صورت میں کابل اس قدر طاقتور ہو جائے گا کہ اردگرد کی دیگر ریاستوں پر اثرانداز ہو سکے گا۔ اس لیے امریکہ اس اسلحہ کو خانہ جنگی میں اسی طرح ضائع کرا دینا چاہتا ہے جس طرح اس نے ایران میں اپنا چھوڑا ہوا اسلحہ عراق ایران جنگ کی صورت میں ضائع کرا دیا تھا۔

اسی طرح امریکہ افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے کیونکہ یہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کی ناکامی کے بعد عالم اسلام اور اسلام کے عادلانہ اور متوازن فلاحی معاشرہ کا آغاز ہوگا جسے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ چند ماہ قبل جنرل رشید دوستم کے دورۂ امریکہ کے موقع پر حکمت عملی یہ طے کر لی گئی تھی کہ یا تو جنرل دوستم کے اشتراک کے ساتھ کابل میں ایک ڈھیلی ڈھالی حکومت بنوا دی جائے اور یا پھر افغانستان کو تقسیم کر کے وسطی ایشیا کی نوآزاد مسلم ریاستوں اور افغانستان کے درمیان ایک نئی بفر اسٹیٹ

قائم کر دی جائے تاکہ کابل کی حکومت ان ریاستوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ساری باتیں تسلیم، مگر سوال یہ ہے کہ اس سب کچھ کیلئے آلۂ کار کون ہے اور امریکہ ان مقاصد کیلئے استعمال کسے کر رہا ہے؟ پروفیسر برہان الدین ربانی، انجینئر حکمت یار اور انجینئر احمد شاہ مسعود اگر اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر اس سوال کا جواب تلاش کر سکیں تو یہ ان کا پوری امت پر احسان ہو گا۔

اس ساری صورتحال اگر کوئی بات کسی حد تک اطمینان بخش ہے تو وہ یہ ہے کہ اس افسوسناک خانہ جنگی میں علماء کی جماعتیں براہ راست شریک نہیں ہیں اور افغان مسلمانوں کا بے مقصد اور بے گناہ خون بہانے کے اس شرمناک عمل میں مولانا محمد نبی محمدی، مولانا محمد یونس خالص، مولانا جلال الدین حقانی، اور مولانا ارسلان رحمانی کا نام سامنے نہیں آ رہا۔ گویا اس کشمکش میں دینی مدارس کی تربیت یافتہ قیادت کا کردار نسبتاً متوازن اور معتدل ہے۔ لیکن ان چاروں بزرگوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ افغان مجاہدین کی خانہ جنگی میں ان کا فریق کے طور پر سامنے نہ آنا ایک اچھا عمل ہے جس پر وہ بلاشبہ تحسین کے مستحق ہیں لیکن یہ کردار کافی نہیں ہے۔ انہیں خانہ جنگی کو رکوانے کیلئے مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنا چاہیے اور آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ان کے منفی طرز عمل کے سنگین نتائج کا احساس دلانا چاہیے جو محض شخصی انا یا گروہی ترجیحات کی خاطر شعوری یا غیر شعوری طور پر عالمی استعمار کا آلۂ کار بن کر افغانستان کو تباہ کرنے پر تل گئے ہیں۔

دفاعی بجٹ میں کمی: قومی خودکشی کے مترادف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۵ء

ان دنوں عالمی طاقتوں اور اداروں کی طرف سے پاکستان کو مسلسل یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کرے اور جدید ہتھیاروں کی تیاری سے گریز کرنے کے علاوہ فوج کی تعداد بھی گھٹائے۔ خود ہمارے بعض دانشور بھی اسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کیلئے دفاعی اخراجات کو کم سے کم کرنا ضروری ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے حضرات دو باتوں کو بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور اس ناتے سے اسے دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتوں سے خطرہ ہے،
2. دوسری یہ کہ پاکستان کا سابقہ بھارت سے ہے جس کی تنگ نظر ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی گذشتہ ایک ہزار برس سے مسلسل محاذ آرائی ہے۔ اور کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے تب بھی اس تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے اس کشیدگی اور محاذ آرائی کا ختم ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تاریخی حقائق کے ہوتے ہوئے پاکستان کو دفاعی اخراجات میں کمی اور فوج کو گھٹانے کا مشورہ یقیناً پاکستان کی خیر خواہی نہیں ہے۔ پھر اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ مشورہ اسلامی تعلیمات کے بھی یکسر منافی ہے

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

”دشمن کے مقابلہ میں جتنی قوت تمہارے بس میں ہو مہیا کرو تاکہ دشمن پر تمہارا رعب قائم رہے۔“ (سورۃ الانفال)

گویا حکمِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی دفاعی قوت اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ دشمن کے مقابلہ میں طاقت کا توازن ان کے حق میں ہو کیونکہ اس کے بغیر دشمن پر رعب قائم ہونا اور دشمن کا مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت اس امر پر متفق ہیں کہ جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری اور مکمل دفاعی ٹیکنالوجی کا حصول مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ہے اور اس معاملہ میں کوتاہی کر کے مسلمان حکومتیں اپنی شرعی ذمہ داری سے کوتاہی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر بھی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو اس معاملہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ

”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“ (سورۃ البقرۃ)

اس آیت کریمہ کی تشریح میں امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ملک کی عمومی اقتصادی صورتحال اور دفاعی اخراجات کے درمیان توازن و تناسب کے سلسلہ میں اسلام کے مزاج اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ معروف صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے موقع پر مسجد نبویؐ اور اس کے ملحقہ حجروں کی تعمیر تک رسول اکرمؐ کے میزبان رہے، اور حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں اس وقت کی ایک بڑی قوت سلطنت روما کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے شوق میں بڑھاپے اور ضعف کے باوجود اصرار کر کے لشکر میں شامل ہوئے، ان کی قبر رومی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ (استنبول) میں ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف جنگ کے دوران ایک محاذ پر تھے جہاں مسلمانوں اور رومیوں کا آمنا سامنا ہوا اور ایک پرجوش مسلمان مجاہد مسلمانوں کی صف سے نکل کر اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا جس پر کسی صاحب نے قرآن کریم کی یہ آیت بلند آواز سے پڑھی ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نوجوان نے اکیلے دشمن کی صفوں میں گھس کر غلطی کی ہے جو اس آیت کریمہ کی منشا کے خلاف ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے لوگوں کی زبان سے اس آیت کریمہ کا حوالہ سن کر ان کو ٹوکا اور فرمایا کہ تم نے آیت کا مطلب صحیح نہیں سمجھا کیونکہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت ہم انصار مدینہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ہمیں ایک غلط سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اس کا پس منظر یوں بیان فرمایا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہم انصار مدینہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپؐ کی نصرت و رفاقت میں مصروف ہو گئے۔ ہجرت کے دوسرے سال ہی غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مسلسل چند برس ایسے گزرے کہ ہم اپنے کاروبار، کھیتی باڑی اور معاشی حالات کی طرف توجہ نہ دے سکے

جس سے ہماری معاشی صورتحال ناگفتہ بہ ہوگئی۔ لیکن چند برسوں کے بعد جب مسلمان مضبوط ہوگئے اور کفار کی پے در پے شکستوں کے باعث کچھ استحکام کی صورتحال نظر آنے لگی تو بعض انصارؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب حالات خاصے بدل گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری اس طرح کی مدد کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمیں جہاد کے معاملات سے تھوڑا سا صرف نظر کر کے اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور کھیتی باڑی اور کاروبار کے معاملات کی طرف دوبارہ متوجہ ہونا چاہیے۔ اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی کہ

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

اس لیے اس آیت میں ہم انصار مدینہ کو اس سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آیت کریمہ کے مطابق ہلاکت کا راستہ یہ ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیا جائے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوگی اور طاقت کا توازن دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اس وضاحت کے ساتھ یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ فوجی اور دفاعی قوت کا توازن و تناسب اس طور پر قائم رکھنا ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں فوجی قوت کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی فوجی قوت میں کمی کرنا قرآن کریم کی زبان میں "قومی خودکشی" کہلائے گا۔

اس پس منظر میں جب ہم آج پاکستان کو درپیش صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف عالمی سازشوں اور بھارت کی فوجی طاقت میں مسلسل اضافہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یقیناً پاکستان کی فوجی قوت میں کمی کے مشورے وطن عزیز کے مفاد کے منافی دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے مذکورہ بالا دونوں احکام یعنی وقت کی جدید ترین فوجی قوت کے حصول کا حکم اور فوجی اخراجات میں کمی کو ہلاکت کا راستہ قرار دینا ہماری فوجی اور دفاعی پالیسی کو واضح طور پر یہ رخ دیتے ہیں کہ ہم دفاع کیلئے ایٹمی قوت کے حصول کی کوشش کریں اور انصار مدینہؓ کی طرح ہر قسم کی تنگی ترشی اور معاشی نقصانات برداشت کرتے ہوئے پاکستان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مستحکم اور ناقابل شکست فوجی قوت بنانے کی طرف توجہ دیں۔

مجاہدین کی عالمی تنظیم "حرکۃ الانصار"

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۵ء

افغانستان میں مسلح روسی جارحیت کے بعد اس خطہ کے غیور علماء اور مسلمانوں نے جہاد کا آغاز کیا تو اس میں دنیا بھر کے غیرت مند مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے علماء اور دینی کارکنوں نے بھی پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد افغانستان کیلئے علماء اور طلبہ کو منظم کرنے کے کام کا آغاز فیصل آباد کے مجاہد عالم دین مولانا ارشاد احمد شہیدؒ نے کیا اور "حرکۃ الجہاد الاسلامی" کے نام سے مجاہدین کی جماعت تیار کی جس نے مختلف محاذوں

پر افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں عملی حصہ لیا۔ مولانا ارشاد احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد یہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ مولانا سیف اللہ اختر کی قیادت میں "حرکۃ الجہاد الاسلامی" کے پلیٹ فارم پر کام ہوتا رہا اور مولانا فضل الرحمان خلیل کی سربراہی میں "حرکۃ المجاہدین" منظم ہوگئی۔ دونوں جماعتوں نے افغانستان کے مختلف محاذوں کے علاوہ تاجکستان، کشمیر اور دیگر علاقوں میں جہاد میں پرجوش حصہ لیا۔ ان کے ذریعے ہزاروں علماء اور طلبہ نے جہاد کی تربیت حاصل کی، سینکڑوں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا اور ملک کے دینی مدارس میں جہاد کی فضا قائم ہوگئی۔

دو سال قبل اکابر علماء کرام کی محنت سے دونوں جماعتوں میں اتحاد کی راہ ہموار ہوئی اور دونوں تنظیموں کے راہنماؤں نے حرکۃ الجہاد الاسلامی اور حرکۃ المجاہدین کی بجائے "حرکۃ الانصار" کے نام سے ایک نئے مشترکہ پلیٹ فارم پر کام شروع کر دیا جو اس وقت مقبوضہ کشمیر اور دیگر خطوں میں اپنی جرأت مندانہ جہادی سرگرمیوں کے باعث عالمی سطح پر متعارف ہے اور دینی بیداری کی مسلح تحریکات میں ایک باوقار اور منظم جماعت کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل چند غیر مطمئن دوست حرکۃ الجہاد الاسلامی کے دوبارہ احیاء کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا سیف اللہ اختر کی سربراہی میں اس سمت عملی پیش رفت کا آغاز ہوگیا تو اکابر علماء نے صورتحال کا بروقت نوٹس لیا اور مجاہدین کے اس وسیع حلقہ کو ایک نئے خلفشار سے بچا لیا۔ اس سلسلہ میں دو عظیم افغان کمانڈروں حضرت مولانا محمد ارسلان رحمانی اور حضرت مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ انٹرنیشنل اسلامک مشن کے سربراہ مولانا عبد الحفیظ مکی کی توجہات اور مساعی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے شبانہ روز کی محنت کے ساتھ حرکۃ الانصار اور نوتشکیل شدہ حرکۃ الجہاد الاسلامی کے راہنماؤں میں پیدا ہوجانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ان سب کو حرکۃ الانصار کے پلیٹ فارم پر دوبارہ مجتمع کر دیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف حرکۃ الانصار کی متفقہ قیادت کا چناؤ عمل میں آگیا ہے بلکہ نیا دستور اور مجلس شوریٰ بھی طے پا گئی ہے۔

ہم اس مثبت اور مبارک پیشرفت پر مولانا ارسلان رحمانی، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا عبد الحفیظ مکی اور حرکۃ الانصار کے تمام راہنماؤں اور کارکنوں بالخصوص مولانا قاری سیف اللہ اختر اور مولانا فضل الرحمان خلیل کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی بھرپور کامیابی کیلئے دعاگو ہیں، اللّٰھم ربنا آمین۔

سرد جنگ کے بعد کی صورتحال اور ورلڈ اسلامک فورم

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۵ء

افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں روسی استعمار کی پسپائی اور عالمی سرد جنگ کے نتیجہ میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد ملتِ اسلامیہ پوری دنیا میں ایک نئی صورتحال سے دوچار ہوگئی ہے۔ مغرب نے امریکی استعمار کی قیادت میں کمیونزم کے بعد اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کے ان طبقوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے جو اسلام کو اپنی شناخت قرار دیتے ہیں اور مسلم معاشرہ میں اسلامی اصولوں کی بالادستی اور حکمرانی کیلئے برسرپیکار ہیں۔

ویسٹرن سولائزیشن کی بنیاد انسانی معاشرہ کے اجتماعی معاملات میں مذہب کے کسی بھی عملی کردار سے انکار پر ہے۔ مغربی دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ عالم اسلام کے کسی حصہ میں دینی اقدار کی بنیاد پر صحیح مسلم معاشرہ وجود میں آگیا تو وہ ویسٹرن سولائزیشن کیلئے حقیقی خطرہ ثابت ہوگا اور اضمحلال کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا مغربی معاشرہ تازہ دم اسلامی سوسائٹی کا سامنا نہیں کرپائے گا۔ اسی خطرہ کے پیش نظر مغربی حکومتیں، لابیاں اور ذرائع ابلاغ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ایسے اقدامات میں مصروف ہیں جو عالم اسلام میں دینی تحریکات کی راہ میں رکاوٹ بن سکیں اور مسلم ممالک میں بے دینی کے اثرات کو مستحکم کرسکیں۔

مغربی دانشوروں کا خیال تھا کہ گذشتہ دو سو سال کے عرصہ میں مسلم ممالک پر مغربی ممالک کے تسلط کے دوران ان علاقوں میں آزاد خیالی اور تہذیب و ترقی کے نام پر مذہبی اقدار سے بے زاری کا جو بیج بویا گیا ہے اس کی فصل پک چکی ہے اور اب مذہبی حلقوں میں نئے رجحانات کا سامنا کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح مغربی اہل دانش یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف مسلمان ملکوں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں مغربی ممالک میں آبسی ہے، وہ یا ان کی آئندہ نسل مکمل طور پر مغربی سانچے میں ڈھل کر اپنے علاقوں میں مغربیت کے اثرات کی تقویت کا سامان فراہم کرے گی۔ لیکن مغربی دانشوروں کے یہ دونوں خیال غلط ثابت ہوئے ہیں اور جہاں مسلم ممالک میں دن بدن قوت پکڑتی ہوئی دینی بیداری کی تحریکات نے مغرب کی سیکولر لابیوں کی توقعات خاک میں ملادی ہیں وہاں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں میں اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کا روز افزوں احساس بھی مغربی دانشوروں کیلئے پریشان کن صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور وہ محض چند عبادات یا اخلاقی ہدایات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاشرہ کی تمام ضروریات پر محیط مکمل نظام حیات ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنی ضرورت و افادیت کو فطری انداز میں اجاگر کرتا جارہا ہے۔ جبکہ تکوینی طور پر بھی عالمی سطح پر رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں اسلام کے ساتھ انسانیت کے مستقبل کا رشتہ جوڑتی دکھائی دے رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان قوتوں کی سرگرمیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں جو اسلام کا راستہ روک دینا چاہتی ہیں اور عالم اسلام کی دینی قوتوں کے خلاف فیصلہ کن محاذ آرائی کا آغاز کرچکی ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کے ساتھ مغربی قوتوں کا معاملہ اس سے قبل بھی کبھی دوستانہ نہیں رہا لیکن روسی استعمار کے خلاف سرد جنگ کے دوران مسلم ممالک کے ساتھ بظاہر ہمدردانہ تعلق مغرب کی اپنی ضرورت تھا جو اس ضرورت کی حد تک اس دوران ضرور قائم رہا مگر اسی تعلق کے حوالے سے مغرب کو مسلم ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو بڑھانے اور مسلم دارالحکومتوں میں اپنی گھاتیں قائم کرنے کا موقع بھی ملتا رہا ہے جو آج بھی مغربی مفادات کیلئے پوری کامیابی کے ساتھ استعمال ہورہی ہیں اور دینی حلقوں کے مقابلے کیلئے روبوٹ کا کام دے رہی ہیں۔

روسی استعمار کا خاتمہ اور اس کے تسلط سے افغانستان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی عالم اسلام اور مغربی استعمار کی مشترکہ ضرورت تھی جس کیلئے ایک عرصہ تک دونوں میں تعاون کی فضا قائم رہی۔ لیکن آج جبکہ مشترکہ دشمن سامنے سے ہٹ گیا ہے، عالم اسلام اور مغربی استعمار کے درمیان باہمی تعاون و مفاہمت کی مجبوری باقی نہیں رہی تو دونوں ایک دوسرے کے حریف کے طور پر آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ اس میں مغرب کو یہ تفوق بہرحال حاصل ہے کہ وہ مستحکم ہے،

منظم ہے، متحد ہے، اس کے وسائل مجتمع اور ترقی یافتہ ہیں اور اس کی ترجیحات طے شدہ ہیں۔ جبکہ عالم اسلام منتشر ہے، غیر مستحکم ہے، اپنے وسائل پر اس کا کنٹرول نہیں ہے، اس کی بیشتر حکومتیں مغرب کی ہمدرد یا اس سے مرعوب ہیں اور ترجیحات تو رہیں ایک طرف اس کے اہداف بھی واضح طور پر متعیّن نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس صورتحال کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اسلام کی بالادستی کا راستہ روکنے کی اس جنگ میں مغرب کی مستحکم حکومتوں، منظم لابیوں اور ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کا مقابلہ مسلم ممالک کی حکومتوں سے نہیں بلکہ ان دینی تحریکات سے ہے جو اپنی اپنی جگہ پورے اخلاص کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہیں۔ لیکن نہ ان تحریکات کے پاس اقتدار اور حکومت کے وسائل ہیں اور نہ وہ باہمی ربط و مشاورت اور مشترکہ قیادت سے بہرہ ور ہیں جو اس جنگ میں ان کیلئے اجتماعی حکمت عملی اور ترجیحات کا تعین کر سکے۔

مغرب اس جنگ کو بھی سرد جنگ کے دائرے میں محدود رکھے ہوئے ہے اور اسلحہ اور ہتھیار کا استعمال انتہائی اہم ضرورت کے بغیر اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ اس جنگ میں اس کے اصل ہتھیار تعلیم، میڈیا اور نفسیاتی حربے ہیں جن کے ذریعے وہ ملتِ اسلامیہ کی رائے عامہ کے ذہن کو کنٹرول میں رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہاں تک عالم اسلام کی دینی قوتوں کی رسائی نہ ہو سکے اور دنیا کی مسلم رائے عامہ کی عظیم قوت اسلامی اصولوں کی بالادستی اور ایک صحیح مسلم معاشرہ کے قیام کی طرف پیش رفت نہ کر سکے۔ اس مقصد کے لیے

- مغرب، ویسٹرن سولائزیشن کو انسانی معاشرت کا نقطۂ عروج قرار دے کر اس کی طرف پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام کو دعوت دے رہا ہے،
- اسلامی احکام و قوانین کو انسانی حقوق اور سولائزیشن کے منافی قرار دے کر ان کے خلاف نفرت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے،
- اور عالم اسلام کی دینی تحریکات پر بنیاد پرست اور دہشت گرد کا لیبل چسپاں کر کے باقی دنیا کو ان سے دور رکھنے کی تگ و دو کر رہا ہے۔

اس صورتحال میں شدت کے ساتھ اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ عالمی سطح پر حالات کی تیز رفتار تبدیلی اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے نئے تقاضوں اور ضروریات کی طرف دینی حلقوں کو متوجہ کرنے کیلئے منظم جدوجہد کی جائے۔ کیونکہ بدقسمتی سے آنے والے حالات کے رخ کا بروقت اندازہ کرنا اور اس کے تقاضوں کو محسوس کرنا ہمارے قومی مزاج کا حصہ نہیں بن سکا اور پہلی چار پانچ صدیوں کو چھوڑ کر ہر دور میں ملتِ اسلامیہ کو نئے تقاضوں کا احساس دلانے کیلئے اہل فکر و دانش کو خاصی چیخ و پکار کرنا پڑی ہے۔ جیسا کہ برصغیر کے معرف دانشور مفکر احرار چودھری افضل حق مرحوم نے قوموں کا مزاج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریز کوئی کام کرنے سے پہلے سالوں سوچتا ہے اور اس کی منصوبہ بندی کرتا ہے، ہندو مہینوں پہلے سوچتا ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے، جبکہ مسلمان کام کرتا جاتا ہے اور سوچتا جاتا ہے۔ اور برصغیر ہی کی ایک اور قوم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کام کر چکنے کے بعد سوچنے کی عادی

ہے۔ مگر مغربی میڈیا کی فسوں کاری کی داد دینا پڑتی ہے کہ مسلمان کو اس مقام پر بھی نہیں رہنے دیا کہ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچ اور فکر سے کام لے سکے، چنانچہ یہ المناک صورتحال دیکھنا پڑ رہی ہے کہ کام ہو رہا ہے مگر کام کرتے ہوئے بھی اس کے سود و زیاں کے بارے میں سوچنے کی عادت بیدار نہیں ہو رہی۔

مسلم ممالک میں دینی حلقوں اور جماعتوں کی کمی نہیں بلکہ بعض مقامات پر وہ ایک سے دو، اور دو سے تین ہوتی جا رہی ہیں۔ دینی ادارے مسلسل قائم ہو رہے ہیں، سوسائٹیاں بن رہی ہیں، اپنی اپنی بساط کے مطابق سب لوگ کام کر رہے ہیں اور وسائل، محنت اور خلوص کا فقدان بھی نہیں ہے۔ مگر جس چیز کا فقدان ہے وہ ہے: حالات کی تبدیلی کا احساس، نئے تقاضوں سے آگاہی، باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ کام کرنے کی ترجیحات اور تقسیم کار کا تعین، اور مشترکہ اہداف کیلئے مشترکہ جدوجہد کا اہتمام۔

دینی اداروں اور تحریکات کی جدوجہد میں یہ خلا حالات کی تیز رفتار تبدیلی کے پس منظر میں اہل فکر و دانش کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہا ہے اور یہی احساس "ورلڈ اسلامک فورم" کے قیام کا بنیادی محرک بنا ہے۔ ورلڈ اسلامک فورم کا قیام نومبر ۱۹۹۲ء کے دوران لندن میں عمل میں لایا گیا تھا جب لیٹن سٹون لندن میں الحاج غلام قادر کی رہائش گاہ پر چند اہل فکر جمع ہوئے، بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالباقی رحمہ اللہ تعالیٰ کی صدارت میں اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل مقاصد کیلئے فورم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا:

- اسلام کی دعوت اور اسلامی نظام کو جدید اسلوب اور زبان میں دنیا کے سامنے پیش کرنا۔
- اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی سیکولر لابیوں اور ذرائع ابلاغ کی منفی مہم کا ادراک اور تعاقب۔
- جدید ترین ذرائع ابلاغ تک رسائی کی کوشش۔
- عالم اسلام کی دینی تحریکات اور اداروں کے درمیان رابطہ اور مشاورت کا فروغ۔
- مغربی ممالک میں مقیم مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے کی جدوجہد۔

عام طور پر کسی نئے کام کیلئے نئی جماعت اور حلقے کا قیام ہمارے ہاں ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جماعت، حلقے یا ادارے کے قیام کے بعد توجہات اور صلاحیتوں کا بیشتر حصہ اپنے وجود کا احساس دلانے، دائرہ کو وسعت دینے اور جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے پر صرف ہو جاتا ہے، جبکہ اصل ہدف و مقاصد توجہات کا بہت کم حصہ حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ورلڈ اسلامک فورم کے قیام کے ساتھ ہی یہ حکمت عملی اختیار کر لی گئی تھی کہ فورم کو مستقل جماعت یا فکری حلقہ کی شکل دینے کی بجائے ہم خیال دوستوں کی ایک سوسائٹی کے درجہ میں رکھا جائے گا اور جو ادارے، حلقے، جماعتیں اور گروہ مختلف محاذوں پر کام کر رہے ہیں انہی کو توجہ دلا کر اجتماعی مقاصد کی طرف پیش رفت کی کوشش کی جائے گی۔ گویا ورلڈ اسلامک فورم تمام علمی و دینی اداروں، جماعتوں اور حلقوں کا خادم ادارہ ہے جس کا کام وقت کے تقاضوں کو محسوس کرنا، ان کی نشاندہی کرنا اور متعلقہ اداروں کو ان کی طرف توجہ دلا کر ان کی بریفنگ کا اہتمام کرنا ہے۔ اس کے ساتھ تعلیم اور میڈیا کے شعبوں میں خصوصی توجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں چند عملی اقدامات بھی کیے گئے جن کی

تفصیل آگے آ رہی ہے۔

کسی نئی جماعت یا سوسائٹی کے قیام کے بعد کام کو منظم کرنے کیلئے وسائل و اسباب کی فراہمی سب سے اہم مسئلہ ہوتی ہے جس کیلئے عام چندے یا مسلم حکومتوں سے رابطے کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے لیکن فورم کیلئے معروضی حالات میں ان میں سے کوئی طریق کار اختیار کرنا مشکل تھا۔ عام چندہ اس لیے کہ مساجد میں عمومی چندہ کیلئے جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارے نزدیک باوقار صورت نہیں ہے اور کسی مسلم حکومت کے ساتھ رابطہ سے اس لیے گریز کیا گیا کہ عالم اسلام بالخصوص مغربی ممالک کے مسلمانوں میں مختلف مسلم حکومتوں اور لابیوں اور ان کے درمیان کشمکش کی جو صورتحال کافی عرصہ سے دیکھنے میں آ رہی ہے اس کے پیش نظر کسی مسلم حکومت کی لابی سے وابستہ ہونا فورم کے بنیادی مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس قسم کی وفادارانہ وابستگی کے بغیر کوئی حکومت کسی ادارے سے تعاون کیلئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ فورم کے کاموں کو ممبر شپ کی فیس اور اصحابِ خیر کے تعاون سے آگے بڑھایا جائے گا مگر بدقسمتی سے ہم نہ تو زیادہ تعداد میں دوستوں کو ممبر شپ کیلئے آمادہ کر سکے اور نہ ہی اصحاب خیر کو اپنے پروگرام کی اہمیت سمجھانے میں ہمیں کامیابی ہوئی ہے۔ اس لیے اسباب و وسائل کا پہلو خاصا تشنہ ہے اور اس سلسلہ میں فورم مسلسل مقروض اور زیربار ہے۔ اس کے باوجود ورلڈ اسلامک فورم اپنے قیام کے بعد سے اب تک پونے تین سال کے عرصہ میں جو خدمات سرانجام دے سکا ہے اس کی رپورٹ پیش خدمت ہے۔

چیچنیا کے صدر جوہر داؤد دوفؒ کی شہادت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۶ء

چیچنیا کے مجاہد صدر جوہر داؤد دوفؒ گذشتہ دنوں روسی فوجوں کی گولہ باری کے دوران ایک مورچہ میں جامِ شہادت نوش کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ گذشتہ پانچ برس سے روسی جارحیت کے خلاف اپنی بہادر قوم کی جنگِ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ جوہر داؤد دوفؒ ایک ماہر ہوا باز کے طور پر روسی فوج میں شامل رہے ہیں مگر سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد جب اس خطہ کی ریاستیں آزاد ہوئیں تو چیچنیا کے مسلمانوں نے بھی آزادی کا پرچم بلند کر دیا اور جوہر داؤد دوفؒ جیسے عظیم مجاہد نے ان کی قیادت سنبھال لی۔ چیچنیا ایک ملین کے لگ بھگ آبادی کی ریاست ہے اور یہاں کے مسلمان ہر دور میں روسی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

چیچنیا کے ساتھ ہی داغستان ہے جس کا ذکر برصغیر پاک و ہند کی جدوجہدِ آزادی میں اکثر ہوتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کے باقی ماندہ افراد نے معرکہ بالاکوٹ کے بعد اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس خطہ کو کوہ قاف کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور روسی استعمار کے خلاف امام شاملؒ کی یادگار جنگِ آزادی کی تگ و تاز کا مرکز بھی یہی خطہ ہے۔

ہفت روزہ ''العالم الاسلامی'' مکہ مکرمہ نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں چیچنیا کے ایک اور لیڈر روسلان حبولاتوف کے ایک خط کے حوالے سے چیچنیائی مسلمانوں کے قتلِ عام کے بارے میں اعداد و شمار کی رپورٹ شائع کی ہے۔ روسلان حبولاتوف چیچنیا میں صدر جوہر داؤد دوفؒ کے سیاسی حریف سمجھے جاتے تھے اور روسی پارلیمنٹ کے اسپیکر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے روسی حکومت کے نام ایک خط میں بتایا ہے کہ چیچنیا کی دس لاکھ کے لگ بھگ آبادی میں سے روسی افواج کی حالیہ جارحیت کے ہاتھوں ساٹھ ہزار سے زائد افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ چار لاکھ کے قریب افراد ہجرت پر مجبور ہوئے ہیں اور ایک لاکھ کے قریب زخمی کسی طبی امداد کے بغیر پڑے ہیں۔ اس مکتوب کے مطابق چیچنیا کی چار سو دس بستیوں میں سے تین سو ستر بستیاں تباہ ہو چکی ہیں اور باقی ماندہ لوگوں کی اکثریت مسمار شدہ مکانوں میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ حبولاتوف کا کہنا ہے کہ انہوں نے صدر جوہر داؤد دوفؒ کو مصالحت کیلئے مذاکرات پر آمادہ کر لیا تھا لیکن روسی حکومت نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مسلح جارحیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے روسی قیادت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی ترک کر کے جارحیت کا سلسلہ روکے اور چیچنیائی مسلمانوں کا قتلِ عام بند کرے۔

اس صورتحال کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ بوسنیا کی طرح چیچنیا کے مسلمانوں کا قتلِ عام بھی عالمِ اسلام کی مسلمان حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کا ضمیر بیدار نہیں کر سکا۔ بلکہ بیشتر مسلمان حکومتیں اور ادارے چیچنیا پر روس کی وحشیانہ جارحیت اور مسلمانوں کے قتلِ عام پر اس درجہ کے رسمی احتجاج کا اظہار بھی نہیں کر سکے جس کا بوسنیا کے بارے میں ایک حد تک برائے نام ہوتا رہا ہے۔ شاید رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں اسی صورتحال کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

> ''تمہارا کیا حال ہو گا جب دنیا کی کافر قومیں تم پر حملہ آور ہونے کیلئے ایک دوسرے کو یوں دعوت دیں گی جیسے میزبان تیار دستر خوان پر مہمان کو کھانے کی دعوت دیتا ہے؟''

سچی بات ہے آج ہم اپنی بداعمالیوں اور قرآن و سنت سے انحراف کی وجہ سے دنیا بھر میں کافر قوموں کیلئے تَر نوالہ بن چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اجتماعی طور پر استغفار اور اصلاح کے ساتھ اپنی حالت درست کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

طالبان کا پہلا دور

(۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء)

افغانستان میں
دینی مدارس کے طلبہ کی حکومت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۶ء

راقم الحروف کو ۹ اور ۱۰ جون کو افغانستان میں طالبان کے دارالحکومت قندھار اور افغانستان کے سرحدی قصبہ سپین بولدک میں طالبان کے راہنماؤں کے ساتھ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال پر گفت وشنید اور افغانستان کے اس خطہ کے حالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اس دوران جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان میں طالبان کے امیر مولوی محمد عمر اخوند، چیف جسٹس مولوی سید محمد پسنئی، گورنر قندھار حاجی ملا محمد حسن اخوندزادہ، آئی جی پولیس ملا عبدالصمد ثانی، طالبان کے ترجمان مفتی محمد معصوم افغانی، اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے دو ارکان مولوی محمد صدیق اور مولوی سیف الدین بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی سید محمد پاسنئی کا شمار علاقہ کے بڑے علماء میں ہوتا ہے، ان کے علاوہ باقی سب مذکورہ حضرات دینی مدارس کے طلبہ ہیں جو مختلف دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور جہادِ افغانستان میں عملاً شریک رہے ہیں۔

جہادِ افغانستان کے بعد جہاد کے منطقی نتائج یعنی شرعی نظام کا نفاذ اور امن کا قیام سامنے نہ آنے پر یہ لوگ پریشان ہو گئے اور ”تنگ آمد بجنگ آمد“ کے مصداق رفتہ رفتہ منظم ہو کر انہوں نے پہلے سرحدی قصبہ سپین بولدک اور پھر صوبائی دارالحکومت قندھار پر قبضہ کر لیا، جس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور وہ گذشتہ ڈیڑھ سال کے دوران افغانستان کے تیس میں سے پندرہ صوبوں پر قبضہ کرنے کے بعد کم و بیش تیس ہزار کی مسلح فورس قائم کر چکے ہیں، جو زیادہ تر دینی مدارس کے ان طلبہ پر مشتمل ہے جو جہادِ افغانستان کے دوران روسی جارحیت کے خلاف عملاً برسرِپیکار رہے ہیں۔

طالبان کے امیر مولوی محمد عمر اخوند ایک سادہ سے مخلص اور دیندار نوجوان ہیں، افغانستان ہی کے دینی مدارس میں پڑھتے رہے ہیں، جہادِ افغانستان کے دوران تین بار زخمی ہوئے، ایک آنکھ کو بھی نقصان پہنچا اور ایک بار علاج کیلئے پاکستان لائے گئے، اس کے علاوہ کبھی افغانستان سے باہر نہیں گئے۔

طالبان کا طریق کار یہ ہے کہ جس علاقہ پر قبضہ کرتے ہیں، وہاں کی عام آبادی کو نہتا کر دیتے ہیں۔ کسی عام شخص کے پاس ایک پستول بھی نہیں چھوڑتے، جس کی وجہ سے امن قائم ہونے کے علاوہ اسلحہ کی ایک بہت بڑی مقدار ان کی تحویل میں آجاتی ہے۔ اس کے بعد وہاں شرعی عدالتیں قائم کر دیتے ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں، اور امن و امان کو سادگی کے ساتھ کنٹرول کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام ان کے ساتھ ہیں۔ قندھار کے بازاروں میں رونق نظر آتی ہے، زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے، مہاجرین رفتہ رفتہ واپس آکر آباد ہو

رہے ہیں، اور ایک افغان راہنما کے بقول اب قندھار شہر کے اندر کسی عمارت کا خریدنا یا کرائے پر لینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

طالبان کو عالمی سطح پر "بنیاد پرست" سمجھا جاتا ہے، اس لیے انہیں کسی حکومت یا عالمی ادارے کی سرپرستی یا ہمدردی حاصل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے سیاسی تعارف، مالی مشکلات کے حل، اور میڈیا کے ساتھ رابطے میں انہیں دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ تاہم امید ہے کہ وہ اپنے خلوص، سادگی اور قناعت کی بدولت بالآخر ان مشکلات پر قابو پا لیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مشن میں کامیابی سے نوازیں اور عالمی سازشوں کا شکار ہونے سے بچائیں، آمین یا رب العالمین۔

افغانستان میں تین حکومتیں اور عالمی قوتوں کی حکمتِ عملی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۶ء

روزنامہ جنگ لاہور نے ۱۸ اگست ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں وائس آف جرمنی کے حوالے سے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ افغانستان میں ربانی حکومت کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے دو امریکی فرموں نے جنرل رشید دوستم کے ساتھ تیل کی تلاش اور ازبکستان سے پاکستان تک تیل کی پائپ لائن تعمیر کرنے کے معاہدے کیے ہیں اور اس پاپ لائن کے تحفظ کیلئے انہوں نے طالبان کے ساتھ بھی معاہدہ طے کر لیا ہے۔

افغانستان کی صورتحال اس وقت یہ ہے کہ وہاں تین الگ الگ حکومتیں قائم ہیں:

1. کابل میں پروفیسر برہان الدین ربانی اور انجینئر گلبدین حکمت یار کی حکومت ہے جن کے زیر اثر سات یا آٹھ صوبے بتائے جاتے ہیں۔
2. شمال میں مزار شریف پر جنرل رشید دوستم حکمران ہیں اور سات صوبے ان کی تحویل میں ہیں۔
3. جبکہ جنوب اور مغرب کے پندرہ صوبے طالبان کی تحویل میں ہیں اور قندھار ان کا دارالحکومت ہے۔

امریکہ اور اقوامِ متحدہ نے ربانی حکومت کو باقاعدہ حکومت کے طور پر تسلیم کیا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود دوستم اور بعض امور میں طالبان کے ساتھ بھی الگ الگ معاملات طے کرنے کی کوششیں جاری ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ بہادر افغانستان کی موجودہ منقسم شدہ صورتحال کو اپنے مفاد میں سمجھتے ہوئے اسے برقرار رکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور خاص طور پر جنرل رشید دوستم کی حکومت کو مضبوط و مستحکم دیکھنا چاہتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے موقع پر امریکہ نے روس کو زچ کرنے کیلئے افغانستان کے حریت پسند مجاہدین کی دل کھول کر امداد کی، لیکن روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جب کابل پر مجاہدین کی نظریاتی اسلامی

حکومت قائم ہونے کے امکانات واضح ہوئے تو امریکہ اور روس دونوں نے مصالحت کر کے اس کا راستہ روکنے کیلئے سازشوں کا آغاز کر دیا۔ دونوں کو یہ خطرہ ہے کہ کابل میں اگر مستحکم اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو وہ نہ صرف پاکستان اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک پر اثرانداز ہوگی بلکہ وسطی ایشیا کی نوآزاد مسلم ریاستیں بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ اس لیے امریکہ اور روس دونوں کی مشترکہ کوشش یہ ہے کہ کابل میں مجاہدین کی کوئی مشترکہ اور مضبوط نظریاتی حکومت نہ بن سکے، بلکہ کابل اور طالبان کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنرل رشید دوستم کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دیا جائے جو جہادِ افغانستان کے دوران کمیونسٹ جرنیل کے طور پر مجاہدین کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہے ہیں اور آخر میں کابل کے قبضہ میں احمد شاہ مسعود کے ساتھ تعاون کر کے وہ مزار شریف سمیت شمال کے بعض اہم علاقوں میں اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جنرل دوستم کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ آزاد خیال مسلمان ہونے کی وجہ سے مغربی مفادات کے زیادہ بہتر محافظ بن سکتے ہیں، اور ان کے زیر تسلط علاقہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے درمیان واقع ہے جو کسی بھی وقت "بفر اسٹیٹ" کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ مغربی قوتوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے ہیں اور ان کے استحکام و ترقی میں سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں وائس آف جرمنی کی مذکورہ رپورٹ کا یہ حصہ بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ

> "دوستم کا علاقہ امریکہ کی نظر میں ایک ایسی مضبوط دیوار ثابت ہوگا جو کہ افغانستان سے اسلامی بنیاد پرستی کو وسطی ایشیا میں داخل ہونے سے روکے گی۔"

ہمارا خیال ہے کہ افغانستان کے بارے میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی موجودہ حکمتِ عملی کی تہہ تک پہنچنے کیلئے یہی بات کافی ہے۔ اس پس منظر میں وہ قوتیں جو ربانی حکومت اور طالبان کے درمیان مصالحت کیلئے کسی درجہ میں بھی کوئی کردار ادا کر سکتی ہیں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے متحرک ہونا چاہیے، کیونکہ جہادِ افغانستان کے منطقی نتائج حاصل کرنے اور افغانستان کو امریکہ دوستم گٹھ جوڑ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت اور برطانیہ کے مسلم دانشور

روزنامہ وفاق، لاہور --- ۱۴ نومبر ۱۹۹۶ء

کابل پر طالبان کے قبضہ کے بعد جہاں ان کے خلاف مغرب کی میڈیا وار میں تیزی آگئی ہے وہاں مغرب میں مقیم مسلم دانشوروں اور علماء میں بھی حرکت پیدا ہوئی ہے اور اس میڈیا وار میں شرکت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں اس وقت تک اس سلسلہ میں تین اجتماعات ہو چکے ہیں۔ پہلا اجتماع ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام ۵ اکتوبر کو نارتھ لندن کی مرکزی جامع مسجد فنس بری پارک میں ہوا۔ دوسرا اجتماع پاکستان شریعت کونسل برطانیہ کے زیر اہتمام ۱۳ اکتوبر کو

مدرسہ قاسم العلوم واش وڈ ہیتھ برنگھم میں ہوا۔ جبکہ تیسرا اجتماع ۱۹ اکتوبر کو مسلم کمیونٹی سنٹر الفورڈ لندن میں مسلم لیگ اصلی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ ان اجتماعات میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے شرکت کی جن میں سعودی عرب کے جلاوطن اپوزیشن لیڈر ڈاکٹر محمد المسعری، ممتاز شامی عالم اور المہاجرون کے امیر الشیخ عمر بکری محمد، اباداں یونیورسٹی نائجیریا کے پروفیسر داؤد نوبی، ڈاکٹر خالد علوی، بیرسٹر یوسف اختر، مولانا محمد عیسیٰ منصوری، ڈاکٹر اختر الزمان غوری، بیرسٹر محمد فاروق، اور فیاض عادل فاروقی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

راقم الحروف کو بھی ان تینوں اجتماعات میں شرکت کا موقع ملا۔ ان ارباب فکر و دانش نے طالبان اور افغانستان کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

طالبان کی کامیابی پر دینی حلقوں کا اطمینان

ایک حصہ اس مسرت اور اطمینان کے اظہار پر مشتمل ہے جو طالبان کی کامیابیوں پر دنیا بھر کے دینی حلقوں میں پایا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ طویل عرصہ کے بعد کسی مسلمان ملک میں یہ عزم سننے میں آیا ہے کہ وہاں قرآن و سنت کی بالادستی پر مبنی مکمل شرعی نظام قائم کیا جائے گا۔ اور اعلان کرنے والے بھی دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ ہیں جن کی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی ہے، اس لیے ان کے دعویٰ اور عزم کی تکمیل کے بارے میں اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ بعض مقررین کا کہنا تھا کہ خلافت، امیر المومنین، اور اسلامی حکومت کا نام سننے کیلئے مسلمانوں کے کان ترس گئے تھے اور اب طالبان کی صورت میں اہل اسلام کا یہ دیرینہ خواب پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

طالبان کی طرف سے اسلام کے نام پر ناقابلِ قبول اقدامات کا خدشہ

دوسرے نمبر پر مقررین نے اس بات پر اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ طالبان کے تمام تر خلوص، جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود کسی نظام کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد کے بارے میں تجربہ نہ ہونے کے باعث خدشہ ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ایسے اقدامات نہ کر بیٹھیں جو آج کی دنیا میں اسلامی نظام کے بہتر تعارف کی بجائے اس کی بدنامی کا باعث بن جائیں۔ ان اہل دانش کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں اسلامی نظام کے حوالے سے بہت سے امور کا طے ہونا باقی ہے جو ظاہر ہے کہ اجتہاد کے ذریعے اہل اجتہاد کے ہاتھوں طے ہوں گے۔ لیکن ایسا کوئی بھی اجتہاد کسی ایک ملک کے مخصوص حالات اور مسائل کے پس منظر میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ پوری دنیا اور عالم اسلام کے اجتماعی اصول اور ضروریات کو سامنے رکھ کر اس عمل کو آگے بڑھنا چاہیے۔ ورنہ اگر ہر ملک کی اسلامی تحریک اجتہادی امور کے حوالے سے الگ الگ تعبیر پر کھڑی ہوگئی تو عالمی سطح پر اسلام کے عالمگیر مذہب اور نظام ہونے کا تصور دھندلا پڑ جائے گا۔ اس ضمن میں ارباب فکر و دانش نے دو تجاویز پیش کی ہیں۔

1. ایک پاکستان کے علماء کرام اور اہل دانش کیلئے ہے، بالخصوص ان علماء کرام کیلئے جن کے اثرات افغانستان کے علماء اور طالبان میں موجود ہیں کہ یہ اہل علم و اہل دانش باہمی مشاورت کے ساتھ طالبان کی علمی و فکری راہنمائی کا اہتمام کریں۔
2. دوسری تجویز طالبان کیلئے ہے کہ وہ خود دنیائے اسلام کی علمی شخصیات، دینی اداروں، اور اسلامی تحریکات کے ساتھ اس قسم کے روابط اور مشاورت کا اہتمام کریں کہ ان کا قائم کردہ نظام دنیا بھر کے رہنما اداروں اور علمی حلقوں کے اعتماد سے بہرہ ور ہو اور دنیا کے ہر مسلم ملک کیلئے مثال بن سکے۔

مغربی میڈیا کی جانب سے طالبان کی کردار کشی

ان اجتماعات میں شرکت کرنے والے اہل دانش نے طالبان کے حوالے سے مسئلہ کے جس تیسرے پہلو پر اظہار خیال کیا وہ طالبان کے خلاف مغربی ذرائع ابلاغ کی عیارانہ مہم ہے جس کا مقصد طالبان کی کردار کشی کے سوا کچھ نہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مغربی میڈیا نے ایک عرصہ سے اسلام اور دیندار مسلمانوں کو اپنا ہدف بنا رکھا ہے کیونکہ مغرب اسلام سے خوفزدہ ہے۔ اور یہ خوف اس کے ذہن پر سوار ہو گیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اگر صحیح اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور ایک مثالی اسلامی حکومت اور سوسائٹی تشکیل پا گئی تو مغرب کا کھوکھلا فلسفہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے گا۔ اس لیے مغرب کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ کسی مسلم ملک میں صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہونے دی جائے اور اسلام کے نفاذ کی علمبردار تحریکات کو اس قدر بدنام کیا جائے کہ رائے عامہ ان کی بات سننے کو تیار نہ ہو۔ آج کل طالبان بھی مغرب کی اسی مہم کا سب سے بڑا نشانہ ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مغرب کے پریس میں چھپ رہی ہیں اور ان پر دلچسپ تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔

مثلاً ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ طالبان نے پولیس کے اہلکاروں کو وردی کے ساتھ نکٹائی پہننے سے منع کر دیا ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کو زدوکوب کیا گیا ہے۔ اس پر ایک صاحب نے بے ساختہ تبصرہ کیا کہ ''یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ ہم نے کسی فورس کی وردی میں آج تک نکٹائی نہیں دیکھی۔''

اسی طرح چند روز قبل ایک خبر چھپی کہ طالبان نے کابل میں ایسے خوش نوا پرندے جبراً آزاد کرا دیے ہیں جن کے مالکان نے ان پرندوں کو موسیقی اور گانے کی تربیت دے رکھی تھی اور وہ ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس خبر پر ایک صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ ''دیکھو! آزادی کے ان ٹھیکیداروں کو پرندوں کو آزاد کرنے پر بھی تکلیف ہو رہی ہے۔''

الغرض طرح طرح کی خبریں اور عجیب و غریب تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ اس سارے قصے میں مذکور بالا ارباب فکر و دانش کیلئے باعث تشویش بات یہ ہے کہ طالبان کے خلاف تو بہت کچھ چھپ رہا ہے اور عالمی میڈیا ان کے خلاف منظم اور مربوط جنگ میں مصروف ہے مگر طالبان کو اپنے موقف اور پالیسیوں کو عالمی سطح پر پیش کرنے اور ان کو اپنی باتوں کی خود وضاحت کرنے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔

اسامہ بن لادن اور سعودی علماء کرام کی جدوجہد

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۷ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۴ دسمبر ۱۹۹۶ء کی ایک خبر کے مطابق سعودی عرب کے ایک جلاوطن لیڈر اسامہ بن لادن نے سعودی حکومت کی یہ پیشکش مسترد کر دی ہے کہ اگر وہ سعودی حکومت کو ایک اچھی اسلامی حکومت قرار دیں تو انہیں سعودی عرب واپس آنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ قریبی ذرائع کے مطابق اسامہ بن لادن کا کہنا ہے کہ سعودی حکومت نے متعدّد قوانین ایسے نافذ کر رکھے ہیں جو قرآن و سنت کے منافی ہیں، نیز سعودی شاہی خاندان دولت کی ریل پیل کی وجہ سے انتہائی کرپٹ ہو چکا ہے اور امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی مسلح افواج کی جزیرۂ عرب میں مسلسل موجودگی سے سعودی عرب کی خود مختاری اور حرمین شریفین کا تقدس مجروح ہو رہا ہے، اس لیے ان حالات میں وہ سعودی حکومت کی اس پیشکش کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متمول خاندان کے فرزند ہیں جو ''بن لادن فیملی'' کے نام سے تجارتی حلقوں میں خاصا معروف ہے۔ اسامہ نے روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کے جہادِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ مجاہد گروپوں کی دل کھول کر مالی مدد کی اور خود بھی عملاً جہاد میں سالہا سال تک شریک رہے۔ اسامہ بن لادن نے سوڈان میں اسلامی اصلاحات کی حمایت کی اور سوڈان کو معاشی طور پر خود کفیل بنانے کا منصوبہ دیا، اس منصوبہ پر خود سوڈان میں بیٹھ کر عملدرآمد کرایا، مالی مدد کی اور بھرپور تعاون کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو سوڈان ہمیشہ قحط زدہ ملک سمجھا جاتا رہا ہے ان زرعی اصلاحات اور ترقی کی وجہ سے گندم برآمد کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ اسامہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی جہادی تحریکات کی عملی سرپرستی اور معاونت میں ایک عرصہ سے سرگرم ہیں جس کی وجہ سے امریکہ نے انہیں سرکاری طور پر دہشت گرد قرار دے رکھا ہے، اسی وجہ سے انہیں سعودی عرب سے جلاوطن ہونا پڑا اور پھر سوڈان سے بھی مسلسل امریکی دباؤ اور دھمکیوں کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ آج کل اسامہ بن لادن افغانستان میں ہیں اور وہاں سے انہیں نکالنے کیلئے امریکہ طالبان کی حکومت پر مسلسل دباؤ بڑھا رہا ہے۔

اسامہ بن لادن کا موقف یہ ہے کہ

- جزیرہ عرب سے امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی فوجوں کو بلا تاخیر نکال دینا چاہیے،
- سعودی عرب اور تمام ممالک میں خالص اسلامی شرعی حکومت قائم ہونی چاہیے، اور
- عالمی سطح پر خلافتِ اسلامیہ کا احیا ہونا چاہیے، اس مقصد کیلئے وہ مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔

اس کے ساتھ سعودی علماء کی اس جدوجہد کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہی مقاصد کیلئے کئی سالوں سے جاری ہے۔ ۱۹۹۳ء میں سرکردہ سعودی علماء نے حکومت کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں

- امریکی فوجوں کی واپسی،
- خالص اسلامی حکومت کے قیام،

- سودی معیشت کے خاتمہ، اور
- نظامِ مملکت میں شرعی اصلاحات

کے مطالبے کیے گئے ہیں۔ اس کی پاداش میں سینکڑوں علماء اور دانشور گرفتار کر لیے گئے جن میں الشیخ سفر الحوالی اور الشیخ سلیمان عودہ جیسے سرکردہ سلفی علماء شامل ہیں اور وہ اب بھی جیل میں ہیں۔ انہی علماء کا ایک گروپ لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور لجنة الدفاع عن الحقوق الشرعية کے نام سے سعودی علماء کی مذکورہ یادداشت کے مطابق جدوجہد میں مصروف ہے۔

حرمین شریفین کی حفاظت اور خدمت کے باعث سعودی عرب کی شاہی حکومت کو عالمِ اسلام میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس مناسبت سے یہ احترام سعودی حکومت کا ایک حد تک حق بھی ہے۔ لیکن سعودی عرب کے دینی حلقوں اور علماء کی جدوجہد اور مطالبات بھی ایسے نہیں جنہیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکے۔ حالات اس قدر پوشیدہ اور مخفی نہیں ہیں کہ انہیں معلوم کرنے کیلئے زیادہ تگ و دو کی ضرورت ہو۔ اس لیے ہمارے خیال میں پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے دینی حلقوں اور اداروں کو اس سلسلہ میں مصلحت بلکہ مداہنت سے کام لینے کی بجائے کھلی آنکھوں سے صورتحال کا ادراک کرنا چاہیے اور سعودی عرب کے علماء اور دینی حلقوں کی اس دینی جدوجہد کی حمایت میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

اسامہ بن لادن کے ساتھ ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳ مارچ ۱۹۹۷ء

اسامہ بن لادن کا نام سب سے پہلے جہادِ افغانستان کے دوران خوست میں سنا تھا جہاں یاور کے مقام پر مجاہدین کی عسکری تربیت گاہ تھی۔ دنیا کے مختلف ممالک سے نوجوان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر وہاں آتے اور چند دن ٹریننگ حاصل کر کے افغان مجاہدین کے ہمراہ روسی استعمار کے خلاف برسرپیکار ہو جاتے۔ راقم الحروف کو متعدّد بار حرکت الانصار کی ہائی کمان کی فرمائش پر ایسی تربیت گاہوں میں جانے کا موقع ملا۔ میرے جیسے لوگ وہاں جا کر عملاً تو کچھ نہیں کر پاتے مگر مجاہدین کا خیال تھا کہ ہمارے جانے سے ان کو حوصلہ ملتا ہے، خوشی ہوتی ہے۔ اور خود ہمیں حالات کا براہ راست مشاہدہ کر کے لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا موقع ملتا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ ہم وقتاً فوقتاً وہاں جاتے اور ایک دو روز مجاہدین کے ساتھ تربیت گاہوں اور مورچوں میں گزار کر واپس آجاتے۔ وہیں ایک تربیت گاہ عرب نوجوانوں کیلئے مخصوص تھی جہاں مختلف عرب ممالک سے آئے ہوئے سینکڑوں نوجوان تربیت حاصل کرتے تھے، مختلف عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوتی تھی اور عالم اسلام کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

ایک موقع پر پاور سے میران شاہ تک واپس پہنچانے کیلئے جو گاڑی بھجوائی گئی اس کا ڈرائیور ایک عرب نوجوان تھا جس کی عمر بمشکل اٹھارہ برس ہوگی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ مدینہ منورہ کا رہنے والا ہے اور دو سال سے جہاد میں

مصروف ہے۔ وطن واپسی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ جہاد میں کامیابی کے بعد ہی وطن واپس جانے کا ارادہ ہے۔ یہ دور وہ تھا جب ابھی خوست فتح نہیں ہوا تھا۔ وہاں اسامہ بن لادن کا نام سنا اور یوں یاد پڑتا ہے کہ شاید کسی موقع پر انہیں دیکھا بھی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ سعودی عرب کے متمول ترین تاجر خاندان ''بن لادن فیملی'' کا ایک نوجوان جس کا نام اسامہ ہے، خود بھی جہاد میں عملاً شریک ہے اور زیادہ تر اگلے مورچوں میں رہتا ہے اور مجاہدین کے مختلف گروپوں کی دل کھول کر مالی امداد بھی کرتا ہے۔ بلکہ بعض دوستوں نے بتایا کہ جہاد افغانستان میں مالی تعاون اور مجاہدین کی کفالت میں شاید ہی کوئی دوسرا عرب شیخ اس نوجوان کی ہمسری کا دعوی کر سکے۔ اسامہ بن لادن کا نام اس کے بعد مختلف حوالوں سے وقتاً فوقتاً سننے میں آتا رہا۔

پھر معلوم ہوا کہ جہاد افغانستان میں تربیت حاصل کرنے والے اور جہاد میں عملاً شرکت کرنے والے عرب نوجوان اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کے ہاں معتوب قرار پا چکے ہیں۔ ان حکومتوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ جہاد کے جذبہ سے سرشار اور ٹریننگ سے بہرہ ور یہ نوجوان اپنے ملکوں میں جذبۂ جہاد کے فروغ کا باعث بنیں گے اور ان ممالک میں مغربی استعمار کے مسلط کردہ نوآبادیاتی نظاموں کیلئے چیلنج ثابت ہوں گے۔ اس لیے انہیں دہشت گرد قرار دینے کا فیصلہ ہوا اور ان سے نمٹنے کیلئے مسلم ممالک کے وزراء داخلہ اور وزراء خارجہ کے مسلسل اجلاس ہونے لگے۔ پاکستان میں ان ''دہشت گردوں'' کے خلاف مہم کا آغاز ہوا اور انہیں پاکستان سے نکالنے کیلئے منظم منصوبہ بندی کی گئی۔ اس دوران اسامہ بن لادن کا نام ایک بار پھر سامنے آیا اور پتہ چلا کہ یہ نوجوان سوڈان میں بیٹھا ہے اور نہ صرف سوڈان کی نظریاتی اسلامی حکومت کو اقتصادی سپورٹ مہیا کر رہا ہے بلکہ ان عرب نوجوانوں کی پناہ گاہ بھی ہے جو روسی استعمار کے خلاف تاریخی جہاد میں حصہ لینے کی پاداش میں اپنے ممالک کی حکومتوں کے ہاں دہشت گرد اور مفرور قرار پا چکے ہیں۔ سوڈان رقبہ کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے اور ہمیشہ قحط سالی کا شکار رہا ہے۔ لیکن چند برسوں سے ڈاکٹر حسن ترابی اور جنرل عمر بشیر کی قیادت سے معاشی خود کفالت اور اسلامی اصلاحات کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ سوڈانیوں نے اس راز کو پا لیا کہ اسلامی نظام کے حقیقی نفاذ کیلئے اس سے قبل معاشی خود کفالت ضروری ہے ورنہ مغربی ملکوں اور عالمی اداروں کی معاشی امداد کا شکنجہ دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ انہوں نے ناکل مما نزرع ونلبس مما نصنع (اپنا بویا ہوا کھائیں گے اور اپنا بنایا ہوا کپڑا پہنیں گے) کا قومی نعرہ لگایا اور مغرب کے آگے پھیلنے والے ہاتھ سمیٹ لیے۔ سوڈانیوں نے زراعت کو فروغ دیا، ملک کے اندر سڑکیں تعمیر کیں اور محنت کا راستہ اختیار کیا جس کا ثمرہ بارگاہ ایزدی سے یہ ملا کہ سوڈان گندم میں خود کفیل ہو گیا ہے بلکہ اب برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہے جس پر مغرب کے پیچ و تاب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مصر کے صدر حسنی مبارک پر کسی دور میں ہونے والے قاتلانہ حملہ کے ملزموں کو پناہ دینے کے الزام میں سوڈان کو دہشت گرد ملک قرار دیا جا چکا ہے اور امریکہ بہادر سوڈان سے نمٹنے کیلئے تیاریاں کر رہا ہے۔ جبکہ سوڈان کے جنوب میں عیسائی اقلیت کو ابھار کر اور اسے مالی و عسکری سپورٹ مہیا کر کے سوڈان کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے اور تقسیم کر دینے کے مذموم منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوڈان کی اس معاشی خود کفالت اور نظریاتی پیشرفت کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ہاتھ ہے اور اسامہ بن لادن نے سوڈان میں بیٹھ کر نہ صرف

وہاں کی اسلامی حکومت کا حوصلہ بڑھایا بلکہ قومی شاہراہ کی تعمیر میں ہاتھ بٹھا کر سوڈان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اسامہ بن لادن کا یہ "جرم" ناقابل معافی تھا کہ اس نے ایک غریب مسلمان ملک کو معاشی خود کفالت کا راستہ دکھایا، اسلامی نظام کے نفاذ کی مستحکم بنیاد فراہم کی اور عالمی مالیاتی اداروں کو ایک شکار گاہ سے محروم کر دیا۔ چنانچہ امریکہ بہادر نے گذشتہ سال عالمی دہشت گردوں کی جو فہرست جاری کی، اس میں اسامہ بن لادن کا نام سرفہرست ہے۔ سوڈان کو دھمکی دی گئی کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دے ورنہ نتائج بھگتنے کیلئے تیار ہو جائے۔

اسامہ بن لادن نے سوڈان کو مشکلات سے نکالنے میں مدد دی تھی اس لیے اس کی مشکلات میں اضافے کا باعث بننا اس غیور عرب نوجوان کی حمیت و غیرت کے خلاف تھا۔ اس لیے اسامہ بن لادن نے چپکے سے سوڈان کو خیرباد کہا اور افغانستان کی آزاد سرزمین میں نیا مسکن بنالیا۔ اسامہ بن لادن کا اپنا وطن سعودی عرب ہے جہاں اس کا خاندان آج بھی ملک کا متمول ترین تجارتی خاندان ہے، جہاں اس کے اہلِ خاندان ملک کی معاشی ترقی کا ایک اہم کردار ہیں لیکن اسامہ پر سعودی عرب کے دروازے بند ہیں۔ اس لیے کہ وہ خلیج عرب میں امریکی افواج کی مسلسل موجودگی کا مخالف ہے اور اسے عرب ممالک کی خود مختاری کے منافی اور اسرائیل کی تقویت کا باعث سمجھتا ہے۔ وہ سعودی عرب میں اسلامی اصلاحات کا داعی ہے اور ملک کے نظام کو مکمل طور پر اسلامی تعلیمات واحکام کے سانچے میں ڈھالنے کی بات کرتا ہے۔ وہ شاہی خاندان کی پر تعیش زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور خلافت اسلامیہ کا احیاء چاہتا ہے اور یہ "جرم" آج کے دور میں اتنا ہلکا نہیں کہ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔

راقم الحروف کو گذشتہ ماہ کے اواخر میں افغانستان جانے کا اتفاق ہوا تو جی چاہا کہ ممکن ہو تو اسامہ بن لادن سے بھی ملاقات کر لی جائے اور اس کا مسکن دیکھ لیا جائے۔ کچھ دوستوں سے بات کی تو حالات نے موافقت کا رخ اختیار کر لیا اور ایک شب ہم کچھ دوست چپکے سے اسامہ بن لادن کے کیمپ میں جا پہنچے۔ چند نو تعمیر شدہ کچے مکانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی الشیخ اسامہ بن لادن کی پناہ گاہ ہے جہاں ان کے ساتھ انہی کی طرح کے بہت سے عرب نوجوان قیام پذیر ہیں۔ ایک رات ہم وہاں رہے۔ الشیخ اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی، دبلے لمبے قد کا ایک نوجوان، افغانی لباس پہنے ہوئے، سر پر پگڑی باندھے، کندھے سے کلاشنکوف لٹکائے اور ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح گھماتے ہوئے سامنے آیا تو یوں محسوس ہوا کہ کوئی افغان عالم دین کسی دینی مدرسہ میں سبق پڑھا کر درسگاہ سے باہر نکل رہا ہے۔ اسامہ بن لادن کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ ہیں جو اسی خیمہ بستی میں قیام پذیر ہیں بلکہ دسترخوان پر سادہ کپڑوں میں ملبوس تیرہ سال کا ایک بچہ ہمارے ہاتھ دھلاتے ہوئے آگے بڑھا تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست نے بتایا کہ شیخ اسامہ کا بیٹا ہے۔ جی چاہا کہ اس بچے کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لوں اور خود اس کے پاؤں دھلاؤں جو سعودی عرب میں اپنے خاندان کے بلند و بالا محلات کے بجائے افغانستان کے ایک کیمپ میں اپنے پر عزم اور مجاہد باپ کے ساتھ صرف اس لیے صعوبتیں برداشت کر رہا ہے کہ وہ اسلام کی سربلندی اور نفاذ کا خواہاں ہے اور اس بارے میں کسی مصلحت اور لچک کا روادار نہیں ہے۔

سچی بات ہے کہ اسامہ بن لادن کا کیمپ دیکھ کر مجھے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو بصیرؓ کا وہ کیمپ یاد آگیا جو انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مظلوم مسلمانوں کو کافروں کے مظالم سے بچانے کیلئے پناہ گاہ کے

طور پر بنایا تھا۔ ابوبصیرصلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر مدینہ پہنچے تو جناب رسول اللہؐ معاہدہ کی رو سے انہیں واپس کفار کے پاس بھجوانے کے پابند تھے۔ چنانچہ آپؐ نے معاہدے پر عمل کر کے انہیں واپس کر دیا۔ مگر ابوبصیرؓ نے مکہ مکرمہ واپس جانے کے بجائے راستہ میں سمندر کے کنارے ایک کیمپ بنا لیا جو دیکھتے دیکھتے کفار کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی محفوظ پناہ گاہ بن گیا اور بالآخر کفار کو خود معاہدہ کی اس شق سے دستبردار ہونا پڑا۔ خدا کرے کہ آج کا یہ ابوبصیرؓ بھی مسلمان مجاہدین کو محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو اور اس کی یہ جدوجہد دنیا میں اسلام کے غلبہ و نفاذ کا نقطۂ آغاز بن جائے، آمین یارب العالمین۔

سعودی حکمران خاندان، علماء کرام، اسامہ بن لادن

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۸ اپریل ۱۹۹۷ء

روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے مدیر جناب حامد میر نے افغانستان میں سعودی عرب کے ممتاز تاجر اور جہادِ افغانستان کے حوالے سے عالمی شہرت یافتہ شخصیت اسامہ بن لادن سے مل کر ایک جرأتمندانہ قدم اٹھایا ہے، اس پر وہ بلاشبہ مبارکباد کے ساتھ ساتھ اہلِ دین کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کیونکہ اس سے انہیں ایک ایسے عنوان پر معلومات حاصل کرنے اور گفت و شنید کا موقع ملا ہے جس کے گرد ذہنی تحفظات کا ایک تہہ در تہہ حصار قائم ہو گیا تھا، اور بہت سے حضرات ان ذہنی تحفظات کی وجہ سے اس بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود حجاب محسوس کر رہے تھے۔

حرمین شریفین کی مسلسل خدمت اور اپنے بعض اسلامی اقدامات کی وجہ سے سعودی عرب کے حکمران خاندان کو عالمِ اسلام میں ہمیشہ احترام حاصل رہا ہے، اور اس احترام کے باعث ان کے بارے میں کوئی بات کہتے ہوئے احتیاط کے کئی پہلو ملحوظ رکھنا پڑتے ہیں۔ بالخصوص دو امور میں تو آج بھی سعودی عرب کے حکمرانوں کی تعریف کیے بغیر کوئی بات آگے نہیں بڑھتی:

1. ان میں سے ایک حرمین شریفین کی توسیع اور حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کی پالیسی ہے،
2. اور دوسرا معاشرتی جرائم میں شرعی حدود کے نفاذ کے باعث امن کا قیام و استحکام اور جرائم کی شرح کا بے حد کم ہونا ہے، جس کی مثال اسلامی قوانین کی برکات کے ثبوت میں اکثر دی جاتی ہے۔

لیکن ان دو معاملات سے ہٹ کر قومی زندگی اور اجتماعی معاملات کے دیگر پہلو ایک عرصہ سے توجہ طلب ہیں، اور ان امور میں سعودی عرب کے حکمران خاندان اور دینی حلقوں کے درمیان کشمکش دن بدن واضح ہوتی جا رہی ہے۔

مملکتِ عربیہ سعودیہ کا قیام موجودہ صدی کے تیسرے عشرہ میں اس وقت عمل میں آیا تھا جب یورپی ممالک کی مسلسل سازشوں کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی نمائندگی کرنے والی ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ عرب نیشنلزم کے نعرہ کی آڑ میں عرب صوبوں کو خلافتِ عثمانیہ سے باغی کر کے مستقل ممالک کی شکل دے دی گئی تھی۔ اور خلافتِ عثمانیہ کی

طرف سے حجازِ مقدس کے گورنر شریفِ مکہ شاہ حسین کو ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے باوجود اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کیلئے فضا ساز گار نہیں ملی تھی۔ اور برطانوی استعمار نے ان کے خاندان میں بغاوت و تقسیم کا بیج بو کر ان کا پورے عرب کا بادشاہ بننے کا خواب پریشان کر دیا تھا۔ ان حالات میں نجد سے تعلق رکھنے والی دو قوتیں آگے بڑھیں اور ۱۹۲۶ء میں شریفِ مکہ شاہ حسین سے حجازِ مقدس کا کنٹرول حاصل کر کے مملکتِ عربیہ سعودیہ کے نام سے ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈال دی۔ ان میں:

1. ایک قوت سیاسی تھی جو آلِ سعود کے نام سے نجد کے ایک علاقہ پر ایک عرصہ سے حکمران چلی آرہی تھی،
2. اور دوسری قوت مذہبی تھی جو نجد کے عظیم مصلح الشیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے خاندان اور پیروکاروں پر مشتمل تھی اور عرب قبائل اور عوام کی ایک بڑی تعداد ان سے منسلک تھی۔

الشیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک شرک اور رسوم وبدعات کے خلاف اصلاحی تحریک تھی، مزاج میں تیزی اور شدت تھی اور بعض دینی معاملات میں جداگانہ رائے اور تفرد بھی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے عالمِ اسلام بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے مذہبی حلقوں میں انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جو انہیں نجد و حجاز کے علاقوں میں حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن بہر حال وہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس نے قوت حاصل کی اور پھر آلِ سعود کے ساتھ مل کر نئی قائم ہونے والی سلطنت میں شریکِ حکومت خاندان کا درجہ حاصل کر لیا۔

بتایا جاتا ہے کہ "آلِ سعود" اور الشیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے خاندان کے درمیان، جسے "آلِ شیخ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ خاموش معاہدہ طے پا گیا تھا کہ مملکتِ عربیہ سعودیہ کا دستور قرآن و سنت ہو گا، ریاست میں مکمل شرعی نظام نافذ کیا جائے گا، اور قضاء و شرعی نظام "آلِ شیخ" کی تحویل میں ہو گا جو اس حیثیت سے مملکت کے پورے نظام کو شرعی طور پر کنٹرول کرے گا۔

شاہ عبدالعزیز بن سعودؒ کے دور میں اس معاہدہ پر پوری طرح عملدرآمد ہوتا رہا اور ملک کے اجتماعی نظام پر شرعی فیصلوں کی چھاپ اور آلِ شیخ کی بالادستی قائم رہی۔ لیکن ان کے بعد معاملات میں اس درجہ کی گرمجوشی باقی نہ رہی اور پالیسی امور پر آلِ شیخ کی بالادستی کا پہلو کمزور پڑتا چلا گیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس علمی و دینی شخصیت نے اختلافات کا دوٹوک اظہار کیا وہ الشیخ محمد ابراہیمؒ ہیں جو محکمہ شرعیہ کے سربراہ اور قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ الشیخ محمد بن ابراہیمؒ چار واسطوں سے الشیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے پوتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز بن سعودؒ کے برادر نسبتی ہیں اور شاہ فیصل شہیدؒ کے ماموں ہیں۔ اپنے وقت کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے، ان کے فتاوٰی دیکھ کر ان کی علمی ثقاہت اور جراَت و عزیمت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور میں انہیں تمام حکومتی نظام کے نگرانِ اعلٰی کی حیثیت حاصل تھی اور تمام معاملات شرعی توثیق کیلئے ان کے سامنے آتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ حکومت نے کچھ شعبوں کو ان کی دسترس سے مستثنٰی کرنے کی کاروائی کی، مثلاً تجارتی تنازعات کے فیصلوں کیلئے شرعی محکمہ کی بجائے الگ تجارتی عدالت قائم کر دی گئی، جس پر الشیخ محمد بن ابراہیمؒ نے احتجاج کیا، اور اس سلسلہ میں ان کے خطوط ان کے مطبوعہ فتاوٰی میں موجود ہیں، مثلاً:

- ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ کو گورنر ریاض کے نام اپنے خطوط میں انہوں نے تجارتی تنازعات کو محکمہ شرعیہ سے

الگ کرنے کی کاروائی کو شرعی اصولوں سے متصادم قرار دیا اور اس پر شدید احتجاج کیا۔ اس قسم کے متعدّد خطوط حکومت کے مختلف ذمہ داروں کے نام سے انہوں نے تحریر کیے جو ان کے مطبوعہ فتاویٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔

- اس کے بعد حکومت نے سرکاری محکموں کے ملازمین سے متعلقہ تنازعات کو بھی محکمہ شرعیہ سے الگ کر کے ان کیلئے مستقل لیبر ٹربیونل قائم کر دیا، اور الشیخ محمد بن ابراہیمؒ نے متعلقہ حکام کے نام اپنے خطوط میں اس پر بھی احتجاج کیا۔

ان معاملات میں شیخ کا موقف یہ تھا کہ ملک کے اجتماعی نظام کا کوئی حصہ بھی محکمہ شرعیہ کے اختیار سے باہر نہیں ہے، اور شرعی عدالت کو ہر مسئلہ اور معاملہ کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کا حق حاصل ہے۔ شیخ کی علمی وجاہت اور بزرگی کی وجہ سے ان کے سامنے انکار کی تو کسی میں ہمت نہیں تھی لیکن ان کے احتجاج در احتجاج کے باوجود حکومتی نظام میں تبدیلیوں کا پرنالہ بدستور آلِ سعود کی مرضی کے مطابق بہتا رہا۔ حتیٰ کہ تجارت معاملات، ملازمتوں کے امور، اور بینکوں کے نظام سمیت ملک کے اجتماعی نظام کا بیشتر حصہ محکمہ شرعیہ کے دائرۂ اختیار سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

الشیخ محمد بن ابراہیمؒ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انتہائی خوددار، غیور اور بے باک عالمِ دین تھے، انہیں ایک موقع پر شاہ فیصل شہیدؒ نے وزیر عدل بنانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے وزارت کی ضرورت نہیں، جو باتیں میں کہتا ہوں ان پر عمل کرو۔ ان کی حق گوئی کی کیفیت یہ تھی کہ شاہ فیصل شہیدؒ کے دور میں ٹیلیویژن کو سرکاری طور پر ملک میں رائج کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تو انہوں نے شدت سے مخالفت کی کہ اس سے لوگوں کے اخلاق خراب ہوں گے۔ شاہ فیصل شہیدؒ نے کہا کہ عام لوگوں کا تقاضا ہے اور ہمیں لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تو اس پر شیخ نے کہا کہ ہمیں صرف قرآن وسنت کے احکام کا لحاظ رکھنا چاہیے، لوگ اگر کل یہ کہیں کہ ہمیں ملک فیصل کی بجائے کوئی اور حکمران چاہیے تو کیا لوگوں کی یہ بات بھی قبول کر لو گے؟

الغرض الشیخ محمد بن ابراہیمؒ نے ملکی نظام کو مکمل طور پر شرعی احکام کے تابع رکھنے کیلئے پورا زور صرف کیا اور اپنی زندگی میں محکمہ شرعیہ میں ہر سطح پر قاضیوں کے تقرر و برخواستگی پر بھی اپنا کنٹرول رکھا لیکن یہ سب کچھ ان کی زندگی تک تھا۔ جب ۱۳۸۹ء میں ان کی وفات ہوئی تو محکمہ شرعیہ کے سربراہ کا یہ منصب ہی سرے سے ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ ان کی جگہ اب الشیخ عبد العزیز بن باز جو انہی کے شاگرد ہیں، سعودی عرب میں سرکاری سطح پر سب سے بڑے عالم شمار ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت مفتی کی ہے اور بحیثیت قاضی انہیں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس تفصیل کے ذکر کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ سعودی عرب میں حکمران خاندان اور علماء کے درمیان آج جو کشمکش نظر آ رہی ہے وہ نئی نہیں بلکہ اس کی تاریخ نصف صدی پر محیط ہے۔ اور اس کا بنیادی نکتہ علماء کا یہ موقف ہے کہ شرعی عدالت اور محکمہ شرعیہ کا کام صرف جرائم کی شرعی سزائیں دینا نہیں ہے بلکہ اجتماعی نظام کے دیگر شعبوں مثلاً نظم و نسق، تجارت، معیشت اور دوسرے محکموں کو بھی شرعی اصولوں کے مطابق چلانا ضروری ہے اور ان کے فیصلے بھی قرآن و سنت کی روشنی میں ہونے چاہئیں۔

اس پس منظر میں سعودی عرب کے حکمران خاندان کے ساتھ وہاں کے سرکردہ علماء کرام کی موجودہ کشمکش کا جائزہ لیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس کشمکش کا آغاز اس وقت ہوا جب جولائی ۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے ایک سو سے زائد علماء اور علمی شخصیات نے اپنے دستخطوں کے ساتھ مذکرۃ النصیحۃ (خیر خواہی کی یادداشت) کے نام سے ایک مفصل عرضداشت سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد بن عبد العزیز کی خدمت میں پیش کی جو کتابی سائز کے ایک سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس یادداشت میں ملک کے مجموعی نظام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے شرعی نقطۂ نظر سے مختلف شعبوں میں غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اصلاحات تجویز کی گئی ہیں۔ ان اصلاحات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- ملک کے اجتماعی نظام پر قرآن و سنت کی مکمل بالادستی قائم کی جائے،
- لوگوں کے شرعی حقوق اور رائے کی آزادی بحال کی جائے،
- سودی نظام ختم کیا جائے،
- سرکاری دولت کو عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں ضائع کرنے کا سلسلہ ختم کیا جائے،
- امریکہ اور دیگر اسلام دشمن مغربی طاقتوں کے ساتھ تعلقات و معاہدات پر نظر ثانی کی جائے،
- اور عالمِ اسلام کی حقیقی وحدت کیلئے جدوجہد کی جائے۔

اس یادداشت کو سعودی عرب کے چار اکابر علماء الشیخ سفر الحوالی، الشیخ سلیمان العودہ، الشیخ عبد اللہ الجبرین، اور الشیخ عبد اللہ الجلالی کی تائید بھی حاصل ہے، جن کے خطوط اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہیں۔ اور ان میں اول الذکر دو بزرگ یادداشت پیش ہونے کے بعد سے اب تک زیر حراست ہیں۔ یادداشت پیش ہونے کے بعد سینکڑوں علماء کرام گرفتار کر لیے گئے، جن میں بہت سے اب بھی جیلوں میں ہیں۔ یادداشت پر دستخط کرنے والے دو اہم راہنما ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ المسعری اور ڈاکٹر سعد الفقیہ لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف پرجوش تقریریں کرنے والے مجاہد عالم الشیخ عائض القرنی جلاوطنی اور گرفتاریوں کے مراحل سے مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔

لندن میں لجنۃ الدفاع من الحقوق الشرعیۃ کے نام سے سعودی علماء کا ایک گروپ ڈاکٹر محمد المسعری کی قیادت میں اپنے مطالبات کیلئے جدوجہد میں مصروف ہے اور ان علماء کو اپنی اس جدوجہد میں الشیخ اسامہ بن لادن کی حمایت حاصل ہے۔ اسامہ بن لادن کا موقف بھی اس کا علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سعودی عرب میں مکمل شرعی نظام نافذ کیا جائے، سود کا نظام ختم کیا جائے، اور امریکی تسلط سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ انسانی حقوق، آزادیٔ رائے اور قانون کی حکمرانی کے دعویدار مغربی ذرائع ابلاغ اور لابیاں سعودی عرب کے دینی حلقوں کی اس جدوجہد کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور ان کی حمایت کیلئے صرف اس وجہ سے آگے نہیں بڑھ رہیں کہ یہ جدوجہد اسلام کے حوالے سے ہے اور سعودی علماء لوگوں کے حقوق کی بحالی کا شریعتِ اسلامیہ کے حوالے سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں عالمِ اسلام اور خاص طور پر پاکستان کے دینی

حلقوں اور علماء کی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصلحتوں اور تحفظات کے حصار سے باہر نکلیں اور سعودی عرب کے علماء کرام اور اہلِ دین کی اس جائز دینی اور شرعی جدوجہد کی حمایت کریں تاکہ سعودی عرب جو حرمین شریفین کی وجہ سے پورے عالمِ اسلام کی عقیدتوں کا مرکز ہے، صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے دنیائے اسلام کی قیادت کر سکے۔

ڈیلی ٹیلی گراف اور دیوبندی مکتبِ فکر

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۷ء

برطانیہ کے مذہبی حلقوں میں ان دنوں "ڈیلی ٹیلی گراف" کی ایک رپورٹ کا بہت چرچا ہے جو انگلش کے اس معروف اخبار نے دو ہفتے قبل مذہبی حلقوں کے تجزیے کے حوالے سے شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں خاص طور پر دیوبندی مکتبِ فکر کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے فروغ میں اس جماعت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ رپورٹ میں طالبان کی تحریک کا بطورِ خاص حوالہ دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں آباد مسلمانوں کا کم و بیش بیس فیصد حصہ دیوبندیوں پر مشتمل ہے اور یہ مذہبیت اور بنیاد پرستی کو پھیلانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ رپورٹ میں تبلیغی جماعت اور دیوبندی مدارس کا تذکرہ بھی اسی پس منظر میں کیا گیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ افغانستان میں شکست کے بعد سوویت یونین کے بکھر جانے اور کمیونزم کی پسپائی کے نتیجے میں امریکہ واحد سپر پاور کے نعرے کے ساتھ سامنے آیا ہے، مغربی ممالک کم و بیش سب کے سب اس کے ساتھ ہیں، اور کمیونزم کے بعد مغربی قوتوں نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دے کر اسلام اور دیندار مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ چنانچہ کمیونزم کے خلاف قائم ہونے والے مغربی ممالک کے فوجی اتحاد "نیٹو" کو باقی رکھنے کا جواز اس کے ایک سابق سیکرٹری جنرل نے یہی پیش کیا ہے کہ "ابھی اسلام باقی ہے"۔

عالمِ اسلام کے ساتھ اس محاذ آرائی میں مغرب اپنی ترجیحات واضح کرتا جا رہا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ عالمِ اسلام کے مذہبی حلقے، عسکری تحریکات، اور نفاذِ اسلام کی داعی جماعتیں ہماری حریف ہیں۔ پھر یہ تاثر دیا گیا کہ جنوبی ایشیا (پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش) کے دینی مدارس و مراکز اس بنیاد پرستی کا سرچشمہ ہیں۔ اور اب بات اس رخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ مغرب کے بقول "فساد" کی اصل جڑ دیوبندی مکتبِ فکر ہے، اور اسلامی تحریکات اور مذہبی جوش و خروش پر قابو پانے کے لیے سب سے پہلے دیوبندیوں سے نمٹنا ہوگا۔ اور ہمارے نزدیک ڈیلی ٹیلی گراف کی مذکورہ رپورٹ اسی مہم کا ایک حصہ ہے۔

راقم الحروف نے ۱۰ اگست ۱۹۹۷ء کو مرکزی جامع مسجد برمنگھم میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی بارہویں سالانہ عالمی ختمِ نبوت کانفرنس سے خطاب کے دوران اس رپورٹ کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے یہ عرض کیا ہے کہ اس رپورٹ کا مطالعہ اسلام اور مغرب کی عالمی کشمکش کے تناظر میں کیا جائے، اور اس کی روشنی میں اپنے اہداف اور ترجیحات کا تعین کیا جائے۔

کیونکہ ہمارے نزدیک یہ رپورٹ دیوبندی جماعت کے لیے ایک تمغہ اور کریڈٹ ہے جو اسلام اور کفر کے معرکے میں دیوبندیوں کے اصل مقام کا تعین کرتی ہے، اور انہیں ان کا یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے کہ امام ولی اللہ دہلویؒ، امیر المومنین سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نام لیواؤں کی اس جماعت کا اصل ہدف اسلام کا غلبہ و نفاذ اور عالمی استعمار کا مقابلہ ہے۔ اس لیے اس قسم کی رپورٹوں سے مرعوب یا مجوب ہونے کی بجائے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ ان کا سامنا کرنا ہوگا اور ہوشمندی اور تدبر کے ساتھ اپنی ترجیحات کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔

امریکہ اور حرکۃ الانصار

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۱۹۹۷ء

امریکی وزارتِ خارجہ نے اس سال عالمی سطح پر دہشت گرد تنظیموں کی جو فہرست جاری کی ہے اس میں فلسطین میں اسرائیلی حکومت سے نبرد آزما مجاہدین کی جماعت حماس کے ساتھ ساتھ افغانستان اور کشمیر کے جہاد میں شریک حرکۃ الانصار کا نام بھی شامل ہے۔ اور امریکی حکومت نے دنیا بھر کی حکومتوں سے کہا ہے کہ وہ اس فہرست میں شامل تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں، ان کے فنڈز ضبط کرلیں، اور انہیں مختلف ممالک میں آمد و رفت کی سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھانے دیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی اخبارات کے ذریعے سامنے آرہی ہیں کہ حکومتِ پاکستان نے حرکۃ الانصار کو خلافِ قانون قرار دینے کی تیاری کرلی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقدامات کیے جارہے ہیں۔

حرکۃ الانصار بنیادی طور پر پاکستان اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے دینی مدارس کے طلبہ، اساتذہ اور دینی کارکنوں کی عالمی تنظیم ہے جس کے تحت ہزاروں افراد نے روسی جارحیت کے خلاف جہادِ افغانستان میں مسلسل حصہ لیا اور ٹریننگ حاصل کی۔ اور اب اس تنظیم کے تحت بے شمار نوجوان مقبوضہ کشمیر کے اندر مجاہدینِ کشمیر کے شانہ بشانہ بھارتی فوج کی جارحیت کے خلاف مصروفِ کار ہیں۔ اس تنظیم میں دنیا کے بہت سے مسلم ممالک کے نوجوان شامل ہیں اور برما، فلپائن، تاجکستان، صومالیہ، اور دوسرے علاقوں کے مسلم مجاہدین کے ساتھ جہادی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

ہمارے نزدیک امریکہ کی طرف سے حرکۃ الانصار کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کا سب سے بڑا مقصد مقبوضہ کشمیر میں اس کے کردار کو ختم کرنا ہے، کیونکہ اس وقت مقبوضہ کشمیر میں عسکری طور پر سب سے زیادہ فعال اور مؤثر تنظیم وہاں کی حرکۃ الانصار ہے جس کی موجودگی میں امریکہ کیلئے کشمیر میں اپنے پروگرام کو آگے بڑھانا مشکل ہوگیا ہے، کیونکہ امریکہ ایک عرصہ سے کشمیر کو تقسیم کرکے اس بندربانٹ میں اپنے لیے وادی کا خطہ حاصل کرنے کا خواہشمند ہے تاکہ وہاں فوجی اڈہ قائم کرسکے، لیکن حرکۃ الانصار اور دیگر مجاہدین تنظیمیں اس امریکی پروگرام کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اور وہ اس طرح کی دھونس سے انہیں غیر مؤثر بنانا چاہتا ہے۔

امریکہ تو خیر وہی کرے گا جو اس کی پالیسی ہے مگر حکومتِ پاکستان سے ہم یہ ضرور گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ امریکہ

پرستی میں اس حد تک آگے نہ بڑھے کہ ملک کے بنیادی مسائل اور قومی مفادات ہی کو داؤ پر لگا دے کیونکہ یہ ملک اور قوم کے ساتھ صریح غداری ہوگی۔

عالمِ اسلام کے دینی حلقے اور امریکہ بہادر

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۸ء

"امریکہ اور عالمِ اسلام" کے عنوان سے الشریعہ کی اشاعت پیش خدمت ہے۔ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ان مختصر صفحات میں ممکن نہیں ہے تاہم ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ عالم اسلام کے دینی حلقوں اور امریکہ کے درمیان دن بدن واضح تر ہونے والی فکری اور تہذیبی کشمکش کا عمومی منظر قارئین کے سامنے آجائے اور اس کشمکش میں دینی حلقوں کی پوزیشن اور موقف کا اندازہ ہو جائے۔

افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد جہاں سوویت یونین کی عظیم قوت بکھری ہے اور مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئی ہیں وہاں عالمی سطح پر طاقت کا توازن بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے بعد امریکہ انا ولا غیری کے نعرہ کے ساتھ دنیا کی تنہا چودھراہٹ کو مستحکم کرنے کیلئے مسلسل اقدامات کر رہا ہے۔ لیکن اس کے دل میں یہ خوف بھی بیٹھا ہوا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور جلد یا بدیر کسی نہ کسی طاقت کو اس کے مدمقابل آنا ہے اس لیے وہ مستقبل میں سامنے آنے کی صلاحیت رکھنے والی قوتوں کا اندازہ کر کے ان سے نمٹنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے:

- امریکی دانشوروں کا خیال ہے کہ چین مستقبل قریب میں سامنے آسکتا ہے اور اگر ریاستہائے متحدہ یورپ کا خواب اپنی تعبیر سے عملی طور پر بہرہ ور ہو جاتا ہے اور اس کی قیادت جرمنی یا فرانس کے ہاتھ آجاتی ہے تو یہ بھی اس کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ خطرناک عالمِ اسلام ہے جو اگرچہ منتشر ہے، جدید ٹیکنالوجی اور ایٹمی قوت سے محروم ہے اور سیاسی قیادت بے بہرہ ہے لیکن مراکش سے انڈونیشیا تک مسلسل آبادی رکھنے والی اس قوت کو اگر نظریاتی سیاسی قیادت مل جاتی ہے اور وہ مغربی ثقافت کے فریب کا جال توڑ کر اپنے ماضی کی طرف واپس پلٹ جاتی ہے تو اسے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی تلافی کرنے کیلئے چند سالوں سے زیادہ کا عرصہ درکار نہیں ہوگا اور اسے دنیا کی قیادت سنبھالنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔
- امریکہ کے دانشوروں کو یہ بھی نظر آرہا ہے کہ مسلم ممالک میں مغرب پرست حکمران گروہوں کی پیدا کردہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اسلامی تحریکات کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اور ان کے جوش و جذبہ، صلاحیت کار اور دائرہ عمل میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔
- اس کے علاوہ مغربی لابیوں نے مسلم ممالک میں اسلام اور مغربی تہذیب کو گڈمڈ کر کے اسلام کا نیا ایڈیشن

پیش کرنے کیلئے دو نمبر کی جو فکری قیادت کھڑی کی تھی اس کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور ملتِ اسلامیہ اصلی، خالص اور پرانے اسلام کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔

اس لیے آج عالم اسلام کے دینی حلقے اور مدارس و مراکز امریکہ کے نزدیک دشمنوں کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہیں اور وہ دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں خالص اسلام کے عملی نفاذ کو روکنے اور اس کے علمبرداروں کو منتشر کرنے اور غیر مؤثر بنانے کیلئے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے۔ جبکہ دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے عنوان سے دینی حلقوں کی کردار کشی کیلئے بیشتر عالمی ذرائع ابلاغ وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔

امریکہ نے عالم اسلام میں ان "خطرات" سے نمٹنے کیلئے ۱۹۹۱ء میں ہی منصوبہ بندی کر لی تھی جس کی تفصیلات زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر نور محمد غفاری ایم این اے کے مضمون میں آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ قارئین سے اسے بطور خاص ملاحظہ کرنے کی گزارش ہے کیونکہ امریکہ نے اپنی ترجیحات اور حکمتِ عملی اس میں بالکل واضح کر دی ہے اور اس کے بعد اس سلسلہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام کا راستہ روکنے کیلئے امریکہ کے عزائم اور پروگرام کیا ہے؟ دینی حلقوں، مراکز و مدارس، جماعتوں اور شخصیات کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عالمی کشمکش کی موجودہ صورتحال کا صحیح ادراک حاصل کریں اور اپنی ترجیحات اور طرز عمل پر نظر ثانی کر کے حوصلہ، تدبر اور منصوبہ بندی کے ساتھ یہ جنگ لڑیں۔ جب جنگ سر پر آ ہی پڑی ہے اور اسے لڑے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو بے دلی اور تذبذب کے ساتھ لڑنے کا فائدہ؟

امریکی جرائم اور شہر سدوم

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۹ مارچ ۱۹۹۸ء

گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے ایک مسیحی جریدہ ماہنامہ "کلامِ حق" نے جنوری ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں امریکہ کے ایک دانشور ڈاکٹر جم فال ویل کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ

"اگر خدا نے امریکہ کے گناہ معاف کر دیے تو خدا کو سدوم اور عمورہ سے معافی مانگنا ہوگی۔"

سدوم اور عمورہ ان پانچ بستیوں میں سے ہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے میں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی، آگ برسی، اور پھر وہ زمین میں دھنس گئیں۔ آج بحیرۂ مردار اسی عذاب الٰہی کی نشانی کی صورت میں سطح زمین پر ان بستیوں کی تباہی کی یاد زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سدوم، عمورہ، اومہ، خیبان، اور نفر نامی ان پانچ بستیوں میں سے صرف نفر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کے کھنڈرات خشکی پر پائے جاتے ہیں جبکہ باقی چاروں بستیاں بحیرۂ مردار میں غرق ہو چکی ہیں۔ ان بستیوں کے باشندوں کا قصور کیا تھا؟ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے دو باتوں کی بطور خاص نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام پر ایمان لانے اور ان پر نازل ہونے والی آسمانی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور دوسری یہ کہ وہ ہم جنس پرستی کی لعنت کا شکار ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت لوط علیہ السلام کو قوم کی تباہی کی خبر دینے کیلئے اللہ تعالیٰ کے

فرشتے آزمائش کے طور پر خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تو پوری قوم ان کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے معصوم پیغمبر کو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کیلئے بصد حسرت یہ کہنا پڑا تھا کہ الیس منکم رجل رشید کیا تم میں بات کو سمجھنے والا ایک آدمی بھی نہیں ہے؟

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا ایک بڑا حصہ آسمانی تعلیمات سے انکار پر ڈٹا ہوا ہے اور ہم جنس پرستی کے مادر پدر آزاد کلچر اور فری سیکس سوسائٹی کا دائرہ پوری دنیا تک وسیع کرنے کیلئے سرگرم عمل ہے۔ اس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس دو نکاتی ایجنڈے کی تکمیل کیلئے اپنی پوری توانائیاں، وسائل اور صلاحیتیں وقف کر چکا ہے۔ امریکی نفسیات کو سمجھنے کیلئے اس کے ماضی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، اس لیے کہ امریکی ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ امریکہ کے دریافت ہونے کے بعد یورپ کے مختلف ممالک کے ان مہم جو اور طالع آزما لوگوں نے ادھر کا رخ کیا جو اپنی اپنی سوسائٹیوں پر قناعت نہ کر سکے اور نئے دریافت شدہ براعظم میں جا کر ایک جتھے کی شکل اختیار کر گئے۔ انہوں نے اس خطہ کے اصل باشندوں کو دھکیلتے دھکیلتے "کارنر" کر دیا، حتیٰ کہ انہیں ان کی اصل شناخت سے محروم کر کے "ریڈ انڈین" کا مصنوعی نام دے دیا اور وہ آج اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ریڈ انڈین جو اس براعظم کے اصل باشندے ہیں آج قومی، سیاسی، تجارتی، اور عملی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتے اور سوسائٹی کا جزو معطل بن کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ یورپی آباد کاروں نے امریکہ کو اپنی من مانیوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد بوڑھے برطانوی استعمار کو عالمی معاملات پر اپنی گرفت ڈھیلی پڑتی دکھائی دی تو اس نے اس برخوردار کی اٹھتی جوانی کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کی۔ دوسری جنگ عظیم تک "ریشماں" جوان ہو چکی تھی اور نو دریافت شدہ براعظم امریکہ میں یورپی آباد کاروں کا جتھہ ایک منظم قوم کی شکل اختیار کر کے عالمی معاملات سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی پوزیشن میں آ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر عالمی سیاست میں اپنی آمد کا اعلان کیا۔ یہ امریکہ بہادر کا پہلا عالمی تعارف تھا جس کے بعد یہ نئی عالمی قوت اسی رخ پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

امریکہ کا دوسرا عالمی کارنامہ اسرائیل کی سرپرستی ہے جہاں اس نے فلسطینیوں کو ان کے وطن سے بے دخل کر کے ریڈ انڈین کا تجربہ دہرانے اور یہودیوں کو وہاں آباد کر کے انہیں ناقابل شکست طاقت کی حیثیت دینے کا برطانوی منصوبہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور آج اسرائیل صرف اور صرف امریکہ کی پشت پناہی کی وجہ سے تمام تر اخلاقی، سیاسی، اور قانونی تقاضوں کو رد کرتے ہوئے فلسطینیوں کے وطن پر قابض ہے۔

امریکہ کا تیسرا تجربہ ویتنام میں گھسنے کا تھا جو بری طرح ناکام ہوا اور ویت کانگ نے جس عزیمت و جرأت کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کی، اس کی یاد آتے ہی اب بھی امریکیوں کو جھرجھری آجاتی ہے۔

امریکہ کو افغانستان میں اس حد تک کامیابی ملی کہ اس کا سب سے بڑا عالمی حریف سوویت یونین بکھر گیا جس کے نتیجے میں مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا میں امریکہ بہادر کو نئی شکار گاہیں میسر آگئیں۔ لیکن افغانیوں کی یہ حکمت عملی بھی کامیاب رہی کہ انہوں نے امریکہ کی فوجیں قبول کرنے کی بجائے اس کی مالی، سیاسی، اور عسکری امداد پر قناعت کر کے میدان جنگ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ جبکہ روسی افواج کی واپسی کے بعد مختلف افغان گروپوں کو آپس میں الجھا کر اپنی مداخلت

کا راستہ کھلا رکھنے کی امریکی پالیسی کو طالبان نے سبوتاژ کر دیا۔ آج امریکہ افغانستان کے حوالے سے حیران و پریشان ہے کہ ایک طرف اسے کابل پر طالبان کی حکومت کو ایران اور چین (سنکیانگ) کے خلاف حرکت میں لانے کے امکانات نظر آ رہے ہیں جنہیں وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ جبکہ دوسری طرف افغانستان میں طالبان کا واحد قوت کے طور پر آگے بڑھنا اور بے لچک اسلامی نظریاتی ریاست کا قیام اس کیلئے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ اور امریکہ اقوامِ متحدہ کو آگے کر کے طالبان کو ان دو اہداف سے محروم کرنے کیلئے پورا زور صرف کر رہا ہے۔

امریکہ کا تازہ شکار عراق ہے جسے وہ ایٹمی قوت بننے کی کوشش کرنے کی سزا دے رہا ہے۔ اور اسرائیل کے ہاتھوں اس کی ایٹمی تنصیبات تباہ کرانے کے بعد سے مسلسل ایسے اقدامات میں مصروف ہے کہ عراق یا خلیج کا کوئی بھی ملک اسرائیل کیلئے فوجی خطرہ نہ بن سکے۔ امریکہ اس صورت حال کو خلیج میں اپنی فوجی موجودگی کا جواز بنانے کیلئے بھی استعمال کر رہا ہے تاکہ تیل کے چشموں پر اس کا کنٹرول قائم رہے۔ اور ان مقاصد کیلئے اسے نہ صرف خلیج کی بادشاہتیں اور آمریتیں قبول ہیں بلکہ اسے اس خطہ کے عوام کیلئے ووٹ کا حق، رائے کی آزادی، اور دیگر سیاسی و شہری حقوق بحال کرانے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ لاہور میں امریکہ کے سابق قونصل جنرل مسٹر رچرڈ مکی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں بھی سفارتی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ راقم الحروف نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہاں بھی انہوں نے شہری حقوق کیلئے کبھی بات کی ہے؟ اس پر مسٹر رچرڈ مکی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا کہ ”وہاں کون ایسی بات کر سکتا ہے“۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنے، قاتل کو قصاص میں کھلے بندوں قتل کرنے، اور شرابیوں کو کوڑے مارنے کی جو شرعی سزائیں افغانستان میں امریکہ کے نزدیک بنیاد پرستی، رجعت پسندی اور تہذیب دشمنی کی علامت قرار پاتی ہیں، سعودی عرب میں انہی سزاؤں کے نفاذ اور ان پر عملدرآمد پر امریکہ کو کوئی تکلیف نہیں۔ بات کچھ لمبی ہوگئی ہے لیکن گفتگو جب امریکی جرائم کے حوالے سے ہو رہی ہے تو چند بڑے جرائم کا مختصر تذکرہ ضروری تھا۔

امریکہ اور اس کے ”ددھیال“ یورپ کے داخلی معاشرتی جرائم کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے جہاں عصمت اور عزت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، خاندانی سسٹم بکھر کر رہ گیا ہے، رشتوں کا تقدس پامالی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، اولاد کے دھتکارے ہوئے بوڑھوں کیلئے اولڈ پیپلز ہومز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، بن بیاہی ماؤں اور نامعلوم باپوں کی اولاد کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے، ہم جنس پرستی حقوق میں شمار کی جانے لگی ہے جس کیلئے باقاعدہ مظاہرے ہوتے ہیں اور قانون سازی کی جاتی ہے، چوری و ڈکیتی کی وارداتوں کے پچھلے سب ریکارڈ ٹوٹ چکے ہیں، اور آسمانی تعلیمات سے انحراف بلکہ انکار اور ان کا تمسخر اڑانے کی روش نے مہذب ہونے کی علامت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ان حالات میں اگر ڈاکٹر جم فال نے امریکہ کے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے سدوم اور عمورہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھا ہے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔ امریکہ آج کی دنیا میں سدوم اور عمورہ کے کلچر کا ہی نمائندہ ہے اور اگر اس نے اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی تو اسے سدوم اور عمورہ جیسے انجام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس لیے کہ فطرت کے قوانین سب کیلئے یکساں ہوتے ہیں اور ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

طالبان اور داڑھی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ مارچ ۱۹۹۸ء

افغانستان میں طالبان کی حکومت نے داڑھی کے مسئلہ پر سختی شروع کی اور داڑھی نہ رکھنے والوں پر تعزیر جاری کی تو بہت سے اہلِ علم نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ سختی غیر ضروری ہے۔ کئی دوستوں نے راقم الحروف سے بات کی تو میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ شرعی اور علمی نہیں، نفسیاتی ہے۔ اور میرے نزدیک طالبان کا یہ طرز عمل داڑھی کے خلاف پھیلائی جانے والی اس نفرت کا نفسیاتی ردعمل ہے جو مغرب کے ذرائع ابلاغ کا وطیرہ بن گیا ہے۔ کیونکہ مغرب جن چیزوں کو کٹر اسلامیت کی علامت کے طور پر پیش کر رہا ہے اس کے ردعمل میں کٹر اسلامیت جب اپنے سفر کا آغاز کرے گی تو وہ انہی چیزوں سے بسم اللہ کرے گی۔ اس لیے ان معاملات کو شرعی دلائل اور ترجیحات کے حوالے سے نہیں بلکہ مغرب کے طرز عمل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

بات صدر محترم جناب محمد رفیق تارڑ کی داڑھی سے چلی تھی جو بلاشبہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے والے بھی کم نہیں ہیں حتیٰ کہ ملک کی اپوزیشن لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اچھے انداز میں نہیں کیا تھا جس کا نقد جواب قدرت کی طرف سے انہیں مل گیا ہے کہ جس سیاسی اتحاد کیلئے وہ ایک عرصہ سے سرگرم عمل تھیں اس کا قیام ایک داڑھی والے کی صدارت میں عمل میں لایا گیا ہے، اور محترمہ کو کم از کم ایک سال کیلئے داڑھی والے کی قیادت قبول کرنا پڑ گئی ہے۔

اسامہ بن لادن: کل کا مجاہد، آج کا دہشت گرد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اپریل ۱۹۹۸ء

اسامہ بن لادن کے خلاف امریکی کمانڈوز کی وسیع پیمانے پر نقل و حرکت کی خبریں اخبارات میں آ رہی ہیں۔ سعودی عرب کے متمول تاجر خاندان ''بن لادن فیملی'' کے اس چشم و چراغ کو امریکہ نے دہشت گرد قرار دے رکھا ہے اور اس کی گرفتاری کیلئے ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہے۔ جبکہ یہ سعودی تاجر امارت اسلامی افغانستان میں قیام پذیر ہے اور والیٔ افغانستان ملا محمد ربانی نے ایک بار پھر اس موقف کا اعادہ کر دیا ہے کہ اسامہ ہمارے مہمان ہیں اور ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ اسامہ بن لادن پر امریکہ کا الزام ہے کہ وہ عرب ممالک میں دہشت گردوں کی سرپرستی کر رہے ہیں، ان کی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں، صومالیہ میں ان امریکیوں کے قتل کے ذمہ دار ہیں جن کے قتل کے بعد امریکہ کو صومالیہ سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑی تھیں، اور ریاض میں وہ دھماکے انہوں نے کرائے ہیں جن میں متعدّد امریکی جاں بحق ہو گئے تھے۔ اور اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ اسامہ بن لادن نے امریکیوں کے خلاف قتل کا فتویٰ جاری کر دیا ہے کہ جہاں

بھی کوئی امریکی قابو چڑھے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد دنیا بھر بالخصوص پاکستان میں امریکہ کے سفارتی عملہ اور مراکز کی حفاظت کے انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں اور سفار تکاروں کی سرگرمیاں اور نقل و حرکت محدود کر دی گئی ہے۔

اسامہ بن لادن ان میں سے کسی بات سے انکاری نہیں ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کے خلاف حالت جنگ میں ہیں، اور حالت جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے اور کمزور کرنے کی کوئی بھی کاروائی ان کا حق ہے۔ اس لیے وہ ان میں سے کسی بات پر ندامت اور معذرت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنے وسائل اور طاقت کی حد تک امریکہ کے خلاف ہر اس اقدام کیلئے پر عزم ہیں جو امریکہ کیلئے کسی بھی درجہ میں نقصان دہ ہو۔

راقم الحروف نے کچھ عرصہ قبل افغانستان میں اسامہ بن لادن سے ملاقات کی تھی جس کی تفصیل ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والے مضمون میں ذکر ہو چکی ہے اور اسامہ کی طرف سے جاری کیے جانے والے بعض اعلانات اور بیانات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور اسامہ کے درمیان اس کشمکش کے حوالے سے ان معروضی حالات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے جنہوں نے سعودی عرب کے شاہی خاندان کے بعد ملک کے امیر ترین خاندان کے نازونعم میں پلنے والے تجارتی شہزادے کو کندھے پر کلاشنکوف لٹکانے، کیمپوں کی زندگی بسر کرنے، اور امریکہ جیسی سپر پاور کے خلاف کمانڈو کارروائیوں پر مجبور کر دیا ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے اسامہ کا ایک جائز حق بھی ہے کہ میڈیا اور لابنگ کے تمام وسائل اس کے مخالف کیمپ میں ہیں اور اس کی کردارکشی کی یکطرفہ مہم مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جبکہ اسامہ بن لادن کو اس میڈیاوار میں ایک بھی ایسا مورچہ میسر نہیں ہے جسے وہ اپنے دفاع کیلئے آزادی کے ساتھ استعمال کر سکے۔

امریکہ کے خلاف اسامہ بن لادن کی اس جدوجہد کو موقف کے اعتبار سے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ عالم اسلام کے وسیع تناظر میں ہے، دوسرا حصہ خلیج عرب کے علاقائی دائرے سے متعلق ہے، اور تیسرا حصہ سعودی عرب کی داخلی صورتحال کے حوالے سے ہے۔

اسامہ بن لادن نے اپنی امنگوں بھری جوانی کا ایک بڑا حصہ جہاد افغانستان کی نذر کیا ہے اور عیش و آرام کے اسباب و وسائل سے بھرے بلند و بالا محلات کو چھوڑ کر افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں پتھروں اور گولیوں کے درمیان عمر عزیز کا سرکش اور منہ زور حصہ گزار دیا ہے۔ سالہا سال تک جہاد میں حصہ لیا، خود جنگ لڑی، اور ہزاروں نوجوانوں کو جنگ میں حصہ لینے کیلئے تیار کیا۔ جان بھی خرچ کی اور مال خرچ کرنے میں بھی کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ اپنی ضرورت و مفادات کیلئے جہادِ افغانستان کی پشت پناہی کر رہا تھا اور سوویت یونین کو شکست دینے کیلئے افغان مجاہدین کی بھرپور حمایت و امداد کر رہا تھا۔ اس دور میں دنیا کے ہر خطے سے مسلم نوجوانوں نے افغانستان پہنچ کر جہاد میں حصہ لیا اور جہاد کی تربیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے جذبہ سے اپنے دلوں اور دماغوں کی شمعیں روشن کر لیں۔

سوویت یونین کی فوجیں افغانستان سے واپس ہوئیں تو امریکہ کا خیال تھا کہ مختلف ملکوں سے افغانستان میں آنے

والے مسلمان نوجوان بھی اپنے اپنے وطن واپس لوٹ جائیں گے اور کرائے کے سپاہیوں کی طرح باقی عمر فتح کی سرشاری اور اخبارات میں اپنے کارناموں کی خبریں اور تصویریں چھپوانے میں گزاریں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ان نوجوانوں نے ایک نیا مشن اپنے سینوں میں پال لیا کہ اپنے اپنے ملکوں میں کفر و استحصال کے نظاموں کے خاتمہ اور اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کیلئے اسی جذبہ کے ساتھ کام کریں گے جس جذبے کے ساتھ افغانستان کی سرزمین پر روسی استعمار کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ صورتحال امریکہ کے نئے عالمی سیٹ اپ کے یکسر منافی اور مسلم ممالک کی مغرب پرست حکومتوں کیلئے قطعی غیر متوقع اور پریشان کن تھی۔ اس سے نمٹنے کیلئے نئی حکمت عملی طے کی گئی کہ جو لوگ روسی افواج کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھا کر مجاہدین اور حریت پسند کہلاتے تھے، انہیں دہشت گرد کا خطاب دے دیا گیا۔ مسلم ممالک کی حکومتوں نے ان نوجوانوں کو سنبھالنے کیلئے جیل خانے تیار کر لیے، ان کی واپسی کا انتظار کرنے کی بجائے ان کی گرفتاری کے مطالبے ہونے لگے، اور پھانسی کے پھندوں کی قوت برداشت جانچی جانے لگی۔

اس فضا میں جب جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف ممالک کے مسلم نوجوانوں کیلئے کوئی پناہ گاہ باقی نہ رہی تو اسامہ بن لادن نے ان کی پناہ گاہ بننے کا فیصلہ کیا۔ سوڈان میں ڈیرہ لگا لیا اور سوڈانی حکومت کو معاشی خود کفالت کی مہم میں معاونت و مشاورت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مجاہد مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کا کام سنبھال لیا۔ دنیا کے ہر مسلم مجاہد کو سپورٹ کرنا اور اس سے رابطہ رکھنا تو اسامہ بن لادن کے بس کی بات نہیں تھی، لیکن وہ اپنی عزیمت و استقلال اور جرأت و حوصلہ کے باعث جذبۂ جہاد سے سرشار ہر مسلم نوجوان کا نفسیاتی سہارا ضرور بن گیا۔ اور عالمِ اسلام کے وسیع تناظر میں یہی وہ خطرناک قوت تھی جو امریکہ کیلئے اضطراب کا باعث بن گئی۔ سوڈان کی زمین اسامہ بن لادن پر تنگ کر دی گئی اور اسے اس ملک کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اب اسامہ بن لادن کا کیمپ افغانستان میں ہے جہاں وہ مہمان کی حیثیت سے مقیم ہے اور اس کی سرگرمیوں کا کوئی ایسا نیٹ ورک نہیں ہے جو بین الاقوامی ایجنسیوں کی باریک بین نگاہوں سے اوجھل رہ سکے۔ البتہ پوری دنیا کے مسلم مجاہدین کے دلوں میں اس کی محبت و عقیدت دن بدن بڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے امریکیوں کے قتل کیلئے اس کا حالیہ فتویٰ ایٹم بم سے بھی خطرناک سمجھا جا رہا ہے۔

خلیج کے حوالے سے اسامہ بن لادن کی جنگ امریکہ کے ساتھ یہ ہے کہ امریکہ فوجی قوت کے بل بوتے پر اس خطہ میں اپنا تسلط دن بدن مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کے مکمل تحفظ کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کو منتشر اور بے بس بنائے رکھنے کیلئے اپنے تمام وسائل وقف کر رکھے ہیں۔ وہ تیل کے چشموں پر غاصبانہ قبضہ جمائے ہوئے ہے اور عرب عوام کو ووٹ، آزادئ رائے، اور شہری حقوق سے مکمل طور پر محروم کر دینے والی آمریتوں کا پشت پناہ بنا ہوا ہے۔ اسامہ بن لادن کا مطالبہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری خلیج سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں، عربوں کے تیل اور دولت کا ظالمانہ استحصال بند کریں، اور عرب ممالک اور اقوامِ متحدہ کی خود مختاری بحال کر دیں، تاکہ عرب عوام پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ کسی قسم کے دباؤ اور مداخلت کے بغیر اپنے فیصلے خود کر سکیں۔

سعودی عرب کی داخلی صورتحال میں اسامہ بن لادن کو یہ شکایت ہے کہ وہاں اسلام کی مکمل عملداری نہیں ہے۔ شاہی نظام ہے جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، قومی خزانہ شاہی خاندان کے اللوں تللوں میں برباد ہو رہا ہے، سودی

معیشت نے ملک کو کھوکھلا کر دیا ہے، سعودی عرب کے عوام کو شریعت اسلامی کے مطابق شہری حقوق حاصل نہیں ہیں، ملک کو امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھ دیا گیا ہے، اور سعودی عرب کی موجودہ پوزیشن کی وجہ سے امریکہ اور اسرائیل پورے مشرق وسطیٰ میں من مانی کاروائیاں کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کر رہے۔

یہ ہے حالات و واقعات کا وہ تسلسل جس نے بن لادن فیملی کے اس تجارتی شہزادے کے ہاتھ میں کلاشنکوف پکڑا کر اسے امریکہ جیسی سپر پاور کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ وہ امریکیوں کو جہاں ملیں قتل کرنے پر آ گیا ہے اور امریکہ اس کی گرفتاری کیلئے بے قرار ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایمل کانسی کی طرح اسامہ کی گرفتاری کیلئے بھی مقامی اور علاقائی ذرائع کو استعمال کرنے میں امریکہ کامیاب ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکی استعمار کے تسلط سے خلیج عرب کی آزادی کی جنگ میں اسامہ بن لادن ایک نئے گوریلا لیڈر کے طور پر تاریخ کے مستقل باب کا عنوان بن جائے۔ اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی لیکن اس مرحلہ پر ہم اپنی گزارشات کا اختتام بعض حلقوں کے اس نازک اور چبھتے ہوئے سوال کا جائزہ لیتے ہوئے کرنا چاہیں گے کہ اسامہ بن لادن آخر ہتھیار کی زبان میں کیوں بات کرتا ہے؟ اور کیا حکومتوں اور نظاموں کے خلاف ہتھیار اٹھانا اور قتل کی دھمکیاں دینا دہشت گردی نہیں ہے؟

سوال بجا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیے کہ امریکہ بھی تو خلیج میں ہتھیار کی زبان استعمال کر رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کا خنجر عسکری قوت کے بل بوتے پر ہی عربوں کے سینے میں گھونپ رکھا ہے، وہ عربوں کے تیل اور دولت پر مسلح فوجوں کی طاقت کے زور پر ہی قابض ہے، اس نے عرب عوام کی شہری آزادیوں اور شرعی حقوق کا راستہ بندوق کی نالی سے ہی روک رکھا ہے، اور عرب ممالک کی خود مختاری اس کی فوجی چھاؤنیوں کے تہہ خانوں میں ہی جکڑی پڑی ہے۔ اس لیے اگر کسی عرب نے ہتھیار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھا لیا ہے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑی کہ آزادی کی جنگیں اسی طرح لڑی جاتی ہیں۔ پھر ہم تو سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، جنرل بخت خانؒ، مولانا محمد قاسمؒ، سردار محمد خان کھرل شہیدؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، فقیر ایپیؒ، اور حاجی صاحب ترنگ زئیؒ کے خطہ کے لوگ ہیں۔ ہمیں جنگ آزادی اور ہتھیار کا تعلق سمجھنے کیلئے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم تو ان مراحل سے کئی بار گزر چکے ہیں۔ اور جنوبی ایشیا میں امریکہ کی موجودہ پالیسیاں مستقبل قریب میں ہمارے انہی مراحل سے ایک بار پھر گزرنے کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

مغربی دانشور اور طالبان کا اسلام

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے گذشتہ سال ایک تقریب میں اپنے دانشوروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اسلام کا مطالعہ کریں اور بطور نظام زندگی اور متبادل سسٹم اسے اسٹڈی کریں، لیکن اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتوں کی طرف مت دیکھیں، ایک یہ کہ ہمارے بڑوں نے اسلام کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے، دوسرا یہ کہ اس وقت مسلمان کیسے نظر

آرہے ہیں۔

برطانیہ ہی کے ایک ممبر پارلیمنٹ جم مارشل نے چند سال پہلے لیسٹر میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس اسلام سے ہمارے بڑوں نے متعارف کرایا وہ اور ہے، جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اور ہے، جبکہ دنیا میں اس وقت موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں میں جو اسلام نظر آتا ہے وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آج اسلام دنیا کی ضرورت بن گیا ہے اور مروجہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی سسٹم کی ناکامی کے بعد اب آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی طرف رجوع کیے بغیر نسل انسانی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ جبکہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی اگر محفوظ حالت میں کسی مذہب کے پاس موجود ہیں تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔ لیکن کنفیوژن اس بات نے پیدا کر رکھا ہے کہ کتابوں میں جو اسلام ملتا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں اور معاملات سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا کو ضرورت دراصل کتابوں والے اسلام کی ہے، ہماری زندگیوں والے اسلام کی نہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ برائے نام اسلام تو ہمیں مشکلات و مسائل میں سہارا نہیں دے رہا، دنیائے انسانیت کے مسائل کیا حل کرے گا؟

برصغیر کی تحریک آزادی کے عظیم راہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب ماسکو گئے اور کمیونسٹ لیڈروں سے اسلام کے فلسفۂ حیات اور نظام زندگی پر بات کی تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ فلسفہ اور سسٹم دنیا میں کسی جگہ عملاً رائج بھی ہے؟ مولانا سندھیؒ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج مولانا سندھیؒ کا قافلہ اس سوال کے جواب میں خاموش رہنے پر مجبور نہیں ہے، اس لیے کہ طالبان نے کتابوں میں لکھے ہوئے اسلام کو افغانستان کی سرزمین میں عملی شکل دینے کا کام شروع کر دیا ہے اور یہی بات مغرب کے دانشوروں کیلئے سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

اسلام نام ہے سادگی، قناعت اور جفاکشی کا۔ اور یہ صرف ہمارے تصوف کے موضوعات نہیں بلکہ سیاست کے بنیادی ستون بھی ہیں۔ سادگی، قناعت اور جفاکشی کروڑوں روپے کی لاگت سے بنے ہوئے ایوانوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے اجتماعات کر کے ان عنوانات پر دلکش تقریریں کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان اصولوں کو ذاتی اور اجتماعی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کا نام ہے جس کا بہترین نمونہ خلفاء راشدینؓ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ یا ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ جیسے نیک دل حکمران ہیں۔ اور سیاست و حکومت کا یہی انداز ہے جس کی آج کی دنیا کو ضرورت ہے۔

آج کے دانشور کتابوں میں اس طرز سیاست اور طرز حکومت کو پڑھ کر دنیا کے جغرافیے میں وہ خطے تلاش کرنے لگتے ہیں جہاں اس کی جھلک نظر آتی ہو۔ مگر بدقسمتی سے دنیا کا کوئی مسلمان ملک اس کی جھلک پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور اب پہلا موقع ہے کہ طالبان کی حکومت سادگی، قناعت اور جفاکشی کے ان سنہری اصولوں کو اپنی حکومت اور سیاست کی بنیاد بنا کر دنیا کو کتابوں میں پائے جانے والے خالص اسلام کا عملی نمونہ دکھا رہی ہے۔ مجھے کابل، قندھار اور جلال آباد میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد جانے کا اتفاق ہوا ہے، امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد اور ان کی حکومت کے کئی اساطین سے ملاقات اور گفت و شنید ہوئی ہے، ان کا طرز بود و باش اور لوگوں کے ساتھ معاملات کا انداز دیکھا ہے، سچی بات یہ ہے کہ کتابوں والے اسلام کا عملی نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کی چابیاں وصول کرنے کیلئے بذات خود تشریف لے گئے تھے، اس وقت کیفیت یہ تھی کہ کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے، ان کا غلام اونٹ پر سوار تھا اور نکیل امیر المومنین کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تاریخ نے ایک اور منظر بھی دیکھا تھا کہ عیسائی علماء ہاتھوں میں پرانی کتابیں اٹھائے ان میں سے بیت المقدس کے فاتح کی نشانیاں پڑھتے جاتے تھے اور ایک ایک نشانی کو حضرت عمرؓ میں دیکھتے جاتے تھے۔ اور بالآخر سب کے سب پکار اٹھے تھے کہ بیت المقدس کی چابیاں اس کے حوالے کر دو، ہماری کتابوں کے مطابق بیت المقدس کا فاتح یہی ہے۔ آج پھر بیت المقدس فاتح کا منتظر ہے اور وہ فاتح اسی طرز کا کوئی درویش ہوگا جو دنیا کے پروٹوکول اور پرسٹیج کے جھوٹے ضابطوں کو رد کرتا ہوا سادگی، قناعت اور جفاکشی کے ساتھ آگے بڑھے گا اور بیت المقدس پر ایک بار پھر اسلام کا ہلالی پرچم لہرائے گا۔

البتہ طالبان کی بعض ترجیحات کو میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے کہ ممکن ہے میری سوچ ہی کوتاہ ہو۔ اس لیے کہ طالبان کا بنیادی مقصد صحیح ہے، ان کا خلوص اور تقویٰ شک و شبہ سے بالاتر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے رخصتوں کے دامن میں پناہ لینے کی بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کیا ہے جو ملتِ اسلامیہ کی اصل منزل ہے۔ اور انہوں نے ہمارے روایتی اسلام کا پرچم بلند کرنے کی بجائے کتابوں والے پرانے اور خالص اسلام کو ملی زندگی میں رائج کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے جس کے بارے میں ماسکو کے کمیونسٹ لیڈروں نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے سوال کیا تھا اور جس اسلام کو کتابوں سے تلاش کرنے کا مشورہ شہزادہ چارلس اپنے دانشوروں کو دے رہے ہیں۔ طالبان کوئی حادثہ نہیں بلکہ حالات کے مدوجزر کا ایک فطری مرحلہ اور تاریخ کے ایک سوال بلکہ چیلنج کا عملی جواب ہیں جس کا نسل انسانی کو صدیوں سے انتظار تھا اور جو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی طرف انسانی معاشرے کی واپسی کا نکتہ آغاز ہیں۔

دو گھنٹے افغان سفارت خانے میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء

ورلڈ اسلامک فورم (برطانیہ) کے سیکرٹری جنرل مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور ان کے رفیق محترم مولانا اورنگزیب خان نے گذشتہ روز اسلام آباد میں امارت اسلامی افغانستان کا سفارت خانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو خیال ہوا کہ نئے افغان سفیر ملا عبد الحکیم مجاہد سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی، چلو دونوں کام اکٹھے ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم تینوں اور مولانا اللہ وسایا قاسم سفارت خانے جا پہنچے۔ میری بہت سی کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے سے وقت لینے کے تکلف میں نہیں پڑتا، موقع پر کام جائے تو ٹھیک ورنہ پھر سہی کے فارمولے پر اکثر عمل کرتا ہوں۔ گیٹ سے چٹ بھجوائی تو جلدی بلا لیا گیا۔ سفیر محترم موجود تھے بلکہ افغان وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی بھی تشریف لائے ہوئے تھے، ان سے غیر متوقع ملاقات کی خوشی ہوئی۔ اس سے قبل کابل میں ان سے مل چکا ہوں، نوجوان ہیں، ذہین ہیں، اور گفتگو کا اچھا

سلیقہ رکھتے ہیں، اردو بول لیتے ہیں اس لیے پاکستانی حضرات کو ان سے گفتگو میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

دونوں حضرات اپنی پہلے سے طے شدہ مصروفیات بھگتا رہے تھے اس لیے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا اور پھر دونوں سے الگ الگ ملاقات ہو گئی۔ پہلے ملا امیر خان متقی ہمارے پاس انتظار گاہ میں آئے اور وہیں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے، ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا اور انہوں نے میرے والد محترم (شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر) کا حال بطور خاص دریافت کیا۔

والد صاحب کے براہ راست اور بالواسطہ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی عمر اس وقت پچاسی برس سے زائد ہے اور وہ اب بھی بحمد اللہ تعالیٰ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بخاری شریف پابندی کے ساتھ پڑھا رہے ہیں۔ والد صاحب پشتون ہیں اور پشتو میں روانی کے ساتھ گفتگو اور خطاب کرتے ہیں۔ گذشتہ سال قندھار جا کر امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد سے مل چکے ہیں اور اب ضعف و علالت کے باوجود کابل جانے کا شوق رکھتے ہیں، جبکہ اب یہ سفر بظاہر ان کے بس کی بات نہیں نظر آتا۔

افغان وزیر اطلاعات سے افغانستان کی موجودہ صورتحال اور طالبان کی حکومت کو درپیش مختلف مسائل پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ بین الاقوامی حلقوں کا وہ دباؤ بھی زیر بحث آیا جو اسلامی احکام و قوانین پر عملدرآمد کے حوالے سے مسلسل بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دباؤ میں اگرچہ اضافہ ہو رہا ہے لیکن امیر المومنین ملا محمد عمر اپنے عزم پر قائم ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ صرف ایک چٹان پر کھڑے ہوں، اردگرد کا سارا ماحول ان کے خلاف ہو جائے اور کوئی بھی ان کا ساتھ نہ دے تب بھی وہ اسلامی احکام و قوانین پر مکمل عملدرآمد کے موقف پر قائم رہیں گے اور اس مسئلہ پر کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ انہوں کہا کہ امیر المومنین کا یہ عزم ہماری اصل قوت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں ضرور سرخرو کریں گے۔

ملا امیر خان متقی نے بتایا کہ افغانستان میں کمیونسٹ دور کے نظام تعلیم کے مکمل خاتمہ کے بعد کچھ وقفہ رہا ہے مگر اب تعلیمی ادارے دوبارہ کھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے بیس کے لگ بھگ نئے دینی مدارس نے بھی کام شروع کر دیا ہے جن کے نصاب میں انگریزی زبان اور دیگر عصری تقاضوں کو سمویا جا رہا ہے۔ صنعتی حوالے سے انہوں نے بتایا کہ شمال کی کشمکش کی وجہ سے بڑے صنعتکار ابھی سرمایہ کاری کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ البتہ قندھار کے اردگرد تھوڑا بہت کام شروع ہے جسے آہستہ آہستہ بڑھایا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شمال کا مسئلہ اپنی جگہ پر مگر جنوب اور وسط میں تو مکمل امن ہے اور ایسا امن افغانستان کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے صنعتکاروں اور تاجروں کو کسی خوف کے بغیر آنا چاہیے اور سرمایہ کاری کر کے اس شعبہ میں اپنے افغان بھائیوں کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

افغان وزیر اطلاعات نے ایک اور ضرورت کی طرف توجہ دلائی کہ افغان عوام میں دینی مسائل کا شعور بیدار کرنے اور دینی معلومات کو عام کرنے کیلئے دینی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ اور وہ ایسی کتابوں کا فارسی اور پشتو میں ترجمہ کرا کے انہیں شائع اور تقسیم کرانا چاہتے ہیں جن میں مسائل و احکام کو اچھے طریقہ سے سمجھایا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی مشہور کتاب ''بہشتی زیور'' کا بطور خاص ذکر کیا جس کا ترجمہ وہ کرا چکے ہیں مگر طباعت کیلئے

وسائل میسر نہیں ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کچھ اصحابِ خیر دلچسپی لے کر ایسی چند کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری اٹھالیں تو ایک اچھے اور مفید کام میں پیشرفت ہوجائے گی۔

ملا امیر خان متقی سے ملاقات کے بعد ہم سفیر محترم ملا عبدالحکیم مجاہد سے ملنے کیلئے ان کے کمرے کی طرف بڑھے تو ذہن اس تردد میں تھا کہ اللہ جانے انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے یا نہیں۔ لیکن آمنا سامنا ہوا تو صورت کچھ دیکھی بھالی سی لگی مگر پہچان نہ سکا۔ البتہ انہوں نے معانقہ کے ساتھ یہ سوال داغ دیا کہ ”راشدی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟“ مجھے معذرت کے سوا کوئی جواب نہ سوجھا کیونکہ دماغ کا کمپیوٹر اس کے بغیر کچھ نہیں بتا رہا تھا کہ انہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ چنانچہ یہ عقدہ انہیں خود ہی حل کرنا پڑا کہ افغان مجاہدین کے شہید راہنما مولوی نصر اللہ منصورؒ کے ہمراہ وہ ہمارے ساتھ ایک دفعہ آزاد کشمیر کے سفر میں شریک تھے جہاں مولوی صاحب شہید نے دارالعلوم تعلیم القرآن باغ کے سالانہ جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ مولوی عبدالحکیم مجاہد جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فاضل ہیں، اردو و عربی کے ساتھ ساتھ انگلش پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور معاملہ فہم اور زیرک عالم دین ہیں۔

افغان سفیر نے اپنی تفصیلی گفتگو میں مختلف امور پر روشنی ڈالی جن میں سے دو باتوں کا تذکرہ اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے ”وسیع البنیاد حکومت“ کی اصطلاح کا ذکر کیا جس کا افغانستان کے حوالے سے ایک عرصہ سے چرچا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ اس پر زور دے رہا ہے کہ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے۔ اس سے ان کی مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ عوام کے مختلف گروہوں اور طبقات کی نمائندگی حاصل ہو، کیونکہ عوام کی اکثریت تو طالبان کے ساتھ ہے اور طالبان کی حکومت اور نظام میں ہر طبقہ، گروہ، علاقہ، اور زبان کے افراد شامل ہیں۔ بلکہ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ خالص اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کی تنہا حکومت نہ رہے اور اس میں سیکولر اور کمیونسٹ عناصر کو بھی شریک اقتدار کیا جائے تاکہ طالبان اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کے پروگرام پر عمل نہ کر سکیں۔ اس لیے اگر سارا افغانستان ایک طرف ہوجائے اور گنتی کے چند لوگ دوسری طرف رہ جائیں تب بھی یہ مغربی ممالک یہی مطالبہ کرتے رہیں گے کہ ”وسیع البنیاد حکومت“ کے نام پر انہیں ضرور شریک حکومت کیا جائے۔ جبکہ یہ بات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ جہاد افغانستان کا مقصد ہی اسلامی نظام کا نفاذ تھا، اور طالبان کی تحریک اسی مقصد کو زندہ کرنے اور بروئے کار لانے کیلئے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں کسی لچک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ آج امریکہ اور اقوامِ متحدہ ہمیں تسلیم نہیں کر رہے لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا؟ انہوں نے چین کو بھی ایک عرصہ تک تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اس کی ضد میں تائیوان کو سلامتی کونسل میں بٹھائے رکھا۔ لیکن حقیقت خود کو تسلیم کرا لیتی ہے چنانچہ انہیں آخر کار چین کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ اس لیے ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے اور اس بات کا یقین ہے کہ ہم اگر اپنے عزم اور پروگرام پر قائم رہے اور اس میں مسلسل آگے بڑھتے رہے تو اقوامِ متحدہ اور دوسرے اداروں اور ممالک کیلئے ہمارا وجود تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا اور وہ حقیقت سے زیادہ دیر تک انکار نہیں کر سکیں گے۔

ہمارے وفد میں شریک مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور مولانا اورنگزیب خان ایک عرصہ سے برطانیہ میں قیام پذیر ہیں

اور مغربی میڈیا اور لابیوں کی براہ راست زد میں ہیں۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات و خدشات تھے، لیکن افغان سفارت خانے میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو ان کے چہروں کا اطمینان اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ ان خدشات و سوالات سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس کی دلیل مولانا رضاء الحق کا یہ عزم ہے کہ وہ برطانیہ جا کر طالبان حکومت کے خلاف پھیلائے گئے شکوک و شبہات کے ازالہ کیلئے کام کریں گے اور وہاں کے مسلمانوں کو اصل صورتحال سے باخبر کرنے کی کوشش کریں گے۔

طالبان کی حکومت اور اقوام متحدہ کا منشور

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ جولائی ۱۹۹۸ء

اس بات سے قطع نظر کہ انسانی حقوق کے حوالے سے مغربی ممالک نے ہمیشہ دہرا معیار رکھا ہے۔ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، اور کوسووو میں انسانی حقوق کی پامالی امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی وہ توجہ کبھی حاصل نہیں کر سکی جو ان کے اپنے مفادات کے علاقوں میں ہمیشہ امتیازی حیثیت کی حامل رہی ہے۔ ہمارے نزدیک انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ، اقوامِ متحدہ کا منشور، اور اقوامِ متحدہ کے متعلقہ اداروں کی قراردادوں کا موجودہ فریم ورک ہی سرے سے متنازعہ ہے۔ مثلاً نکاح و طلاق اور خاندانی نظام کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے چارٹر نے جو اصول بیان کیے ہیں، قرآنی تعلیمات ان کو قبول نہیں کرتیں۔ اور اس چارٹر کو من وعن قبول کرنے سے کوئی بھی مسلمان فرد، خاندان، یا قوم بنیادی اسلامی تعلیمات سے منحرف قرار پاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دفعات اس چارٹر میں ایسی موجود ہیں جو اسلامی احکام و قوانین کی نفی کرتی ہیں۔ اور اب جبکہ عالم اسلام کے بیشتر ممالک آزاد ہو چکے ہیں، ان میں سے بہت سے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری کی تحریکات مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں، دنیا کے نقشے پر بہت سی مسلم حکومتوں کے گریز اور تذبذب کے باوجود عالم اسلام ایک واضح بلاک کی شکل اختیار کرتا نظر آرہا ہے، اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے بعد طاقت کے عالمی توازن میں بھی عالم اسلام کی پوزیشن پہلے سے بہتر ہوگئی ہے۔ اس صورتحال میں اقوامِ متحدہ کا منشور اور اس کی آڑ میں امریکہ و دیگر مغربی ممالک کا طرز عمل پہلے سے زیادہ متنازعہ ہوتا جا رہا ہے، اور عالم اسلام کی دینی تحریکات اور اسلامی عناصر اس کی مسلسل نفی کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت اب تک جو اقوامِ متحدہ کے منشور اور اس کے دیگر متعلقات پر دستخط کرنے سے گریزاں ہے اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔

تین سال قبل اقوامِ متحدہ کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر ملیشیا کے وزیراعظم جناب مہاتیر محمد نے مسلم ممالک کو تجویز دی تھی کہ وہ انسانی حقوق کے بارے میں مغربی ممالک کے دہرے معیار اور طرز عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر اقوامِ متحدہ کی گولڈن جوبلی تقریبات کا بائیکاٹ کریں۔ لیکن ایک دو کے سوا کسی مسلم حکومت نے اس تجویز کا مثبت جواب نہیں دیا۔ اس موقع پر جناب مہاتیر محمد نے اقوامِ متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کا مطالبہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ بدلتے ہوئے

حالات اور نئے عالمی حقائق کے پیش نظر اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر یہ مطالبہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوا تھا۔

ازبکستان میں مساجد کی بندش

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۸ء

روزنامہ نیشن لندن نے ۶ جون ۱۹۹۸ء کو خبر دی ہے کہ ازبکستان کی حکومت نے تین ہزار مساجد کو بند کر کے ان میں شاپنگ سنٹر کھولنے کا فیصلہ کیا ہے اور وزارتِ انصاف کے ایک ترجمان کے مطابق بائیس مساجد کو اس پالیسی کے تحت اب تک بند کیا جا چکا ہے۔

وسطی ایشیا کی ان ریاستوں میں روس کے کمیونسٹ انقلاب کے تسلط کے بعد مساجد کو بند کر دیا گیا تھا اور نماز کا اجتماعی اہتمام اور دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ راقم الحروف نے چند سال قبل تاشقند اور سمرقند میں خود ایسی مساجد دیکھی ہیں جو کمیونسٹ دور میں سیمنٹ کے گودام اور سینما ہال کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں۔

جہادِ افغانستان کے بعد روس کو اس خطہ سے واپس جانا پڑا اور سوویت یونین بکھر گیا تو یہ ریاستیں آزاد ہوئیں، لیکن ان میں حکومتیں ابھی تک وہی چلی آ رہی ہیں جو کمیونسٹ دور میں تھیں، اس لیے ان کا مزاج اور طریق کار ابھی تک وہی ہے۔

آزادی کے بعد مذہبی لوگ جو اس سے قبل زیر زمین تھے اور خفیہ طور پر تہہ خانوں میں نمازوں اور دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے، منظر عام پر آ گئے۔ مساجد اور مدارس کھلنے کا عمل شروع ہو گیا اور ہزاروں مساجد پھر سے آباد ہو گئیں۔ جس سے دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ دینی تحریکات منظم ہونا شروع ہو گئیں جنہوں نے بعض ریاستوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ یہ صورتحال ان ریاستوں کی پہلے سے چلی آنے والی کمیونسٹ مزاج حکومتوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی، اور انہیں پڑوس میں ترکی کی سیکولر حکومت کے اسلام دشمن اقدامات سے بھی حوصلہ ملا۔ اس لیے ان ریاستوں میں ''ریورس گیئر'' کا عمل شروع ہو گیا ہے اور ازبکستان حکومت کا یہ فیصلہ بھی اسی کا حصہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان اور عالمِ اسلام کی دیگر حکومتوں اور بین الاقوامی مسلم اداروں اور تنظیموں کو اس صورتحال کا نوٹس لینا چاہیے اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے ان ریاستوں کی حکومتوں سے رابطہ کرنا چاہیے، تاکہ اس خطہ میں اسلامی اقدار کے احیا کا جو عمل دوبارہ شروع ہوا ہے وہ فطری انداز میں جاری رہ سکے۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور جہادِ افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ اگست ۱۹۹۸ء

...... افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد کے بعد جہادِ افغانستان کا آغاز ہوا تو حضرت درخواستیؒ نے افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے قبائلی علاقہ کا طوفانی دورہ کیا جہاں ان کے مرید اور شاگردوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ جہادِ افغانستان کی حمایت میں پرجوش بیانات جاری کر کے پورے علاقہ میں جہاد کے حق میں فضا گرم کر دی، جس کے اثرات مدت تک محسوس کیے جاتے رہے۔

افغان مجاہدین کے ایک سرگرم راہنما مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ ایک بار شیرانوالہ لاہور میں جمعیت علماء اسلام کے مرکزی اجلاس کے موقع پر آئے اور کہا کہ میں حضرت درخواستیؒ کی زیارت کیلئے آیا ہوں جنہوں نے قبائلی علماء اور عوام کو جہادِ افغانستان کی حمایت کیلئے تیار کر کے ہمارا راستہ صاف کر دیا ہے۔

حضرت درخواستیؒ آخر وقت تک علالت، ضعف، اور نقاہت کے باوجود جہاد افغانستان کیلئے فکرمند رہے اور اس سلسلہ میں بہت سے اجتماعات میں شریک ہو کر خطاب کیا۔ ایک موقع پر اسلام آباد میں افغان مجاہدین کی سات بڑی جماعتوں کے سربراہوں کو جمع کر کے انہیں آپس میں متحد رہنے اور دشمن کی سازشوں سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ساتوں بڑے افغان لیڈر حضرت درخواستیؒ کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن جنہیں خانہ کعبہ کے اندر کیا ہوا معاہدہ متحد نہ رکھ سکا حضرت درخواستیؒ کی تلقین ان پر کیا اثر کر سکتی تھی؟......

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء

...... حضرت درخواستیؒ کے خطابات و تقاریر کا ایک اہم موضوع جہاد ہوتا تھا۔ جس دور میں جہادِ افغانستان کا آغاز نہیں ہوا تھا وہ اس وقت بھی عام طور پر جہاد کے فضائل بیان کرتے اور علماء کرام اور دینی کارکنوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تھے۔ اور جب افغانستان میں جہاد کا عملی آغاز ہوا تو وہ اس جہادی تحریک کے پشت پناہ بن گئے، انہوں نے افغان علماء کی اس جدوجہد کو شرعی جہاد قرار دیا، اس کی حمایت میں ملک بھر کا دورہ کیا اور خاص طور پر افغانستان کی طویل سرحد کے ساتھ قبائلی علاقوں کا طوفانی دورہ اور تفصیلی دورہ کر کے علماء کرام اور عوام کو جہادِ افغانستان کی حمایت و نصرت کیلئے تیار کیا۔ پاکستان کے علماء کرام اور کم و بیش سب اہم دینی جماعتوں نے جہادِ افغانستان کی حمایت و اعانت کی ہے لیکن اس جہاد کی پشتی بانی میں جو عظیم کردار حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا عبد الحقؒ کا ہے وہ افغان جہاد کی تاریخ میں ایک مستقل اور روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔......

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۸ مارچ ۲۰۰۳ء

......مقررین اپنے خطابات میں حضرت درخواستیؒ کی اس چومکھی لڑائی کا تذکرہ کررہے تھے جو انہوں نے زندگی بھر باطل کے خلاف لڑی اور ان کی بصیرت افروز باتوں کو یاد کرکے ایمان کی تازگی کا سامان کررہے تھے جن کے ذریعے انہوں نے اہل وطن کو آنے والے فتنوں سے بروقت خبردار کردیا تھا۔ جہاد افغانستان میں حضرت درخواستیؒ کے سرگرم کردار کا بھی تذکرہ ہوا اور ایک مقرر نے بتایا کہ ابھی افغانستان سے مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تھی اور روسی افواج کے خلاف مسلح مزاحمت کا کوئی واضح پروگرام سامنے نہیں آیا تھا کہ افغان مہاجرین کے ایک کیمپ میں حضرت درخواستیؒ تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطاب کے دوران مہاجر سامعین کی مسلسل اٹھک بیٹھک شروع کرادی۔ بعد میں فرمایا کہ انہوں نے اب جہاد کرنا ہے اور میں ان کو تربیت دے رہا ہوں۔ یہ ان کی خداداد بصیرت کی بات تھی کہ انہوں نے آنے والے دور کی ضروریات سے بروقت لوگوں کو خبردار کرنا شروع کردیا تھا......

---

۶ مئی ۲۰۰۳ء کو جمعیت علماء اسلام فیصل آباد کے زیر اہتمام حضرت درخواستیؒ کی یاد میں منعقدہ ایک اجتماع سے خطاب کا متعلقہ حصہ

......حضرت درخواستیؒ کی زندگی میں ہم نے بارہا دیکھا کہ ملک میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا یا حالات میں کسی بڑی خرابی کے آثار نمودار ہوئے تو حضرت درخواستیؒ خانپور سے نکل پڑے اور قریہ قریہ گھوم گئے، کہیں جلسہ سے خطاب کرکے عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کررہے ہیں، کہیں مدارس کے اجتماعات میں علماء کرام اور کارکنوں سے اس فتنہ کے مقابلہ کا عہد لے رہے ہیں، کسی کو سامنے کھڑا کرکے اس سے نعرے لگوارہے ہیں، کسی کی دستار بندی کرکے اس کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں، کسی کو اس کی سستی پر ڈانٹ رہے ہیں اور کسی کو علمی انداز میں اس کی ذمہ داری یاد دلارہے ہیں۔ حضرت درخواستیؒ چند دنوں میں ملک کے اکثر حصوں میں گھوم جایا کرتے تھے اور تحریک کی سی کیفیت پیدا کردیا کرتے تھے، ہم نے دیکھا ہے کہ ان دنوں میں وہ نہ دن کو آرام کرتے تھے، نہ رات کو کہیں نیند کیلئے رکتے تھے، مسلسل سفر ہوتا تھا اور میرے جیسے متحرک کارکن بھی دو تین روز سے زیادہ ان کے ساتھ مسلسل سفر نہیں کرپاتے تھے۔ پرانے حضرات کو یاد ہوگا کہ افغانستان پر روسی افواج کی یلغار کے بعد افغانستان کے ساتھ ساتھ قبائلی پٹی میں عوام کو جہاد کیلئے تیار کرنے کی غرض سے حضرت درخواستیؒ کس طرح چند دنوں میں آزاد قبائل میں گھوم گئے تھے، یہ حضرت درخواستیؒ کی شبانہ روز محنت، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے علمی اثرات، اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا مضبوط علمی اور سیاسی موقف تھا جس نے جہاد افغانستان کی پشت پناہی کی تھی اور افغان مجاہدین پورے اعتماد کے ساتھ روسی افواج کے خلاف نبرد آزما ہوگئے تھے۔......

اسامہ بن لادن پر امریکی حملہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ اگست ۱۹۹۸ء

امریکہ بہادر نے بالآخر اسامہ بن لادن کو اپنے حملوں کا نشانہ بنا لیا ہے جو اس امر کا اعتراف ہے کہ واحد سپر پاور ہونے کا دعوے دار ملک اپنے ایک دشمن کو قابو کرنے میں تمام تر وسائل اور اثر و رسوخ استعمال کرنے کے باوجود ناکام رہا ہے۔ اور اب جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر طاقت کے بھونڈے استعمال پر اتر آیا ہے۔

اسامہ پر الزام ہے کہ وہ افریقہ کے دو ملکوں میں امریکی سفارت خانوں کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور کچھ دیگر امریکی مراکز کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس لیے امریکہ کیلئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تمام تر بین الاقوامی ضابطوں اور مسلمہ اصول و روایات کو ایک طرف رکھتے ہوئے دو آزاد ملکوں کی داخلی حدود میں محض اس شبہ پر نہتے شہریوں کی جانوں سے کھیلے کہ اس کے خیال میں وہاں اسامہ بن لادن موجود ہے، یا وہاں امریکی مراکز پر حملہ آور ہونے کیلئے افراد کو تربیت دی جا رہی ہے اور اس کیلئے سامان تیار کیا جا رہا ہے۔ طاقت کی حکمرانی یا جنگل کے قانون کا یہ بے رحمانہ اظہار کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ ہر زمانے کے فرعونوں کا وطیرہ رہا ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کسی فرعون کو اپنے عزائم میں کامیابی نہیں ملی اور ہمیشہ اس کی درندگی اور بربریت کا شکار ہونے والے مظلوم، بے بس، اور نہتے عوام کو ہی سرخروئی حاصل ہوئی ہے۔

امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے اپنے اس اقدام کا جواز پیش کرنے کیلئے ٹیلی ویژن پر خطاب بھی کیا ہے اور وہ اپنی چھٹیاں مختصر کر کے وائٹ ہاؤس واپس پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اب دنیا اتنی سادہ اور بے خبر نہیں ہے کہ وہ ٹی وی پر امریکہ کے صدر کا چہرہ دیکھ کر مطمئن ہو جائے کہ عزت مآب جو کچھ فرما رہے ہیں وہی درست ہے۔ بلکہ اب ٹی وی کے سامنے بیٹھنے والا اور اخبار پڑھنے والا عام آدمی بھی بال کی کھال اتارنے لگا ہے۔ آج صبح راقم الحروف اخبار پڑھنے کیلئے ساؤتھ آل لندن کے علاقے میں حاجی محمد اشرف خان کی دکان پر گیا تو کچھ حضرات اسی موضوع پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔

ایک صاحب کا کہنا تھا کہ صدر بل کلنٹن کے اس اقدام کے پیچھے ان کے ذاتی حالات کار فرما ہیں اور انہوں نے اس جنسی سکینڈل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کیلئے یہ سب کچھ کیا ہے جس میں انہیں جیوری کے سامنے وائٹ ہاؤس کی ایک ملازمہ کے ساتھ جنسی تعلقات کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

جبکہ دوسرے صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ اسامہ بن لادن پر دہشت گردی کا الزام لگانے والا امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک اس حقیقت سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کہ اس دہشت گردی کا باعث وہ خود ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سازش کے تحت عربوں کی زمین یہودیوں کو دلوا کر وہاں اسرائیل قائم کرایا اور اب تک اسے تحفظ فراہم کیے ہوئے ہیں جو اس سارے قضیے کی اصل جڑ ہے۔ پھر امریکہ اور اس کے حواری ممالک مشرق وسطیٰ میں اپنی بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ براجمان ہیں اور من مانی کر رہے ہیں۔ اس لیے اس خطہ کے آزادی خواہ لوگوں کیلئے اس کے سوا کون سا راستہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ اپنے حقوق اور آزادی کیلئے وہی کچھ کریں جو ان کے بس میں ہو۔

ایک اور صاحب کا تبصرہ تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ صدر بل کلنٹن نے خلیج عرب اور دوسرے علاقوں میں یہود نواز

پالیسی میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لی تھی اور عربوں و مسلمانوں کو کچھ مراعات دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی جس کی سزا یہودی لابی نے انہیں سیکس سکینڈل کی صورت میں دی۔ اس سیکس سکینڈل میں یہودی لابی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد کلنٹن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب مسلمان ملکوں پر یہ تازہ حملہ ان کا "سجدہ سہو" ہے جس کے ذریعے وہ یہودی لابی کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے پالیسی میں لچک کا خیال ترک کر دیا ہے اور وہ بہت سے سابق امریکی صدور کی طرح یہودی لابی کے ہاتھوں مکمل طور پر استعمال ہونے کیلئے تیار ہیں۔

انہی میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ان مغربی حکمرانوں اور دانشوروں سے جب پوچھا جائے تو ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا جواب دہشت گردی اور انتہا پسندی نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے اسباب معلوم کرو، اس کے طرز عمل کا پس منظر دیکھو، اور اس کی جڑ تلاش کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ مگر مسلمانوں کے بارے میں ان کا معیار یہ نہیں ہے اور یہ دوسرے کئی معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی مسلمانوں کیلئے الگ معیار رکھتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اس امریکی اقدام کے بارے میں عام لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کیلئے کچھ حضرات سے ملاقات کروں گا مگر اسی ایک محفل میں دو تین عام شہریوں کی گفتگو سن کر اندازہ ہو گیا کہ افغانستان اور سوڈان پر امریکہ کے فضائی حملوں کے جواز میں صدر بل کلنٹن کی منطق عام لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکی۔ اور انہی میں سے ایک صاحب کے بقول امریکہ نے یہ حملے کر کے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ الٹا نقصان اٹھایا ہے۔

صدر بل کلنٹن کا کہنا ہے کہ ان کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ دہشت گردی کے خلاف ہے اور وہ دہشت گردی کے مراکز کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ہم ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ "دہشت گردی" کی تعریف کیا ہے؟ کیا کسی کے خلاف ہتھیار اٹھانا مطلقاً دہشت گردی ہے؟ اور کیا اپنی آزادی، خود مختاری، اور حقوق کیلئے جابر اور ظالم قوتوں کو ہتھیار کا جواب ہتھیار کی زبان میں دینا بھی دہشت گردی کہلاتا ہے؟ اگر امریکی صدر کی منطق یہی ہے تو ہم بصد احترام یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ خود امریکہ نے برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنگ لڑ کر آزادی حاصل کی تھی اور ہتھیار اٹھا کر برطانوی حکمرانوں کو امریکہ سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کیا تھا۔ اس طویل جنگ آزادی میں امریکی حریت پسند بھی اسی طرح برطانوی حکمرانوں کے مراکز کو نشانہ بناتے تھے اور حکمران گروہ کے افراد کو قتل کرتے تھے جن کے ساتھ کئی بے گناہ بھی قتل ہو جایا کرتے تھے۔ تاریخ اٹھا کر امریکہ کی جنگ آزادی کے ان مراحل پر نظر ڈالیے اور ان تمام لوگوں پر دہشت گرد ہونے کا الزام عائد کیجیے جو برطانوی استعمار کے خلاف امریکہ کی آزادی کیلئے ہتھیار بکف اور مورچہ زن ہو گئے تھے۔ اور پھر صدر کلنٹن کو یہ یاد دلانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ وہ خود انہی دہشت گردوں کی نسل میں سے ہیں اور ان کے آباؤ اجداد میں بھی کوئی نہ کوئی اسامہ بن لادن طرز کا دہشت گرد ضرور رہا ہو گا۔

ہم دہشت گردی کے حق میں نہیں اور اس کی کسی شکل کی حمایت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، لیکن ظالم و جابر قوت کے خلاف اپنی آزادی کیلئے ہتھیار اٹھانے والوں کو دہشت گرد کہنے کے روادار بھی نہیں ہیں۔ صدر کلنٹن کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ امریکہ کی سرپرستی میں فلسطین کا علاقہ وہاں کے اصل باشندوں سے چھین کر یہودیوں کے حوالہ کیا گیا ہے۔ اور

عالمی رائے عامہ حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے علی الرغم امریکہ ان یہودیوں کی سلطنت کی مسلسل سرپرستی اور پشت پناہی کر رہا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری ممالک فوجی طاقت کے بل بوتے پر خلیج میں ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں اور تیل کے چشموں پر قبضے کے علاوہ عربوں کے سرمائے کا وحشیانہ استحصال کر رہے ہیں۔ امریکہ کے تسلط کے باعث خلیج عرب کے بیشتر ممالک کے عوام ان شہری آزادیوں اور سیاسی و انسانی حقوق سے مسلسل محروم ہیں جن کا وہ خود پوری دنیا میں چیمپئن بنا ہوا ہے۔

اس لیے اگر اسامہ بن لادن یا دیگر عرب حریت پسند اپنی آزادی، خود مختاری، اور شہری و انسانی حقوق کیلئے اپنے اوپر مسلط ظالم و جابر قوت کو ہتھیار کا جواب ہتھیار سے دینے پر مجبور ہو گئے ہیں اور جانیں ہتھیلی پر رکھ کر خلیج عرب سے امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی مسلح افواج کی واپسی اور فوجی اڈوں کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یہ دہشت گردی نہیں بلکہ حریت اور آزادی کی جنگ ہے جو اس خطہ کے عوام کا جائز حق ہے اور صدر کلنٹن کو اسے دہشت گردی کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

طالبان کی مزید کامیابیاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۸ء

افغانستان میں بالآخر طالبان کی اسلامی حکومت نے مزار شریف اور دیگر ایسے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے جو ان کے مخالف شمالی اتحاد کے کنٹرول میں تھے۔ اور جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں وادئ پنج شیر کے علاوہ پورے افغانستان پر طالبان کا کنٹرول قائم ہو چکا ہے۔

طالبان دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ پر مشتمل فورس ہے جو جہادِ افغانستان کے نتیجہ میں روسی افواج کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کی مختلف جماعتوں کی مشترکہ حکومت کی ناکامی، اور جہادی تنظیموں کے درمیان بڑھتی ہوئی خانہ جنگی کے ردعمل میں ابھری، اور افغان عوام کے تعاون سے اس نے رفتہ رفتہ پورے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

جہادِ افغانستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والی تنظیموں کے قائدین کے باہمی اختلافات کو ختم کرانے اور انہیں باہمی اعتماد کے ساتھ ایک متحدہ حکومت قائم کرنے پر آمادہ کرنے کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر متعدّد کوششیں ہوئیں، اور بالخصوص پاکستان اور سعودی عرب کی حکومتوں نے ان کے درمیان کئی معاہدے کرائے جن میں ایک معاہدہ پر اتفاقِ رائے کے اظہار کیلئے ساتوں افغان جماعتوں کے قائدین کو بیت اللہ شریف کا دروازہ کھول کر اس کے اندر جمع کیا گیا اور وہاں سب لیڈروں نے متحد رہنے کا عہد کیا، لیکن یہ قائدین ان معاہدوں پر قائم نہ رہ سکے۔

ایک موقع پر پاکستان کے بزرگ ترین عالمِ دین اور جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے بھی ان ساتوں لیڈروں کو پشاور میں جمع کیا اور انہیں باہم متحد رہنے اور جہادِ افغانستان کے منطقی اور اسلامی تقاضوں کی تکمیل کیلئے مشترکہ جدوجہد کی تلقین کی، لیکن ان افغان قائدین پر کوئی تلقین اثرانداز نہ ہو سکی۔

جس کے نتیجے میں افغانستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، اور وہ جہادِ افغانستان جس کی بدولت مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی درجنوں ریاستوں کو آزادی ملی اور جرمنی دوبارہ متحد ہوا، خود اپنی سرزمین پر ان لیڈروں کے منفی طرزِ عمل نے اسی جہادِ افغانستان کے نتائج کو تماشہ بنا کر رکھ دیا۔ جس پر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی اور افغان مجاہدین کی انہی سات تنظیموں میں شامل دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ نے اپنے اپنے لیڈروں کے خلاف بغاوت کر دی اور باہم متحد ہو کر قندھار سے اصلاحِ احوال کا آغاز کیا۔ اور یہ ان درویشوں کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج افغانستان ان کی قیادت میں نہ صرف ایک بار پھر متحد ہو گیا ہے بلکہ خانہ جنگی اور خلفشار کا خاتمہ ہوا ہے، اور افغان عوام کو امن و سکون کے ساتھ اسلامی نظام کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل رہا ہے۔

طالبان اپنے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر اخوند کی قیادت میں اس عزم پر قائم ہیں کہ وہ جہادِ افغانستان کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے افغانستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ کریں گے اور اسے ایک مثالی ریاست بنائیں گے۔ اور اسی مقصد کیلئے انہوں نے افغانستان کا سرکاری نام "امارتِ اسلامی افغانستان" رکھ دیا ہے۔

طالبان کی اسلامی حکومت کو عالمی رائے عامہ اور استعماری قوتوں کی شدید ترین مخالفت اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی مسلسل سازشوں کا سامنا ہے۔ کیونکہ ایک صحیح نظریاتی اور عملی اسلامی ریاست کا وجود ان میں سے کسی کیلئے بھی قابلِ برداشت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ اور امریکہ سمیت دنیا کے بیشتر ممالک اور عالمی ادارے افغانستان پر مکمل کنٹرول اور مثالی امن و امان کے باوجود طالبان کی اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے ابھی تک تیار نہیں ہیں۔ اور ان پر مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ اور عالمی اداروں کے پروگرام کو قبول کر کے اسلامی نظام کے عملی اور مکمل نفاذ کے عزم میں لچک پیدا کریں اور دنیا کی دیگر بہت سی مسلم حکومتوں کی طرح اسلام کے نام کو محض ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عالمی برادری کے موجودہ اجتماعی دھارے میں شامل ہو جائیں۔

لیکن طالبان کی حکومت ابھی تک اس دباؤ کا مقابلہ کر رہی ہے اور ایک مکمل اسلامی ریاست کے قیام کے عزم پر پختہ دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے پاکستان کے دینی حلقوں اور سنجیدہ دینی اداروں اور شخصیات بلکہ دنیا بھر کے اسلامی حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالبان کے اس جائز، اصولی اور اسلامی موقف اور عزم کی حمایت کرتے ہوئے انہیں اخلاقی اور سیاسی سپورٹ اور پشت پناہی فراہم کریں تاکہ وہ زیادہ حوصلے اور اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ سکیں۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم طالبان کی تازہ فتح یابیوں پر انہیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی مکمل کامیابی اور استقامت کیلئے دعاگو ہیں، آمین یارب العالمین۔

ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ ستمبر ۱۹۹۸ء

پاکستان میں ایران کے سفیر جناب مہدی اخوند زادہ نے امریکی عزائم کو پاکستان، ایران اور افغانستان کیلئے یکساں طور

پر خطرناک قرار دیتے ہوئے تینوں ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے پاکستان اور ایران کے درمیان باہمی مفاہمت و تعاون کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے افغانستان میں طالبان کی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات کیلئے چار تجاویز پیش کی ہیں۔

ہمیں سفیر محترم کی ان تینوں باتوں سے اتفاق ہے۔ اول یہ کہ فی الواقع امریکی عزائم ان تینوں ممالک کیلئے یکساں خطرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، دوم یہ کہ تینوں ممالک کو اس سلسلہ میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے، اور سوم یہ کہ پاکستان اور ایران کے درمیان اس بارے میں زیادہ سے زیادہ باہمی مفاہمت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ مگر طالبان کی حکومت کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کیلئے انہوں نے جو مطالبات اور تجاویز پیش کی ہیں وہ ہمارے نزدیک بحث طلب ہیں اور ہم اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مثلاً ایران کے سفیر محترم نے پہلا مطالبہ یہ کیا ہے کہ طالبان کی حکومت ان ایرانی سفارت کاروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے جو ان کے بقول مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر گرفتار کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں جہاں تک ہماری معلومات ہیں طالبان کی حکومت کا موقف یہ ہے کہ مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر ایرانی قونصل خانے میں کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہاں سے کسی کو گرفتار کیا گیا ہے۔ تاہم دوسرے مقامات سے کچھ ایرانی شہری حراست میں لیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ اسلحہ کی ایک بڑی مقدار بھی تحویل میں لی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طالبان کے خلاف جنگ میں ان کے مخالف شمالی اتحاد کے ساتھی تھے اور وہ جنگی قیدی ہیں۔ ہم سفارت کاروں کی غیر مشروط رہائی کے مطالبہ کی تائید کرتے ہیں لیکن اگر طالبان کا یہ موقف درست ہے تو جنگی قیدیوں کو سفارت کار قرار دے کر ان کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کرنا سفیر محترم کو زیب نہیں دیتا اور نہ ہی اس کی حمایت کی جا سکتی ہے۔

جناب مہدی اخوند زادہ نے طالبان کی حکومت سے دوسرا مطالبہ یہ کیا ہے کہ شمالی اتحاد کی جماعتوں کو افغانستان کی حکومت میں شریک کیا جائے۔ یہ دراصل اس مطالبہ کا اعادہ ہے جو دنیا کی مختلف حکومتوں کی طرف سے افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے عنوان سے ایک عرصہ سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مطالبہ بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ اول اس لیے کہ شمالی اتحاد میں شامل انہی جماعتوں کی باہمی خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت اور بدامنی کے ردعمل میں ہی طالبان کی تحریک اٹھی تھی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ طالبان نے ان جماعتوں کی پیدا کردہ بدامنی اور غارت گری سے نجات دلا کر افغان عوام کو امن فراہم کیا ہے۔ اس لیے اگر طالبان ان کی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر لیتے ہیں تو خود ان کے اپنے وجود کا جواز ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کی اخلاقی بنیادوں سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ ان لیڈروں کی اقتدار کی جنگ سے افغان عوام کو نجات دلانے کیلئے میدان میں آئے ہیں۔ دوم اس لیے کہ اب تو میدان جنگ میں بات بہت آگے بڑھ چکی ہے اور شمالی اتحاد کے لیڈر سمٹ سمٹا کر ایک محدود خطہ میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے انہیں اقتدار میں شریک کرنے کی تجویز ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حکومت ایران سے مطالبہ کرے کہ چونکہ مسعود رجائی کی خلق پارٹی اور آیت اللہ شریعت مدار کے حامی علماء بھی ایرانی عوام ہی کے ایک معتدبہ حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ایران میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کیلئے انہیں بھی اقتدار میں شریک کیا جائے۔ ہمیں

یقین ہے کہ ایران کے سفیر محترم اس تجویز پر لاحول ولا قوۃ پڑھنے کے سوا کوئی اور تبصرہ نہیں کر سکیں گے۔

ایرانی سفیر کا تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ طالبان کی حکومت افغانستان کے داخلی معاملات میں ان کے بقول سخت گیر اور انتہا پسندانہ طرز عمل کو ختم کر کے متوازن پالیسیاں اختیار کرے۔ طالبان کی داخلی پالیسیوں کے بارے میں اس سے پہلے بھی بعض ایرانی لیڈروں کا یہ تبصرہ سامنے آچکا ہے کہ طالبان اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر پیش کر رہے ہیں اور اسلام کی تصویر کو خراب کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی توجہ طلب ہے اس لیے کہ خود ایران کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے ملک میں اسلام کی جس تعبیر کو اختیار کیا ہے وہ عالم اسلام کے اجتماعی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتی اور اس کی بنیاد ایران کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب اثنا عشری پر ہے۔ حتیٰ کہ ایرانی دستور کی بنیاد ''ولایتِ فقیہ'' کے جس فلسفے پر ہے وہ خالصتاً فرقہ وارانہ اور انتہا پسندانہ ہے جو موجودہ عالمی رجحانات تو کجا، ملتِ اسلامیہ کی اکثریت کیلئے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود چونکہ وہ ایرانی باشندوں کی اکثریت کے فقہی مذہب کی رو سے ضروری ہے اس لیے اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اور ایرانی قوم کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر اور اسلامی قوانین کے نفاذ میں اپنے اکثریتی مذہب کو بنیاد بنائے، وہ خواہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے کسی گروہ کیلئے بھی قابل قبول نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی اصول پر ایرانی لیڈروں کو افغان عوام کا بھی یہ حق تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ میں اسی تعبیر کو اختیار کریں جو ان کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور جس طرح ایران میں دینی معاملات کو طے کرنے میں وہاں کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب کے علماء فائنل اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں اسی طرح افغانستان میں بھی افغان علماء کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے فقہی اصولوں کے مطابق دینی اصول و احکام طے کریں۔ اس میں کوئی الجھاؤ کی بات نہیں اور یہ بالکل سادہ اور منطقی اصول ہے کہ ہر مسلم ملک میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح وہاں کی اکثریتی فقہی مذہب کے مطابق ہو اور اس میں اسی فقہ کے علماء کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔

جہاں تک اسلام کی نیک نامی یا بدنامی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مقابلے کا میدان ہے، اگر طالبان کی حکومت اپنے دعوؤں کے مطابق افغان عوام کو امن اور خوشحالی کی منزل سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہی وقتی طور پر بدنامی کا باعث بننے والی سخت پالیسیاں اپنے نتائج کے لحاظ سے باقی دنیا کیلئے بھی قابل تقلید بن سکتی ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ طالبان اپنے دعوؤں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو تاریخ کے عجائب گھر میں ابھی بہت سے خانے خالی ہیں کسی ایک میں وہ بھی فٹ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا فیصلہ ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار ہے جس کا سب کو حوصلے کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

جناب مہدی اخوندزادہ نے طالبان کی حکومت سے چوتھا مطالبہ یہ کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کو قبول کریں اور ان کی پابندی کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ایرانی سفیر کے اس مطالبے پر سب سے زیادہ تعجب ہوا ہے کیونکہ ایک نظریاتی مذہبی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے کسی بھی درجے میں اس مطالبے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ مروجہ بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کے فریم ورک کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی بنیاد مغرب کے سیکولر فلسفے اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر ہے جسے اسلامی تعلیمات قبول نہیں کرتیں۔ اور کسی بھی ملک میں

اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا دعویٰ رکھنے والی حکومت کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ موجودہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی قبول کرتے ہوئے اسلام کی مکمل عملداری کے پروگرام پر عمل کر سکے۔ اور اگر کوئی مسلم حکومت اس کا دعویٰ رکھتی ہے تو وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور منافقت کر رہی ہے۔ اب تو اس سلسلہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا کہ موجودہ عالمی اسٹرکچر اور اسلام آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اگلی صدی کی قیادت سنبھالنے کیلئے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ان میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اور اب یہ فیصلہ میدان میں ہی ہوگا کہ اگلی صدی میں انسانی سوسائٹی کی قیادت اسلام اور موجودہ عالمی نظام میں سے کس نے کرنی ہے۔ اس لیے اگر اس فضا میں کوئی شخص کسی اسلامی حکومت یا تحریک کو مروجہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی کی تلقین کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ میدان جنگ میں اسلام کو کفر کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دے رہا ہو۔

جناب مہدی اخوند زادہ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی اسلامی تحریکات کی طالبان کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی صرف اس وجہ سے ہے کہ طالبان کی حکومت اپنے ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی دعوے دار ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والے بین الاقوامی ضابطوں اور قوانین کو قبول نہیں کر رہی۔ گذشتہ سال لندن میں چند اسلامی تحریکات کے ایک اجلاس میں ایک ممتاز عرب دانشور نے کہا کہ ہم تو صرف اس بات کو دیکھ رہے ہیں کہ طالبان موجودہ عالمی سسٹم کے فریم ورک کو قبول کر کے اسلام کو اس کے تابع کرتے ہیں یا اسلام کو اس کے مقابل ایک مستقل سسٹم کے طور پر پیش کر کے ایک نئے عالمی دور کا نقطۂ آغاز بنتے ہیں۔ کیونکہ یہی اصل ٹرننگ پوائنٹ ہے جہاں سے اسلام کی طرف انسانی معاشرہ کی واپسی کا سفر شروع ہوگا۔ اور کیا بعید کہ قدرت نے یہ سعادت طالبان کے حصے میں ہی لکھ رکھی ہو۔

اس لیے ہم جناب مہدی اخوند زادہ اور ایرانی حکومت کے ذمہ دار حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ معروضی حقائق کو نظر انداز نہ کریں اور طالبان کی اسلامی حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے اسے سپورٹ کریں۔ اور اس خطہ بلکہ پورے عالم اسلام میں امریکہ کے خطرناک عزائم کو ناکام بنانے کیلئے فرقہ وارانہ ترجیحات اور تحفظات سے بالاتر ہو کر باہمی تعاون کو فروغ دیں، کیونکہ موجودہ عالمی تناظر میں امریکہ کو شکست دینے اور اس کے اسلام دشمن عزائم کو خاک میں ملانے کا واحد راستہ یہی ہے۔

وزیراعظم میاں محمد نواز شریف اور طالبان کا اسلام

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۹۸ء

وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے گذشتہ دنوں مہمند ایجنسی میں قبائلی عوام سے خطاب کرتے ہوئے افغانستان میں نفاذِ اسلام کیلئے طالبان کی اسلامی حکومت کے اقدامات کا ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ طالبان نے اسلامی نظام کے ذریعے ملک کے بڑے حصے میں امن قائم کر دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی امن کے قیام کیلئے اس طرح کے نظام کی ضرورت ہے۔

اس پر دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اور اخبارات میں تبصرے ہو رہے ہیں اور سیکولر حلقے اس بیان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ مگر ہم میاں محمد نواز شریف کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں کہ طالبان کی اسلامی حکومت نے فی الواقع اپنے زیرنگیں علاقوں میں مثالی امن قائم کر دیا ہے، جو اسلامی قوانین کی برکت ہے اور دن کی روشنی کی طرح ساری دنیا کو نظر آرہا ہے، اس لیے ہمیں بھی اگر امن قائم کرنا ہے اور قتل و غارت، کرپشن، دہشت گردی اور بدامنی سے نجات حاصل کرنا ہے تو اسی نہج پر خالص اسلامی قوانین عملاً نافذ کرنا ہوں گے، ورنہ وطنِ عزیز بدامنی اور لاقانونیت سے نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔

البتہ اس کے ساتھ وزیراعظم سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ طالبان جیسا اسلام نافذ کرنے کیلئے خود بھی طالبان جیسا بننا ضروری ہے، کیونکہ آم کا پھل آم ہی کے درخت سے حاصل کیا جا سکتا ہے، خودرو جھاڑیوں کے کنارے دامن پھیلائے کھڑے رہنے سے کانٹوں کے سوا کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔

طالبان جیسا نظام اور دینی مدارس

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ دسمبر ۱۹۹۸ء

ہمارے معاشرے میں عام آدمی کا تعلق دینی تعلیم کے ساتھ قائم رکھنے اور دینی علوم کی حفاظت و ترویج کیلئے دینی مدارس نے گذشتہ سو، سوا سو برس میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ بلاشبہ ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اور کسی سرکاری امداد کے بغیر عام لوگوں کے رضاکارانہ تعاون سے انتہائی سادگی، قناعت اور کم سے کم خرچہ کے ساتھ اپنے اہداف میں پیشرفت کر کے دینی مدارس کے اس نیٹ ورک نے جو سب سے بڑا مقصد حاصل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے ارشاد کے مطابق یہ خطہ اسپین بننے سے بچ گیا ہے، اور صدی سے زیادہ عرصہ تک فرنگی اقتدار اور مغرب کی فکری اور ثقافتی یلغار کا شکار رہنے کے باوجود اس خطہ کے مسلمانوں کا اپنے دینی عقائد، روایات، ماضی اور اسلاف کے ساتھ ذہنی رشتہ نہ صرف قائم ہے بلکہ دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہی بات مغرب کی سیکولر لابیوں کیلئے پریشانی کا سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہے جس کا اظہار ان دینی مدارس کے خلاف مغربی ابلاغ کے منفی پراپیگنڈا اور کردار کش مہم سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

ان دینی مدارس نے اسلامی علوم و اقدار کے تحفظ و دفاع کی جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی ہے، اور اس تحفظاتی اور دفاعی جنگ کے دور میں دینی مدارس کے منتظمین نے بہت سے ایسے تحفظات اختیار کر لیے تھے جو عام لوگوں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ مگر اس دفاعی جنگ کو صحیح ترتیب کے ساتھ لڑنے کیلئے ضروری تھے اور ان تحفظات کے بغیر یہ مدارس نہ اپنی صف بندی صحیح رکھ سکتے تھے اور نہ ہی متعیّن اہداف کی طرف ضروری پیشرفت ان کیلئے ممکن تھی۔ انہی تحفظات میں ایک بات دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں ان مدارس کے منتظمین اور اساتذہ کا بے لچک رویہ تھا کہ وہ تمام تر تحریص و تخویف کے باوجود نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کو قبول اور اختیار کرنے

کے روادار نہیں ہوئے اور اصحابِ کہف کی طرح ایک غار میں داخل ہو کر خود کو ارد گرد کے ماحول سے کلی طور پر لاتعلق کر لیا۔

یہ بات بہت سے دانشوروں کے نزدیک قابل اعتراض تھی مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طرز عمل اس ہدف کی طرف بڑھنے کیلئے ناگزیر تھا جو دینی مدارس قائم کرتے وقت اس تحریک کے بانیوں کے ذہنوں میں تھا، کیونکہ اگر یہ دینی مدارس اپنی جداگانہ روش ترک کرکے ''اجتماعی دھارے'' کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جاتے تو ان کی آخری منزل بھی عملاً وہی ہوتی جو اجتماعی دھارے کیلئے اس دھارے کی حدود متعیّن کرنے والوں نے طے کر رکھی تھی۔ اور اگر یہ دینی مدارس اجتماعی دھارے کے ساتھ بہہ جانے کی بجائے اس اجتماعی دھارے کا رخ اپنے اہداف کی طرف موڑنے کی کوشش میں کامیاب دکھائی دے رہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ وہی بے لچک رویہ ہے جو ان دینی مدارس نے اپنے نصاب و نظام کے حوالے سے اختیار کیے رکھا اور تمام تر طعن و تشنیع اور تنقیدات و اعتراضات کے باوجود انہوں نے اپنی مقرر کردہ حدود سے باہر جھانکنے سے بھی گریز کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی باشعور شخص صرفِ نظر نہیں کر سکتا مگر وقت اب بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ہم تحفظ اور دفاع کے دور سے نکل کر پیش قدمی اور اقدام کے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت اور پاکستان میں طالبان کی طرز کے اسلامی نظام کی خواہش کا ہر سطح پر اظہار اس پیش قدمی اور اقدام کے دور کا عملی آغاز ہے، اس لیے ہماری دیانت دارانہ رائے ہے کہ دینی مدارس کو اب ان تحفظات پر زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے جو تحفظ اور دفاع کی جدوجہد کیلئے تو ضروری تھا مگر اب وہ پیش قدمی اور اقدام کی جدوجہد کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ دینی مدارس کے اربابِ حل و عقد کو ''دفاعی جنگ'' اور ''اقدامی پیشرفت'' کے درمیان فرق کا ادراک کرنا چاہیے اور ان ضروریات کا احساس کرنا چاہیے جو اسلام کے نفاذ کے حوالے سے ناگزیر تقاضوں کی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ان دینی اداروں اور مدارس کے علاوہ اور کوئی قابل اعتماد نظام اس وقت موجود نہیں۔

مثلاً انہی ضروریات میں ایک ضرورت اسلامی نظام کو چلانے کیلئے رجال کار کی فراہمی کی ہے کیونکہ ایسے افراد کی تیاری انتہائی ضروری ہے جو دینی علوم پر ماہرانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ آج کے عالمی نظام اور ملک کے اندرونی سسٹم کے اہم پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہوں، اور خرابیوں کی نشاندہی کے علاوہ ان کو دور کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ ایسے افراد اگر دینی مدارس تیار نہیں کریں گے تو انہیں یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ کوئی اور ادارہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہو۔ اس لیے جس طرح دفاع اور تحفظ کے دور میں دینی مدارس نے وقت کے چیلنج کو قبول کرکے خود کو اس مشن کیلئے وقف کر دیا تھا، اس طرح انہیں پیشرفت اور اقدام کے نئے دور کا چیلنج بھی قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ ان کی سستی اور بے پروائی سے اقدام اور پیشرفت کی یہ جدوجہد کامیابی کے مطلوبہ اہداف حاصل نہ کر سکی تو اس کی ذمہ داری عند اللہ اور عند الناس انہی مدارس پر ہوگی اور ان کا کوئی عذر اس بارے میں نہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسموع ہوگا اور نہ ہی تاریخ اپنے صفحات میں اسے جگہ دینے کو تیار ہوگی۔ چنانچہ دینی مدارس کے جو مختلف وفاق مختلف مذہبی مکاتب فکر کے حوالے سے کام کر رہے ہیں، ان سب کے اربابِ بست و کشاد سے ہماری استدعا

ہے کہ وہ اپنے اپنے طور پر اور مشترکہ طور پر بھی نفاذ اسلام کی عملی ضروریات کا جائزہ لیں اور انہیں اپنے نصاب و نظام میں ایڈجسٹ کرنے کی راہ نکالیں تاکہ وہ وقت کے اس چیلنج کا صحیح طور پر سامنا کر سکیں جو اسلامی نظام کے نفاذ و تطبیق کے ضمن میں اس وقت دینی حلقوں کو درپیش ہے۔

اس اصولی گزارش کے ساتھ ایک عملی تجویز بھی ہم ان وفاقوں اور بڑے دینی مدارس کے منتظمین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ سردست درس نظامی کے فضلاء کیلئے بڑے مدارس میں ایک خصوصی کورس کا اہتمام کیا جائے جس کا سرسری خاکہ ہمارے ذہن میں یوں ہے:

- ان فضلاء کو دنیا کے بڑے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرایا جائے۔
- تاریخ عالم اور تاریخ اسلام ترتیب کے ساتھ پڑھائی جائے۔
- مختلف شعبہ ہائے زندگی کے حوالے سے اسلام کا بطور نظام مطالعہ کرایا جائے۔
- اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں رائج نظاموں سے متعارف کرایا جائے۔
- مغرب کے سیکولر فلسفہ اور نظام سے کماحقہ روشناس کرایا جائے۔
- عربی اور انگریزی زبان پڑھائی جائے اور کم از کم اردو میں صحافتی اسلوب کے ساتھ مضمون نویسی کی مشق کرائی جائے۔
- مطالعہ اور تحقیق کا ذوق بیدار کیا جائے اور مختلف موضوعات پر اچھی گفتگو اور اچھی تحریر کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔
- اس دوران میں جو فضلاء میٹرک پاس نہیں ہیں، انہیں میٹرک کی تیاری کرادی جائے اور جو میٹرک کر چکے ہیں، انہیں ایف اے کی تیاری کرائی جائے۔

یہ کورس دو سال کا ہو تو زیادہ بہتر طریقہ کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے اور اگر ضروری ہو تو اسے کھینچ تان کر ایک سال کے دورانیہ میں بھی ایڈجسٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس کورس کے اختتام پر امتحان پاس کرنے والے فضلاء کو "شہادۃ التکمیل" کی باقاعدہ سند دی جائے اور اس کیلئے فضلاء کو باقاعدہ مہم کی صورت میں تیار کیا جائے۔ امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد اس تجویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور آنے والے دور کی ناگزیر ضروریات کا ادراک کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کیلئے عملی پیشرفت سے گریز نہیں کریں گے۔

نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ جنوری ۱۹۹۹ء

گورنر سرحد نے گذشتہ ہفتہ مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان میں "شرعی نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء" کے نفاذ کا اعلان

کیا ہے اور مختلف اخبارات میں اس سلسلہ میں شائع ہونے والی تفصیلات کے مطابق اس آرڈیننس کی رو سے ضلع سوات، ضلع دیر، ضلع چترال، ضلع کوہستان اور مالاکنڈ کے وفاق کے زیر اہتمام علاقے پر مشتمل خطے میں عدالتوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامیہ کے مطابق کریں گے جبکہ غیر مسلموں کے خاندانی مقدمات کے فیصلے ان کے مذہبی احکام کے مطابق ہوں گے۔ اس مقصد کیلئے قاضیوں کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے جن کی کوالیفیکیشن یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی تسلیم شدہ اسلامی یونیورسٹی سے شریعت میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر چکے ہوں یا ایم اے اسلامیات کے ساتھ انہوں نے شریعت کورس بھی کر لیا ہو۔ ان قاضی صاحبان کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ مقدمہ کی سماعت کے دوران کسی مستند عالم دین کو اپنے ساتھ مشاورت میں شریک کریں گے۔ جبکہ علمائے کرام کو مقدمات میں بطور وکیل پیش ہونے کی اجازت ہوگی۔ اس کے علاوہ اس سارے عمل کی نگرانی کیلئے پشاور ہائی کورٹ اور وفاقی شریعت کورٹ میں مالاکنڈ بینچ قائم کیے جائیں گے۔

آرڈیننس کا مکمل اردو متن کسی اخبار میں ہماری نظر سے نہیں گزرا البتہ مختلف قومی اخبارات نے مذکورہ بالا نکات کو بطور خاص شائع کیا ہے اور وزیر اعلیٰ سرحد جناب مہتاب عباسی نے اس کے ساتھ ہی قوم کو یہ خوش خبری دی ہے کہ حکومت نے ملک میں نفاذ شریعت کا آغاز کر دیا ہے اور بہت جلد پورے ملک تک یہ سلسلہ وسیع کر دیا جائے گا۔

نفاذِ شریعت کی جدوجہد کے ایک کارکن کے طور پر اس پیشرفت کا خیر مقدم کرنے اور اس پر حکمرانوں کو مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ماضی کے تجربات اور مستقبل کے خدشات نے ذہن میں تحفظات کا کچھ ایسا تانابانا بن رکھا ہے کہ خیر مقدم اور مبارکباد کے الفاظ زبان اور قلم کی نوک پر بار بار آکر رک جاتے ہیں اور انہیں اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ ماضی کے تجربات کا دامن بڑا وسیع ہے اور اس میں ملک گیر سطح پر نافذ ہونے والے نصف درجن کے لگ بھگ آرڈیننسوں کے علاوہ مالاکنڈ کے اسی خطے میں چند سال قبل نافذ ہونے والا شریعت آرڈیننس بھی موجود ہے۔ یہ سب آرڈیننس وقتاً فوقتاً نافذ ہوئے، ان پر شادیانے بجائے گئے، قوم کو اصلاحِ احوال کی خوشخبریاں دی گئیں اور خدمتِ اسلام کے بڑے بڑے تمغے حکمرانوں نے اپنے اپنے سینوں پر سجائے مگر نتیجہ وہی "ڈھاک کے تین پات" کے سوا کچھ نہیں برآمد ہوا اور ان میں سے کوئی آرڈیننس بھی قوم کو نہ امن فراہم کر سکا اور نہ ہی اس کی دیگر مشکلات میں کوئی کمی لا سکا۔

مستقبل کے خدشات بھی ماضی کے انہی تجربات کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں اور ان کو سامنے لائے بغیر گورنر سرحد کے اس اقدام کے بارے میں شرح صدر کے ساتھ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افغانستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے نتائج و ثمرات کو دیکھتے ہوئے ہماری اسٹیبلشمنٹ نے پیش بندی کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ حکمت عملی اختیار کی ہے کہ نوآبادیاتی سسٹم کو بچانے کیلئے سعودی عرب کی طرز پر صرف عدالتی نظام کو نفاذ شریعت کی تجربہ گاہ بنا دیا جائے اور وہ بھی سارے ملک میں یکبارگی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔ سعودی عرب میں یہی ہے کہ عدالتی نظام اسلامی ہے مگر اس کے علاوہ معیشت، سیاست اور ایڈ منسٹریشن کے قومی شعبے اسلامی تعلیمات کی پابندی سے آزاد اور فرد واحد یا زیادہ سے زیادہ ایک خاندان کے تابع فرمان ہیں۔ البتہ عدالتی شعبے میں شرعی قوانین کے نفاذ کا فائدہ یہ ہے کہ جرائم پر کافی حد تک کنٹرول ہے اور سعودی عرب میں جرائم کی شرح دوسرے کئی ممالک سے بہت کم

ہے، لگتا ہے کہ ہمارے حکمران اسی تجربہ کو دہرانا چاہتے ہیں جس میں انہیں تین واضح فائدے دکھائی دے رہے ہیں:

- امن و امان کی صورتحال بہتر ہوگی اور جرائم پر کسی حد تک کنٹرول ہو جائے گا۔
- علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد اس عمل میں کھپ جائے گی اور قومی زندگی کے دیگر شعبوں میں شرعی قوانین پر عملدرآمد کے مطالبات جدوجہد ڈھیلی پڑ جائے گی۔
- عدالتی شعبے کے سوا باقی تمام امور میں فرنگی دور کا چھوڑا ہوا نوآبادیاتی نظام محفوظ رہے گا اور اس سے مفادات حاصل کرنے والے طبقات کی موجودہ پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس کا ایک بڑا فائدہ عالمی قوتوں کو بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں ان کے مفادات پر کوئی زد نہیں پڑے گی اور کاروبار زندگی یوں ہی چلتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہی افغانستان میں طالبان کا اسلامی انقلاب بھی اپنے ملک کی حدود سے تجاوز نہیں کر سکے گا جس کا دائرہ وسیع ہونے کا خوف بڑی طاقتوں اور ہمارے ملک کے مراعات یافتہ طبقوں کو مسلسل اضطراب سے دوچار کیے ہوئے ہے۔

یہ سب فوائد ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہوں مگر ہماری اسٹیبلشمنٹ کے شہ دماغ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ عدالتی شعبے میں شرعی قوانین کی دھیرے دھیرے اور "کنٹرولڈ" پیشرفت کے ساتھ وہ نتیجہ حاصل کر لیں گے جسے محاورے کی زبان میں "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے" کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا عملاً ایسا ہو گا؟ اور کیا ان اقدامات کے ذریعے ملک میں امن و امان کے قیام اور جرائم پر کنٹرول کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا اور پاکستان کے حالات کو سعودی عرب پر قیاس کرنا دانشمندی کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ سعودی عرب میں جس وقت یہ نظام طے ہو رہا تھا اسی وقت یہ طے پا گیا تھا قومی زندگی کے مذہبی، عدالتی اور تعلیمی شعبوں پر آل شیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا خاندان) کا کنٹرول ہو گا اور باقی سب امور آل سعود (سعودی شاہی خاندان) کے سپرد ہوں گے اور وہ بادشاہت کے عنوان سے ملک کا نظام چلائیں گے، اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب کی شکست و ریخت کا دور تھا، خلافت عثمانیہ بکھر گئی تھی اور مغربی طاقتیں خلیج عرب میں مکمل طور پر براجمان ہو گئی تھیں۔ اس لیے دینی حلقوں نے سب کچھ جاتا دیکھ کر کچھ نہ کچھ باقی رہنے پر قناعت کر لی مگر اب صورت حال بدل چکی ہے۔ خلیج پر امریکہ کے مکمل تسلط کے باوجود خود سعودی عرب کے اندر اس نظام کے خلاف دینی حلقے بغاوت کر چکے ہیں، علماء قربانیاں دے رہے ہیں، متعدّد اکابر علماء جیلوں میں ہیں اور بہت سے دانشور جلاوطن ہیں جبکہ سعودی عرب میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے اسامہ بن لادن کی صورت میں ایک جاندار اور توانا آواز عالمی فورم پر موجود ہے، اس لیے آج کے دور میں پاکستان کو سعودی عرب کے پون صدی پہلے کے ماحول پر قیاس کرنا اور خود سعودی عرب میں امریکہ کی عسکری قوت کی بنیاد پر مصنوعی تنفس کے سہارے زندگی کے دن گزارنے والے نظام کا پاکستان میں تجربہ کرنے کی خواہش کرنا کم از کم الفاظ میں حماقت ہی کہلائے گا۔

اس گزارش کے بعد ہم دو عملی الجھنوں کی طرف بھی اس آرڈیننس کے حوالے سے توجہ دلانا چاہیں گے۔ ایک تو وہی کہ قومی زندگی کے باقی شعبوں مثلاً معیشت، قانون سازی، ایڈمنسٹریشن اور دیگر معاملات میں مروجہ نوآبادیاتی نظام باقی

رہے گا تو صرف عدالتی شعبے کے اسلامی نظام کی اس کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کیسے ہوگی؟ یہ تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی شوقین مزاج ڈرائیور کو ہنڈا کار کا گیئر بکس اچھا لگا ہے اور وہ اسے فورڈ ٹرک میں فٹ کر کے اسٹیئرنگ سنبھالنے کیلئے بے تاب ہو رہا ہے کہ دیکھوں اب گاڑی کتنی اچھی چلتی ہے۔ یا کسی من چلے نواب کو مس ورلڈ کی ناک بھا گئی ہے اور وہ مچل رہا ہے کہ کسی طرح اسے ناک کا معاوضہ دے کر پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کی ناک اپنے چہرے پر فٹ کرا لے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ ہنڈا کار کا گیئر بکس بہت اچھا ہے مگر اس کے صحیح کام کرنے کیلئے باقی مشنری بھی اسی کار کی ضروری ہے ورنہ اس کی اچھائی کسی کام کی نہیں رہے گی اور اسی طرح مس ورلڈ کی ناک بہت خوبصورت ہے مگر اس کی تمام تر خوبصورتی اسی چہرے کے ساتھ ہے اور اسے کسی اور چہرے پر فٹ کرنے سے اس کا سارا حسن خاک میں مل کر رہ جائے گا۔ اس لیے اسلام کا عدالتی نظام فی الواقع بہت اچھا ہے اور بلاشبہ امن کا ضامن ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ قومی زندگی کے دیگر سب شعبے بھی اسلامی احکام کی پابندی میں اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں ورنہ صرف عدالتوں کا شرعی نظام قوم کو وہ نتائج نہیں دے سکے گا جس کی خوشخبریاں ہمارے حکمران قوم کو مسلسل سنا رہے ہیں۔

دوسری عملی الجھن یہ ہے کہ مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان میں الگ طور سے نافذ کیا جانے والا یہ عدالتی نظام جیسا کہ نظر آ رہا ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے موجودہ نظام کے تابع ہے اور اس سلسلہ میں فائنل اتھارٹی مروجہ نظام کو ہی حاصل ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر الگ نظام کا فائدہ کیا ہے؟ یہ ناکام تجربہ تو ہم پہلے ہی ملک گیر سطح پر کر چکے ہیں کیونکہ وفاقی شرعی عدالت کے متعدّد فیصلے سپریم کورٹ کے فریزر میں منجمد پڑے ہیں اور سپریم کورٹ قرارداد مقاصد کے حوالے سے اپنے فیصلے میں قطعی طور پر یہ قرار دے چکی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے اگر مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان کی شرعی عدالتوں کے فیصلوں نے بھی اسی ''ریڈ لائن'' پر جا کر پھڑ پھڑا کر رہ جانا ہے تو پھر اس سارے کھیل کا مقصد کیا ہے؟

الغرض شریعت اسلامیہ کا نفاذ کئی حوالوں سے ہماری سب سے اہم قومی ضرورت بن چکا ہے۔ اس لیے بھی کہ ہم مسلمان ہیں اور قرآن و سنت کے احکام کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے عقیدہ کے لحاظ سے پابند ہیں، اس لیے بھی کہ پاکستان کا مقصدِ قیام ہی اسلامی معاشرے کا قیام ہے جو مکمل اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے بھی کہ امن کے قیام اور قومی وحدت کے بچاؤ کیلئے اسلامی اصولوں اور قوانین کے سوا ہمارے پاس کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا، اور اس لیے بھی کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے عملی نفاذ اور اس کے نتیجہ میں امن کے قیام کا واضح نقشہ سامنے آنے کے بعد اب اسے مزید ٹالنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی۔ مگر اسلام

- جزوی نہیں بلکہ مکمل،
- دکھاوے کا نہیں بلکہ عملی،
- اور موجودہ نوآبادیاتی سسٹم کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی شکل میں نہیں بلکہ اس کے مکمل خاتمے کے بعد اس کی جگہ لینے کی صورت میں

آئے گا تو بات بنے گی۔ ورنہ نفاذِ شریعت آرڈیننسوں کی کہانیاں تو ہم ایک عرصہ سے سنتے آ رہے ہیں، ایک کہانی اور سہی!

مسیحی کمیونٹی: طالبان کے نقشِ قدم پر

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۱۹۹۹ء

روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۹۹ء کے مطابق صوبہ سرحد میں مسیحی کمیونٹی کے کچھ افراد نے "مسیحی طالبان تنظیم" قائم کر لی ہے اور بھارت میں مسیحی اقلیت پر انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے ہونے والے مظالم کے خلاف پشاور میں احتجاجی مظاہرہ کیا ہے۔ خبر کے مطابق اس تنظیم کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان کی طالبان اسلامی تحریک کی کامیابی سے متاثر ہو کر اپنی تنظیم کو طالبان سے منسوب کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن بحال کر کے لوگوں کو مذہب کی طرف راغب کیا ہے اور سماجی برائیوں سے جنگ کی ہے اسی طرح ان کی بھی خواہش ہے کہ پاکستان کے عیسائی اپنے مذہب کی طرف لوٹ آئیں اور سماجی برائیوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔

یہ طالبان کی اسلامی حکومت کا کرشمہ اور ان کے خلوص کا ثمرہ ہے کہ ان کی کامیابیوں کو غیر مسلم بھی تسلیم کر رہے ہیں اور مذہب کی طرف واپسی کیلئے ان کی پیروی کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر طالبان اپنے خلوص اور خالص اسلامی اقدار کے ساتھ بے لچک وابستگی اور وفاداری پر اسی استقامت کے ساتھ قائم رہے تو وہ دنیا بھر میں آسمانی تعلیمات کی طرف نسلِ انسانی کی واپسی کیلئے ہراول دستہ ثابت ہوں گے اور ان کی برکت سے انسانی معاشرہ ایک خوشگوار انقلاب کے دور میں داخل ہو گا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو! معاملات کو گڈمڈ نہ کریں

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- ۱۶ فروری ۱۹۹۹ء

قائد حزب اختلاف محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک حالیہ مضمون میں موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذ شریعت آرڈیننس اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملات پر بھی بحث کی ہے۔ محترمہ کا موقف ہے کہ پاکستان کو سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینا چاہئیں بلکہ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق خود حکومت پاکستان نے بھی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے اور اس کیلئے حالات کو سازگار بنانے پر کام کیا جا رہا ہے۔ مگر دینی اور قومی نقطۂ نظر سے یہ موقف درست نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اس معاملہ میں حکومت اور اپوزیشن دونوں اسلام اور پاکستان کے مفادات کی نگہبانی کرنے کی بجائے عالمی استعمار کے ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں کیونکہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کا اصولی مطلب ایٹمی پروگرام پر عالمی اداروں کی نگرانی اور کنٹرول کو قبول کرنا ہے۔ وہ

عالمی ادارے جو اقوامِ متحدہ کے ٹائٹل کے ساتھ صرف اور صرف امریکی مفادات کے محافظ بنے ہوئے ہیں اور انہیں دنیا پر امریکہ کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور اس کے نیو ورلڈ آرڈر کی عملداری کے سوا اور کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے، اس لیے کوئی باشعور مسلمان اور محب وطن پاکستانی اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے (افغان) طالبان کے اسلامی اقدامات کو ہدف تنقید بناتے ہوئے مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذ شریعت کے حالیہ اقدامات پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ:

”پاکستان ایک مسلم ریاست ہے جو اعتدال پسند ملکوں کے جھرمٹ میں ہے، یہ جھرمٹ بحر اوقیانوس میں انڈونیشیا سے شروع ہو کر ملیشیا، بنگلہ دیش، ترکی، اردن اور مصر سے ہوتا ہوا بحر الکاہل کے ساحلوں پر مراکش میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ مالاکنڈ میں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگل کی آگ کی طرح درہ خنجراب سے ہوتی ہوئی چین کے صوبہ سنکیانگ تک پھیل سکتی ہے۔ طالبان برانڈ طرز زندگی کا رائے ونڈ کے جنوب میں کوئی وجود نہیں۔ یہ تنگ نظری اور متعصبانہ نظام اس دھرتی کیلئے قابل قبول نہیں ہے جہاں اسلام کا پیغام صوفیوں اور اولیاء کے ذریعے پھیلا ہے جن کے محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیتے ہوئے نغمے حضرت فرید گنج شکرؒ کے مزار، ملتان کی خانقاہوں، اوچ شریف، شاہ عبد اللطیفؒ بھٹائی، سچل سرمستؒ اور لال شہباز قلندرؒ کے مزاروں پر گائے اور سنے جاتے ہیں۔ پاکستان ایک کثیر الاقساط معاشرہ ہے جو ایران اور افغانستان کی صورتحال سے مختلف ہے جہاں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ایک خاص متعصبانہ نظام قائم کرنے کی کوشش سے جنوبی پاکستان شمالی پاکستان سے جدا ہو جائے گا۔“ (بحوالہ روزنامہ اوصاف اسلام آباد۔ ۷ فروری ۱۹۹۹ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو اچھی طرح جانتی ہیں کہ مالاکنڈ میں شرعی قوانین کے نفاذ کا جو ڈھانچہ دیا گیا ہے وہ مروجہ نوآبادیاتی سسٹم کے نیٹ ورک کے اندر ہے اس لیے اس سے ملک میں طالبان طرز کے اسلامی انقلاب یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اور انہوں نے اس چنگاری کو جس طرح شعلہ جوالہ بنا کر پیش کیا ہے اس کی روشنی میں ملک کے حکمران طبقات کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کی آئندہ عزائم کی جھلک اور جنوبی پاکستان میں سرائیکی، سندھی، مہاجر اور بلوچی قومیتوں کے نام پر اٹھائے جانے والے طوفان کے اصل رخ کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو جس فکر و دانش کی نمائندگی کر رہی ہیں اس کے نزدیک سوسائٹی میں اسلامی احکام و قوانین کی پابندی کا اہتمام اور اس میں ریاستی اداروں کا کردار تعصب کہلاتا ہے اور قرآن و سنت کے قواعد و ضوابط سے آزاد معاشرہ اور اسلام کی بجائے مغربی فلسفہ و نظام کی نمائندگی کرنے والے ریاستی ادارے ”اعتدال پسند“ کے میڈل کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ منطق نئی نہیں بلکہ گذشتہ تین سو برس سے مغرب ہمیں یہی سبق پڑھانے میں مصروف ہے اس لیے ہمیں ان کی طرف سے مغرب کی ترجمانی پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ البتہ اس ترجمانی اور نمائندگی میں صوفیائے کرامؒ اور اولیائے عظامؒ کو

بلاوجہ گھسیٹنا اور انہیں ''فری سوسائٹی'' کے علمبردار کے طور پر پیش کرنا سراسر زیادتی ہے۔ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، شاہ عبد اللطیفؒ بھٹائی، لال شہباز قلندر اور دیگر صوفیائے کرام ہماری تاریخ کا قابل فخر سرمایہ ہیں مگر ان کا میدان غیر مسلم معاشرہ کو اسلام سے متعارف کرانے، غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے اور فرد کی بحیثیت فرد اصلاح کا میدان تھا۔ اس کے تقاضے وہی تھے جو انہوں نے کمال حکمت و تدبیر سے پورے کیے اور اس میدان میں آج بھی ان کی تعلیمات اور اسوہ ہم سب کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ مگر ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل، اسلامی ریاست کا قیام اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کا میدان اس سے مختلف ہے، اس کے تقاضے اس سے بالکل الگ ہیں اور اس کے قائدین بھی قطعی طور پر مختلف بزرگ ہیں۔ یہ میدان حضرت عمر بن الخطابؓ، عمر بن عبد العزیزؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ کا میدان ہے اور اس میں انہی کی راہنمائی کام آئے گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو سے گزارش ہے کہ وہ معاملات کو گڈمڈ نہ کریں اور فوج کے کمانڈر کو عدالت کا جج اور پولیس کے افسر کو ڈپلومیٹ اور سفارتکار بنانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ فطرت اور انصاف کے تقاضوں سے انحراف اور اسلام کے اجتماعی کردار سے بغاوت ہے۔

نظام حکومت کی اصلاح کیلئے سعودی علماء کی تجاویز

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ فروری ۱۹۹۹ء

اب سے دو سال قبل افغانستان میں جلال آباد کے قریب ایک خفیہ مرکز میں الشیخ اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ ایک رات رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کے عزم و حوصلہ، جوش و جذبہ، حکمت و تدبر اور خلوص وللہیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ شخص عالم اسلام کی بیداری میں اہم کردار ادا کرے گا۔ مگر یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اور اس سطح پر اسے پذیرائی ملے گی کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی ظاہری قوت امریکہ کے طاقتور حکمران صدر کلنٹن کیلئے ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کر جائے گا۔ آج اسامہ بن لادن کی روپوشی امریکہ اور اس کے حواریوں کیلئے مستقل مسئلہ بن گئی ہے اور چھپا ہوا اسامہ نفسیاتی طور پر سامنے چلتا پھرتا نظر آنے والے اسامہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اس لیے آج پھر وہ عالمی ذرائع ابلاغ کا موضوع ہے اور اس کے حوالے سے وسیع تناظر میں میڈیا ماہرین اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔

پاکستان کے صحافیوں میں سے شیخ اسامہ بن لادن کے ساتھ سب سے پہلا انٹرویو جناب حامد میر نے روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جبکہ اسامہ کے موقف اور جدوجہد کے بارے میں ابتدائی ایک دو کالم راقم الحروف نے لکھے تھے۔ اس وقت ہمیں یہ کہا جاتا تھا کہ آپ لوگوں نے بہت مشکل گھاٹی میں قدم رکھ دیا ہے مگر ہمیں یقین تھا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے اسلام کے لیے، ملتِ اسلامیہ کے لیے، اور سچائی کیلئے کیا ہے اس لیے ہماری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ چنانچہ آج جب کہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر اسامہ بن لادن اخبارات و جرائد کا سب سے اہم موضوع ہے اور اس کے موقف اور جدوجہد کے مختلف گوشے منظر عام پر آ رہے ہیں، ہم اپنی چھوٹی سی کاوش کے بارآور

ہونے پر خوشی اور اطمینان کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہیں۔

روزنامہ اوصاف سے پہلے روزنامہ پاکستان اسلام آباد میں میرے مضامین جن دوستوں کی نظر سے گزرتے رہے ہیں انہیں ''سعودی حکمران خاندان اور اہلِ دین کی کشمکش'' کے عنوان سے مضمون ضرور یاد ہوگا جو ۲۸ اپریل ۱۹۹۷ء کو روزنامہ پاکستان کے لاہور ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اسامہ بن لادن کے ساتھ جناب حامد میر کے تفصیلی انٹرویو کے حوالے سے سعودی عرب کے دینی حلقوں کی جدوجہد کے بارے میں کچھ معروضات پیش کی گئی تھیں اور یہ عرض کیا تھا کہ اس جدوجہد میں اسامہ بن لادن تنہا ایک شخص نہیں ہیں بلکہ وہ سعودی عرب کے دینی حلقوں اور دانشوروں کے ایک بہت بڑے طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں جو سالہا سال سے سعودی عرب کے داخلی نظام کی اصلاح اور بیرونی مداخلت کے خاتمہ کیلئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس مضمون میں مذکرۃ النصیحہ کے عنوان سے ایک یادداشت کا تذکرہ بھی تھا جو سعودی عرب کے علماء کرام کی طرف سے شاہ فہد کو پیش کی گئی تھی۔ اس یادداشت کی پاداش میں سینکڑوں علماء کرام اور دانشور گرفتار کر لیے گئے تھے جن میں سے ڈاکٹر محمد مسعری اور ڈاکٹر سعد فقیہ جیسے اصحاب جلاوطن ہو کر لندن میں بیٹھے ہیں جبکہ الشیخ سفر الحوالی اور الشیخ سلیمان عودہ جیسے اکابر علماء ۱۹۹۲ء سے اب تک مسلسل جیل میں ہیں۔

آج کی صحبت میں اس یادداشت کا تھوڑا سا خلاصہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے تاکہ اس جدوجہد کا ایک خاکہ قارئین کے سامنے آجائے جس کیلئے سعودی عرب کے علماء اور دانشور صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اور جس کیلئے الشیخ اسامہ بن لادن ایک عظیم مجاہد اسلام کے طور پر عالمی فورم پر اپنے ملک کے دینی حلقوں اور دانشوروں کی جرأت و عزیمت کے ساتھ ترجمانی کر رہے ہیں۔

مذکرۃ النصیحہ کے عنوان سے یہ یادداشت عربی زبان میں ہے جو ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس پر ۱۰۹ حضرات کے دستخط ہیں جن میں اکثریت ممتاز علماء کرام، وکلاء، اساتذہ اور دانشوروں کی ہے۔ یہ یادداشت جولائی ۱۹۹۲ء میں شاہ فہد کو پیش کی گئی۔ یادداشت کے آخر میں دستخط کرنے والوں کے نام اور ان کے دستخطوں کے عکس موجود ہیں اور ان کے علاوہ سعودی عرب کے چار اکابر علماء کرام (۱) الشیخ عبد اللہ الجلالی (۲) الشیخ سلیمان عودہ (۳) الشیخ سفر الحوالی اور (۴) الشیخ عبد اللہ الجبرینؒ کے تصدیقی خطوط کے فوٹو بھی اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ جبکہ اکابر علماء کی سرکاری کمیٹی نے الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن الباز کی سربراہی میں اس یادداشت پر جو تنقید کی ہے اور حکومت پر نکتہ چینی کے اس طریقے سے جو اختلاف کیا ہے وہ بھی کتابچہ میں شامل ہے۔

اس یادداشت میں ملک کی داخلی، خارجی، دفاعی، معاشی، انتظامی اور قانونی پالیسیوں پر الگ الگ بحث کرتے ہوئے ان میں خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور شرعی نقطۂ نظر سے اصلاحی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ان سب تجاویز کا احاطہ تو اس مختصر کالم میں ممکن نہیں ہے، البتہ ان میں سے چند تجاویز کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الشیخ اسامہ بن لادن اور سعودی عرب کے دیگر علماء اور دانشوروں کا اصل موقف اور مشن کیا ہے جس کیلئے وہ محاذ آرائی، جلاوطنی اور قید و بند کے مراحل سے دوچار ہیں۔

- عدالتی نظام کے حوالے سے یادداشت میں ''شرعی عدالت عالیہ'' کے خاتمہ پر نکتہ چینی کی گئی ہے جو سعودی عرب کے موجودہ مفتی اعظم الشیخ عبدالعزیز بن باز کے پیش رو الشیخ محمد بن ابراہیمؒ تک قائم تھی۔ وہ ملک کے چیف جسٹس تھے، حکومت کے غیر شرعی فیصلوں پر کڑی گرفت کرتے تھے، اور انہوں نے مالی معاملات، سروس رولز، تجارتی قوانین اور دیگر شعبوں کو شرعی عدالت سے مستثنیٰ قرار دینے کے حکومتی اقدام پر سخت تنقید کی تھی۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد یہ پوسٹ ہی ختم کر دی گئی اور ان کے جانشین شیخ بن باز کو قاضی القضاۃ کی بجائے مفتی اعظم کی حیثیت دے دی گئی۔ یادداشت میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس صورتحال کو ختم کرتے ہوئے ''محکمہ شرعیہ کبریٰ'' یعنی شرعی عدالت عظمیٰ بحال کی جائے اور قومی زندگی کے تمام شعبوں کو شرعی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں شامل کیا جائے۔
- انسانی حقوق کے حوالے سے یادداشت میں تجویز کیا گیا ہے کہ لوگوں کا رائے دینے کا حق بحال کیا جائے اور اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اخبارات اور تقاریر و بیانات پر سنسر ختم کیا جائے۔ آزاد اداروں اور تنظیموں کے قیام میں رکاوٹ ختم کی جائے۔ علماء کرام اور مبلغین پر اجتماعات اور خطبات کیلئے سرکاری اجازت کی شرط ختم کی جائے۔ ریاست کو مملکت کے تمام شہریوں کے بنیادی حقوق مثلاً خوراک، رہائش، تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ گھروں کی تلاشی اور بلاوجہ گرفتاریوں کا سلسلہ بند کیا جائے۔ کسی شخص کو عدالتی فیصلے کے بغیر ایک دن سے زائد حراست میں نہ رکھا جائے۔ اور عدالتی فیصلے کے بغیر نہ کسی کے گھر کی تلاشی لی جائے اور نہ کسی کو سفر سے روکا جائے۔
- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ سرکاری منصب کی تقسیم میں اہلیت کو بنیاد بنایا جائے اور علاقائی اجارہ داری کا تاثر ختم کیا جائے کیونکہ علاقائی عصبیت جاہلی عصبیت ہے۔
- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ بیرونی قرضوں اور امداد کے حصول کا سلسلہ ترک کر کے ملکی وسائل کے اندر رہتے ہوئے تمام مالیاتی امور طے کیے جائیں۔ قناعت اور کفایت شعاری اختیار کی جائے۔ سرکاری خزانے سے بڑی عمارتوں کی تعمیر روک دی جائے۔ مالدار خاندانوں کو سرکاری خزانے سے عطیات نہ دیے جائیں، ان کی بجائے معذوروں اور ضرورت مندوں کے وظائف مقرر کیے جائیں۔ شادی کے قابل نوجوانوں کو شادی کیلئے امداد دی جائے اور بچوں کے وظیفے مقرر کیے جائیں۔
- یادداشت میں دفاع کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ملک کے دفاع کیلئے دوسرے ملکوں پر انحصار ختم کیا جائے اور اس سلسلہ کے تمام معاہدے منسوخ کیے جائیں۔ مملکت کی خود مختاری اور سیاسی وقار کو بحال رکھا جائے۔ اسلحہ کی فیکٹریاں قائم کی جائیں اور کم از کم پانچ لاکھ افراد پر مشتمل باقاعدہ قومی فوج قائم کر کے اس کے علاوہ ملک کے ہر نوجوان کو فوجی تربیت دینے کے بعد ریزرو فورس بھی بنائی جائے۔

- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ تیل کی پیداوار کو محدود اور اس کے نرخوں کو ایک سطح پر رکھنے کی عالمی پالیسی مسترد کر کے خود مختار پالیسی اختیار کی جائے اور بین الاقوامی مارکیٹ کے نرخ کے مطابق تیل فروخت کیا جائے۔
- یادداشت میں خارجہ پالیسی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کو اپنا اصل ہدف قرار دیا جائے۔ عالمی اداروں میں اسلام اور مسلمانوں کی بھرپور وکالت کی جائے۔ اور عالمی طاقتوں بالخصوص مغربی اداروں کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہ کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو یا اس سے سعودی عرب کی خود مختاری اور سیاسی وقار پر حرف آتا ہو۔

یہ صرف چند تجاویز کا خلاصہ ہے جو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ مذکرۃ النصیحہ میں سعودی عرب کی قومی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اصلاح احوال کی جامع تجاویز پیش کی گئی ہیں جو یادداشت پیش کرنے والے علماء کرام اور دانشوروں کی اسلام دوستی اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ان کی جرأت و حوصلہ، بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کی بھی غمازی کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس مشن میں جلد از جلد کامیابی عطا فرمائیں تاکہ سعودی عرب ایک خود مختار اور باوقار اسلامی ملک کی حیثیت سے عالم اسلام کی صحیح قیادت کر سکے، آمین یا رب العالمین۔

مسیحی طالبان اور مسلح جدوجہد کی تربیت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۹ء

ہم نے ''نصرۃ العلوم'' کے گزشتہ شمارے میں صوبہ سرحد میں ''مسیحی طالبان تنظیم'' کے نام سے عیسائی نوجوانوں کی ایک تنظیم کے قیام کا ذکر کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ یہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی تحریک کے اثرات ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اپنی کمیونٹی کو مذہب کی طرف راغب کرنے کیلئے طالبان کے طریق کار کو اپنا رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کچھ مزید تفصیلات سامنے آئی ہیں جس سے تصویر کا دوسرا رخ بھی کچھ کچھ نظر آنے لگا ہے۔

چنانچہ روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۳ فروری ۱۹۹۹ء کے ادارتی شذرہ میں برطانوی اخبار ''انڈی پینڈنٹ'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاکستانی عیسائی نوجوانوں نے مسلمانوں کی عسکری تحریکوں کے کیمپوں میں فوجی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق ۳۵ عیسائی نوجوانوں نے اسلامی نام اختیار کر کے مجاہدین کی دو مختلف تنظیموں کے کیمپوں میں مسلح جدوجہد کی ٹریننگ حاصل کی ہے جس پر خود کیتھولک چرچ نے بھی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

''انڈی پینڈنٹ'' کی یہ رپورٹ ملک کے سرکاری اداروں اور دینی حلقوں کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے کیونکہ عالمی ادارے جس طرح پاکستان کی مسیحی کمیونٹی کو ایک عرصہ سے پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی تشخص کے خلاف منظم اور متحرک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے پیشِ نظر اس خدشہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں طے شدہ منصوبے کے تحت عیسائی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو مسلح جدوجہد کی ٹریننگ دلوا کر پاکستان کے دینی حلقوں اور محب وطن عناصر کے

خلاف دہشت گردی کا ایک اور محاذ تو نہیں کھولا جا رہا؟

اس لیے ہم ملک کی دینی قیادت، مجاہدین کی تنظیموں اور سرکاری اداروں سے گزارش کریں گے کہ وہ ''انڈی پینڈنٹ'' کی اس رپورٹ کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور اس خدشہ کی روک تھام کیلئے بروقت اقدامات کریں۔

چیچنیا میں اسلامی قوانین کا نفاذ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۹ء

حال ہی میں مسلح روسی جارحیت کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کرنے والی چھوٹی سی مسلم ریاست چیچنیا میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی پریس کے مطابق چیچن صدر ارسلان مسحادوف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ قرآن و سنت کی بنیاد پر شرعی قوانین نافذ کر دیے گئے ہیں جو معاشرے کے تمام شعبوں پر لاگو ہوں گے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ بھی تیار کر لیا گیا ہے جسے قومی کانگریس سے منظوری کے بعد نافذ کر دیا جائے گا۔

یہ خبر ہمارے لیے خوشی اور مسرت کا باعث ہے کہ ایک مسلم ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز ہوا ہے اور شرعی نظام کی برکات سے ایک مسلم قوم بہرہ ور ہو رہی ہے۔ جس پر صدر ارسلان مسحادوف اور چیچن قوم کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عزم میں کامیابی سے ہمکنار فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

مگر اس کے ساتھ ہی اس خبر میں ہمارے لیے حسرت کا پہلو بھی ہے کہ ہمیں فرنگی استعمار سے آزادی حاصل کیے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک ہم قرآن و سنت کو اپنے ملک کا سپریم لاء تسلیم کرنے کا مرحلہ بھی نہیں طے کر پائے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

طالبان کے بارے میں مایوسی کا آغاز؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ مارچ ۱۹۹۹ء

اسلام آباد میں امارت اسلامی افغانستان کے سفیر مفتی سعید الرحمن حقانی کا ایک انٹرویو ''اوصاف'' میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے طالبان حکومت کو درپیش مشکلات اور معروضی مسائل کے حوالے سے طالبان کی پالیسیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے فرمودات میں سے دو باتوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ایک تو افغانستان کی تقسیم کے خدشات کے پس منظر میں انہوں نے کہا ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان تقسیم ہو۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ خدشہ بلکہ خطرہ ایک عرصہ سے افغان عوام کے سروں پر لٹک رہا ہے اور عالمی طاقتوں کا منصوبہ ہی یہ ہے کہ افغانستان کو شمال اور جنوب میں تقسیم کر کے کابل اور وسطی ایشیا کے درمیان ''بفر اسٹیٹ'' قائم کر دی

جائے تاکہ کابل کی نظریاتی اسلامی حکومت وسطی ایشیا کی نوآزاد مسلم ریاستوں پر اثرانداز نہ ہوسکے۔ کابل میں ایک مستحکم اور نظریاتی اسلامی حکومت کا قیام اور اردگرد ممالک پر اس کے اثرانداز ہونے کے امکانات عالمی قوتوں بالخصوص امریکہ کیلئے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔

اس وقت اس ایجنڈے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ کام ہو رہا ہے کہ کابل میں کسی نظریاتی اسلامی حکومت کو مستحکم نہ ہونے دیا جائے۔ اور اس کے شمال اور جنوب دونوں اطراف میں اثرانداز ہونے کے امکانات کو محدود کرکے اس کے اثر انداز ہونے کا رخ مشرق اور مغرب کی طرف موڑ دیا جائے۔ تاکہ جہاں اسلام آباد اور وسطی ایشیا کو طالبان کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو وہاں سنکیانگ اور تہران کے بارے میں امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کیلئے طالبان ہی کی قوت استعمال میں آجائے۔ یہ ایک گہری اور خطرناک چال ہے جو عالمی سیاست کی بساط پر اس وقت پوری مہارت کے ساتھ کھیلی جا رہی ہے اور پاکستان کی افواج کو طالبان کے اثرات سے بچانے کیلئے امریکہ کی طرف سے پاک فوج کے ساتھ تعلقات کار کی بحالی کی نئی پالیسی بھی اسی گیم کا حصہ ہے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب طالبان نے قندھار اور اس کے ساتھ گیارہ صوبوں کا کنٹرول حاصل کرلیا تھا مگر کابل اور ہرات ابھی ان کی دسترس میں نہیں آئے تھے۔ طالبان کا ایک وفد پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کرکے دینی مدارس میں زیر تعلیم افغان طلبہ کو ترغیب دے رہا تھا کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں کو کچھ عرصہ کیلئے معطل کرکے طالبان فورس میں شامل ہوں تاکہ طالبان کی تحریک جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ یہ وفد گوجرانوالہ بھی آیا اور راقم الحروف کے ساتھ اس کے ارکان کی ملاقات ہوئی۔ میں نے اس وقت اس وفد سے عرض کیا تھا کہ طالبان کے خلوص، جذبہ، دینداری اور ایثار میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور ہم ہر وقت ان کی کامیابی کیلئے دعاگو رہتے ہیں۔ مگر موجودہ تناظر میں دو باتوں کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے:

1. ایک یہ کہ طالبان کی تحریک کہیں غیر شعوری طور پر افغانستان کی تقسیم کا باعث نہ بن جائے، کیونکہ طالبان کی ذمہ دار قیادت کا بیشتر حصہ پشتون رہنماؤں پر مشتمل ہے اور فارسی بان کمیونٹی کو طالبان کی لیڈرشپ میں اس نوعیت کی نمائندگی حاصل نہیں ہے جو افغانستان کی تقسیم کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔
2. جبکہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ طالبان کی قیادت کے ذہن میں اسلامی نظام اور آج کے حالات میں اس کی تطبیق کا عملی خاکہ کیا ہے، یہ بات کچھ واضح نظر نہیں آرہی۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ طالبان کی اسلامی حکومت پورے خلوص اور جذبہ للّٰہیت کے ساتھ نفاذ اسلام کیلئے جو عملی اقدامات اپنے ذہن اور ترجیحات کے مطابق کرے وہ باقی دنیائے اسلام میں کنفیوژن کا باعث بن جائیں۔ اور اس سے مسلم ممالک کی اسلامی تحریکات کو قوت ملنے کی بجائے ان کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ ہوجائے۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر چکے ہیں اور اس کے بعد کابل، ہرات، جلال آباد اور مزار شریف جیسے اہم مراکز بھی طالبان کے زیر تسلط آچکے ہیں اور معاملات کافی آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرا ذہن ان خدشات سے نجات حاصل نہیں کرسکا اور دونوں حوالوں سے کوئی ایسی تبدیلی ابھی تک سامنے نہیں آئی جو ان خدشات کے دھبوں کو ذہن کی سلیٹ سے صاف کرنے میں معاونت کرتی ہو۔ اس لیے اگر اسلام آباد میں متعیّن افغان سفیر مفتی سعید الرحمن حقانی یہ کہہ

رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت افغانستان کی تقسیم کو روکنے کیلئے ہر ممکن اقدامات کرے گی تو ان کا یہ ارشاد یقیناً خوشی اور اطمینان کا باعث ہے اور ہم ان کی کامیابی کیلئے سراپا دعا ہیں۔ مگر اتنی گزارش ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ افغانستان کی تقسیم کو روکنے اور اس سلسلہ میں عالمی سازشوں اور امریکی عزائم کو ناکام بنانے کیلئے کچھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت ہے جن سے طالبان کی حکومت پوری طرح باخبر ہوگی۔ اور اسے ان سے باخبر ہونا بھی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر افغانستان اور وسطی ایشیا کو امریکہ کی نئی شکار گاہ بنانے سے نہیں روکا جاسکے گا۔

افغان سفیر کے مذکورہ انٹرویو کا دوسرا اہم نکتہ اسامہ بن لادن کے بارے میں ہے جس میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسامہ بن لادن سعودی عرب کی حکومت کے ساتھ طالبان کی اسلامی حکومت کے تعلقات میں بگاڑ کا باعث بنے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی گئی ہے اور وہ ناراض ہوکر روپوش ہوگئے ہیں۔ اس کا عام سا مطلب یہ ہے کہ طالبان کی حکومت نے سعودی عرب اور اسامہ بن لادن میں سے ایک کے انتخاب میں سعودی حکومت کو ترجیح دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اور اسامہ بن لادن سے مواصلات اور روابط کی سہولتیں واپس لے کر اس فیصلہ پر عملدرآمد کا آغاز بھی ہوگیا ہے۔

اس پر ان حلقوں نے یقیناً اطمینان کا سانس لیا ہوگا جو ایک عرصہ سے طالبان کے رہنماؤں کے کانوں میں کھسر پھسر کررہے تھے کہ ایک شخص کی خاطر حکومت کو ناراض کرنا دانش مندی نہیں ہے کہ اسامہ ایک شخص ہے جو اپنی حکومت کا باغی ہے اور اسے اس حد تک اہمیت دینا عقلمندی کی بات نہیں ہے کہ سعودی حکومت کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ آجائے۔ مگر اسلامی تحریک کے میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کیلئے یہ فیصلہ الجھن کا باعث بنا ہے اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں کارکنوں کو مایوسی ہوئی ہے جو طالبان کی اسلامی تحریک کو دنیا میں احیائے اسلام کا نقطۂ آغاز سمجھ کر اپنی تمام تر دعائیں، تمنائیں اور ہمدردیاں اس کیلئے وقف کیے ہوئے ہیں۔

کیونکہ اسامہ بن لادن ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوچ اور فکر کا نمائندہ ہے جو اسلام کی سربلندی اور دنیا میں اسلام کے دوبارہ غلبے اور نفاذ کیلئے موجودہ عالمی نظام اور بین الاقوامی استعماریت کے پورے نیٹ ورک کو مسترد کرکے اسلام کو اس کے مقابل ایک مستقل نظام کے طور پر لانے کیلئے کوشاں ہے۔ اور طالبان کے ساتھ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور نظریاتی کارکنوں کی ہمدردیوں اور حمایت کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ طالبان کی اسلامی حکومت موجودہ عالمی سسٹم میں ایڈجسٹ ہونے کی بجائے اسلام کو موجودہ عالمی نظام کے بالکل متوازی نظام کے طور پر پیش کررہی ہے۔ اور وہ اقوامِ متحدہ، امریکہ اور موجودہ مسلمان حکومتوں کے نیٹ ورک کا حصہ نہیں بننا چاہتی، اسی وجہ سے اس نے اسامہ بن لادن کو تحفظ اور امن فراہم کررکھا ہے اور اس کے بارے میں امریکی مطالبات کو خاطر میں نہیں لارہی۔

دونوں راستے بالکل واضح ہیں۔ ایک طرف مروجہ عالمی نظام ہے، امریکی قیادت ہے، بین الاقوامی ادارے ہیں اور انہی کے زیر سایہ چلنے والی مسلم حکومتیں ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اسلامی تحریکات ہیں، اسلام کے غلبہ کا عزم ہے اور ایڈجسٹمنٹ کی بجائے مروجہ نیٹ ورک کو کلیتاً مسترد کرتے ہوئے اسلام کے اجتماعی اور عالمی کردار کا احیا ہے۔ پہلا راستہ

سہولتوں کا ہے، آسائشوں کا ہے اور موجودہ عالمی سسٹم سے بے پناہ فائدے حاصل کرنے کا ہے۔ جبکہ دوسرا راستہ ایثار کا ہے، قربانی کا ہے، فقر و فاقہ کا ہے۔ ایک راستہ شاہ فہد کا ہے جبکہ دوسرا راستہ اسامہ بن لادن کا ہے۔ یہ فیصلہ کن دوراہا ہے جہاں سے طالبان کی اسلامی حکومت نے بالآخر ایک طرف کو مڑ جانا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا انہی کا کام ہے کہ وہ کدھر کا رخ کرتے ہیں۔ البتہ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات طالبان کی قیادت سے عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کا احیا اور غلبہ تو مقدر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ یہ غلبہ مروجہ عالمی سسٹم اور اس کی آلہ کار مسلم حکومتوں کے ساتھ مفاہمت کی صورت میں نہیں ہو گا بلکہ اسامہ بن لادن جیسے مجاہدوں اور درویشوں کے ہاتھوں ہو گا۔ اس لیے اگر اس عالمی انقلاب کا نقطۂ آغاز بننا طالبان کے مقدر میں نہیں ہے تو اس سے اسلامی تحریکات کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ فطرت کا قانون اور تاریخ کا عمل اٹل ہوتے ہیں اور پھر:

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

اشک آباد کے مذاکرات اور مولانا سمیع الحق کی پیشکش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۱ مارچ ۱۹۹۹ء

آج صبح دو اچھی خبریں پڑھنے کو ملیں اور ذہن کی اسکرین پر خوشی کی کرنیں جھلملانے لگیں۔ ایک خبر اشک آباد میں طالبان اور شمالی اتحاد کے مذاکرات کی کامیابی کی ہے جو کم و بیش سبھی اخبارات نے شائع کی ہے جبکہ دوسری خبر مولانا سمیع الحق کی طرف سے مولانا فضل الرحمان کے ساتھ اتحاد کی پیشکش ہے جو انہوں نے ''اوصاف'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کی ہے۔

افغانستان کے بارے میں ایک مضمون میں راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ استعماری قوتوں کی دیرینہ خواہش ہے کہ افغانستان شمال اور جنوب میں تقسیم ہو جائے اور شمال میں ایک ایسی ریاست قائم ہو جو کابل کی نظریاتی اسلامی حکومت اور وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستوں کے درمیان ''بفر اسٹیٹ'' کا کام دے۔ اس تقسیم کو روکنے کیلئے ضروری تھا کہ یا تو طالبان شمالی اتحاد کے خلاف مکمل فتح حاصل کر کے پورے افغانستان کا کنٹرول حاصل کر لیں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو شمالی اتحاد کو اعتماد میں لے کر عالمی مداخلت کے امکانات کو کم سے کم کرنے کی صورت اختیار کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے راستے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے پر طالبان نے دوسرا راستہ اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے جو عالمی حالات کے موجودہ تناظر میں آخری چارہ کار کے طور پر بہتر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ مذاکرات مزید آگے بڑھے تو افغانستان میں ایک مستحکم حکومت کے قیام اور تباہ حال افغانستان کی تعمیر نو کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔

اس لیے ہم اس مفاہمت کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کریں اور افغان قوم کیلئے بہتر مستقبل کا زینہ بنائیں، آمین۔ اس میں جہاں اطمینان کا ایک پہلو ہے کہ مذاکرات میں طالبان کا سامنا جنرل دوستم اور جنرل عبد المالک جیسے کمیونسٹ لیڈروں سے نہیں بلکہ پروفیسر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود جیسے جہادی

راہنماؤں سے ہے، جن سے تمام تر اختلاف کے باوجود روسی جارحیت کے خلاف دس سالہ جہاد افغانستان میں ان کے نمایاں کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور باہمی اختلافات پر خوش اسلوبی سے قابو پا لیا جائے تو وہ طالبان کے فطری اور نظریاتی حلیف ثابت ہوسکتے ہیں۔ مگر خدشے کا ایک پہلو بھی موجود ہے کہ کابل میں مشترکہ قومی حکومت کے قیام سے افغانستان کا رخ ایک خالص نظریاتی اور بے لچک اسلامی ریاست کی بجائے عالمی برادری کیلئے قابل قبول مسلم ریاست کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں ان مذاکرات کی کامیابی کے بعد عالمی اداروں کی جدوجہد اسی ہدف کیلئے وقف ہوجائے گی کہ دیگر بہت سے مسلم ممالک کی طرح افغانستان بھی اسلام کا پرچم تھامے ہوئے دنیا کے موجودہ عالمی کلچر اور بین الاقوامی سسٹم کا ایک قابل قبول یا کم از کم گوارا حصہ بن جائے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کا وہ خواب پورا نہ ہونے پائے جو وہ دنیا کے نقشے پر ایک خالص نظریاتی اور مثالی اسلامی ریاست کے ابھرنے کے حوالے سے ایک عرصہ سے دیکھ رہی ہیں۔

بہرحال یہ طالبان کی قیادت کا امتحان ہے اور میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ خلافت راشدہ کی طرز پر خالص اور اصلی اسلام کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ اگر قائم رہی تو انہیں اسلامی تحریکات کے نظریاتی کارکنوں کی حمایت، دعائیں اور تعاون بدستور حاصل رہے گا۔

مولانا سمیع الحق کی طرف سے مولانا فضل الرحمان کو اتحاد کی پیشکش کے حوالے سے عرض ہے کہ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایم آر ڈی کی شکل میں پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کا مسئلہ اختلاف کا باعث بنا تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور ان کے رفقاء پیپلز پارٹی کے ساتھ ایم آر ڈی میں شریک کار بننے کے خلاف تھے جبکہ مولانا فضل الرحمان کے ساتھ جماعتی راہنماؤں کا ایک بڑا گروہ ایم آر ڈی میں شامل ہوگیا تھا۔ جمعیت علماء اسلام دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ درخواستی گروپ اور دوسرا فضل الرحمان گروپ کہلایا۔ راقم الحروف اس کشمکش میں حضرت درخواستیؒ کے ساتھ تھا اور ان کے گروپ کا ایک سرگرم کردار تھا۔

ایم آر ڈی ختم ہوئی تو وجۂ اختلاف ختم ہوجانے کی وجہ سے بہت سے جماعتی حلقوں کی طرف سے تحریک ہوئی کہ اب جمعیت کو پھر سے متحد ہوجانا چاہیے کیونکہ پالیسی کا کوئی نمایاں اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ راقم الحروف بھی اتحاد کی اس کوشش میں پیش پیش رہا اور اب بھی ہے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور مولانا فضل الرحمان کے درمیان اتحاد طے پا گیا اور جمعیت علماء اسلام کے متحد ہونے کا اعلان کر دیا گیا مگر حضرت درخواستیؒ کی جمعیت کے سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق اور ان کے رفقاء نے اس اتحاد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور "مولانا سمیع الحق گروپ" کے نام سے الگ گروپ بنا لیا جو ابھی تک قائم ہے۔ اسی وجہ سے جمعیت علماء اسلام اب بھی دو دھڑوں میں منقسم نظر آتی ہے اور اس کے اتحاد کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو رہی۔

اس صورتحال میں سرحد اور بلوچستان میں دونوں دھڑوں کے اختلافات اور قومی انتخابات میں ایک دوسرے کے مقابلہ کی وجہ سے جمعیت علماء اسلام کی پالیمانی قوت دن بدن سکڑتی جا رہی ہے اور ملک بھر میں نفاذ اسلام، عالمی استعمار کے عزائم کی روک تھام اور قومی مسائل میں ایک مضبوط آواز کے طور پر جدوجہد کا وہ مقام اور کردار جمعیت علماء اسلام کو

حاصل نہیں رہا جو بیس سال قبل اسے حاصل تھا۔ اور جمعیت علماء اسلام کے نظریاتی کارکنوں اور اس کے بہی خواہ علماء کرام کی یہ خواہش حسرت میں بدلتی جا رہی ہے کہ اے کاش! جمعیت علماء اسلام ایک بار پھر متحد ہو کر قومی سیاست میں اپنا جائز مقام بحال کر لے۔

اس پس منظر میں مولانا سمیع الحق کے اعلان پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی اور مولانا فضل الرحمان کی خدمت میں دو گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ انہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۹۵ء کے عام انتخابات سے پہلے مولانا عبد الحفیظ مکی اور راقم الحروف ان دونوں حضرات اور ان کے علاوہ مولانا اعظم طارق کے پاس حاضر ہوئے تھے اور گزارش کی تھی کہ

1. جمعیت علماء اسلام کو متحد کر کے حسب سابق ایک جماعت کی شکل دے دی جائے۔
2. یہ قابل عمل نہ ہو تو جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑے اور سپاہ صحابہؓ انتخابی اتحاد بنا کر اکٹھے الیکشن لڑیں۔
3. یہ بھی مشکل ہو تو کم از کم درجہ یہ ہے کہ جن سیٹوں پر باہمی مقابلہ ہوتا ہے اور آپس کے مقابلہ کی وجہ سے سیٹیں ضائع ہو جاتی ہیں ان پر باہمی انڈراسٹینڈنگ کر کے باہمی مقابلہ سے گریز کیا جائے تاکہ انتخابی حلقے محفوظ رہیں۔

اس وقت ہماری یہ گزارشات قبول نہیں ہوئی تھیں، لیکن یہ تجاویز ہماری طرف سے آج بھی موجود ہیں اور ایک بار پھر گزارش ہے کہ دونوں راہنما ان کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں۔

دوسری گزارش ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد، امریکی استعمار کے عزائم کے مقابلہ اور دینی مدارس و مراکز کے تحفظ جیسے اہم اہداف کی خاطر دیوبندی مکتب فکر کی اکثر و بیشتر دینی و سیاسی جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ "مجلسِ عمل علماء اسلام پاکستان" کے نام سے گزشتہ سال قائم ہوا تھا جس میں جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑے اور سپاہ صحابہؓ بھی شامل ہیں۔ مگر کچھ ذہنی تحفظات کی وجہ سے دونوں جماعتوں کی قیادت خود اس میں آگے آنے سے گریز کر رہی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ متحدہ محاذ ایک اچھا فورم ہے اور اگر مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق خود آگے بڑھ کر اس کی قیادت کریں تو علماء دیوبند کی منتشر قوت کو ایک بار پھر متحد کیا جا سکتا ہے۔ اور دونوں لیڈروں کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دیوبندیوں کی قوت اگر کسی بھی حوالے سے متحد ہو گی تو اس کا سیاسی فائدہ انہی دو قائدین کو ہو گا، اس لیے حوصلہ کر کے آگے بڑھیں اور علماء اور کارکنوں کی دعائیں لیں۔

طالبان اور شمالی اتحاد میں مفاہمت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۱۹۹۹ء

گزشتہ ہفتے ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد میں افغانستان کی طالبان حکومت اور ان کے مخالف شمالی اتحاد کے درمیان مذاکرات کے پہلے دور کے بعد دونوں فریقوں کی طرف سے اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان میں قومی حکومت

کے قیام پر اتفاق ہو گیا ہے، اور طالبان کی حکومت نے شمالی اتحاد کو حکومت کے علاوہ مقننہ اور عدلیہ میں نمائندگی دینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ جبکہ عید الاضحیٰ کے بعد مذاکرات کے دوسرے دور میں مستقل جنگ بندی اور دیگر امور طے کر لیے جائیں گے۔

طالبان کی اسلامی حکومت پر ایک عرصہ سے بین الاقوامی دباؤ تھا کہ وہ اقتدار کو بلا شرکتِ غیرے اپنے پاس رکھنے کی بجائے "وسیع البنیاد" حکومت قائم کرے جس میں افغانستان کے تمام نسلی گروہوں کو نمائندگی دی جائے۔ جبکہ طالبان کا موقف یہ تھا کہ چونکہ انہوں نے افغانستان میں خانہ جنگی پر قابو پا کر امن قائم کیا ہے، ملک کے بہت بڑے حصے میں ان کا کنٹرول ہے، اور دارالحکومت کابل بھی ان کے پاس ہے، اس لیے دنیا کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق انہیں افغانستان کی جائز حکومت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ مگر اقوامِ متحدہ اور دیگر عالمی اداروں اور مغربی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کم و بیش سب مسلم حکومتوں نے بھی طالبان کے اس جائز اور اصولی موقف کی حمایت کرنے کی بجائے بین الاقوامی دباؤ کا ساتھ دینے میں عافیت سمجھی، جس کے نتیجہ میں اشک آباد کے یہ مذاکرات اور ان کا مذکورہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔

ہمارے نزدیک مغربی حکومتوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ کابل کا اقتدار صرف طالبان کے پاس نہ ہو بلکہ مختلف نسلی گروہوں کے نام سے ایسے حضرات کو بھی حکومت کا حصہ دار بنا دیا جائے جو افغانستان کو خالص اسلامی اور "مولویانہ" ریاست بننے سے روک سکیں۔ اور بظاہر لگتا ہے کہ اس مقصد میں عملی پیشرفت ہو رہی ہے، کیونکہ شمالی اتحاد میں جہاں چند جہادی گروپ شامل ہیں وہاں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو جہادِ افغانستان کے دوران مجاہدین کے خلاف روسی افواج کے شانہ بشانہ صف آرا رہے ہیں، اس لیے ان کی شمولیت کے ساتھ قومی حکومت کا جو نقشہ سامنے آئے گا وہ مذکورہ خدشات اور خطرات سے خالی نہیں ہوگا۔

تاہم شمال کی جنگ کے خاتمہ اور مستقل جنگ بندی سے طالبان کی حکومت کو افغانستان کی تعمیرِ نو کی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع ملے گا اور وہ اپنے مسائل کو مزید دل جمعی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کر سکیں گے۔ البتہ ان کا محاذِ جنگ عسکری میدانوں سے مذاکرات کی میز کی طرف منتقل ہو جائے گا اور افغانستان کو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کیلئے اب انہیں ٹیبل ٹاک اور ڈپلومیسی کی جنگ لڑنا پڑے گی۔ جس میں ان کا سامنا اگرچہ ہوشیار اور تجربہ کار راہنماؤں سے ہے مگر طالبان کے خلوص، دینداری اور اسلام کے ساتھ ان کی محبت کے باعث ہمیں امید ہے کہ انہیں اس محاذ پر بھی پسپائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اور ہم اس نئی آزمائش پر ان کی ثابت قدمی اور کامیابی کیلئے دعاگو ہیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا فضل الرحمان کے بیان پر امریکی ردعمل

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- ۱۶ اگست ۱۹۹۹ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان کے اس بیان پر امریکہ نے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے کہ

امریکہ نے اسامہ بن لادن یا طالبان کے خلاف کوئی کارروائی کی تو پاکستان میں امریکی باشندے محفوظ نہیں رہیں گے۔ اس پر برطانیہ نے مولانا موصوف کو ویزا دینے سے معذرت کر دی ہے اور اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ کے ذمہ دار حضرات نے مولانا فضل الرحمان سے ملاقات کر کے ان سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی ہے۔ جبکہ اخباری اطلاعات کے مطابق مولانا فضل الرحمان نے اپنے موقف کو درست قرار دیتے ہوئے امریکی سفارت کاروں سے کہہ دیا ہے کہ اگر امریکہ افغانستان پر بلاجواز فضائی حملے کر سکتا ہے اور پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجاہدین کو نشانہ بنا سکتا ہے تو پاکستان میں امریکی باشندوں کے تحفظ کی ضمانت دینا بھی مشکل ہے۔

امریکہ اس وقت انا ربکم الاعلیٰ کے نعرے کے ساتھ دنیا کے واحد چوہدری کی حیثیت سے اپنا یہ حق سمجھتا ہے کہ وہ جسے چاہے اور جب چاہے اپنی جارحیت کا نشانہ بنائے اور کوئی اسے روکنے والا نہ ہو۔ گذشتہ سال افغانستان اور سوڈان پر امریکی فضائی حملے اسی فرعونیت کا شاہکار تھے اور اب پھر وہ عرب مجاہد اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی کے عنوان سے افغانستان پر نئے حملوں کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس لیے ہمارے خیال میں مولانا فضل الرحمان نے امریکہ کو یہ انتباہ کر کے اہل حق کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اس پر وہ بلاشبہ مبارکباد اور تحسین کے مستحق ہیں۔

اس کے ساتھ ہم ایک اور گزارش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جب جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑوں کے قائدین مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق مل کر امارت اسلامی افغانستان کی شرعی حکومت کی حمایت و امداد کر رہے ہیں، خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے عظیم عرب مجاہد اسامہ بن لادن کا ساتھ دے رہے ہیں اور امریکی عزائم کی مذمت میں پوری جرأت کے ساتھ پیش پیش ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس متفقہ پالیسی کو مؤثر طور پر آگے بڑھانے کیلئے دونوں متحد ہو جائیں؟ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ جمعیت علماء اسلام کے اتحاد کی طرف وہ جو قدم بھی بڑھائیں گے ملک بھر کے اہل حق کی انہیں بھرپور تائید حاصل ہوگی، اور ایسا ہونے کی صورت میں اہل حق کی طاقت ایک بار پھر مجتمع ہو کر عالمی استعمار کے مکروہ عزائم اور مذموم ارادوں کی راہ میں ناقابل تسخیر دیوار بن جائے گی۔

شیخ الہندؒ، طالبان، اسامہ بن لادن

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ اگست ۱۹۹۹ء

امریکہ بہادر کو مولانا فضل الرحمٰن کی اس بات پر بہت غصہ آیا ہے کہ اگر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا یا اسامہ کو اس کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچا تو پاکستان میں امریکی باشندے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ جمعیت علمائے اسلام کی امریکہ مخالف ریلی کے حوالے سے مولانا فضل الرحمٰن کا یہ اعلان جب میں نے لندن کے اخبارات میں پڑھا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بات طبع نازک پر گراں گزرے گی مگر اس کا ردعمل اس سطح پر ہو گا اس کا اندازہ نہیں تھا۔ امریکی سفارت کار جس طرح متحرک ہوئے اور برطانیہ نے جس طرح مولانا فضل الرحمٰن کو ویزا دینے میں لیت و لعل سے کام لیا اس کے بعد اس مسئلہ میں امریکہ کے احساسات و جذبات کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

امریکہ کا کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن دہشت گرد ہے اور اس سے امریکہ کو خطرہ ہے اس لیے طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالہ کر دیں ورنہ اسامہ کے خلاف سخت کارروائی کی زد میں وہ بھی آئیں گے۔ اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے دونوں دھڑوں کے رہنماؤں مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق نے جو مضبوط موقف اختیار کیا ہے وہ فی الواقع قابل ستائش ہے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے قافلہ سے اس کے تاریخی پس منظر میں اسی ردعمل اور موقف کی توقع کی جاسکتی تھی۔

راقم الحروف ان دنوں خلافت عثمانیہ کے آخری دور کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے اس سیاسی مرکز کو ختم کرنے اور امت مسلمہ کی وحدت کا شیرازہ بکھیرنے میں کس کس نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید کی ذاتی ڈائری کا عربی ترجمہ اس وقت میرے سامنے ہے جو ۱۸۷۲ء سے ۱۹۰۹ء تک خلیفۃ المسلمین رہے جبکہ ترکی کے علاوہ مصر، عراق، شام، فلسطین، اردن، حجاز مقدس، الجزائر، لیبیا، اور تیونس سمیت بیشتر عرب علاقے خلافت عثمانیہ کا حصہ رہ چکے تھے اور اس وقت بھی ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب خطے سلطان عبدالحمید کی قلمرو میں شامل تھے۔ اس ڈائری کے اہم حصے تو کسی اور موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کیے جائیں گے البتہ اس کے مندرجات سے اس منظم منصوبہ بندی اور مسلسل تگ و دو کا ایک خاکہ ضرور سامنے آجاتا ہے جو خلافت عثمانیہ کا تیاپانچہ کرنے، تیل کے متوقع چشموں کا کنٹرول حاصل کرنے، خلیج میں فوجی بالادستی قائم کرنے، اور اسرائیل کے نام سے یہودیوں کو فلسطین پر مسلط کر کے ان کی ریاست قائم کرانے کیلئے مغربی قوتوں نے کی۔ اور اس سے خلیج کی کشمکش کا اصل منظر سامنے آجاتا ہے کہ مغربی ملکوں کیلئے یہ خطہ کس قدر اہم ہے اور وہ اس کیلئے اخلاق و دیانت کے تمام تر اصولوں کی قربانی دینے کیلئے بلاوجہ تیار نہیں ہوئے۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اسامہ بن لادن کا قصہ محض ایک بہانہ ہے اور امریکہ کے نزدیک اصل مسئلہ طالبان کا ہے جنہیں وہ اسامہ کی آڑ میں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ برمنگھم کی بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس میں مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت کے ایک ذمہ دار عہدے دار نے یہ کہہ بھی دیا کہ اسامہ بن لادن کی بات تو صرف ڈرامہ ہے اصل قصہ طالبان کا ہے۔ مگر ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ موقف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے سامنے تاریخ کا پس منظر نہیں ہے اور جو خلیج میں یہودیوں اور مغربی ممالک کے مفادات کی گہرائی اور گیرائی سے بے خبر ہے۔ ہمارے نزدیک اسامہ اور طالبان دونوں اصل مسئلے ہیں جو اتفاق سے اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا اب کسی کیلئے ممکن نہیں رہا۔ اسامہ خلیج عرب میں یہودیوں اور مغربی ممالک کے مفادات اور ان مفادات کی آڑ میں عرب ممالک پر مغربی ملکوں کے عسکری تسلط کے خلاف صدائے احتجاج کا نام ہے۔ کیونکہ جب اسامہ یہ کہتا ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری خلیج عرب سے اپنی فوجیں نکال لیں اور عرب ممالک کو آزادی اور خود مختاری کی فضا میں اپنے فیصلے خود کرنے کا موقع دیں تو اس کی تکلیف براہ راست وائٹ ہاؤس کو ہوتی ہے۔ اور ہونی بھی چاہیے کہ مفادات اور لوٹ کھسوٹ کا جو نیٹ ورک ایک صدی کی مسلسل محنت کے ساتھ خلیج عرب میں مغربی حکومتوں نے قائم کیا ہے اس کو بکھرتے دیکھنا وائٹ ہاؤس کیلئے ممکن نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے اسامہ بن لادن دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد قرار پایا ہے کہ وہ خلیج عرب میں مغربی ملکوں کے نیٹ ورک کیلئے خطرہ بن گیا ہے۔ ایسا خطرہ جو ہر وقت مغربی حکمرانوں کے اعصاب پر سوار

رہتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے خلیج میں اپنے مفادات کی دوڑ کو اطمینان کے ساتھ جاری رکھنا مغربی حکمرانوں کیلئے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ اسامہ محض ایک بہانہ ہے درست سوچ نہیں ہے۔

اسی طرح طالبان بھی امریکہ اور مغربی ملکوں کے نزدیک اصل مسئلہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ دنیا کے کسی خطے میں خالص اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ اور ان پر بے لچک عملدرآمد امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک کے نزدیک اب قابل قبول نہیں رہا تھا کیونکہ وہ اپنے زعم میں عالمی سطح پر ایک ایسا تانا بانا بن چکے تھے کہ اگر کہیں اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ ہو بھی تو وہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کو تسلیم کرتے ہوئے موجودہ عالمی نظام کے نیٹ ورک کے اندر ہو تاکہ مروجہ ورلڈ سسٹم کیلئے وہ چیلنج نہ بن سکے۔ مگر طالبان نے اس طلسم کو توڑ دیا ہے اور وہ اس عالمی نظام کے سامنے ”سرنڈر“ ہونے کیلئے آمادہ نہیں ہو رہے، اس لیے امریکہ اس مسئلہ کو بھی ثانوی حیثیت نہیں دے سکتا۔ البتہ یہ بات امریکہ کے حق میں جارہی ہے کہ اس کے دونوں بڑے دشمن اکٹھے ایک ہی نشانے کی زد میں نہیں اور وہ ایک تیر سے بیک وقت دونوں شکار کھیل سکتا ہے۔

آج سے پون صدی قبل جب خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ اور عرب دنیا کو کئی حصوں میں بانٹ کر اس بندر بانٹ میں یہودیوں کیلئے اسرائیل کے نام سے الگ علاقہ مخصوص کرنے کے منصوبے پر عملدرآمد جاری تھا تو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اس کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی پاداش میں مکہ مکرمہ میں خلافت عثمانیہ کے باغی گورنر شریف مکہ حسین نے انہیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا تھا اور وہ کم و بیش چار سال مالٹا کے جزیرہ میں نظر بند رہے تھے۔ چنانچہ میرے جیسے نظریاتی کارکن کیلئے یہ بات بے حد اطمینان کی ہے کہ آج اسی منصوبے کے فائنل حصے کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے تو شیخ الہندؒ ہی کے قافلہ سے تعلق رکھنے والے دو لیڈر اس منصوبہ کو چیلنج کرنے کیلئے میدان میں کھڑے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحقؒ دو یا تین واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد ہیں اور انہی کے فکری و علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں ان کے اعلانات کو اسامہ بن لادن یا طالبان کی حمایت نہیں کہتا بلکہ شیخ الہندؒ کی جدوجہد کا تسلسل سمجھتا ہوں۔

آج ہم اگر اسامہ یا طالبان کے حق میں بات کرتے ہیں تو ان پر ہمارا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ ہم تو اپنا بھولا ہوا سبق یاد کر رہے ہیں اور اپنے ماضی کے ساتھ رشتہ جوڑ کر اپنے حال کو تابناک اور مستقبل کو روشن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں اگر کوئی احسان ہے تو وہ ہم پر طالبان اور اسامہ بن لادن کا ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارا ماضی یاد دلا دیا ہے اور بھیڑوں کے گلے میں پلنے والے شیر کے بچے کو چشمے پر لے جا کر صاف پانی کے آئینے میں اس کا چہرہ دکھا دیا ہے۔ امریکہ بھی شیخ الہندؒ کے گروہ سے بے خبر نہیں ہے اور وہ اپنے پرانے ”دوستوں“ کو خوب پہچانتا ہے اس لیے مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کے اعلانات پر اس کی بے چینی بلاوجہ نہیں ہے۔ البتہ ایک حسرت دل میں ابھی باقی ہے کہ اگر سعودی عرب کا اسامہ بن لادن اور قندھار کے طالبان یکجا ہو سکتے ہیں تو اکوڑہ خٹک کے مولانا سمیع الحق اور ڈیرہ اسماعیل خان کے مولانا فضل الرحمٰن کے یکجا ہونے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ گئی ہے؟

مسلم پرسنل لاء اور موجودہ عالمی صورتحال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۱ اگست ۱۹۹۹ء

۲۰ اگست ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسگو برطانیہ میں جمعیت اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام ایک نشست میں "مسلم پرسنل لاء" کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کیلئے آواز بلند کرنی چاہیے۔ سرکردہ علماء کرام کی یورپی کونسل نے دو ماہ قبل جرمنی میں معروف سکالر ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کی زیر صدارت اجلاس منعقد کر کے اس تجویز کی طرف دینی اداروں کو توجہ دلائی ہے اور برطانوی دارالامراء کے مسلمان رکن لارڈ نذیر احمد نے بھی ایک حالیہ تقریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہ رہا ہوں لیکن قبل اس کے کہ غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں مسلم اقلیتوں کیلئے مسلم پرسنل لاء کی اہمیت پر کچھ عرض کروں خود مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں مسلم پرسنل لاء کی صورتحال کے بارے میں گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے شخصی قوانین اور فیملی لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور مسلم حکومتوں پر بین الاقوامی طور پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے ممالک میں عمومی قوانین اور خاص طور پر پرسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلقہ قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کیلئے قرآن و سنت کے بیان کردہ ضابطوں میں تبدیلی کریں اور انہیں عالمی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس سلسلہ میں بین الاقوامی معیار سے مراد اقوامِ متحدہ کا بنیادی حقوق کا چارٹر اور اس کی تشریح میں اقوامِ متحدہ کے مختلف اداروں اور کانفرنسوں کی قراردادیں ہیں جن کی بہت سی باتیں نکاح و طلاق اور وراثت کے بارے میں قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں۔ اسی لیے بین الاقوامی اداروں اور لابیوں کی طرف سے مسلم ممالک سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب وہ اقوامِ متحدہ کے رکن ہیں اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر چکے ہیں تو انہیں اس کے مطابق اپنے قوانین میں ترمیم کرنی چاہیے اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور اس کے اداروں کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر مروجہ بین الاقوامی قوانین اور قرآن و سنت کے شرعی احکام میں کیا فرق اور تضاد ہے؟ اس کو واضح کرنے کیلئے دو تین باتوں کو بطور مثال ذکر کرنا چاہوں گا۔

1. بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی بھی مرد اور عورت رنگ و نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر آپس میں آزادانہ مرضی سے شادی کر سکتے ہیں، مگر اسلام میں مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا، اسی طرح مسلمان مرد بھی اہل کتاب کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کا اظہار آپ کے سامنے اس وقت ہوتا ہے جب یہاں کسی مغربی ملک میں

کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلمان نوجوان کے ساتھ عدالت کے ذریعے شادی کر لیتی ہے، لیکن جب آپ عدالت سے رجوع کرتے ہیں کہ اسلام اس شادی کی اجازت نہیں دیتا تو یہاں کی عدالت آپ کا اعتراض سننے کیلئے تیار نہیں ہوتی اور مروجہ بین الاقوامی معیار کے مطابق نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ یہاں کا سسٹم اس شادی کو مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

2. اسی طرح نکاح کا رشتہ ختم کرنے میں مروجہ بین الاقوامی قانون خاوند اور بیوی کا یکساں حق تسلیم کرتا ہے کہ دونوں میں سے جو بھی چاہے اس رشتہ کو ختم کر سکتا ہے۔ جبکہ اسلام نے نکاح کا رشتہ غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا حق خاوند کو دیا ہے جسے قرآن کریم نے بیدہ عقدة النکاح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جبکہ عورت کو یہ حق براہ راست اور غیر مشروط طور پر نہیں دیا گیا بلکہ خلع کے عنوان سے عورت کا یہ حق عدالتی پراسیس کے ذریعے تعلیم کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام عورت کو نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا حق غیر مشروط طور پر نہیں دیتا اور یہ بات مروجہ بین الاقوامی قانون سے متصادم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برطانیہ میں کوئی مسلمان خاتون اپنے خاوند کو طلاق دے دے تو کوئی عدالت خاوند کا یہ اعتراض سننے کیلئے تیار نہیں ہوگی کہ چونکہ شرعی قوانین کی رو سے طلاق دینے کا حق صرف اسے ہے اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ قانونی طور پر وہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہاں کا سسٹم اس طلاق کا تحفظ بھی کرے گا۔

3. اس کے علاوہ وراثت کے معاملہ میں بھی قرآن کریم نے حصوں کی جو تقسیم کی ہے وہ واضح طور پر غیر مساویانہ ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں بیوی کو ایک صورت میں آٹھواں اور دوسری صورت میں چوتھا حصہ ملتا ہے، اور بیٹی کا حصہ ہر صورت میں بیٹے سے نصف ہوتا ہے۔ جبکہ بین الاقوامی قانون اس سلسلہ میں برابری کا متقاضی ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ غیر مساویانہ حصوں کو غیر منصفانہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا جب وراثت کے قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں ترمیم کی جائے۔

یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے باب میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں اس لیے اقوامِ متحدہ کے مختلف اداروں سمیت بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے مسلم ممالک پر یہ دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں رد و بدل کر کے انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس پر مسلم ممالک اور حکومتوں کا ردعمل تین طرح کا ہے۔

1. ایک ردعمل ترکی کا ہے کہ اس نے پون صدی قبل ہی قرآن و سنت کے احکام سے اعلانیہ دستبرداری اختیار کر کے مغربی قوانین کو قبول کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلہ پر سختی کے ساتھ قائم ہے۔ بلکہ اگر ترکی میں اس

حوالے سے قرآن و سنت کے احکام کی طرف واپسی کا معمولی سا رجحان بھی نظر آنے لگتا ہے تو ریاستی قوانین اور ادارے اسے روکنے کیلئے پوری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں۔

2. دوسرا ردعمل امارت اسلامی افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کے ساتھ بے لچک وابستگی قائم رکھتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ اور ان کا یہ انکار بھی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول اور دارالحکومت کا قبضہ حاصل کرنے اور اپنے زیر تسلط علاقے میں مکمل امن قائم کر لینے کے باوجود ان کی حکومت کو اقوامِ متحدہ میں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں اقوامِ متحدہ میں افغانستان کی نشست سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

3. ترکی اور افغانستان کے فیصلے تو دوٹوک اور غیر مبہم ہیں جو سب کے سامنے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا ردعمل بھی ہے جو پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا ہے کہ قرآن و سنت پر عملدرآمد کا ٹائٹل بھی ہاتھ میں رہے اور مغرب کو بھی مطمئن رکھا جائے۔ اس کیلئے ایک الگ راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی ایسی تعبیر و تشریح کی جائے جس سے قوانین کو مغرب کے معیار کے قریب تر لایا جائے۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس یعنی عائلی قوانین کے نفاذ کی صورت میں ہوئی تھی جس کی متعدّد دفعات کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ نافذ ہوئے اور ابھی تک ریاستی قوت کے بل بوتے پر مسلسل نافذ العمل ہیں۔ ان قوانین میں سے صرف ایک کی مثال دوں گا کہ نکاح کے فارم میں خاوند کی طرف سے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینے کا خانہ رکھ کر ہم نے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے پاکستان میں عورت کو بھی طلاق کا حق دے دیا ہے۔ اسی سے باقی قوانین کے رخ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اب اقوامِ متحدہ کی قاہرہ اور بیجینگ میں ہونے والی خواتین کانفرنسوں کے بعد ان کی قراردادوں اور فیصلوں کی روشنی میں اگلے مرحلوں کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک حاضر سروس جسٹس کی سربراہی میں قائم ہونے والی "خواتین حقوق کمیشن" نے کچھ عرصہ قبل جو سفارشات پیش کی ہیں وہ قانون سازی کیلئے وزارت قانون کی میز پر ہیں۔ ان میں واضح طور پر سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا مکمل حق دیا جائے اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم ختم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتوں میں بھی اس نوعیت کے فیصلے ہونے لگے ہیں مثلاً لاہور ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا ہے اور سندھ ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں وراثت میں بیٹی کے نصف حصے کو انصاف کے منافی قرار دے دیا ہے۔ اس طرح ہم نے

قرآن و سنت کا ٹائٹل برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کے قریب آنے کیلئے شرعی احکام کی نئی اور من مانی تعبیر و تشریح کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوانین کے معیار کو پورا کرنے اور مغربی اداروں کو مطمئن کرنے کیلئے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی نئی تعبیر و تشریح کا یہ عمل مسلم ممالک کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کا ہے جبکہ عام مسلمانوں اور ملتِ اسلامیہ کی رائے عامہ نے اس عمل کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ہر مسلمان ملک میں دینی حلقے اور عام مسلمان قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی اسی تعبیر و تشریح پر سختی سے عمل پیرا ہیں جو چودہ سو سال سے اجماعی طور پر چلی آ رہی ہے اور وہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ دینی ادارے ہر جگہ اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابھی بنگلہ دیش سے لندن آئے ہوئے ہمارے پرانے بزرگ مولانا محی الدین خان نے بتایا ہے کہ بنگلہ دیش کی ہائیکورٹ نے کومیلا کے ایک مقدمہ میں طلاق یافتہ خاتون کو سابقہ خاوند کی طرف سے زندگی بھر نان و نفقہ دیے جانے کا حکم صادر کر دیا تو سرکردہ علماء کرام نے شریعت کونسل قائم کر کے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور عدالت عظمٰی نے علماء کرام کا موقف سننے کے بعد ہائیکورٹ کے فیصلے کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دیا۔

الغرض یہ ایک الگ کشمکش ہے جو مسلمان حکومتوں اور دینی حلقوں کے درمیان جاری ہے اور عام مسلمان ہر ملک میں قرآن و سنت کے حوالے سے علماء کرام اور دینی حلقوں کے ساتھ ہیں۔

یہ قدرے تفصیل میں نے اس لیے عرض کی ہے تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہ صورتحال واضح ہو جو اس وقت مسلم ممالک میں نکاح و طلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالے سے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء خود مسلم ممالک میں خطرہ میں ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ایک مسلسل عمل جاری ہے۔ اور صرف پرسنل لاء اور خاندانی قوانین کی بات نہیں بلکہ قرآن و سنت کے بہت سے دیگر احکام و قوانین بھی مغربی دباؤ کی زد میں ہیں۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ کسی مجرم کو دی جانے والی سزا اہانت، ذہنی اذیت اور جسمانی تشدد سے خالی ہونی چاہیے۔ یعنی سزا ایسی ہو کہ اس میں مجرم کی توہین نہ ہوتی ہو، وہ ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو اور اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی نہ بننا پڑے۔ چنانچہ اس بنیاد پر ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں عام لوگوں کے سامنے سزا دینے کے سب قواعد و ضوابط اس بین الاقوامی معیار کے منافی قرار پاتے ہیں۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کی بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جو مخالفت ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے اور جرائم کی شرعی سزاؤں کو بعض سیاسی لیڈروں کی طرف سے وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیے جانے کا پس منظر بھی یہی ہے۔

اس حوالے سے مغرب والوں کا موقف تو سمجھ میں آتا ہے کہ بہت سے اسلامی احکام و قوانین ان کے بقول آج کے بین الاقوامی معیار کے منافی ہیں اس لیے اگر مسلم ممالک نے بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اس کے احکام و ضوابط بھی قبول کرنا ہوں گے۔ اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن مسلم ممالک نے اقوامِ متحدہ کی رکنیت قبول کر کے اس کے چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں انہیں اس بین الاقوامی معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ البتہ ان مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل سمجھ سے بالاتر ہے جو بین الاقوامی معیار اور قرآن و سنت کے قوانین کو ساتھ ساتھ لے کر

چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کوشش میں شرعی احکام کا حلیہ بگاڑ دینا چاہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کی وہ بات پسند آئی ہے جو انہوں نے اقوامِ متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کے موقع پر مسلم حکومتوں کے سامنے رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے دوہرے طرزِ عمل پر احتجاج کے طور پر مسلم ممالک کو اقوامِ متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اسے از سرِ نو مرتب کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ چارٹر پچاس سال قبل ترتیب دیا گیا تھا جب اکثر مسلم ممالک غلامی کی حالت میں تھے جبکہ آج صورتحال بدل گئی ہے اس لیے عالم اسلام کے موقف اور پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اس چارٹر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مہاتیر محمد کی یہ بات مسلم حکومتوں نے قبول نہیں کی لیکن یہی موقف حقیقت پسندانہ ہے اور مسلم ممالک کو بالآخر اسی موقف پر آنا ہوگا۔

یہ تو ہے صورتحال مسلم پرسنل لاء کے حوالے سے خود مسلم ممالک کی۔ اب آئیے ان ممالک کی طرف جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں بھارت کے مسلمان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے خاندانی قوانین کا تحفظ کیے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں تمام مکاتب فکر کا مشترکہ ”آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ“ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے پرسنل لاء کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت میں ”کامن سول کوڈ“ کے نفاذ کے نام سے مسلمانوں کے جداگانہ شخصی قوانین کو ختم کرنے کی مہم ایک عرصہ سے چل رہی ہے اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ قومی یکجہتی کی خاطر نکاح و طلاق اور وراثت میں اپنے جداگانہ مذہبی قوانین سے دستبردار ہو کر کامن سول کوڈ قبول کر لیں۔ چنانچہ یہاں بھی کامن سول کوڈ سے مراد وہی بین الاقوامی قوانین اور معیار ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے حوالے سے کر دیا ہے۔ مگر انڈین مسلمان اس معاملہ میں بالکل بے لچک ہیں اور پرسنل لاء میں اپنے مذہبی احکام و قوانین کے تحفظ کا پوری طرح عزم کیے ہوئے ہیں جس پر وہ بلاشبہ تبریک و تحسین اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

جہاں تک مغربی ممالک کا تعلق ہے، میں نے چند ایسے مسائل کا ابتداء میں ذکر کر دیا ہے جن کا سامنا آپ حضرات کو یہاں درپیش ہے۔ مثلاً مسلمان لڑکی کی غیر مسلم لڑکے سے شادی، مسلمان بیوی کا عدالتی سسٹم کے ذریعے خاوند کو طلاق دینا، اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم۔ اس قسم کے مسائل آپ حضرات کو مسلسل پیش آتے ہیں اور آپ جب مذہب اور اپنی روایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو آپ کی بات قطعی طور پر نہیں سنی جاتی۔ لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، لڑکے باغی ہو جاتے ہیں، انہیں اس سلسلہ میں ریاستی سسٹم کی طرف سے مکمل تحفظ و پشت پناہی مہیا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے مسلم خاندان تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جبکہ عالمی صورتحال یہ ہے کہ پرسنل لاء اور کلچر میں ہر قوم کے جداگانہ تشخص کے حق کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کو پرسنل لاء بلکہ بزنس لاء میں بھی اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے اور ان کیلئے الگ عدالتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں برطانیہ میں بھی یہودیوں کو جداگانہ پرسنل لاء کا تحفظ حاصل ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بھی پرسنل لاء میں اپنے جداگانہ تشخص کو تسلیم کرانے کیلئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کی حکومت کو اس سے

کوئی انکار ہوگا کیونکہ اسی برطانیہ نے جب برصغیر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما پر مشتمل متحدہ ہندوستان میں مغلوں سے اقتدار حاصل کیا تھا تو مغلوں کے دور سے چلا آنے والا عدالتی نظام ختم کر دیا تھا۔ اس وقت متحدہ ہندوستان کی عدالتوں میں فتاویٰ عالمگیری نافذ تھا جس کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس عدالتی نظام کو ختم کر کے انگریزی قوانین نافذ کر دیے تھے جو اب تک چلے آ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے پرسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے باب میں مسلمانوں کا یہ حق اس وقت بھی بحال رکھا تھا کہ وہ ان معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں اور ''محمڈن لاء'' کے نام سے پرسنل لاء اور خاندانی قوانین میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس دور میں جبکہ ہم برطانوی استعمار کے غلام تھے اور برطانیہ کی نوآبادی تھے ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا گیا تھا تو آج برطانیہ میں رہنے والے مسلمان غلام نہیں بلکہ برابر کے شہری ہیں تو ان کے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو پرسنل لاء میں جداگانہ تشخص فراہم کیا گیا ہے۔ خود پاکستان کے دستور میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلے علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا کہ پرسنل لاء میں تمام اقلیتوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس لیے جب پاکستان میں عیسائی اقلیت اور دیگر اقلیتوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا گیا تو برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے میں بھی کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دیں اور پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کیلئے منظم جدوجہد کا آغاز کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ خاندانی نظام کے حوالے سے درپیش ان مسائل اور مشکلات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے جنہوں نے مغرب میں رہنے والے ہر حساس اور دیندار مسلمان خاندان کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن جدوجہد سے میرا مقصد لڑائی جھگڑا اور بے تکا شور و غوغا نہیں ہے بلکہ جدوجہد سے مراد یہ ہے کہ معقولیت اور منطق کے ساتھ اپنا موقف متعلقہ اداروں اور شخصیات کے سامنے پیش کیا جائے، اس کیلئے لابنگ کی جائے، بریفنگ کی جائے اور رائے عامہ کو موثر طریقہ سے ہموار کر کے مغرب کی حکومتوں کو اس کیلئے آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے اس مسلمہ حق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں اسے دستوری تحفظ فراہم کریں۔

ڈاکٹر محمد المسعری اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳ ستمبر ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر محمد المسعری سعودی عرب کے معروف دانشور ہیں جو گذشتہ پانچ برس سے لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور لجنۃ الدفاع عن الحقوق الشرعیۃ (شرعی حقوق کے دفاع کی کمیٹی) کے نام سے سعودی عوام کے شرعی

و سیاسی حقوق کی بحالی کیلئے سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ نومبر ۱۹۴۶ء میں مکہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم الشیخ عبد اللہ بن سلیمان المسعری کا شمار سعودی عرب کے سرکردہ علماء کرام میں ہوتا ہے جو قضا کے مختلف مناصب پر فائز رہے اور دیوانِ مظالم کے رئیس کے عہدہ پر بھی کام کیا۔ جبکہ ان کے نانا الشیخ محمد عبد الرزاق حمزہؒ امام الحرمین تھے اور انہیں ملک کے اکابر علماء کرام میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد المسعری نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم سعودی عرب میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے جرمنی چلے گئے۔ گیارہ سال وہاں رہے اور فزکس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ۱۹۷۶ء میں وطن واپس آئے اور ریاضی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جرمنی میں قیام کے دوران اخوان المسلمون، حزب التحریر اور دیگر اسلامی تحریکوں سے متعارف ہوئے جو مختلف عرب ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ و احیا کیلئے کام کر رہی ہیں اور ان میں سے بعض کے ساتھ انہیں کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے سرکردہ علماء کرام اور دانشوروں نے خلیج میں امریکہ کی مسلح مداخلت کے خلاف اور سعودیہ کے داخلی نظام کی اصلاح کیلئے مذكرة النصيحة (خیر خواہی کی یادداشت) کے نام سے شاہ فہد کو ایک عرضداشت پیش کی تو اس پر دستخط کرنے بلکہ اس کیلئے کام کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد المسعری بھی شامل تھے۔ اس عرضداشت کی پاداش میں دیگر علماء کرام اور دانشوروں کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہوگئے۔ چھ ماہ جیل میں رہے، پھر کسی ذریعہ سے جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اتنا ہی عرصہ مختلف علاقوں میں سرگرداں رہنے کے بعد یمن کے راستہ سے لندن پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور یہاں آکر سیاسی پناہ حاصل کر لی۔

اقوامِ متحدہ کے بارے میں ڈاکٹر محمد المسعری کا کہنا ہے کہ یہ تنظیم یہودی مفادات کے تحفظ کیلئے قائم کی گئی تھی اور اپنے قیام کے بعد سے اب تک وہی کام کر رہی ہے۔ اس لیے مسلمان ممالک کے اس میں شامل ہونے اور شامل رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اقوامِ متحدہ کا منشور اور چارٹر کفر کے قوانین پر مبنی ہے اور سیکولرازم کا علمبردار ہے جس کی قرآن و سنت کی رو سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اقوامِ متحدہ میں شمولیت کا مطلب یہودیت اور عالمی کفر کے ساتھ اتحاد ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اقوامِ متحدہ سے الگ ہوکر اپنی الگ اقوامِ متحدہ تشکیل دینی چاہیے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مسلم ممالک کفر کے عالمی نظام میں شریک ہونے سے بچ جائیں گے اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ عالمی سطح پر توازن کی قوت ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت نے اقوامِ متحدہ میں شامل نہ ہوکر درست کیا ہے مگر ابھی اس سلسلہ میں ان کی پالیسی دوٹوک اور واضح نہیں ہے۔ انہیں کھلے طور پر کہہ دینا چاہیے کہ وہ اقوامِ متحدہ میں شمولیت کے خواہشمند نہیں ہیں بلکہ حالات مناسب ہونے پر عالمِ اسلام کی الگ اقوامِ متحدہ قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس معاملہ میں طالبان تنہا نہیں ہوں گے بلکہ اس وقت بھی دنیا میں سوئٹزرلینڈ ایک ایسا ملک ہے جو اقوامِ متحدہ کا رکن نہیں ہے۔ اور اگرچہ اقوامِ متحدہ کے بہت سے شعبوں کے دفاتر اور مراکز جنیوا میں ہیں جن سے سوئٹزرلینڈ مالی مفادات حاصل کر رہا ہے لیکن خود سوئٹزرلینڈ اقوامِ متحدہ کا رکن نہیں ہے اور اس سلسلہ میں سوئس حکومت کا موقف یہ ہے کہ انہیں اقوامِ متحدہ کے منشور اور ڈھانچے سے اتفاق نہیں ہے اس لیے وہ اس میں باضابطہ طور پر شامل نہیں ہوں

گے۔

طالبان حکومت کے بارے میں ڈاکٹر المسعری نے کہا کہ طالبان مخلص لوگ ہیں، مجاہد ہیں اور ان کی حکومت ایک اسلامی حکومت ہے جس کی وہ حمایت کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کیلئے دعا گو ہیں۔ لیکن طالبان کی حکومت کا نظام اور بہت سے اہم معاملات میں اس کی ترجیحات واضح نہیں ہیں جس سے ابہام پیدا ہو رہا ہے۔ طالبان کو اپنا نظام باقاعدہ طور پر تشکیل دینا چاہیے، اس کا اعلان کرنا چاہیے اور اس کیلئے عالم اسلام کے دانشوروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ طالبان نے اپنے داخلی نظام کی بنیاد فقہ حنفی اور فتاویٰ عالمگیری پر رکھی ہے مگر میرے خیال میں انہیں فتاویٰ عالمگیری کی بجائے اس کے مرتب کرنے والے حکمران سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کی پیروی کرنی چاہیے جنہوں نے اس وقت کے منتخب اربابِ علم و دانش کو جمع کر کے اس دور کے تقاضوں کے مطابق فتاوٰی عالمگیری کے نام سے ایک نظام مرتب کرایا اور اسے نافذ کیا۔ یہ ایک مسلم حکمران کی پہلی ذمہ داری ہے اور آج افغانستان کے امیر ملا محمد عمر کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ انہیں سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کی طرح حاکمِ وقت کی حیثیت سے اربابِ علم و دانش کو جمع کرنا چاہیے اور فتاوٰی عالمگیری کی طرز پر آج کے دور کے تقاضوں کے مطابق مکمل اسلامی نظام مرتب کرانا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد المسعری نے کہا کہ میں ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء کو دو باتوں کا مشورہ دوں گا۔ ایک یہ کہ اپنا دائرہ کار کسی ایک فقہی مذہب تک محدود نہ رکھیں بلکہ قرآن و سنت کو اصل سرچشمہ قرار دیتے ہوئے تمام فقہی مذاہب سے ضرورت کے مطابق استفادہ کریں۔ اور اصحابِ علم و فن سے استفادہ میں بخل سے کام نہ لیں بلکہ اگر کسی معاملہ میں غیر مسلم اہلِ فن کی ضرورت پڑ جائے تو ان سے استفادہ سے بھی گریز نہ کریں۔ اور دوسرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی پہچان پر کسی ایک مسلک کی چھاپ نہ لگنے دیں، ان کا دیوبندی ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے اور انہیں اس پر فخر بھی ہونا چاہیے لیکن عالمی سطح پر ان کی پہچان اس حوالے سے نہیں ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں انہیں دو مثالیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ سعودی حکومت نے اپنی پہچان سلفی اور وہابی تحریک کے حوالے سے کرائی ہے اور ریاستی پالیسی کی ترجیحات میں اس کو نمایاں جگہ دی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ تمام تر کوششوں کے باوجود عالم اسلام کے علمی و دینی حلقوں کا اس درجے کا اعتماد حاصل نہیں کر سکی جس کی وہ ہمیشہ خواہشمند رہی ہے۔ اسی طرح ایران نے کامیاب انقلاب کے بعد اپنی پہچان پر اثناعشری چھاپ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی تمام تر دعوؤں اور تگ و دو کے باوجود عالم اسلام میں اپنی تنہائی اور اجنبیت کو کم نہیں کر سکا۔ طالبان کو اس سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کا نہ صرف انہیں نقصان ہو گا بلکہ عالمی سطح پر نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور اسلامی تحریکات کی حمایت میں وہ جو کردار ادا کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں وہ کمزور پڑ جائے گا۔ اس لیے طالبان کو اپنے فکر و عمل کا دائرہ وسیع رکھنا چاہیے تاکہ عالم اسلام کی اسلامی تحریکات کو ان سے رابطہ رکھنے اور دنیا کے کسی بھی خطہ میں اسلامی نظام کے نفاذ کی خواہشمند مسلمان حکومت کو ان سے استفادہ کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہ ہو۔

خدیو مصر اور خدیو پنجاب

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء

میاں شہباز شریف صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیں اور وزیر اعظم میاں نواز شریف کے بھائی ہیں۔ ان کے بیرونی دوروں کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے خدشات اور شبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ایک سیاسی راہنما نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی یہ حق دیا جائے کہ وہ بیرونی دورے کریں اور اپنی ذمہ داری پر بیرونی اداروں کے ساتھ معاملات طے کریں۔

سیاسی رہنماؤں کے خیالات اور چھوٹے صوبوں کے خدشات اپنی جگہ مگر مجھے اسماعیل پاشا یاد آ رہے ہیں جو خلافت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ایک صوبے مصر پر حکمران تھے اور ”خدیو مصر“ کہلاتے تھے۔ سوا صدی پہلے کی بات ہے کہ خلیفہ عثمانی سلطان عبد العزیز مرحوم سے انہوں نے یہ اجازت لی کہ وہ مصر کیلئے بیرونی ممالک سے اپنے طور پر بھی مالی اور تجارتی معاملات طے کر سکتے ہیں۔ سلطان مرحوم نے اجازت دے دی جس کے بعد خدیو مصر کے وارے نیارے ہو گئے۔ اسماعیل پاشا نے مغربی ممالک سے بے تحاشا قرضے لیے اور انہیں بلڈنگوں اور سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ سرکاری نمود و نمائش اور اللّوں تللّوں میں اڑا دیا۔ حتیٰ کہ صرف مصر کے بیرونی قرضوں کی مقدار دولت عثمانیہ کے مجموعی قرضوں کے برابر پہنچ گئی اور خلافت عثمانیہ کو وہ قرضے ادا کرنے کیلئے مغربی ممالک میں اپنے اثاثے بیچنے پڑے۔

وہ زمانہ گزرا اور سلطان عبد الحمید مرحوم کا زمانہ آ گیا۔ اس وقت برطانیہ اور فرانس دونوں مصر پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور دونوں کی فوجی قوت مصر کے دائیں بائیں موجود تھی۔ بیرونی قرضوں اور اثاثوں کی فروخت کے باعث مصر کے اندر بحران پیدا ہو گیا۔ خدیو مصر نے اپنی کابینہ میں برطانوی اور فرانسیسی لابیوں کی نمائندگی کرنے والے دو غیر مسلم وزیر شامل کر لیے جس کے نتیجے میں مصر کی فوج کی تعداد نصف سے بھی کم کر دی گئی اور ہزاروں افسروں اور سپاہیوں کو فارغ کر دیا گیا۔ اس سے مصر کا اندرونی بحران شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا اور بات بغاوت تک جا پہنچی۔ برطانیہ اور فرانس نے عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید سے مطالبہ کیا کہ وہ مصر کی بغاوت اور خلفشار پر قابو پانے کیلئے فوج کشی کریں۔ سلطان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ خلیفۃ المسلمین ہیں اور اپنی ہی مسلم رعایا کے خلاف فوج کشی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مصر کے اندرونی حالات کا بہانہ بنا کر برطانیہ نے مصر میں فوجیں داخل کر دیں اور قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔

میں نے مصر پر برطانوی قبضے کے پس منظر کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر اس میں اور بھی بہت سی اندرونی کہانیاں ہیں جن کی بازگشت ہمیں آج کے حالات میں بھی اپنے اردگرد صاف طور پر سنائی دے رہی ہے۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے بیرونی دوروں کو میں اسی پس منظر میں دیکھ رہا تھا مگر میاں شہباز شریف نے گذشتہ روز پریس کانفرنس کر کے اس کے ایک پہلو کو خود ہی نمایاں کر دیا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں دہشت گردی کی حالیہ وارداتوں کا رشتہ طالبان کی اسلامی مملکت کے ساتھ جوڑ کر جو کچھ کہا ہے اس سے ان کے دورۂ امریکہ اور امریکی حکام کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کے مقاصد کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔ وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین اس سے قبل کہہ چکے

ہیں کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کی یہ لہر فرقہ وارانہ کشمکش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بیرونی ایجنسیوں بالخصوص ''را'' کی کارستانی ہے۔ گورنر پنجاب نے یہی بات زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی ہے۔ مگر میاں شہباز شریف کا اصرار ہے کہ یہ سب کچھ طالبان نے کرایا ہے اور اس کے حوالے سے انہوں نے طالبان کے خلاف باقاعدہ سرکاری مہم کا آغاز بھی کر دیا ہے۔

میاں شہباز شریف کا کہنا ہے کہ افغانستان میں عسکری تربیت کے اڈے ہیں جہاں نوجوانوں کو فوجی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ مگر انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ یہ تربیتی مراکز وہی ہیں جن میں تربیت حاصل کر کے نوجوانوں نے روسی استعمار کے خلاف پاکستان کی سالمیت کی جنگ لڑی ہے اور فوجی ٹریننگ کے یہ اڈے وہی ہیں جہاں سے تربیت پانے والے نوجوان کشمیر میں اپنے مجاہد کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ مصروف جہاد ہیں۔ بلکہ بوسنیا، چیچنیا، داغستان اور کوسووو کے مجاہدین بھی انہی مراکز کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان تربیتی مراکز میں یقیناً کچھ ایسے لوگوں نے بھی ٹریننگ حاصل کی ہوگی جنہوں نے اس ٹریننگ سے غلط فائدہ اٹھایا ہے، مگر چند افراد کے غلط کردار کے باعث اگر میاں شہباز شریف افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے مراکز کو دہشت گردی کے اڈے قرار دے رہے ہیں تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہ کہہ کر جہاد افغانستان اور جہاد کشمیر دونوں کی نفی کر رہے ہیں، اور روس و بھارت کے سیاسی موقف کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گردوں کی وارداتیں مذموم ہیں اور اس امکان کو بھی ہم رد نہیں کرتے کہ دہشت گردی کے مرتکب کچھ افراد نے افغانستانی کیمپوں میں تربیت حاصل کی ہوگی۔ مگر اس کی آڑ میں مجاہدین کو تربیت دینے والے عسکری مراکز کی کردار کشی اور ان کے خلاف مہم جوئی پاکستان کا نہیں بلکہ امریکہ کا ایجنڈا ہے۔ کیونکہ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ ایشیا کے اس خطہ میں طالبان کا کردار آگے نہ بڑھے اور وہ اس سرزمین کو آزادی کے ساتھ اسلامی قوتوں کو چین کے خلاف اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکے جس کی وہ ایک عرصہ سے خواہش رکھتا ہے۔

اس پس منظر میں ہم میاں شہباز شریف صاحب سے باادب یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ جو کردار ادا کرنا چاہیں بڑے شوق سے کریں، انہیں ہر رول ادا کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن تاریخ میں ہر کردار کیلئے ایک مخصوص باب ہوتا ہے، اس کا مطالعہ بھی کر لیں۔ اور بطور خاص ''خدیو مصر'' اسماعیل پاشا کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں۔ اگر انہیں کہیں اور سے اس سلسلہ میں معلومات میسر نہ ہوں تو تاریخ کے اس حصہ کے بارے میں مستند لٹریچر ہم ان کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ خدیو مصر کی پالیسیوں کے نتیجہ میں تو برطانیہ کی فوجیں مصر پر قابض ہوئی تھیں، لیکن ''خدیو پنجاب'' کے منصوبوں میں یہ کردار کس ملک کی فوج کیلئے تجویز کیا گیا ہے؟ میاں صاحب خود ہی وضاحت فرما دیں تو ان کا بے حد کرم ہوگا۔

جنرل پرویز مشرف سے دینی جماعتوں کی توقعات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء

افغانستان میں جہادی ٹریننگ کے مراکز، طالبان کی اسلامی حکومت، پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی کی وارداتوں کے حوالے سے میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کی پریس کانفرنسوں کے بعد ملک کے دینی حلقوں میں یہ خدشات بڑھتے جا رہے تھے کہ حکومت، طالبان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دینی مراکز و مدارس کے خلاف بھی کسی کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں علماء کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس صورتحال میں حکومتی اقدامات اور عزائم سے نمٹنے کیلئے کوئی لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ مجلس عمل علماء اسلام پاکستان دینی جماعتوں کا متحدہ محاذ ہے جس میں دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی کم و بیش سب دینی و سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اس متحدہ محاذ کے سربراہ ہیں جبکہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند مولانا سید عطاء المومن شاہ بخاری رابطہ سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

شرکاء محفل نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ پاک فوج میں خلفشار پیدا کرنے کی سازش ناکام ہوگئی ہے اور سابقہ حکومت نے واشنگٹن کے حکمرانوں کی آشیرباد سے طالبان کی اسلامی حکومت اور پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف جس کارروائی کا عزم ظاہر کیا تھا اور جس کیلئے مدارس دینیہ کی فہرستیں اور کوائف مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے وہ کارروائی وقتی طور پر رک گئی ہے۔ مگر ان دونوں حوالوں سے نئی حکومت کے عزائم کے بارے میں ابہام بدستور موجود ہیں اور جب تک نئے حکمرانوں کی پالیسی اور ترجیحات سامنے نہیں آتیں اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے یہی مشورہ ہوا کہ چند روز تک صورتحال واضح ہونے پر از سر نو علماء کنونشن بلایا جائے تاکہ دینی حلقوں کے آئندہ لائحہ عمل کا تعین کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی مشورہ میں یہ بات طے پائی کہ مجلس عمل کی طرف سے ایک "یادداشت" جنرل پرویز مشرف کو بھجوائی جائے جس میں ان توقعات اور خدشات کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے جو ملک کی حالیہ تبدیلیوں کے بعد دینی حلقوں کے ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور جن سے ملک کی نئی حکومت کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں شرکاء محفل نے جن امور کا تذکرہ کیا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

1. اول یہ کہ آئین معطل ہو جانے کے بعد آئین کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی دستوری ترمیم کے بارے میں ابہام پیدا ہو گیا ہے اور ان دفعات کا تعطل ان بین الاقوامی لابیوں کی تقویت کا باعث بن سکتا ہے جو پاکستان کے دستور سے اسلامی دفعات کو حذف کرانے اور پاکستان کو سیکولر قرار دلوانے کیلئے مسلسل مصروف عمل ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ فوجی حکمران دستور پاکستان کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی آئینی دفعہ کے بارے میں اپنے موقف کا دوٹوک اعلان

کریں تاکہ دستور پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور نئی حکومت کے حوالے سے بے جا شکوک و شبہات نہ پھیل سکیں۔

2. دوم یہ کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کے عنوان پر گذشتہ برسوں میں جو تباہی مچی ہے اس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس دوران سنی اور شیعہ مکاتب فکر کے سینکڑوں علماء اور اراکین جاں بحق ہوئے ہیں، ہزاروں افراد کے خلاف مقدمات درج ہیں جن میں بہت سے لوگ سالہا سال سے جیلوں میں بند ہیں۔ سینکڑوں افراد پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں مگر فرقہ وارانہ کشیدگی اپنے تمام تر اسباب و عوامل سمیت پوری طرح بدستور موجود ہے۔ اس لیے نئی حکومت کو چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہ میں اعلیٰ عدالتی انکوائری کمیشن قائم کرے جو سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کرے، دونوں طرف کے مارے جانے والے رہنماؤں اور کارکنوں کے مقدمات کا جائزہ لے، پولیس مقابلوں میں مارے جانے والے افراد کے کیسوں کی انکوائری کرے اور ملک بھر کے تھانوں میں درج ان ہزاروں مقدمات کی میرٹ کی بنیاد پر چھان پھٹک کرے جو دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف درج کروار کھے ہیں اور جن میں سے اکثر مقدمات کی بنیاد محض مخاصمت اور عناد ہے۔ جبکہ ان مقدمات کے تحت بہت سے افراد سالہا سال سے جیلوں میں بند چلے آرہے ہیں۔

3. سوم یہ کہ مسئلہ کشمیر، طالبان، اسامہ بن لادن اور پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں امریکی دباؤ کو مسترد کرنے کا واضح اعلان ضروری ہے۔ اور اس سلسلہ میں شرکاء محفل نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اگر فوجی حکومت امریکی دباؤ کو مسترد کر کے قومی وقار اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے مضبوط موقف اختیار کرے تو اسے ملک کے عوام بالخصوص دینی حلقوں کی طرف سے بھرپور حمایت ملنی چاہیے اور ایسی صورت میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان کو سرگرم کردار ادا کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

عوامی جمہوریہ چین کے حکمرانوں سے ایک گزارش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۹ء

عوامی جمہوریہ چین ہمارا عظیم پڑوسی ملک ہے اور پاکستان کے ان دوستوں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے ہر آڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا۔ مگر گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران دو تین خبریں ایسی آئی ہیں جنہوں نے پاک چین تعلقات کے حوالے سے محب وطن پاکستانیوں کو بے چینی سے دوچار کر دیا ہے۔

- ایک خبر تو رائٹر کی جاری کردہ ہے جو لاہور سے شائع ہونے والے ایک قومی اخبار نے ۱۲ اکتوبر کو شائع کی ہے کہ

چین کے شورش زدہ صوبے ژنجیانگ (سنکیانگ) میں عدالت نے بم دھماکوں اور ڈکیتیوں کی منصوبہ بندی کرنے پر تین مسلمان علیحدگی پسندوں کو سزائے موت سنا دی ہے اور ان کے چھ دیگر ساتھیوں کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا ہے۔

- دوسری خبر این این آئی نے ہندوستان ٹائمز کے حوالے سے جاری کی ہے کہ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف نے واشنگٹن کے دورہ میں امریکی حکام کے ساتھ جو سمجھوتہ کیا ہے اس میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ پاکستان چین کے ساتھ امریکہ کے معاملات میں امریکہ کا ساتھ دے گا۔
- جبکہ تیسری خبر حرکت المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمان خلیل نے گزشتہ ہفتے پریس کانفرنس میں بتائی ہے کہ رابطہ عالم اسلامی نے ان سے رابطہ قائم کر کے ترغیب دی تھی کہ وہ سنکیانگ میں مسلمانوں کو جہادِ آزادی کیلئے تیار کرنے میں کردار ادا کریں مگر انہوں نے چین کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔

سنکیانگ چین کا وہ سرحدی صوبہ ہے جو پاکستان کے ساتھ ملتا ہے اور اسے چینی ترکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کاشغر نام کا معروف شہر بھی اسی صوبہ میں ہے۔ اس صوبہ کی مجموعی آبادی ایک کروڑ بیان کی جاتی ہے جس کی اسی فیصد اکثریت مسلمان بتائی جاتی ہے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد اس خطہ کے مسلمانوں نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کیلئے مزاحمت کی اور علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا ثبوت اللہ الغور شہیدؒ کی قیادت میں کمیونسٹ فوجوں کے ساتھ سالہا سال تک مقابلہ کیا۔ مگر وہ شہید ہو گئے، مزاحمتی تحریک دم توڑ گئی اور ان کے قریبی رفقاء ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے جن میں ایک بزرگ مولانا نیاز محمد ختنی بھی تھے۔ مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی کے ہمراہ بہاولنگر آ گئے اور مرکزی عید گاہ میں جامع العلوم کے نام سے دینی درسگاہ قائم کی جو آج بھی ان کے فرزند مولانا جلیل احمد اخون کی نگرانی میں تعلیمی خدمات میں مصروف ہے۔

جہادِ افغانستان اور اس کے نتیجہ میں وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی کے اثرات چین کے اس مسلم اکثریت کے صوبے پر پڑنا بھی لازمی اور فطری بات تھی اور یہ بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ امریکہ چین کے خلاف جو عزائم رکھتا ہے اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو غیر مؤثر بنانے کیلئے اس کے اردگرد حصار قائم کرنے کی جو کوشش کر رہا ہے اس میں سنکیانگ کے مسلمانوں کا مسئلہ اس کیلئے ایک مفید ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ حالات کی ترتیب بتا رہی ہے کہ امریکہ اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کے تقاضوں سے غافل نہیں رہا اور مذکورہ بالا خبروں سے امریکی پروگرام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

خود راقم الحروف سے بھی اس مسئلہ پر بعض اسلامی تحریکات نے رابطہ قائم کیا اور اسی سال اگست کے دوران لندن میں اس سلسلہ میں ایک مختصر سی مشاورت بھی ہوئی جہاں کچھ دوستوں کا تقاضہ تھا کہ سنکیانگ کے مسلمانوں میں آزادی کے روز افزوں جذبات کو فروغ دینے کیلئے کام کیا جائے۔ مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ ہم اس حوالے سے بہت نازک صورتحال سے دوچار ہیں اور کوئی قدم پوری طرح سوچے سمجھے بغیر اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف

سنکیانگ میں بسنے والے اسی لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کا مسئلہ ہے جو جہاد افغانستان اور وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی آزادی کے تناظر میں ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے اور اپنے تشخص اور آزادی کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں۔ وہاں آزادی کیلئے مزاحمتی تحریک پیدا ہو چکی ہے، ہزاروں افراد ہجرت کر کے قازقستان اور دوسرے ملکوں میں جا چکے ہیں، خود پاکستان بلکہ اسلام آباد میں بھی ہم نے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جو سنکیانگ سے تعلق رکھتے ہیں اور ریاستی جبر سے بے بس ہو کر سرحد پار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے قطعی طور پر لاتعلق رہنا شرعی اصولوں اور غیرت وحمیت کے تقاضوں کے منافی ہے۔ مگر دوسری طرف امریکہ اور اس کے حواری بعض دیگر ممالک اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے اور اس کے ذریعے چین کا شیرازہ بکھیرنے کیلئے بالکل تیار بیٹھے ہیں جو موجودہ حالات میں نہ صرف پاکستان کے وجود اور اس کی سالمیت و وحدت کیلئے انتہائی نقصان دہ بات ہوگی بلکہ عالمی سطح پر بھی امریکہ کی واحد اجارہ داری کو مستحکم کرنے اور اس کے نتیجہ میں عالم اسلام کی تباہی پھیلانے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ بات ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ کسی ایسی تحریک کو سپورٹ کریں جو عالم اسلام کے مقابلے میں امریکہ کی قوت میں اضافہ پر منتج ہوتی ہو۔

راقم الحروف نے ان دوستوں سے عرض کیا کہ میرے نزدیک چین کے حکمرانوں کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ اس خطہ کے معروضی حقائق کا سامنا کریں اور سنکیانگ کے مسئلہ کو کسی ایسی حکمت عملی کے ساتھ حل کریں کہ وہاں کے مسلمان محرومی کے احساس سے نجات حاصل کر لیں اور امریکہ کو موقع نہ ملے کہ وہ اس مسئلے سے فائدہ اٹھا کر چین کے خلاف کوئی نیا محاذ گرم کر سکے۔

جہاں تک پاکستان کے دینی حلقوں کا تعلق ہے، ایک تاریخی حقیقت کی طرف چین کے محترم حکمرانوں کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کمیونسٹ ہونے کے ناطے سے ہمارے نزدیک روس اور چین میں کوئی فرق نہیں تھا اور کمیونزم کے دونوں فلسفے ہمارے نقطۂ نظر سے یکساں کفر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن روس کے عزائم توسیع پسندانہ تھے اور اس نے ہمیشہ پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کو سپورٹ کیا جبکہ چین نے اپنے کمیونزم کے فلسفہ کو اپنی سرحدوں تک محدود رکھا اور پاکستان کو دوستی کی فضا فراہم کی۔ اس لیے پاکستان کے دینی حلقوں کی کمیونزم کے خلاف جدوجہد میں ان کا ہدف ہمیشہ روس رہا جبکہ چین کے خلاف پاکستان کی کسی دینی جماعت نے کبھی کوئی تحریک نہیں چلائی جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ پاکستان کے دینی حلقے معروضی حالات کا مکمل ادراک رکھتے ہیں بلکہ دوست اور دشمن کی پہچان سے بھی بہرہ ور ہیں۔ مگر تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اور اب وقت آگیا ہے کہ چین کے حکمران اور دانشور معروضی حالات اور مستقبل کے خطرات کا صحیح طور پر اندازہ کریں اور جنوبی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احساس کرتے ہوئے افہام و تفہیم کے ساتھ امریکی یلغار کا راستہ روکنے کیلئے مشترکہ حکمت عملی کا راستہ اپنائیں کیونکہ دونوں کا مفاد اور بقا اب اسی میں ہے۔

اسامہ بن لادن: اسلام اور مسلمانوں کا غدار؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۷ نومبر ۱۹۹۹ء

اسامہ بن لادن اسلام اور مسلمانوں کا غدار ہے اور اس کی سعودی شہریت منسوخ کی جاچکی ہے اس لیے اگر اسے امریکہ کے حوالے کر دیا جائے تو سعودی حکومت کو کوئی تشویش نہیں ہوگی۔ خبر کے مطابق سعودی وزیر دفاع نے یہ بات واشنگٹن میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہی ہے۔

اسامہ بن لادن کے خلاف امریکہ نے ایک عرصہ سے جو مہم چلا رکھی ہے اس کے پس منظر میں سعودی شہزادے کی یہ بات کسی طور پر بھی خلاف توقع نہیں ہے اور موجودہ حالات کے تناظر میں اس کے علاوہ وہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہم بڑے ادب کے ساتھ سعودی حکمرانوں سے یہ گزارش کریں گے کہ نہ صرف یہ کہ یہ بات قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے بلکہ اسلام کی غلط ترجمانی اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش ہے جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ بات صرف سعودی حکومت یا سعودیہ کے مروجہ سسٹم اور قواعد و ضوابط کی ہوتی تو اسے سعودی حکمرانوں کی مجبوری قرار دے کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا مگر بات اسلام کے حوالے سے ہوئی ہے اور اسامہ کی مذمت کرنا ہمارے نزدیک اسلام سے غداری اور مجاہدین کے مقدس خون کا مذاق اڑانے کے مترادف ہو گا جسے کم از کم بے حمیتی اور بے غیرتی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متمول خاندان کا فرد ہے جس نے سالہا سال تک روسی جارحیت کے خلاف جہاد افغانستان میں بنفس نفیس حصہ لیا اور مختلف مجاہد گروپوں کی خطیر مالی امداد کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں مسلم اور عرب نوجوانوں کو جہاد کی عملی ٹریننگ دلوانے کا اہتمام کیا۔ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جب مختلف مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے تربیت یافتہ مجاہدین کی فہرستیں ان ممالک کی حکومتوں کو امریکی سی آئی اے نے فراہم کیں اور یہ طے پایا کہ ان مجاہدین کو ان کے ملکوں میں واپس بھجوا کر ریاستی قوانین کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے تو اسامہ بن لادن نے سوڈان میں ڈیرہ لگا لیا۔ اور وہ سوڈان کی حکومت کا زراعت میں خود کفالت اور سڑکوں کی تعمیر میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ ان مجاہدین کی پناہ گاہ بن گیا جن کو امریکہ اور اس کے حواری مسلم حکومتوں کے دباؤ پر پاکستان سے نکال دیا گیا تھا مگر وہ اپنے ملکوں میں واپس جانے کی بجائے اسامہ بن لادن کے پاس جا پہنچے اور اس کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

اسامہ بن لادن نے سعودی عرب کے اندر ان علماء کرام اور دانشوروں کی جدوجہد کی حمایت کی جو مطلق العنان بادشاہت اور مختلف سرکاری اداروں میں رائج غیر شرعی قوانین کے خاتمہ اور مکمل شرعی نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں، اور خلیج عرب میں امریکہ اور اس کی اتحادی ممالک کی مسلح افواج کی موجودگی کو عرب عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کے منافی اسرائیل کی ناجائز حکومت کے تحفظ اور حرمین شریفین کی آزادی و تقدس کیلئے خطرہ سمجھتے ہوئے خلیج سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کا مطالبہ کر رہے ہیں جو بلا شبہ ایک جائز اور ناگزیر مطالبہ اور عرب علماء و عوام کا مسلمہ حق ہے۔

اس لیے سوڈان پر امریکہ کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا کہ اسامہ کو سوڈان سے نکال دیا جائے اور اس میں اس حد تک

اضافہ کیا گیا کہ خود اسامہ بن لادن نے سوڈان کو مشکلات سے بچانے کیلئے اسے چھوڑ دیا اور افغانستان آ گئے۔ یہاں انہیں نظریاتی طور پر ان سے ہم آہنگ طالبان کی اسلامی حکومت کی اخلاقی حمایت میسر آئی جو امریکہ اور اس کے حواری مسلم حکومتوں کیلئے سوہان روح بن گئی اور اسی کرب و اضطراب میں امریکہ نے تمام اخلاقی و قانونی حدود کو پھلانگتے ہوئے سوڈان اور افغانستان کو فضائی حملوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اب وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے افغانستان کے خلاف پابندیاں لگانے کا اعلان کر رہا ہے۔

اسامہ پر الزام ہے کہ اس نے امریکہ کے خلاف مختلف مقامات پر دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے اور وہ دنیا بھر کے دہشت گردوں کو امداد دے رہا ہے۔ جبکہ اس کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ سعودی عرب کے اندر مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور خلیج عرب سے امریکی افواج کی واپسی کیلئے جدوجہد کر رہا ہے۔ اور امریکہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سعودی عرب میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام اور خلیج سے امریکی فوجوں کی واپسی کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کو پورے عالم اسلام سے دیس نکالا مل جائے گا اور اس نے نیوورلڈ آرڈر کے نام پر دنیا کی واحد چوہدراہٹ اور اجارہ داری کا جو پلان بنا رکھا ہے وہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی امریکہ کیلئے یہ بات بھی کسی طور پر قابل قبول نہیں ہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت نے اقوامِ متحدہ کے چارٹر کو نظر انداز کرتے ہوئے مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جو پروگرام شروع کر رکھا ہے وہ پایہ تکمیل تک پہنچے اور دنیا کے سامنے ایک نظریاتی اسلامی حکومت اور مثالی اسلامی معاشرہ کا نمونہ ابھرے۔ اس لیے امریکہ اسامہ بن لادن کو ہدف قرار دے کر اسے سزا دینے کے جنون میں اس حد تک مبتلا ہو چکا ہے کہ اس کیلئے قانونی اصولوں اور اخلاقی قدروں کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی اور وہ طالبان کو بائیکاٹ اور دیگر کارروائیوں کی مسلسل دھمکیاں دے رہا ہے۔

امارت اسلامی افغانستان اور اسامہ بن لادن کے درمیان موجودہ بحران سے نکلنے کیلئے کیا ترتیب طے پاتی ہے اس کا رخ ان سطور کی اشاعت تک واضح ہو چکا ہو گا۔ مگر ہم اس بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں، یہ آزادی کے حصول اور خود مختاری کے تحفظ کی جنگ ہے اور اسلام کی بالادستی اور اسلامی احکام و قوانین کی بالادستی کا معرکہ ہے، جنگوں اور معرکوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا آیا ہے۔ اور معاملات جہاں تک پہنچ گئے ہیں وہاں اسامہ بن لادن کی ذات اور اس کی جان کا مسئلہ اب کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا، اس مرد مجاہد نے اپنے مشن اور جذبات دونوں کو دنیائے اسلام کے ہزاروں مجاہدین کے سینوں میں منتقل کر دیا ہے اور اگر اسے شہادت کی وادی سے بھی گزرنا پڑا تو وہ نہ صرف سرخرو ہو گا بلکہ دنیا بھر میں امریکہ اور اس کے حواریوں کے خلاف صف آراء مجاہدین کے جذبات اور عزم میں اس کی شہادت سے اضافہ ہو گا۔

البتہ اسامہ بن لادن کو اسلام کا غدار قرار دینے والے نام نہاد مسلم حکمرانوں کو نوشتہ دیوار ضرور پڑھ لینا چاہیے کیونکہ اسلام امریکہ کا نام نہیں کہ اس کے ناپاک مفادات اور مکروہ عزائم کی مخالفت اسلام سے غداری قرار پائے۔ وہ مسلم حکمران جنہوں نے اپنے ملکوں میں اسلامی احکام و قوانین کا راستہ روک رکھا ہے، خلیج میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کو بٹھا رکھا ہے، عرب عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کو دنیاوی مفادات کی خاطر امریکہ کے لاکروں میں گروی رکھا ہوا ہے اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف عالمی استعمار کے ایجنڈے کی تکمیل کیلئے آلہ کار بنے ہوئے

ہیں، انہیں اپنے چہروں سے امریکی نقاب ہٹا کر ایک بار معروضی حالات کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لینا چاہیے تا کہ انہیں ”اسلام کا غدار“ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

طالبان، امریکہ، اقوامِ متحدہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۱۹۹۹ء

امریکی صدر بل کلنٹن نے اعلان کیا ہے کہ وہ دہشت گردوں کی سرپرستی کرنے پر طالبان کو سزا دینا چاہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ افغانستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں کا مقصد طالبان تحریک کو عالمی برادری سے دہشت گردی سمیت اہم معاملات پر عدم تعاون کی راہ اپنانے کی سزا دینا ہے۔

اس سے قبل اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان جنرل اسمبلی میں سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ افغانستان دنیا بھر کے مذہبی دہشت گردوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ان کے خیال میں افغانستان میں خانہ جنگی، وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور مذہبی انتہا پسندی کی لہر نئی صدی میں افغانستان اور اس کے ہمسایہ ممالک کی سلامتی کیلئے ایک سنگین خطرہ بن جائے گی۔ مسٹر کوفی عنان کا کہنا ہے کہ افغانستان مذہبی انتہا پسندوں کی پرورش گاہ بن چکا ہے جہاں پاکستان سمیت عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے کم عمر بچوں کو طالبان کے ساتھ جہاد میں جھونکا جاتا ہے۔

بل کلنٹن اور کوفی عنان کی طالبان کے بارے میں یہ شکایات نئی نہیں ہیں اور وہ ایک عرصہ سے ان الزامات کا تکرار کر رہے ہیں لیکن اصل میں انہیں تکلیف اس بات پر ہو رہی ہے کہ ان کے بیانات، وسیع تر پراپیگنڈے اور طالبان کی کردارکشی کی مہم پر پاکستان اور جنوبی ایشیا کے مسلمان ”ایمان“ نہیں لائے اور ان الزامات کو مسترد کرتے ہوئے طالبان کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ امریکی حکومت اور اس کی آلہ کار اقوامِ متحدہ کے بزرجمہروں کا خیال تھا کہ وہ جو ارشاد فرمائیں گے وہ سچ سمجھا جائے گا، ان کی قراردادوں اور فیصلوں کو صحیفۂ آسمانی تصور کیا جائے گا اور جب وہ طالبان کی کردارکشی کی عالمی مہم اور میڈیا کے تابڑ توڑ حملوں کے بعد افغانستان پر پابندیاں عائد کریں گے تو اس خطہ کے عوام سجدۂ شکر بجالائیں گے کہ امریکہ بہادر نے دہشت گردوں سے ان کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے اور وہ طالبان سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ اور امریکہ کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر کے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ طالبان کے ساتھ اس خطہ کے عوام کی ہمدردیاں بڑھ گئی ہیں اور اہل دانش پہلے سے زیادہ اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ طالبان کا دفاع کر رہے ہیں۔ پاکستان نے افغانستان کے بارے میں عالمی برادری کے نام نہاد ٹائٹل میں لپٹا ہوا امریکی ایجنڈا من وعن قبول کرنے سے معذرت کر دی ہے، ایران نے افغانستان کے ساتھ تجارت کیلئے پیش رفت کی ہے اور پاکستان کی دینی جماعتیں افغانستان اور طالبان کی حمایت میں پہلے سے زیادہ متحرک اور سرگرم ہو گئی ہیں۔

کلنٹن اور کوفی عنان کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ انہوں نے طالبان پر دیوبندی کا لیبل چسپاں کر کے پاکستان کے بہت سے دینی حلقوں کو ان سے دور رکھنے کی جو منصوبہ بندی کی تھی اور بین الاقوامی پریس کی رپورٹوں میں اسے دیوبندیوں

کی حکومت قرار دے کر طالبان کو کارنر کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بھی کامیابی کا ہدف حاصل نہیں کر سکی۔ اور طالبان کو جہاں مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق کی قومی آواز کی پشت پناہی حاصل ہے وہاں وہ مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبد الستار خان نیازی، قاضی حسین احمد، لشکر طیبہ اور علامہ ساجد نقوی کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں اور طالبان کی تحریک کو کارنر کرنے کا امریکی منصوبہ فلاپ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسٹر کلنٹن کا "حقائق نامہ" اور کوفی عنان کی یہ رپورٹ اسی غصہ کا اظہار ہے جو انہیں اپنی پالیسیوں میں ناکامی پر چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ طالبان آج بھی وہی ہیں جو روس کے خلاف جہاد کے موقع پر تھے، اس وقت بھی انہوں نے ڈاڑھیاں رکھی ہوئی تھیں، ان کی عورتیں پردے سے باہر نہیں آتی تھیں، وہ تب بھی نمازیں پڑھتے تھے، دنیا بھر سے مسلمان نوجوان جہاد کی تربیت کیلئے ان کے پاس آتے تھے، وہ اس وقت بھی اسلام کی بالادستی اور اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کرتے تھے، ان کے دل اس وقت بھی شرعی قوانین کے نفاذ کیلئے دھڑکتے تھے اور روس کے خلاف وہ جنگ بھی انہوں نے جہاد کے نام پر لڑی تھی، اس لیے آج افغانستان کے کیمپوں میں اور طالبان کے حلقوں میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی۔

وقت زیادہ نہیں گزرا، ابھی چند سال پہلے کی بات ہے اور اگر اقوامِ متحدہ کو اور امریکہ بہادر کو شوق ہے تو آئیں ہم انہیں دعوت دیتے ہیں کہ غیر جانبدار مبصرین کا ایک کمیشن مقرر کر لیں اور افغانستان میں روس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ اور اب امریکہ کی بالادستی اور اس کے گماشتوں کی مداخلت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا باہمی موازنہ کر لیں اور کوئی ایک نئی بات دکھا دیں جو اس دور میں نہیں ہوتی تھی اور اب ہوتی ہے۔ ہمیں انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس جنگ اور آج کی جنگ کے حوالے سے افغانستان کے حالات، مجاہدین کے طرزِ عمل اور کیمپوں کی صورتحال میں کوئی فرق دکھا دیں تو ہم ان کے موقف کی حمایت پر سنجیدگی سے غور کرنے کیلئے تیار ہوں گے۔

امریکہ کو شکایت ہے کہ روس کے خلاف جنگ میں اس نے افغان مجاہدین کی حمایت کی تھی اور ساتھ دیا تھا اس لیے اب افغان مجاہدین کو آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلنا چاہیے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امریکہ نے ساتھ دیا تھا لیکن امریکہ نے اپنی حمایت کا پھل وصول کر لیا ہے اور سوویت یونین کی شکست و ریخت کی صورت میں نتائج حاصل کر لیے ہیں۔ جبکہ وہ خود سارے نتائج حاصل کر کے افغان عوام کو ان کے حصے کے نتائج سے بہرہ ور ہونے کا حق نہیں دے رہا اور انہیں اپنی جدوجہد کے جائز اور منطقی ثمرات سے محروم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جسے کم از کم الفاظ میں کمینگی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ہم مسٹر کلنٹن اور کوفی عنان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ افغان عوام اور طالبان میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جب روسی استعمار کے خلاف نبرد آزما تھے اس وقت بھی ان کا واحد ہدف اپنی خود مختاری اور دینی تشخص کا تحفظ تھا اور آج جب انہیں امریکی سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے تب بھی ان کی جنگ اپنے دینی تشخص اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہے۔ تبدیلی اگر آئی ہے تو اس کا مشاہدہ کرنے کیلئے کلنٹن اور کوفی عنان کو آئینے کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے کوئی بات ان سے اوجھل نہیں رہے گی۔ اس لیے آج اگر عالم اسلام کی رائے عامہ بالخصوص جنوبی ایشیا کے مسلمان اور پاکستان کے دینی و سیاسی حلقے افغانستان کے بارے میں امریکہ اور اقوامِ متحدہ کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے موقف کو قبول نہیں کر رہے اور

منافقت کو دیکھ کر انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے تو اس میں طالبان کا کیا قصور ہے؟ یہ تو مکافاتِ عمل ہے اور منافقت کا منطقی انجام ہے جس سے امریکہ اور اقوامِ متحدہ کو اب بہرحال گزرنا ہی ہے۔

امیر امان اللہ خان اور افغانستان میں مغربی ثقافت کی ترویج

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۹ دسمبر ۱۹۹۹ء

مارچ ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خان نے اپنے والد امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد افغانستان کی بادشاہت سنبھالی تو صورتحال یہ تھی کہ اگرچہ افغانستان ایک آزاد ملک کہلاتا تھا مگر امیر حبیب اللہ خان اور ان کے والد امیر عبد الرحمٰن کے برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدوں کی بدولت پالیسیوں پر انگریزوں کا ریموٹ کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ ان معاملات کے تحت نہ صرف چترال، وزیرستان، خیبر، چاغی، چمن، پشین، پاراچنار، اور کرم کے علاقے انگریزوں کے حوالہ کر دیے گئے تھے بلکہ ۱۹۰۵ء میں کیے جانے والے ایک معاہدہ کی رو سے امیر حبیب اللہ خان نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کے عوض افغانستان کے خارجہ معاملات کا کنٹرول بھی انگریزوں کی تحویل میں دے رکھا تھا۔

امیر امان اللہ خان نے بادشاہت سنبھالتے ہی افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جس میں افغان قوم نے اپنے حکمران کا بھرپور ساتھ دیا اور بالآخر مختلف جھڑپوں اور محاذ آرائی کے بعد برطانوی حکومت نے ۱۸ اگست ۱۹۱۹ء کو افغانستان کی آزادی کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کامیابی کے بعد امیر امان اللہ خان نے ملک کے نظام کی اصلاح اور دستوری ماحول قائم کرنے کی طرف توجہ دی اور متعدّد اصلاحات نافذ کیں جو افغان قوم کو ہضم نہ ہو سکیں اور جنوری ۱۹۲۹ء میں ایک تاجک سردار بچہ سقہ نے، جسے پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے تاجک ڈاکو لکھا ہے، کابل پر قبضہ کر کے امان اللہ خان کو اقتدار سے محروم کر دیا اور وہ اقتدار کے دوبارہ حصول کی ایک کوشش میں ناکامی کے بعد اٹلی چلے گئے۔

امیر امان اللہ خان جس وقت افغانستان میں یہ اصلاحات نافذ کر رہے تھے اس وقت ایک ہندوستانی دانشور عزیز ہندی بھی وہاں موجود تھے جو ۱۹۱۸ء میں ہجرت کر کے کابل گئے تھے۔ وہ وہاں دس سال قیام کے بعد وطن واپس آئے، انہوں نے امان اللہ خان کے دور حکومت اور اصلاحات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور ان مشاہدات پر مشتمل ساڑھے چار سو صفحات کی ایک کتاب ”زوالِ غازی امان اللہ خان“ کے نام سے لکھ کر انہیں تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ عزیز ہندی وطن واپسی کے بعد بغاوت کے الزام میں گرفتار ہو گئے تھے اور انہوں نے یہ کتاب سنٹرل جیل ملتان میں لکھی جو ۱۹۳۳ء میں ان کی رہائی کے بعد ثنائی برقی پریس امرتسر سے شائع ہوئی۔

امیر امان اللہ خان افغانستان میں سیاسی اور ثقافتی انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس کیلئے انہوں نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے جدید کلچر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یورپی ثقافت کو افغانستان میں طاقت کے زور پر رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عزیز ہندی کے بقول امان اللہ خان نے سردار محمود خان یاور کے ذمہ لگا رکھا تھا کہ وہ ان کے واپس

آنے تک افغانستان میں رائے عامہ کو ثقافتی انقلاب کیلئے ہموار کرنے کی کوشش کریں اور خاص طور پر آزاد خیالی اور برہنہ روئی کا پرچار کریں۔ برہنہ روئی کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتوں کیلئے پردہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ چہرے کے پردے کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ مگر امیر امان اللہ خان کی وطن واپسی پر جب محمود خان یاور نے انہیں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنا چاہی تو انہوں نے کہا کہ "بس بس محمود جان رہنے دو یہ باتیں اس طرح حاصل نہیں ہوسکتیں، مصطفیٰ کمال نے مجھے کہا ہے کہ انہیں محض سنگین کی نوک سے رائج کیا جاسکتا ہے اور میں اب انہیں بہ نوک سنگین رائج کرکے رہوں گا۔"

عزیز ہندی نے امیر امان اللہ خان کے ترکی کے دورہ اور جمہوریہ ترکیہ کے بانی و صدر مصطفیٰ کمال اتاترک کے ساتھ ان کی ملاقات و گفتگو کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور وہ مکالمہ بھی اپنے الفاظ میں نقل کر دیا ہے جو ان کے بقول اس ملاقات میں دونوں لیڈروں کے درمیان ہوا تھا۔

- مصطفیٰ کمال اتاترک نے امیر امان اللہ خان سے کہا کہ وہ جس طرح کی اصلاحات نافذ کرنا چاہتے ہیں اس کیلئے ضروری ہے کہ انہیں عوام میں حد درجہ کی مقبولیت حاصل ہو تاکہ کوئی طبقہ اصلاحات کی راہ میں مزاحمت کی جرأت نہ کرسکے۔ امان اللہ خان نے اس کے جواب میں کہا کہ ملانے (علماء) اگرچہ طاقتور گروہ ہیں مگر اب وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ مزاحمت کرسکیں۔
- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اگر اصلاحات کے نتیجہ میں بغاوت ہوگئی تو اسے کچلنے کیلئے فوج کا مکمل طور پر وفادار ہونا ضروری ہے۔ امان اللہ خان نے جواب دیا کہ میری فوج پوری طرح وفادار ہے اور ہر طرح کی بغاوت کو کچلنے کیلئے میرے ساتھ ہوگی۔
- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اگر کسی جگہ بغاوت ہوگئی تو محصولات کی وصولی میں رکاوٹ ہوگی، جنگ کی وجہ سے راستے مخدوش ہوجائیں گے جس سے تجارت کمزور پڑ جائے گی اور آمدنی کم ہوجائے گی، اس لیے مالی حالات کا مستحکم ہونا ضروری ہے تاکہ صورتحال کنٹرول میں رہے۔ امان اللہ خان نے کہا کہ ان کی مالی حالت پوری طرح مستحکم ہے اور بوقت ضرورت ان کے دوست ان کی مدد کریں گے۔
- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اندرونی شورش اور بغاوت کی صورت میں بین الاقوامی حمایت اور تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ امان اللہ خان نے جواب دیا کہ انگریزوں اور روس دونوں کے ساتھ ان کے معاملات موجود ہیں جو اپنے معاملات کی پاسداری کریں گے اور ضرورت پڑنے پر مالی مدد بھی مل سکتی ہے۔

اس طرح کی تفصیلی گفتگو کے بعد مصطفیٰ کمال نے امان اللہ خان سے جو آخری بات کی اسے عزیز ہندی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ

- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ ترکیہ میں اصلاحات کو کبھی خوش آمدید نہیں کہا گیا بلکہ ہم نے بہ نوک سنگین ان کو رائج کیا

ہے۔کسی ملک کے باشندے اپنے پرانے عقائد و خیالات اور رسم و رواج کی پابندیوں کو از خود خیرباد نہیں کہا کرتے تاآنکہ حکومت وقت ان کے برعلیہ جبر و قوت کو استعمال نہ کرے۔

مصطفی کمال سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد امان اللہ خان واپس افغانستان پہنچے تو ان کی ذہنی حالت یہ ہو چکی تھی کہ وزارت خارجہ کے ہال میں علماء کرام کا ایک وفد ان کی پذیرائی اور ملاقات کیلئے آیا مگر امیر امان اللہ خان نے سابقہ دستور اور اسلامی طریقہ کے مطابق ان سے سلام اور مصافحہ کرنے کی بجائے ہیٹ اتار کر یورپی طریقہ سے ان کے سلام کا جواب دیا اور ایک ہاتھ سے ہر ایک کے ساتھ خشک مصافحہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔اسی مجلس میں ایک بڑے عالم ''ملا صاحب چکنور'' کے ہاتھ میں موٹے دانوں کی تسبیح دیکھ کر امان اللہ خان نے کہا کہ ''یہ کیا اونٹ کی لیڈنیوں سے کھیل رہے ہو؟''کسی مصاحب نے تھوڑی دیر کے بعد ملا صاحب چکنور کی بزرگی اور مقام کی طرف توجہ دلائی تو بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ ''کوئی سار یچھ بھی ہو میں ان سب کو جلد انسان بنا دوں گا۔''

اس فضا میں امان اللہ خان نے اس ثقافتی انقلاب کا آغاز کیا جسے ''۱۹۲۸ء کا انقلاب افغانستان''کہا جاتا ہے اور اس کی شروعات جن اصلاحات سے ہوئی ان میں مردوں کیلئے مغربی لباس کے استعمال کی پابندی، ایک سے زیادہ نکاح کی قانونی ممانعت، اور پردہ کے قانونی خاتمہ کے قوانین شامل تھے جن کیلئے محلوں میں نگران مقرر کیے گئے کہ کوئی عورت برقع پہن کر گھر سے باہر نہ نکلے۔اور سڑکوں پر پولیس کھڑی کر دی گئی جو ہر اس گزرنے والے سے جرمانہ وصول کرتی تھی جس نے یورپی لباس نہ پہن رکھا ہو۔ادھر گھر کی حالت یہ تھی کہ عزیز ہندی کے بقول ایک روز کسی خادمہ سے قرآن کریم کے کچھ اوراق گر گئے جو اس نے اٹھا کر چومنا شروع کر دیے تو بادشاہ بیگم نے اسے ٹوکا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے کہا کہ یہ کلام پاک ہے۔اس پر بادشاہ بیگم نے کہا کہ اس سے بڑھ کر بھی کتابیں لکھی جائیں گی اس لیے ان عقائد کو تہہ کر کے رکھ دو اور آدمیت سیکھو۔

اس پس منظر میں امیر امان اللہ خان نے افغانستان میں جس ثقافتی انقلاب کی طرف پیش رفت کرنا چاہی اس کا نتیجہ ''بچہ سقہ''کی صورت میں ہی نمودار ہونا تھا کہ یہ فطری عمل ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔اس لیے اگر آج بھی کسی کے دماغ میں کسی مسلم معاشرہ میں یورپی ثقافت کو بہ نوک سنگین رائج کرنے کا اور ویسٹرن کلچر کو فروغ دینے کا خیال کلبلا رہا ہو تو اسے ''بچہ سقہ''کا یہ کردار اپنے سامنے ضرور رکھنا چاہیے کیونکہ ترکی کے ایک تجربہ کے بعد دنیا کا کوئی اور مسلم ملک اس راستہ پر چلنے کیلئے آج تک تیار ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔

افغان طالبان کے خلاف پابندیاں: عالمی استعمار کی نئی صف بندی

ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد --- ۵ جنوری ۲۰۰۰ء

اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف نئی پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے اور ان پابندیوں سے براہ راست متاثر ہونے والے پاکستان کے سوا کسی مسلمان ملک کو اس پر رسمی احتجاج کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ سلامتی کونسل میں موجود ملائیشیا نے بھی ایک برادر مسلم ملک کے حق میں کلمہ خیر کہنے کی بجائے اس اجلاس سے غیر حاضری کو ترجیح دی ہے جس میں طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف اقتصادی پابندیوں کی قرارداد منظور کی گئی ہے۔ اس سے افغانستان کی اسلامی حکومت یا بالفاظ دیگر عالمی نقشہ پر نمودار ہونے والی واحد اسلامی نظریاتی ریاست کے خلاف عالمی صف بندی کی کیفیت دیکھی جا سکتی ہے اور یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ خالص اور عملی اسلامی نظام کو روکنے اور ناکام بنانے کیلئے صرف امریکہ اور روس ہی متحد نہیں ہوئے بلکہ نام نہاد مسلم حکومتوں نے بھی اپنا وزن انہی کے پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

جہاں تک اقتصادی پابندیوں اور معاشی ناکہ بندی کا تعلق ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جس نظام اور فلسفۂ فکر کی خاطر طالبان اس ظلم کا شکار ہو رہے ہیں اور جس دین کا پرچم اٹھانے کی پاداش میں انہیں بھوک اور افلاس میں ہوشربا اضافے کی اس دلدل میں دھکیلا جا رہا ہے اس کا آغاز بھی آج سے چودہ سو برس قبل انہی حالات میں اور اسی قسم کی کیفیات میں ہوا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ ایک بار پھر پیچھے مڑ کر اس مقام پر جا کھڑی ہوئی ہے جب مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے ساتویں سال قریش کے قبائل نے آپؐ کے خاندان بنو ہاشم کا اقتصادی بائیکاٹ کر دیا تھا اور بنو ہاشم شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبیؐ" میں اس اقتصادی بائیکاٹ اور محاصرہ و ناکہ بندی کی تفصیلات بیان کی ہیں جن کے مطابق تمام قبائل نے اس قرارداد پر اتفاق کر لیا تھا کہ

> "کوئی شخص نہ خاندانِ ہاشم سے قرابت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیلئے حوالے نہ کر دیں"۔

طالبان حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی قرارداد کا مطالعہ کر لیں آپ کو بھی میری طرح یہی محسوس ہوگا کہ یہ قرارداد چودہ سو سال کی اسی قرارداد کی نقل و تشریح ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے قبائل نے طے کی تھی اور اس کی اہمیت بڑھانے کیلئے اسے بیت اللہ شریف کے دروازے پر لٹکا دیا گیا تھا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ

"تین سال تک بنوہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ للح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں صحابہؓ سے مذکور ہے کہ ہم للح کے پتے کھا کھا کر بسر کرتے تھے یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے چنانچہ سہیلیؒ نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔"

تین سال تک مسلسل ان مصائب اور تکالیف کے باوجود جب جناب نبی اکرمؐ کی دعوت میں کوئی فرق نہ آیا اور اس کا دائرہ تنگ ہونے کی بجائے وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے بزرگ بھی باہر سے آکر اس دور میں مسلمان ہوئے اور کھلے بندوں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو پابندیوں اور ناکہ بندی کی ناکامی دیکھتے ہوئے خود قریش ہی کے کچھ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے اس معاہدہ کو چاک کر دیا۔

طالبان بھی اسی اسلام کے علمبردار اور حضرت محمدؐ کے پیروکار ہیں اور اسی اسلام کو انسانی معاشرہ میں از سرنو نافذ و جاری کرنے کے داعی ہیں، اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ اگر وہ اپنے عزم پر قائم رہے اور جیسا کہ امارت اسلامی افغانستان کے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ تعالیٰ نے ان پابندیوں کو مسترد کرنے، عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہ کرنے، اور نفاذ اسلام کا عمل جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے، انہوں نے تکالیف اور اذیتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا تو ان کے خلاف عائد کی جانے والی یہ پابندیاں بھی اسی طرح ناکام ہو جائیں گی جیسے قریش کا معاہدہ بنوہاشم کے خلاف فیل ہو گیا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے، یہ درست ہے کہ پاکستان کے اکثر دینی حلقوں اور سرکردہ زعماء نے طالبان حکومت کے خلاف ان پابندیوں کی مذمت کرتے ہوئے طالبان کے ساتھ ہمدردی، یک جہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے جو بہت خوش آئند ہے۔ مگر صرف اتنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے سنجیدہ عملی محنت کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے خیال میں مندرجہ ذیل صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

1. امارت اسلامی افغانستان کی مالی معاونت کیلئے باقاعدہ مہم منظم کی جائے اور کوشش کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ احباب کو توجہ دلا کر سفارت خانہ امارت اسلامی افغانستان ہاؤس نمبر ۸ اسٹریٹ ۹۰ جی ۶/۳ اسلام آباد کے ذریعے امدادی رقم یا سامان بھجوانے کا اہتمام کیا جائے۔
2. امارت اسلامی افغانستان کی حمایت اور امریکی عزائم کی مذمت کیلئے رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور دینی جماعتیں اس سلسلہ میں مشترکہ جدوجہد کی طرف پیشرفت کریں۔
3. تاجروں اور صنعتکاروں کو افغانستان میں تجارت اور سرمایہ کاری کی ترغیب دی جائے اور اس مقصد کیلئے فوری اور ہنگامی بنیادوں پر کام کیا جائے۔

4. مسلم حکومتوں اور اسلام آباد میں ان کے سفارت خانوں کو خطوط، وفود اور یادداشتوں کے ذریعے ان کی بے حسی کی طرف توجہ دلائی جائے اور ان کی غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے۔

5. امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے اور عوام کو اس کیلئے تیار کیا جائے۔

بھارتی طیارے کا اغوا اور طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۹ جنوری ۲۰۰۰ء

بھارتی طیارے کے اغوا کے باقی پہلوؤں سے قطع نظر اب تک کے حالات میں جو دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوئی ہیں ان میں ایک مسئلہ کشمیر کی نزاکت اور سنگینی کا پہلو ہے جس نے دنیا بھر کو ایک بار پھر اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ اس مسئلہ کو اس خطہ کے عوام کی خواہش کے مطابق حل نہ کیا گیا تو جنوبی ایشیا میں امن کا قیام کبھی نہیں ہو سکے گا اور آزادیٔ کشمیر کی تحریک بھی آگے بڑھنے کے معروف راستوں کو مقیّد پا کر دیگر تحریکات آزادی کی طرح کوئی نیا رخ اختیار کر سکتی ہے۔

دوسرا پہلو امارت اسلامی افغانستان کی حکمران جماعت ”طالبان“ کی معاملہ فہمی اور تدبر و حوصلہ کا ہے جس نے دنیا کو پہلی بار اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور طالبان کو محض ایک خونریز اور جنگجو قوت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے والوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے ان نوجوانوں نے صرف ہاتھوں میں کلاشنکوف ہی نہیں اٹھا رکھی بلکہ ان کے سینوں میں انسانیت کیلئے دھڑکنے والے دل اور کھوپڑیوں میں انسانیت کے مفاد میں سوچنے والے دماغ بھی موجود ہیں۔ اور وہ جہاں میدان جنگ میں دشمن کو ناکوں چنے چبوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہاں مشکل سے مشکل حالات میں انسانی جانوں کے تحفظ اور امن کو یقینی بنانے کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ چنانچہ برطانوی اخبار ”گارجین“ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

> ”بھارتی طیارے کی ہائی جیکنگ کے معاملہ سے نبرد آزما ہونے کے طریق کار اور طرز عمل سے طالبان عالمی ہیرو بن گئے ہیں اور محض چھ ہفتے قبل اسامہ کی حوالگی سے انکار، منشیات کی سمگلنگ اور دہشت گردی کے حوالے سے پوری دنیا کے لعن طعن کا نشانہ بننے والے طالبان اب بہت بہتر حالات میں ہیں اور طالبان حکومت تسلیم نہ کرنے والا بھارت بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ طالبان انتہائی تعمیری کردار ادا کر رہے ہیں۔“

بھارت نے جب اپنے اغوا شدہ طیارے کو اپنے ہی شہر امرتسر کے ایئرپورٹ سے دوبارہ پرواز کا موقع دیا تو بھارتی حکمرانوں کا خیال تھا کہ یہ طیارہ لازماً پاکستان ہی کے کسی ایئرپورٹ پر اترے گا لیکن طیارہ جب قندھار ایئرپورٹ پر اترا تو بھارت کے ساتھ اور بھی بہت سی قوتوں اور لابیوں کے منہ میں پانی بھر آیا کہ اب تو ایک تیر سے دو شکار ہوں گے، طالبان

ان معاملات میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہائی جیکنگ کے جال میں پھنس جائیں گے اور انہیں پاکستان کے ساتھ نتھی کر کے پاکستان اور طالبان کو دنیا بھر میں "میڈیاوار" کا نشانہ بنایا جاسکے گا۔ مگر طالبان کی اسلامی حکومت نے جس ہوش مندی اور تدبر کا مظاہرہ کیا اس نے پوری دنیا کو حیران و ششدر کر دیا ہے۔

گذشتہ شب برطانیہ کے شہر ٹونگھم کے پاکستان سنٹر میں تراویح میں قران کریم مکمل ہونے پر ایک تقریب تھی جس میں راقم الحروف کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ مجھ سے پہلے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے عالمی جماعت اہل سنت کے سربراہ مولانا ضیاء الحق سیاکھوی نے اس صورتحال پر دلچسپ تبصرہ کیا جو اس حوالے سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا بار بار خیال آتا تھا کہ طالبان کے خلاف دنیا بھر کے جدید ذرائع ابلاغ جس طرح مسلسل پراپیگنڈا کر رہے ہیں اس کا توڑ کرنے کیلئے طالبان کو بھی ابلاغ کے ان جدید ذرائع کو استعمال میں لانا چاہیے، اور طالبان کے ایسا نہ کرنے پر بہت سے دوسرے دوستوں کی طرح انہیں بھی غصہ آتا تھا، مگر طالبان کی اسلامی حکومت ان ذرائع کو اختیار کرنے سے مسلسل گریزاں رہی جس پر اللہ تعالیٰ نے غیب سے یہ انتظام کر دیا کہ بھارتی طیارے کے اس اغوا کے باعث دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ قندھار پر رہی اور ایک ہفتہ تک مسلسل دنیا کے لوگ طالبان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے کہ وہ کس سادگی اور حوصلہ کے ساتھ حالات کو برداشت کر رہے ہیں اور کس تدبر اور سنجیدگی کے ساتھ ہائی جیکنگ جیسے سنگین معاملہ سے نمٹ رہے ہیں اور اس طرح وہی ذرائع ابلاغ جو اس سے قبل طالبان کو صرف ایک جنگجو اور لڑاکا گروپ کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں انہی ذرائع ابلاغ نے دنیا کو طالبان کی امن پسندی، انسان دوستی اور مہمان نوازی کا یہ روپ بھی دکھا دیا ہے جس سے ان کے خلاف شکوک و شبہات کم ہوں گے۔

ہائی جیکنگ اپنی تمام تر سنگینی اور قابل نفرت ہونے کے باوجود ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی اس کے نقصانات اور تباہ کاری کا دائرہ ایٹم بم سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن ایٹم بم کو ایک جدید ترین ہتھیار کے طور پر امن کا ضامن سمجھا جاتا ہے اور امن کی گارنٹی کیلئے بہت سے ممالک نے اس کی تیاری اور تنصیب کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اس لیے اگر حریت پسندوں نے ریاست میں بھارتی افواج کے وحشیانہ جبر و تشدد اور اس پر عالمی قوتوں کی مسلسل بے حسی اور بے توجہی کے خلاف احتجاج کے طور پر ہائی جیکنگ جیسے سنگین جرم کا راستہ اختیار کیا ہے تو اسے ان کی مجبوری، بے بسی اور لاچاری پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اور قوموں کی آزادی کی تحریکات میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے جس کا اظہار ایک اخباری رپورٹ کے مطابق بھارتی طیارہ اغوا کرنے والے ہائی جیکروں نے کیا ہے اور جہاز سے نیچے اترنے سے قبل تمام یرغمالی مسافروں سے اس عرصہ کے دوران ہونے والی زحمت پر معذرت طلب کی اور کہا کہ "ہم مجبور تھے کیونکہ یہ ہماری جدوجہد آزادی کا مسئلہ تھا۔"

بہرحال بھارتی طیارے کے اغوا سے یرغمالی مسافروں کی رہائی تک اس ساری صورتحال کے چند پہلو ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنے ہیں، وہ یہ ہیں کہ طیارے کے سینکڑوں مسافر جان کی سلامتی اور امن کے ساتھ گھروں میں پہنچ گئے ہیں اور مولانا مسعود اظہر، عمر سعید شیخ اور مشتاق احمد زرگر کو سالہا سال کی بھارتی قید سے رہائی مل گئی ہے۔

صوبہ سرحد اور افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ جنوری ۲۰۰۰ء

تیسری گزارش یہ ہے کہ یہ بات عام ذہنوں میں الجھن کا باعث بنی ہوئی ہے کہ پاکستان تو ایک ملک ہے، یہاں ایک روز متفقہ عید کیوں نہیں ہوتی؟ جبکہ مرکزی سطح پر رؤیت ہلال کمیٹی بھی قائم ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام موجود ہیں اور انہی کے فیصلے پر چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلے کی پرواہ نہیں کی جاتی اور عام طور پر ایک روز قبل عید منائی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کا تھوڑا سا پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے اس علاقہ کے لوگ جہاں زیادہ تر پشتون آباد ہیں اپنے آپ کو کلچر اور ثقافت کے لحاظ سے افغانستان کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اور اپنی روایات و اقدار میں اپنے افغان بھائیوں کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ افغانستان میں ہمیشہ سے ایک روز پہلے عید ہوتی ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ وہاں کی غالب اکثریت حنفی ہے اور وہ احناف کے اصول کے مطابق اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سعودی عرب میں رؤیت ہلال کے اعلان پر عید کر لیتے ہیں، یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ افغانستان کی مغربی سرحد کا پاکستان کے ساتھ وقت کا اتنا فرق موجود ہے کہ پاکستان میں نظر نہ آنے والا چاند افغانستان کے مغربی حصے میں اسی روز نظر آ سکتا ہے، اس لیے وہ ایک روز پہلے چاند دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے جب افغانستان میں عید ہو جاتی ہے تو افغانستان کی سرحد سے ملنے والے پاکستانی علاقوں میں عید نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جہادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی، قرآن کا حکم

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۳ جنوری ۲۰۰۰ء

ایک قومی اخبار کے لاہور ایڈیشن کی رپورٹ کے مطابق چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے ساتھ ملاقات کے دوران ان پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکا تھا۔ مذکورہ رپورٹ میں اعلیٰ عسکری ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتا دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرمِ عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جا سکتا۔

اس سے قبل یہ خبریں قومی پریس کے ذریعے سامنے آ چکی ہیں کہ امریکی سینٹروں نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ

ملاقاتوں میں جن امور پر زور دیا ہے ان میں سی ٹی بی ٹی (Comprehensive Test Ban Treaty) پر دستخط کرنے، حرکۃ المجاہدین اور دیگر جہادی تنظیموں پر پابندی لگانے، مولانا مسعود اظہر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے، ان کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں مقدمہ درج کرنے، اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں تعاون کرنے کے تقاضے بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جنرل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے کہ وہ جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جہاد اور جہادی تنظیمیں صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کا دائرہ پورے عالمِ اسلام تک پھیلا ہوا ہے اور جہاد کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے اسے لیے اسے روکنا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی قوتوں کیلئے پریشانی کی اصل بات بھی یہی ہے کہ جہاد کا دائرہ پوری دنیا میں وسیع ہوتا جا رہا ہے، ورنہ جب تک جہاد کا یہ عمل صرف افغانستان تک محدود تھا اور اس کی زد صرف روس پر پڑ رہی تھی اس وقت تک مغربی ملکوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس سے خوش تھے اور جہادی تنظیموں کی حمایت و امداد میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد افغانستان کی مجاہد تنظیمیں شاید امریکہ کے سامنے اظہار تشکر میں سجدہ ریز ہو جائیں گی اور امریکہ بہادر آسانی کے ساتھ انہیں کچھ اور تھپکی دے کر سنکیانگ میں چین کے خلاف صف آرا کر دے گا۔ مگر ان مجاہدین تنظیموں نے چین کی طرف رخ کرنے کی بجائے پہلے خود امریکہ سے نمٹ لینا زیادہ ضروری سمجھا اور نہ صرف یہ کہ فلسطین، کشمیر، صومالیہ، بوسنیا، کسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور اب انڈونیشیا میں جہاد کا چرچا ہونے لگا۔ بلکہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کی موجودگی ان مجاہدین کو زیادہ کھٹکنے لگی اور مختلف مسلم ممالک سے جہاد افغانستان میں شرکت کیلئے آنے والے نوجوانوں نے اپنے اپنے ملکوں کی مغرب نواز اور امریکہ پرست حکومتوں کیلئے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں تو امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ مجاہدین توفی الواقع جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔ اسی جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کیلئے برطانوی استعمار کو مرزا غلام احمد قادیانی اور زار شاہی روس کو محمد علی باب اور بہاء اللہ شیرازی جیسے جھوٹے نبی کھڑے کرنا پڑے تھے اور جس جہاد سے جان چھڑانے کیلئے ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کا تیاپانچہ کیا گیا تھا۔

امریکہ بہادر کو یہ بات بھی تکلیف دے رہی ہے کہ جن مجاہدین کو روس کے خلاف اسلحہ خود اس نے فراہم کیا تھا اور ان میں سے بہت سے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دی تھی وہی مجاہدین اب خود امریکہ کے سامنے کھڑے ہیں اور پوری دنیا میں اس کیلئے چیلنج کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب امریکہ جہاد کی آواز کو دنیا سے ختم کرنا چاہتا ہے، مجاہدین کے عالمی نیٹ ورک کو توڑنے کے درپے ہے اور جہادی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں بدنام کرنے اور مسلم ممالک کی ریاستی قوت کے ذریعے انہیں کچلنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھا ہے۔ مگر اب وقت گزر چکا ہے کیونکہ جہادی تحریکات نے پوری دنیا میں وسیع نیٹ ورک قائم کر لیا ہے اور ان کی جڑیں مسلمان عام میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ انہیں ختم کرنے کی امریکی خواہش حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ مغرب استعمار کیلئے اب دانت پیسنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔

اس لیے ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو جہادی تحریکات کے بارے میں ملتِ اسلامیہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے اور امریکی سینٹروں کو معروضی حقائق سے آگاہ کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جنرل صاحب! یہ سی ٹی بی ٹی کا چکر بھی اسی ایجنڈے کا حصہ ہے اور امریکی خواہشات اور مطالبات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو جہادی تحریکات پر پابندی لگانے اور ایٹمی پروگرام پر بین الاقوامی کنٹرول قبول کرنے کے ان دونوں مطالبات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تقاضوں کی عِلت اور پس منظر ایک ہی ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے کہ عالمِ اسلام اس قابل نہ رہے کہ وہ بھارت اور اسرائیل جیسی مسلمان دشمن طاقتوں کیلئے خطرہ بن سکے، تاکہ خلیج عرب میں اسرائیل کی بالادستی اور جنوبی ایشیا میں بھارت کی تھانیداری قائم کرنے کا منصوبہ کسی رکاوٹ کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور مسلم دنیا کو ایک بار پھر صدیوں کی غلامی کے نئے شکنجے میں جکڑا جا سکے۔ امریکہ بھارت کو ایٹمی طاقت تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے اور اسرائیل کے پاس ایٹم بموں کی موجودگی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر پاکستان کا ایٹمی قوت ہونا اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے، اور وہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک کو اسلام، جہاد اور ایٹمی قوت تینوں سے محروم کر دینے کیلئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے اور اسی لیے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کیلئے پاکستان پر مسلسل دباؤ بڑھایا جا رہا ہے۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حامی عناصر کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاہدے پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس کے عوض ملک کو بہت سی مراعات حاصل ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ جب ایٹمی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو بہت سی مراعات آخر کس چیز کے عوض حاصل ہوں گی؟ اور مغرب کا یہودی ساہوکار ہم پر کس لیے اتنا مہربان ہو رہا ہے کہ کوئی معاوضہ وصول کیے بغیر وہ ہمیں مراعات سے مالامال کر دینا چاہتا ہے؟ ہمیں جن اقتصادی سہولتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے اور جس معاشی خوشحالی کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں آخر وہ کس چیز کے بدلے میں ہیں؟ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑنے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے دانشور اگر اس گتھی کو سلجھا سکیں اور مغرب کے یہودی سرمایہ کاروں کی ہم پر متوقع بے تحاشا نوازشات کی وجہ بتا سکیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینے کی حمایت میں یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ دستخط کر دینے کا مطلب ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا نہیں بلکہ مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے، جبکہ ہم اس وقت اتنی ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں کہ ہمیں اس میں مزید پیشرفت کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اگر اپنے ایٹمی پروگرام پر سی ٹی بی ٹی کے ذریعے بین الاقوامی کنٹرول قبول کر لیتے ہیں اور خود کو ایک معاہدہ کا پابند کر لیتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بین الاقوامی کنٹرول کی کنٹرولنگ اتھارٹی آئندہ ہمیں اس ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کیلئے کبھی نہیں کہے گی؟ آخر اس معاملہ میں کنٹرولنگ اتھارٹی خود ہم تو نہیں ہیں بلکہ یہ پوزیشن انہی بین الاقوامی اداروں اور قوتوں کو حاصل ہے جو نصف صدی سے ہمارے خلاف بھارت اور اسرائیل کو ہر طرح سپورٹ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ہماری کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان قوتوں اور اداروں کو ہم گذشتہ پچاس برس سے دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں اس لیے ان کی کسی بات اور کسی وعدے پر

بھروسہ آخر کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

چنانچہ ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کریں گے کہ جس طرح انہوں نے جہاد اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی سینٹروں کے سامنے اپنے ایمانی جذبات اور پاکستانی عوام کے دلی احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اسی طرح ایٹمی پروگرام اور سی ٹی بی ٹی کے بارے میں بھی اپنے ملک کے غیور عوام کے جذبات سے امریکہ اور دیگر عالمی قوتوں کو پورے حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگاہ کر دیں۔ اور پھر یہ مسئلہ صرف جذبات واحساسات کا ہی نہیں بلکہ ہمارے عقیدہ وایمان کا بھی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف جنگی قوت حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کی حد بھی بیان کی ہے ترھبون به عدو الله وعدوکم (الانفال) کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو یعنی مقابلہ میں طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے جب تک ایٹمی توانائی اور جدید ترین جنگی قوت کے حوالے سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طاقت کے تناسب میں توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا اور مسلم ممالک ترھبون به عدو الله کی پوزیشن میں نہیں آجاتے، ایٹمی قوت میں کسی پیشرفت پر پابندی قبول کرنا قرآن کریم کی منشا اور حکم کے خلاف ہے، وہی قرآن کریم جسے ہاتھ میں لے کر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے لاکھوں مسلمانوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا دستور یہ قرآن ہوگا اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور دستور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے جنرل صاحب سے یہ استدعا ہے کہ جہاد اور جہادی تحریکات کی طرح جہادی قوت کے بارے میں بھی قرآن کریم کے حکم اور مسلمانوں کے دینی وملی جذبات سے مغربی قوتوں کو دوٹوک طور پر آگاہ کر دیں کہ ملک اور قوم دونوں کا مفاد اسی میں ہے۔

امریکی ایجنڈا اور جنرل پرویز مشرف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۰ء

امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر انڈر فرتھ گذشتہ دنوں اسلام آباد آئے اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف اور دیگر مقتدر شخصیات سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے انتباہ کیا کہ پاکستان کو اپنی سرحدی حدود میں کام کرنے والے انتہا پسند اسلامی گروپوں پر پابندی عائد کرنا ہوگی جو بین الاقوامی برادری کیلئے بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مسٹر انڈر فرتھ نے کہا کہ حرکۃ المجاہدین سمیت بہت سے مسلح اسلامی گروپ دہشت گردی کر رہے ہیں اس لیے ان پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی امریکی سینٹروں کے وفد کے حالیہ دورۂ پاکستان کے اختتام پر وفد کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کیلئے پانچ شرائط پیش کی گئی ہیں۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی وفد کی پیش کردہ شرائط یہ ہیں:

- دہشت گردی اور مذہبی بنیاد پرستی کا ازالہ۔
- جمہوریت کی بحالی کیلئے طریقہ کار اور ٹائم فریم ورک۔

- ایسی وسیع تر اقتصادی اصلاحات جن میں جمہوری اصلاحات جڑ پکڑ سکیں۔
- سی ٹی بی ٹی پر دستخط اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی کیلئے عالمی کوششوں میں تعاون۔
- اور اپنے تمام شہریوں کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی آزادیوں کو یقینی بنانا۔

جہاں تک امریکی مطالبات اور شرائط کا تعلق ہے یہ نئی نہیں ہیں بلکہ ایک عرصہ سے یہ شرائط الفاظ اور عنوان کی تبدیلیوں کے ساتھ بار بار سامنے آرہی ہیں اور امریکی حکومت ان شرائط کی تکمیل کیلئے حکومت پاکستان پر مسلسل دباؤ جاری رکھے ہوئے ہے۔ مگر امریکی صدر مسٹر بل کلنٹن کے مجوزہ دورۂ بھارت سے قبل اس سلسلہ میں کسی حتمی فیصلہ کیلئے پاکستان پر زور دیا جارہا ہے تاکہ مسٹر کلنٹن بھارت کے ساتھ پاکستان کا دورہ بھی کر سکیں اور امریکہ کی منصوبہ بندی میں جنوبی ایشیا اور کشمیر کے حوالے سے جو پروگرام پہلے سے طے شدہ ہے وہ اس کے آغاز کا اعلان کر سکیں۔

امریکہ کی مجبوری یہ ہے کہ جہاد کے جس عمل اور مجاہدین کے جن گروپوں کو اس نے اپنے روایتی حریف سوویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد آزادی میں سپورٹ کیا تھا اور مالی، عسکری اور تربیتی امداد مہیا کی تھی، امریکہ نے ان سے یہ توقع بھی وابستہ کر لی تھی کہ مجاہدین کی یہ تنظیمیں سوویت یونین کے خاتمہ اور روس کی شکست کے بعد امریکہ کی احسان مند رہیں گی اور امریکہ آئندہ بھی انہیں اپنے مقاصد اور پروگرام کیلئے حسب منشا استعمال کر سکے گا۔ مگر جہاں افغانستان میں امریکی امداد حاصل کرنے والے افغان گروپوں کے ہاتھ سے وہاں کا اقتدار نکل گیا اور طالبان کے نام سے ایک نئی قوت نے افغانستان کا کنٹرول حاصل کر کے امریکی ایجنڈے کیلئے آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا وہاں مجاہدین کی تنظیموں نے بھی اپنی سرگرمیوں کیلئے نئے محاذوں کا انتخاب کیا اور امریکی اشاروں کی پروا کیے بغیر کشمیر، فلسطین، بوسنیا، صومالیہ، کسووو اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کیلئے سرگرم ہوگئیں۔ امریکہ کی خواہش تھی کہ طالبان اور جہادی تنظیمیں سنکیانگ میں وہاں کے مسلمانوں کیلئے جہاد آزادی کا میدان گرم کر کے چین کو بھی سوویت یونین کی طرح شکست دینے کے امریکی پروگرام کا حصہ بنیں مگر ان مجاہدین کی ترجیحات میں خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی، کشمیر کی آزادی، بوسنیا، کسووو اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد اور فلسطین کی حقیقی آزادی جیسے معاملات زیادہ ضروری اور مقدم قرار پائے جس سے امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر اور اس کی عالم اسلام پر بالادستی کا منصوبہ فلاپ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ چنانچہ اسی غصہ میں امریکہ بہادر ان جہادی تحریکات کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں ختم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جن کی وہ خود روسی استعمار کے خلاف حمایت و امداد کرتا رہا ہے۔ اور امریکی نائب وزیر خارجہ اور سینٹروں کے حالیہ دورۂ پاکستان کا پس منظر بھی یہی ہے مگر چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے وفد کو ملاقات کے دوران جو جواب دیا ہے وہ ہمارے نزدیک پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اور معروضی حالات میں ایک غیور حکمران کی حیثیت سے انہیں یہی جواب دینا چاہیے تھا۔ چنانچہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۷جنوری ۲۰۰۰ء کے مطابق:

> ”چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے وفد کو دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے جیسے روس کے

خلاف جہاد کو نہیں روکا جاسکا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع نے "جنگ" کو بتایا کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہوگا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے، دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جاسکتا۔"

ہمارے خیال میں جنرل پرویز مشرف کی اس دوٹوک وضاحت کے بعد اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ البتہ جنرل صاحب کو پاکستانی عوام کے جذبات کی اس جرأت مندانہ ترجمانی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ امریکہ کی دیگر شرائط کے بارے میں بھی وہ دوٹوک اور صاف انداز میں وضاحت کر دیں کہ ہم ایک اسلامی ریاست کے باشندے ہیں اور اسلام صرف ہمارا سرکاری مذہب ہی نہیں بلکہ دستور پاکستان کی صراحت کے مطابق قومی دستورِ حیات اور حکومتی پالیسیوں کا سرچشمہ بھی ہے، اس لیے جمہوریت، معیشت، آزادی، حقوق اور ایٹمی قوت سمیت تمام امور کے بارے میں ہم وہی پالیسی اختیار کر سکتے ہیں جس کی قرآن و سنت کی تعلیمات میں گنجائش ہو۔

اس کے ساتھ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی حمایت کرنے والے حلقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی موجودہ ایٹمی پوزیشن پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر اصولی طور پر دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

- سی ٹی بی ٹی پر دستخط سے ایٹمی پروگرام بین الاقوامی کنٹرول میں چلا جائے گا اور ہم اس کے بارے میں کسی آزادانہ فیصلے کے مجاز نہیں رہیں گے۔ پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ پروگرام کنٹرول کرنے والی بین الاقوامی اتھارٹی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک اور ختم کرنے کیلئے آئندہ کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔
- سی ٹی بی ٹی کا مقصد بظاہر ایٹمی پروگرام کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے جبکہ جنگی قوت کے بارے میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ وقت کی جدید ترین جنگی قوت حاصل کرو اور اس قوت کی حد بھی قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم اس قوت کے ذریعے دشمن پر تمہارا رعب قائم ہو۔ جس کا مطلب اصطلاحی معنوں میں یہ ہے کہ طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے ایٹمی قوت اور وسائل کے لحاظ سے جب تک توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا ایٹمی قوت میں مزید پیش رفت پر پابندی کو قبول کرنا قرآن کریم کی منشا کے خلاف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح جہاد اسلامی

تعلیمات کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اس مذہبی فریضہ کی ادائیگی سے نہیں روکا جاسکتا اسی طرح ایٹمی قوت کا اس حد تک حصول کہ توازن کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں جھک جائے، یہ بھی ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور اس ہدف کے حصول سے قبل ایٹمی پروگرام میں مزید پیش رفت پر پابندی کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں امید ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے رفقاء اس صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور جہادی تحریکات کی طرح سی ٹی بی ٹی کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات کے حوالے سے امریکہ کو دوٹوک جواب دے کر دینی حمیت اور قومی غیرت کا بروقت مظاہرہ کریں گے۔

کلہ بہ زئی (واپس کب جاؤ گے؟)

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- فروری ۲۰۰۰ء

محترم میجر (ر) سہیل پرویز نے گذشتہ روز اپنے کالم میں افغان مہاجرین کے حوالے سے ایک خوبصورت سوال اٹھایا ہے کہ ”کلہ بہ زئی؟“ (یعنی واپس کب جاؤ گے؟)۔ میجر صاحب کا ارشاد ہے کہ افغان مہاجرین جب روسی جارحیت کا شکار ہونے کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے تو پاکستانی عوام نے ان کا خیر مقدم کیا تھا لیکن ان مہاجرین میں ایسے لوگ بھی بڑی تعداد میں آگئے جنہوں نے پاکستان میں جائیدادیں خریدنے اور کاروبار بڑھانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اور اب یہ لوگ پاکستانی قوم کیلئے وبال جان بنتے جارہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس مبینہ عوامی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ

”بائیس سال پہلے سرحد پار سے آنے والے اپنے مہمانوں کی آمد پر اگر ہم خوش ہوئے تھے تو اللہ اب ہمیں یہ موقع بھی کوئی فراہم کرے کہ ہم ان کی رخصتی پر بھی مسرور ہوں“۔

جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے میجر صاحب کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ شرعاً ہجرت کے ساتھ ہی مہاجر کا تعلق اپنے وطن کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ فقہی احکام کی رو سے شرعی ہجرت کی صورت میں اپنے سابقہ مکانوں اور جائیدادوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رفقاء کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اگرچہ صرف آٹھ برس کے بعد مکہ مکرمہ میں ان کا اقتدار قائم ہوگیا تھا اور وہ فاتح کی حیثیت سے دوبارہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوگئے تھے لیکن جناب رسول اللہؐ سمیت ان مہاجرین میں سے کسی نے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر دوبارہ مکہ مکرمہ کو وطن نہیں بنایا تھا اور اپنی ہجرت پر قائم رہے تھے۔ انہیں فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد بھی مدینہ منورہ کی آبادی کے ایک حصے کی طرف سے مسلسل یہ طعنے سننے پڑے تھے کہ یہ مہاجرین ہم پر بوجھ بن گئے ہیں اور انہیں اب مدینہ منورہ سے چلے جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ایسے بعض افراد کے طعنوں کا خود قرآن

کریم نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود رسول اکرمؐ اور ان کے مہاجر ساتھیوں نے مکہ مکرمہ واپس جانا قبول نہیں کیا تھا اور ہجرت کا شرعی مسئلہ بھی یہی ہے۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد جو اپنے وطن کے حالات کچھ بہتر ہونے پر واپس چلی گئی ہے ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہیے ورنہ اگر وہ اڑ جاتے اور ہجرت کے شرعی احکام کا عذر ہمارے سامنے رکھ دیتے تو ہمارے پاس انہیں زبردستی واپس بھیجنے کا کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ ہم اصولاً اس بات سے متفق ہیں کہ افغانستان کے حالات سازگار ہونے پر افغان مہاجرین کو وطن واپس لوٹ جانا چاہیے اور ہمارے خیال میں جن علاقوں کے حالات سازگار ہوئے ہیں وہاں کے مہاجرین کی اکثریت واپس جا چکی ہے۔ اور اب صرف ان صوبوں کے لوگ یہاں رہ گئے ہیں جہاں کے حالات ابھی مہاجرین کی واپسی کیلئے سازگار نہیں ہیں۔ یا ایسے لوگ باقی ہیں جو شروع سے ہی ہجرت کی نیت سے نہیں بلکہ ہجرت کے نام پر مفادات اٹھانے، کاروبار چمکانے، اسلحہ و منشیات کی سمگلنگ کرنے اور گند پھیلانے کیلئے آئے تھے۔ اور ان کے تعلقات یہاں اپنے مزاج اور قماش کے لوگوں سے ہو گئے تھے اس لیے انہیں اپنے مقاصد پورے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور نہ ہی وہ اب وہ یہاں سے واپس جانے کیلئے تیار ہیں کیونکہ ان کے بھائی بند یہاں ہر شعبے میں موجود ہیں اور انہیں پورا تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر اس قسم کے مفاد پرست افراد کو یہاں سے نکل جانے کیلئے کہا جائے بلکہ ان کے اخراج کیلئے قانون سازی کا بھی کوئی مرحلہ آئے تو ہم اس کی حمایت کریں گے۔

لیکن ایسا کوئی افغان بھائی جو واقعتاً ہجرت کی نیت سے پاکستان آیا تھا، اس نے یہاں پاکستان کے عوام اور حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے شریف شہری کے طور پر وقت گزارا ہے اور اس کا ریکارڈ درست ہے تو اگر وہ یہاں رہنا چاہتا ہے تو یہ نہ صرف اس کا شرعی حق ہے بلکہ آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین بھی اسے یہ حق دیتے ہیں کہ اتنا عرصہ پاکستان میں شریف اور قانون کا احترام کرنے والے شہری کے طور پر رہنے کے بعد وہ یہاں کی شہرت حاصل کر سکے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ افغان مہاجرین ہمارے پاس پاکستان میں آنے والے پہلے مہاجرین نہیں ہیں، اس سے قبل مشرقی پنجاب، یوپی، بہار اور مقبوضہ کشمیر کے لاکھوں مہاجرین یہاں آ چکے ہیں اور پاکستانی معاشرہ میں ضم ہو کر شریف شہریوں کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ کاروبار بھی کرتے ہیں، انہوں نے جائیدادیں خرید رکھی ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ ٹرانسپورٹ کے شعبہ سے وابستہ ہیں اور ان کے کچھ افراد بھی سمگلنگ، لاقانونیت اور دیگر غیر قانونی و غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ کشمیر جلد آزاد ہو اور ہمارے کشمیری بھائی قومی آزادی کی نعمت عظمیٰ سے جلد از جلد سرفراز ہوں، لیکن کیا کشمیر کے آزاد ہو جانے کے بعد پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں کشمیری بھائیوں کیلئے بھی محترم میجر (ر) سہیل پرویز صاحب انہیں وبال جان قرار دیتے ہوئے ان سے سوال کریں گے کہ ”وہ کب واپس جا رہے ہیں؟“

اس لیے اس حوالے سے ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمارے جو بھی مسلمان بھائی خواہ کشمیری ہوں یا افغان، پاکستان آ گئے ہیں اور ہمارے قانون اور اقدار و روایات کی پابندی قبول کرتے ہیں، انہیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک

کے حالات درست ہونے کے بعد بھی اگر یہاں رہنا چاہیں تو آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔

البتہ میجر (ر) سہیل پرویز صاحب کا یہ خوبصورت سوال "کلہ بہ زئی؟" کچھ اور لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو دو صدیاں قبل تجارت کے بہانے یہاں آئے تھے اور مسلسل سازشیں کر کے ہماری آزادی اور خود مختاری غصب کرنے کے بعد ہمارے مالک بن بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمارے قانون اور اقدار و روایات کی پابندی کرنے کی بجائے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے اپنا پورا زور صرف کیا اور اپنے نظام و قوانین کو طاقت کے زور سے ہم پر مسلط کر دیا۔ انہوں نے ہماری صنعت و تجارت کے نظام کو تباہ و برباد کر کے اپنی تجارت اور صنعت کا سکہ جمایا، ہمارے وسائل اور دولت کی وحشیانہ لوٹ مار کر کے اپنی تجوریاں بھریں اور ہمیں اپنے ہی ملک میں خود اپنے وسائل اور دولت سے براہ راست اور آزادانہ استفادہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا۔ انہوں نے جب یہ سمجھا کہ اب ان کا خود یہاں زیادہ دیر رہنا ممکن نہیں رہا تو اپنی جگہ اپنی "پونگ" کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا جو پیر تسمہ پا بن کر ہمارے کندھوں مسلط ہے۔ اور اس کی راہنمائی اور نگرانی و کنٹرول کیلئے بدیشی آقاؤں کی ایک پوری فوج ظفر موج سفارت کاروں، اقتصادی مشیروں، این جی اوز، فنی ماہرین اور دانشوروں کی شکل میں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا ہمارے ساتھ اعتقادی، فکری، تہذیبی یا جغرافیائی کسی لحاظ سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ زبردستی ہمارے مہمان بلکہ وی وی آئی پی مہمان بنے بیٹھے ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ راقم الحروف اور محترم میجر (ر) سہیل پرویز مل کر ایک مشترکہ کالم لکھیں جس میں زبردستی کے اس "مہمان وبال جان" کی چیرہ دستیوں اور ستم ظریفیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا جائے کہ "کلہ بہ زئی؟" واپس کب جاؤ گے؟

چیچنیا کے مشیر سلیم خان کی گرفتاری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۶ فروری ۲۰۰۰ء

چیچنیا کے سابق صدر اور موجودہ حکومت کے مشیر سلیم خان کی اسلام آباد میں گرفتاری کی خبر پڑھی تو سناٹے میں آگیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ سلیم خان اسلام آباد پہنچیں گے تو انہیں ایک مجاہد اور مجاہدوں کے غیور نمائندہ کے طور پر پروٹوکول دیا جائے گا، جہاد کشمیر اور جہاد افغانستان میں مجاہدین کی پشت پناہی کرنے والے ادارے جہادِ چیچنیا کے سرکاری سفیر سے وہاں کے حالات معلوم کر کے انہیں تعاون کا یقین دلائیں گے، اور روسی جارحیت کا دلیرانہ سامنا کرنے والے غیور مسلمانوں کی پشت پر ہاتھ رکھیں گے۔ کیونکہ ابھی چند روز قبل پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں سے بات چیت کرتے ہوئے چیچنیا کے جہاد کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جہاد اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور مسلمان جہاں کہیں بھی جہاد کرتے ہیں خواہ کشمیر ہو چیچنیا وہ اپنے مذہبی فرض کی تعمیل کرتے ہیں اس لیے انہیں جہاد سے روکا نہیں جا سکتا۔

جنرل صاحب کے اس ارشاد کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ چیچنیا کے جہاد کے بارے میں پاکستان کے عوام اور حکومت

کے جذبات مختلف نہیں ہیں اور روسی جارحیت کا شکار ہونے والے مجاہدین کو پاکستان کے عوام اور حکمرانوں کی یکساں تائید و حمایت حاصل ہے۔ لیکن سلیم خان کے ساتھ خفیہ اداروں کے اس شرمناک طرز عمل نے ان تمام اندازوں کو غلط ٹھہرا دیا ہے۔ سلیم خان نے کہا ہے کہ روسی فوجوں نے ان کے جسموں کو زخمی کیا مگر پاکستان کے خفیہ اداروں نے ان کی روح کو زخمی کر دیا ہے۔ ان کی یہ بات درست بھی ہے کہ یہ زخم جسموں کے زخم سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور آسانی سے مندمل نہیں ہوتا۔ سلیم خان ہمارے مہمان ہیں جس طرح اسامہ بن لادن افغانستان کے مہمان ہیں اور دونوں جہادی تحریکوں کے نمائندے ہیں۔ ایک مشرق وسطیٰ میں امریکی تسلط کے خلاف معرکہ آرا ہے اور دوسرا روسی فیڈریشن کی جارحیت کے شکار مظلوم مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اسامہ بن لادن کی گرفتاری کیلئے امریکہ ایک عرصہ سے دانت پیس رہا ہے مگر غیور طالبان کے سامنے اس کا بس نہیں چل رہا۔ افغانستان کی امارت اسلامی اپنے اس اصولی موقف پر پوری سختی کے ساتھ قائم ہے کہ اسامہ بن لادن ہمارا مہمان ہے اور وہ اپنے مہمان کو ملک سے چلے جانے کیلئے نہیں کہیں گے اور نہ ہی اسے اس کے کسی دشمن کے حوالے کریں گے۔ اس موقف کی خاطر طالبان نے امریکی بمباری برداشت کی ہے، قندھار کے عین وسط میں دہشت گردی کا سامنا کیا ہے، اقوامِ متحدہ کی پابندیاں قبول کی ہیں اور عالمی میڈیا کی نفرت انگیز مہم کو برداشت کیا ہے مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے موقف پر قائم ہیں۔ افغان حکمران ملا محمد ربانی نے ابھی اسلام آباد میں ایک بار پھر یہ کہہ کر اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اسامہ ہمارا مسلہ ہے اور اس پر ہمارا موقف سب کے سامنے واضح ہے۔

دوسری طرف ہم نے اپنے مہمان کو جس سلوک کا مستحق ٹھہرایا ہے اس نے پورے عالم اسلام کے سامنے ہماری گردن جھکا دی ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکی صدر بل کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے دورہ کے پروگرام میں ابھی تک پاکستان شامل نہیں ہو سکا اور یہ بھی درست ہے کہ چیچنیا کے مظلوم اور مجاہد مسلمانوں کی پاکستان کے عوام اور دینی جماعتوں کی طرف سے مسلسل حمایت پر روسی حکمران ناراض ہیں۔ ہمارے خفیہ اداروں کو اس پر پریشانی ہے اور خاص طور پر امریکہ کے صدر کے پاکستان نہ آنے کا تصور ہی ہمارے حکمران طبقوں میں شامل بہت سے افراد کی نیندیں حرام کرنے کیلئے کافی ہے۔ لیکن کوئی ادارہ اس حد تک بھی حواس باختہ ہو سکتا ہے، اس کا کم از کم مجھے اندازہ نہیں تھا۔

میں حامد میر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سلیم خان سے خود مل کر میرے جیسے لاکھوں بلکہ کروڑوں پاکستانیوں کے جذبات ان تک پہنچا دیے اور ہماری ترجمانی کر دی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیں اور اس جرأت قلندرانہ پر استقامت نصیب فرمائیں، آمین۔ وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کا کہنا ہے کہ اس واقعہ پر پریس میں کچھ نہ کہا جائے اور کچھ نہ لکھا جائے۔ وہ یقیناً کسی مصلحت کے تحت یہ بات کہہ رہے ہوں گے لیکن مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ چیچنیا کے سابق صدر اور مجاہدین کے نمائندہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس پر اگر احتجاج بھی نہ ہو اور عوام اور دینی حلقوں کا ردعمل بھی سامنے نہ آئے تو اس سے چیچنیا کے مسلمانوں کے دل پر لگنے والا زخم اور زیادہ گہرا ہو جائے گا اور وہ خود کو مزید تنہا محسوس کرنے لگیں گے۔ پھر یہ تاثر بھی ابھرے گا کہ شاید پاکستان کے عوام، دینی حلقے اور صحافی بھی شاید خفیہ اداروں کے لوگ ہیں جو اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ کوئی طرز عمل اختیار کرنے سے قبل امریکی اور

روسی حکمرانوں کے چہروں کے زاویے دیکھتے ہیں اور ان کی پیشانیوں کی شکنیں شمار کرتے ہیں۔

اس لیے حامد میر کے ساتھ میں بھی اپنے معزز مہمان سلیم خان کے سامنے پوری پاکستانی قوم بالخصوص دینی حلقوں کی طرف سے شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں اور ان سے ہونے والی اس بدسلوکی پر معافی مانگتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی سلیم خان کی توہین کرنے والے خفیہ اداروں کے ان افسران سے جن کے حکم پر یہ سب کچھ ہوا یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکی صدر کا پاکستان نہ آنا اور روسی حکمرانوں کا اظہار ناراضگی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے لوگ اس حد تک بدحواس ہوجائیں اور بالکل ہی "بونتر" جائیں۔ ابھی تو عشق کے اور بھی بہت سے امتحان باقی ہیں اس لیے اپنے حواس قائم رکھیں اور امریکہ اور روس کی چاکری کرنے کی بجائے کہیں سے غیرت و حمیت کا درس بھی لے لیں۔

ملک میں اسلحہ کلچر: وفاقی وزیر داخلہ سے اہم گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ فروری ۲۰۰۰ء

گذشتہ دنوں ملک میں امن وامان کے حوالے سے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے بعد وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر نے اخباری نمائندوں کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں اسلحہ کلچر کو ختم کرنے کیلئے اقدامات کیے جارہے ہیں، اور اس سلسلہ میں اسلحہ کی نمائش پر پابندی اور فائرنگ کی قانونی ممانعت کے علاوہ ان دینی طلبہ کی حوصلہ شکنی بھی پروگرام میں شامل ہے جو افغانستان جاکر اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ وزیر داخلہ نے پریس بریفنگ میں کہا کہ اس حوالے سے افغانستان کی حکومت سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلحہ چلانے کی تربیت دینے والے مراکز بند کر دے اور پاکستان سے اسلحہ کی تربیت کیلئے افغانستان جانے والے دینی طلبہ کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ جناب معین الدین حیدر کا کہنا ہے کہ پاکستان بھر کے دینی مدارس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو اسلحہ کی تربیت دیتے ہیں البتہ کم وبیش چار ہزار دینی مدارس میں ایک فیصد تعداد ایسے مدارس کی ضرور ہے جو اپنے طلبہ کو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ دلانے کا اہتمام کرتے ہیں اور اسی کی روک تھام کیلئے اس قسم کے اقدامات ضروری ہوگئے ہیں۔

جہاں تک ملک میں اسلحہ کو کنٹرول کرنے اور جرائم کی روک تھام کیلئے اسلحہ رکھنے اور چلانے پر پابندی کے مجوزہ اقدامات کا تعلق ہے ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔ کیونکہ دہشت گردی، فوجداری جرائم اور لاقانونیت کی صورتحال یقیناً یہ رخ اختیار کرچکی ہے کہ اسلحہ کو مکمل طور پر کنٹرول کر کے شہریوں کو نہتا کر دینے کے سوا اب کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔ اصولی طور پر ہم اسلحہ رکھنے کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ یہ سنت رسولؐ ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو ہتھیار رکھنے اور اس کی تربیت دینے کی ہدایت کی ہے لیکن ہمارے ہاں معروضی صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ اسلحہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں زیادہ ہے اور اکثر و بیشتر غلط مقاصد کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔ اس لیے جس طرح امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے ملک میں امن وامان کیلئے سب لوگوں سے اسلحہ واپس لینے اور شہریوں کو نہتا کر دینے کی پالیسی اختیار کی ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آرہے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی اس بات کی ضرورت بڑھتی جارہی

ہے کہ اس معاملہ میں ہم بھی طالبان کی پیروی کریں اور ہر قسم کے اسلحہ کو سرکاری تحویل میں لے کر ''وپین لیس سوسائٹی'' کی طرف قدم بڑھائیں۔

البتہ اس حوالے سے دو ضروری گزارشات جناب معین الدین حیدر اور ان کی وساطت سے امن عامہ کے دیگر ذمہ دار حضرات اور اداروں کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلحہ اگر واپس لینا ہے تو پھر کسی استثنا کے بغیر سب لوگوں سے واپس لیا جائے اور افغانستان کی طرح کسی ایک شخص کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہ رہنے دیا جائے کیونکہ اسلحہ پر کنٹرول کی پالیسی کا عملی فائدہ صرف اسی صورت میں ہوگا۔ ورنہ اگر روایتی انداز میں جن لوگوں تک پولیس کی رسائی ہے ان سے تو اسلحہ لے لیا جائے لیکن جو بااثر اور جرائم پیشہ افراد و گروہ اس رسائی کی رینج سے باہر ہیں ان کا اسلحہ بدستور ان کے پاس رہے تو اس سے جرائم میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہوگا اور وہ پہلے سے زیادہ بے خوف ہو کر اسلحہ استعمال کریں گے۔

چند سال پہلے جب ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں فدا حسین مرحوم ایس ایس پی ہوا کرتے تھے اس زمانہ میں پنجاب حکومت نے لوگوں سے اسلحہ واپس لینے کی مہم شروع کی تھی۔ اس سلسلہ میں فدا حسین مرحوم نے ہم سے بات کی کہ لوگوں سے اسلحہ واپس دلوانے میں علمائے کرام پولیس سے تعاون کریں جس پر میں نے عرض کیا کہ اگر یہ پالیسی سب کیلئے یکساں ہے تو ہم تعاون کرنے، لوگوں کو اسلحہ کی واپسی کی ترغیب دینے بلکہ پولیس افسروں کے ساتھ مل کر چھاپے مارنے کیلئے بھی تیار ہیں۔ لیکن اگر صرف فارمیلٹی پورا کرنا مقصد ہے تو ہمیں اس سے معذور سمجھا جائے۔ اس موقع پر میں نے ایس ایس پی مرحوم کو شہر کے چند بااثر افراد کے بارے میں کہا کہ ان کے گھروں اور ڈیروں پر اسلحہ کے انبار موجود ہیں خود آپ بھی انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، جس روز ان لوگوں کے ڈیروں پر چھاپے مار کر ان کا اسلحہ قبضہ میں کریں گے اس سے اگلے روز ہمیں بلا لیں ہم پولیس افسروں کے ساتھ عوام سے اسلحہ واپس لینے کی مہم میں شریک ہو جائیں گے۔ ہماری اس گزارش کا کوئی جواب نہ ملا اور اسلحہ پر کنٹرول کی یہ مہم دم توڑ کر رہ گئی۔

جناب وزیر داخلہ سے گزارش ہے کہ اس قسم کی مہم سے تو گریز ہی کریں کہ شریف شہری اور قانون کی زد میں آجانے والے لوگ مزید نہتے ہو جائیں لیکن جن افراد اور گروہوں کے پاس اسلحہ کے انبار موجود ہیں اور جن کے جرائم اور اسلحہ کی حفاظت کرنے والے ان کے عزیز، رشتہ دار اور بھائی بند خود امن قائم کرنے والے اداروں میں نمایاں جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے اسلحہ کے استعمال میں مزید بے خوف ہوتے چلے جائیں۔ ہاں اگر قانون سب کیلئے یکساں اور طرز عمل سب کے ساتھ ایک جیسا ہو تو ہم اسلحہ سے معاشرہ کو پاک کر کے جرائم اور دہشت گردی کو کنٹرول کرنے کی مہم کا ساتھ دیں گے۔ البتہ اس سلسلہ میں ہماری تجویز یہ ہے کہ امارت اسلامی افغانستان کے کامیاب تجربہ سے استفادہ کیا جائے اور طالبان کی حکومت سے تجربہ کار مشیر حاصل کر کے ان کی راہنمائی میں اسلحہ کنٹرول پالیسی کی تفصیلات طے کی جائیں۔

دوسری گزارش اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ جناب معین الدین حیدر کے بقول امارت اسلامی افغانستان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اسلحہ کی تربیت دینے والے کیمپ بند کر دے کیونکہ ان سے پاکستان کے بعض افراد تربیت لے کر اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے وزیر داخلہ کے علم میں یقیناً ہوگی کہ افغانستان کے ان کیمپوں سے صرف

پاکستان کے ایک فیصد دینی مدارس کے چند طلبہ تربیت حاصل نہیں کرتے بلکہ دنیا بھر کی جہادی تحریکات کے مجاہدین نے انہی کیمپوں سے تربیت پائی ہے۔ کشمیر، چیچنیا، فلسطین، مورو، اراکان، بوسنیا، کوسووا اور دیگر علاقوں میں جو مجاہدین کفر کی طاقتوں کے مقابلہ میں ہتھیار بکف ہیں ان کی بڑی اکثریت نے افغانستان کے انہی کیمپوں میں ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ہمارا جناب معین الدین حیدر سے سوال یہ ہے کہ افغانستان کے تربیتی کیمپ بند کرانے کے بعد ان کے پاس کشمیر، چیچنیا، فلسطین، کوسووا اور بوسنیا جیسے مظلوم خطوں کے مجاہدین کیلئے اسلحہ کی ٹریننگ کا متبادل انتظام کیا ہے؟ کیا پاک فوج اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے؟ اگر ایسا ہو جائے تو ہم خود جناب معین الدین حیدر کے ساتھ قندھار جا کر امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد سے افغانستان میں موجود اسلحہ کی ٹریننگ کے کیمپ بند کرنے کی درخواست کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن اگر افغانستان کے کیمپ پاکستان کے دباؤ کی وجہ سے خدانخواستہ بند ہو جاتے ہیں اور دنیا میں مختلف مقامات پر کفر کے خلاف پنجہ آزمائی کرنے والے مجاہدین کی ٹریننگ کا کوئی متبادل انتظام بھی نہیں ہو پاتا تو امارت اسلامی افغانستان کی حکومت سے اسلحہ کی تربیت کے کیمپ بند کرنے کا مطالبہ کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ طالبان کی حکومت مجاہدین اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی ایجنڈے کو تسلیم کر لے اور عالمی استعمار کی خواہشات اور مطالبات کے آگے سرنڈر ہو جائے۔

اس لیے ہم حکومت پاکستان کے اس موقف کی حمایت نہیں کر سکتے اور بڑے ادب کے ساتھ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ میاں محمد نواز شریف، میاں شہباز شریف اور جنرل ضیاء الدین بٹ کے ایجنڈے سے جنرل پرویز مشرف اور لیفٹیننٹ جنرل معین الدین حیدر کا ایجنڈا عوام کو ابھی تک بظاہر مختلف دکھائی دے رہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ نہ صرف دونوں ایجنڈوں کا یہ فرق قائم رہے بلکہ جنرل (ر) معین الدین حیدر جب افغان حکمرانوں سے گفت و شنید کیلئے کابل اور قندھار تشریف لے جائیں تو ان کے ہاتھ میں وہی فائل نہ ہو جو جنرل ضیاء الدین بٹ کے ہاتھ میں تھی۔

چیچنیا کا جہادِ آزادی اور مسلم حکومتیں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۰ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۷ فروری ۲۰۰۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق چیچنیا کے سابق صدر اور موجودہ چیچن صدر کے نمائندہ جناب زیلم خان نے لاہور ہائیکورٹ بار کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ چیچنیا کے مسلمانوں پر روسی افواج کے مظالم کے ذمہ دار مسلم ممالک ہیں، کیونکہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ چیچنیا کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ چیچنیا پر روسی افواج کی یلغار پر خاموشی اختیار کر کے روس کو چیچن مسلمانوں پر مظالم توڑنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ زیلم خان نے کہا کہ ۱۹۹۱ء میں جب چیچنیا نے اپنی آزاد حکومت کا اعلان کیا تھا اگر مسلم ممالک اس وقت اسے تسلیم کر لیتے تو آج ان حالات کی نوبت نہ آتی، مگر مسلمان حکومتوں نے چیچن حکومت کو تسلیم نہ کیا جس کے نتیجے میں روس کو چیچنیا پر فوجی چڑھائی کا موقع مل گیا۔ انہوں نے کہا کہ روس نے اثر و رسوخ استعمال کر کے ترکی اور سعودی عرب سمیت بہت سے ممالک کو چیچن

حکومت کو تسلیم کرنے سے روکا۔

جناب زیلم خان کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے، انہوں نے مسلمان حکومتوں کی جس بے رخی اور سرد مہری کا ذکر کیا ہے اسے دنیا بھر کے مسلمان محسوس کر رہے ہیں۔ اور یہ مسلم حکمرانوں کی بے حسی کا نتیجہ ہے کہ روسی فوجیں چیچن دارالحکومت گروزنی پر غاصبانہ قبضہ جمائے بیٹھی ہیں اور چیچن مجاہدین پہاڑوں میں اپنا ہیڈ کوارٹر منتقل کرکے آزادی کیلئے گوریلا جنگ پر مجبور ہوگئے ہیں۔ بلکہ ہمارے ہاں پاکستان میں تو مزید ظلم یہ ہوا کہ چیچن حکومت کے نمائندہ زیلم خان جب اسلام آباد پہنچے تو انہیں خفیہ اداروں کے اہل کاروں نے حراست میں لے لیا اور ان کے ساتھیوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا، جو مجاہدین کے ایک غیور نمائندہ اور چیچن حکومت کے معزز نمائندہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ایک مسلم حکومت کے اہلکاروں کا شرمناک سلوک تھا اور اس کی ہر سطح پر مذمت کی گئی ہے۔

مگر اس کے باوجود چیچن مجاہدین نے جس حوصلہ اور عزم کے ساتھ جہاد جاری رکھا ہوا ہے وہ ان کی عزیمت و استقامت کا مظہر ہے۔ ہم ان مجاہدین کی کامیابی اور استقامت کیلئے دعاگو ہیں اور مسلم حکومتوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف توجہ دیں اور چیچن حکومت کو تسلیم کرکے جہادِ آزادی میں اسے اخلاقی، سفارتی اور عسکری امداد فراہم کریں۔

سقوطِ ڈھاکہ، جہادِ افغانستان، معاشی خودمختاری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳ مارچ ۲۰۰۰ء

محترم راجہ انور صاحب کا کہنا ہے کہ

> ”سامراج سے آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم پانچ سال کیلئے اپنی ساری ترجیحات معطل کردیں، صرف پانچ سال کیلئے اپنے سارے اہم مسائل طاق نسیاں کی نذر کردیں اور معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ جس دن ہم معاشی طور پر مضبوط اور آزاد ہوگئے اس دن دنیا کی کوئی قوت، کوئی سامراج اور کوئی سازش ہمیں غلام نہیں رکھ سکے گی۔“

اس سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک اشکال ہے جس پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں مگر اس اشکال پر کچھ عرض کرنے سے پہلے راجہ صاحب کے مضمون کے بعض دیگر مندرجات کے حوالے سے تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے چند معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

راجہ صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے المیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کی ”کوتاہ فکر فوجی، سیاسی اور مذہبی قیادت“ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس الیکشن میں مذہبی جماعتوں میں سب سے زیادہ نشستیں جمعیت علماء اسلام اور جمعیۃ العلماء پاکستان نے حاصل کی

تھیں جن کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمد نورانی کر رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں یحییٰ خان کے فوجی ایکشن کو جماعت اسلامی کی حمایت حاصل تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمدؒ نورانی نے یحییٰ خان کو سپورٹ نہیں کیا تھا۔ بلکہ راجہ انور صاحب کے ممدوح جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے جب منتخب پارلیمنٹ کا ڈھاکہ میں طلب کیا جانے والا اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے "ادھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ لگایا تھا اور ان کے لاہور کے جلسہ میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کیلئے ڈھاکہ جانے والے ممبران اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو اس کے جواب میں مولانا مفتی محمودؒ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس دھمکی کو مسترد کرتے ہیں اور اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کیلئے ضرور ڈھاکہ جائیں گے۔

اس وقت کی صورتحال کا اصل منظر یہ ہے کہ نو منتخب دستور ساز اسمبلی کا ڈھاکہ سیشن ملتوی کرنے اور مشرقی پاکستان پر فوجی ایکشن کے سلسلہ میں یحییٰ خان کے اقدامات کو جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جماعت اسلامی نے سپورٹ کیا تھا۔ جبکہ اسمبلی کی دو بڑی مذہبی جماعتوں جمعیت علماء اسلام اور جمعیۃ العلماء پاکستان نے توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا تھا۔ اس لیے کسی استثناء کے بغیر اس دور کی پوری مذہبی قیادت کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار قرار دینا اور اس پر کوتاہِ فکری کی پھبتی کسنا راجہ انور صاحب کی دلی خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقائق کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح راجہ صاحب نے یہ لکھ کر بھی تاریخی حقائق کو غلط رخ دینے کی کوشش کی ہے کہ ۱۹۸۰ء میں سرزمین افغانستان پر امریکی سائبان تلے جونہی روس کے خلاف غلغلۂ جہاد بلند ہوا ہم فوراً اس کھیل کا پانچواں پیادہ بننے پر آمادہ ہو گئے۔

میں نہیں سمجھتا کہ راجہ انور جیسا دانا و بینا اور سرد و گرم چشیدہ شخص واقعات کے اصل تسلسل سے اس قدر بے خبر ہو سکتا ہے کہ وہ جہاد افغانستان میں امریکی سائبان کی لمبائی کو ۱۹۸۰ء تک کھینچ لے جانے میں بھی کوئی حرج محسوس نہ کرے۔ بلکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ جب ببرک کارمل کو کابل کے اقتدار پر بٹھانے اور اسے تحفظ دینے کیلئے روس نے مسلح افواج کو افغانستان میں اتارا تھا تو ابتدائی تین سال تک مجاہدین اس حالت میں جنگ لڑتے رہے کہ اکثر ان کے پاس دو وقت کھانے کی روٹی نہیں ہوتی تھی۔ راجہ صاحب چاہیں تو میں ان نوجوانوں سے ان کی ملاقات کرا سکتا ہوں جو اس دور میں خوست کی پہاڑیوں پر مولوی جلال الدین حقانی کے ساتھ کئی ہفتے تک جہاد میں شریک رہے اور اس کیفیت کے ساتھ شریک رہے کہ کئی کئی روز مسلسل پیدل چل کر مورچوں تک پہنچا کرتے تھے اور انہیں دن رات میں ایک وقت سوکھی روٹی پیاز کے ساتھ میسر ہوتی تھی۔ راجہ صاحب موصوف کی ملاقات لاہور کے اس مرد درویش سے بھی کرائی جا سکتی ہے جو ایک ایک دکان پر گھوم کر مجاہدین کیلئے آٹے کے تھیلے جمع کرتا تھا اور مہینہ ڈیڑھ کے بعد انہیں خوست بھجوانے کا اہتمام کیا کرتا تھا تاکہ مجاہدین کو دو وقت کھانے کو خشک روٹی تو مل جائے۔ اس مرد درویش کا نام مولانا حمید الرحمان عباسی ہے جو آج بھی شیرانوالہ گیٹ لاہور کی جامع مسجد میں خاموشی کے ساتھ قرآن و حدیث پڑھانے کی خدمت میں مصروف ہے۔ اور راجہ صاحب کو ان بوتل بموں کی زیارت بھی کرائی جا سکتی ہے جو روایتی اسلحہ میسر نہ آنے کی وجہ سے مجاہدین نے خود ایجاد

کیا تھا اور بوتل میں صابن اور پٹرول کا محلول تیار کر کے وہ اس تکنیک سے ٹینک پر مارتے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹینک جل کر بے کار ہو جاتا تھا۔

مجاہدین نے مسلسل تین سال تک جنگ اس بے سروسامانی اور کسمپرسی کی حالت میں لڑی ہے۔ حتیٰ کہ جب چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر افغانستان کے کم و بیش ستر فیصد علاقے پر مجاہدین نے کنٹرول حاصل کر لیا تو اس کے بعد امریکہ اور دوسرے ممالک اپنے مفادات کیلئے اس میں شریک ہو گئے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اس مرحلہ پر مجاہدین کو امریکہ کی حمایت قبول کرنا چاہیے تھی یا نہیں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ مجاہدین نے امریکہ کی حمایت قبول کر کے غلطی کی جس کی سزا افغانستان اب تک بھگت رہا ہے۔ مگر جہاد افغانستان کے اس سارے عمل کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ امریکی سائبان تلے شروع کیا گیا تھا، سراسر غلط بیانی اور مجاہدین کے ساتھ ناانصافی ہے۔

راجہ صاحب نے چیچن مجاہدین کے معرکہ کا بھی ذکر کیا ہے اور انہیں شکوہ ہے کہ چیچن مجاہدین نے صرف دو ہزار نیم مسلح گوریلوں کے ساتھ روس جیسی طاقت کے خلاف نبرد آزما ہو کر جذباتی خودکشی کی ہے اور چیچن عوام کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے روس کی غلامی میں دینے کی سازش کی ہے۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ آزادی کی جنگوں میں طاقت کا توازن نہیں دیکھا جاتا بلکہ جذبہ حریت اور صرف جذبہ حریت اس کی بنیاد بنتا ہے۔ ورنہ خود ہمارے ہاں عظیم تر برطانیہ کی خوفناک جنگی قوت کی موجودگی میں سکھوں کے ساتھ شہدائے بالاکوٹ کی جنگ بھی خودکشی کی جذباتی کوشش قرار پائے گی اور اس کے ساتھ بنگال کے حاجی شریعت اللہؒ اور تیتومیرؒ، سندھ کے پیر صبغۃ اللہ شہیدؒ، پنجاب کے سردار احمد خان کھرل شہیدؒ اور صوبہ سرحد کے حاجی ترنگ زئیؒ اور فقیر ایپیؒ سمیت عظیم مجاہدین آزادی کے بیسیوں معرکے بھی راجہ انور صاحب کے فلسفہ کے مطابق جذباتی خودکشی کی کوشش قرار پا جائیں گے۔ جبکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ ہماری آزادی کے اصل معمار وہی ہیں اور انہی کے مقدس خون کی برکت سے ہم آج ایک آزاد مملکت کے شہری کہلاتے ہیں۔ اس لیے چیچنیا کے مجاہدین کو اگر وقتی طور پر روسی فوجوں کے سامنے پسپائی اختیار کرنا پڑی ہے تو کوئی بات نہیں، آزادی کی جنگوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مگر قومیں جب آزادی حاصل کرنے پر تل جاتی ہیں تو انہیں کوئی طاقت زیادہ دیر تک غلام بنا کر نہیں رکھ سکتی۔ چیچنیا بالآخر آزاد ہوگا اور اسے جب بھی آزادی ملی اس کی تاریخ میں گروزنی کے مجاہدین اور شہداء کو وہی مقام حاصل ہوگا جو ہماری جنگ آزادی میں مذکورہ بالا مجاہدین اور شہداء کو حاصل ہے۔

ان معروضات کے بعد راجہ صاحب کے اس فلسفہ کی طرف آتا ہوں کہ سامراج سے آزادی حاصل کرنے کیلئے معاشی طور پر خود مختار ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر سامراج سے کبھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے لیکن اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشی خود مختاری کیلئے بھی سامراج سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک سامراج کا پنجہ ہماری گردن سے ڈھیلا نہیں ہوگا اس وقت تک معاشی خود مختاری کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہوگی۔ ہم اس کا مشاہدہ مشرق وسطیٰ میں کر چکے ہیں کہ عربوں کی معاشی حالت ہم سے کہیں بہتر تھی اور قدرت نے انہیں تیل کی عظیم دولت سے نوازا تھا لیکن چونکہ ان کی گردن سامراج کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے ان کی دولت اور معاشی بہتری ان کے کسی کام نہیں آئی بلکہ الٹا ان کیلئے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔

اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے، راجہ صاحب اور ان کے ہمنواؤں کا موقف یہ ہے کہ آزادی کیلئے معاشی خود مختاری اور مضبوطی ضروری ہے، جبکہ ہم فقیروں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ معاشی خود مختاری اور مضبوطی کیلئے آزادی ضروری ہے کیونکہ غلام جتنی چاہے کمائی کرے اور جتنی چاہے دولت جمع کر لے وہ بالآخر آقا کے خزانوں کی زینت ہی بنتی ہے۔ اس لیے ایک دوسرے سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کو طعنے دینے اور پھبتیاں کسنے کا کوئی موقع ہے۔ اپنے اپنے رخ پر لگے رہیں اور ایک دوسرے کو کوس کر وقت ضائع نہ کیجئے، قوم کو آزادی اور معاشی خود مختاری دونوں کی یکساں ضرورت ہے، دونوں میں سے جو گروہ بھی اپنے ہدف کی طرف سبقت کر گیا وہ دوسرے کیلئے یقیناً تقویت اور کامیابی کا باعث ہی بنے گا۔

جہادی تربیتی مراکز اور تحریکِ جعفریہ پاکستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء

افغانستان میں جہادی تربیت کے عسکری کیمپوں کے بارے میں ایک کالم میں ہم نے گزارش کی تھی کہ ان کی بندش کا مطالبہ درست نہیں ہے کیونکہ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، کوسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور دیگر علاقوں میں مسلمان مجاہدین آزادی اور اپنے اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے جو جنگ لڑ رہے ہیں اس جنگ کا تربیتی سرچشمہ یہی کیمپ ہیں اور ان کیمپوں کے بند ہونے کا براہ راست نقصان ان جہادی تحریکات کو ہوگا اس لیے امریکہ ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ کر رہا ہے لہٰذا ان کیمپوں کی بندش کا مطلب دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو ایک بہت بڑے سہارے سے محروم کر دینا ہوگا۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہو سکتا ہے ان کیمپوں سے تربیت حاصل کرنے والے کچھ افراد نے پاکستان میں اس تربیت کا غلط استعمال بھی کیا ہو جس سے ملک میں دہشت گردی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور لاقانونیت میں اضافہ ہوا ہے لیکن ایسے افراد کا تناسب بہت کم ہے اس لیے ان کی روک تھام کیلئے کوئی اور بندوبست ہونا چاہیے اور چند فیصد لوگوں کے غلط کردار کی وجہ سے سرے سے ان کیمپوں کو بند کرنے کا مطالبہ کر کے امریکی ایجنڈے کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

اس پر تحریک جعفریہ پاکستان کے مولانا اظہار بخاری صاحب کا درج ذیل خط موصول ہوا ہے:

”محترم جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب۔

السلام علیکم، مزاج گرامی!

گذشتہ دنوں (۲۸ فروری ۲۰۰۰ء) روزنامہ اوصاف میں آپ کا کالم ”وزیر داخلہ سے دو اہم گزارشات“ کے عنوان سے پڑھا جس میں آپ نے اسلحہ کی نمائش پر پابندی اور افغانستان میں موجود دہشت گردی کے کیمپوں کے حوالے سے اپنا موقف واضح کیا ہے۔ اول الذکر مسئلہ پر آپ کی تجاویز سے ہم کافی حد تک اتفاق کرتے ہیں لیکن آخر الذکر مسئلہ کے ضمن میں نہ صرف اختلاف رکھتے ہیں بلکہ حقائق

کی روشنی میں اس کی وضاحت بھی آپ کو ارسال کر رہے ہیں تاکہ آپ سمیت ہر انصاف پسند اور باشعور شہری حقیقت حال سے آگاہ ہو سکے۔

وطن عزیز میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کا آغاز ایک مخصوص شدت پسند گروہ کی فتویٰ سازی اور غلیظ نعرہ بازی کی وجہ سے ہوا جس میں ان ملاؤں نے ایک خاص ایجنڈے کے تحت سادہ لوح اور جذباتی نوجوانوں کو شیعہ عوام کے قتل عام پر اکسایا جس کا انجام ''لشکرِ جھنگوی'' کی تشکیل تک پہنچا، آج یہی گروہ دہشت و وحشت کا سرخیل ہے۔

اسلامی جہاد پر عالم اسلام کے تمام مکاتب فکر نہ صرف متحد و متفق ہیں بلکہ اسے اصول دین میں شمار کرتے ہیں۔ مسلک اہل بیت میں جہاد انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ آج پوری دنیا میں تمام مکاتب و مسالک کے پیروکار اپنے دائرہ میں جہاد کے ذریعے امریکہ، روس، اسرائیل، ہندوستان اور دیگر استعماری طاقتوں کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور حیدر کرار کی جرأت و بہادری سے الہام حاصل کرتے ہوئے دشمنان اسلام پر اسلام کا سکہ جمارہے ہیں۔

گذشتہ دہائی میں نام نہاد سپر پاور روس کے خلاف افغانستان کے محاذ پر مختلف جہادی قوتیں نمودار ہوئیں اور پھر متحد ہونے کے بعد منتشر ہوئیں۔ یہاں ہم جہادی قوتوں کے باہمی اختلافات سے قطع نظر جہاد کے اس طریقہ کے نقصانات پر بات کریں گے جس کی وجہ سے امت مسلمہ باہمی نزاع کی کیفیت سے دوچار ہوئی۔ افغانستان سے روسی افواج کے انخلا کے بعد جہادی قوتیں کشمیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ تقریباً اسی دور میں یا پھر تھوڑے ہی عرصے بعد پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کا آغاز ہوا۔ ان واقعات کے ملزمان اور مجرمان گرفتار ہوتے رہے اور انہوں نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والوں، فرقہ وارانہ دہشت گردی کی وجوہات، اسباب فرقہ وارانہ دہشت گردی کے مراکز، سرکاری سرپرستی اور ایجنسیوں کے کردار کے بارے میں حیران کن اور ہوشربا انکشافات کیے۔ اس کے علاوہ وزیراعظم سے لے کر ایک تھانے کے ایس ایچ او تک تمام نے وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ دہشت گردی کے اسباب و مضمرات اور حقائق کو بے نقاب کیا۔

انہی حقائق میں سے ایک حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ افغانستان میں موجود جہادی تربیتی کیمپوں میں پاکستان کے شیعہ سنی عوام کو قتل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور مخصوص نظریات کے حامل افراد نوجوانوں کے ذہن زہر آلود کر کے انہیں جنونی بنا کر لوگوں کے قتل کیلئے تیار کرتے ہیں اور یہ نوجوان گروہوں، لشکروں اور گینگز کی شکل میں پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور منظم منصوبہ بندی کے تحت فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کرتے ہیں۔ دو تین ماہ قبل معروف اشتہاری دہشت گرد راحیل نے

گرفتاری کے بعد جو انکشافات کیے تھے وہ دیگر اخبارات کی طرح آپ کے اخبار اوصاف میں بھی جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے جس میں اس نے کھلے عام کہا کہ ہم ایک فرقہ کے پیروکار کو قتل کرنا واجب سمجھتے ہیں اور ہمارے مراکز افغانستان میں موجود ہیں نیز ہمارے تربیتی کیمپ لشکر جھنگوی کے کمانڈر اب بھی چلا رہے ہیں۔

گذشتہ دور حکومت میں وزیراعظم نواز شریف، وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے واضح بیانات اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے دورہ افغانستان نے ہماری طرف سے کئی سالوں سے پیش کیے جانے والے موقف کی تائید کر دی جس میں ہم نے کہا کہ دہشت گردی کے سرچشمے افغانستان میں موجود ہیں۔ آج بھی جنرل پرویز مشرف اور وزیر داخلہ جنرل معین الدین حیدر نے ان کیمپوں کے بارے میں تشویش ظاہر کر کے نہ صرف ہمارے موقف پر مہر تصدیق ثبت کی ہے بلکہ وطن عزیز کی خیر خواہی کرتے ہوئے اور امن و امان کے قیام کیلئے ان کیمپوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے یہ مقصد لینا کہ حکومت یا تحریک جعفریہ جہاد کی حامی نہیں قطعاً درست نہیں ہے۔

جہاد کی حمایت پاک فوج اور اس کے ادارے سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی مخلص و محب وطن پاکستانی اور مسلمان جہاد کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ البتہ جہاد کی آڑ میں عبادت گاہوں تک میں مسلمانوں کے قتل عام اور باہمی کشت و خون کرنے والے فرقہ پرست جنونیوں کی کارروائیوں سے ہر مسلمان پریشان ہے۔ افغانستان میں دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں کی موجودگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں دہشت و بربریت کی علامت سمجھا جانے والا شخص اور دہشت گردوں کا سرغنہ ریاض بسرا اور اس کے ساتھی کابل کے نواح میں موجود ہیں اور بقول عوامی اخبارات اور دہشت گردوں کے انکشافات کے وہ دہشت گردوں کے کیمپ بھی چلا رہا ہے اور امارت اسلامی افغانستان اس طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی بلکہ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کے مطالبے پر پس و پیش اختیار کر رہی ہے۔

آپ جیسے بالغ نظر اور وسیع القلب شخص کی طرف سے اس طرح کا موقف تعجب خیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ارض وطن پر مسلمانوں کی وحدت و یکجہتی کے فروغ، فرقہ وارانہ دہشت گردی کے ناسوروں کے خاتمے، امن و امان کے قیام، اسلامی مسالک و مکاتب کے اتحاد کی خاطر اپنے نقطۂ نظر میں اصلاح کریں گے اور ہمارے نقطۂ نظر کو اپنے کالم میں جگہ دے کر اس طرح کے سنگین مسائل کے حوالے سے عوام میں پائی جانے والی تشویش کا خاتمہ کریں گے۔ ہم آپ کے عملی اور تحریری تعاون (بذریعہ اوصاف) کے منتظر ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

والسلام، سید اظہار بخاری

انچارج میڈیا سیل تحریک جعفریہ پاکستان"

ہمیں واقعتاً اس سے قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ افغانستان میں عسکری تربیت کے مراکز کی بندش کے سلسلہ میں امریکہ کے ساتھ تحریک جعفریہ پاکستان بھی شریک ہے اور ہمارا خیال تھا کہ تحریک جعفریہ شاید ہماری طرح اس عسکری تربیت کے غلط استعمال کی روک تھام پر زور دے رہی ہے۔ مگر اس خط سے واضح ہوا ہے کہ تحریک جعفریہ ان کیمپوں کی مکمل بندش چاہتی ہے اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان کیمپوں کو بند کرانے کیلئے جنرل ضیاء الدین بٹ نے آئی ایس آئی کے سربراہ کی حیثیت سے افغانستان کا جو دورہ کیا تھا اسے تحریک جعفریہ کی حمایت حاصل تھی۔

خط قارئین نے پڑھ لیا ہے، ہم اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کالموں میں ہم اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کر چکے ہیں۔ البتہ بطور یاد دہانی دو امور کا اعادہ اس خط سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کیلئے کر رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے جو اس مکتوب میں ظاہر کی گئی ہے بلکہ اصل ترتیب یہ ہے کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد پاکستان میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے انقلاب ایران کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ پاکستان میں فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کیلئے اسلام آباد کے سول سیکرٹریٹ کا محاصرہ کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے ردعمل کے طور پر سپاہ صحابہؓ وجود میں آئی اور اس نے تشدد کے جواب میں تشدد کی پالیسی اختیار کی اور دونوں طرف کے تشدد میں روز بروز اضافہ کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے ان کالموں میں تشدد اور جواب تشدد دونوں کو ہمیشہ غلط قرار دیا ہے اور آج بھی دونوں کو غلط کہتے ہیں۔
2. دوسری گزارش یہ ہے کہ سید اظہار بخاری صاحب نے اپنے مکتوب میں شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل عام کا ذکر کیا ہے جو بلاشبہ اور انتہائی افسوسناک ہے لیکن وہ دوسری طرف کا ذکر اس طرح گول کر گئے ہیں جیسے ان کے مخالف کیمپ میں سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس دوران اہل سنت کے مذہبی رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل کا تناسب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چونکہ دونوں طرف ہونے والے واقعات قارئین کے سامنے ہیں اس لیے اس کے ذکر کو مزید بڑھا کر ہم تلخ یادوں کو پھر سے تازہ نہیں کرنا چاہتے مگر ایک سادہ سا سوال ہے کہ اگر شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کرنے والے "دہشت گردوں" نے افغانستان کے کیمپوں میں ٹریننگ حاصل کی ہے تو سنی رہنماؤں اور کارکنوں کا وسیع پیمانے پر قتل عام کرنے والے "دہشت گردوں" کے تربیتی مراکز کہاں ہیں؟ اور اگر ان کیمپوں کا سراغ مل جائے تو کیا تحریک جعفریہ

پاکستان ان کی بندش کا مطالبہ کرنے میں بھی اسی مستعدی اور سرگرمی کا مظاہرہ کرے گی؟

ہمارے خیال میں اس قسم کی یکطرفہ سوچ نے معاملات کو یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ اگر دونوں فریق معروضی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے انصاف کے مسلمہ تقاضوں کو نظر انداز نہ کریں تو صورتحال اب بھی قابو میں آسکتی ہے۔ ہم ملک کے سنجیدہ حلقوں کی اس خواہش کے ساتھ متفق اور اس کے مؤید ہیں کہ جہادی تربیت کے مراکز میں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو ملک کے داخلی معاملات بالخصوص فرقہ وارانہ کشیدگی میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اور اس کے سدباب اور روک تھام کیلئے پاکستان، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کے درمیان باضابطہ طور پر جو معقول سسٹم طے کیا جا سکتا ہے ہم اس کا خیر مقدم کریں گے بشرطیکہ یہ نظام یکطرفہ نہ ہو بلکہ دونوں طرف کے ”دہشت گردوں“ کا راستہ روکنے والا ہو۔ لیکن اپنے اس موقف پر ہم آج بھی قائم ہیں کہ دہشت گردی کی روک تھام کے نام پر سرے سے ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ خالصتاً امریکی ایجنڈا ہے اور ہم دنیا بھر کی جہادی تحریکات سے بے وفائی کرتے ہوئے اس امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے والی کسی کارروائی یا تجویز کی حمایت نہیں کر سکتے۔

افغان اور چیچن مجاہدین

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- اپریل ۲۰۰۰ء

میرا سوال راجہ صاحب محترم سے یہی تھا کہ جو کچھ ہمارے ان بزرگوں نے برصغیر میں برطانوی استعمار کے خلاف کیا تھا وہی کچھ افغانستان اور چیچنیا کے مجاہدین نے روسی استعمار کے خلاف کیا ہے۔ وہی فتویٰ جہاد ہے، وہی تکنیک ہے، وہی جذبۂ آزادی ہے اور وہی بے سروسامانی کے باوجود وقت کی بہت بڑی قوت کے ساتھ ٹکرانے کا عمل ہے۔ اس لیے اگر ہمارے مجاہدین آزادی قومی ہیرو ہیں اور ان کی جدوجہد کو خودکشی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے تو ان کے نقش قدم پر چلنے والے افغان مجاہدین اور چیچن مجاہدین بھی اسی طرح کے قومی ہیرو ہیں اور انہیں صرف اس وجہ سے اعزاز سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جنگ آزادی میں ان کا سامنا روس سے ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

راجہ صاحب محترم کیلئے میری یہ گزارش بہت اطمینان کا باعث بنی ہے کہ افغان مجاہدین نے امریکہ کی امداد قبول کر کے غلطی کی تھی۔ میں اس رائے پر اب بھی قائم ہوں لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ امریکی امداد قبول کرنے والے جہادی گروپ آج بھی امریکی کیمپ میں ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے افغان عوام کی قربانیوں کو قبول کرتے ہوئے تکوینی طور پر طالبان کو آگے کر دیا ہے جنہوں نے امریکی امداد کی نحوست کو ایک طرف کر کے افغان عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی اور جہاد کے منطقی ثمرات کو صحیح رخ پر رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بارگاہ ایزدی میں افغان عوام کے خلوص اور قربانیوں کی قبولیت کی دلیل ہے کہ جہاد افغانستان میں امریکی امداد کے منحوس اثرات بہت جلد ”کھڈے لائن“ لگ گئے ہیں۔

راجہ صاحب محترم کا ذہن اس بات کو بھی قبول نہیں کر رہا کہ صرف (ان کے بقول) دو ہزار چیچن مجاہدین نے روسی فوج کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ جنگ آزادی کیسے ہوگئی ہے اور اسے خودکشی سے کیوں تعبیر نہیں کیا جاتا؟ انہوں نے اس حوالے سے یہ بھی سوال کیا ہے کہ آخر یہ کس کی سنت ہے؟ اس کے جواب میں اسلامی تاریخ کے سینکڑوں ایسے معرکوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جن میں مٹھی بھر مسلمانوں نے دشمن کی افواج قاہرہ کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان میں سے صرف ایک واقعہ کا تذکرہ سر دست کر رہا ہوں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں رومۃ الکبریٰ کی عظیم سلطنت کی افواج کے مقابلہ میں ایک محاذ پر حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ اسلامی لشکر کی کمان کر رہے تھے، دشمن کی فوج کی تعداد تین لاکھ جبکہ مسلمانوں کی تعداد ۳۰ ہزار تھی۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دشمن نے دو لاکھ چالیس ہزار فوج کو ریزرو میں ایک طرف رکھتے ہوئے ساٹھ ہزار فوج کو مسلمانوں کے سامنے کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تیس ہزار فوج کا مقابلہ اس ساٹھ ہزار کے لشکر سے ہوگا اور جب دونوں لشکر جنگ میں تھک ہار جائیں گے تو دو لاکھ چالیس ہزار کی تازہ دم ریزرو فوج اچانک حملہ کر کے مسلمانوں کا صفایا کر دے گی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے دشمن کی چال کو محسوس کرتے ہوئے ساتھیوں کے مشورہ سے فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی تھوڑی سی فوج کو مقابلہ میں کھڑا کر کے باقی فوج کو ریزرو میں رکھنا چاہیے تاکہ تازہ دم فوج کا مقابلہ تازہ دم فوج سے ہی ہو۔ یہ طے کر کے انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ مجھے اسلامی فوج میں سے اپنی مرضی کے صرف ساٹھ افراد منتخب کرنے کا اختیار دے دیجیے، میں ان ساٹھ نوجوانوں کے ساتھ ساٹھ ہزار کے اس لشکر سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خالد بن ولیدؓ نے صرف ساٹھ نوجوانوں کی کمان کرتے ہوئے ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل فوج کو میدان جنگ میں عبرتناک شکست سے دوچار کر دیا۔ یہ معرکہ اس قدر معروف ہے کہ اس پر عرب شعراء نے مجاہدین کی تعریف میں قصیدے لکھے جن میں سے ایک شعر اس وقت میرے ذہن میں آ رہا ہے:

غزا ستون ہم ستون الفا
ومع ہذا تولوا مدبرینا

ترجمہ: ساٹھ مجاہدین نے ساٹھ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا اور ساٹھ ہزار کا لشکر کثرت کے باوجود میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس لیے راجہ انور صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اگر روسی وحشیوں کے خلاف بددعا میں کوئی حرج محسوس نہ کرتے ہوں تو حضرت خالد بن ولیدؓ کی سنت زندہ کرنے والے چیچن مجاہدین کو خودکشی کا طعنہ دینے کی بجائے ان کی کامیابی کیلئے بارگاہ ایزدی میں دعا کریں۔

"دہشت گردی" کا امریکی تصور

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- اپریل ۲۰۰۰ء

آخر میں کچھ بات "دہشت گردی" کے حوالے سے بھی ہو جائے کہ آخر امریکہ کے نزدیک اس کی تعریف کیا ہے؟ افغانستان کے حوالے سے دیکھ لیں کہ وہی عمل افغان مجاہدین روس کے خلاف کریں تو امریکہ کے نزدیک یہ ان کا جہادِ آزادی ہے۔ اور اسی لہجے میں وہ امریکی مداخلت کو قبول کرنے سے انکار کریں تو وہ دہشت گردی قرار پائے۔ امریکی سفیر یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ طالبان نے اسامہ بن لادن کو پناہ دے رکھی ہے اس لیے وہ دہشت گرد ہیں، اس لیے کہ اسامہ بن لادن کو امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کا کوئی معروف اصول اور قانون بھی ہے یا امریکہ ہی دنیا کا واحد معیار ہے کہ جسے امریکی حکومت دہشت گرد کہہ دے اس پر وحی آسمانی کی طرح ایمان لانا پوری نسل انسانی کے ذمہ فرض ہو جاتا ہے؟

جناب ولیم بی مائیلم سے بڑے ادب کے ساتھ ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بالفرض کسی وقت کوئی بڑی قوت امریکہ کی کسی ریاست میں اپنی فوجیں اتار کر اس کے تمام وسائل پر قبضہ کر لے، اور امریکہ میں ایسی حکومت ہو جو وہاں کے عوام کو ووٹ اور رائے کا حق دینے سے صاف انکار کر رہی ہو، اور اس شخصی آمریت اور قابض فوجی قوت کے درمیان گٹھ جوڑ کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنی بات کہنے کا کوئی فورم موجود نہ رہا ہو، ایسے حالات میں اگر کوئی باغیرت امریکی شہری اسامہ بن لادن کی طرح تنگ آکر غیر ملکی افواج کے تسلط سے اپنے وطن کو نجات دلانے کیلئے ہتھیار اٹھا لے تو کیا سفیر محترم اسے بھی دہشت گرد قرار دے دیں گے؟ اور آئندہ کیا، امریکہ تو ماضی میں اس مرحلہ سے گزر چکا ہے کہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف امریکی قوم نے اسی طرح ہتھیار بکف ہو کر آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اور جناب ولیم بی مائیلم شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ امریکہ جس طرح آزادی کی بات کر رہا ہے خود اس کی اپنی آزادی کے پیچھے اسامہ بن لادن طرز کے کئی "دہشت گرد" تاریخ کے جھروکوں سے جھانک رہے ہیں۔ اور صرف برطانوی استعمار کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا عمل نہیں بلکہ افغانستان میں طالبان اور شمالی اتحاد کی باہمی جنگ کی طرح بلکہ اس سے کہیں خوفناک خانہ جنگی بھی امریکی آزادی کی بنیادوں میں صاف دکھائی دے رہی ہے۔

لہٰذا اپنے لیے الگ اور دوسروں کیلئے الگ معیار قائم نہ کیجئے، اور جن مراحل سے خود گزر کر اس مقام پر پہنچے ہیں، دوسری قوموں کو ان مراحل سے گزرتے ہوئے ان پر پھبتیاں کس کر اور انہیں طعن وطنز کا نشانہ بنا کر خود اپنے ماضی کی نفی نہ کیجئے کہ یہ زندہ اور انصاف پسند قوموں اور افراد کا شیوہ نہیں ہوتا۔

طالبان کی اسلامی حکومت اور ڈاکٹر جاوید اقبال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء

معاصر قومی اخبار روزنامہ نوائے وقت نے گذشتہ روز ادارتی شذرہ میں یہ خوشگوار انکشاف کیا ہے کہ فرزند اقبالؒ ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ دنوں افغانستان کا دورہ کیا ہے اور واپسی پر اکوڑہ خٹک میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے

طالبان کے اسلامی انقلاب کی تعریف کی ہے اور اسے ایک کامیاب انقلاب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن قائم کیا آج کے دور میں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مذکورہ اداراتی شذرہ کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس ارادے کا اظہار کیا ہے کہ وہ پاکستان میں طالبان اور ان کے طرزِ حکومت کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کیلئے آواز اٹھائیں گے۔

جہاں تک طالبان کے طرز حکومت کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے سادگی، قناعت اور فرض شناسی کے حوالے سے ان عادل حکمرانوں کی یاد تازہ کر دی ہے جن کا تذکرہ ہم اب تک صرف کتابوں میں ہی پڑھتے آرہے ہیں۔ خود راقم الحروف کو بھی طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد دوبار افغانستان جانے کا موقع ملا ہے اور امارت اسلامی افغانستان کے سربراہ ملا عمر سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے ان کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی بے تکلفی، قناعت اور اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ ہے جس کیلئے وہ دنیا کی ہر قوت اور ہر دباؤ کا سامنا کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے معیار زندگی کو اتنا آگے بڑھایا ہی نہیں کہ انہیں عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے جھولی پھیلانے پر مجبور ہونا پڑے۔ جہاں ایک وفاقی وزیر کی تنخواہ ہزار بارہ سو روپے پاکستانی کے لگ بھگ ہو اور جہاں وفاقی وزیر کے ناشتہ میں دودھ کے بغیر چائے کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے ہوں وہاں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کیا کریں گے؟ اور یہی راز ہے طالبان کی کامیابی کا کہ انہوں نے اپنی چادر ماپ رکھی ہے اور اپنے پاؤں کو اس کی حدود کے اندر رہنے کا عادی بنا لیا ہے۔

اسی طرح افغانستان جیسے فساد زدہ ملک میں جہاں ایک ایک شہر میں درجنوں مسلح گروپ باہم متصادم رہتے ہیں اس درجہ کا امن قائم کرنا کہ طالبان کی ہر حرکت کو ناقدانہ انداز میں جانچنے والا ورلڈ میڈیا بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے بلاشبہ اس دور میں اسلام کا معجزہ ہے اور اس حقیقت کا عملی اظہار ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن کی ضمانت اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے۔

طالبان نے امن کے قیام کیلئے کوئی لمبی چوڑی محنت نہیں کی اور نہ ہی مختلف ملکوں میں کمیشن بھیج کر ان کے نظاموں کو اسٹڈی کیا ہے بلکہ صرف دو کام کیے ہیں۔

1. ایک یہ کہ تمام شہریوں سے اسلحہ واپس لے کر انہیں نہتا کر دیا،
2. دوسرا یہ کہ معاشرتی جرائم پر قرآن و سنت کی بیان کردہ شرعی سزاؤں کو عملاً نافذ کر دیا ہے۔

اس بارے میں انہوں نے کسی رورعایت سے کام نہیں لیا، کسی وی آئی پی کا لحاظ نہیں کیا اور قانون کے سامنے کسی فرد یا گروہ کے امتیاز کو سر نہیں اٹھانے دیا۔ اس لیے وہ یہ بات کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کا زیر حکومت علاقہ اس وقت دنیا کا سب سے پر امن علاقہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ہمارے ملک کے معروف دانشور ہیں، صاحب علم ہیں، صاحب مطالعہ ہیں اور علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند کی حیثیت سے امتیازی تعارف رکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام اور اسلام کی تشریح کے حوالے سے اب تک ان کی

سوچ جمہور علماء سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا ہے انہوں نے ترکی کے سیکولر انقلاب کی حمایت کی ہے اور اسی طرز کے "اجتہاد" کو پاکستان میں فروغ دینے کی بات کی ہے جسے پاکستان کے دینی حلقوں میں کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا اور خود ہم نے بھی متعدّد مواقع پر اپنے مضامین میں ان کے افکار پر کھلے بندوں تنقید کی۔ لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورۂ افغانستان کی اس اچانک خبر نے جہاں خوشی کے ایک نئے احساس سے دوچار کیا ہے وہاں اس حقیقت کے ایک بار پھر ادراک کا موقع بھی فراہم کیا ہے کہ محض سنی سنائی باتوں اور میڈیا کی پھیلائی ہوئی خبروں کی بنیاد پر کسی معاشرہ اور قوم کے بارے میں تاثرات قائم کر لینا درست طرز عمل نہیں ہوتا بلکہ صحیح تاثر وہاں کے حالات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک طرف تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے تفصیلی تاثرات کے منتظر ہیں کہ انہوں نے جو کچھ افغانستان میں دیکھا اس کے بارے میں ان کی مثبت یا منفی رائے کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ وہاں سب کچھ تو مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوگا، کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی ہوں گی اور ان کی نشاندہی بھی اہل دانش کا کام ہے بشرطیکہ وہ خلوص دل سے اصلاح احوال کے جذبہ کے ساتھ ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم دیگر اہل دانش سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ طالبان اور افغانستان کے بارے میں ورلڈ میڈیا کے تبصروں اور خبروں پر انحصار کرنے کی بجائے خود وہاں جائیں، حالات کا مشاہدہ کریں، انقلاب کا تجزیہ کریں اور اس کی خوبیوں کا فراخ دلی سے اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ کمزوریوں اور خامیوں کی نیک نیتی کے ساتھ نشاندہی کریں۔ آخر ہم بھی نصف صدی سے ملک میں اسلامی نظام کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اس کیلئے کسی ماڈل کی تلاش میں ہیں۔ اس ماڈل سسٹم کی تلاش میں مغرب اور مشرق کے کئی ملکوں میں ہمارے دانشوروں کے وفود جا چکے ہیں اور کئی نظاموں کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ یہ قریب اور پڑوس کا نظام بھی ایک نظر دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ ہمارا کام یہیں بن جائے۔

جہادی تربیتی کیمپ: وزیر داخلہ کے نام کھلا خط

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ اپریل ۲۰۰۰ء

بعد از سلام مسنون!

گزارش ہے کہ گذشتہ روز ایک قومی اخبار نے آنجناب کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ

"امریکہ کی طرف سے پاکستان سے دہشت گردی کی روک تھام کیلئے اقدامات کرنے کے مطالبہ پر لندن میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر داخلہ نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے طالبان کی حکومت پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر موجود تمام تربیتی کیمپ بند کر دے جہاں پر پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلح تربیت حاصل کرتے ہیں"۔ وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ

"انہوں نے سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ پر بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت گری بند کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو حکومت ان کے خلاف سختی سے نمٹے گی"۔

میں اس سلسلہ میں آنجناب کی توجہ چند حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے کیمپوں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں ایک عرصہ سے عالمی سطح پر اس تاثر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کیمپوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے اور طالبان حکومت اس دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اور باہمی قتل و غارت کے عنصر کو شامل کر کے اس تاثر کو یہ رخ دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کرنے والے سب لوگ انہی کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں اس لیے پاکستان میں فرقہ وارانہ امن کے قیام کیلئے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کے ان جہادی تربیتی مراکز کو بند کر دیا جائے۔

یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے جو مغربی میڈیا اور مغرب کی سیکولر لابیاں منظم طور پر پھیلا رہی ہیں اور امریکہ اس میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اپنے استحصالی اور استعمار پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کیلئے یہ تکنیک اختیار کی ہے اور میں آنجناب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کا اصل منظر یہ نہیں ہے جو ورلڈ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور آپ جیسے سنجیدہ حضرات نے بھی اگر اس کی تائید شروع کر دی ہے، اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ جنوبی اور وسطی ایشیا کے حوالے سے اپنے ایجنڈے کیلئے اس خطہ کے حکمران طبقہ کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جنوبی ایشیا کے دورہ سے صدر کلنٹن کے خالی ہاتھ واپس جانے کا تاثر امریکی ذرائع ابلاغ کی طرف سے طے شدہ پالیسی کے تحت اندرون خانہ طے ہونے والے معاملات پر پردہ ڈالنے کیلئے دیا جا رہا ہے۔

جناب والا! امریکہ اس خطہ میں جو کچھ چاہتا ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہیں ہو گا، میں یاددہانی کے طور پر بعض اہم امور کا ذکر اس عریضہ میں مناسب سمجھتا ہوں:

- امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے مغربی ثقافت اور اقوامِ متحدہ کے منشور کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی بنیاد پر خالص اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا جو عزم کر رکھا ہے وہ امریکہ کیلئے قابل قبول نہیں ہے اور امریکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں "وسیع البنیاد حکومت" کے نام پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کا حصہ بننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے جو دنیا کی بہت سی دیگر مسلم حکومتوں کی طرح "اسلام اسلام" کا راگ تو الاپتی رہے مگر افغانستان میں اقوامِ متحدہ کے منشور کے نفاذ اور مغربی ثقافت اور کلچر کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنے۔
- اس خطہ کی معیشت پر پہلے سے حاصل بالادستی کو امریکہ "آزادانہ تجارت" اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے مکمل اجارہ داری اور کنٹرول میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور چین سمیت کسی بھی دوسری قوت کے اس میں در آنے کے امکانات کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔

- امریکہ چین کے خلاف بھارت کی سربراہی میں متحدہ محاذ کے قیام میں اسلامی جمہوریہ پاکستان اور امارت اسلامی افغانستان کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان رکاوٹوں کو اس قدر کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ یا بھارت کے کسی بھی اقدام کی راہ میں کسی درجہ میں بھی حائل نہ ہو سکیں۔
- امریکہ اور بھارت کو مشترکہ طور پر پریشانی یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کے خلاف جو مجاہدین سالہا سال سے نبرد آزما ہیں اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجنڈے میں اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ان مجاہدین نے افغانستان کے انہی تربیتی مراکز میں ٹریننگ حاصل کی ہے اور ان تربیتی مراکز کو بند کرائے بغیر کشمیری مجاہدین کی سپلائی لائن کو کاٹا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔
- امریکہ کو یہ بھی پریشانی ہے کہ افغانستان میں جو تربیتی مراکز خود اس کے تعاون سے قائم ہوئے تھے اور جن مراکز نے افغان قوم کو روسی افواج کے مقابلہ میں صف آرا کر کے سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا ان مراکز سے دنیا بھر کے دیگر مسلم مجاہدین نے بھی عسکری تربیت حاصل کر لی ہے اور بوسنیا، کوسوو، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، مورو، اراکان اور صومالیہ وغیرہ میں اسلام کی سربلندی کے نام سے صف آرا ہو چکے ہیں جس سے دینی حلقے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں جس سے مسلم دنیا میں جہاد کا وہ عمل اور جذبہ ایک بار پھر عالمی سطح پر منظم ہو رہا ہے جسے ختم کرنے کیلئے مغربی طاقتیں دو صدیوں سے اپنے تمام وسائل کے ساتھ مصروف کار رہی ہیں مگر ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود فلسطین سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پوری دنیائے اسلامی میں پھر سے جہاد کے نعرے پورے جوش و خروش کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے امریکہ افغانستان کے ان تربیتی مراکز کو جلد از جلد بند کرانے کیلئے بے چین ہے۔

جناب وزیر داخلہ! جہاں تک پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا تعلق ہے یہ بلاشبہ انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اور اس کی روک تھام کیلئے حکومت پاکستان اور تمام تر قومی حلقوں کو سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کرنی چاہیے۔ لیکن اس فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار افغانستان کے تربیتی کیمپوں کو ٹھہرانا اور اس کی آڑ میں طالبان حکومت سے ان مراکز کی بندش کا مطالبہ کرنا سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کیمپوں سے تربیت پانے والے کچھ افراد پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث ہوئے ہوں گے لیکن یہ ہر ادارے میں ہوتا ہے۔ اگر پاکستان کی جیلوں اور مقدمات کے ریکارڈ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لے لیا جائے کہ ملک بھر میں قتل و غارت کرنے والے افراد نے اسلحہ چلانے کی ٹریننگ کہاں کہاں حاصل کی ہے تو ان میں یقیناً ایسے افراد نکل آئیں گے جنہوں نے اسلحہ کی تربیت پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز میں حاصل کی ہوگی۔ لیکن کوئی بھی باہوش شخص محض اس بنا پر پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز کو ملک میں بدامنی اور قتل کا ذمہ دار قرار نہیں دے گا اس لیے کہ چند افراد کی

انفرادی کارروائیوں کو اداروں اور مراکز کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسی طرح افغانستان کے تربیتی مراکز کو بھی پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کا باعث اور ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے اصل عوامل اور سرچشمے کچھ اور ہیں اور اگر آپ ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور سدباب میں سنجیدہ ہیں تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو آزادانہ انکوائری کے ذریعے سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کے اسباب و عوامل اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے سرچشموں کی نشاندہی کرے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آزادانہ اعلیٰ سطحی عدالتی انکوائری کے ذریعے پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کے فروغ میں افغانستان کے تربیتی مراکز کا کوئی کردار سامنے آیا تو اس کے سدباب اور روک تھام کیلئے ہر اقدام کی حمایت کی جائے گی مگر محض امریکی رپورٹوں کی بنیاد پر افغانستان کے تربیتی مراکز کو پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کا ذمہ دار قرار دے کر ان کی بندش کیلئے طالبان حکومت پر کسی بھی قسم کے دباؤ کی پالیسی کو ہم جہاد کے خلاف امریکی مہم کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس کی کسی درجہ میں تائید کیلئے تیار نہیں ہیں۔

جناب معین الدین حیدر! میں آپ کو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے وہ ریمارکس یاد دلانا چاہتا ہوں جو انہوں نے جنوری ۲۰۰۰ء کے وسط میں امریکی سینٹروں کے دورۂ پاکستان کے موقع پر ان سے گفتگو کے دوران دیے تھے اور جنہیں ایک قومی اخبار نے ان الفاظ میں رپورٹ کیا تھا کہ

> ”چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے وفد کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع کے مطابق جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہوگا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جا سکتا۔“

جناب وزیر داخلہ! جہاد اور دہشت گردی کے حوالے سے ہمارا موقف بھی یہی ہے اور ہم اس پر بدستور قائم ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپ کے ہر منصفانہ اقدام کی حمایت کریں گے مگر دہشت گردی کے خلاف کارروائی کے نام پر جہاد کے عمل، جہادی تحریکات اور جہادی تربیتی مراکز کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی پاکستان کے دینی حلقوں کیلئے قطعی طور پر قابل قبول نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ آنجناب بھی اپنی پالیسی ترجیحات میں جہاد اور دہشت گردی کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھ کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں گے۔

پاکستان، افغانستان، ایران کی کنفیڈریشن کی تجویز

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ اپریل ۲۰۰۰ء

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ روز لاہور میں منعقدہ ایک تقریب میں اپنے دورۂ افغانستان کے تاثرات بیان کرتے ہوئے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان، افغانستان اور ایران پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کی جائے اور تینوں ملک اپنے وسائل یکجا کر کے عالم اسلام کے وسیع تر اتحاد کی طرف پیش رفت کا آغاز کریں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے طالبان کی اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ طالبان نے افغانستان میں مثالی امن قائم کیا ہے اور وہ انتہائی مشکلات اور تکالیف کے باوجود پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہے، اس لیے ان کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں عوامی سطح پر افغانستان کی حکومت اور عوام کے ساتھ تعاون کیلئے ”افغان فنڈ“ قائم کیا جائے اور طالبان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے۔ اس سے قبل تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد بھی پاکستان اور افغانستان پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کرنے کی تجویز پیش کر چکے ہیں مگر ان کی تجویز میں ایران کا ذکر نہیں تھا جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور افغانستان کی اس مجوزہ کنفیڈریشن میں ایران کو شامل کرنے کی تجویز بھی دی ہے۔

جہادِ افغانستان کے نتیجے میں وسطی ایشیا سے روسی استعمار کی پسپائی کے بعد وسطی اور جنوبی ایشیا کے مستقبل کے سیاسی نقشے کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے اہل دانش اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سلسلہ میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ دہلی سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مقالہ نے صورتحال کے اس رخ کی نشاندہی کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں میں وسطی ایشیا، افغانستان اور پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں اس خطہ میں مغل ایمپائر دوبارہ زندہ تو نہیں ہو رہا؟ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر خود راقم الحروف کا وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ ایک طرف پاکستان، افغانستان اور وسطی ایشیا میں بڑھتے ہوئے روابط اور دوسری طرف جنوبی ہند میں ہندو انتہا پسندی کی روز افزوں منظم ہوتی ہوئی جذباتی تحریکات سے یوں لگتا ہے جیسے ہم پانی پت کی چوتھی اور آخری لڑائی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں جو غالباً وہی لڑائی ہوگی جسے بعض احادیث کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”غزوۂ ہند“ سے تعبیر کیا ہے اور جس کے بارے میں بعض اللہ والوں کی پیشین گوئیاں تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں کہ یہ فیصلہ کن اور آخری جنگ ہوگی جس کے بعد اس خطہ میں اسلام کا پرچم ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ لہرائے گا اور مشرق وسطی اور مشرق بعید کی اسلامی قوتوں کے درمیان جنوبی ایشیا کی یہ پٹی جو خلیج کے طور پر حائل دکھائی دیتی ہے مکمل طور پر کاٹ دی جائے گی۔

اس لیے تاریخی عمل کے ایک منطقی مرحلہ کے طور پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک ایسا تعلق ناگزیر دکھائی دیتا ہے جو دونوں کو ایک متحد قوت کی شکل دے دے اور دونوں کی قوت و وسائل اور توانائیاں یکجا ہو کر ایک بار پھر اسی طرح جنوبی ہند کی انتہا پسند اور جنونی ہندو قوت کے سامنے متحد ہو کر صف بندی کریں جس طرح مرہٹوں کی خوفناک یلغار کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت پر والیٔ افغانستان احمد شاہ ابدالیؒ نے پانی پت کے میدان میں معرکہ بپا کر کے

مرہٹوں کی قوت کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر اس میں ایران کی شرکت کی بات تاریخی پس منظر کے حوالے سے ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور ہم اس کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔

ماضی کا ریکارڈ یہ کہتا ہے کہ ایران کے صفوی حکمرانوں نے جہاں ایک طرف ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف معرکہ کارزار ہر دور میں سرگرم رکھا وہاں وہ وسطی ایشیا میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور متحدہ ہندوستان کی مسلم حکومت کو خلافتِ عثمانیہ سے کاٹ کر رکھنے کی پالیسی پر بھی مسلسل عمل پیرا رہے، اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دہلی پر ان افغانوں کی حکومت قائم نہ ہونے پائے جو مذہبی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کے خالص رجحانات کے حامل تھے۔ چنانچہ افغانوں کے مقابلہ میں مغل حکمران ہر دور میں ایران کے صفوی بادشاہوں کے منظورِ نظر رہے اور بابر بادشاہ کو نہ صرف سمرقند کے قبضہ میں صفیوں کا تعاون حاصل رہا بلکہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں بابر کی شکست کو اس کے بیٹے ہمایوں کے ذریعے دوبارہ شکست میں تبدیل کرنے میں بھی صفوی بادشاہت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ جبکہ شیر شاہ سوری کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اہل سنت کے عقائد اور رجحانات کا حامل تھا اور اس کے شاہی سکہ پر ایک طرف اس کا نام بطور بادشاہ درج تھا اور دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی کندہ تھے جو شیر شاہ سوری کی حکومت کے مذہبی رجحانات کی نشاندہی کر رہے تھے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ اگر شیر شاہ سوری کے جانشینوں کو ہمایوں کے ہاتھوں شکست نہ ہوتی اور افغان حکومت کی جگہ دہلی میں مغل حکومت قائم نہ ہوتی تو برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں اسلام ایک اسلامی نظریاتی حکومت کے طور پر سامنے آتا، اور اس خطہ کا نہ صرف خلافت عثمانیہ کے ساتھ باقاعدہ تعلق قائم ہو جاتا بلکہ دعوت و تبلیغ کے مسلسل ماحول کی وجہ سے یہ صورتحال یقیناً نہ سامنے آتی کہ انگریزوں کے ہاتھوں مغل حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی اس خطہ میں ہندوؤں ہی کی اکثریت باقی رہتی۔ مگر افغانوں کے مقابلہ میں مغلوں کا مزاج نسبتاً سیکولر تھا جنہوں نے مذہب کی بجائے علاقائی کلچر کے فروغ کو ترجیح دی اور اسلامی حکومت کی راہ ہموار کرنے کی بجائے مسلم حکومت کے ٹائٹل پر قناعت کرتے ہوئے پورے جنوبی ایشیا میں اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ شیر شاہ سوری کی حکومت کے خاتمہ میں یقیناً اس کے جانشینوں کی نااہلی کا بڑا دخل تھا مگر اس میں سب سے اہم کردار ایران کے صفوی حکمرانوں کا رہا ہے۔ اور اس کے بعد بھی دہلی کے معاملات میں ان کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ اورنگزیب عالمگیر کی اسلامی حکومت کو کامیاب ہوتا دیکھ کر اس کے بیٹوں اور اہل خاندان کو ورغلانے اور پھر دہلی پر نادر شاہ کے حملہ، وحشیانہ قتل عامہ اور لوٹ مار کے مراحل طے کر جانے میں بھی ایرانی حکمرانوں کو کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دلی پر جب تک مسلمان حکومت رہی اسے ایرانیوں کی مداخلت کا ہمیشہ سامنا رہا۔

چنانچہ جب میرے جیسا طالب علم اس تاریخ کو پڑھتا ہے تو اسے یہ سن کر ہی پریشانی ہونے لگتی ہے کہ کیا پاکستان اور افغانستان کی حکومتیں ایک بار پھر اسی دور میں واپس چلی جائیں گی اور ہمارے مقدر میں کیا کوئی اور نادر شاہ بھی تاریخ نے اپنے دامن میں چھپا رکھا ہے؟ اس لیے محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے بصد ادب و احترام گزارش ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کیلئے ان کا جذبہ اپنی جگہ قابل قدر ہے اور بلاشبہ یہ ان کے عظیم باپ علامہ محمد اقبالؒ کی خواہش اور آرزو بلکہ ہر

باشعور اور حساس مسلمان کی تمنا ہے، مگر اس کیلئے تجاویز کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے زمینی حقائق اور تاریخی پس منظر کو نظر انداز نہ کریں۔ کیونکہ ماضی کے تلخ تجربات سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو مستقبل کے نقشے میں صحیح رنگ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورۂ افغانستان کے تاثرات

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۰ء

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند اور لاہور ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ دنوں افغانستان کا دورہ کیا ہے اور واپسی پر لاہور میں ایک تقریب کے دوران اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انہوں نے افغانستان کے انقلاب کو ایک کامیاب اسلامی انقلاب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن قائم کیا ہے وہ اس دور میں اور کوئی نہیں کر سکا اور یہ اسلامی احکام کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان اسلام اور پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہمیں مغرب کے دباؤ کے تحت طالبان کو ناراض نہیں کرنا چاہیے اور ان سے ہر ممکن تعاون کرنا چاہیے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ افغان خواتین کے بارے میں مغرب منفی پراپیگنڈا کر رہا ہے اور طالبان ہماری جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت ہمارے مفاد میں نہیں ہے اور ہم نے مغرب کے کہنے پر طالبان کا ساتھ چھوڑا تو ہمیں شدید نقصان ہو گا۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کا شمار ہمارے ملک کے لبرل دانشوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہمیشہ علماء کے طبقہ کی مخالفت کی ہے، اور اجتہاد کے نام پر اسلامی احکام و قوانین کی جدید تعبیر و تشریح کی بات کی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر جاوید اقبال ترکی کی ان اصلاحات کی بھی حمایت کرتے رہے ہیں جن کے تحت مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ اور اس کے ساتھ اسلامی قوانین کے پورے نظام کو ترکی سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا دورہ افغانستان اور ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر ان کی طرف سے طالبان کی حکومت کی حمایت کا یہ رجحان بلاشبہ حالات میں بہت بڑی تبدیلی کی غمازی کرتا ہے، اور طالبان کی اسلامی حکومت کی مخلصانہ پالیسیوں کی شہادت دیتا ہے۔

اس لیے ہم ملک کے دیگر دانشوروں سے بھی یہی گزارش کریں گے کہ وہ مغربی میڈیا کے پروپیگنڈا پر انحصار کرنے کی بجائے خود افغانستان جا کر حالات اور حقائق کا مشاہدہ کریں اور اپنے مظلوم اور غیور افغان مسلم بھائیوں کو اس مشکل اور نازک مرحلہ سے وقار اور کامیابی کے ساتھ باہر نکالنے میں ان سے عملی تعاون کی کوئی صورت نکالیں۔

جہاد اور قومی اتفاق رائے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- مئی ۲۰۰۰ء

راجہ انور صاحب محترم کی دوسری شکایت یہ ہے کہ جہادِ افغانستان کے بارے میں ان کے سوال کا جواب تشنہ رہ گیا ہے۔ اگر وہ جواب کے حسب منشا نہ ہونے کی بات کرتے تو مجھے مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی مگر جواب کے تشنہ رہ جانے کی بات ہوئی ہے تو اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

راجہ صاحب محترم کو جہادِ افغانستان کو جہاد تسلیم کرنے میں اشکال ہے، وہ اس کیلئے یہ دلیل دے رہے ہیں کہ جہاد کا یہ فتویٰ کسی مجاز اتھارٹی نے نہیں دیا تھا اور مجاز اتھارٹی ان کے نزدیک صرف ایک اسلامی حکومت ہے، اور اگر اس کا وجود نہ ہو تو قومی اتفاق رائے یا افغانوں کی زبان میں ”لویہ جرگہ“ کو اس کی جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن وہ علماء کو یہ حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ وہ جہاد کا فتویٰ دیں۔ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ ان سے فتویٰ لینے کے بعد جہاد کا اعلان کرے، اور نہ ہی حکومتی اتھارٹی کی عدم موجودگی میں علماء کرام کو یہ فتویٰ دینے کا اختیار حاصل ہے، اس لیے ان کے نزدیک جہاد افغانستان کو جہاد کہنا درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے راجہ صاحب کے ایک سوال پر عرض کیا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں جہاد کے اعلان کا اختیار صرف حکومت کو حاصل ہے اور اس کے سوا کسی اور کو یہ حق نہیں ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت کا وجود نہ ہو اور کفار کے غلبہ و تسلط کا خطرہ پیش آجائے، یا کوئی برائے نام مسلم حکومت موجود ہو اور وہ غلبہ پانے والے کفار کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے تو ملی آزادی اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے جہاد کے اعلان کا حق علماء کو منتقل ہو جاتا ہے، اور یہ صرف حق اور اختیار نہیں ہوتا بلکہ ذمہ داری اور فرض بن جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ملت کی قیادت کرتے ہوئے حملہ آوروں کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں واضح شرعی اور فقہی احکام موجود ہیں، لیکن ان سے قطع نظر ایک مشترکہ اصول عالمی سطح پر بھی تسلیم شدہ ہے کہ ”اتھارٹی“ کا خلا کبھی کسی جگہ نہیں رہتا۔ اور اگر کہیں اصل اتھارٹی موجود نہ رہے تو اسے پر کرنے کیلئے جو بھی آگے آجائے اور اس کے فرائض سنبھال لے، خلا اور تعطل سے بچنے کیلئے اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ ہم اس اصول کو اپنی قومی زندگی میں کئی بار بھگت چکے ہیں اور اس وقت بھی اسی مرحلہ میں ہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں برصغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی کی مثال دی تھی کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کے اقتدار پر قبضہ کر کے مغل بادشاہ کو ایک کٹھ پتلی کی حیثیت دے دی تو برائے نام مغل حکمران کے موجود ہوتے ہوئے بھی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جانشین شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور اسی فتویٰ کی بنیاد پر آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی۔

میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان میں علماء کا فتویٰ برطانوی استعمار کے خلاف جہاد آزادی کی بنیاد بن سکتا ہے تو افغانستان میں بھی روسی استعمار کے خلاف علماء کا فتویٰ جہاد کی بنیاد قرار پا سکتا ہے، اور اس کے شرعی جہاد ہونے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ورنہ اگر افغان علماء کو جہاد کا فتویٰ دینے کا حق نہیں تھا تو شاہ عبد العزیز دہلویؒ اور دوسرے

علماء ہند کو بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوٰی دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا، اور راجہ صاحب کے اس فلسفہ کے مطابق برصغیر پاک و ہند کا جہاد آزادی بھی شرعی جہاد کی بجائے فساد قرار پاتا ہے۔ میں نے راجہ صاحب سے ان دونوں کے درمیان فرق پوچھا تھا مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب دینے کی بجائے میرے جواب کو تشنہ قرار دینے میں عافیت سمجھی ہے۔

میرے نزدیک راجہ صاحب کی اصل مجبوری یہ ہے کہ ان کے گراموفون کی سوئی کابل پر اٹک کر رہ گئی ہے اور اس سے آگے یا پیچھے ہونے کیلئے تیار نہیں ہے۔ ورنہ وہ اگر کابل کی سطح سے بلند ہو کر تھوڑے سے وسیع تناظر میں جائزہ لے لیں تو مسئلہ کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ عالم اسلام میں استعماری قوتوں کے خلاف جہاں بھی آزادی کی جنگ جہاد کے عنوان سے لڑی گئی ہے وہاں اصل قوت محرکہ علماء ہی کی تھی اور انہی کے فتوٰی پر جہاد آزادی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ برصغیر پاک و ہند اور افغانستان سے ہٹ کر ایک اور مسلم ملک کی جنگ آزادی پر نظر ڈال لیں جس نے مسلسل جہاد آزادی کے ذریعے فرانسیسی استعمار سے آزادی حاصل کی ہے۔ میری مراد الجزائر سے ہے جہاں الشیخ عبد الحمید بن بادیسؒ اور الشیخ بشیر الابراہیمیؒ کی قیادت میں علماء کرام نے فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد کا فتوٰی دیا اور خود بھی اس جہاد آزادی میں عملاً شریک ہوئے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی واقعہ قارئین کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ الشیخ عبد الحمید بن بادیسؒ جن کا شمار الجزائر کی جنگ آزادی میں بن بیلا، بومدائن اور بوضیاف کے ساتھ صف اول کے راہنماؤں میں ہوتا ہے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں اور انہی کے حکم پر انہوں نے الجزائر کی جنگ آزادی میں علماء کرام کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ وہ فرانسیسی استعمار کے مظالم کی وجہ سے ہجرت کر کے الجزائر سے مدینہ منورہ چلے گئے تھے، یہ وہ دور تھا جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مسجد نبویؐ میں حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ بن بادیسؒ نے ان سے حدیث شریف پڑھ کر اجازت حاصل کی تو حضرت مدنیؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ مدینہ منورہ میں قیام کرنے کی بجائے اپنے وطن الجزائر واپس جائیں اور علماء کرام کو منظم کر کے فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد آزادی میں حصہ لیں۔ چنانچہ شیخ بن بادیسؒ نے استاد کے حکم پر مدینہ منورہ میں رہنے کا ارادہ ترک کیا اور الجزائر واپس جا کر علماء کرام کو جہاد آزادی کیلئے تیار کیا۔

راجہ صاحب محترم کا کہنا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی اتھارٹی موجود نہ ہو تو جہاد کے فتوٰی کیلئے قومی اتفاق رائے ضروری ہے، ورنہ وہ شرعی جہاد نہیں ہوگا۔ راجہ صاحب سے گزارش ہے کہ یہ بات قطعی طور پر قابل عمل نہیں ہے اور اس کے علاوہ شرعی احکام اور ملی روایات کے بھی منافی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی تحریکات آزادی میں کسی جگہ بھی اس کا اہتمام ضروری نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی کسی ملک میں اس کا اہتمام کرنا ممکن تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں اگر شاہ عبد العزیز دہلویؒ جہاد کا فتوٰی دینے سے پہلے قومی اتفاق رائے کے حصول کیلئے نکل کھڑے ہوتے تو یہ آج تک حاصل نہ ہو پاتا۔

اور اگر برصغیر پاک و ہند، افغانستان اور الجزائر کے حوالے سے بات راجہ صاحب کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو اس تناظر کا دائرہ تھوڑا سا اور وسیع کرتے ہوئے ایک اور حوالے سے راجہ صاحب سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ جب ویتنام میں

امریکی فوجیں اتری تھیں تو کامریڈ ہوچی منہ اور ویت کانگ نے امریکی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کیلئے کون سے قومی اتفاق رائے کا اہتمام کیا تھا؟ اور اگر وہ راجہ صاحب کے اس فلسفہ کے پیچھے چل پڑتے تو کیا ویتنام سے امریکی فوجوں کا انخلا کبھی ممکن ہوتا؟ اس لیے اگر ویت کانگ کو اس فلسفہ کی پابندی سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے تو بیچارے افغانوں کو بھی "معافی" دے دینے میں کیا حرج ہے؟

صوفیائے کرام اور مجاہدین

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ مئی ۲۰۰۰ء

راجہ انور صاحب نے اپنے تفصیلی مضمون میں بعض امور کی وضاحت کیلئے فرمایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی ہے کہ علم الکلام کی موشگافیوں میں نہ پڑوں۔ مگر میرے لیے اس شرط کو پورا کرنا مشکل ہے اس لیے کہ اگر بات علم الکلام سے متعلق ہوگی تو اس کی وضاحت کیلئے علم الکلام کے اصولوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا، ورنہ اگر انجینئرنگ کے کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے میڈیکل سائنس کے اصولوں کو تذکرہ کرنے بیٹھ جاؤں گا تو خود راجہ صاحب موصوف کو شکایت ہوگی۔ مثلاً انہوں نے عقائد و نظریات کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں کو غیر جامد اور متحرک قرار دیا ہے جس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ اس امر کی وضاحت میں سابقہ مضمون میں کر چکا ہوں کہ عقائد اور چیز ہیں اور نظریات ان سے مختلف امور کا نام ہے۔ اب ان میں سے عقائد کا تعلق علم الکلام سے ہے اس لیے اس حوالے سے جو بات بھی ہوگی علم الکلام کے اصولوں کی روشنی میں ہوگی اور اس اصول سے صرف نظر کرنے کا مطلب گفتگو اور مباحثہ کے مسلمات اور طے شدہ قواعد و اصول سے انحراف ہوگا جو کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں ہے۔

عقائد و نظریات کے بارے میں چند ضروری امور کی وضاحت گذشتہ مضمون میں کر چکا ہوں البتہ اس میں ایک پہلو قدرے تشنہ رہ گیا تھا جس کی تکمیل کیلئے تھوڑا سا تکرار ضروری ہوگیا ہے، امید ہے کہ قارئین اس تکرار کو محسوس نہیں کریں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عقائد کی بنیاد وحی الٰہی، آسمانی تعلیمات، حقائق ثابتہ اور نصوص صریحہ پر ہوتی ہے اس لیے ان میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ یہ قطعی طور پر جامد اور غیر متحرک ہیں اور انسان کی عقل، شعور اور مشاہدہ جتنا بھی ترقی کر جائے بنیادی عقائد میں کسی طرح کا کوئی فرق رونما نہیں ہوگا۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا وجود قائم رہے گا، اس کی توحید موجود رہے گی، اور اس کی صفات و اختیارات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ البتہ عقائد کی تعبیر و تشریح اصحاب علم کے پاس موجود و میسر معلومات اور ان کی قوت ادراک پر موقوف ہے اس لیے اس بارے میں ارباب علم و دانش کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ جبکہ افکار و نظریات کا انحصار انسانی فکر و شعور پر ہے اور افکار و نظریات کے باب میں انسانوں کا آپس میں مکمل طور پر متفق ہونا کہیں بھی ضروری نہیں ہے۔

اس اصول کی وضاحت کے بعد میں نے عرض کیا تھا کہ معاملہ وہاں گڑبڑ ہوتا ہے جہاں ان تینوں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس فرق کی وضاحت تشنہ رہ گئی تھی کہ جس طرح کچھ مذہبی حلقے عقائد کی طرح ان کی تعبیر و تشریح

اور افکار و نظریات کو بھی جامد اور غیر متغیرّ قرار دے کران پر عقائد کی طرح ڈٹ جاتے ہیں جس سے تنازعات جنم لیتے ہیں اور فرقہ بندی کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اسی طرح دوسری طرف جب ہمارے بعض دانشور تعبیر و تشریح اور افکار و نظریات کی طرح عقائد کو بھی متحرک اور غیر جامد قرار دے کران میں تغیر و تبدل کا تقاضا کرنے لگتے ہیں تو دین کا پورا ڈھانچہ ہی سبوتاژ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور قدیم و جدید کے درمیان فکری کشمکش کا موجودہ تناظر انہی دو انتہاؤں کے ٹکراؤ اور تصادم کے نتیجے میں نظر آرہا ہے۔ ورنہ اگر تینوں امور کو اپنے اپنے دائرہ میں رکھا جائے تو ہر تنازعہ کا حل نکل آتا ہے۔

مذہبی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے راجہ انور صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ سعودی عرب، مراکش، ایران، پاکستان، افغانستان اور دیگر ممالک میں فقہی مذاہب مختلف ہیں اور کسی ملک میں وہاں کی فقہ سے وابستگی نہ رکھنے والے کسی مسلمان کا اقتدار میں آنا مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ کوئی پریشانی اور الجھن کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ بات مسلمہ طور پر طے ہو چکی ہے کہ جس ملک کے باشندوں کی اکثریت جس فقہ سے تعلق رکھتی ہے وہاں اسی اکثریت کا فقہی مذہب نافذ العمل ہوگا اور اس پر کسی دوسرے کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مثلاً سعودی عرب میں حنبلی فقہ نافذ ہے جو دیگر تمام فقہی مذاہب کے پیروکاروں کیلئے ملکی قانون کے طور پر قابل قبول ہے۔ جبکہ افغانستان میں فقہ حنفی کو ملکی قانون کا درجہ دیا گیا ہے اور دنیا کے کسی خطہ کے غیر حنفی حضرات کو اس پر کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس لیے جب ان فقہی مذاہب کے علمبردار ایک دوسرے کے اس اصول اور فطری حق کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کا احترام کر رہے ہیں تو میرے خیال میں محترم راجہ انور صاحب کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

راجہ صاحب محترم نے صوفیاء کرام اور مجاہدین کے الگ الگ راستوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مجاہدین کی طرح تلوار لہرا کر اسلام کا نعرہ لگانے کی بجائے صوفیاء کرام کی طرح خاموشی، محبت اور رواداری کے ساتھ اسلام کی دعوت دینا زیادہ مؤثر ہے۔ لیکن راجہ صاحب یہ تاریخی حقیقت نظر انداز کر گئے ہیں کہ صوفیاء کرام اور مجاہدین کا راستہ کبھی ایک دوسرے سے متضاد اور مختلف نہیں رہا، دونوں ایک دوسرے کے کام میں ہمیشہ معاون و مددگار رہے ہیں۔ میں اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں ہندوستان پر ہونے والے تین بڑے عسکری حملوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

سلطان محمود غزنویؒ ہمارے مجاہدین اور فاتحین میں بلند مقام رکھتے ہیں اور ہند کو مسلمانوں کے حق میں مسخر کرنے میں ان کے حملوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان پر ان کی فوج کشی کے دوران اس وقت کے چشتیہ سلسلہ کے سب سے بڑے بزرگ خواجہ ابو محمد چشتیؒ بذات خود اپنے سینکڑوں مریدوں کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوئے اور لڑائی میں عملاً حصہ لیا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوریؒ کا ذکر خود راجہ انور صاحب نے بھی کیا ہے لیکن انہیں شاید یہ بات یاد نہیں رہی کہ سلطان شہاب الدین محمد غوریؒ کو ہندوستان پر لشکرکشی کی دعوت ہی سلطان الاولیاء حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتیؒ نے دی تھی۔ اور نہ صرف ان کے مریدوں نے بلکہ بعض مصدقہ تاریخی روایات کے مطابق خود خواجہ اجمیریؒ نے بھی سلطان غوریؒ کے پرچم تلے جہاد میں عملاً حصہ لیا تھا اور اسی کے نتیجے میں اس خطہ میں پہلی مسلم ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔

مغلوں کے انحطاط و زوال کے دور میں جب جنوبی ہند کے مرہٹے انتہا پسندانہ اور جنونی ہندوازم کا پرچم اٹھائے شمالی ہند کے مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کیلئے طوفانی یلغار کی صورت میں آگے بڑھ رہے تھے تو ان کے مقابلہ میں دہلی کی مسلم قوت کو کمزور دیکھتے ہوئے اس وقت کے سب سے بڑے صوفی اور فلسفی عالم حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قندھار کے والی احمد شاہ ابدالیؒ کو ہندوستان پر لشکرکشی کی دعوت دی تھی اور اسی دعوت پر احمد شاہ ابدالیؒ نے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر شمالی ہند (موجودہ پاکستان) کے مسلمانوں کو جنونی مرہٹوں کی یلغار سے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا تھا۔

یہ تاریخی حقائق ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ صوفیاء کرام اور مجاہدین کے راستے کبھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں رہے اور طریق کار الگ الگ ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان نہ صرف تعلقات کار موجود رہے ہیں بلکہ انہوں نے ہر دور میں ایک دوسرے سے تعاون بھی کیا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کا امتحان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ مئی ۲۰۰۰ء

سپریم کورٹ آف پاکستان کے بارہ جج صاحبان نے متفقہ طور پر جنرل پرویز مشرف کے بارہ اکتوبر کے اقدام کو نظریۂ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا ہے اور انہیں تین سال تک عام انتخابات کرانے کی ہدایت کرتے ہوئے آئین میں ترمیم کا اختیار بھی سونپ دیا ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کو بھی سپریم کورٹ نے اسی نوعیت کا اختیار دیا تھا مگر اس میں تین سال کے عرصہ کی قید نہیں تھی۔ چنانچہ جنرل مرحوم نے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مختلف اقدامات کے ذریعے گیارہ سال تک اقتدار کو اپنے پاس رکھا تھا اور اگر بہاولپور کا سانحہ پیش نہ آتا تو بظاہر ابھی اقتدار سے ان کا الگ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے بارہ اکتوبر کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت برطرف کرتے ہوئے آرمی چیف کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو ان کا یہ اقدام آئین سے ماورا ہونے کے باوجود نہ صرف پاکستانی عوام نے اسے قبول کرتے ہوئے اس میں خیر مقدم اور خوش آمدید کا رنگ بھر دیا تھا بلکہ بین الاقوامی اداروں اور امریکہ سمیت مغربی حکومتوں نے بھی اس کے بارے میں ”گوارا ہے“ کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے کہ میاں محمد نواز شریف کی حکومت عالمی قوتوں اور پاکستانی عوام دونوں کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی اور بیک وقت دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں وہ دونوں کے اعتماد سے محروم ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے بارہ اکتوبر کے اقدام کو دونوں حلقوں میں اپنے اپنے انداز سے قبول کر لیا گیا اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سندِ جواز بھی فراہم کر دی ہے۔

اس عدالتی مینڈیٹ کے بعد جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا رخ کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ چند روز تک ہو جائے گا بلکہ کچھ کچھ ہو بھی رہا ہے۔ مگر ہماری فقیرانہ رائے ہے کہ جنرل پرویز مشرف بھی میاں محمد نواز شریف کی طرح اسی مخمصے کا

شکار ہو چکے ہیں کہ عالمی اداروں اور پاکستانی عوام میں سے کس کو خوش رکھنا ہے اور ان میں سے کس کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی خواہشات، توقعات اور ترجیحات مختلف بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور دونوں کو بیک وقت خوش رکھنے کی کوئی کوشش اب میاں نواز شریف کے حشر سے سبق حاصل نہ کرنے کی کوشش ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

مغربی ممالک اور عالمی اداروں کی توقعات اور ایجنڈا کچھ اس طرح ہے کہ:

- پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے کشمیر سے دستبردار ہو جائے، چین کے خلاف امریکہ کے قائم کردہ متحدہ محاذ میں شریک ہو، اور نیپال، سکم اور بھوٹان کی طرح ایک طفیلی ریاست کی حیثیت اختیار کرے۔
- پاکستان صنعتی ترقی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے، وسطی ایشیا کی منڈی کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی بجائے ایک زرعی ملک کی حیثیت پر اکتفا کرے اور صنعتی ممالک کیلئے وسطی ایشیا تک محض ایک گزر گاہ بن جانے کے ساتھ ساتھ خود بھی منڈی بننا قبول کرے۔
- مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کیلئے خطرات کا باعث بننے کی بجائے ان کے استحکام اور ترقی کیلئے کردار ادا کرے۔
- حکومت پاکستان بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور بڑی حکومتوں کے قرضے اور سود کی قسطیں بہر صورت ادا کرنے کیلئے اپنے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتی چلی جائے اور مالیاتی اداروں کو یہ مواقع فراہم کرتی رہے کہ وہ پاکستانی عوام کو کوئی ریلیف فراہم کرنے کی بجائے ان کے گرد معاشی پابندیوں اور ٹیکسوں کے حصار تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جائیں۔
- پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد پر افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی تقویت اور استحکام کا باعث نہ بنے بلکہ طالبان کو کسی طرح گھیر گھار کر شمالی اتحاد کے ساتھ مخلوط حکومت کیلئے آمادہ کرے تاکہ افغانستان کی حکومت میں اسلامیت کے عنصر کو جس حد تک ممکن ہو کم کیا جا سکے۔
- پاکستان کے اندر دینی مدارس جہادی تحریکات اور مذہبی اقدار کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ثقافت و کلچر کی آڑ میں حلال و حرام کے تصور سے ناآشنا معاشرت کے فروغ کی مہم کو ہر سطح پر عام کیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ ایجنڈا یا اس کی کوئی ایک شق بھی پاکستانی عوام کیلئے قابل قبول نہیں ہے۔ بلکہ اپنے پڑوس میں طالبان حکومت کی سادگی، قناعت پسندی، دینی حمیت، قومی غیرت اور قرضوں کیلئے عالمی طاقتوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کی روش کو دیکھ کر پاکستانی عوام کا بھی جی چاہتا ہے کہ:

- ان کے ملک کا نظام تبدیل ہو، پروٹوکول اور پرسٹیج کے تکلفات سے انہیں نجات ملے اور انہیں قناعت پسند

اور کفایت شعار حکمران اور افسران میسر ہوں۔

- انہیں طبقاتی امتیاز سے چھٹکارا حاصل ہو، وسائل اور دولت کی غلط تقسیم اور ہوشربا معاشی تفاوت کی لعنت سے جان چھوٹے۔
- قرضوں کا شکنجہ ٹوٹے، قومی دولت لوٹنے والوں کا حقیقی احتساب ہو اور ان سے قومی دولت اور اثاثے واپس لیے جائیں۔
- وہ مذہبی عدم رواداری اور فرقہ وارانہ تشدد کی دلدل سے نکلیں اور ایک پرامن اور خوشحال قوم کی حیثیت سے انہیں اقوامِ عالم کی برادری میں جائز اور باوقار مقام حاصل ہو۔
- پاکستان کی شہ رگ کشمیر سے بھارت کا آہنی پنجہ ہٹے اور کشمیری عوام آزادی حاصل کریں۔
- اسلامی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہوں اور ایک مضبوط اسلامی بلاک تشکیل پائے۔
- بیت المقدس آزاد ہو اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔
- جنوبی ایشیا میں بھارت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر باوقار تعلقات قائم ہوں، طاقت کا کوئی بھی عدم توازن اس خطہ میں بھارت کی بالادستی کا ذریعہ نہ بنے۔ اور افغانستان اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اسلامی اخوت کی بنیاد پر مستحکم سے مستحکم تر ہوتے چلے جائیں۔

یہ دو ایجنڈوں کا ٹکراؤ ہے اور دو پروگراموں کا تصادم ہے۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے کہ وہ ان میں سے کس کا ساتھ دیتے ہیں اور کس پروگرام کو قبول کرتے ہیں۔ جنرل صاحب برسراقتدار آئے تو بہت سے دوست پوچھتے تھے اور اب بھی مختلف حضرات دریافت کرتے رہتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کس کے نمائندے ہیں اور کس لابی سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں ان سے عرض کرتا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دو دھاری تلوار کس طرف چلے گی۔ یہ آنے والا وقت بتائے گا اور جنرل پرویز مشرف کا ایجنڈا اور ترجیحات نشاندہی کریں گے کہ وہ اصل میں کس کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں وہ وقت آگیا ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلے نے جنرل پرویز مشرف کو اس فیصلہ کن دوراہے پر لاکھڑا کیا ہے جہاں سے انہوں نے بہرحال کسی ایک طرف ٹرن لینا ہے۔ میں اس نازک مرحلہ پر جنرل پرویز مشرف سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ صرف ایک شخص کا ٹرن نہیں بلکہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کے مجموعی تناظر میں پوری امت مسلمہ کا ٹرن بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وائٹ ہاؤس اور کعبۃ اللہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہوئے اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور پوری طرح جائزہ لے لیں کہ وہ تاریخ کے صفحات میں اپنی تصویر صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یا پھر میر جعفر، میر صادق اور شریف مکہ حسین میں سے کس کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں؟

جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے چند گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ جون ۲۰۰۰ء

گذشتہ ماہ کے دوران گوجرانوالہ میں حرکۃ الجہاد الاسلامی، باغ آزاد کشمیر میں جیش محمدؐ اور پسرور ضلع سیالکوٹ میں حرکۃ المجاہدین کے چند پروگراموں میں شرکت اور مجاہد نوجوانوں سے گفتگو کا موقع ملا، ان سے جہاد اور جہادی تحریکات کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایک بلند مرتبہ راہنما اور مفکر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں، انہوں نے آزادئ ہند کی خاطر زندگی کا ایک بڑا حصہ جلاوطنی میں گزارا اور تحریکِ آزادی کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کیلئے سرگرم کردار ادا کیا۔ ان کے رفقاء میں ایک نام مولانا منصور انصاریؒ کا بھی آتا ہے جو ان کے انتہائی قریبی ساتھی تھے اور جب ایک مرحلہ میں برلن میں پروفیسر برکت اللہ بھوپالیؒ کی سربراہی میں ”آزاد ہند گورنمنٹ“ کے نام سے جلاوطن حکومت کی بنیاد رکھی گئی اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو اس کا وزیر خارجہ مقرر کیا گیا تو ان کی نیابت کے طور پر مولانا منصور انصاریؒ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے طالب علمی کے دور میں ان کے دو رسالے دیکھے تھے جو فارسی میں تھے اور ان میں دنیا کے مختلف نظام ہائے حکومت اور اسلامی ریاست کے دستوری خاکے پر بحث کی گئی تھی۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے ان میں سے ایک رسالہ میں مولانا منصور انصاریؒ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؒ کے ظہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دو بزرگوں کی تشریف آوری سے قبل دنیا میں دو کام عملاً مکمل ہو چکے ہوں گے۔ ایک یہ کہ پوری دنیائے اسلام میں عالمی سطح پر بنیادی دینی تربیت یعنی نماز، روزہ اور دیگر احکام اسلامی اور دینی اخلاق کے حوالے سے ایک تربیت یافتہ جماعت وجود میں آچکی ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ جہاد کی تیاری اور ٹریننگ کے شعبہ میں بھی عالمی طور پر ایسی جماعت تیار ہو چکی ہوگی کہ دونوں بزرگ اسے لے کر عالمی استعمار اور یہودیت کے مقابلہ میں صف آرا ہو سکیں گے کیونکہ نزول اور ظہور کے بعد اتنا وقت نہیں ملے گا کہ وہ افراد جمع کریں، انہیں جماعت کی شکل دیں، ان کی تربیت کا اہتمام کریں اور ان کو معاشرتی انقلاب اور عسکری محاذ آرائی کیلئے تیار کریں۔ یہ دونوں کام ہو چکے ہوں گے اور دونوں بزرگ تشریف لا کر ان دونوں جماعتوں کی قیادت سنبھالتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔ مجھے اب پوری عبارت یاد نہیں ہے مگر بنیادی خیال مولانا انصاریؒ کا یہی ہے جسے میں نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور اگر مولانا انصاریؒ یہ بات نہ لکھتے تو بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؒ کے ظہور کے بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس لگتی ہے۔

یہ بات پڑھنے کے بعد ایک عرصہ تک میں اس شش و پنج میں رہا کہ یہ دو جماعتیں کونسی ہو سکتی ہیں؟ پہلی جماعت کے بارے میں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ تبلیغی جماعت ہو اس لیے کہ اس کا دائرہ پوری دنیا تک وسیع ہو رہا ہے اور اس میں مختلف اقوام و ممالک اور ہر رنگ و نسل کے لوگوں کی مسلسل شمولیت جاری ہے، نیز اس کا بنیادی کام ایک مسلمان کی دینی و اخلاقی تربیت اور اسے مسجد کے ساتھ جوڑ کر دین کے بنیادی اعمال پر لانا ہے۔ اس لیے اس جماعت

کی محنت اسی نہج پر محسوس ہوتی ہے جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ لیکن جہادی تربیت اور عسکری ٹریننگ والی جماعت کونسی ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک ذہن اس الجھن کا حل تلاش کرنے میں لگا رہا۔ کبھی کبھار مسلم ممالک کی مسلح افواج کا تصور ذہن میں آتا مگر ذہن اسے فوراً جھٹک دیتا کہ ان افواج کی تربیت اور ذہن سازی اس ماحول میں نہیں ہوئی کہ وہ دین کے کسی کام آسکیں بلکہ ان میں سے کوئی فوج خود کو اپنے ملک کے دینی حلقے کے خلاف استعمال ہونے سے بچالے اور وقت آنے پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام مہدیؒ کی جہادی افواج کے خلاف صف آرا ہونے سے باز رہ جائے تو اسلام اور ملتِ اسلامیہ پر یہی اس کا سب سے بڑا احسان ہوگا۔ لیکن کسی مسلم ملک کی موجودہ فوج سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ دین کے حوالے سے مسلمانوں کے کسی کام آئے گی اور اسلام کا پرچم بلند کر کے عالمی استعمار اور یہودیت کے خلاف صف آرا ہوگی۔ بہرحال ذہن اس الجھن میں تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جہاد افغانستان کا پرچم بلند ہوا اور روسی استعمار کے خلاف یہ دس سالہ جہاد پوری دنیا کے مجاہد نوجوانوں کا ٹریننگ سنٹر بن گیا اور آج صرف پندرہ بیس سال کے بعد میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جہاد کا عمل پوری دنیا میں پھیل گیا ہے اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں جہاد کے نعرے نہ گونج رہے ہوں اور جہاد کے دینی جذبہ سے سرشار ہزاروں نوجوانوں کا دل عالم کفر سے پنجہ آزمائی کیلئے نہ مچل رہا ہو۔

بوسنیا، کوسوو، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، صومالیہ، اری ٹیریا، اراکان، مورو، انڈونیشیا اور دیگر علاقوں میں جہاد کا جو عمل سامنے آ چکا ہے اس نے کفر کی آنکھیں کھول دی ہیں اور میری ذہنی الجھن بھی حل کر دی ہے کہ دنیائے اسلام میں عالمی سطح پر جہادی تربیت اور عسکری ٹریننگ سے بہرہ ور ایک عالمی فوج وجود میں آ چکی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے نزول اور امام مہدیؒ کے ظہور کے ساتھ ان کے پرچم تلے متحد ہو کر عالمی کفر اور اس کے یہودی قائدین کے خلاف صف آرا ہو کر معرکہ کارزار گرم کر سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنے وجدان اور تاریخی مطالعہ کی بنیاد پر عالمی تبلیغی جماعت اور دنیائے اسلام کی جہادی تحریکات کو وہی دو جماعتیں سمجھتا ہوں جن کا تذکرہ مولانا منصور انصاریؒ نے کیا تھا۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ایک جماعت کا شعبہ سول ہے اور دوسری جماعت کا میدان عسکری ہے لیکن دونوں کا رخ اور جہت ایک ہی ہے۔ اس لیے میں مجاہد نوجوانوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا عزم بلند رکھیں اور خود کو اس عالمی اسلامی فوج میں شمولیت کے جذبہ کے ساتھ تیار کریں جس کی قیادت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام مہدیؒ نے کرنی ہے اور دنیا میں ایک بار پھر خلافت اسلامیہ کا احیا کرنا ہے۔ یہ کشمیر، چیچنیا، فلسطین، اراکان اور مورو کے معرکے درمیانی مرحلے ہیں اور ٹریننگ اسکیمیں ہیں جو تکوینی طور پر جاری ہیں۔ اصل معرکہ ابھی آگے آنے والا ہے جو عالمی ہوگا، فیصلہ کن ہوگا اور آخری ہوگا اور ہر جہادی تحریک کے ہر کارکن کو اس کیلئے ذہنی اور عملی طور پر پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔

جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں کہ یہ جہادی تحریکات جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں جہاد افغانستان کے ثمرات ہیں اور افغان علماء اور مجاہدین کی عظیم خدمات کا نتیجہ ہیں۔ جبکہ جہاد افغانستان کے ثمرات صرف مسلمانوں اور مجاہدین تک محدود نہیں رہے بلکہ دنیا بھر نے ان ثمرات کو سمیٹا ہے:

- آج امریکہ روسی استعمار کی شکست کے بعد جو عالمی فاتح کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے یہ افغانستان کے غیور عوام کے جذبۂ حریت اور قربانیوں کا ثمر ہے ورنہ امریکہ ان نتائج کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔
- یورپ کے ممالک متحد ہو رہے ہیں اور ریاستہائے متحدہ یورپ کا ایجنڈا آگے بڑھ رہا ہے تو یہ افغان مجاہدین کی جدوجہد کا صدقہ ہے ورنہ یورپی ممالک اس اتحاد کا خیال بھی ذہن میں نہیں لا سکتے تھے۔
- جرمنی ایک بار پھر متحد ہو گیا ہے اور دیوار برلن ٹوٹ گئی ہے تو یہ افغان عوام کی عظیم قربانیوں کا ثمرہ ہے ورنہ جرمنی کے دونوں حصے کبھی خواب میں بھی متحد ہونے کی بات اپنے ذہنوں میں نہیں لا سکتے تھے۔
- وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کو آزادی ملی ہے اور بالٹیک خطہ کی مسیحی ریاستیں آزادی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ یہ افغان عوام کے خون کا صدقہ ہے ورنہ ان ممالک کے عوام تو آزادی کے تصور تک سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔
- پاکستان کی ہزاروں کلومیٹر لمبی شمال مغربی سرحد محفوظ ہو گئی ہے اور پاکستان اپنے روایتی حریف بھارت کے مقابلہ میں بہتر پوزیشن میں آ گیا ہے تو یہ بھی جہاد افغانستان کی برکات ہیں۔

لیکن تاریخ کی ستم ظریفی کا یہ کتنا خوفناک منظر ہے کہ جن اقوام و ممالک نے افغان عوام کی قربانیوں کے ثمرات سمیٹے ہیں اور لاکھوں افغان مجاہدین کے خون کے صدقے آزادی اور وحدت کے ادھورے خوابوں کی تعبیر حاصل کی ہے آج وہی سب مل کر افغانستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور افغان عوام کو اس جہاد کے منطقی اور نظریاتی ثمرات سے محروم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میرے خیال میں چشم فلک نے اس سے قبل پوری تاریخ میں احسان فراموشی کا اس سے المناک منظر نہیں دیکھا ہو گا اور تاریخ عالم اپنی ابتدا سے اب تک بے وفائی اور خود غرضی کی اس سے بڑی کوئی مثال پیش کرنے سے یقیناً قاصر رہے گی۔ مگر یہ موجودہ کافر اور منافق اقوام کا طرز عمل ہے اور ان دو طبقوں سے اسی قسم کے طرز عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔

البتہ جہادی عمل سے وابستہ نوجوانوں اور جہادی تحریکات کے قائدین کی یہ دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے طرز عمل سے گریز کریں اور جہاد کے دینی جذبہ اور عمل کے دنیا بھر میں پھیلنے کے اصل سرچشمہ اور منبع کے طور پر افغانستان کو نظر انداز نہ کریں بلکہ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے اپنے دائرہ میں تعاون کا سلسلہ جاری رکھیں۔ جہاد افغانستان کی منطقی اور نظریاتی منزل یہ ہے کہ وہاں کمیونسٹ دور سے چلا آنے والا نظام مکمل طور پر ختم ہو اور پورے افغانستان میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں آئے۔ اور اب تک کے حالات کا اتار چڑھاؤ شہادت دیتا ہے کہ اس منزل تک مثبت اور سنجیدہ پیش رفت صرف اور صرف طالبان نے کی ہے اور وہ نہ صرف اس مشن اور ہدف کیلئے پوری طرح سنجیدہ ہیں بلکہ عالمی دباؤ اور داخلی مشکلات و مصائب کے باوجود اپنے اس پروگرام میں کسی قسم کی لچک پیدا کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

مجاہدین سے ایک گزارش یہ ہے کہ اس فطری اصول کو یاد رکھیں کہ جب کام میں پھیلاؤ ہوتا ہے تو تقسیم بھی ہوتی

ہے۔ کنبے بڑے ہوتے ہیں تو بٹ جاتے ہیں، ایک کنبہ کئی کنبوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، الگ الگ مکانات میں بسنے لگتے ہیں بلکہ ایک ہی مکان کے اندر کئی دیواریں کھینچ دی جاتی ہیں، بھائی بھائی سے اور بیٹا باپ سے الگ ہو جاتا ہے، اور مزاجوں کا اختلاف ماں اور بیٹی کو ایک جگہ اکٹھے نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے تقسیم میں کوئی برائی نہیں ہے، یہ فطری بات ہے، البتہ تقسیم کے بعد رشتوں کا تعلق ضرور قائم رہنا چاہیے اور باہمی تعلقات کار میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ بیٹے نے باپ سے الگ ہو کر نیا گھر بسا لیا ہے مگر دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ قائم ہے اور شفقت و احترام کے تعلقات موجود ہیں تو تقسیم سے کسی کا کچھ نہیں بگڑا بلکہ محبت کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دو بھائی اکٹھے نہیں رہ سکے اور الگ الگ مکان میں چلے گئے ہیں مگر اس کے بعد دونوں بھائیوں میں بھائی چارہ موجود ہے اور چھوٹے بڑے کا فرق قائم ہے تو الگ الگ ہونے کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس لیے مختلف جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الگ الگ جہادی گروپوں سے نہ گھبرائیں البتہ آپس میں تعلقات کار قائم رکھیں، ایک دوسرے کا احترام کریں، ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ ڈالیں اور ایک دوسرے کی خوبیوں سے استفادہ کریں۔

اجتماعی زندگی کا اصول ہی یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی خوبیوں کو یکجا کر کے قوت بنا دیا جائے ورنہ ساری خوبیاں کسی ایک انسان میں اکٹھی نہیں ملیں گی۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے پاس ایک بار کسی مسجد کے منتظمین آئے کہ ہمیں خطیب مہیا کر دیں اور اس کے ساتھ ہی خطیب کے اوصاف گننا شروع کر دیے۔ جب پانچ چھ صفات گن چکے تو شاہ جیؒ نے کہا کہ بس بس! میری ساری زندگی کی لڑائی یہی ہے کہ اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا مگر تم مجھ سے نبی کا تقاضا کر رہے ہو۔ کیونکہ جتنے اوصاف تم نے گنے ہیں یہ کسی نبی میں ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں اور یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ کے بندو! کسی شخص میں دو خوبیاں ہوں گی تو دو خامیاں بھی ہوں گی، اس لیے سب کو قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ مجاہدین سے میری گزارش بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے میں کمزوریاں تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کے عیوب نہ اچھالو بلکہ اچھائیاں تلاش کر کے ان سے استفادہ کرو اور اگر کوئی کمزوری نظر آئے تو اس پر پردہ ڈالو اور خاموشی کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرو کیونکہ جماعتیں اسی طرح اپنے مقاصد میں آگے بڑھتی ہیں۔

افغانستان میں این جی اوز کی سرگرمیاں اور طالبان کا موقف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۰ء

امارتِ اسلامی افغانستان میں طالبان کی حکومت نے گذشتہ دنوں ایک امریکی خاتون کو افغانستان سے نکال دیا جو ایک این جی او کے حوالے سے وہاں مصروف کار تھی اور مبینہ طور پر رفاہی کاموں کی آڑ میں جاسوسی سرگرمیوں میں ملوث پائی گئی تھی۔ اس پر اقوامِ متحدہ کے رابطہ افسر ایرک ڈیمرل کابل پہنچے اور انہوں نے طالبان کی حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ این جی اوز کیلئے کام کرنے والی خواتین کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ ڈالیں، لیکن طالبان نے ان کا موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۲۱ جولائی ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق اقوامِ متحدہ

کے نمائندہ سے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ خواتین کے حقوق کے خلاف نہیں اور نہ ہی ان کی ملازمتوں کے خلاف ہیں، لیکن افغانستان میں ایسی این جی اوز کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو فلاحی کاموں کی آڑ میں جاسوسی میں ملوث ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان حکومت کا یہ موقف ایک اصولی اور جائز موقف ہے اور تمام تر مشکلات و مصائب اور رکاوٹوں کے باوجود طالبان کا اپنے اصولی موقف پر قائم رہنا لائقِ صد تحسین ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ایسی این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے جو رفاہی کاموں اور عام لوگوں کے مفادات کے حوالے سے بے پناہ رقوم صرف کر کے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی ہیں، اور اس کی آڑ میں نہ صرف جاسوسی بلکہ فکری انتشار پیدا کرنے اور مغرب کی بے حیا ثقافت کی راہ ہموار کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ اس لیے حکومتِ پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے طول و عرض میں کام کرنے والی ہزاروں این جی اوز کی سرگرمیوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے اور ایسی این جی اوز پر کسی رو رعایت کے بغیر پابندی لگا دی جائے جو اسلامی روایات و اقدار اور ملکی مفادات کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث پائی جائیں۔

دو دن کابل کی آزاد فضا میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۰ اگست ۲۰۰۰ء

حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی گوجرانوالہ کے سربراہ قاری عبد القادر صاحب علماء کرام اور دیگر دینی کارکنوں کا ایک گروپ کابل لے جانے کیلئے تیار کر رہے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ششماہی امتحان کی تعطیلات کی وجہ سے میرے پاس تین چار دن کی گنجائش تھی اس لیے میں بھی گروپ میں شامل ہو گیا۔ قاری صاحب نے اس گروپ کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے ۱۲ اگست ہفتہ کو رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ کابل پہنچا دیا۔ مختلف جہادی تحریکات کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ علماء کرام اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والے سمجھدار حضرات خود کابل جائیں، وہاں کے حالات کا جائزہ لیں، طالبان حکومت کی کارکردگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، ان کے خلاف عالمی سطح پر کیے جانے والے پروپیگنڈہ کی حقیقت معلوم کریں، موجودہ بحرانی کیفیت میں امارت اسلامی افغانستان کی مشکلات اور ضروریات کا خود اندازہ کرتے ہوئے ان سے تعاون کی ممکنہ عملی صورتیں تلاش کریں، اور انہیں بروئے کار لانے کیلئے سنجیدہ پیش رفت کریں۔

میں اس سے قبل دو دفعہ کابل جا چکا ہوں، ایک بار پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کی عبوری صدارت کے دور میں جبکہ وہ اس عبوری صدارت کو طول دینے کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ پاکستان کے سرکردہ علماء کرام کا ایک بھرپور وفد کابل گیا جس میں بڑے بڑے بزرگوں کے ساتھ میں بھی ایک کارکن کے طور پر شامل تھا۔ مجددی صاحب کے ساتھ میری پرانی یاد اللہ ہے، ان کی خاندانی عظمت اور تاریخی کردار کے حوالے سے ان سے ہمیشہ محبت اور عقیدت رہی ہے، اور وہ میری دعوت پر ایک بار گوجرانوالہ بھی تشریف لا چکے ہیں۔ انہوں نے صدارتی محل میں پاکستانی علماء کرام کے ساتھ ایک نشست

کا اہتمام کیا اور ان سے مشورہ کے طور پر یہ دریافت کرنا چاہا کہ عبوری دور کے چھ ماہ مکمل ہونے پر ان کیلئے اقتدار کو چھوڑنا ضروری ہے یا وہ اس اقتدار کو اس کے بعد بھی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں؟ ہمارے بعض بزرگوں نے ان کے حق میں تاویلات کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر میں نے ان سے اس محفل میں صاف عرض کیا کہ انہوں نے چھ ماہ کی عبوری مدت کیلئے ایک طے شدہ معاہدہ کے مطابق اقتدار سنبھالا ہے اس لیے قرآن کریم کے حکم کی رو سے عہد کی پاسداری بہر حال ضروری ہے۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ان کی بزرگی اور مجد دی خاندان کی عظمت کے اعتراف کے طور پر مجاہدین کی طرف سے اقتدار کا چارج لینے کیلئے ان کی شخصیت کا انتخاب تاریخی حوالے سے ان کا بہت بڑا کریڈٹ اور اعزاز ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ وہ اس تاریخی اعزاز کو اپنے لیے کافی سمجھتے ہوئے باوقار طور پر مدت گزرتے ہی اقتدار سے الگ ہو جائیں اور اپنے خاندان کے اس تاریخی اعزاز کو دھندلانے کا راستہ اختیار نہ کریں۔

دوسری بار جب میں کابل گیا تو طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر ابھی ابتدائی مراحل تھے اس لیے مشکلات اور وسائل کے بھنور میں تھی۔ اور انتظامی و حکومتی امور میں طالبان کی ناتجربہ کاری بجائے خود ایک بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔

لیکن اب مجھے مذکورہ وفد کے ہمراہ تیسری بار کابل جانے اور دو روز قیام کرنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اگرچہ مسائل و مشکلات میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا ہے مگر طالبان اہلکاروں نے جس ہمت اور محنت کے ساتھ اپنی ناتجربہ کاری پر قابو پایا ہے اور ایثار و استقامت کے ساتھ معاملات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی ہے اس کے اثرات کابل میں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے ہیں۔ کابل کی رونقیں بحال ہو رہی ہیں، بازاروں کی چہل پہل میں اضافہ ہوا ہے، چھ بجے سر شام کابل کے راستے بند ہو جانے کی بجائے اس کی مدت رات دس بجے تک بڑھا دی گئی ہے۔ طالبان کے آنے سے پہلے شام چھ بجے کابل کے راستے بند ہو جاتے تھے مگر انہوں نے اسے رات دس بجے کر دیا ہے۔ جرائم میں کمی ہوئی ہے اور بعض بارونق محلوں میں نصف شب کے بعد ہم نے خود ایسی دکانیں دیکھی ہیں جن کے دروازے باہر سے کھلے تھے۔ بازار میں پڑے ہوئے عام استعمال کے سامان پر صرف کپڑے کا پردہ ڈال کر اسے ڈھک دیا گیا تھا اور دوکاندار خود گھر میں مزے کی نیند سو رہا تھا۔ سرکاری دفاتر میں عوام کی آمد و رفت اور اہلکاروں کی کارکردگی بھی اطمینان بخش ہے اور کابل ایک بار پھر بارونق اور پر امن شہر کا روپ دھار تا جا رہا ہے۔

ہمارے وفد میں دیگر بہت سے حضرات کے علاوہ مولانا منظور احمد چنیوٹی کے بڑے فرزند مولانا محمد الیاس چنیوٹی، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے نائب مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی، اور مدرس مولانا ظفر فیاض، نیز گوجرانوالہ ہی کے مولانا قاری یعقوب تبسم اور مولانا ظہیر الدین بابر بھی شریک تھے۔

اس دوران ہمیں جن حضرات سے ملاقات اور گفت و شنید کا موقع ملا ان میں امارت اسلامی افغانستان کے نائب صدر ملا محمد حسن، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد ثاقب، کابل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی، فاتح ارگون مولانا ارسلان رحمانی، نامور افغان کمانڈر مولوی سیف الرحمان منصور، اکیڈمی آف سائنسز کے ڈپٹی ڈائریکٹر مولانا فرید الدین محمود، اور وزارت صحت میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کے ڈائریکٹر مولانا شمس الدین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ملاقاتوں کے حوالے سے افغانستان کے تازہ ترین حالات کے بارے میں حاصل ہونے والی

معلومات اور اپنے تاثرات اسی کالم میں مختلف عنوانات کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

ہم نے پاکستان کا یوم آزادی شمالی اتحاد کے خلاف برسر جنگ طالبان مجاہدین کے ساتھ ان کے اگلے مورچوں میں منایا۔ چودہ اگست کو ہم چاری کار اور بگرام ایئرپورٹ کے قریب اگلے مورچوں میں گئے اور مجاہدین کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ وہاں برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کے شہداء، تحریک پاکستان کے شہداء اور جہاد افغانستان کے شہداء کے ایصال و ثواب کیلئے قرآن خوانی کی گئی۔ اور طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی وحدت و سالمیت کی حفاظت اور پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنانے کیلئے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔

اس موقع پر راقم الحروف نے ان مجاہدین سے باتیں کرتے ہوئے دو گزارشات کیں۔ ایک یہ کہ ہمیں پاکستان کا یوم آزادی طالبان مجاہدین کے ساتھ مناتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریز حکمرانوں سے آزادی حاصل کی تھی مگر انگریزی نظام ہم پر نصف صدی گزر جانے کے باوجود بدستور مسلط ہے اور ہماری آزادی ابھی نامکمل ہے۔ جبکہ افغانستان کے لوگوں نے روسی فوجوں اور کمیونسٹ نظام دونوں سے آزادی حاصل کر لی ہے اور مکمل آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس مناسبت سے طالبان مجاہدین سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے لیے بطور خاص دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرح ہمیں بھی مکمل آزادی اور اسلامی نظام کی منزل سے ہمکنار کریں۔

دوسری گزارش یہ کی کہ اس وقت دنیا بھر کی نظریں امارت اسلامی افغانستان پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ خالص نظریاتی اور اسلامی حکومت اگر کامیاب ہوتی ہے تو دنیا بھر میں اسلامی تحریکات کو حوصلہ اور قوت حاصل ہوگی اور مسلم ممالک میں کفر کے نظام سے نجات اور اسلامی نظام کے نفاذ کا دروازہ کھل جائے گا۔ جبکہ طالبان کی اسلامی حکومت کے استحکام کا دارومدار شمال کی جنگ پر ہے اور اسی وجہ سے دنیا بھر کا کفر اس جنگ میں طالبان کی مخالفت پر متحد ہوگیا ہے۔ اس پس منظر میں معروضی صورتحال یہ بن گئی ہے کہ پوری دنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ میں پیش رفت کا دارومدار طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی اور استحکام پر ہے۔ اور طالبان کی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا مدار شمال کی جنگ میں ان کی فتح پر ہے۔ اس لیے آپ مجاہدین بہت اہم اور فیصلہ کن جنگ میں مصروف ہیں اور ہم آپ حضرات کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہوئے اس جنگ میں طالبان حکومت کی جلد اور مکمل فتح کیلئے دعا گو ہیں، آمین یارب العالمین۔

افغان نائب صدر ملا محمد حسن سے ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ اگست ۲۰۰۰ء

ہماری خواہش تھی کہ طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد ربانی سے ملاقات ہوجائے مگر جب ان کے سیکرٹریٹ سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ علالت کی وجہ سے ملاقاتوں سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں اور ان کی ایک دو روز کی مصروفیات پہلے سے طے شدہ ہیں اس لیے فوری طور پر ملاقات مشکل ہوگی۔ دوسری طرف ہماری مجبوری یہ تھی کہ ایک دو روز سے

زیادہ کابل میں قیام کی ہمارے پاس گنجائش نہیں تھی، اور ہم نے کابل پہنچنے سے قبل کابل حکومت کو کوئی پیشگی اطلاع بھی نہیں دی تھی اس لیے زیادہ زور نہیں دے سکتے تھے۔

البتہ نائب صدر ملا محمد حسن صاحب نے ہمیں چودہ اگست کو گیارہ بجے کا وقت مرحمت فرمادیا اور ان سے تفصیلی ملاقات اور گفت و شنید کا موقع مل گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، سابقہ تعارف نہیں تھا، اس کے باوجود انہوں نے جس خوش دلی اور بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بات چیت کی اس سے ہمارے گروپ کے شرکاء بہت متاثر ہوئے۔ مزاج میں سادگی ہے، دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں، اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی سوال کا جواب تشنہ نہ رہے۔ اس لیے جب سوال و جواب کا سلسلہ زیادہ طویل ہونے لگا تو انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور ہم گفتگو کا دائرہ سمیٹتے ہوئے ان سے اجازت کے طلبگار ہوئے۔

انہوں نے افغانستان کی عمومی صورتحال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہم اس وقت آزمائش اور امتحان کے مرحلہ میں ہیں۔ ایک طرف شمال کی جنگ نے ہمیں ہمہ تن متوجہ کر رکھا ہے، دوسری طرف بین الاقوامی پابندیوں کے باعث مشکلات و مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، اور تیسری طرف مسلسل خشک سالی بھی ہمارے لیے آزمائش بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہمارے عزائم میں بحمد اللہ تعالیٰ کوئی کمزوری نہیں ہے اور ہم نے طے کر رکھا ہے کہ اسلام کی سربلندی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے پروگرام میں کوئی لچک نہیں آئے گی۔ اور جب تک ایک طالب بھی باقی ہے اسلامی نظام کے نفاذ کا پرچم سربلند رہے گا۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ہم عثمانی ایمپائر (خلافت عثمانیہ) کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں اور اپنے انقلاب کو درآمد کر کے دوسرے ممالک کیلئے مشکلات کا باعث بنیں گے۔ لیکن میں اس سلسلہ میں دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام کا نفاذ ہمارا واحد مقصد ہے، اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے ہمارے سامنے آئیڈیل اور نمونہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ ہے۔ ہم اس کی پیروی کی کوشش کر رہے ہیں اور اسی طرح کا اسلام نافذ کرنا چاہ رہے ہیں جس طرح کا اسلام صحابہ کرامؓ کے دور میں نافذ تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اپنے ملک کی حدود میں کر رہے ہیں اور اپنے ملک کے عوام کی خواہشات کے مطابق کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ عزم اور فیصلہ ہے کہ افغانستان کی حدود میں اسلام اور صرف اسلام کا نفاذ ہوگا لیکن ہم دوسرے کسی ملک کے معاملہ میں مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہماری خواہش ضرور ہے کہ دنیا کے تمام مسلم ممالک اپنے اپنے ممالک میں اسلام نافذ کریں اور اگر کوئی مسلم ملک اس مقصد کیلئے آگے بڑھتا ہے تو ہم اس سے بھی تعاون کریں گے۔ لیکن اپنی طرف سے کسی ملک پر انقلاب مسلط کرنے اور مسلم ملکوں کے معاملات میں مداخلت کا کوئی پروگرام ہم نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی کو ایسا خطرہ محسوس کرنا چاہیے۔

افغان نائب صدر ملا محمد حسن نے کہا کہ میں پاکستان کے علماء کرام، صحافیوں، اور دانشوروں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ افغانستان آئیں، یہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، ہمارے بارے میں عالمی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈہ کی حقیقت معلوم کریں، اور اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے توڑ کیلئے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے

معاملات میں رہنمائی کیلئے بھی علماء کرام اور دانشوروں کی راہ دیکھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اہل علم و دانش اپنا وقت فارغ کر کے تشریف لائیں اور ہمارے حالات، ضروریات، اور مشکلات کا جائزہ لے کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔

وفد میں شامل ایک تاجر دوست کے سوال پر ملا محمد حسن نے کہا کہ پاکستان کے تاجر اور سرمایہ کار اگر افغانستان میں آکر سرمایہ کاری کرنا چاہیں تو تجارت اور صنعت دونوں میدانوں میں ہم ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اپنے حالات کے دائرہ میں جو سہولت ہمارے بس میں ہوگی فراہم کریں گے لیکن کوئی آئے تو سہی۔ افغان نائب صدر نے یہ بات زبان سے تو نہیں کہی مگر ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ زبانی جمع خرچ تو بہت ہوتا ہے مگر کوئی عملی کام کیلئے آگے نہیں بڑھتا۔ جبکہ ہم اس انتظار میں ہیں کہ پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے اصحاب صنعت و تجارت اور ارباب خیر آگے آئیں اور افغانستان کی تعمیر نو میں تعاون کرتے ہوئے صنعت و تجارت کے شعبوں میں سرمایہ کاری کے علاوہ صحت، تعلیم، سڑکوں کی تعمیر، اور عوامی فلاح کے دیگر کاموں میں بھی طالبان کی اسلامی حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

ہماری دوسری اہم ملاقات مولانا ارسلان رحمانی سے ہوئی جو پرانے علماء میں سے ہیں اور ایک دینی درسگاہ میں دینی علوم کی تعلیم دیتے ہوئے جہاد کے میدان میں آگئے۔ انہوں نے پکتیکا کے صوبے میں مجاہدین کی قیادت کی اور ارگون کی چھاؤنی فتح کرنے کی وجہ سے فاتحِ ارگون کہلاتے ہیں۔ وہ کسی بڑے منصب پر تو فائز نہیں ہیں لیکن طالبان حکومت کے دماغوں میں شمار ہوتے ہیں اور اہم معاملات میں ان کی مشاورت اور رہنمائی سے طالبان حکومت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان مجاہد علماء میں سے ہیں جو اپنی سنیارٹی کی پروا کیے بغیر طالبان حکومت کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور ایک کارکن اور خدمت گار کے طور پر اسلامی حکومت کی خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔ اور یہی بات ان کے خلوص اور قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مولانا ارسلان رحمانی کے ساتھ بھی میرا بہت پرانا تعلق ہے اور وہ جہاد کے ابتدائی دنوں میں گوجرانوالہ تشریف لا چکے ہیں۔ انہیں ہماری کابل حاضری کی پیشگی اطلاع نہیں تھی اس لیے جب ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ خوش ہونے سے زیادہ پریشانی میں پڑ گئے۔ کیونکہ وہ اسی وقت ایک اہم مسئلہ کیلئے پکتیکا روانہ ہونے والے تھے اور اگر ہم سے تھوڑی سی مزید تاخیر ہو جاتی تو وہ کابل سے روانہ ہو چکے ہوتے اور ہماری ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ بار بار افسوس کا اظہار کر رہے تھے کہ آپ ایسے وقت میں آئے ہیں کہ میں ایک انتہائی ضروری سفر پر روانہ ہو رہا ہوں جبکہ میری خواہش تھی کہ آپ سے تفصیلی بات چیت ہو اور ہم مختلف امور پر اطمینان سے تبادلہ خیالات کریں۔

مولانا ارسلان رحمانی نے اس موقع پر چند باتیں کیں جن میں بطور خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ افغانوں نے اس سے قبل بھی امت کی رہنمائی کی ہے کیونکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق کابل سے ہے، حدیث نبویؐ کی چھ بڑی کتابوں (صحاح ستہ) میں سے پانچ کے مصنفین کا تعلق بھی اسی علاقہ سے ہے، اور آج افغان پھر اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے امت کی رہنمائی کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے دنیائے اسلام بالخصوص پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں سے گزارش ہے کہ وہ اس عظیم اور مقدس مشن میں افغان علماء اور عوام کے ساتھی بنیں اور افغانستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں۔

کابل میں "اکیڈمی آف سائنسز" کا قیام

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ اگست ۲۰۰۰ء

کابل کے حالیہ سفر کے دوران جن دو باتوں پر مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی آج کے کالم میں ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک خوشی معروف افغان کمانڈر مولوی سیف الرحمن منصوری سے ملاقات ہے جو میرے انتہائی مخلص دوست مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ کے فرزند ہیں جنہیں دیکھ کر شہید دوست کی یاد تازہ ہوگئی۔

مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ کا تعلق حرکت انقلاب اسلامی سے تھا اور وہ صاحب فکر اور صاحب رائے عالم دین تھے۔ جہادی معاملات اور ان کے نتائج و عواقب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کو جہاد افغانستان کے بارے میں باخبر رکھنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کیلئے سب سے زیادہ محنت کی۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ خصوصی عقیدت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جہاد افغانستان کے آغاز کے فوراً بعد حضرت درخواستیؒ اور مولانا مفتی محمودؒ نے قبائلی اور سرحدی علاقوں کا دورہ کر کے جہاد افغانستان کی حمایت اور مجاہدین کی پشت پناہی کیلئے اس خطہ کے عوام کو جس طرح تیار کیا اس سے ہمارے حوصلوں میں اضافہ ہوا اور جہاد کے میدان میں ہمارے پاؤں جم گئے۔

میرے ساتھ بھی ان کا مشفقانہ اور مخلصانہ تعلق تھا اور میں پاکستان کے بعض دوروں میں ان کے ساتھ شریک رہا۔ وہ دو باتوں پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ ایک یہ کہ مجاہدین کے مختلف گروپ باہمی اتحاد کر کے ایک کمان کے تحت کاروائیاں کریں۔ اس مقصد کیلئے محنت کر کے ایک موقع پر انہوں نے ایک اتحاد بنوایا مگر وہ اتحاد مختلف گروپوں کو اکٹھا کرنے کی بجائے خود ایک گروپ کی شکل اختیار کر گیا جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرا وہ امریکی امداد اور مغربی ممالک کے تعاون کو ایک خاص دائرہ تک محدود رکھنے کی بات کرتے تھے اور اس تعاون کو جہادی معاملات میں مداخلت کی صورت میں قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اپنی اس آزادانہ سوچ کے باعث پورے جہادی نیٹ ورک سے ہی وقتی طور پر آؤٹ ہوگئے اور انہیں حالات کی سنگینی نے ایران پہنچا دیا جس پر ہمارے بہت سے ساتھی ان سے ناراض ہوگئے۔ مگر مجھے ان کی افتادِ طبع، سوچ اور مجبوریوں کا علم تھا اس لیے ان کا ایران جانا میرے لیے تشویش کا باعث نہ بنا اور ہمارے تعلقات بدستور پہلے کی طرح استوار رہے۔

طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد انہوں نے اپنی سنیارٹی اور خدمات کا حوالہ دیے بغیر پورے خلوص کے ساتھ انہیں سپورٹ کیا مگر ان کی گاڑی میں بم کے دھماکے نے انہیں عروس شہادت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے خاندان کے ساتھ طالبان حکومت کے روابط سے میں بالکل بے خبر تھا اس لیے جب ان کے بیٹے مولوی سیف الرحمن منصور کو طالبان کی سرکاری فوج کے ایک کمانڈر کی صورت میں دیکھا تو مجھے جو خوشی ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جہاد کے دوران زخمی ہوگئی تھیں اور بعض انگلیاں کٹ گئی ہیں لیکن وہ اس کے باوجود جنگی خدمات میں مصروف ہیں اور ایک بریگیڈ کی کمان کر رہے ہیں۔ حالیہ سفر میں ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں،

میں انہیں دیکھ کر اپنے شہید دوست کو یاد کرتا رہا اور بیٹے کے روپ میں باپ کی شبیہہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

دوسری خوشی مجھے کابل کے اس سفر میں ”اکیڈمی آف سائنسز“ کو دیکھ کر ہوئی جس کا باقاعدہ نام پشتو میں ”دعلومو اکادمی“ ہے۔ میرے میزبان اس کا ترجمہ ”ریسرچ اکیڈمی“ کرتے تھے لیکن میں نے اس کا ترجمہ ”اکیڈمی آف سائنسز“ کیا ہے۔ اپنے میزبان کے ساتھ کابل کے ایک روڈ پر گزرتے ہوئے دعلومو اکادمی کے بورڈ پر نظر پڑی تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ علوم کی تحقیق و ریسرچ کا ادارہ ہے جو طالبان کی حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی اور میں نے اپنے میزبان سے عرض کیا کہ یہ تو میرے اپنے ذوق اور شعبہ کا کام ہے جس کا کابل کے حوالے سے ایک عرصہ سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس لیے اس ادارہ کو ضرور دیکھنا ہے اور اس کے ذمہ دار حضرات سے بات کرنی ہے۔

چنانچہ مولانا الیاس چنیوٹی اور دیگر رفقاء کے ہمراہ تھوڑی دیر کیلئے وہاں حاضری ہوئی۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا خلیل اللہ فیروزی موجود نہیں تھے البتہ ان کے نائب مولانا فرید الدین محمود سے ملاقات ہوگئی جو بنیادی طور پر استاد ہیں اور اس وقت بھی طلبہ کی ایک کلاس کو تعلیم دے رہے تھے۔ اکیڈمی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے، الماری میں چند کتابیں پڑی تھیں اور ڈپٹی ڈائریکٹر ہمیں اکیڈمی کے مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے بے سروسامانی کا شکوہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ اکیڈمی مختلف علوم و فنون کے حوالے سے افغانستان کی موجودہ معروضی صورتحال کا جائزہ لینے، مختلف شعبوں میں تحقیقی کام اور افراد کار کے خلاء کی نشاندہی کرنے، اور ریسرچ کے کام کو آگے بڑھانے کیلئے قائم کی گئی ہے۔ لیکن ضروری وسائل کے فقدان کے باعث ابتدائی اور بنیادی کام کیلئے بھی ہمارے پاس اسباب اور افراد کی کمی ہے اور ہم کام کو صحیح طور پر منظم نہیں کر پا رہے۔ البتہ خواہش ضرور موجود ہے اور چند نوجوان اس سلسلہ میں محدود دائرہ میں کچھ نہ کچھ کر بھی رہے ہیں جو کام کی نوعیت اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے اس پیش رفت پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے وقت کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے انہیں دعوت دی کہ اگر اکیڈمی آف سائنسز کابل کے ذمہ دار دوست کسی وقت اسلام آباد آئیں تو مختلف شعبوں کے ماہرین اور ارباب علم و دانش کے ساتھ ان کی نشست کا اہتمام کیا جا سکتا ہے جو اس علمی و فکری کام کی حدود اور اساسی اصولوں کے تعین، اور اسے آگے بڑھانے کے بارے میں اسباب و وسائل اور افراد کار کی فراہمی کیلئے مفید ثابت ہوگی۔ راقم الحروف نے ”ورلڈ اسلامک فورم“ کی طرف سے بھی انہیں تعاون کا یقین دلایا اور گزارش کی کہ ہم لندن میں افغان دانشوروں کی میزبانی اور علوم و فنون کے مختلف مراکز تک ان کی رسائی کیلئے خدمت کا شرف حاصل کر کے خوشی محسوس کریں گے۔

مولانا فرید الدین محمود نے اس پیشکش پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ امارت اسلامی افغانستان کی حکومت سے اجازت حاصل کر کے اسلام آباد آنے کا پروگرام بنائیں گے تاکہ اس سلسلہ میں مزید تعاون کے عملی امکانات کا جائزہ لیا جا سکے اور اس میں پیش رفت کا طریق کار طے کیا جا سکے۔

افغانستان کے عدالتی اور تعلیمی نظام پر ایک نظر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ اگست ۲۰۰۰ء

کابل میں دو روزہ قیام کے دوران جن اہم شخصیات سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں ان میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد ثاقب اور کابل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں میں مولانا محمد الیاس چنیوٹی بھی ہمراہ تھے۔

مولانا نور محمد ثاقب نوجوان علماء میں سے ہیں، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں، انہوں نے دورۂ حدیث کے امتحان میں دارالعلوم حقانیہ اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان دونوں میں اول پوزیشنیں حاصل کی تھیں۔ ملاقات ہوئی تو بڑے احترام سے ملے اور کہنے لگے کہ میں آپ کا شاگرد ہوں، دورۂ حدیث سے پہلے موقوف علیہ کے درجہ میں ایک سال میں نے مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان سے اور جلالین شریف آپ سے پڑھی تھی۔ یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی اور دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی کہ ہم دینی مدارس میں جو تھوڑی بہت تعلیمی خدمات سرانجام دیتے ہیں اس کے نتائج کسی نہ کسی جگہ تو مسلمانوں کی عملی اور اجتماعی زندگی میں نظر آنے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نظر بد سے محفوظ رکھیں اور وہ دن لائیں کہ ہم پاکستان کی اجتماعی اور قومی زندگی میں بھی دینی مدارس کی تعلیمی خدمات کے اثرات و نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، آمین یارب العالمین۔

مولانا نور محمد ثاقب سے افغانستان کے عدالتی نظام کے بارے میں چند پہلوؤں پر گفتگو ہوئی، انہوں نے بتایا کہ افغانستان میں عدالتی سطح پر شرعی نظام پہلے سے چلا آرہا تھا جو صرف کمیونسٹ دور میں کچھ عرصہ معطل رہا۔ اس کے بعد ہم نے دوبارہ اسے شروع کر دیا ہے اور چونکہ عدالتی سسٹم، قواعد و اصول اور ڈھانچہ پہلے عملاً موجود رہا ہے اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی اور ہم پورے اعتماد اور نظم و ضبط کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے میری فرمائش پر عدالتی اصول و ضوابط کی ایک مطبوعہ کاپی بھی مجھے مرحمت فرمائی جو ۲۶۴ دفعات پر مشتمل ہے اور پشتو اور فارسی دو زبانوں میں ہے۔ یہ اصول و ضوابط ظاہر شاہ کے دور میں جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ میں نافذ کیے گئے تھے۔ یعنی اب سے کوئی چوالیس برس قبل ان کا نفاذ عمل میں آیا تھا اور اب نیا نظام بھی انہی اصولوں کی روشنی میں چلایا جا رہا ہے۔ ان اصول و ضوابط کی رو سے افغانستان کے عدالتی نظام کی بنیاد فقہ حنفی پر ہے اور قاضی حضرات قرآن و سنت کی اسی تعبیر کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہیں جو فقہ حنفی کی صورت میں کتابوں میں موجود ہے، اور جو عظیم مسلم سلطنتوں خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت میں صدیوں تک نافذ العمل رہی ہے۔

افغان چیف جسٹس نے بتایا کہ ہمارے ہاں ابتدائی عدالت دو ماہ میں کسی بھی کیس کا فیصلہ کر دینے کی پابند ہے۔ جبکہ ہائی کورٹ میں اپیل کی سماعت ایک ماہ میں اور سپریم کورٹ میں بیس دن کے اندر مکمل ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی قاضی مقررہ مدت کے اندر فیصلہ نہیں کر پاتا تو اسے تاخیر کی وجوہ کی وضاحت کرنا پڑتی ہے جو قابل قبول نہ ہونے کی صورت میں

قاضی کے خلاف تادیبی کارروائی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مذکورہ عدالتی اصول نامہ کی دفعہ ۱۰ میں بھی لکھا گیا ہے کہ اگر قاضی کسی معقول عذر کے بغیر تاخیر کرے گا تو اسے معزولی کے علاوہ دیگر تعزیری سزا کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

مولانا پیر محمد روحانی ان مجاہد علماء میں سے ہیں جنہوں نے جہاد افغانستان میں عملی حصہ لیا اور سالہا سال تک روسی فوجوں کے خلاف میدان جنگ میں نبرد آزما رہے۔ وہ فاتح خوست مولانا جلال الدین حقانی کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے ہیں اور تعلیمی کام کا وسیع تجربہ رکھنے کے باعث انہیں کابل یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کابل یونیورسٹی کے کم و بیش تمام شعبے دوبارہ شروع ہو گئے ہیں اور ان سب فیکلٹیز میں مجموعی طور پر اس وقت ساڑھے چھ ہزار سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں تین ہزار کے لگ بھگ طلبہ ہاسٹل میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے طب، سائنس، انجینئرنگ اور دیگر شعبوں کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ ہر فیکلٹی میں "ثقافتِ اسلامی" کے نام سے ضروریات دین کے نصاب کا اضافہ کر دیا ہے جس میں عقائد، عبادات، معاملات، حقوق، اخلاق، اور دیگر ضروریات کے بارے میں قرآن و سنت اور فقہ کی ضروری تعلیمات کو سمو دیا گیا ہے۔ تاکہ مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے دینی لحاظ سے بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں اور ایک دیندار مسلمان کے طور پر اپنے اپنے شعبہ میں ملی و قومی خدمات سرانجام دے سکیں۔

انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں ساڑھے پانچ سو کے قریب اساتذہ کام کر رہے ہیں جبکہ ثقافت اسلامی کے نصاب کی تعلیم کیلئے ساٹھ ستر اساتذہ کا اضافہ کیا گیا ہے جن کیلئے مستند عالم دین ہونا شرط ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس اسلامی جذبات سے سرشار نظریاتی اساتذہ کام کر رہے ہیں جن کی تنخواہیں بہت معمولی ہیں اور ایک پروفیسر کی تنخواہ پاکستانی کرنسی کے حساب سے پندرہ سو روپے سے زیادہ نہیں بنتی۔ لیکن وہ اس کے باوجود ملی خدمت کے جذبہ سے تعلیمی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اساتذہ کو غیر ملکی این جی اوز کی طرف سے پندرہ ہزار روپے تک کی تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے مگر انہوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ بعض اساتذہ تو ایسے ہیں کہ شام کو پارٹ ٹائم پرائیویٹ ملازمت کر کے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ مگر چونکہ تعلیم کے ساتھ ان کا نظریاتی اور شعوری تعلق ہے اس لیے وہ اس سے وابستگی ترک کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ کابل میں طالبان کی حکومت قائم ہونے تک سکولوں میں وہی پرانا سیکولر نصاب تعلیم رائج تھا اور مخلوط تعلیم کا نظام بدستور چلا آ رہا تھا۔ اور یہ دونوں باتیں ہمارے لیے قطعی طور پر قابل قبول نہیں تھیں اس لیے ہمیں مجبوراً لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ مکمل طور پر بند کرنا پڑا جسے اب ابتدائی سطح پر دوبارہ شروع کر دیا گیا ہے اور ہزاروں بچیاں پرائمری سطح کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ جبکہ نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کا کام جاری ہے اور اس کے ساتھ لڑکیوں کیلئے جداگانہ سکولوں کی تعمیر اور انہیں گھروں سے باپردہ لانے لے جانے کا انتظام فراہم ہوتے ہی اوپر کی سطحوں پر بھی زنانہ تعلیم کا سلسلہ بتدریج آگے بڑھایا جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان کیلئے اقوامِ متحدہ کے نمائندے نے بھی ان سے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور انہیں

یونیورسٹی کا دورہ کرا کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری موجودہ تعمیرات اور انتظامات طلبہ کیلئے بھی ناکافی ہیں اور ہمیں مزید تعمیرات کی ضرورت ہے جن کیلئے ہمارے پاس فنڈز نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ہمارے معترضین لڑکیوں کی تعلیم کیلئے الگ عمارت کی تعمیر اور آمد و رفت کے باپردہ انتظامات کیلئے تعاون کریں اور ضروری فنڈز فراہم کر دیں تو ہم کسی تاخیر کے بغیر ہائی سکول اور کالج و یونیورسٹی کی سطح پر بھی لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کیلئے تیار ہیں۔

مولانا پیر محمد روحانی نے بتایا کہ نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کا کام جاری ہے اور ہم انٹرمیڈیٹ تک ضروریات دین اور ضروری عصری علوم کا مشترکہ نصاب مرتب کر رہے ہیں جو سب طلبہ اور طالبات کیلئے لازمی ہوگا اور اس کے بعد طلبہ کے ذوق وصلاحیت اور ملکی ضروریات کے پیش نظر الگ الگ شعبوں کی تعلیم کا نظام وضع کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ہم نے زیرو پوائنٹ سے کام شروع کیا ہے اور دھیرے دھیرے بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں اس لیے بہت سا خلاء دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن جب ہم آگے بڑھیں گے اور یہ نظام تکمیل تک پہنچے گا تو سب لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔

افغانستان میں این جی اوز کا کردار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ اگست ۲۰۰۰ء

میرے افغانستان جانے کے مقاصد میں ایک بات یہ بھی تھی کہ بین الاقوامی ادارے اور غیر ملکی این جی اوز وہاں افغانستان کی تعمیر نو کے عنوان سے جو کام کر رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں دو اصحاب سے ملاقات ہوئی اور ان سے ان اداروں کی سرگرمیوں کے حوالے سے مختصر تبادلہ خیالات ہوا۔ ایک وزارت صحت میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کے ڈائریکٹر مولانا شمس الدین حقیار ہیں جو وزارت صحت سے متعلق این جی اوز کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور دوسرے جناب سہیل فاروقی ہیں جو کسی سرکاری منصب پر نہیں ہیں مگر این جی اوز کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ مغربی ممالک سے آنے والی این جی اوز کی بجائے مسلم ممالک کی این جی اوز اور رفاہی ادارے افغانستان کی تعمیر نو اور افغان عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں اور آگے آئیں، تاکہ ان مفاسد اور خرابیوں سے بچا جا سکے جو مغربی ممالک کی این جی اوز کے متحرک ہونے سے سامنے آ رہے ہیں۔

سہیل فاروقی صاحب اس سلسلہ میں پاکستان کے کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پاکستان سے جو اصحاب خیر طالبان حکومت سے تعاون کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں وہ چھپ چھپا کر اور انفرادی طور پر نہیں بلکہ سامنے آ کر اور منظم صورت میں کریں تاکہ ان کے تعاون کا افغان رائے عامہ کو بھی علم ہو۔ اور یک طرفہ جو تاثر قائم ہو رہا ہے کہ افغان عوام کی امداد کیلئے صرف مغربی ممالک کے ادارے ہی دلچسپی رکھتے ہیں، اس کا ازالہ ہو سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کے عوام اور اصحاب خیر طالبان حکومت کی بہت امداد کر رہے ہیں لیکن چونکہ وہ انفرادی طور پر ہوتی ہے اور بہت سے اصحاب خیر سمجھتے ہیں کہ اس تعاون کے ظاہر ہونے سے ان کے ثواب میں فرق آئے گا اس لیے افغان عوام کیلئے پاکستانی بھائیوں کی امداد نظر نہیں آتی۔ جبکہ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت ہے کہ یہ امداد نظر آئے اور وہ افغان عوام

کو معلوم ہو کہ ان کی بحالی اور تعمیر نو میں ان کے پاکستانی بھائی بھی پوری طرح شریک ہیں۔

مولانا شمس الدین حقیار نے بتایا کہ بیرونی ممالک سے آنے والی این جی اوز کو افغان حکومت کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ افغانستان کی حدود میں امارت اسلامی افغانستان کے قوانین کا پوری طرح احترام کریں گی اور اگر ان کا کوئی کارندہ افغانستان میں کسی جرم کا ارتکاب کرے گا تو اسے اس ملک کے قوانین کے تحت سزا دی جائے گی۔ اس معاہدہ کے تحت این جی اوز افغانستان میں کام کر رہی ہیں اور ہم ان کی سرگرمیوں کی پوری طرح نگرانی کرتے ہیں۔

افغانستان میں کام کرنے والی غیر ملکی این جی اوز کے بارے میں چند شکایات سننے میں آ رہی ہیں۔ ایک یہ کہ طالبان حکومت نے سابقہ دور کے جن کمیونسٹ افسران اور اہلکاروں کو ملازمت سے فارغ کیا تھا ان میں سے بیشتر این جی اوز میں کھپ گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ این جی اوز ان افراد کو کھپانے میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سی این جی اوز کابل حکومت کے سابق کمیونسٹ اہلکاروں کی پناہ گاہیں بلکہ کمین گاہیں بن گئی ہیں۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ ان این جی اوز میں بین الاقوامی اداروں کے انتظامی اور غیر ترقیاتی اخراجات کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ یعنی ان کے فراہم کردہ فنڈز میں سے افغان عوام کی ضروریات پر رقم کم خرچ ہوتی ہے اور ان اداروں کے اپنے دفاتر، عملہ کی تنخواہوں، آمد و رفت اور دیگر ضروریات پر اس سے کہیں زیادہ رقوم خرچ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سہیل فاروقی صاحب نے بتایا کہ افغانستان کیلئے اقوامِ متحدہ کا سالانہ فنڈ ۲۰۰ ملین ڈالر ہے مگر اس کا ۸۰ فیصد انتظامی اخراجات پر لگ جاتا ہے اور صرف ۲۰ فیصد رقم افغان عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو پاتی ہے۔

پھر یہ شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ بعض این جی اوز عوام کو امداد دینے سے زیادہ امداد دینے کے عمل کو فلمانے اور ان کی ویڈیو تیار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بطور مثال بتایا گیا کہ ایک بستی میں خواتین میں روٹیاں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا مگر پہلی بار عورتیں مطلوبہ تعداد میں نہیں آئیں تو ان کو روٹی نہیں ملی۔ دوسری بار پھر اعلان کیا گیا اور جب خاصی تعداد میں خواتین جمع ہو گئیں تو پہلے ان کی ویڈیو بنائی گئی اور پھر روٹیاں تقسیم کی گئیں۔ حالانکہ ویڈیو بنانا افغانستان میں منع ہے اور افغان قوانین کی خلاف ورزی کے ضمن میں آتا ہے۔

دوسری طرف طالبان حکومت کی صورتحال یہ ہے کہ خشک سالی، بین الاقوامی پابندیوں اور مسلسل حالت جنگ کی سہ طرفہ مشکلات کے باوجود عام اشیائے صرف پر ٹیکس لگانے سے گریز کیا جا رہا ہے تاکہ عام شہریوں کو ضرورت کی چیزیں سستے داموں ملتی رہیں۔ جبکہ وزراء اور افسران معمولی تنخواہوں پر گزارہ کر رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض وفاقی وزراء تک کی تنخواہیں پاکستانی کرنسی کے حساب سے دو ہزار روپے سے زیادہ نہیں بنتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عین حالت جنگ میں بھی کابل میں آٹے کی اسّی کلو کی بوری سات سو روپے میں، چینی بارہ روپے فی کلو، گھی کا بڑا کنستر پانچ سو روپے، پٹرول اٹھارہ روپے لیٹر، اور بکرے کا گوشت چالیس روپے فی کلو کے حساب سے مل رہا ہے۔ اور جو گاڑی بھاری بھرکم کسٹم ڈیوٹی کے باعث پاکستان میں تین سوا تین لاکھ کی ملتی ہے افغانستان میں برائے نام کسٹم ڈیوٹی کی وجہ سے ایک لاکھ روپے میں مل جاتی ہے۔

اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ طالبان حکومت نے خود قناعت اور کفایت شعاری کو اختیار کرتے ہوئے اپنے عوام کو ٹیکسوں کے غیر ضروری بوجھ سے بچایا ہوا ہے۔ مگر طالبان حکومت کے بس میں صرف یہی ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو کم

سے کم کر کے عوام کو سہولت پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ جن کاموں کیلئے فنڈز کی ضرورت ہے ان کو پورا کرنا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ مثلاً سڑکوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے، خصوصاً پشاور سے کابل جانے والا روڈ جو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے پوری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اور ان سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کیلئے طالبان حکومت کے پاس مطلوبہ فنڈز موجود نہیں ہیں۔ جبکہ بین الاقوامی ادارے امداد اور تعاون کیلئے جو شرائط عائد کر رہے ہیں ان کو پورا کرنا طالبان حکومت کیلئے ممکن ہی نہیں۔ ان میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ طالبان حکومت اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفے کو قبول کر کے شرعی قوانین کے عملی نفاذ سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا کرنے سے تو طالبان کے وجود اور ان کے اقتدار کا جواز ہی ختم ہو کر رہ جائے گا۔

ان حالات میں افغانستان کے عوام اور طالبان حکومت کی مشکلات و مسائل اور ضروریات کو سمجھنا اور ان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے افغان عوام کی بحالی اور افغانستان کی تعمیر نو میں ان سے تعاون کرنا نہ صرف دنیا بھر کی مسلم حکومتوں کی ذمہ داری ہے بلکہ اسلامی رفاعی اداروں، مسلم این جی اوز اور اصحاب خیر کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اس مشکل اور آزمائش کے مرحلہ میں افغان بھائیوں کا ہاتھ تھام کر انہیں مسائل و مشکلات کے اس بھنور اور دلدل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

افغانستان کے اخبارات پر ایک نظر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ اگست ۲۰۰۰ء

میں افغانستان کی حدود میں ۱۲ اگست کو دوپہر کے وقت داخل ہوا اور ۱۵ اگست کو اسی وقت افغانستان سے واپسی پر پاکستان کی حدود میں قدم رکھا۔ اس طرح مجھے افغانستان میں تین دن گزارنے کا موقع ملا جس کے دوران کابل کے علاوہ جلال آباد، سروبی اور قرہ باغ کے علاقوں میں بھی تھوڑے وقت کیلئے جانے کا موقع مل گیا۔

ان تین دنوں میں میری نظریں بازاروں میں کسی ایسے اسٹال کی تلاش میں رہیں جہاں اخبارات و رسائل فروخت ہوتے ہوں مگر کوئی اسٹال اس قسم کا میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ واپسی پر جلال آباد کے ایک بازار میں چھوٹا سا اسٹال نظر آیا جس کے باہر ایک ڈوری پر ”ننگرہار“ نامی اخبار لٹکا ہوا دکھائی دیا جو پشتو زبان میں ہے۔ یہ اخبار ننگرہار صوبے کے نام پر اس کے دارالحکومت جلال آباد سے شائع ہوتا ہے۔ چار صفحے کے اس اخبار کی قیمت پوچھی تو اسٹال کے مالک نے، جو نو عمر لڑکا تھا، دو روپے بتائی مگر اس نے ہمیں مہمان سمجھتے ہوئے اخبار بلا قیمت ہمارے حوالے کر دیا۔

اخبارات و رسائل کسی سوسائٹی کی مجموعی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ آزاد ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ معاشرہ کے مجموعی حالات کو آئینہ کی سکرین پر دکھا سکتے ہوں۔ آزادی سے مراد صرف ریاستی پابندیوں اور پالیسیوں سے آزادی نہیں بلکہ آزاد صحافت کیلئے ان غیر مرئی اور ریموٹ کنٹرول قدغنوں اور رکاوٹوں سے آزادی بھی ضروری ہوتی ہے جو در پردہ لابیوں اور خفیہ اداروں کی طرف سے غیر محسوس طور پر اخبارات و جرائد کے گرد ایک ناقابل عبور حصار کی

صورت میں قائم کردی جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے خود مختار اور طاقتور نظر آنے والے اخبارات و رسائل بھی اپنے لیے اشاعتی مواد کے انتخاب اور پالیسی ترجیحات کے تعین میں ان رکاوٹوں کو عبور نہیں کر پاتے۔

میرا خیال تھا کہ کسی اسٹال سے اخبارات و جرائد کا انتخاب کروں گا اور انہیں سامنے رکھتے ہوئے افغانستان میں صحافت کی موجودہ صورت حال کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔ مگر کابل سے صرف روزنامہ ''ھیواد'' کا ایک پرچہ اپنے میزبان کے گھر سے ملا جبکہ جلال آباد سے روزنامہ ''ننگرہار''۔ البتہ مولانا محمد الیاس چنیوٹی نے اچھا کیا کہ میرے اس ذوق اور تلاش کو محسوس کرتے ہوئے ''کابل ٹائمز''، ''انیس'' اور ''شریعت'' کا ایک ایک شمارہ میرے لیے لیتے آئے۔ چونکہ وہ میرے بعد دو دن وہاں رہے اس لیے روزنامہ انیس کا ۱۲ اگست کا شمارہ بھی ان کی وساطت سے دیکھنے کو مل گیا۔

''کابل ٹائمز'' چار صفحات کا انگلش ہفت روزہ ہے جس کے چیف ایڈیٹر عیسیٰ خان ہیں اور یہ اخبار البیرونی پبلشنگ ہاؤس کابل سے شائع ہوتا ہے، اس کی قیمت ایک ہزار افغانی یا دو روپے پاکستانی ہے۔ اس کا ایڈریس پوسٹ بکس ۱۵۶۰ جی پی او کابل اور فون نمبر ۶۱۸۴۸ ہے۔ چونکہ میں انگلش نہیں پڑھ سکتا اس لیے اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

روزنامہ ''ھیواد'' کابل سے شائع ہوتا ہے، پشتو زبان میں ہے، اس کے مدیر ملا اسد اللہ حنیفی ہیں، امارت اسلامی افغانستان کے مرکزی ادارہ نشریات کی طرف سے چھپتا ہے، چار صفحات کا اخبار ہے، اور اس کا ۱۴ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ میں پشتو نہیں پڑھ سکتا مگر اس کا ایک صفحہ فارسی میں بھی ہے جو مفہوم سمجھنے کی حد تک پڑھ لیتا ہوں۔ چونکہ ۱۴ اگست پاکستان کا یوم آزادی ہے اس لیے طبعی طور پر یہ دیکھنے کو جی چاہا کہ اس اخبار میں پاکستان کے یوم آزادی کے حوالے سے کوئی مضمون یا خبر چھپی ہے یا نہیں۔ مگر اخبار کے چاروں صفحات پر نظر ڈال کر افسوس ہوا کہ اس سلسلہ میں کوئی مواد مضمون یا خبر کی صورت میں موجود نہیں تھا۔

پشتو اخبار ''شریعت'' ہفت روزہ ہے جس کے مدیر عبد الرحیم ثاقب ہیں اور یہ بھی امارت اسلامی افغانستان کے مرکزی شعبہ نشریات کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

''انیس'' فارسی روزنامہ ہے جو کابل سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے بانی کے طور پر غلام محی الدین انیس کا نام پیشانی پر درج ہے اور ناشر ''موئسہ نشریاتی انیس کابل'' ہے۔ ایڈریس پوسٹ بکس ۵۴۹ کابل ہے۔ اخبار میں فارسی کے ساتھ ساتھ کچھ مضامین اور خبریں پشتو میں بھی ہیں۔ اخبار انیس کا ۱۲ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے اور چونکہ یہ دن افغانستان میں ''یومِ استقلال'' کے طور پر منایا جاتا ہے اس لیے زیادہ تر مضامین اور کچھ خبریں استقلال کے حوالے سے ہیں۔

افغانستان میں ''یومِ استقلال'' برطانوی استعمار کے خلاف افغانستان کی جنگ آزادی میں کامیابی اور برطانیہ کی طرف سے افغانستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کی خوشی میں منایا جاتا ہے جو اگست ۱۹۱۹ء میں ''معاہدہ راولپنڈی'' کی صورت میں تسلیم کی گئی تھی۔ اس سے قبل افغانستان پر برطانوی فوجوں کی یلغار رہتی تھی اور متعدّد بار کابل، قندھار اور جلال آباد پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہوا۔ اور ایک مرحلہ پر والیٔ افغانستان امیر عبد الرحمن خان نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کے عوض افغانستان کے بیرونی معاملات کا کنٹرول تحریری طور پر برطانوی حکومت کے سپرد کر دیا۔ مگر مارچ ۱۹۱۹ء میں امیر عبد

الرحمن خان کے پوتے امیر امان اللہ خان نے برطانوی استعمار سے مکمل آزادی کا اعلان کر کے جنگ چھیڑ دی جس میں برطانوی فوجوں کو افغان حریت پسندوں کے مقابلہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور پھر اس کے نتیجے میں اسی سال اگست میں مذکورہ معاہدہ ہوا اور افغانستان کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

انگلش، فارسی اور پشتو کے یہ سب اخبارات چار چار صفحات کے ہیں، ان میں جاندار کی تصویر نہیں ہے، کسی عنوان پر تجزیاتی مضامین اور فیچروں کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے، اور مراسلات کا کوئی کالم بھی نظر سے نہیں گزرا۔ جبکہ میرے لیے کسی اخبار کا سب سے زیادہ دلچسپی کا کالم یہی ہوتا ہے اور اسی سے میں سوسائٹی کے مجموعی رجحانات کا اندازہ کرتا ہوں۔ یہ اخبارات چونکہ سرکاری طور پر شائع ہوتے ہیں اس لیے انہیں حکومتی خبر نامہ یا گزٹ کہنا زیادہ مناسب ہوگا جس سے حکومتی پالیسیوں اور ترجیحات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جبکہ اخبار اس سے بالکل مختلف چیز ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک "آئینہ" کی ہوتی ہے جو چہرے کے حسن و قبح دونوں کو یکساں دکھائے تو اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ کسی صاف اور شفاف آئینے پر بھی اپنی مرضی کے نقش و نگار مرتسم کر دیے جائیں تو وہ اپنے تمام تر حسن اور چمک کے باوجود آئینہ کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔

طالبان حکومت کی مشکلات اور عزم

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۰ء

گذشتہ ہفتہ کے دوران راقم الحروف کو حرکۃ الجہاد الاسلامی کے ایک وفد کے ہمراہ کابل جانے کا موقع ملا۔ مدیر نصرة العلوم حاجی محمد فیاض خان سواتی اور مدرسہ نصرة العلوم کے مدرس مولانا ظفر فیاض بھی وفد میں شامل تھے۔ راقم الحروف ۱۳ اور ۱۴ اگست دو روز کابل میں گزار کر واپس آ گیا جبکہ وفد کے دیگر ارکان غزنی اور قندھار بھی گئے اور براستہ کوئٹہ واپس آئے۔

ہم نے کابل میں دو روزہ قیام کے دوران طالبان حکومت کے جن ذمہ دار حضرات سے ملاقات کی ان میں سے امارتِ اسلامی افغانستان کے نائب صدر ملا محمد حسن، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد ثاقب، کابل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی، اور ممتاز افغان کمانڈر مولانا ارسلان رحمانی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس سفر اور کابل وغیرہ میں میزبانی کے انتظامات حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی نے کیے جس پر ہم سفر کے منتظم قاری عبد القادر صاحب اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے دیگر ذمہ دار حضرات کے شکر گزار ہیں۔

افغانستان کے اس سفر میں وہاں کی صورتحال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر کے خوشی ہوئی کہ مسائل و مشکلات میں مسلسل اضافہ کے باوجود طالبان کی اسلامی حکومت کے اہلکار پورے صبر و حوصلہ، ایثار و استقامت اور قناعت و کفایت شعاری کے ساتھ حکومتی نظام چلا رہے ہیں، جو بلا شبہ قابلِ رشک اور لائقِ تقلید ہے اور طالبان کے خلوص اور دینی تربیت کا ثمرہ ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک مثال کا ذکر کر دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ طویل خشک سالی، بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں اور مسلسل حالتِ جنگ کے باوجود طالبان حکومت عام آدمی کے استعمال میں آنے والی اشیا پر ٹیکس لگانے سے گریز کر رہی ہے، جو خود مشقت اٹھا کر عوام کو سہولت پہنچانے کی بہترین مثال ہے۔ اور اسی وجہ سے کابل میں عام شہریوں کو چینی ۱۲ روپے (پاکستانی) فی کلو، آٹے کی ۸۰ کلو کی بوری ۲۰۰ روپے، بکرے کا گوشت ۴۰ روپے فی کلو، گھی کا ڈبہ (کنستر) ۵۰۰ روپے، اور پٹرول ۱۸ روپے فی لیٹر کے حساب سے فراہم ہو رہا ہے۔ اور جو گاڑی ہمارے ہاں پاکستان میں کئی گنا کسٹم ڈیوٹی ادا ہونے کے بعد تین سوا تین لاکھ میں ملتی ہے وہ افغانستان میں معمولی کسٹم ڈیوٹی کی وجہ سے ایک لاکھ روپے میں مل جاتی ہے۔

البتہ افغانستان میں سڑکوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے اور جنگ کی تباہ کاری کے بعد انہیں دوبارہ بنانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عالمی مالیاتی ادارے اور ترقی یافتہ ممالک افغانستان کو جن شرائط پر امداد دینا چاہتے ہیں وہ طالبان کی اسلامی حکومت کیلئے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم شرط اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کو قبول کر کے اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ سے دستبردار ہونا ہے۔ جس کیلئے طالبان حکومت تیار نہیں ہے اور پورے عزم و استقامت کے ساتھ مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے موقف پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں افغان نائب صدر ملا محمد حسن نے ہمارے وفد سے ملاقات کے دوران کہا کہ ہم وہی اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں جو حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دور میں نافذ تھا اور اس بارے میں ساری دنیا دوسری طرف ہو جائے ہم کسی کی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ طالبان کی اسلامی حکومت کو اس مبارک عزم پر قائم رکھیں اور انہیں مشکلات و مسائل کے بھنور سے نجات دلا کر استحکام اور ترقی کی راہ پر گامزن فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

حرکۃ المجاہدین کا طلبہ سیمینار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۴ ستمبر ۲۰۰۰ء

کراچی میں حرکۃ المجاہدین کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ”طلباء سیمینار“ میں شرکت کیلئے ۱۳ ستمبر کو رات مولانا اللہ وسایا قاسم اور سید سلمان گیلانی کے ہمراہ کراچی پہنچا تو ایئرپورٹ پر ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انتظامیہ نے نشتر پارک میں حرکۃ المجاہدین کو سیمینار منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے اور نشتر پارک کو پولیس کی گاڑیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے تاکہ حرکۃ کے نوجوان وہاں سیمینار کے انتظامات نہ کر سکیں۔ گلشن اقبال میں حرکۃ کے ترجمان ہفت روزہ ”الہلال“ کے دفتر پہنچ کر مزید تفصیلات معلوم ہوئیں اور پتہ چلا کہ گفتگو جاری ہے مگر انتظامیہ کے ارباب حل و عقد اس بات پر مصر ہیں کہ یہ سیمینار نشتر پارک میں نہ ہو بلکہ کسی اور جگہ منعقد کر لیا جائے۔ حرکۃ کے نوجوانوں کا اصرار تھا کہ اگر انتظامیہ کو یہی کرنا تھا تو یہ بات چند روز پہلے کہہ دی جاتی کیونکہ سیمینار کا اعلان اور اس کی تشہیر کافی دنوں سے ملک بھر میں

ہو رہی تھی مگر سب اعلانات، رابطوں اور انتظامات کے مکمل ہونے کے بعد صرف ایک دن پہلے نشتر پارک کو ممنوع قرار دینا سخت ناانصافی بلکہ جانبدارانہ طرزِ عمل کی غمازی کرتا ہے۔ کیونکہ اب نہ دوبارہ تشہیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی مختلف مقامات پر احباب سے رابطے کر کے سب کو متبادل جگہ کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے۔ حرکۃ کے نوجوانوں کو اس بات کا غصہ تھا کہ ابھی ماضی قریب میں نشتر پارک میں فلاں فلاں تنظیم کے جلسے ہو چکے ہیں تو حرکۃ کے سیمینار میں کیا خرابی نظر آ رہی ہے کہ انتظامیہ نشتر پارک میں اس کے انعقاد کی روادار نہیں ہے۔

میرے لیے اس موقع پر انتظامیہ کے کسی ذمہ دار سے بات کرنا اور ان سے اس صورتحال کی وجہ معلوم کرنا تو بہت مشکل تھا البتہ اربابِ نظم و نسق کے موقف کا بالواسطہ طور پر جتنا علم ہو سکا اس کے مطابق ظاہری بات تو یہ تھی کہ وہ امنِ عامہ کے نقطۂ نظر سے نشتر پارک میں اس سیمینار کے انعقاد کو درست نہیں سمجھ رہے تھے لیکن بین السطور یہ بات بھی صاف پڑھی جا رہی تھی کہ اتنی مصروف اور تاریخی جلسہ گاہ میں ''حرکۃ المجاہدین'' کے اتنے بڑے جلسہ کا انعقاد امریکہ بہادر کو زیادہ ناگوار گزرے گا جس نے حرکۃ المجاہدین کو دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے اور جس کی طرف سے حرکۃ المجاہدین پر پابندی کا بار بار مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وائٹ ہاؤس کی چشم خشمگیں کا سامنا کرنا پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے کسی بھی حصے کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے بالآخر ۱۴ستمبر کی صبح تک حرکۃ المجاہدین کی قیادت کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ طلباء سیمینار کا انعقاد نشتر پارک کی بجائے گلشن اقبال کے اردو سائنس کالج کی گراؤنڈ میں کر لیں جو اگرچہ نشتر پارک کی طرح معروف نہیں ہے مگر وسعت میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس صورتحال پر حرکۃ المجاہدین کے چند پرجوش نوجوانوں کا تبصرہ یہ تھا کہ ہمارے سیمینار کو ناکام بنانے کی جان بوجھ کر سازش کی گئی ہے مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ نشتر پارک میں اجازت دینے سے انکار کر کے اور ایک دن قبل بکتربند گاڑیوں کے ساتھ پارک کا گھیراؤ کر کے انتظامیہ نے ان کے سیمینار کی پچاس فیصد کامیابی کا اعلان خود ہی کر دیا ہے اس لیے وہ پریشان نہ ہوں اور باقی پچاس فیصد کامیابی کو یقینی بنانے کیلئے شام تک اطلاعات اور رابطوں کے محاذ پر ڈٹ جائیں تاکہ پابندی لگانے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ زندہ جماعتوں کیلئے یہ پابندی اور نقل مکانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے ہدف تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ چونکہ متبادل انتظامات اور لوگوں کو جگہ کی تبدیلی کی اطلاع دینے کیلئے صرف ایک دن کا وقت ملا ہے اس لیے حرکۃ کے نوجوان اگر اس خلا کو پچاس فیصد بھی پر کر لیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ لیکن رات کو جب اردو سائنس کالج کے گراؤنڈ میں سیمینار میں شرکت کیلئے پہنچا تو حاضرین کی تعداد اور نوجوانوں کا جوش و خروش دیکھ کر پہلے یہی محسوس ہوا کہ جلسہ شاید نشتر پارک میں ہی ہو رہا ہے کیونکہ کسی بھی حوالے سے کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گویا حرکۃ کے نوجوانوں نے اسے بھی ''محاذِ جنگ'' تصور کرتے ہوئے ہنگامی بنیادوں پر سارے متبادل انتظامات بروقت کر ڈالے تھے۔ حاضری کے اعتبار سے یہ سیمینار کراچی کے چند بڑے جلسوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور نظم و نسق کو جس طرح حرکۃ کے نوجوانوں نے کنٹرول کیا اس نے افغانستان کی طرح پاکستان کی سرزمین پر بھی لوگوں کو یہ مشاہدہ کرا دیا کہ ڈاڑھیوں والے اور مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر سبق پڑھنے پڑھانے والے اگر نظم و نسق کے محاذ پر آ جائیں تو یہ میدان بھی ان کیلئے اجنبی

نہیں ہے۔

میرے لیے مجاہدین کی سب جماعتیں اور گروپ یکساں حیثیت رکھتے ہیں، جو جہادی تنظیم اپنے کسی پروگرام میں شرکت کی دعوت دیتی ہے اسے بلاجھجک قبول کرتا ہوں لیکن حرکۃ المجاہدین کا نام چونکہ امریکی حکمرانوں کی زبان پر بار بار آتا ہے اس لیے اس کے ساتھ طبعی طور پر زیادہ قلبی انس محسوس کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والی ہر جماعت کا خادم ہوں اور ہر ایک سے ہر ممکن تعاون کرتا ہوں لیکن چونکہ مرزا طاہر احمد کی زبان پر مولانا منظور احمد چنیوٹی کا نام بار بار آتا ہے اس لیے اس میدان میں مولانا چنیوٹی کے ساتھ میرا انس طبعی طور پر زیادہ ہے، یہ بھی ایک معیار ہے۔

مجھے سیمینار میں خطاب کیلئے کہا گیا تو میری گفتگو کا آغاز اسی نکتہ سے ہوا کہ میں زندہ دلان کراچی کا شکر گزار ہوں اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ حرکۃ المجاہدین کی دعوت پر رکاوٹوں کے باوجود اتنی عظیم تعداد میں جمع ہو کر انہوں نے حرکۃ المجاہدین کو دہشت گرد قرار دینے کے امریکی فیصلے کو مسترد کر دیا ہے اور وائٹ ہاؤس کو یہ پیغام دے دیا ہے کہ ہم نہ تو حرکۃ المجاہدین کو دہشت گرد جماعت سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس پر پابندی کی کسی کارروائی کو برداشت کر پائیں گے۔

وسطی ایشیا کی ریاستیں آزادی کے بعد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی انتظامیہ نے ازبکستان سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کی تنظیم ”ازبک اسلامک فرنٹ“ کو بھی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کر کے اس پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا ہے۔ رپورٹ میں امریکی محکمہ خارجہ کے شعبہ انسداد دہشت گردی کے کوآرڈینیٹر مائیکل شیہان کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ عام طور پر دہشت گرد تنظیموں کی فہرست پر دو سال کے بعد نظر ثانی ہوتی ہے اور کسی نئی تنظیم کو اسی موقع پر فہرست میں شامل کیا جاتا ہے لیکن ازبک مجاہدین کی اس تنظیم کی سرگرمیوں کے پیش نظر دو سال کی اس مدت کے دوران ہی روٹین سے ہٹ کر اسے فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس سے امریکہ کے نزدیک دہشت گرد تنظیموں کی تعداد اب ۲۹ ہو گئی ہے۔

ازبکستان وسطی ایشیا کے ان ممالک میں سے ہے جو سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد آزاد ہوئے ہیں اور غالب مسلم اکثریت کے ممالک ہیں۔ تاشقند اور سمرقند جیسے معروف شہر اسی ازبکستان میں ہیں اور ایک زمانہ میں یہ خطہ اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ مگر روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ علاقہ بھی کمیونزم کے زیر تسلط آ گیا اور اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و اقدار کی روایات قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔ کم و بیش پون صدی تک وسطی ایشیا کے یہ ممالک کمیونزم کے غلبہ کا شکار رہے اور جہادِ افغانستان کے نتیجے میں جب سوویت یونین کا آہنی شکنجہ ڈھیلا ہوا تو سوویت یونین کی یہ ریاستیں دنیا کے نقشہ پر آزاد ممالک کی حیثیت سے نمودار ہو گئیں۔

ازبکستان کے آزادی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد راقم الحروف کو وہاں جانے کا موقع ملا ہے اور تاشقند و سمرقند

میں چند روز گزارنے کے علاوہ سمرقند سے چند میل کے فاصلے پر ''خرتنگ'' میں حضرت امام بخاریؒ کے مزار پر حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے جب وہاں بند مساجد دوبارہ کھل رہی تھیں اور اسلامی روایات واقدار کا ایک بار پھر احیاء ہو رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہزاروں مساجد ایسی ہیں جو پون صدی کا عرصہ مقفل رہی ہیں اور بہت سی مساجد کو دوسرے مقاصد کیلئے استعمال میں لایا جاتا رہا ہے۔ تاشقند کی ایک بڑی مسجد ہم نے دیکھی جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ چالیس سال تک یہ مسجد سیمنٹ کے گودام کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ سمرقند کی مرکزی جامع مسجد میں بھی حاضری ہوئی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس مسجد کا مین ہال تقریباً نصف صدی تک سینما ہال بنا رہا۔

عام زندگی میں نماز وغیرہ عبادات کا اظہار ممکن نہیں تھا، کچھ لوگ چوری چھپے پڑھتے تھے۔ ایک عالم دین نے بتایا کہ ملازمت سے دوپہر کے وقفہ کے دوران وہ کھانے کیلئے گھر آتے تو ظہر کی نماز اس کیفیت سے پڑھتے تھے کہ ایک شخص دروازے پر پہرہ دیتا تھا تاکہ کسی کے دیکھنے کا خطرہ محسوس ہو تو وہ نماز پڑھنے والے کو نماز توڑنے کا اشارہ کر سکے۔ قرآن کریم کا چھاپنا اور پڑھنا شجر ممنوعہ تھا، حتیٰ کہ آزادی کا پرچم لہرائے جانے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کا باقی دنیا کے مسلمانوں سے سب سے بڑا تقاضہ یہ تھا کہ انہیں قرآن کریم کے جس قدر نسخے مہیا کیے جا سکیں کیے جائیں۔ چنانچہ سعودی عرب اور مصر کی حکومتوں اور پاکستان کے دینی اداروں نے کروڑوں کی تعداد میں قرآن کریم چھپوا کر ان ممالک میں تقسیم کرائے۔

لیکن ان ممالک کی بدقسمتی یہ رہی کہ آزادی کا لیبل چسپاں ہونے کے باوجود ان ریاستوں میں حکومتی ڈھانچے، ریاستی نظام اور حکمران کلاس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور آزادی کے منتظم اور رکھوالے بھی وہی قرار پائے جو آزادی سے قبل کمیونسٹ نظام کو چلانے کے ذمہ دار تھے اور چلاتے آرہے تھے۔ اس طرح وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی ''ٹریجڈی'' ہوئی جس کا اس سے قبل ہم جنوبی ایشیا کے مسلمان شکار ہو چکے ہیں کہ کہنے کو ہمیں آزادی مل گئی اور ہم پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ملک کی حیثیت سے آزاد اقوام کی فہرست میں شمار کر لیے گئے مگر سیاست و معیشت اور عدالت و معاشرت کا نظام وہی رہا جو غلامی کے دور میں تھا، بلکہ حکمران کلاس اور طبقات بھی وہی رہے جو برطانوی استعمار کے معاون و مددگار کے طور پر آزادی سے قبل اس خطہ میں حکمرانی کرتے چلے آرہے تھے۔ اور اس قسم کی آزادی نے ہمارے معاشرتی نظام اور ڈھانچے کو ترقی اور بہتری کی طرف لے جانے کی بجائے تذبذب، انارکی اور دو عملی کی دلدل میں دھکیل دیا۔

ازبکستان اور وسطی ایشیا کی دیگر مسلمان ریاستوں کے ساتھ بھی یہی المیہ پیش آیا ہے کہ جب افغانستان میں روسی افواج کی شکست یقینی ہوگئی اور یہ واضح نظر آنے لگا کہ روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے سوا اب کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تو شکست خوردہ روسی دانشوروں سے زیادہ فاتح امریکی دانشوروں کو اس بات کی فکر لاحق ہوگئی کہ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جب کابل میں مجاہدین کی حکومت قائم ہوگی تو اس کی بنیاد اسلام پر ہوگی، یہ اسلام محض دکھاوے کا نہیں بلکہ عملی ہوگا اور اس کے اثرات صرف افغانستان تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ اردگرد کے ممالک بالخصوص پاکستان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کا اس سے متاثر ہونا لازمی بات ہے۔ اس لیے کابل میں خالص اسلامی حکومت کے قیام کو روکنے اور قائم ہو جانے کی صورت میں اس کے اردگرد اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو محدود کرنے کیلئے ایک نئی منصوبہ

بندی کی گئی جس کیلئے امریکہ کے سابق صدر مسٹر نکسن نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر روسی دانشوروں کو دعوت دی کہ وہ امریکہ کے ساتھ اپنے اختلافات کو ختم کر دیں تاکہ امریکہ اور روس دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن سے نمٹ سکیں جو "احیائے اسلام" کی ایک نئی لہر کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے اور کابل اس کے مرکز کے طور پر سامنے آنے لگا ہے۔

چنانچہ مسٹر نکسن کی تحریک پر نئی منصوبہ بندی ہوئی جس کے تحت "جنیوا امن معاہدہ" ہوا، امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کا خاتمہ ہوا اور بالٹیک ریاستوں کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی "نقد آزادی" کو غنیمت سمجھا گیا تاکہ کم از کم وہاں کے ریاستی نظام اور حکومتی طبقات کو کسی متوقع انقلاب سے محفوظ رکھا جا سکے، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ملک کے عوام اس نظام یا حکمران گروہ کی تبدیلی اور وہاں اپنے عقائد و رجحانات اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق نئے نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کرتے ہیں تو انہیں بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دے کر امریکہ اور روس دونوں ان کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

ازبک اسلامک فرنٹ کا معاملہ بھی یہی ہے کیونکہ وہ ان گروہوں میں سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب سوویت یونین بکھر گیا ہے تو وسطی ایشیا کے مسلمان ممالک سے کمیونسٹ دور کی یادگار نوآبادیاتی نظام کا بھی خاتمہ ہونا چاہیے۔ ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکہ کا الزام یہ ہے کہ اس نے ہتھیار اٹھا رکھے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب منطق، دلیل اور استدلال کے سارے راستے بند کر دیے جائیں تو حق مانگنے والوں کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟ اور ترکی اور الجزائر میں رائے عامہ کا حشر سامنے آنے کے بعد اب امریکہ عالم اسلام کی تحریکات کو ہتھیار پھینک کر دلیل سے بات کرنے کے کون سے فلسفے کا سبق پڑھانا چاہتا ہے؟

امریکی نائب وزیرخارجہ کارل انڈرفرتھ کو پاکستان میں "طالبانائزیشن" کا خطرہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳ ستمبر ۲۰۰۰ء کے مطابق امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مسٹر کارل انڈر فرتھ نے کہا ہے کہ وہ طالبان کی حکومت کو صرف امریکہ اور دوسرے ممالک کیلئے ہی خطرہ نہیں سمجھتے بلکہ پاکستان کیلئے بھی خطرہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انہیں تشویش ہے کہ پاکستان بھی طالبانائزیشن کا شکار ہو کر ایک زیادہ بنیاد پرست ملک بن سکتا ہے۔

امریکی حکمرانوں کے اس خدشے اور خطرہ کا اصل پس منظر یہ ہے کہ

- طالبان حکومت کے اکثر اہلکار چونکہ پاکستان کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، اور ان کے پاکستان کے دینی حلقوں اور عوام کے ساتھ نہ صرف خوشگوار تعلقات ہیں بلکہ باہمی محبت و احترام اور تعاون و استفادہ کا رشتہ

بھی موجود ہے،

- اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی امریکی حکمرانوں کیلئے مسلسل پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان جاتے ہیں اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں وہ طالبان کی دینداری، سادگی، قناعت، عوام دوستی اور کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ ان کی انتظامی صلاحیتوں اور وہاں کے ماحول میں شرعی قوانین کے نفاذ کی برکات دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔
- حتٰی کہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب جیسے حضرات جو ناقدانہ نظر سے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے جاتے ہیں، واپس آکر ان کیلئے بھی طالبان کے طرزِ حکومت کو سراہے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اس لیے امریکی حکمران یہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کے عوام میں طالبان حکومت کے بارے میں جو مثبت جذبات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں، ان کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے ملک میں حکمرانی اور نظم ونسق کے حوالے سے اسی قسم کی قیادت کو سامنے لانے کے بارے میں سوچنے لگیں، جو طالبان کی پیروی کر کے ملک کو بدامنی اور عالمی طاقتوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکتی ہو۔ مسٹر کارل انڈر فرتھ کے مذکورہ بیان میں یہی خوف جھلک رہا ہے اور امریکی حکمران پاکستان کے حکمران طبقات اور اداروں کے ذہنوں پر بھی یہی خوف مسلط کر کے انہیں پاکستان میں طالبان کے اثرات کو کم اور محدود کرنے کیلئے سخت اقدامات پر آمادہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اب ایسا کرنا ممکن نہیں رہا کیونکہ پاکستان کے دینی حلقوں میں طالبانائزیشن کا شعور دن بدن بڑھ رہا ہے اور عوام بھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس پر مشتمل اسٹیبلشمنٹ کے طرزِ حکومت اور طالبان کے اندازِ حکمرانی میں زمین وآسمان کے فرق کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے اگر ملک کے عوام نے طالبانائزیشن کو اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے ہوئے اسے خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کر لیا تو ان شاء اللہ امریکی حکمرانوں کا یہ واویلا ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکے گا۔

ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکی پابندی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

ہفت روزہ الہلال کراچی نے ۲۲ تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں ”نیویارک ٹائمز“ کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ امریکی حکومت نے ازبک مجاہدین کی تنظیم ”ازبک اسلامک فرنٹ“ کو بھی دہشت گرد قرار دے کر اس پر پابندی لگانے کا اعلان کیا ہے۔ خبر کے مطابق امریکی محکمہ خارجہ کے انسدادِ دہشت گردی کے شعبہ کے انچارج مائیکل شیان نے بتایا ہے کہ دہشت گرد تنظیموں کی فہرست پر نظر ثانی کر کے اسے دوبارہ جاری کرنے کا کام عام طور پر دو سال بعد کیا جاتا ہے لیکن ازبک اسلامک فرنٹ کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر دنیا بھر کی دیگر اسلامی تحریکات کو اس قسم کی کاروائی کا اشارہ دینے کے لیے دو سالہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اسے دہشت گرد تنظیم قرار دے کر اس کا نام ممنوعہ جماعتوں کی فہرست میں

شامل کر دیا گیا ہے۔ جس سے امریکی حکومت کی طرف سے دنیا بھر میں دہشت گرد قرار دی جانے والی تنظیموں کی تعداد انتیس ۲۹ ہو گئی ہے۔

ازبک اسلامک فرنٹ کا تعلق وسطی ایشیا کی ایک مسلم ریاست ازبکستان سے ہے جو جہادِ افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد اس خطہ کی دیگر مسلم ریاستوں کے ساتھ آزاد ہوئی تھی، لیکن ان سب ریاستوں کے حکومتی ڈھانچے اور نظامِ مملکت حتّٰی کہ حکمران ٹیمیں بھی بدستور وہی چلی آ رہی ہیں جو روسی تسلط کے دوران کمیونسٹ حکومت کے طور پر ان کا نظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ جبکہ ازبک اسلامک فرنٹ اور اس جیسی متعدّد دیگر تنظیمیں ان ریاستوں میں اس مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہیں کہ سوویت یونین سے گلوخلاصی کے بعد کمیونسٹ نظام اور اس دور کے حکمران طبقوں سے بھی نجات حاصل کی جائے اور ان ممالک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ ان میں بعض مسلح تحریکیں ہیں، اور علمی و فکری تحریکات بھی ہیں، جن کا طریق کار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لیکن ہدف سب کا یہی ہے کہ کمیونسٹ نظام اور کمیونسٹ دور کی حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان، آذربائیجان اور وسطی ایشیا کی دیگر مسلم ریاستوں میں قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا جائے۔ اور امریکہ کی طرف سے ازبک اسلامک فرنٹ کو دہشت گرد قرار دینے کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے اثرات کو وسطی ایشیا کی ان ریاستوں تک پھیلنے سے روکا جائے۔

دراصل جہادِ افغانستان کے دوران روسی افواج کی شکست کے آثار نمایاں ہوتے ہی اس بات کی منصوبہ بندی شروع ہو گئی تھی کہ افغان مجاہدین کے نظریاتی اثر و رسوخ اور جہادی دائرہ کو وسیع نہ ہونے دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے امریکہ کے سابق صدر آنجہانی نکسن نے بہت فعال اور متحرک کردار ادا کیا تھا، اور روسی دانشوروں کو انہوں نے ہی اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ امریکہ کے خلاف محاذ آرائی ترک کر دیں تاکہ امریکہ اور روس دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن اِسلام کے خلاف صف آرا ہو سکیں۔ اسی مفاہمت کے نتیجے میں وسطی ایشیا کی ریاستوں پر سوویت یونین کا شکنجہ ڈھیلا کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اس ظاہری آزادی پر قناعت کرتے ہوئے کمیونسٹ نظام کے خلاف بغاوت پر نہ اتر آئیں۔ لیکن یہ فسوں زیادہ دیر تک نہیں چل سکا اور وسطی ایشیا کی ان مسلم ریاستوں کے عوام دھیرے دھیرے اس حقیقت کو سمجھتے جا رہے ہیں کہ آزادی کے نام پر ان ملکوں میں کمیونسٹ نظام اور کمیونسٹ حکومتوں کو بدستور باقی رکھنے کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ اس لیے وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے اور مختلف گروپ اس کے لیے متحرک ہو رہے ہیں جن کا راستہ روکنے کے لیے امریکہ نے مذکورہ کاروائی کی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وسطی ایشیا کے مسلمان بالآخر کمیونسٹ نظام اور حکومتوں سے بھی جلد نجات حاصل کر لیں گے۔

پاکستان میں افغان طالبان کی تقلید؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۰ء

اس ضمن میں ایک اور غلط فہمی کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض دوست بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں خالصتاً علماء کی بنیاد پر شرعی عدالتی نظام قائم کیا ہے اسی طرح ہم بھی یہاں کر لیں گے۔ لیکن یہ بات سادگی اور جذباتیت پر مبنی ہے اس لیے کہ افغانستان میں جب طالبان نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت ان کے ملک میں نظام نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی اور پرانا نظام کھنڈر کی شکل اختیار کر چکا تھا جس پر کسی رکاوٹ کے بغیر انہوں نے نئے نظام کی بنیاد رکھ دی۔ جبکہ پاکستان میں صورتحال قطعی طور پر مختلف ہے یہاں نہ صرف ایک منظم نظام موجود ہے بلکہ اس کی حفاظت کرنے والے طبقات بھی پوری طرح چوکس اور طاقتور ہیں۔

- اس نظام سے کسی نئے نظام کیلئے جگہ خالی کرانے کی ایک صورت تو وہی ہے جو افغان مجاہدین نے اختیار کی اور پرانے نظام کو کھنڈر میں تبدیل کرنے کیلئے انہیں پندرہ لاکھ جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ لیکن اگر موجودہ معروضی حالات میں یہ قابل عمل نہ ہو اور راقم الحروف کی دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ یہ راستہ پاکستان میں فی الواقع قابل عمل نہیں ہے،
- تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ مروجہ نظام میں شامل ان افراد سے راہ و رسم بڑھائی جائے جو اپنی مجبوریوں کے باعث اس سسٹم میں شریک ہیں مگر قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں اور شرعی نظام و قوانین کے نفاذ کے خواہاں ہیں اور انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے مروجہ نظام کی بھول بھلیوں سے نکلنے کی راہ تلاش کی جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر کی سطح کو چھوڑ کر مروجہ نظام کے ہر شعبہ کے اہلکاروں کی غالب اکثریت انہی لوگوں پر مشتمل ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور ملک میں فی الواقع شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ علماء کرام انہیں شرعی قوانین کا مخالف سمجھنے کی بجائے ان کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے ان سے روابط استوار کریں، ان کی فکری و نظریاتی تربیت کریں، انہیں قرآن و سنت کی تعلیمات اور اسلامی نظام کی ضروری باتوں سے آگاہ کریں اور نفاذِ اسلام کے حوالے سے ان کی ذہن سازی کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نفاذ اسلام کی خواہاں دینی جماعتیں اور مراکز اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرتے ہوئے صرف پانچ سال کیلئے اس رخ پر محنت کر لیں تو ملک میں ایک خوشگوار انقلاب کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسا انقلاب جس کیلئے خون اور جانوں کی قربانیوں کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ البتہ یہ انقلاب علماء کرام اور دینی راہنماؤں سے مصروفیات، ترجیحات، فرقہ وارانہ بالادستی کے رجحان، باہمی معاصرانہ چشمک اور بلاشرکت غیرے ''قائدِ انقلاب'' بننے کی خواہش کی قربانی کا ضرور تقاضا کرتا ہے۔ اور جس روز ہماری مذہبی قیادت ان چار پانچ چیزوں کی قربانی دینے کیلئے تیار ہو گئی اس روز پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

افغانستان کی تعمیرِ نو: ڈاکٹر سلطان بشیر محمود کے تاثرات

ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد --- ۱۶ دسمبر ۲۰۰۰ء

''امہ تعمیرِ نو افغانستان'' کے چیئرمین ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب گذشتہ روز گوجرانوالہ تشریف لائے اور جامع مسجد تقویٰ پیپلز کالونی میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کرنے کے علاوہ البرق میرج ہال جی ٹی روڈ گوجرانوالہ میں حرکت المجاہدین کی طرف سے دی گئی افطار پارٹی میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے جس کے اہتمام میں جناب عثمان عمر ہاشمی اور ناصر محمود ہاشمی ایڈووکیٹ نے سرگرم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ تعارف تو ایک عرصہ سے تھا کہ وہ ایک معروف انجینئر اور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ محب وطن شہری اور قرآن کریم کا وسیع مطالعہ رکھنے والے دانشور بھی ہیں، وہ قرآنی علوم و معارف کو سائنس کی زبان میں لوگوں تک پہنچانے کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی متعدّد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مگر اس سے قبل ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے راقم الحروف ان سے ملاقات کی خواہش کے ساتھ افطار پارٹی میں شریک ہوا جہاں ان کی پر مغز گفتگو سننے کا موقع مل گیا۔

ڈاکٹر صاحب کا پرانا نام سلطان بشیر الدین محمود ہے۔ جب پہلی بار ان کا نام سنا بلکہ کسی کتابچہ میں پڑھا تو نام کی وجہ سے پہلا تاثر یہی ذہن میں ابھرا کہ شاید کوئی قادیانی مشنری ہوں گے مگر اسلام آباد کے دوستوں نے بتایا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان اور قرآنی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے جذبہ سے سرشار دانشور ہیں۔ ان کی ایک کتاب میں خود ان کے اپنے تحریر کردہ پیش لفظ سے معلوم ہوا کہ نام کی اس مشابہت نے انہیں اور بھی بہت سے حلقوں میں مشکوک بنا رکھا تھا کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے اور جانشین مرزا بشیر الدین محمود کے نام کی وجہ سے ان کا نام سنتے یا پڑھتے ہی ان کے قادیانی ہونے کا تاثر ذہنوں میں ابھرنے لگتا تھا۔ حالانکہ ان کے خاندان میں کسی سطح پر بھی قادیانیت کے کوئی اثرات نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی تاثر کو ختم کرنے کیلئے انہوں نے اپنا نام ''سلطان بشیر محمود'' رکھ لیا ہے۔ گذشتہ روز افطار پارٹی میں ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی اور ان کی مختصر گفتگو سن کر مزید اطمینان ہوا کہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف عالمی کفر کی سازشوں کا ادراک اور ان کے توڑ کیلئے واضح ذہن رکھنے والوں کی اب ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کمی نہیں رہی، اور ملک کی اعلیٰ ذہانت کے حلقوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اسلام، عالم اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے مفادات کیلئے سرگرم بھی رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب نے افطار پارٹی میں افغانستان کے حوالے سے گفتگو کے دوران تازہ ترین صورتحال پر روشنی ڈالی، طالبان حکومت کے خلاف بڑھتے ہوئے عالمی دباؤ کا ذکر کیا، اس کی وجوہات بیان کیں، اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے ''امہ تعمیر نو'' کے پروگرام کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے پاکستان کے شہریوں بالخصوص تاجروں اور صنعتکاروں پر زور دیا کہ وہ افغانستان کی تعمیر نو اور طالبان حکومت کے استحکام کی ضرورت کو محسوس کریں اور کفر کی عالمی یلغار سے طالبان حکومت کو بچانے کیلئے اپنا کردار بروقت ادا کریں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کا مفاد اس خطہ میں مشترک ہے اور دونوں کا نفع و نقصان ایک ہے، اس لیے اگر افغانستان کو نقصان پہنچتا ہے تو پاکستان اس کے اثرات

سے محفوظ نہیں رہے گا۔ ان کے خیال میں طالبان حکومت اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور ہمیں یعنی پاکستانیوں کو اس صورتحال کا صحیح طور پر ادراک کرنا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران طالبان کی حکومت افغانستان کی پہلی حکومت ہے جو پاکستان کے حق میں ہے اور دہلی کی بجائے اسلام آباد سے وابستگی رکھتی ہے۔ طالبان حکومت کے بیشتر افراد پاکستان کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں اور پاکستان سے محبت رکھتے ہیں، اس لیے پاکستان کو اس حکومت کو بچانے کیلئے خود اپنے مفاد کے خاطر بھی سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اور روس گذشتہ دو عشروں میں صرف ایک بات پر متفق ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ طالبان کی حکومت کو ہر قیمت پر ناکام بنایا جائے اور ختم کر دیا جائے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ طالبان نے اسلام کا عادلانہ نظام عملاً نافذ کر دیا ہے اور اسلامی قوانین کے تحت پر امن معاشرہ اور فری ٹیکس معیشت کا عملی نمونہ دکھا کر اسلام کی برکات کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کر دی ہے جو امریکہ، روس اور کفر کی دیگر سب قوتوں کیلئے ناقابل قبول بلکہ ناقابل برداشت ہے، چنانچہ طالبان حکومت کو ناکام بنانے کیلئے پوری دنیا کی کفر طاقتیں متحد ہو گئی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے اور اسلام اور اسلامی تحریکات کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر خدانخواستہ طالبان کی اسلامی حکومت ناکام ہو گئی تو عالم اسلام پر اس کے اثرات کیا ہوں گے۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود نے کہا کہ افغانستان اور طالبان کو سپورٹ کرنے اور عالمی کفر کے خلاف انہیں تحفظ فراہم کرنے کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ پاکستان کے صنعتکار اور تاجر افغانستان میں سرمایہ کاری کی طرف متوجہ ہوں جہاں کام کا وسیع میدان ہے، ٹیکس فری معیشت ہے، حکومتی اہل کاروں کا رویہ حوصلہ افزا ہے، امن ہے، روپے و مال کا تحفظ ہے، اور شرعی قوانین کے تحت تحفظ کے ساتھ ساتھ بے پناہ برکات بھی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان میں معدنیات کے وسیع ذخائر ہیں، تیل ہے، گیس ہے، لوہا ہے، اور قیمتی پتھر ہے جسے نکالنے کیلئے مغربی ممالک کی درجنوں کمپنیاں قطار میں کھڑی ہیں لیکن طالبان حکومت ان کی بجائے پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کی طرف دیکھ رہی ہے اور انتظار میں ہیں کہ پاکستان کے تاجر اور صنعتکار آئیں اور معدنیات نکالنے کا کام سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ان فیکٹریوں کا کنٹرول بھی سنبھالیں جو بند پڑی ہیں اور وہ سرمایہ کاری کرنے والی پارٹیوں کی منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے توجہ نہ دی اور طالبان حکومت ان کاموں کا ٹھیکہ مغربی کمپنیوں کو دینے پر مجبور ہو گئی تو ایسی صورت میں صرف افغانستان نہیں بلکہ خود پاکستان کا بھی بہت بڑا نقصان ہو گا۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب کے ارشادات کا مختصر خلاصہ پیش کر کے میں اب ملک بھر کے ارباب دانش سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ اس اہم ملی ضرورت کو محسوس کریں اور دیندار تاجروں اور صنعتکاروں کو اس طرف توجہ دلانے کیلئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔

طالبان حکومت پر
اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی پابندیاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۱ء

اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف دباؤ بڑھانے کیلئے نئی پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے، جن میں طالبان پر دہشت گردی کی سرپرستی کرنے اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے سپرد نہ کرنے کے الزامات عائد کرتے ہوئے دنیا بھر کی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ طالبان حکومت کے ساتھ اقتصادی اور مواصلاتی بائیکاٹ کریں۔

طالبان حکومت کے خلاف ان پابندیوں کی بات ایک عرصہ سے چل رہی تھی اور امریکہ کے اشارے پر عراق، سوڈان اور لیبیا کی طرح افغانستان کو بھی اقتصادی ناکہ بندی کا نشانہ بنا کر عالمی استعمار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کیلئے اس قسم کی پابندیوں کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں، جو بالآخر سلامتی کونسل کی قرارداد کی صورت میں سامنے آگئی ہیں، اور اس کی چین اور ملائشیا کے سوا سلامتی کونسل کے دیگر تمام ارکان نے حمایت کی ہے، جبکہ چین اور ملائشیا نے بھی ان پابندیوں کی مخالفت کرنے اور افغان عوام کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہنے کی بجائے سلامتی کونسل کے مذکورہ اجلاس سے غیر حاضر رہنے کو ترجیح دی ہے۔

ادھر اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۵ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے مستقل مندوب شمشاد احمد نے ان پابندیوں پر احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ افغانستان کے ایک حصے پر پابندیاں عائد کر دی جائیں، جبکہ ان کے مخالفین کو اسلحہ اور اقتصادی امداد دینے کیلئے آپ کے دروازے کھلے ہیں؟ انہوں نے پاکستان کی طرف سے سلامتی کونسل سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس قرارداد کا از سرِ نو جائزہ لے۔

علاوہ ازیں روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کے مطابق اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ کے ترجمان ریاض محمد خان نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ افغانستان کے خلاف عائد کی جانے والی ان پابندیوں سے پاکستان بھی شدید متاثر ہوگا، اس لیے پاکستان نے متاثر فریق کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سلامتی کونسل کے سامنے از سرِ نو اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری طرف طالبان حکومت کے وزیر خارجہ مولوی وکیل احمد متوکل نے کابل میں پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران سلامتی کونسل کی پابندیاں مسترد کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکہ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اسامہ بن لادن کے مسئلہ کو امریکہ نے صرف بہانہ بنا رکھا ہے اور وہ دراصل طالبان حکومت کو اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی وجہ سے بہر صورت ختم کر دینا چاہتا ہے، لیکن امیر المومنین ملا محمد عمر نے امریکی دباؤ کو قبول نہ کرنے اور اسلامی احکام و قوانین پر عملدرآمد کو بہر حال جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔

جہاں تک امارتِ اسلامی افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی عائد کردہ پابندیوں کا تعلق ہے، یہ قطعی طور پر غیر متوقع نہیں ہیں اور کافی دنوں سے عالمی استعمار کے ایوانوں میں یہ کھچڑی پک رہی تھی۔ لیکن اس مسئلہ میں مسلمان حکومتوں اور خاص طور پر اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کا کردار بہت مایوس کن ہے، اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بیت المقدس، بوسنیا، چیچنیا، کشمیر اور عالمِ اسلام کے دیگر حساس معاملات کے حوالے سے اقوامِ متحدہ کے منافقانہ کردار، دوغلی پالیسی، اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کھلم کھلا معاندانہ طرزِ عمل کے باوجود مسلم حکمرانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں، اور وہ دوحہ میں سربراہی کانفرنس منعقد کرکے وقتی طور پر غصہ کا اظہار کرنے کے بعد پھر سے اپنے سابقہ کردار پر قانع ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کا "قصور" اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نے دنیا کے دیگر مسلم حکمرانوں کی طرح اسلام کا نام لے کر منافقانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے اسلامی نظام کے عملی نفاذ کا راستہ اختیار کر رکھا ہے جو امریکہ، روس اور چین سمیت دنیا میں کفر کی کسی قوت کو گوارا نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے طالبان حکومت کے خلاف اسی طرح کا متحدہ محاذ قائم ہو گیا ہے جیسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عرب قبائل نے متحد ہو کر غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا تھا، اور کفر کی اس وقت کی تمام قوتیں اسلام کا راستہ روکنے کیلئے متحد ہو گئی تھیں۔ لیکن ہمارا ایمان ہے کہ جس طرح مدینہ منورہ کے ہزار ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے خلاف پورے عرب قبائل کا اتحاد اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا، اسی طرح افغانستان کی طالبان حکومت اگر اپنے عزم پر قائم رہی تو دنیائے کفر کا یہ اتحاد اس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نئی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں گے۔

البتہ طالبان کے حوالے سے بے یقینی، تذبذب، منافقت اور دوعملی کا شکار ہونے والی مسلمان حکومتوں، اداروں، تنظیموں اور حلقوں سے ہم یہ گزارش کریں گے کہ وہ غزوۂ احزاب کے واقعات و نتائج کا ایک بار پھر مطالعہ کرتے ہوئے اس آئینے میں اپنے چہروں کے خدوخال کا ضرور جائزہ لیں تاکہ کل جب غبار چھٹے تو اپنے کردار کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کے بارے میں ان کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم سلامتی کونسل کی پابندیاں مسترد کرنے کے بارے میں طالبان حکومت کے دوٹوک اعلان کی مکمل حمایت کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت طالبان حکومت کو اس سنگین اور صبر آزما آزمائش سے باوقار طور پر سرخرو کرتے ہوئے دنیا میں خلافتِ اسلامیہ کے اِحیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کا ہراول دستہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

اسامہ بن لادن کی آڑ میں امارتِ اسلامی افغانستان کا نشانہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۱ء

اسلام آباد میں امارتِ اسلامی افغانستان کے سفیر مولوی سید محمد حقانی نے گزشتہ روز پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ اسامہ بن لادن کی آڑ میں افغانستان کو اسلامی نظام کے نفاذ پر انتقامی کاروائی کا نشانہ بنا رہا ہے اور معصوم افغان شہریوں کے خلاف دہشت گردی کی کاروائی کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کئی بار امریکہ سے تقاضا کیا ہے کہ اسامہ بن لادن کے خلاف کوئی ثبوت ہے تو فراہم کیا جائے، لیکن امریکہ ابھی تک کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکا اور یکطرفہ پروپیگنڈا کے زور سے عالمی رائے عامہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

افغانستان ان دنوں امریکہ اور اس کے ایما پر اقوامِ متحدہ کی طرف سے عائد کی جانے والی اقتصادی پابندیوں کے حصار میں ہے۔ اور عراق، سوڈان اور لیبیا کے بعد امریکہ نے اب افغانستان کے عوام کو اپنی معاندانہ انتقامی کاروائیوں کیلئے چن لیا ہے۔ ان ممالک کا قصور یہ ہے کہ وہ دنیا میں امریکہ کی واحد چودھراہٹ کو تسلیم کرنے اور ہر معاملہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اور بھروسہ رکھنے والی غیور افغان قوم کو جس طرح روس کی مسلح لشکرکشی اس کی آزادی اور قومی خودمختاری سے محروم نہیں کر سکی، اسی طرح امریکی اقتصادی ناکہ بندی بھی افغان عوام کی دینی حمیت و غیرت کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی اور افغانستان ان شاء اللہ تعالیٰ اس بحران میں سرخرو ہو گا۔

افغان طالبان کی مشکلات اور سنتِ نبویؐ

جنوری ۲۰۰۱ء کے دوران دوبئی کی مسجد بلال بن رباحؓ میں خطاب

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کے اس اجتماع سے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمن تفصیلی خطاب کریں گے۔ ان سے قبل مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے، اس لیے بطور تمہید چند باتیں آپ سے عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی عبد الرحمن نے اپنے خطاب میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ذکر کیا ہے اور اسے درپیش مشکلات کا حوالہ دیا ہے۔ بلاشبہ طالبان آج کے دور کا مظلوم ترین طبقہ ہے جس کے خلاف کفر ونفاق کی پوری دنیا متحد ہو گئی ہے اور انہیں عالمی استعمار کے سامنے جھکانے یا مٹا دینے کیلئے منصوبے بن چکے ہیں۔

طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام نہیں لیتے بلکہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو عملی طور پر نافذ بھی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کے بین الاقوامی دباؤ کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا اصل جرم یہی ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف پابندیوں اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، اس سے قبل بھی اہل حق اس قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے آ رہے ہیں حتیٰ کہ خود نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ مکرمہ کے کفار کی طرف سے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قریش کے باقی خاندانوں نے بنوہاشم سے مطالبہ کیا تھا کہ محمدؐ کو قتل کیلئے ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن بنوہاشم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل نے مل کر بنوہاشم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا اور جناب رسول اللہؐ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔

کفار کی طرف سے ان کے خلاف یہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ ان کے ساتھ لین دین نہیں ہوگا، ان سے رشتہ داری قائم نہیں کی جائے گی، ان کے پاس خوراک وغیرہ کی کوئی چیز نہیں جانے دی جائے گی اور ان کی معاشی ناکہ بندی ہوگی۔ اس دوران آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم درختوں کے پتے کھا کر گزارے کیا کرتے تھے اور راستے میں پڑا ہوا خشک چمڑا اٹھا لیتے تھے اور اسے گرم پانی میں نرم کر کے چبا کر نگل لیا کرتے تھے۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وادی میں بھوکے بچے جب روتے چلاتے تو اردگرد گھومنے والے مشرکین یہ آوازیں سن کو خوش ہوا کرتے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ نبی اکرمؐ اور ان کے خاندان کو محصور رہنا پڑا لیکن مشرکین کی عائد کردہ یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عمل نہ صرف جاری رہا بلکہ اس دوران حضرت ابوذر غفاریؓ اور بہت سے دیگر حضرات نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی پابندیاں اور ناکہ بندی تین سال گزرنے کے باوجود کارگر نہیں ہو رہی تو کچھ سمجھ دار مشرکین نے آگے بڑھ کر وہ معاہدہ ختم کرا دیا۔ اس لیے آج بھی یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں گی اور اگر طالبان حکومت اپنے مشن اور پروگرام پر استقامت کے ساتھ گامزن رہی تو پابندیاں لگانے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔

میں اس موقع پر اس صورت حال کے حوالے سے آپ حضرات کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشکلات و مصائب کے بارے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس پر سیرت نبوی سے دو واقعات پیش کروں گا تاکہ یہ بات ہمارے سامنے رہے کہ مشکلات و مصائب کے دور میں سنت نبوی کیا ہے۔ ایک واقعہ تو اس وقت کا ہے جب آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت ظاہری کیفیت یہ تھی کہ خود اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، سفر کیلئے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خفیہ راستے سے سفر کر رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے ہمراہ تین دن تک غار ثور میں روپوش رہے اور راستہ میں چلتے ہوئے کسی کو اپنے نام بتانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ تو ظاہری کیفیت تھی کہ بظاہر جان کا بچانا مشکل ہو رہا تھا لیکن اسی دوران سراقہ بن مالکؓ جناب نبی اکرمؐ کو راستہ میں ملے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر امان چاہی تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ ”سراقہ، میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں“

یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت کا بھی اظہار تھا جس میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ ایک یہ کہ خدائی فیصلے ظاہری حالات پر نہیں ہوتے۔ ظاہری حالات جس قدر بھی ناموافق ہوں، اگر مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہے اور اس کا ایمان و یقین پختہ ہے تو ظاہری حالات کی ناسازگاری اس کا کچھ

بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ اور دوسرا سبق یہ ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، مشکلات کتنی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اپنا ہدف سامنے رکھنا چاہئے اور ٹارگٹ میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہئے۔ اب دیکھیے کہ جناب رسول اللہؐ ظاہری طور پر کس حال میں ہیں کہ چھپ کر اور جان بچا کر مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نظر کہاں ہے؟ کسریٰ کے کنگنوں پر جو اس وقت کی ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا اور سراقہ بن مالکؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اسے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے اور پھر یہ صرف ایک وقتی بات نہیں تھی بلکہ پیش گوئی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں فارس فتح ہوا، کسریٰ کے شاہی خزانے غنیمت کے مال میں مدینہ منورہ آئے، ان میں وہ کنگن بھی تھے جو کسریٰ بادشاہ دربار میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے سراقہ بن مالک کو بلایا اور یہ کہہ کر تھوڑی دیر کیلئے کسریٰ کے کنگن انہیں پہنائے کہ اگرچہ سونے کے کنگن پہننا مرد کیلئے جائز نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کو پورا کرنے کیلئے میں یہ کنگن کچھ دیر کیلئے تمہیں پہنا رہا ہوں۔ اس طرح رسول اکرمؐ نے ہمیں سبق دیا کہ مشکلات و مصائب اور حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہئے اور اپنے ہدف اور ٹارگٹ میں کوئی کمزوری نہیں دکھانی چاہئے۔

دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بدر و احد کی جنگ میں ناکام و نامراد ہو کر قریش مکہ نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ اکیلے جناب نبی اکرمؐ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عرب قبائل سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بنوایا اور ایک بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی۔ یہ غزوۂ احزاب کی بات ہے جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف عرب قبائل کا بہت بڑا متحدہ محاذ تھا اور دوسری طرف حضورؐ اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے سب ملا کر ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ آپؐ نے مدینہ منورہ کے دفاع کیلئے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھودنے کا پروگرام بنایا اور خود صحابہ کرام کے ساتھ مل کر دن رات خندق کھودنے میں مصروف رہے۔ قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اہل ایمان کو یاد دلایا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پر چاروں طرف سے لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمہاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب خوف کی شدت سے تمہارے دل سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مومنوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا اور جب ان پر شدید زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

یہ اس وقت کی ظاہری کیفیت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ بہت سے خندق کھودنے والوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور بعض لوگوں نے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے حتیٰ کہ ایک صاحب نے آنحضرتؐ کو اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے تو آپؐ نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھا کر دکھا دیا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اس صورت حال میں جب ظاہری طور پر سخت مایوسی اور شدید خوف کی کیفیت مدینہ منورہ کی آبادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، حضورؐ سے خندق میں ایک چٹان کے سخت ضربوں کے باوجود نہ ٹوٹنے کی شکایت کی گئی، چنانچہ آپؐ خود تشریف لے گئے اور کدال کی ایک ہی

ضرب سے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ جب آپ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہاں سے چمک اٹھی اور اللہ کے نبیؐ نے فرمایا کہ "مجھے اس چمک میں قیصر و کسریٰ کے محلات دکھائی دیے ہیں"

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ خوف اور مایوسی کا کیا عالم ہے؟ اور اس حالت میں نظر کی بلندی ملاحظہ کیجئے کہ اس وقت کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے شاہی محلات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری تھی اور یہ سبق تھا کہ ظاہری حالات سے مایوس نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھو، اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہو اور اپنے ٹارگٹ اور ہدف میں کوئی کمزوری نہ آنے دو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر سازوسامان اور لشکر کی کثرت کے باوجود قبائل عرب کی یہ یلغار ناکام ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو نہ صرف فتح عطا فرمائی بلکہ اس پیش گوئی کے مطابق قیصر و کسریٰ کے شاہی محلات بھی اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ آزمائش اور ابتلا کے اس سخت ترین دور کے بعد غزوۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد اس طرح کی کہ ہوا کو تیز کر دیا اور غیبی لشکر آسمان سے اتارے جنہوں نے محاصرہ کرنے والے کافروں کے لشکر کو تتر بتر کر دیا اور وہ کوئی مقصد حاصل کیے بغیر ناکام واپس لوٹ گئے۔ اس لیے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ طالبان کی اسلامی حکومت اگر اسلام کے مکمل اور عملی نفاذ کے مشن پر قائم رہتی ہے اور ظاہری حالات کی ناسازگاری سے خوفزدہ نہیں ہوتی تو اس کیلئے بھی غیب کی قدرتیں حرکت میں آئیں گی اور امریکہ کی قیادت میں عالمی استعمار کا ان کے خلاف متحدہ محاذ اسی طرح ناکام ہو گا جس طرح جناب رسول اللہؐ کے خلاف قبائل عرب کا اتحاد ناکام ہو گیا تھا۔ البتہ ہمیں اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں پر ضرور نگاہ رکھنی چاہئے کہ اپنے مظلوم طالبان بھائیوں کی اس مشکل وقت میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کا ہاتھ کس طرح بٹا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

"نیا جال لائے پرانے شکاری"

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- جنوری ۲۰۰۱ء

مسٹر اسٹیفن پی کوہن نے جارج ڈبلیو بش کے دور صدارت میں متوقع امریکی پالیسیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسٹر بش کی حکومت پاکستان کی حکومت پر سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے دباؤ نہیں ڈالے گی کیونکہ ری پبلکن پارٹی خود سی ٹی بی ٹی کی مخالفت کرتی رہی ہے، اس لیے اس حوالے سے پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ خاصا کم ہو جائے گا۔ انہوں نے دینی مدارس کے مسئلہ کو بھی اظہار خیال کا موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ بعض امریکی پالیسی ساز ادارے ان دنوں جائزہ لے رہے ہیں کہ پاکستان کیلئے تعلیمی شعبے میں امداد میں اضافہ کیا جائے۔ یہ امداد ایسے دینی مدارس کو جدید بنیادوں پر استوار

کرنے کیلئے استعمال کی جا سکتی ہے جہاں اندیشہ ہے کہ بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کی سوچ پروان چڑھائی جاتی ہے اور بعض میں مسلح تربیت بھی دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسے ادارے اگر جدید تعلیم سے بہرہ ور ہوں تو اس کا فائدہ پاکستان کو بھی ملے گا۔

جہاں تک پاکستان پر دباؤ کم ہونے کی بات ہے اگر ایسا ہوا تو ہمیں خوشی ہوگی۔ اور یہ بات اس سے پہلے بھی ایک عوامی تاثر کے طور پر موجود ہے کہ پاکستان کے حوالے سے ری پبلکن پارٹی کے رویہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کی بہ نسبت کچھ نہ کچھ فرق ضرور موجود ہوتا ہے اور بعض دوست اس سلسلہ میں ماضی کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس قسم کے کسی فرق کے مؤثر ہونے کے امکانات بہت کم دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ اگر ایک طرف سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے سلسلہ میں دباؤ میں کچھ کمی ہوگی تو دوسری طرف افغانستان کے حوالے سے پاکستان کو اس سے کہیں زیادہ دباؤ کا شکار رکھنے کا انتظام کر لیا گیا ہے، جس کا عملی اظہار سلامتی کونسل کی اس حالیہ قرارداد کی صورت میں ہو چکا ہے جس میں طالبان حکومت کو دہشت گردی اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں تعاون نہ کرنے کے الزامات کا نشانہ بنا کر تمام ممالک سے ان کے اقتصادی، سفارتی اور مواصلاتی بائیکاٹ کیلئے کہا گیا ہے۔ اور پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے طالبان حکومت پر سلامتی کونسل کی طرف سے لگائی جانے والی ان نئی پابندیوں کے پاکستان پر اثرانداز ہونے کے امکانات کا ذکر کرتے ہوئے قرارداد پر نظر ثانی کیلئے سلامتی کونسل سے دوبارہ رجوع کے عندیہ کا اظہار کیا ہے۔

طالبان حکومت کی طرف سے ان پابندیوں کو مسترد کرنے اور اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکہ کے حوالے نہ کرنے کے دوٹوک اعلان کے بعد ان پابندیوں کے عملاً لاگو ہونے اور پاکستان پر ان کے شدت کے ساتھ اثرانداز ہونے کے بارے میں اب کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس لیے امریکی ماہر کی طرف سے پاکستان پر دباؤ کم ہونے کے امکان کا اظہار ہمارے لیے کسی خوش فہمی کا باعث نہیں بن سکتا اور بات صرف پینترا بدلنے اور ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لینے کی باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے لیے طالبان حکومت پر لگائی جانے والی یہ پابندی قطعی طور پر غیر متوقع نہیں ہے بلکہ ہمیں اس میں اتنی دیر ہونے پر تعجب ہو رہا تھا اس لیے کہ طالبان حکومت نے قرآن و سنت کے قوانین کے عملی نفاذ اور ٹیکس فری معیشت کے قیام کی صورت میں ایک نئے نظام کا جو تجربہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ امریکہ اور روس سمیت کسی بڑے ملک اور موجودہ عالمی نظام کیلئے قابل قبول نہیں ہے۔ اور طالبان کو دراصل اسی کی سزا دینا مقصود ہے لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اگر طالبان حکومت اپنے عزم پر قائم رہتی ہے تو اس کے خلاف عالمِ کفر کا یہ اتحاد بھی اسی طرح ناکام ہوگا جس طرح غزوۂ احزاب کے موقع پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صرف ڈیڑھ ہزار ساتھیوں کے خلاف پورے عرب قبائل کے متحدہ محاذ کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔ بات صرف استقامت، صبر اور حوصلہ کی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ طالبان حکومت کے اہل کار اور غیور افغان عوام روسی استعمار کی یلغار کی طرح امریکی استعمار کے اس نئے حملہ اور یلغار سے بھی سرخرو نکلیں گے کیونکہ وہ صبر، حوصلہ، استقامت اور قناعت و جفاکشی کی اسلامی تعلیمات سے صرف آگاہ ہی نہیں بلکہ اپنے مزاج، عادات اور کلچر کے لحاظ سے ان کے خوگر بھی ہیں۔

باقی رہی بات دینی مدارس کیلئے امریکہ کی نئی امداد کی تو یہ بھی "نیا جال لائے پرانے شکاری" کے مصداق پالیسی میں

کسی تبدیلی کی بجائے پینترا بدلنے ہی کا ایک انداز ہے۔ کیونکہ دینی مدارس پر پابندی لگوانے یا کم از کم انہیں ریاستی اداروں کے کنٹرول میں دینے کے تمام حربے ناکام ہو چکے ہیں اور اب تخویف کی بجائے تحریص اور لالچ ہی کا ایک راستہ باقی رہ گیا ہے جسے آزمانے کیلئے امریکی پالیسی ساز ادارے ضرور سوچ بچار کر رہے ہوں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ امریکی پالیسی ساز ابھی عقل سے اتنے عاری نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کو اس امید پر فنڈز فراہم کر دیں کہ جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر ان کی "بنیاد پرستی" میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ بنیاد پرستی تو اس نظام تعلیم کے تربیت یافتہ افراد کے ذہنوں سے بھی نہیں نکالی جا سکی جو دینی مدارس کے مقابلہ پر قائم کیا گیا تھا اور مسٹر اور ملا کی تفریق قائم کر کے ملا کو غیر مؤثر بنانے کیلئے تمام ریاستی وسائل وقف کر دیے گئے تھے۔ لیکن آج ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد انہی پالیسی سازوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ مسٹر اور ملا میں سے زیادہ بنیاد پرست کون ہے؟

امریکی امداد کا زہر قبول کرنے کی حمایت تو ہم کسی حالت میں نہیں کر سکتے لیکن دینی مدارس میں ضروری جدید تعلیم کو شامل کرنے اور علماء و طلباء کو جدید علوم اور تکنیک سے آراستہ کرنے کے ہم خود بھی داعی ہیں۔ البتہ ایک فرق ہے کہ امریکی پالیسی سازوں کو جدید تعلیم کے ذریعے علماء کی بنیاد پرستی میں کمی کا کوئی امکان نظر آرہا ہوگا جبکہ ہمیں جدید علوم، عالمی زبانوں اور ابلاغ عامہ کے ترقی یافتہ وسائل سے بہرہ ور ہونے کی صورت میں دینی مدارس کی بنیاد پرستی دو آتشہ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ایک امریکی دانشور کی اس پیشکش پر ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

غامدی صاحب کا فلسفۂ جہاد

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۴ جنوری ۲۰۰۱ء

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو مختلف جہادی گروپوں کی طرف سے جہاد کے نام پر مسلح سرگرمیوں پر اشکال ہے اور وہ ان کے اس عمل کو جہاد تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جہاد کا اعلان صرف ایک مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے اس کے سوا کسی اور کو جہاد کا اعلان کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مگر ہمیں ان کے اس ارشاد سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ جہاد کی مختلف عملی صورتیں اور درجات ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کا اعلان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ایک اسلامی یا کم از کم مسلمان حکومت اس کا اعلان کرے۔ لیکن جب کسی مسلم آبادی پر کفار کی یلغار ہو جائے اور کفار کے غلبہ کی وجہ سے مسلمان حکومت کا وجود ختم ہو جائے یا وہ بالکل بے بس دکھائی دینے لگے تو غاصب اور حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کے اعلان کیلئے پہلے حکومت کا قیام ضروری نہیں ہوگا اور نہ ہی عملاً ایسا ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسے مرحلہ میں مسلمانوں کی اپنی حکومت کا قیام قابل عمل ہو

تو کافروں کی یلغار اور تسلط ہی بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ صورت پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب مسلمانوں کی حکومت کفار کے غلبہ اور تسلط کی وجہ سے ختم ہو جائے، بے بس ہو جائے، یا اسی کافر قوت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ اگر جاوید غامدی صاحب محترم کا فلسفہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ ضروری ہو گا کہ مسلمان پہلے اپنی حکومت قائم کریں اور اس کے بعد اس حکومت کے اعلان پر جہاد شروع کیا جائے۔ لیکن پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہو گا کہ جب مسلمانوں نے اپنی حکومت بحال کر لی ہے تو اب جہاد کے اعلان کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی ہے؟ کیونکہ جہاد کا مقصد تو کافروں کا تسلط ختم کر کے مسلمانوں کا اقتدار بحال کرنا ہے اور جب وہ کام جہاد کے بغیر ہی ہو گیا ہے تو جہاد کے اعلان کا کون سا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

اس کی ایک عملی مثال سامنے رکھ لیجیے کہ فلسطینی عوام نے تنظیم آزادی فلسطین کے عنوان سے غیر سرکاری سطح پر اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ سالہا سال کی مسلح جدوجہد کے نتیجہ میں مذاکرات کی نوبت آئی اور ان مذاکرات کے بعد ایک ڈھیلی ڈھالی یا لولی لنگڑی حکومت جناب یاسر عرفات کی سربراہی میں قائم ہوئی جو اس وقت بین الاقوامی فورم پر فلسطینیوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اگر مسلح جدوجہد نہ ہوتی تو مذاکرات اور حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مسلح جدوجہد کسی حکومت کے اعلان پر نہیں بلکہ غیر سرکاری فورم کی طرف سے شروع ہوئی اور اسی عنوان سے مذاکرات کی میز بچھنے تک جاری رہی۔ یہاں عملی طور پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت مسلح جدوجہد کے نتیجہ میں قائم ہوئی ہے نہ کہ حکومت نے قائم ہونے کے بعد مسلح جدوجہد یا جہاد کا اعلان کیا۔ لیکن اگر غامدی صاحب کے فلسفہ کو قبول کر لیا جائے تو یہ ساری جدوجہد غلط قرار پاتی ہے۔ اور ان کے خیال میں فلسطینیوں کو یہ چاہیے تھا یا شرعاً ان کیلئے جائز راستہ یہ تھا کہ وہ پہلے ایک حکومت قائم کرتے اور پھر وہ حکومت جہاد کا اعلان کرتی، تب ان کی مسلح جدوجہد غامدی صاحب کے نزدیک شرعی جہاد قرار پا سکتی تھی۔

خود ہمارے ہاں برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کر لی اور عملاً انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو اس وقت کے علماء کے سرخیل حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور پھر بالاکوٹ کے معرکے تک اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں مسلح جہاد آزادی کے مختلف مراحل تاریخ کا حصہ بنے۔ جہاد کا یہ اعلان بھی غیر سرکاری فورم کی طرف سے تھا اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ یا انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے والے دیگر علماء کو کوئی سرکاری اتھارٹی حاصل نہیں تھی۔ اس لیے غامدی صاحب کے فلسفہ کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی قرار پاتا ہے۔ محترم غامدی صاحب یا ان کا کوئی شاگرد رشید اس دور میں موجود ہوتا تو وہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو یہی مشورہ دیتا کہ حضور! آپ کو جہاد کے اعلان کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ہی حکومتی معاملات میں فریق بننے کا آپ کیلئے کوئی جواز ہے۔ آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ حکومت کی راہ نمائی کریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آلۂ کار کی حیثیت اختیار کر جانے والے مغل بادشاہ کو مشورہ دیتے رہیں اور اس سے کہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، کیونکہ اس کے سوا جہاد کا اعلان کرنے کا شرعی اختیار اور کسی کے پاس نہیں ہے۔

جہادِ افغانستان کی صورتحال بھی کم وبیش اسی طرح کی ہے کہ جب کابل میں روسی فوجیں اتریں، مسلح غاصبانہ قبضہ کے بعد افغانستان کے معاملات پر روس کا کنٹرول قائم ہوگیا اور ببرک کارمل کی صورت میں ایک کٹھ پتلی حکمران کو کابل میں بٹھا دیا گیا تو افغانستان کے مختلف حصوں میں علماء کرام نے اس تسلط کو مسترد کرتے ہوئے حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ان کے باہمی روابط قائم ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ چند گروپوں کی صورت میں یکجا ہوگئے۔ پھر انہیں روسی فوجوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں ثابت قدم دیکھ کر باہر کی قوتیں متوجہ ہوئیں اور روس کی شکست کی خواہاں قوتوں نے ان مجاہدین کو سپورٹ کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں روس کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔
غامدی صاحب کے اس ارشاد کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی اور ناجائز ٹھہرتا ہے اور ان کے خیال میں افغان علماء کو از خود جہاد کا اعلان کرنے کی بجائے ببرک کارمل کی رہنمائی کرنے تک محدود رہنا چاہیے تھا، اور اس سے درخواست کرنی چاہیے تھی کہ چونکہ شرعاً جہاد کے اعلان کا اختیار صرف اس کے پاس ہے اس لیے وہ روسی حملہ آوروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، تاکہ اس کی قیادت میں علماء کرام جہاد میں حصہ لے سکیں۔
فرانسیسی استعمار کے تسلط کے خلاف الجزائر کے علماء کو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہاں کے قوم پرست لیڈروں بن باللہ، بومدین اور بونسیاف کے ساتھ ساتھ الشیخ عبدالحمید بن بادیسؒ اور الشیخ بشیر الابراہیمیؒ جیسے اکابر علماء نے بھی مسلح جدوجہد کی قیادت کی۔ انہوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کو جہاد قرار دیا، اس کیلئے علماء کی باقاعدہ جماعت بنائی، اور جمعیت علماء الجزائر کے پلیٹ فارم سے سالہا سال تک غاصب حکومت کے خلاف مسلح جنگ لڑ کر الجزائر کی آزادی کیلئے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ بلکہ الشیخ عبدالحمید بن بادیسؒ کو یہ مشورہ ہی ان کے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے دیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مولانا مدنیؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور مسجد نبوی میں حدیث نبویؐ پڑھایا کرتے تھے۔ الشیخ عبدالحمید بن بادیسؒ نے ان سے حدیث پڑھی اور وہیں مدینہ منورہ میں کسی جگہ بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی تو شیخ مدنیؒ نے ان سے کہا کہ ان کا ملک غلام ہے اس لیے وہ واپس جائیں اور علماء کرام کو منظم کر کے اپنے وطن کی آزادی کیلئے جہاد کریں۔ اگر اس وقت شیخ بن بادیسؒ کے ذہن میں کوئی "دانشور" یہ بات ڈال دیتا کہ آپ لوگوں کو از خود مسلح جدوجہد شروع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے اور جہاد کیلئے کسی مسلم حکومت کی طرف سے اعلان ضروری ہے تو وہ بھی مدینہ منورہ میں کوئی علمی مرکز قائم کر کے بیٹھ جاتے اور الجزائر کی جنگ آزادی کا جو حشر ہوتا وہ ان کی بلا سے ہوتا رہتا۔
غامدی صاحب محترم کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے آخر میں عالم اسلام کے خلاف تاتاریوں کی خوفناک یلغار کے موقع پر جب دمشق کے حکمران سراسیمگی اور تذبذب کے عالم میں تھے اور عوام تاتاریوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو اس موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے از خود جہاد کی فرضیت کا اعلان کر کے عوام کو اس کیلئے منظم کرنا شروع کر دیا تھا جس کے نتیجے میں حکمرانوں کو حوصلہ ہوا اور عوام نے شہر چھوڑنا ترک کیا۔ ورنہ اگر ابن تیمیہؒ بھی غامدی صاحب کے فلسفہ پر عمل کرتے تو بغداد کی طرح دمشق کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۱ء

اس اصولی بحث کے بعد میں جہاد کے مسئلہ کی طرف آتا ہوں جس میں ہمارے درمیان اختلاف کا نکتہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے ملک یا آبادی پر کفار کا تسلط قائم ہو جائے تو کیا مسلمان آبادی یا ان کے علماء کسی باضابطہ حکومت کے قیام کے بغیر اس تسلط کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ ایسی صورت میں علماء کرام کو جہاد کے اعلان کا حق حاصل ہے اور ان کے اعلان کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ شرعاً جہاد کہلائے گی۔ جیسے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف، الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے تسلط کے خلاف، اور افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ علماء کے فتویٰ پر جہاد کے عنوان سے لڑی گئی ہے۔ مگر معزز امجد ان میں سے کسی جنگ کو جہاد قرار دینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نے ان کے بقول مسلمانوں کی آبادی پر کافروں کے تسلط کی صورت میں دو ہی راستے بتائے ہیں۔ پہلا راستہ یہ کہ اگر ہجرت کا راستہ اور مقام موجود ہو تو وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اور دوسرا یہ کہ اگر ہجرت قابل عمل نہ ہو تو صبر و شکر کر کے بیٹھے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء، سورۃ الانفال اور سورۃ الاعراف کی بعض آیات کریمہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ وہ مسئلہ کی نوعیت ہی کو سرے سے نہیں سمجھ سکے۔ کیونکہ ان آیات کریمہ میں ان مسلمانوں کیلئے احکام بیان کیے گئے ہیں جو کافروں کی سوسائٹی میں مسلمان ہو گئے ہیں اور ان کے زیر اثر رہے ہیں۔ ان کیلئے حکم یہ ہے کہ اگر وہ وہاں سے ہجرت کر سکتے ہیں تو نکل جائیں ورنہ صبر و حوصلہ کے کے ساتھ حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ جبکہ ہم جس صورت پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی پر باہر سے آکر کافروں نے تسلط جما لیا ہے اور مسلمان اکثریت پر کافر اقلیت کا جبر و اقتدار قائم ہو گیا ہے اس صورت میں محترم غامدی اور ان کے تلامذہ ہی مسلم اکثریت کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنا علاقہ کافر غالبین کے حوالہ کر کے وہاں سے چلے جائیں یا ان کے جبر و ظلم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے جائیں۔ ورنہ ہمیں تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس سے برعکس رہنمائی ملتی ہے۔

یمن کا علاقہ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں مسلم مملکت میں شامل ہو گیا تھا اور شہر بن باذانؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ یمن کے مختلف علاقوں میں حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، اور دوسرے عمال کا تقرر کیا تھا۔ مگر اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر کے صنعا پر چڑھائی کی اور شہر بن باذانؓ کو قتل کر کے یمن کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ مقتول گورنر کی بیوی کو زبردست اپنے حرم میں داخل کیا، یمن کے مختلف علاقوں سے جناب نبی اکرمؐ کے مقرر کردہ عاملوں کو نکال دیا، اور اس طرح یمن کا صوبہ اسلامی حکومت سے نکل کر کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس پر تین حضرات حضرت فیروز ویلمیؓ، حضرت قیس بن مکشوحؓ، اور حضرت دادویہؓ نے باہمی مشورہ کر کے گوریلا طرز جنگ پر شبخون مارنے کا پروگرام بنایا۔ مقتول مسلمان گورنر شہر بن باذانؓ کی بیوی سے جو اسود عنسی نے زبردستی اپنے حرم میں داخل کر رکھی تھی، ان تینوں حضرات نے رابطہ کر کے ساز باز کی جس کے تحت اس نے رات کو اسود عنسی کو بہت زیادہ شراب پلا دی، ان حضرات نے محل کی دیوار میں نقب لگا کر اندر داخل ہونے کا راستہ نکالا اور رات کی

تاریکی میں اسود عنسی اور اس کے پہرہ داروں کو قتل کر کے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ یہ گوریلا کاروائی تھی اور مسلح کاروائی تھی۔ اس میں معزامجد صاحب کو یقیناً کچھ اخلاقی خرابیاں نظر آ رہی ہوں گی اور بلاضرورت قتل و غارت بھی دکھائی دیتی ہوگی۔ لیکن عملاً یہ سب کچھ ہوا جس کے نتیجہ میں یمن پر مسلمانوں کا اقتدار دوبارہ بحال ہوا۔ اور جناب نبی اکرمؐ کو جب ان کے وصال سے صرف دو روز قبل وحی کے ذریعے اس کارروائی کی خبر ملی تو آپؐ نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کو یہ خوشخبری سنائی فاز فیروز کہ فیروز اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت فیروز ویلمیؓ جب اس کامیابی کی خبر لے کر یمن سے مدینہ منورہ پہنچے تو جناب نبی اکرمؐ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کو پیش کی اور انہوں نے اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس لیے محترم معزامجد صاحب سے عرض ہے کہ جن آیات کریمہ سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان کا مصداق یہ نہیں ہے بلکہ اس کی عملی شکل وہی یمن والی ہے کہ جب کسی مسلمان ملک پر کافروں کا تسلط قائم ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلئے جو صورت بھی اس وقت کے حالات کی روشنی میں اختیار کر سکیں اس سے گریز نہ کریں۔ اور وہ کافر و ظالم قوت کے جابرانہ تسلط کے خلاف مزاحمت کی جو صورت بھی اختیار کریں گے وہ حضرت فیروز ویلمیؓ کی اس گوریلا کاروائی اور شبخون کی طرح جہاد ہی کہلائے گی۔

افغان طالبان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۴ جنوری ۲۰۰۱ء

مولانا سمیع الحق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے پابندیوں کے اعلان کے بعد انہوں نے دینی حلقوں کی قیادت کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کا بروقت اہتمام کیا۔ گذشتہ سال جب افغانستان پر امریکی حملہ کے خطرات نظر آنے لگے تو مولانا فضل الرحمان نے عوامی بیداری کی مہم شروع کر کے امریکہ پر واضح کر دیا تھا کہ افغانستان پر حملہ اس قدر آسان نہیں ہے اور ایسا کرنا پاکستان کے عوام کے غیظ و غضب کو بھڑکانے کے مترادف ہوگا۔ اور اب جبکہ سلامتی کونسل کی آڑ میں امریکہ نے طالبان حکومت کو بے دست و پا کرنے اور اس کیلئے افغان عوام کو بھوکا مارنے کا پروگرام بنایا ہے تو مولانا سمیع الحق نے آگے بڑھ کر ملک کی دینی قیادت کو طالبان حکومت کی پشت پر کھڑا کر دیا ہے اور امریکہ کو عملاً یہ پیغام دے دیا ہے کہ افغانستان کو عراق، لیبیا اور سوڈان نہ سمجھا جائے کیونکہ افغانستان کی سرحدیں پاکستان کے ساتھ ملتی ہیں، وہی پاکستان جس نے جہاد افغانستان میں اپنے افغان بھائیوں کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں راستوں سے تعاون و حمایت کے تمام ممکنہ دروازے کھول دیے تھے۔ اس لیے اب اگر امریکہ بہادر پاکستان کے سرکاری راستوں پر سلامتی کونسل کی پابندیوں کے پتھر کھڑے کرنے میں بالفرض کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو افغان عوام کے ساتھ تعاون و حمایت کے غیر سرکاری راستے اس کی دسترس سے باہر ہیں اور پاکستان کی دینی

قیادت اپنے افغان بھائیوں کو سلامتی کونسل کی پابندیوں کے منفی اثرات سے بچانے کیلئے سنجیدگی کے ساتھ متحرک ہوگئی ہے۔

طالبان کی حمایت میں اکوڑہ خٹک میں ہونے والی ”متحدہ اسلامی کانفرنس“ میں مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا معین الدین لکھوی، جنرل حمید گل، جناب اجمل خٹک، حافظ سعید احمد، مولانا مسعود اظہر، مولانا فضل الرحمان خلیل، مولانا محمد اکرم اعوان، مولانا اعظم طارق، مولانا امان اللہ خان اور دیگر قائدین کا یک زبان ہوکر سلامتی کونسل کی پابندیوں کو مسترد کرنا اور حکومت پاکستان سے ان پابندیوں کو مسترد کرنے کا مطالبہ کرنا ایک اہم پیش رفت ہے جس سے دنیا کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ نے طالبان کے خلاف امریکی الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ ان الزامات کو محض ایک بہانہ تصور کرتے ہوئے سلامتی کونسل کی قرارداد کو اس امریکی مہم کا حصہ سمجھتے ہیں جو طالبان حکومت کو صرف اور صرف اسلامی نظام کے نفاذ پر سزا دینے کیلئے شروع کی گئی ہے۔ اور چونکہ پاکستان کے عوام اور دینی حلقوں کی اپنی منزل بھی اسلامی نظام کا نفاذ اور معاشرہ میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری ہے اس لیے ان کے نزدیک طالبان کو اس کی سزا دینے کا مطلب پاکستان میں اسلامی نظام کا راستہ روکنے اور اس حوالے سے پاکستانی عوام کو ڈرانے دھمکانے کے مترادف بھی ہے۔ لہٰذا اکوڑہ خٹک کی ”متحدہ اسلامی کانفرنس“ کے اعلانات اور مشترکہ اعلامیہ صرف طالبان کی حمایت نہیں بلکہ خود پاکستان میں نفاذ شریعت اسلامیہ کی جدوجہد کی طرف سے امریکہ کی اس بالواسطہ دھمکی کو مسترد کرنا بھی ہے اور اس بروقت پیشرفت اور پیش بندی پر مذکورہ کانفرنس کے تمام شرکاء تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

اکوڑہ کانفرنس میں راقم الحروف بھی شریک تھا بلکہ اس کانفرنس میں شرکت کیلئے مجھے دوبئی کا سفر دو دن آگے کرنا پڑا۔ میں نے اپنے ٹریول ایجنٹ کو ۹ جنوری منگل کو دوبئی جانے کا شیڈول دے رکھا تھا مگر کانفرنس کی اہمیت کی وجہ سے پروگرام مؤخر کر کے ہفتہ کی صبح دوبئی پہنچا اور یہ سطور وہیں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ شدید سردی کے موسم میں تمام جماعتوں کی اعلیٰ قیادت کا اکوڑہ خٹک جیسے دیہاتی ماحول میں پہنچنا اور کانفرنس کی کاروائی میں پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شریک ہونا جہاں میرے جیسے کارکنوں کیلئے اس اطمینان کا باعث تھا کہ ملک کی دینی قیادت کو مسئلہ کی اہمیت اور سنگینی کا پوری طرح احساس ہے وہاں امریکہ بہادر کیلئے بھی اس میں واضح پیغام ہے کہ جنوبی ایشیا کے حوالے سے اس کے ایجنڈے کی پیشرفت میں دینی حلقوں کی روایتی اور بے لچک رکاوٹ موجود ہے جس کی پشت پر رائے عامہ اور اسٹریٹ پاور کی ایک مضبوط قوت ہے۔ اس لیے امریکہ اگر اس خطہ میں اپنے مستقبل کے دائمی مفادات کے تحفظ میں سنجیدہ دلچسپی رکھتا ہے تو اسے ”اسلام دشمنی“ کی عینک اتار کر اس خطہ کے عوامی منظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا ورنہ برطانوی استعمار اور اس کے بعد روسی استعمار کی طرح اسے بھی اس خطہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

مولانا شاہ احمد نورانی تو کانفرنس کے آغاز کیلئے دیے گئے وقت کے مطابق پورے دس بجے تشریف لے آئے جبکہ ابھی منتظمین بھی کانفرنس شروع کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے جس کی پاسداری سب حضرات کرنے لگیں تو بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مولانا نورانی نے ایک اور اچھی روایت یہ نبھائی کہ

کانفرنس کے داعی مولانا سمیع الحق نے وقت کی کمی کا ذکر کر کے قائدین سے پانچ پانچ منٹ میں اظہار خیال کی درخواست کرتے ہوئے مولانا نورانی کو افتتاحی خطاب کی دعوت دی تو انہوں نے پورے پانچ منٹ میں اپنی گفتگو مکمل کر لی، اس خوبصورت کے ساتھ کہ موضوع کے حوالے سے کوئی بات تشنہ نہیں تھی۔ اور اس میں بعد میں آنے والے مقررین کیلئے واضح طور پر ”گائیڈ لائن“ موجود تھی کہ انہوں نے کیا کہنا ہے اور اس کانفرنس نے کیا کرنا ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی جب اکوڑہ پہنچے تو ہم لوگ مولانا سمیع الحق کی رہائش گاہ پر مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے، اس موقع پر ایک ہلکا پھلکا سا لطیفہ بھی ہو گیا۔ میں مولانا نورانی سے ملا تو گلے لگاتے ہوئے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگے کہ آپ ان دنوں یہیں ہیں (یعنی ملک میں ہی ہیں) میں نے عرض کیا کہ جی ہاں! تو فرمایا کہ میں بھی ان دنوں یہیں ہوں۔ اس پر ارد گرد موجود حضرات نے قہقہہ کے ساتھ رسید دی کہ وہ ہمارے اس سوال و جواب سے محظوظ ہوئے ہیں۔ مولانا کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ زیادہ وقت ملک سے باہر گزارتے ہیں اور کچھ عرصہ سے میرے بارے میں بھی یہ تاثر پھیل رہا ہے حالانکہ میں سال میں صرف دو تین ماہ کیلئے ملک سے باہر جاتا ہوں مگر عمومی تاثر کچھ ایسا بن گیا ہے کہ جب بھی کسی دوست سے کچھ وقفہ کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ باہر سے کب واپس آئے ہیں؟

بہر حال اکوڑہ کانفرنس ایک اچھی اور بروقت پیشرفت ہے جس نے دینی حلقوں کی جدوجہد کو نیا اور عملی رخ دے دیا ہے اور ”دفاعِ افغانستان و پاکستان کونسل“ کے نام سے نئے مشترکہ فورم کے قیام کے ساتھ ملک کی دینی قیادت جس عملی مہم کا آغاز کر رہی ہے اس کے اثرات پورے جنوبی ایشیا کے حوالے سے انتہائی دور رس ہوں گے بشرطیکہ اسے محض رسمی امور تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ مشترکہ اعلامیہ میں دیے گئے نکات کی روشنی میں عملی طور پر سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ”دفاعِ افغانستان کونسل“ کیلئے ایک مضبوط مرکزی ڈھانچہ جلد از جلد تشکیل دیا جائے جس کے تحت کم از کم صوبائی سطح پر باہمی رابطہ و تنظیم کے ڈھانچے فوری طور پر قائم کر دیے جائیں اور ان کے اجلاس منعقد کر کے حکمت عملی بروقت ترتیب دی جائے۔ مختلف شہروں میں مشترکہ جلسوں اور سیمینارز کا اہتمام کیا جائے جس کیلئے مرکزی قائدین وقت کی قربانی دیں اور جہاں بھی جلسہ ہو اس میں مرکزی قائدین میں سے کوئی بزرگ ضرور شریک ہوں جو صورتحال پر تفصیل سے روشنی ڈال سکیں۔

مشترکہ اعلامیہ کے اعلان کے مطابق:

- افغانستان اور پاکستان کے درمیان سینکڑوں میل لمبی سرحد کے ساتھ ساتھ قبائلی علاقوں کے عوام کو بیدار کرنے کیلئے بطور خاص مہم چلائی جائے تاکہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے سرحدات کی نگرانی کے نام پر افغانستان کی ناکہ بندی کے پروگرام کو ناکام بنایا جا سکے۔
- مرکزی قائدین کا ایک بھرپور وفد اسلام آباد میں کچھ دن گزارے اور حکومت پاکستان کے ذمہ دار حضرات کے علاوہ مسلم ممالک کے سفارت خانوں، اقوامِ متحدہ کے مراکز اور خاص طور پر چین کے سفارت خانے کا دورہ کر کے انہیں پاکستان کے عوام اور دینی حلقوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

- تاجروں، صنعتکاروں اور اصحاب خیر کو امارت اسلامی افغانستان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ امداد و تعاون کیلئے توجہ دلائی جائے اور کوشش کی جائے کہ تعاون و امداد کی عملی صورت براہ راست اسلام آباد میں افغان سفارت خانہ کے ذریعے ہو۔
- قومی پریس، سیاسی جماعتوں کے قائدین، تعلیمی اداروں کے اساتذہ وطلبہ اور بار کونسلوں کو صورتحال سے باخبر رکھنے اور انہیں اس جدوجہد کیلئے اعتماد میں لینے کا بطور خاص اہتمام کیا جائے۔
- بیرونی دنیا بالخصوص مغربی ممالک میں جن دینی جماعتوں کے حلقے موجود ہیں وہ ان کی اس مسئلہ کے حوالے سے بریفنگ کا اہتمام کریں اور انہیں توجہ دلائیں کہ وہ ان ممالک کی رائے عامہ، پریس اور انسانی حقوق کے اداروں کو افغان عوام کی حالت زار اور امریکہ کے ناجائز طرز عمل سے باخبر کرنے کیلئے منظم کام کریں۔

جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ جنوری ۲۰۰۱ء

اکوڑہ خٹک کی متحدہ اسلامی کانفرنس میں پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا صلاح الدین فاروقی میرے ساتھ تھے، واپسی پر رات ٹیکسلا میں انہی کے ہاں قیام کیا۔ حسب سابق انہوں نے عشاء کے بعد ایک مسجد میں قرآن کریم کے درس اور اس کے بعد نوجوانوں کے ساتھ سوال و جواب کی نشست کا اہتمام کر لیا۔ ایک عرصہ تک میرا یہ معمول رہا کہ شمال کی طرف سے کسی بھی سفر میں ایک رات ٹیکسلا میں گزارتا تھا اور یہاں ایک نشست ایسی ہو جاتی تھی جس میں مختلف نوعیت کے سوال و جواب ہوتے اور شرکاء محفل کے ساتھ مجھے بھی یہ فائدہ ہوتا کہ متعدّد مسائل پر ذہن ایک بار پھر حاضر ہو جاتا اور نت نئے نکات ذہن میں ابھرتے۔ کچھ عرصہ کے وقفہ کے بعد گذشتہ ایک دو سالوں سے یہ روایت پھر سے زندہ ہوگئی ہے، اسی حوالے سے اس رات بھی اچھی خاصی نشست ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نشست کے اہم سوالات و جوابات کی ایک جھلک قارئین کے سامنے بھی آجائے۔

سوال: کیا افغانستان کی جنگ دراصل امریکہ اور روس کی جنگ تھی جو امریکہ کے کہنے پر شروع ہوئی اور دینی حلقے امریکہ کیلئے استعمال ہوگئے؟ کیا اب بھی ایسا نہیں لگتا کہ امریکہ ہی کوئی چال ہے جس کی وجہ سے دینی حلقے پھر سے متحرک ہو رہے ہیں؟

میں نے اس سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ اس سلسلہ میں دو باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ امریکہ کے کہنے پر لڑی گئی ہے۔ اس لیے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج کی آمد پر مولوی محمد نبی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی محمد یونس خالص، مولوی ارسلان رحمانی اور دیگر جن علماء کرام نے اپنے اپنے علاقوں میں جہاد کا فتویٰ دے کر اس کا عملی آغاز کیا تھا ان کا امریکہ کے

ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر شرعی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے جہاد کا فتویٰ دیا اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اس کا آغاز کر دیا۔ اس وقت ان کے پاس پرانا روایتی اسلحہ بھی مناسب مقدار میں نہیں تھا، وہ بوتلوں میں پٹرول اور صابن کے محلول بھر کر ان بوتل بموں سے ٹینکوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ اور شروع کے کم و بیش تین سال تک یہ کیفیت رہی ہے کہ وہ بہت معمولی اسلحہ کے ساتھ اور انتہائی فقر و فاقہ کے ماحول میں محض ایمانی قوت کے ساتھ روسی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ البتہ اس دوران جب انہوں نے افغانستان کے اچھے خاصے علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا تو امریکہ اور دیگر ممالک ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر جس جس نے بھی روس کے ساتھ کوئی حساب چکانا تھا وہ اس جنگ میں کود پڑا۔ اس کے بعد امریکہ اور اس کے ساتھیوں نے اسلحہ بھی دیا، دولت بھی دی اور ہر طرح کی امداد کی۔ چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ اس جنگ میں امریکہ کا بھی مفاد تھا اور اس نے اپنے مفاد کی خاطر افغان مجاہدین کی بھرپور مدد کی ہے، لیکن یہ کہنا قطعی طور پر غلط اور حقائق کے منافی ہے کہ افغان جہاد امریکہ کے کہنے پر شروع کیا گیا تھا اور افغان علماء نے اس معرکہ میں امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔

دوسری بات، یہ کہنا درست ہے کہ روسی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کے نام پر لڑی جانے والی یہ جنگ ابتدائی تین چار سال کے بعد افغان مجاہدین اور امریکہ کی مشترکہ جنگ بن گئی تھی جس میں دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ افغان مجاہدین کو یہ فائدہ پہنچا کہ امریکہ کے تعاون کی وجہ سے ان کی جنگ آسان ہو گئی۔ جبکہ امریکہ کو یہ فائدہ پہنچا کہ اپنی باقاعدہ فورسز استعمال کیے بغیر اس نے سوویت یونین کو شکست دے کر نہ صرف اس کے خلاف سرد جنگ جیت لی بلکہ ویت نام کی ہزیمت کا بدلہ بھی لے لیا۔

لیکن اس سوال کا جواب دینا ابھی باقی ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے دوسرے کو استعمال کیا؟ اس سوال کے جواب کیلئے ہمیں جنگ کے بعد کے حقائق پر ایک نظر ڈالنا ہوگی۔ اور میں اس سلسلہ میں بھی ایک سادہ سا معیار اور کسوٹی پیش کرتا ہوں کہ اگر تو جنگ کے خاتمہ اور روس کی شکست کے بعد افغان مجاہدین کی قیادت امریکہ کے ایجنڈے پر چل رہی ہے اور افغانستان میں امریکہ کی پالیسیوں پر عمل ہو رہا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ امریکہ نے افغانستان میں اپنے مفاد کیلئے مولوی کو استعمال کر لیا ہے اور افغان مولوی نے جہاد کے نام پر امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر افغان مولوی نے جنگ کے بعد والے افغانستان میں امریکہ کی پالیسی اور پروگرام کو مسترد کر کے اپنے ایجنڈے پر عمل شروع کر رکھا ہے اور وہ امریکہ کی طرف سے تمام تر مخالفت، دھمکیوں اور پابندیوں کے باوجود اپنے ایجنڈے پر قائم ہے تو ہمیں پورے شرح صدر کے ساتھ تاریخ کے اس فیصلے کو قبول کرنا ہوگا کہ افغان مولویوں نے اپنی جنگ کیلئے امریکہ کو استعمال کیا ہے۔ اور امریکہ بہادر اپنے تمام تر جاہ و جلال اور شکوہ و دبدبہ کے باوجود افغانستان کی سنگلاخ زمین پر سادہ، غریب اور بے سروسامان مولوی کے ہاتھوں بری طرح استعمال ہو گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہی پیچ و تاب امریکہ کو اس حوالے سے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا۔

سوال: اگر افغان جنگ کمیونزم کے خلاف تھی تو یہ جنگ روس کے کمیونزم کے خلاف کیوں لڑی گئی

ہے اور چین کا کمیونزم اس جنگ کے اثرات سے کیوں محفوظ ہے؟

میں نے عرض کیا کہ روس کے کمیونزم اور چین کے کمیونزم میں ایک بنیادی فرق تھا۔ وہ یہ کہ روس کے کمیونزم نے اپنے پاؤں پھیلا کر پوری دنیا پر اپنے فلسفہ کے تسلط کیلئے مہم شروع کر رکھی تھی۔ اور وسطی ایشیا اور افغانستان کو عبور کرنے کے بعد اس کا اگلا نشانہ پاکستان تھا جس کیلئے یہاں بھی خاصا ورک ہو چکا تھا۔ جبکہ چین کا کمیونزم جیسا کیسا بھی ہے اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر ہے اور ملک سے باہر توسیع پسندانہ عزائم اور پروگرام نہیں رکھتا۔ اس لیے ہمیں اس سے اپنے لیے کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا افغان مولوی یا جنوبی ایشیا کے دینی حلقوں نے روس کے خلاف جو جنگ لڑی ہے وہ دراصل کمیونزم کے خلاف نہیں بلکہ اس کے توسیع پسندانہ عزائم اور پروگرام کے خلاف تھی، اور اپنے عقائد و روایات اور ملی تشخص کے تحفظ کیلئے تھی۔

اب اس خطہ کے دینی حلقوں کو یہی خطرہ امریکہ کی طرف سے درپیش ہے کہ وہ نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر اور اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی آڑ میں مسلمانوں کو اسلام کے معاشرتی کردار اور اسلامی عقائد و احکام کے عملی نفاذ کے حق سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ اس لیے وہی دینی حلقے اب امریکہ کے خلاف صف بندی میں مصروف ہیں۔ چین کی طرف سے اس قسم کی کوئی مہم نہیں اس لیے اس کے خلاف ہماری کوئی جنگ بھی نہیں ہے اور ہم ایک عظیم اور دوست پڑوسی کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے ہیں۔

سوال: چین کے صوبے سنکیانگ کے مسلمانوں پر ہونے والے ریاستی جبر اور سینکڑوں مسلمان نوجوانوں کی شہادت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ موجود ہے اور ہمیں اس کی سنگینی کا احساس ہے۔ مگر ہم اس مسئلہ کے حوالے سے امریکی عزائم سے بھی باخبر ہیں اور کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتے کہ امریکہ اس مسئلہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کے خلاف کوئی محاذ گرم کر سکے۔ البتہ سنکیانگ کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے بارے میں چینی حکومت سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں سنجیدگی سے توجہ دے۔ اور پاکستان کی دینی قیادت جہاں چینی حکمرانوں سے طالبان اور امریکہ کے سوال پر بات کرنے کی خواہشمند ہے وہاں سنکیانگ کے مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں بھی بات ہوگی۔ تاکہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور امریکہ اسے چین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔

اس موقع پر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ جنوبی ایشیاء کے دینی حلقے اب امریکہ کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں اور امریکہ نے خود سلامتی کونسل کی قرارداد کی صورت میں اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس لیے اب آزمائش اور ابتلاء کا ایک اور دور شروع ہونے والا ہے جس میں اور کئی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس خطہ میں استعمار کے اصل دشمن کون ہیں اور استعمار دشمنی کے نام پر دولت اکٹھی کر کے چوری کھانے اور کھوکھلے نعرے لگانے والے کون ہیں۔

"دفاعِ افغانستان کونسل" کا قیام

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۱ء

۱۰ جنوری ۲۰۰۱ء کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں جمعیت علماء اسلام کے راہنما مولانا سمیع الحق کی دعوت پر "متحدہ اسلامی کانفرنس" کے عنوان سے ملک کی دینی جماعتوں کے قائدین کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی مذمت کرتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔ اور حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان پابندیوں کو قبول کرنے کی بجائے انہیں مسترد کرنے کا اعلان کرے، اور اسلامی سربراہ کانفرنس کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے طالبان حکومت کو باقاعدہ تسلیم کرنے اور مذکورہ پابندیوں کے خلاف ان کی حمایت و تعاون کا اہتمام کیا جائے۔

اس کانفرنس میں مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا امان اللہ خان، مولانا محمد اکرم اعوان، مولانا محمد اعظم طارق، اور ڈاکٹر اسرار احمد سمیت مختلف مکاتبِ فکر کی اہم جماعتوں کے قائدین نے شرکت کی۔ اور سب نے بیک زبان طالبان حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی پابندیوں کو امریکہ کے اسلام دشمن عزائم کی آئینہ دار، اور افغانستان میں نافذ ہونے والے اسلامی نظام کے خلاف معاندانہ کاروائی قرار دے کر طالبان حکومت کو ان ناروا اور ظالمانہ پابندیوں کے خلاف مکمل حمایت و تعاون کا یقین دلایا، اور اس کی عملی حمایت و معاونت کیلئے "دفاعِ افغانستان کونسل" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر مولانا فضل الرحمان کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام پاکستان نے بیت المقدس اور افغانستان کے بارے میں امریکہ کے معاندانہ کردار اور مسلم بیزار طرزِ عمل کی مذمت کرتے ہوئے ملک بھر میں امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی مہم شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے جسے ملک کی بہت سی دیگر جماعتوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں اقدامات بروقت اور ضروری ہیں جن سے افغانستان کی اسلامی حکومت اور بیت المقدس کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والے فلسطینی مجاہدین کے ساتھ پاکستانی عوام کی ہم آہنگی اور یکجہتی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور امریکہ اور اس کے کیمپ کی طرف سے اسلام اور دیندار مسلمانوں کے خلاف کیے جانے والے مسلسل اقدامات کے پس منظر میں یہ دینی حمیت اور قومی غیرت کا تقاضہ بھی ہے۔ مگر اس کیلئے ضروری ہے کہ اس مہم میں باہمی اشتراک و تعاون کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا جائے، اور مشترکہ جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیتے ہوئے ملک بھر میں رائے عامہ کو اس جدوجہد کیلئے منظم و بیدار کرنے کیلئے مربوط محنت کی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے دینی حلقے اگر اپنے مذکورہ اعلانات کے مطابق منظم اور مسلسل جدوجہد کا بھی اہتمام کر لیں تو طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی یہ پابندیاں بھی اسی طرح بے اثر ثابت ہوں گی جس طرح امارتِ اسلامی افغانستان کو اسلامی قوانین سے روکنے کیلئے اس سے قبل ڈالا جانے والا بین الاقوامی دباؤ ناکام ثابت ہوا ہے۔

افغان عوام کی امداد و حمایت کا وقت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۱ء

افغان دفاع کونسل نے امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کی حمایت میں سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ اور مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ زعماء پر مشتمل اس کونسل کے مرکزی قائدین مولانا سمیع الحق، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا معین الدین لکھوی، قاضی حسین احمد، ڈاکٹر اسرار احمد، جنرل (ر) حمید گل، مولانا اعظم طارق اور دیگر حضرات نے اسلام آباد میں مختلف سفارتی نمائندوں سے ملاقاتوں کے دوران افغان مسئلہ پر پاکستان کے دینی حلقوں کے موقف کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طالبان حکومت کے خلاف امریکہ کے ایما پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندیاں سراسر ظالمانہ اور معاندانہ ہیں، پاکستان کی رائے عامہ انہیں مسترد کرتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ افغانستان کی اسلامی حکومت کے حق میں پاکستان کے دینی حلقوں کا یہ اتحاد نیک فال ہے، جس سے طالبان حکومت کو بھی یقیناً تقویت حاصل ہوگی، اور خود پاکستان کے اندر اسلام دشمن عناصر اور بعض عالمی قوتوں کی ان سرگرمیوں کی راہ میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگی جو پاکستان کے اندر اسلامی تشخص سے محروم کرنے اور سیکولر ریاست بنانے کیلئے دن بدن آگے بڑھ رہی ہیں۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سرگرمیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور طالبان حکومت کی اخلاقی اور سیاسی حمایت کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی اور مالی معاونت کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔ کیونکہ خشک سالی، مسلسل جنگ، اور اقتصادی پابندیوں کے باعث اس وقت افغان عوام کی سب سے بڑی ضرورت معاشی بحالی اور وہاں کے غریب عوام کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ہے۔

اس لیے پاکستان کے دینی حلقوں اور اصحابِ خیر کو چاہیے کہ وہ افغان عوام اور طالبان حکومت کو مالی امداد اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دیں اور آزمائش کے اس مرحلہ میں اپنے افغان بھائیوں کو تنہا نہ چھوڑیں۔

وزیرِ داخلہ پاکستان اور جہادی تنظیمیں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۱ء

ملک بھر میں ان دنوں وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کے حالیہ بیانات پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے جن میں انہوں نے جہادی تنظیموں کی سرگرمیوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس عندیہ کا اظہار کیا ہے کہ جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی جا رہی ہے تاکہ وہ جہاد کے نام کھلے بندوں چندہ نہ کریں اور اسلحہ کی بر سرِ عام نمائش نہ کر سکیں۔ وزیر داخلہ کا کہنا ہے کہ جہادی تنظیمیں اسلحہ کی بر سرِ عام نمائش کر کے امن کی صورتحال کو بگاڑنے کا باعث بن رہی ہیں اور چندہ کے نام پر

لوگوں سے زبردستی بھتہ وصول کرتی ہیں۔

لیکن پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد صفدر نے وزیر داخلہ کے ان بیانات سے اتفاق نہیں کیا اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اسلحہ کی نمائش اور زبردستی بھتہ کی وصولی اگر کراچی میں ہو تو ہو سکتی ہے لیکن پنجاب میں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے اس لیے پنجاب میں جہادی تنظیموں کے چندہ جمع کرنے پر پابندی نہیں لگائی جا رہی۔

ہمارے خیال میں کراچی کے حوالے سے بھی وفاقی وزیر داخلہ کا یہ کہنا حقائق پر مبنی نہیں ہے کہ وہاں جہادی تنظیمیں جہادی چندہ کے نام پر زبردستی بھتہ وصول کر رہی ہیں اور اسلحہ کی عام نمائش ہو رہی ہے۔ کیونکہ کراچی اور حیدر آباد وغیرہ میں اسلحہ کی نمائش اور زبردستی بھتہ کی وصولی کا کام جو عناصر کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں اور یہ کام ایک عرصہ سے ہو رہا ہے۔ جہادی تحریکیں تو بہت بعد میں کراچی میں متحرک ہوئی ہیں، ان سے بہت پہلے قوم پرست اور لسانی تحریکیں جبری بھتہ اور اسلحہ کی نمائش بلکہ خانہ جنگی کا کلچر عام کر چکی ہیں، اور حکومت تمام تر دعووں کے باوجود اب تک ان پر قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔

اس لیے ہم وزیر داخلہ سے گزارش کریں گے کہ وہ ان لوگوں کو ضرور قابو کریں جو خانہ جنگی کو فروغ دیتے ہیں، علاقائیت اور لسانیت کو ابھار کر قوم میں تفریق پیدا کرتے ہیں، اور گروہی عصبیت کے نام پر بے گناہ لوگوں کا خون بہاتے ہیں، لیکن ان کی کاروائیوں کو خواہ مخواہ جہادی تحریکوں کے کھاتے میں ڈال کر بیرونی آقاؤں کو خوش کرنے اور ان کے سامنے نمبر بنانے کی کوشش نہ کریں۔

امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء

اس دفعہ عید الاضحیٰ کے بعد تعطیلات کے تین چار ایام آزاد کشمیر میں سیاکھ اور ڈڈیال کے علاقے میں گزارنے کا ارادہ تھا اس لیے عید کے دوسرے روز سفر کے آغاز کیلئے جہلم میں اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے گھر پہنچ چکا تھا۔ لیکن پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی نے موبائل فون پر قابو کر لیا۔ ان کا ارادہ قندھار جانے کا تھا اور چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ قندھار چلوں۔ مولانا درخواستی اس سے قبل قندھار نہیں گئے تھے اور اپنے ادارہ جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی کی طرف سے کچھ رقم طالبان حکومت کی امداد کیلئے بھی دینا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس بہانے قندھار دیکھ لیا جائے اور طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات بالخصوص امیر المومنین ملا محمد عمر سے بھی ملاقات ہو جائے۔ کچھ دوستوں نے تھوڑی بہت رقم مجھے بھی طالبان حکومت تک پہنچانے کیلئے دے رکھی تھی اس لیے ہم دونوں کا پروگرام طے ہو گیا۔

میں ڈڈیال اور سیاکھ کے دوستوں سے فون پر معذرت کر کے گوجرانوالہ واپس آ گیا اور جمعہ پڑھا کر دوسرے روز کوئٹہ پہنچ گیا جہاں مولانا فداء الرحمن درخواستی اپنے فرزند مولانا رشید احمد درخواستی کے ہمراہ میرے انتظار میں تھے۔ اتوار کو کوئٹہ

میں افغان قونصل خانہ نے ہمیں بطور مہمان وصول کیا اور ہم ظہر کے بعد روانہ ہو کر عشاء تک قندھار پہنچ گئے۔ قندھار کے کور کمانڈر ملا اختر محمد عثمانی ہمارے میزبان تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ تفسیر کے دوران انہوں نے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر سے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھی ہے۔ ہم تین دن ان کے مہمان خانے میں رہے۔

انہی دنوں قطر اور مصر کے علماء کرام بھی بتوں کو مسمار کرنے کے سوال پر بات چیت کرنے کیلئے قندھار آئے ہوئے تھے اور ان کی آمد کا خاصا چرچا تھا۔ اس سے قبل پاکستان کے وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر بھی قندھار جا کر طالبان حکومت کے سربراہ سے بت نہ توڑنے کی سفارش کر چکے تھے جو قبول نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس فضا میں جب ہم پہنچے تو ہمارے میزبان نے سوال کیا کہ کیا آپ حضرات بھی بتوں کے بارے میں آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں ہم بھی اسی سلسلہ میں آئے ہیں لیکن ہماری گزارش ہے کہ یہ کام شروع کر دیا ہے تو اب پیچھے ہٹنا درست نہیں ہے اور اس کام کو جلد از جلد مکمل کر دیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ بتوں کو مسمار کرنے کے اس عمل کے شرعاً صحیح اور ضروری ہونے میں تو سرے سے کوئی کلام ہی نہیں ہے لیکن اگر کام شروع کرنے سے قبل ہم سے دریافت کیا جاتا تو ممکن ہے ہم بھی یہ عرض کرتے کہ اس کے مناسب وقت کیلئے زیادہ سے زیادہ اصحاب علم و دانش سے مشورہ کر لیں۔ مگر اب جبکہ اس کار خیر کا آغاز ہو چکا ہے تو ہم اس کو جلد از جلد مکمل کرنے کے حق میں ہیں اور اس میں کسی قسم کی نرمی کو اب درست نہیں سمجھتے۔

امیر المومنین ملا محمد عمر سے ہماری ملاقات منگل کے روز ہوئی۔ ہمارے میزبان ہمیں لے کر ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو ان کی رہائش گاہ سے باہر کھلے میدان میں ننگی زمین پر کچھ علماء کرام دائرہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر ہم نے سمجھا کہ شاید گھر کے اندر باری باری حضرات کو ملاقات کیلئے بلایا جا رہا ہے اور یہ حضرات اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ لیکن جب قریب ہوئے تو دیکھا کہ ملا محمد عمر بھی انہی لوگوں کے ساتھ خالی زمین پر آلتی مالتی مارے بیٹھے ہیں اور ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں پہلے بھی دیکھ رکھا تھا اس لیے پہچان لیا لیکن مجھے مولانا درخواستی کو یہ بتانا پڑا کہ یہ صاحب جنہوں نے درمیان سے اٹھ کر ہمارے ساتھ معانقہ کیا ہے یہی طالبان حکومت کے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر وہ حدیث یاد آگئی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے درمیان بے تکلفی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور بسا اوقات باہر سے آنے والے کو بیٹھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہ دیکھ کر یہ پوچھنا پڑتا تھا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں؟ آج اسی سنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ ہوتے دیکھ کر جو خوشی ہوئی اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

اس وقت افغانستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی نور محمد ثاقب امیر المومنین کو عرب علماء کے وفد کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن بعد میں ہمیں اس کا جو خلاصہ بتایا گیا اس کے مطابق ملا محمد عمر نے یہ کہا تھا کہ ان بتوں کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ ان کی عبادت نہیں ہوتی تھی اور یہ صرف نمائش اور یادگار کے طور پر تھے۔ اس لیے کہ عبادت صرف سامنے کھڑے ہو کر سر جھکانے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور ہستی یا چیز کے بارے میں دل میں تعظیم اور محبت کے وہ

جذبات رکھنا بھی عبادت کے زمرے میں شامل ہے جو جذبات صرف خالق و مالک حقیقی کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں، خواہ یہ تعظیمی جذبات رکھنے والا ہزاروں میل دور کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اختیار حاصل ہونے کے بعد ہم نے ان بتوں کو توڑنے میں اب تک جو تاخیر کی ہے وہ ہماری کوتاہی ہے اور شاید اسی وجہ سے ہم بارش سے بھی مسلسل محروم چلے آرہے ہیں اور پورے افغانستان میں طویل عرصہ کے بعد بارش کا نزول ہوا ہے۔

امیر المومنین کے ساتھ اس مختصر ملاقات کے علاوہ طالبان حکومت کے دیگر ذمہ دار حضرات سے بھی ہماری گفتگو ہوئی۔ ہم بازار گئے، مختلف دکانوں میں گھومے، بہت سے لوگوں سے باتیں کیں، افغان وزارت خارجہ کے دفتر میں گئے، مختلف اہل کاروں سے افغانستان کی موجودہ صورت حال بالخصوص اقوامِ متحدہ کی پابندیوں کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں اور افغان معاشرہ پر ان پابندیوں کے اثرات کا جائزہ لیا۔ ان کی تفصیلات آئندہ چند کالموں میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

افغانستان پر پابندیوں کے عملی اثرات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۴ مارچ ۲۰۰۱ء

قندھار حاضری کا ایک مقصد اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے افغانستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے اثرات کا جائزہ لینا بھی تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدّد حکام سے گفتگو کے علاوہ ہم نے بازاروں میں گھوم پھر کر اشیاء صرف کی دستیابی اور ان کی قیمتوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

ہمارے میزبان ملا اختر محمد عثمانی نے، جو قندھار کے کور کمانڈر ہیں، سلامتی کونسل کی پابندیوں کے اثرات و نتائج کے بارے میں سوال کے جواب میں کہا کہ ان پابندیوں کی وجہ سے مسلمان بھائیوں کی توجہات اور خاص طور پر پاکستان کے اہل دین اور اہل خیر کی حمایت و تعاون میں اضافہ ہوا ہے۔ اور دنیا بھر کے دیندار حلقے ہمارے لیے دعاؤں کے ساتھ ساتھ حمایت و معاونت کا بھی اہتمام کر رہے ہیں جس پر ہم خوش ہیں۔ اس سے ہمارا حوصلہ و اعتماد بڑھا ہے اور یہ ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

کراچی میں امارت اسلامی افغانستان کے قونصل جنرل ملا رحمت اللہ کاکازادہ بھی ان دنوں قندھار میں تھے بلکہ امیر المومنین ملا محمد عمر سے ملاقات میں ہماری ترجمانی بھی انہوں نے کی۔ ان سے اس سلسلہ میں تفصیلی بات چیت ہوئی، انہوں نے کہا کہ سلامتی کونسل کی پابندیوں کے بعد ہمیں تین طرح کی تبدیلیوں اور تغیرات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ بین الاقوامی پابندیوں کی وجہ سے افغانستان کرنسی کی قیمت تقریباً چالیس فیصد تک مزید گر گئی ہے جس سے عام آدمی کی قوت خرید بری طرح متاثر ہوئی ہے اور اشیاء صرف پہلے سے زیادہ مہنگی ہو گئی ہیں۔ یہ بات ہم نے بھی محسوس کی اس لیے کہ تقریباً آٹھ ماہ قبل جب میں کابل گیا تھا تو ایک سو دس یا ایک سو پندرہ روپے پاکستانی کے عوض ایک لاکھ افغانی ملتا تھا مگر اب کرنسی کا ریٹ پوچھا تو اسی روپے پاکستانی کے عوض ایک لاکھ افغانی ملتے ہیں اور اشیاء صرف کی قیمتوں میں بھی اسی تناسب

سے اضافہ ہوا ہے۔

حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے قندھار سے ایک چپل خریدا جو کراچی کا بنا ہوا تھا مگر قندھار کی نسبت سے خرید اگیا۔ جبکہ میں نے ایک کتب خانہ سے دو کتابیں خریدیں۔ ایک عبد الحیٔ مرحوم کی فارسی میں "تاریخ مختصر افغانستان" ہے اور دوسری ایک اطالوی دانشور ڈاکٹر پیو کارلو تریزیو (Dr. Pio-Carlo Toranzio) کی کتاب۔۔۔۔۔ اور افغانستان کے خطہ میں روس اور برطانیہ کی رقابت وکشمکش کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ یہ کتابیں مجھے سوا سو روپے پاکستانی یعنی تقریباً ڈیڑھ لاکھ افغانی میں ملیں۔ مولانا درخواستی نے ایک دکان سے ہمیں آئس کریم کھلائی جو دراصل فریزر میں لگی ہوئی کسٹرڈ کھیر تھی اور پندرہ ہزار افغانی میں ایک پلیٹ (تقریباً تیرہ روپے پاکستانی) میں مل رہی تھی۔ بہرحال افغان کرنسی کی قیمت میں واضح کمی اور اشیاء صرف کی قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ ہم نے دیکھا جو افغانستان کے خلاف بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں کا لازمی نتیجہ ہے اور اس سے بلاشبہ افغان عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔

ملا رحمت اللہ کاکازادہ نے کہا کہ سلامتی کونسل کی پابندیوں کا دوسرا اثر عملی طور پر یہ ہوا ہے کہ امارت اسلامی افغانستان کے خلاف عالمی پریس اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے مسلسل معاندانہ پراپیگنڈہ کے جواب میں طالبان حکومت کے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کیلئے جو افغان مشن مختلف ملکوں میں جاتے تھے اور ان کی بات کسی نہ کسی حد تک کچھ لوگوں تک پہنچ جاتی تھی، ان سفارتی مشنوں کی آمد و رفت میں سلامتی کونسل کی پابندیوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس طرح طالبان حکومت کو عالمی رائے عامہ کے سامنے اپنے موقف کی براہ راست وضاحت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

افغان قونصل جنرل کے مطابق ان پابندیوں کا تیسرا اثر یہ ہوا ہے کہ جنگ سے متاثرہ ایسے زخمی اور مریض جن کا علاج ملک میں نہیں ہو سکتا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح علاج معالجہ کیلئے بیرونی ملکوں بالخصوص مغربی ممالک میں چلے جاتے تھے۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا اور اس قسم کے سینکڑوں مریض علاج معالجہ کی سہولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس کے علاوہ اور کوئی عملی تبدیلی ان پابندیوں کی وجہ سے نمودار نہیں ہوئی، بالخصوص عام لوگوں کو ضرورت کی اشیاء بازار میں دستیاب ہیں کیونکہ پاکستان، ایران اور ترکمانستان کے راستوں سے اشیاء خورد و نوش اور دیگر عام ضروریات کی اشیاء مارکیٹ میں پہنچ رہی ہیں اور افغان عوام کو اس سلسلہ میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہے۔

البتہ ایک بات بطور خاص ہم نے محسوس کی کہ بازار میں ایرانی مال کا تناسب زیادہ ہے اور نسبتاً وہ سستا بھی ہے۔ اس کی وجہ ایک افغان افسر نے ہمارے دریافت کرنے پر یہ بتائی کہ ہم پاکستانی تاجروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے جبکہ ایرانی تاجر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ افغان مارکیٹ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کیلئے کام کر رہے ہیں اور انہیں اس سلسلہ میں ایرانی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ افغان افسر نے کہا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ پاکستانی تاجر ادھر متوجہ ہوں اور افغان مارکیٹ میں اپنی جگہ بنائیں۔ اس کیلئے ہم ہر قسم کی سہولت فراہم کرنے کو تیار ہیں لیکن۔۔۔۔۔ رسک نہیں لے رہے جبکہ ایرانی تاجروں نے تمام تحفظات بالائے طاق رکھ دیے ہیں اور افغان مارکیٹ میں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کیلئے ہر قسم کا رسک لے رہے ہیں جس کی وجہ سے ایرانی مال افغانستان کے

بازاروں میں ہر طرف نظر آرہا ہے۔

یہ بات جب میں نے گوجرانوالہ کے بعض تاجر دوستوں سے کی تو انہوں نے کہا کہ اس کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ ایرانی صنعت کار اور تاجر کو اپنے ملک میں ان ٹیکسوں کا سامنا نہیں ہے جنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ اس لیے ایرانی تاجر اپنی اشیاء کو افغان مارکیٹ میں جس پرچون نرخ پر فروخت کر رہا ہے وہ ہماری کاسٹ سے بھی کم ہے اور اس صورت حال میں ہم ایرانی مال کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ ان تاجر دوستوں کا کہنا ہے کہ ایرانی حکومت اپنی پالیسیوں میں خود مختار ہے اس لیے وہ اپنے صنعتکاروں اور تاجروں کو نئی منڈیاں بنانے کیلئے ہر قسم کی سہولت دے سکتی ہے، جبکہ ہماری معیشت پر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا کنٹرول ہے اس لیے ہماری حکومت چاہے بھی تو ہمیں وہ سہولتیں اور ٹیکسوں میں چھوٹ نہیں دے سکتی جو افغان مارکیٹ میں ایرانی مال کا مقابلہ کرنے کیلئے بہر حال ضروری ہیں۔

افغانستان میں سرمایہ کاری کی اہمیت اور امکانات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ مارچ ۲۰۰۱ء

افغان قونصل جنرل ملا رحمت اللہ کاکازادہ نے یہ بتا کر مجھے تو حیران کر دیا کہ دو سال قبل دوبئی میں مختلف ملکوں کی مصنوعات کی بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی جس میں لیدر، قالین اور کشیدہ کاری کے شعبوں میں ۳۴ ممالک میں افغان مصنوعات سرفہرست رہی تھیں اور اس پر ایک پڑوسی ملک کے تاجر کف افسوس ملتے رہ گئے تھے۔ حیرانی اور تعجب کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ مسلسل جنگ کی تباہ کاریوں اور مکمل بے سروسامانی کے ماحول میں اگر افغان صنعت کار اور ہنرمند بین الاقوامی نمائش میں اپنے لیے نمایاں جگہ بنا سکتے ہیں تو سازگار فضا اور اسباب و وسائل کی فراہمی کی صورت میں وہ یقیناً اس سے کہیں بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ افغان صرف لڑنے مرنے کے میدان کے لوگ نہیں بلکہ ہنر اور صنعت کے شعبوں میں بھی اپنی ذہانت اور بہادری کا سکہ منوا سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں مناسب ماحول میسر ہو، ضروری اسباب و وسائل مہیا ہوں، اور حوصلہ افزائی و قدر دانی کی فضا فراہم ہو جائے۔ افغانوں کے بارے میں یہ بات تو عام مشاہدہ کی ہے کہ وہ محنت اور جفاکشی کے عادی ہیں اور محنت و مشقت کے کسی کام کو اپنے لیے عار کا باعث نہیں سمجھتے۔ خود ہمارے ہاں محنت و مشقت کے جن کاموں کو افغانوں نے سنبھال رکھا ہے وہ شاید کوئی دوسرا طبقہ اس طرح سنبھال سکے۔ جوتے پالش کرنے سے لے کر لکڑیاں کاٹنے تک، رات کو چوکیدارہ کرنے اور سڑکوں کی روڑی کوٹنے تک کے کام ان کے کھاتے میں ہیں۔ کبھی کبھی بعض دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں افغانوں نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہ واپس کیوں نہیں جاتے؟ لیکن جب ان سے عرض کیا جاتا ہے کہ محنت و مشقت کے جو کام ان افغانوں نے اپنے حصہ میں لے رکھے ہیں ان کے جانے کے بعد یہ کام کون سنبھالے گا، اور اگر کوئی سنبھال بھی لے تو اس دل جمعی، دیانت داری، محنت اور یکسوئی کے ساتھ ان کاموں کو اور کون کر پائے گا؟

الغرض افغان قوم جہاں جنگجو ہے وہاں محنت و مشقت کی خوگر بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت اور ہنرمندی کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے لیکن ان کی زندگی کا یہ پہلو اکثر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر اس سمت ان کی صحیح راہنمائی ہو اور انہیں حوصلہ افزائی اور وسائل فراہم ہو جائیں تو بہت جلد وہ ترقی یافتہ یا کم از کم ترقی پذیر ممالک میں نمایاں جگہ بنا سکتے ہیں۔

طالبان حکومت نے افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار افغان عوام سے اسلحہ واپس لے کر اور شرعی حدود عملاً نافذ کر کے افغان معاشرہ کو باہمی قتل و قتال سے نجات دلائی ہے۔ اور خدا کرے کہ شمال کی جنگ جلد اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچ جائے تو اس کے بعد بلاشبہ افغان معاشرہ ایک پر امن معاشرہ کے طور پر نئے دور کا آغاز کرے گا۔ پھر افغان قومی صلاحیتیں یکسوئی کے ساتھ تعمیر نو اور صنعت و حرفت کیلئے وقف ہوں گی اور نہ صرف افغانستان ایک مثالی اسلامی اور فلاحی ریاست کی صورت میں ابھرے گا بلکہ پاکستان، ایران اور وسطی ایشیا کی ریاستیں بھی افغان قوم کی ان صلاحیتوں کے نتائج و ثمرات سے اپنے اپنے حوصلہ اور ظرف کے مطابق فائدہ اٹھا سکیں گی لیکن اس کیلئے ابھی سے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

جو ملک اور قوم اس وقت آنے والے حالات کا صحیح طور مشاہدہ کر کے اس کے مطابق منصوبہ بندی کرے گی وہی مستقبل کے نقشہ میں اپنے لیے صحیح جگہ حاصل کر سکے گی۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ عالمی نظام خود اپنے پھیلائے ہوئے حکومت و فریب کے جال میں بری طرح الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کی پسپائی بلکہ موت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا نظام ابھر رہا ہے جس کی بنیاد یقین و ایمان، آسمانی تعلیمات، دینی اخلاقیات، سودی اور استحصالی معیشت کے خاتمہ، اور انسانیت کی بھلائی پر ہے۔ اور افغانستان کا کردار اس میں ہراول دستہ کا نظر آتا ہے۔ اس لیے پاکستانی تاجروں، صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کو آنکھیں کھولنی چاہئیں اور تحفظات کے دائرہ سے نکل کر کھلی فضا میں موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینا چاہیے۔ افغانستان میں اس وقت سرمایہ کاری کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ وہاں کی مارکیٹ اپنے پاکستانی بھائیوں کے انتظار میں ہے، بند کارخانے پاکستانی صنعت کاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں، اور زیر زمین چھپے ہوئے معدنیات کے بیش قیمت اور وسیع ذخائر پاکستان کے ہنرمندوں اور سرمایہ کاروں کو دعوت عمل دے رہے ہیں۔

ایک معاملہ میں میرے سوال پر افغان قونصل جنرل ملا رحمت اللہ کاکازادہ نے یہ بھی بتایا کہ وہ مئی کے اوائل میں کراچی میں افغان مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں مختلف حلقوں سے رابطے قائم کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں افغان مصنوعات کی نمائش ہو جبکہ پاکستانی مصنوعات کا افغانستان میں عمومی تعارف کرانے کیلئے کابل، قندھار اور دیگر شہروں میں ان کی نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے طالبان حکومت ہر ممکن سہولیات مہیا کرنے کیلئے تیار ہے۔ طالبان حکومت کے ایک اور اعلیٰ افسر نے کہا کہ مغربی ممالک کی بہت سی کمپنیاں اور ادارے افغانستان میں سرمایہ کاری کیلئے لائن میں لگے ہوئے ہیں مگر ہم ان کو راستہ نہیں دے رہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کام کیلئے مسلم ممالک آگے آئیں اور ان میں سے بھی ہماری سب سے پہلی ترجیح پاکستان ہے لیکن ہم

زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکیں گے اور نہ ہماری ضروریات ہمیں زیادہ دیر تک انتظار کی اجازت دیں گی۔ اس لیے اگر ہم اس خلا کو پر کرنے کیلئے مغربی ممالک اور دیگر غیر مسلم ممالک کے مالیاتی اداروں کو راستہ دینے پر آخر کار مجبور ہو گئے تو اس سلسلہ میں غفلت سے کام لینے والے ہمارے مسلمان بھائی اس کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکیں گے۔

ملا رحمت اللہ کاکازادہ نے کہا کہ افغانستان میں سرمایہ کاری کیلئے ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب کا گروپ زیادہ بہتر اور منظم طریقہ سے کام کر رہا ہے، خواہش مند حضرات ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اور اسلام آباد میں افغان سفارتخانہ کے علاوہ کراچی میں خود ان سے بھی اس پتہ پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ مکان نمبر ۱۱/۳۳، گلی نمبر ۲۷، خیابان شمشیر فیز V ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

چند لمحے احمد شاہ باباؒ کے مزار پر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مارچ ۲۰۰۱ء

قندھار جانا ہو اور احمد شاہ ابدالیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کیلئے حاضری نہ ہو، یہ میرے جیسے تاریخ کے طالب علم کیلئے ممکن ہی نہیں۔ گذشتہ دفعہ جب قندھار گیا تو احمد شاہ ابدالیؒ کے مزار پر بھی گیا۔ اس وقت مزار کے دروازے کھلے تھے اس لیے نیچے تہہ خانے میں اتر کر قبر کی پائنتی پر کافی دیر کھڑا رہا اور فاتحہ خوانی کے بعد تصور کی دنیا میں احمد شاہ باباؒ سے راز و نیاز میں مصروف رہا۔ مگر اس بار حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی کے ہمراہ حاضری ہوئی تو دروازے بند تھے اس لیے باہر کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی اور ''خلوت'' میسر نہ ہونے کی وجہ سے راز و نیاز کا شوق بھی ادھورا رہ گیا۔

احمد شاہ ابدالیؒ کو افغان عوام محبت و عقیدت سے احمد شاہ باباؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اسی عقیدت سے اس عظیم افغان فرمانروا کی قبر پر حاضری بھی دیتے ہیں جس نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں قندھار میں افغان سلطنت کی بنیاد رکھی اور صرف ربع صدی کے عرصہ میں اس کی سرحدیں دریائے آمو سے دریائے سندھ تک اور تبت سے خراسان تک وسیع کر کے ۵۱ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالیؒ ۱۷۲۴ء میں ملتان میں پیدا ہوا۔ افغانستان کے ابدالی قبیلہ کے پوپلزئی خاندان کی سدوزئی شاخ سے اس کا تعلق ہے۔ اس کا باپ سردار زمان خان مرحوم ہرات پر ایرانیوں کے قبضہ کی مزاحمت کرتا رہا مگر ناکام رہا اور ایرانی ہرات پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد سردار زمان خان کے بھائی ذوالفقار خان نے ایرانیوں کے خلاف بغاوت کی مگر وہ کامیاب نہ ہوا اور ۱۷۳۱ء میں ہرات پر ایرانی قبضہ مکمل ہو گیا۔ سردار زمان خان کا بیٹا احمد خان ایرانی فرمانروا نادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہوا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث ایک سپاہی کے منصب سے ترقی کرتے ہوئے صرف تئیس برس کی عمر میں سپہ سالار کے مقام تک جا پہنچا۔ مگر ۱۷۴۷ء میں قزلباشوں کے ہاتھوں نادر شاہ قتل ہوا تو احمد خان نے دیگر افغان فوجیوں کے ہمراہ وطن واپسی کی راہ اختیار کی، قندھار میں افغان سلطنت کی بنیاد رکھی، احمد شاہ کا لقب پایا، اور در دراں (موتیوں کا موتی) کا خطاب حاصل کیا جس کی وجہ سے اسے درانی کہا جاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالیؒ نے ۱۷۷۳ء میں وفات

پائی مگر اس دوران مسلسل معرکہ آرائی اور فوجی مہمات میں اس نے اپنی سلطنت کو دریائے آمو سے دریائے سندھ تک اور تبت سے خراسان تک وسیع کر لیا جس میں کشمیر، پشاور، ملتان، سندھ، بلوچستان، ایرانی خراسان، ہرات، قندھار، کابل اور بلخ کے علاقے شامل تھے۔

احمد شاہ ابدالیؒ نے ہندوستان پر نو حملے کیے اور ایک مرحلہ پر لاہور اور سرہند پر قبضہ کر کے انہیں بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر اس کا سب سے بڑا معرکہ پانی پت کی تیسری لڑائی ہے جس میں اس نے جنوبی ہند کے جنوبی مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کا راستہ روکا اور شمالی ہند کے اس خطہ کو، جسے آج پاکستان کہلانے کا شرف حاصل ہے، ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کے نام مخصوص کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغل بادشاہت زوال کا شکار تھی۔ اسے ایک طرف سمندر پار سے تجارت کے نام پر آنے والی کمپنیوں نے، جن میں برطانیہ اور فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنیاں سرفہرست تھیں، دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے جنوبی ہند کے انتہا پسند ہندوؤں یعنی مرہٹوں کی فوج دہلی پر قبضہ کیلئے بے چین تھی۔ تیسری طرف پنجاب میں سکھوں نے اپنی قوت اور خود مختاری کے اظہار کا آغاز کر دیا تھا۔ اور اسی فضا میں ایرانی فرمانروا نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور وہ قتل عام کیا تھا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی علمی و دینی قیادت کا علم اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے دہلی کی طرف ہندو مرہٹوں کی یلغار کو شمالی ہند کے مسلمانوں کیلئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے مغل بادشاہت کو اس کے مقابل بے بس پا کر احمد شاہ ابدالیؒ سے مدد کی فریاد کی۔ مرہٹے بھی اپنے مقابلہ میں افغانوں کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے اور ۱۷۵۸ء میں پنجاب کو افغانوں سے خالی کرانے کی مہم میں پشاور تک یلغار کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں افغانوں کی یہ ابھرتی ہوئی قوت ہی عالم اسباب میں شمالی ہند کے مسلمانوں کا سب سے بڑا سہارا بن سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالیؒ نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے مقابلہ کیلئے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو تاریخی شکست سے دوچار کرنے کے بعد دہلی کی حکومت ایک بار پھر مغل بادشاہ محمد شاہ کے سپرد کر کے اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔

"تاریخ مختصر افغانستان" کے مصنف عبدالحئی حبیبی مرحوم کا کہنا ہے کہ احمد شاہ ابدالی حنفی المذہب عالم تھا، دینی احکام کا پابند اور متشرع حکمران تھا۔ اور شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ پشتو میں احمد شاہ ابدالیؒ کا دیوان عبدالحئی حبیبی مرحوم نے ہی شائع کیا ہے جو اڑھائی ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں غزل، رباعی، قطعات، اور مخمس وغیرہ کی مختلف شعری اصناف شامل ہیں۔ تصوف و سلوک میں اپنے وقت کے دو بڑے شیوخ حضرت شاہ فقیر اللہ جلال آبادیؒ اور حضرت میاں محمد عمر پشاوریؒ سے اس کا ارادت کا تعلق تھا۔ اور سلوک و معرفت کے مسائل پر بھی اس کا شاعرانہ کلام موجود ہے جس کی شرح پشاور کے قاضی ملا محمد غوثؒ نے "شرح الشرح" کے نام سے لکھی تھی۔

احمد شاہ ابدالیؒ کی فرمانروائی کا یہ پہلو تاریخ کی نظر میں عجیب اور ناقابل فہم ہے کہ اس نے مسلمان سرداروں اور حکمرانوں پر تسلط حاصل کرنے اور انہیں میدان جنگ میں شکست دینے کے باوجود ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا اور ان کے علاقوں پر مسلسل قبضہ برقرار رکھنے کی بجائے انہی کو مناسب شرائط پر ان کے علاقے لوٹا دیے۔ مؤرخ حبیبی

مرحوم نے احمد شاہ ابدالیؒ کے اس طرز عمل کو تاریخی طور پر عجیب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی، بخارا، خراسان، سندھ اور بلوچستان کے حکمرانوں کے ساتھ اس نے یہی معاملہ کیا۔ اور پانی پت کا معاملہ تو ہمارے سامنے ہے کہ مرہٹوں کی خوفناک شکست کے بعد اگر احمد شاہ ابدالیؒ دہلی میں بیٹھ جاتا اور ہندوستان پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس اقدام سے نہیں روک سکتی تھی۔ بلکہ تاریخ کے میرے جیسے طالب علم کی نظر میں اس وقت احمد شاہ ابدالیؒ کے دہلی میں بیٹھ جانے کی صورت میں نہ صرف فرنگیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے بلکہ سکھوں کی روز افزوں سرکشی بھی کنٹرول میں رہتی۔ لیکن احمد شاہ ابدالیؒ نے اپنی افتادِ طبع اور اس کے ساتھ اپنے پیچھے قندھار میں بغاوت کے آثار دیکھ کر واپس لوٹ جانے کو ترجیح دی۔

مؤرخ حبیبی مرحوم نے احمد شاہ ابدالیؒ کے اس طرز عمل پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ ابدالیؒ کا یہ رویہ اس دنیا کے معاملات کے حساب سے نہ تھا۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک احمد شاہ ابدالیؒ کا معاملہ تکوینیات اور عالم غیب سے تھا کہ وہ اپنے ذمہ عائد کی گئی ذمہ داری ادا کر کے اسی طرح واپس چلا گیا۔

بت شکنی اور طالبان حکومت کا موقف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۲۰۰۱ء

عید الاضحیٰ کے بعد پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی کے ہمراہ قندھار جانے کا اتفاق ہوا اور طالبان حکومت کے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر اور دیگر سرکردہ حضرات سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا۔ امیر محترم کے فرزند مولانا رشید احمد درخواستی بھی ہمارے ساتھ تھے، اور ہمارا قیام قندھار کے کور کمانڈر ملا اختر عثمانی کے ہاں تھا جو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ تفسیر قرآن کریم میں شریک رہ چکے ہیں۔

ان دنوں قندھار میں قطر اور مصر کے بعض سرکردہ علماء کرام کا وفد بھی آیا ہوا تھا جو طالبان حکومت کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ بتوں کو مسمار کرنے کا جو عمل آپ لوگوں نے شروع کر رکھا ہے وہ مصلحت کے خلاف ہے۔ ان علماء کی امیر المومنین سے ملاقات نہیں ہو سکی البتہ افغانستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی نور محمد ثاقب سے ان کے مذاکرات ہوئے مگر وہ افغان حکّام کو اپنے موقف پر قائل نہ کر سکے۔ مولوی نور محمد ثاقب افغانستان کے سرکردہ علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں اور مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔

قریبی حلقوں کے مطابق مولوی نور محمد ثاقب صاحب نے عرب علماء سے دریافت کیا کہ ایک اسلامی ریاست میں کھلے بندوں بت اور مجسمے نصب ہوں تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟ جواب میں عرب علماء نے کہا کہ شرعاً ایسے بتوں اور مجسموں کو توڑنا اسلامی حکومت پر واجب ہے۔ افغانستان کے قاضی القضاۃ نے دریافت کیا کہ اگر ان بتوں کو مسمار کرنا واجب ہے تو پھر آپ حضرات ہمیں اس عمل سے رک جانے کا مشورہ کیسے دے رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہم مصلحت کی خاطر یہ کہہ رہے ہیں۔ اس پر مولوی نور محمد ثاقب نے یہ بصیرت افروز جواب دیا کہ شرعی واجبات میں کسی اور

مصلحت کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے فرائض اور واجبات خود مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔

چنانچہ وفد طالبان کو حکومت کو قائل نہ کر سکا اور بے نیل مرام واپس لوٹ گیا۔ امیر المومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ تعالیٰ وایدہ اللہ بنصرہ العزیز سے ہماری ملاقات ہوئی تو اس میں مولوی نور محمد بھی شریک تھے اور انہوں نے امیر المومنین کو اس موقع پر عرب علماء سے گفتگو کی کچھ تفصیل سنائی۔ جس پر امیر المومنین نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ان بتوں کی پوجا نہیں ہوتی تھی اور یہ محض نمائش اور یادگار کیلئے تھے، اس لیے کہ پوجا اور عبادت صرف سامنے آکر سر جھکانے کا نام نہیں بلکہ ہزاروں میل دور اُن کیلئے تعظیم اور محبت کے وہ جذبات بھی عبادت کے زمرہ میں آتے ہیں جو خالقِ کائنات کی ذاتِ گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اختیار ملنے کے بعد ان بتوں کو مسمار کرنے میں ہم نے جو تاخیر کی ہے وہ ہماری غلطی ہے اور اسی وجہ سے دو برس سے بارش نہیں ہو رہی تھی، اور اب جبکہ ہم نے بتوں کو توڑنے کا عمل شروع کیا ہے تو پورے افغانستان میں بارانِ رحمت کا نزول ہو گیا ہے۔

ہم نے قندھار میں تین روزہ قیام کے دوران بطورِ خاص یہ بات محسوس کی کہ افغانستان کے خلاف اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی پابندیوں سے افغان حکومت اور عوام کی مشکلات میں اضافہ ضرور ہوا ہے مگر ان کے چہروں پر اس سلسلہ میں پریشانی اور اضطراب کے اثرات نہیں ہیں بلکہ وہ پورے حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ ان پابندیوں کو برداشت کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کے عمل کو بہر حال مکمل کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ آزمائش اور ابتلا کے اس نازک مرحلہ میں امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کیلئے استقامت و کامیابی کی دعاؤں کا اہتمام کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مظلوم افغان بھائیوں کی امداد اور معاونت کیلئے بھی ہر ممکن عملی صورت اختیار کریں۔

۲۰۱۸ء کے دوران الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں تعارفِ مذاہب کے حوالے سے
منعقدہ ایک نشست سے گفتگو کا متعلقہ حصہ

- - - -

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ذکر اذکار اور اخلاقیات کے لحاظ سے بدھ مت کوئی آسمانی مذہب لگتا ہے۔ ذرائع ابلاغ آج کل تو اور ہیں، اس زمانے میں بلند مقامات اور چٹانوں وغیرہ پر اپنے قوانین کندہ کروا دیتا تھا۔ مانسہرہ میں آثار میں نے دیکھے ہیں، افغانستان میں بامیان کا بت بدھا کے بڑے بتوں میں سے تھا جو طالبان نے توڑا تھا۔ ایک بہت بڑی پہاڑی کو تراش کر مہاتما بدھ کا بت بنایا گیا تھا۔ جب طالبان نے اپنے دور حکومت میں اسے توڑا تو عالمی سطح پر اقوام متحدہ میں، دنیا میں اور جاپان میں کہرام مچ گیا تھا کیونکہ جاپان تو بدھوں کا ملک ہے اور انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب طالبان نے بامیان کا بت توڑنے کا فیصلہ کیا تو جاپان نے پیشکش کی تھی کہ اس کے عوض جو تم چاہو ہم دینے کو تیار ہیں یہ بت ہمارے حوالے کر دو۔ بہر حال یہ سارا علاقہ بنگال کے ساتھ بہار تک ان کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔

- - - -

مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق کا قومی مسائل پر اظہارِ یکجہتی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۷ اپریل ۲۰۰۱ء

مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق نے قومی مسائل پر یکجہتی کا اظہار کر کے ملک بھر کے دینی کارکنوں کیلئے مزید اطمینان کا سامان فراہم کر دیا ہے اور اس سے ۹، ۱۰، ۱۱ اپریل کو پشاور میں منعقد ہونے والی ”خدماتِ دارالعلوم دیوبند کانفرنس“ کیلئے دیوبندی جماعتوں اور کارکنوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جمعیت علماء پاکستان کے نورانی اور نیازی گروپوں میں اتحاد کا اعلان ہوا اور مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خان نیازی متحدہ جمعیت کے پلیٹ فارم پر پھر سے یکجا ہوئے تو سنجیدہ دینی کارکنوں نے اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ امید اپنے دلوں میں پھر سے زندہ کر لی تھی کہ ہو سکتا ہے جمعیت علماء اسلام میں یہ بھی صورتحال پیدا ہو جائے۔ پھر آزاد کشمیر کی سب سے پرانی جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے دو دھڑے متحد ہوئے اور سردار محمد عبدالقیوم خان نے سردار سکندر حیات خان کے والد مرحوم کی برسی پر اچانک ان کے ہاں پہنچ کر جس تدبر اور ایثار کا مظاہرہ کیا اس سے مسلم کانفرنس کے دونوں دھڑوں کے اکٹھا ہونے کی راہ ہموار ہوگئی چنانچہ سردار محمد عبدالقیوم خان کی قیادت میں پھر سے یہ جماعت متحد ہو چکی ہے۔ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اگرچہ خطہ کشمیر میں مسلم لیگ ہی کا دوسرا نام ہے لیکن آزادئ کشمیر اور ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالے سے اس کا کردار پاکستان کی مسلم لیگ سے قدرے مختلف دکھائی دیتا ہے اور اس میں اسلام کے عملی نفاذ سے دلچسپی رکھنے والے کارکنوں کا تناسب زیادہ ہے۔ اس لیے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کی حیثیت سے مجھے مسلم کانفرنس کے دولخت ہونے پر دکھ ہوا تھا اور اب متحد ہونے پر اسی طرح خوشی بھی ہوئی ہے۔

اس فضا میں دیوبندی مکتب فکر کے کارکنوں کیلئے یہ بات پریشانی کا باعث بن رہی تھی کہ گذشتہ دنوں مولانا سمیع الحق نے افغانستان پر اقوامِ متحدہ کی پابندیوں کے خلاف اکوڑہ خٹک میں دینی جماعتوں کی کانفرنس طلب کی تو اس میں مولانا فضل الرحمان نے خود شریک ہونے کی بجائے نمائندہ بھیجنے پر اکتفا کیا تھا اور ان کے قریبی حلقوں نے اس کی توجیہ یہ کی تھی کہ اس مشترکہ اجتماع کیلئے مولانا فضل الرحمان کو براہ راست اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ چنانچہ ”خدماتِ دیوبند کانفرنس“ کیلئے جب مولانا فضل الرحمان نے عوامی رابطہ مہم کا آغاز کیا تو یہ تاثر عام ہونے لگا تھا اور اس کی ہلکی پھلکی جھلکیاں اخبارات میں بھی دکھائی دینے لگی تھیں کہ شاید اب کی بار مولانا سمیع الحق کی اس کانفرنس میں براہ راست شرکت یقینی نہ رہے مگر مولانا فضل الرحمان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حضرت مولانا امان اللہ خان اور مولانا گل نصیب خان کے ہمراہ خود مولانا سمیع الحق کے گھر جا کر انہیں کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور اس طرح تمام منفی تاثرات اور خدشات کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے صورتحال میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ جمعیت علماء اسلام (ف) اور جمعیت علماء اسلام (س) کے کارکن یکساں

جوش و خروش کے ساتھ پشاور کانفرنس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

مولانا فضل الرحمان گذشتہ روز گوجرانوالہ تشریف لائے اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، حضرت مولانا حمید اللہ خان اور راقم الحروف کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے کے علاوہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں اساتذہ و طلبہ کے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ اس موقع پر میں نے کانفرنس کے سلسلہ میں ان کی مسلسل محنت کا ذکر کرتے ہوئے کہ جس طرح "پکے پیریں" (دل جمعی اور سنجیدگی کے ساتھ) کانفرنس کیلئے تگ و دو کر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اور ان کے رفقاء اس کانفرنس کو دیوبندی مکتب فکر کی تمام جماعتوں اور مراکز کا نمائندہ اور بھرپور اجتماع بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں مولانا سمیع الحق کے گھر جا کر خود دعوت دینے پر بھی داد دی اور اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔

میں تو جے یو پی اور مسلم کانفرنس کے حوالے سے اس سے اگلی بات بھی عرض کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھے اس لیے میں نے منہ بند رکھنا مناسب سمجھا۔ یہ بات میں کچھ عرصہ پہلے تک مختلف مجالس اور مضامین میں عرض کرتا رہا ہوں مگر اس سے میرے یہ دونوں بھائی ناراض ہو جاتے ہیں جبکہ میں ان میں سے کسی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا اس لیے اب یہ بات لکھنا اور کہنا چھوڑ دی ہے۔ بہر حال اب تک کی صورتحال میں دو پہلو نمایاں ہیں اور دونوں خوشگوار اور حوصلہ افزا ہیں۔

- ایک یہ کہ مولانا سمیع الحق نے "خدماتِ دارالعلوم دیوبند کانفرنس" میں شرکت کی دعوت قبول کر لی ہے جس سے کارکنوں کی نچلی سطح پر دھیرے دھیرے رینگنے والی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔
- دوسرا یہ کہ مولانا فضل الرحمان نے "دفاعِ افغانستان کونسل" کے فورم پر افغان کاز کیلئے مشترکہ جدوجہد کے عزم کا اظہار کیا ہے اور پھر دونوں نے یک زبان ہو کر اعلان کیا ہے کہ ان کے درمیان بین الاقوامی مسائل اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے حوالے سے کوئی اختلاف نہیں اور وہ ان مسائل کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں گے۔

اس وقت امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو ناکام بنانے، پاکستان میں این جی اوز اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے قومی معاملات پر بین الاقوامی کنٹرول مسلط کرنے اور دینی قوتوں کو بدنام اور بے اثر کرنے کیلئے عالمی سطح پر جس منصوبے اور ایجنڈے پر تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے اس کی روک تھام کیلئے ملک کے تمام دینی حلقوں بالخصوص دیوبندی مکتب فکر کی جماعتوں اور اس سے بھی زیادہ جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں زیادہ سے زیادہ یکجہتی، ہم آہنگی اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم "خدماتِ دیوبند کانفرنس" کو اس ہم آہنگی اور اشتراک عمل کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو عالمی استعمار کے اس ایجنڈے کو بے اثر کرنے میں بھی ان شاء اللہ العزیز کامیاب رہیں گے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ کے خواب کی عملی تعبیر!

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اپریل ۲۰۰۱ء

خواب کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزو قرار دیا ہے۔ اور بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نبوت کے اجزاء یعنی وحی کی اقسام میں سے صرف ایک قسم باقی رہ گئی ہے جو اچھے خواب کی صورت میں ہے، اور جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے نیک بندوں کو آنے والے حالات و واقعات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ مگر شرعی مسئلہ یہ ہے کہ حجت اور دلیل صرف پیغمبر کا خواب ہے، یا وہ خواب جو کسی مومن نے دیکھا اور رسول اللہؐ نے سن کر اس کی توثیق فرما دی۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کیا تو بیداری میں اس خواب کو وحی الٰہی سمجھتے ہوئے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ یا جیسے دنیا بھر میں اسلام کا سب سے زیادہ اور ہر وقت گونجنے والا شعار اذان ہے جس کی بنیاد خواب پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے خواب میں ایک شخص کو اذان کے یہ کلمات بلند آواز سے پکارتے سنا اور انہوں نے جناب نبی اکرمؐ کو اپنے اس خواب سے آگاہ کیا جس پر رسول اللہؐ نے ہر نماز سے پہلے ان الفاظ کو اعلان کے طور پر بلند آواز سے پکارنے کا حکم دیا جو اذان کہلاتی ہے۔

جناب نبی اکرمؐ صحابہ کرامؓ کو اپنے خواب بتایا کرتے تھے اور ان کے خواب سن کر تعبیر سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں "کتاب التعبیر" کے نام سے مستقل باب قائم کیا ہے جس میں ساٹھ سے زیادہ روایات اس حوالے سے نقل کی ہیں۔ لیکن پیغمبر کے خواب یا پیغمبر کے سامنے پیش کیے جانے والے خواب کے سوا اور کوئی خواب اس معنٰی میں شرعی حجت اور دلیل نہیں ہے کہ اس پر کسی فیصلے یا حکم کی بنیاد رکھی جائے خواہ وہ کسی بھی شخصیت کا خواب ہو۔ البتہ خوشخبری اور کسی معاملہ کی پیشگی اطلاع کے طور پر خواب کی اہمیت وافادیت آج بھی موجود ہے۔

اس پس منظر میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے ایک خواب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اپنی معروف کتاب "فیوض الحرمین" میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ خواب ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو حرم پاک میں جمعہ کی شب کو دیکھا جس کے اہم امور یہ ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں پر کافروں کا غلبہ ہو گیا ہے، کافروں نے اہل اسلام سے ان کے ممالک اور اموال چھین لیے ہیں، ان کی اولادوں کو غلام بنا لیا ہے، اور مسلمانوں کے شہروں میں اسلام کے شعائر مغلوب اور کفار کے شعائر غالب ہو گئے ہیں۔ اس صورتحال پر اہل زمین اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا سامنا کر رہے ہیں اور شاہ صاحبؒ خواب کے دوران ملاء اعلیٰ میں غضب الٰہی کے مظاہر دیکھتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ خود بھی غیظ و غضب سے بھر گئے ہیں اور ان کے گرد ایسے لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا ہے جو غضب سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں مختلف ممالک کے لوگ ہیں، سوار بھی ہیں اور پیدل بھی ہیں۔

شاہ صاحبؒ اس خواب میں خود کو "قائم الزمان" کی صورت میں دیکھتے ہیں جس سے مراد وہ ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ

کسی نظام خیر کے نافذ کرنے کیلئے سبب کے طور پر ذریعہ بنا لیتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق دنیا میں نظام خیر کے قیام کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔ خواب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے گرد غیظ و غضب سے بھرے ہوئے دنیا بھر کے مسلمان جم غفیر کی صورت میں گھیرا ڈال کر ان سے سوال کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ فک کل نظام کہ تمام نظاموں کو توڑ پھوڑ دینا ہی اس وقت اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کا حکم ہے تاکہ دنیا کے تمام مروجہ نظاموں کا خاتمہ ہو اور قرآن و سنت کا نظام ان نظاموں کی جگہ لے سکے۔

تحریک ولی اللّٰہی سے تعلق رکھنے والے مختلف ارباب علم و دانش نے مختلف اوقات میں اس خواب کی مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جو اس وقت تک کے حالات کی روشنی میں ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس خواب کی وہ عملی تعبیر اب ظاہر ہوئی ہے جو امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کی صورت میں ہے۔ ہماری اس گزارش کو سمجھنے کیلئے حضرت شاہ صاحبؒ کے دور سے لے کر اب تک پیش آنے والے حالات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ دنیا کے مختلف بلکہ بیشتر مسلم ممالک پر کفر کی طاقتوں کا غلبہ قائم ہوا اور کم و بیش دو صدیوں تک قائم رہا۔ اسلامی احکام و قوانین منسوخ کر کے کفر و ظلم کے نظام مسلط کر دیے گئے، مسلمانوں کے اموال اور وسائل کا استحصال کیا گیا جو اب تک جاری ہے، دنیا بھر کے مسلمانوں کی عملی حالت غلاموں جیسی ہے، اور عالمی استعمار کے احکام اور فیصلوں کے سامنے وہ مکمل طور پر بے بس ہیں۔

کفر و استحصال کے اس غلبہ کے خلاف مختلف مسلم ممالک میں آزادی اور جہاد کی تحریکیں منظم ہوئیں جو عالمی کفر اور استعمار کے خلاف غیظ و غضب سے بھری ہوئی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت اور تحریک کو عالمی کفر کے خلاف بغاوت کیلئے اللہ تعالیٰ نے بطور سبب اور آلہ کے اختیار فرمایا، چنانچہ اسی جماعت نے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کو شکست دی، وسطی ایشیا اور افغانستان سے روسی استعمار کو پسپا کیا، اور آج امریکی استعمار کے خلاف سب سے مضبوط اور بے لچک تحریک کا پرچم بھی اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں رفتہ رفتہ تحریک ولی اللّٰہی کے اس ماٹو کی طرف آ رہی ہیں کہ فک کل نظام یعنی دنیا کے تمام مروجہ نظاموں کا مکمل خاتمہ کیے بغیر اسلام نافذ نہیں ہو سکتا اور دنیا کے کسی مروجہ نظام کے ساتھ اسلام کی ایڈجسٹمنٹ ممکن نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکری تحریک کا سب سے بڑا علمبردار دارالعلوم دیوبند ہے جس نے ایک سو چالیس سال کی جدوجہد کے ذریعے اسلامی تعلیمات و احکام اور تہذیب و ثقافت کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ جنوبی ایشیا کے لاکھوں مسلمانوں کو مختلف شعبوں میں اس کی حفاظت و ترویج اور نفاذ و غلبہ کیلئے تیار کیا ہے۔ اور اسی علمی و فکری تحریک کی ایک شاخ "طالبان" نے امارت اسلامی افغانستان میں فک کل نظام کا عملی مظاہرہ کر دکھایا ہے کہ اپنے ملک میں کفر کے ہر نظام کے اثرات کو مٹا ڈالا ہے اور ہر قسم کے مروجہ سسٹم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس سے قرآن و سنت کے شرعی نظام کے عملی اور حقیقی نفاذ کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔

طالبان کے طرز حکومت میں ہمارے بہت سے دوستوں کو شدت دکھائی دے رہی ہے اور وہ ان کے بعض اقدامات کو انتہا پسندانہ قرار دے رہے ہیں لیکن اگر وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ماٹو فک کل نظام کی روشنی میں دیکھیں تو اس بات کا انہیں بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا کے مروجہ نظاموں کے مکمل خاتمہ کے بغیر قرآن و سنت کے

احکام و قوانین کا عملی نفاذ اور خلافت اسلامیہ کا احیاء ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا کے مروجہ نظاموں کا خاتمہ طالبان حکومت کے طرز عمل کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور جو تحریکات اور فکری حلقے موجودہ عالمی سسٹم اور مروجہ نظاموں کے اسٹرکچر کے اندر رہتے ہوئے ایڈجسٹمنٹ اور مفاہمت کے ذریعے نفاذ اسلام کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہیں۔ ہمارے نزدیک امام ولی اللہ دہلویؒ کے اس تاریخی خواب کی عملی تعبیر اپنے آخری مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ دنیا میں اسلام کا دوبارہ نفاذ و غلبہ کی جدوجہد فک کل نظام کے الہامی ماٹو اور پرچم کے ساتھ کامیابی کی منزل تک پہنچے گی۔

جہادِ کشمیر اور جہادِ افغانستان کا موازنہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۳ اپریل ۲۰۰۱ء

پاکستان کے بعض علمی حلقوں اور شخصیات کو اشکال ہے کہ کشمیر کا جہاد افغانستان کی طرح کا نہیں ہے اس لیے کہ افغانستان میں جہاد کا فتویٰ علماء نے دیا تھا اور جہادی گروپ اس کی بنیاد پر روسی استعمار کے خلاف جہاد کر رہے تھے، جبکہ ان کے خیال میں کشمیری مجاہدین کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ اپنے عمل اور فیصلوں میں آزاد نہیں ہیں بلکہ ایجنسیوں کا کنٹرول ان پر حاوی ہے اور کنٹرولر قوت نے خود جہاد کا کوئی اعلان نہیں کیا، اس لیے ان حضرات کے نزدیک جہادِ کشمیر کو افغانستان کی طرح کے شرعی جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن میرے نزدیک اس کی حیثیت ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے کہ یہ مفروضہ صرف اس صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب جہادِ کشمیر کا نقطۂ آغاز موجودہ جہادی گروپوں کی حالیہ جدوجہد کو قرار دیا جائے جبکہ فی الواقع صورتحال یہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل تاریخی تناظر یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد کشمیری علماء نے جن میں امیر شریعت مولانا عبد اللہ کفل گڑھی، مولانا غلام حیدر جنڈالوی، مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا محمد عبد اللہ سیاکھوی، مولانا مظفر حسین ندوی اور دیگر سرکردہ علماء شامل تھے، ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا اور اس کی بنیاد پر خود میدان جہاد میں نکل کر آزادئ کشمیر کیلئے جہاد کا آغاز کیا تھا جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر کی موجودہ ریاست قائم ہوئی۔ اس کے بعد نہ ان علماء نے اپنا یہ فتویٰ واپس لیا اور نہ ہی کشمیری عوام آزادی کے مطالبہ اور جدوجہد سے دستبردار ہوئے۔

اس لیے جہادِ کشمیر کا موجودہ راؤنڈ اسی تسلسل کا حصہ ہے اور اس کی شرعی اساس بھی مذکورہ بالا علماء کرام کے اسی فتویٰ پر ہے جس کے ذریعے انہوں نے ڈوگرہ استعمار سے جنگ لڑ کر آزاد کشمیر کا خطہ آزاد کرایا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی جہادِ کشمیر میں زیادہ تر حصہ دینی جماعتوں، دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کرام کا ہے جو اصل فریق ہیں جبکہ حکومت پاکستان اور ایجنسیوں کی حیثیت آج بھی اسی طرح کے معاون کی ہے جس طرح کی معاونت ان کی طرف سے جہادِ افغانستان کو حاصل رہی ہے۔ البتہ سرحدی حالات اور علاقائی مجبوریوں کا دائرہ اس سے قطعی مختلف ہے اور وہی فرق بعض ذہنوں کو بلاوجہ

الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ جہادِ کشمیر کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنے والے حضرات اس مسئلہ کو وقتی حالات کی بجائے تاریخی تناظر کے وسیع دائرہ میں دیکھیں تو ان کا اشکال خود بخود رفع ہو جائے گا اور وہ بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ کشمیری عوام کی یہ جدوجہد شرعی جہاد کا درجہ رکھتی ہے جس کی حمایت و امداد ہماری دینی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

افغانستان کی موجودہ صورتحال کا پس منظر اور جناب حکمت یار کا انتخابی فارمولا

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ اپریل ۲۰۰۱ء

حزبِ اسلامی افغانستان کے سربراہ انجینئر گلبدین حکمت یار نے گذشتہ روز تہران میں پاکستانی رہنماؤں محترم قاضی حسین احمد، جناب وسیم احمد سجاد اور جناب الٰہی بخش سومرو سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے سربراہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر اگر الیکشن میں منتخب ہو جائیں تو وہ انہیں امیر المؤمنین تسلیم کر لیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ملا محمد عمر کو ایک خط میں فارمولا پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سربراہی میں عبوری حکومت قائم کریں جس میں تمام گروپوں کو نمائندگی دی جائے اور تمام اضلاع کے نمائندوں پر مشاورتی کونسل قائم کی جائے جو الیکشن کرائے۔ روزنامہ اوصاف کی رپورٹ کے مطابق جناب حکمت یار نے یہ بھی بتایا کہ ان کے خیال میں طالبان حکومت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی کیونکہ روس نے یورپی یونین کی مدد سے بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج تیار کر لی ہے جو طالبان پر حملہ کرنے والی ہے، اس دوران طالبان کے زیر قبضہ علاقوں میں اندرونی شورشیں بھی ہوں گی جن کی وجہ سے طالبان حکومت کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

انجینئر گلبدین حکمت یار افغانستان کے ان رہنماؤں میں شامل ہیں جنہوں نے افغانستان پر روسی استعمار کے تسلط کے خلاف جرأت مندانہ جنگ لڑی اور میدان جنگ میں روسی افواج کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سفارتی محاذ پر بھی روسی جارحیت کو بے نقاب کرنے کیلئے متحرک کردار ادا کیا۔ وہ حزب اسلامی افغانستان کے ایک مؤثر دھڑے کے سربراہ تھے یہی وجہ ہے کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جب افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں پر مشتمل مشترکہ حکومت تشکیل دی گئی تو انہیں اس کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ اس مشترکہ حکومت میں پروفیسر برہان الدین کو صدر، جناب حکمت یار کو وزیر اعظم اور کمانڈر احمد شاہ مسعود کو وزیر دفاع مقرر کیا گیا تھا لیکن یہ ٹیم مل جل کر ملک کے نظام کو نہ سنبھال سکی اور گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کی شخصی مخاصمت اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ مجاہدین کی حکومت مسلسل عدم استحکام کا شکار رہی بلکہ کابل جو گذشتہ جنگ کے دوران محفوظ رہ گیا تھا ان دونوں رہنماؤں کی اقتدار کی جنگ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ربانی، حکمت یار اور مسعود

پر مشتمل ٹیم میں انڈر اسٹینڈنگ ہوتی اور یہ تینوں رہنما باہمی اعتماد اور تعاون کے ساتھ ملک کا نظام سنبھالتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ:

- افغانستان کو ایک مستحکم حکومت نصیب ہوتی،
- مجاہدین کے باقی تمام گروپوں کیلئے ان کے ساتھ چلنے اور ان سے تعاون کرنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہتا،
- روس اور مجاہدین کی جنگ میں محفوظ رہنے والے کابل کی تباہی نہ ہوتی،
- اور طالبان ملیشیا کا سرے سے کوئی وجود نہ ہوتا۔

لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کی باہمی آویزش اور ایک دوسرے کو اقتدار میں غیر مؤثر بنانے کی کشمکش نے افغانستان کو روسی فوجوں کی واپسی کے بعد خوفناک خانہ جنگی سے دوچار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں انارکی پھیلی اور اس کے ردعمل میں طالبان ملیشیا نے جنم لیا جس نے تمام گروپوں کو ایک طرف کرتے ہوئے افغانستان میں خانہ جنگی ختم کر کے امن قائم کیا اور کابل، جلال آباد، مزار شریف، قندھار اور دیگر شہروں میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا جہادی لیڈروں کو میدان سے باہر کر دیا۔

آج امریکہ، بھارت، اسرائیل، روس اور یورپی یونین کو طالبان حکومت سے جہاں یہ تکلیف ہے کہ طالبان اسلام کے بارے میں بے لچک رویہ رکھتے ہیں اور انہوں نے کتابوں میں جس اسلام کو پڑھ رکھا ہے اسے کسی ردوبدل کے بغیر نافذ کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہاں اس کے ساتھ یہ بات بھی مغربی ممالک کیلئے تکلیف دہ ہے کہ طالبان کے آنے سے افغانستان کے بیشتر علاقے میں ایک گروپ کی حکومت قائم ہوگئی ہے جو اگر افغانستان کے باقی حصے پر بھی کنٹرول حاصل کر لیتی ہے تو یہ پورے افغانستان پر ون پارٹی گورنمنٹ ہوگی جس کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے مغرب اور اقوامِ متحدہ کو بہرحال اس کی ترجیحات اور موقف کا احترام کرنا ہوگا۔ اور حکومت میں مختلف گروپوں کی شمولیت کی صورت میں ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے اور بارگیننگ میں اپنے مفادات کیلئے راستے نکالنے کی سہولت مغربی ملکوں کو حاصل نہیں رہے گی۔ اسی وجہ سے اقوامِ متحدہ، امریکہ، روس اور دیگر عالمی طاقتیں مسلسل اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ وسیع البنیاد حکومت یا عوامی انتخابات کے عنوان سے مختلف گروپوں کو کسی نہ کسی طرح افغانستان کی حکومت میں شامل کرا دیا جائے تاکہ انہیں اپنے مفادات کا کھیل کھیلنے کیلئے اپنی مرضی کا وسیع میدان مل سکے۔ لیکن طالبان حکومت اس چال کو پوری طرح سمجھ رہی ہے اور مغربی ملکوں کو کوئی راستہ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔

جہاں تک ایک اسلامی حکومت اور امارت شرعیہ کیلئے عوامی اتحاد کے حامل ہونے کی بات ہے ہم اسے ضروری سمجھتے ہیں اور ہمارا موقف بھی یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور خلافت عوام کے اعتماد کے ساتھ ہی قائم ہو سکتی ہے جس کی واحد صورت اس دور میں الیکشن ہے۔ لیکن الیکشن کیلئے فضا کا سازگار ہونا اور کسی مناسب فریم ورک کا ہونا بھی ضروری ہے جس کیلئے افغانستان کے موجودہ حالات بالکل سازگار نہیں ہیں:

- افغان عوام مختلف ملکوں میں بکھرے پڑے ہیں،

- افغانستان کو عالمی اقتصادی پابندیوں کا سامنا ہے،
- انہیں امریکہ، روس، بھارت اور یورپی یونین کی پشت پناہی سے جاری شمال کی جنگ کا سامنا ہے،
- اور انہیں مختلف لابیوں اور قوتوں کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور مداخلت کی صورتحال درپیش ہے۔

ان حالات میں یہ کہنا کہ وہ پہلے الیکشن کرائیں اور اس کے بعد جناب حکمت یار ان کی حکومت کو تسلیم کریں گے دراصل طالبان حکومت کو یورپی یونین، امریکہ اور روس کے ایجنڈے کے سامنے سپر انداز ہونے کا مشورہ دینا ہے۔

پھر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ افغانستان سے روسی فوجوں کے چلے جانے اور افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی مشترکہ حکومت قائم ہو جانے کے بعد کابل اور افغانستان کو جس خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑا اور جو خوفناک تباہی پھیلی اس کے اصل فریق جناب حکمت یار اور احمد شاہ مسعود تھے اور ان کی باہمی اقتدار اور بالادستی کی جنگ میں جو خونریزی اور قتل وغارت ہوئی اس کی ذمہ داری میں یہ دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کی خانہ جنگی کے ردعمل میں ابھرنے والی طالبان ملیشیا ان میں سے ایک کے خلاف تو برسرپیکار رہے اور دوسرے کے سر پر فکری قیادت اور رہنمائی کا تاج سجادے۔

چنانچہ ہم بڑے ادب کے ساتھ جناب حکمت یار سے عرض کرنا چاہیں گے کہ ان کی اس حالیہ گفتگو نے بات واضح کر دی ہے کہ مقاصد اور نتائج کے حوالے سے ان کی اور احمد شاہ مسعود کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ جو مقاصد احمد شاہ مسعود عسکری قوت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں بالکل وہی مقاصد اور نتائج جناب حکمت یار سفارتی جنگ کے ذریعے حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک طالبان حکومت کے ساتھ ہمدردی یہ نہیں ہے کہ انہیں افراتفری کی اس فضا میں الیکشن کی راہ پر ڈال کر افغان عوام کو ایک نئے فکری انتشار سے دوچار کر دیا جائے اور افغان معاشرے میں مغربی حکومتوں اور لابیوں کی مداخلت کی راہیں تلاش کی جائیں۔ بلکہ افغان عوام اور ان کی اسلامی حکومت کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ:

- طالبان حکومت کو تسلیم کیا جائے، اسے مستحکم کرنے میں تعاون کیا جائے اور اس کے خلاف مغرب کے ایجنڈے اور عزائم کو واضح طور پر مسترد کرنے کا اعلان کیا جائے۔
- ایسے حالات پیدا کرنے میں ان کا ساتھ دیا جائے کہ وہ پورے افغانستان کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد افغان مہاجرین کی واپسی کا اہتمام کریں، ایک اسلامی حکومت کا دستور تشکیل دیں، حکومتی ڈھانچے اور نظام کے خدوخال طے کریں، اور اس کی روشنی میں عام انتخابات کرا کے عوامی اعتماد کی حامل حکومت کے قیام کی راہ ہموار کریں۔

باقی رہی بات روس اور یورپی یونین کی مدد سے بیس ہزار فوج کی تیاری اور طالبان حکومت کے خلاف اس کے حملہ آور ہونے کے پروگرام کی تو ہمارے نزدیک یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو افغان عوام کا مزید کوئی امتحان مقصود نہیں ہے اور وہ طالبان حکومت سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو طالبان اس مرحلہ سے بھی سرخروئی کے

ساتھ گزر جائیں گے اور امریکہ، روس اور یورپی یونین کا یہ گٹھ جوڑ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ان کیلئے کربلا اور بالاکوٹ جیسے مراحل تقدیر نے طے کر رکھے ہیں تو نظریاتی تحریکوں کو ان مراحل سے بھی بسا اوقات گزرنا پڑ جاتا ہے اور ہم جناب حکمت یار اور ان کی طرح روس، امریکہ اور یورپی یونین سے امیدیں وابستہ کر لینے والے حضرات سے بڑے ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہیں گے کہ بالاکوٹ میں سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے ذبح ہو جانے سے برصغیر پر فرنگی حکمرانوں کے تسلط کو جواز فراہم نہیں ہو گیا تھا اور نہ ہی ان شہداء کی جدوجہد کو منزل تک پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک سکی تھی۔

جہاد کے بارے میں چند اشکالات کا ازالہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۱ء

محترم جاوید احمد غامدی کے بعض ارشادات کے حوالے سے جو گفتگو کچھ عرصے سے چل رہی ہے اس کے ضمن میں ان کے دو شاگردوں جناب معز امجد اور ڈاکٹر محمد فاروق خان نے ماہنامہ اشراق لاہور کے مئی ۲۰۰۱ء کے شمارے میں کچھ مزید خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جناب غامدی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ جہاد کے اعلان کا حق اسلامی ریاست کے سوا کسی کو نہیں ہے جس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ اگر کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط قائم ہو جائے اور اسلامی ریاست کا وجود ہی ختم ہو جائے تو علماء کرام اور دینی قیادت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کافرانہ تسلط کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مزاحمت کریں اور اسلامی اقتدار بحال کرنے کی کوشش کریں۔ جیسا کہ یمن پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی اسود عنسی نے قبضہ کر لیا تھا اور حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے گوریلا طرز پر شب خون مار کر اسود عنسی کو قتل کر دیا تھا جس سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس لیے اب بھی ایسی صورت میں کافروں کے تسلط کا شکار ہونے والے مسلمانوں کیلئے شرعی مسئلہ یہی ہے کہ وہ اس تسلط کو قبول نہ کریں، اس کے خاتمہ کیلئے جو ان کے بس میں ہو کر گزریں اور اس سلسلے میں ان کی جدوجہد کو شرعی جہاد کا درجہ حاصل ہو گا۔

معز امجد صاحب نے ہمارے استدلال کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جیسا کہ مولانا نے بیان فرمایا ہے"۔ لیکن خود انہوں نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اس بات کو من و عن تسلیم کیا گیا ہے کہ اسود عنسی کو حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے قتل کیا تھا جس سے اس کی حکومت ختم ہو کر مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گئی تھا البتہ اتنے واقعہ کو بعینہ تسلیم کرتے ہوئے معز امجد صاحب نے اس میں دو اضافے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو اس کارروائی کا حکم خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد اس مسئلہ پر یمن کے مسلمانوں کا اجتماع ہوا

جس میں اسود عنسی کے خلاف کاروائی کیلئے اجتماعی مشاورت ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تفصیل سے ہمارے بیان کردہ واقعہ کی تردید کس طرح ہوگئی جسے موصوف اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ واقعہ تو وہ بھی وہی بیان کر رہے ہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ کارروائی حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے از خود نہیں کی تھی بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور دوسرے مسلمانوں کے مشورہ سے کی تھی تو اس سے ہمارے موقف کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر اس کی وضاحت سے قبل اس امر کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیروز دیلمیؓ کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی اس ہدایت کا ہمیں بھی علم تھا لیکن چونکہ وہ روایت جناب غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق "خبریت" کے قابلِ قبول معیار پر پوری نہیں اترتی تھی اس لیے ہم نے اس کا حوالہ نہیں دیا اور نفس واقعہ کا ذکر کر دیا۔ البتہ مسلمانوں کی مشاورت کا واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا جس کا معز امجد صاحب نے ذکر کیا ہے، معلومات میں اس اضافے پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ویسے استنباط و استدلال، تعبیر و تشریح اور اصول سازی کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کا یہ فائدہ تو ہوتا ہی ہے کہ جس بات پر جی چاہا اسے قبول کر لیا اور جسے ذہن نے قبول نہ کیا اس سے انکار کر دیا۔ جی نہ چاہا تو رجم کے بارے میں بخاری اور مسلم کی روایات قابل قبول قرار نہ پائیں اور کہیں "گیئر" پھنس گیا تو "اصابہ" کی روایت کا سہارا لینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوا۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

واقعات کی ان تفصیلات کو تسلیم کرتے ہوئے جو جناب معز امجد صاحب نے بیان کی ہیں ہماری گزارش ہے کہ اس سے ہمارا یہ موقف مزید پختہ ہوگیا ہے کہ کسی مسلم علاقہ پر کافروں کے تسلط کی صورت میں وہاں کے مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس تسلط کے خاتمہ کیلئے جدوجہد کریں اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت یہی ہے جو حافظ ابن حجرؒ کی اصابہ کے حوالے سے معز امجد صاحب نے نقل کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو اسود عنسی کے خلاف کاروائی کا حکم دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معز امجد صاحب کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بحیثیت حاکم دیا تھا اور ہمارے نزدیک اس میں ان کی پیغمبرانہ حیثیت بھی شامل ہے۔ اس لیے اب بھی اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط ہو جائے تو وہاں کے مسلمانوں کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور حکم وہی ہے جو یمن کو اسود عنسی کے تسلط سے آزاد کرانے کیلئے حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو دیا گیا تھا۔

پھر یہ نکتہ بھی یہاں قابلِ غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر صوبہ میں بغاوت کو کچلنے کیلئے صرف ریاستی کاروائی کرنا ہوتی تو اس کیلئے فوج کشی مدینہ منورہ سے ہوتی مگر نبی اکرمؐ ریاست کی طرف سے یہ فوج کشی کرنے کی بجائے یمن کی مقامی آبادی کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ اسود عنسی کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ "اصابہ" کی جس روایت کا معز امجد صاحب نے حوالہ دیا ہے اس کے مطابق نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دیلیؓ اور ان کے رفقاء کو اسود عنسیؒ کے خلاف "محاربہ" کا حکم دیا ہے۔ اب محاربہ کے معنی و مفہوم کے بارے میں اور کسی کو تردد ہو تو ہو مگر غامدی صاحب کے شاگردوں سے یہ توقع نہیں کی ہو سکتی کہ وہ اس کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معز امجد

صاحب اس واقعہ کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کے پیچھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و ہدایت کا تذکرہ بھی کرتے ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس واقعہ کو جہاد کی حیثیت دینے میں تامل انہیں ہے جیسا کہ ان کا ارشاد گرامی ہے کہ:

> ''یہ جابر و غاصب قوم کے خلاف گروہ بندی اور جتھا بندی کر کے جہاد کرنے کا واقعہ نہیں بلکہ ایک غاصب حکمران کے قتل کا واقعہ ہے۔ گروہ بندی اور جتھا بندی کر کے جہاد کرنا اور کسی (اچھے یا برے) حکمران کے قتل کی سازش کرنا دو بالکل الگ معاملات ہیں۔''

واقعہ کی ان تفصیلات کو ایک بار پھر ترتیب وار دیکھ لیں جو خود معز امجد صاحب نے بیان کی ہیں کہ یمن میں اسود عنسی کے تسلط کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے یمن کے لوگوں کو اس کے خلاف محاربہ کا حکم دیا۔ اس حکم کے بعد یمن کے مسلمانوں کا مشاورتی اجتماع ہوا جس میں اسود عنسی کے خلاف کارروائی کے فریقوں کا جائزہ لیا گیا، اس کے بعد حضرت فیروز دیلمیؓ، حضرت قیس بن مکشوحؓ اور حضرت دادویہؓ نے گروپ بنایا اور اسود عنسی کے حرم میں زبردست شامل کی جانے والی خاتون آزادؓ کے ساتھ ساز باز کر کے اسود عنسی کو قتل کر دیا۔ اور پھر معز امجد صاحب کے حوصلہ کی داد دیجئے کہ اس سب کچھ کے باوجود ان کے نزدیک اس کاروائی کو شرعی جہاد کی حیثیت حاصل نہیں ہے اور وہ اسے ''محض ایک غاصب حکمران کے قتل کی سازش'' ہی تصور کر رہے ہیں۔ اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ واقعہ کی یہ ساری تفصیلات خود بیان کرنے کے بعد معز امجد صاحب اس سے نتیجہ یہ اخذ کر رہے ہیں کہ:

> ''اس ساری کارروائی کا عملی ظہور اسود عنسی کے اپنے گروہ میں پھوٹ پڑنے اور اس کے اپنے ہی عمال کی طرف سے اس کے قتل کو کامیاب بنانے کی صورت میں ہوا۔''

اس ذہنی گورکھ دھندے پر اس کے سوا کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے کہ:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہم نے عرض کیا تھا کہ دمشق پر تاتاریوں کی یلغار کے موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا جو کسی ریاستی نظام کے تحت نہیں بلکہ آزادانہ حیثیت سے تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ اگر حالات ایسی صورت اختیار کر لیں تو علماء کو حق حاصل ہے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور امت کی عملی قیادت کریں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے اس واقعہ کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ ابن تیمیہؒ نے یہ فتویٰ دے کر ریاستی نظام کو سہارا دیا تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اور نہ ہی اس سے ہمارے موقف میں کوئی فرق ہی پڑتا ہے۔ اصل بات اپنی جگہ قائم ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے یہ فتویٰ کسی ریاستی نظم کے تحت دیا تھا یا آزادانہ حیثیت سے اپنی دینی و علمی ذمہ داری سمجھتے ہوئے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا؟ اس بات کی کوئی وضاحت ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے الجزائر کی جنگ آزادی کی تاریخ یوں بیان کی ہے کہ ۱۹۵۴ء میں محاذ حریت وطنی قائم ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں قاہرہ میں فرحت عباس کی سربراہ میں الجزائر کی جلاوطن حکومت قائم ہوئی اور ۱۹۶۲ء میں الجزائر آزاد ہو گیا۔ یہ

ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا اور اس کی پشت پر علماء کے مسلسل جہاد آزادی، بالاکوٹ اور شاملی کے معرکوں، قبائلی عوام کی جنگ، حاجی شریعت اللہؒ، سردار احمد خان کھرلؒ، حاجی صاحب ترنگ زئیؒ اور تیتو میرؒ کے معرکہ ہائے حریت اور لاکھوں علماء کرام اور عوام کی جانوں کی قربانیوں کو یوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے ان واقعات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی ۱۹۵۴ء میں شروع ہو کر صرف آٹھ سال میں منزل تک نہیں پہنچ گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے لاکھوں مجاہدین آزای کا خون ہے اور ان میں وہ غریب مولوی بھی شامل ہیں جن کا نام لیتے ہوئے محترم غامدی صاحب کے شاگردوں کو نہ جانے کیوں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ الشیخ عبدالحمید بن بادیسؒ اور الشیخ ابراہیمیؒ تو جہاد آزادی کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دے کر اور جمعیۃ العلماء الجزائر قائم کر کے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ انہی علماء کی وجہ سے لاہور میں الجزائر کے جہاد آزادی کی حمایت میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قیادت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کی مہم چلائی گئی تھی۔ الجزائر کی آزادی کے بعد الشیخ ابراہیمیؒ لاہور تشریف لائے تھے جن کا شاندار استقبال کیا گیا تھا اور الشیخ بن بادیسؒ کی انہی خدمات کے اعتراف میں لاہور میونسپل کارپوریشن نے ایک سڑک کو بن بادیس روڈ کے نام سے موسوم کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے مگر کیا مجال کہ کسی غریب مولوی کا نام ان کی نوک قلم پر آنے پائے سوائے مولوی محمد یونس خالص کے کہ ان کا تذکرہ انجینئر گلبدین حکمت یار کی جماعت میں تفریق بیان کرنے کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔ حالانکہ مولوی محمد نبی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی نصر اللہ منصور اور مولوی ارسلان رحمانی جہاد آزادی کے عملی قائدین میں سے ہیں۔ جبکہ مولوی جلال الدین حقانی نے خوست چھاؤنی کی فتح میں اور مولوی ارسلان رحمانی نے ارگون چھاؤنی کی فتح میں مجاہدین کی خود کمان کی تھی۔ لیکن چونکہ مولویوں کے تذکرے سے جہاد کی شرعی حیثیت کا تاثر ابھرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے صرف جنگ آزادی کی حد تک دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے مولویوں کا تذکرہ ہی سرے سے غائب کر دیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی افغانستان پر پابندیاں اور "الرشید ٹرسٹ" کا جرأت مندانہ فیصلہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ جون ۲۰۰۱ء

ایک قومی روزنامہ نے لندن کے اخبار ٹیلی گراف کے حوالے سے یہ رپورٹ شائع کی ہے کہ برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا نے پاکستان کے وزیر خارجہ جناب عبدالستار سے اپنی حالیہ گفتگو میں خبردار کیا ہے کہ پاکستان طالبان کے ساتھ فاصلہ قائم رکھے ورنہ وہ عالمی برادری سے دور ہوتا چلا جائے گا۔

یہ انتباہ ایسے موقع پر کیا گیا ہے جب کہ اقوامِ متحدہ نے کابل میں بے سہارا افغان عوام کو خوراک مہیا کرنے کیلئے قائم کی گئی ۱۵۵ بیکریاں (تنور) بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ ان بیکریوں پر کام کرنے والے اہل کاروں بالخصوص عورتوں کے سلسلہ میں افغانستان کی طالبان حکومت اپنے مقامی قوانین پاسداری کرنے کی بجائے اقوامِ متحدہ کے قوانین کا اطلاق قبول کرے۔ جس کے بارے میں طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات کئی بار کہہ چکے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے متعدّد قوانین اور ضابطے شریعت اسلامیہ سے متصادم ہیں اور وہ اسلام کے قوانین و احکام کے خلاف کسی قانون یا قاعدہ کو قبول نہیں کر سکتے۔

اقوامِ متحدہ کے ان تنوروں کے ذریعے کابل کے تقریباً پونے تین لاکھ افراد کو خوراک مہیا کی جا رہی تھی جن میں غربا، مساکین اور بیوائیں شامل ہیں لیکن اقوامِ متحدہ نے ان بے کس اور افلاس زدہ افغان عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کی بجائے اپنے قوانین و احکام پر عملدرآمد کو ترجیح دی ہے۔ جس سے ایک بار پھر واضح ہو گیا ہے کہ افغانستان میں جنگ زدہ عوام کی امداد اور بحالی کے نام پر اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک کے پروگراموں کا اصل مقصد افغان عوام کی امداد اور ان کی ناگزیر ضروریات کو پورا کرنا نہیں بلکہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے قوانین اور کلچر کو ان پر مسلط کرنا ہے اور انہیں بہر حال مغربی ثقافت اور کلچر کو قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ مگر طالبان حکومت ہر قسم کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین کے ساتھ اپنی دوٹوک کمٹمنٹ کا بار بار اعلان کر رہی ہے اور وہ اس بارے میں لالچ یا خوف کے کسی حربے کو کارگر ہونے کا موقع نہیں دے رہی۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے ان تنوروں کو بند کر دینے کے اعلان کے بعد بھی طالبان حکومت کے وزراء نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کا مقصد شرعی قوانین میں لچک پیدا کرنے کیلئے دباؤ ڈالنا ہے مگر طالبان حکومت نے اس سلسلہ میں کسی بھی دباؤ کو قبول کرنے کا حتمی فیصلہ کر رکھا ہے اور اس کیلئے وہ کوئی بھی قربانی دینے کیلئے تیار ہے۔

مغربی ممالک نے امریکہ کی قیادت میں اقوامِ متحدہ کی چھتری تلے طالبان حکومت کو دنیا مین یکہ و تنہا کر دینے اور افغان عوام کو بھوکا مارنے کا یہ پروگرام ایک عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اور برطانوی وزیر خارجہ کی طرف سے پاکستان کو طالبان کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے کے اس انتباہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاکستان سے طالبان حکومت کو جو حمایت، امداد اور پشت پناہی فراہم ہو رہی ہے اس کا راستہ بند کیا جا سکے۔ کیونکہ مغربی حکومتیں بجا طور پر یہ سمجھتی ہیں کہ اگر پاکستان کی طرف سے طالبان حکومت کے ساتھ تعاون اور حمایت کا سلسلہ جاری رہا تو اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک کی پابندیاں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی اسی لیے وزیر خارجہ جناب عبدالستار کو براہ راست گفتگو میں یہ انتباہ کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ لیکن جیک سٹرا کو یہ معلوم نہیں کہ پاکستان صرف حکومت کا نام نہیں بلکہ اس ملک میں کروڑوں ایسے مسلمان بستے ہیں جو طالبان حکومت کے ساتھ محبت اور عقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں، پاکستان میں دینی حلقے ہیں جنہوں نے افغان جہاد میں اپنے افغان بھائیوں کی مکمل پشت پناہی کی ہے، ہزاروں علماء، طلبہ اور دینی کارکنوں نے روسی استعمار کے خلاف لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا ہے اور وہ اب بھی جہاد افغانستان کے نظریاتی و منطقی نتائج کی تکمیل کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس لیے اقوامِ متحدہ یا جیک سٹرا کے کہنے پر حکومت اگر طالبان کے ساتھ فاصلے قائم کرنے یا رکھنے کی کوئی حکمت عملی

طے کرتی ہے تو وہ صرف اسی کے دائرہ تک محدود رہے گی اور پاکستان کے دینی حلقوں اور مسلمانوں کے جو تعلقات محبت وعقیدت طالبان کے ساتھ استوار ہو چکے ہیں انہیں ختم یا کم کرنا اب کسی کے بس میں نہیں رہا۔ اور یہ بات نظری اور خیالی نہیں بلکہ اس کی عملی مثال بھی سامنے آچکی ہے کہ کراچی کے ''الرشید ٹرسٹ'' نے اقوامِ متحدہ کی کابل میں بند کی جانے والی ۱۵۵ بیکریوں کا انتظام سنبھالنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں الرشید ٹرسٹ کے نمائندے طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مل کر عملدرآمد کیلئے سروے مہم کا آغاز کر چکے ہیں۔

الرشید ٹرسٹ ایک عرصہ سے حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کی سرپرستی میں افغانستان اور دیگر علاقوں میں مظلوم اور بے سہارا مسلمانوں کی اداد اور بحالی کیلئے سرگرم عمل ہے اور وقیع خدمت سرانجام دے رہا ہے، لیکن اس کی طرف سے اقوامِ متحدہ کے بند کیے ہوئے تنوروں کا انتظام سنبھالنے کا یہ فیصلہ فی الواقع بہت بڑا ہے جس پر بی بی سی نے بھی حیرت کا اظہار کیا ہے۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ پونے تین لاکھ افراد کو مستقل بنیادوں پر خوراک کی فراہمی ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کیلئے ہر ماہ اڑھائی ہزار ٹن گندم درکار ہوگی اور سالانہ لاگت آٹھ ملین ڈالر کے لگ بھگ پہنچ سکتی ہے۔ مگر الرشید ٹرسٹ نے ایک حالیہ نشریہ میں کہا ہے کہ وہ دیندار اور مخیر مسلمانوں کے تعاون سے اس خدمت کو سرانجام دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الرشید ٹرسٹ نے یہ اعلان کر کے بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہے اور اقوامِ متحدہ پر واضح کیا ہے کہ پاکستان کے عوام اور دینی حلقے افغانستان میں اسلامی قوانین پر مکمل عملدرآمد یا ان میں مغربی ممالک کی خواہش کے مطابق لچک پیدا کرنے کی اس کشمکش میں نہ صرف افغان عوام کے ساتھ ہیں بلکہ ان کی بھرپور عملی امداد اور پشت پناہی کیلئے بھی تیار ہیں۔ لیکن الرشید ٹرسٹ کو اس میدان میں تنہا چھوڑ دینا بھی دانش و حمیت کی بات نہیں ہوگی اس لیے ہم دیگر رفاہی اداروں اور دینی حلقوں سے گزارش کریں گے کہ وہ بھی صورتحال کی نزاکت اور سنگینی کو محسوس کریں اور اپنے افغان بھائیوں کی مدد، حمایت اور پشت پناہی کیلئے آگے بڑھیں جنہیں دنیائے کفر صرف اس لیے بھوکا مارنے پر تل گئی ہے کہ وہ اسلامی احکام و قوانین پر ہر حالت میں عمل کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی دباؤ قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ کی پاکستان کو طالبان سے فاصلہ رکھنے کی ہدایت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۱ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۹ جون ۲۰۰۱ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی وزارتِ خارجہ نے حکومتِ پاکستان سے کہا ہے کہ وہ طالبان حکومت کے ساتھ فاصلہ رکھے اور طالبان کی حمایت سے باز رہے ورنہ اسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس سے قبل برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا بھی پاکستان کے وزیر خارجہ جناب عبد الستار کے ساتھ گفتگو میں یہ بات کہہ چکے

ہیں۔

امریکہ اور دیگر مغربی ممالک طالبان کی بے لچک اسلامی پالیسیوں سے نالاں ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہے کہ پاکستان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے طالبان حکومت کو اسلامی قوانین کے نفاذ میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کیا جائے۔

- لیکن ایک طرف طالبان حکومت نے دوٹوک اعلان کر دیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کی لچک پیدا نہیں کریں گے اور نہ ہی اس حوالے سے کسی کا دباؤ قبول کریں گے،
- اور دوسری طرف حکومتِ پاکستان کے ذمہ دار حضرات متعدّد بار واضح کر چکے ہیں کہ وہ طالبان حکومت سے برابری کی سطح پر ہی بات کر سکتے ہیں، اور ان کی مرضی کے خلاف ان سے کوئی بات دباؤ کے ساتھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

یہ صورتحال امریکہ اور اس کے حواری ممالک کیلئے پریشان کن ہوتی جا رہی ہے اور وہ تمام تر عالمی اثر و رسوخ اور سطوت و حشمت کے باوجود امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے بارے میں بے بسی محسوس کرتے ہوئے مسلسل دانت پیس رہے ہیں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ طالبان حکومت اگر اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے اپنے عزم پر قائم رہتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور وہ بالآخر دنیا کو ایک بار پھر اسلام کے عادلانہ نظام کا عملی نقشہ اور اسلامی سوسائٹی کی عملی شکل دکھانے میں کامیاب ہوں گے۔

امریکی نائب وزیر خارجہ کا دورۂ پاکستان

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۱ء

جنوبی ایشیا کیلئے امریکہ کی نائب وزیر خارجہ محترمہ کرسٹینا روکا ان دنوں جنوبی ایشیا کے دورے پر ہیں اور جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں وہ اسلام آباد میں پاکستانی حکام سے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ جبکہ امارت اسلامی افغانستان کے سفیر محترم ملا عبدالسلام ضعیف سے بھی ان کی ملاقات ہونے والی ہے۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد کرسٹینا روکا کا یہ پہلا دورۂ پاکستان ہے اور اخباری اطلاعات کے مطابق ان کے ایجنڈے میں

1. پاکستان میں جمہوریت کی بحالی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی روک تھام،
2. افغانستان کے خلاف اقوامِ متحدہ کی پابندیوں پر مؤثر عمل درآمد،
3. عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا سوال،
4. اور کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے

کے مسائل سرفہرست ہیں جن کے بارے میں وہ متعدّد بیانات میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں۔

جنوبی ایشیا کے حوالے سے امریکہ کا یہ ایجنڈا کوئی نیا نہیں ہے اور نہ امریکہ میں حکومت کی تبدیلی اور کلنٹن کی جگہ

جارج ڈبلیو بش کی بطور صدر آمد سے اس ایجنڈے اور اس کے حوالے سے امریکہ کی قومی پالیسی میں کوئی فرق سامنے آیا ہے۔ امریکہ کے ایجنڈے کی بنیاد اس کے اس زعم پر ہے کہ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور واحد سپر پاور ہے اس لیے دنیا کے ہر خطے میں سیاست و معیشت اور قانون و عدالت سے لے کر اخلاق و معاشرت تک تمام شعبوں میں اس کی مرضی، خواہش اور پالیسی پر عمل ہونا چاہیے اور دنیا کے ہر ملک اور قوم کو صرف اور صرف امریکی مفادات کے تحفظ اور تکمیل کے حوالے سے اپنی پالیسیاں مرتب کرنی چاہئیں۔ امریکہ اپنی اس بالادستی کیلئے انسانی حقوق کے نعرے، جمہوریت کے پرچار اور اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے لیکن یہ محض فریب کاری ہے جس کا صرف دو عملی مثالوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

1. ایک یہ کہ امریکہ پاکستان میں جمہوری عمل کی جلد بحالی کا خواہاں ہے اور پاکستان میں آنے والی نئی امریکی سفیر نے صاف طور پر کہا ہے کہ بطور سفیر ان کی پہلی ترجیح پاکستان میں جمہوری عمل کی بحالی ہوگی۔ لیکن مشرق وسطیٰ کے ممالک میں امریکہ کو جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور چونکہ وہاں شخصی آمریتیں اور بادشاہتیں امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو رہی ہے اس لیے امریکہ کے نزدیک ان ممالک کے عوام کی سیاسی آزادیوں، شہری حقوق اور جمہوری تقاضوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور امریکہ پورے مشرق وسطیٰ میں آمریتوں اور بادشاہتوں کا سب سے بڑا محافظ بنا ہوا ہے۔
2. دوسری مثال بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسرائیل اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور فیصلوں کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتا چلا آرہا ہے اور اب بھی اعلانیہ خلاف ورزی کر رہا ہے لیکن اسرائیل کو ان خلاف ورزیوں سے روکنے کیلئے اقوامِ متحدہ کی مانیٹرنگ ٹیموں کو مشرق وسطیٰ بھجوانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جبکہ اس کے برعکس افغانستان کی سرحدوں پر صرف اس لیے اقوامِ متحدہ کی مانیٹرنگ ٹیمیں بھجوانے کیلئے امریکہ سب سے زیادہ متحرک ہے کہ امریکہ کے اندازوں، توقعات اور خواہشات کے علی الرغم افغانستان کے عوام اقوامِ متحدہ کی اقتصادی پابندیوں کے باوجود اس طرح بھوکے نہیں مر رہے جس طرح امریکہ انہیں بھوکا مار کر اپنے سامنے جھکانا چاہتا تھا، اور وہاں نہ صرف طالبان کی حکومت کاروبار حکومت پورے اعتماد کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ افغان عوام کو طالبان حکومت کے خلاف بھڑکانے اور بغاوت پر آمادہ کرنے کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہو رہا۔

امریکی پالیسوں میں کھلے تضاد کی یہ دو واضح مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن کی بنیاد پر یہ بات کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جمہوریت، انسانی حقوق، امن اور معاشرتی ترقی کے حوالے سے امریکہ کے نعرے اور دعوے کسی اصول اور فلسفہ کے فروغ کیلئے نہیں بلکہ محض اپنے مفادات کے حصول اور تحفظ کیلئے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک یہی سب سے بڑی وجہ ہے اس امر کی کہ امریکہ کو تمام تگ و دو کے باوجود دنیا پر اپنی پالیسیاں ہر حال میں مسلط کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی

اور دنیا کے ہر خطے میں اس کی مخالفت اور اس کے خلاف نفرت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ہم امریکی حکمرانوں سے گزارش کریں گے کہ وہ جنوبی ایشیا کے ممالک پر اپنی یک طرفہ پالیسیاں طاقت کے زور پر مسلط کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کریں اور دوسروں کے خلاف طاقت اور دباؤ کے اندھا دھند استعمال کے بجائے اپنی پالیسیوں کے تضادات اور طرز عمل کے دوغلے پن کا جائزہ لیں۔ محض طاقت کا استعمال نہ پہلے کبھی انسانی تاریخ کے کسی دور میں اپنے مطلوبہ اور مزعومہ مقاصد حاصل کر سکا ہے اور نہ اب کسی کو محض قوت اور طاقت کے سہارے اپنے مزعومہ مقاصد تک پہنچنے کی توقع کرنی چاہیے۔

افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور طالبان کا موقف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۷ اگست ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق:

> ”افغانستان میں طالبان نے ”شیلٹر ناؤ“ نامی انٹرنیشنل تنظیم کے دفاتر کو بند کر دیا اور عملے کے چوبیس افراد کو گرفتار کر لیا جن میں چھ غیر ملکی خواتین اور دو غیر ملکی مرد بھی شامل ہیں۔ بی بی سی کے مطابق عملے کے ایک افغان اہلکار کے گھر سے بائبل ملی اور ایک کمپیوٹر اور کمپیوٹر ڈسکس جن میں بائبل کا مواد ہے۔ یہ گرفتاری انتہائی سنگین نوعیت کا معاملہ ہے چونکہ جنوری میں طالبان کا فتویٰ آ چکا ہے کہ اسلام چھوڑنے والے افغانیوں کیلئے سزا موت ہوگی اور کسی افغانی کو تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ کرنا ریاست کے خلاف جرم ہو گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس فتویٰ کے تحت کاروائی ہوئی ہے۔ افغانستان میں شیلٹر ناؤ انٹرنیشنل کے عملے میں تیرہ غیر ملکی افراد ہیں جو خوراک کی فراہمی اور بہبودِ آبادی کے کام میں مصروف ہیں۔“

افغانستان کے بارے میں ایک عرصہ سے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ خوراک کی فراہمی اور انسانی ہمدردی کے دیگر امور کی انجام دہی کے نام سے جو غیر ملکی این جی اوز وہاں کام کر رہی ہیں ان میں سے بعض عیسائیت کی تبلیغ اور افغان عوام کو مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے میں مصروف ہیں۔ اور بعض خبروں کے مطابق بہت سے افغانوں کو ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائی بنا لیا گیا ہے۔ اس خبر سے ان باتوں کی تصدیق ہوگئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے عالمی ادارے اور ورلڈ میڈیا ایک بار پھر امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف پروپیگنڈا اور طالبان حکومت پر دباؤ بڑھانے کی کاروائیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔

جبکہ طالبان حکام کا کہنا ہے کہ بیرونی این جی اوز کو ایک معاہدہ کے تحت افغانستان میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جس میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ریاست کے سرکاری مذہب اسلام کے خلاف کسی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوں گے، اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کے خلاف افغانستان کے رائج الوقت قانون کے تحت کاروائی کی جائے

گی۔ اس لیے ان گرفتار افراد نے افغانستان کے قانون اور مذکورہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اور انہیں معاہدہ کے مطابق سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان حکومت کا یہ اقدام بالکل جائز اور منصفانہ ہے، اس لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اسلام میں مرتد ہونے اور ارتداد پھیلانے کی شرعی سزا موت ہے، اور اسلام ہی افغانستان کا رائج الوقت دستور و قانون ہے جس کی پابندی کا ان این جی اوز نے افغانستان کی حکومت سے معاہدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اس مسلّمہ بین الاقوامی قانون کے تحت کہ کسی بھی ملک میں معاہدہ کے تحت جانے والوں کو معاہدہ اور اس ملک کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے، غیر ملکی این جی اوز کو افغانستان میں مذہبی تبلیغ اور ارتدادی سرگرمیوں کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اور اگر انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے تو انہیں اس کی سزا ملنی چاہیے تاکہ اور کسی کو اس قسم کی خلاف ورزی کی جرات نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ صرف افغانستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے بہت سے مسلم ممالک کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ افغانستان میں اسلامی نظریاتی حکومت موجود ہے اس لیے اس نے اس کا نوٹس لے لیا ہے جبکہ بنگلہ دیش، نائجیریا اور انڈونیشیا سمیت بہت سے مسلمان ملکوں میں اور خاص طور پر پاکستان میں کام کرنے والی سینکڑوں این جی اوز کی سرگرمیاں بھی مسلمانوں کو ان کے مذہب، عقائد اور کلچر سے بیگانہ کرنے اور باغی بنانے کی مساعی پر مشتمل ہیں۔ اور بعض این جی اوز تو کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کو مرتد بنا رہی ہیں۔

اس لیے مسلمان حکومتوں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو اس قسم کی ارتدادی سرگرمیوں کی روک تھام کیلئے عالمی سطح پر کوئی مؤثر حکمتِ عملی طے کرنی چاہیے۔

پاک افغان سرحد کی نگرانی کیلئے اقوامِ متحدہ کی ٹیمیں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۱ء

۹ اگست ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں افغان ڈیفنس کونسل کا اہم اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا سمیع الحق نے کی، جبکہ مولانا فضل الرحمان، مولانا فداء الرحمان درخواستی، جناب لیاقت بلوچ، جنرل (ر) کے ایم اظہر، جنرل (ر) حمید گل اور مولانا محمد احمد لدھیانوی سمیت مختلف دینی جماعتوں کے زعماء نے اس میں شرکت کی، اور امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی مانیٹرنگ کیلئے پاک افغان سرحد پر اقوامِ متحدہ کی مانیٹرنگ ٹیموں کی تعینات کو پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی۔ اجلاس میں حکومتِ پاکستان سے مانیٹرنگ ٹیموں کو مسترد کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ ان ٹیموں کی سرگرمیوں کی مزاحمت کی جائے گی۔

جبکہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۹ اگست ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق قبائلی علاقہ میں مولانا امان اللہ خان کی زیر صدارت

منعقد ہونے والے جمعیت علماء اسلام کے کنونشن میں اعلان کیا گیا ہے کہ قبائلی علاقوں میں اقوامِ متحدہ کی مانیٹرنگ ٹیموں کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور ان ٹیموں کے افراد اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ اور امریکہ کی معاندانہ کاروائیوں کے خلاف امارتِ اسلامی افغانستان کی حمایت میں پاکستان کے دینی حلقوں کی یہ بیداری نیک فال اور خوش آئند ہے، لیکن اسے مزید منظم کرنے اور اس کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے مظلوم افغان بھائیوں کی پشت پناہی کا فرض بروقت ادا کر سکیں۔

سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی قیادت کی آزمائش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ ستمبر ۲۰۰۱ء

گیارہ ستمبر کو امریکہ کے دو بڑے شہروں نیویارک اور واشنگٹن میں جو قیامتِ صغریٰ بپا ہوئی ہے اس نے ظاہری طور پر دکھائی دینے والے معروضی حقائق کا نقشہ ایک بار پھر پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل بھی تاریخ نے کئی بار یہ منظر دیکھا ہے کہ حالات و واقعات کا ظاہری منظر کچھ اور نظر آ رہا ہے مگر سمندر کی پر سکون سطح کی تہہ میں کسی طوفان نے جب انگڑائی لی ہے تو سطح سمندر اور اس پر نظر آنے والا پورا منظر ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔

نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں نے ۱۹۸۷ء میں دیکھا جب مولانا میاں محمد اجمل قادری مجھے سیر و سیاحت کیلئے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے تھے۔ تب میرے ہم زلف محمد یونس صاحب نئے نئے نیویارک میں آباد ہوئے تھے اور وہی ہمارے میزبان تھے۔ ہم ایک روز ورلڈ ٹریڈ سنٹر دیکھنے گئے، اتنی بلند و بالا اور پر شکوہ عمارت دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ اس کی غالباً ۱۰۷ ویں منزل پر تفریح گاہ تھی جہاں تک ہم پہنچے، بادل اس سے نیچے تھے اس لیے نیویارک شہر کا منظر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا، چنانچہ وہیں تھوڑی دیر گھومے پھرے اور پھر واپس آ گئے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کی شام کو جب میرے چھوٹے بیٹے حافظ عامر خان نے انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل ہونے والی یہ خبر مجھے سنائی کہ دو ہوائی جہاز ٹکرانے سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی یہ محیر العقول بلڈنگ زمین بوس ہو گئی ہے تو چند لمحے یقین نہ آیا لیکن جب تفصیلات سنیں اور رات ۹ بجے کے خبر نامے میں اس کے مناظر دیکھے تو اس دلخراش منظر پر یقین کیے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں وزارت دفاع کے مرکز پینٹاگان میں اغوا شدہ مسافر ہوائی جہازوں کے ذریعے فدائی حملوں سے ہونے والے عظیم مالی نقصان اور ہزاروں بے گناہ انسانی جانوں کے ضیاع سے ہر شخص کو دکھ ہوا ہے۔ دنیا کے ہر ذی ہوش انسان نے اس پر صدمہ و افسوس کا اظہار کیا ہے اور ہم بھی امریکی قوم بالخصوص متاثرین کے خاندانوں کے اس غم میں ان کے ساتھ شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ ہلاک ہونے والوں میں جو بھی مغفرت کے مستحق ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور سب ہلاک شدگان کے خاندانوں کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

جہاں تک اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کا تعلق ہے اس کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنا ہم

ضروری سمجھتے ہیں۔ ان حادثات کے بعد بظاہر ایسا لگتا ہے کہ امریکی حکومت نے سارا ملبہ اسامہ بن لادن پر ڈالنے اور اس کی آڑ میں افغانستان کے خلاف کوئی بڑا فوجی ایکشن لینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو ممکن ہے ان سطور کی اشاعت تک وقوع پذیر بھی ہو چکا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ محض غصہ نکالنے، امریکی قوم کو وقتی طور پر نفسیاتی تسکین دینے، اور افغانستان کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانے کا عمل ہو گا۔ کیونکہ جب تک چھان بین اور تحقیقات کے ذریعے کوئی واضح رخ سامنے نہیں آ جاتا اس وقت تک کسی کے خلاف اس قسم کی کوئی کارروائی شاید خود امریکی رائے عامہ کی نظر میں بھی قرین انصاف نہیں ہو گی۔ جبکہ اس سے قبل اوکلاہاما کے سنٹر کی تباہی کے موقع پر امریکی حکمران یہ تجربہ کر چکے ہیں کہ ابتداء میں ردعمل اور انتقام کا نشانہ مسلمان اور عرب نوجوان بن رہے تھے لیکن تحقیقات کے بعد یہ حرکت ایک مایوس امریکی نوجوان کی نکلی جس کا مسلمانوں اور عربوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے ہم کسی درجہ میں یہ امید کر سکتے ہیں کہ امریکی حکمران غصہ اور جوش کے ساتھ ساتھ ہوش اور ماضی کے تجربہ سے بھی استفادہ کریں گے اور ان کے فوری اشتعال کا نزلہ افغانستان کے عضوِ ضعیف پر نہیں گرے گا۔

بعض اخبارات میں ایک جاپانی تنظیم کی طرف سے بھی اس المیہ کی ذمہ داری قبول کرنے کا تذکرہ ہوا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ صرف عالمی رائے عامہ کو یاددہانی کرانے کی ایک کوشش ہے کہ جس دہشت گردی کا نشانہ آج امریکہ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ بڑی اور خوفناک دہشت گردی کا نشانہ جاپان کے عوام ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ کے ایٹمی حملوں کی صورت میں بن چکے ہیں اور ان حملوں میں ہزاروں نہتے اور بے گناہ شہری المناک ناگہانی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ البتہ اگر امریکی قیادت اپنے غصہ اور انتقامی جذبہ پر تھوڑا سا قابو پا کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس صورتحال پر غور کیلئے آمادہ ہو تو ہم اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اپنی تمام تر سنگینی اور تباہ کاری کے باوجود ایک ردعمل ہے۔ اور کسی بھی ردعمل کو اس عمل سے الگ کر کے دیکھنا قرین انصاف نہیں ہوتا جس کے جواب میں وہ ظہور میں آتا ہے۔ امریکی حکمرانوں کو اس ردعمل کے اصل عوامل تک پہنچنے کیلئے اس عمل کا ادراک کرنا ہو گا جس نے کسی بھی گروہ کے انتہا پسندوں کو اس حد تک آگے جانے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہزاروں بے گناہ جانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی جانوں کے تلف ہو جانے کو بھی انہوں نے اس قدر آسانی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں موت کے سپرد کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور کوئی انتہائی مجبوری، بے بسی اور مایوسی ہی انسان کو اس مقام تک لے جاتی ہے۔

چنانچہ اگر امریکی قیادت دہشت گردی کے خاتمے کے اعلان اور دعویٰ میں سنجیدہ ہے تو اسے دہشت گردی اور اس کے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام اور گروہوں کو دہشت گردی کی انتہائی منزل تک لے جانے والے محرکات کا جائزہ بھی لینا ہو گا۔ اس لیے کہ آگ ہو گی تو دھواں بھی اٹھے گا اور اردگرد کے ماحول میں تپش بھی موجود رہے گی، صرف دھوئیں کو کنٹرول کرنے یا اردگرد کی تپی ہوئی دیواروں پر پانی ڈالنے سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہو گا بلکہ اس کیلئے آگ کو بجھانا ضروری ہے۔ اور یہ آگ ناانصافی، جانبداری، منافقت، استحصال، اور ہر حال میں ایک گروہ کی بالادستی قائم کرنے کا وہ عالمی نظام ہے جس نے پوری دنیا کے امن کو داؤ پر لگا دیا ہے اور انسانیت ایک بار پھر عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی دکھائی دے رہی ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ امریکہ جس جمہوریت اور انسانی حقوق کی باقی دنیا کیلئے دہائی دیتا ہے اسے خلیج عرب کے ممالک کیلئے بھی تسلیم کرلے، فلسطینیوں کے جن جائز حقوق کو اقوامِ متحدہ کا عالمی فورم تسلیم کرتا ہے امریکہ ان کا احترام کرتے ہوئے اسرائیل کی ناجائز پشت پناہی ترک کردے، افغانستان کے عوام کو اپنے ملک میں اپنی مرضی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دے، اور دنیا بھر کے مختلف ممالک و اقوام کو طاقت اور سرمائے کے ہیر پھیر کے ذریعے زبردستی اپنا زیردست رکھنے کی پالیسی پر نظر ثانی کرلے تو کسی کو امریکی عوام کے ساتھ کیا دشمنی ہے کہ وہ اپنی جان کو قربان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جانوں کے بھی درپے ہو جائے؟

ان گزارشات کے ساتھ ہم اس عظیم اور المناک سانحہ والمیہ کے موقع پر امریکی حکومت، عوام اور متاثرہ خاندانوں کے ساتھ ان کے غم میں شرکت کا اظہار کرتے ہیں اور امریکی قوم کے ساتھ پوری ہمدردی، خیر خواہی اور خلوص رکھتے ہوئے اس استدعا کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ محض ردعمل کے اظہار کی بجائے صورتحال کو عمل اور ردعمل دونوں کے مجموعی تناظر میں دیکھا جائے اور دونوں کے اسباب و محرکات کو کنٹرول کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ ورنہ کوئی بھی یکطرفہ ردعمل اس قسم کے خوفناک واقعات میں اضافہ کا باعث تو بن سکتا ہے انہیں روکنے کیلئے قطعاً مفید ثابت نہیں ہوگا۔

سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں امریکی عزائم اور پاکستان کا کردار

۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور میں خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ محترم بزرگو اور دوستو! اس وقت پوری دنیا میں ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والے حادثات اور ان میں ہزاروں جانوں کے ضائع ہو جانے کے بعد اس پر امریکہ کے ردِعمل اور اس سے پیدا شدہ صورتحال پر بحث کا سلسلہ جاری ہے اور میں بھی اسی حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن کے پینٹاگون سے اغوا شدہ طیاروں کے ٹکرانے سے جو عظیم جانی و مالی نقصان ہوا، اس سے سب لوگوں کو دکھ ہوا ہے لیکن امریکہ نے اس کی ذمہ داری عرب مجاہد اسامہ بن لادن پر ڈال کر اس کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کرنے کا جو اعلان کیا ہے، اس سے صورتحال میں اور کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ افغانستان کی طالبان حکومت سے امریکہ کا مطالبہ ہے کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کردے مگر طالبان حکومت کا موقف یہ ہے کہ امریکہ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے، اس کے مطالبہ پر غور کیا جائے گا۔ محض شک یا الزام پر وہ ایک مجاہد کو، جو ان کا مہمان ہے، امریکہ کے سپرد کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی افغان علماء کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسامہ بن لادن اپنے طور پر افغانستان چھوڑ دیں مگر انہیں امریکہ یا کسی اور ملک کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طالبان حکومت کا یہ موقف بہت پرانا ہے اور اس سے پہلے بھی امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کی طرف

سے کہا جا چکا ہے کہ اسامہ بن لادن رضا کارانہ طور پر افغانستان سے چلے جائیں تو ان کی مرضی ہے مگر انہیں بطور ملزم کسی ملک کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ افغان علماء کی مجلسِ شوریٰ نے یہی بات اب ذرا مختلف انداز میں کہی ہے اور اسی سے وقتی طور پر کشیدگی میں کسی حد تک کمی کے آثار پیدا ہوئے ہیں مگر امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے آج امریکی ایوان نمائندگان سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ مسئلہ صرف اسامہ کا نہیں بلکہ وہ دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو توڑنا چاہتے ہیں اور دنیا بھر میں دہشت گردوں کے تمام مراکز کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔

امریکہ کے نزدیک عالمِ اسلام کی جہادی تحریکات دہشت گرد ہیں اور جب وہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد یہی جہادی تحریکات ہوتی ہیں جو مراکش سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پھیلی ہوئی ہیں اور کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور مورو سمیت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو غاصب اور مسلط قوتوں سے نجات دلانے کیلئے عسکری جدوجہد کر رہی ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کا کہنا ہے کہ ان سب دہشت گردوں نے افغانستان میں ٹریننگ حاصل کی ہے، اس لیے افغانستان کو تباہ کرنا امریکہ کیلئے ضروری ہو گیا ہے اور اسی ہدف کو حاصل کرنے کیلئے امریکہ بھرپور جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم پہلے ہی عرض کیا کرتے تھے کہ اسامہ بن لادن کا نام صرف بہانہ ہے، اصل مسئلہ جہادی تحریکات ہیں جو امریکہ اور اس کے حواری ممالک کیلئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں اور اب صدر بش نے صاف طور پر تمام جہادی تحریکات کے خاتمہ کو اپنا سب سے بڑا ہدف قرار دے کر ہمارے ان خدشات کی تصدیق کر دی ہے۔

مگر اس میں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکہ افغانستان پر حملے کیلئے ہمارے کندھے پر بندوق رکھنا چاہتا ہے اور پاکستان کی زمین اور فضا سے حملہ آور ہو کر امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہے اور مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے اربابِ اختیار امریکہ کو افغانستان پر حملہ کیلئے زمینی اور فضائی سہولتیں فراہم کرنا چاہتے ہیں اور اسے اسلام اور پاکستان کے مفاد کا تقاضا بتا رہے ہیں۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف صاحب نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جس طرح افغانستان پر حملہ کیلئے امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی کا دفاع کیا ہے، وہ انتہائی حیران کن ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔

صدر محترم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا حوالہ دیا کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے یہودیوں سے صلح کا معاہدہ کر کے کفار مکہ کے خلاف احد اور خندق کی جنگیں لڑی تھیں جبکہ اس کے بعد حدیبیہ میں کفارِ مکہ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر کے خیبر میں یہودیوں سے جنگ جیتی تھی اس لیے یہ عین حکمت اور دانش کا تقاضا ہے اور سنتِ نبوی کی پیروی ہے۔ لیکن جنرل صاحب کا یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ نبی اکرمؐ کے سامنے دونوں قومیں کافر تھیں اور دونوں دشمن تھے۔ ان سے بیک وقت لڑنے کے بجائے حضورؐ نے ایک وقت میں ایک دشمن سے صلح کرنے اور دوسرے دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کی حکمتِ عملی اختیار فرمائی جو فی الواقع دانش مندی کی بات تھی لیکن یہاں ایک طرف امریکہ ہے جس کی مہربانیاں نصف صدی سے ہم بھگت رہے ہیں اور دوسری طرف طالبان کی اسلامی حکومت ہے جس کی باقی تمام باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بھی یہ حقیقت ہے کہ کابل میں طالبان حکومت کا وجود ہی پاکستان

کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس لیے اس صورتحال پر جناب نبی اکرمؐ کی مذکورہ حکمت عملی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا اور اسے غلط فہمی یا دھوکہ کے عنوان سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کی تعلیم کا تاریخ کے اس عظیم واقعہ سے پتہ چلتا ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراتھیں اور دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کے درپے تھے۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسیحی سلطنت روم کے بادشاہ قیصر نے حضرت معاویہؓ کو پیش کش کی تھی کہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں وہ ان کی مدد کر سکتا ہے مگر حضرت معاویہؓ نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ رد کر دیا اور وہ جواب دیا جو اسلامی تاریخ کا روشن باب اور قیامت تک آنے والے مسلم حکمرانوں کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے قیصر روم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

"میری حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا جائے گا اور اگر تم نے حضرت علیؓ کے خلاف فوج کشی کی تو تمہارے مقابلے میں حضرت علیؓ کے پرچم تلے سامنے آنے والا سب سے پہلا سپاہی معاویہؓ ہوگا"

یہ اس کیفیت کی بات ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک دوسرے کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے جبکہ ہماری طالبان کے ساتھ کوئی جنگ بھی نہیں ہے اس لیے ہمارے لیے اسلام کی تعلیم یہی ہے جو حضرت معاویہؓ نے قیصرِ روم کے نام اپنے خط میں بیان فرمائی ہے۔

جنرل صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ہم نے امریکہ کو حملے کی سہولتیں فراہم نہ کیں تو بھارت ایسا کر دے گا اور پھر امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا جس سے ہمارے کشمیر کاز کو نقصان پہنچے گا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی بھولپن ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جو امریکہ کو جانتا نہیں ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے جس کا شکار ہم سے پہلے ہمارے عرب بھائی ہو چکے ہیں۔ ہمارے برادر عرب ملکوں نے اسی توقع اور امید پر امریکہ دوستی کا پرچم اٹھایا تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں امریکہ ان کا لحاظ کرے گا اور ان کے امریکہ کا ساتھی بننے سے اسرائیل اور عربوں کے حوالے سے امریکہ کی پالیسیوں میں توازن قائم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور ساری دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے کہ امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب اور کویت میں بٹھا رکھی ہیں اور پشت پناہی اسرائیل کی کر رہا ہے۔ وسائل عربوں کے استعمال کر رہا ہے اور تحفظ اسرائیل کو فراہم کر رہا ہے اس لیے ہمارے مہربانوں کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہئے کہ امریکہ پاکستان میں بیٹھ جائے گا تو بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی حمایت بھی کرے گا اور پاکستان میں اس کی موجودگی سے پاکستان کے کشمیر کاز کو کوئی فائدہ بھی پہنچے گا۔ پھر یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب امریکہ کے بقول وہ جہادی تحریکات کا خاتمہ کر دے گا، پاکستان کو افغانستان سے لڑا دے گا اور چین کے سر پر فوجیں بٹھا کر پاک چین تعلقات میں رخنہ پیدا کر دے گا تو پھر کون سا کشمیر کاز باقی رہ جائے گا جسے بچانے کی ہمارے حکمران فکر کر رہے ہیں؟ "کشمیر کاز" اگر ہے تو وہ مجاہدین کی قربانیوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے ہزاروں شہداء کا خون دے کر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ جب یہ مجاہدین اور ان کے گروپ ہی دہشت گرد قرار پا کر پاکستان کے ہاتھوں امریکی انتقام کا نشانہ بن جائیں گے تو کشمیر کاز کا وجود ہی کہاں باقی رہ

جائے گا؟

صدر محترم کا ارشاد ہے کہ ہم امریکہ کو افغانستان کے خلاف سہولتیں فراہم کر کے اپنی ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ کر سکیں گے مگر یہ بات بھی خود فریبی ہے اس لیے کہ ہماری عسکری صلاحیت میں اضافے اور ایٹمی پروگرام کے بارے میں امریکہ اب تک جو کچھ کہتا آرہا ہے، اس کے پیش نظر ہم اس قدر فاصلے سے اپنی ایٹمی تنصیبات کو امریکی مداخلت سے محفوظ تصور نہیں کر رہے تو جب وہ گوادر، کوئٹہ اور پشاور میں آبیٹھے گا تو پھر ایٹمی تنصیبات کے تحفظ کی گارنٹی کون دے سکتا ہے؟ اس لیے ہم دیانت داری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ ہماری ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ امریکہ کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے میں ہے، اسے اپنی داخلی حدود میں براجمان ہونے کا موقع دینے میں نہیں۔

جنرل پرویز مشرف صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ امریکہ کو سہولتیں دینے کی پالیسی سے ہمیں معیشت کو سنبھالا دینے میں مدد ملے گی اور ہمارے معاشی حالات سدھر جائیں گے۔ میں اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات ان عرب ممالک سے دریافت کر لیجئے جن کے کندھے پر دس سال سے امریکہ سوار ہے اور اس نے وہاں اپنی فوجیں بٹھا رکھی ہیں کہ امریکہ بہادر کی تشریف آوری اور اس کی فوجوں کی آمد سے ان کی معیشت کو کتنا سہارا ملا ہے؟ ان میں سے سعودی عرب کی حالت آج یہ ہے کہ تیل کی دولت سے مالا مال اس ملک کو اپنا بجٹ کا خسارا پورا کرنے کیلئے عمرہ جیسی عبادت کو بزنس کے حساب سے ڈیل کرنا پڑ رہا ہے اور قرضے لینے کیلئے مجبور ہونا پڑا ہے اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات بھی خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کہ امریکہ کو افغانستان کے خلاف فوجی سہولتیں دینے سے پاکستان کی معیشت سدھرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

حضراتِ محترم! میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے اصل مقصد کو پہچانیں اور اس کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک امریکہ کے موجودہ عالمی کردار اور بھاگ دوڑ کے بنیادی مقاصد تین ہیں:

1. ایک یہ کہ دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو دہشت گردی کا نام دے کر سختی کے ساتھ کچل دیا جائے اور افغانستان کو اس تمام تر دہشت گردی کا سرچشمہ قرار دے کر طالبان حکومت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اپنی مرضی کی حکومت بٹھائی جائے۔
2. دوسرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں فکری ہم آہنگی اور نظریاتی یگانگت کے فروغ کو وسطی ایشیا تک پھیلنے سے روکا جائے۔ ان اثرات کے وسیع ہونے کے امکانات کو سامنے رکھ کر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ خطہ اگر دوبارہ اکٹھا ہو گیا تو بہت بڑی قوت بنے گا اور اسے بھارتی حلقوں میں ''مغل امپائر'' کے زندہ ہونے سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے روکنے پر امریکہ اور بھارت دونوں متفق ہیں جس کی واحد صورت پاکستان اور افغانستان کی دوستی کو توڑنا ہے اور امریکہ اسے توڑنے کیلئے پاکستان کو افغانستان کے خلاف حملوں میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔
3. امریکہ کا تیسرا مقصد چین کے خلاف حصار قائم کرنا اور پاکستان میں بیٹھ کر پاک چین دوستی میں رخنے ڈالنا ہے

تاکہ چین اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہیں اور امریکہ ان کے حوالے سے آسانی کے ساتھ من مانی کر سکے۔

ان حالات میں آپ خود سوچ لیں کہ جب خدانخواستہ پاکستان کے تعلقات چین اور افغانستان دونوں کے ساتھ خراب ہو جائیں گے اور مجاہدین کے گروپوں کو بھی دہشت گرد قرار دے کر خود پاکستان کے ہاتھوں گراؤنڈ کر دیا جائے گا تو خطے میں خود پاکستان کی حیثیت کیا رہ جائے گی اور کیا کل کوئی صاحب یہ کہنے کیلئے کھڑے نہیں ہو جائیں گے کہ کشمیریوں کے ساتھ ہمیں بہت ہمدردی ہے اور ہمیں ان کی فکر بہت زیادہ ہے لیکن خود پاکستان کی سالمیت ہمارے لیے سب سے مقدس ہے اس لیے کشمیریوں کو بھول جائیے اور پاکستان کے وجود کا تحفظ کیجئے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے حالات کا نقشہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور میری آپ سے گزارش ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس صورتحال کا جائزہ لیں۔ یہ اسلام کے مفاد کی بات ہے، پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ ہے اور طالبان کی اسلامی حکومت کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک کی دینی جماعتوں نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے، وہ بالکل درست اور ملک و ملت کے مفاد کا تقاضا ہے اس لیے سب دوستوں کو چاہئے کہ وہ اس موقف کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں اور دینی قوتوں کو مضبوط کریں کیونکہ اس وقت دین، ملک اور قوم کے تحفظ کا یہی ناگزیر تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کا سیرتِ نبویؐ سے استدلال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء

صدر جنرل پرویز مشرف کے خطاب میں یہ بات مجھے اچھی لگی ہے کہ انہوں نے حوالہ اور استناد کیلئے قرآن کریم اور سنت نبویؐ سے رجوع کیا ہے، ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے سربراہ کا یہی حق بنتا ہے کہ وہ قرآن و سنت سے راہنمائی حاصل کرے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں بھی قرآن و سنت کو ہی ریاستی پالیسی اور قوانین کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ قرآن و سنت سے استفادہ کیلئے ان اصول و ضوابط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے جو راہنمائی و ہدایت کے ان دو سرچشموں سے استفادہ کیلئے امت کے جمہور اہل علم کے ہاں مسلم چلے آرہے ہیں۔ ورنہ اگر ہر شخص اپنی مرضی اور فہم کے مطابق قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات کو اپنے موقف کے حق میں پیش کرنے لگے تو قرآن و سنت راہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہیں گے بلکہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

صدر صاحب نے افغانستان پر حملہ میں امریکہ کی معاونت کے جواز میں جناب رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ رسالت مآبؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہودی قبائل کے ساتھ معاہدہ کرکے بدر،

احد اور خندق کے معرکوں میں کفار مکہ کو شکست دی اور اس کے بعد حدیبیہ میں کفار مکہ سے معاہدہ کر کے غزوۂ خیبر میں یہودیوں کی شکست کی راہ ہموار کی، اس لیے حکمت اور دانش کے تحت کسی کافر قوم سے وقتی مصالحت کا جواز موجود ہے۔

صدر مشرف کا یہ استدلال درست نہیں ہے، اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ کے دونوں طرف کافر اقوام تھیں اور دونوں دشمن تھیں۔ آنحضرتؐ نے دونوں سے بیک وقت جنگ کو حکمت کے خلاف سمجھتے ہوئے یہ حکمت عملی اختیار کی مگر یہاں یہ صورتحال نہیں ہے۔ یہاں ایک طرف کافر قوم ہے اور دوسری طرف مسلمان بھائی ہیں۔ ایک طرف وہ طاقت ہے جس نے گذشتہ نصف صدی میں پاکستان کے ساتھ دوستی کے تمام تر معاہدوں کے باوجود ہر نازک مرحلہ میں پاکستان سے بے وفائی کی ہے، جبکہ دوسری طرف وہ قوم ہے جس نے گرم پانیوں کی طرف سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے قدم روک کر پاکستان کی جغرافیائی سالمیت کا تحفظ کیا ہے۔ ایک طرف وہ ملک ہے جس کے ایجنڈے میں پاکستان کے جغرافیہ کو تبدیل کرنا اور اسے ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا شامل ہے، جبکہ دوسری طرف وہ ملک ہے جس میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کا وجود ہی پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس لیے میں صدر جنرل پرویز مشرف سے بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ سیرت طیبہ کا حوالہ دینے سے قبل اس بات کا ایک بار پھر جائزہ لے لیں کہ وہ کس کے ساتھ معاہدہ کر رہے ہیں اور کس کے خلاف کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی صدر صاحب اس سوال کا جواب بھی مرحمت فرمادیں کہ جناب رسول اللہؐ کی اس حکمت عملی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو کفار مکہ اور یہودِ خیبر میں سے کس کے زمرہ میں شمار کیا ہے؟

جنرل صاحب کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور خلافت میں جب وہ امیر شام حضرت معاویہؓ کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور دونوں طرف مسلمان فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آراء تھیں اس وقت کی سپر پاور رومن ایمپائر کے بادشاہ قیصر روم نے حضرت معاویہؓ کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے۔ مگر حضرت معاویہؓ نے اس کے جواب میں جو تاریخی موقف اختیار کیا تھا وہ قیامت تک ایسے معاملات میں مسلم حکمرانوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ ان کا یہ جواب تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہے جس میں انہوں نے قیصر روم کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ

> ”حضرت علیؓ کے خلاف میری جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دوں گا۔ اور اگر تم نے علیؓ کے خلاف فوج کشی کی تو علیؓ کے پرچم کے نیچے تمہارے خلاف میدان جنگ میں اترنے والا سب سے پہلا سپاہی معاویہؓ ہوگا۔“

اور صدر صاحب کو یہ بتانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ یہ اس دور کی بات ہے جب دو مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں تھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ یہاں تو پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کے رشتہ سے بندھے ہوئے ہیں، دونوں کے مفادات مشترکہ ہیں، دونوں ایک دوسرے کے پشتی بان ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ یہی وہ رشتہ ہے جسے توڑنے کیلئے امریکہ اور

بھارت دونوں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اس لیے ان حالات میں اگر صدر جنرل پرویز مشرف افغانستان کے خلاف امریکی حملوں میں امریکہ کو پاکستان کی زمین یا فضا فراہم کر کے فریق بننا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مصلحت کا تقاضا ہو سکتا ہے، یا طالبان کے طرز حکومت سے اپنے مفادات اور عیش پرستی کو خطرہ محسوس کرنے والے مراعات یافتہ طبقوں کی ضرورت تو ہو سکتی ہے، اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا اسلامی تاریخ کی شاندار روایات کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کی خود فریبی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن ترجیحات کا اعلان کیا ہے وہ صرف ان کی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر شہری کی ترجیحات ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں جو پاکستان کی سالمیت اور قومی وحدت کے تحفظ کو دوسری ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں اور پاکستان کی عسکری اور ایٹمی صلاحیت کو ہر حالت میں برقرار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ تاثر دینا کہ جو لوگ امریکہ اور افغانستان کے حالیہ تنازعہ کے تناظر میں صدر پرویز مشرف سے اختلاف کر رہے ہیں ان کی ترجیحات اس سے مختلف ہیں، قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بات ترجیحات کی نہیں بلکہ انہیں بروئے کار لانے کیلئے طریق کار کی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان ترجیحات پر عملدرآمد کیلئے صدر صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے خطاب میں جس طریق کار کا عندیہ دیا ہے وہ ان ترجیحات کے نفاذ و عملداری کا نہیں بلکہ خدانخواستہ انہیں سبوتاژ کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اس طریق کار سے پوری دیانتداری اور شرح صدر کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں۔

صدر پرویز مشرف نے امارت اسلامی افغانستان پر حملوں کیلئے امریکہ کو سہولتیں فراہم کرنے کی پالیسی کے حق میں کہا ہے کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو بھارت یہ کر گزرے گا اور وہ امریکہ کو اس مقصد کیلئے سہولتیں فراہم کرنے کی پیشکش کر چکا ہے، اس لیے ہم بھارت کو سبقت کا موقع نہیں دینا چاہتے کیونکہ اس سے امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا اور ہمارے کشمیر کاز کو نقصان پہنچے گا۔

سچی بات ہے کہ صدر صاحب کے اس بھولپن پر مجھے ہنسی آتی ہے اس لیے کہ یہ بات وہ شخص تو کہہ سکتا ہے جس نے امریکہ کو پہلی بار دیکھا ہو، اس کی تاریخ، اس کے قومی مزاج سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو مگر ایسے ملک کے سربراہ کے منہ سے یہ بات بھولپن اور سادگی ہی کہلائے گی جو گذشتہ نصف صدی سے "امریکہ دوستی" کے مسلسل چرکے کھا رہا ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خود فریبی کی انتہا ہے کہ وہ افغانستان کے خلاف پاکستان کی زمین یا فضا استعمال کرنے کے بعد اس خطہ میں اپنی ترجیحات بدل دے گا اور بھارت کو اپنے مخالفین میں شمار کر کے کشمیر کو آزادی دلوانے کیلئے پاکستان کی سپورٹ کرے گا۔

پاکستان کے ساتھ اس وقت امریکہ کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کی نظریاتی وحدت کو توڑنا چاہتا ہے، ان کی باہمی دوستی کو دشمنی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، پاکستان اور افغانستان کے وسطی ایشیا کے ساتھ روابط کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور چین کے خلاف اپنے مجوزہ حصار کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ حاصل ہوجانے کے بعد امریکہ کی ترجیحات بدستور وہی رہیں گی جو پہلے چلی آرہی ہیں اور جن ترجیحات میں پاکستان کو بھارت پر ترجیح دینا یا کم از کم اس کے برابر رکھنا بھی امریکی مفادات سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے صدر مشرف اور ان کے ساتھ اس مسئلہ کو پاک بھارت تنازعہ اور کشمکش کے تناظر میں دیکھنے والے دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ اور مطالعہ کا دائرہ کشادہ کریں اور وسیع تر عالمی تناظر میں امریکہ کے مفادات، پالیسیوں اور عزائم کا جائزہ لیں۔

جنرل پرویز مشرف سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہوگا کہ عربوں نے بھی اسی غلط فہمی میں امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے عروج کے دور میں روس کے کیمپ میں شمار ہونے والے بعض عرب ممالک اسی توقع پر امریکی کیمپ میں چلے گئے تھے کہ ہم اس خطہ میں امریکہ کو سہولتیں فراہم کریں گے تو امریکہ ہمارے ساتھ ہوجائے گا، اور جب امریکہ ہمارے ساتھ ہوگا تو فلسطین کے مسئلہ کے حل کیلئے ہمیں رعایتیں دے گا اور اسرائیل کے مقابلہ میں ہمیں ترجیح دے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کا ہوا؟ صدر صاحب کو اگر خود واقفیت نہ ہو تو برادر مسلم ملک عرب جمہوریہ مصر کے صدر جناب حسنی مبارک سے کسی وقت رازداری کے ساتھ پوچھ لیں کہ اسرائیل کے مقابلہ میں ترجیح اور مسئلہ فلسطین کے حل میں تعاون کی توقع پر امریکہ کے ساتھی بننے والے ملکوں کے ساتھ امریکہ بہادر نے کیا سلوک کیا ہے؟

فلسطین کی صورتحال سب کے سامنے ہے، وہاں اسرائیل کے جبر و تشدد، فلسطینیوں کے قتل عام، اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کی مسلسل سازشیں کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہیں۔ جبکہ اسرائیل کے مقابل جو عرب ممالک کھڑے ہیں وہ سب کے سب امریکہ کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کو تیل کے چشموں پر بالادستی دلائی ہے، فوجی استعمال کیلئے زمین اور اڈے فراہم کر رکھے ہیں، اور امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، صرف اس لیے کہ اسرائیل کے مقابلہ میں امریکہ انہیں بھی کچھ رعایت دے دے۔ لیکن امریکی دوستی کے اس فریب نے انہیں معروف محاورے "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" کے مصداق اقوامِ عالم کی برادری میں بے بسی اور عبرت کی تصویر بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس لیے جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ ہماری ترجیحات بھی وہی ہیں جو انہوں نے بیان کی ہیں، ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہے تو سب کچھ ہے، ہمیں بھی اس بات کا شعور ہے کہ ملکی معیشت کو مستحکم کرنا ہماری اولین ضرورت ہے، ہم بھی پاکستان کے حساس مراکز ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا ہر قیمت پر تحفظ چاہتے ہیں، اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر جلد از جلد حل ہو اور امریکہ سمیت سب عالمی قوتیں اس میں انصاف کا ساتھ دیں۔ لیکن اس کا صحیح راستہ امریکہ کے ساتھ قرب بڑھانا اور اسے اپنی داخلی حدود میں عسکری دخل اندازی اور رسائی کے مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنا ہے۔ ہم اس وقت انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں، جس طرف بھی مڑ گئے واپسی

کیلئے دور دور تک کوئی ”یوٹرن“ نہیں ہے، اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔

افغانستان اور پاکستان: سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے دو شہروں نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والے بڑے سانحات میں ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا ہے جس پر دنیا کے ہر شخص کو افسوس ہے، مگر امریکہ کی قیادت اس پر سیخ پا ہو کر جس بدحواسی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس نے اہلِ دنیا کو افسوس اور رنج کے ساتھ ساتھ تعجب اور حیرت سے بھی دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ امریکہ کسی ثبوت کی فراہمی کی ضرورت محسوس کیے بغیر اور معاملہ کو کسی غیر جانبدار فورم کے سامنے لائے بغیر از خود عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو اس کا مجرم قرار دے رہا ہے، اور افغانستان کی طالبان حکومت پر اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کا الزام عائد کر کے اس پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہے، حتٰی کہ امریکہ نے اس حملہ میں پاکستان کو شریک کار بننے کی دعوت بلکہ دھمکی دے کر اس کیلئے بھی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔

ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اس معاملہ میں امریکہ خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی جج کا منصب سنبھالے ہوئے ہے۔ اور امریکی قیادت طالبان کے اس مطالبہ کو انتہائی رعونت کے ساتھ رد کر چکی ہے کہ اگر اسامہ بن لادن کے خلاف کوئی ثبوت ہے تو اسے سامنے لایا جائے، اور کسی ثبوت کے بغیر محض شک اور قیاس آرائی کی بنیاد پر اسے مجرم قرار نہ دیا جائے۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں امریکہ کا موقف انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسے ہٹ دھرمی کے سوا اور کسی عنوان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ اصل مقصد یہ نظر آتا ہے کہ امریکہ ان سانحات کو صرف افغانستان کے خلاف کاروائی کیلئے بطور بہانہ استعمال کرنا چاہتا ہے، جس کا مقصد:

- امارتِ اسلامی افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو ختم کر کے وہاں لبرل طرز کی کوئی متبادل مسلمان حکومت قائم کرنا،
- پاکستان کی ایٹمی تنصیبات اور دیگر حساس عسکری مراکز پر نگرانی کا نظام قائم کرنا،
- اور عوامی جمہوریہ چین کے پڑوس میں امریکہ کی فوجی موجودگی کی راہ ہموار کرنا ہے، جو جنوبی ایشیا کے حوالے سے امریکہ کے ایجنڈے کا اہم حصہ ہے۔

اس پس منظر میں افغانستان کے خلاف امریکہ کے فوجی عزائم میں اسے تعاون فراہم کرنے کی بات صرف افغانستان کے نہیں بلکہ خود پاکستان کے مفادات کے بھی منافی ہے۔ اور ہم حکومتِ پاکستان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہوئے ان معروضی حقائق اور ملکی مفاد کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرے گی۔

سانحہ گیارہ ستمبر پر ایک امریکی مذہبی راہنما کا تبصرہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پینٹاگون کی عمارت سے اغوا شدہ طیاروں کے ٹکرانے سے جو قیامتِ صغریٰ بپا ہوئی ہے اس پر سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ تبصرہ خود امریکہ کے ایک پروٹسٹنٹ مذہبی راہنما جیری فالول نے کیا ہے، جسے روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۵ ستمبر ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں "کرسچیئن براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک" کے حوالے سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

"نیویارک اور واشنگٹن میں حالیہ حملوں کی ذمہ داری حقوقِ نسواں اور شہری آزادی کے گروپوں پر عائد ہوتی ہے اور ہم جنس پرست، اسقاطِ حمل کے حامی، بت پرست اور سیکولر لوگ بھی اس ذمہ داری میں شریک ہیں، اور امریکی زمین پر ان بدترین اور دہشت ناک حملوں کے شاید ہم پوری طرح مستحق تھے۔ یہ خونریز حملے مزید تباہی کی محض ابتدا ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اسی طرح پردے اٹھاتا رہا تو امریکہ کے دشمنوں کو وہ کچھ کرنے کا موقع ملے گا جس کے شاید ہم مستحق ہیں۔ سول لبرٹیز یونین اس صورتحال کی ذمہ دار ہے اور اسقاطِ حمل کا بھی اس میں عمل دخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تمسخر نہیں اڑایا جا سکتا۔ جب ہم چالیس ملین معصوم بچوں کو ضائع کر دیں گے تو اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کو ناراض ہی کریں گے۔ اسی طرح بت پرستی کرنے والے، اسقاطِ حمل اور حقوقِ نسواں کے حامی، ہم جنس پرست جنہوں نے ایک متبادل لائف سسٹم بنا رکھا ہے، اور وہ سب لوگ جنہوں نے امریکہ کو سیکولر بنانے کی کوشش کی، ہم ان لوگوں کو ہی ان واقعات کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔"

گویا پروٹسٹنٹ راہنما جیری فالول نے آسمانی تعلیمات کی روشنی میں ان حقیقی اسباب کی نشاندہی کی ہے جو قوموں کی بربادی اور ان پر اس قسم کے خداوندی عذاب کا باعث بنتے ہیں۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے صحیح بات کہی ہے اور درست سمت امریکی قوم کی راہنمائی کی ہے۔ لیکن امریکی معاشرہ تو ایک عرصہ ہوا آسمانی تعلیمات سے دستبردار ہو کر سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کو اپنا حاکمِ مطلق قرار دے چکا ہے، اس کیلئے ان نصیحتوں کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟

امریکہ کو روسی کرنل کا مشورہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ ستمبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان میں پانچ برس تک جنگ لڑنے والے روسی کرنل یوری شامانوف کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے امریکہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ افغانستان سے جنگ نہ لڑے، یہ ان کیلئے ویتنام

سے دس گنا زیادہ تباہ کن ملک ثابت ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے لڑنے کیلئے افغانستان جانے والے امریکیوں، ان کی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں پر ترس آ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں پہاڑ عظیم پناہ گاہیں ہیں، میزائل افغانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اگر امریکی افغانستان گئے تو افغانوں کو لڑائی کیلئے تیار پائیں گے، انہوں نے روس کے خلاف تباہ کن جنگ لڑی اور بہت اچھی طرح لڑے۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب روس نے افغانستان میں فوجیں اتاری تھیں اور افغان عوام نے ان کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا تو برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے بھی اس قسم کا مشورہ روسی لیڈروں کو دیا تھا، اور خود ماسکو جا کر روسی قائدین سے کہا تھا کہ وہ افغانوں سے پنجہ آزمائی نہ کریں اور ہمارے تجربہ سے فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ برطانوی استعمار نے بھی برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے بعد افغانستان پر قبضہ کرنے کیلئے فوجیں بھیجی تھیں مگر انہیں عبرتناک شکست ہوئی تھی، حتٰی کہ ایک معرکہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف ایک برطانوی فوجی زندہ بچ کر واپس آیا تھا جس نے اپنے ساتھیوں کے عبرتناک حشر سے برطانوی افسران کو آگاہ کیا تھا۔ اور پھر برطانیہ عظمٰی نے افغانستان سے جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح روسی لیڈروں نے برطانیہ کے مشورہ کو قبول نہیں کیا تھا اور ان کے تجربہ پر قناعت کرنے کی بجائے خود تجربہ کرنا ضروری سمجھا تھا، اسی طرح امریکی لیڈر بھی شاید برطانیہ اور روس کے تجربہ پر اکتفا نہ کریں اور اپنا الگ تجربہ کرنا چاہیں۔ وہ خود کو دنیا کی واحد سپر پاور سمجھتے ہیں اور اپنا نفع و نقصان خود بہتر سمجھتے ہیں، اس لیے ان سے اس سے زیادہ کیا عرض کیا جا سکتا ہے:

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

افغانستان پر متوقع امریکی حملہ اور عالمی منظر نامہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء

افغانستان پر امریکہ کے فوری حملہ کا خطرہ ٹل جانے کے بعد عالمی میڈیا کا رخ ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ان پر بحث و تمحیص کی طرف بتدریج مڑ رہا ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے ۱۱ ستمبر کے المناک واقعات کے باعث بنے۔ اور اس وقت بھارت اور اسرائیل دونوں کی وہ کوششیں ناکام ہوتی نظر آ رہی ہیں جو انہوں نے ۱۱ ستمبر کے حادثات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امارت اسلامی افغانستان اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کو امریکی حملوں اور مداخلت کی زد میں لانے کیلئے شروع کی تھیں۔ بھارت اور اسرائیل نے اسامہ بن لادن، افغانستان اور پاکستان کے خلاف جس نفرت انگیز مہم کا آغاز کیا تھا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اشتعال میں اضافہ ہو، کشیدگی بڑھے اور اس اشتعال کی فضا میں امریکہ افغانستان پر چڑھ دوڑے جس کے نتائج سے پاکستان کسی صورت بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن پاکستان کی دینی جماعتوں کی مشترکہ جدوجہد، رائے عامہ کی بیداری، جنرل پرویز مشرف کی حکمت عملی اور اعتدال پسندی، عالمی راہنماؤں اور حلقوں کی مسلسل کوششوں کے باعث

اس کا فوری خطرہ ٹل گیا ہے اور جوش و اشتعال کی بجائے ہوش و حکمت عملی کا پہلو لحہ بہ لحہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

البتہ بعض سنجیدہ حلقے ہوش اور حکمت عملی کے تحت مستقبل میں متوقع امریکی حملوں کو زیادہ خطرناک قرار دے رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کی جانے والی امریکی کارروائیاں نہ صرف افغانستان کیلئے زیادہ نقصانات کا ذریعہ بنیں گی بلکہ پاکستان کیلئے بھی زیادہ خطرناک ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود فوری کارروائی کے ٹل جانے کے امکان کو اس حوالے سے غنیمت سمجھا جا رہا ہے کہ اس سے ہر فریق کو اپنی مرضی کے مطابق صف بندی کرنے کا موقع ملے گا اور عالمی برادری کو بھی اپنی ترجیحات نسبتاً زیادہ پرسکون ماحول میں از سر نو طے کرنے کی سہولت حاصل ہوگی۔

جہاں تک جنگ کا تعلق ہے وہ ناگزیر ہو چکی ہے۔ مغرب کے راہنماؤں میں اس جنگ کے لیبل کے بارے میں تو اختلاف پایا جاتا ہے مگر جنگ اور لمبی مدت کی جنگ کے ناگزیر ہونے پر مغرب کے تمام لیڈر متفق ہیں اور اس کیلئے سب تیاریاں کر رہے ہیں۔ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے پہلے اسے ''صلیبی جنگ'' قرار دیا مگر بعد میں اس پر معذرت کر دی۔ پینٹاگون نے افغانستان کیلئے اپنے فوجی آپریشن کا نام ''آپریشن انفینٹ جسٹس'' رکھا تھا جس کا معنٰی حتمی انصاف ہے۔ مگر اس پر اعتراض کیا گیا کہ حتمی انصاف تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، چنانچہ یہ نام تبدیل کر کے اب اسے ''آپریشن اینڈیورنگ فریڈم'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اپنے بیانات اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں میں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ جنگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف دہشت گردی کے خلاف ہوگی۔ مگر اٹلی کے وزیر اعظم نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ ہماری جنگ اسلام کے خلاف ہے۔ بعض مغربی دانشور اسے ''سولائزیشن وار'' کہہ رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنی مخالف تہذیبوں سے آخری جنگ کرنے جا رہی ہے۔ جبکہ مخالف تہذیبوں میں اسلام اور چینی تہذیب کو سرفہرست سمجھا جا رہا ہے۔

الغرض اس میں تو اختلاف موجود ہے کہ اس جنگ کو کس عنوان سے تعبیر کیا جائے مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ جنگ ہوگی اور وقتی کارروائی کی بجائے طویل جنگ ہوگی جس کیلئے مغرب پوری طرح تیاری میں ہے اور منظم منصوبہ بندی کے ساتھ نئی صف بندی کر رہا ہے۔

اس جنگ کا منظر نامہ یہ ہے کہ عالم اسلام کی رائے عامہ اور دینی حلقے ایک طرف ہیں جو امریکہ کی دھمکیوں اور جنگی عزائم کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تصور کرتے ہیں اور اس کے خلاف محاذ آراء ہو رہے ہیں۔ مگر افغانستان اور ایران کو چھوڑ کر باقی کم و بیش تمام مسلمان ممالک کی حکومتیں اپنے عوام کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر امریکہ کی حمایت میں بلکہ اس کے کیمپ میں کھڑی ہیں۔ صرف ایران واحد ملک ہے جو امریکی کیمپ کی مسلسل کوششوں کے باوجود افغانستان کے خلاف امریکی پروگرام میں شریک ہونے کیلئے ابھی تک تیار نہیں ہوا، غالب امکان یہ ہے کہ اسے امریکی کیمپ میں لانے کی کوشش آئندہ بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ جبکہ باقی مسلم حکومتوں میں اس بات کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ان میں سے کون امریکہ کا زیادہ وفادار ہے اور کون اس جنگ میں امریکہ اور اس کے مغربی کیمپ کو زیادہ سہولتیں فراہم کر سکتا ہے۔

ان مسلمان حکومتوں کو یہ خطرہ ہے کہ عالم اسلام میں تیزی سے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے جن رجحانات کو وہ امریکہ اور مغربی کیمپ کی پیروی میں بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے رجحانات قرار دے رہے ہیں وہ مسلم ممالک کے موجودہ

سیاسی ڈھانچوں اور نوآبادیاتی نظاموں کے خاتمہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ اور یہ رجحانات افغانستان کی طرح دیگر مسلم ممالک میں بھی مروجہ ریاستی ڈھانچوں کی توڑ پھوڑ اور اسلامی تعلیمات پر مبنی نئے انقلابی نظام کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ مسلم حکومتیں اپنے سیاسی وجود اور نوآبادیاتی ریاستی ڈھانچوں کے تحفظ کیلئے خود کو اس بات پر مجبور پا رہی ہیں کہ وہ امریکہ کا ساتھ دیں اور یہ حکومتیں اپنے ملکوں کے عوام کے جذبات و احساسات کو کچلتے ہوئے انہی کے خلاف امریکی کیمپ میں کھڑی ہیں۔ حالانکہ یہ مجبوری ان کی خود ساختہ ہے جو انہوں نے امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں سے مفادات حاصل کر کے اور بین الاقوامی قرضوں کے جال میں پھنس کر خود پیدا کی ہے۔ اور اگر وہ اپنے ملکوں کی رائے عامہ کے ساتھ کھڑے ہو کر اور عوامی رجحانات کا ساتھ دے کر اس جال اور مجبوری کو توڑنا چاہیں تو یہ بات ان کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس کشمکش میں ایک اور بات مزید نکھر کر سامنے آئی ہے کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی حکومتیں جمہوریت اور رائے عامہ کے جن اصولوں کا مسلسل پرچار کر رہی ہیں وہ محض ڈھونگ ہیں۔ انہیں مسلم ممالک کی رائے عامہ، مسلم عوام کے شہری حقوق، اور ان ممالک میں جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم ایک عرصہ سے یہ بات کہتے آ رہے ہیں کہ جمہوریت، رائے عامہ اور شہری حقوق کے نعرے صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔ جبکہ اس کے کھانے کے دانت اور ہیں جنہیں وہ صرف ضرورت کے وقت ظاہر کرتا ہے اور اپنا کام نکال لیتا ہے۔

چند روز قبل جب امریکہ کی طرف سے پاکستان پر سخت دباؤ تھا کہ وہ اس بات کا ہاں یا ناں میں فوری جواب دے کہ وہ افغانستان کے خلاف حملوں میں امریکہ کا ساتھ دے گا یا نہیں تو ایک امریکی رہنما کو اس کے ٹیلی ویژن انٹرویو میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ پاکستان کی رائے عامہ اس بات کی حمایت نہیں کر رہی کہ حکومت پاکستان افغانستان کے خلاف امریکی حملوں میں افغانستان کے خلاف فریق بنے۔ اس پر اس امریکی لیڈر نے بلا تامل جواب دیا کہ ”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے“۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ امریکی لیڈروں کی نظر میں یہ حیثیت نہیں رکھتی کہ پاکستان کی حکومت کسی بنیادی فیصلے کے موقع پر اس کا بھی لحاظ کرے۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے ایسا نہیں کیا اور مشرف حکومت نے اپنی حکمت عملی طے کرتے وقت امریکی دباؤ اور پاکستانی رائے عامہ کے رجحانات دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس سے مغربی ممالک کے اس طرز عمل کی ایک بار پھر نشاندہی ہوگئی ہے کہ ان کے نزدیک جمہوریت، رائے عامہ اور شہری حقوق کے نعروں کی حیثیت اصولوں کی نہیں ہے کہ وہ ہر جگہ یکساں لاگو ہوں بلکہ یہ صرف ہتھیار ہیں جنہیں ضرورت کے وقت اور ضرورت کے مطابق کسی بھی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس بحران میں سب سے زیادہ مایوسی اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کے بارے میں ہوئی۔ اس کے سیکرٹریٹ نے اپنے طرز عمل سے عام مسلمانوں کے ان تاثرات کی تصدیق کر دی کہ اس تنظیم کا رول بین الاقوامی برادری میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا نہیں ہے بلکہ مسلمان ممالک میں بین الاقوامی قوتوں اور خاص طور پر امریکی مفادات کی نمائندگی اور تحفظ کا ہے۔ ورنہ اس قدر سنگین بحران میں بھی اس کی خاموشی کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اب سنا ہے کہ پاکستان کی کوششوں سے مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلانے کیلئے تحریک ہو رہی ہے۔ مگر ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے فوراً بعد عالمی سطح کے بحران کے آغاز اور شدت کے دور میں او آئی سی کو باہمی

مشاورت اور عالم اسلام کی راہنمائی کے لیے جس طرح متحرک ہونا چاہیے تھا اس کے فقدان نے عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اس تنظیم کی افادیت کو اور زیادہ مشکوک بنا دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ او آئی سی متحرک کردار ادا کر کے عالم اسلام کی مشکلات میں کمی کر سکتی ہے مگر اس کیلئے شرط یہ ہے کہ امریکہ کی چھتری سے نکل کر یہ تنظیم آزاد اور خود مختار ادارہ کی حیثیت سے اپنے کردار کا تعین کرے۔

سانحہ گیارہ ستمبر: لندن میں علماء کا مشترکہ اعلامیہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

لندن پہنچتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد عالمی میڈیا کی ہمہ جہتی یلغار اور شدید امریکی ردعمل کے اظہار نے مسلمان حلقوں کو اس حد تک ششدر کر دیا ہے کہ انہیں کسی اجتماعی اور متوازن موقف اور طرز عمل پر لانے کیلئے خاصی محنت کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی نمائندگی میں نمایاں طور پر دو قسم کی آوازیں میڈیا میں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ آواز ہے جسے انتہا پسندانہ اور جذباتی قرار دیا جا رہا ہے اور اس کے نتائج سے یہاں کے مسلمان خطرات محسوس کر رہے ہیں۔ اور دوسری آواز خالصتاً معذرت خواہانہ ہے جس کا مقصد دینی حلقوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے امریکہ کے موقف اور پروگرام کی اعلانیہ حمایت ہے۔ جبکہ ان دونوں کے درمیان معتدل اور متوازن موقف کیلئے کوئی سنجیدہ کام نہیں ہو رہا جو کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کی غالب اکثریت کا موقف ہے لیکن اس کے اظہار کی کوئی منظم صورت سامنے نہیں آ رہی۔

اس احساس کے تحت پہلے لندن میں اور پھر برمنگھم میں ورلڈ اسلامک فورم کے ذریعے احباب سے ملاقاتوں اور مشاورت کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں جمعیت علماء برطانیہ، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، جمعیت اہلحدیث برطانیہ، یوکے اسلامک مشن، جماعت اہل سنت برطانیہ، مرکزی جمعیت علماء برطانیہ اور دیگر اہم جماعتوں کے قائدین سے صلاح مشورہ کے بعد ۷ ستمبر کو پاکستان میں یومِ یکجہتی کے موقع پر برمنگھم میں مولانا بوستان قادری کی صدارت میں مختلف دینی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس میں اگلے ہفتے کے دوران تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی حلقوں کا مشترکہ اجلاس وسیع پیمانے پر طلب کرنے کا فیصلہ ہوا جس کیلئے مولانا بوستان قادری، مولانا امداد الحسن نعمانی اور قاری عبد الوافی پر مشتمل رابطہ کمیٹی قائم کی گئی جبکہ موجودہ حالات کی روشنی میں مندرجہ ذیل مشترکہ اعلامیہ کی ابتدائی طور پر منظوری دی گئی۔

- ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن کے سانحات میں بے گناہ انسانوں کی موت پر ہر شخص کو دکھ ہے اور ہم سب متاثرہ خاندانوں اور امریکی عوام کے دکھ میں شریک ہیں۔
- دنیا کا کوئی مذہب اور مہذب فلسفہ دہشت گردی اور بے گناہ انسانوں کی خونریزی کو روا نہیں رکھتا اور اسلام بھی امن و سلامتی کے مذہب کی حیثیت سے اس کا روادار نہیں ہے۔ اس لیے دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے

مہم کوئی بھی شروع کرے اسے دنیا کے تمام امن پسند لوگوں کی طرح مسلمانوں کی حمایت بھی یقیناً حاصل ہوگی۔

- دہشت گردی کے اسباب و عوامل، محرکات اور پس منظر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف دہشت گردی کے خاتمہ کی مہم یکطرفہ اور ادھوری ہوگی جس کے نتائج مثبت کی بجائے منفی برآمد ہوں گے اور دہشت گردی کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس لیے یہ ناگزیر بات ہے کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کے اہداف میں دہشت گردی کے اسباب و عوامل کے خلاف مہم کو بھی شامل کیا جائے تاکہ بات مکمل اور منطقی ہو اور تمام اقوام اس میں شریک ہو سکیں۔
- غاصب اور مسلط اقوام کے تسلط کے خلاف آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑنے والی اقوام مثلاً فلسطین، کشمیر، چیچنیا وغیرہ کی مسلح جدوجہد کا دہشت گردی کے اطلاق سے استثناء و امتیاز ضروری ہے۔ ورنہ مظلوم اور زیر تسلط اقوام کی آزادی کیلئے بین الاقوامی اصول اور عالمی حمایت بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور دہشت گردی کے خلاف چلائی جانے والی مہم مظلوم اقوام کو مزید دبانے کا ذریعہ بن جائے گی۔
- اسامہ بن لادن کی طرف سے ۱۱ستمبر کے سانحات میں ملوث ہونے کی واضح تردید کے بعد کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اسامہ کو مجرم قرار دینا اور اسے یا اس کی بنیاد پر افغانستان کی طالبان حکومت کو کسی کارروائی کا نشانہ بنانا انصاف کے مسلمہ اصولوں کے منافی ہوگا جس کا پوری دنیا میں شدید ردعمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی فورم تشکیل دیا جائے جس میں سلامتی کونسل، او آئی سی اور عوامی جمہوریہ چین کی باضابطہ نمائندگی ہو اور اس فورم کے سامنے متعلقہ ثبوت لا کر اس کی تجاویز اور فیصلوں پر عملدرآمد کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی بھی کارروائی انصاف کی بجائے انتقام پر مبنی قرار پائے گی۔
- پاکستان کی سالمیت و وحدت اور قومی خود مختاری نیز وطن عزیز کی عسکری و ایٹمی صلاحیت کا تحفظ سب امور پر مقدم ہے۔ اور حکومت پاکستان کے ہر ایسے اقدام کی بھرپور حمایت تمام پاکستانیوں کی ذمہ داری ہے جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی حیثیت، سالمیت، وحدت، خود مختاری، عسکری صلاحیت و ایٹمی مراکز کی حفاظت، اور وطن عزیز کو بیرونی مداخلت واثرات سے بچانا ہو۔ ہم پاکستان کی حکومت، سیاسی جماعتوں اور دینی حلقوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی بجائے باہمی مشاورت اور اعتماد کے ساتھ پاکستان کو اس سنگین بحران سے نکالنے کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں۔
- او آئی سی، رابطہ عالم اسلامی، مؤتمر عالم اسلامی اور عالم اسلام کے دیگر بین الاقوامی اداروں کو اس موقع پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کی بجائے متحرک ہونا چاہیے اور اس سنگین بحران میں عالم اسلام کی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے، جنگ کے امکانات کو روکنے، اور

دہشت گردی کے خلاف مجوزہ مہم کو صحیح رخ پر ڈالنے کیلئے مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے۔

- برطانیہ اور یورپ میں مقیم مسلمانوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی کے فروغ کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے تمام مکاتب فکر کی دینی و سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہمی رابطہ و مشاورت میں اضافہ کریں اور مسلمانوں کے ملی جذبات کی باوقار نمائندگی کے ساتھ ساتھ یورپ کی مقامی آبادی اور مسلمانوں کے تعلقات میں کسی بھی طرف سے رخنہ پیدا کرنے کی مذموم کوششوں سے باخبر رہیں۔ نیز مقامی آبادی کے ذمہ دار حلقوں اور شخصیات کے ساتھ روابط استوار کر کے انہیں اعتماد دلائیں کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور مسلمان امن پسند شہری ہیں۔ اور یہ کہ مسلمان نہ صرف دہشت گردی کے خلاف ہر سنجیدہ مہم میں تعاون کیلئے تیار ہیں بلکہ دہشت گردی کے اسباب و محرکات کے خلاف اقوامِ متحدہ کی مشترکہ جدوجہد کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ دنیا میں حقیقی امن صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے۔
- یہ بھی وقت کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے استحکام کیلئے ملک میں فوری طور پر نظام مصطفیٰ نافذ کیا جائے اور پاکستان کے خلاف قادیانیوں اور دیگر سازشی گروہوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

کیا امریکہ عالمی قیادت کا اہل ہے؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء

ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خامنہ ای نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم افغانستان پر حملے کیلئے امریکہ کی کسی قسم کی مدد نہیں کریں گے اور ہم افغانستان پر حملوں کے خلاف ہیں کیونکہ ہمارا مسلم پڑوسی ملک پہلے ہی مفلوک الحال ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف مہم یا امن کیلئے کسی عالمی مہم کی قیادت کا اہل نہیں، امریکہ کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ امریکہ ایک طرف عالمی تعاون کیلئے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف عالمی ممالک کی تعظیم ملحوظ نہیں رکھ رہا جو ایک نفرت انگیز رویہ ہے۔ انہوں نے امریکی صدر کے اس بیان پر تنقید کی جس میں امریکی صدر نے تمام ممالک سے کہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے ساتھ ہیں۔ ایرانی راہنما نے کہا کہ نہ ہم امریکہ کے ساتھ ہیں اور نہ دہشت گردوں کے ساتھ ہیں کیونکہ امریکہ کے ہاتھ صیہونی ریاست کے مظالم اور جرائم سے داغدار ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایرانی راہنما کے خیالات موجودہ حالات میں عالم اسلام کی رائے عامہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں لیکن ان پر تبصرہ سے قبل ایران کے حوالے سے ایک اور خبر ملاحظہ فرمالیں کہ گذشتہ روز برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا تہران کا دورہ کرنے کے بعد اسرائیل پہنچے تو وزیر اعظم ایریل شیرون نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا

اور اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے بھی برطانوی وزیر خارجہ کے اعزاز میں دیا جانے والا عشائیہ منسوخ کر دیا۔ اس پر برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے فون پر براہ راست اسرائیلی وزیر اعظم سے بات کی جس کے بعد برطانوی وزیر خارجہ کی اسرائیلی وزیر اعظم سے ملاقات ہو سکی۔ اسرائیلی راہنماؤں کے غصے کی وجہ دورۂ ایران کے موقع پر ایرانی اخبارات میں شائع ہونے والا برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا ایک مضمون بنا ہے جس میں انہوں نے امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ”دہشت گردی کے فروغ میں یہ عنصر بھی کار فرما ہے کہ فلسطین میں کئی سالوں سے جو واقعات رونما ہو رہے ہیں اس پر غصہ و ناراضگی پائی جاتی ہے۔“

خبر کے مطابق اسرائیلی حکمران اس جملے پر بہت زیادہ سیخ پا ہوئے ہیں اور انہوں نے محسوس کیا ہے کہ فلسطین میں رونما ہونے والے تشدد کی ذمہ داری اسرائیل پر ڈالی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون کے دھماکوں کی دھول بیٹھنے کے بعد ان اسباب و عوامل پر غور کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے جو حالات کو اس انتہا پر لانے کا باعث بنے ہیں اور ان اسباب و عوامل میں اسرائیل کا کردار بھی دھیرے دھیرے نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور تبصرہ بھی ملاحظہ فرما لیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید تاریخ کے استاذ مارک المنڈ کا ہے جس میں انہوں نے اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کو سور کا دماغ رکھنے والا اور انتہا پسند قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا ہے کہ

> ”انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ کی حمایت کے بغیر اسرائیل کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اگر امریکہ اس کی پچاس سال سے بھرپور حمایت نہ کر رہا ہوتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس لیے اسے امریکہ کی راہ میں روڑا بننے کی بجائے تعاون کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اپنی بقا، دفاع اور معاشی خوشحالی کیلئے وہ امریکی امداد کا محتاج ہے، اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ گیارہ ستمبر کے حادثے میں جتنے امریکی مارے گئے ہیں اتنے اسرائیلی ۱۹۴۸ء سے اب تک ہونے والی تمام جنگوں میں نہیں مارے گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے صرف ایک جہاز میں جتنے مسافر مارے گئے اتنے اسرائیلی پی ایل او، حماس یا حزب اللہ کے حملوں میں نہیں مرے۔“

ہمارے خیال میں امریکہ میں ہونے والی مبینہ دہشت گردی کے اسباب و محرکات کی نشاندہی اور ان میں اسرائیلی کردار کی اہمیت کے حوالے سے برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا مذکورہ مضمون اور برطانوی اخبار ڈیلی میل میں شائع ہونے والا پروفیسر مارک المنڈ کا یہ تبصرہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ان نئے رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے جو اگرچہ پہلے بھی موجود تھے مگر دبے ہوئے تھے کہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مسلسل پشت پناہی اور تعاون کے اثرات امریکہ کے حق میں مثبت نہیں ہیں۔ البتہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد دیگر سنجیدہ دانشور بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کی طرف برطانوی وزیر خارجہ نے

اپنے مذکورہ بالامضمون میں اشارہ کیا ہے۔ یقیناً اسرائیل کے اس کردار کو نمایاں کرنے اور عالمی رائے عامہ کو اس کی طرف متوجہ کرنے میں ایرانی حکومت کے دوٹوک موقف اور جرأت مندانہ طرز عمل کا بھی دخل ہے بلکہ موجودہ تناظر میں یہ کریڈٹ ایران ہی کو جاتا ہے کہ اس نے اسرائیل کو اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا اور دہشت گردی کے فروغ میں اسرائیلی کردار کو نمایاں کر کے عالمی راہنماؤں اور دانشوروں کو اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ہمیں ایرانی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ہے کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف یا عالمی امن کے حق میں کسی مہم کی قیادت کا اہل نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنا کردار دوہرے پن کا حامل ہے اور اس کے اپنے ہاتھ دہشت گردی کی سرپرستی اور معاونت سے داغدار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کے پاس اسباب و وسائل کی فراوانی ہے۔ دولت، اسلحہ، ٹیکنالوجی اور دنیا بھر میں معاونین اور حمایتیوں کا ایک وسیع حلقہ اسے میسر ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس کا دوہرا معیار و کردار کسی عالمی مہم میں اس کی قیادت کی اہلیت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ کیونکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ

1. امریکہ خود کو نسل پرستی اور دہشت گردی کا مخالف قرار دیتا ہے لیکن وہ اسرائیل کی نسل پرست اور دہشت گرد حکومت کی مسلسل اور مکمل پشت پناہی کر رہا ہے۔
2. امریکہ اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کو بزور قوت نافذ کرنے کا علمبردار ہے لیکن کشمیر کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے فیصلوں اور وعدوں کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔
3. امریکہ شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے لیکن خلیج عرب کے ممالک میں اس کی فوجی موجودگی ان ملکوں کے عوام کے شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کی بحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔
4. امریکہ رائے عامہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اسی کو کسی ملک کے فیصلوں کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن موجودہ مہم میں امریکہ کا ساتھ دینے کے بارے میں پاکستان اور دیگر بہت سے ممالک کی رائے عامہ کی قطعاً کوئی پرواہ کیے بغیر ان حکومتوں پر مہم میں شامل ہونے کیلئے دباؤ ڈالے ہوئے ہے۔
5. امریکہ قوموں کی آزادی اور ممالک کی خود مختاری کے احترام کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے لیکن دہشت گردی کے خلاف خود اپنی طے کردہ مہم میں دنیا بھر کے ممالک کو "ساتھ دو ورنہ دشمن سمجھے جاؤ گے" کے خالص فرعونی لہجے میں دھمکا کر اس نے اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری کا مذاق اڑایا ہے۔

ان حالات میں ایرانی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای کا یہ ارشاد کہ "امریکہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا اہل نہیں" صرف ان کے اپنے جذبات کا اظہار نہیں بلکہ عالمی رائے عامہ بالخصوص دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں کیلئے دعوت فکر بھی ہے جسے نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی اور زیادتی کی بات ہوگی۔

دہشت گردی کا کوئی بھی حامی نہیں ہے اور دنیا کے سب باشعور انسان اس کے خاتمہ کیلئے کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن دہشت گردی کے ساتھ ساتھ اس کے اسباب و محرکات اور عوامل کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔ اور اس عالمی مہم

کی قیادت کیلئے کسی ایسے ملک کو آگے آنا چاہیے جس کا اپنا دامن صاف ہو۔ ہیروشیما، ناگاساکی، ویتنام، فلسطین، افغانستان، اور سوڈان کے نہتے شہریوں پر بم برسانے والے اور مشرق وسطیٰ کے عوام کی سیاسی آزادیوں اور شہری حقوق کا خون کرنے والے ملک کے ہاتھ میں دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا پرچم آخر کس طرح دیا جاسکتا ہے؟

عالمی ابلاغیاتی گھٹن میں تازہ ہوا کا جھونکا

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء

لندن کے ایک اخبار کی خبر ہے کہ امریکی حکومت نے عربوں کے سامنے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کیلئے الجزیرہ ٹی وی پر وقت خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری نے مجھے برنگھم فون کیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میڈیا وار میں بھی بحمد اللہ تعالیٰ مسلمان اس سطح پر آگئے ہیں کہ الجزیرہ ٹی وی نہ صرف مغربی ذرائع ابلاغ کا مقابلہ کر رہا ہے کہ بلکہ امریکہ تک کو اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

الجزیرہ ٹی وی خلیج عرب کی ریاست قطر کا ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے جس کی نشریات عربی میں ہوتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ اس نے خبروں تک رسائی اور انہیں بروقت دنیا کے سامنے لانے کی تکنیک میں اس حد تک محنت اور تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ مغرب کے اکثر ٹی وی چینل افغانستان کے بارے میں اس کے حوالے سے خبریں دینے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ اس میں بنیادی طور پر اس بات کا بھی دخل ہے کہ طالبان حکومت نے صرف الجزیرہ ٹی وی کو ہی افغانستان میں رپورٹنگ کی اجازت دے رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ذہانت، تکنیک اور ضروری وسائل کے بروقت استعمال نے الجزیرہ کو عالمی ذرائع ابلاغ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

یہاں (برطانیہ) کے عام مسلمان جب سی این این اور بی بی سی سمیت بہت سے ٹی وی چینلوں پر "خاص بالجزیرۃ" کی پٹی کے ساتھ روزانہ خبریں اور رپورٹیں دیکھتے ہیں تو انہیں خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ کی صف میں ایک چینل ایسا بھی شامل ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کے یکطرفہ پراپیگنڈے اور رپورٹنگ کو بیلنس کر سکتا ہے۔ جبکہ بہت سے لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اس بار امریکی حملوں اور افغانستان کے خلاف مغربی مہم کے بارے میں عالمی رائے عامہ کے ایک بڑے حصے نے جو احتجاجی روش اختیار کی ہے اور خاص طور پر عرب ممالک میں احتجاج و اضطراب بلکہ مزاحمت و انکار کے جو رجحانات ابھر رہے ہیں ان کے پس منظر میں بھی الجزیرہ ٹی وی کی کاوش کارفرما نظر آ رہی ہے۔

میں نے الجزیرہ ٹی وی دیکھا ہے اور مجھے اس کی یہ روش پسند آئی ہے کہ اس نے مغربی چینلوں کی طرح تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرنے کی بجائے تمام متعلقہ پہلوؤں کو اپنے ناظرین کے سامنے رکھا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں عرب مجاہد اسامہ بن لادن کا انٹرویو پیش کیا ہے وہاں برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کو بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا پورا موقع فراہم کیا

ہے۔ اس کی متوازن پالیسی کی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد بڑھا ہے اور اسے بہت سے دیگر ٹی وی چینلز کیلئے خبروں اور رپورٹوں کے ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی خوشی کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ وہ اور راقم الحروف گذشتہ دس برس سے ''ورلڈ اسلامک فورم'' کے پلیٹ فارم سے چیخ و پکار کر رہے ہیں کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے جس میں میڈیا اور لابنگ جنگی ہتھیاروں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ منصوری صاحب تو میڈیا کو کسی بھی جنگ کا ''مقدمۃ الجیش'' یعنی ہراول دستہ قرار دیتے ہیں۔ امر واقع بھی یہی ہے کہ اگر آج کی ترقی یافتہ اقوام کسی ملک یا قوم کے خلاف جنگ کا فیصلہ کرتی ہیں تو پہلے میڈیا اور پروپیگنڈا کی طاقت سے اسے دنیا کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اور پھر اسے بدنامی کے شکنجے میں پوری طرح کس کر ہتھیاروں کی ضرب لگانا شروع کرتی ہیں۔ خلیج کی جنگ میں ایسا ہی ہوا تھا اور اب بھی مغرب کا یہی ارادہ اور پروگرام تھا مگر الجزیرہ ٹی وی آڑے آگیا اور اس نے تصویر کا دوسرا رخ اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا کہ اب مغربی حکومتوں اور ذرائع ابلاغ کیلئے بھی یکطرفہ بات کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت نے امریکی ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر امارت اسلامی افغانستان کے امیر ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن کے انٹرویو نشر کرنے پر پابندی لگانا چاہی تو ان کیلئے اس پابندی کو قبول کرنا ممکن نہ رہا۔

اس سے قبل یہ خبر بھی سامنے آچکی ہے کہ امریکی وزارت خارجہ نے وائس آف امریکہ کو ہدایت کی ہے کہ طالبان حکومت کے امیر ملا محمد عمر اور دیگر طالبان لیڈروں کے بیانات نشر نہ کیے جائیں کیونکہ امریکی حکومت اسے مناسب نہیں سمجھتی۔ اس کے جواب میں وائس آف امریکہ کے صحافیوں نے اسے آزادیٔ رائے اور اظہار رائے کے حق کے منافی قرار دیتے ہوئے اس پر احتجاج کیا ہے۔ الجزیرہ ٹی وی اور وائس آف امریکہ کے بارے میں امریکی حکومت کے اس طرز عمل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رائے اور اس کے اظہار کی آزادی کا نعرہ مغرب کے نزدیک کسی اصول یا اخلاق کے حوالے سے نہیں بلکہ ہتھیار کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جو بات مغرب کے حق میں ہو اسے پیش کرنے اور پھیلانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو لیکن جو بات مغرب کے مفاد کے خلاف ہو تو اس میں کلام ہے کہ اس کے اظہار کی آزادی ملنی چاہیے یا نہیں۔

ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن کو ہی لے لیجیے کہ اگر امریکی حکومت کے موقف کو وقتی طور پر تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کی حیثیت صرف ملزم کی بنتی ہے کہ امریکہ نے ان پر ایک فرد جرم عائد کی ہے۔ اسے نہ کسی عدالت میں ٹرائیل کیا گیا ہے، نہ کسی فورم پر اس کے ثبوت پیش کیے گئے ہیں، اور نہ ہی دوسرے فریق کو صفائی کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن امریکی قیادت نے یہ سارے مراحل از خود طے کر کے یعنی خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی جج بن کر سزا دینے کیلئے کوڑے بھی برسانے شروع کر دیے ہیں۔ اور امریکہ بہادر کو اصرار ہے کہ جنہیں وہ ملزم قرار دے رہا ہے انہیں اپنی بات کہنے کا موقع نہ دیا جائے اور دنیا کا کوئی ریڈیو یا ٹی وی ان کا کوئی بیان یا انٹرویو نشر نہ کرے جس کے ذریعے وہ اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کر رہے ہوں، اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی نفی کر رہے ہوں، اور اپنی صفائی پیش کر رہے ہوں۔

اب عالمی منظر بدل چکا ہے، لوگ دوسری طرف بھی دیکھ رہے ہیں، ان کی باتیں بھی سن رہے ہیں اور ان کے

موقف اور مجبوریوں پر بھی غور کر رہے ہیں۔ اس لیے طاقت، طاقت اور محض طاقت کے بل پر دنیا سے کوئی بات منوانا ممکن نہیں رہا۔ اور امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ طاقت اور اسلحہ کے بل پر کسی کو وقتی طور پر دبا لینا، عارضی طور پر چپ کرا دینا، اور کچھ عرصہ کیلئے اٹھنے کے قابل نہ رہنے دینا تو ممکن ہے اور شاید افغانستان میں امریکہ ایسا کر بھی گزرے لیکن دباؤ، دھمکی اور تشدد کے ذریعے سے کسی سے بات منوا لینا ممکن نہیں ہے۔ خلیج میں اس نے تجربہ کر لیا ہے جہاں اس نے عراق پر مسلسل بمباری کر کے اسے تباہ حال کر دیا اور جہاں اس کی فوجیں آج بھی براجمان ہیں۔ لیکن اس کے سب سے بڑے اتحادی ملک سعودی عرب کی طرف سے فوجی اڈے دینے سے انکار اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کو سعودی عرب کے دورہ سے روک دینے اور نیز چھوٹی سی ریاست قطر میں میڈیا کے اتنے بڑے مورچے کا قیام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خلیج کے حوالے سے اس کی پالیسیاں دولت کی لوٹ مار سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکیں اور اس خطہ میں اس کا مستقل ایجنڈا آج بھی سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اس لیے امریکہ اگر اس تجربہ کو وسطی اور جنوبی ایشیا میں بھی دہرانا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے دہرائے لیکن یہ بات اسے نوٹ کر لینی چاہیے کہ نتائج کے لحاظ سے یہ تجربہ بھی پہلے سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ اس کا دورانیہ بھی شاید اس سے بہت کم ہو۔

خیر بات الجزیرہ ٹی وی کی ہو رہی تھی کہ اس نے عالمی میڈیا کے محاذ پر مغربی ذرائع ابلاغ کی یکطرفہ مہم کا راستہ روک دیا ہے اور اب اس نے ایک ماہ بعد انگلش چینل کے آغاز کا اعلان کر کے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا ہے جس پر ہم الجزیرہ ٹی وی کے کارپردازان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبولیت سے نوازے اور اس عظیم مورچے کو نظر بد سے محفوظ رکھتے ہوئے عالم اسلام اور عرب دنیا کی زیادہ دیر تک خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

امریکی اتحاد کی یلغار

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)

افغانستان پر امریکی حملے: مقاصد و اہداف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

امارتِ اسلامیہ افغانستان پر امریکہ اور برطانیہ کے حملوں کے خلاف عالمی رائے عامہ مسلسل غم و غصہ کا اظہار کر رہی ہے مگر تادمِ تحریر (۱۷ اکتوبر) حملوں کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور امریکی صدر جارج بش نے حملوں کا دائرہ وسیع کرنے، جنگ کو لمبی مدت تک جاری رکھنے، اور جنگ بند ہونے کے بعد بھی افغانستان میں موجود رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔

یہ حملے بظاہر عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہ کرنے پر طالبان حکومت کو سزا دینے کیلئے کیے جا رہے ہیں جن میں نہتے عوام اور غریب شہری نشانہ بن رہے ہیں، لیکن امریکی صدر کے مذکورہ بالا اعلانات سے واضح ہو گیا ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس بہانے جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا میں فوجی موجودگی کا راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔ اور جس طرح خلیج عرب میں عراق اور کویت میں تنازعہ کھڑا کر کے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں براجمان ہو گئی تھیں، اسی طرح افغانستان کے مسئلہ کو جان بوجھ کر بگاڑا جا رہا ہے تاکہ اس خطہ میں فوجیں اتارنے کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اور طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ چین، پاکستان اور وسطی ایشیا کی فوجی ناکہ بندی اور وسطی ایشیا میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کو زمین سے نکالنے سے پہلے ہی کنٹرول کر لینے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش اور برطانوی وزیر اعظم بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی جنگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے اور ان کی نظر میں اسلام امن پسند مذہب اور مسلمان امن پسند قوم ہیں، لیکن صدر امریکہ نے اس جنگ کو "صلیبی جنگ" قرار دے کر اور برطانوی وزیر اعظم نے ایک حالیہ مضمون میں طالبان کے طرزِ حکومت کو طعن و تنقید کا نشانہ بنا کر اپنے اصل جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔ اور اس سے قبل ان ممالک کے مسلسل طرزِ عمل سے یہ بات دنیائے اسلام پر پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اس جنگ کا ہدف صرف الشیخ اسامہ بن لادن اور طالبان کی اسلامی حکومت نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کی جہادی تحریکات، دینی حلقے اور قرآن و سنت کے ساتھ بے لچک وابستگی رکھنے والے مسلمان ہیں۔ اور مغربی حکمران دراصل عالمِ اسلام میں دینی بیداری کے انہی روز افزوں رجحانات کو ختم کرنے کیلئے میدان میں اترے ہیں۔

برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا ایک مضمون روزنامہ جنگ لندن نے ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے طالبان کی حکومت کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہا ہے کہ طالبان اور اسامہ بن لادن "ایک دقیانوسی اور غیر روادار نظام پوری مسلمان دنیا کو برآمد کرنا چاہتے ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسامہ اور طالبان سے مغربی حکمرانوں کو اصل شکایت یہی ہے کہ وہ افغانستان میں اسلامی نظام کا کامیاب تجربہ کرنے کے بعد پوری دنیائے اسلام میں نفاذِ اسلام کی تحریکات کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں۔ اور

مغربی حکمرانوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر افغانستان میں یہ نظام کامیاب ہو جاتا ہے تو دنیا کے دوسرے مسلم ممالک تک اس نظام کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور مسلم ممالک کو اپنے کنٹرول میں رکھنے اور ان کے وسائل اور صلاحیتوں کا مسلسل استحصال کرتے رہنے کیلئے مغرب نے ان پر جو نوآبادیاتی اور استحصالی نظام طاقت اور سازشوں کے زور پر مسلط رکھا ہوا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہمارے نزدیک اس سارے قضیے کا اصل نکتہ یہی ہے اور باقی سارے عوامل بھی اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب کا استحصالی اور سرمایہ دارانہ نظام اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے، اس کی گرفت عالمی نظام پر ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور تاریخ کا پہیہ حرکت میں آ گیا ہے۔ اس لیے افغانستان کے خلاف فوجی کاروائی اور غریب عوام پر وحشیانہ بمباری اور ان کے قتلِ عام سے اس خطہ کے مسلمانوں کیلئے مشکلات تو کھڑی کی جا سکتی ہیں اور چند سال مزید انہیں پریشان اور مضطرب رکھا جا سکتا ہے، لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ اور سیکولر نظام کو بچانے اور اسلام کے عادلانہ اور فطری نظام کو روکنے کی کوئی کوشش اب زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس میں دنیائے اسلام کی دینی قیادتوں اور اسلامی تحریکات کا امتحان ضرور ہے کہ وہ اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے باہمی رابطہ و مشاورت اور حوصلہ و تدبر کا کس حد تک مظاہرہ کرتی ہیں۔

امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی حیرت انگیز حیرت

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

معروف کالم نگار جناب ارشاد احمد حقانی نے جنگ لندن میں ۱۴ اکتوبر کو شائع ہونے والے کالم میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی ایک حالیہ گفتگو کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے کہ

> ”بش نے کہا کہ مجھے اس نفرت پر حیرت ہے جو اسلامی دنیا میں لوگ امریکہ کیلئے رکھتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے اور ہمارے ملک کے بارے میں دوسرے لوگوں میں کس قدر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اکثر امریکیوں کی طرح مجھے بھی اس نفرت کو سمجھنے میں سخت دقت پیش آتی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم امریکی کتنے اچھے لوگ ہیں۔“

صدر بش کو عالمِ اسلام میں امریکہ کے خلاف پائی جانے والی عمومی نفرت پر حیرت ہو رہی ہے، اور ہمارے لیے ان کی یہ ”حیرت“ سخت تعجب اور حیرت کا باعث بن رہی ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور حکومت کے سربراہ کو ان اسباب و عوامل تک رسائی میں مشکل پیش آ رہی ہے جو دنیائے اسلام میں ان کے ملک کے خلاف نفرت کے فروغ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کے جو ادارے اور ایجنسیاں دنیا کے حالات معلوم کرنے، عالمی سطح پر مختلف اقوام کے رجحانات و خیالات سے باخبر ہونے اور امریکی قیادت کو ان سے باخبر رکھنے پر مامور ہیں، اور جو اس مقصد کیلئے

اربوں ڈالر سالانہ صرف کر ڈالتے ہیں، وہ صدرِ امریکہ کو صحیح صورتحال سے باخبر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اور اگر وہ باخبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو صدر امریکہ کے نزدیک ان کی رپورٹوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ وہ ان پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔

اسی سے کسی قوم اور ملک کے خلاف امریکی قیادت کے فیصلوں کے جواز اور معقولیت کی سطح کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر صدر بش کے ان ریمارکس کے حوالے سے سوال یہ ہے کہ جب امریکی صدر بش کو امریکہ کے خلاف عالمِ اسلام کی نفرت کی وجہ ہی ابھی تک سمجھ نہیں آئی تو وہ "صلیبی جنگ" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں کس بنیاد پر کود پڑے ہیں؟

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ جنگ لندن ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۱ء کے مطابق ساؤتھ ہیمپٹن یونیورسٹی میں ایک درخت پر مقامی کونسل کی طرف سے ایک خط چسپاں کیا گیا ہے جس میں کونسل کی لیگل سروسز کے سربراہ کے دستخطوں کے ساتھ اس درخت کو یقین دلایا گیا ہے کہ اسے کاٹا نہیں جائے گا۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس درخت کو چند دوسرے درختوں کے ساتھ کاٹ کر ان کی جگہ دوسرے درخت لگانے کا منصوبہ تھا۔ جس پر کچھ مقامی لوگوں نے اعتراض کیا تو کونسل نے درخت کو کاٹنے کا فیصلہ تبدیل کر دیا، اور درخت کو مخاطب کر کے اسے تحریری یقین دہانی کرائی ہے کہ اسے کاٹا نہیں جائے گا۔ اس نوٹس میں درخت سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ اس سلسلہ میں اپنا موقف پیش کرنا چاہے تو تحریری طور پر پیش کر سکتا ہے۔

جانوروں اور درختوں کے تحفظ کے سلسلہ میں برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں کے ہمدردانہ طرزِ عمل کے حوالے سے اس قسم کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں کہ چند افراد کے توجہ دلانے پر جانوروں اور درختوں کو نہ صرف ہلاکت اور ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے بلکہ ان کے تحفظ کیلئے باقاعدہ بجٹ بنائے جاتے ہیں اور اس پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف انسانوں کے بارے میں ان حکومتوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ اپنے استحصالی نظام کو بچانے اور دنیا پر چودھراہٹ قائم رکھنے کیلئے لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام سے ان کے ہاتھ رنگین ہیں اور عالمی رائے عامہ ان کی اس سفاکی پر مسلسل چیخ و پکار کر رہی ہے مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو لندن کی سڑکوں پر ہونے والے اس مارچ اور مظاہرہ میں راقم الحروف بھی شریک تھا جس میں افغانستان پر امریکہ و برطانیہ کے حملوں کو بلاجواز قرار دیتے ہوئے بے گناہ افغانیوں کے قتلِ عام کی مذمت کی گئی اور افغانستان پر بمباری فی الفور بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مظاہرہ میں محتاط رپورٹ کے مطابق پچیس ہزار افراد شریک ہوئے جن میں ہر مذہب، ہر مکتبِ فکر، ہر علاقہ اور ہر رنگ و نسل کے لوگ شامل تھے۔ اور سب نے متفقہ طور پر افغان عوام کے قتلِ عام کی مذمت کرتے ہوئے جنگ بند کرنے اور مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر چند

افراد کی درخواست پر ہیمپٹن یونیورسٹی کے ایک درخت کو تحفظ فراہم کرنے والی برطانوی حکومت نے ہزاروں برطانوی شہریوں کے اس احتجاج کا نوٹس لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی، اور برطانیہ کی شراکت کے ساتھ امریکی حملے افغانستان پر بدستور جاری ہیں۔ غالباً اسی کیفیت اور صورتحال کیلئے کہا گیا ہے کہ

"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور"

اظہارِ رائے کی آزادی کا مغربی معیار

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

مغرب کو رائے کی آزادی اور اس کے اظہار کے حق پر بڑا ناز ہے اور دوسری اقوام و ممالک پر اس کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ وہ اظہارِ رائے کے اس معیار کو پورا نہیں کرتے جو مغرب کے نزدیک ضروری ہے۔ لیکن مغرب کا اس سلسلہ میں اپنا طرزِ عمل کیا ہے، اس کا اندازہ روزنامہ جنگ لندن ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کی اس خبر سے کیا جا سکتا ہے کہ

> "امریکی وزارتِ خارجہ نے عالمی نشریاتی ادارے وائس آف امریکہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ افغانستان کے حکمران ملا محمد عمر اور دوسرے طالبان راہنماؤں کے انٹرویو نشر نہ کرے۔ وزارتِ خارجہ کے ترجمان رچرڈ باؤچر نے کہا ہے کہ امریکی حکومت کے خیال میں یہ درست نہیں ہے کہ طالبان راہنماؤں کے انٹرویو امریکی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیے جائیں، اور امریکہ میں ٹیکس ادا کرنے والے عوام بھی طالبان راہنماؤں کے انٹرویو نشر ہونے کو پسند نہیں کریں گے۔ وائس آف امریکہ کے صحافیوں نے وزارتِ خارجہ کی اس ہدایت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس اقدام کو صحافتی اصولوں کے منافی اور آزادیٔ اظہار پر قدغن قرار دیا ہے۔"

اسی طرح امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے گزشتہ روز دولتِ قطر کے حکمران سے فون پر بات کرتے ہوئے ان سے تقاضہ کیا ہے کہ الجزیرۃ ٹی وی کو لگام دی جائے اور اس کی نشریات پر پابندی لگائی جائے۔

الجزیرۃ ٹی وی کی نشریات عربی زبان میں ہوتی ہیں، اس کا ہیڈ کوارٹر قطر میں ہے، اس نے خبروں کے معیار اور وسعت میں ورلڈ میڈیا میں یہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ بہت سے مغربی ٹی وی اسٹیشن الجزیرۃ سے خبریں حاصل کر کے اس کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ اور اس نے مغربی ذرائع ابلاغ کی اجارہ داری کو توڑتے ہوئے الشیخ اسامہ بن لادن اور طالبان حکومت کے موقف کو تفصیل کے ساتھ عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کیا ہے، جس سے دنیا کے ایک بڑے حصے تک افغانستان کے بارے میں صحیح خبریں پہنچ رہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ امیر قطر نے امریکی وزارتِ خارجہ کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ الجزیرۃ ایک پرائیویٹ ادارہ ہے جو اپنی پالیسیوں میں آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی اظہارِ رائے کی آزادی کے منافی ہوگی۔ ہم دولتِ قطر کے اس موقف کا خیر مقدم کرتے ہوئے امریکی حکمرانوں

سے عرض کریں گے کہ خود اپنے پڑھائے ہوئے سبق کو دہرائے جانے پر وہ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟

افغانستان پر جاری امریکی حملہ: برطانوی رائے عامہ کا ردعمل

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ نومبر ۲۰۰۱ء

گلاسگو برطانیہ کے بڑے شہروں میں سے ہے جہاں مجھے ہر سال دو چار روز کیلئے حاضری کا موقع ملتا ہے۔ اس سال بھی معمول کے مطابق حاضری ہوئی مگر نئی بات یہ ہوئی کہ مجلس احرار اسلام پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات عبد اللطیف خالد چیمہ مجھ سے پہلے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجلس احرار اسلام سکاٹ لینڈ کے زیر اہتمام مرکزی جامع مسجد گلاسگو میں ''عالم اسلام کی موجودہ صورتحال اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے ایک جلسہ کا اہتمام کار کھا تھا جس میں مہمان خصوصی کی کرسی پر انہوں نے مجھے بٹھا دیا۔ جلسہ میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث مکاتب فکر اور جماعت اسلامی کے سرکردہ علماء کرام نے شرکت کی۔ بعض حاضرین کا کہنا تھا کہ ۱۱ ستمبر کے سانحہ کے بعد پہلا موقع ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام مشترکہ فورم سے اس مسئلہ پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔

گلاسگو کی مقامی آبادی افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف دو بار مظاہرہ کر چکی ہے۔ ۲۷ اکتوبر کو ہونے والے مظاہروں میں راقم الحروف نے بھی جمعیت علماء برطانیہ کے رہنما مولانا امداد الحسن نعمانی، مجلس احرار اسلام کے رہنما عبد اللطیف خالد چیمہ، اور شیخ عبد الواحد کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ مظاہرہ گلاسگو کے جارج سکوائر میں ایک اسٹوڈنٹ تنظیم کی طرف سے کیا گیا اور اس میں مختلف جماعتوں کے رہنماؤں کے علاوہ اسکاٹش پارلیمنٹ کے مقامی ممبر ٹامی شیرون نے خطاب کیا۔ مظاہرین نے مختلف کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر جنگ بند کرو، جنگ نہیں امن، دہشت گردی کا علاج دہشت گردی نہیں جیسے نعرے درج تھے۔ ایک کتبے پر ''تین دہشت گرد بھائی: بش، بلیئر اور بن لادن'' لکھا ہوا تھا۔ مقررین کی تقریروں کے دوران ریلی کے شرکاء تالیوں اور سیٹیوں کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

اسکاٹش پارلیمنٹ کے ممبر نے برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پارلیمنٹ میں بحث و مباحثہ کیے بغیر اور ہم سے پوچھے بغیر جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا ہے جبکہ ہم اس جنگ کی حمایت نہیں کرتے اور نہتے افغان شہریوں پر بمباری اور ان کے قتل عام کو ظلم تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے افغانستان پر حملے روکنے کا مطالبہ کرتے ہوئے وزیر اعظم ٹونی بلیئر سے کہا کہ وہ اس معاملہ کو پارلیمنٹ میں لائیں اور رائے شماری کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ ارکان پارلیمنٹ کی رائے کیا ہے۔

ریلی میں ایک افغان طالبہ نے بھی تقریر کی جسے سب سے زیادہ داد ملی۔ اس طالبہ کا نام حورا قادر ہے اور اس نے انگلش میں پرجوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ بش اور بلیئر افغانستان میں جو مقاصد حاصل کرنا

چاہتے ہیں انہیں ان میں کامیابی نہیں ہوگی کیونکہ افغان قوم نے ہمیشہ اپنی آزادی برقرار رکھی ہے اور وہ اب بھی اپنی آزادی کا تحفظ کرے گی۔

برطانوی دارالعوام میں جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے میں ممبر پارلیمنٹ جارج گیلوے سب سے پیش پیش ہیں اور ان کا تعلق بھی گلاسگو سے ہے۔ انہوں نے عراق پر امریکی جارحیت کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اب افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف بلند آواز کے ساتھ کلمۂ حق بلند کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے گذشتہ دنوں برطانوی اور اسکاٹش پارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں کا شکوہ کیا ہے کہ وہ انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے وزیراعظم ٹونی بلیئر کی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں لندن کے ایک اخبار میں جارج گیلوے کا بیان شائع ہوا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

گلاسگو کیلون سے لیبر ممبر پارلیمنٹ جارج گیلوے نے ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے مسلمان ارکان کو چیلنج کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ مباحثہ کریں کہ افغانستان میں امریکہ اور برطانیہ کی جنگ کیسے جائز ہے اور اس کی کیوں حمایت کی جائے؟ انہوں نے کہا کہ ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے مسلمان ارکان مباحثہ کیلئے جگہ اور سامعین کا خود انتخاب کریں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسلمان ارکان پارلیمنٹ سے یہ بحث کرنا چاہتے ہیں کہ وہ افغانستان پر حملوں کیلئے کیا جواز پیش کرتے ہیں اور تین ہفتوں سے روزانہ چوبیس گھنٹے بمباری کی کیوں حمایت کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جنگ کے خلاف انہیں روزانہ ہزاروں خطوط آرہے ہیں جن میں سے اکثر خط مسلمانوں کے ہیں، وہ بمباری کے خلاف سخت مشتعل ہیں۔ جارج گیلوے نے کہا کہ یہ امر افسوسناک ہے کہ وہ اور دیگر ارکان پارلیمنٹ ایک عرصہ سے یہ جنگ لڑ رہے تھے کہ مسلمانوں کو ارکان پارلیمنٹ بنایا جائے لیکن دکھ کی بات ہے کہ وہ مسلمانوں کی بجائے وزیراعظم کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جارج گیلوے نے (سب سے پہلے) جب پارلیمنٹ میں افغانستان کے خلاف امریکی حملوں پر احتجاج کیا تھا اور جنگ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو وہ تنہا تھے لیکن اب ان کی حمایت پارلیمنٹ کے اندر اور باہر بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے ارکان پارلیمنٹ بھی رفتہ رفتہ ان کی مہم میں شریک ہو رہے ہیں اور عوامی سطح پر جنگ کے خلاف احتجاج کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

لندن میں گذشتہ ہفتے بہت بڑی ریلی ہوئی تھی اور ۱۸ نومبر کو لندن میں جنگ کے خلاف اس سے بھی بڑی ریلی منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جس کا اہتمام سی این ڈی اور گرین پارٹی جیسی جماعتیں کر رہی ہیں۔ مسلم پارلیمنٹ کے لیڈر ڈاکٹر غیاث الدین اس مقصد کیلئے متحرک ہیں کہ اس ریلی میں مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں۔ گذشتہ روز انہوں نے ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری سے ملاقات کی جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر دونوں رہنماؤں نے ۱۸ نومبر کی ریلی کو کامیاب بنانے اور اس میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی شرکت کو یقینی بنانے کیلئے مشترکہ رابطوں کا فیصلہ کیا۔

اس کے علاوہ گذشتہ ہفتے برمنگھم میں جمعیت علماء برطانیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری تصور الحق کی دعوت پر مختلف دینی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں طے پایا کہ ۱۱ نومبر کو برمنگھم میں جنگ کے خلاف ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جائے گا جس سے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام خطاب کریں گے۔

الغرض برطانیہ میں عوامی سطح پر اور مسلمانوں کے دینی حلقوں میں جنگ کے خلاف بیداری بڑھ رہی ہے اور اس پس منظر میں گلاسگو کی مرکزی جامع مسجد میں مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والا مذکورہ مشترکہ جلسہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جلسہ سے راقم الحروف اور جناب عبد اللطیف خالد چیمہ کے علاوہ جمعیت علماء برطانیہ کے رہنما مولانا صاحبزادہ امداد الحسن نعمانی، ورلڈ اسلامک مشن کے رہنما علامہ فروغ القادری، جمعیت اہل حدیث کے رہنما مولانا محمد ادریس مدنی، یوکے اسلامک مشن کے رہنما مولانا عبد الرحمان عابد، اور مرکزی جامع مسجد گلاسگو کے خطیب مولانا حبیب الرحمان نے خطاب کیا۔ علامہ فروغ القادری گلاسگو میں مولانا شاہ احمد نورانی کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ نمائندگی صرف ورلڈ اسلامک مشن تک محدود نہیں بلکہ ان کی وضع قطع، انداز گفتگو اور تازہ بتازہ معلومات میں بھی مولانا نورانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور اس قسم کی نستعلیق اور ٹو دی پوائنٹ گفتگو اس مکتب فکر میں مولانا نورانی کا کوئی نمائندہ ہی کر سکتا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں اس نکتے پر زیادہ زور دیا کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو اپنے ملک کے قوانین کی پابندی اور اپنے معاہدات اور حلف کی پاسداری کرتے ہوئے ظلم کی مخالفت اور مظلوموں کی حمایت کیلئے قانونی ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی آواز بلند کرنے کیلئے مسلمان جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے انہیں گریز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے والے حلقوں کے ساتھ شریک ہوں، میڈیا و لابنگ کے محاذ پر متحرک ہوں، بے گھر مسلمانوں کی امداد کیلئے مالی تعاون کو منظم کریں، اور مسلم حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ افغانوں کے قتل عام پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کی بجائے امریکی حملوں کو رکوانے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔

یہ جنگ فراڈ ہے: برطانوی صحافی جان پلجر کا تجزیہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۷ نومبر ۲۰۰۱ء

گذشتہ روز گلاسگو میں مجلس احرار اسلام سکاٹ لینڈ کے صدر شیخ عبد الواحد کی رہائش گاہ پر مختلف ٹی وی چینلز پر خبریں دیکھ رہا تھا۔ انگریزی نہ جاننے والے میرے جیسے لوگوں کیلئے پاکستانی چینل پرائم ٹی وی اور سکائی ٹی وی کے اردو پروگراموں کے علاوہ اے آر وائی کا چینل موجود ہے جبکہ عربی سمجھنے والوں کیلئے قطر کا الجزیرہ ٹی وی شب و روز معلومات اور دستاویزی پروگرام اس انداز سے پیش کر رہا ہے کہ اور کسی چینل کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ ایسے تو قادیانیوں کا چینل بھی ایم ٹی وی (مسلم ٹی وی احمدیہ) کے نام سے شب و روز مسلسل مصروف رہتا ہے لیکن اس کے پروگرام میں اپنے ناظرین کو حالات حاضرہ اور عالمی صورتحال سے باخبر رکھنا سرے سے شامل ہی نہیں اور اس کے تمام تر پروگرام اپنے مذہب کی تبلیغ اور اسلام کے نام پر اپنے معتقدات کو پیش کر کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش پر مشتمل ہوتے ہیں کہ حقیقی اسلام صرف ان کے پاس ہے اور ”اصلی تے وڈے مسلمان“ وہی ہیں۔

البتہ کبھی کبھی مغربی میڈیا کا رخ اور انداز معلوم کرنے کیلئے دوسرے چینلز پر بھی نظر ڈالنی پڑ جاتی ہے اور کوئی

انگریزی جاننے والا دوست پاس موجود ہو تو اس کی مدد سے پکچر کے ساتھ ساتھ خبر بھی کچھ نہ کچھ پلے پڑ جاتی ہے۔ بی بی سی کا چوبیس گھنٹے خبریں نشر کرنے والا چینل سامنے تھا اور اسکرین پر چند نوعمر لڑکے اور لڑکیاں گفتگو کر رہی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ لندن کے ویسٹ منسٹر کے علاقہ میں ان لڑکوں اور لڑکیوں کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر ۱۱ ستمبر کے حملوں کی فلم دکھائی گئی ہے اور ان سے باری باری ان کے تاثرات دریافت کیے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی اور غالباً کسی اسکول کی طالبہ تھی، اس کی زبان سے اسامہ بن لادن کا نام سن کر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے دوست سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی کہہ رہی ہے کہ گیارہ ستمبر کے یہ واقعات انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ ہیں جن پر اسے بہت صدمہ ہوا ہے، امریکہ ان واقعات کا مجرم اسامہ بن لادن کو قرار دے رہا ہے جبکہ اسامہ نے انکار کیا ہے اور امریکہ کہتا ہے کہ اس کے پاس ثبوت موجود ہیں تو ان واقعات کی فلم دکھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ ثبوت اور پروف کیوں نہیں دکھائے جاتے؟ ہم وہ ثبوت بھی اس فلم کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔

امریکہ گیارہ ستمبر کے واقعات کا ذمہ دار اسامہ بن لادن کو ٹھہرانے کے ثبوت پیش کرنے کی پوزیشن میں ہے یا نہیں مگر یہ بات دن بدن واضح ہوتی جا رہی ہے کہ خود مغرب کی رائے عامہ امریکہ کے اس دعویٰ کو کسی واضح دلیل کے بغیر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور عام آدمی حتیٰ کہ بچوں پر بھی یہ حقیقت کھلتی جا رہی ہے کہ اصل قصہ کچھ اور ہے اور امریکہ اپنے اصل اہداف پر پردہ ڈالنے کیلئے اسامہ بن لادن اور طالبان کا نام استعمال کر رہا ہے۔ ہم یہ پروگرام دیکھ کر اس پر آپس میں تبصرہ کر رہے تھے کہ شیخ عبد الواحد نے بتایا کہ برطانوی اخبار ڈیلی مرر کی تو آج کی بڑی سرخی ہی یہی ہے کہ ''یہ جنگ فراڈ ہے''۔ اور اس سرخی کے تحت ایک سینئر برطانوی کا تجزیہ شائع ہوا ہے جس میں جنگ کے اصل مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گلاسگو سے لندن پہنچا تو ایک اور دوست جن کا تعلق لاہور سے ہے، ڈیلی مرر کا یہ پرچہ سنبھالے میرے منتظر تھے اور مجھے اس کا ترجمہ سنانے کی تیاری میں تھے۔ ڈیلی مرر کا یہ شمارہ ۲۹ اکتوبر کا ہے اور اس کی بڑی سرخی یہ ہے کہ

This war is a fraud یہ جنگ فراڈ ہے۔

یہ ایک برطانوی صحافی جان پلجر (John Pilger) کے تجزیاتی مضمون کا عنوان ہے۔ جان پلجر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کا شمار برطانیہ کے سینیئر صحافیوں میں ہوتا ہے اور اب تک وہ صحافتی خدمات کے حوالے سے چالیس کے لگ بھگ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں جن میں ''سال کا بہترین صحافی'' کا ایوارڈ بھی شامل ہے جو انہیں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۹ء میں دو بار ملا اور ۱۹۷۰ء میں انہوں نے ''سال کا بہترین بین الاقوامی رپورٹر'' کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ جبکہ انہوں نے مڈل ایسٹ، افریقہ اور دوسرے علاقوں میں صحافی خدمات سرانجام دیں جن میں متعدد جنگوں کی رپورٹیں بھی شامل ہیں۔ جان پلجر نے اس عنوان کے تحت موجودہ صورتحال کا جو تجزیہ کیا ہے اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے بلکہ امریکہ کے خفیہ استعماری ایجنڈا کی تکمیل کیلئے ہے جس کا مقصد پوری دنیا میں نوآبادیات کا ایک نیا نظام قائم کر کے اس پر تسلط جمانا ہے۔ برطانیہ اس میں صرف معاون ہے اور وزیراعظم ٹونی بلیئر نے اس جنگ میں جو رول اختیار کیا ہے اس سے برطانوی فوجوں کو ''کرائے کے سپاہی'' یا اس سے کچھ بہتر پوزیشن

کے سوا کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔

یہ بات ثابت کرنے کیلئے کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ تین ہفتوں کی مسلسل بمباری میں کوئی دہشت گرد قتل یا گرفتار نہیں ہوا اور نہ ہی کسی مبینہ دہشت گرد کو کوئی نقصان پہنچا ہے بلکہ غریب شہری بمباری کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جھونپڑیوں، ہسپتالوں، امدادی مراکز، ریڈ کراس کے اڈوں اور خوراک کے ذخیروں پر بم گرائے جا رہے ہیں جس کا مقصد صرف عوام کو مارنا ہے اور دنیا کا سب سے طاقتور ملک سب سے کمزور اور غریب ملک کے بھوکے عوام پر بم برسا رہا ہے۔ اس جنگ میں ''کلسٹر بم'' استعمال کیے جا رہے ہیں جو صرف لوگوں کو مارنے اور آبادیوں کو نشانہ بنانے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ ان بموں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ صرف عام لوگوں کو مارنے کیلئے ہی استعمال ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی ہتھیار ریاستی دہشت گردی کیلئے سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہے تو وہ یہی بم ہے جو امریکہ افغانستان کی شہری آبادی پر یہ کہہ کر گرا رہا ہے کہ اس کا مقصد عوام کو مارنا نہیں ہے۔

گیارہ ستمبر کے واقعات میں کوئی افغانی ملوث نہیں ہے اور جن لوگوں کے اس سلسلہ میں نام لیے جا رہے ہیں ان میں ایک بھی افغانی نہیں ہے لیکن اس کی سزا افغان عوام کو دی جا رہی ہے۔ اسامہ بن لادن کو ان واقعات کا مجرم قرار دیا جا رہا ہے جو خود امریکہ کی پیداوار ہے، اسے امریکہ نے روس کے خلاف جنگ کی ٹریننگ دی اور سپورٹ کیا۔ اسے سی آئی اے نے امداد دی اور اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ٹریننگ امریکہ اور جرمنی میں ہوئی۔

افغانستان پر جب طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو امریکہ نے خاموشی اختیار کی اور خفیہ طور پر طالبان حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ یہ رابطہ امریکی ریاست ٹیکساس کے دارالحکومت ہیوسٹن کی ایک کمپنی نے کیا جس کا نام ''یونوکال'' ہے جس میں امریکی حکومت کی درپردہ خواہش اور حمایت شامل تھی۔ طالبان حکومت کے نمائندوں کے ساتھ اس تجارتی کمپنی کے مذاکرات ہوئے جن کا مقصد وسطی ایشیائی ریاستوں سے تیل اور گیس حاصل کرنے کیلئے افغانستان کے اندر سے پائپ لائن گزارنے پر طالبان کو آمادہ کرنا تھا۔ امریکہ کا خیال تھا کہ طالبان کو افغانستان میں سعودی عرب کی طرز کی حکومت اور نظام قائم کرنے پر آمادہ کر لیا جائے گا جس میں عوام کو حقوق حاصل ہوں یا نہ ہوں مگر وسطی ایشیا کے تیل کے ذخائر پر امریکی کنٹرول کیلئے افغانستان ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر لے تو افغانستان کی تعمیر نو بھی سعودی عرب کی طرز پر کر دی جائے۔ مگر طالبان حکومت کے ساتھ امریکہ کی یہ ڈیل کامیاب نہ ہو سکی جبکہ امریکہ کی اس خطہ کے حوالے سے سب سے بڑی ترجیح یہی ہے کہ اسے وسطی ایشیا کے تیل اور گیس کا کنٹرول حاصل ہو جائے جو مڈل ایسٹ کے بعد دنیا میں تیل اور گیس کے سب سے بڑے ذخائر ہیں اور جن تک رسائی افغانستان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

امریکہ کی یہ جنگ صرف اس مقصد کیلئے ہے اور حیرت کی بات ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے کھلم کھلا اس عندیہ کا اظہار کر دیا ہے کہ ماڈریٹ طالبان امریکہ کی حمایت سے قائم ہونے والی کمزور سی حکومت کو قبول کر لیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کا اصل مقصد افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا ہے اور اس پر صرف دکھاوے کیلئے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ اس جنگ میں دراصل امریکی خواہشات کارفرما ہیں اور جب ہمارے لیڈر جنگ کی طوالت کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جنگ پچاس سال تک بھی جاری رہ سکتی ہے تو انسان کا

سانس رک جاتا ہے۔ جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے اس کو روکنے کا راستہ یہ نہیں ہے بلکہ اس سے دہشت گردی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گا۔

گیارہ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی افسوسناک ہے مگر اس کے جواب میں افغان عوام کے خلاف دہشت گردی کے ارتکاب اس سے زیادہ افسوسناک ہے۔ برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر اگر دہشت گردی کو روکنا چاہتے ہیں توسب سے پہلے اسلحہ کی فروخت کو روکیں۔ یہ منافقت کی انتہا ہے کہ جس روز امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جارہا تھا اسی دن لندن کے ڈاک لینڈ کے علاقہ میں برطانوی اسلحہ کی نمائش کا افتتاح تھا۔ اس اسلحہ میں کلسٹر بم اور میزائل بھی شامل ہیں اور اس اسلحہ کی خریدار وہ حکومتیں ہیں جو اپنے عوام پر ظلم ڈھاتی ہیں، جنہوں نے اسلحہ وطاقت کے زور پر عوام کے حقوق دبا رکھے ہیں۔ یا وہ گروہ یہ اسلحہ خریدتے ہیں جو دنیا میں دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت ایک طرف ایسے اسلحہ کی فروخت کا اہتمام کرتی ہے اور دوسری طرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نعرہ لگایا جاتا ہے، یہ منافقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وزیراعظم ٹونی بلیئر نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اخلاقی قدروں کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے اندر جو اخلاقی حس اور صلاحیت موجود ہے ہم اس کی بنیاد پر یہ جنگ جیت لیں گے لیکن یہ اخلاقی قدریں خود ساختہ ہیں اور اسی طرح کی ہیں جیسے پرانے نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتیں کچھ اخلاقی قدروں کو عنوان بنا کر کمزور ممالک کے خلاف جنگ کیلئے بحری بیڑے روانہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان اخلاقی قدروں کا انتخاب استعماری قوتیں خود کرتی ہیں اور ان کی بنیاد معروضی حقائق پر نہیں بلکہ اپنے مفادات پر ہوتی ہے۔ اگر بات اخلاقی قدروں کی ہے تو وزیراعظم ٹونی بلیئر یہ بتائیں کہ انہوں نے اسرائیل سے فلسطین کے مقبوضہ علاقے آزاد کرانے کیلئے کیا کچھ کیا؟ اس کیلئے سلامتی کونسل کی واضح قرارداد موجود ہے کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلا جائے اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ خالی کر دے۔ لیکن اسرائیل اس کے باوجود اپنی ضد پر قائم ہے جبکہ اقوامِ متحدہ کے فیصلے خاموش ہیں۔ کیونکہ اقوامِ متحدہ اب صرف امریکہ اور برطانیہ کا نام ہو کر رہ گیا ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہی وہاں سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عراق کو مسلسل بمباری کا نشانہ بنایا گیا ہے جہاں پانچ لاکھ بچے بھوک سے مر گئے ہیں اور معروف اخبار وال اسٹریٹ جرنل نے دو سال قبل ایک رپورٹ میں کہا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کو اب عراق میں کوئی ہدف نظر نہیں آرہا ہے کیونکہ شاید ہی وہاں کوئی مکان ایسا باقی رہ گیا ہو جو ان کی بمباری کا نشانہ نہ بنا ہو۔

میں عراق گیا تو ایک عورت نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند چرواہا تھا جو کھلے میدان میں بکریاں چرا رہا تھا، اس کے چار بچے بھی ساتھ تھے کہ اچانک دو جہاز آئے اور ان پر بم برسا کر چلے گئے جس سے اس کا خاوند اور چار بچے جاں بحق ہو گئے۔ اس عورت نے کہا کہ میں اس جہاز کے پائلٹ سے ملنا چاہتی ہوں اور اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس نے کیا دیکھ کر بکریوں کے اس ریوڑ اور اس کے چرواہے کو بمباری کا نشانہ بنایا تھا؟ امریکہ اگر دہشت گردی کو ختم کرنا چاہتا ہے تو فلوریڈا کے ساحل کا رخ کرے جہاں سی آئی اے نے ٹارچر سیل قائم کر رکھے ہیں اور جہاں لوگوں کو لا کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر ان مراکز کا رخ کیا جائے جہاں جنوبی امریکہ کے ظالم اور ڈکٹیٹر حکمرانوں کو پناہ دی جاتی ہے اور سی آئی اے انہیں

فنڈز فراہم کرتی ہے۔ یہ دہشت گردوں کے اصل مراکز ہیں جن کا خاتمہ ضروری ہے مگر اس کی بجائے کمزور ملکوں کو دبا کر اور انہیں حملوں کا نشانہ بنا کر اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ قرار دیا جا رہا ہے جو سراسر جھوٹ اور فراڈ ہے۔

افغانستان کی صورتحال پر ایک پینل انٹرویو

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ نومبر ۲۰۰۱ء

گذشتہ روز لندن کے ٹی وی چینل اے آر وائی ڈیجیٹل کے پینل انٹرویو کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ موضوع ''افغانستان کی صورتحال'' تھا اور شرکائے گفتگو میں دیگر حضرات کے علاوہ برطانوی دارالامراء کے رکن لارڈ نذیر احمد بھی شامل تھے۔ اردو اور انگلش کے ایک گھنٹے کے اس ملے جلے پروگرام میں ٹیلی فون پر جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے ترجمان جنرل راشد قریشی سے بھی رابطہ کیا گیا اور پینل کے شرکاء نے ان سے سوالات کیے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ اور کراچی کے کچھ ناظرین نے بھی فون پر سوالات کیے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اے آر وائی ڈیجیٹل کے پی جے میر صاحب نے پروگرام کنڈکٹ کیا، ان کا پہلا سوال مجھ سے تھا کہ کیا آپ طالبان کی حمایت کرتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو دوسرا سوال ہوا کہ طالبان کی حمایت کس وجہ سے کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا اس لیے کہ طالبان ایک جائز موقف کیلئے لڑ رہے ہیں، وہ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی نتائج کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ان پر یہ جنگ ٹھونسی گئی ہے اور وہ مظلوم ہیں اس لیے میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ اس پر لارڈ نذیر احمد صاحب نے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے طالبان کے موقف سے اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ جب امریکہ اور عالمی برادری نے ان سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کا مجرم ہے اس لیے اسے امریکہ کے حوالہ کر دیا جائے تو انہیں یہ مطالبہ مان لینا چاہیے تھا۔ آخر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابیٔ رسول حضرت ابو جندلؓ کو کفار مکہ کے مطالبہ پر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ یہ بات دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

1. ایک اس وجہ سے کہ جناب رسول اللہؐ نے صلح حدیبیہ میں قریش کے مطالبہ پر حضرت ابو جندلؓ کو ان کے حوالہ کر دیا تھا لیکن یہ ایک معاہدہ کا نتیجہ میں تھا۔ کفار مکہ کے ساتھ آنحضرتؐ کا باقاعدہ معاہدہ ہوا تھا جس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ قریش مکہ کا کوئی شخص انہیں چھوڑ کر حضورؐ کے پاس جائے گا تو آپؐ اسے واپس کر دیں گے۔ یہ معاہدہ طے پانے کے بعد حضرت ابو جندلؓ پابہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آپ کے ساتھ مدینہ منورہ جانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں معاہدہ کر چکا ہوں اس لیے ساتھ نہیں لے جا سکتا چنانچہ ابو جندلؓ کو قریش مکہ اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ لیکن امریکہ

اور طالبان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں ہے، نہ مجرموں کے باہمی تبادلہ کا کوئی معاہدہ موجود ہے اور نہ ہی امریکہ نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے اسامہ بن لادن کے حوالے کرنے کا مطالبہ کا ہی سرے سے کوئی جواز نہیں بنتا۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ نے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دے دیا ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اس کیس میں امریکہ کی حیثیت مدعی کی ہے یا مجسٹریٹ کی؟ اگر امریکہ مدعی ہے تو وہ کونسی غیر جانبدار عدالت ہے جس نے امریکہ کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دیا ہے؟ طالبان نے اسامہ کی حوالگی سے انکار نہیں کیا، صرف ثبوت مانگے ہیں اور غیر جانبدار عدالتی فورم کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے اور ان کا یہ موقف جائز ہے۔

گفتگو میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ طالبان پاکستان کے مخالف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں، طالبان نے کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کے موقف سے اختلاف اور چیز ہے اور پاکستان کی مخالفت اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں ان دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے۔

پھر یہ کہا گیا کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان میں لڑنے کیلئے جا رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ اس کا جواب قاضی حسین احمد صاحب نے دیا کہ طالبان نے کسی کو اپنے ملک میں لڑنے کیلئے بلایا ہے اور نہ کوئی جا رہا ہے یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ جبکہ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ افغانستان میں جا کر جہاد میں شریک ہونے کا عزم ظاہر کر رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ امریکہ کے خلاف لڑنے کا عزم رکھتے ہیں اور امریکہ کے خلاف جنگ کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان تو اس جنگ میں خود کو فریق ہی تسلیم نہیں کر رہا تو اس کے خلاف جنگ کیسی؟

پینل گفتگو میں ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ قاضی حسین احمد نے اپنی ٹیلی فونک گفتگو میں کہا کہ جنرل پرویز مشرف اپنے موقف میں تنہا ہیں اور ان کے ساتھ ایک محدود ٹولہ ہے جبکہ پوری قوم ان کے اس موقف کے خلاف ہے۔ اس پر کہا گیا کہ دینی جماعتوں کو تو پارلیمنٹ میں کبھی ایسی نمائندگی حاصل نہیں رہی کہ وہ پوری قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتیں اس لیے یہ کہنا کہ قوم ان کے ساتھ ہے مشکل بات ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس مسئلہ کا حل مشکل نہیں ہے، میری تجویز یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ قوم کا اجتماعی موقف کیا ہے، یا تو معطل پارلیمنٹ کا صرف اس مسئلہ پر دو گھنٹے کا اجلاس طلب کر لیا جائے اور اس سے استفسار کیا جائے کہ موجودہ حالات میں جنرل پرویز مشرف اور دینی جماعتوں میں سے کس کا موقف درست ہے اور قومی جذبات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر عوامی ریفرنڈم کرا لیا جائے، خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ قوم اس مسئلہ میں کس کے ساتھ ہے۔

میں نے ریفرنڈم کا نام لیا تو گفتگو میں شریک ایک خاتون جرنلسٹ شیری رحمان نے صدر ضیاء الحق مرحوم کے ریفرنڈم کا ذکر چھیڑ دیا کہ انہوں نے ریفرنڈم کرایا تھا لیکن اس کیلئے جو الفاظ ڈیزائن کیے گئے تھے وہ مضحکہ خیز تھے۔ میں نے گزارش کی کہ الفاظ باہمی مشورہ سے ڈیزائن کر لیے جائیں اور عوام سے ان کے مطابق پوچھا جائے، آخر عوام سے

پوچھیں تو سہی!

میں نے عرض کیا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا یہ جبر نہ ہوتا اور جنرل پرویز مشرف آزاد فضا میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو ان کا فیصلہ یہ نہ ہوتا۔ البتہ انہوں نے فیصلہ کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے اور اپنی قوم اور بین الاقوامی مسلم برادری کو اعتماد میں لینے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان کرنے کے بعد صلاح مشورے شروع کیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور صدر پرویز مشرف فیصلہ کرنے سے قبل ملک کی دینی و سیاسی جماعتوں کو مشورہ میں شریک کر لیتے اور عالم اسلام کے راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ ساتھ او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیتے تو کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا اور حالات اس مقام تک نہ پہنچتے جس کا ہم آج سامنا کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ سے ایک صاحب نے فون پر سوال کیا کہ جس طرح نیٹو کے ممالک نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر حملہ نیٹو کے سب ارکان پر حملہ متصور ہوگا اس طرح کا کوئی معاہدہ مسلم ممالک آپس میں کیوں نہیں کر لیتے؟ اس پر گفتگو میں شریک مصری صحافی عبداللہ حمودہ نے کہا کہ یہ بات نظریاتی لحاظ سے تو ٹھیک ہے مگر عملاً مشکل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک اس میں عملی مشکلات ہیں لیکن عالم اسلام کیلئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسلم دنیا کو بالآخر اس نکتے پر آنا ہوگا اور مشکلات کا حل نکالتے ہوئے نیٹو کی طرز کے مسلم بلاک کی تشکیل کرنا ہوگی۔

پینل گفتگو میں ننکانہ صاحب کے ناظم رائے محمد نواز کھرل بھی شریک تھے، انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے موقف کی تائید کی اور کہا کہ ان کیلئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے طالبان کی بھی حمایت کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے دل طالبان کے ساتھ ہیں اور ہم ان کیلئے دعا گو ہیں۔

پینل کے سب شرکاء کا اس بات پر اتفاق تھا کہ سب کچھ کے باوجود افغانستان کی شہری آبادی اور متعیّن اہداف سے ہٹ کر امریکی اور برطانوی طیاروں کی بمباری قطعی طور پر غلط اور افسوسناک ہے اور موجودہ صورتحال میں صحیح بات یہی ہے کہ افغانستان پر فضائی حملے فوری طور پر بند کیے جائیں اور جنگی کارروائی روک کر مذاکرات اور سیاسی ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

افغانستان کی تباہی: دانشوروں کی سوچ تاریخ کے آئینے میں

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۱۹ نومبر ۲۰۰۱ء

صدر محترم جنرل پرویز مشرف کا خیال ہے کہ طالبان نے ہماری بات نہیں مانی اس لیے انہیں اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور ہمارے بعض سیاسی و مذہبی دانشوروں کا بھی یہی ارشاد ہے کہ طالبان اگر اسامہ بن لادن کو امریکہ کے سپرد کرنے کی بات مان لیتے تو افغان عوام کو اس ہولناک تباہی سے بچایا جا سکتا تھا جو بمباری اور بھوک کی صورت میں ان پر نازل ہوئی ہے۔

ہمارے ان دانشوروں کی مجبوری یہ ہے کہ یہ کتاب اور تھیوری کی دنیا کے لوگ ہیں جو ہر مسئلے کا حل اسی میں تلاش کرتے ہیں جبکہ طالبان کا تعلق عمل اور پریکٹیکل کے جہان سے ہے۔ اس لیے انہیں جب کچھ لوگ دانش و حکمت اختیار کرنے اور صرف ایک مہمان کی خاطر اپنے لوگوں کو نہ مروانے کا مشورہ دیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بین الاقوامی یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر پہلوانی کے فن پر دو چار کتابیں پڑھ کر اکھاڑے کے تماشائیوں میں کھڑا ہو گیا ہے اور کشتی میں ایک دوسرے سے نبرد آزما پہلوانوں کو کتاب ہاتھ میں لے کر داؤ پیچ بتا رہا ہے۔

ہماری الجھن یہ ہے کہ حالات کے جبر اور جابر و قاہر قوتوں کی فرعونیت کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہونے کی ہم نے اپنے اندر ہمت نہ پائی اور گردن جھکا کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اور جو چند سر پھرے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر سر اٹھائے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہیں ان پر بھی ہمیں غصہ آ رہا ہے کہ یہ بے وقوف اس طرح کیوں کھڑے ہیں اور انہوں نے ہماری طرح سر جھکا کر جان بچانے کی ''دانش و حکمت'' کیوں اختیار نہیں کی؟ لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہے، تاریخ اس سے قبل بھی اس قسم کے منظر دیکھ چکی ہے اور ایسے سرفروشوں کا جنون ہی ہمیشہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر رہا ہے جنہوں نے قوت، طاقت اور جبر و تشدد کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا ہے اور اپنے اس انکار کی آبرو قائم رکھنے کیلئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا ہے۔ آیئے ذرا تاریخ کے جھروکوں سے ایسے چند مناظر پر ہم بھی نظر ڈال لیں۔

بنو ہاشم کا سوشل بائیکاٹ

یہ مکہ مکرمہ ہے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک، بت پرستی، اور جہالت کے ماحول میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدہ کا اعلان کر کے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے کر پوری سوسائٹی میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ قوم مخالف ہو گئی ہے، ارباب اقتدار اس دعوت کو اپنے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں، اور اصحاب دانش کو اپنی حکمت و دانش کے سارے پیمانے ٹوٹتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ اور ان کے چند رفقاء کے خلاف طعن و تشنیع، تشدد واذیت، اور مخالفت و عناد کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔ قبائلی روایات کے مطابق آنحضرتؐ کے سرپرست اور ان کے خاندان کے سربراہ جناب ابوطالب پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ اس نوجوان کو بتوں کی مخالفت سے باز رکھو، اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اس کی سرپرستی چھوڑ کر اسے ہمارے حوالے کر دو، ہم خود اس سے نمٹ لیں گے۔ جناب ابوطالب نے نہ تو اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلمہ پڑھا ہے اور نہ ہی ان کا دین قبول کیا ہے۔ لیکن ان کی حفاظت کو اپنی خاندانی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ان کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ادھر مخالفت بڑھ رہی ہے اور دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ قریش کے تمام خاندان متحد ہو کر ابوطالب کے پاس آ گئے ہیں کہ یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے کہ محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم تمہیں بھی اس کا ساتھی شمار کریں گے اور جو معاملہ اس کے ساتھ ہو گا وہی تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔

اگر یہ آج کی حکمت و دانش کا دور ہوتا تو جناب ابوطالب کیلئے یہ بات بہت آسان ہوتی کہ اپنی جان بچانی ضروری ہے اور دوسروں کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال لینا عقلمندی نہیں ہے۔ لیکن ابھی حکمت و دانش اس معیار کو نہیں پہنچی تھی اس لیے جناب ابوطالب نے حضرت محمدؐ کو قریش کے حوالے کرنے سے دو ٹوک انکار کر دیا جس کے نتیجے میں خاندان بنو ہاشم کا

سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا اور جناب ابوطالب ایمان نہ لاتے ہوئے بھی اپنے بھتیجے کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہوگئے۔ یہ بائیکاٹ تین سال جاری رہا، بھوک اور فقر و فاقہ نے اس گھاٹی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے اور بچوں کی بھوک اور پیاس پر قہقہے لگانے والے بھی موجود تھے۔ مگر نہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی مرحلہ میں جناب ابوطالب کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر کچھ عقلمندوں کی بات مان لیتا تو خاندان بنوہاشم پر بھوک اور فقر و فاقہ کی یہ مصیبت نہ ٹوٹتی۔

کربلا کا محاصرہ

یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت سیدہ فاطمہؓ کے لخت جگر ہیں جن کا نام حضرت امام حسینؓ ہے۔ انہوں نے امیر المومنین حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید کو خلیفہ ماننے اور اس کی بیعت سے انکار کر دیا ہے۔ حضرت حسینؓ کو کوفے والوں نے خطوط لکھ کر بلایا کہ آپ تشریف لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہیں۔ وہ مدینہ منورہ سے خاندان سمیت چل پڑے مگر کربلا تک پہنچتے پہنچتے صورتحال تبدیل ہوگئی۔ کوفے پر یزید کے گورنر ابن زیاد کا کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ حضرت امام حسینؓ کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو شہید کیا جا چکا تھا اور اب امام حسینؓ کے استقبال کیلئے کوفہ سے ان کے عقیدت مندوں کا گروہ نہیں آیا تھا۔ بلکہ مزاحمت کیلئے ابن زیاد کی فوج عمر بن سعد کی کمان میں کربلا پہنچ کر راستہ روکے کھڑی تھی اور حضرت امام حسینؓ سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ یزید کی خلافت تسلیم کرنے کا اعلان کر کے اس کی بیعت کرو یا پھر خود کو ہتھیار ڈال کر ہمارے حوالے کر دو۔

حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ مجھے یزید کے پاس دمشق لے چلو، میں خود اس سے بات کر لوں گا، یا مجھے واپس مدینہ مدینہ جانے دو، میں اپنے گھر بیٹھ جاؤں گا، یا کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو جہاں کافروں کے خلاف کسی معرکہ میں مصروف ہو جاؤں گا۔ لشکر کا کمانڈر عمر بن سعد اس پیشکش کو معقول قرار دیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ کوئی درمیان کی راہ نکل آئے گی اور خاندان نبوت کے ساتھ مزاحمت کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر گورنر کوفہ ابن زیاد کیلئے یہ بات قابل قبول نہ تھی۔ اس نے اپنے کمانڈر کو جواب دیا کہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ حسین خود کو ہمارے حوالے کر دیں، اس کے سوا کوئی بات قابل قبول نہیں ہے۔ اگر وہ ہتھیار ڈال کر خود کو تمہارے حوالے نہیں کرتے تو ان کا سر قلم کر کے ہمارے پاس لاؤ، اگر تم اس بات میں جھجک دکھاؤ گے تو تمہیں بھی عبرتناک سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب امام حسینؓ کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ سر جھکا کر خود کو ابن زیاد کے حوالے کرتے ہوئے اپنی اور اپنے خاندان کی عورتوں و بچوں کی جانیں بچائیں یا پھر ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکر کے ہاتھوں خاندان سمیت ذبح ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ کے گرد و پیش غالباً کوئی دانشور موجود نہیں تھا، کوئی ڈپلومیٹ بھی نہیں تھا، اور شاید کوئی فقیہ عصر بھی قریب قریب نہیں تھا۔ ورنہ ”حکمت و دانش“ کا یہ سبق انہیں بھی پڑھایا جا سکتا تھا کہ جب جان بچانے کی اور کوئی صورت ممکن نہ رہے تو سر جھکا لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا، اور اپنے ساتھ معصوم بچوں اور عورتوں کو بھی خطرے میں ڈال لینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے، اور یہ کہ جب طوفان آتا ہے تو عقلمند لوگ کھڑے رہنے کی

بجائے بیٹھ جایا کرتے ہیں اور طوفان کے گزر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ اصحاب دانش کی کوئی کھیپ وہاں موجود ہو اور اس نے مشوروں سے نوازا بھی ہو مگر امام حسینؓ نے ان مشوروں کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اپنے انکار کا بھرم قائم رکھنے کو ترجیح دی۔ اور تاریخ کا ریکارڈ یہی کہتا ہے کہ امام حسینؓ نے جبر و قہر کی رعونت کے سامنے سر جھکانے کا راستہ اختیار نہیں کیا اور خاندان کے معصوم بچوں اور خواتین سمیت مقدس جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بتا دیا کہ سب لوگ سر جھکانے والے نہیں ہوتے، کچھ سر اٹھا کر بھی چلتے ہیں، اور یہی لوگ تاریخ کے روشن ابواب کا عنوان ہوا کرتے ہیں۔

شیر کی ایک دن کی زندگی

یہ میسور ہے۔ سلطان حیدر علیؒ کا میسور، اور سلطان فتح علی ٹیپوؒ کا میسور جو برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مزاحمت کا آخری مورچہ تھا اور جس مورچے پر قابض ہونے کے بعد انگریز حکمرانوں کو یہ اعلان کرنے کا حوصلہ ہوا تھا کہ ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے“۔

بنگال میں نواب سراج الدولہ شہیدؒ کی شکست کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس اقتدار اور نوآبادیاتی تسلط کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کے طور پر سلطان فتح علی ٹیپوؒ برصغیر کی آزادی کے تحفظ کی آخری جنگ لڑ رہا تھا، اور تنہا لڑ رہا تھا۔ پڑوس کی مسلم ریاست حیدر آباد نے ٹیپو کا ساتھ دینے کی بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیمپ میں رہنے کو ترجیح دی اور ترکی کی خلافت عثمانیہ مدد کیلئے سلطان ٹیپوؒ کی درخواست مسترد کر کے اسے انگریزوں کے خلاف مزاحمت نہ کرنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر سلطان ٹیپوؒ کا جنون کسی بات کی پروا نہیں کر رہا تھا، نہ اسے حیدر آباد کی مسلم ریاست کی پالیسی کی کچھ پروا ہے، اور نہ خلافت عثمانیہ کی تلقین سے کوئی دلچسپی۔ بلکہ اس پر ایک ہی جنون سوار ہے کہ کسی طرح برصغیر میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جائے اور سلطنت خداداد میسور کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کی جائے۔

یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ اور فرانس بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے اور برصغیر پاک و ہند میں فرانسیسی بھی برطانیہ کی طرح قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو نے اس کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس نے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کرنے کیلئے ان کے کچھ لوگوں کو اپنی افواج میں شامل کر لیا۔ یہ بات برطانوی حکمرانوں کیلئے اشتعال اور غیظ و غضب کا باعث بنی اور انہوں نے اسے بہانہ بنا کر دھمکی دی کہ ہمارے دشمن فرانسیسیوں کو فوج سے نکال دو ورنہ جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ سلطان ٹیپوؒ سمجھ رہا تھا کہ انگریزوں نے اس کی سلطنت پر حملہ تو ویسے بھی کرنا ہے مگر وہ اس کیلئے فرانسیسیوں کی موجودگی کا بہانہ کر رہے ہیں۔ اس لیے اس نے انگریزوں کی کوئی بھی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ سلطان ٹیپوؒ کی فوج کے فرانسیسی افسر خود سلطان ٹیپوؒ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر اس سے انگریزوں کا غصہ وقتی طور پر ٹھنڈا ہوتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، آپ ہمیں ان کے حوالے کر دیں۔ اس وقت بھی کسی نہ کسی دانشور، ڈپلومیٹ، یا فقیہ عصر نے سلطان ٹیپوؒ کو یہ مشورہ ضرور دیا ہوگا کہ کوئی حرج کی بات نہیں، وقت نکالو اور سر پر آئی ہوئی جنگ کو سر دست ٹالنے کی کوشش کرو کہ یہ حکمت و دانش کا راستہ بھی ہے اور عقلمندی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مگر سلطان ٹیپوؒ نے کسی بھی مشورے پر کان نہ دھرا، تمام شرطیں بے نیازی کے ساتھ مسترد کرتے ہوئے میدان جنگ میں دشمن کے سامنے جا کھڑا ہوا اور

ہزاروں جاں نثاروں کی قربانی پیش کر کے خود بھی حریت پسندوں اور عزم و استقامت کی شاہراہ کے مسافروں کو یہ سبق دیتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گیا کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے“۔

دہشت گردی یا حریت پسندی؟

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۵ نومبر ۲۰۰۱ء

امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے یہ کہہ کر ایک بار پھر امریکی اتحاد کی حالیہ جنگ کے اصل مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ ”جب تک تہذیب مکمل طور پر محفوظ نہیں ہو جاتی، دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رہے گی“۔ اس سے قبل جنگ کے آغاز میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اس جنگ کیلئے ”صلیبی جنگ“ کی اصطلاح استعمال کی تھی اور اس کے بعد ایک موقع پر کہا تھا کہ ہم تہذیب کے تحفظ کیلئے لڑ رہے ہیں۔ اور اٹلی کے وزیراعظم نے مغربی تہذیب کی برتری کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ اس تہذیب کی حفاظت کی جائے گی۔ اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے اپنے مضمون میں، جو روزنامہ جنگ لندن میں ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا تھا، طالبان حکومت کو چارج شیٹ کرتے ہوئے صاف طور پر کہا تھا کہ ”وہ ایک دقیانوسی اور غیر روادار نظام پوری مسلمان دنیا کو برآمد کرنا چاہتے ہیں“۔

صورتحال یہ ہے کہ جس ”دہشت گردی“ کے خلاف مغرب نے جنگ شروع کی ہے اس کی کوئی تعریف متعیّن نہیں ہے جبکہ عالمی رائے عامہ کے بہت سے لیڈر بار بار مطالبہ کر رہے ہیں کہ دہشت گردی کی واضح تعریف متعیّن کی جائے اور اس کی حدود واضح کی جائیں تاکہ آزادی کی تحریکات اور جبر و تشدد کے خلاف دفاع کیلئے ہتھیار اٹھانے والے مظلوموں کو دہشت گردی کے الزام سے الگ کیا جا سکے۔ مگر نہ اقوامِ متحدہ اور نہ ہی حملہ آور اقوام اس کی طرف توجہ دینے کیلئے تیار ہیں۔ انہوں نے دہشت گردی کا کوئی متعیّن مفہوم طے کیے بغیر جنگ کا بگل بجا دیا ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہیں دہشت گردی یا اس کے خاتمہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ صرف دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں تاکہ جس کا نام وہ چاہیں اس پر لکھ کر اس کے خلاف کارروائی کر سکیں۔

چند سال قبل سے واقعات کے تسلسل کو اس کے اصل تناظر میں دیکھیں تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد آزادی جاری تھا اور ابھی روسی افواج نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، البتہ یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ افغان مجاہدین کا راستہ روکنا اب زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوگا اور روسی افواج کو بالآخر افغانستان سے نکلنا ہوگا، اس وقت امریکہ کے ایک سابق صدر جناب نکسن تمام تر اختلافات اور محاذ آرائی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے روس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے روسی دانشوروں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہماری جنگ کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں جو دینی بیداری ابھر رہی ہے اور جہادی تحریکات جس طرح منظم ہو رہی ہیں وہ ہم دونوں کیلئے مشترکہ خطرہ ہیں، اس لیے ہمیں باہمی محاذ آرائی ترک کر کے اس مشترک دشمن سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کرنی چاہیے۔

سابق امریکی صدر نکسن کے اس دورۂ روس کے بعد امریکہ اور روس میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور افغانستان

سے روسی فوجوں کی واپسی کے حالات سامنے آئے تھے۔ اس موقع پر روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان میں حکومت کے معاملات کو جان بوجھ کر مبہم چھوڑ دیا گیا تھا اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم اور وزیر اعظم جناب محمد خان جونیجو مرحوم کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات کا پس منظر بھی یہی تھا۔ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم روسی فوجوں کی واپسی سے قبل کابل کی حکومت کا معاملہ طے کرنا چاہتے تھے تاکہ مجاہدین روسی فوجوں کے جانے کے بعد افغانستان کی حکومت سنبھال سکیں، جبکہ جونیجو مرحوم کابل کی حکومت کا معاملہ طے کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور روسی افواج کی واپسی کے معاہدے پر جلد از جلد دستخط کرنا چاہتے تھے۔ روسی افواج کی واپسی کے بعد کابل کی حکومت کا معاملہ مبہم چھوڑ دینے کی بات اتفاقی نہیں بلکہ امریکہ اور روس دونوں کی طے شدہ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ روس کی واپسی کے بعد مختلف افغان گروپوں میں اقتدار کیلئے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اسے باہر سے ایندھن فراہم کیا جاتا رہے گا، اور مجاہدین کی وہ اسلامی نظریاتی ریاست وجود میں نہیں آ سکے گی جسے امریکہ اور روس دونوں اپنے لیے مشترکہ خطرہ سمجھ رہے تھے۔

آج مغربی لیڈر بار بار یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے افغانستان کو روس کے خلاف جنگ کے بعد اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ایسا نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ سرسری بات نہیں بلکہ طے شدہ منصوبے کا حصہ تھی جس کا مقصد واضح تھا کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف گروپ کابل کی حکومت کیلئے ایک دوسرے کے خلاف مستقل طور پر صف آراء ہوں اور جب وہ تھک ہار کر باہر سے تعاون اور امداد کیلئے رجوع کریں تو امریکہ اور روس باہمی مشورہ سے وہاں کوئی ایسی حکومت بنوا دیں جو ان کے عالمی نظام میں تو شریک ہو لیکن افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کا ذریعہ نہ بن سکے۔ مگر مجاہدین کے مختلف گروپوں میں طویل خانہ جنگی کے ردعمل میں سامنے آنے والے طالبان نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو خانہ جنگی سے نجات دلا کر اور ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم کر کے اس منصوبے میں رخنہ ڈال دیا۔ انہوں نے نہ صرف امن و امان کی صورتحال کو تسلی بخش بنایا بلکہ افغان معاشرے کو ہتھیاروں سے پاک کرنے اور ہیروئن کے کاروبار کو مکمل طور پر بند کرنے کا محیر العقول کارنامہ بھی سرانجام دے ڈالا۔ اگر وہ اپنے اس عمل کے ساتھ اسلام کا نام نہ لیتے اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ کی بات نہ کرتے تو آج وہ دنیا میں ایک آئیڈیل گورنمنٹ اور ایک ہیرو پارٹی کے طور پر متعارف ہوتے اور انہیں پوری دنیا میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے صاف طور پر اعلان کیا کہ وہ سب کچھ اسلام کیلئے کر رہے ہیں اور اسلامی احکام کے تحت کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں مغرب کے نظام، فلسفہ، اور تہذیب کیلئے خطرہ سمجھ لیا گیا اور ایسا سمجھنے والوں نے کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ

1. خانہ جنگی سے نجات،
2. اسلامی قوانین کے ذریعے معاشرتی جرائم پر کنٹرول،
3. لاء اینڈ آرڈر کی مثالی صورت حال،
4. منشیات کا مکمل خاتمہ، اور

5. بیرونی قرضوں سے بے نیازی اختیار کر کے سادگی اور قناعت کے ساتھ نظام حکومت چلانے کی جو روش انہوں نے کامیابی کے ساتھ اپنالی تھی اگر انہیں اس پر آٹھ دس سال تک چلنے کا موقع دیا جاتا تو دنیا کے سامنے فی الواقع ایک ایسی ریاست اور معاشرے کا نقشہ عملی طور پر آجاتا جس کے سامنے مغربی فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت کا چراغ زیادہ دیر تک نہ جل سکتا۔ اور کم از کم عالم اسلام کے متعدّد ممالک میں اس طرز کے نظام حکومت اور فلسفہ حیات کی علمبردار دینی قوتوں کو تقویت حاصل ہوتی اور اسلامی نظام کی طرف مسلم ممالک کی واپسی کی راہ کھل جاتی۔

اس کے علاوہ تاریخ کے ریکارڈ پر ایک اور شہادت بھی موجود ہے کہ جب سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد نیٹو کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل سے پوچھا گیا کہ نیٹو کا قیام ہی سوویت یونین کے خلاف عمل میں لایا گیا تھا تو اب سوویت یونین کے عالمی منظر سے ہٹ جانے کے بعد نیٹو کو باقی رکھنے کا کیا جواز رہ گیا ہے؟ تو انہوں نے بے ساختہ کہہ دیا تھا کہ "ابھی اسلام باقی ہے"۔ چنانچہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مغربی لیڈروں نے جس نئی جنگ بلکہ عالمی دہشت گردی کا آغاز کیا ہے وہ دراصل عالم اسلام میں دینی بیداری کی ابھرتی ہوئی لہر کو دبانے اور مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے غاصبانہ تسلط کے خلاف منظم ہونے والی مسلح جہادی تحریکات کو کچلنے کیلئے ہے۔ تاکہ دنیا میں کوئی ایسی نظریاتی اسلامی ریاست قائم نہ ہو پائے جو اس وقت دنیا میں موجود استحصالی نظام، مغرب کی مادر پدر آزاد ثقافت،، اور لادینی فلسفہ کیلئے خطرہ بن سکے۔ اور اس جنگ میں مسلم ممالک کے وہ تمام حکمران گروہ اور طبقات مغرب کے ساتھ شریک اور اس کے فطری حلیف ہیں جو مغرب کے پروردہ ہیں اور مغرب کی نمائندگی کرتے ہوئے عالم اسلام کی سیاست و معیشت اور فکر و دانش کو مغرب کے ہاتھوں گروی رکھ کر اپنے اقتدار اور عیاشیوں کو طول دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس سب کچھ سے قطع نظر مغربی لیڈروں بالخصوص جارج ڈبلیو بش، ٹونی بلیئر، اور کولن پاول سے یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب! تہذیب و ثقافت کی جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کے سہارے لڑی جاتی ہے اور جن تہذیبوں کی اخلاقی اقدار و روایات بے حوصلہ ہو جائیں، ہتھیاروں کی جھنکار ان کو کبھی سہارا نہیں دیا کرتی۔ کیا یہ مغربی لیڈر تاریخ کے اس نوشتہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت:
پاکستان کیوں مجبور تھا؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ نومبر ۲۰۰۱ء

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے جبکہ تمہاری بہت سی حرکتیں اللہ تعالیٰ درگزر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ فاطر کی آخری آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہر حرکت پر گرفت شروع کر دیں تو روئے زمین پر ایک کیڑا بھی رینگنے

نہ پائے لیکن اللہ تعالیٰ اکثر معاملات کو مؤخر کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ انسانی سوسائٹی میں جو مصیبت اور پریشانی بھی آتی ہے وہ انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اکثر اعمال کو در گزر کر دیتے ہیں یا آخرت کے دن کیلئے مؤخر کر دیتے ہیں۔ اور صرف بعض باتوں کا اس دنیا میں مواخذہ فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔

اس قانون اور ضابطے کے بیان کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ روئے زمین پر انسان اس کائنات کے خالق و مالک کے احکام و قوانین کی جس قدر پابندی کرے گا اسی قدر فساد اور خرابی سے محفوظ رہے گا۔ اور جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین سے ہٹ کر من مانی اختیار کرے گا یہ بات نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنے گی بلکہ اس سے سوسائٹی کے نظام میں بھی بگاڑ پیدا ہوگا اور اس بگاڑ کے اثرات پورے معاشرے پر مجموعی طور پر پڑیں گے۔ ایک سادہ سی مثال سے اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مشینری بنانے والی فرم اپنی مشینری کو مارکیٹ میں بھیجنے کے ساتھ اس کا تعارف اور اس کے چلانے کیلئے ہدایات بھی بھجواتی ہے۔ اگر مشین کو ان ہدایات کے مطابق چلایا جائے گا تو صحیح چلتی رہے گی اور اگر چلانے والے ہدایات کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی سے مشینری کو چلانے کی کوشش کریں گے تو خرابیاں پیدا ہوں گی اور مشین صحیح طریقے سے کام نہیں کر پائے گی۔ انسانی سوسائٹی بھی ایک مشینری ہے جس کے پرزے انسان ہیں۔ ہم اس مشین اور اس کے پرزوں کو بنانے والے نہیں بلکہ استعمال کرنے والے ہیں۔ بنانے والی ذات اور ہے جس نے اس ساری کائنات کو بنایا ہے اور وہ اسے کنٹرول بھی کر رہا ہے۔ جبکہ ہمیں اس نے وحی الٰہی اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے ذریعے واضح ہدایات دی ہیں کہ انسانی معاشرہ کے اجتماعی نظم اور اس کے کل پرزوں کے طور پر انسانی افراد اپنے شخصی نظام کو بنانے والے کی ہدایات کے مطابق چلاتے رہیں گے تو یہ مشینری اپنے مقاصد کیلئے کام کرتی رہے گی ورنہ فساد رونما ہوگا اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔

انسانی معاشرہ میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے مصائب و مشکلات اور تکالیف و آلام میں خود انسانی اعمال کے سبب کے طور پر کار فرما ہونے کا ایک پہلو تو باطنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نافرمانیوں سے ناراض ہوتے ہیں اور جب ان کی ناراضگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کا اظہار سزا و عذاب کے طور پر انسانی سوسائٹی کے کسی نہ کسی حصے میں ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر ظاہری اسباب کے حوالے سے دیکھا جائے اور انسانی معاشرہ میں روز مرہ آنے والی مصیبتوں، آزمائشوں اور آفتوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی انسانی غلطی اور کچھ لوگوں کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور دکھائی دے جاتی ہے اور صاف طور پر بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بحران اور المیہ فلاں غلطی اور حرکت کے نتیجے میں پیش آیا ہے۔

دور حاضر میں عالم اسلام کے دو بڑے المیوں کا بطور مثال ذکر کیا جائے تو ایک فلسطین کا مسئلہ ہے اور دوسرا افغانستان کے حوالے سے پاکستان پر عالمی جبر کا معاملہ ہے جس نے حکومت کو اپنے ملک کے مفادات اور عوام کے جذبات کی پروا کیے بغیر افغانستان پر مغربی حملہ آوروں کا ساتھی بننے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ فلسطین کے عوام در بدر پھر رہے ہیں اور اسرائیل نہ صرف انہی کے علاقوں پر قابض ہو کر اسرائیلی ریاست قائم کر چکا ہے بلکہ اسرائیل کے اصل دائرہ سے باہر بھی انہیں ایک فلسطینی قوم کی حیثیت سے آزاد ریاست کے قیام کا حق دینے پر تیار

نہیں ہے۔ فلسطینی اپنی آزادی اور آزاد ریاست کے قیام کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں، ان کا قتل عام ہو رہا ہے لیکن عالمی سطح پر ان کی شنوائی اور دادرسی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔

مسئلہ فلسطین کی ابتداء کا جائزہ لیں تو یہ بات تاریخ کے ریکارڈ میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ آج سے ایک صدی قبل فلسطین میں یہودیوں کی کوئی آبادی نہیں تھی، فلسطین ترکی کی خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا جبکہ عالمی یہودی تنظیم کے راہنما ترک خلفاء کے درباروں کا بار بار طواف کر رہے تھے کہ انہیں فلسطین میں بسنے کی اجازت دی جائے۔ مگر خلافت عثمانیہ اس کیلئے تیار نہیں تھی۔ خلیفہ عثمانی سلطان عبدالحمیدؒ ثانی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ عالمی صیہونی تحریک کا لیڈر ہرتزل کئی بار اس سے ملا اور فلسطین میں جگہ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر سلطان موصوف چونکہ اسرائیلی ریاست کے قیام کے سلسلہ میں یہودیوں کے عزائم سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ خلافت عثمانیہ کے زیرِ کنٹرول کسی اور علاقے میں یہودیوں کو جتنی وہ چاہیں زمین بلا معاوضہ دی جاسکتی ہے لیکن فلسطین کی ایک انچ زمین بھی یہودیوں کو دینے کیلئے وہ تیار نہیں ہیں۔ اسی کی پاداش میں سلطان عبدالحمیدؒ کے خلاف ترکی میں تحریک منظم کی گئی۔ سلطان نے لکھا ہے کہ اس کیلئے وہ لمحہ زندگی کا سب سے زیادہ صدمہ و حسرت کا لمحہ تھا جب اسے خلافت سے معزولی کا پروانہ دینے کیلئے وہ یہودی آیا جو چند سال قبل ہرتزل کے ساتھ سلطان سے فلسطین میں زمین حاصل کرنے کی درخواست لے کر آیا تھا۔

سلطان عبدالحمیدؒ معزول ہو گئے اور اس کے بعد آنے والے بعض خلفاء کو رام کر لیا گیا بلکہ رفتہ رفتہ خلافت کا نظام ہی ختم کر دیا گیا۔ اب یہودیوں نے فلسطین میں زمین کی خریداری کا کام شروع کیا تو کوئی ریاستی ادارہ اس کی روک تھام کیلئے موجود نہیں تھا۔ چنانچہ اس خلاء کو علماء کرام نے پر کیا اور آگے بڑھ کر یہ فتویٰ دیا کہ فلسطین کی زمین یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ میں نے اس فتوٰی کے بارے میں سن رکھا تھا مگر فتویٰ ریکارڈ میں مل نہیں رہا تھا۔ گذشتہ دنوں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی آخری تصنیف ”بوادر النوادر“ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں یہ فتویٰ مل گیا۔ یہ سوال ان سے بھی کیا گیا تھا اور اس پر ان کا فتویٰ ۱۳۵۳ھ کا جاری کردہ ہے یعنی اب سے کوئی ستر برس قبل۔ گویا یہی وہ دور تھا جب یہودی فلسطین میں وسیع پیمانے پر زمینوں کی خریداری کر رہے تھے اور فلسطینی دگنی تگنی قیمت کی لالچ میں اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کر رہے تھے۔ اس پر علماء کرام نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے فتویٰ صادر کیا کہ چونکہ فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا منصوبہ سامنے آچکا ہے اور زمین خرید کر وہ اس کیلئے بیس بنانا چاہتے ہیں اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین فروخت کرنا شرعاً حرام ہے۔ اس فتویٰ کو مولوی کی دیوانگی قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا اور فلسطینیوں نے دگنی تگنی قیمتوں پر اپنی زمینیں فروخت کر کے یہودیوں سے دام کھرے کیے جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

افغانستان کے مسئلہ میں حکومت پاکستان کی موجودہ پالیسی کو عالمی جبر کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مگر اس بے بسی اور مجبوری کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں یہ بات سرفہرست دکھائی دیتی ہے کہ امیر ممالک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے لیے ہوئے قرضے ہمارے لیے وبال جان بن گئے ہیں

اور قرضوں کے اس خوفناک جال نے ہماری معیشت کے ساتھ ساتھ قومی پالیسیوں اور ملی مفادات کو بھی جکڑ لیا ہے۔ اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ ہم شمال مغربی سرحد پر ایک دوست حکومت سے محروم ہو چکے ہیں بلکہ اس سے خود کو محروم کرنے کے عمل میں ہم خود بھی شریک ہیں۔ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے خاتمہ کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے اور افغانستان میں بیشتر علاقوں پر کنٹرول رکھنے والی حکومت کو ختم کر کے قبائلی کشمکش اور خانہ جنگی کا دور واپس لانے میں ہم بھی شریک ہیں۔

مگر اس سے قطع نظر اس کے ایک سبب بلکہ سب سے بڑے سبب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کچھ شریف لوگ اس وقت بھی ہمیں سمجھا رہے تھے، جب ہم قرضوں کے سہارے اپنی معیشت کا ڈھانچہ تشکیل دینے میں مصروف تھے، کہ قرضوں کے چکر میں نہ پڑو، اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانا سیکھو اور تعیش و لگژری کا ماحول ختم کر کے اسلامی نظام اور خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کے مطابق سادگی و قناعت کا راستہ اختیار کرو۔ مگر سادگی کے اس سبق اور تلقین کو بھی سادگی پر محمول کر لیا گیا اور کہا گیا کہ یہ لوگ تو آج کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، عالمی ماحول سے بے گانہ ہیں، اور جدید دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی سوچ سے محروم ہیں۔ اس بات کو بھی ایک لمحہ کیلئے بھول جائیے کہ یہ قرضے کن لوگوں نے حاصل کیے، کہاں استعمال ہوئے اور اب بھی مغربی ملکوں کے بینکوں میں کس کس کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ ان قرضوں نے قوم کو بے بسی اور لاچاری کے کس مقام پر پہنچا دیا ہے؟ اور یہی مفہوم ہے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ کا کہ "تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔"

افغانستان میں طویل جنگ کا ایک نیا دور

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

افغانستان میں امریکی اتحاد کی وحشیانہ بمباری بدستور جاری ہے اور اس بمباری کی مدد سے شمالی اتحاد نے کابل، ہرات اور مزار شریف سمیت بہت سے شہروں کا کنٹرول حاصل کر لیا ہے، جبکہ قندوز میں محصور طالبان پر بمباری ہو رہی ہے اور قندھار ملحقہ علاقوں سمیت طالبان کے قبضے میں ہے۔

طالبان کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے شہری آبادی کو امریکی بمباری سے بچانے اور اپنی جنگی حکمتِ عملی کو نیا رخ دینے کیلئے کابل اور دیگر شہر خالی کیے ہیں، امریکی اتحاد سے شکست قبول کرنے کی بجائے نئی حکمتِ عملی کے تحت طویل جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے، اور افغانستان سے امریکی تسلط کے خاتمہ تک ان کی جدوجہد جاری رہے گی۔

حالات نے اب تک جو رخ اختیار کیا ہے اس کے پیشِ نظر افغانستان میں مستقبل کے حوالے سے دو امکانات دکھائی دے رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ طالبان قندھار اور جنوبی افغانستان کے چند دیگر علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں اگر کامیاب رہے تو افغانستان "جنوبی افغانستان" اور "شمالی افغانستان" کے ناموں سے دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

اسی طرح جیسے امریکی مداخلت سے کوریا اور ویتنام جنوبی اور شمالی حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے، جس کے بعد ویتنام تو طویل گوریلا جنگ کے نتیجے میں امریکی تسلط سے نجات حاصل کر کے دوبارہ متحد ہو گیا، مگر شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کی تقسیم ابھی تک قائم ہے۔ قندھار پر طالبان کا کنٹرول قائم رکھنے کی صورت میں افغانستان کی یہ تقسیم نمایاں ہوتی نظر آ رہی ہے۔ سرِدست یہی ہو گا اور اس کے بعد اگر طالبان شمالی افغانستان کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھ سکے تو ویتنام کی طرح جانگسل لڑائی کے بعد افغانستان کے دوبارہ متحد ہونے کے امکانات موجود ہیں۔

2. اور اگر خدانخواستہ قندھار بھی طالبان کے ہاتھ سے نکل گیا اور طالبان نے شکست قبول نہ کرتے ہوئے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ قائم رکھا تو پھر وہی صورت عود کر آئے گی جو کابل میں روسی فوجوں کی آمد کے وقت تھی کہ کابل پر روس نواز ببرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت تھی، جس کے کنٹرول میں کابل اور دیگر شہر تھے۔ جبکہ افغان مجاہدین شہروں سے باہر پہاڑوں پر مورچے بنا کر گوریلا کاروائیاں کر رہے تھے، اور انہی گوریلا کاروائیوں کے نتیجے میں انہوں نے نہ صرف روس کو فوجیں واپس بلانے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کابل میں روس نواز حکومت بھی اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکی تھی۔

بہر حال جو صورت بھی ہو افغانستان ایک نئی اور طویل جنگ کے دور میں داخل ہو رہا ہے، جس میں ایک طرف امریکہ اور روس سمیت کم و بیش سبھی بڑے ممالک ہیں، اور مسلم حکومتوں کی مجموعی طاقت بھی انہیں کے ساتھ ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہیں جنہیں عالمِ اسلام کے دینی حلقوں کی حمایت و تعاون حاصل ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر طالبان اپنے موقف اور عزم پر قائم رہے تو وقتی پسپائی کا یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں ہو گا اور افغانستان ایک اسلامی ریاست کے طور پر اپنا تشخص باقی رکھنے میں ضرور کامیاب ہو گا۔ نظریہ اور عقیدہ کی جنگوں میں پلاسی، سرنگا پٹم، بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کے مراحل آیا کرتے ہیں، اور ان آزمائشوں سے گزر کر اپنے مشن اور پروگرام پر قائم رہنے والی قومیں بالآخر آزادی کی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جایا کرتی ہیں، اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، آمین یا رب العالمین۔

تہذیبی جنگ کا تحفظ: امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کا عندیہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء کے اداریہ میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کے ان ریمارکس کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ

"جب تک تہذیب مکمل طور پر محفوظ نہیں ہو جاتی دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔"

گویا کولن پاول نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اصل مسئلہ دہشت گردی کا نہیں بلکہ "تہذیب کے تحفظ" کا ہے، اور امریکی اتحاد کی جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں بلکہ مغربی تہذیب و ثقافت کو بچانے کیلئے ہے، جسے مغربی لیڈروں کے بقول افغانستان میں ایک نئی تہذیب کے ابھرنے سے خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔

ہم ایک عرصہ سے یہ عرض کر رہے ہیں کہ مغرب اور عالمِ اسلام کے درمیان کشمکش نظریہ اور ثقافت کی کشمکش ہے، جس کے ساتھ عالمِ اسلام کے معاشی وسائل پر کنٹرول کا ہدف بھی شامل ہو گیا ہے۔ اور افغانستان میں امریکہ کی معرکہ آرائی صرف اسامہ بن لادن اور ان کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے کیلئے نہیں بلکہ طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو ختم کرنے اور وسطی ایشیا میں زیرِ زمین موجود تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کا کنٹرول حاصل کرنے کیلئے ہے۔ اور اسی وجہ سے امریکہ اس خطہ میں مستقل طور پر موجود رہنے کی راہ ہموار کرتا جا رہا ہے۔

طالبان کی حکومت میں امریکہ کو ایک نئی تہذیب کے ابھرنے یا مغربی تہذیب کیلئے خطرہ بننے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں، اور انہی آثار کو جڑ سے اکھاڑنے کیلئے امریکہ نے افغانستان پر وحشیانہ بمباری کر کے اس کی رہی سہی عمارتوں کو بھی کھنڈرات میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہت سے دوستوں کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ طالبان کی کمزور سی حکومت اور افغان جیسی غریب اور بے سہارا قوم امریکی ثقافت اور مغربی کلچر کیلئے کیسے خطرہ بن سکتی ہے؟ مگر مغربی دانشور اتنے سادہ نہیں کیونکہ انہوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ

- طالبان نے محض عقیدہ اور ایمان کی قوت کے سہارے افغانستان میں اپنے زیرِ قبضہ علاقہ کو مثالی امن و امان فراہم کر دیا۔
- قرآن و سنت کے شرعی احکام و قوانین کی بنیاد پر لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال کو انتہائی خراب حالات میں بھی بہتر بنا کر ایک دفعہ دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ افغان معاشرہ کو ہتھیاروں اور منشیات سے مکمل طور پر پاک کر کے اکیسویں صدی میں اسلام کا زندہ معجزہ دکھایا۔
- عالمی سسٹم کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اس کے خلافِ اسلام حصوں کی نشاندہی کی اور اس حوالے سے اپنے تحفظات کو قائم رکھا۔
- اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی پالیسی اختیار کر کے بیرونی قرضوں اور بین الاقوامی اداروں کے مشروط تعاون کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ اور حکومتی شعبوں میں سادگی اور قناعت کے حوالے سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یاد تازہ کر دی۔
- نظامِ مملکت کی بنیاد انسانی خواہشات پر رکھنے کی بجائے آسمانی تعلیمات اور قرآن و سنت کے ساتھ بے لچک

وابستگی قائم رکھنے کا اعلان کیا۔

یہی اس ”نئی تہذیب“ کے بنیادی خدوخال ہیں جو افغانستان میں ابھرتی نظر آئی اور مغربی لیڈروں نے دیکھا کہ مسلم ممالک کے عوام میں اس نئی تہذیب سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اور اس کے حامیوں کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ اس لیے اسے مغربی تہذیب کیلئے خطرہ قرار دیتے ہوئے امریکی اتحاد نے اس پر دھاوا بول دیا، اور اب مغربی لیڈر خوش ہو رہے ہیں کہ انہوں نے اس نئی تہذیب کو بمباری کے ذریعے افغانستان کے چند شہروں میں شکست دے کر مغربی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، لیکن یہ ان کی بھول ہے۔

عقیدہ اور ثقافت کی جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اخلاق و اقدار کی قوت سے لڑی جاتی ہے، جس کا ایک ہلکا سا مظاہرہ دنیا نے افغانستان کی اس جنگ میں بھی دیکھ لیا ہے کہ

- ایک طرف امریکی اتحاد کی وحشیانہ بمباری سے کھنڈرات میں تبدیل ہوئے افغان شہر، اور شمالی اتحاد کے انتقام کا نشانہ بننے والے طالبان کی ننگی لاشوں کے ڈھیر ہیں،
- اور دوسری طرف اس حالت میں بھی طالبان نے افغانستان میں گرفتار ہونے والی مغربی خاتون صحافی کو مہمان کے طور پر رکھنے کے بعد رہا کیا ہے، اور عیسائیت کی تبلیغ میں پکڑے جانے والے آٹھ افراد کو کابل چھوڑتے وقت اپنے ساتھ لے جا کر ان کی محفوظ رہائی کو یقینی بنایا ہے۔ جبکہ انہی میں سے دو خواتین نے رہائی کے بعد اخباری بیانات میں کہا کہ طالبان نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ بہنوں کی طرح رکھا۔

دونوں تہذیبوں کے منظر دنیا کے سامنے ہیں اور کولن پاول درست کہتے ہیں کہ یہ تہذیب کے تحفظ کی جنگ ہے۔ البتہ ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو تہذیب اپنے اخلاق و اقدار میں مقابلہ کا حوصلہ نہ پا کر ہتھیار اٹھا لیا کرتی ہے وہ تاریخ میں کبھی خود کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

- روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء کے مطابق دولتِ قطر کے امیر شیخ حماد بن خلیفہ الثانی نے گزشتہ روز متحدہ عرب امارات کی مشاورتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دہشت گردی اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ میں بلیک لسٹ کی جانے والی ”حزب اللہ“ اور دیگر تنظیمیں گیارہ ستمبر کی دہشت گردی میں ملوث نہیں تھیں، انہیں بلیک لسٹ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ انہوں نے دہشت گردی اور اسلام کے درمیان کسی تعلق کو بھی مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ عرب اور اسلامی ممالک نے اسی بنا پر یہ اصولی موقف اختیار کیا ہوا ہے کہ دہشت گردی اور اپنے ملک کو قبضے سے آزاد کرانے کیلئے عوام کی جانب سے کی جانے والی جدوجہد میں واضح فرق ہے۔ قطر کے

امیر نے لبنانی تنظیم حزب اللہ اور اپنے ممالک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والی دیگر حریت پسند تنظیموں کو امریکہ کی جانب سے بلیک لسٹ کرنے کے اقدام کی مخالفت کی ہے۔

- دوسری طرف امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے واشنگٹن میں فلپائنی صدر سے اپنی ملاقات میں انہیں پیشکش کی ہے کہ فلپائن کے مسلم اکثریتی علاقہ "مورو" کی آزادی کیلئے مسلح جنگ لڑنے والے "ابوسیاف گروپ" سے نمٹنے کیلئے امریکہ فلپائن کی حکومت سے تعاون کیلئے تیار ہے۔
- اور بھارت میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک ویل نے دہلی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گرد صرف دہشت گرد ہوتے ہیں، انہیں مجاہدِ آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ نومبر ۲۰۰۱ء کے مطابق امریکی سفیر نے واضح طور پر کہا کہ امریکہ اور بھارت کے خلاف دہشت گردی ختم ہونے تک جنگ جاری رہے گی اور کشمیری تنظیموں کے اثاثے منجمد کر دیے جائیں گے۔

گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد جب امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے اس کیلئے متحدہ محاذ بنانے کا اعلان کیا تھا تو عالمی سطح پر مطالبہ کیا گیا تھا کہ پہلے دہشت گردی کی تعریف متعیّن کی جائے، اور دہشت گردی اور جدوجہدِ آزادی کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے۔ امریکہ، اقوامِ متحدہ اور مغربی لیڈروں میں سے کسی نے اس مطالبہ کو درخورِ اعتنانہ سمجھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ "دہشت گردی" کی تعریف متعیّن کر کے اور آزادی کی تحریکات کو مستثنٰی کر کے خود کو محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اس بات کو مبہم رکھ کر دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس پر جس کا نام چاہے لکھ لیں اور اسے دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔ چنانچہ ان کی یہ حکمتِ عملی فلسطین، کشمیر اور مورو کے حوالے سے سامنے آچکی ہے اور رفتہ رفتہ پورے عالمِ اسلام کی تحریکاتِ آزادی کے بارے میں ان کے عزائم کھلتے جا رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں امیرِ قطر نے دہشت گردی اور جدوجہدِ آزادی میں فرق کے حوالے سے جن تحفظات کا اظہار کیا ہے، اور عرب ممالک اور اسلامی ممالک کے جس موقف کا ذکر کیا ہے، اس کے اظہار کا وقت وہ تھا جب وہ امریکہ کے متحدہ محاذ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر رہے تھے، اور اقوامِ متحدہ میں دہشت گردی کے خلاف امریکی کاروائی کو جواز کی سند دینے کی قرارداد کی حمایت کر رہے تھے۔ اس وقت اگر عرب ممالک اور مسلم ممالک اس موقف پر ڈٹ جاتے اور اس کیلئے عالمی سطح پر لابنگ کر کے اپنے موقف کو منوانے کی سنجیدہ محنت کرتے تو یہ بات منوائی جا سکتی تھی۔ مگر یہ موقع گنوا دینے کے بعد اب قطر کے امیر کو دہشت گردی اور جدوجہدِ آزادی کا فرق یاد آرہا ہے، جبکہ اقوامِ متحدہ اور خود مسلم ممالک کی منظوری کے ساتھ "دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ" امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور اس پر نام درج کرنے کا تمام تر اختیار وائٹ ہاؤس کے پاس ہے، اس لیے

اب پچھتائے کیا ہوت
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۵ دسمبر ۲۰۰۱ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے گذشتہ دنوں ایک گفتگو میں یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ افغانستان کے حوالے سے ان کی پالیسیوں کے مخالفین دانش اور دلیل کی بجائے جذبات کی بات کر رہے ہیں۔ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ کے حالیہ راؤنڈ کے آغاز سے پہلے ہی دلیل اور دانش کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور اس کی جگہ طاقت اور دھونس نے لے لی تھی۔ اب جبکہ جنگ خاصی بڑھ چکی ہے اور ایک نئے دور میں داخل ہونے والی ہے تو جنرل پرویز مشرف کو دلیل اور دانش اچانک کیسے یاد آگئی ہے؟

- ۱۱ ستمبر کے نیویارک اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد جب امریکہ نے اس کا مجرم اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا تو دلیل اور دانش نے امریکہ سے تقاضا کیا تھا کہ کسی کو مجرم قرار دینے سے پہلے ثبوت فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان ثبوتوں کے مؤثر ہونے کا فیصلہ بھی مدعی کی بجائے کوئی غیر جانبدار فورم کیا کرتا ہے۔ لیکن دلیل اور دانش کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا گیا کہ ہم یہ بات بہتر سمجھتے ہیں اس لیے تم خاموش رہو۔
- امریکہ نے طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تو طالبان نے دلیل اور دانش کی بات ہی کی تھی کہ ثبوت فراہم کیے جائیں اور فریقین کیلئے قابل X قبول ٹربیونل تشکیل دیا جائے تو وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کیلئے تیار ہیں۔ مگر طالبان کی بات یہ کہہ کر مسترد کر دی گئی کہ چونکہ ہم طاقت رکھتے ہیں اور بالادست ہیں اس لیے ہم خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، اور خود ہی جج ہیں۔ تم ایک غریب اور بے بس قوم ہو اس لیے تمہارے سامنے کوئی ثبوت پیش کرنا اور تمہارے کسی مطالبہ پر توجہ دینا ہمارے اسٹیٹس کے منافی بات ہے۔
- امریکہ نے جب اقوامِ متحدہ کے سامنے اپنا کیس رکھا اور اس سے دہشت گردی کے خلاف کارروائی کیلئے این او سی مانگا تو دلیل اور دانش نے ڈرتے ڈرتے وہاں بھی عرض کیا تھا کہ ”دہشت گردی“ کی تعریف طے کر لی جائے اور اس کی حدود متعیّن کر لی جائیں تاکہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی زد میں وہ مظلوم اور مجبور اقوام نہ آجائیں جو اپنی آزادی اور تشخص کیلئے قابض اور مسلط قوتوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ مگر دلیل اور دانش کی آنکھوں پر یہ کہہ کر پٹی باندھ دی گئی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا، ابھی امریکہ کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کرنی ہے، جب وہ ایجنڈا کسی فیصلہ کن اسٹیج تک پہنچ جائے گا تو دہشت گردی کی تعریف متعیّن کرنے کی درخواست پر بھی غور کر لیا جائے گا۔
- امریکہ نے افغانستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے پوری دنیا کو وارننگ دی کہ جو اس جنگ میں عملی طور پر

ہمارا ساتھ نہیں دے گا اور دہشت گردی کے خلاف ہمارے اتحاد کا سرگرم رکن نہیں بنے گا اسے دشمن تصور کیا جائے گا۔ دلیل اور دانش نے اس وقت بھی اپنا فرض ادا کیا تھا کہ جنگ میں کسی ایک طرف فریق بننے کی بجائے ایک راستہ غیر جانبدار رہنے کا بھی ہوتا ہے جو ہر شخص اور قوم کا حق سمجھا جاتا ہے، اس حق سے ملکوں اور قوموں کو محروم کر دینا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ مگر دلیل اور دانش کے لبوں پر یہ کہہ کر ٹیپ لگا دی گئی کہ ہر معاملہ میں تمہارا بولنا ضروری نہیں ہے کبھی چپ بھی ہو جایا کرو۔

- امریکہ نے پاکستان کو جنگ میں فرنٹ لائن اسٹیٹ قرار دے کر اس سے فوری طور پر جواب مانگا کہ دو ٹوک طور پر یہ فوراً بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو؟ دلیل اور دانش نے اس وقت بھی جھرجھری لی تھی اور زیر لب منمنائی تھی کہ یہ قومی خود مختاری کے تصور کے خلاف بات ہے۔ اور پاکستان سے کسی معاملہ میں آزادانہ فضا میں فیصلہ کرنے کا حق ہی سرے سے چھین لینا اقوامِ متحدہ کے ان اصولوں کے بھی منافی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر خود امریکہ کے شہر نیویارک میں ہے۔ مگر یہ کہنے پر دلیل اور دانش کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ایسی زوردار چپت پڑی تھی کہ اسے دوبارہ یہ بات کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔
- امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کے شواہد پیش کیے اور برطانوی حکومت نے بڑے اہتمام سے انہیں پریس کیلئے جاری کیا تو دلیل اور دانش نے برطانوی پریس اور ممتاز برطانوی ماہرین قانون کا سہارا لے کر ان کی زبان سے کہا تھا کہ ان پیش کردہ شواہد کی بنیاد پر تو کسی کیس کو قابلِ سماعت قرار دینا اور مجرم پر فرد جرم عائد کرنا ہی سرے سے مشکل ہے۔ اسے مجرم قرار دینا اور اس کیلئے سزا کا اعلان کرنا ان شواہد کے حوالے سے کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر دلیل اور دانش کی اس بات کا جواب یہ دیا گیا کہ ثبوت فراہم کرنا، انہیں عدالت میں پیش کرنے کے قابل بنانا، اور ان پر مخالفانہ دلائل کا سامنا کرنا، یہ سب ترقی یافتہ اور امیر ملکوں کے چونچلے ہیں۔ غریب اور بے بس ملکوں میں ان کا کیا کام؟ ان کیلئے تو صرف ہمارا فرمان کافی ہے، اس لیے اگر ہم نے انہیں دہشت گرد کہہ دیا ہے تو وہ دہشت گرد ہیں۔ دلیل اور دانش کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔
- امریکی طیاروں نے افغانستان کے بھوکے، نہتے اور بے قصور عام شہریوں کو بمباری کا نشانہ بنانا شروع کیا تو دلیل اور دانش نے گزارش کی تھی کہ شہریوں پر بمباری کرنا اور انہیں بلاوجہ موت کے گھاٹ اتارنا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ اگر امریکی سراغ رساں ادارے اپنے اہداف کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو ان کی ناکامی کی سزا عام شہریوں کو دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ مگر دلیل اور دانش کو اس کے جواب میں یہ سننا پڑا کہ یہ غصے اور انتقام کا محل ہے، اس لیے جب تک افغانستان کی اینٹ سے اینٹ نہیں بج جاتی ہمارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا اور نہ ہی ہم دلیل اور دانش کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ ۱۱ستمبر کو پہنائی جانے والی عینک اتار کر کھلی آنکھوں کے ساتھ عالمی منظر کو دیکھیں جہاں دلیل اور دانش سراسیمگی کے عالم میں ایک طرف طاقت اور دھونس کے خوفناک جلاد کے کوڑے کے سائے میں سہمی کھڑی ہے۔ اور ذرا قریب جا کر کانوں کو اس کے منہ کے قریب کریں تو وہ بے چاری اب بھی "جان کی امان پاؤں تو۔۔" کا ورد کرنے میں مصروف ہے۔ اور پھر صدر محترم! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ جب وہ خود یہ کہتے ہیں کہ طالبان نے ہماری بات نہیں مانی اس لیے انہیں بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اور اگر ہم امریکہ کی بات نہ مانتے تو ہمیں بھی اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا، تو کیا اس واضح اعتراف کے بعد بھی دلیل اور دانش کا نام لینے کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

سلطان ٹیپو شہیدؒ اور افغان طالبان: تاریخی مماثلت

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء

افغانستان کے بڑے شہروں پر طالبان کا کنٹرول ختم ہونے سے بعض حلقوں میں افسوس و حسرت کا یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ مدتوں بعد ایک نظریاتی اسلامی ریاست کا عملی نقشہ سامنے آیا تھا مگر اب اس کا جاری رہنا مشکل نظر آرہا ہے۔ پھر خدا جانے کب ایسے امکانات پیدا ہوں گے کہ ہماری آنکھیں خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو نافذ ہوتا دیکھ سکیں گی۔ مجھ سے بھی کچھ دوستوں نے اس سلسلہ میں بات کی ہے مگر میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے، مشکلات آتی رہتی ہیں اور نظریاتی تحریکوں کو مدوجزر کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس لیے وقتی حالات سے حتمی نتیجہ اخذ کر لینا اور مایوسی کا شکار ہو جانا درست عمل نہیں ہے۔

اول تو یہ بات ہی محل نظر ہے کہ بڑے شہروں میں کنٹرول نہ رہنے سے طالبان کا وجود ختم ہو گیا ہے، کیونکہ طالبان نے بڑے شہروں کو خود خالی کیا ہے اور اپنی فورسز کو وہ ان پہاڑوں پر لے گئے ہیں جن پہاڑوں میں رہتے ہوئے افغانوں نے روسی استعمار کے خلاف دس سال تک جنگ لڑی تھی اور بالآخر اسے افغانستان چھوڑ دینے پر مجبور کیا تھا۔ اسی طرح مستقبل قریب کا نقشہ بھی یہی نظر آرہا ہے کہ طالبان ان پہاڑوں پر مورچہ زن ہو کر امریکی اتحاد کی فوجوں اور ان کی حمایت سے بننے والی کابل حکومت کے خلاف گوریلا جنگ لڑیں گے، افغان قوم کی روایات کے مطابق جلد یا بدیر امریکی اتحاد کی فوجوں کو افغانستان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں گے، اور روس کے بعد امریکی پشت پناہی سے قائم ہونے والی کابل حکومت کیلئے بھی اپنا وجود برقرار رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

لیکن اگر خدانخواستہ طالبان کا وجود ختم بھی ہو گیا اور وہ افغانستان کا کنٹرول دوبارہ حاصل نہ کر سکے تو بھی تاریخ میں ان کا یہ کردار کم نہیں ہے کہ انہوں نے ساری دنیا کی مخالفت اور دشمنی کے باوجود افغانستان میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ اور اس کی برکات کا عملی نمونہ آج کے دور میں دنیا کو دکھا دیا۔ اور شرعی قوانین کے ذریعے ایک تباہ شدہ معاشرہ میں مکمل امن قائم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ آج بھی انسانی سوسائٹی کو امن قرآن و سنت کے فطری قوانین کے ذریعے ہی مل سکتا

ہے۔ اس لیے اگر خدانخواستہ طالبان اپنی حکومت کا تسلسل قائم نہ رکھ سکے تو بھی اس دور میں مکمل شرعی نظام کے نفاذ کا آغاز اور اس کا عملی نقشہ پیش کرنا ان کا وہ روشن کارنامہ ہے جو دنیا میں کسی بھی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا، اور اس کے آغاز کا کریڈٹ ہمارے دور کے حوالے سے طالبان کے نام پر تاریخ کے ریکارڈ میں درج ہو چکا ہے۔

باقی رہی بات ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کے ختم ہونے کی تو اس سے قبل کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اندلس میں صدیوں تک اسلامی حکومت رہی ہے جو آج موجود نہیں ہے۔ شہدائے بالاکوٹ نے ۱۸۳۰ء میں پشاور میں اسلامی حکومت قائم کی تھی جو ایک سال بھی نہ چل سکی مگر ان کا مشن بدستور زندہ ہے اور طالبان کی یہ حکومت بھی اسی مشن کا تسلسل ہے۔ اس طرح کے سانحات تاریخ میں کئی بار ہوئے ہیں مگر اسلام کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا، وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ فطری انداز میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اسے قیامت تک زندہ رہنا ہے، زندہ جسم میں زخم لگتے ہیں اور مندمل ہو جاتے ہیں، گھاؤ لگتے ہیں اور بھر جاتے ہیں، بسا اوقات اعضاء بھی ٹوٹ جاتے ہیں مگر جسم کی زندگی اور نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس پس منظر میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران جنوبی ہند میں قائم ہونے والی ایک اسلامی ریاست کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ۱۷۶۱ء میں قائم ہوئی اور ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپوؒ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لیکن چالیس سال سے بھی کم عرصہ قائم رہنے والی اس اسلامی ریاست نے برصغیر کے مسلمانوں کو زندہ رہنے اور آزادی کے حصول کیلئے لڑنے مرنے کا حوصلہ بخشا۔ آج ہم آزاد ہیں اور پاکستان کے نام سے ایک اسلامی ریاست کا پرچم دنیا میں لہرائے ہوئے ہیں تو اس کے پیچھے ''سلطنتِ خداداد میسور'' کا چالیس سالہ شاندار دور اور سلطان ٹیپوؒ اور ان کے رفقاء کی قربانیاں بھی تاریخی پس منظر کے طور پر کارفرما نظر آ رہی ہیں۔

سلطان ٹیپوؒ کا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا، اس خاندان کے ایک بزرگ حسن بن یحیٰیؒ پندرہویں صدی عیسوی کے ساتویں عشرے میں خلافت عثمانیہ کی طرف سے مکہ مکرمہ کے گورنر رہے ہیں، ان کے خاندان کے کچھ لوگ تلاشِ روزگار میں بغداد، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے پنجاب میں آبسے اور ایک عرصہ پنجاب میں گزارنے کے بعد جنوبی ہند کی طرف نکل گئے۔ سلطان ٹیپوؒ کے دادا فتح محمد مغلیہ دور میں سپاہیانہ خدمات سرانجام دیتے رہے جبکہ والد حیدر علی میسور کی ریاست میں راجہ کرشناراج کی فوج میں ایک عام سپاہی کے طور پر بھرتی ہوئے اور خداداد صلاحیتوں اور نمایاں خدمات کی وجہ سے سپہ سالار کے منصب تک پہنچ گئے۔ ۱۷۶۱ء میں میسور کی ریاست راجہ کرشناراج کے ساتھ اردگرد کے راجاؤں کی مسلسل کشمکش اور جنگوں کی وجہ سے صرف ۳۳ گاؤں تک محدود رہ گئی اور راجہ کیلئے اس کو باقی رکھنا بھی مشکل ہو گیا تو سپہ سالار حیدر علی نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور ''سلطنتِ خداداد میسور'' کے نام سے مستقل حکومت قائم کر لی۔ سلطان حیدر علی اور اس کے فرزند سلطان ٹیپو نے تھوڑے عرصہ میں ہی اس سلطنت کا دائرہ اس قدر وسیع کر لیا کہ اس کی سرحد شمال میں دریائے کرشنا اور جنوب میں کیرالہ تک پھیل گئی جبکہ اس کا رقبہ اس دور میں اسی ہزار مربع میل بتایا جاتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب دہلی کی مغلیہ سلطنت کمزور پڑ چکی تھی اور اس پر قبضہ کرنے کیلئے ایک طرف سے انگریز آگے بڑھ

رہے تھے جو ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ شہیدؒ کو شکست دے کر اپنی حکومت کو مستحکم کر چکے تھے جبکہ دوسری طرف سے مرہٹوں کی طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دور میں حیدر آباد بھی ایک طاقتور ریاست سمجھی جاتی تھی مگر اسے انگریزوں نے اپنے گماشتوں کے ذریعے قابو میں رکھا ہوا تھا چنانچہ اس نے ہمیشہ اس خطہ میں انگریزوں کا ہی ساتھ دیا۔ حیدر علیؒ کی قائم کردہ یہ نئی ریاست ان سب طاقتوں کو کھٹک رہی تھی اور ان سب نے باری باری اور پھر متحد ہو کر اس سلطنت کو ختم کرنے کی کوششیں کی مگر حیدر علیؒ نے انتہائی حوصلہ اور تدبر کے ساتھ ان سب قوتوں کا مقابلہ کیا اور سلطنت خداداد کا وجود نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کی وسعت، ترقی اور استحکام میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

۱۷۶۷ء میں انگریزوں، مرہٹوں، حیدر آباد، اور تامل ناڈو کی ریاست ارکاٹ کے نواب محمد علی کی متحدہ فوجوں نے جنرل سمتھ کی قیادت میں سلطنت خداداد پر دھاوا بول دیا۔ دو سال لڑائی جاری رہی جس میں حیدر علیؒ کو فتح ہوئی اور متحدہ محاذ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ۱۷۸۰ء میں دوسری جنگ ہوئی اس میں بھی حیدر علیؒ نے کامیابی حاصل کی اور ۱۷۸۲ء میں حیدر علیؒ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان فتح علی ٹیپوؒ تخت نشین ہوا تو یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریز، مرہٹے اور ان کے ساتھ حیدر آباد اور ارکاٹ کی مسلم ریاستیں اپنے پڑوس میں ایک نئی اسلامی ریاست کے وجود کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور اسے ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ سلطان ٹیپوؒ ایک نیک دل، عالم، بہادر اور حوصلہ مند حکمران تھا جس نے تخت سنبھالتے ہی اپنے پہلے اعلان میں اس بات کا حلف اٹھایا کہ

> "انگریزوں کو اس ملک سے باہر نکالنے کے لیے، جو ہمارے حقیقی دشمن ہیں، پورے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کروں گا۔"

اس نے سلطنت میں اسلامی احکام پر عمل کا اہتمام کیا، قاضی مقرر کیے، قرآن کریم کی تعلیم کا اہتمام کیا اور دینی شعائر و اقدار کی ترویج کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس کی دینداری کا عالم یہ تھا کہ جب اس نے شاہی محل کے ساتھ "مسجد اعلیٰ" کے نام سے نئی مسجد بنوائی تو اس کے افتتاح کے موقع پر اعلان کیا کہ میری خواہش ہے کہ وہ بزرگ پہلی نماز پڑھا کر مسجد کا افتتاح کریں جو صاحب ترتیب ہوں یعنی بالغ ہونے کے بعد ان کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو۔ یہ اعلان سن کر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی تو بالآخر سلطان ٹیپوؒ نے یہ کہتے ہوئے خود آگے بڑھ کر نماز پڑھائی کہ "بحمد اللہ میں صاحبِ ترتیب ہوں"۔

سلطان ٹیپوؒ کے بارے میں ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ قدرتی طور پر ان کی داڑھی نہیں تھی اس لیے ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے انہیں عالم نہیں سمجھا جاتا ورنہ وہ پختہ عالمِ دین اور انتہائی نیک و متقی شخصیت کے حامل تھے۔ سلطان ٹیپوؒ نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کو زندگی کا سب سے بڑا مشن قرار دیا اور دہلی کے مغل حکمرانوں کے علاوہ حیدرآباد دکن کے نظام سے بھی بار بار رابطہ قائم کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسے اپنا حریف نہ سمجھیں اور ساتھ دیں تاکہ سب مل جل کر انگریزوں سے ہندوستان کو خالی کرا سکیں۔ لیکن حیدرآباد دکن کے مسلمان حکمرانوں نے اس بات پر کبھی توجہ نہ دی حتیٰ کہ ایک موقع پر سلطان ٹیپوؒ کی طرف سے آپس میں رشتہ داریاں قائم کرنے کی تجویز بھی مسترد کر دی اور ہمیشہ

انگریزوں کا ساتھ دیا۔

سلطان ٹیپوؒ نے اپنی ریاست میں انگریزوں کے ساتھ تجارت کو ممنوع قرار دیا اور غیر ملکی مصنوعات پر پابندی لگا کر ریاست میں ہتھیار سازی، گھڑی سازی، برتن سازی، اور قینچی سازی کے بڑے بڑے کارخانے بنوائے اور زراعت کو ترقی دینے کیلئے اقدامات کیے۔ خود سلطان ٹیپوؒ غیر ملکی مصنوعات کے استعمال سے گریز کرتا تھا اور اس نے ہمیشہ دیسی کپڑا پہنا۔ سلطان ٹیپوؒ نے خلافت عثمانیہ کے سلطان سلیم کو دوبار وفد بھیج کر پیشکش کی کہ انگریزوں سے خلافت عثمانیہ اور ہندوستان دنوں کو خطرہ ہے اس لیے اگر خلیفہ عثمانی عدن کی بندر گاہ سلطان ٹیپوؒ کو کرایہ پر دے دے تو انگریزوں کے خلاف جنگی محاذ کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ سلطان سلیم نے خلافت کی طرف سے سلطان ٹیپوؒ کی بادشاہت کی توثیق تو کر دی مگر انگریزوں کے خلاف اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا بلکہ سلطان ٹیپوؒ کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں سے دشمنی ترک کر کے ان سے دوستی کر لے۔ سلطان ٹیپوؒ نے افغانستان کے حکمران زمان شاہ سے رابطہ کیا کہ وہ اگر ادھر سے یلغار کرے تو سلطان ٹیپوؒ جنوب سے پیش رفت کرے گا اور دونوں مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔ زمان شاہ جو احمد شاہ ابدالیؒ کا پوتا تھا اس نے سلطان ٹیپوؒ کی یہ پیشکش قبول کر لی اور تیس ہزار سے زائد فوج لے کر کابل سے چل پڑا مگر انگریزوں نے ایران کے بادشاہ کو کسی طرح ورغلا کر افغانستان پر اس سے حملہ کرا دیا اور شیعہ سنی کشمکش کو ابھار کر ہرات کے گورنر کو زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا جس کی وجہ سے زمان شاہ سلطان ٹیپوؒ کی مدد کیلئے نہ پہنچ سکا اور اسے راستہ سے واپس جانا پڑا۔

خلافت عثمانیہ کو سلطان ٹیپوؒ نے باہمی معاہدہ کی تحریری پیشکش کی جس کے اہم نکات یہ ہیں:

1. عدن کی بندر گاہ سلطان ٹیپوؒ کو کرایہ پر دی جائے گی۔
2. انگریزوں کے خلاف خلافت عثمانیہ کے فوجی تعاون کے اخراجات سلطان ٹیپوؒ برداشت کرے گا۔
3. خلافت عثمانیہ کو انگریزوں کے خلاف تعاون کی ضرورت پڑنے پر سلطان ٹیپوؒ اپنے خرچہ پر فوجی تعاون کرے گا۔

مگر سلطان ٹیپوؒ کی یہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور انگریزوں کے خلاف اسے جنگ نہ صرف یہ کہ تنہا لڑنا پڑی بلکہ پڑوس کی دو مسلم ریاستوں حیدر آباد اور ارکاٹ نے انگریزوں کے ساتھ متحدہ محاذ میں شامل ہو کر سلطان ٹیپوؒ کا مقابلہ کیا۔ سلطان ٹیپوؒ پورے شعور کے ساتھ انگریزوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک بڑا خطرہ سمجھتا تھا اور اس نے ایک جنگ کے موقع پر انگریز جنرل میکلوڈ کو اپنے خط میں لکھا کہ

”مستند کتابوں سے ظاہر ہے کہ آپ جو اپنے آپ کو مسیح علیہ السلام کا پیروکار کہتے ہو صحیح نہیں ہے۔ یہ دعویٰ آپ کا غلط ہے کیونکہ اصلی انجیل میں تثلیث کی پرستش کی ہدایت نہیں ہے، یہ تو صرف مشرکین کا رویہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا تھا، تم لوگوں نے انجیل کی تعلیم کے خلاف شراب پینا، خنزیر کا گوشت کھانا اور سود کھانا شروع کر دیا ہے اور ہر وہ کام جو نہ صرف مذہبی بلکہ

انسانی نقطۂ نظر سے بھی ممنوع ہے اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر حضرت مسیح علیہ السلام اور تمام برگزیدہ لوگ تم سے نفرت و کراہت کرتے ہیں اس لیے تم سے لڑنا واجب ہے۔"

اس کیفیت میں انگریزوں نے حیدر آباد، مرہٹوں اور ارکاٹ کو ساتھ ملا کر متحدہ محاذ بنا لیا اور "سلطنتِ خداداد میسور" کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ انگریز گورنر جنرل لاڈ ویلزلی نے سلطان کو دھمکی دی کہ اس نے برطانیہ کے دشمن فرانسیسیوں کو فوج میں بھرتی کیا ہوا ہے وہ انہیں فوراً نکال کر انگریزوں کو بھرتی کرے اور بنگلور کی بندر گاہ انگریزوں کیلئے خالی کر دے ورنہ اس پر حملہ کر دیا جائے گا۔ اور اس خط کے ساتھ نوٹس یہ تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس خط کا جواب دیا جائے۔ سلطان نے یہ دھمکی مسترد کر دی جس پر انگریزوں کے متحدہ محاذ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ سلطان ٹیپوؒ کا وزیر میر صادق انگریزوں سے ملا ہوا تھا اس نے جنگ کی ساری منصوبہ بندی دشمن کو بتا دی اور دشمن کے کمانڈروں کو اندر کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس کے باوجود انگریزی فوجوں کی یلغار سلطان ٹیپوؒ کے آہنی عزم کے سامنے کئی روز رکی رہی۔ ایک روز سلطان ٹیپوؒ قلعہ سے باہر نکل کر انگریزی فوجوں سے براہ راست جنگ میں مصروف تھا کہ اچانک دشمنوں کا زیادہ ہجوم دیکھ کر اس نے واپس قلعہ میں جانا چاہا، میر صادق یہ منظر دیکھ رہا تھا اس نے سلطان کو آتا دیکھ کر قلعہ کا دروازہ بند کرا دیا جس سے سلطان ٹیپوؒ دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا۔

میر صادق کو تو اسی وقت سلطان ٹیپوؒ کے ایک وفادار سپاہی احمد خان نے یہ کہہ کر تلوار کے ایک ہی وار سے جہنم رسید کر دیا کہ "سلطان کو دشمنوں کے حوالے کر کے خود بچ کر کہاں جا رہے ہو؟" جبکہ سلطان ٹیپوؒ نے آخری دم تک مقابلہ کیا اور آخری لمحات میں جب اس کے ایک خادم راجہ خان نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی جان بچانے کیلئے خود کو دشمن کے حوالہ کر دے تو سلطانؒ نے پلٹ کر غصہ سے کہا کہ

"میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

اور اس طرح سلطان ٹیپوؒ نے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے ۴ مئی ۱۸۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔ سلطان کی لاش پر کھڑے ہو کر انگریز کمانڈر فرط مسرت سے چیخ اٹھا کہ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے" اور اس طرح سلطان ٹیپوؒ کے ساتھ ہی اس کی اسلامی ریاست بھی دنیا کے نقشہ سے معدوم ہو گئی۔

امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمہ اور نئی افغان حکومت کے رجحانات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ دسمبر ۲۰۰۱ء

کابل پر امارتِ اسلامی افغانستان کا کنٹرول ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سنبھالنے والے شمالی اتحاد کے وزیر انصاف نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طالبان کے سخت قوانین ختم کر دیے جائیں گے اور کسی کو ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے،

اور کوڑے مارنے کی سزا آئندہ نہیں دی جائے گی بلکہ صدر داؤد خان کے دور کے قوانین واپس لائے جائیں گے جن کے بارے میں ایک قومی اخبار نے یکم دسمبر کو یہ خبر شائع کی ہے کہ کابل کے ایک پچیس سالہ شخص نے بتایا ہے کہ اسے طالبان حکومت نے اس جرم میں ایک سال قید کی سزا دی تھی کہ اس نے گرل فرینڈ رکھی ہوئی تھی جبکہ صدر داؤد خان کے دور میں اسے جرم تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کابل کی نئی حکومت کے رجحانات کیا ہیں اور طالبان حکومت نے شرعی نظام کے نفاذ کو جہاد افغانستان کا منطقی تقاضا قرار دیتے ہوئے اس کی طرف جو پیش رفت کی تھی اسے کابل کی نئی حکومت کس حد تک جاری رکھنے کیلئے تیار ہوگی؟

جہاں تک شرعی قوانین کے نفاذ کو جہادِ افغانستان کا منطقی تقاضا قرار دینے کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ روسی استعمار کے خلاف جہاد کا اعلان ہی اس بنیاد پر ہوا تھا کہ کمیونزم کا کافرانہ نظام نافذ ہوگیا ہے اور اسے ختم کر کے شرعی نظام کا نفاذ مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اگر اب بھی افغانستان میں صدر داؤد کے دور کے قوانین نے ہی واپس آنا ہے تو سرے سے اس جنگ کی شرعی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جو جنگ کمیونسٹ نظام کے خاتمہ کیلئے ''جہادِ افغانستان'' کے نام سے لڑی گئی تھی اور جس میں موجودہ شمالی اتحاد میں شامل اہم راہنما بھی پیش پیش تھے۔ باقی رہی یہ بات کہ طالبان نے جو قوانین نافذ کیے تھے وہ سخت ہیں تو ان کی سختی اپنی جگہ مگر انہیں ''طالبان کے قوانین'' قرار دے کر مسترد کرنا کسی ایسے شخص یا گروہ کو زیب نہیں دیتا جو مسلمان کہلاتا ہے اور قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس لیے کہ سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، اور ہاتھ کاٹنے کی سزائیں طالبان کی تجویز کردہ نہیں بلکہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہے اور یہ سزائیں قرآن کریم میں بدستور موجود ہیں۔

گذشتہ دنوں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ''انسانی حقوق کمیٹی'' نے ایک قرارداد میں ایران کو بھی وارننگ دی ہے کہ وہ سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، ہاتھ کاٹنے اور سرعام سزا دینے کے قوانین تبدیل کرے۔ شاید اسی لیے افغانستان میں شمالی اتحاد کے وزیر انصاف کو اقوامِ متحدہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے پیشگی یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ افغانستان کی نئی حکومت ملک میں طالبان کے نافذ کردہ شرعی قوانین کا تسلسل جاری نہیں رکھے گی۔

ہم ایک عرصہ سے عرض کر رہے ہیں کہ افغانستان کے حوالے سے امریکی ایجنڈے کی سب سے اہم شق طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنا تھا کیونکہ یہ دنیا کی واحد مسلم حکومت تھی جو اسلام کا صرف نام نہیں لیتی تھی بلکہ اس نے سوسائٹی میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین کو من وعن نافذ کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا اور وہ اس میں کس قسم کی لچک اختیار کرنے کیلئے کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ طالبان حکومت کی بعض تعبیرات یا ترجیحات سے اختلاف ہو سکتا ہے اور خود ہم نے بھی متعدّد بار طالبان حکومت کے بعض ذمہ دار حضرات سے ان تعبیرات و ترجیحات کے حوالے سے بات کی ہے اور اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تعبیرات و ترجیحات کا فرق اور چیز ہے اور سرے سے ان قوانین کو ہی ''طالبان کے سخت قوانین'' قرار دے کر مسترد کر دینا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ اور مغرب دراصل یہی چاہتا ہے کہ ''وحشیانہ سزائیں'' اور ''دہشت گردی'' کے نام سے شرعی قوانین کے خلاف وسیع تر معاندانہ پراپیگنڈا کر کے، نیز عسکری قوت اور معاشی دباؤ کے ذریعے انہیں اس بات کیلئے تیار کیا جائے کہ وہ شریعت کے ان احکام و قوانین سے دستبردار ہو

جائیں جو مغرب کے عالمی نظام سے مطابقت نہیں رکھتے اور جن کی موجودگی میں مسلمان معاشرہ کو مغربی ثقافت کے دائرہ میں لانا ممکن نہیں ہے۔

مغرب اور اس کے ہمنواؤں کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سب قوانین قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں جو چودہ سو برس سے بالکل محفوظ حالت میں مسلمانوں کے پاس نہ صرف موجود ہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اس حفاظ و قراء مسلسل اس کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں اور وہ اتنے اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے کہ اس کے کسی لفظ یا جملے کو آگے پیچھے کرنا یا اس کے بیان کردہ کسی قانون اور ضابطے کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً مذہب کے نام پر اور مذہب کے تحفظ کیلئے جنگ کو مغرب کے ہاں "دہشت گردی" سمجھا جاتا ہے اور امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف موجودہ عالمی جنگ کا مقصد صرف یہی ہے کہ دنیا بھر کے ان لوگوں کو ختم کیا جائے جو مذہبی جذبہ کے ساتھ مذہب کے فروغ یا تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ جبکہ اسلام میں یہ جنگ "جہاد" کہلاتی ہے اور اس پر قرآن کریم کی سینکڑوں آیات موجود ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ جہاد کے احکام و قوانین بیان کرتی ہیں اور مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ مگر قرآن کریم نے جہاد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ مغربی فلسفہ کی رو سے انتہا پسندی اور دہشت گردی شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم اور سنت نبویؐ نے چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنے، جھوٹی تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے، قاتل کو قصاص میں قتل کرنے، ڈاکو کے ہاتھ پاؤں کاٹنے، اور مجرم کو سرعام سزا دینے کے احکام دیے ہیں جو مغربی فلسفہ کی رو سے وحشیانہ سزائیں کہلاتی ہیں۔

چنانچہ اب یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اقوامِ متحدہ کے منشور، جنرل اسمبلی کی قراردادوں، مغربی لابیوں کے مطالبات، اور امریکہ کی دھونس کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن و سنت کے احکام سے دستبرداری پر مجبور کیا جائے اور "انسانی حقوق کے چارٹر" کی پابندی کے نام پر انہیں مغربی تہذیب و ثقافت کے دائرہ میں لایا جائے۔ یہ مہم آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جاری ہے جب بہت سے مسلم ممالک پر برطانوی، فرانسیسی اور پرتگیزی استعمار نے قبضہ کر کے وہاں صدیوں سے چلے آنے والے شرعی قوانین کو ختم کر دیا تھا اور مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو یہ سمجھانا شروع کیا تھا کہ اب ان قوانین کا دور نہیں رہا، زمانہ بہت ترقی کر چکا، سائنس نے بہت سے نئے حقائق دریافت کیے ہیں اور ٹیکنالوجی بہت آگے بڑھ گئی ہے، اس لیے خاندان اور معاشرہ کے حوالے سے ان قوانین کیلئے دنیا میں اب کوئی جگہ نہیں رہی جو قرآن و سنت میں بیان کیے گئے ہیں۔

اس مقصد کیلئے خود مسلمانوں میں بہت سے ایسے فکری حلقے کھڑے کیے گئے جنہوں نے قرآنی احکام و قوانین کی من مانی تشریح کر کے مسلمانوں کو مغربی فکر و فلسفہ کے سامنے سر جھکانے کی سر توڑ کوشش کی۔ مگر مسلم ممالک کے حکمران گروہوں اور ان کے ساتھ ایک محدود مغرب زدہ طبقہ کے علاوہ کسی نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی دنیا کے ہر خطے میں عام مسلمانوں کی اکثریت اپنے اس ایمان و یقین پر قائم ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو قیامت تک نافذ العمل رہے گی اور اس کی تعبیر و تشریح صرف وہی قبول ہوگی جو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کہ سیرت و سنت اور حدیث کے ذخیرہ میں پوری طرح موجود و محفوظ ہے۔

چنانچہ ان قوانین کو طالبان کے قوانین یا ایرانی حکومت کے قوانین کا نام دینے یا دہشت گردی اور وحشیانہ سزائیں قرار دینے کی اس نئی عالمی مہم کا نتیجہ بھی پہلے سے مختلف نہیں ہوگا۔ دنیا بھر کا عام مسلمان قرآن و سنت پر دوٹوک ایمان اور ان کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ رکھتا ہے، اسے امریکی بمباری اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے ذریعے قرآن و سنت کے صریح احکام سے دستبردار کرانے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اقوامِ متحدہ کے منشور پر نظرثانی کی ضرورت

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۱ء

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی انسانی حقوق کمیٹی نے کچھ عرصہ قبل اسلامی جمہوریہ ایران کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں ایرانی حکومت سے متعدّد قوانین اور پالیسیوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ قرارداد ۵۲ کے مقابلہ میں ۷۱ ووٹوں سے منظور ہوئی ہے۔ قرارداد کے خلاف ووٹ دینے والوں میں اکثریت مسلم ممالک اور سابق کمیونسٹ ملکوں کی ہے جبکہ ۴۱ ممالک رائے شماری سے غیر حاضر رہے جن میں زیادہ افریقی ممالک ہیں۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنرل اسمبلی اگلے ماہ اس قرارداد کی حتمی منظوری دے گی۔

قرارداد میں ایرانی حکومت سے جن قوانین کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں بطور خاص (۱) سرعام سزا دینے (۲) ہاتھ یا پاؤں کاٹنے (۳) سنگسار کرنے (۴) بعض غیر سنگین جرائم پر موت کی سزا دینے (۵) اور کوڑے مارنے کی سزائیں بھی شامل ہیں جنہیں قرارداد میں ”وحشیانہ سزائیں“ قرار دیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ جنرل اسمبلی کی طرف سے اس قرارداد کی حتمی منظوری کے بعد اگر ایران نے ان قوانین میں ردوبدل نہ کیا تو اس کے خلاف اقوامِ متحدہ کی طرف سے امتناعی احکامات اور پابندیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس سے قبل افغانستان میں کابل کا کنٹرول حاصل کرنے والے شمالی اتحاد کے وزیر قانون اور وزارت انصاف کے ایک ڈائریکٹر نے گذشتہ روز ایک انٹرویو میں واضح کیا ہے کہ طالبان دور کے ”سخت قوانین“ تبدیل کیے جا رہے ہیں اور صدر داؤد خان کے دور کا قانونی نظام واپس لایا جا رہا ہے۔ شمالی اتحاد کے ان راہنماؤں کے بقول خاص طور پر سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور ہاتھ کاٹنے جیسی سزائیں منسوخ کر دی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ایک قومی اخبار نے طالبان حکومت کے دور میں ایک سال قید کاٹنے والے پینتیس سالہ افغان شہری کا انٹرویو شائع کیا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ طالبان حکومت نے اسے گرل فرینڈ رکھنے کے جرم میں سزا دی تھی جبکہ صدر داؤد کے دور میں یہ جرم نہیں تھا۔ دوسری طرف سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبد اللہ کے اس حالیہ اخباری بیان کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی میڈیا قرآن کریم کے احکامات کے خلاف زہریلا پراپیگنڈا کر رہا ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی، امریکی وزارت خارجہ کے جنوبی ایشیا ڈیسک اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی چند سال کی مسلسل رپورٹوں میں ان امور کا تذکرہ ہوتا رہا ہے اور خود پاکستان

کے بعض سیاسی راہنماؤں کی طرف سے کوڑے مارنے، سنگسار کرنے اور ہاتھ کاٹنے کی سزاؤں کو کھلم کھلا وحشیانہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کشمکش کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ بات واضح طور پر سامنے آجائے کہ اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک کا اس بارے میں موقف کیا ہے اور وہ اس قسم کی قراردادوں اور رپورٹوں کے ذریعے مسلم ممالک سے کیا تقاضہ کررہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ نے انسانی حقوق کے جس چارٹر کو دنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ اور عملداری کی بنیاد بنا رکھا ہے اس کی دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ

> "کسی شخص کو ذہنی اذیت، جسمانی تشدد اور عزت نفس کے منافی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی ایسی سزا دی جائے گی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی جرم کی سزا کا ذہنی اذیت، جسمانی تشدد اور تذلیل کے عناصر سے خالی ہونا ضروری ہے۔ جبکہ اسلام میں معاشرتی جرائم کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً:

- سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ ڈکیتی اور قتل کے مرتکب افراد کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔
- اسی سورہ کی آیت ۳۸ میں کہا گیا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔
- سورہ نور کی آیت ۲ میں کہا گیا ہے کہ زنا کرنے والے مرد اور عورت دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔
- اسی سورہ کی آیت ۴ میں کہا گیا ہے کہ کسی پاک دامن عورت پر بدکاری کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اسی کوڑے مارے جائیں۔
- سورہ نور کی آیت نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ بدکاری کی سزا سرعام دی جائے تاکہ لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔
- فقہاء امت کا کہنا ہے کہ سورہ نور میں مذکورہ زنا کی سزا غیر شادی شدہ مرد اور عورت کیلئے ہے جبکہ شادی شدہ مرد اور عورت زنا کے مرتکب ہوں تو تورات میں ان کیلئے سنگسار کرنے کی سزا مقرر تھی جسے بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور متعدّد کیسوں میں تورات کے اسی قانون کے مطابق مجرموں کو سنگسار کرنے کی سزا دی۔

یہ چند حوالہ جات اس بات کی وضاحت کیلئے دیے گئے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے، پاؤں کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور سرعام سزا دینے کے یہ قوانین ایرانی حکومت یا طالبان حکومت کے خود ساختہ نہیں بلکہ قرآن کریم کے بیان کردہ ہیں جن پر صدیوں تک امت میں عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان سزاؤں میں جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور عزت نفس مجروح ہونے کے واضح پہلو موجود ہیں اس لیے اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی رو سے یہ قوانین وحشیانہ قرار

پاتے ہیں اور ان کے نفاذ سے اقوامِ متحدہ کے اصولوں کی رو سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

ایران کے خلاف اقوامِ متحدہ کی مذکورہ قرارداد میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ کسی سنگین جرم کے بغیر موت کی سزا دینے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ یہ بہت دلچسپ نکتہ ہے اس لیے کہ اسلام میں زنا، ارتداد اور توہینِ رسالت کے جرائم میں موت کی سزائیں مقرر ہیں اور یہ تینوں امور اقوامِ متحدہ کے نزدیک سنگین جرم نہیں ہیں بلکہ سرے سے انہیں جرم ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ مذہب تبدیل کرنے کے عمل کو اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ ۱۸ میں انسانی حقوق میں شمار کیا گیا ہے اور کسی بھی معاملہ میں رائے قائم کرنے اور اس کے کھلم کھلا اظہار کو ہر شخص کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اقوامِ متحدہ کے منشور اور اس کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلم ممالک سے انسانی حقوق کے عملی احترام کیلئے اس کے مطالبہ کی زد میں جو قوانین آتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو قرآن و سنت کے بیان کردہ ہیں اور اسلامی شریعت کے قوانین تصور کیے جاتے ہیں۔ ہم نے ان سب اسلامی قوانین کا احاطہ نہیں کیا جو اقوامِ متحدہ کے منشور سے ٹکراتے ہیں بلکہ بطور نمونہ صرف چند ایک کا تذکرہ کیا ہے تاکہ عالمی سطح پر موجودہ تہذیبی اور ثقافتی کشمکش کا وہ پہلو واضح طور پر سامنے آسکے جو اس وقت دنیا بھر میں اقوامِ متحدہ کے منشور کی بنیاد پر یکساں قوانین کے نفاذ کیلئے کی جانے والی جدوجہد کا اہم عنوان بن چکا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی اب تک کی قراردادوں اور رپورٹوں میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مسلم ممالک اپنے قانونی نظاموں کو اقوامِ متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے مطابق تبدیل کرتے ہیں تو انہیں نکاح، طلاق، وراثت، زنا، شراب، چوری، ڈکیتی، قذف، ارتداد اور ناموسِ رسالت ؐ جیسے بہت سے معاملات میں قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے صریح احکام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ قرآن و سنت کے ان واضح احکام و قوانین سے دستبرداری اختیار کیے بغیر اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر اس طرح کا عملدرآمد ممکن ہی نہیں ہے جس کیلئے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی مسلسل قراردادیں منظور کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور ایران کے خلاف بھی اس نے اسی مقصد کیلئے یہ قرارداد منظور کی ہے۔ اقوامِ متحدہ کا موقف یہ ہے کہ جن ممالک نے انسانی حقوق کے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں وہ اس پر عملدرآمد کے پابند ہیں اس لیے انہیں اس منشور اور اس کی وضاحت میں اقوامِ متحدہ کی منظور کردہ قراردادوں پر مکمل عملدرآمد کا اہتمام کرنا چاہیے اور یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

اب ایک طرف قرآن و سنت کے واضح احکام ہیں اور دوسری طرف اقوامِ متحدہ کا منشور اور جنرل اسمبلی کی قراردادیں ہیں جنہوں نے مسلم حکمرانوں کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے اور ان کیلئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ وہ یا تو اقوامِ متحدہ کے منشور پر کیے گئے دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے تمام مطالبات کو منظور کر کے ترکی کی طرح باقی مسلم ملکوں میں بھی اسلامی قوانین کو شجر ممنوعہ قرار دے دیں، یا پھر اقوامِ متحدہ کے منشور کی قرآن و سنت کے منافی دفعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے خلاف تحفظات کا اظہار کریں اور ان کی تبدیلی کیلئے منظم دباؤ ڈالیں۔

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی قبل جب اقوامِ متحدہ نے انسانی حقوق کا یہ چارٹر منظور کیا تھا تو اس وقت مسلم دنیا کی وہ پوزیشن نہیں تھی جو آج ہے، بیشتر ممالک غلام تھے اور جو چند مسلم ملک آزاد کہلاتے تھے وہ بھی ایک منظم

گروپ کے طور پر اپنی بات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ جبکہ آج اقوامِ متحدہ میں ساٹھ کے قریب مسلم ممالک کا گروپ موجود ہے اور اسے یہ پوزیشن حاصل ہے کہ اگر مسلم ممالک قرآن و سنت کے ساتھ عملی وابستگی اور دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کا مطالبہ کریں اور اس منشور کے ذریعے پوری دنیا پر مغربی تہذیب و ثقافت مسلط کرنے کی کوششوں کے خلاف ڈٹ جائیں تو وہ مغرب کی اس ثقافتی یلغار کو بریک لگا سکتے ہیں جو امریکہ کی فوجی قوت اور اقوامِ متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے زور پر پوری دنیا کے مسلم معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لینے کیلئے مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

چند سال قبل ملائیشیا کے وزیرِ اعظم مہاتیر محمد نے مسلم حکومتوں سے کہا تھا کہ وہ اقوامِ متحدہ کے طرزِ عمل اور پالیسیوں کے خلاف منظم گروپ کے طور پر احتجاج کریں اور اجتماعی دباؤ ڈال کر اقوامِ متحدہ کو اپنے منشور اور پالیسیوں پر نظر ثانی پر مجبور کریں۔ ہمارے نزدیک مسلم حکومتوں کیلئے آج بھی باوقار راستہ یہی ہے، ورنہ دنیا بھر کے مسلم حکمران یہ بات نوٹ کر لیں کہ اگر انہوں نے اسلامی شریعت کے صریح منافی اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تو وہ اس عمل میں تنہا ہوں گے اور مسلم دنیا کے عوام کو اقوامِ متحدہ کے منشور کی خاطر قرآن و سنت کے ارشادات سے دستبردار ہونے کیلئے وہ کبھی تیار نہیں پائیں گے۔

افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت اور وزیر داخلہ کا اعترافِ حقیقت

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل جناب معین الدین حیدر نے گذشتہ دنوں دارالعلوم کورنگی کراچی میں علماء کرام سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا حرام ہے لیکن مجبوری کی حالت میں حرام کھانا بھی جائز ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح معین الدین حیدر اپنی تمام تر تلخ نوائی اور دھمکیوں کے باوجود اصولی طور پر ہمارے ساتھ اس موقف میں متفق ہو گئے ہیں کہ امارات اسلامی افغانستان کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینا مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا ہے۔ ہمیں "اعترافِ حقیقت" کے اس حصہ سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ مجبوری اس درجہ کی تھی کہ اس میں حرام کھانا بھی جائز ہو جاتا، کیونکہ شریعت نے بعض حالات میں ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی اجازت دی ہے لیکن اسے صرف مجبوری کی بجائے "اضطرار" کی کیفیت کے ساتھ مشروط کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ اگر اضطرار اس درجہ کا ہو کہ فی الواقع ہلاکت کا خطرہ ہو اور دوسرا کوئی متبادل نہ ہو تو حرام کھانے کی اجازت ہے، اور حرام بھی صرف اس قدر کہ اس سے جان بچ جائے اس سے زیادہ اس حالت میں بھی حرام کھانے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنے سے قبل ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب باقی ماندہ پاکستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اقتدار سنبھالا اور صوبہ سرحد میں نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کے تعاون سے مولانا مفتی محمودؒ وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے صوبہ سرحد میں شراب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر مکمل پابندی کا اعلان کیا۔ اس پر وفاقی حکومت نے صوبہ سرحد کی حکومت کو لکھا کہ شراب کی مد میں صوبائی حکومت کو لاکھوں روپے کا جو ٹیکس وصول ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے گا جس سے بجٹ میں خسارہ ہوگا، اور وفاقی حکومت اس خسارے کو پورا کرنے کیلئے کوئی تعاون نہیں کرے گی۔ اس کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا کہ ٹھیک ہے ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے خسارہ پورا کر لیں گے اور اس مد میں وفاق سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد وفاقی حکومت کا دوسرا خط انہیں موصول ہوا کہ صوبہ سرحد میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جن پر شراب کی پابندی ختم کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ شراب کے حرام ہونے کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا اور اگر غیر مسلم شراب پییں گے تو ان پر ہمارا قانون لاگو نہیں ہوگا، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے صوبائی حکومت اس طرح کی دکانیں نہیں کھلوا سکتی۔ تھوڑا عرصہ گزرا تو وفاقی حکومت نے تیسرا خط بھجوا دیا کہ شراب بعض بیماریوں میں علاج کے طور پر استعمال ہوتی ہے اس لیے اس قسم کی بیماریوں کیلئے شراب کی کچھ دکانیں کھلوانا ضروری ہیں۔ اس پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کے ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اسے یہ کہا کہ ایسی بیماریوں کی نشاندہی کرو جو مہلک ہوں اور شراب کے علاوہ ان کا اور کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ میڈیکل بورڈ نے بہت تلاش کیا مگر ایسی کوئی بیماری نہ ملی مگر اس کی حتمی رپورٹ کی تیاری ابھی جاری تھی کہ صوبہ بلوچستان میں مینگل حکومت کی بلا جواز برطرفی کے خلاف احتجاج کے طور پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا، ورنہ یہ گفتگو خدا جانے اور کس کس انداز میں آگے بڑھتی۔

اس لیے یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا حکومت پاکستان کی مجبوری فی الواقع اس درجہ کی تھی کہ اسے شرعی اضطرار قرار دے کر اتنے بڑے حرام کے ارتکاب کا جواز فراہم کر دیا جائے جو افغانستان میں پاکستان کی دوست حکومت کے خاتمہ، افغان عوام پر وحشیانہ بمباری اور کابل پر پاکستان دشمن شمالی اتحاد کے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے امریکی اقدامات کے ساتھ تعاون بلکہ ان میں عملاً شرکت کی صورت میں سامنے آ چکا ہے۔ ہمارے خیال میں معاملہ ایسا نہیں تھا اور مجبوری کو جس درجہ میں حکومت پاکستان نے خود پر مسلط کر لیا تھا اس سطح کی مجبوری نہیں تھی۔ کیونکہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد جنرل پرویز مشرف شخصی طور پر امریکی دباؤ کا شکار ہوئے وہ اس طور پر خود ہی حتمی فیصلہ کرنے کی بجائے حالات کا بروقت اندازہ کرتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہی خواہوں اور دوستوں سے رابطہ و مشاورت کا اہتمام کر لیتے تو امریکی دباؤ کے آگے سیاسی یا اخلاقی رکاوٹ کھڑی کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا۔ مگر یہاں عملاً یہ ہوا کہ شخص واحد نے خود کو "عقل کل" سمجھتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیا اور پوری قوم سے یہ تقاضا کیا گیا کہ چونکہ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے اس لیے سب کو ہمارے پیچھے ہر حال میں چلنا ہوگا۔

اس تاریخی لمحہ پر ہم سے جو تاریخی غلطی سرزد ہوئی اس کے نتائج و عواقب سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور جوں جوں

امریکی بمباری کی دھول بیٹھے گی اور مستقبل کا منظر مزید واضح نظر آنا شروع ہوگا ہمارے وزیر داخلہ محترم پر اس "حرام کام" کے مزید اسرار و رموز بھی ان شاء اللہ کھلتے چلے جائیں گے۔ مگر سردست ہم جناب معین الدین حیدر سے ان کے اس ارشاد گرامی کے حوالے سے دو سوال کرنا چاہتے ہیں:

1. ایک یہ کہ یہ درست ہے کہ اضطرار کی حالت میں زندگی بچانے کیلئے ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی واقعی شریعت نے اجازت دی ہے تو کیا افغانستان میں ان کی یہ ضرورت اب تک پوری ہوگئی ہے یا اور شہروں کی تباہی اور لوگوں کی لاشوں کی ضرورت ابھی باقی ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں ہمارے حکمرانوں کو اپنی جانیں بچانے کیلئے اور کتنے افغانوں کا خون درکار ہے؟
2. اور دوسرا سوال یہ کہ جب وہ خود اس کو حرام کہہ رہے ہیں اور مجبوری کے درجہ میں اس حرام کے استعمال کا اعتراف کر رہے ہیں تو اس عمل کے ساتھ دانش، حکمت اور تدبر کا جوڑ لگا کر ان مقدس الفاظ کی معنویت کو دھندلانے میں آخر کون سی دانش پنہاں ہے؟

کابل کی نئی حکومت اور اسلامی قوانین

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۲ء

روزنامہ جنگ لاہور یکم دسمبر ۲۰۰۱ء کی ایک خبر کے مطابق کابل کا کنٹرول سنبھالنے والے شمالی اتحاد کی وزارتِ انصاف کے ڈائریکٹر نور محمد امیری نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ افغانستان میں اب سرعام پھانسی، سنگساری، اور مرد و عورت کی تمیز کیے بغیر کوڑے لگانے کی سزائیں نہیں دی جائیں گی اور طالبان کے ان سخت قوانین کو بدل دیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ سابق صدر داؤد خان کے دور کے قانونی نظام کو واپس لایا جائے گا اور اب طالبان جیسا سلوک نہیں ہوگا۔

طالبان حکومت سے دنیا کو اصل شکایت ہی یہ تھی کہ انہوں نے افغان معاشرہ میں معاشرتی جرائم کی شرعی سزاؤں کا نفاذ کر دیا تھا اور ان پر پوری طرح عملدرآمد بھی ہوتا تھا۔ جس سے مسلسل جنگ کی تباہ حالی اور اقتصادی بربادی کے باوجود مثالی طور پر امن قائم ہو گیا تھا اور افغان عوام سکون سے زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ یہ سزائیں اگرچہ بظاہر سخت ہیں لیکن کسی بھی معاشرہ میں حقیقی امن کے قیام کی ضامن ہیں، اور یہ سزائیں طالبان حکومت کی تجویز کردہ نہیں بلکہ قرآن و سنت میں واضح طور پر ان کی صراحت موجود ہے اور صدیوں تک خلافت کے نظام کے تحت دنیا کے ایک بڑے حصے میں نافذ العمل رہی ہیں۔

مغربی دنیا اور اس کی تہذیب و ثقافت پر ایمان لانے والے مسلم حکمرانوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر طالبان حکومت کا یہ نظام کامیابی کے ساتھ چند سال اور چل گیا تو باقی دنیا بالخصوص مسلم ممالک میں بدامنی اور لاقانونیت سے دوچار عوام کیلئے اس نظام میں کشش بڑھنے لگے گی، اس لیے انہوں نے مل جل کر طاقت اور قوت کے زور سے طالبان

حکومت کو ختم کر دیا ہے۔ اور اب امریکہ کی سرپرستی میں بننے والی کابل حکومت کی طرف سے اس واضح اعلان نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا اصل مقصد دہشت گردی پر قابو پانا نہیں بلکہ افغانستان میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اسلامی نظام کو ختم کرنا تھا۔

اسامہ بن لادن اور ان کی جدوجہد

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۲ء

(لاہور کے ایک دینی حلقے کی طرف سے بھیجے گئے سوالات کے جوابات)

سوال: ستمبر کے حملے کے بعد جو حالات پیش آئے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پنٹاگون کی عمارت سے جہاز ٹکرانے کے جو واقعات ہوئے ہیں، ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس نے کیے ہیں، اور خود مغربی ایجنسیاں بھی اس سلسلے میں مختلف امکانات کا اظہار کر رہی ہیں۔ لیکن چونکہ امریکہ ایک عرصہ سے معروف عرب مجاہد اسامہ بن لادن اور عالمِ اسلام کی مسلح جہادی تحریکات کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہا تھا، اور خود اسامہ بن لادن کی تنظیم ''القاعدہ'' کی طرف سے امریکی مراکز اور تنصیبات کو نشانہ بنانے کے اعلانات بھی موجود تھے، اس لیے امریکہ نے ان حملوں کا ملزم اسامہ بن لادن کو ٹھہرانے اور افغانستان کی طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا فوری مطالبہ کر دیا اور اقوامِ متحدہ اور ورلڈ میڈیا کے ذریعے سے وہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش میں لگ گیا کہ ان حملوں کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک ان حملوں کا تعلق ہے، دنیا کے ہر باشعور شخص نے ان کی مذمت کی اور ان میں ضائع ہونے والی ہزاروں بے گناہ جانوں کے نقصان پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ نے اس پر جس ردعمل کا اظہار کیا اور اس ردعمل پر اپنے آئندہ اقدامات کی بنیاد رکھی، اس کے بارے میں واضح تاثر یہ تھا کہ اس ردعمل کی بنیاد حوصلہ و تدبر پر نہیں بلکہ غصے اور انتقام پر ہے، اور عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ امریکہ بہر صورت فوری انتقامی کارروائی کرنے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہادی تحریکات کو کچل دینے پر تل گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہونے والے مسلسل اقدامات نے اس عمومی تاثر و احساس کی تصدیق کر دی ہے۔

جہاں تک الشیخ اسامہ بن لادن اور افغانستان کی طالبان حکومت کے موقف کا تعلق ہے، ان کے طریقۂ کار اور ترجیحات سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود اصولی طور پر ان کا موقف درست تھا اور امریکہ کا موقف اس کے مقابلے میں کمزور اور بے وزن تھا۔ اسی لیے امریکہ نے کارروائی میں عجلت سے کام لیا تاکہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے نتیجے میں اسے عالمی سطح پر جو ہمدردی حاصل ہوئی ہے، اس کے ٹھنڈا پڑ جانے سے قبل وہ سب کچھ کر دیا جائے جس کیلئے امریکی دماغ اور

ادارے کئی سال سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اسامہ بن لادن روس کے خلاف جہادِ افغانستان میں عملاً شریک تھے اور امریکہ بھی اس جہاد کا سب سے بڑا سپورٹر تھا، اسی لیے اس دور میں مغربی ذرائع ابلاغ اور خود امریکی ادارے انہیں ایک عظیم مجاہد کے طور پر پیش کرتے رہے اور جہادِ افغانستان کے خاتمے کے بعد اسامہ بن لادن ایک ہیرو کے طور پر اپنے وطن واپس جا چکے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ خود ان کے اپنے ملک سعودی عرب اور اس کے ساتھ پورے عرب خطے کو امریکہ کے ہاتھوں وہی صورتحال درپیش ہے جو جہادِ افغانستان سے قبل افغانستان کو روس کے ہاتھوں درپیش تھی تو ان کیلئے اس صورتحال کو قبول کرنا ممکن نہ رہا۔ انہوں نے دیکھا کہ

- خلیج عرب میں امریکی فوجیں مسلسل بیٹھی ہیں جس کی وجہ سے عرب ممالک کی آزادی اور خود مختاری ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے،
- عرب ممالک کی دولت اور تیل کا بے دردی کے ساتھ استحصال کیا جارہا ہے،
- عرب عوام کو انسانی، شہری اور شرعی حقوق حاصل نہیں ہے اور اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھانے کا کوئی موقع بھی میسر نہیں ہے،
- جبکہ فلسطین کے خلاف اسرائیل کی جارحیت اور تشدد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور فلسطینی عوام پر ان کی اپنی زمین تنگ کر دی گئی ہے۔

تو انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور مطالبہ کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں خلیج عرب سے نکل جائیں۔ لیکن چونکہ ان کے ملک میں اس قسم کی بات کہنے اور کوئی سیاسی مہم چلانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس لیے انہیں مجبوراً اس رخ پر آنا پڑا کہ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے تشدد کا راستہ اختیار کریں اور خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی کیلئے اسی قسم کی جدوجہد منظم کریں جس طرح کی جدوجہد کا تجربہ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کیلئے اس سے قبل ہو چکا تھا اور وہ خود اس میں شریک رہے تھے۔

اسامہ بن لادن کے طریق کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا موقف اور مطالبہ اصولی طور پر درست تھا۔ اور اس بات سے اختلاف کرنا بھی ممکن نہیں ہے کہ سعودی عرب اور خلیج عرب کے دیگر ممالک میں سیاسی جدوجہد کے راستے مکمل طور پر مسدود ہونے کی وجہ سے اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کیلئے اپنے جذبات اور موقف کے اظہار کیلئے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا جسے تشدد کا راستہ کہا جاتا ہے اور جس پر اسامہ بن لادن کو مطعون کیا جاتا ہے، لیکن طعن و تشنیع کرنے والے اس معروضی تناظر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ ان حالات میں ان کیلئے اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اسامہ بن لادن کا خیال تھا کہ وہ جہاد افغانستان میں ٹریننگ لینے والے دنیا بھر کے مجاہدین کو ایک نظم اور پروگرام میں منسلک کریں گے اور اس طرح ایک ایسا مزاحمتی گروپ وجود میں آجائے گا جو عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں ہونے

والے جبر و تشدد کے خلاف "پریشر گروپ" کا کام کرے گا، اور شاید وہ اس کے ذریعے سے اسرائیلی جارحیت کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کے خلاف اس حد تک دباؤ منظم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو امریکہ کو خلیج عرب میں اپنی فوجوں کی موجودگی کے تسلسل پر نظر ثانی کیلئے مجبور کر سکے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے سوڈان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا لیکن امریکی دباؤ کی وجہ سے سوڈان کی حکومت کیلئے اسامہ بن لادن کا وجود برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ سوڈان چھوڑ کر افغانستان آ گئے جہاں طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور وہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام اور امریکہ کے تسلط سے عالمِ اسلام بالخصوص خلیج عرب کی آزادی کے حوالے سے اسامہ بن لادن کے موقف سے متفق تھی۔ ان کے ساتھ وہ ہزاروں عرب مجاہد بھی افغانستان آ گئے جو جہادِ افغانستان میں شریک تھے اور اسلامی جذبات سے سرشار ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں میں واپس جانے کی صورت میں حکومتوں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں اور ریاستی جبر کا نشانہ بننے کے خطرات سے دوچار تھے۔

طالبان حکومت نے نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ موقف اور جذبات کی ہم آہنگی اور دینی حمیت میں شراکت کی وجہ سے دونوں میں ایسے تعلقات کار بھی قائم ہو گئے کہ انہیں ایک ہی منزل کے مسافر سمجھا جانے لگا۔ اس کے باوجود طالبان حکومت نے ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد یکطرفہ موقف اختیار نہیں کیا بلکہ ان واقعات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ثبوت فراہم کر دیے جائیں تو وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کر دینے کے مطالبے پر غور کرنے کیلئے تیار ہیں، یا کسی ایسے بین الاقوامی فورم کے حوالے بھی کر سکتے ہیں جو غیر جانبدار ہو۔ مگر امریکہ نے رعونت اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ان کے اس جائز موقف کو مسترد کر دیا اور اپنے الزامات کو ہی قطعی ثبوت قرار دیتے ہوئے افغانستان پر حملہ کا اعلان کر دیا جس کے ذریعے سے امریکہ نے وہ دونوں مقاصد حاصل کر لیے جو اس نے پہلے سے طے کر رکھے تھے اور ۱۱ ستمبر کے واقعات ان کیلئے محض بہانہ ثابت ہوئے۔

سوال: افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے۔ اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: طالبان حکومت قائم ہوتے ہی مجھے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا اور میں نے کئی مضامین میں اس کا اظہار بھی کیا کہ اس حکومت کو برداشت کرنا نہ صرف یہ کہ امریکہ کیلئے ممکن نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان حکومتیں بھی اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہیں جو اپنے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کا سامنا کر رہی ہیں۔ کیونکہ طالبان حکومت کی کامیابی کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کو تقویت حاصل ہوتی اور ایک کامیاب حکومت کی صورت میں عملی آئیڈیل بھی مل جاتا۔ اس لیے امریکہ اور کفر کی دیگر طاقتوں کے ساتھ ان مسلم حکومتوں کا اتحاد ایک فطری بات تھی اور ان سب نے مل کر ایک ایسی حکومت کو ختم کر دیا ہے جو اپنی کامیابی کی صورت میں دونوں کیلئے خطرہ بن سکتی تھی۔ خطرہ اس معنی میں نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی قوت ہوتی بلکہ اس معنی میں کہ موجودہ عالمی سسٹم سے ہٹ کر اور اس سے بغاوت کر کے ایک الگ نظریہ اور فلسفہ کے تحت بننے والی کسی حکومت کی کامیابی سے ان تمام قوتوں اور عناصر کو بغاوت کا راستہ مل جاتا جو موجودہ عالمی سسٹم سے مطمئن نہیں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ اسی لیے اسے بہت بڑا خطرہ سمجھا گیا اور اسے ختم کرنے پر دنیا کی سب حکومتیں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود

متفق ہوگئیں۔

امریکہ اور اس کی زیرِ قیادت عالمی استعمار کو عالمِ اسلام سے کوئی فوجی، سیاسی یا معاشی خطرہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان ہی ہے۔ بلکہ فوجی، سیاسی اور معاشی طور پر پورا عالمِ اسلام امریکہ کے شکنجے میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے۔ مگر مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و نظام کے مقابلے میں اگر کسی فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت میں کھڑا ہونے کی قوت و صلاحیت موجود ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ اور اس کے اتحادی اسلامی تحریکات کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں اور بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت کو اگر دنیا کے کسی خطے میں ایک ریاستی سسٹم کے طور پر قدم جمانے کا موقع مل گیا تو وہ موجودہ عالمی نظام اور مغربی فلسفہ و ثقافت کیلئے حقیقی خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ عالمی سسٹم کے ارباب حل و عقد نے قطعی طور پر یہ بات طے کر رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں کوئی ایسی مسلمان حکومت وجود میں نہ آنے پائے جو موجودہ عالمی سسٹم اور بین الاقوامی نیٹ ورک سے ہٹ کر ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقوامِ متحدہ کی بالادستی قبول کرنے کے بجائے وہ اپنا کوئی الگ ایجنڈا رکھتی ہو۔ افغانستان میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو تسلیم نہ کرنے اور اب اسے فوجی طاقت کے زور پر ختم کر دینے کا بھی یہی پس منظر ہے۔

البتہ طالبان حکومت کے خاتمے پر انتہائی افسوس اور صدمہ کے باوجود کسی حد تک یہ بات اطمینان بخش ہے کہ طالبان حکومت کا خاتمہ فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت میں مغرب کی بالادستی کے حوالے سے نہیں ہوا بلکہ محض مادی طاقت، جبر و تشدد اور عسکری قوت کے زور پر اسے ہٹایا گیا ہے۔ فکر و فلسفہ اور نظام و ثقافت اگر زندہ ہوں تو عسکری ناکامیاں زیادہ دیر تک ان کا راستہ نہیں روک سکتیں اور وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے اظہار اور پیش قدمی کے راستے نکال لیا کرتے ہیں۔

سوال: مستقبل میں افغانستان کی صورتحال کیا ہوگی؟

جواب: میرے خیال میں امریکی اتحاد کی پشت پناہی سے قائم ہونے والی حکومت افغانستان میں امن قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی اور افغانستان کے سب قبائل کو مطمئن کرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔ یہ صرف اسلام اور ایمان کی قوت تھی جس نے قبائلی تعصبات اور علاقائی امتیازات کو دبا رکھا تھا۔ اس کا پردہ ہٹ جانے کے بعد اب تمام معاملات قبائل اور علاقائیت کے حوالے سے طے پائیں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان عصبیتوں میں اضافہ ہوگا۔ جبکہ مغربی قوتوں کا مفاد بھی اسی میں ہوگا کہ یہ عصبیتیں بڑھیں اور اختلافات و تفرقہ کا ماحول قائم رہے تاکہ وہ اس کی آڑ میں افغانستان پر اپنا کنٹرول زیادہ دیر تک قائم رکھ سکیں اور وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کر سکیں۔

دوسری طرف طالبان تحریک نے میدانِ جنگ سے پسپائی اختیار کی ہے، ذہنی طور پر شکست اور دستبرداری قبول نہیں کی۔ اور ان کی افرادی قوت بڑی حد تک محفوظ ہے اس لیے وہ کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ منظم ہوں گے اور مزاحمت کا راستہ اختیار کریں گے جس کی حمایت و تعاون کرنا اس خطے کی ان تمام قوتوں کی مجبوری بن جائے گا جو امریکہ کی

یہاں مستقل موجودگی کو اپنے مفادات کیلئے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ وقتی لشکرکشی میں امریکی اقدامات کا ساتھ دینا اور بات ہے اور اس خطے میں امریکہ کی مستقل فوجی موجودگی کو قبول کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ اس لیے اس کا فائدہ ہر اس قوت کو ہوگا جو افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجوں کی مستقل یا زیادہ دیر تک موجودگی کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کرے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ طالبان کی یہ مزاحمتی تحریک دوبارہ منظم ہونے میں ایک سال اور اپنے ہدف تک پہنچنے میں پانچ چھ سال کا عرصہ لے سکتی ہے اور افغان قوم کے مزاج، روایات اور تاریخی تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس کی کامیابی میں شک اور تردد کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

سوال: القاعدہ اور طالبان کو نشانہ بنا کر امتِ مسلمہ پر جو ظلم کیا گیا ہے، اس میں اسلامی ممالک کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ موجودہ مسلم حکومتیں عالمی نظام اور اقوامِ متحدہ کے نیٹ ورک کا حصہ ہیں، وہ اس سے بغاوت اور انحراف کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے ان سے کسی ذمہ داری کی ادائیگی بلکہ کسی بھی درجے میں کسی خیر کی توقع کرنا ہی فضول ہے۔ اسلامی تحریکات کو مسلم عوام سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہوگا اور انہی کے اعتماد اور تعاون سے اپنے کام کو آگے بڑھانا ہوگا، اس کے سوا ان کیلئے کوئی راستہ نہیں ہے۔

سوال: مستقبل میں مجاہدین کو کس طرح کا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ بالخصوص اب جبکہ پاکستان میں بھی مجاہدین کے خلاف عملی کارروائی ہونے کی توقع ہے؟

جواب: میں اصولی طور پر تشدد کے حق میں نہیں ہوں اور پُرامن سیاسی جدوجہد کا قائل ہوں۔ اسی وجہ سے جہاں سیاسی جدوجہد کے راستے کھلے ہوں وہاں کسی قسم کی پُرتشدد تحریک کو جائز نہیں سمجھتا، اور پاکستان میں بھی نفاذِ اسلام کی جدوجہد کیلئے تشدد اور عسکریت کا راستہ اختیار کرنا میرے نزدیک درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ البتہ جہاں عالمی جبر یا ریاستی تشدد کی فضا موجود ہو اور اس کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے، اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھانے، اور سیاسی دباؤ ڈالنے کے تمام راستے مسدود ہوں، وہاں احتجاج کرنے اور کلمۂ حق بلند کرنے والوں کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کو ان کی مجبوری سمجھتا ہوں اور مجبوری ہی کے درجے میں ان کی حمایت کو دینی حمیت کا تقاضا تصور کرتا ہوں۔ اسی طرح جن غیر مسلم ممالک میں مسلم اکثریت کے خطے اپنی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں، ان کی جدوجہد میرے نزدیک جہاد ہے۔ اس پس منظر میں جہادی تحریکات کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ مل بیٹھ کر اپنی پالیسی اور طریق کار کا از سرِ نو جائزہ لیں، اپنی غلطیوں کی نشاندہی کریں، ترجیحات پر نظر ثانی کریں، اور اہل علم و دانش کو اعتماد میں لے کر اپنا آئندہ طرزِ عمل طے کریں۔

میرے نزدیک جن باتوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا ہے، ان میں چند اہم امور یہ ہیں:

1. اصل اہداف سے ہٹ کر جذباتی نعرہ بازی مثلاً دہلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے، پاکستان میں طالبان کی طرز پر انقلاب لانے، اور مغربی ملکوں کے مراکز کو نشانہ بنانے کی باتیں، جنہوں نے ان سب قوتوں کو نہ صرف چوکنا کیا بلکہ متحد بھی کر دیا۔
2. ایجنسیوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اختلاط اور اس اختلاط میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی

در پردہ کوششیں جن کی وجہ سے پالیسی سازی اور فیصلوں کی قوت بتدریج جہادی تحریکات کی لیڈرشپ کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

3. باہمی مشاورت، تعلقات کار اور انڈر سٹینڈنگ کے ضروری اہتمام سے گریز۔
4. ملک کے داخلی معاملات بالخصوص فرقہ وارانہ امور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ملوث ہونا۔
5. اور اہلِ علم و دانش سے صرف تعاون اور سرپرستی کے حصول پر قناعت کرتے ہوئے ان سے راہنمائی اور مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کرنا۔

یہ اور اس قسم کی دیگر کئی باتیں ہیں جنہوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا اور ان کے مخالف عناصر کو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے جہادی تحریکات کو اپنی پالیسیوں اور طریق کار کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور اہلِ علم و دانش کی راہنمائی میں لائحہ عمل اور ترجیحات کا پھر سے تعین کرنا چاہیے۔

سوال: حال ہی میں انڈین پارلیمنٹ پر فدائی حملہ ہوا ہے، اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ حملہ جس نے بھی کیا ہے، اس نے انڈیا کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کارروائی کی راہ ہموار کرے اور امریکہ کو جہادی تحریکوں کے خلاف دباؤ بڑھانے میں اس سے سہولت حاصل ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں مجھے یہ حملہ کسی بین الاقوامی پلان کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

سوال: مسئلہ کشمیر اور فلسطین کے مسئلے میں امریکہ کیا اب سنجیدگی سے غور کرے گا؟ میری مراد اس سے اقوامِ متحدہ ہے۔

جواب: فلسطین اور کشمیر دونوں جگہ امریکہ کی دلچسپی یا اقوامِ متحدہ کی تھوڑی بہت حرکت کا بنیادی سبب مزاحمتی تحریک اور مجاہدین کا کسی نہ کسی حد تک دباؤ ہے۔ یہ دباؤ موجود رہا تو شاید اقوامِ متحدہ اور امریکہ کسی درجے میں ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں۔ اور اگر یہ دباؤ ختم ہو گیا یا جیسا کہ خود امریکہ کا پروگرام ہے کہ مجاہدین کے اس دباؤ کو بزور بازو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد حالات کے نارمل ہو جانے پر امریکہ، اقوامِ متحدہ یا دیگر مغربی قوتوں کیلئے کوئی دردِ سر باقی نہیں رہے گا کہ وہ ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں، اور پھر عربوں اور پاکستان کو آزادی اور اطمینان کی فضا میں اقتصادی اور معاشی ترقی کا موقع بھی فراہم کریں۔ یہ سب باتیں امریکہ کے اپنے مفادات کے خلاف ہیں اس لیے اس سے یا اقوامِ متحدہ سے اس سلسلے میں کسی مثبت کردار کی توقع ایک خوش فہمی اور خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔

طالبان قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۲ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ نے پینٹاگان میں

پریس بریفنگ کے دوران کہا ہے کہ طالبان کے جن قیدیوں کو تفتیش کیلئے کیوبا کے قریب امریکی بیس میں منتقل کیا جارہا ہے ان سے جنیوا کنونشن کے مطابق جنگی قیدیوں جیسا سلوک نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ جنگی قیدی نہیں ہیں۔

رپورٹ کے مطابق افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے سینکڑوں ارکان کو حراست میں لیا گیا ہے جن میں سے اب تک ساڑھے چار سو افراد کو امریکہ کے حوالے کیا جاچکا ہے جنہیں کیوبا کے امریکی بیس میں بتدریج منتقل کیا جارہا ہے۔ بعض دیگر اخباری رپورٹوں کے مطابق ان قیدیوں کی ڈاڑھیاں اور سر کے بال مونڈھ دیے گئے ہیں اور انہیں ان کے لباس اتروا کر صرف نیکروں میں جہاز پر سوار کیا گیا ہے۔

یہ تو صرف وہ باتیں ہیں جو دیکھنے والوں کے نوٹس میں آگئی ہیں، اس کے علاوہ ان قیدیوں کو جس وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے اس کا اندازہ مذکورہ حرکت کے ساتھ ساتھ امریکی وزیر دفاع کے اس بیان سے بھی کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے قیدیوں کو جنگی قیدی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ جنیوا کنونشن نے جنگی قیدیوں کیلئے جن قواعد وضوابط کا تعین کر رکھا ہے ان کا اطلاق ان قیدیوں پر نہیں کیا جائے گا۔

امریکہ اور اس کے حواری پوری دنیا میں انسانی حقوق، اقوامِ متحدہ کے فیصلوں اور جنیوا کنونشن کے اصولوں کا پرچار کرتے رہتے ہیں اور ان کے زبردستی نفاذ کیلئے خدائی فوجدار بنے ہوئے ہیں، لیکن انہی فیصلوں اور اصولوں کو خود اپنے لیے تسلیم کرنے سے امریکہ نے انکار کر دیا ہے۔ جس سے ہمارے اس موقف کی ایک بار پھر تصدیق ہوگئی ہے کہ انسانی حقوق، اقوام متحدہ کا منشور، اور بین الاقوامی اصولوں کا پرچار امریکہ کی طرف سے اصولوں کے طور پر نہیں بلکہ یہ اس کے ہتھیار ہیں جو اس نے صرف غریب ممالک کو دبانے اور مظلوم اقوام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے اپنا رکھے ہیں۔

امریکہ کا یہ دوہرا معیار کوئی نیا نہیں، اس سے قبل امریکہ کئی بار اس دوہرے معیار کا عملی مظاہرہ کر چکا ہے۔ اس لیے اس پر حیرت و تعجب کا کوئی محل نہیں، البتہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی مسلسل دہائی دینے والے مسلم حکمرانوں کی خاموشی اور بے حسی ضرور باعثِ تعجب ہے جو اس سب کچھ کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی ''خاموش تماشائی'' بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی و جہادی جماعتوں پر پابندی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۲ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے لشکر طیبہ، جیش محمدؐ اور سپاہ صحابہؓ سمیت متعدّد مذہبی و جہادی تنظیموں کو خلافِ قانون قرار دے دیا ہے جس کے تحت ان تنظیموں کے ہزاروں افراد کی مسلسل گرفتاریوں کے علاوہ ان کے سینکڑوں دفاتر بند کر دیے گئے ہیں اور اکاؤنٹس منجمد کر دیے گئے ہیں۔ صدر پرویز مشرف نے پابندی کی وجوہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تنظیمیں دہشت گردی میں ملوث ہیں اس لیے ان پر پابندی لگانا ضروری ہو گیا تھا۔

ہمارے خیال میں صدر محترم کا صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ان تنظیموں کے خلاف سپریم کورٹ میں باقاعدہ ریفرنس پیش کیا جائے اور ان کے خلاف الزامات باضابطہ طور پر

سامنے لا کر انہیں عدالتی سطح پر صفائی کا موقع دیا جائے۔ اس کے بغیر ان جماعتوں پر پابندی اور ہزاروں علماء و کارکنوں کی گرفتاری کو بہر حال بے انصافی اور بلا جواز ہی تصور کیا جائے گا۔ اس لیے ہماری گزارش ہے کہ حکومت یا تو یہ کیس باقاعدہ طور پر سپریم کورٹ میں پیش کرے اور یا پھر پابندی واپس لے کر انہیں حسبِ سابق سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع دیں، کیونکہ انصاف اور عدل کا تقاضا بہر حال یہی ہے۔

افغان خواتین وکلاء کے خیالات

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۰ فروری ۲۰۰۲ء کی رپورٹ کے مطابق طالبان حکومت کی آمد کے بعد کابل سے پشاور شفٹ ہونے والی چند سرکردہ خواتین نے گذشتہ روز لاہور ہائیکورٹ کا دورہ کیا، اور ہائیکورٹ بار کے صدر مزمل خان ایڈووکیٹ کی طرف سے دیے گئے استقبالیہ میں شرکت کے علاوہ پریس کلب میں پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ افغان خواتین کا گروپ ۲۴ خواتین پر مشتمل تھا جن کی قیادت آصفہ کاکڑ ایڈووکیٹ اور مریم تاجک ایڈووکیٹ کر رہی تھیں۔ اور ان میں زیادہ تر ایڈووکیٹس، جج اور پروفیسر خواتین تھیں جو کافی عرصہ سے پاکستان میں موجود ہیں۔

رپورٹ کے مطابق تمام خواتین پردہ کیے ہوئے تھیں اور پریس کانفرنس میں انہوں نے طالبان حکومت اور افغان خواتین پر طالبان کے ظلم وستم کے سلسلہ میں کیے گئے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔

اس موقع پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمیں تحفظ صرف اسلامی نظام میں مل سکتا ہے اور ہمیں افغانستان میں مغرب کا نظام نہیں چاہیے۔ آصفہ کاکڑ ایڈووکیٹ نے کہا کہ ۱۹۷۶ء میں بھی افغانستان میں مکمل اسلامی نظام رائج تھا، اس وقت بھی مختلف جرائم کی سزائیں اسلامی قوانین اور شریعت کے مطابق دی جاتی تھیں، تمام قانونی ادارے فقہ حنفی کے تحت کام کرتے تھے، افغانستان میں فیملی خواتین بھی موجود تھیں اور لویہ جرگہ میں بھی خواتین کی نمائندگی ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم افغانستان میں مکمل اسلامی نظام چاہتی ہیں اور مغرب کا نظام نہیں چاہتیں۔

ہمیں جدید تعلیم یافتہ سرکردہ افغان خواتین کے ان خیالات سے خوشی ہوئی ہے اور اس سے ہمارے اس یقین میں اضافہ ہوا ہے کہ افغانستان میں کچھ بھی کر لیا جائے، غیور افغانوں کو ان کے دین اور دینی روایات سے دور کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم ان معزز خواتین سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر وہ فی الواقع اسلامی نظام اور شریعت کی بالادستی کو افغانستان میں برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو وہ امریکہ اور مغربی ممالک کی سرپرستی کے ماحول میں ممکن نہیں ہے۔ اور اس کیلئے مغربی فلسفہ ونظام سے مرعوب قیادت کی بجائے مغرب کے فکر وفلسفہ کا حوصلہ و جرأت کے ساتھ سامنا کرنے والی قیادت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طالبان کی صورت میں نیک دل، سادہ منش، قناعت پسند اور راسخ العقیدہ قیادت افغانوں کو دی تھی جس کی قدر نہیں کی گئی، اب اس کے بعد اسلامی نظام اور شریعت کی باتوں کو خود فریبی

کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

پاکستان کی افغان پالیسی اور عوامی جذبات

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۹ فروری ۲۰۰۲ء کی رپورٹ کے مطابق صوبائی وزیر قانون ڈاکٹر خالد رانجھا نے گذشتہ روز خانۂ فرہنگ ایران لاہور کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان کے مسئلہ پر حکومتی پالیسی عوامی جذبات کے برعکس تھی۔ انہوں نے کہا کہ دہشت گردی اور جہاد میں بڑا فرق ہے۔ اگر ہم یہ کہنا بند ہو گئے تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ مغرب کو اس وقت مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے خوف ہے اور وہ اس جذبے کو غرق کرنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ایک صدی قبل جب برطانیہ سپر پاور تھا اس نے ۱۸۸۰ء میں افغانستان پر حملہ کیا تو وہاں سے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچ کر آیا تھا، شکست کھانے کے بعد انگریزوں نے اس کے بارے میں غور کرنا شروع کیا کہ وہ افغانستان سے کیوں ہارے ہیں؟ اس پر ۱۹۰۲ء میں ایک رپورٹ لکھی گئی جس میں برطانیہ کی شکست کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی کہ برطانوی فوجی سر پر ٹوپ پہن کر لڑتے تھے جبکہ افغان سر پر پگڑیاں باندھ کر لڑتے تھے، انہیں موت سے خوف نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اگر مارے گئے تو یہی پگڑی ہمارا کفن بن جائے گی، لہٰذا اس جذبۂ جہاد کے ہوتے ہوئے افغانستان کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اگر انہیں شکست دینی ہے تو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو ختم کرنا ہو گا۔ لہٰذا یہ منصوبہ بندی بڑی دیر سے جاری ہے۔

ہمیں خالد رانجھا صاحب کے ارشادات سے مکمل اتفاق ہے لیکن اتنی گزارش بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان ارشادات کی جگہ قونصل خانہ کی تقریب نہیں بلکہ حکومتِ پاکستان کا کوئی پالیسی ساز فورم تھا، اے کاش! رانجھا صاحب نے یہ باتیں پالیسی طے ہوتے وقت وہاں فرمائی ہوتیں۔

مغربی اقوام کی بربریت تاریخ کے آئینے میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ فروری ۲۰۰۲ء

مجھ سے بعض دوستوں نے پوچھا ہے کہ کیوبا کے امریکی تفتیشی مرکز میں جن طالبان اور القاعدہ کے ارکان کو لے جایا گیا ہے اور وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کے بارے میں آپ نے ابھی تک کیوں نہیں لکھا؟ میں نے ان دوستوں کو جواب دیا کہ یہ سب کچھ میرے لیے خلاف توقع نہیں ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے توقع کے مطابق ہو رہا ہے اور ایسا ہی ہونا تھا۔ اس لیے مجھے بطور خاص اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی سر دست ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اور یہ صرف میری

بات نہیں جس شخص کی بھی تاریخ پر نظر ہے اور وہ مغربی اقوام کے دکھانے کے دانتوں کے ساتھ ساتھ کھانے کے دانتوں سے بھی واقف ہے اس کیلئے امریکہ کا یہ طرز عمل خلاف توقع اور قابل تعجب نہیں ہے کہ اس نے افغانستان کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کرنے اور ہر مرحلہ پر اسے جنگ قرار دینے کے باوجود اپنے شکست خوردہ مخالفین میں سے گرفتار شدگان کو جنگی قیدی تسلیم نہیں کیا۔ اور امریکہ پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود کیوبا کے تفتیشی مرکز میں لے جائے جانے والے قیدیوں کو وہ حقوق اور سہولتیں دینے کیلئے تیار نہیں ہے جو ''جنیوا کنونشن'' کے واضح فیصلوں کے مطابق انہیں ہر حال میں حاصل ہونی چاہئیں۔ یہ طاقت کی حکومت اور جنگل کے قانون کا مظاہرہ ہے جو پہلی بار نہیں ہے بلکہ مغربی اقوام اس سے قبل بیسیوں بار ایسا کر چکی ہیں۔

طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی حکومت کا موجودہ رویہ صرف ان لوگوں کیلئے تعجب اور حیرت کا باعث ہو سکتا ہے جو امریکی اتحاد کو اقوامِ متحدہ کے منشور، جنیوا کنونشن کے فیصلوں، اور امریکہ یا دیگر مغربی ملکوں کے دساتیر و قوانین کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اصول پسند قوتیں ہیں جو اصول و ضوابط کی جنگ لڑتی ہیں۔ لیکن جو حضرات ان اقوام کے ماضی اور مفتوح اقوام کے ساتھ ان کے طرز عمل کے تسلسل سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امریکی اتحاد کے نزدیک اصول و ضوابط اور اخلاق و اقدار کی حیثیت صرف ہتھیاروں کی ہے جنہیں وہ اپنی مخالف اقوام و ممالک کے خلاف خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب انہی اصول و ضوابط پر خود عمل کی باری آتی ہے تو ''وی آئی پی'' کے مقام پر فائز ہو کر اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ یہ نسلی برتری یا وی آئی پی ہونے کی بات محض اندازہ نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کے اعتقادی اور تہذیبی پس منظر کا حصہ ہے جس کی نشاندہی قرآن کریم نے سورہ البقرہ کی آیت ۸۰، سورہ المائدہ کی آیت ۱۸ اور دیگر مقامات پر کی ہے کہ یہ دونوں قومیں خود کو باقی امتوں سے ممتاز اور وی آئی پی سمجھتی ہیں۔ یہودیوں کا کہنا ہے کہ ہم انبیاء کرامؑ کی اولاد ہیں جبکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قیامت تک جو گناہ بھی کریں گے ان سب کا کفارہ حضرت عیسیٰؑ ان کے بقول سولی پر چڑھ کر دے گئے ہیں۔ اس لیے بالادستی، برتری اور کسی بھی قسم کی مسئولیت سے بالاتر ہونے کی بات یہود و نصاریٰ کی جبلت اور مزاج میں شامل ہے جس کا مظاہرہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور آج بھی امریکی اتحاد اسی جبلت و فطرت کا کھلے بندوں اظہار کر رہا ہے۔

میں اپنے قارئین کو مشورہ دوں گا کہ وہ کیوبا کے تفتیشی مرکز میں طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی طرز عمل پر حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے اور اس سلسلہ میں امریکہ سے کسی خیر اور انصاف کی توقع بلکہ خوش فہمی رکھنے کی بجائے مغربی اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان ''کارناموں'' پر ایک نظر ڈالیں جو انہوں نے مختلف ممالک و اقوام کو غلام اور نو آبادی بنانے کے بعد گذشتہ صدیوں میں ان سے روا رکھے تھے۔ خود ہمارے ہاں برصغیر میں فرنگی حکومت قائم ہونے کے بعد حریت پسندوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اور انہیں جس اذیت ناک اور وحشت ناک تشدد کا نشانہ بنایا گیا وہ آج بھی تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اگر تقابل کر کے دیکھا جائے تو برصغیر میں برطانوی حکمرانوں کے تشدد و بربریت کا شکار ہونے والے حریت پسندوں اور کیوبا میں امریکی تشدد کا نشانہ بننے والے مظلوم قیدیوں کی حالت زار میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔

کچھ عرصہ قبل سابق ڈپٹی میئر دہلی مولانا امداد صابری مرحوم کی کتاب ''تاریخ جرم و سزا'' دیکھنے کا موقع ملا، آج کل پھر اس کی تلاش میں ہوں مگر دستیاب نہیں ہو رہی۔ اس میں انہوں نے ان مظالم کی تفصیل بیان کی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے برصغیر کے عوام کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے کیلئے روا رکھے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تہذیب و تمدن کے علمبردار برطانوی افسران نے اپنے مخالفین کو

1. توپ کے منہ پر باندھ کر گولے سے اڑا دیا تھا،
2. گھٹنوں تک زمین میں گاڑ کر ان پر بھوکے کتے چھوڑے گئے تھے،
3. اور زندہ انسانوں کو سور کی کھالوں میں سی کر آگ میں جلا دیا تھا۔

امریکی استعمار بھی اسی برطانوی استعمار کا جانشین ہے اس لیے اس سے اس کے علاوہ اور کس طرز عمل کی توقع کی جا سکتی ہے؟ مولانا امداد اللہ صابری مرحوم کے علاوہ معروف احرار الحاج مرزا غلام نبی جانباز مرحوم نے بھی اپنی کتاب ''بڑھتا ہے ذوق جرم میرا ہر سزا کے بعد'' میں اس تشدد و بربریت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکی عزائم، طرز عمل اور ہٹ دھرمی کے پس منظر اور اسباب کو سمجھنے کیلئے ان دو کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

اس وقت میرے سامنے گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرنوالہ کے ادبی مجلہ ''مہک'' کا گوجرانوالہ نمبر ہے جو ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء کے دورانیہ میں شائع ہوا تھا۔ گیارہ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل اس ضخیم نمبر میں گوجرانوالہ کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے معلومات کا گراں قدر ذخیرہ مرتب صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے موقع پر ملک بھر میں ابھرنے والی سیاسی احتجاجی تحریک اور اس میں شریک ہونے والوں پر مہذب برطانوی حکومت کے مظالم کی کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے جس کے بعض حصے بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ بات قارئین کے علم میں ہو کہ طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی اتحاد کا طرز عمل کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ ان کی جبلت اور تاریخ کا حصہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں نیشنل کانگریس نے مطالبہ کیا تھا کہ اس سال کے اندر اندر مکمل طور پر ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ اس خیال سے انقلاب پسندوں نے تحریک آزادی شروع کر دی۔ وائسرائے نے ان حالات اور تحریک کے اسباب کی تحقیق کیلئے ایک ایسی رپورٹ تیار کی جس میں ہندوستانیوں کی تحریک آزادی کو مکمل طور پر دبانے کی سفارش کی۔ ۱۹۱۹ء میں ایک رولٹ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے باغیانہ تحریکوں کو سختی سے دبا دینے کا اختیار حکومت کو دے دیا نیز اس سلسلہ میں ملزموں کیلئے صفائی کے امکانات کم رہ گئے، گویا حکومت جس کو چاہے گرفتار کر لے اور جیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے۔ اس رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ یعنی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی جس کی غرض یہ تھی کہ رولٹ ایکٹ کو حکومت منسوخ کر دے۔ گاندھی جی نے جنگ عظیم اول میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ دل کھول کر مالی اور جانی قربانی دیں۔۔۔۔۔ اب انگریزوں کی تنگ نظری سے مایوس ہو گیا اور اس نے بھی لوگوں کو پرامن مظاہرے اور شورش کرنے کی اجازت دی لیکن لوگ پرامن نہ رہ سکے۔ عوام نے کئی سرکاری عمارات کو نذر آتش کر دیا، ریل کی پٹریاں اکھیڑ

دیں، پل توڑ دیے، عدالتوں اور سکولوں کو آگ لگا دی، تار کاٹ دی تاکہ حکومت کا کام معطل ہو جائے۔ آخر چند مقامات مثلاً گوجرانوالہ، لاہور اور امرتسر میں مارشل لاء لگا دیا گیا جہاں ٹکٹکیاں بازاروں میں لگا کر ہر اس آدمی کو بید لگائے گئے جس نے کسی گورے کو سلام نہ کیا۔ کئی لوگوں کو تپتی ہوئی زمین پر گھسیٹا گیا، کئی سرکردہ وکلاء اور لوگوں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں اذیتیں دی گئیں، کئی ایک کی جائیداد ضبط کر لی گئی، امرتسر میں نہتے ہندوستانیوں پر جلیانوالہ میں بغیر اطلاع دیے جنرل ڈائر نے گولی چلا دی، باغ چونکہ آبادی میں گھرا ہوا تھا وہاں سے آسانی سے نکلنا مشکل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے۔

۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو وزیرآباد میں مکمل ہڑتال رہی اور عوام نے اپنے غیظ و غضب کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ دوسرے دن ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کرنل اوبیران فوج اور پولیس کے جلو میں وزیرآباد میں وارد ہوا، اس نے آتے ہی سرکردہ اور مشتبہ لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور ان لوگوں کے ساتھ بھی اس نے اپنی روایات کے مطابق انسانیت سوز سلوک کیا۔ پکڑ دھکڑ اور دار و گیر کا یہ سلسلہ ۱۸ اپریل تک جاری رہا۔ ۱۸ اپریل کو وزیرآباد میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں ڈپٹی کمشنر نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

> ”پاگل اور بے وقوف لوگو! سنو تم نے یہ سمجھ لیا کہ سرکار انگلینڈ کی حکومت ختم ہو گئی، اب تمہارے پاگل پن کا علاج کیا جائے گا۔ ہم نے تمہارے پاگل پن کا علاج دریافت کر لیا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ جس آدمی کی جائیداد چاہے ضبط کر سکتی ہے، اس کے مکان کو گرا کر ملیامیٹ کر سکتی ہے، نہیں نہیں اگر وہ چاہے تو اس کو نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہے۔ اور آج یہاں اپنے حکم سے سردار جماعت سنگھ باگا کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کرنے کا حکم دیتا ہوں۔“

اس کے بعد وزیرآباد میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ مارشل لاء کے احکامات و ہدایات پر مشتمل اشتہارات دیواروں پر چسپاں کر دیے گئے، بالخصوص ان لوگوں کے مکانوں پر جنہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ راہنماؤں اور ان کے اعزہ کے مکانوں پر خاص طور پر یہ اشتہار آویزاں کیے گئے اور وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا ان کو حکم دیا گیا کہ وہ ان اشتہارات کی حفاظت کریں۔ چنانچہ لوگوں کو دن میں کئی بار اور رات کو جا جا کر ان اشتہاروں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ مارشل لاء کے حکم کے مطابق ان اشتہارات کو پھاڑنا یا انہیں نقصان پہنچانا جرم تھا۔ ایک جگہ خود پولیس ہی نے اشتہار پھاڑ دیا چنانچہ جس آدمی کے مکان پر وہ اشتہار تھا اور جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس اشتہار کی نگہداشت کرے دونوں کو سربازار کوڑے لگائے گئے، اسی طرح ایک اشتہار بارش کی وجہ سے ضائع ہو گیا تو اس پر متعلقہ شخص کو بید کھانے پڑے۔

کرنل اوبیران کی آمد کے بعد حافظ آباد میں عجیب و غریب اعلان کیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو شخص بھی اپنے سر پر پگڑی باندھتا ہے وہ صبح سات بجے تحصیل کے ساتھ ملحق میدان میں جمع ہو جائے، جو شخص دیدہ دانستہ نہیں آئے گا یا بیماری وغیرہ کا بہانہ بنائے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ اس اعلان کی وجہ سے کم و بیش تمام بالغ مرد تحصیل کے پاس جمع ہو گئے،

انہیں وہاں دن بھر بٹھائے رکھا گیا، اس گروہ میں سے پولیس مقدمات کیلئے جھوٹے گواہ تیار کرتی تھی، جو شخص غداری اور گواہی پر آمادہ ہوجاتا اسے اس جبری حاضری سے رخصت مل جاتی اور شہر کے شرفاء کی یہ تذلیل کم و بیش ڈیڑھ ماہ تک جاری رہی۔

گوجرانوالہ شہر کے جیالے اور زندہ دل باسیوں کا احتجاج جب کسی طرح فرنگی حکمرانوں کے کنٹرول میں نہیں آرہا تھا تو ان پر باقاعدہ طیاروں سے بمباری کی گئی جس کی کیفیت "مہک" کے مضمون نگار نے یوں بیان کی ہے کہ

> "شور، ہنگامہ، آگ، لوٹ مار کا ایسا سماں تھا کہ دیکھنے والے خوفزدہ ہوئے جاتے تھے۔ اسی شور و شر میں ہوائی جہازوں کی گونج پیدا ہوئی اور پھر یہ گونج اس طرح ہر شور پر غالب آئی کہ اس گونج کے علاوہ باقی کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لیکن چار جنگی جہاز آناً فاناً شہر کے اوپر پہنچ چکے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ سو دو سو فٹ کی بلندی پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چکر لگا رہے تھے، ان کی گھن گرج سے شہر کا شہر ہراساں اور خوفزدہ ہوگیا، سڑکیں بازار گلیاں ویران ہوگئیں۔ مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ اور جہازوں کی آواز سے لوگ اس قدر ہراساں ہوئے کہ تھوڑی دیر پہلے کا میدان حشر شہر خموشاں بن چکا تھا۔ پورے شہر میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، ہوائی جہاز اتنے نیچے تھے کہ شہر کی بلند عمارتوں سے ان کا فاصلہ پانچ چھ فٹ ہی کا تھا۔ پورے شہر میں جب کوئی آدمی نظر نہ آیا تو ہوائی جہازوں نے شہر کے آس پاس گاؤں پر پرواز کی۔ دھلے سے کچھ لوگ شہر کی طرف آرہے تھے ان لوگوں کو منتشر کرنے کیلئے ہوائی جہاز سے بم گرایا گیا جس کی آواز شہر کے کونے کونے میں سنی گئی۔ پھر اوپر تلے دو تین بم پھینکے گئے، زمین تھر تھرا گئی، لوگوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ لاشوں کا قیمہ فضا میں اڑنے لگا گرجاکھ کے لوگ بمباری سے خوفزدہ ہوکر گھروں سے باہر نکل آئے تھے لیکن اوپر تلے دو بم ان پر بھی گرائے گئے اور مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔ شہر کے لوگ بھی گھروں سے نکل کر کھلی فضا میں پہنچنا چاہتے تھے، ایسے ہی بدحواسوں کا ایک گروہ خالصہ ہائی سکول کے صحن میں جمع ہوگیا لیکن ایک بم گرا اور ان کے پرخچے اڑا دیے گئے۔ اس کے بعد شہر پر اور ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کئی بم گرائے گئے، مشین گنوں سے لگاتار فائرنگ کی گئی اور تقریباً پون گھنٹہ ان کی زندگیوں سے کھیلنے کے بعد ہوائی جہاز لاہور کی طرف واپس ہوئے۔"

مہذب اور متمدن مغربی اقوام کا یہ سلوک ان شہریوں کے ساتھ تھا جو ان کی حکومت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک قانون کی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن جن لوگوں نے مغرب کی بالادستی کو سرے سے تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے اور ہتھیار بند ہوکر ان کے مقابلہ پر آگئے ہیں ان کے بارے میں امریکہ سے جنیوا کنونشن کی قراردادوں پر عملدرآمد کی توقع رکھنے والوں کی سادگی اور بھولپن پر آخر کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے؟

مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۲ء

گردیز میں طالبان اور القاعدہ کے ساتھ امریکی اتحاد کی تازہ جھڑپوں کے بعد جو نام سب سے نمایاں طور پر سامنے آیا ہے وہ کمانڈر سیف الرحمان منصور کا ہے جس نے امریکی فوجوں کی بالادستی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فتح یا شہادت کے عزم کے ساتھ امریکی فوجوں کے سامنے ڈٹ گیا ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ کیا نکلتا ہے یہ وقت بتائے گا لیکن سیف الرحمان منصور کی قیادت میں افغان اور عرب مجاہدین کی اس معرکہ آرائی نے ایک بار پھر سلطان ٹیپو شہیدؒ کی یاد تازہ کر دی ہے جس نے چاروں طرف سے انگریزی فوجوں میں گھر جانے کے بعد اپنے ہی ایک ساتھی کی طرف سے ہتھیار ڈالنے اور جان بچانے کی تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“۔

سیف الرحمان منصور روس کے خلاف دس سال تک جنگ لڑنے والے افغان مجاہدین کے ایک بڑے کمانڈر مولوی نصر اللہ منصورؒ کا بیٹا ہے جو میرے دوستوں میں سے تھے اور ایک مدبر، ذی ہوش اور معاملہ فہم رہنما تھے۔ مولوی نصر اللہ منصورؒ کو میں نے پہلی بار شیرانوالہ لاہور میں دیکھا تھا، یہ وہ دور تھا جب افغان علماء نے روسی افواج کے خلاف مسلح جدوجہد کا اعلان کر دیا تھا اور پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے متعدّد افغان رہنما پاکستان کے مختلف حصوں کے دورے کر رہے تھے۔ شیرانوالہ لاہور میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اجلاس کے صدر تھے اور قائد جمعیت حضرت مولانا مفتی محمودؒ بھی اجلاس میں شریک تھے۔ مولوی نصر اللہ منصورؒ وہاں پہنچے، میں نے ان سے تشریف آوری کی غرض پوچھی تو بتایا کہ دو مقصد لے کر آیا ہوں، پہلے نمبر پر حضرت درخواستیؒ کی زیارت کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے افغانستان اور پاکستان کے درمیان قبائلی پٹی کا تفصیلی دورہ کر کے جہاد افغانستان کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور قبائلی مسلمانوں کو افغان مجاہدین کی حمایت و تعاون کیلئے تیار کیا ہے۔ اور دوسرے نمبر پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور جمعیت کے دیگر اکابر سے جہاد افغانستان کی تازہ ترین صورتحال پر مشاورت کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ منصورؒ کئی بار پاکستان آئے اور مختلف شہروں کے دورے کیے، بعض دوروں میں مجھے بھی ان کے ساتھ شرکت و رفاقت ملی اور بہت سے علماء کرام اور مراکز کے ساتھ ان کے تعارف میں تھوڑا بہت میرا حصہ بھی شامل ہے۔

مولوی نصر اللہ منصورؒ کا تعلق مولوی محمد نبی محمدی کی جماعت ”حرکتِ انقلاب اسلامی“ سے تھا اور وہ مولوی محمد نبی محمدی کے بعد اس جماعت کے بڑے لیڈر شمار کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جہادی سرگرمیوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے چھ جماعتوں نے ”اتحادِ اسلامی افغانستان“ کے نام سے متحدہ محاذ قائم کیا تو مولوی نصر اللہ منصور کو اس کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا لیکن وہ زیادہ دیر دوسرے لیڈروں کے ساتھ نہ چل سکے اور پالیسی اختلاف نے نہ صرف ان کا راستہ دوسرے افغان لیڈروں سے الگ کر دیا بلکہ وہ کچھ عرصہ کیلئے پس پردہ چلے جانے پر بھی مجبور ہو گئے۔ ان کا اختلاف دیگر افغان لیڈروں کے ساتھ امریکی امداد کو قبول کرنے کے حوالے سے تھا اور وہ اس سلسلہ میں اپنے بعض تحفظات سے دستبردار

ہونے کیلئے تیار نہیں تھے۔

ان کالموں میں کئی بار عرض کیا جا چکا ہے کہ جہاد افغانستان کے ابتدائی دو تین سال افغان مجاہدین نے صرف اپنے عزم و استقلال کے سہارے جنگ لڑی ہے، امریکہ یا کسی دوسرے ملک کی عملی امداد اس دوران انہیں حاصل نہیں تھی۔ پاکستان ان کی پناہ گاہ تھا اور محدود حد تک کچھ تعاون بھی انہیں میسر تھا لیکن بنیادی لڑائی انہیں دو تین سال تک تنہا لڑنا پڑی۔ اور جب انہوں نے پرانی بندوقوں اور بوتل بموں کے ساتھ روسی فوجوں کا مقابلہ کر کے افغانستان کا ایک معقول علاقہ روسی فوجوں کی دسترس سے نکال لیا تو پھر امریکہ اور دوسری قوتیں اس طرف متوجہ ہوئیں اور افغان مجاہدین کو ایک زندہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے ان کی حمایت و امداد کیلئے پیش رفت کی۔

یہ اسی دور کی بات ہے جب امریکی نمائندے افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے ساتھ گفت و شنید کر رہے تھے اور باہمی تعاون کی تفصیلات طے ہو رہی تھیں، مولوی نصر اللہ منصورؒ اس کو جہاد افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے خطرناک بات سمجھتے تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں کی حمایت کو ایک حد تک محدود رکھا جائے اور پالیسی سازی کے معاملات میں انہیں کسی درجہ میں شریک نہ کیا جائے۔ لیکن ان کی بات نہ چل سکی اور وہ بددل ہو کر نہ صرف عملی سرگرمیوں سے وقتی طور پر کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایران چلے گئے جہاں انقلاب آ چکا تھا اور انقلابی حکومت کی زیر قیادت پورا ایران امریکہ کے خلاف ایک مضبوط مورچہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مولوی نصر اللہ منصور کے ایران چلے جانے پر ہمارے کئی دوست جزبز ہوئے، بعض بزرگوں نے مجھ سے بھی بات کی کہ تمہارے دوست کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور تم اس سے بات کرو کہ وہ ایران سے واپس آ کر دیگر افغان لیڈروں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ لیکن میں مولوی نصر اللہ کے موقف، مزاج اور پوزیشن کو سمجھتا تھا اور اصولی طور پر بھی ان سے کسی حد تک متفق تھا اس لیے میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور حالات میں تبدیلی کا انتظار کرتا رہا۔

اس کے بعد مولوی نصر اللہ منصورؒ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب روسی افواج افغانستان سے واپس جا چکی تھیں اور پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی نے افغانستان کے عبوری صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ اس موقع پر پاکستان سے علماء کرام کا ایک وفد کابل گیا جس میں پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی اور راقم الحروف بھی شامل تھے، کابل میں پروفیسر مجددی کی معاونت میں مولوی محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی پیش پیش تھی اور مولوی نصر اللہ منصور اپنا اختلاف ختم کر کے حرکت انقلاب اسلامی میں واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکمران پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان دنوں حرکت انقلاب اسلامی کی تحویل میں تھا جہاں مولوی محمد نبی محمدی کے ساتھ پاکستانی علماء کے وفد کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا اہتمام و انتظام مولانا نصر اللہ منصورؒ کے ذمہ تھا اور اسی حوالے سے ان سے ملاقات ہوئی۔ مولوی نصر اللہ منصور پارٹی کی طرف سے ہمارے میزبان تھے اور انہوں نے ہمارے قیام کا اہتمام انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کر رکھا تھا۔ علماء کا وفد اپنا دورہ مکمل کر کے پاکستان کیلئے روانہ ہو رہا تھا کہ میں نے اور مولانا فداء الرحمان درخواستی نے کچھ روز مزید کابل میں قیام کا ارادہ کر لیا۔

مولانا فداء الرحمان درخواستی کے رکنے کی وجہ کمانڈر احمد شاہ مسعود تھے جو اس وقت مجددی حکومت میں افغانستان

کے وزیر دفاع تھے اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے شاگرد ہونے کے ناطے ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ جبکہ میری دلچسپی کی وجہ مولوی نصر اللہ منصور تھے جن سے کئی برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اور میں ان سے ماضی اور مستقبل دونوں حوالوں سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہم ابھی ایک دن ہی رک پائے تھے کہ کابل شہر میں حزب وحدت اور استاذ سیاف کے گروپوں میں شدید لڑائی چھڑ گئی۔ ہمارا ہوٹل بھی اس خانہ جنگی کی زد میں تھا اور کئی گولے ہوٹل کی عمارت کی حدود میں ہمارے سامنے آکر گر چکے تھے۔ اس دوران مولوی نصر اللہ منصور ہوٹل آئے اور کہا کہ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں اور ہم نے سخت لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے فیصلہ کیا ہے کہ آپ دونوں حضرات کو جلد از جلد پاکستان واپس پہنچا دیا جائے۔ اس لیے مزید قیام کا ارادہ ترک کر کے واپسی کی تیاری کریں۔ چنانچہ ہمیں اسی روز رات پشاور پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ مناسب موقع پر افغانستان جاؤں تاکہ مولوی نصر اللہ منصور سے ضروری معاملات پر گفتگو کر سکوں لیکن چند دنوں کے بعد یہ خبر آگئی کہ وہ بم کے ایک حادثہ میں جام شہادت نوش کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس پس منظر میں جب یہ پتہ چلا کہ گردیز میں امریکی فوجوں کے خلاف اس نئی مزاحمت کی قیادت کمانڈر سیف الرحمان منصور کر رہا ہے تو مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی اس لیے کہ کمانڈر سیف الرحمان منصور مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ کا بیٹا ہے، اس کی رگوں میں ایک غیرت مند باپ کا خون گردش کر رہا ہے اور مولوی نصر اللہ منصور کے دوستوں اور دشمنوں دونوں کو اس سے یہی توقع ہو سکتی تھی۔

شاہِ اردن سے ایک سوال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ء

اور اگر شاہ عبد اللہ محترم زیادہ ناراض نہ ہو جائیں تو تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان سے یہ سوال پوچھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ابھی گذشتہ سال افغانستان پر امریکہ کی فوج کشی اور وحشیانہ بمباری کے دوران شاہِ اردن سمیت اکثر عرب حکمرانوں نے جو یہ راگ الاپنا شروع کر دیا تھا کہ ہم دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے ساتھ ہیں لیکن کسی عرب ملک پر حملہ برداشت نہیں کیا جائے گا، اس کے پیچھے کون سا فلسفہ کار فرما تھا؟ اور افغانستان اور عربوں کو الگ الگ حیثیت میں رکھنے اور دیکھنے والا تعصب کون سی نسل سے تعلق رکھتا تھا؟ بات اگر اصول اور انصاف کی ہے تو ہم عرب حکمرانوں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آج عراق پر مجوزہ امریکی حملے کو مسترد کرنے اور امریکہ سے عراق کے خلاف الزامات کا ثبوت فراہم کرنے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ عرب حکمرانوں کے یہ مطالبات اور ان کی یہ اصول پسندی اب سے صرف چھ ماہ قبل کون سے فریزر میں منجمد پڑی تھی۔

عراق پر امریکہ کے مجوزہ حملہ کی ہم بھی مذمت کرتے ہیں اور اسے بھی اسی طرح وحشت درندگی سمجھتے ہیں جیسی

وحشت و درندگی کا اظہار امریکہ نے افغانستان میں کیا ہے، لیکن ہمارے لیے عراق اور افغانستان کو الگ الگ عینکوں سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ حجۃ الوداع پر ہمارا غیر متزلزل ایمان ہے جس میں رسالت مآبؐ نے عرب وعجم میں فرق کے تصور کی نفی کرتے ہوئے تمام انسانوں کے خون مال اور آبرو کو یکساں قابل احترام قرار دیا تھا اور اسے اسلام کی عالمگیریت کی بنیاد کے طور پر پیش فرمایا تھا۔

شاہِ اردن اور دیگر عرب حکمرانوں سے ہماری مؤدبانہ اور عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ امریکہ اور صہیونیوں کو نسلی اور قومی تعصب سے نجات حاصل کرنے کا درس ضرور دیں، اس درس میں ہم بھی ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس تعصب سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں کیونکہ اس کے بغیر نہ عالمِ اسلام متحد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے مصائب وآلام کی دلدل سے نکالنے کے کوئی راہ نکل سکتی ہے۔

افغانستان کے سابق فرمانروا ظاہر شاہ کی واپسی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۲ء

افغانستان کے سابق فرمانروا ظاہر شاہ کم وبیش تیس سال کی جلاوطنی کے بعد گزشتہ روز وطن واپس پہنچے ہیں۔ انہیں تقریباً تیس برس قبل عین اس وقت جبکہ وہ بیرون ملک دورے پر تھے، داؤد خان نے معزول کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے بعد سے ظاہر شاہ روم میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس دوران ان کے ملک پر روسی افواج نے قبضہ کر لیا اور افغانستان کے علماء کرام اور غیور دیندار عوام نے روسی جارحیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کر کے لاکھوں جانوں کی قربانی دی اور روسی فوجوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مگر افغانستان پر ایک عرصہ تک حکومت کرنے والے ظاہر شاہ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنے ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کی جدوجہد میں کوئی حصہ ڈال سکیں۔ البتہ افغانستان میں مجاہدین کے اثر ورسوخ کو کم کرنے اور سابقہ لبرل ماحول کو بحال کرنے کیلئے ان کا نام وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہا، اور مجاہدین کے اقتدار کا راستہ روکنے کیلئے ان کی وطن واپسی کی کوششیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی اور طالبان نے افغانستان کے بڑے علاقہ کو خانہ جنگی سے نجات دلا کر ایک مستحکم حکومت کے ذریعے امن بحال کیا تو افغانستان کے اس سابق فرمانروا کو ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے کی توفیق نہ ہوئی۔ البتہ جب طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی قیادت میں عالمی اتحاد قائم ہوا، اور قوت و طاقت کے زور پر ایک نوزائیدہ اسلامی ریاست کو بہر حال کچل دینے کی کاروائی منظم کی گئی، تو اس کاروائی کو ظاہر شاہ کی مکمل حمایت و تائید حاصل تھی۔ اور افغانستان کے نہتے اور غریب عوام پر جو قیامتِ صغریٰ بپا ہوئی اس میں ظاہر شاہ کا پورا پورا ہاتھ کار فرما تھا۔

اور آج اسی کاروائی کو استحکام دینے اور افغانستان کے قبائل کو نئے امریکی نظام کی حمایت پر آمادہ کرنے کیلئے ظاہر شاہ کو

افغانستان لایا گیا تاکہ ان کے بڑھاپے کو افغانستان میں امریکی پروگرام کی تکمیل کیلئے استعمال کیا جا سکے۔ مگر افغانستان کے اس ۸۷ سالہ سابق فرمانروا کو شاید اس بات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے کہ وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے، حالات نے تبدیلی کے کئی مراحل طے کر لیے ہیں، اور افغانستان کے عوام نے دین اور جہاد کے عنوان سے لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اپنی دینی روایات اور افغان کلچر کی اقدار کو اور زیادہ مستحکم کر لیا ہے، جنہیں بمباری اور بربریت کے زور سے وقتی طور پر دبایا تو جا سکتا ہے لیکن افغان عوام کو ان دینی اقدار اور افغان ثقافت سے محروم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ظاہر شاہ کی واپسی پر کابل میں قندھار کے گورنر گل آغا نے ان کے اعزاز میں جس دعوت کا اہتمام کیا، اس میں روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ اپریل ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق ۸۷ سالہ ظاہر شاہ نے ڈھول کی تھاپ پر رقص کر کے اپنی آمد کے مقاصد کو واضح کیا ہے، اور افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کیلئے گذشتہ تیس برس کے دوران آگ اور خون کا دریا عبور کرنے والے مجاہدین اور لاکھوں شہداء کے بارے میں ان کی خاموشی نے ان کے دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ مجاہدین اور شہداء کی عظیم قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور وہ بالآخر روسی استعمار اور اس کے حواریوں کی طرح امریکی استعمار اور اس کے حواریوں کے تسلط سے بھی افغانستان کو نجات دلانے میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دینی مدارس کے خلاف امریکی کاروائیاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۲ء

قبائلی علاقہ میں مبینہ دہشت گردوں کی تلاش کی آڑ میں دینی مدارس کے خلاف امریکی کمانڈوز پاکستانی فورسز کی مدد سے جو کاروائیاں مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ہر محبِ وطن شہری کیلئے بے چینی اور اضطراب کا باعث ہیں، اور قومی خود مختاری اور دینی تشخص کے خلاف کی جانے والی ان کاروائیوں کے خلاف ملک بھر میں احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔

گذشتہ جمعہ کو جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان کی اپیل پر ملک کے مختلف شہروں میں احتجاجی مظاہرے ہوئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ دینی مدارس و مراکز کے خلاف یہ کاروائیاں بند کی جائیں اور امریکیوں کو دینی مدارس کے خلاف اس قسم کی حد درجہ اشتعال انگیز حرکتوں سے روکا جائے۔

دوسری طرف روزنامہ نوائے وقت لاہور ۸ مئی ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق بھارت کے صوبہ مغربی بنگال کی حکومت نے امریکی قونصلر کے ایک مدرسہ میں جانے کا نوٹس لے لیا ہے اور اس کی تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ خبر کے مطابق مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر بڈھا دیب بھٹا چاریہ نے کلکتہ شہر کے ایک مدرسہ میں نصاب کے معائنہ کیلئے امریکی قونصلر کے جانے کے واقعہ کا نوٹس لیا ہے اور چیف سیکرٹری کو واقعہ کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ خبر کے مطابق صوبائی حکومت نے اسے بھارتی معاملات میں مداخلت قرار دیا ہے۔

ہم حکومتِ پاکستان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر امریکی خواہشات اور دباؤ کی اس شدید دھند میں اسے قومی خود مختاری اور ملی وقار کے ناگزیر تقاضے براہ راست دکھائی نہیں دے رہے تو کم از کم وہ مغربی بنگال کی حکومت کے اس اقدام سے ہی راہنمائی حاصل کرے کہ زندہ قومیں اور آزاد ممالک اپنے معاملات میں غیر ملکی مداخلت پر کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ امریکہ کی دھاندلیوں اور چیرہ دستیوں کے خلاف اپنے ملک کے وقار اور قومی آزادی کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔

حضرت مولوی محمد نبی محمدیؒ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ مئی ۲۰۰۲ء

گذشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر چھوٹے سے چوکھٹے میں یہ خبر نظر سے گزری کہ افغانستان کے بزرگ عالم دین مولوی محمد نبی محمدیؒ انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسے نیرنگیٔ زمانہ کا کرشمہ کہیے یا گردشِ حالات کا نتیجہ کہ مولوی محمد نبی محمدیؒ جیسے بزرگ عالم دین کی وفات پر چند سطروں کی ایک خبر کے بعد قومی پریس میں مکمل خاموشی کی کیفیت طاری ہے۔ ورنہ اگر یہی بات اچھے دنوں میں ہوتی تو نہ صرف افغانستان میں قومی سطح پر ان کا سوگ منایا جاتا بلکہ پاکستان میں بھی کئی دنوں تک ان کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ رہتا۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ کا تعلق افغانستان کی ولایت لوگر سے تھا اور وہ بلاشبہ اپنے دور میں افغانستان کے سرکردہ، ذہین ترین اور مدبر علماء میں سرفہرست تھے۔ مولوی محمد نبی محمدیؒ ان علماء میں سے تھے جنہوں نے افغانستان میں روسی اثرات کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی فکری مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور کمیونزم کے اثر و نفوذ سے افغانستان کو بچانے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ وہ روسی افواج کی باقاعدہ آمد سے قبل اپنے علاقہ سے افغان پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور ایوان میں ببرک کارمل کے ساتھ اسلام اور کمیونزم کے حوالے سے ان کے طویل پارلیمانی مباحثے افغان تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ ان مباحثوں کی ایک مطبوعہ رپورٹ مولوی محمد نبی محمدیؒ نے خود مجھے ایک ملاقات میں دی تھی جن کا بیشتر حصہ پشتو یا فارسی میں ہونے کی وجہ سے میں ان سے پوری طرح استفادہ تو نہ کر سکا لیکن ایک تاریخی دستاویز کے طور پر وہ رپورٹ اب بھی میری فائلوں میں محفوظ ہو گی۔

مولوی صاحبؒ جید اور پختہ کار عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے والے زیرک راہنما اور حق بات کھلے بندوں کہنے اور حق کی خاطر عملی جدوجہد کے حوصلہ سے بہرہ ور لیڈر بھی تھے۔ مجھے ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا اور تفصیلی گفتگو ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ افغانستان کے جتنے علماء سے بھی اب تک ملا ہوں ان میں سب سے زیادہ مولوی محمد نبیؒ کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا۔ اور میں اپنے دوستوں کے حلقہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں ”افغانستان کا مفتی محمودؒ“ کہا کرتا تھا۔ وہ افغانستان میں روسی اثر و نفوذ کے خلاف شروع سے متحرک تھے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے ”حرکتِ انقلاب اسلامی“ کے نام سے جماعت قائم کی تھی جو ایک دور میں افغانستان میں علماء کی

سب سے بڑی جماعت تھی۔ وہ اگر روسی فوجوں کی واپسی اور مجاہدین کی عبوری حکومت کے قیام کے بعد پروفیسر برہان الدین ربانی اور انجینئر حکمت یار کا راستہ روکنے کو ہی اپنا واحد ہدف قرار دینے کی بجائے امن کا ماحول فراہم کر کے عام انتخابات کی کوئی صورت نکال لیتے تو میرا اندازہ تھا کہ اس وقت مولوی محمد نبی محمدیؒ کی ”حرکتِ انقلاب اسلامی“ اور انجینئر حکمت یار کی ”حزبِ اسلامی“ افغانستان کی دو سب سے بڑی پارٹیوں کی حیثیت سے سامنے آتیں۔ لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ تھا اور کابل کے کنٹرول پر احمد شاہ مسعود اور حکمت یار کی جنگ نے حالات کا رخ ایسا پلٹا کہ آج نہ صرف افغانستان بلکہ جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کا سارا منظر تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کیلئے پاکستانی قافلہ کے ساتھ بھارت گئے۔ یہ قافلہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں تھا جبکہ مولوی محمد نبی محمدیؒ ایک عام فرد کے طور پر قافلہ میں شامل تھے جو خاموشی کے ساتھ گئے اور تقریبات میں شرکت کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس آ گئے۔ اس کے بعد مجھے ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پشاور میں مولوی محمد نبی محمدیؒ کے ہیڈ کوارٹر میں ان سے تفصیلی انٹرویو کا موقع ملا جس میں افغانستان کی تاریخ، افغان معاشرہ میں علماء کے کردار، کمیونزم و لبرل ازم کے فروغ، روسی اثرات کے نفوذ، افغان علماء و عوام کے جہاد، آزادی اور افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے کئی گھنٹے گفتگو ہوئی۔

میں بہت سے افغان لیڈروں اور علماء سے ملا ہوں اور ان سے گفت و شنید کی ہے لیکن مولوی محمد نبی محمدیؒ جیسی معاملہ فہمی کسی اور میں نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ میرے نزدیک ان کی یہی انتہا درجہ کی معاملہ فہمی بہت سے مواقع پر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ اس کے بعد بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور قندھار پر طالبان کے قبضہ کے بعد جب مجھے قندھار جانے کا موقع ملا اس وقت تک کابل طالبان کے قبضہ میں نہیں آیا تھا اور احمد شاہ مسعود کے ساتھ طالبان حکومت کے مذاکرات کی تجویز ہو رہی تھی۔ تب مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص بھی قندھار میں تھے۔ میں ان سے ملا اور اس حوالے سے گفتگو ہوئی، مولوی صاحبؒ کا موقف یہ تھا کہ ربانی حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کی ضرورت تو ہے لیکن حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کی روشنی میں یہ نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ میں نے امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے بھی مختصر ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا، ان کا مختصر ترین جواب دو لفظوں میں تھا کہ ”فائدہ نہیں ہے۔“

اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص ”طالبان انقلاب“ کے خاموش سرپرستوں میں سے ہیں اور طالبان کو مکمل سپورٹ کر رہے ہیں۔ لیکن ان دو بزرگ ترین شخصیات کو نئے نظام میں جو مقام ملنا چاہیے وہ انہیں نہیں مل رہا جس کے اثرات ان دونوں بزرگوں کی گفتگو میں بھی بین السطور محسوس ہو رہے تھے۔ طالبان راہنماؤں کے تقویٰ، خلوص، دیانت، ایثار، قناعت اور بہت سے حوالوں سے طالبان حکومت کی شاندار کامیابی کے باوجود فطری طور پر تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود تھا اور ایسی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی موجودگی بھی ناگزیر تھی جو ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ میں اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں جس میں اس پہلو پر بھی گزارشات پیش

کروں گا۔ البتہ اس موقع پر صرف اتنی بات عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبان قیادت اپنی صفوں سے باہر اپنے بہی خواہوں اور معاونین کی درجہ بندی نہیں کرسکی کہ کس کو کس مقام پر رکھنا ضروری ہے اور کس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ طالبان قیادت اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے جذبات، وسائل اور خدمات سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کرسکی جس کا اسے بہرحال نقصان ہوا۔ اور یہی بات مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص کے حوالے سے مجھے مسلسل کھٹکتی رہی۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ سے میں پاکستانی علماء کے اس وفد کے ساتھ بھی ملا جو عبوری صدر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی سے ملاقات اور انہیں مجاہدین کی حکومت کے قیام پر مبارک باد دینے کیلئے کابل گیا تھا۔ اس وقت مولوی محمد نبی محمدیؒ کو مجددی صاحب کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ سابق حکمران پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان کی تحویل میں تھا جسے انہوں نے حرکتِ انقلاب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت دے دی تھی۔ اور سیاسی معاملات میں ان کی ٹیم اور پارٹی سب سے زیادہ متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ پاکستانی علماء سے اسی ہیڈ کوارٹر میں ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے مفصل گفتگو کے بعد بہت سے سوالات کے جوابات بھی دیے۔ اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ مجددی حکومت کے داخلی معاملات پر مولوی محمد نبی محمدیؒ کا کنٹرول بڑھ رہا ہے اور وہ افغانستان کے مستقبل اور نئے نظام کے بارے میں بھی ایک واضح ذہن اور پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ گفتگو کررہے تھے اور مستقبل کے نقشہ کے حوالے سے جو خطوط واضح کررہے تھے اس میں میرے جیسے سیاسی کارکن کیلئے اطمینان اور تسلی کا بہت سا مواد موجود تھا۔ اور میں ذاتی طور پر اس اطمینان کے ساتھ ہی واپس آرہا تھا کہ افغانستان اب ایک متوازن اسلامی سیاسی نظام اور مستحکم حکومت کی طرف پیش رفت کرے گا اور افغانستان کی تعمیر نو اور اسلامی حیثیت کی بحالی کے عمل کا آغاز ہوجائے گا۔ لیکن اسی روز کابل میں ''حزبِ وحدت'' اور ''اتحادِ اسلامی'' کے درمیان شدید گولہ باری سے نئی خانہ جنگی کا دور شروع ہوگیا جس نے ان توقعات اور امیدوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ بیاسی سال کی عمر میں وفات پاچکے ہیں اور ان کی موت کی خبر پڑھ کر ماضی کی یادوں کا ایک طویل اور متنوع سلسلہ ذہن کی سکرین پر یکے بعد دیگرے ابھر رہا ہے۔ مجھے مولوی صاحبؒ کی وفات کے غم کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی ستا رہا ہے کہ ان کے علم و فضل، فہم و تدبر اور حکمت و دانش سے دشمنوں نے ضرور زک اٹھائی مگر ان کے دوست کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور افغانستان کے بارے میں ان کی نیک تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم

۱۶ مئی ۲۰۰۲ء کو شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام
"سیرۃ النبیؐ کانفرنس" سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصد کی باتیں کہنے، سننے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ مجھے گفتگو کیلئے "سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ حتیٰ کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالے سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور ان کے بارے میں مثبت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

"جہاد" کا لفظ لغوی مفہوم کے حوالے سے کوشش، محنت و مشقت اور تگ و دو کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سربلندی، دعوت و تبلیغ، ترویج و تنفیذ، اور تحفظ و دفاع کیلئے کی جانے والی مختلف النوع عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کنٹرول اور نفس کی اصلاح کی مساعی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا ہے جس کی قرآن و سنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم جنگ اور محاربہ بھی ہے جسے قرآن کریم میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال" کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں احادیث نبویہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور اس جہاد کے فضائل، احکام، مسائل اور مقصدیت پر قرآن و سنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جابجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے کافروں کے خلاف میدان جنگ میں صف آرا ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا اور قتل و قتال کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت و فضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں۔ اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید و اعتراض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ جدید عقل و دانش کے نزدیک عقیدہ و مذہب کے فروغ اور غلبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ و مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کیلئے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہؐ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے اس حوالے سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کے بجائے آسمانی مذاہب کی ایک مسلسل روایت کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بائبل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی

اسرائیل نے اپنے مذہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور تشخص کے تحفظ کیلئے لڑیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم نے فلسطین کی سرزمین پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ کا سورۃ البقرۃ میں تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے ظالم حکمران کے خلاف حضرت طالوت کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا معجزانہ طور پر خاتمہ ہوا۔ اس جنگ کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوت کو "ساؤل بادشاہ" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر آج کی جدید دانش کو مذہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر بائبل اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ بائبل کے ماننے والوں نے بائبل پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس کے عملی احکام اور ماضی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام و تعلیمات سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیت کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد آنحضرتؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظن و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کیلئے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے آسمانی مذاہب کی ان دینی معرکہ آرائیوں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے تاکہ کسی دور میں بھی انسانی خواہشات اور عقل و گمان کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر غلبہ حاصل نہ ہونے پائے اور انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عملداری کے جس مشن کیلئے حضرت انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے ہیں، اس میں تعطل واقع نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے ایک ارشاد مبارک میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرمادیا ہے کہ الجهاد ماض الى يوم القيامة۔

یہ فکر و فلسفہ کی جنگ ہے، اسلوب زندگی کی معرکہ آرائی ہے، اور تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے جس میں شروع سے آسمانی مذاہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی مذاہب و ادیان کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی اور اس کے مسائل کے حل کیلئے انسانی خواہشات اور عقل و دانش تنہا کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ اس "چیک اینڈ بیلنس" کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کیلئے پوری نسل انسانی کی ضروریات و مفادات میں توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تہذیب جدید نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواہشات اور عقل ہی کو تمام امور کی فائنل اتھارٹی قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگڑ گیا ہے، اجتماعی اخلاقیات دم توڑ گئی ہیں، طاقت کا بے لگام گھوڑا وحی الٰہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے، اور پوری دنیا میں ہر طرف جنگل کے قانون کا دور دورہ ہے۔

آج کی جدید دانش نے چونکہ مذاہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شخصی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے اس لیے عقل جدید کے نزدیک مذہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کیلئے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ و تنفیذ کیلئے عسکری قوت کو استعمال میں لایا جائے ورنہ ہتھیار تو آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو

رہے ہیں، انسانی تاریخ میں اسے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال بھی ہوتے ہیں اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوانات مختلف ہیں:

- جرمنی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کیلئے تباہی کا سامان فراہم کیا۔
- روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشا استعمال کیا اور نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو تہہ تیغ کر دیا۔
- اسرائیل ایک نسلی مذہب کی برتری کیلئے اپنے سائز سے سینکڑوں گنا زیادہ ہتھیار جمع کیے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی میں مصروف ہے۔
- اور امریکہ نے مغربی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری، طبقاتی بالادستی، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانا اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں اندھا دھند استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا دہشت گردی نہیں ہے تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کیلئے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی تمام پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صورتحال میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف "عالمی اتحاد" کے پرچم تلے جو وحشیانہ فوج کشی جاری ہے، اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہا پسندوں سے آج کی عالمی تہذیب کو خطرہ ہے، بالادست ثقافت کو خطرہ ہے، اور بین الاقوامی نظام کو خطرہ ہے، اس لیے ان انتہا پسندوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے میدان جنگ میں مسلسل صف آرا ہیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانے اور اسے بے دریغ استعمال کرنے کا ایک فریق کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے علمبرداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جا سکتا اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کیلئے یہ کوئی وجۂ جواز نہیں ہے کہ چونکہ ایک فریق کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے مواقع زیادہ میسر ہیں، اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے، اور دوسرا فریق اس صلاحیت میں کمزور اور ان مواقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اسے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ وہ لڑ رہے ہیں، وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر لڑی جا رہی ہے، انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے، اور ان کے بقول اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصدیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی و مالی نقصان کی کوئی پروا نہیں ہے جو دنیا بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے۔ انسان مر رہے ہیں، عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی ہیں، ملکوں اور قوموں کی معیشتیں تباہ ہو رہی ہیں، اور امن و امان کا توازن مسلسل بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کیلئے کر رہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعے سے اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا تحفظ کر رہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جسے کسی چون و چرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ نسل انسانی کیلئے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کی نگرانی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کیلئے ضروری ہے۔ اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ انسانی خواہشات اور عقل محض نہیں بلکہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کیلئے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ مخالف فریق کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار پا گیا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن و سنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں:

- قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے جہاد کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چنگل سے بنی اسرائیل کو نکال کر صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ بیت المقدس کو عمالقہ سے آزاد کرنے کیلئے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں۔ مگر غلامی کے دائرے سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔
- قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالے سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ جالوت نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظالم کا شکار بنانا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔
- جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کفار مکہ کے خلاف پہلے بڑے معرکے کی قیادت بدر کے میدان میں کی اور قریش کو شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ جنگ قریش مکہ کے ان عزائم

پر ضرب لگانے کیلئے بپا ہوئی تھی جو وہ اسلام کو ختم کرنے اور جناب نبی اکرمؐ اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کیلئے اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اُحد اور اَحزاب کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشمکش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب آپؐ نے ۸ھ میں خود پیش قدمی کرکے مکہ مکرمہ پر قبضہ کرلیا۔

- یہود مدینہ کے ساتھ آنحضرتؐ نے امن و امان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو آپؐ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز خیبر پر حملہ آور ہوکر اسے فتح کرلیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔
- قیصر روم کے باج گزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصر روم مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کے بجائے شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور تبوک میں ایک ماہ قیام کرکے رومی فوجوں کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے واپس تشریف لائے۔

یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو علانیہ لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدّد کارروائیاں بھی سیرت النبی کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپہ مار کارروائیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

- مدینہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب نبی اکرمؐ کے ایما پر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور ان کے رفقاء نے شب خون مار کر قتل کیا۔
- خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابورافع کو جناب نبی اکرمؐ کے حکم پر حضرت عبداللہ بن عتیکؓ نے اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائی کے ذریعے سے قتل کیا۔
- جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یمن کے اسلامی صوبہ پر ایک مدعی نبوت اسود عنسی نے قبضہ کرکے آنحضرتؐ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یمن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو آپؐ کے ایما پر حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے چھاپہ مار کارروائی کرکے اسود عنسی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یمن پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔
- صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی بعض ناجائز اور یک طرفہ شرائط کے خلاف دباؤ ڈالنے کیلئے حضرت ابوبصیرؓ اور حضرت ابوجندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپہ مار کیمپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا جس سے مجبور ہوکر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاہدے میں شامل اپنی یک طرفہ شرائط واپس لینا پڑیں اور ابوبصیرؓ کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آکر قریش کو حضورؐ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔

جناب نبی اکرمؐ نے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صف آرائی کی چنانچہ غزوۂ احزاب کے بعد حضورؐ نے مدینہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش

مکہ کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرات نہیں ہوگی لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پراپیگنڈے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ آپؐ نے اس موقع پر شعر و خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو میدان میں آنے کی ترغیب دی چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ محاذ سنبھالا اور شعر و شاعری کے محاذ پر کفار کے حملوں کا پوری جرات کے ساتھ مقابلہ کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہوگی کہ جناب رسول اللہؐ نے اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کے تحفظ و استحکام کیلئے موقع و محل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کی اور محاذ آرائی کے جس اسلوب نے بھی آنحضرتؐ کے سامنے اپنا چیلنج رکھا، اسے جواب میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے حالات میں جہاد کے حوالے سے دو سوال عام طور پر کیے جاتے ہیں:

1. ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا کسی علاقے میں جہاد کیلئے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اس کی اجازت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں حضرت ابوبصیرؓ کا کیمپ اور حضرت فیروز دیلمیؓ کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابوبصیرؓ نے اپنا کیمپ حضورؐ کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ کیمپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو آپؐ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریش کی طرف سے یک طرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس کیمپ کے مجاہدین کو باعزت طور پر واپس بلا لیا۔ اسی طرح یمن پر اسود عنسی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا حکم دیا اور اسی بغاوت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجے میں اسود عنسی قتل ہوا۔
2. دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت Minority کے طور پر رہتے ہیں، ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کیلئے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد محترم جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کیلئے حاضر ہو رہے تھے کہ راستے میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے ہمیں رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ فرما کر انہیں بدر کے معرکے میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے اس بات کا وعدہ کر لیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد

محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرمؐ قبا میں قیام فرما تھے اور ابھی مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ وہ احد ہی میں شریک ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے چنانچہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوے میں ہوئی، وہ احزاب کا معرکہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاہدات موجود ہیں، ان کیلئے ان معاہدات کی پاسداری لازمی ہے۔ البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ہمدردی و خیر خواہی کیلئے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، وہ ان کی دینی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجے میں بھی کوتاہی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ گذشتہ سال افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا۔ مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیروی کرنا چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے عالمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کیلئے کر رہے ہیں، اسلام کے غلبہ اور مظلوم مسلمانوں کے دفاع کیلئے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں، ان کے ساتھ اپنے معاہدات اور کمٹمنٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

1. آج دنیا کی عمومی صورت حال پھر اس سطح پر آ گئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار کر کے حاکمیت مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الٰہی سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے نشانات و اثرات کو ختم کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضا میں اعلاء کلمۃ اللہ کا پرچم پھر سے بلند کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت کا تقاضا یہی ہے کہ نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الٰہی کے ہدایات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔

2. اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں ظالم اور متسلط قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی آزادی اور علاقائی خود مختاری سے محروم کیا جا رہا ہے، اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر کے ماحول سے نجات دلانے کیلئے جو کچھ ممکن ہو، کر گزرنا یہ بھی حضورؐ کی تعلیمات

وارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرف نظر کرکے ہم آپؐ کی اتباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔

ان دوعظیم ترملی مقاصد کیلئے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں۔ فکروفلسفہ کا میدان ہے، میڈیا اور انفریمیشن ٹیکنالوجی کی جولان گاہ ہے، تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے، تعلیم و تربیت کا دائرہ ہے، لابنگ اور سفارت کاری کا شعبہ ہے، اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معرکہ آرائی ہے۔ یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے شعبے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں "سنتِ نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" یہ ہے کہ:

- نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آسمانی تعلیمات کی عمل داری کی طرف لانے کیلئے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔
- اسلام کی دعوت اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوت اسلام کا مقصد وافادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔
- ملتِ اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشی خود کفالت، ٹیکنالوجی کی مہارت، اور عسکری قوت و صلاحیت کی فراہمی کیلئے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔
- مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کیلئے تگ ودو کی جائے نیز دینی تعلیم و تربیت کے نظام کو ہر سطح پر مربوط و منظم کیا جائے۔
- مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے اور ان کے دینی تشخص اور علاقائی خود مختاری کی بحالی کیلئے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔
- مسلم ممالک میں قرآن و سنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کرکے تمام مسلم ملکوں کو عالمی سطح پر کنفیڈریشن کی صورت میں خلافت اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔
- دینی جذبہ و غیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتل عام پر خوش ہونے کے بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملتِ اسلامیہ کیلئے حقیقی معنوں میں ایک کارآمد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔
- اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے یک طرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر و مرعوب ہونے کے بجائے اس کو مسترد کیا جائے اور دلیل و منطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت و افادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔

یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں او آئی سی کے عملی ایجنڈے کا حصہ ہونا چاہیے لیکن اگر دینی مراکز اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ ان مقاصد کیلئے مشترکہ پیش رفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصا بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم: چند مزید گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء

شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کی سالانہ سیرت کانفرنس میں ”سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم“ کے عنوان سے راقم الحروف کی گزارشات قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اس کانفرنس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی اور دیگر علماء کرام نے بھی خطاب کیا جبکہ مہمان خصوصی اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان تھے جنہوں نے اپنے اختتامی خطاب میں راقم الحروف کی معروضات کو سیرت النبیؐ کے صحیح رخ پر مطالعہ کی کوشش قرار دیا اور کہا کہ آج کے عالمی حالات اور مشکلات و مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت نبویؐ کے اسی طرز کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے میری گزارشات کے حوالے سے دو پہلوؤں پر اپنے تحفظات کا بھی اظہار فرمایا جن کے بارے میں خود میرا بھی خیال ہے کہ ان کی وضاحت ضروری تھی اور یہ وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے خطاب کے بعد اس سیرت کانفرنس میں مزید کچھ گزارش کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ان امور کی طرف توجہ دلانے پر ڈاکٹر ایس ایم زمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ”نوائے قلم“ کے ذریعے ان کے بارے میں ضروری معروضات پیش کر رہا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے سے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ:

- اگر تو اس سے مراد مذہب کے دفاع کیلئے ہتھیار اٹھانا ہے تو اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے،
- اور اگر اس کا مطلب مذہب کی تبلیغ کیلئے ہتھیار اٹھانا ہے تو یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور قرآن کریم نے سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ ”دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔“

مجھے ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں باتوں سے اتفاق ہے لیکن یہ معاملہ ان دو صورتوں میں محدود نہیں ہے بلکہ ایک اور صورت بھی درمیان میں موجود ہے جس کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے عام طور پر یہ الجھن پیش آجایا کرتی ہے۔ وہ ہے کچھ قوموں اور گروہوں کا اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نسل انسانی تک اسلام کا پیغام پہنچانے میں رکاوٹ بننا۔ اور اسلام نے کافر قوتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم اسی صورت میں دیا ہے جبکہ وہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچنے میں رکاوٹ

بن جائیں، کیونکہ اسلام یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو پیغام ہے صرف وہی نسل انسانی کی نجات کا ضامن ہے اور انسانی معاشرہ اس کے بغیر نجات و فلاح اور امن و خوشحالی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو لوگ شخصی یا مقامی دائروں میں اسلام قبول نہیں کرتے لیکن اسلام کی دعوت میں بھی رکاوٹ نہیں بنتے، اسلام ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ لیکن جو کافر اسلام قبول نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف اس قدر معاندانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اس کی دعوت میں رکاوٹ بن جائیں تو اسلام ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی بات کرتا ہے۔ یہ ہتھیار اٹھانا کسی کو قبول اسلام پر مجبور کرنے کیلئے نہیں بلکہ اسلام کی دعوت میں رکاوٹ بننے سے روکنے کیلئے ہے۔

چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے حوالے سے اپنے کمانڈروں کو یہی ہدایات دی ہیں کہ:

1. سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کرو، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے اور کوئی تنازع باقی نہیں رہتا۔
2. لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو دوسرے نمبر پر کافروں کے سامنے یہ پیشکش رکھنے کی ہدایت جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے دی گئی ہے کہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلام کی بالادستی (عالمی کردار) کو قبول کر لو، اگر وہ یہ درجہ قبول کر لیں تو بھی ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا بلکہ اسلامی ریاست ان کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اسے نبھاتی ہے۔
3. اس کے بعد تیسرے درجہ میں یہ بات ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں اور اسلام کی بالادستی کو قبول نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں مزاحم ہیں اور رکاوٹ بن رہے ہیں، چنانچہ اس صورت میں جناب نبی اکرمؐ نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیتے ہوئے اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ بتایا ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے امریکہ اور اس کے اتحادی یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت جو عالمی نظام اور بین الاقوامی سسٹم موجود ہے اور جس تہذیب و ثقافت نے اس وقت پوری دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے وہی سسٹم اور ثقافت نسل انسانی کیلئے سب سے بہتر ہے اور اس سے بہتر کسی سسٹم اور کلچر کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لیے دنیا کا جو ملک اور قوم ان کے نزدیک اس نظام و ثقافت کے عالمی کردار کیلئے خطرہ قرار پاتا ہے وہ اس کے خلاف چڑھ دوڑتے ہیں، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں اور پھر ہزاروں انسانوں کی ہلاکتوں کے باوجود بڑے فخر کے ساتھ اس اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے عالمی تہذیب کو بچا لیا ہے اور ورلڈ سسٹم کو درپیش خطرات کو ختم کر دیا ہے۔

میں اس مرحلہ میں اپنے اس موقف کا پھر اعادہ کرنا چاہوں گا کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک تہذیب اور نظام کو نسل انسانی کیلئے سب سے بہتر سمجھتے ہوئے اس کے عالمی غلبہ کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھائیں تو وہ کسی دوسری تہذیب اور نظام کے علمبرداروں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتے کہ وہ اگر اپنے نظام و تہذیب کو نسل انسانی کیلئے دیانتداری کے ساتھ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں تو اس کیلئے عالمی کردار کے قیام اور تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھائیں۔ اور اگر امریکی

اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھتے ہوئے دوسرے فریق کو اس حق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا نام انصاف نہیں بلکہ یہ جنگل کا قانون اور طاقت کی حکمرانی ہے جو طاقت اور اسلحہ کے زور پر تو قائم کی جا سکتی ہے لیکن اخلاقی جواز اور انصاف کی بنیاد سے محروم ہونے کی وجہ سے اسے قائم رکھنا کبھی ممکن نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی امکان ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم زمان نے دوسرا سوال یہ اٹھایا کہ میں نے جن چھاپہ مار کارروائیوں کا حوالہ دیا ہے ان کے حوالے سے دہشت گردی کی ایسی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی جا سکتی جن میں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں اور نہ ہی ایسی کسی کارروائی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے جس میں کسی بستی، چوک یا پڑی میں بم رکھ کر بے گناہ شہریوں کے جسموں کے پرخچے اڑا دیے جاتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر محترم کے اس ارشاد سے بھی مکمل اتفاق ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ ہر چھاپہ مار کارروائی دہشت گردی نہیں ہوتی اور ہمیں چھاپہ مار کارروائیوں اور دہشت گردی میں فرق کرتے ہوئے ان کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ہوگی۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف، ابورافع اور اسود عنسی کے قتل کیلئے جن کاروائیوں کا حکم دیا وہ چھاپہ مار کاروائیاں ہیں اور حضرت ابو بصیرؓ نے سمندر کے کنارے عسکری کیمپ قائم کر کے قریش مکہ کے خلاف جو کارروائیاں کیں وہ بھی چھاپہ مار کاروائیاں ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کارروائیاں متعیّن اہداف کیلئے تھیں اور ان کا دائرہ بھی اہداف تک محدود رہا۔ جبکہ بدر کی جنگ سے قبل ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو روکنے کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی تیاری اور قریش کے تجارتی راستے میں چھاپہ مار کیمپ قائم کر کے حضرت ابو بصیرؓ کا قریش کی شام کے تجارت میں رکاوٹ ڈالنا، یہ دشمن کی معیشت پر ضرب لگانے کی کارروائیاں تھیں اور یہ بھی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہونے کی وجہ سے دہشت گردی نہیں ہیں۔

البتہ اس سے ہٹ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سول آبادی اور بے گناہ اور غیر متعلق شہریوں کو نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دی، اس کے بارے میں آپؐ کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ اور اسی وجہ سے غیر متعلقہ، بے گناہ اور نہتے شہریوں کو کسی قسم کی عسکری کارروائی کا نشانہ بنانا، اسی طرح کسی بس یا چوک میں بم رکھ کر یا کسی مسجد یا امام بارگاہ میں بم پھینک کر بے گناہ لوگوں کی جانوں سے کھیلنا یقیناً دہشت گردی ہے جس کی کوئی بھی ذی شعور شخص حمایت نہیں کر سکتا۔

مگر ایک سوال باقی ہے کہ کسی ضروری ہدف کو نشانہ بناتے ہوئے اگر ناگزیر درجہ میں کچھ بے گناہ زد میں آ رہے ہوں تو پھر کیا کیا جائے؟ تو اس کے بارے میں ابوداؤد شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ کا واضح ارشاد موجود ہے کہ ایک غزوہ میں آپؐ سے سوال کیا گیا کہ دشمن کی قوت توڑنے کیلئے فلاں جگہ شب خون مارنا ضروری ہو گیا ہے مگر وہاں کچھ غیر متعلقہ لوگ بھی موجود ہیں جو حملہ کی صورت میں زد میں آ سکتے ہیں۔ تو نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ بھی انہی میں سے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگی ضروریات کیلئے اگر کہیں کارروائی ناگزیر ہو جائے اور اس کارروائی کی زد میں غیر متعلقہ لوگ آ رہے ہوں تو مجبوری کے درجہ میں اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکی اتحاد نے اہداف کو نشانہ بناتے ہوئے ہزاروں بے گناہ افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس کا جواز صرف یہی پیش کیا جاتا ہے کہ جنگی کارروائی کیلئے ایسا ناگزیر تھا اور اس سے کوئی مفر نہیں تھا۔

امید ہے کہ ڈاکٹر ایس ایم زمان کے اٹھائے ہوئے دو سوالوں کی مناسب وضاحت قارئین کے سامنے آگئی ہوگی، اس سلسلہ میں اگر مزید کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اس کیلئے بھی حاضر ہوں، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

دینی مدارس: امداد اور چھاپوں کی زد میں

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۷ جون ۲۰۰۲ء

ایک طرف صورتحال یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے امریکہ کی زیر قیادت عالمی اتحاد کے ساتھ مل کر دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ طالبان حکومت دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی تھی اور دینی مدارس افغانستان میں خالصتاً نظریہ اور دینی بنیادوں پر قائم طالبان حکومت کو دیکھ کر مطمئن تھے کہ ان کی ڈیڑھ صدی کی محنت رنگ لے آئی ہے اور اسلام کی جن تعلیمات کو انہوں نے گذشتہ دو سو برس سے محنت، قناعت، فاقہ کشی اور قربانیوں کے ساتھ زمانے کی دست برد سے بچا کر رکھا ہوا تھا وہ نہ صرف محفوظ ہے بلکہ عملی اور اجتماعی زندگی میں ان کی عملداری کے امکانات بھی نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن امریکی اتحاد نے حکومت پاکستان کے تعاون سے طاقت کے بل پر اس حکومت کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے علمی اور فکری سرچشمہ دینی مدارس کے خلاف وسیع تر انتقامی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جن کا سلسلہ افغانستان سے آگے بڑھتا ہوا پاکستان کے مختلف شہروں تک پھیلتا جا رہا ہے۔ دینی مدارس پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، علماء اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں، خوف و ہراس کی فضا قائم کی جا رہی ہے اور دینی مدارس کے ساتھ تعاون کرنے والے اصحاب خیر کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ امریکی کمانڈوز کی رہنمائی میں پاکستانی فورسز اس وقت پاکستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں اور جس طرح دینی حلقوں کو خوف زدہ اور ہراساں کیا جا رہا ہے اس فضا میں دینی مدارس کیلئے تیرہ ارب روپے کی امداد اور ان کی اصلاح و ترقی کے سرکاری اقدامات کو ایک سنگین مذاق اور زخموں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے؟

موجودہ حکومت اگر دینی مدارس کے نظام و نصاب کی اصلاح میں مخلص ہے اور خلوص دل کے ساتھ ان کی امداد کرنا چاہتی ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ

- ملک بھر میں دینی مدارس کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں فی الفور بند کر دی جائیں،
- امریکی کمانڈوز سے دوٹوک طور پر کہہ دیا جائے کہ القاعدہ کے ارکان کی تلاش کی آڑ میں ہم اپنے دینی تعلیم کے نظام اور ماحول کو ڈسٹرب نہیں کر سکتے،
- دینی مدارس کو مالیاتی و انتظامی خود مختاری کے تحفظ کی دوٹوک گارنٹی دی جائے،
- نصاب و نظام کے معاملہ میں انہیں ڈکٹیشن دینے کی بجائے مشاورت کے ذریعے ضروری اصلاحات کی راہ ان کے وفاقوں کے ذریعے ہموار کی جائے،

- اور دینی حلقوں اور مدارس کے بارے میں امریکہ اور بھارت کے ایجنڈے سے لاتعلقی کا واضح طور پر اعلان کیا جائے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوندوں سے فرمایا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو غلاموں کی طرح زدوکوب نہ کیا کریں کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں ہوگی کہ دن کے وقت وہ انہیں تھپڑ مار رہے ہوں اور شام کو پھر انہیں گلے لگانے کیلئے بھی آگے بڑھیں۔ حکمران بھی گھر کے سربراہ کی طرح ہوتا ہے، اسے بھی اگر گھر کے افراد کے تعاون کی ضرورت ہے تو اسے جناب نبی اکرمؐ کی اس نصیحت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہ تو کوئی شرافت کی بات نہیں سمجھی جائے گی کہ ایک طرف دینی مدارس چھاپوں کی زد میں ہوں، رات کی تاریکی میں ان کی دیواریں پھلانگی جا رہی ہوں، اساتذہ و طلبہ کو زدوکوب کیا جا رہا ہو اور جیل کی کالی کوٹھڑیوں کو مولویوں سے بھرا جا رہا ہو اور دوسری طرف وفاقی وزیر مذہبی امور تیرہ ارب روپے کے نوٹ تھالی میں رکھ کر دینی مدارس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہوں۔ ان حالات میں تو امداد اور نصیحت کی بات کوئی عام آدمی بھی قبول نہیں کرتا، حکومت نے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے اس کی توقع کیسے کر لی ہے؟

روس، عرب، یورپی ممالک کا فلسطین کی حمایت میں متوقع اتحاد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۸ جولائی ۲۰۰۲ء

ایک قومی اخبار کی رپورٹ کے مطابق فلسطین کی حمایت میں روس، عرب اور یورپی ممالک کا اتحاد وجود میں آنے والا ہے، جبکہ فلسطین پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف روس اور یورپی یونین کے بعض ملکوں کے درمیان خفیہ اتحاد ہو گیا ہے۔ ان یورپی ممالک نے روس کو یقین دلایا ہے کہ وہ فلسطین کی حمایت پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف اسٹینڈ لیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ روس نے اسلامی و یورپی ملکوں کے سربراہوں سے رابطے کیے ہیں اور اسرائیلی مظالم رکوانے کیلئے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ فلسطین کے اندر اسرائیل جو مظالم اور تباہ کاریاں کر رہا ہے اس سے اکثر یورپی ممالک کے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ امریکہ کی حمایت کے بغیر اسرائیل یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔

ادھر امریکہ اس موقف پر ڈٹا ہوا ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام کی صورت میں یاسر عرفات کا کوئی کردار نہیں ہوگا اور فلسطینی عوام کو یاسر عرفات کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا لیڈر منتخب کرنا ہوگا، ورنہ یاسر عرفات کے دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں امریکہ فلسطینی ریاست کی حمایت اور تعاون سے دست کش ہو جائے گا۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق امریکہ کے اس موقف کے خلاف غزہ کے علاقہ میں ہزاروں فلسطینیوں نے یاسر عرفات کے حق میں مظاہرہ کیا ہے اور صدر بش کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا ہے کہ فلسطینی عوام اپنی قیادت بالخصوص یاسر عرفات کو تبدیل کریں۔ مظاہرین نے ہوائی فائرنگ کی اور کہا کہ آزادانہ انتخاب ہمارا حق ہے، ہم بش کی ڈکٹیشن قبول

نہیں کریں گے اور ہمارا انتخاب اور لیڈر یاسر عرفات ہے۔ جب کہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا ہے کہ واشنگٹن نے فلسطین کے صدر یاسر عرفات سے تمام رابطے منقطع کر دیے ہیں اور فی الحال انہیں بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ یاسر عرفات امریکہ کی خواہش کے مطابق فلسطینیوں کو قیادت فراہم کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ کولن پاؤل نے کہا کہ اب امریکہ سمجھتا ہے کہ فلسطینیوں کی قیادت کیلئے کسی نئے آدمی کو سامنے لایا جائے جو امریکی خواہشات کے مطابق قیادت کرے، چونکہ یاسر عرفات امریکی خواہشات پر پورا اترنے میں ناکام رہے ہیں اس لیے اب امریکہ انہیں ہٹا کر ہی دم لے گا۔

روس کی طرف سے فلسطینیوں کی حمایت اور اس سلسلہ میں اسلامی ممالک اور یورپی ملکوں کے ساتھ روس کے رابطوں کی خبر سے اب سے کوئی تیس برس پہلے کا منظر نامہ پھر سے سامنے آگیا ہے جب دنیا دائیں اور بائیں بازو کے عنوان سے دو بڑے چودھریوں کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف امریکہ تھا اور دوسری طرف روس۔ اور ان کی قیادت میں دو بڑے بلاک قائم تھے جن کے مابین سرد جنگ کا سلسلہ جاری تھا، جس سے کمزور ممالک اور اقوام کو یہ سہولت میسر تھی کہ اگر ایک چودھری کی طرف سے ظلم اور ناانصافی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو وہ دوسرے چودھری کا سہارا لے کر خود کو کسی حد تک محفوظ کر لیا کرتی تھیں۔ مگر اب یہ صورتحال باقی نہیں رہی کہ ''افغان وار'' میں روس کی ہزیمت کے بعد امریکہ دنیا کا واحد چودھری اور حکمران بن گیا اور اس کے مقابل کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی جو اس کے کسی اقدام کو چیلنج کر سکے اور اسے مظلوم اقوام کے ساتھ زیادتی سے روک سکے۔

اس وقت عالمی صورتحال کچھ عجیب سی تھی اور مسلم ممالک بھی تقسیم کے اس عمل سے محفوظ نہیں تھے:

- مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو امریکہ کی کھلی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی، جو اب تک مسلسل جاری ہے بلکہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔
- جبکہ عرب ممالک دو حصوں میں تقسیم تھے: ایک حصہ سعودی عرب کی قیادت میں امریکی کیمپ میں تھا اور دوسرا کیمپ مصر کے جمال عبدالناصر مرحوم کی سربراہی میں روس کی بہی خواہوں میں شمار ہوتا تھا۔
- عرب قوم پرستی کی تحریک کو روس کی حمایت حاصل تھی اور وہ عرب ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کیلئے اپنے حامی عرب ممالک کے ساتھ اقتصادی اور فنی تعاون میں بھی پیش پیش تھا۔
- ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں خوفناک پٹائی کے بعد روسی کیمپ کے عرب ممالک میں یہ احساس ابھرنا شروع ہوا کہ روس کی حمایت اور تعاون ان کیلئے کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہو رہا، اس لیے اب ان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ امریکی کیمپ میں اپنے لیے جگہ تلاش کریں تاکہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکہ کی پالیسیوں میں توازن کی کوئی صورت نکل آئے، اور وہ علاقہ میں اسرائیل کے ساتھ اپنے معاملات کو بیلنس کر سکیں۔ چنانچہ صدر ناصر مرحوم کے آخری دور میں اس رخ پر کام شروع ہو گیا تھا جسے ان کے جانشین انور سادات مرحوم نے تکمیل تک پہنچایا اور عربوں نے ''کیمپ ڈیوڈ'' سمجھوتے کی صورت میں اپنا

مستقبل امریکہ کے ساتھ وابستہ کر لیا۔

- یاسر عرفات اس کشمکش میں اس کیمپ کے آدمی تھے جو روس کے ساتھ وابستگی رکھتا تھا اور انہوں نے اسی پس منظر میں قوم پرستی کی بنیاد پر فلسطین کی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک آزادی فلسطین کیلئے مسلح جنگ لڑی اور گوریلا کاروائیوں کی قیادت کی، اسی وجہ سے امریکہ کو بہت دیر تک اس میں تامل رہا کہ وہ یاسر عرفات کو فلسطینیوں کے لیڈر کے طور پر قبول کرے۔ یاسر عرفات پر امریکہ کے دروازے بند تھے اور ایک موقع ایسا بھی آیا کہ یاسر عرفات کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطینیوں کی نمائندگی کیلئے آنا تھا مگر امریکہ نے انہیں ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔

یاسر عرفات کو امریکی کیمپ میں جانے کیلئے عسکری سرگرمیوں سے دستبردار ہونا پڑا، روسی کیمپ سے تعلقات منقطع کرنا پڑے، بلکہ خدا جانے کون کون سی یقین دہانیوں سے گزرنا پڑا، تب جا کر یاسر عرفات کو امریکی کیمپ میں قدم رکھنے کی اجازت ملی۔ مگر اس کے بعد امریکہ کی طرف سے ایک نئی شرط سامنے آئی کہ یاسر عرفات خود تو عسکری سرگرمیوں اور جہادی عمل سے دست کش ہو گئے ہیں اور گوریلا جنگ کی بجائے سیاسی مذاکرات کی میز پر آبیٹھے ہیں، مگر فلسطینی عوام میں عسکری کارروائیوں کے رجحان کو مکمل طور پر ختم کرنے اور جہادی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری بھی یاسر عرفات کو قبول کرنا ہو گی، ورنہ انہیں جہادی سرگرمیوں سے دستبرداری کے موقف میں سنجیدہ تصور نہیں کیا جائے گا۔

ان شرائط اور یقین دہانیوں کے بعد فلسطین کی ایک ادھوری اور غیر رسمی سی برائے نام حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا صدر یاسر عرفات کو منتخب کیا گیا۔ اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ فلسطین میں عسکریت پسندی کے رجحانات کو مکمل طور پر ختم کریں اور جہادی گروپوں کو عسکری سرگرمیوں سے باز کریں، ورنہ بصورت دیگر انہیں پوری طرح کچل دینے میں اسرائیل کے ساتھ شریک ہوں۔ یاسر عرفات اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور اپنی بساط کی حد تک ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود حماس اور دیگر جہادی گروپوں کی عسکری سرگرمیاں نہ صرف جاری ہیں بلکہ ان سے اسرائیل کے مظالم اور وحشیانہ کاروائیوں کے خلاف مزید شدت پیدا ہو رہی ہے، اور ان فلسطینیوں کے خودکش حملوں نے اس خطہ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے خواب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

اس پس منظر میں امریکہ کی یکطرفہ اور جارحانہ پالیسیوں کے ردعمل میں روس اور یورپی یونین کے بعض ممالک کے درمیان نئے رابطوں کی یہ خبر خوش آئند ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی ضمیر بالکل ہی موت کے گھاٹ نہیں اتر گیا بلکہ اس میں زندگی کی کچھ رمق باقی ہے۔ خدا کرے کہ روس، یورپی یونین اور اسلامی ممالک کے یہ رابطے جلد کسی نتیجے تک پہنچیں کیونکہ عالم اسباب میں اسرائیل اور امریکہ کے وحشیانہ مظالم اور سنگدلانہ طرز عمل سے رہی سہی فلسطینی قوم کو کسی حد

تک بچا لینے کی اب یہی صورت باقی رہ گئی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی پریشان کر رہی ہے کہ بالکل یہی صورتحال کشمیر میں پیش آنے والی ہے بلکہ اس کی شروعات ہو گئی ہیں۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس نے بھی یاسر عرفات بننا ہے اس غریب کو جہادی سرگرمیوں کو مکمل طور پر کچلنے کی صورت میں جب امریکی غیظ و غضب کا نشانہ بننا ہو گا تو اسے کون سہارا دے گا؟ یاسر عرفات تو ماضی میں روسی کیمپ میں رہے ہیں اس لیے پرانے تعلقات ہمدردیاں بروئے کار لانے کا کوئی امکان نظر آرہا ہے۔ ہم تو شروع سے ہی امریکی کیمپ سے وابستہ ہیں اور اس حد تک وابستہ ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمہ اور اس کے بعد افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے خاتمہ میں بھی خود ہمارا خون شامل ہے، جس کی وجہ سے ہماری تباہی میں روس امریکہ سے بھی دو قدم آگے ہے۔ اس لیے جو بزرگ بھی مسئلہ کشمیر کے حوالے سے یاسر عرفات بننے جا رہے ہیں ان سے ہماری گزارش ہے کہ اس وقت کیلئے کوئی نہ کوئی پناہ گاہ ضرور سوچ رکھیں جب امریکہ بہادر آدھا کام نکل جانے اور باقی آدھے کام کا ان ہاتھوں پورا ہونے کا امکان باقی نہ رہنے پر بڑی بے نیازی کے ساتھ یہ فرما دے گا کہ "گیٹ آؤٹ! اب تمھاری ضرورت باقی نہیں رہی"۔

پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۶ اگست ۲۰۰۲ء

مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور اس کی پیچیدگی اور سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر حافظ سعید کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے، انہوں نے "لشکر طیبہ" کے نام سے مجاہدین کی جماعت بنائی جس نے بہت جلد مجاہدین کی تنظیموں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کی حمایت کیلئے شروع سے سرگرم عمل رہے جبکہ افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت اور امریکی عزائم کی مذمت و مخالفت میں پروفیسر حافظ محمد سعید ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی جماعت کو نہ صرف امریکہ کی طرف سے دہشت گرد قرار دیا گیا بلکہ پاکستان میں بھی اس پر پابندی لگا دی گئی جس پر انہوں نے "جماعۃ الدعوۃ" کے نام سے ایک نئی دینی و سیاسی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور لشکر طیبہ کو کشمیر کے دائرہ میں محدود کر کے پاکستان میں اس کی سرگرمیاں ختم کر دیں۔ تب سے وہ جماعت الدعوۃ کے امیر ہیں اور ملک کی دینی سیاست میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔

حافظ محمد سعید کو افغانستان پر امریکی حملہ کے موقع پر "دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل" کے مشترکہ فورم سے احتجاجی مہم میں متحرک کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رہا ہوئے لیکن کچھ دنوں کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیے گئے، ان کی گرفتاری کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں اور حکومتی حلقوں کی طرف سے ان خبروں پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔ لیکن جب گذشتہ دنوں ان کی اہلیہ محترمہ نے لاہور ہائی کورٹ میں ان کی گرفتاری یا نظربندی کے خلاف رٹ دائر کی تو

صوبائی حکومت نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ موقف اختیار کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو حکومت نے گرفتار نہیں کیا اور وہ حکومت کی تحویل میں نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں صوبائی حکومت کو علم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ اس کے بعد جب وفاقی حکومت سے دریافت کیا گیا تو حکومت پاکستان کے وکیل نے بھی لاہور ہائیکورٹ میں وہی موقف دہرایا جو صوبائی حکومت اس سے قبل پیش کر چکی تھی۔

اس طرح اب صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید غائب ہیں، ان کے گھر والوں کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں اور وہ معلومات حاصل کرنے کیلئے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے واضح طور پر ان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے کہ نہ انہیں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔

ہمارے خیال میں حکومت کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں ہے اور پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں اس درجہ کی لاعلمی کا اظہار کر کے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ورنہ اگر حکومت کا یہ موقف درست ہے تو اس کا اظہار اس وقت ہونا چاہیے تھا جب حافظ سعید کی دوبارہ گرفتاری کی خبریں قومی اخبارات میں شائع ہوئیں اور مسلسل کئی روز تک اس گرفتاری پر احتجاج بھی ہوتا رہا۔ اگر حکومت نے انہیں گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ اسی وقت حکومت کی طرف سے ان خبروں کی تردید جاری کی جاتی اور واضح طور پر قوم کو بتا دیا جاتا کہ یہ خبریں غلط ہیں اور حکومت نے انہیں حراست میں نہیں لیا۔ حافظ صاحب ملک کی معروف دینی شخصیت ہیں اور ایک دینی سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان کی گرفتاری کی خبروں پر حکومت کا خاموش رہنا اور کئی ماہ گزر جانے کے بعد ہائیکورٹ میں اس سے بے خبری کا اظہار کرنا نہ تو قانون و ضابطہ کی زبان میں درست طرز عمل ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز بنتا ہے۔

دوسری طرف ایک خبر کے مطابق حافظ محمد سعید کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی گمشدگی یا گرفتاری کے کیس میں صوبائی وزیر مذہبی امور مفتی غلام سرور قادری کو فریق بنانے کی درخواست دے دی ہے جنہوں نے مبینہ طور پر ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ حافظ محمد سعید حکومت کی حراست میں ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کیس کی سنگینی میں اس بات سے کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید ان حضرات میں سے ہیں جن کے بارے میں امریکہ اور بھارت دونوں ملکوں کی حکومتیں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کا کھلم کھلا مطالبہ کر چکی ہیں کہ انہیں آزاد نہ چھوڑا جائے، ان کی سرگرمیوں کو ختم کرایا جائے بلکہ انہیں ایک دہشت گرد کے طور پر امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لیے ان کی گرفتاری کی واضح خبروں کے کافی عرصہ بعد حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں بے خبری کا اعلان ذہنوں میں یہ شک پیدا کرتا ہے کہ کہیں انہیں کسی خفیہ ڈیل کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے تو نہیں کر دیا گیا؟ اور صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی آمد کے موقع پر جو یہ اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے کشمیر میں "دہشت گردی" کو ختم کرنے کیلئے بہت کچھ کر دیا ہے۔ کہیں اس بہت کچھ میں پروفیسر حافظ محمد سعید کی "گمشدگی" بھی تو شامل نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور ہضم بھی ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ہمارا یہ خدشہ بے جا نہیں ہے۔ ہم

نے ملا عبد السلام ضعیف کو افغانستان کا سفیر تسلیم کر رکھا تھا اور ان کے کاغذات سفارت باقاعدہ ایوان صدر میں قبول کیے گئے تھے لیکن افغانستان میں ان کو سفیر مقرر کرنے والی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب وہ سفیر نہ رہے تو ان کے ساتھ ڈیلنگ کے سفارتی تقاضے، ضوابط اور اخلاق کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے موجود تھا، جبکہ انہوں نے سیاسی پناہ کی درخواست بھی دے رکھی تھی، جو ہمارے ہاں زیر غور تھی۔ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی سفارت کار کی سیاسی پناہ کی درخواست زیر غور ہو اور اس کا فیصلہ کیے بغیر اسے اس کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے جبکہ واضح طور پر اس کو جان کا خطرہ بھی نظر آ رہا ہو۔ مگر ہم نے ایسا کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ نہ سفارتی آداب نے ہمارا دامن پکڑا اور نہ ہی قانون و ضابطہ کی کوئی دفعہ ہمارا ہاتھ روک سکی۔ چنانچہ ایک مسلمہ سفارت کار ہمارے ہاتھوں جنگی مجرم کا درجہ پا کر دشمن کی حراست میں ہے جس کے بارے میں وحشیانہ تشدد کی خبریں بار بار عالمی پریس میں آ رہی ہیں اور چند روز سے اسی تشدد کی وجہ سے ان کی موت اور شہادت کی خبریں بھی منظر عام پر آنا شروع ہو گئی ہیں۔

اس پس منظر میں جماعت الدعوۃ پاکستان کے امیر اور ملک کے معروف سیاسی و دینی رہنما پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی ملک بھر کے دینی حلقوں اور محب وطن عناصر کیلئے سخت پریشانی اور اضطراب کا باعث بن گئی ہے اور پروفیسر صاحب محترم کی زندگی کے حوالے سے سنگین اور شدید خدشات ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس لیے حکومت پاکستان یا پنجاب حکومت عدالت عالیہ میں یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو جاتی کہ اسے پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے اور اس نے انہیں حراست میں نہیں لیا۔ بلکہ یہ حکومت کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن عوام کے سامنے واضح کرے اور ان کی رہائی یا بصورت دیگر بازیابی کیلئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے فوری اور ٹھوس اقدامات کرے۔ ورنہ اگر حکومت نے اس حوالے سے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کیا تو عوام کے ذہنوں سے اس شبہ کو نکالنا مشکل ہو جائے گا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو خفیہ ڈیل کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اب بے خبری کے اظہار کے ذریعے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال اور مولانا فضل الرحمان کا مستحسن اقدام

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۲ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان نے میانوالی جیل میں اسیر کالعدم سپاہِ صحابہؓ کے سربراہ مولانا اعظم طارق سے ملاقات کر کے ان کی ایک ماہ سے زائد عرصہ سے جاری بھوک ہڑتال ختم کرا دی ہے اور ان کی مسلسل گرفتاری کو افسوسناک قرار دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کی رہائی کیلئے متعلقہ حکام سے بات چیت کر رہے ہیں۔

مولانا اعظم طارق کو افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد اس کے خلاف ”دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل“ کی احتجاجی

تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا جس کے بعد سے وہ مسلسل زیر حراست ہیں اور متعلقہ عدالتوں سے ان کی ضمانت ہو جانے بلکہ لاہور ہائیکورٹ کی طرف سے ان کی رہائی کے واضح حکم کے باوجود انہیں رہا کرنے سے گریز کیا جارہا ہے۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی تھی۔

مولانا اعظم طارق کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ چونکہ مولانا موصوف جھنگ سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر رہے ہیں، اور اب بھی وہ الیکشن میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے انہیں الیکشن سے دور رکھنے کیلئے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت زیر حراست رکھا جارہا ہے، اور یہ بات ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے آزادانہ اور شفاف انتخابات کے دعووں کے بھی منافی ہے۔

ہم مولانا فضل الرحمان کے اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے خود جیل جا کر مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال ختم کرائی اور انہیں ان کی رہائی کیلئے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ مولانا فضل الرحمان صاحب، جمعیت علماء اسلام کے دیگر قائدین بلکہ متحدہ مجلسِ عمل کے راہنماؤں سے ہماری درخواست ہے کہ مولانا اعظم طارق اور ان کے علاوہ مولانا محمد مسعود اظہر، پروفیسر حافظ محمد سعید اور دیگر ایسے سینکڑوں گرفتار علماء کرام اور دینی کارکنوں کی رہائی کیلئے سنجیدگی کے ساتھ حکومت سے بات چیت کریں۔ جن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے برادر اسلامی ملک افغانستان پر امریکہ کے حملہ کے خلاف احتجاج کا جائز حق استعمال کیا اور اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنے مظلوم افغان بھائیوں کا ساتھ دیا۔ ہمیں امید ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت اس سلسلہ میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی قدم اٹھائے تو ان مظلوم دینی راہنماؤں اور کارکنوں کی رہائی کی صورت نکل سکتی ہے۔

افغانستان اور عراق کے بارے میں مسلم دنیا کے الگ الگ معیارات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۴ ستمبر ۲۰۰۲ء

ایک سال قبل گیارہ ستمبر کے روز نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن کے پینٹاگون پر ہونے والے خودکش حملوں کی یاد منائی جا چکی ہے۔ ان حملوں میں ہزاروں افراد جاں بحق ہوئے اور اس کارروائی نے پوری دنیا کی سیاست کا رخ تبدیل کر دیا۔ سیاسی وابستگیوں کے پیمانے بدل گئے، اخلاق و اقدار کے معیار تبدیل ہو گئے، حقوق و مفادات کی کشمکش نے ایک نیا انداز اختیار کر لیا، دنیا کی واحد طاقت ہونے کے نشہ سے سرشار امریکہ کیلئے یہ وار ہوش و حواس سے محرومی کا باعث بن گیا، بے بس مظلوموں پر خوفناک قیامت ٹوٹ پڑی، اور تاریخ عالم میں ایک بار پھر عقل و خرد کے ساتھ اصول و شرافت کو بھی پامال کر دیا گیا۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس کی ہولناکی اپنی جگہ مگر اس کی آڑ میں امریکہ کی خدائی کو تسلیم نہ کرنے والوں پر جو قیامت ٹوٹی ہے وہ ختم ہونے میں نہیں آرہی۔ اس قیامت کے بطن سے

نئی نئی قیامتیں جنم لیتی چلی جا رہی ہیں اور اس سب کچھ کے باوجود ”دنیا کے بادشاہ“ کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

تباہی کا شکار ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جگہ ایک تقریب منعقد ہوئی ہے جو اس حوالے سے منعقد ہونے والی سب سے بڑی اور سب سے اہم تقریب تھی۔ اس میں ایک سال قبل اس مقام پر جاں بحق ہونے والوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت گردی سے نمٹنے کیلئے نئے عزم اور پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک چھوٹی سی تقریب ہم نے بھی مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں منعقد کی جو صبح گیارہ سے دو بجے تک رہی۔ اس میں بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے حملوں میں جاں بحق ہونے والے بے گناہ شہریوں کی موت پر صدمہ کا اظہار کیا گیا اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اہل علم و دانش کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی کہ وہ گیارہ ستمبر کے سانحات میں ہونے والے نقصانات کے ساتھ ساتھ اس کے ردعمل میں بے بس اور نہتے لوگوں پر ڈھائی جانے والی قیامتوں کے نقصانات کا بھی جائزہ لیں اور دانش و انصاف کے حوالے سے فیصلہ کریں کہ دہشت گردی کے اس مقابلہ میں جیت کس پہلوان کی ہوئی ہے؟ اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ساتھ دینے والوں نے انسانیت اور تہذیب و تمدن کی کون سی خدمت کی ہے؟

اس مقامی تقریب کی صدارت مولانا قاضی حمید اللہ خان نے کی جبکہ اس سے خطاب کرنے والوں میں جے یو آئی کے مولانا محمد امجد خان، جے یو پی کے مولانا مفتی غلام فرید رضوی، جمعیت اہل حدیث کے مولانا محمد اعظم، بریلوی مکتب فکر کے مولانا خالد حسن مجددی، ان کے علاوہ مولانا سید عبد المالک شاہ، مولانا ایوب صفدر، اور مولانا حافظ گلزار احمد آزاد بھی شامل ہیں۔

راقم الحروف نے اس سیمینار کے داعی کی حیثیت سے چند گزارشات پیش کیں اور عرض کیا کہ گیارہ ستمبر اور اس کے بعد ایک سال کے دوران ہونے والے واقعات پر میرے نزدیک سب سے بہترین تبصرہ اقوامِ متحدہ کی کمشنر برائے انسانی حقوق میری رابنسن نے کیا ہے۔ یہ خاتون آئرلینڈ کی صدر رہ چکی ہیں اور ابھی حال ہی میں اقوامِ متحدہ کی کمشنر برائے انسانی حقوق کے منصب سے سبکدوش ہوئی ہیں۔

میری رابنسن نے اپنے الوداعی انٹرویو میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دنیا بھر میں انسانی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے اور دنیا بھر میں بہت سے ممالک دہشت گردی کے خلاف لڑائی کو شہری اور سیاسی آزادیاں ختم کرنے کیلئے ایک بہانے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد انسانی حقوق کی پامالی کا رجحان پیدا ہوا ہے اور بعض ملکوں میں اختلاف رائے رکھنے والوں پر دہشت گردی کا ٹھپہ لگاتے ہوئے آزادیٔ اظہار کو کچلا جا رہا ہے۔ لوگوں کو لمبی مدت کیلئے زیر حراست رکھا جا رہا ہے، بش انتظامیہ نے طالبان اور القاعدہ کے سینکڑوں قیدیوں کو گوانتاناموبے (کیوبا) میں کوئی الزام عائد کیے بغیر بند کر رکھا ہے اور اس نے دنیا بھر میں انسانی حقوق کے معیار میں تنزلی کی مثال قائم کر دی ہے۔

محترمہ میری رابنسن کا یہ تجزیہ حقیقت پسند افراد اور گروہوں کیلئے لمحۂ فکریہ ہے جس پر دنیا بھر کے انصاف پسند

لوگوں کو توجہ دینی چاہیے۔ راقم الحروف کی دوسری گزارش ۱۱ستمبر۲۰۰۱ء کے بعد مسلم ممالک کے حکمرانوں کے طرزِ عمل کے بارے میں تھی کہ ہمارے مسلمان حکمرانوں نے اس سانحہ کے بعد کہا تھا کہ ہم امریکہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے سوا ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ امریکہ نے بھی ان سے دوٹوک کہہ دیا ہے کہ ہمارا عملی طور پر ساتھ دو ورنہ تمہیں دشمنوں کی صف میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن آج عراق کے معاملہ میں عرب اور دیگر مسلم حکمران امریکہ کا ساتھ نہ دینے کا اعلان کر رہے ہیں اور عراق کے خلاف امریکی الزامات کے ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے مسلم حکمرانوں میں امریکہ کا ساتھ نہ دینے کے اعلان کا حوصلہ اور الزامات کا ثبوت طلب کرنے کی جرأت ایک سال قبل کہاں تھی؟ اور صرف ایک سال بعد اس حوصلہ اور جرأت کو نئی زندگی کہاں سے مل گئی ہے؟ یہ ثبوت افغانستان کے حوالے سے طلب کیوں نہیں کیے گئے اور وہاں امریکہ سے یہ کہنے کی جرأت کیوں نہیں کی گئی کہ ہم اس جنگ میں تمہارا ساتھ دینے سے قاصر ہیں؟

ہم عام مسلمانوں کے نزدیک تو افغانستان اور عراق دونوں پر امریکی حملے یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور ہم دونوں ملکوں کے مظلوم عوام کے ساتھ ہیں لیکن مسلم حکمرانوں نے افغانستان اور عراق کیلئے الگ الگ معیار کیسے قائم کر لیا ہے اور ان کی مجبوری و بے بسی ایک سال گزرنے سے بھی پہلے امریکہ سے ثبوت طلب کرنے اور ساتھ نہ دینے کے اعلان کے حوصلہ میں کیسے تبدیل ہوگئی ہے؟ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مسلم حکمران افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت سے خود خائف تھے اور انہیں خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ اگر یہ حکومت کامیاب ہوگئی تو ان کے ملکوں میں استعمار کے مسلط کردہ نظاموں اور جبر و استحصال کے طریقوں کو کامیاب رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے خود انہوں نے اپنے سرپرست سے کہہ کر افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت کا دھڑن تختہ کرا دیا جبکہ عالم اسلام کی رائے عامہ کے سامنے جواب دہی سے بچنے کیلئے خود پر مجبوری اور بے بسی کی مصنوعی چادر تان رکھی ہے۔ ورنہ صرف ایک سال کے دوران افغانستان اور عراق کے حوالے سے مسلم حکومتوں کے موقف اور پالیسی میں اس بنیادی تبدیلی کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

سیمینار کے شرکاء اور مقررین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ گیارہ ستمبر کے سانحہ کی آڑ میں عالم اسلام پر جو یکطرفہ جنگ مسلط کی گئی ہے اس میں ظلم و جبر اور دہشت و بربریت کا پورے حوصلہ اور صبر کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان ملکوں کے اندر ظلم و جبر اور استحصال کے جو نظام مسلط ہیں اور عالمی سطح پر جبر و استحصال کا جو شکنجہ دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے انہیں عقیدہ و ایمان اور دین کی قوت کے ساتھ ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ اور جذبۂ ایمانی ہی ایک ایسی قوت ہے جو وسائل و اسباب کی کمی بلکہ فقدان کے باوجود بڑی سے بڑی قوت اور طاقت کا سامنا کر سکتی ہے اور اسے شکست دے سکتی ہے۔ اس لیے عالم اسلام اور پاکستان دونوں کی سالمیت اور خود مختاری کا تقاضا ہے کہ دینی قوتوں کو مستحکم کیا جائے، انہیں مضبوط کیا جائے اور انہیں سیاسی و اخلاقی سپورٹ دی جائے کیونکہ یہی ایک قوت ہے جو دنیائے اسلام اور پاکستانی قوم کو جبر و استحصال کے شکنجے سے نجات دلا سکتی ہے۔

"دہشت گردی" کے حوالے سے
اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اکتوبر ۲۰۰۲ء

سوالنامہ

اسلام امن و آشتی اور صلح و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے اور اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، نیز نجی زندگی سے متعلق معاملات میں انہیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اس نے نہ صرف ظلم و تعدی سے روکا ہے بلکہ ظلم کے جواب میں دوسرے فریق کے بارے میں حد انصاف سے متجاوز ہو جانے کو ناپسند کیا ہے اور انتقام کیلئے بھی مہذب اور عادلانہ اصول و قواعد مقرر کیے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی نیت سے اور کسی قدر غلط فہمیوں کی بنا پر اس وقت عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے اور اس جھوٹ کو اس قدر دہرایا گیا ہے کہ اب ایک طبقہ اسلام اور دہشت گردی کو مترادف سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں علماء، فقہاء اور ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے کہ دہشت گردی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو واضح کریں اور اسلام نے امن، صلح، عدل، مذہبی رواداری اور غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایات دی ہیں، ان کو واضح کریں تاکہ لوگوں کے سامنے اسلام کی حقیقی اور سچی تصویر آ سکے۔ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

1. اسلامی نقطہ نظر سے ''دہشت گردی'' کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟
2. یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات حکومتیں اپنے ملک میں بسنے والے تمام طبقات کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک نہیں کرتیں بلکہ بعض طبقات کے ساتھ سیاسی و معاشی ناانصافی روا رکھی جاتی ہے اور کبھی تو ان کے جان و مال کے تحفظ میں بھی دانستہ کوتاہی سے کام لیا جاتا ہے یا سرکاری سطح پر ایسی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ وہ طبقہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہو۔ تو کیا حکومتوں کے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویے پر بھی 'دہشت گردی' کا اطلاق ہوگا؟
3. اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جاتی ہے تو اس پر احتجاج اور رد عمل کا اظہار جائز ہے یا واجب؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ کیا مظلوم کا ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی

دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے؟

4. اگر ایک طبقہ کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو جس میں اس طبقہ کے کچھ افراد شریک ہوں تو کیا مظلوموں کو ظلم کرنے والے گروہ کے ان لوگوں سے بدلہ لینا جائز ہے جو بے قصور ہوں اور جو خود اس ظلم میں شامل نہ ہوں؟

5. مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

6. جہاں بھی دہشت گردی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کے کچھ بنیادی اسباب و محرکات ہوتے ہیں، جیسے کسی گروہ کے ساتھ معاشی یا سیاسی ناانصافی، یا کسی گروہ کے اندر طاقت وقوت کے ذریعے حکومت اور معاشی وسائل پر تسلط حاصل کر لینے کی خواہش۔ ان اسباب کے تدارک کیلئے اسلام کیا ہدایات دیتا ہے؟

7. اگر کسی گروہ یا فرد کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حتی المقدور مدافعت واجب ہے، مباح ہے یا مستحب؟ نیز حق مدافعت کے حدود کیا ہیں؟

جواب

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

اسلام بلاشبہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا دین ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کا ایک معنی یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جسے دوسرے لوگ اپنی جان و مال پر امین سمجھیں اور انہیں اپنی جان و مال اور آبرو کے حوالے سے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام اعتدال و توازن کا دین ہے جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کا راستہ بھی بتاتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم و تعدی اور جبر و ناانصافی انسانی سوسائٹی کے لوازم میں سے ہے جو نسل انسانی کے آغاز سے جاری ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اس لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام ظلم و تعدی کو روکنے اور جبر و ناانصافی کے سدباب کیلئے بھی ایک مستقل فلسفہ و نظام رکھتا ہے جس کی تفصیلات قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہر دور میں اس زمانے کے مقتضیات اور احوال کی روشنی میں فقہاء امت اس فلسفہ و نظام کی احکام و قواعد کی شکل میں وضاحت کرتے آرہے ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ (۱۹۲۴ء) تک چونکہ اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی سطح پر تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے اس لیے ہر دور میں نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا حل بھی ساتھ ساتھ سامنے آتا رہا ہے جس میں قضاۃ کے اجتہادی فیصلوں کے علاوہ ارباب علم اور اصحاب استنباط کی آزادانہ اجتہادی کاوشیں بھی شامل ہیں اور انسانی سوسائٹی کے حالات میں تغیر کے ساتھ ساتھ اجتہادی دائرہ میں ضرورت کے

مطابق شرعی احکام و قوانین میں ضروری تغیر و تبدل کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے البتہ خلافت کے زوال و ادبار کے دور میں بد قسمتی سے اجتماعی زندگی کے مسائل و ضروریات کی طرف اہل علم و دانش کی توجہ کم ہوتی گئی اور بیرونی افکار و نظریات اور فلسفہ و تہذیب کے مسلم معاشرے میں فروغ کے باعث اور اس سے پیدا ہونے والی آزاد روی کی وجہ سے ارباب فقہ و استنباط تحفظات کا شکار ہوکر ''جمود'' پر قناعت میں عافیت محسوس کرنے لگے تو جدید پیش آمدہ مسائل اور فکری و علمی چیلنجز کے حوالے سے استنباط اور اجتہاد کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا جو تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی رفتار کا ساتھ دے سکتا اور اگرچہ بہت سے علمی اداروں اور شخصیات نے اس خلا کو پر کرنے کی اپنے اپنے طور پر کوشش کی لیکن تنفیذی اور اجتماعی اجتہاد و استنباط کے فقدان اور شخصیات و مراکز کے انفرادی اجتہاد و استنباط میں فطری اختلاف کے باعث وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے جو اس اجتہاد و استنباط کا اصل مقصد وہدف تھے اور باہمی ربط و مفاہمت کا کوئی سسٹم موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ نظری و فکری خلفشار کا عنوان بن گئے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور اقوامِ متحدہ کے تحت اس کے منشور کے حوالے سے نئے عالمی نظام کے آغاز کے بعد دنیا کی صورتحال یکسر تبدیل ہوگئی تھی اور بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ساتھ ہمارے داخلی اجتماعی نظام کے احکام و قوانین کا بھی ایک بڑا حصہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد و استنباط کے ایک نئے اور ہمہ گیر عمل سے گزارے جانے کا متقاضی تھا لیکن عالمی سطح پر ملتِ اسلامیہ کے پاس اس کا کوئی فورم موجود نہیں تھا، مسلم حکومتوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انفرادی طور پر اس عمل کا اہتمام کرنے والے مراکز و شخصیات پر علاقائی، گروہی اور طبقاتی رجحانات کا غلبہ فطری امر ہے اس لیے یہ خلا نہ صرف باقی چلا آرہا ہے بلکہ فطری انداز میں نہ ہونے کی وجہ سے فکری خلفشار اور انتشار کی کیفیت نمایاں نظر آرہی ہے اور اس وقت ہماری صورتحال یہ ہے کہ:

- ایک طرف عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات مد و جزر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ مسلم ممالک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور عالمی سطح پر خلافت کے احیا کی خواہاں ہیں۔
- دوسری طرف مغرب کے سیکولر فلسفہ، نظام اور ثقافت کی مسلم ممالک میں ترویج و نفاذ کیلئے اقتصادی، سیاسی اور عسکری بالادستی کے ساتھ، نیز مسلمان کہلانے والی حکومتوں کے تعاون سے پیش رفت جاری ہے۔
- تیسری طرف کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوامِ متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے اور اس کے منشور و قوانین پر دستخط کرنے کے باعث قانونی اور اخلاقی طور پر آج کے عالمی نظام کا حصہ ہیں جس کا بڑا حصہ اپنے مقاصد و اہداف اور قوانین و ضوابط دونوں حوالوں سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔
- چوتھی جانب عالم اسلام میں دینی بیداری کے رجحانات، اسلامی تعلیمات کے مراکز، قرآن و سنت کے ساتھ غیر مشروط اور بے لچک کمٹمنٹ کے جذبات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے عالمی سطح پر احیا کیلئے اسلامی تحریکات کے عزائم مبینہ دہشت گردی کے خلاف اس عالمی جنگ کا براہ راست ہدف ہیں جس کی فوج کشی کا شکار اسی وجہ سے افغانستان بن چکا ہے اور مذکورہ بالا عزائم و جذبات رکھنے والی ہر تحریک اور ہر طبقہ اس جنگ

کی ''ہٹ لسٹ''میں شامل ہے۔

- ان کے علاوہ معروضی حقائق و حالات کا ایک پانچواں دائرہ یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کے وسائل خود مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں ہیں، مسلم ممالک اقتصادی اور معاشی طور پر بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تہہ در تہہ جال میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، مسلم حکومتیں سیاسی، معاشی، عسکری اور انتظامی شعبوں میں کوئی بنیادی فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں ہیں اور دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی مسلم حکومت کے اختیارات و معاملات کے گرد ایک غیر مرئی ''ریڈلائن''موجود ہے جس کو کراس کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔

اس وسیع تناظر میں دہشت گردی کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لینا یقیناً ایک اہم بات ہے اور اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جزوی مسئلہ سے پہلے بہت سے اصولی معاملات اہل علم کی توجہات کے مستحق ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ مسئلہ ہے کہ عالم اسلام کو اس مخمصہ سے نکالنے اور اس کی آزادی و خود مختاری بحال کرنے کیلئے ہمارے ارباب علم و دانش جہد و عمل کا کون سا خاکہ تجویز کرتے ہیں؟ اور وہ ملت اسلامیہ کو موجودہ صورتحال پر قناعت کرنے یا اس سے جان چھڑانے کیلئے کچھ کر گزرنے میں سے کون سا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دہشت گردی کی اسلامی حیثیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام و قوانین کی وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اور اس کی اصل غرض کیا ہے؟ اگر تو اس کا مقصد عالم اسلام کی دینی تحریکات کی راہنمائی کرنا ہے اور ان کو یہ بتلانا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی خود مختاری کی بحالی، خلافت اسلامیہ کے احیا، عالم اسلام کے وسائل کی بازیابی اور مسلم اقوام و ممالک کے گرد عالمی استعمار کے حصار کو توڑنے کیلئے ان کی جدوجہد کو ان شرعی حدود کا پابند رہنا چاہیے اور انہیں ارباب علم و دانش کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تو یہ ایک مفید اور مثبت عمل ہے جس کی ضرورت مسلم ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس سارے عمل کی غرض دہشت گردی کے حوالے سے عالمی استعمار کو مطمئن کرنا اور قاعدین و متخلفین کو ان کے قعود و تخلف کیلئے جواز اور اس کے دلائل فراہم کرنا ہے تو اس سے زیادہ قابل نفرین عمل کا موجودہ حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عالم اسلام کی بعض عسکری تحریکات پر ''دہشت گردی''کا لیبل چسپاں کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ایک اصولی بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عمل کے احکام سے ردعمل کے احکام مختلف ہوتے ہیں اور کسی ایکشن پر جن قواعد و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے ری ایکشن پر انہی قواعد و ضوابط کا کلیتاً اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصول دنیا کے ہر قانونی نظام میں تسلیم شدہ ہے اور قرآن کریم نے بھی سورۃ النساء آیت ۱۴۸ میں اس اصول کو اس حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بری بات کو ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم و زیادتی کو روا رکھنے والے ظالم کی برائی کو ظاہر کرے۔ گویا جس بات کی ایکشن اور عمل میں شرعاً اجازت نہیں ہے، ری ایکشن اور ردعمل میں قرآن کریم اس کی اجازت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ کوئی مظلوم ردعمل میں کوئی ایسی بات کر گزرتا ہے جس کی عام حالات میں اجازت نہیں ہے تو اس کی مظلومیت کا

لحاظ رکھتے ہوئے اس معاملے میں اس سے درگزر کر دینا ہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔

اس لیے واقعاتی پس منظر کی تفصیل میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی جن تحریکات اور گروپوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ اگر وہ غلبہ اور اقتدار کے شوق میں ایسا کر رہے ہیں اور حکمرانی کی حرص نے انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے تو ان کے دہشت گرد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اگر انہیں کسی طرف سے ہونے والے مظالم اور جبر نے ردعمل کے طور پر اس راستے پر ڈالا ہے اور جبر واستبداد کے حصار کو توڑنے میں دیگر کسی متبادل حربہ اور کوشش میں کامیابی کا کوئی امکان نہ دیکھتے ہوئے ”تنگ آمد بجنگ آمد“ کے مصداق وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو انہیں اس رعایت سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں مظلوموں کیلئے بیان فرمائی ہے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف آتے ہیں جو مذکورہ بالا سوال نامہ میں اٹھائے گئے ہیں۔

ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں ”محاربہ“ کا جو حکم بیان فرمایا ہے، ہمیں اس پر غور کر لینا چاہیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو سزا کا مستحق بتایا ہے، ان کے دو وصف بیان فرمائے ہیں:

- ایک یحاربون اللہ ورسولہ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں جس سے مراد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے قائم کردہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں۔
- دوسرا ویسعون فی الارض فسادا کہ وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں جس کا معنی آج کی معروف زبان میں یہ ہوگا کہ وہ امنِ عامہ کیلئے خطرہ بن جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہمارے ناقص فہم کے مطابق جو لوگ کسی جائز اور قانونی سسٹم کے خلاف ناجائز طور پر بغاوت کرتے ہیں اور عام شہریوں کی جان و مال کیلئے بلاوجہ خطرہ بن جاتے ہیں، وہ دہشت گرد کہلائیں گے۔ کسی حکومت کے جائز اور قانونی ہونے کیلئے اس دور کے عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس وقت بین الاقوامی تعامل اور عرف کی رو سے کون سی حکومت کو جائز اور قانونی سمجھا جاتا ہے جبکہ بغاوت کے جائز یا ناجائز ہونے میں بھی اسی بین الاقوامی عرف کا اعتبار ہوگا لیکن اس میں ایک بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ عرف اور تعامل اور چیز ہے اور کسی مخصوص مسئلہ پر عالمی برادری کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے جس کا تجربہ ہمیں حال ہی میں افغانستان کے حوالے سے ہوا ہے کہ وہاں طالبان کی حکومت نے ملک کے ۹۰ فیصد علاقہ کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا، دارالحکومت کابل بھی ان کے کنٹرول میں تھا اور ان کے زیر اثر علاقہ میں امن کا قیام اور ان کے احکام کی عمل داری بھی تسلیم شدہ ہے۔ آج کے بین الاقوامی عرف میں کسی حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے یہ باتیں کافی سمجھی جاتی ہیں بلکہ اس سے کم تر اہداف حاصل کرنے والی حکومتیں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی برادری نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس پر فوج کشی کر کے اسے جبراً ختم کر دیا۔ اس لیے ہمیں حقیقی عرف و تعامل اور وقتی طرز عمل میں فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور اب تو یہ فرق اس قدر واضح ہو گیا ہے

اور بڑھتا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی قوانین و ضوابط، اخلاقیات اور عالمی سیاسیات کی بیشتر اقدار و روایات کا مفہوم و معیار تک بدل کر رہ گیا ہے۔

دوسرا سوال اس حوالے سے ہے کہ کوئی حکومت اپنے ملک کے کسی طبقہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتی اور ان کے سیاسی حقوق اور جان و مال تک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو کیا اس حکومت کے ایسے طرز عمل کو بھی دہشت گردی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعیت کے کسی طبقے کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتی ہے اور اس محروم رکھنے میں ریاستی جبر کا ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جس سے اس طبقہ کے وجود اور اس کے افراد کی جان و مال کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں تو یہ بات یقیناً ریاستی دہشت گردی کہلائے گی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جاتی ہو تو اس پر احتجاج اور ردعمل کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا مظلوم کا ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی دہشت گردی کہلائے گا؟

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا دنیا کے ہر قانون میں حق حاصل ہے اور اسلام بھی اسے یہ حق دیتا ہے۔ اب اس حق کی درجہ بندی کہ یہ جائز ہے یا واجب، اس کا انحصار اس وقت کے حالات پر اور مظلوم کی صواب دید پر ہے۔ اسلام نے اس میں دو درجے رکھے ہیں: عزیمت اور رخصت۔ اگر وہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اپنے حق کیلئے ظالم کے خلاف جدوجہد کرتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے اور اگر صبر و تحمل کے ساتھ رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کیلئے اس کا جواز بھی ہے چنانچہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی عزت کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔ اس ارشاد نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ رخصت پر عمل کی اجازت ہے، لیکن ترجیح بہرحال عزیمت ہی کو حاصل ہے۔

باقی رہی بات ہتھیار اٹھانے کی تو فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اور انفرادی معاملات میں تو قانون کو ہاتھ میں لینے اور ہتھیار اٹھانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اور ایسا کرنا بغاوت کے زمرے میں آئے گا البتہ اجتماعی معاملات میں

- مسلم حکمران کی طرف سے کفر بواح کے ارتکاب اور
- مسلم اکثریت پر غیر مسلم اقلیت کا جبری اقتدار قائم ہو جانے کی صورت میں

ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے جو بسا اوقات فرض کا درجہ بھی اختیار کر جاتا ہے جیسا کہ دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور دیگر اکابر علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

حملہ آور قوت کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کیلئے ہتھیار اٹھانے کے حق کو دنیا کے ہر قانون میں تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے حریت اور آزادی کی جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے دہشت گردی قرار دینا ایسا ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کیلئے جن امریکی حریت پسندوں نے ہتھیار اٹھائے تھے اور اس جنگ میں انہوں نے متعلقہ اور

غیر متعلقہ ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ حریت پسند نہیں بلکہ دہشت گرد تھے اور اسی طرح دنیا بھر کی وہ تمام اقوام و ممالک دہشت گرد قرار پائیں گے جنہوں نے غیر ملکی قابضین اور نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑ کر آزادی حاصل کی ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر کسی طبقہ کے کچھ افراد نے ظلم کیا ہے تو کیا مظلوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس طبقے کے دوسرے افراد کو انتقام کا نشانہ بنائیں جو اس عمل میں شریک نہیں تھے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جہاں تک غیر متعلقہ لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کا تعلق ہے، اسلام اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی اسی طرح کا ظلم ہو گا جس کا وہ مظلوم خود نشانہ بن چکے ہیں۔ البتہ ظالموں کے خلاف کارروائی کے دوران کچھ لوگ ناگزیر طور پر زد میں آتے ہوں تو ان کا معاملہ مختلف ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر متعلقہ افراد کو قتل کرنے سے صراحتاً منع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم شریف کتاب الجہاد میں حضرت صعب بن جثامہؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہم ایک جگہ شب خون مارنا چاہتے ہیں مگر وہاں عورتیں اور بچے بھی ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ ھم منھم "وہ انہی میں سے ہیں" یعنی اگر وہ شب خون (چھاپہ مار کارروائی) کی زد میں ناگزیر طور پر آتے ہیں تو وہ انہی میں شمار ہوں گے اور ان کی وجہ سے کارروائی روکی نہیں جائے گی۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

اس کے جواب میں ہمارا طالب علمانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی مسلم حکومت ایسی نہیں ہے جس پر خالص اسلامی حکومت کا اطلاق کیا جا سکے یا جسے خلافت کا قائم مقام قرار دیا جائے اور اس کے دائرے میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمیوں کا درجہ دینا شرعاً ضروری ہو جبکہ کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوامِ متحدہ کے منشور پر دستخط کرنے کے علاوہ اس حوالے سے دیگر بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی قبول کر چکے ہیں اس لیے جب تک خلافت کا احیا نہیں ہوتا اور خالصتاً اسلامی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، ہم "میثاق مدینہ" کی طرز پر بین الاقوامی معاہدات کے پابند ہیں اور ہمیں ان پر عمل درآمد کرنا چاہیے الا یہ کہ ان میں سے کوئی بات کسی مسلمان ملک کی خود مختاری و سالمیت اور مسلمانوں کے ملی مفاد کیلئے صریحاً خطرے کا باعث ہو تو اس میں وہ ملک ضروری تحفظات اختیار کر سکتا ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کے ہر جگہ کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ اسلام ان اسباب کے تدارک کیلئے کیا ہدایات دیتا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ دہشت گردی فی الواقع بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام تو عام معاشرتی جرائم میں بھی مجرم کیلئے سخت سزائیں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ جرم کے اسباب و عوامل کے تدارک کا حکم دیتا ہے اور ان دواعی کا راستہ روکتا ہے جو کسی شخص کو جرم تک لے جاتے ہیں۔ اسلام کا یہی اصول دہشت گردی کے بارے میں بھی ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے نزدیک دہشت گردی کے حوالے سے دو محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک محاذ یہ ہے کہ جو عالمی قوتیں

"دہشت گردی کے خلاف جنگ" کا عنوان اختیار کر کے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو ٹارگٹ بنائے ہوئے ہیں، انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ جس کو تم دہشت گردی قرار دے رہے ہو، یہ دراصل ردعمل ہے ان مظالم اور جبر و ناانصافی کا جو ان اقوام و ممالک اور طبقات پر مسلسل روا رکھے جا رہے ہیں اور اس ردعمل کو جبر اور تشدد کے ذریعے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں جبر و تشدد سے مزید منافرت بڑھتی ہے اور جذبات میں شدت پیدا ہوتی ہے اس لیے اگر تم دہشت گردی کو ختم کرنے میں سنجیدہ اور مخلص ہو تو تمہیں جبر و تشدد اور عسکری جنگ کا راستہ ترک کر کے مفاہمت اور مذاکرات کا راستہ اپنانا ہوگا۔ ظالم اور مظلوم کے فرق کو محسوس کرو، مظلوم کی مظلومیت کو تسلیم کرو، ظالم کو ظالم قرار دو اور مسلمہ اصولوں کی روشنی میں مظلوم اقوام و طبقات کو ظلم و استحصال سے نجات دلانے کیلئے سنجیدہ پیش قدمی کرو ورنہ تمہاری یہ جنگ دہشت گردی کے خاتمے کیلئے نہیں بلکہ اس کے فروغ کیلئے متصور ہوگی اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ذریعے دے کر تم خود سب سے بڑے دہشت گرد قرار پاؤ گے۔

دوسری طرف عالم اسلام کی ان عسکری تحریکات سے بھی گفتگو کی ضرورت ہے جو مختلف محاذوں پر مصروف کار ہیں اور جنہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کو کچلنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ان تحریکات کی قیادتوں کو دو باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہر مسئلے کا حل ہتھیار نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر جگہ ہتھیار اٹھانا ضروری ہے۔ جہاں کسی مسئلہ کے حل کا کوئی متبادل راستہ موجود ہے، اگرچہ وہ لمبا اور صبر آزما ہی کیوں نہ ہو، وہاں ہتھیار سے کام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں شاید شرعاً جائز بھی نہ ہو۔ ہتھیار تو آخری حربہ ہے۔ جہاں اور کوئی ذریعہ کام نہ دیتا ہو اور کسی جگہ مسلمانوں کا وجود اور دینی تشخص حقیقی خطرات سے دوچار ہو گیا ہو تو آخری اور اضطراری حالت میں ہتھیار اٹھانے کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے اضطرار بلکہ ناگزیر اضطرار کے بغیر ہتھیار کو ہاتھ میں نہ لیا جائے۔

دوسری بات ان سے یہ عرض کرنے کی ہے کہ آزادی، قومی تشخص اور خود مختاری کیلئے اضطرار کی حالت میں قومیں ہتھیار اٹھایا کرتی ہیں۔ یہ زندہ قوموں کا شعار ہے اور آزادی کی عسکری تحریکات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے لیکن غیر متعلقہ لوگوں کو نشانہ بنانا اور بے گناہ لوگوں کا خون بہانا نہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی اور قانون و ضابطہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان تحریکات کو اس حوالے سے شرعی احکام و قوانین کی پابندی کا ایک بار پھر عہد کرنا چاہیے اور شرعی احکام بھی وہ نہیں جو خود ان کے ذہن میں آ جائیں بلکہ وہ قوانین و ضوابط جو امت کے اجماعی تعامل و توارث کے ساتھ تسلیم شدہ چلے آ رہے ہیں اور جنہیں وقت کے اکابر علماء و فقہاء کی طرف سے ضروری قرار دیا جا رہا ہو۔ اس کے بغیر کوئی بھی تحریک اور جدوجہد تمام تر خلوص و جذبہ اور ایثار و قربانی کے باوجود خلفشار پیدا کرنے کا باعث بنے گی اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی ہوگی اس لیے ایسی تحریکات کو کسی بھی ایسی بات سے قطعی طور پر گریز کرنا چاہیے جو:

- معروف اور مسلمہ شرعی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔
- جس سے مسلمانوں کی مشکلات میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہو۔
- جو اسلام کیلئے بدنامی کا باعث بن سکتی ہو۔

- اور جس سے خود ان تحریکات کی قوت کار اور دائرہ عمل متاثر ہوتا ہو۔

ساتواں سوال یہ ہے کہ کسی گروہ یا فرد کی جان و مال اور عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ دفاع واجب ہے یا مستحب؟

اس سلسلے میں اصولی طور پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جب اپنی جان، مال، اور آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والے مسلمان کو شہید قرار دیا ہے تو ان تینوں حوالوں سے دفاع کا حق اور اس کی فضیلت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی البتہ ایک اور بات عرض کرنا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ جان بچانے کو فقہاء کرام نے فرض قرار دیا ہے اور جہاں جان کے تحفظ کا مسئلہ آجائے، وہاں اضطرار کی حالت میں خنزیر کا گوشت بقدر ضرورت کھانے کو بھی بعض فقہاء نے فرض بتایا ہے تو اس اصول کی رو سے کسی فرد یا گروہ کیلئے یہ بات بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اسے اپنے وجود اور جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اسے بچانے کیلئے جو صورت دفاع کی ناگزیر ہو، وہ اسے اختیار کرے اور اس دفاع کی حد بھی وہی ہے جو حالت اضطرار کی دیگر صورتوں میں ہے کہ جتنی کارروائی سے جان بچ سکتی ہو، اسی حد تک اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

دینی کارکنوں اور علماء کرام سے اپیل

روزنامہ اسلام، مظفر آباد--- یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء

”پاکستان شریعت کونسل“ کا انتخابی اور حکومتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے قیام کے ساتھ واضح کر دیا گیا تھا کہ انتخابی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے الگ تھلگ رہتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل ملک میں

- اسلامی نظام کے نفاذ،
- دینی قوتوں میں رابطہ و مفاہمت کے فروغ،
- اور اسلام مخالف لابیوں اور سرگرمیوں کے تعاقب کیلئے فکری اور علمی محاذ پر کام کرے گی۔

چنانچہ اسی دائرہ میں رہتے ہوئے کونسل اپنے وسائل اور استطاعت کے دائرہ میں سرگرم عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ پاکستان شریعت کونسل کا کوئی بھی رکن یا عہدیدار کسی بھی سیاسی فورم سے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے اور کسی بھی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار کر سکتا بشرطیکہ وہ وہاں بھی پاکستان شریعت کونسل کے مذکورہ بالا تین مقاصد کیلئے محنت کرتا رہے۔

موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر پاکستان کی اسلامی حیثیت اور ملک کے دینی حلقوں اور مراکز کے مستقبل کے حوالے سے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات انتہائی اہمیت اختیار کر گئے ہیں اس لیے اقتدار کی کشمکش سے قطع نظر ملی، قومی و دینی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی اور سیکرٹری جنرل راقم الحروف کی طرف سے حسب ذیل اپیل جاری کی جا رہی ہے، ملک بھر کے احباب سے گزارش ہے کہ اسے زیادہ سے

زیادہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کریں اور خواص و عوام کو اس موقع پر ان کی دینی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کیلئے بھرپور کردار ادا کریں۔

مکرمی! __________ السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی عالمی اور ملکی سطح پر اسلام دشمن عناصر کی مکروہ سازشوں کی زد میں چلا رہا ہے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ:

1. پاکستان خود مختاری اور آزادی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو۔
2. پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت مستحکم نہ ہونے پائے۔
3. پاکستان میں جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ اور اس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں کوئی عملی پیشرفت نہ ہوسکے۔
4. پاکستان معاشی اور عسکری طور پر خود مختار اور باوقار حیثیت نہ حاصل کرسکے۔
5. پاکستان کی دینی قوتوں میں خلفشار کی فضا قائم رہے اور وہ پاکستانی قوم کی قیادت کیلئے اجتماعی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہیں۔
6. پاکستان میں فحاشی اور عریانی پر مشتمل مغربی اور ہندو کلچر کے اثرات کو وسیع سے وسیع تر کردیا جائے۔
7. پاکستان میں دینی ادارے مراکز اور شخصیات کی کردارکشی کرکے عوام کو ان سے دور رکھا جائے۔
8. ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے والے پاکستان سے عالم اسلام بالخصوص ملتِ اسلامیہ کے دینی حلقوں نے جو توقعات وابستہ کررکھی ہیں ان کی تکمیل کی کوئی عملی صورت پیدا نہ ہو۔
9. نئی نسل کو ہر قیمت پر دین اور دینی اثرات سے دور رکھا جائے، اور
10. بالآخر پاکستان کو ترکی کی طرح ایک سیکولر ریاست اور معاشرہ کا درجہ دے دیا جائے۔

گذشتہ سال ۱۱ستمبر کے سانحات کی آڑ میں افغانستان پر امریکی اتحاد کے حملے اور دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور جہادی قوتوں کے خلاف منفی پروپیگنڈے اور اقدامات کے ساتھ اس مہم کو مزید تیز کردیا گیا ہے اور عالمی استعمار اپنے مقامی معاونین کے تعاون سے پاکستان کو سیکولر ملک کی حیثیت دینے کے ایجنڈے پر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھا رہا ہے۔

ان حالات میں ۱۰اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ہونے والے عام انتخابات انتہائی اہم حیثیت اختیار کرگئے ہیں اور

- پاکستان کی اسلامی حیثیت کے تحفظ
- وطنِ عزیز کی خود مختاری اور قومی آزادی کی بحالی

- اور دینی مراکز کے معاشرتی کردار

کے حوالے سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ملک کا ہر ووٹر اپنی ترجیحات کا از سرنو جائزہ لے اور برادری ازم، دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اس الیکشن میں ایسے افراد کو سامنے لانے کیلئے کردار ادا کرے جو دینی سوچ، نظریاتی کردار اور ملی حمیت و غیرت کے حامل ہوں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی موجود بحران سے ملک و قوم کو باوقار طور پر نکال کر خود مختاری، آزادی اور اسلامی تشخص کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس موقع پر بھی دینی تقاضوں اور ملی ضروریات کو قبیلہ، برادری، لوکل دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں پر قربان کر دیا گیا تو پاکستان کے گرد استعماری نظام کا شکنجہ سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور ملک و قوم کی رہی سہی آزادی بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں "متحدہ مجلس عمل" کے نام سے متحد ہو کر ان انتخابات میں قوم کے سامنے آ گئی ہیں اور تمام دینی مکاتب فکر نے اجتماعی دینی قیادت کی عملی شکل ملت کے سامنے پیش کر دی ہے جس سے یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اس قیادت کو پاکستان کے عوام نے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں آگے آنے کا موقع فراہم کیا تو وطن عزیز کو عالمی استعمار کے مفادات اور سازشوں کی دلدل سے نکالنے، نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ، اسلامی نظام کے نفاذ اور قومی خود مختاری کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام، دینی کارکنوں اور غیور مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے الیکشن کو "ٹیسٹ کیس" سمجھتے ہوئے اس میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کی کامیابی کیلئے متحرک ہو جائیں اور صرف ووٹ دینے پر اکتفا کرنے کے بجائے اپنے اپنے حلقہ اثر میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کیلئے کام کریں اور انہیں کامیاب بنانے کیلئے مقامی حالات کی روشنی میں جو عملی کردار بھی ادا کر سکتے ہوں اس سے گریز نہ کریں۔

"متحدہ مجلس عمل" سے ہٹ کر چند دیگر رہنماؤں کے حوالے سے بھی گزارش کرنا ضروری ہے جن میں راولپنڈی سے محترم راجہ ظفر الحق، کوہاٹ سے حاجی جاوید ابراہیم پراچہ اور جھنگ سے مولانا اعظم طارق بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اگرچہ متحدہ مجلس عمل کی طرف سے امیدوار نہیں ہیں لیکن اپنے نظریاتی کردار اور خدمات کے تسلسل میں بھرپور اعتماد کے حامل ہیں اور یہ جس فورم سے بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے، ان شاء اللہ تعالیٰ حق کی آواز بلند کریں گے اور حق کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس لیے ملک بھر میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کو کامیاب بنانے اور ان کیلئے بھرپور محنت کرنے کی اپیل کے ساتھ ساتھ ان تین حضرات کے حلقوں سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی کارکنوں سے بطور خاص گزارش ہے کہ وہ ان کی کامیابی کیلئے ہر ممکن محنت کریں اور ان سے بھرپور تعاون فرمائیں۔

مغربی عوام اور حکمران ہم آہنگ نہیں

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء

۲۸ستمبر ۲۰۰۲ء کو لندن میں عراق پر متوقع امریکی حملے کے خلاف عوامی مظاہرہ تھا۔ گذشتہ سال انہی دنوں میں افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف لندن میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا تھا جس میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ مغربی ممالک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان کے حوالے سے امریکہ اور برطانیہ کی قیادت میں قائم عالمی اتحاد کے عزائم کو ان کے اصل پس منظر میں سمجھتے ہیں اور اسے سراسر ظلم قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف آواز بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ میں عوامی سطح پر تین باتوں پر غصے کا سرعام اظہار ہو رہا ہے:

1. ایک تو اسرائیل کی دہشت گردی اور امریکہ کی طرف سے اس کی مسلسل پشت پناہی کا منظر یہاں کے عوام کے ذہنوں میں دن بدن اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔
2. دوسرا وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ جنگ صرف اور صرف تیل کے چشموں پر قبضہ جمانے کیلئے ہے۔
3. اور تیسرے نمبر پر افغان، کشمیری، عراقی اور فلسطینی عوام کی مظلومیت کا احساس بھی عالمی میڈیا کے یکطرفہ پروپیگنڈے کے باوجود اضافہ پذیر ہے۔

گذشتہ سال اس حوالے سے لندن اور گلاسگو میں ہونے والے عوامی مظاہروں میں شریک ہو کر میری اس رائے کو تقویت حاصل ہوئی کہ حالیہ عالمی کشمکش میں ہمیں مغربی ممالک و اقوام کو اقوام و ممالک کے طور پر اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے جذبات سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و احساسات سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے ارباب فکر و دانش مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق براہ راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کر سکیں تو میڈیا، رائے عامہ، بریفنگ اور لابنگ کے مغربی ہتھیاروں کو مغرب کی بالادست قوتوں کے اسلام دشمن عزائم کے خلاف استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

”ورلڈ اسلامک فورم“ گذشتہ دس سال سے ارباب علم و دانش کو اسی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن بدقسمتی سے ایک محدود حلقہ کے سوا ہم اس ضرورت کا احساس عام کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ حالانکہ نہ صرف مسلمانوں کی مشکلات اور عالم اسلام کے مسائل کے حوالے سے بلکہ اسلام کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے سلسلے میں بھی یہ صورتحال واضح ہے، مگر کام کا ایک وسیع میدان سامنے موجود ہونے کے باوجود مسلم ادارے اور تنظیمیں اس کے ناگزیر تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہیں یا ان کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔

چند سال قبل برطانیہ کے ایک معروف ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر میں، جو جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر محترم پروفیسر خورشید احمد کی سربراہی میں کام کر رہا ہے، ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی پارلیمنٹ کے رکن جم مارشل نے کہا تھا کہ ہمارے سامنے اسلام کی مختلف تصویریں ہیں جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں:

- اسلام کا جو نقشہ ہمارے بڑوں نے ہمیں بتا رکھا ہے وہ اور ہے،

- جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اس سے قطعی مختلف ہے،
- اور جس اسلام کا مشاہدہ ہم اپنے اردگرد رہنے والے مسلمانوں کی عملی زندگی میں کر رہے ہیں، وہ ان دونوں سے الگ ہے۔

جم مارشل کا کہنا تھا کہ یہ "کمیونیکیشن گیپ" ہے جسے دور کر دیا جائے تو یہاں کے لوگ اسلام کی بات سننے کیلئے تیار ہیں۔

یوسف اسلام یہاں کے معروف نومسلم ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد لندن میں تعلیمی محاذ پر گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر مغربی ممالک میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کیلئے مسلم ممالک سے آنے والے علماء کرام اور دانشوروں کے بارے میں کہا کہ آپ لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ جن کے پاس علم ہے ان کے پاس زبان نہیں ہے، اور جو یہاں کی زبان اور اسلوب کے مطابق بات کہنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کے پاس مطلوبہ علم نہیں ہے۔ اس لیے آپ پہلے اس مسئلہ کا حل نکالیں، اس کے بعد آپ یہاں کے معاشرے کو اپنی بات صحیح طور پر پہنچا سکیں گے۔

چند سال قبل ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا رضاء الحق سیاکھوی کے ہمراہ مجھے ٹونگھم کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کا موقع ملا اور ان سے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ جن میں انسانی معاشرہ میں بڑھتی ہوئی دلی بے چینی، فکری انتشار اور اس کے ساتھ بے حیائی، بدکاری، حرام خوری اور خدائی احکامات سے بغاوت کے تیزی سے پھیلتے ہوئے رجحانات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ہم دونوں کی تشویش و اضطراب کی نوعیت یکساں تھی لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس صورتحال کا آپ کے پاس کیا حل ہے تو انہوں نے کسی تکلف اور ذہنی تحفظ کے بغیر بے ساختہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے اور ہم تو اس کیلئے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی معاشرہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور عالم اسلام کی مشکلات و مسائل، دونوں حوالوں سے بات کہنے اور باضمیر لوگوں کو توجہ دلانے کی گنجائش موجود ہے اور بات سننے والوں کی کمی نہیں ہے۔ البتہ اس کیلئے یہاں کی زبان، اسلوب، نفسیات اور عوامی مزاج کو سمجھنے اور اس کے مطابق بات کرنے کی ضرورت ہے جس کا ہمارے ہاں سرے سے فقدان ہے، اور اسی وجہ سے مغربی ممالک میں دعوتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ہر طرف دکھائی دینے باوجود غیر مسلم معاشرہ میں اس کے خاطر خواہ اثرات نظر نہیں آرہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء و ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۶ء

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے اور میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے

دورۂ حدیث کے ساتھی تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے کراچی کو اپنی علمی و دینی جولان گاہ بنایا اور بہت جلد ملک کے بڑے مفتیان کرام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ بلند پایہ مفتی تھے، اپنے معاصر مفتیان کرام سے بعض مسائل میں علمی بنیاد پر اختلاف بھی رکھتے تھے جیسا کہ ہر عالم اور مفتی کا حق ہے، ان کے کچھ تفردات بھی تھے جو علمی حلقوں میں موضوع بحث بنے رہتے تھے، لیکن ان کا علمی مقام اور ثقاہت ہمیشہ علمی حلقوں میں مسلم رہی اور ان کی علمی تحقیقات کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوئے اہل علم ان سے مسلسل استفادہ کرتے تھے۔ مگر مجھے ان کی جس ادا نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا ذوقِ تربیت تھا اور اس کے ساتھ خدمت خلق کے جذبے کو عام کرنے کا اسلوب جس نے انہیں اپنے معاصر علماء کرام میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے ساتھ میری عقیدت دو حوالوں سے ہے:

- ایک حوالہ تو مشترک ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نامور مفتیان کرام میں سے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ ایک دور میں ایسے مفتیان کرام میں تیسرا بڑا نام مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کا سامنے آتا تھا، جن سے مسائل معلوم کرنے کیلئے عامۃ الناس کی ایک بڑی تعداد تو رجوع کرتی ہی تھی مگر ان بزرگوں کو ملک بھر کے علماء کرام میں بھی مراجع کی حیثیت حاصل تھی کہ علماء کرام اور مفتیان کرام اپنی الجھنوں اور علمی اشکالات کو دور کرنے کیلئے انہی سے رجوع کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔
- جبکہ دوسرا حوالہ یہ ہے کہ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ دورۂ حدیث کے ساتھی تھے اور دونوں نے غالباً سن ۱۹۴۱ء/ ۱۹۴۲ء میں دار العلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور دیگر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اکٹھے سند فراغت حاصل کی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ فقہ و افتاء کے شعبہ میں بلند پایہ استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر اور تجربہ کار روحانی مربی بھی تھے اور وہ اپنے تلامذہ کے تعلیمی معیار پر نظر رکھنے کے علاوہ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تربیت کا نظام بہت سخت تھا، وہ اپنے مرید کی دینی یا دنیاوی وجاہت کا لحاظ رکھے بغیر اور اس کی رعایت کرنے کی بجائے تربیت کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اسی طرح کی جھلک حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے نظام تربیت میں بھی نظر آتی تھی۔

مفتی صاحب مرحوم نے جس جرأت و حوصلہ کے ساتھ جہاد افغانستان کو سپورٹ کیا، مجاہدین کی سرپرستی اور پشت پناہی کی، طالبان کی اسلامی حکومت کی حمایت و امداد کا اہتمام کیا اور علماء اور دینی حلقوں کو حق کی حمایت کی طرف متوجہ کرنے میں مسلسل محنت کی، اس نے خیر القرون کے مجاہد علماء کرام کی یاد تازہ کر دی۔ اور ان کے قائم کردہ ''الرشید ٹرسٹ'' نے رفاہی میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔۔۔۔۔ ہمارے دینی حلقوں میں دینی مدارس کی محنت اگرچہ خود ایک بہت بڑی سماجی اور تعلیمی خدمت کا درجہ رکھتی ہے، جس کا اعتراف صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی نشری تقریر

میں ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا کہ یہ دینی مدارس سب سے بڑی این جی اوز ہیں جو لاکھوں طلبہ کو نہ صرف مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں بلکہ لاکھوں نادار افراد کو رہائش، خوراک اور علاج معالجہ کی سہولتیں بھی مہیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تعلیم سے ہٹ کر دوسرے شعبوں میں سماجی خدمات کا دینی حلقوں میں جو خلا نظر آتا تھا جو غیر ملکی این جی اوز کے سماجی خدمات کے نیٹ ورک اور خاص طور پر پاکستان میں مسیحی مشنریوں کی سماجی سرگرمیوں کے پس منظر میں بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس خلا کو پر کرنے کی خدمت حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ سے لی اور مفتی صاحب نے الرشید ٹرسٹ کے ذریعے سماجی خدمات کے ان تمام شعبوں کی طرف اصحاب خیر کی توجہ دلائی جن کا تذکرہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی خدمات کے حوالے سے بخاری شریف کی روایت میں کیا ہے۔

مجھے گذشتہ دنوں لندن جاتے ہوئے کراچی میں ایک دن رکنے کا موقع ملا اور جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی میں بخاری شریف کے اختتام کی سالانہ تقریب میں شرکت کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے قائم کردہ اداروں میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔۔۔۔ سب سے زیادہ مسرت الرشید ٹرسٹ سے متّصل بلڈ بینک دیکھ کر ہوئی جس کا حال ہی میں افتتاح ہوا ہے اور جس میں خون کے حصول، ٹیسٹ، حفاظت اور نادار افراد کو اس کی صحیح حالت میں مفت فراہمی کا نظم و نسق دیکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ کیلئے بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔ میں نے مغربی ممالک کے جدید ترین ہسپتال دیکھے ہیں لیکن جدید ترین مشینری، مہارت اور کارکردگی کے لحاظ سے مجھے ان کے مقابلہ میں اس بلڈ بینک میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ملک کے دیگر دینی اداروں اور شخصیات کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

انتخابات میں متحدہ مجلسِ عمل کی کامیابی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ء

عام انتخابات کے نتائج نے ایک دنیا کو حیران و ششدر کر دیا ہے اور ان کے بارے میں سب کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ خود میرا اندازہ یہ تھا بلکہ برطانیہ آمد کے بعد اکثر دوست مجھ سے پوچھتے رہے تو میں ان سے یہی کہتا تھا کہ متحدہ مجلس عمل بیس کے لگ بھگ سیٹیں قومی اسمبلی میں حاصل کر پائے گی، اور اگر اسمبلی میں مجلس عمل کی قیادت اسی طرح اکٹھی رہی جس طرح اس الیکشن کیمپین میں اس نے یکجہتی کا اظہار کیا ہے اور اگلے انتخابات تک یہ اتحاد قائم رہا تو مجلس عمل کے ملک گیر سطح پر الیکشن جیتنے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ اگلے انتخابات کے بارے میں تو میرا اندازہ اب بھی یہی ہے کہ:

- اگر پارلیمنٹ کے اندر مجلس عمل نے ٹیم ورک کا ماحول پیدا کر لیا،
- اقتدار میں شامل ہونے کی بجائے اپوزیشن میں بیٹھ کر عوامی جذبات کی بے لاگ ترجمانی کی،
- عوام کے حقیقی مسائل اور قومی خود مختاری کی بحالی کو اپنے ایجنڈے میں اولیت دی،

- اور پارلیمنٹ سے باہر بھی مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے عوامی سطح پر اپنے اتحاد واشتراک کا مظاہرہ مسلسل جاری رکھا

تو الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کی طرح پاکستان میں دینی جماعتوں کی متحدہ مجلس عمل بھی اگلے عام انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن حالیہ انتخابات کے نتائج خود میرے لیے بھی خوشگوار حیرت کا باعث بنے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں گوجرانوالہ شہر اور کراچی کے ایک آدھ پروگرام کے سوا اس انتخابی مہم کو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا اور اپنے سابقہ تجربہ کے ساتھ ساتھ اخبارات کی خبریں اور تجزیے ہی میری معلومات کا بڑا ذریعہ رہی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو بہر حال مجھے انتخابات میں ان نتائج کی توقع نہیں تھی اور دس اکتوبر کی شام کو جوں جوں انتخابی نتائج کی تفصیلات معلوم ہوتی گئیں میری حیرت اور تعجب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے تعجب اور حیرت میں افسوس، حسرت اور غصہ کا عنصر شامل تھا لیکن دنیا بھر کے دینی کارکنوں کی طرح میرے تعجب اور حیرت میں خوشی اور تشکر کے جذبات موجزن تھے۔

میں دس اکتوبر کی شام کراؤلی (برطانیہ) میں مولانا قاری عبد الرشید رحمانی کے ہاں تھا جو استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رسول خان ہزارویؒ کے پوتے ہیں اور کراؤلی کی جامع مسجد میں خطیب و امام ہیں۔ جمعیت علمائے برطانیہ کے قاری محمد ہاشم بھی وہیں تھے جو اپنے موبائل فون پر مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے اور مجھے آگاہ کرتے جاتے تھے۔ ان کی خوشی قابل دید تھی اور میری خوشی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا حتیٰ کہ رات گئے برمنگھم سے مولانا قاری تصور الحق نے مجھے بطور خاص فون کر کے اطلاع دی کہ میرے شہر گوجرانوالہ سے متحدہ مجلس عمل کے امیدوار مولانا قاضی حمید اللہ خان نے بھی قومی اسمبلی کی سیٹ جیت لی ہے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

متحدہ مجلس عمل کی یہ شاندار کامیابی کہ اس نے قومی اسمبلی میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی پوزیشن حاصل کر لی ہے، عام طور پر اس کے دو بڑے سبب بیان کیے جا رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ افغانستان پر امریکہ کے وحشیانہ حملہ اور طالبان کی مظلوم و معصوم حکومت کی تباہی پر پاکستان کے عوام بالخصوص صوبہ سرحد و بلوچستان کے غیور مسلمانوں کو اپنے غصے کے اظہار کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے انہوں نے اس الیکشن میں طالبان کی سپورٹر جماعت کو ووٹ دے کر اس غصہ کا عملاً اظہار کیا ہے۔
2. اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مختلف مکاتب فکر کی دینی جماعتوں نے کسی اور سیاسی اتحاد میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنا سیاسی اتحاد قائم کر کے جداگانہ تشخص کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا ہے جس کی پاکستان کے عوام کو خوشی ہوئی ہے اور انہوں نے دینی جماعتوں کو ووٹ دے کر اپنی اس خوشی کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ دونوں باتیں درست ہیں، متحدہ مجلس عمل کے حق میں اتنی بڑی تعداد میں ووٹ ڈال کر پاکستان کے عوام نے صرف غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ امریکہ اور اس کے حمایتیوں کو یہ پیغام بھی دے دیا ہے کہ ڈیزی کٹرز کی بارش، اقوامِ متحدہ کی

قراردادوں، عالمی برادری کے یکطرفہ موقف اور ورلڈ میڈیا کے مسلسل منفی پروپیگنڈے کے باوجود طالبان اور عرب مجاہدین کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ اب بھی روسی استعمار کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی کے منطقی نتائج کی عملی شکل طالبان ہی کی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور اس کی طرف سے اسرائیل کی پشت پناہی کو ناجائز اور سراسر ناانصافی اور ظلم تصور کرتے ہوئے اس کے خلاف اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کی جدوجہد کو جائز اور درست تصور کرتے ہیں۔

خدا جانے مغرب کے ارباب حل و عقد کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہوگئی ہے کہ جبر و تشدد اور یکطرفہ پروپیگنڈے کے زور سے قوموں کی رائے تبدیل کی جاسکتی ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو دفن کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے غیور شہریوں اور خاص طور پر صوبہ سرحد و بلوچستان کے عوام نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ رائے کی تبدیلی کا تعلق طاقت، جبر اور تشدد سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف دلیل اور منطق کے ذریعے ہی تبدیل ہوتی ہے۔ عباسی دور خلافت میں قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے غلط عقیدہ کو منوانے کیلئے جب حکومت کی طرف سے جبر سے کام لیا گیا اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر ان سے یہ منوانے کیلئے کوڑے برسائے گئے کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر نہیں بلکہ مخلوق ہے، تو امام احمد بن حنبلؒ نے برستے کوڑوں میں یہ جواب دیا کہ کوئی دلیل پیش کرو تو سننے کیلئے تیار ہوں لیکن کوڑوں کی ضرب اور جسم کے لہولہان ہونے کی وجہ سے اپنا عقیدہ اور رائے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے پاکستانی عوام نے بھی اپنے عمل کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے اسی موقف کو دہرایا ہے کہ اقوامِ متحدہ کی یکطرفہ قراردادوں، عالمی میڈیا کے معاندانہ پروپیگنڈا، طاقت کے استعمال کی دھمکی کے ذریعے قائم ہونے والے عالمی اتحاد کے فیصلوں، اور ڈیزی کٹرز کی بارش سے ہزاروں انسانوں کے جسموں کے پرخچے اڑا کر کسی کو دہشت گرد اور انتہا پسند ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی باضمیر لوگ عقیدہ اور رائے کے بارے میں ان ”دلیلوں“ کو ماننے کیلئے تیار ہیں۔

اس لیے متحدہ مجلس عمل کے قائدین مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمان، مولانا سمیع الحق، قاضی حسین احمد، پروفیسر ساجد میر اور علامہ ساجد نقوی کو اس شاندار کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے غیور پاکستانیوں کو سلامِ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے طاقت اور جبر کی دلیل کو ایک بار پھر مسترد کر دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کے عوام جبر و تشدد اور دباؤ کے حصار میں بھی حق بات کہنے اور حق کی حمایت میں رائے دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی جماعتوں کے متحد ہونے پر اور اپنا جداگانہ سیاسی تشخص قائم کرنے پر پاکستان کے عوام کو خوشی ہوئی تو اس میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دینی جماعتوں نے موجودہ اتحاد قائم کرنے کے بعد پہلی کامیابی ووٹرز فارم سے عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ حذف کرنے کے خلاف اپنے احتجاج کی پذیرائی کی صورت میں حاصل کی تھی۔ دوسری کامیابی مدارس دینیہ کے بارے میں حکومتی آرڈیننس کی پسپائی کی شکل میں ان کے حصہ میں آئی، اور اب تیسری کامیابی بھی انہوں نے دیکھ لی ہے جو صرف کامیابی نہیں بلکہ آئندہ کئی کامیابیوں کی کلید بھی بن سکتی ہے بشرطیکہ:

- متحدہ مجلس عمل اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھے،
- پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ٹیم ورک کا ماحول پیدا کرے،
- اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائے عوامی جذبات کی ترجمانی اور عوام کے حقیقی مسائل کی نشاندہی کے کردار کو ترجیح دے،
- اور اپنی پالیسیاں اور ترجیحات طے کرتے ہوئے ان مجاہدین اور شہداء کو بھی یاد رکھے جن کے مقدس خون کی برکت سے متحدہ مجلس عمل کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

متحدہ مجلسِ عمل کی کامیابی اور ذمہ داری

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۲ء

حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے مشترکہ محاذ ''متحدہ مجلسِ عمل'' نے خلافِ توقع کامیابی حاصل کی ہے اور وہ قومی اسمبلی میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی حیثیت مل جانے کے علاوہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریتی پارٹی کی پوزیشن سے بھی بہرہ ور ہوگئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ متحدہ مجلسِ عمل کو یہ کامیابی افغانستان کے حوالے سے اس کے جرأتمندانہ موقف اور دینی جماعتوں کے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوجانے کی وجہ سے ملی ہے۔

متحدہ مجلسِ عمل نے ملک کی روایتی سیاسی قوتوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے جداگانہ سیاسی تشخص کی بنیاد پر یہ مشترکہ محاذ قائم کیا ہے، اور افغانستان پر امریکی حملہ کی شدید مذمت کے ساتھ پاکستان کے داخلی امور میں امریکہ کی مسلسل اور بے جا مداخلت پر احتجاج کرتے ہوئے پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کے عزم کا اظہار کیا ہے، اور اسی نعرہ پر دینی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام کے دلی جذبات و احساسات کیا ہیں اور وہ جنوبی ایشیا کے بارے میں امریکی عزائم کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہم اس کامیابی پر متحدہ مجلسِ عمل کے قائدین کو مبارکباد دیتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ کامیابی ان کیلئے ایک عظیم امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور ان پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ

- وہ اپنے منشور اور انتخابی وعدوں کی تکمیل کیلئے سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں،
- باہمی اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے اپنے عمل اور کردار کے ساتھ واضح کر دیں کہ دینی قیادت قوم کی سیاسی قیادت اور نظامِ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتی ہے، اور اسلام کے عادلانہ نظام کو آج کے دور میں اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت متحدہ مجلسِ عمل کی قیادت اور منتخب ارکان کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی

توفیق دیں، اور اپنے عمل و کردار کے ساتھ نفاذِ اسلام کی جدوجہد کو کامیابی کی طرف آگے بڑھانے کے مواقع اور اسباب مہیا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

عالمی اسلامی تحریکات کی متحدہ مجلسِ عمل سے وابستہ توقعات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ نومبر ۲۰۰۲ء

پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر دنیا بھر میں جہاں حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے وہاں مختلف ممالک کے دینی حلقوں اور اسلامی تحریکات میں توقعات اور امیدوں کی ایک نئی لہر بھی ابھری ہے۔ گذشتہ سال افغانستان پر امریکہ کے حملوں اور پاکستان میں طالبان کی حمایت کرنے والی دینی شخصیات اور کارکنوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکات کے خلاف کریک ڈاؤن سے مایوسی اور اضطراب کی جو صورتحال پیدا ہوگئی تھی اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی سے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو حوصلہ ملا ہے، مجھے اس سلسلہ میں لندن میں جن شخصیات سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا ان کے تاثرات پیش خدمت ہیں۔

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا شمار بھارت کے ممتاز علمی شخصیات میں ہوتا ہے، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند ہیں، ایک مدت سے ماہنامہ الفرقان لکھنو کے ایڈیٹر ہیں، صاحب فکر و دانش ہیں کافی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں، ان سے ہر سال لندن میں حاضری پر ملاقات کا موقع ملتا ہے، اس دفعہ ملاقات ہوئی تو دریافت کیا کہ انہوں نے ”الفرقان“ میں جو تفصیلی مضمون لکھا ہے وہ میری نظر سے گزرا ہے یا نہیں؟ یہ مضمون ”الفرقان“ کے اداریے کے طور پر دو قسطوں میں چند ماہ قبل شائع ہوا تھا، میں نے اس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن دیکھ نہیں پایا تھا، اس میں انہوں نے طالبان کی پالیسیوں اور سیاسی و فکری طرز عمل پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس حسرت کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی صورت میں ایک مثالی اسلامی ریاست و حکومت کا جو خواب دنیا بھر کے مسلمانوں نے دیکھا تھا وہ طالبان قیادت کے خلوص و دیانت اور سادگی و ایثار کے باوجود اس کی بعض مسائل میں غلط حکمت عملی کے باعث بکھر کر رہ گیا ہے۔ میں نے ان کے اس ارشاد کے بعد وہ مضمون دیکھا، مولانا سنبھلی کا خیال تھا کہ میں ان کے مضمون پر سخت ردعمل کا اظہار کروں گا مگر میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کے موقف سے نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اتفاق ہے بلکہ میں ان کے مضمون کو ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ میں شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔

مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو طالبان قیادت کو ”معصومیت“ کے مقام پر فائز کر کے ان کی حکمتِ عملی اور پالیسیوں سے اختلاف کو گناہ قرار دیے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اہل علم و دانش کو طالبان حکومت کے پانچ سالہ دور کا پوری تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے اور خالصتاً علمی اور فکری بنیادوں پر جہاں انہیں کوئی جھول اور غلطی

محسوس ہو اس کی صاف طور پر نشاندہی کرنی چاہئے، کیونکہ طالبان اگر افغانستان کے اقتدار میں دوبارہ آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہے تو اصحاب علم و دانش کا یہ بحث و مباحثہ ان کے پیش نظر ہونا چاہئے اور اسے سامنے رکھ کر انہیں اپنی نئی حکمت عملی اور پالیسیاں ترتیب دینی چاہئیں۔

البتہ مولانا سنبھلی سے میں نے یہ گزارش کی کہ ان کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ "خواب بکھر گیا ہے" اور معاملہ ختم ہو گیا ہے کیونکہ ابھی بہت سے مراحل باقی ہیں، ابھی عشق کے اور بھی کئی امتحان انتظار میں ہیں، اور ستاروں سے آگے جہانوں کا سلسلہ ابھی بہت وسیع ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی طالبان نے ایک کروٹ لینی ہے اور جہاد افغانستان میں اسلام کی سربلندی کے جذبہ کے ساتھ حصہ لینے والے مجاہدین کی نئی صف بندی ہونی ہے، اس لیے موجودہ صورتحال کو حتمی تصور نہ کیا جائے اور اسے محمود غزنویؒ کے سومنات پر کئے جانے والے ان سولہ حملوں میں سمجھ لیا جائے جنہیں بعض لوگ ناکام حملے قرار دیتے ہیں لیکن میں انہیں سترہویں اور کامیاب حملے کی تمہید سمجھتا ہوں۔

متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی پر مولانا سنبھلی بہت خوش ہیں البتہ ان کی رائے یہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو اپنی تمام تر توجہ صوبہ سرحد کی حکومت پر مبذول رکھنی چاہئے اور وہاں حکومت کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے جو ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کیلئے بھی کشش کا باعث بن سکے اور آئندہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی ملک گیر کامیابی کا ذریعہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ المسعری سعودی عرب کے ان دانشوروں میں سے ہیں جو امریکی فوجوں کی خلیج میں آمد کے موقع پر شاہ فہد کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنے کے جرم میں زیر عتاب ہیں، وہ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، اس عرضداشت پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے، کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور یمن کے راستے لندن پہنچ کر سیاسی پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے خود میری تلاش میں تھے ایک روز میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی، انہوں نے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اسلامی قوتوں کی ایک اہم پیشرفت قرار دیا اور کہا کہ متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان میں امریکی مظالم کے ردعمل میں ملے ہیں اور پاکستان کے غیور مسلمانوں نے اپنے جذبات کا اچھے انداز میں اظہار کیا ہے، اب اس ووٹ بینک کو سنبھالنے اور اس میں اضافے کیلئے ٹھوس حکمت عملی کی ضرورت ہے اور متحدہ مجلس عمل کو اپنے کام کا دائرہ پھیلانے کے بجائے سرحد اور بلوچستان کو سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہیے۔ اگر صوبہ سرحد کی حکومت کی صورت میں ملک کے عوام کو یہ نظر آ گیا کہ یہ حکومت سابقہ حکومتوں سے مختلف ہے اور حکمرانی کی بجائے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے تو پنجاب اور سندھ کے لوگ بھی آئندہ سوچنے پر مجبور ہوں گے، لیکن اگر دوسرے صوبوں کی حکومتوں کی طرح صوبہ سرحد کی حکومت بھی روایتی ڈگر پر چلتی رہی اور لوگوں کو کوئی نمایاں عملی فرق دکھائی نہ دیا تو متحدہ مجلس عمل اپنے موجودہ ووٹ بینک کی حفاظت بھی نہیں کر سکے گی۔

ڈاکٹر المسعری نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور اسٹیبلشمنٹ اس کیلئے کئی حربے اختیار کرے گی جس میں فنڈ کی فراہمی میں رکاوٹیں بھی شامل ہیں، اس پر

قابو پانے کیلئے عوام کو ساتھ ملانا ہوگا اور امداد باہمی کو فروغ دے کر رفاہی اور سماجی کاموں کا دائرہ بڑھانا ہوگا۔ انہوں نے مثال دی کہ الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ نے پہلے مرحلہ میں بلدیاتی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اور لوکل حکومتیں بنائی تھیں، جنہیں ناکام بنانے کیلئے مرکزی حکومت نے ضروری فنڈز روک لیے، مگر اسلامک سالویشن فرنٹ نے اس کی پرواہ کئے بغیر عام لوگوں سے رضاکارانہ طور پر خدمات سرانجام دینے کی اپیل کی اور فرنٹ کی قیادت خود بھی خدمت گزاروں میں شامل ہوگئی، مقامی حکومتوں کے ذمہ دار حضرات عام لوگوں کے ساتھ مل کر گلیوں کی صفائی کرتے اور مختلف شعبوں میں رضاکارانہ خدمات سرانجام دیتے جس کے نتیجے میں انہیں مزید عوامی ہمدردی حاصل ہوئی اور قومی انتخابات میں بھی انہوں نے واضح اکثریت حاصل کرلی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مرحلہ میں ان کی واضح کامیابی کے بعد انتخابات کا دوسرا مرحلہ مغربی ملکوں کے دباؤ پر منسوخ کر دیا گیا اور پھر جبر کے ذریعے نہ صرف ان کا راستہ روک دیا گیا بلکہ الجزائر کو بھی خوفناک خانہ جنگی میں دھکیل دیا گیا۔

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور ڈاکٹر محمد المسعری جیسے ممتاز دانشوروں کے ان خیالات و تاثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے میں ایم ایم اے کی قیادت کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ معروضی سیاست اور روایتی طریق کار کی رو میں بہنے کی بجائے اسلامی نظام کے عملی تعارف اور عوامی ہمدردی کے حصول کیلئے اجتہادی اور انقلابی رویہ اختیار کریں گے تاکہ ان کی یہ کامیابی پاکستان کی قومی سیاست میں دینی حلقوں کی مزید پیشرفت کا ذریعہ بنے اور پاکستان کے عوام اسلامی نظام کے حوالے سے اپنے خوابوں کی عملی تعبیر دیکھ سکیں، آمین۔

متحدہ مجلس عمل سے ہماری توقعات

ماہنامہ یوتھ کانٹیکٹ گوجرانوالہ کے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو سے منتخب سوالات

سوال: پاکستان کے حالیہ عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: متحدہ مجلس عمل کو میرے خیال میں دو وجہ سے عوام میں پذیرائی ملی۔ ایک ان کے اتحاد کی وجہ سے کہ پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی حلقوں اور مذہبی مکاتب فکر نے جب بھی متحد ہو کر کسی ملی کاز کیلئے قوم کو آواز دی ہے قوم نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ سال امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی کٹھ پتلی حکومت مسلط کرنے کیلئے جو قیامت ڈھائی ہے اور افغانستانی عوام کو جس شرمناک طریقے سے درندگی اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے، پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے الیکشن میں اس کے خلاف اپنی نفرت اور غصے کا بھرپور اظہار کر دیا ہے، اور اس کے ساتھ ان

عناصر کے اس منفی پراپیگنڈے کا عملی جواب بھی دیا جو اَب تک یہ کہتے آرہے تھے کہ پاکستان میں دینی جماعتوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس سے امریکہ اور اس کے سارے حواریوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے اور نوشتہ دیوار پڑھتے ہوئے اپنی پالیسیوں اور طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

سوال: متحدہ مجلس عمل سے آپ قومی سیاست کے حوالے سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں اقتدار کی کشمکش میں شریک نہیں ہونا چاہئے تھا اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہئے تھی۔ اس وقت ملک میں حقیقی جمہوریت اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ کیلئے سب سے نمایاں اور مضبوط آواز متحدہ مجلس عمل کی ہے، اس آواز کے ساتھ اقتدار اور وزارتوں کی خواہش کی آمیزش نہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ بہرحال پھر بھی غنیمت ہے کہ متحدہ مجلس عمل نے اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنے کا اعلان کیا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل کو اس اصولی موقف پر استقامت اور اس میں سرخروئی سے نوازیں۔ البتہ اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

1. وہ مرکز میں اقتدار کے کھیل سے کنارہ کش رہے اور اپوزیشن میں بیٹھ کر عوام کے جذبات کی ترجمانی کرے۔
2. صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت عوامی مسائل کے حل کے ساتھ اسلامی طرز حکومت کا ایسا نمونہ عملاً پیش کرے جو دوسرے صوبوں کیلئے مشعل راہ ہو، اور اگلے الیکشن میں دوسرے صوبوں کے عوام بھی متحدہ مجلس عمل کو موقع دینے پر مجبور ہو جائیں۔
3. متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان کے مظلوم عوام کے خون کی برکت سے ملے ہیں اور عالمی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کی وجہ سے ملے ہیں، اس حوالے سے مجلس عمل کے موقف اور عملی کردار میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں ہونی چاہئے۔
4. دینی مکاتب فکر کے اتحاد کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے، باہمی ایثار و اعتماد کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے، اور اس بات سے ہر وقت چوکنا رہا جائے کہ مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ کوشش یہی ہوگی کہ اس وحدت اور باہمی اعتماد میں کسی نہ کسی طرح دراڑیں ڈال دی جائیں۔
5. صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت ایک علمی کمیشن قائم کرے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات کو الگ کرے اور ان کے عملی نفاذ کیلئے طریق کار تجویز کرے۔
6. متحدہ مجلس عمل کے وزراء پروٹوکول اور پرسٹیج کے چکروں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سادگی، قناعت، اور کفایت شعاری کا نمونہ پیش کریں، اور اپنے عمل کے ساتھ واضح کریں کہ ایک اسلامی حکومت کے وزراء کس طرح کام کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا نظامِ حکومت اور جناب اسفند یار ولی

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۲ء

آن لائن کی ایک رپورٹ کے مطابق عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اسفند یار خان ولی نے عید الفطر کے موقع پر چارسدہ کی تاریخی مسجد غازی گل بابا میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے اگر صوبہ سرحد میں سنجیدگی کے ساتھ شریعت نافذ کرنے کی طرف توجہ دی تو صوبائی اسمبلی میں اے این پی کے ۱۰ ارکان کی حمایت بھی اسے حاصل ہوگی، لیکن شریعت کے نفاذ سے ان کی مراد حضرت عمرؓ کی حکومت کا نظام ہے۔

حضرت عمرؓ کے نظام حکومت کو اپنانے میں پہلی بڑی رکاوٹ آج کا مروجہ عالمی نظام اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ ہے جس کیلئے سود اور استحصال سے پاک اور خالص مذہبی تعلیمات پر مبنی نظام حکومت کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے جب بھی اور جہاں بھی حضرت عمرؓ والا نظام حکومت نافذ ہونا شروع ہوگا اور اسفند یار ولی کے بقول اس میں سنجیدگی بھی ہوگی تو اس کے خلاف ورلڈ سسٹم فوراً حرکت میں آئے گا۔ اس صورت میں حضرت عمرؓ والے نظام کی حمایت کرنے کا مطلب آج کے ورلڈ سسٹم اور اس کے لیڈر امریکہ بہادر کی دشمنی مول لینا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسفند یار خان ولی اور ان کے ۱۰ ارکان اسمبلی اس بات کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرلیں گے؟

حضرت عمرؓ والے نظام حکومت کے نفاذ میں دوسری بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ظاہری نقشہ تو وہی بنے گا جو افغانستان کی طالبان حکومت کا تھا کہ امیر المؤمنین کے ہاتھ میں کوڑا ہوگا جو نماز نہ پڑھنے والوں پر بھی برسے گا اور پردہ نہ کرنے والی خواتین بھی اس سے محفوظ نہیں ہوں گی۔ ایسا ہوا تو پھر بہت سے دوستوں کو اور خود اسفند یار خان ولی کو شکایت ہوگی کہ ڈنڈے کے زور پر اسلام نافذ کیا جارہا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا تعارف ان کے کوڑے کے بغیر اسی طرح نامکمل رہتا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کا تعارف ان کے عصا کے بغیر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت عمرؓ ہوں گے تو کوڑا بھی ہوگا، اور کوڑا ہوگا تو برسے گا بھی، اور اس کا برسنا بھی نمائشی نہیں بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ہوگا۔ اس لیے اسفند یار ولی اور اس کے ۱۰ ارکان اسمبلی حضرت عمرؓ والے اسلام کا مطالبہ کرنے سے قبل ان دو الجھنوں کا کوئی حل سوچ لیں کیونکہ یہ دونوں الجھنیں سب سے زیادہ انہی کو پیش آئیں گی۔

متحدہ مجلس عمل نے تو نہ اس سے قبل ایسی الجھنوں کو اپنے ذہن میں زیادہ جگہ دی ہے اور نہ ہی اب اس قسم کی الجھنیں اور رکاوٹیں اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکیں گی۔ متحدہ مجلس عمل کی مرکزی قیادت اور صوبہ سرحد میں اکرم درانی اور ان کی ٹیم کے بارے میں ہماری توقعات تو یہی ہیں، باقی اندر کی بات خدا جانتا ہے۔ خدا کرے کہ اکرم درانی اور ان کے رفقاء اپنی پالیسیوں اور ترجیحات کا کوئی ایسا ''سیٹ اپ'' قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں کہ ۱۹۷۲ء کی طرح ۲۰۰۳ء میں بھی خان عبد الغفار خان مرحوم کے سیاسی پیروکار جمعیت علماء اسلام کی قیادت قبول کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہوئے تاریخ کو ایک بار پھر دہرا دیں، آمین یارب العالمین۔

اسامہ بن لادن اور یاسر عرفات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ دسمبر ۲۰۰۲ء

اے ایف پی کے مطابق فلسطینی لیڈر یاسر عرفات نے ''سنڈے ٹائمز'' کو انٹرویو دیتے ہوئے عرب مجاہد اسامہ بن لادن سے کہا ہے کہ وہ فلسطین کا نام استعمال نہ کریں۔ یاسر عرفات فلسطینی لیڈر ہیں اور اسامہ بن لادن کا تعلق سعودی عرب سے ہے، دونوں اپنے اپنے دعویٰ کے مطابق عرب کاز کیلئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یاسر عرفات کی جدوجہد کا ہدف آزاد فلسطینی ریاست کا قیام ہے اور اسامہ بن لادن کا ٹارگٹ یہ ہے کہ امریکی فوجیں خلیج عرب سے نکل جائیں تاکہ عرب ممالک کی خود مختاری بحال ہو۔

یاسر عرفات ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عرب ممالک کی شکست کے ردعمل میں ایک قوم پرست فلسطینی لیڈر کے طور پر منظر عام پر آئے، اس جنگ میں اسرائیل نے مصر کے صحرائے سینا، شام کی گولان پہاڑیوں، اور اردن کے شہر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا اور فلسطین کا بہت سا علاقہ اس کے تسلط میں آگیا تھا۔ عالمی برادری اور اقوامِ متحدہ نے ان علاقوں پر اسرائیل کے قبضہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس سے مقبوضہ علاقے خالی کرنے کا مطالبہ کر رکھا ہے جسے آج تک اسرائیل نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ مصر نے چند سال قبل ایک اور جنگ میں سویز اور سینا کے علاقے اسرائیل سے واپس لے لیے تھے جبکہ فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کو اپنا حق سمجھتے ہوئے انہیں خالی کرنے سے اسرائیل صاف انکاری ہے۔ اس ظلم و جبر اور بربریت و درندگی کے جواب میں فلسطینی علاقوں کی آزادی کیلئے مختلف مزاحمتی گروپ سامنے آئے جنہوں نے اسرائیلی قبضے کے خلاف مسلح جدوجہد کا اعلان کیا۔ ان میں یاسر عرفات کا گروپ بھی تھا۔ بعد ازاں یہ گروپ یکجا ہوئے اور یاسر عرفات کو تمام فلسطینی گروپوں کا مشترکہ لیڈر چن لیا گیا۔

یاسر عرفات کا ذاتی تشخص ایک قوم پرست فلسطینی لیڈر کا تھا اور عالمی سیاست میں وہ امریکی کیمپ کے بجائے روسی کیمپ کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے عالمی کشمکش اور سرد جنگ کے حوالے سے اہم مسائل میں اپنا وزن ہمیشہ روسی پلڑے میں ڈالا، حتیٰ کہ مسئلہ کشمیر اور افغانستان پر روسی جارحیت کے معاملے میں بھی انہوں نے کشمیری عوام اور افغان مسلمانوں کے حق میں کلمہ خیر کہنے کی بجائے روس بھارت گٹھ جوڑ کی حوصلہ افزائی اور حمایت کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔

یاسر عرفات ایک دور میں ہتھیار بکف عسکری لیڈر رہے تھے، مسلح جدوجہد کے ذریعے اسرائیل پر دباؤ ڈالنا ان کی پالیسی تھی، اور چھاپہ مار کارروائیوں، طیاروں کا اغوا اور بندوق کی نالی کے ذریعے بات کرنا ان کا طریق کار تھا۔ وہ امریکہ مخالف لیڈر رہے تھے، امریکہ میں ان کا داخلہ بند تھا جہاں انہیں ایک دہشت گرد لیڈر کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ پھر انہوں نے کیمپ تبدیل کیا اور امریکہ کے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ تب سے امریکہ ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کھیل میں یاسر عرفات کا کردار حسب منشا نہ پاتے ہوئے اب امریکہ انہیں فلسطین کی قیادت سے الگ کر کے ان کی جگہ اپنی مرضی کی قیادت مسلط کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ آزاد فلسطینی ریاست

بنوانے کیلئے تیار ہے لیکن اس کا نقشہ وہ ہوگا جو امریکہ طے کرے گا، جس میں بیت المقدس فلسطین کا حصہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ اسرائیل کے ساتھ وعدہ کر چکا ہے۔ اس لیے یاسر عرفات اور دیگر عرب لیڈروں کا یہ مطالبہ ماننے کیلئے امریکہ کسی صورت آمادہ نہیں ہے کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ انہیں خالی کر کے اس جنگ سے پہلے پوزیشن پر واپس چلا جائے۔

گذشتہ سال سعودی عرب نے یہ فارمولا پیش کیا تھا کہ اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلا جائے تو عرب ممالک فلسطین کی تقسیم کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس منصوبے کو عرب لیگ نے بھی تمام عرب ممالک کے متفقہ موقف کے طور پر قبول کر لیا تھا، جبکہ اس سے قبل سعودی عرب سمیت اکثر عرب ممالک فلسطین کی تقسیم کو مسترد کرتے ہوئے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کرتے چلے آرہے تھے، لیکن اپنے سابقہ موقف سے عرب ملکوں کی یہ پسپائی بھی کسی کام نہیں آئی اور نہ صرف یہ کہ اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا ہے بلکہ امریکہ نے بھی سرکاری دستاویزات میں بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دے کر اسرائیل کے موقف کی عملی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔

فلسطینی لیڈر یاسر عرفات کی رہی سہی امید یورپی یونین سے تھی کہ وہ شاید اپنے مفادات کیلئے امریکہ سے قدرے مختلف موقف اختیار کر لے۔ لیکن برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے شام کے صدر بشار الاسد کے دورہ لندن کے موقع پر یہ کہہ کر بات صاف کر دی ہے کہ فلسطینی ریاست کا وہ نقشہ جو امریکہ دے رہا ہے اس کو قبول کرنے سے ہی بات بنے گی، اس کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ٹونی بلیئر نے اگلے ماہ لندن میں مشرق وسطی کے حوالے سے بین الاقوامی امن کانفرنس طلب کر لی ہے جس میں شرکت کی دعوت یاسر عرفات نے قبول کر لی ہے۔ چنانچہ بشار الاسد کا دورہ لندن اور یاسر عرفات کی طرف سے لندن کی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کا اعلان اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ امریکہ فلسطین کی اپنی مرضی کے مطابق تقسیم کے ایجنڈے کو ان دونوں لیڈروں سے قبول کرانے میں بھی بالآخر کامیاب ہو جائے گا۔

دوسری طرف اسامہ بن لادن کا تعلق سعودی عرب کی متمول بن لادن فیملی سے ہے۔ وہ افغانستان پر روس کی فوج کشی کے خلاف افغان عوام کی مسلح مزاحمتی جدوجہد کے دوران سامنے آئے۔ انہوں نے افغان جہاد میں عملی حصہ لیا، افغان مجاہدین کو مالی طور پر سپورٹ کیا اور الشیخ عبداللہ عزامؒ کے ساتھ مل کر ہزاروں عرب نوجوانوں کو اس کام کیلئے تیار کیا کہ وہ افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد میں شریک ہوں، اور اس کے ساتھ بھرپور عسکری ٹریننگ بھی حاصل کریں تاکہ وہ مشرق وسطی میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف جہاد کو منظم کر سکیں۔ انہیں اس دوران روس کے خلاف مسلح جنگ کیلئے امریکہ کی حمایت حاصل تھی اور ان کی تربیت و ٹریننگ میں سب سے زیادہ امریکی اداروں کا حصہ ہے۔ لیکن افغان جہاد کے بعد جب انہوں نے مشرق وسطی میں اسرائیل کی مسلسل جارحیت اور امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فلسطینی عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کیلئے آواز بلند کی تو روس کے خلاف جہاد کرنے والا یہ مجاہد یکلخت امریکی دوستوں کے کیمپ سے نکل کر دہشت گردی کے الزام کا مستحق قرار پا گیا اور آج امریکہ اسے دنیا میں اپنا دشمن

نمبر ایک قرار دے رہا ہے۔

اسامہ بن لادن کا قصور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ صرف عرب عوام اور ملکوں کی بات نہیں کرتا بلکہ کشمیر کی بات بھی کرتا ہے، چیچنیا کا ذکر بھی اس کی زبان پر ہوتا ہے، وہ مسجد اقصیٰ کی آزادی کا نعرہ بھی لگاتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی مظلوم مسلمان ظالموں کے خلاف نبرد آزما ہے وہ اس کی حمایت کرتا ہے۔

اس طرح یاسر عرفات اور اسامہ بن لادن ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ یاسر عرفات نے امریکہ دشمنی کا کیمپ چھوڑ کر امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کر رکھی ہے اور ہتھیار پھینک کر مذاکرات کا کشکول گلے میں لٹکا لیا ہے۔ جبکہ اسامہ بن لادن امریکی کیمپ سے نکل کر اس کے مخالف کیمپ کا لیڈر بن گیا ہے مگر یاسر عرفات کی طرح ہتھیار ڈالنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں یاسر عرفات کی طرف سے اسامہ بن لادن کو فلسطین کا نام استعمال نہ کرنے کی تلقین کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ یاسر عرفات اور ان کے ہمنوا عرب لیڈر امریکہ کے ساتھ جو معاملات طے کرنے جا رہے ہیں، اسامہ بن لادن اس میں کباب میں ہڈی بن سکتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے فلسطین، فلسطینی عوام اور بیت المقدس کا حسب منشا سودا طے کرنے کی بات بنتی نظر نہیں آ رہی۔ یہ بات درست ہے کہ اسامہ بن لادن یاسر عرفات اور دیگر عرب لیڈروں کے عزائم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، لیکن جناب یاسر عرفات کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جن جانباز اور سرفروش فلسطینی حریت پسندوں کی عسکری جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کی قیمت پر ان کی لیڈری ابھی تک قائم ہے اور جن مجاہدین کے خون کی برکت سے انہیں مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کا موقع مل رہا ہے، وہ مجاہدین اور ان کا جہاد حریت پسند اسامہ بن لادن کی جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر ہے۔ فلسطینی حریت پسندوں کی موجودہ جدوجہد کے پس منظر سے شہید عبد اللہ عزامؒ اور اسامہ بن لادن کا نام ہٹا دیا جائے تو اس کے دامن میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

خلافتِ اسلامیہ کا اِحیا: روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کا خوف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۳ء

آن لائن کی ایک رپورٹ کے مطابق روس کے صدر ولادی میر پیوٹن نے ایک قومی ٹیلیویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے اسلامی تحریکات کو ایک بار پھر ہدفِ تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ وہ مختلف ممالک میں دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ صدر پیوٹن نے اپنے انٹرویو میں اس خدشہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ اسلامی شدت پسند دنیا میں اسلامی خلافت لانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں اسلامی تحریکات کے خلاف روس، امریکہ اور ان کے دیگر اتحادیوں کے غیظ و غضب کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مغرب نے اب سے پون صدی قبل جس خلافت کو صدیوں کی مسلسل سازشوں کے بعد ختم کر دیا تھا، اور اپنے زعم میں یہ خیال کر لیا تھا کہ اب دنیا میں کہیں بھی کوئی ریاست اسلام کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی، ان کا یہ

اندازہ بلکہ پروگرام غلط ثابت ہوا ہے۔ اور صرف پون صدی کے بعد پورے عالمِ اسلام میں نہ صرف جہاد کے جذبات اور جدوجہد از سرنو منظم ہوگئی ہے بلکہ مختلف ممالک میں خلافتِ اسلامی کے دوبارہ احیا کی تحریکات بھی فطری انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں۔

اس لیے صدر پیوٹن کا یہ خوف بجا ہے لیکن ہم ان سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ اس پر اس قدر سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ

- اسلامی احکام کی رو سے خلافت کا نظام قائم کرنا مسلمانوں کے دینی فرائض میں شامل ہے، کیونکہ اگر دنیا کے کسی خطے میں خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو شرعی احکام کی رو سے دنیا بھر کے مسلمان ایک دینی فریضہ کے تارک اور گنہگار قرار پاتے ہیں۔ امام ولی اللہ دہلویؒ اور دیگر فقہاء کرامؒ کی تصریحات کے مطابق خلافت کا قیام دینی فریضہ ہے اور اس کی حیثیت ملتِ اسلامیہ کیلئے فرضِ کفایہ کی ہے، کہ کسی خطہ میں اسلامی خلافت کا نظام قائم ہو جائے تو دنیا بھر کے سب مسلمانوں کی طرف سے فرض ادا ہو جائے گا، لیکن اگر کہیں بھی اسلامی خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو دنیا بھر کے تمام مسلمان بلاامتیاز اس شرعی فریضہ کے تارک اور گنہگار ہیں۔
- پھر اسلامی تحریکات خلافت کا نظام روس اور امریکہ کی سرزمین پر قائم کرنے کا نعرہ نہیں لگا رہیں کہ پیوٹن اور ان کے دیگر ہمنواؤں کو واویلا کرنے کی ضرورت پیش آئے، بلکہ مسلمان صرف اپنے ملکوں میں نفاذِ اسلام کی بات کرتے ہیں، اور اس سرزمین پر نظامِ خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے پاس ہے اور جس میں وہ اکثریت کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس طرح خلافت کا قیام مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا حق بھی ہے کہ وہ اپنی سرزمین اور اپنی سوسائٹی میں جس طرح کا نظام وہ چاہیں قائم کر سکتے ہیں۔ اس لیے روسی صدر کا یہ کہنا کہ اسلامی تحریکات دنیا میں خلافت کا نظام لانا چاہتی ہیں، خلافِ واقعہ تو نہیں، لیکن مسلمانوں کے مذہبی فرائض اور ملی حقوق میں ناروا مداخلت کی حیثیت ضرور رکھتا ہے، اور اسلام کے خلاف مغربی لیڈروں کی معاندانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۳ء

کالعدم جیش محمدؐ کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کے خلاف حکومت عدالت عالیہ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی اور لاہور ہائیکورٹ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا ہے لیکن امریکی دباؤ اور بھارت کا واویلا عدالت عالیہ کے فیصلے پر غالب آگیا اور حکومت نے انہیں رہا کرنے کی بجائے ان کی دوبارہ گرفتاری کے احکام جاری کر دیے ہیں۔ مولانا مسعود اظہر کو افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پاکستان میں اس کے خلاف ردعمل کی عوامی تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا اور اس وقت سے وہ مسلسل زیرِ حراست ہیں۔ اس ''جرم'' میں ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمن، قاضی حسین

احمد، مولانا اعظم طارق اور پروفیسر حافظ محمد سعید بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن وہ سب باری باری رہا ہو چکے ہیں مگر مولانا مسعود اظہر کی رہائی کیلئے حکومت خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں پا رہی یا امریکہ اور بھارت کا دباؤ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے عدالت عالیہ کے حکم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

بہرحال جو صورت بھی ہو مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری قابل مذمت ہے، حکومت سے ہماری گزارش ہے کہ وہ قومی خود مختاری، ملی حمیت اور عوامی جذبات کے حوالے سے اپنے طرز عمل کا از سر نو جائزہ لے اور امریکہ اور بھارت کی تابعداری میں اس حد تک آگے نہ جائے کہ ملی حمیت اور قومی غیرت کا ہر دائرہ امریکی عزائم اور بھارتی دھمکیوں کے ہاتھوں پامال ہوتا چلا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ دیگر راہنماؤں کی طرح مولانا محمد مسعود اظہر کو بھی رہا کر دے اور بھارتی دھمکیوں کے آگے سیر انداز ہونے کی بجائے قومی حمیت کا مظاہرہ کرے۔

امریکی یلغار۔ سرحد اسمبلی کی قراردادیں

روزنامہ اسلام، لاہور--- یکم جنوری ۲۰۰۳ء

سرحد اسمبلی کی دوسری قرارداد جنوبی وزیرستان پر مبینہ امریکی بمباری کے بارے میں ہے اور اسے پاکستان کی خود مختاری کی سنگین خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے کہ یہ ملک کی آزادی، سلامتی اور خود مختاری کا مسئلہ ہے اس پر امریکہ سے شدید احتجاج کیا جائے اور اس کی روک تھام کیلئے ٹھوس حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

اس کے جواب میں امریکی افواج کے اس حالیہ وضاحتی بیان سے صورتحال کی سنگینی میں اور اضافہ ہو گیا ہے کہ ہم اپنی کاروائی جاری رکھیں گے، ہمیں اس میں یہ آزادی حاصل ہے کہ ہم جس جگہ کو منتخب کریں وہاں کاروائی کریں اور یہ پاکستان کی حکومت کی مرضی سے ہوگا۔ وضاحتی بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ افغانستان سے ملحق پاکستانی صوبہ سرحد، جس میں امریکہ مخالف مسلمان جماعتوں کی حکومت ہے، اس نے واقعہ کو زبردستی اچھالا ہے، جو چودہ ماہ قبل افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکی جنگ کے منافی ہے۔

امریکی افواج کی اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ امریکہ کو پاکستان کی سالمیت، خود مختاری اور آزادی کی کوئی پرواہ نہیں، اس سلسلہ میں بین الاقوامی قوانین اور اصول و ضوابط کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت نے امریکی طرز عمل اور اقدامات کے خلاف حالیہ الیکشن میں جس کھلی نفرت کا اظہار کیا ہے وہ اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کیلئے تیار نہیں ہے، نیز اس وضاحتی بیان کے مندرجات کی رو سے اسے اس ساری صورتحال میں پاکستان کی وفاقی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

ایک قرارداد میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ حالیہ افغان لڑائی میں پاکستان کے جتنے مجاہدین امریکہ کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار کیے گئے ہیں انہیں جیلوں سے آزاد کیا جائے۔

ہم سرحد اسمبلی کی مذکورہ بالا قراردادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور انہیں ملی حمیت اور قومی غیرت کے اظہار کی علامت قرار دیتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کی قیادت اور صوبہ سرحد کی حکومت کے سربراہ جناب محمد اکرم خان درانی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قراردادوں کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے منشور اور عوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے کرنے کیلئے سنجیدہ عملی اقدامات کی طرف بھی توجہ دیں گے۔

متحدہ مجلسِ عمل کی خدمت میں!

فروری ۲۰۰۳ء کے آغاز میں مجلسِ فکر و نظر کے زیر اہتمام ہمدرد سنٹر، لٹن روڈ، لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب

آخر میں صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے حوالے سے بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کی دینی تحریکات اور دینی کارکنوں کی نظریں ان پر لگی ہوئی ہیں اور افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے جبری خاتمہ نے دنیا بھر کے دینی کارکنوں کے دلوں پر جو زخم لگائے ہیں، وہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اپنے زخموں پر مرہم کی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر کم از کم چھ مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مبارک باد دیتے ہوئے اپنے جذبہ اور خلوص کے مطابق صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی متوقع حکومت کو کامیاب بنانے کیلئے بہت سے مشورے دیے۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ شاید متحدہ مجلس عمل میں مجھے بھی ایسی حیثیت حاصل ہے کہ میں اس کی قیادت کو پالیسی اور ترجیحات کے معاملہ میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مجھے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے جبکہ میں اس بات پر خوش تھا کہ متحدہ مجلس عمل کو صرف پاکستان کے دین دار عوام ہی نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے مسلمان دانش ور بھی اپنی جماعت سمجھ رہے ہیں اور اس سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان سب دوستوں کے مشوروں کا خلاصہ یہ تھا کہ:

- متحدہ مجلس عمل کو صوبہ سرحد میں ایک مثالی عوامی اور اسلامی حکومت کا عملی نقشہ پیش کرنا چاہیے۔
- عوامی مسائل کے حل اور مشکلات کے خاتمہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔
- سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کی فراہمی کو اولیت دینی چاہیے۔
- پروٹوکول، پرسٹیج اور وی آئی پی کلچر کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلانا چاہیے۔
- صوبائی وزراء کو قناعت، سادگی اور قانون کی یکساں عملداری کا اپنی ذاتی زندگی میں نمونہ بننا چاہیے۔
- ناانصافی، رشوت، بدعنوانی اور سرخ فیتہ کی لعنت کے خاتمہ کیلئے سنجیدہ اقدامات کرنے چاہئیں۔

- عام لوگوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سماجی کاموں کا شعور بیدار کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے دوسرے صوبوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے وزرا سے متحدہ مجلس عمل کے وزرا کو الگ اور ممتاز نظر آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے صوبہ میں عوام کو عدل و انصاف کا صحیح ماحول فراہم کر سکیں بلکہ ان کا کردار اور حکومتی طرز عمل ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کیلئے بھی باعث کشش ہو اور پورے پاکستان کے عوام عملاً یہ محسوس کریں کہ ان کی فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل اسلامی نظام اور دینی قیادت ہی سے وابستہ ہے۔

ان مشوروں کے ساتھ میں اپنی طرف سے سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کیلئے ایک مشورہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی شکل میں موجود ہے۔ صرف آئین کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر صوبائی اختیارات کی حدود واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بعد صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو چھانٹ لیجیے اور متعلقہ ماہرین کی مشاورت سے ترجیحات طے کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعے ان کے بارے میں قانون سازی کا آغاز کر دیجیے کہ اس وقت آپ کے بس میں عملاً صرف یہی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب اپنے بس اور اختیار کا کام آپ کر گزریں گے تو اگلی پیش رفت کی راہیں بھی اللہ تعالیٰ ضرور کھول دیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مسلم دنیا اور جرمنی

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۹ فروری ۲۰۰۳ء

اس کے ساتھ ایک اور حقیقت کا اظہار بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ اپنے تاریخی پس منظر کے حوالے سے ہمارے نزدیک جرمنی دوسرے یورپی ممالک سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی ان استعماری یورپی ممالک کی دوڑ میں شریک نہیں تھا جنہوں نے اکثر مسلم ممالک کو گذشتہ دو صدیوں کے درمیان نوآبادی بنائے رکھا ہے۔ یورپ میں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی مہم میں بھی جرمنی کا وہ حصہ نہیں ہے جو برطانیہ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کا رہا ہے بلکہ پہلی جنگ عظیم میں خلافتِ عثمانیہ اور جرمنی آپس میں حلیف تھے۔ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور پروفیسر برکت اللہ بھوپالیؒ جیسے راہنماؤں کو جرمنی کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جس کی تفصیلات خود جرمنی کی وزارتِ خارجہ کے ایک افسر پروفیسر اولف شمل کی کتاب ''اعلانِ برلن'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ اور عالمِ اسلام کے دیگر کئی ممالک کی طرح جرمنی بھی یورپی استعماری قوتوں کا کشتہ ستم رہا ہے اور ''جہادِ افغانستان'' میں مسلم مجاہدین کی قربانیوں کے نتیجے میں جرمنی کو اتحاد نصیب ہوا ہے۔ اس لیے اگر اسلام اور مغرب کے درمیان ڈائیلاگ کی بات جرمنی کی طرف سے آئی ہے تو ہم دینی کارکنوں کیلئے زیادہ خوشی کی بات ہے لیکن یہ مکالمہ صحیح رخ پر ہونا چاہیے اور صحیح لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

افغان شہداء کے خون کا ثمرہ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۶ فروری ۲۰۰۳ء

ہم سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں امریکی جارحیت اور دہشت گردی کے بعد عالمِ اسلام کی دینی تحریکات نے مصلحتوں کی کچھ زیادہ ہی لمبی چادر تان رکھی ہے، اس لیے ان کے اس سکوت و جمود سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی جارحیت و درندگی کے خلاف عالمی رائے عامہ کے جذبات کو منظم کرنے کا کام بائیں بازو نے سنبھال لیا ہے۔ اور جس طرح اسلامی تحریکات کے ساتھ ہمیشہ سے ہو رہا ہے کہ قربانیاں وہ دیتی ہیں لیکن ان کی قربانیوں کو کیش کرانے کیلئے کوئی اور سامنے آجاتا ہے، اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ہمارے قائدین اس کی جو توجیہ بھی کریں اور جو بہانہ بھی تراشیں مگر یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے کہ دنیا میں امریکا مخالف جذبات کو منظم کرنے کا جو کام عالمِ اسلام کی دینی تحریکات کی اولین ذمہ داری تھی اسے دوسروں نے سنبھال لیا ہے۔ او آئی سی (مسلم سربراہ کانفرنس) کی جگہ غیر وابستہ تحریک سامنے آگئی ہے اور سٹریٹ پاور کی راہنمائی ان دانشوروں نے سنبھال لی ہے جو اس سے قبل بائیں بازو کے حوالے سے متحرک رہے ہیں اور اب پھر انہی نظریات و افکار کا پرچم اٹھائے میدان میں آگئے ہیں۔

اگر ہماری اس گزارش کو جسارت و گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو ہم یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ عالم اسلام کی دینی تحریکات موجودہ عالمی کشمکش میں فٹ بال بن کر رہ گئی ہیں۔ ان دینی تحریکات نے سوویت یونین کے خلاف جہاد میں سرگرم حصہ لیا اور لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر سوویت یونین کو نہ صرف افغانستان سے واپس جانے پر مجبور کیا بلکہ خود سوویت یونین بھی بکھر کر رہ گیا لیکن ان لاکھوں مجاہدین اور شہداء کے خود کو عالمی مارکیٹ میں کیش کس نے کرایا؟

1. اس خون کی قیمت امریکہ نے سرد جنگ میں فتح اور دنیا کا واحد عالمی لیڈر بن جانے کی صورت میں وصول کی۔
2. مشرقی یورپ کی ریاستوں نے اس خون کے صلے میں آزادی حاصل کی۔
3. اسی خون نے دیوار برلن توڑی اور جرمنی متحدہ ہوا۔
4. وسطی ایشیا کے مسلم ممالک اور بالٹک ریاستوں کو اس خون کے صدقے آزادی نصیب ہوئی۔
5. اور پاکستان کو اسی خون کے صلے میں مغربی سرحد کا استحکام حاصل ہوا۔

مگر جب انہی خون دینے والوں نے خود اپنے خون کو اپنی مرضی سے کیش کروانا چاہا تو یہ سب کے سب محسن کش اور احسان فراموش ان کے خلاف اکٹھے ہو گئے اور ان پر ڈیزی کٹر بموں کی بارش کر دی۔ اور آج وہی معاملہ دوسرے رخ سے درپیش ہے۔ آج امریکا کے خلاف محاذ ہے، خون دینے والے اور ہیں، قربانیوں کی بھینٹ اور لوگ چڑھ رہے ہیں، سینے اور لوگوں کے چھلنی ہو رہے ہیں، مگر ان کی نمائندگی اور سیاسی و اخلاقی سپورٹ کا پرچم دوسروں نے سنبھال لیا ہے۔ ہمیں یہ پرچم سنبھالنے والوں سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ ہمیں خوشی ہے کہ کوئی تو آگے آیا ہے، کسی نے تو ظلم و جبر اور دہشت گردی و درندگی کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور کسی کا ضمیر تو جاگا ہے۔ ہم ان مظاہروں کا خیر مقدم کرتے ہیں، غیر وابستہ

تحریک کی سربراہی کانفرنس کے اعلانات کا خیر مقدم کرتے ہیں، بلکہ ہم تو یورپی یونین کی ان کوششوں پر بھی یورپی لیڈروں کے شکر گزار ہیں جو وہ عراق پر امریکہ کے حملے کو روکنے کیلئے کر رہے ہیں۔

ہماری شکایت ان سے نہیں بلکہ ہم اپنی اس نا اہل، ناعاقبت اندیش اور مصلحت کوش سیاسی قیادت کا نوحہ پڑھ رہے ہیں جو اسلام کا نام لیتی ہے، اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کرتی ہے، اسلام کے نعرہ پر اقتدار کے ایوانوں تک بھی پہنچ جاتی ہے، اسلام کے حوالے سے سیاسی عزت و وقار کے مقامات طے کرتی ہے، مجاہدین کی خدمات اور قربانیوں کے تذکرے کرتی ہے، اور مسلم امہ کی رائے عامہ کی قیادت و رہنمائی کی بلا شرکت غیرے دعوے دار ہے، لیکن اقتدار یا اقتدار کے چانس کے لولی پاپ نے اسے اپنی اصل ذمہ داریوں سے بے پرواکر دیا ہے۔ اور امریکہ کے خلاف عالمی رائے عامہ کی راہنمائی وقیادت یا کم از کم اس میں شرکت کا چانس بھی ضائع کر دینے کے بعد اب بہانے تراش رہی ہے کہ حج کا موقع تھا اس لیے ہم یہ نہ کر سکے وہ نہ کر سکے اور اگر حج درمیان میں نہ آجاتا تو ہم یہ کر دیتے وہ کر دیتے۔

تاہم اس سناٹے میں وہ لوگ غنیمت ہیں جو لوگوں کو اس ظلم و درندگی کے خلاف ابھارنے اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کیلئے کسی نہ کسی سطح پر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ گذشتہ روز مجھے بورے والا کے پریس کلب میں ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا جس کا اہتمام مجلس احرار اسلام نے کیا تھا اور جس میں "امریکی جارحیت اور عالمِ اسلام" کے عنوان پر احرار رہنماؤں پروفیسر خالد شبیر احمد، سید کفیل شاہ بخاری، عبد اللطیف خالد چیمہ اور مولانا عبد النعیم نعمانی، جبکہ ان کے علاوہ جناب سیف اللہ ایڈووکیٹ اور چودھری مسعود احمد امیر جماعت اسلامی نے بھی خطاب کیا۔ سیمینار کی صدارت معروف عالم دین مولانا قاری طیب حنفی نے کی اور مجھے بھی اس میں کچھ معروضات پیش کرنے کیلئے کہا گیا۔ مقررین نے امریکہ کے عزائم اور دھمکیوں کی مذمت کرتے ہوئے اپنے جذبات پیش کیے، عراقی عوام کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کیا، مسلم حکمرانوں کی بے حسی اور بے بسی کا رونا رویا، اور اسلامی تحریکوں کی قیادتوں کی بے بصیرتی اور مصلحت کوشی کا ماتم کیا۔

یہ ایک چھوٹا سا پروگرام تھا مگر میرے نزدیک غنیمت تھا اور مجھے وہاں سٹیج پر بیٹھے ہوئے وہ چڑیا یاد آرہی تھی جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو ایک چڑیا اپنی چھوٹی سی چونچ میں پانی لا کر اس آگ پر ڈالتی تھی۔ وہ مسلسل اسی کام میں لگی رہی تو کسی نے پوچھا کہ کیا تمہارے اس عمل سے آگ بجھ جائے گی؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اس سے آگ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس سے میرا فرض تو ادا ہو جائے گا کہ جتنی چونچ مجھے میرے خدا نے دے رکھی ہے میں اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے استعمال کر رہی ہوں۔

سیمینار سے فارغ ہوئے تو ایک احرار خاندان کے فرزند محمد حنیف صوفی سے ملاقات ہوئی جو ہمارے معروف خطیب مولانا قاری عبد الحی عابد کے برادر نسبتی ہیں اور پنجابی کے اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے ہنگام رخصت اپنے کلام سے نوازا جس سے دل کو ڈھارس ہوئی کہ ابھی اس راکھ میں حرارت باقی ہے اور تپش محسوس ہوتی ہے، اس لیے اس راکھ کو ٹٹولتے رہو کہیں نہ کہیں سے کوئی چنگاری نکل ہی آئے گی۔ ان کا پیغام قارئین کی خدمت میں بھی پیش ہے۔

کنوں بولیے منہ نوں سیتی پھرنے آں
اپنا آپ وکاؤ کیتی پھرنے آں
جام شہادت پینا ساڈا شیوہ سی
اسی تے خورے کی شے پیتی پھرنے آں
اپنا قبلہ کعبہ چھڈ کے صوفی جی
اج فیر گوریاں پچھے نیتی پھرنے آں
آؤ ہاں اج یار بنائیے پتھر نوں
رل مل کے اج جو کاں لائیے پتھر نوں
دل ورگی کوئی چیز نئیں اس کول جدوں
کاہنوں دل دا حال سنائیے پتھر نوں
ایویں ناں توہین کرائیے شیشے دی
پتھر جئی کوئی چیز وکھائیے پتھر نوں

افغانستان کے بعد عراق

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ مارچ ۲۰۰۳ء

خدا خدا کر کے اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم کا بھی اجلاس ہوا ہے اور قطر کے دارالحکومت میں او آئی سی کے غیر معمولی اجلاس میں ۵۷ ملکوں کے نمائندوں نے مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے عراق پر امریکی حملے اور طاقت کے زور پر عراق کی حکومت کی تبدیلی کے پروگرام کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی ممالک عراق یا کسی بھی اسلامی ملک کی جغرافیائی سرحدوں اور سلامتی پر حملے میں شرکت سے باز رہیں۔ صدام حکومت کی تبدیلی کیلئے امریکی کوششوں کو مسترد کرتے ہوئے اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ ایسی کوئی بھی کوشش اور تبدیلی اندرونی معاملات میں مداخلت ہوگی جو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ مشترکہ اعلامیہ میں عالمی برادری پر زور دیا گیا ہے کہ مشرق وسطٰی کے بحران پر بھی توجہ دی جائے اور اسرائیل کے تباہ کن ہتھیاروں پر بھی غور کیا جائے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں عالمی برادری پر تمام بین الاقوامی تنازعات میں ایک جیسا معیار رکھنے پر زور دینا چاہیے۔

اسلامی سربراہ کانفرنس کے اجلاس کا ہمیں ایک مدت سے انتظار تھا اور پوری دنیائے اسلام ایک عرصہ سے اپنے حکمرانوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ کب مل بیٹھنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور کب موجودہ عالمی حالات اور مسلمانوں کے خلاف بڑھتی ہوئی استعماری یلغار کے ماحول میں اپنے موقف اور پروگرام کے تعین کیلئے جمع ہوں گے؟ ہمیں تو اس

اجلاس کا انتظار اب سے ڈیڑھ سال قبل تھا جب یہی امریکہ ایک اسلامی ملک ''امارتِ اسلامی افغانستان'' پر چڑھ دوڑا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، وہاں کی حکومت کو عوام سے پوچھے بغیر تبدیل کر دیا گیا تھا، افغانستان کی سالمیت، جغرافیائی سرحدوں اور اندرونی معاملات کو پامال کر دیا تھا، اور الزامات کی تحقیق و ثبوت کے تمام مسلمہ اصولوں اور معیار کو نظر انداز کرتے ہوئے بین الاقوامی تنازعات میں دوہرے معیار کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مسلم حکمران ایک اسلامی ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے احترام کے لیے، اس کی سالمیت کے تحفظ کیلئے اور اس کے اندرونی معاملات کو بیرونی دخل اندازی سے بچانے کیلئے کوئی کردار ادا کریں گے یا کم از کم آواز ہی بلند کریں گے۔

افغان عوام بھی اسی امید پر امریکی جارحیت کے سامنے ڈٹ گئے تھے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں، ان کے بھائی دنیا میں موجود ہیں اور زندہ ہیں، وہ انہیں دشمن کے ہاتھوں مرتا نہیں دیکھیں گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مسلم حکمرانوں نے آنکھیں بند کر لیں جبکہ عرب حکمرانوں نے اپنی آنکھوں پر عرب قومیت کی سیاہ عینک چڑھالی۔ بیشتر مسلم حکمران یہ کہہ کر امریکہ کے ساتھ اتحاد میں شریک ہوگئے کہ جن ''دہشت گردوں'' کو خود امریکہ نے ٹریننگ دی تھی اور جنہیں خود ان مسلم ممالک نے اسلحہ اور امداد فراہم کی تھی وہ اب چونکہ روس سے نمٹنے کے بعد امریکہ سے بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے ہیں اور ایک اسلامی ملک کو روس کی فوجی مداخلت سے نجات دلانے کے بعد بہت سے اسلامی ملکوں کو امریکہ کی فوجی مداخلت سے نجات دلانے کی باتیں انہوں نے شروع کر دی ہیں اس لیے وہ گردن زدنی ہوگئے ہیں، ان کا دنیا میں زندہ رہنے کا جواز باقی نہیں رہا، وہ دنیا کی ہر گالی اور ہر الزام کے مستحق قرار پا گئے ہیں اور وہ ان بنیادی انسانی حقوق کے استحقاق سے بھی محروم ہوگئے ہیں جو اقوامِ متحدہ کے منشور اور قراردادوں میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے امریکہ ان سے جو سلوک روا رکھے جائز ہے، جس طریقہ سے انہیں ذبح کرے اور جبر و تشدد کی جس سان پر انہیں چڑھادے بجا ہے۔

مسلم حکمرانوں نے طے کر لیا کہ ہم امریکہ کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے، اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اس کے کسی پروگرام کی مزاحمت نہیں کریں گے بلکہ اس کیلئے ہمارے کندھے حاضر ہوں گے اور ہم اپنے لاجسٹک وسائل اس کی خدمت میں پیش کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھیں گے۔ جبکہ عرب حکمرانوں نے صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ عرب سرزمین کا قصہ نہیں ہے، عجمیوں کی بات ہے، یہ افغان ہیں اور پشتو یا فارسی بولنے والے ہیں اس لیے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے، ہمیں صرف اتنی ضمانت دے دی جائے کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہیں ہوگا تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ دل و جان سے ساتھ دینے کو تیار ہوں گے۔ افغانستان پر امریکی حملہ کے دوران مسلم اور عرب حکمرانوں نے یہ سب کچھ کر دکھایا اور پھر اس پر خوشیاں منائیں کہ ہم نے ''دہشت گردی'' پر کاری ضرب لگادی ہے۔ ہماری زبانیں اب تک دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم اور کھلم کھلا فوجی جارحیت کی تائید و حمایت میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے سمجھا کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر ہم نے پاکستان کو بچالیا ہے اس لیے اب ہماری باری نہیں آئے گی، اور عرب حکمران مطمئن ہوگئے کہ ہم نے تو کسی عرب ملک پر حملہ نہ کرنے کی ضمانت پر دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم کا ساتھ دیا تھا اس لیے اب عرب ممالک ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوگئے ہیں، اب کسی عرب ملک کو امریکہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا اور

ہم نے افغان بھائیوں کی قربانی دے کر عرب ممالک کو بیرونی جارحیت اور مداخلت سے محفوظ کر لیا ہے۔

لیکن ابھی صرف ایک سال گزرا ہے کہ نیا منظر سامنے ہے۔ کہتے ہیں کہ جنگلی درندے کو انسان کا خون پینے کو مل جائے تو پھر اسے کسی اور جانور کے خون میں مزہ نہیں آتا اور وہ انسانی خون ہی کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ تو مسلمان کا خون ہے۔ اس لیے اب عراق اس کے پنجوں کی زد میں ہے اور پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کے اندر وہ اپنے شکار کی تلاش میں بلا روک ٹوک گھوم رہا ہے، نہ پاکستان کے داخلی معاملات کا احترام باقی رہا اور نہ ہی کسی عرب ملک کے تحفظ کی کوئی ضمانت موجود ہے۔ اور اب ہمارے حکمرانوں کو یاد آیا ہے کہ کسی ملک کی سالمیت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اس کی خود مختاری بھی کوئی مسئلہ ہے، اس کی حکومت کی تبدیلی کا بھی کوئی اصول ہونا چاہیے، بین الاقوامی تنازعات کا کوئی معیار بھی ہوتا ہے، کسی ملک پر دوسرے ملک کے حملہ سے کوئی بین الاقوامی ضابطہ اور قانون ٹوٹ بھی جایا کرتا ہے، اور کسی ملک کی سالمیت اور اندرونی خود مختاری کے تحفظ میں بین الاقوامی برادری کا بھی کوئی کردار ہوتا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مسلم حکمران بہت دیر سے سہی مگر کسی جگہ مل تو بیٹھے ہیں اور انہیں کچھ ضابطے اور اصول بھی یاد آگئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کا خاصا کردار ہے کہ وہ مغرب کے اس دوہرے معیار کے خلاف مسلسل آواز بلند کر رہے ہیں، اقوام و ممالک کی خود مختاری کے احترام کی طرف مسلسل توجہ دلا رہے ہیں اور ایک عرصہ سے مسلم حکمرانوں کو جھنجھوڑ رہے ہیں کہ وہ متحد ہو کر ایک موقف طے کریں اور اکیلے اکیلے مرنے کے بجائے مل جل کر عالمی استعمار کا پنجہ ڈھیلا کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے غیر وابستہ کانفرنس کا سربراہی اجلاس بلایا اور اسلامی سربراہ کانفرنس کا ایک ہنگامی اجلاس بھی منعقد کر ڈالا جس کے فیصلے کے مطابق قطر میں مذکورہ اجلاس ہوا ہے اور مسلم حکمرانوں نے یک آواز ہو کر امریکی عزائم اور پروگرام کے حوالے سے اپنے مشترکہ موقف کا کسی حد تک اظہار کر دیا ہے۔

ہم قطر کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے فیصلوں اور موقف کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے تمام تر تحفظات کے باوجود امید کی ایک کرن سمجھتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے مل بیٹھنے کی ضرورت تو محسوس کی اور کسی مشترکہ موقف کے تعین اور اظہار کا حوصلہ تو کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم مسلم حکمرانوں سے یہ گزارش ضروری سمجھتے ہیں کہ مغرب کو ملکوں کی سالمیت و خود مختاری کے احترام اور دوہرا معیار ترک کرنے کا جائزہ مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ خود اپنے متضاد موقف اور دوہرے معیار کا بھی جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور عراق کی خود مختاری، اندرونی معاملات اور سالمیت کے حوالے سے خود ان کے ضابطے اور معیار کہیں الگ الگ تو نہیں ہیں؟

اسامہ بن لادن اور امریکی تحریکِ آزادی کے جنگجو

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۱ مارچ ۲۰۰۳ء

ایک معاصر اخبار نے این این آئی کے حوالے سے یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکی کانگریس کی ایک خاتون رکن مارکی

کیپٹر Marcy Kaptur نے اسامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینے کے موقف سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ اسامہ بن لادن مذہبی طور پر آزادی کی جنگ لڑنے والے انقلابی رہنماؤں کی طرح ہیں جیسا کہ امریکہ میں ۱۷۷۰ء میں ورماؤنٹ ملیشیا نے برطانوی سامراج کے خلاف اسی طرح کی جدوجہد کی تھی۔ مارکی کیپٹر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اوہایو ڈسٹرکٹ سے گیارہویں بار کانگریس کی رکن منتخب ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب اور اسلامی دنیا کی ظالم حکومتوں کے خلاف بھی اسی طرح کی انقلابی تحریکیں شروع ہو چکی ہیں جس طرح کی تحریکیں برطانوی سامراج کے خلاف شروع ہوئی تھیں اور اس انقلاب کو دہشت گردی کا نام دینا قابل قبول نہیں ہے۔

ہم تو ابتداء سے ہی یہ عرض کر رہے ہیں کہ ''دہشت گردی'' کا عنوان صرف ان کارروائیوں کو جواز فراہم کرنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے جو عالم اسلام میں عالمی استعمار کے آہنی شکنجے کو توڑنے اور مسلم ممالک واقوام کی خود مختاری کی بحالی کیلئے اٹھنے والی تحریکوں کو کچلنے کیلئے کی جا رہی ہیں۔ اور جن کارروائیوں کا واحد مقصد عالم اسلام میں حریت فکر اور خود مختاری کے جذبات کو دبا کر عالمی استعمار کے شکنجے کو دوبارہ مستحکم کرنا ہے تاکہ استعماری قوتیں کسی رکاوٹ اور احتجاج کا سامنا کیے بغیر مسلم دنیا کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھ سکیں اور مسلم ممالک کی سیاست و معیشت پر ان کا کنٹرول بدستور قائم رہے۔

اسامہ بن لادن کی جدوجہد اور اس کے عزائم و مطالبات پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ طریقہ کار سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود یہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ یہ سب کچھ آخر کیوں کر رہا ہے اور اسے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اسامہ بن لادن سعودی عرب کے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے جس کی ولادت و پرورش شہزادوں کی طرح ہوئی ہے۔ لیکن اس نے افغانستان پر روس کے مسلح حملہ کے خلاف افغان عوام کی جدوجہد کا ساتھ دیا اور جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ اس نے نہ صرف خود جہاد میں عملاً حصہ لیا بلکہ ہزاروں مجاہدین کے اخراجات برداشت کیے اور مجاہدین کے مختلف گروپوں کی بے پناہ مالی امداد کی۔ اسے سوویت یونین کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کی حمایت حاصل تھی، مغربی اور مسلم ممالک بھی اس جدوجہد میں تعاون کر رہے تھے، اور اس کا تذکرہ عالمی میڈیا میں ایک مجاہد اور حریت پسند کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن سوویت یونین کی افغانستان سے پسپائی کے بعد جب اسامہ بن لادن نے سعودی عرب واپس جا کر خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی بلاجواز موجودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور سعودی عرب کے داخلی نظام میں اصلاحات کیلئے آواز اٹھائی تو وہ اچانک ''مجاہدِ آزادی'' کے تمغہ سے محروم ہو کر ''دہشت گرد'' ہونے کے الزام کا ہدف قرار پا گیا۔

اسامہ بن لادن کے دو ہی مطالبے تھے اور ہیں:

- ایک یہ کہ امریکہ اور اس کے اتحادی خلیج عرب سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔
- اور دوسرا یہ کہ سعودی عرب کے داخلی نظام میں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق اصلاحات کی جائیں۔

دنیا کا کوئی باشعور اور انصاف پسند شخص ان دو مطالبوں کی معقولیت سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہ بات پوری دنیا پر

واضح ہو چکی ہے کہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی افواج تیل کے چشموں پر قبضہ اور اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے براجمان ہیں۔ ان فوجوں کی خلیج عرب میں موجودگی اس خطہ کے بہت سے ملکوں کی خود مختاری کو مجروح کر رہی ہے اور عوام کی مرضی اور رائے کے خلاف شخصی آمریتوں کو تحفظ فراہم کرنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ خلیجی ممالک کے عوام کی اکثریت رائے کی آزادی، ووٹ کے حق، اور دیگر شہری و انسانی حقوق سے محروم ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی ہے۔

امریکہ نصف صدی قبل اقوامِ متحدہ کے قیام کے بعد سے دنیا بھر میں جن شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے اور اقوامِ متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر کا علمبردار بنا بیٹھا ہے، ان میں سے بیشتر حقوق خلیج عرب کے خطہ میں ایک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ صورتحال صرف اور صرف امریکی پالیسیوں، ترجیحات، اور اس کی افواج کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اسامہ بن لادن اگر خلیج عرب سے امریکی فوجیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ عرب عوام کے جائز حقوق کی بحالی کا مطالبہ ہے۔ لیکن امریکہ اور اس کے حواری اسامہ بن لادن کے اس جائز، اصولی اور منطقی مطالبے پر کان دھرنے کی بجائے مطالبہ کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دے کر دنیا کی توجہ عرب عوام کے جائز حقوق سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سعودی عرب کے داخلی نظام میں شریعت اسلامیہ کے مطابق اصلاحات کا مطالبہ بھی ناروا اور غیر معقول نہیں ہے اس لیے کہ خود سعودی حکومت اس بات کو کھلم کھلا تسلیم کرتی ہے کہ سعودی نظام کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ جبکہ سعودی حکومت کے سرکردہ علمائے کرام کو یہ شکایت ہے کہ تعلیم اور عدالت کے دائروں کے سوا ملک کے باقی قومی شعبوں میں گذشتہ ربع صدی کے دوران جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہیں۔ ان میں بہت سی اصلاحات و ترمیمات کی ضرورت ہے جنہیں سعودی عرب کے سابق چیف جسٹس الشیخ محمد بن ابراہیمؒ سعودی حکمرانوں کے نام اپنے خطوط میں واضح کر چکے ہیں، یہ خطوط ان کے فتاویٰ میں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ اور اب سے دس سال قبل سعودی عرب کے دو سو سے زائد سرکردہ علمائے کرام اور دانشور ایک ''عرضداشت'' کی صورت میں اس حوالے سے اپنے مطالبات تفصیل کے ساتھ سعودی فرمانروا کو پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ اسامہ بن لادن اگر وہی مطالبات دہرا کر سعودی عرب کے داخلی نظام میں شرعی اصلاحات کی بات کرتا ہے تو وہ کوئی ناجائز بات نہیں کرتا اور اس وجہ سے اسے گردن زنی کا مستحق قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

البتہ اپنے مطالبات کیلئے اسامہ بن لادن کے طریق کار پر گفتگو کی گنجائش موجود ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر اپنے ملک میں بلکہ پورے خطے میں سیاسی عمل اور رائے عامہ کے حوالے سے جدوجہد منظم کرنے کا کوئی راستہ موجود ہوتا اور اسامہ بن لادن اس محفوظ اور پرامن راستے کو ترک کر کے تشدد کا راستہ اختیار کرتا تو شاید ہم بھی اس کی جدوجہد کے طریق کار کو غلط قرار دینے والوں میں شامل ہوتے۔ کیونکہ ہم اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ دین یا سیاست میں کسی بھی حوالے سے اصلاح احوال کی جدوجہد کیلئے پرامن راستہ موجود ہو تو تشدد کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تشدد ایک آخری حربہ ہے جو مظلوم قومیں اور طبقات

اپنے وجود، تشخص، اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے امن کے سارے راستے مسدود ہو جانے پر مجبوراً اختیار کیا کرتے ہیں۔ اور اسے تمام اقوام و ممالک کے ہاں یکساں طور پر ایک جائز حق کی صورت میں مسلمہ اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ امریکی حریت پسندوں نے بھی اسی وجہ سے تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا اور آزادی کے حصول کیلئے ہتھیار اٹھائے تھے۔ اور اس بات کے ثبوت کیلئے مارکی کیپٹر کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے، خود امریکہ کی تحریک آزادی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آپ کو ایسے سینکڑوں اسامہ بن لادن نظر آئیں گے جنہوں نے برطانوی سامراج کے تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھائے، مسلح جنگ کی، شب خون مارے، ہزاروں متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگوں کا خون بہایا، خود اپنی جانوں کی قربانی پیش کی، اور آگ و خون کا ایک طویل صحرا عبور کر کے امریکہ کو آزادی اور خود مختاری کی منزل سے ہمکنار کیا۔

ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں بھی برطانوی سامراج کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلئے بیسیوں تحریکیں اٹھیں، شہدائے بالاکوٹ، مجاہدین ۱۸۵۷ء، علمائے صادق پور، سندھ کے حر مجاہدین، پنجاب کے سردار احمد خان کھرلؒ، صوبہ سرحد کے فقیر ایپیؒ، نواب صاحبؒ ترنگزئی، حاجی شریعت اللہؒ، تیتو میر شہیدؒ، اور امیر المجاہدین حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے سینکڑوں مجاہدین آزادی کے کارنامے ہماری ملی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں جن کا نام لے کر ہم سر فخر سے بلند کرنے کے قابل ٹھہرتے ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے دور کے اسامہ بن لادن ہی تھے۔ ان کی جدوجہد کا طریقہ کار اور اہداف بھی وہی تھے جو آج اسامہ بن لادن کا ہدف اور طریقہ کار ہے۔ اس لیے جب اسامہ بن لادن کو دہشت گرد کہا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے شہدائے بالاکوٹ سے لے کر فقیر ایپیؒ تک آزادی کے تمام مجاہدین کو دہشت گردوں کی لائن میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بلکہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف امریکہ کی آزادی کیلئے مسلح جنگ لڑنے والے وہ تمام حریت پسند بھی اسی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں جن کا محترمہ مارکی کیپٹر نے اپنے بیان میں تذکرہ کیا ہے۔

این این پی کی رپورٹ کے مطابق محترمہ مارکی کیپٹر کے اس بیان پر امریکی حلقوں میں خاصی لے دے ہو رہی ہے اور رپورٹ کے الفاظ میں امریکی حکومت میں کھلبلی سی مچی ہوئی ہے، بہت سے ارکان اس پر غم و غصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن ایوان کے اکثریتی لیڈر نے ارکان کو مشورہ دیا ہے کہ اس بیان کی مذمت نہ کی جائے اور اس معاملے کو احتیاط کے ساتھ دیکھا جائے کیونکہ یہ حساس معاملہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے اپنے سامراجی عزائم کو آگے بڑھانے کیلئے عالمی سطح پر یک طرفہ پروپیگنڈہ اور مسلم مجاہدین کی کردارکشی کی مہم کا جو تانا بانا تیار کر رکھا تھا، وہ بکھر رہا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ دنیا بھر کے عوام نے معاملات کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے، جیسا کہ گذشتہ ماہ دنیا کے سینکڑوں شہروں میں ہونے والے زبردست احتجاجی مظاہروں سے واضح ہو گیا ہے، بلکہ انصاف پسند امریکی راہنماؤں نے بھی امریکی حکومت کے موقف اور ڈکٹیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن انسانی ضمیر اور عالمی رائے عامہ کی یہ صدائے احتجاج بھی عراق کے خلاف امریکہ کے جنگی جنون کے اظہار میں رکاوٹ نہیں بن سکی۔ اس نے عراق پر حملہ کر دیا ہے اور اس کی توپیں، میزائل، اور بمبار طیارے عراقی عوام پر آتش و آہن کی بارش کر رہے ہیں۔ اب دنیا یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا خود امریکہ دہشت گردی کا مرتکب نہیں ہو رہا؟

ملتِ اسلامیہ کے بحران اور ہماری دینی قیادت

۳۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو مجلسِ احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کے شہداء کی یاد میں پیرجی سید عطاء المہیمن شاہ بخاری کی زیرصدارت منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج ہم ان عظیم شہداء ختم نبوت کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے جمع ہیں جنہوں نے ۱۹۵۳ء میں عقیدہ ختم نبوت اور ناموس رسالتؐ کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہوکر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور قادیانیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگادی۔ اس تحریک میں جس کی قیادت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ جیسے عظیم بزرگوں کے ہاتھ میں تھی، دینی جماعتوں کے دو بڑے مطالبات تھے۔

1. ایک یہ کہ قادیانیوں کو ملک میں دستوری حوالے سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے،
2. اور دوسرا یہ کہ قادیانی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے برطرف کیا جائے۔

چودھری ظفر اللہ خان قیامِ پاکستان کے بعد سے ملک کے وزیر خارجہ چلے آرہے تھے اور ان کی وجہ سے نہ صرف ملک کے اندر سرکاری طور پر قادیانیوں کا اثرورسوخ بڑھ رہا تھا بلکہ بیرون ملک بھی پاکستان کے سفارتخانے قادیانیت کی تبلیغ اور اثرونفوذ کے اڈے بنتے جارہے تھے۔ ملک کی دینی جماعتوں نے چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا لیکن ان کا مطالبہ منظور کرنے کی بجائے تحریک کے راہنماؤں اور کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد شہید ہوئے اور ہزاروں علماء کرام اور دینی کارکن جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے۔

میں اس حوالے سے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج جس خارجہ پالیسی نے پوری قوم کو بند گلی میں دھکیل دیا اور امریکی غلامی کے ریموٹ کنٹرول شکنجے میں اس بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ ہم بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ خارجہ پالیسی چودھری ظفر اللہ خان کی تشکیل کردہ ہے۔ اس قادیانی وزیر خارجہ نے پاکستان کو امریکہ نواز پالیسی کی پٹڑی پر چڑھایا اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک پانچ چھ سال کے عرصہ میں ملک کو امریکی مفادات کے چنگل میں اس قدر پھنسا دیا کہ ہم آج تک اس میں مزید آگے کی طرف دھنستے چلے جارہے ہیں اور ہمیں پیچھے ہٹنے بلکہ دائیں بائیں دیکھنے کا بھی کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ سارا کرشمہ چودھری ظفر اللہ خان کا ہے اور اس کی بوئی ہوئی فصل آج پوری قوم کو کاٹنی پڑ رہی ہے۔ دینی حلقوں نے تو پاکستان بننے کے بعد سے ہی اس پر واویلا مچانا شروع کردیا تھا لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی اور آج اس کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے۔

ہمارا المیہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ قومی وملی معاملات میں دینی قیادت کے موقف کو نظر انداز کیا ہے اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے طرزعمل میں کوئی تبدیلی ابھی تک دیکھنے میں نہیں آرہی۔ آج سے ایک صدی قبل جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کیلئے عرب ممالک میں عرب قومیت کے نام پر اور ترکی میں ترک نیشنلزم کے نام پر جذبات

کو ابھارا جا رہا تھا اور خلافت کو بے فائدہ قرار دے کر اسے ختم کرنے کی سازش کی جا رہی تھی، ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی شور مچایا تھا کہ خلافت کے خاتمہ کی یہ تحریک یہودیوں کی سازش ہے۔ بہت سے عرب علماء نے آواز اٹھائی اور ہمارے ہاں جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں زبردست عوامی تحریک خلافت بپا ہوئی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ خلافت کا تحفظ کیا جائے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کے اس ادارے کو بچایا جائے لیکن نہ ترکوں نے بات سنی اور نہ ہی عربوں نے اس آواز پر توجہ دی۔ حتیٰ کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کو تو شریف مکہ نے اسی جرم میں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کیا تھا کہ انہوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کے جواز کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس موقع پر جنوبی ایشیا کی دینی قیادت نے ایک اور آواز بھی اٹھائی کہ یہاں کے مسلمان برطانیہ کی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ متحدہ ہندوستان کے سینکڑوں علماء کرام نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا حرام ہے اس لیے کہ یہ فوج اسلام کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف اور خلافت عثمانیہ کے خلاف استعمال ہوگی۔ مگر اس فتویٰ پر کسی نے کان نہ دھرے، ہزاروں کی تعداد میں لوگ انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے اور پھر یہی فوجی مشرق وسطیٰ لے جائے گئے اور انہیں کے ہاتھوں ترک فوجیوں کو شکست دلوا کر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کی گئی۔ آج اگر خلافت کا فورم موجود ہوتا، خواہ کتنی ہی کمزور اور ڈھیلی ڈھالی خلافت ہوتی، مگر عالمی سطح پر اپنی بات کہنے کا کوئی فورم تو ہوتا اور حالات یقیناً اس مقام تک نہ پہنچتے جن کا ہم اب سامنا کر رہے ہیں۔

ہم اسی دور سے کہہ رہے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن آج اسرائیلی وزیر دفاع جنرل موفاذ نے کھلے بندوں یہ بات کہہ کر ہمارے موقف کی تصدیق کر دی ہے کہ ہمیں عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید دوم نے فلسطین میں آباد ہونے کیلئے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا اس کے نتیجے میں ہم نے نہ صرف اس کی حکومت ختم کرا دی بلکہ سرے سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کرا دیا۔ جنرل موفاذ نے ایک بات اور بھی کہی ہے کہ عراق پر اب ہمارا قبضہ ہوگا اور اسرائیل کے عزائم میں جو بھی رکاوٹ بنے گا اس کا یہی حشر ہوگا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل کے عزائم کیا ہیں اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عراق پر امریکہ اور برطانیہ کا حملہ دراصل اسرائیل کی توسیع اور "عظیم تر اسرائیل" کے قیام کے منصوبے کا حصہ ہے جس میں عراق، مصر، شام، لبنان اور دیگر علاقوں کے علاوہ مدینہ منورہ سمیت سعودی عرب کا بھی ایک بڑا علاقہ شامل ہے۔

دینی قیادت نے اس وقت بھی واویلا کیا تھا جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنر بٹھا دیا تھا اور دنیا بھر کے یہودیوں کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ فلسطین میں آکر آباد ہو سکتے ہیں اور زمین خرید کر کالونیاں بنا سکتے ہیں۔ اس وقت سرکردہ علماء کرام نے فتویٰ دیا تھا کہ یہودی چونکہ فلسطین میں آباد ہو کر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس پر قبضہ بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین کا بیچنا شرعاً جائز نہیں۔ یہ فتویٰ ہمارے بزرگوں نے بھی جاری کیا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتاویٰ موجود ہیں۔ اور حضرت تھانویؒ کا تفصیلی فتویٰ ان کی کتاب

"بوادر النوادر" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور فلسطینی اپنی زمینوں کو ڈیڑھ گنا اور دو گنا قیمت کی لالچ میں یہودیوں پر فروخت کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے کہ جن یہودیوں کا آج سے ایک صدی قبل فلسطین کی آبادی میں قابل ذکر حصہ نہ تھا، آج وہ وہاں نہ صرف قابض ہیں بلکہ پوری عرب دنیا کیلئے عذاب بنے ہوئے ہیں۔

حالیہ عالمی بحران کے آغاز میں بھی ہماری دینی قیادت نے امت کی بروقت رہنمائی کی کہ امریکی خواہشات اور عزائم کے سامنے گردن جھکانے اور ہاں میں ہاں ملاتے چلے جانے کی بجائے جرأت و حوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہماری بات پر بروقت توجہ نہ دی گئی اور آج وہی بات سب حضرات کہہ رہے ہیں۔ میں اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم (او آئی سی) نے آج جو موقف اختیار کیا ہے کہ عراق کی سرحدوں، ملکی سالمیت اور قومی وحدت کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائے گی، یہ موقف آج سے ڈیڑھ سال قبل افغانستان پر امریکہ کے حملہ سے پہلے اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور اس موقف کا صحیح وقت وہ تھا۔ کیونکہ افغانستان کی قومی وحدت اور سرحدوں کے تقاضے بھی اس نوعیت کے تھے لیکن ہم نے اس وقت جائز موقف اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح ہمارے عرب بھائیوں نے اس وقت یہ سوال کھڑا کر دیا کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہ کیا جائے لیکن صرف ایک سال کے بعد ایک عرب ملک پر نہ صرف حملہ ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ کئی عرب ممالک کی سرحدات اور قومی سلامتی بھی خطرات سے دوچار ہو گئی ہے۔ ہمارے خیال میں او آئی سی اور عرب لیگ نے آج جو موقف اختیار کیا ہے اور اس پر اسٹینڈ لیا ہے اس کا صحیح وقت افغانستان پر امریکہ کی یلغار سے قبل تھا۔ اب بھی غنیمت ہے کہ ہمارے مسلم اور عرب حکمرانوں نے کسی جگہ کھڑا ہونے کی ضرورت محسوس کی، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ موقف اگر افغانستان پر امریکی حملہ سے قبل اختیار کر لیا جاتا اور مسلم حکمران اس پر سنجیدگی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو نہ صرف افغانستان تباہی سے بچ سکتا تھا بلکہ عراق اور اس کے ساتھ دیگر کئی عرب ممالک کی تباہی کو بھی ٹالا جا سکتا تھا۔

بہرحال ان معروضات کا مقصد یہ ہے کہ ہماری دینی قیادت نے ہر دور میں اور ہر اہم مسئلہ پر امت کو حالات کی سنگینی سے خبردار کیا اور صحیح موقف کی طرف راہنمائی کی لیکن ہم نے قومی اور ملکی سطح پر کبھی اس کی بات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کے حالیہ بحران اور ملکی مسائل کے حوالے سے دینی قیادت کی آواز کو سنا جائے اور اسے سنجیدہ توجہ دی جائے کیونکہ ملی حمیت اور دینی غیرت کا تقاضا یہی ہے اور مشکلات و مصائب کی دلدل سے نکلنے کا راستہ بھی یہی ہے۔

اسامہ انقلابی راہنما ہیں:
امریکی کانگریس وومن مارکی کیپٹر

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۲۰۰۳ء

روزنامہ اسلام کراچی نے ۱۱ مارچ ۲۰۰۳ء کو این این آئی کے حوالے سے خبر دی ہے کہ امریکی کانگریس کی ایک خاتون رکن مسز مارکی کیپٹر Marcy Kaptur نے گذشتہ دنوں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہہ کر امریکی حلقوں میں کھلبلی مچادی ہے کہ اسامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ وہ ایک انقلابی راہنما ہیں جو اپنے ملک میں ظالم حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مسز مارکی کیپٹر کا کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن ان امریکی انقلابیوں سے مماثلت رکھتے ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ رپورٹ کے مطابق امریکی کانگریس کی یہ خاتون رکن ڈسٹرکٹ اوہایو سے گیارہویں دفعہ مسلسل کانگریس کی رکن منتخب ہوئی ہیں، اور ان کے اس بیان پر پارٹی کے حلقوں میں غم و غصہ پایا جاتا ہے، لیکن کانگریس کے اکثریتی لیڈر نام ڈیلے نے یہ کہہ کر پارٹی ارکان کو مسز مارکی کیپٹر کی خدمت کرنے سے روک دیا ہے کہ یہ نازک معاملہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی کانگریس کی مذکورہ خاتون رکن نے اسامہ بن لادن اور دیگر مجاہدینِ اسلام کے خلاف امریکی راہنماؤں اور میڈیا کے یکطرفہ معاندانہ پروپیگنڈا کو مسترد کرتے ہوئے امریکی معاشرہ کو آئینہ دکھایا ہے کہ جس عمل کو امریکی لیڈر دہشت گردی کہہ رہے ہیں وہ خود ان کے بڑے بھی کرتے رہے ہیں، اور استعماری مظالم کا نشانہ بننے والی ہر قوم کو اس عمل سے مجبوراً گزرنا پڑتا ہے۔

امریکہ میں ایک عرصہ تک برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلح جنگِ آزادی جاری رہی ہے، اور اگر اس دور کی تاریخ کو سامنے لایا جائے تو امریکی قوم میں بیسیوں ایسے اسامہ بن لادن نظر آئیں گے جو ہتھیار بکف ہو کر بیرونی غاصبوں کے خلاف سالہا سال تک برسرِ جنگ رہے ہیں۔ اس لیے مسز مارکی کیپٹر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اگر ان امریکی چھاپہ ماروں کو دہشت گرد قرار دینے کی بجائے "فریڈم فائٹر" کے طور پر قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے تو اسامہ بن لادن کی جنگ بھی اسی طرح کی ہے، اس لیے اسے دہشت گرد قرار دینے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ اور امارتِ اسلامی افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ مئی ۲۰۰۳ء

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اب سے تین صدیاں قبل ایک بات کہہ دی تھی کہ اب آئندہ عالم اسلام میں اسلامی نظام کے احیا اور خلافت کے قیام کی بنیاد فک کل نظام پر ہوگی اور اس کیلئے ان کے افکار و فلسفہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ فک کل نظام کا مطلب یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں اصلاح و

ترمیم کی گنجائش نہیں ہے اور اس ڈھانچے سے مکمل نجات حاصل کر کے نئے نقشے پر ہی ملتِ اسلامیہ کی نئی اسلامی زندگی کا آغاز ہو سکے گا۔ موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے نے ایک ہزار سال سے زیادہ وقت گزار لیا ہے، اس نے آزادی اور عروج کا دور بھی دیکھا ہے اور غلامی اور زوال کے دور سے بھی ملتِ اسلامیہ اسی ڈھانچے کے ساتھ گزری ہے۔ اب اس بلڈنگ کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ اس میں مرمت اور جزوی اصلاح و تعمیر کے ساتھ صورتحال میں اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور جیسا کہ دنیا کا عمومی رواج اور روایت ہے کہ نئی بلڈنگ تعمیر کرنے کیلئے پرانی بلڈنگ کو گرانا پڑتا ہے۔ اب اس بات کا وقت آگیا ہے کہ اس بوسیدہ عمارت سے بھی جان چھڑا لی جائے اور از سر نو نقشہ ترتیب دے کر اس پر ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی کی جائے۔

اس نئے نقشے کیلئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فکری بنیاد بھی فراہم کی ہے کہ ہمیں سب سے پہلے انسانی سوسائٹی اور عالمگیر معاشرت کیلئے اسلامی نظام و قوانین کی افادیت و ضرورت کو ثابت کرنا ہوگا اور دنیا کو عقل و منطق اور فہم واستدلال کے ساتھ بتانا ہوگا کہ انسانی سوسائٹی کو مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل قرآن و سنت میں موجود ہے اور وہ حل سب سے بہتر ہے اس لیے دنیا کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی جو مختلف عملی صورتیں (وجوہ اعجاز) ہیں اور جن کے حوالے سے قرآن کریم نے دنیا بھر کو چیلنج کیا ہے کہ کوئی فرد یا قوم قرآن کریم کے مقابلہ کی کوئی کتاب لا سکتی ہو تو لا کر دکھائے۔ اس چیلنج کا ہر دور میں الگ الگ مفہوم رہا ہے۔ کسی زمانے میں جبکہ دنیا میں فصاحت و بلاغت کا عروج تھا اور قوموں کیلئے سب سے زیادہ باعث فخر ان کی زبان دانی اور فصاحت ہوا کرتی تھی، ان کیلئے قرآن کریم کا چیلنج اس پہلو سے تھا کہ کوئی فرد یا قوم فصاحت یا بلاغت میں قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دکھائے اور اگر وہ پوری کتاب نہیں لا سکتے تو کم از کم ایک سورۃ کا مقابلہ ہی کر دکھائیں۔ مگر اب آنے والا دور چونکہ سماجیات، سسٹم، قانون اور عالمگیر معاشرت کا ہے اس لیے قرآن کریم کے اس چیلنج کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل، معاشرہ کی فلاح و بہبود اور نسل انسانی کے مسائل کے حل کیلئے قرآن کریم نے جو قوانین و ضوابط پیش کیے ہیں، افادیت و ضرورت اور نتائج و ثمرات کے حوالے سے ان کے مقابل کا کوئی ایک قانون دنیا والے پیش کر دیں۔ لیکن جیسے دوسرے میدانوں میں قرآن کریم کا مقابلہ کسی قوم سے آج تک نہیں ہو سکا اس میدان میں بھی نہیں ہو سکے گا۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمارے سامنے آچکی ہے اور ہم نے اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے، وہ یہ کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک اس کو یاد کیا جا رہا ہے اور نہ صرف یہ افغانستان کے باشندے اس دور کے امن کا تذکرہ کر رہے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی دانشگاہوں میں یہ مسئلہ بحث اور مکالمہ کا موضوع بنا ہوا ہے کہ طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور میں اپنے کنٹرول کی حدود میں وہ امن کیسے قائم کر لیا تھا جو اب فوجوں اور وسائل کی فراوانی کے باوجود قائم نہیں ہو رہا؟ اور یہ کیا بات تھی کہ طالبان کے امیر کے ایک رسمی حکم پر کسی لالچ اور تخویف کے بغیر ان کے زیر کنٹرول پورے علاقے میں پوست کی کاشت ختم ہو گئی تھی مگر اب لالچ اور ڈر کے تمام حربوں کے باوجود اس کی کاشت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق طالبان رہنماؤں سے اس سلسلہ

میں رابطے بھی کیے گئے ہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ انہوں نے امن کیسے قائم رکھا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی راز کی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی لمبے چوڑے فلسفے کا مسئلہ ہے بلکہ سادہ سی بات ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں اپنے زیر کنٹرول علاقے میں قرآن و سنت کے احکام کی عملداری کا اعلان کر رکھا تھا اور وہ اس پر اپنی استطاعت کی حد تک عملدرآمد میں بھی سنجیدہ تھے۔ یہ قانون افغان عوام کے عقیدہ اور معاشرت دونوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا اس لیے انہیں اس پر عملدرآمد میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، انہوں نے سمجھا کہ وہ کسی مسلط ہونے والے گروہ کے احکام پر عمل نہیں کر رہے بلکہ اپنے پیدا کرنے والے خدا کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں جس کے ہر فیصلے میں حکمت ہے اور کسی حکم میں اس کا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، وہ ہمارے مسائل و مشکلات سے کماحقہ آگاہ ہے اور ان کو دور کرنے کی پوری قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمارا خیر خواہ اور مہربان بھی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جس قانون کو کسی بھی معاشرہ میں عقیدہ و یقین کی یہ پشت پناہی میسر ہوگی اسے نفاذ کیلئے کسی لمبے چوڑے سسٹم اور ڈھانچے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور ہر شہری کا ذہن اور ضمیر خود بخود اسے قانون کی پابندی کیلئے تیار کرلے گا۔ جبکہ اس کے برعکس جس قانون اور ضابطے کے بارے میں عام لوگوں کا یہ تاثر ہو کہ یہ مسلط لوگوں نے اپنے مفادات کیلئے نافذ کیا ہے اور اس میں عوام سے زیادہ نافذ کرنے والوں کا مفاد وابستہ ہے، نیز نافذ کرنے والوں کو نہ ان کی حقیقی مشکلات کا علم ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کے اس درجہ کے خیر خواہ ہیں کہ ان کے فائدہ کیلئے خود اپنے مفادات کی قربانی دے سکیں تو ایسے قوانین اور ضوابط کو کسی بھی معاشرہ میں نفاذ اور اثر انداز ہونے کیلئے مصنوعی سہاروں اور دباؤ کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔ وہ قانون اور ضابطہ اسی وقت تک نافذ اور مؤثر رہے گا جب تک اسے دباؤ اور سہارے کی طاقت میسر ہوگی اور جونہی یہ دباؤ اور سہارا کمزور پڑے گا، قانون بھی فضا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اسلام کے قانون کا امتیاز یہی ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان اور یقین کا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر معاشرتی نظام کا ڈھانچہ استوار کرتا ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور نظام کو حاصل نہیں ہے بلکہ دنیا نے علاقائی قومیتوں کے جو بت انسانی عقیدت و محبت اور وفاداری و اطاعت کے جذبات کی تسکین کیلئے تراش رکھے ہیں اور جن مصنوعی سہاروں پر مختلف نظام اب تک چل رہے ہیں وہ بت بھی انٹرنیشنلزم اور بین الاقوامیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے خود کو کھڑا رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کو عقیدہ اور یقین کی قوت سے ایک بار پھر روشناس کرایا جائے اور نسل انسانی کو یہ پیغام دیا جائے کہ انسانی نسل میں کسی نظام اور فلسفہ و فکر کے فروغ اور نفاذ کیلئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر ہو۔ اور کائنات کو پیدا کرنے والی ذات پر یقین ہی وہ واحد عقیدہ ہے جو انسانوں کو کسی ایک سسٹم میں مربوط کر سکتا ہے۔ قرآن کریم اسی عقیدہ کا اعلان کرتا ہے، اسی کی طرف پوری نسل انسانی کو بلاتا ہے، اسی کو انسانی معاشرہ کی واحد فکری بنیاد قرار دیتا ہے اور اسی کو اپنا کر انسانی سوسائٹی ایک بہتر عالمی ماحول اور کامیاب گلوبل سسٹم کی طرف پیش رفت کر سکتی ہے۔

افغانستان میں ہیروئن کا کاروبار

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۲۰۰۳ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد نے ۷ مئی ۲۰۰۳ء کو اے پی پی کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ کسٹم حکام نے چھاپہ مار کر افغانستان سے پاکستان آنے والی ۵۴۰ ملین روپے مالیت کی ہیروئن پکڑی ہے، یہ ہیروئن کوئٹہ میں پکڑی گئی ہے اور اے پی پی کی رپورٹ کے مطابق یہ اب تک کسی بھی ایجنسی کی طرف سے پکڑی جانے والی ہیروئن کی سب سے بڑی مقدار ہے جو کسٹم حکام نے قابو کرلی ہے تاہم دونوں طرف سے بھاری فائرنگ کے دوران اسمگلر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

افغانستان سے مغربی ممالک کو ایک عرصہ سے یہ شکایت ہے کہ وہاں پوست کی بڑی مقدار کاشت ہوتی ہے جس سے ہیروئن بنتی ہے اور وہ پاکستان کے راستے دنیا بھر میں پھیل کر منشیات کی لعنت میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے، اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی حکومتیں افغانستان میں پوست کی کاشت کو ختم کرانے کیلئے تخویف اور تحریص کے تمام حربے آزما رہی ہیں لیکن مغربی ممالک کے ہی وہ ادارے جو منشیات کے عالمی اسمگلر اور بیوپاری ہیں، پوست کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری و فروخت کیلئے افغانستان کے اس قسم کے لوگوں کی پشت پناہی اور سرپرستی کرتے ہیں۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دوران عالمی سطح پر اس کا وسیع پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ افغانستان میں پوست کی بہت زیادہ کاشت ہوتی ہے اور وہاں سے ہیروئن کی بہت بڑی مقدار مغربی ممالک میں سمگل ہو کر جاتی ہے تو طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر نے ایک حکم کے تحت افغانستان میں پوست کی کاشت پر پابندی لگا دی تھی، اور دنیا نے یہ منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ پوست کی جس کاشت کو ختم کرانے کیلئے مغربی حکومتوں کے سالہا سال کے تمام حربے یکسر ناکام ہو گئے تھے اسے اسلامی حکومت کے سربراہ کے ایک آرڈر نے مکمل طور پر ختم کر دیا، اور بین الاقوامی اداروں نے اس کا اعتراف کیا کہ اس کے بعد طالبان کے دور حکومت میں ان کے زیر کنٹرول علاقے میں ایک ایکڑ زمین پر بھی پوست کی کاشت نہیں ہوئی۔ مگر اب مغربی ممالک کی مرضی کی حکومت افغانستان میں مسلط کیے جانے کے بعد افغانستان پھر سے پوست کی کاشت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس ایک بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی مسلم معاشرہ میں نظریاتی اسلامی حکومت اور اسلامی قوانین کی برکات کیا ہوتی ہیں اور انہیں ان کے عقیدہ و دین کے خلاف کسی نظام پر چلانے کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟

محترمہ بے نظیر بھٹو اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ جون ۲۰۰۳ء

سرحد اسمبلی میں ”شریعت بل“ پیش کیے جانے کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے اس پر ردعمل کے اظہار کا سلسلہ

شروع ہوگیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آرہی ہے۔ ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور اسے نت نئے مسائل میں الجھانے کیلئے کیے جارہے ہیں جن میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف سے استعفوں کا اعلان سرفہرست ہیں۔ اور دوسری طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہے حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا ہے اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر حکمران کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو یک آواز اور ہم آہنگ دکھائی دے رہے ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمہ کیلئے مسلح امریکی مداخلت پر بھی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جارہا اور افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کیلئے امریکہ بہادر نے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جنرل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں برسراقتدار ہوتیں تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو "طالبان بل" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیشرفت ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ طالبان کے طرز حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرز عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

- طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جبکہ متحدہ مجلس عمل نے انتخابی عمل کے ذریعے عوامی ووٹ حاصل کرکے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔
- طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسمبلی میں بل پیش کرکے عوامی نمائندوں کے ذریعے اس کا نفاذ کیا ہے۔
- طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیش رفت کی تھی۔ جبکہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔
- طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعبیر و تشریح کیلئے اپنے امیر اور ان کی مجلس مشاورت کو فائنل اتھارٹی قرار دیا تھا۔ جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستور پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور انہیں اتھارٹی تسلیم کیا ہے۔

- طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قومی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ جبکہ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذ قانون کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجائش موجود ہے کہ نفاذِ اسلام کیلئے طالبان کا طرز عمل زیادہ مفید اور مؤثر تھا یا متحدہ مجلس عمل کا طریق کار زیادہ فائدہ مند ہے؟ مگر سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو "طالبان بل" قرار دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوگی، سراسر مغالطہ نوازی اور کج فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی ذہین و فطین خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور اس پر اس کے سوا اور کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ساری صورتحال کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد اسمبلی کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کر کے اعلیٰ ترین قوتوں کو یقین دلانا چاہ رہی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

طالبان والے نظام کا ہوّا

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۰ جون ۲۰۰۳ء

یہ طالبان والے نظام کا "ہوّا" بھی خوب ہے، جس کا ڈراوا دے کر بہت سے دانشور اپنی بصیرت و دانش کا سکہ جمانے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ یہ سب دوست کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت کو طاقت کے زور پر ختم کیے جانے کے بعد وہاں جو حکومت امریکہ کی حمایت اور پشت پناہی سے قائم ہوئی ہے، اس کی سپریم کورٹ نے بھی شرعی حدود، مثلاً رجم کرنا، ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا، اور اس نوعیت کی دیگر اسلامی سزاؤں کو بدستور نافذ رکھا ہوا ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے سے چند ماہ قبل کابل میں ویڈیو سنٹرز اور کیبل نیٹ ورک پولیس نے زبردستی بند کرا دیا تھا، اور ابھی حال ہی میں کابل کی سپریم کورٹ کا ایک اور حکم سامنے آیا ہے جس میں افغانستان کی عورتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر برقعہ پہن کر نکلا کریں۔ گویا قوانین کے نفاذ اور اس کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے ملا عمر کے موقف اور حامد کرزئی کی پالیسیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، لیکن جب یہ اقدامات طالبان حکومت اور ملا عمر کی طرف سے تھے تو پوری دنیا میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا کہ تہذیب تباہ ہو گئی ہے، تمدن اور ثقافت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اور انسانوں کی آزادی غصب کر لی گئی ہے، لیکن اب وہی اقدامات کرزئی حکومت کی طرف سامنے آ رہے ہیں تو اسلام آباد سے لے کر واشنگٹن تک کے ان اصحاب دانش کو اس طرح سانپ سونگھ گیا ہے جیسے وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں رہے۔ لطف کی بات یہ ہے

کہ یہی قوانین اسی انداز میں اور اسی تعبیر وتشریح کے ساتھ سعودی عرب میں بھی نافذ ہیں اور گذشتہ پون صدی سے مسلسل نافذ چلے آرہے ہیں مگر وہاں ان قوانین کا نفاذ کسی کیلئے تکلیف کا باعث نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ صورتحال بھی قابل توجہ ہے کہ صوبہ سرحد کا نفاذِ شریعت ایکٹ کسی طرح بھی طالبان کے نظام اور طریق کار سے مطابقت نہیں رکھتا:

- طالبان نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا تھا، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت عوام کی منتخب کردہ ہے۔
- طالبان نے کوئی دستور نافذ کیے بغیر امیر المومنین کے شخصی احکامات کے ذریعے نفاذ اسلام کی طرف پیشرفت کی تھی، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت اور اسمبلی نے پہلے سے نافذ شدہ دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت "شریعت ایکٹ" منظور کیا ہے۔
- اسی طرح طالبان کا سسٹم پورے ملک کے مروجہ نظام میں مکمل انقلاب کی علامت تھا، جبکہ سرحد اسمبلی کا "شریعت ایکٹ" چند جزوی اصلاحات وترامیم کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکے گا۔
- نیز سرحد حکومت نے یہ بل منتخب صوبائی اسمبلی کے ذریعے نافذ کیا ہے، جبکہ طالبان کے ہاں منتخب اسمبلی کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔

اس واضح فرق کے باوجود سرحد حکومت کے نفاذ شریعت کے اقدامات کو طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی کوشش قرار دے کر جو لوگ پوری دنیا کو اسلام اور پاکستان سے نفرت دلانے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ نہ اسلام کے ساتھ کوئی خیر خواہی کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کا طرز عمل پاکستان کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے۔

روایتی اسلام اور روشن خیال اسلام

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۳۰ جون ۲۰۰۳ء

طالبان کے اسلام کو انتہا پسندانہ قرار دیتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف نے متعدّد مواقع پر پاکستان کو جدید اور روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ صوبہ سرحد میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے بعد اس حوالے سے ان کے اس لہجے اور ارشاد میں شدت آگئی ہے کہ پاکستان میں انتہا پسندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور پاکستان، حتّٰی کہ صوبہ سرحد کے عوام بھی طالبان والے اسلام کو قبول نہیں کریں گے۔

آج کی صحبت میں ہم اس امر کا جائزہ لینا چاہیں گے کہ طالبان کے اسلام اور صدر پرویز مشرف سمیت ہمارے بہت سے رہنماؤں کے ذہنوں میں جس روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کا تصور موجود ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جہاں تک طالبان کے اسلام کا تعلق ہے تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اسلام کے حوالے سے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی، بلکہ جو اسلام انہوں نے کتابوں میں لکھا ہوا پایا اسے انہوں نے کسی رو رعایت کے بغیر اپنے

ملک میں نافذ کر دیا:

- انہوں نے اگر معاشرتی جرائم کی شرعی سزاؤں مثلاً سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، ہاتھ کاٹنے اور موت کی سزا دینے کے قوانین نافذ کیے تو ان میں کوئی قانون بھی ان کی ایجاد نہیں تھا بلکہ ان سب سزاؤں کا ذکر قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ میں موجود ہے۔ یہ خلافتِ اسلامیہ کے دور میں کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا میں نافذ رہی ہیں اور اب بھی سعودی عرب میں نافذ ہیں۔
- طالبان نے اگر پردے کے احکام کا نفاذ کیا تو یہ بھی ان کی اختراع نہیں تھی بلکہ یہ احکام بھی قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کا صدیوں سے حصہ چلے آرہے ہیں۔
- انہوں نے اگر افغانستان میں غیر مسلم مشنریوں کو تبلیغ سے روکا ہے تو یہ بھی ان کا کوئی نیا اقدام نہیں تھا بلکہ فقہ اسلامی میں یہ احکام پہلے سے موجود ہیں۔

غرضیکہ طالبان حکومت کے جن اقدامات کو بھی انتہا پسندانہ اسلام قرار دے کر رد کیا جا رہا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی قانون یا حکم ایسا نہیں ہے جو انہوں نے خود ایجاد کیا ہو، یا قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں پہلے سے موجود نہ ہو، بلکہ یہ صدیوں تک ملتِ اسلامیہ میں نافذ اور رائج نہ رہ چکا ہو۔

بعض احکام کی تعبیر و تشریح کے جزوی پہلوؤں، یا نفاذ کے طریق کار کے حوالے سے تو طالبان حکومت کی پالیسی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اور متعدّد امور میں ان کے دورِ حکومت میں ہم نے بھی کھلم کھلا ان سے اختلاف کیا ہے، لیکن ان کے نافذ کردہ اسلام کے بارے میں یہ تاثر دینا کہ یہ ان کا کوئی الگ اور جداگانہ اسلام تھا، قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد بات ہے، کیونکہ انہوں نے کسی بھی حوالے سے کوئی نئی بات نہیں کی، بلکہ جو کچھ کتابوں میں یا خلافتِ اسلامیہ کے ادوارِ حکومت کے تعامل میں انہوں نے دیکھا، اسے بلا کم و کاست افغانستان میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ صرف اس وجہ سے ناکام ہوئے کہ ''قدیمی اور روایتی اسلام'' دنیا کی بڑی طاقتوں کے لیے قابل برداشت نہیں تھا، اس لیے انہوں نے طاقت کے زور پر طالبان کی حکومت کو ختم کر دیا۔

اس کے برعکس روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ سب کچھ نیا ہے۔ اور اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر و تشریح کا جو نقشہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ سب ایسا ہے کہ قرآن و سنت کے روایتی ذخیرے اور ماضی کی اسلامی حکومتوں اور خلافتوں کے نافذ کردہ نظاموں میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے کہ نفاذِ اسلام کے کون کون سے اقدامات اسلام کی قدیم اور جدید تعبیرات کے حوالے سے متنازع چلے آ رہے ہیں؟ اور کن احکام کو اب تک انتہا پسندانہ قرار دے کر ان کی نئی اور روشن خیالی پر مبنی تعبیر و تشریح کا تقاضا کیا جا رہا ہے؟

- سب سے بڑا مسئلہ ملک کے دستور اور نظام پر قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرنے کا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہماری تاریخ یہ ہے کہ ''قراردادِ مقاصد'' قرآن و سنت کی دستوری بالادستی کا اعلان کرتی ہے، لیکن سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دے کر اس کی نفی کر دی ہے کہ قراردادِ مقاصد کو دستور کی دیگر دفعات پر کوئی ترجیح حاصل

نہیں ہے۔ جبکہ قومی اسمبلی نے میاں نواز شریف کے دور میں جب قرآن کریم کو سپریم لاء قرار دینے کا بل منظور کیا تو اس کے ساتھ اس شرط کا اضافہ کر دیا کہ "بشرطیکہ سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہ ہو۔"

- ہمارا دوسرا بڑا مسئلہ ملک کے معاشی نظام کو مغرب کے چنگل سے نجات دلانے اور سودی نظام کے خاتمے کا ہے، جس کے لیے سپریم کورٹ تک کا فیصلہ آ چکا ہے۔ لیکن ہماری روشن خیالی اور تجدد پسندی اس پر عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ہم نے سپریم کورٹ ہی سے دوبارہ اس رکاوٹ کو باقی رکھنے کے لیے "این او سی" حاصل کر لیا ہے۔
- شراب پر کئی بار پابندی لگی لیکن ہمارے حکمرانوں کی روشن خیالی نے ہر بار ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ کچھ ہی عرصہ بعد پھر سے اس پر پابندی کے اعلان سے صرفِ نظر کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔
- ہمارے ہاں جب بھی نماز کی پابندی اور سرکاری سطح پر اس کے اہتمام کی بات سامنے آئی، اسے ترقی پسندی اور روشن خیالی کے منافی سمجھا گیا۔ جیسا کہ حال ہی میں خود صدر پرویز مشرف بھی اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کر چکے ہیں۔
- بے حیائی، رقص و سرود اور بدکاری کے فروغ کے خلاف دینی حلقوں کی آواز کو ہمیشہ شخصی آزادیوں پر حملہ قرار دیا گیا، اور اس پر انتہا پسندانہ اسلام کی پھبتی کس کر اسلام کی روشن خیال تعبیر کا رخ متعیّن کیا گیا۔ حتیٰ کہ بے حیائی اور بدکاری کے اڈوں اور مراکز کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔
- آج ہماری بیشتر روشن خیال اور ترقی پسند این جی اوز کی قراردادوں، مطالبات اور تنقید کا سب سے بڑا ہدف وہ چند اقدامات ہیں جن میں توہینِ رسالتؐ پر موت کی سزا، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے، جرائم کی قرآنی سزاؤں کے نفاذ، اور ریاست کو قرآن و سنت کے احکامات کا پابند بنانے کے اصولی فیصلے شامل ہیں، اور یہ سب اقدامات انتہا پسندانہ قرار دیے جا رہے ہیں۔

اس کی روشنی میں قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کا آج کا تصور کیا ہے؟ ہم تو پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ میں یہی سمجھ سکے ہیں کہ اگر

- اسلام کو ریاست کی ذمہ داریوں سے خارج قرار دے دیا جائے اور حکومت پر قرآن و سنت کے احکام کی پابندی اور نفاذ کی کوئی ذمہ داری نہ ڈالی جائے،
- سود کو جائز قرار دے دیا جائے اور پاکستان کو مغرب کے استحصالی معاشی نظام کے شکنجے سے نکالنے کی کوئی بات نہ کی جائے،
- نماز، روزے اور دیگر شرعی احکام کی پابندی پر زور نہ دیا جائے،
- رقص و سرود، عریانی، بے حیائی بلکہ بدکاری تک کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے،
- تہذیب و معاشرے میں اسلامی روایات کی بحالی اور تحفظ کی بجائے مغرب کی پیروی کو ترجیح دی جائے

تو ہم روشن خیال اور ترقی پسند سمجھے جائیں گے، اور اسلام کی جدید اور عصرِ حاضر کی روح سے ہم آہنگ نئی تعبیر و

تشریح کے علمبردار کہلائیں گے۔ لیکن اگر ہم ان باتوں کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اسلام کے حوالے سے انہی احکام و قوانین کے نفاذ پر زور دیں گے جو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں گزشتہ چودہ سو برس سے تسلسل کے ساتھ موجود چلے آرہے ہیں، تو ہم بنیاد پرست ہیں، انتہا پسند ہیں، دقیانوسی ہیں، طالبان کے پیروکار ہیں، اسی وجہ سے "گردن زدنی" بھی ہیں۔ اس تناظر میں اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو

- ہمیں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی دو ہی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے روایتی اسلام کے دائروں کو ختم کیا۔ دونوں نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف اعلان کیا کہ وہ ماضی کے اسلام سے دامن چھڑا رہے ہیں اور ایک نیا فکر اور نظام پیش کر رہے ہیں۔
- مگر ہمارے روشن خیال اور ترقی پسند رہنما اسلام کا لیبل بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی ساری عملی باتوں سے ایک ایک کر کے پیچھا بھی چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی مثال ماضی کی تاریخ میں نظر آتی ہے جس کا ذکر مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ نے "سیرۃ النبیؐ" کی دوسری جلد میں طائف کے قبیلہ ثقیفہ کے قبولِ اسلام کے حوالے سے کیا ہے۔

انہوں نے لکھا ہے کہ فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا جو کئی روز جاری رہا مگر طائف فتح نہ ہو سکا اور نبی اکرمؐ محاصرہ اٹھا کر مدینہ منورہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد طائف والوں کا وفد عبدیالیل کی قیادت میں مدینہ منورہ آیا اور طائف والوں کی طرف سے قبولِ اسلام کی خواہش کا اظہار کیا مگر اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی بیان کیں کہ ان شرائط کے ساتھ ہم اہلِ طائف اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ شرائط "سیرۃ النبیؐ" میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہیں:

1. زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں۔
2. اس قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود پر ہے اس لیے سود خوری جائز رکھی جائے۔
3. شراب سے نہ روکا جائے کیونکہ ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تینوں شرطیں نامنظور کر دیں اور طائف والوں کو اپنی یہ شرائط واپس لینا پڑیں۔ اس کے بعد سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے۔ لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرضِ کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں ہے، اور واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں، روز کا کام نہیں۔ اس بنا پر اس وقت ان دونوں باتوں پر ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو رفتہ رفتہ ان میں صلاحیت آجائے گی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جب یہ ایمان لا چکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور زنا، شراب، سود اور نماز کے احکام سے مستثنیٰ قرار دیے جانے کی درخواست نامنظور ہو جانے کے بعد اہلِ طائف نے جب غیر مشروط طور پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو پھر ان کے اسلام میں اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والوں

کے اسلام میں کوئی فرق نہیں تھا، اور وہ بھی خود کو اسلام کے ان تمام احکام کا پابند سمجھتے تھے جن کی پابندی باقی ملتِ اسلامیہ کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔

اس لیے ہم اپنے روشن خیال اور ترقی پسند دوستوں سے گزارش کریں گے کہ اگر وہ اسلام کا لیبل قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو اس کے لیے انہیں اسلامی احکام و قوانین کا وہی ڈھانچہ قبول کرنا ہوگا جو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ جن احکام و قوانین پر امتِ مسلمہ گزشتہ چودہ سو برس سے عمل کرتی چلی آرہی ہے اور جن احکام و قوانین پر آج بھی ملتِ اسلامیہ کی غالب اکثریت بے لچک ایمان رکھتی ہے۔ اور اگر اسلامی احکام و قوانین کا یہ ڈھانچہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تو پھر جلال الدین اکبر اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرح جرأت و حوصلہ کے ساتھ اس سے کھلم کھلا دستبرداری کا اعلان کریں۔ طائف والوں کی طرح شرطیں پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے کہ یہ شرطیں نہ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کی تھیں اور نہ ہی آج ان کی امت ان شرائط کے ساتھ کسی نظام کو اسلام قرار دینے کے لیے تیار ہوگی۔

کیوبا سے رہائی پانے والے ایک مجاہد کی داستان

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۴ جولائی ۲۰۰۳ء

بحمد اللہ تعالیٰ گذشتہ چونتیس برس سے گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک عام سی روایت بن گئی ہے کہ کچھ دوست ملاقات کرتے ہیں اور تھوڑی دیر میرے دفتر میں بیٹھتے ہیں، کسی نے کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا ہے، کوئی کسی معاملہ میں مشورہ کے خواہاں ہوتے ہیں اور کوئی ویسے ہی ملاقات اور گپ شپ کیلئے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسا عام طور پر مساجد میں دینی جلسوں کے بعد بھی ہوتا ہے، خطاب اور دعا کے بعد کچھ حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ مصافحہ کریں ملاقات ہو اور تھوڑی بہت گفتگو بھی ہو جائے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ اسے "جلسی" کہا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جلسہ کے بعد جلسی سے بچنا کیونکہ اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور بسا اوقات اگلے پروگرام کا شیڈول بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وقت اور تھکاوٹ کا مسئلہ نہ ہو تو یہ جلسی یکسر بے فائدہ نہیں ہوتی اور اس میں بہت سی مفید ملاقاتیں اور گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔

گذشتہ جمعہ کو نماز جمعہ سے فارغ ہو کر اپنی نشست گاہ کی طرف جا رہا تھا کہ مصافحہ کرنے والے حضرات میں ایک پشتون بزرگ نے مصافحہ کرتے ہوئے کان میں کہا کہ میں پشاور سے آیا ہوں۔ دوسرے شہروں سے اپنے کسی کام کیلئے دوست آتے ہیں تو جمعہ کی نماز کیلئے مرکزی جامع مسجد میں آجاتے ہیں اور مصافحہ و ملاقات میں شریک ہوتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ کوئی اسی قسم کے بزرگ ہوں گے چنانچہ وہ میرے کمرے میں آکر ملاقاتیوں کے حلقے میں ایک طرف بیٹھ گئے تو میں نے کوئی خاص توجہ نہ کی کہ باقی دوستوں کی طرح یہ بھی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے لیکن جب مجلس کے بہت سے دوستوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی وہ بدستور بیٹھے رہے تو میں نے اس خیال سے کہ شاید انہیں کوئی کام ہو ان سے پوچھا کہ

ہاں خان صاحب فرمائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ پشاور سے آرہا ہوں، ابھی چند روز قبل کیوبا کی قید سے رہا ہو کر آیا ہوں اور آپ سے ملاقات کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سنتے ہی پوری مجلس ان کی طرف متوجہ ہوگئی اور مجھے بھی شرمندگی سی ہوئی کہ یہ بات مجھے ان سے پہلے ہی پوچھ لینی چاہیے تھی۔ انہیں قریب بلایا اور پھر مجلس کے اختتام تک مجلس کا محور وہی رہے۔

یہ مولوی محمد علی خان قادری تھے جو تحریک آزادی کے نامور راہنما حاجی صاحب ترنگ زئی کے مزار پر واقع غازی آباد کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب ہیں اور کیوبا کے جزیرہ میں اٹھارہ ماہ تک امریکی قیدی کی حیثیت سے وقت گزار کر گذشتہ ماہ دیگر ۱۶ افراد کے ہمراہ رہا ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اخبارات میں آپ کے مضامین پڑھتا رہتا ہوں اور اسی وجہ سے آپ سے ملاقات کیلئے آیا ہوں۔ میرے لیے حاجی صاحب ترنگ زئی کا حوالہ ہی کافی تھا کہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف اس خطہ کے مسلمانوں کے مسلح جہادِ آزادی کے بڑے کمانڈروں میں سے تھے اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران ان کے جہادی معرکے اور آزادئ وطن کیلئے ان کی مسلح کاروائیاں ہماری آزادی کی جدوجہد کا ایک روشن باب ہیں۔ ان کی جدوجہد کا ہدف برطانوی حکمران اور ان کے گماشتے قادیانی تھے۔ وہ گرفتار ہوئے اور لاکھوں روپے کی ضمانت پر ان کی رہائی ہوئی، پھر دوبارہ گرفتاری کے آرڈر آئے تو وہ چارسدہ کے علاقہ سے ہجرت کر کے آزاد قبائلی علاقہ مہمند ایجنسی چلے گئے جہاں انہوں نے آخردم تک جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں اور وہیں ان کی قبر ہے۔ اس علاقہ کو غازی آباد کا نام دے دیا گیا اور مولوی محمد علی خان قادری موصوف اسی جگہ مرکزی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے تو وہ صرف اتنا ہی بتا دیتے تو میرا سر عقیدت سے خم ہونے کیلئے کافی تھا لیکن کیوبا کے امریکی عقوبت خانے کا نام لے کر انہوں نے دکھتی رگ کو چھیڑ دیا اور پھر انہوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو دل کے زخموں کے کھرنڈ ایک ایک کر کے چھلتے چلے گئے۔

میری یہ عادت ہے کہ مشکل سے مشکل حالات اور تاریک سے تاریک تر معاملہ میں بھی روشنی اور امید کا کوئی نہ کوئی مثبت پہلو تلاش کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہوں چنانچہ وہ اپنی داستان قید بیان کر رہے تھے اور میرا ذہن تاریخ کے مختلف مراحل کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھا۔ اور یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث بن رہی تھی کہ حاجی صاحب ترنگ زئی کی جدوجہد کا تسلسل قائم ہے۔ حاجی صاحبؒ کی وفات کو پون صدی کا عرصہ گزر رہا ہے مگر ان کا مرکز ابھی تک جہاد کے عمل سے وابستہ ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں کوئی مجھے یہ تسلیاں دے رہا تھا کہ قربانیاں، شہادتیں، قید و بند، ہجرت اور وقتی شکستوں کے مراحل تو زندہ قوموں کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن جن قوموں میں آزادی کا جذبہ باقی رہتا ہے اور اس کے تحفظ کیلئے جدوجہد کے عزم کا تسلسل نہیں ٹوٹتا وہ بالآخر آزادی کی منزل سے ہمکنار ہو جایا کرتی ہیں۔

مولوی محمد علی خان قادری نے بتایا کہ وہ افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر پہلے اپنے علاقے میں مجاہدین کی امداد کیلئے مہم چلاتے رہے پھر بیس نومبر ۲۰۰۱ء کو مجاہدین کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوگئے۔ وہاں انہوں نے جنگ میں حصہ لیا، ان کے ۲۲ ساتھی شہید ہوئے اور وہ متعدّد افراد کے ہمراہ گرفتار ہوگئے۔ انہیں پہلے بحری بیڑے پر لے جایا گیا جہاں ۱۳ دن تک پوچھ گچھ ہوتی رہی، انہیں چھوٹے چھوٹے سیلوں میں بند کیا جاتا تھا، کئی کئی گھنٹے کھڑا رکھا جاتا تھا، سونے نہیں دیا جاتا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ۱۳ دن کے بعد انہیں کیوبا کے جزیرے میں

منتقل کر دیا گیا جہاں وہ ۱۸ ماہ رہے۔ پہلے ۱۶ ماہ اذیتوں کے تھے، تکالیف کے تھے اور جبر و تشدد کے تھے، مسلسل دن رات انہیں بھوکا رکھا جاتا، چھوٹے چھوٹے پنجروں میں بند کر دیا جاتا، سخت سردی میں بدن کے سادہ کپڑوں کے سوا انہیں کوئی کمبل وغیرہ نہیں دیا جاتا تھا، پنجرے سے جب کسی وقت باہر نکالتے تو پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اور ہاتھوں کو رسیوں سے جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ ذہنی اذیتوں کا سلسلہ الگ تھا مگر قیدیوں کی اکثریت نے صبر و حوصلہ سے کام لیا اور بالآخر جبر کرنے والوں کے حوصلے جواب دینے لگے۔ بسا اوقات ڈیوٹی پر متعیّن افسر اور کارندے ان سے معذرت کرتے کہ ہم ان کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر مجبور ہیں لیکن اس کے باوجود جبر و تشدد کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ہم ذرا سی حرکت کرتے تو وہ چوکنا ہو جاتے، انہیں اس بات کا زیادہ ڈر رہتا تھا کہ یہ کہیں خودکش حملہ نہ کر دیں۔ ایک بار ہم نے نماز کی اجازت مانگی تو اس کیفیت میں اجازت دی گئی کہ پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں رسیاں تھیں، اس کیفیت میں ہم نے تکبیر تحریمہ کیلئے ہاتھ اٹھائے تو ارد گرد کھڑے امریکی سپاہیوں نے رائفلیں تان لیں، ہم نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اس طرح ہاتھ اٹھا کر تم ہم پر حملہ کرنے لگے ہو۔

مولوی محمد علی خان قادری کا کہنا ہے کہ ۱۶ ماہ کے اس تشدد کے بعد ہمارے لیے سہولتوں کا دور شروع ہوا اور مختلف لوگ آکر ہمیں سمجھانے اور طرح طرح کے لالچ دینے لگے۔ لوگ آتے اور ہم سے پوچھتے کہ ہم تو تمہارے خیر خواہ ہیں تم پر پیسے خرچ کرتے ہیں تمہیں امداد دیتے ہیں پھر تم ہمارے خلاف کیوں لڑتے ہو؟ ہم یہ جواب دیتے کہ تم لوگ عالم اسلام کے خلاف جو دشمنی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہو اور فلسطین، کشمیر، عراق، چیچنیا اور افغانستان میں تمہاری وجہ سے جو بے گناہ مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے تم ہمارے خیر خواہ کیسے ہو سکتے ہو؟ باقی رہی بات ڈالروں اور امداد کی تو وہ تم اپنے ایجنٹوں کو دیتے ہو جو تمہارے ملازم ہیں اور تمہارے لیے کام کرتے ہیں، ان کی تنخواہ تو تم نے دینی ہی ہے اس کا ہم پر کیا احسان ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس پادری صاحبان بھی آتے اور ہمیں قرآن کریم کی وہ آیات سناتے جن میں امن اور صلح کی بات کی گئی ہے، وہ کہتے کہ اسلام تو امن کا مذہب ہے اور صلح و آشتی کا پیغام دیتا ہے۔ ہم ان سے کہتے کہ ہمارا ان آیات پر ایمان ہے لیکن وہ سینکڑوں آیات بھی قرآن کریم ہی کی ہیں جن میں یہود و نصاریٰ کو مسلمانوں کا دشمن بتایا گیا ہے اور ان سے دوستی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ ہمیں کہا گیا کہ ہمارے خلاف جنگ بند کر دو اور کاروائیاں نہ کرنے کا یقین دلاؤ تو ہم تمہیں امداد دیں گے، مدارس کیلئے تعاون کریں گے، سکول اور ہسپتال یا کوئی اور کام بھی کہو گے تو تمہیں رقوم فراہم کریں گے۔ ہم نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور اپنے اوپر دین اور ملت کے ساتھ غداری کا لیبل چسپاں نہیں کر سکتے۔

مولوی محمد علی خان قادری کی باتیں اور داستان طویل ہے، یہ کالم ان کی تفصیلات کا متحمل نہیں، کسی اخباری رپورٹر کو ان کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنا چاہیے اور اٹھارہ ماہ کی قید کی تفصیلات ان کے سینے سے کرید کر قوم کے سامنے لانی چاہئیں کہ قوم کا حق صرف کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات، بارگیننگ اور منصوبوں کی تفصیلات سے باخبر ہونے کا ہی نہیں بلکہ ان منصوبوں کا نشانہ بننے اور سازشوں کا شکار ہونے والے مظلومین کی داستانِ مظلومیت سے آگاہی بھی قوم کا حق ہے۔ بہرحال مولوی محمد علی خان قادری کے بقول اس کیفیت میں کیوبا کے جزیرے میں قید کے اٹھارہ ماہ گزارنے کے بعد انہیں

تقریباً ڈیڑھ درجن افراد کے ہمراہ ۲۹ مئی کو رہا کر کے پاکستان روانہ کر دیا گیا اور اب وہ اپنے مدرسہ کے اس نقصان کو پورا کرنے کی فکر میں ہیں جو ان کی ڈیڑھ سالہ قید کے دوران ہوا ہے۔ خدا کرے کہ امریکی ڈالروں کی پیشکش کو مبینہ طور پر ٹھکرانے والے اس مولوی محمد علی خان قادری کو اپنے دینی مدرسہ کا بجٹ پورا کرنے اور اس دوران مدرسہ کے ذمہ چڑھ جانے والے قرضہ کی ادائیگی کیلئے کچھ صاحب خیر دوستوں کی توجہ حاصل ہو جائے، آمین یارب العالمین۔

شدت پسندی: شاہ فہد اور مہاتیر محمد کا اختلافِ نظر

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۴ اگست ۲۰۰۳ء

دہشت گردی کے حوالے سے دنیا بھر میں بحث جاری ہے اور اس کی کوئی تعریف متعیّن کیے بغیر عالمی اتحاد کے نام پر طاقتور قومیں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے اس کے خلاف لٹھ لیے پھر رہی ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد جب امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کیلئے عالمی اتحاد بنانے کا اعلان کیا اور افغانستان کو خوفناک بمباری کا نشانہ بنایا تو یہ سوال اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ''دہشت گردی'' کہتے کس کو ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے؟ کیونکہ دہشت گردی کی کوئی متفقہ تعریف طے کیے بغیر اگر ہر طاقتور کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ جسے چاہے دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑے تو مظلوم اور کمزور اقوام کی آزادی اور جینے کا حق سلب ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن امریکہ اور اس کے حواریوں کو اتنی جلدی تھی یا ان کی منشا ہی یہ تھی کہ دہشت گردی کا لیبل اپنے مخالفین پر ہر صورت میں چسپاں کر کے انہیں بلا تاخیر انتقامی کاروائی کا نشانہ بنا ڈالا جائے۔

چنانچہ افغانستان اور عراق پر امریکہ کی فوج کشی کے بعد اب جب عالمی افق پر دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی ہے تو خود مغرب کے اہل دانش میں یہ سوال سر اٹھا رہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اس کاروائی کا اخلاقی اور اصولی جواز کیا ہے؟ بالخصوص عراق پر امریکہ کی فوج کشی نے تو نئے عالمی استعمار کے چہرے سے اخلاقیات اور بین الاقوامی اصولوں کے سارے نقاب ایک ایک کر کے اتار پھینکے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر ہمارے مسلمان حکمرانوں میں اس حوالے سے ایک اور رخ پر گفتگو ہو رہی ہے اور اس سلسلہ میں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد اور ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے حال ہی میں جو کچھ کہا ہے وہ توجہ اور غور و فکر کے لائق ہے:

- شاہ فہد نے سعودی کابینہ کے ہفتہ وار اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے تمام علماء، دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقے سمیت نوجوان نسل پر زور دیا ہے کہ وہ ملک میں شدت پسندی کے خاتمہ کیلئے فعال کردار ادا کریں، اسلام کی جدت پسندی اور رحمدلی سے متعلق نوجوانوں میں شعور اجاگر کیا جائے اور انہیں ایسی تعلیم نہ دی جائے جس سے شدت پسندی کو فروغ ملے۔
- جبکہ دوسری طرف ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے کہا ہے کہ جب تک دنیا دہشت گردی کی بنیادی وجوہات

کو ختم نہیں کرتی دہشت گردی جاری رہے گی۔ آخر ہم اس کی پیش بندی میں اور کتنا وقت لیں گے؟ ہم دہشت گردی کے خاتمہ میں ایک دن کی تاخیر کریں گے تو یہ دوبارہ وقوع پذیر ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ دہشت گردی کو ختم کرنے کیلئے صحیح اقدامات نہیں کر رہا۔

عالمِ اسلام کے ان دو مقتدر رہنماؤں کے ارشادات کو دیکھا جائے تو دو الگ الگ پہلو سامنے آتے ہیں۔ شاہ فہد کی گفتگو سے تاثر ملتا ہے کہ جسے وہ دہشت گردی کہہ رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں ایسی تعلیم دی جا رہی ہے جس سے شدت پسندی کا ذہن پیدا ہوتا ہے اور اس کی کوکھ سے دہشت گردی جنم لیتی ہے، اس لیے انہوں نے علمائے کرام اور دانشوروں کو یہ تلقین کرنا ضروری سمجھا ہے کہ نوجوانوں کو شدت پسندی کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ جدت پسندی اور رحمدلی کی تعلیمات سے انہیں آراستہ کیا جائے تاکہ وہ شدت پسندی کی طرف مائل نہ ہوں۔ مگر مہاتیر محمد نے اس کے برعکس دہشت گردی کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے اور انہیں ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور انہوں نے دہشت گردی کے خلاف امریکی کاروائیوں کو صحیح قرار نہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک دہشت گردی کے اصل اسباب کو ختم نہیں کیا جائے گا دہشت گردی کو ختم کرنا ممکن نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مہاتیر محمد کے موقف میں زیادہ وزن ہے کیونکہ اس وقت جن کاروائیوں کو بھی دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے، اس سے قطع نظر کہ ان پر دہشت گردی کی کسی قابل قبول تعریف کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں، انہیں کچھ دیر کیلئے دہشت گردی تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ان کاروائیوں کا تعلق تعلیم سے نہیں بلکہ ردعمل سے ہے۔ اور جن کاروائیوں کو شدت پسندی قرار دیا جا رہا ہے وہ اس لیے نہیں ہو رہیں کہ انہیں اس کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ اس لیے ہو رہی ہیں کہ ایسا کرنے والوں کے سامنے مسلمانوں کے خلاف مغربی قوتوں کے معاندانہ طرزِ عمل، انتقامی کاروائیوں اور عالم اسلام کے وسائل اور اقتدار و سیاست پر مخالفانہ قبضہ و کنٹرول کا ایک تسلسل ہے جس کے ردعمل میں وہ انتہا پسندی اور شدت پسندی کا شکار ہو رہے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران اسلام، ملتِ اسلامیہ اور مسلم ممالک کے خلاف مغربی ممالک نے جو کچھ کیا ہے اور جو وہ اب کر رہے ہیں اور جس طرح "انجمنِ اقوام" اور پھر "اقوامِ متحدہ" نے اس سب کچھ کو جواز کی سند مہیا کرنے کی ڈیوٹی سنبھالی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اگر مسلم ممالک کے نوجوان احتجاج کا اور کوئی راستہ نہ پاتے ہوئے شدت پسندی پر اتر آئے ہیں تو اسے غیر فطری قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ بالکل ان کی فطرت کا تقاضا ہے اور اس کی ذمہ داری مسلم نوجوانوں پر نہیں بلکہ اس عمل کو تسلسل فراہم کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے جس کے ردعمل میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

جہاں تک علمائے کرام اور دینی رہنماؤں کی بات ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس حوالے سے صرف تین باتوں کے "قصوروار" ہو سکتے ہیں:

- وہ عام مسلمان کو قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں، ان پر ایمان کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کا ذہن بناتے ہیں۔

- وہ قرآن کریم یا سنت نبویؐ کی تعلیم دیتے ہوئے اس بات کی تفریق نہیں کرتے کہ آج کے نوجوانوں کو قرآن و سنت کے کون سے حصوں کی تعلیم دینی ہے اور کون سے حصوں کو ان سے اوجھل رکھنا ہے۔ جبکہ ہمارے ”مہربانوں“ کا تقاضا ہے کہ علمائے کرام اپنے تعلیمی پروگرام میں آج کی عالمی قوتوں اور اداروں کی خواہشات کے مطابق نئی ترجیحات قائم کریں اور قرآن و سنت کی صرف ان باتوں کی مسلمان نوجوانوں کو تعلیم دیں جن سے آج کی عالمی تہذیب اور مغربی قوتوں کو اختلاف نہ ہو۔ مگر علمائے کرام ابھی تک دنیا کے کسی حصے میں اس کیلئے تیار نہیں ہیں۔
- عالمِ اسلام کے دینی حلقے اور علمائے کرام اس بات کیلئے بھی تیار نہیں ہیں کہ اسلام کی جن باتوں پر مغرب کو اعتراض ہے ان کی کوئی نئی تعبیر و تشریح کر کے مغرب کو مطمئن کریں۔ بلکہ وہ اسلامی احکام و قوانین کی اس تشریح پر قائم ہیں جو چودہ سو سال سے اجتماعی طور پر چلی آرہی ہے اور وہ اس سلسلہ میں مغرب کے اعتراضات کو درست سمجھنے کی بجائے اسلامی تعلیمات کو ہی درست اور جائز تصور کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں جب علمائے کرام نئی نسل کو قرآن و سنت کی تعلیم دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ایسی صورتحال کے بارے میں بھی واضح ہدایات موجود ہیں کہ جب مسلمانوں پر کافروں کا تسلط قائم ہو جائے، جب مسلمانوں کے علاقوں اور وسائل پر غیر مسلم قبضہ جمانے لگیں اور جب مسلمان حکمران اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی بجائے غیر مسلم قوتوں کے حاشیہ بردار بن جائیں تو پھر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور مسلمان نوجوانوں کو کس طرح اس صورتحال سے نمٹنا چاہیے۔ اب علمائے کرام یہ تو نہیں کر سکتے کہ مغرب کو راضی رکھنے اور اپنے مسلم حکمرانوں کی ناراضگی سے بچنے کیلئے قرآن و سنت کی ان تعلیمات سے چشم پوشی کرلیں اور نوجوانوں سے یہ کہنا شروع کر دیں کہ دین کی باقی تعلیمات پر وہ عمل کریں لیکن اس صورتحال کے بارے میں شریعت کی جو ہدایات ہیں ان پر اس لیے عمل نہ کریں کہ ان سے مغرب ناراض ہوتا ہے اور اس سے ہمارے مسلم حکمرانوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

شاہ فہد سعودی عرب کے حکمران ہیں، سعودی عرب نے قرآن و سنت کو اپنے دستور و قانون کا سرچشمہ قرار دے رکھا ہے اور عالم اسلام کی عظیم مجاہد شخصیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نہ صرف سعودی حکمرانوں اور اہل علم کے ہاں آئیڈیل شخصیت ہیں بلکہ ہمارے نزدیک بھی مسلمانوں پر کافروں کے تسلط اور جبر کے دور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علمائے کرام کیلئے آئیڈیل شخصیت ہیں جنہوں نے تاتاریوں کی یلغار کے دور میں مسلمانوں کی مجاہدانہ رہنمائی کی اور جرأت و استقامت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ اس لیے اگر آج کے دور میں علمائے کرام اور دیندار نوجوان شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو اپنا راہنما تصور کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیں تو کم از کم سعودی حکومت اور شاہ فہد کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

کیا خلافت کا نظام ناقابلِ عمل ہے؟

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۳ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے گذشتہ دنوں ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ پاکستان میں کمال اتاترک جیسی اصلاحات نافذ نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی خلافت کا نظام قابلِ عمل ہے۔

جہاں تک مصطفٰی کمال اتاترک جیسی اصلاحات کے نفاذ کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا نفاذ کسی بھی مسلمان ملک میں ممکن نہیں رہا، اس لیے کہ وہ اصطلاحات خود ترکی میں کامیابی کی منزل حاصل نہیں کر سکیں اور ترک عوام ان اصلاحات کا جوا بتدریج اپنی گردن سے اتارتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے اعلان کے بعد مصطفٰی کمال اتاترک نے ترکی میں اسلامی قوانین کو منسوخ کرنے اور عربی زبان پر پابندی لگانے کے علاوہ مساجد، خانقاہوں اور دینی درسگاہوں کی بندش اور اسلامی اقدار و روایات پر قدغن کی اصلاحات نافذ کی تھیں اور ترکی کو مکمل طور پر ایک ماڈرن یورپین ملک بنانے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ترک عوام اپنے عقیدہ اور دینیات پر ان پابندیوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور گذشتہ صدی کے چھٹے عشرہ میں منتخب وزیراعظم عدنان میندریس شہیدؒ کی قیادت میں ان میں سے بہت سی اصلاحات کا جوا گردن سے اتار پھینکا۔ جبکہ اس کے بعد بھی ترک مسلمان جناب نجم الدین اربکان اور طیب اردگان کی راہنمائی میں بتدریج ان اصلاحات سے پیچھا چھڑانے میں مصروف ہیں۔

کمال اتاترک کی اصلاحات اسلام کے عقائد و عبادات اور معاشرتی نظام سے انحراف اور بغاوت کا اظہار تھا جس کا کسی مسلم معاشرہ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اس کے احکام کے عملی نفاذ سے مسلسل گریز کو مسلم ممالک کے حکمرانوں نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے، مغربی دانشوروں کی پیروی کرتے ہوئے وہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ خلافت کا نظام آج کے دور میں قابلِ عمل نہیں ہے اور اسلامی نظام آج کی دنیا کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ لیکن افغانستان میں طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور میں اسلامی احکام و قوانین کے ذریعے جرائم پر قابو پاکر اور ایک منظم معاشرہ کی طرف پیشرفت کر کے اس پراپیگنڈا کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے اور دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ مسلسل جنگ سے تباہ شدہ معاشرہ میں بھی اسلامی قوانین کے ذریعے نہ صرف امن قائم کیا جاسکتا ہے بلکہ سوسائٹی کو نظم و ضبط کا پابند بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امیر المومنین ملا محمد عمر کے صرف ایک حکم سے ان کے زیر حکومت پورے علاقے میں پوست کی کاشت مکمل طور پر ختم ہوگئی تھی اور اب طالبان کی حکومت ختم ہونے کے بعد افغانستان میں پوست کی ریکارڈ کاشت کی خبریں بین الاقوامی اخبارات میں مسلسل منظر عام پر آرہی ہیں۔

اس لیے جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مغربی دانشوروں اور اسلام دشمن لابیوں کے پراپیگنڈا سے مرعوب نہ ہوں بلکہ اسلامی نظام کو ناقابلِ عمل قرار دینے کی بجائے دستورِ پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کی طرف پیشرفت کریں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر کہلانے کے بعد ان کی سب سے بڑی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم اور عالمی استعمار

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۳ء

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم ہمارے دور کے سیاستدان نہ تھے۔ اس لیے ان کی بہت سی باتوں کو سمجھنا آج کی نسل کیلئے مشکل ہے۔ وہ اس ٹیم کے آخری اور باقی ماندہ فرد تھے جس نے آزادی کی جنگ لڑی اور آزادی کا پروانہ مل جانے کے بعد اس کے تحفظ اور بقا کیلئے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ وہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی ٹیم کے آدمی تھے۔ انہوں نے مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ تقسیم ہند سے قبل وہ آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری جنرل تھے اور برطانوی استعمار کے تسلط سے وطن عزیز کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ وہ معروف معنوں میں نواب اور نوابزادہ تھے اور زندگی بھر اسی لقب سے پکارے جاتے رہے۔ جبکہ مجلس احرار اسلام کی سیاست اس دور میں "نواب دشمنی" سے عبارت تھی۔ احرار کے سیاسی مزاج کے بارے میں اس دور میں یہ کہا جاتا تھا کہ کسی احراری کی جیب میں پانچ روپے ہوں تو وہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ کون سی ریاست کے نواب کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔ اس لیے ایک عرصہ تک میرے ذہن میں بھی یہ الجھن رہی کہ احرار جیسی "نواب دشمن" جماعت میں نصر اللہ خان جیسے "نواب زادہ" کا سیکرٹری جنرل کے منصب تک رسائی حاصل کر لینا آخر کیسے ممکن ہوا؟ مگر جب انہیں قریب سے دیکھا بلکہ بہت ہی قریب سے دیکھا تو بات سمجھ میں آگئی کہ "نواب زادہ" کے لقب کی چادر تو انہوں نے ویسے ہی تان رکھی ہے، اس کے اندر جھانک کر دیکھیں تو ایک ایسے فقیر منش، عوام دوست، اور درویش صفت سیاستدان سے ملاقات ہوتی ہے کہ فقر و درویشی کو بھی اس "نوابی" پر رشک ہونے لگے۔

وہ نہ صرف نماز روزہ کے پابند تھے اور حلال و حرام کا اہتمام کے ساتھ فرق کرنے والے تھے بلکہ میں ان کی شب زندہ داری اور تہجد گزاری کا بھی شاہد ہوں۔ انہوں نے دینی تحریکات کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد میں تو ان کا کردار ہمیشہ قائدانہ رہا ہے۔ انہیں اگر کسی دینی تحریک کے کسی پہلو سے اختلاف بھی ہوا ہے تو اس کا اظہار انہوں نے درون خانہ کیا ہے۔ بر سر عام ایسے کسی اختلاف کے اظہار سے وہ گریز کرتے تھے جس سے دینی تحریک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ وہ معروف معنوں میں خالصتاً ایک سیاسی رہنما تھے۔ ان کا شمار دینی رہنماؤں میں نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے متعدّد دینی تحریکات کے رہنماؤں کو اپنی جدوجہد کے حوالے سے ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور انہیں دینی رہنماؤں کو تحریکوں کے داؤ پیچ سکھاتے ہوئے پایا ہے۔

مجھ سے اگر کوئی نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کی تین بڑی خصوصیات بیان کرنے کیلئے کہے تو میری گزارش یہ ہوگی کہ:

1. وہ اسلام اور پاکستان کے ساتھ اس قدر دوٹوک اور واضح کمٹمنٹ رکھتے تھے کہ ان دو حوالوں سے کوئی ڈھیلی بات سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔

2. عوام کے حق حکمرانی اور جمہوری اقدار کی سربلندی پر وہ اس درجہ کا یقین رکھتے تھے کہ ساری زندگی انہوں نے اسی کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے گزار دی۔
3. اور ان کی استعمار دشمنی کا یہ عالم تھا کہ سیاسی زندگی کا آغاز انہوں نے برطانوی استعمار کے تسلط سے آزادی کی جدوجہد سے کیا اور ان کی ۸۵ سالہ زندگی کا اختتام امریکی استعمار کے تسلط کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے ہوا۔ انہوں نے افغانستان اور عراق پر امریکی یلغار اور پاکستان کے معاملات میں امریکی مداخلت کے خلاف جس بلند آہنگی کے ساتھ آواز اٹھائی وہ پاکستان اور عالم اسلام کے دیگر سیاست دانوں کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام، پاکستان، جمہوریت اور عالم اسلام کیلئے ہر قسم کی مصلحتوں سے بالاتر ہو جایا کرتے تھے اور ان معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت روا رکھنے کے قائل نہیں تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم فرشتہ نہیں تھے، انسان تھے۔ ان سے یقیناً بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی اور ان کی بہت سی باتوں سے لوگوں کو اختلاف رہا ہو گا۔ خود ہمیں بھی ان کی بعض باتوں سے اختلاف تھا لیکن اسلام اور پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور اسلامی و جمہوری اقدار کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اور اپنے مشن اور فکر و عقیدہ کیلئے جدوجہد میں ان کا حوصلہ و عزم اور استقلال و استقامت آنے والی نسلوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ثابت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مولانا شاہ احمدؒ نورانی اور افغان طالبان

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء

بذلہ سنجی اور خوش کلامی ان کا طرہ امتیاز تھی، ہلکے پھلکے جملوں کے ساتھ محفل کا رنگ بدل دینے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ شرافت اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے خوبصورت چوٹ کرتے تھے اور جس پر فقرہ کستے تھے وہ بھی اگر باذوق ہوتا تو چیں بجبیں ہونے کی بجائے حظ اٹھاتا تھا۔ ایک دور میں ان کا زیادہ تر وقت ملک سے باہر گزرنے لگا حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ لطیفہ عام ہو گیا کہ جب وہ پاکستان کے کسی حصے میں ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ مولانا نورانی پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل میری بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی کہ سال کے کئی مہینے ملک سے باہر گزرنے لگے۔

اس پس منظر میں کافی مدت کے بعد میری ان سے ملاقات اس موقع پر ہوئی جب وہ مولانا سمیع الحق کی دعوت پر ”دفاع افغانستان و پاکستان کونسل“ کی تشکیل کے سلسلے میں اکوڑہ خٹک تشریف لے گئے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ مولانا سمیع الحق کی رہائش گاہ میں علماء کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو اٹھ کھڑے ہوئے، بڑے تپاک

سے معانقہ کیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے پوچھنے لگے "مولانا آپ پاکستان کے دورے پر کب آئے ہیں؟" میں نے جواب میں کہا کہ یہی بات میں آپ سے پوچھنے والا تھا اس پر ایک ہلکا سے قہقہہ لگایا اور حال احوال پوچھنے لگے۔

میں نے ان کو پاکستان کی محافل میں بھی دیکھا اور لندن کی محافل میں بھی ان کے ساتھ شرکت کی اور ہر جگہ ان کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا لطف اٹھایا ہے۔ وہ گفتگو اور ملاقات میں جس قدر نرم خو تھے، اپنے اصولوں کے معاملے میں اسی طرح بے لچک اور سخت تھے۔ ایک دور میں کراچی اور حیدرآباد کی سیاست میں ان کی جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اسلامی پاکستان کا غلبہ تھا اور جے یو پی ان دو شہروں سے اچھی خاصی پارلیمانی نشستیں حاصل کیا کرتی تھی۔ پھر ارباب حل و عقد نے ان جماعتوں کا زور توڑنے کیلئے کراچی کو لسانی تفریق کی نذر کر دیا اور مہاجر غیر مہاجر کے نام سے وہ اودھم مچا کہ کراچی کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ مولانا نورانی مہاجر تھے، اگر وہ اس تقسیم کیلئے تھوڑی سی ذہنی لچک دکھا دیتے تو بہت کچھ بچا سکتے تھے بلکہ بہت کچھ حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اصولوں کی خاطر اپنی جماعت کی پارلیمانی قوت قربان کر دی اور مہاجر غیر مہاجر کی تفریق کے خلاف مسلسل کلمۂ حق بلند کرتے رہے۔

انہوں نے جس بلند آہنگی کے ساتھ عالم اسلام کے بارے میں امریکی عزائم اور جارحیت کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا، طالبان کی اسلامی حکومت کو سپورٹ کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان اور عراق میں امریکہ کی مسلح مداخلت اور قبضے کے خلاف رائے عامہ کی رہنمائی کی، اور بڑھاپے اور علالت کے باوجود مسلسل اور متحرک کردار ادا کیا، وہ علماء کی نئی نسل کیلئے مشعل راہ اور دینی و سیاسی رہنماؤں کیلئے لائق رشک اور قابل تقلید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبولیت سے نوازیں، سیئات سے درگزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور جملہ پسماندگان اور متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین!

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء

مولانا نورانیؒ مسلکاً بریلوی تھے اور ڈھیلے ڈھالے نہیں بلکہ متصلب اور پختہ کار بریلوی تھے۔ اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جہاں بھی مسلک کی بات آئی ہے ان میں کوئی لچک دیکھنے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود مشترکہ دینی معاملات میں انہوں نے مشترکہ جدوجہد اور رابطہ و معاونت سے کبھی گریز نہیں کیا۔ سیاسی معاملات ہوں یا دینی، ملک کی مختلف الخیال جماعتوں اور حلقوں کے درمیان رابطہ و مفاہمت کے فروغ اور اتحاد و اشتراک کے اہتمام میں ان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت، افغانستان کی قومی خود مختاری و آزادی کے تحفظ، امریکہ کی استعماری یلغار کی مخالفت، اور پاکستان کے قومی اور داخلی معاملات میں امریکی مداخلت کی مذمت و مزاحمت میں انہوں نے جو شاندار کردار ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کے ایک مستقل باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی دینی قوتوں نے متحدہ مجلس عمل کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کیا تو اس کی سربراہی کیلئے سب سے نمایاں

اور حقدار شخصیت انہی کی سامنے آئی۔ اور وہ ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی، قومی خود مختاری کے تحفظ، دستور کی بالادستی اور عالمی سطح پر امریکی استعمار کی اسلام دشمنی کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرتے ہوئے اس شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ پوری قوم غم واندوہ میں ڈوب گئی۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی کارکن ان کی جدائی کی کسک اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر طبقہ ان کی دینی و قومی خدمات پر خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

خود احتسابی اور ناقدانہ جائزہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء

دوسری بات جس کی طرف ائمہ اور علماء کی اس کانفرنس کے شرکاء کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے احتساب اور اپنی سرگرمیوں کے ناقدانہ جائزہ کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اس بات کو نہ صرف غیر ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً بعض دوست جب یہ بات کرتے ہیں کہ طالبان ہمارے بھائی ہیں، بہت نیک ہیں، مخلص ہیں اور انہوں نے قربانی اور ایثار کی شاندار روایات زندہ کی ہیں، اس لیے ان کی غلطیاں نہیں نکالنی چاہئیں اور ان کے طرز عمل کا ناقدانہ جائزہ نہیں لینا چاہیے، تو مجھے تعجب ہوتا ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے بہترین اور مقدس طبقہ صحابہ کرامؓ کا گروہ ہے، لیکن جب انہیں غزوۂ احد میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور حنین کی لڑائی میں تھوڑی دیر کیلئے ان کے قدم اکھڑے تو قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا اعتراف کیا، اس کے اسباب بیان کیے اور ان وجوہ کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے انہیں ان دونوں غزووں میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے حضرات صحابہ کرامؓ کے تقدس اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور ان کے خلوص اور قربانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اس لیے قرآن کریم کا اسلوب اور ہدایت ہمارے لیے یہی ہے کہ اگر کسی مرحلہ میں ناکامی ہو تو اس کے اسباب کا جائزہ لو اور وجوہات کی نشاندہی کرو تاکہ ان کے ازالہ کیلئے کوئی صورت نکال سکو۔

تحریکاتِ آزادی کا جہاد اور صدر جنرل پرویز مشرف

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۴ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے گذشتہ دنوں اسلام آباد میں ”علماء و مشائخ کنونشن“ سے خطاب کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی قابل توجہ باتیں کی ہیں وہاں مختلف مسلم حلقوں کی جہادی سرگرمیوں کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ یہ

سرگرمیاں دہشت گردی کے زمرہ میں آتی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں جہاد کا اعلان صرف حکومت کا حق ہے اور پرائیویٹ طور پر جہاد کے نام سے کوئی عمل ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں صدر محترم کا یہ کہنا درست نہیں ہے اس لیے کہ کسی ملک کے خلاف جہاد کا اعلان بلاشبہ حکومت ہی کا حق ہے اور حکومت کے سوا کسی فرد یا طبقہ کو کسی بھی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کے اعلان کا حق حاصل نہیں ہے لیکن مسلم معاشرہ پر مسلط ہونے والے کفر کا راستہ روکنا اور کفر و استعمار کے تسلط سے مسلم آبادی کی نجات کیلئے جدوجہد کرنا کبھی حکومت کی اجازت پر موقوف نہیں رہا:

1. ہمارے ہاں فرنگی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جتنی جنگیں لڑی گئیں ہیں جہاد کے پرائیویٹ فتوؤں کی بنیاد پر لڑی گئی ہیں۔
2. افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف کسی حکومت نے جہاد کا اعلان نہیں کیا تھا، یہ اعلان علماء کی طرف سے ہوا تھا جس کا نہ صرف افغان قوم نے ساتھ دیا بلکہ عالمِ اسلام نے ان کی حمایت کی اور خود پاکستانی حکومت اور فوج نے اس میں حصہ لیا۔
3. اسی طرح فلسطین میں اسرائیلی جارحیت اور تسلط کے خلاف آزادی کی جدوجہد کسی حکومتی اعلان کی بنیاد پر نہیں لڑی جارہی بلکہ پرائیویٹ جماعتیں ہیں جو جانفروشی کے جذبہ کے ساتھ اسرائیلی درندگی کے سامنے ڈٹی ہوئی ہیں۔
4. جبکہ آزاد کشمیر کا موجودہ خطہ پرائیویٹ جہاد کے ذریعے پاکستان کا حصہ بنا ہے اور کشمیری عوام کی مسلح جنگ آزادی جہاد ہی کے عنوان سے مسلسل جاری ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ حکومت کے اعلان کے بغیر کوئی جہاد نہیں ہوسکتا ان تمام تحریکاتِ آزادی اور جنگ ہائے حریت کی نفی ہے، جس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۴ جون ۲۰۰۴ء
روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۲ جون ۲۰۰۵ء

مفتی نظام الدین شامزئی کا تعلق سوات سے تھا، انہوں نے دینی علوم کی تکمیل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی میں کرکے وہیں تدریسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ مولانا مفتی نظام الدین شامزئی کا نام میں نے پہلی بار اس وقت سنا جب انہوں نے حضرت امام مہدی کے بارے میں کتاب لکھی۔ امام مہدی کے ظہور کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں ہر دور میں گمراہی پھیلانے والے گروہوں کا نشانہ مشق رہی ہیں اور سینکڑوں افراد نے اب تک امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرکے ان پیش گوئیوں کو خود پر فٹ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ردعمل میں کچھ اہل علم نے سرے سے ان

پیش گوئیوں کی صحت کو ہی موضوع بحث بنا لیا۔ ہمارے ایک دوست مولانا اختر کاشمیری جو ہمارے ساتھیوں میں سے ہیں، ہفت روزہ خدام الدین لاہور اور ہفت روزہ چٹان لاہور کی ادارت کی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں، اچھا لکھنے اور بولنے والوں میں سے تھے، انہوں نے ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد وہاں کا دورہ کر کے اپنا سفرنامہ "آتش کدہ ایران" کے نام سے لکھا جس نے خاصی شہرت حاصل کی، لیکن حضرت مہدی کے بارے میں ان کا قلم افراط و تفریط کا شکار ہو گیا اور انہوں نے اس سلسلے میں احادیث و روایات کو ایک مقالہ میں ہدف تنقید بنایا۔۔۔

مولانا مفتی نظام الدینؒ شامزئی نے جو ان دنوں جامعہ فاروقیہ کراچی میں مدرس تھے، اس کا جواب لکھا اور معقول استدلال کے ساتھ اس سلسلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ثابت کیا کہ حضرت مہدی کے بارے میں آنحضرتؐ کی پیش گوئی والی روایات صحیح ہیں اور انہیں ہدف تنقید بنانا درست نہیں ہے۔ مفتی صاحبؒ نے امت کو اعتدال کا راستہ دکھایا اور واضح کیا کہ ان پیش گوئیوں کو غلط طور پر استعمال کرنے والے خود ساختہ مہدیوں کا موقف غلط اور گمراہی پر مبنی ہے، لیکن اس کے ردعمل میں سرے سے ان پیش گوئیوں اور احادیث کا انکار کرنا یا انہیں مجروح ثابت کرنے کی کوشش کرنا درست طرز عمل نہیں ہے۔ امام مہدی اپنے وقت پر آئیں گے اور جناب رسول اللہؐ کی پیش گوئیوں کے مطابق ہی آئیں گے، اسی بات پر جمہور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ مفتی نظام الدینؒ شامزئی کے ساتھ میرا پہلا تعارف جو غائبانہ تھا، ان کی اس کتاب کے ذریعے ہوا اور ان کا مقالہ پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ علمی انداز میں انہوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

اس کے بعد کراچی میں حاضری کے ایک موقع پر مفتی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو ان کی سادگی اور علمی ذوق دیکھ کر اور زیادہ متاثر ہوا کہ پرانے اسلاف اور بزرگوں کی روایات کو قائم رکھنے کا جذبہ نوجوان علماء میں موجود ہے اور یہ بات جہاں بھی دیکھتا ہوں، اطمینان اور حوصلے میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور جمعیت علماء اسلام کے بہت سے امور میں وقتاً فوقتاً باہمی مشاورت ہوتی رہی۔ وہ افتاء اور تدریس کے ساتھ ساتھ سیاست کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے اور جمعیت علماء اسلام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے۔

ایک موقع ایسا آیا کہ ایک بیرونی سفر میں چند روز کیلئے ان کے ساتھ رفاقت ہو گئی۔ جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین کے خاتمے اور وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی آزادی کے بعد ان ریاستوں کے علماء کے ساتھ رابطوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پاکستان سے علماء کرام اور دینی رہنماؤں کے متعدّد وفود نے وسطی ایشیا کی ریاستوں کا دورہ کیا۔ ایک وفد میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ میں معمول کے مطابق موسم گرما میں لندن جا رہا تھا اور میں نے ازبک ایئر لائن کے ذریعے سفر کا ارادہ کیا، خیال تھا کہ راستے میں چند روز تاشقند میں رہنے کا موقع مل جائے گا۔ وہاں کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ علماء کا ایک وفد ازبکستان جا رہا ہے، آپ بھی اس کے ساتھ ہی پروگرام بنا لیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وفد میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، مولانا فداء الرحمن درخواستی اور مولانا مفتی نظام الدینؒ شامزئی بھی شامل تھے، جبکہ مفتی جمیل خان شہیدؒ وفد کے منتظم تھے۔ اس سفر میں تاشقند کے علاوہ سمرقند اور خرتنگ بھی جانا ہوا۔ خرتنگ میں حضرت امام بخاری رحمہ اللہ

کی قبر ہے۔ وہاں حاضری ہوئی اور فاتحہ خوانی اور دعا کے علاوہ ایک بات اور ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی بخاری شریف ساتھ لے گئے تھے، انہوں نے حضرت امام بخاریؒ کی قبر کے ساتھ بیٹھ کر امام بخاریؒ تک اپنی سند کے ساتھ ایک روایت بلند آواز سے پڑھی اور بتایا کہ پرانے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ جب امام بخاریؒ کی قبر پر حاضری ہوتی تو ان تک اپنی سند کے ساتھ بخاری شریف کی ایک روایت پڑھتے۔ مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے بھی اس موقع پر یہ روایت پوری کی اور ہم سب ان کے ساتھ شریک تھے۔

اس سفر میں مفتی صاحبؒ کی ایک اور خصوصیت سامنے آئی کہ وہ دوران سفر اور شور و شغب میں بھی اپنا عمل شغل جاری رکھ سکتے ہیں۔ میرا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے کہ شور و شغب اور دیگر مصروفیات کے ماحول میں لکھنے پڑھنے کا کام میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے اس کام کیلئے خاموشی اور تنہائی درکار ہوتی ہے مگر مفتی صاحب کو دیکھا کہ کتابوں کا بستہ ساتھ ہے، جہاں موقع ملا کھول کر بیٹھ گئے اور قلم کاغذ سنبھال لیا۔ باقی دوست گپ شپ میں مصروف ہیں اور مفتی صاحب اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک اور فاضل دوست مولانا سعید الرحمن علویؒ کا بھی یہی معمول تھا، وہ دوران مجلس لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں بھی پوری طرح شریک ہوتے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت رشک ہوتا کہ میں اس صلاحیت سے محروم ہوں۔ بعض حضرات کو دیکھتا ہوں کہ سفر کے دوران مطالعہ کر لیتے ہیں، ان پر بھی مجھے رشک آتا ہے کہ وہ اپنا بہت سا کام دوران سفر ہی نمٹا لیتے ہیں، جبکہ مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا، بمشکل اخبار وغیرہ پڑھ پاتا ہوں۔ بہرحال ازبکستان کے سفر میں مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کے ساتھ اچھی رفاقت رہی اور اس سفر کی بہت سی یادیں ذہن میں وقتاً فوقتاً تازہ ہوتی رہتی ہیں۔

طبیعت میں سادگی اور زندہ دلی تھی، دوستوں کے ساتھ بے تکلف رہتے تھے اور ہنسی مزاح کا شغل چلتا رہتا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں تھا کہ عمر میں شاید مجھ سے بڑے ہوں گے مگر ایک مرتبہ سن ولادت دریافت کی تو غالباً ۱۹۵۲ء بتائی۔ میں نے دل لگی سے کہا کہ مفتی صاحب! یہ بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی، میں خواہ مخواہ اب تک آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا رہا ہوں۔ آپ تو میرے چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس قارن سے بھی عمر میں چھوٹے ہیں۔ یہ سن کر بہت ہنسے لیکن یہ بہرحال دل لگی کی بات تھی۔ مفتی صاحب عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود علم و فضل اور دینی جدوجہد کے جذبہ و حوصلہ میں مجھ سے کہیں آگے تھے اور آخری عمر میں تو ان کی جدوجہد ہم سب کیلئے قابل رشک تھی۔

قومی سطح پر مفتی نظام الدین شامزئی اس وقت ابھرے جب انہوں نے خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کی موجودگی کے خلاف عرب علماء کی احتجاجی تحریک کی حمایت میں فتویٰ دیا اور ملک کے مختلف حصوں میں سیمینار منعقد کر کے اہل دانش کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ جو عرب علماء سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف احتجاج اور خلیج عرب سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کا موقف درست ہے اور ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ اسامہ بن لادن نے اس موقف کا پرچم بعد میں بلند کیا جبکہ ڈاکٹر سفر الحوالیؒ، الشیخ سلمان عودہؒ، ڈاکٹر سعد الفقیہ اور ڈاکٹر محمد المسعری جیسے ممتاز عرب علماء و دانشور پہلے سے ہی اس کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ ایک موقع پر حرمین شریفین کے امام محترم الشیخ علی حذیفی نے بھی مسجد نبوی میں جمعۃ المبارک کے خطبے کے

دوران اہل دین کے اس موقف کی ترجمانی کی تھی۔

خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی آمد اور اس کے خلاف سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کے علماء کی دینی جدوجہد کے آغاز کا مرحلہ بہت اضطراب انگیز تھا اور پاکستان میں اس کے بارے میں آواز بلند کرنے میں بظاہر بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنے دو تین کالموں کے ذریعے اس مسئلے کو چھیڑا اور پاکستان کے دینی حلقوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا تو مجھے بعض دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ کس آگ میں ہاتھ ڈال رہے ہو؟ مگر میرے لیے بالکل خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اسے میری کمزوری سمجھ لیں یا حکمت عملی کہ کوئی مسئلہ سامنے آئے تو اس کی نشان دہی، اس کے بارے میں دینی حلقوں کو توجہ دلانے اور متعلقہ حضرات کی ضروری بریفنگ تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہوں۔ اس کے بعد میری خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا حلقہ اس کام کو سنبھال لے جو اس کیلئے عملی جدوجہد کے تقاضے پورے کر سکتا ہو، کیونکہ بہت سے ایسے تقاضوں کو عملاً پورا کرنا میرے بس میں نہیں ہوتا اس لیے جب کوئی حلقہ یا بزرگ اس کام کو سنبھال لیتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور میں حتی الوسع تعاون بھی کرتا ہوں۔

خلیج عرب میں امریکی افواج کی آمد اور سعودی عرب کے علماء حق کی احتجاجی جدوجہد کے حوالے سے مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی اور مسرت ہوئی کہ اسے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے حلقے نے اور پھر حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے سنبھال لیا اور اس خوبی کے ساتھ سنبھالا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ جب ان بزرگوں نے خلیجی ممالک میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف علم احتجاج بلند کیا اور پاکستان کے دینی حلقوں کو بیدار کرنے کی مہم شروع کی تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مفتی نظام الدین شامزئی نے مختلف سیمیناروں میں ملک کے سرکردہ دانش وروں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا اور ان کے سامنے خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی اور ان سے عالم اسلام اور حرمین شریفین کو درپیش خطرات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ پورے ملک میں بیداری کی لہر پیدا کر دی اور جس مسئلے کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ عرصہ پہلے تک زبانیں رک رک جایا کرتی تھیں، وہ ملک کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی روزمرہ گفتگو کا موضوع بن گیا۔

اس موقع پر علماء کرام کی طرف سے ایک فتویٰ بھی سامنے آیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری وصیتوں میں تلقین فرمائی تھی کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اسی وصیت پر عمل درآمد کرتے ہوئے اپنے دور خلافت میں خیبر سے یہود کو اور نجران سے نصاریٰ کو جلا وطن کر دیا تھا، اس لیے جزیرۂ عرب اور خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کی موجودگی اور اس خطے کے ممالک میں امریکہ کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی اور وصیت کی خلاف ورزی ہے۔ اس فتوے اور موقف کی وضاحت اور قومی سطح پر اسے اجاگر کرنے میں مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے متحرک اور بھرپور کردار ادا کیا۔

مفتی شامزئی شہیدؒ جہاد افغانستان اور طالبان کی اسلامی حکومت کے عملی سرپرستوں میں سے تھے۔ انہوں نے طالبان حکومت کے دفاع اور پشت پناہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ہر ممکن ذریعے سے جہاد افغانستان کے منطقی نتائج کے تحفظ اور طالبان حکومت کی پشت پناہی میں مصروف رہے۔ افغانستان پر امریکی حملہ اور امریکی جارحیت کے حوالے سے

حکومت پاکستان کا کردار عالم اسلام کے بڑے سانحات میں سے ہے جن پر دینی حلقوں نے ہمیشہ شدید غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں مفتی نظام الدین شامزئی کی آواز سب سے زیادہ بلند اور توانا رہی ہے۔ مفتی نظام الدین شامزئی صرف روایتی عالم دین نہیں تھے بلکہ ملتِ اسلامیہ کے مصائب پر کڑھنے والے اور امت کی مشکلات کے حل کی تلاش میں مضطرب و بے چین رہنے والے حق گو راہنما بھی تھے، حتیٰ کہ اسی راہ میں انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۸ جون ۲۰۰۴ء

مولانا مفتی نظام الدین شامزئی کی المناک شہادت اور ٹارگٹ کلنگ پر گزشتہ روز ملک بھر میں متحدہ مجلس عمل کی اپیل پر یوم احتجاج منایا گیا۔ مختلف شہروں میں ہڑتال ہوئی، احتجاجی مظاہرے ہوئے اور جمعۃ المبارک کے اجتماعات میں اس وحشیانہ قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا۔

مفتی نظام الدینؒ شامزئی سوات سے تعلق رکھنے والے ایک بے باک اور حق گو عالم دین تھے، انہوں نے جامعہ فاروقیہ کراچی میں تعلیم پائی اور وہیں تدریس و افتاء سے منسلک ہو گئے۔ سالہا سال تک مادر علمی میں خدمات سرانجام دینے کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن سے وابستہ ہوئے اور آخر دم تک علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی قائم کردہ اس عظیم درسگاہ میں علمی و تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، باون برس کی عمر میں عروس شہادت سے ہمکنار ہوئے۔ مگر اس مختصر عمر میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں اور علمی و دینی حلقوں میں جو مقام حاصل کیا وہ بلاشبہ قابل رشک ہے۔ ان کی تیز رفتاری کی وجہ اب سمجھ میں آتی ہے کہ وقت تھوڑا اور کام زیادہ تھا اور جسے تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنے کی ڈیوٹی سونپ دی جائے اس کی رفتار یہی ہوتی ہے۔

مفتی صاحبؒ سے پہلی ملاقات مجھے یاد نہیں کہ کب ہوئی تھی مگر آخری ملاقات تبلیغی اجتماع کے رائے ونڈ کے گزشتہ سال کے سالانہ اجتماع میں ہوئی جب والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا حسن جان، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر اور حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی پر مشتمل اکابر علماء کرام کے ایک وفد نے بھارت سے تشریف لانے والے تبلیغی جماعت کے بزرگوں حضرت مولانا سعد، حضرت مولانا زبیر، حضرت مولانا احمد لاٹ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم آف گجرات سے بطور خاص ملاقات کی اور اہم امور پر ان بزرگوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ مفتی محمد جمیل خان، مولانا سعید احمد جلال پوری اور راقم الحروف بھی اس وفد میں شریک تھے۔ اس گفتگو میں زیر بحث آنے والے امور انتہائی اہم تھے مگر ان کا اظہار سردست ضروری نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا مفتی نظام الدین شامزئی سے غالباً کوئی ملاقات نہیں ہوئی، البتہ ایک پرانی ملاقات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جب سرکردہ علماء کرام کے ایک وفد نے ازبکستان کا دورہ کیا اور تاشقند، سمرقند اور خرتنگ کے مسلمانوں اور علماء سے ملاقاتیں کیں۔ اس وفد میں مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر اور مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی شامل تھے۔ چند روز رفاقت رہی اور اس دوران مفتی نظام الدین شامزئی کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا علمی شغل تھا جو سفر کے دوران بھی جاری رہا۔ کسی موضوع پر علمی کام کر رہے تھے، ضروری کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان ساتھ رکھا ہوا تھا، جہاں موقع ملتا مطالعہ میں لگ جاتے اور جہاں گنجائش پاتے لکھنا شروع کر دیتے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی اور بہت رشک آیا کہ میں کوشش اور خواہش کے باوجود اپنے مزاج کو اس رخ پر نہ ڈھال سکا۔ مجھے مطالعہ اور لکھنے کیلئے تنہائی درکار ہوتی ہے، رواروی میں اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کئی روز تک نہیں لکھ پاتا اور اہم عنوانات ذہن میں ہونے کے باوجود رہ جاتے ہیں۔

مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کے نامہ اعمال میں بہت سی نیکیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑی سی عمر میں انہیں بہت سے اعمال صالحہ سمیٹنے کا موقع اور توفیق عطا فرمائی ہے۔ ان کی خدمات کی فہرست لکھنے کیلئے اگر مجھے کہا جائے تو میں سب سے پہلے ان کے اس جرأت مندانہ کردار کا تذکرہ کروں گا جو انہوں نے پاکستان کے دینی حلقوں میں خلیج عرب میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف بیداری اور احتجاج کی فضا پیدا کرنے کیلئے ادا کیا۔ یہ وقت وہ تھا جب سعودی عرب کے اکابر علماء کرام نے شاہ فہد کے نام ایک عرضداشت میں خلیج میں یہود و نصاریٰ کی فوجوں کے اجتماع کے خلاف احتجاج کیا اور حرمین شریفین کے محترم امام الشیخ علی حذیفی مدظلہ نے مسجد نبویؐ میں خطبہ جمعۃ المبارک کے دوران سابقہ روایت سے ہٹ کر مشرق وسطیٰ میں یہود و نصاریٰ کے معاندانہ کردار کو موضوع بحث بنایا۔ پاکستان میں اس وقت سعودی حکومت کے احترام کی وجہ سے دینی حلقوں میں اس مسئلہ پر خاموشی جیسی کیفیت طاری تھی، ابتدا میں بعض کالموں میں اس مسئلہ کو چھیڑنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی مگر حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی قدس اللہ سرہ العزیز اور حضرت مولانا مفتی نظام الدینؒ شامزئی نے اس مسئلہ کو جس جرأت و حوصلہ اور عزم و ولولہ کے ساتھ اٹھایا اس نے اگلی پچھلی ساری کسریں نکال دیں۔ بلکہ مفتی نظام الدین شامزئی نے تو اسے زندگی کا مشن بنا لیا۔ اس حوالے سے جب پاکستان کے دینی حلقوں میں پائی جانے والی موجودہ بیداری کو دیکھتا ہوں اور سابقہ حالات سے اس کا موازنہ کرتا ہوں تو میرا سر فرط عقیدت سے ان دونوں بزرگوں کے سامنے جھک جاتا ہے اور دل بے ساختہ انہیں دعائیں دینے لگتا ہے۔

افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی سرپرستی اور مسلسل پشت پناہی مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے جس کا تذکرہ ان کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین میں کثرت کے ساتھ ہو رہا ہے، اس لیے میں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے بہت سے تجزیہ نگاروں کے ساتھ میں بھی اس بات سے متفق ہوں کہ مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت اور ٹارگٹ کلنگ کا تعلق انہی دو مسائل سے ہے۔ اور ان کی شہادت سے پہلے اور بعد میں جس فرقہ وارانہ دہشت گردی کا کراچی میں اہتمام کیا گیا وہ اس رخ سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے ہے تاکہ مفتی نظام الدین شامزئی کا یہ قتل بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کے دھندلکوں میں گم ہو کر رہ جائے۔

راہِ حق میں مفتی نظام الدین شامزئی کا قتل پہلا قتل نہیں ہے، صرف کراچی کی حد تک اس سے قبل جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کے شیخ الحدیث مولانا انیس الرحمان درخواستیؒ شہید ہوئے، جامعہ فاروقیہ کے معزز اساتذہ نے جام شہادت نوش کیا، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ اس دہشت گردی کا نشانہ بنے، حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختارؒ اور حضرت مولانا عبدالسمیعؒ اس درندگی کی زد میں آئے، اور اب مولانا مفتی نظام الدینؒ شامزئی بھی اس شاہراہِ شہادت پر چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جا ملے ہیں۔ ان کی شہادت پر ہونے والے ملک گیر احتجاج سے ہم متفق ہیں، ان کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کرتے رہنا ضروری ہے اور اس ٹارگٹ کلنگ کی پشت پر کارفرما اصل قوتوں کو بے نقاب کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ مگر اس سب کچھ کا نتیجہ حسب سابق رہے گا اور موجودہ سسٹم سے یہ توقع رکھنا عبث ہوگا کہ وہ اس وحشیانہ قتل کا سراغ لگانے اور اس قسم کی المناک وارداتوں کی روک تھام کیلئے کوئی کردار ادا کر سکے گا۔

چنانچہ اصل ضرورت مفتی صاحب شہیدؒ کے مشن کو زندہ رکھنے اور ان کی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی ہے۔ اسلام کی سربلندی، دینی قوتوں کی بیداری، استعماری قوتوں کو بے نقاب کرنا، یہود و نصاریٰ اور ہنود کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے مسلمانوں کو باخبر رکھنا، نئی نسل کو مرعوبیت سے بچاتے ہوئے دشمن کے خلاف ذہنی اور فکری طور پر تیار کرنا، اور کسی ملامت و خوف و تحریص کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہر محاذ پر حق کی آواز بلند کرتے رہنا ہر دور میں اہلِ حق کا شعار رہا ہے۔ مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ بھی اسی شعار کے نمائندہ تھے اور ان کے ساتھ محبت اور وفا کا تقاضا یہی ہے کہ اس شعار کا پرچم بلند رہے اور اس میں کوئی جھول نہ آنے پائے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور بلند سے بلند تر درجات سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

امریکی صدر کا افغان صدر کو مشورہ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۶ جون ۲۰۰۴ء

۱۹ جون کو لاہور سے پی آئی اے کے ذریعے نیویارک آتے ہوئے راستہ میں جہاز دو گھنٹے کیلئے مانچسٹر میں رکا تو روزنامہ جنگ لندن دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ افغانستان کے صدر حامد کرزئی گذشتہ دنوں جب امریکہ کے صدر بش سے ملے تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ امریکہ میں رہنا چاہتے ہیں اور وہاں قیام کو پسند کرتے ہیں مگر صدر بش نے انہیں بے ساختہ جواب دیا کہ وہ افغانستان جاکر اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس سوال جواب کے پیچھے ماضی کی ایک پوری دنیا آباد ہے مگر اس سے قبل ہم اس حقیقت کا اعتراف ضروری سمجھتے ہیں کہ واقعی جو شخص امریکہ میں آتا ہے اس کا یہاں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کی ظاہری سہولتوں کی جس قدر فراوانی امریکہ میں ہے کسی دوسرے ملک بالخصوص تیسری دنیا اور مسلم دنیا کے کسی ملک میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سہولتیں اسباب و وسائل کی فراہمی کے حوالے سے بھی ہیں اور قانون کی عملداری کے حوالے سے بھی ہیں۔

امریکہ کو سائنس و ٹیکنالوجی اور سیاست و معیشت میں اس وقت دنیا پر بالادستی حاصل ہے اور پوری دنیا کے نظام اور

معاملات چلانے والے بین الاقوامی اداروں پر نہ صرف امریکہ کا کنٹرول ہے بلکہ وہ عملاً اس کے سامنے بے بس ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے اور اس کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے پر مجبور ہیں۔ یہ ڈرامہ ساری دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ اقوامِ متحدہ اور دیگر بین الاقوامی ادارے امریکہ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف قراردادیں بھی پاس کر لیتے ہیں لیکن امریکہ جب کوئی کام کرنے پر آجاتا ہے تو وہ ایک طرف دبک کر خاموش تماشائی بن جاتے ہیں اور امریکہ کو وہ کام کرنے سے روکنے میں کوئی عملی کردار ادا نہیں کر پاتے۔ افغانستان اور عراق کے معاملات میں دنیا نے دیکھ لیا کہ افغانستان کے بارے میں تو اقوامِ متحدہ سے امریکہ نے کسی نہ کسی طرح آشیرباد حاصل کر لی تھی لیکن عراق کے مسئلہ میں اس نے اور برطانیہ نے اتنے تکلف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور سب کچھ کر گزرنے کے بعد اب اپنی کارروائیوں کو دوام بخشنے کیلئے اقوامِ متحدہ کا سہارا لینے میں پھر سے کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کی بالادست تہذیب کا مرکز ہے اور اگرچہ اس تہذیب کو اخلاقی قدروں اور عدل وانصاف کی حمایت حاصل نہیں ہے مگر سیاست و معیشت، سائنس و ٹیکنالوجی اور خوفناک عسکری قوت کی پشت پناہی اسے یقیناً میسر ہے اور اسی کے بل بوتے پر اس نے دنیا پر اپنے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کی فضا قائم کر رکھی ہے۔

والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے ۱۹۸۶ء میں برطانیہ کا تین ہفتے کا دورہ کیا تھا اور جمعیت علماء برطانیہ کی ''عالمی توحید و سنت کانفرنس'' میں شرکت کے علاوہ بہت سے علماء اور دانشوروں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ ایک دانش ور سے اپنی گفتگو کا قصہ سناتے ہیں کہ اس نے سوال کیا کہ آپ نے برطانیہ کے دورے کے دوران کیا محسوس کیا ہے؟ حضرت شیخ مدظلہ نے جواب دیا کہ آپ لوگوں نے جسم کی سہولت اور آرام کیلئے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے لیکن روح کیلئے آپ کچھ نہیں کر رہے۔ اس انگریز دانش ور نے اس بات کی تائید کی اور کہا کہ آپ نے صورتحال کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مغرب نے مذہب سے دست بردار ہو کر اس دنیا کو ہی سب کچھ قرار دے لیا ہے اس لیے تمام وسائل واسباب کو اسی زندگی کیلئے آسانیاں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں اور اس کی دیکھا دیکھی مشرق اور عالم اسلام میں بھی سہولتوں اور آسانیوں کا فروغ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر کام مشین کے ذریعے لینے کی کوشش ہو رہی ہے اور جسمانی مشقت کے امکانات کو کم سے کم کرنے کیلئے بے پناہ وسائل خرچ کیے جا رہے ہیں۔ گذشتہ شب واشنگٹن میں پینٹاگون کے قریب ایک محلہ میں ایک پاکستانی دوست نے، جو صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے ریسٹورنٹ کے نئے شعبے کے افتتاح کے موقعہ پر اعزازی ڈنر کا اہتمام کیا جس میں مولانا عبدالحمید اصغر اور راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ یہاں پاکستانی ریسٹورنٹوں پر کھانا کھانے والوں کا خاصا ہجوم ہوتا ہے اور خاص طور پر امریکی باشندے جو پھیکے کھانوں کے عادی ہیں چٹ پٹے پاکستانی کھانے شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ ریسٹورنٹ صبح گیارہ بجے کھلتا ہے لیکن جب وہ اپنے کسی اور کام کیلئے ایک روز ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ریسٹورنٹ میں آئے تو دروازے پر سات آٹھ افراد لائن میں کھڑے تھے کہ جب ریسٹورنٹ کھلے گا تو وہ پہلے داخل ہوں گے۔ اس ریسٹورنٹ میں کھانا پکانے، آٹا گوندھنے اور دیگر اشیاء خوردونوش تیار کرنے کا مشینی نظم دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ اب تو صرف یہ کسر رہ گئی ہے کہ روٹی کا لقمہ توڑنے اور منہ تک لے جانے کیلئے کوئی مشین ایجاد ہو اور انسان اس ''مشقت'' سے

بھی نجات پا جائے۔

اس سہولت پسندی اور راحت طلبی نے جہاں انسان کو آسانیاں فراہم کی ہیں وہاں بہت سے مسائل بھی کھڑے کر دیے ہیں۔ فطری مشقت سے محرومی کے بعد انسانی جسم نئی نئی بیماریوں کا شکار بن رہے ہیں اور جسم کو جو مشقت طبعی طور پر درکار ہے اس کیلئے مصنوعی طریقے ایجاد کیے جا رہے ہیں۔ مغرب کا پروگرام نرالا ہے کہ روح کے سکون اور قلب و ذہن کی طمانینت کے فطری طریقوں سے دست بردار ہو کر اسے سکون کیلئے مصنوعی طریقوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے، حتٰی کہ منشیات کے فروغ نے مغرب کی پریشانی کو انتہاء تک پہنچا دیا ہے مگر وہ اس کے اسباب و عوامل اور محرکات پر غور کرنے اور ذہن و قلب کے اطمینان کے فطری طریقوں کی طرف واپسی کیلئے تیار نہیں ہے۔ اسی طرح جسمانی مشقت سے نجات اور سہولت و راحت کے نتائج دیکھنے اور اس کیلئے متبادل صورتیں ایجاد کرنے پر مجبور ہونے کے باوجود وہ جسمانی تعیش کی دوڑ کی رفتار کم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ مشینی دور کا کرشمہ ہے کہ انسانی جسم کو مشقت سے بچانے کا کام بھی مشینیں کر رہی ہیں اور پھر اسے ضروری مشقت دلانے کا کام بھی مشینوں کے سپرد ہے۔

دولت اور سہولتوں کی یہی فراوانی ہے جس نے ایک دنیا کو مغربی معاشرت کا دلدادہ بنا رکھا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ کھنچے چلے آ رہے ہیں اور تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے بہت سے لوگ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح امریکہ، برطانیہ یا کسی مغربی ملک میں قیام کی اجازت مل جائے جہاں روزگار بھی ہے اور زندگی کی سہولتیں بھی ہیں، امن و امان بھی ہے اور ڈسپلن بھی ہے۔ جبکہ تیسری دنیا اور عالم اسلام کے ممالک میں بدقسمتی سے ان میں سے کسی بات کا تحفظ اور ضمانت موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مغرب کی پالیسی اور حکمت عملی کا حصہ ہے کہ اس نے اس حوالے سے بھی دوہرا معیار قائم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے اکثر و بیشتر حکمران اور سرکاری مشینری کے کارندے مغرب ہی کے شاگرد ہیں جنہوں نے براہ راست مغرب سے یا نوآبادیاتی دور میں مغرب کے مسلط کردہ نظام تعلیم سے تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اور یہ مغرب کے دوہرے نظام اور معیار کا کرشمہ ہے کہ اس نے اپنے ملک کا نظام چلانے کیلئے جن لوگوں کو تربیت اور ٹریننگ دی ہے وہ آج کل صحیح طریقہ سے سسٹم کو چلا رہے ہیں لیکن اسی مغرب نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر تیسری دنیا اور مسلم ممالک کا نظام چلانے کیلئے جو کھیپ تیار کی ہے اس میں بدعنوانی، نااہلی اور کرپشن کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔

یہ صرف حامد کرزئی کی بات نہیں بلکہ جو بھی یہاں آتا ہے اس کا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دس پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ لندن کے علاقہ ساؤتھال میں ایک سکھ دوست نے مجلس میں سوال کیا کہ کیا بات ہے جب ہم یہاں آ کر کچھ دیر رہتے ہیں تو پھر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا اور یہاں کے درو دیوار اچھے لگنے لگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان درو دیوار کی بنیادوں میں ہمارا ہی خون ہے کیونکہ نوآبادیاتی دور میں ہمارے خون پسینے کی کمائی کا استحصال کر کے مغرب نے ترقی اور خوشحالی کی راہیں ہموار کی ہیں اس لیے جہاں خون کا تعلق ہو انس کا پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ اس پر وہ سکھ سردار کہنے لگا " گیانی جی! تساں ٹھیک آکھیا اے" (صوفی جی! آپ نے صحیح کہا ہے)۔ امریکہ کو دیکھ لیجیے اس کی ترقی اور بلند و بالا عمارتوں کی بنیادوں میں ان لاکھوں غلاموں اور سیاہ فاموں کی ہڈیاں دفن ہیں جنہیں بحری جہازوں میں بھر بھر افریقہ سے

لایا جاتا تھا اور ان سے جانوروں کی طرح مشقت لی جاتی تھی۔ اگر ان لاکھوں سیاہ فام غلاموں کی محنت و مشقت کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو امریکہ کی ترقی و خوشحالی کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو کر رہ جاتی ہے۔

آج بھی ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور دیگر بین الاقوامی مالیاتی ادارے یہی کچھ کر رہے ہیں۔ سود کے استحصالی نظام نے پوری دنیا کی معیشت کو جکڑ رکھا ہے۔ مغرب نے دولت کے وسائل اور مراکز پر نہ صرف زبردستی قبضہ جما رکھا ہے بلکہ تجارت، صنعت اور بینکاری کا ایسا نظام دنیا پر مسلط کر دیا ہے جس میں دولت کے بہاؤ کے سارے راستے مغرب یا ان کے ہمنوا ممالک کی طرف جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی دولت اور اسباب دولت پر چند ممالک کی اجارہ داری ہے جن کی کمان مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے جدھر دولت کا بہاؤ ہو گا دولت کے طلب گاروں کا رخ بھی ادھر ہی ہو گا، یہ فطری بات ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ البتہ حامد کرزئی کا معاملہ تھوڑا سا مختلف ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے امریکہ میں رہ رہے تھے، کاروبار بھی تھا اور اطمینان بھی تھا کہ اچانک ان کے سر پر صدارت کا تاج رکھ دیا گیا اور انہیں "تختِ کابل" پر رونق افروز کر دیا گیا جہاں ایک طرف طالبان ہیں جو اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود افغان عوام کے دلوں میں موجود ہیں، دوسری طرف قبائلی سردار ہیں جنہیں راضی رکھنا اور ان کی خواہشات کو پورا کرنا حامد کرزئی کیلئے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے، اور تیسری طرف مغربی آقاؤں کا ایجنڈا ہے جس کی تکمیل کی طرف پیش رفت کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ ایسے میں اگر حامد کرزئی افغانستان کی صدارت کی بجائے امریکہ کے کسی شہر میں قیام کو ترجیح دے رہے ہیں تو ان کی بات ناقابل فہم نہیں، مگر یہ بات صدر بش کو کون سمجھائے، انہیں بہر حال اپنے کام سے غرض ہے اور حامد کرزئی یہ کام امریکہ کے بارونق شہروں میں نہیں بلکہ کابل کے کھنڈرات میں رہ کر ہی کر سکتے ہیں۔

بات ملّا محمد عمر یا مولوی فضل ہادی شنواری کی نہیں ...

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۴ء

ہفت روزہ ضرب مومن کراچی کی رپورٹ کے مطابق افغانستان کے صدارتی انتخاب میں ایک امیدوار کو نااہل قرار دینے پر سپریم کورٹ کے مولوی فضل ہادی شنواری صاحب کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی ہے اور افغانستان میں امریکی سفیر زلمے خلیل زاد نے ان کے اس فیصلے کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق افغانستان کے صدارتی الیکشن میں حصہ لینے والے امیدواروں میں سے ایک صاحب نے گذشتہ دنوں کسی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے انسانی حقوق کے حوالے سے قرآن کریم کے بعض احکام پر تنقید کی اور کہا کہ قرآن کریم کی یہ آیات ان حقوق کے عالمی تصور سے متصادم ہیں، اور وہ برسرِ اقتدار آنے کی صورت میں ان آیات پر عمل کرنے کی بجائے انسانی حقوق کی پاسداری کا اہتمام کریں گے۔ افغانستان کی عدالتِ عظمیٰ کے سربراہ مولوی فضل ہادی شنواری نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے اس امیدوار کو صدارتی الیکشن میں حصہ لینے سے روک دیا ہے اور نااہل قرار دیا ہے۔ جس پر امریکی سفیر نے سخت ردعمل اور غصہ کا اظہار کیا ہے اور کرزئی حکومت سے کہا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر فائز رکھنے کی پالیسی پر نظر ثانی کی جائے۔

مولوی فضل ہادی موصوف اس سے پہلے بھی اُس موقع پر مغربی حکمرانوں کی تنقید اور غصہ کا نشانہ بنے تھے جب انہوں نے کابل میں مغربی حکمرانوں اور این جی اوز کی طرف سے پھیلائے جانے والے ویڈیو سنٹروں اور کیبل نیٹ ورک کے مراکز کو فحاشی اور بے حیائی کے فروغ کا باعث قرار دے کر بند کرنے کا حکم دیا تھا، اور اپنے حکم پر عملدرآمد کراتے ہوئے ان مراکز کو بند کرنے کا اہتمام بھی کیا تھا۔

مولوی فضل ہادی شنواری طالبان کے شدید مخالفین میں سے ہیں اور اس وجہ سے بھی کرزئی حکومت میں انہیں یہ اعلیٰ منصب ملا ہے، لیکن بہرحال مولوی ہیں اور دینی تعلیمات سے بہرہ ور ہیں، اس لیے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی نفی اور افغانستان میں فحاشی، بے حیائی اور مغرب کی عریاں ثقافت کے فروغ کو برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اس کا عملاً اظہار کر دیا ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس کے ساتھ ہم ان کی استقامت کیلئے بھی دعاگو ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ایک اور بات بھی پھر سے واضح ہوگئی ہے کہ افغانستان میں امریکہ کا اصل ہدف طالبان یا ان کی حکومت نہیں تھی بلکہ اسلام اور اس کی اقدار ہیں۔ طالبان چونکہ اسلامی نظام اور اقدار کی نمائندگی کرتے تھے اس لیے وہ زد میں آگئے، ورنہ افغانستان میں جو بھی اسلام کی بات کرے گا یا قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے تحفظ کی طرف پیشرفت کرے گا، وہ کسی بھی طبقہ اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو، امریکہ اور مغرب کے غیض و غضب کا نشانہ ہوگا۔ بات ملا عمر کی یا مولوی فضل شنواری کی نہیں، اسلام کی ہے۔ اور عالمِ اسلام میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی موجودہ ہمہ گیر مہم کا اصل ہدف اسلام اور اس کی تہذیب و ثقافت ہے۔

یاسر عرفات مرحوم

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۸ نومبر ۲۰۰۴ء

یاسر عرفات بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہیں رملہ میں ان کے ہیڈ کوارٹر میں امانتاً سپرد خاک کیا گیا ہے اور فلسطینی قیادت کی طرف سے کہا گیا ہے کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور بیت المقدس کی اس ریاست میں شمولیت کے بعد انہیں بیت المقدس میں دفن کیا جائے گا۔ یاسر عرفات کے جنازے پر فلسطینی عوام اور ان کے عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ زندگی کے آخری حصے میں متنازعہ ہو جانے کے باوجود فلسطینی عوام کے محبوب ترین رہنما تھے اور انہیں اپنے وطن کے عوام کی ایک بڑی اکثریت کی محبت اور عقیدت حاصل تھی۔

یاسر عرفات کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اس وقت سنا جب وہ فلسطین اور بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے بعد فلسطین کی مزاحمتی تحریک کے قائد کے طور پر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس سے

قبل بھی وہ ایک فلسطینی مزاحمتی گروپ کی قیادت کر رہے تھے لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر، شام اور اردن کی خوفناک شکست اور صحرائے سینا اور گولان پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد جب فلسطین کی آزادی کیلئے مسلح جدوجہد کرنے والے مختلف گروپوں نے یکجا ہو کر مشترکہ طور پر تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا اعلان کیا اور یاسر عرفات کو اس کا متفقہ لیڈر منتخب کیا گیا تو عرفات کا نام فلسطین اور فلسطینیوں کی تحریک آزادی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

وہ میرا طالب علمی کا دور تھا اور میں جمعیت علماء اسلام کی سرگرمیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر مرحوم ہماری سیاسی عقیدت کا مرکز و محور تھے اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں وہی مضبوط اور قدآور شخصیت ہیں جو عالم اسلام اور عرب دنیا کے خلاف مغربی استعماری جارحیت اور سازشوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے عرب دنیا اور فلسطین کے حوالے سے ہماری ذہنی و فکری ترجیحات صدر جمال عبدالناصر مرحوم کی پالیسیوں کے حوالے سے تشکیل پاتی تھیں۔ جمال عبدالناصر عرب قوم پرستی کے علمبردار تھے، وہ امریکی اور مغربی استعمار کے شدید ترین مخالف تھے اس لیے بائیں بازو اور روسی بلاک کی طرف ان کا میلان ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ ہم یہ کہہ کر ان کا دفاع کیا کرتے تھے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے، حالات کا جبر ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یاسر عرفات کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ وہ بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے قوم پرست فلسطینی رہنما سمجھے جاتے تھے اور ایک لبرل مسلمان کے طور پر پہنچانے جاتے تھے۔ اس لیے انہیں مسلسل جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کی دلی ہمدردیاں حاصل رہیں۔

دائیں بازو اور بائیں بازو کی عالمی کشمکش میں پاکستان واضح طور پر امریکہ کا حلیف تھا اور اس کے ساتھ سیٹو اور سینٹو کے معاہدات میں شریک تھا۔ اس لیے پاکستان کے ساتھ فاصلے کو قائم رکھنا یاسر عرفات کی مجبوری تھی۔ پھر جب اردن میں فلسطینی حریت پسندوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو کنٹرول کرنے کیلئے ان کے خلاف مسلح ریاستی کارروائی ضروری سمجھی گئی اور اس میں پاکستان کے فوجی دستوں نے اہم کردار ادا کیا تو یہ فاصلے مزید بڑھ گئے اور بہت سے پاکستانی حلقوں کو یہ شکایت ہونے لگی کہ پاکستان تو فلسطینی عوام کی حریت و آزادی کی غیر مشروط حمایت کر رہا ہے اور اسرائیل دشمنی میں پیش پیش ہے مگر فلسطینی قیادت اور یاسر عرفات کی جانب سے پاکستان کو مسئلہ کشمیر سمیت اہم معاملات میں وہ حمایت میسر نہیں ہے جس کی پاکستانی عوام کو ان سے توقع رہتی ہے۔

پھر افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد نے حالات کا سارا نقشہ تبدیل کر دیا۔ پاکستان کے وہ دینی حلقے جو امریکہ اور روس کی عالمی کشمکش میں کسی حد تک بائیں بازو کیلئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، اپنے افغان بھائیوں کی حمایت میں روس کے مقابل جا کھڑے ہوئے جس کا فائدہ ظاہر ہے کہ عالمی سیاست میں امریکہ کو ہونا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا اور افغان عوام کی روسی جارحیت کے خلاف مسلح جدوجہد کی پشت پناہی کر کے امریکہ نے اس مسلح مزاحمت اور اس کی پاکستانی حمایت دونوں کو اپنے پلڑے میں ڈال لیا۔ جس کے مثبت اور منفی نتائج اب تک سامنے آ رہے ہیں اور خدا جانے کب تک ان کا ظہور ہوتا رہے گا۔

ادھر یاسر عرفات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسرائیل کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عسکری قوت، امریکہ کی طرف سے اس کی مکمل اور غیر مشروط پشت پناہی اور افغانستان کی جنگ میں الجھ کر روسی بلاک کے بکھرنے کے عمل نے یاسر عرفات کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب فلسطین میں جو کچھ بھی ہوگا امریکہ کی مرضی سے ہوگا اور فلسطینی عوام کو اگر کچھ ملنا ہے تو اسی سے ملنا ہے۔ اس لیے انہوں نے معروضی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے کم سے کم پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی حدود طے کرتے ہوئے امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ دوستی کا یہ ہاتھ یکطرفہ تھا جس کے ذریعے یاسر عرفات نے فلسطینی مسئلے کے حل کو مکمل طور پر امریکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ان کی ''اجتہادی'' غلطی تھی لہٰذا نظری اور اصولی طور پر ہم نے برملا اس سے اختلاف کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا اور کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا جسے وہ کھٹکھٹاتے۔ اس لیے کہ سوویت یونین بکھر چکا تھا اور اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کی کوئی حیثیت نہیں تھی چنانچہ ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ اسرائیل اور امریکہ کے مشترکہ غیظ و غضب کا نشانہ بن کر منظر سے بالکل ہی غائب ہو جائیں یا خود کو امریکی ایجنڈے کے ساتھ نتھی کر کے جو کچھ بھی حاصل ہو سکتا ہے کر لیں، اور جو کچھ بھی بچایا جا سکتا ہو بچا لیں۔ یاسر عرفات نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور پھر اپنی تمام تر تگ و دو کو اسی نکتے پر مرکوز کر لیا۔

یاسر عرفات کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں بھی اس سے اختلاف ہے۔ لیکن یہ بات بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے مسلح جدوجہد ترک کرنے کے بعد ''مذاکرات کے ذریعے امن'' کے امریکی ایجنڈے کو قبول کر کے فلسطینی عوام کیلئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی جو جدوجہد کی اس میں انہیں مسلح جدوجہد سے زیادہ قربانیاں دینا پڑیں اور اس سے کہیں زیادہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر پورے فلسطین کی آزادی کی بجائے صرف بائیس فیصد علاقے پر آزاد فلسطینی ریاست کے فارمولے کو قبول کیا۔ انہوں نے امریکہ کو خوش رکھنے کیلئے ایک ایسی ''فلسطینی اتھارٹی'' کی صدارت کا تحقیر آمیز تمغہ اپنے سینے پر سجا لیا جس کا زمین پر کوئی وجود نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری دو سال اپنے ہیڈ کوارٹر میں محصوری کے عالم میں بسر کیے۔ یہ سب کچھ کس لیے تھا، صرف اس لیے کہ امریکہ نے فلسطینی عوام سے ان کے وطن عزیز کے ایک چوتھائی سے بھی کم رقبے پر ''آزاد فلسطینی ریاست'' کے قیام کا جو وعدہ کر رکھا ہے وہ اس پر قائم رہے اور اسے اس سے منحرف ہونے کا کوئی جواز فراہم نہ ہو۔

مگر یاسر عرفات کی ان قربانیوں کا صلہ امریکہ نے کیا دیا؟ یہی کہ آخر میں یاسر عرفات کو فلسطینیوں کا جائز نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے ساتھ فلسطین کے مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یاسر عرفات جسے فلسطینی عوام کی اکثریت نے اپنا لیڈر چنا تھا اور جس کی موت پر فلسطینی عوام نے دیوانہ وار جمع ہو کر دنیا کو ایک بار پھر بتا دیا کہ ان کی نمائندگی کا حق صرف اسے ہی حاصل تھا، مگر امریکہ اس کے ساتھ مذاکرات سے انکاری تھا اور اسے اس بات پر اصرار تھا کہ وہ یاسر عرفات سے گفتگو نہیں کرے گا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس نے امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کے ساتھ فلسطینیوں کیلئے جس کم از کم حد کا تعین کر لیا تھا اور جس پر امریکہ نے خود صاد کر لیا تھا، وہ اس کم از کم سے پیچھے ہٹنے کیلئے تیار نہیں تھا اور اسرائیل کو مزید کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔

یاسر عرفات ایک متحرک اور صبر آزما زندگی گزار کر اپنے مالک و خالق کے حضور پیش ہو چکے، ان کی جدوجہد اور تگ و تاز تاریخ کا حصہ بن چکی، اور اب تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ان کے جانشینوں پر آپڑی ہے۔ اس مرحلہ پر وہ ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے جانشینوں کو فلسطینی عوام کے بہتر مستقبل کیلئے صحیح سمت میں پیش رفت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔ البتہ اس کے ساتھ ہم یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی خوشنودی کیلئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والوں کو یاسر عرفات کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لیے کہ خود کو مکمل طور پر جبر کے سپرد کر دینا اور طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا زندگی سے دستبرداری کی علامت ہوا کرتا ہے۔ زندگی ہر حال میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کا نام ہے اور اکثر ہاتھ پاؤں مارتے رہنے والوں کو زندگی مل بھی جایا کرتی ہے۔

جارج ڈبلیو بش کی کامیابی اور عالمِ اسلام

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۱۰ نومبر ۲۰۰۴ء

جارج ڈبلیو بش George Walker Bush دوسری مدت کیلئے امریکہ کے صدر منتخب ہو چکے ہیں اور ان کے حریف جان کیری نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے انہیں مبارکباد دی ہے۔ اس پر حسبِ توقع دنیا بھر میں تبصروں کا سلسلہ جاری ہے، فتح کے اسباب کا ذکر ہو رہا ہے اور مستقبل کے نقشے کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔

امریکہ کی صدارتی الیکشن مہم کے دوران راقم الحروف نے آٹھ دس دن واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں گزارے اور اس الیکشن کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات اور کوششوں کا تذکرہ اپنے ایک کالم میں کر چکا ہوں۔ یہ درست ہے کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی بڑی اکثریت صدر بش کے خلاف تھی اور صرف اسی وجہ سے جان کیری کو نہ صرف ووٹ دیے گئے بلکہ ان کی حمایت میں بعض مسلمان حلقوں کی طرف سے مہم بھی چلائی گئی۔ لیکن اس کے باوجود حالات پر نظر رکھنے والے متعدد مسلم راہنماؤں کی رائے یہ تھی کہ اس الیکشن میں جارج واکر بش ہی کامیاب ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ جان کیری ذاتی طور پر خود کو ایک مضبوط اور باعثِ کشش امیدوار کے طور پر پیش نہیں کر سکے اس لیے وہ صرف ڈیموکریٹک پارٹی کے محفوظ ووٹ ہی حاصل کر پائیں گے، یا انہیں صدر بش سے ناراضگی کا اظہار کرنے والوں کے ووٹ ملیں گے۔

جبکہ دوسری طرف صدر بش امریکی رائے عامہ کو متعدد حوالوں سے اپنی ضرورت کا احساس دلانے میں کامیاب رہے ہیں۔ جن میں مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ان کا بے لچک موقف اور کردار سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے امریکی عوام کو یہ باور کرا دیا ہے کہ جن عناصر کو دہشت گرد قرار دے کر وہ جنگ لڑ رہے ہیں وہ فی الواقع ایسے دہشت گرد ہیں جن سے عالمی امن کے ساتھ ساتھ امریکی سلامتی کو بھی خطرہ ہے، اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ جنگ جیتنے یا امریکی سلامتی کے تحفظ کیلئے ناگزیر ہے۔

اس عمومی تاثر کے بعد امریکی عوام سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ صدر بش کے علاوہ اس موقع پر امریکہ کی قیادت کیلئے کسی اور کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے بہت سے مسلم راہنماؤں نے مجھ سے کہا کہ اگرچہ ہمارے حلقوں میں افغانستان، عراق اور فلسطین کے حوالے سے صدر بش کی پالیسیوں کے خلاف ناراضگی کے اظہار کے طور پر جان کیری کو ووٹ دینے کا رجحان غالب ہے، لیکن کامیابی کا امکان صدر بش کا ہی زیادہ ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کے جذبات کی بات ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مجھے ایک مسلمان ٹیکسی ڈرائیور نے، جو واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں ٹیکسی چلاتا ہے، بتایا کہ ہم پانچ سو مسلمان ڈرائیوروں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ ہم الیکشن والے دن کام نہیں کریں گے۔ اور جو مسلمان فیملی اس روز جان کیری کو ووٹ دینے کی غرض سے پولنگ اسٹیشن تک جانے کیلئے ہماری ضرورت محسوس کرے گی، اسے مفت ٹیکسی سروس فراہم کریں گے۔

مسلمانوں کی طرح یہودیوں کی اکثریت نے بھی صدر بش کے خلاف ووٹ دیا ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی ایک سروے رپورٹ کے مطابق جان کیری کو ۷۸ فیصد یہودیوں کے ووٹ ملے ہیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود الیکشن میں کامیابی جارج واکر بش کے حصے میں آئی ہے، انہوں نے اسے اپنی پالیسیوں پر امریکی عوام کی طرف سے اعتماد کا اظہار قرار دیتے ہوئے ان پالیسیوں کو جاری رکھنے کا اعلان کر دیا ہے۔

صدر بش کی اس کامیابی کے عوامل میں ایک بڑی بات مذہبی اقدار کے ساتھ ان کی دلچسپی اور خاندانی نظام کے تحفظ کے بارے میں ان کے جذبات بھی ہیں، جن کا اظہار انہوں نے الیکشن مہم کے دوران کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ جارج بش اپنے چار سالہ دورِ صدارت، پھر الیکشن مہم کے دوران یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے ہیں کہ وہ مذہب اور مذہبی اقدار کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے ہیں، اور سوسائٹی میں مذہبی اقدار کی بحالی و فروغ کیلئے کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے جس دوٹوک انداز میں ہم جنس پرستی کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ شادی صرف مرد اور عورت کے درمیان ہی ہو سکتی ہے، بلکہ اس مقصد کیلئے انہوں نے امریکی دستور میں ترمیم کی ضرورت کا بھی بعض مواقع پر ذکر کیا، ان کے اس موقف نے امریکہ کے مذہبی حلقوں میں ان کیلئے کشش پیدا کی ہے۔

واشنگٹن (ڈی سی) میں بھی ایک دوست نے مجھے بتایا کہ امریکہ کے بہت سے چرچ اور مذہبی رہنما صدارتی الیکشن میں صدر بش کی کامیابی کیلئے متحرک ہیں۔ ہمارے خیال میں صدر بش اور جان کیری کے درمیان انتخابی مہم کے دوران اگرچہ بہت سے دوسرے مسائل سرفہرست رہے ہیں، لیکن پس پردہ سب سے بڑا محرک یہی فرق سمجھ آ رہا ہے کہ صدر بش کی مذہبی اقدار و خاندانی نظام کے تحفظ کے بارے میں دلچسپی، جبکہ جان کیری کا ان معاملات میں لبرل انداز، امریکی ووٹروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ الیکشن کے بعد جان کیری نے اپنے تبصرے میں امریکی قوم کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے جس خدشے کا اظہار کیا ہے، اس کا پس منظر بھی ہمارے نزدیک یہی ہو سکتا ہے۔

امریکی معاشرے کو قریب سے دیکھنے والے حضرات اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اس سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ملک کے عوام میں ایک خاموش کشمکش بدستور جاری ہے۔ جس میں وہ جو "قدامت پسند" کہلاتے ہیں اور سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں، مکمل طور پر نہ سہی، مگر کسی نہ کسی حد تک مذہبی اقدار کی بحالی کے حق میں ہیں، وہ خاندانی

سسٹم پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے منافی اقدار کے مسلسل فروغ سے ناخوش ہیں۔ واقفانِ حال کا کہنا ہے کہ اس الیکشن میں انہوں نے زیادہ منظم انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو ظاہر ہے کہ صدر جارج بش کے حق میں تھی، غالباً اسی کو دیکھتے ہوئے امریکی قوم کے تقسیم ہو جانے کا خدشہ شکست خوردہ صدارتی امیدوار جان کیری کی زبان پر آیا ہے۔

صدر بش کامیابی کے بعد اپنے اگلے چار سالہ دور کیلئے نئی صف بندی میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے ایجنڈے اور مشن کو اس مدت میں بہر حال پورا کرنے کیلئے تازہ دم ٹیم کو میدان میں اتارنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ الیکشن میں واضح کامیابی نے انہیں اپنے پروگرام اور عزائم کے حوالے سے نیا اعتماد اور حوصلہ بخشا ہے۔ سینٹ اور ایوان نمائندگان میں ری پبلک پارٹی کی برتری نے ان کی قوت میں اضافہ کیا ہے، اس لیے اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ عالمی سطح پر وہ مسائل کو جس طرح ڈیل کر رہے ہیں اور جس جس محاذ پر پیشرفت کر رہے ہیں اس کا تسلسل اگلے چار سال تک نہ صرف باقی رہے گا بلکہ اس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گا۔

جہاں تک عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں امریکہ اور اس کے ہمنواؤں کے خلاف مسلح مزاحمتی تحریکوں کا تعلق ہے، وہ القاعدہ ہو یا اس طرز کے دوسرے گروپ، وہ اپنی پالیسی اور طریق کار میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے، یا یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی گنجائش نہیں پا رہے، کیونکہ انہیں ایسی کسی تبدیلی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا جا رہا، اور ان کے مکمل خاتمے کو ہی اصل اور آخری ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس محاذ کے حوالے سے ''دیکھئے اور نتائج کا انتظار کیجئے'' کے سوا سرِدست کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

باقی رہی بات مسلم حکومتوں کی، تو ان کی بے بسی اور لاچاری میں امریکہ کے صدارتی انتخابات کے نتائج نے مزید اضافہ کر دیا ہے اور وہ ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی عملی تصویر بن کر رہ گئی ہیں۔ اگرچہ عالمی سطح پر ان کی تنظیم (او آئی سی) موجود ہے، مسلم سربراہوں کی کانفرنسیں بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان کانفرنسوں کی عملی حیثیت گپ شپ کے فورم اور رسمی قراردادوں کے اعلان سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا عبث ہو گا کہ وہ موجودہ صورتحال میں حالات کے مزید بگاڑنے کو روکنے کیلئے کوئی کردار ادا کر سکیں گے۔

اس صورتحال پر آزادانہ سوچ بچار اور معروضی حقائق کے ادراک کے ساتھ مسلم اُمہ کی صحیح سمت رہنمائی کیلئے ایک ہی فورم باقی رہ جاتا ہے، جس سے کسی درجے میں کوئی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور وہ عالمِ اسلام کے اربابِ فہم و دانش ہیں جو تدبر، حریتِ فکر، ملی حمیت اور اعتماد و حوصلے سے بہرہ ور ہیں اور ملت کی بہتری کیلئے کچھ کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی حصے کا مسلم معاشرہ ایسے اصحابِ فکر اور اربابِ دانش سے خالی نہیں ہے۔ جبکہ عالمِ اسلام کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت بھی یہی ہے کہ ان کی فکری رہنمائی کیلئے ایسے بے لوث حضرات سامنے آئیں جو حکومتوں اور لابیوں کے اثرات سے آزاد رہتے ہوئے معروضی حقائق کا جائزہ لیں اور کسی رو رعایت کے بغیر غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کریں، مسلم رائے عامہ کے سامنے معروضی حالات کا صحیح نقشہ پیش کریں، آنے والے حالات اور خدشات و خطرات سے آگاہ کریں، اور اس دلدل سے نکلنے کیلئے امتِ مسلمہ کی قابلِ عمل راستوں کی طرف رہنمائی کریں۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس سے حالات کا رخ تبدیل ہو جائے گا لیکن اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی اجتماعی فورم

سامنے آجائے تو امتِ مسلمہ کے بہتر مستقبل کیلئے اس کی نئی نسل کو کوئی صحیح اور قابلِ عمل راستہ یقیناً دکھایا جاسکتا ہے۔

سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی دھونس

ماہنامہ آبِ حیات، لاہور--- جنوری ۲۰۰۵ء

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ--- فروری ۲۰۰۵ء

سوال: نائن الیون کے حادثے کے بعد پاکستان نے جو اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر یوٹرن لیا ہے اور پرویز مشرف نے جو دینی و مذہبی جماعتوں اور اداروں کے متعلق سخت رویہ اپنایا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: نائن الیون کے حادثہ کے بعد جنرل پرویز مشرف نے خارجہ پالیسی میں جو یوٹرن لیا ہے اور داخلی طور پر دینی قوتوں کو دبانے اور کرش کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ ایک طویل پروگرام کا حصہ ہے۔ اس میں کمی یا نرمی کا سردست کوئی امکان نظر نہیں آرہا، بلکہ اس ایجنڈے کے مختلف نئے تقاضے سر اٹھاتے جارہے ہیں۔ دینی حلقوں کو اس امتحان سے بہرحال گزرنا ہوگا اور صبر و حوصلہ کے ساتھ آنے والے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے دین اور ملت کے حوالے سے جو ورثہ ہم تک پہنچایا ہے، ہم اسے کسی نقصان کے بغیر اگلی نسلوں تک منتقل کردیں اور اسے اس کی اہمیت اور نزاکتوں کا صحیح طور پر احساس دلادیں۔ اگر ہم ایسا کر پائے تو یہ اس مشن میں ہماری کامیابی اور سرخ روئی متصور ہوگی۔ اس سے زیادہ ہمیں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: اس وقت دنیا بھر میں دہشت گردی کی وجہ اور محرکات کیا ہیں؟

جواب: اس وقت جس عمل کو دنیا میں دہشت گردی کہا جارہا ہے، وہ خود امریکا کا پیدا کردہ ہے۔ امریکہ نے افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کیلئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اسلحہ کی ٹریننگ دی اور روسی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی مزاحمتی جنگ کو جہاد تسلیم کرتے ہوئے اس کی سیاسی و عسکری سرپرستی کی۔ اب وہی لوگ مختلف علاقوں میں امریکی بالادستی کے خلاف برسرپیکار ہیں تو انہیں دہشت گرد کہا جارہا ہے۔ ایک امریکی دانش ور نے مجھ سے کہا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے گزارش کی کہ بالکل درست بات ہے کہ ہمارے ہاں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم ہم نے دی ہے مگر عملی ٹریننگ تم نے دی ہے اور اسے عملی عسکریت کا رخ تم لوگوں نے دکھایا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جہاں بھی جہاد کی کارروائیاں ہورہی ہیں، جنہیں دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس کی عملی ٹریننگ کا نسب نامہ امریکہ سے جاملتا ہے۔ اسلحہ اور اس کی ٹریننگ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے مگر امریکہ اس بات کو قبول کرنے کی اخلاقی جرات سے محروم ہے اور اس کی ذمہ داری بھی دینی مدارس کے کھاتے میں ڈال کر دنیا کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتا ہے۔

گوانتاناموبے اور افغان قیدیوں کیلئے ذہنی اذیت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۲۰۰۵ء

گوانتاناموبے میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قرآن کریم کی بے حرمتی کے شرمناک واقعات کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل رہا ہے اور عوام کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی حکومتیں بھی اس احتجاج میں شریک ہیں۔ قرآن کریم کی بے حرمتی کا یہ واقعہ منظر عام پر آنے کے بعد بہت سے دیگر واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ افغانستان اور گوانتاناموبے میں مسلم قیدیوں کے سامنے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے اور قرآن مقدس کی بے حرمتی کے واقعات امریکی فوجیوں کا معمول بن گئے ہیں۔ امریکہ دنیا میں رواداری، مذہبی احترام، ان کے حقوق اور تحمل کا سب سے بڑا علمبردار بنا ہوا ہے اور ساری دنیا کو اس کی تلقین کرتا رہتا ہے لیکن خود امریکہ کے فوجیوں نے افغانستان، عراق، گوانتاناموبے اور دیگر اذیت خانوں میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہوا ہے اور ان مظلوموں کے خلاف ہونے والی کاروائیوں کی جو تفصیل وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ امریکہ تہذیب و تمدن اور آزادی اور انسانی احترام کے نام پر اپنا فلسفہ اور کلچر دنیا بھر پر مسلط کرنے کے درپے ہے اور دنیا پر قبضہ جمانے کیلئے وہ تمام حربے استعمال کر رہا ہے جو کسی زمانے میں چنگیز خان اور ہلاکو خان جیسے درندہ صفت حکمرانوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے۔

قرآن کریم کی بے حرمتی دنیا کے کسی بھی مسلمان کیلئے قابلِ برداشت نہیں ہے اور اس پر مسلمانوں کا غصہ میں آنا اور اپنے جذبات کا اظہار کرنا ایک فطری ردعمل ہے جو ان کے ایمان اور قرآن کریم کے ساتھ ان کی وابستگی کا تقاضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس احتجاج میں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان پیچھے نہیں ہیں، اس احتجاج اور اضطراب کا دائرہ انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلا ہوا ہے بلکہ مغربی ملکوں میں رہنے والے مسلمان بھی قرآن کریم کی حرمت و تقدس کے بارے میں جذبات کے اظہار میں عالم اسلام کے ساتھ شریک ہیں۔ اس پس منظر میں بعض دینی راہنماؤں کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو قرآن کریم کی بے حرمتی کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے امریکہ سے باضابطہ طور پر احتجاج کرنا چاہیے اور اس کا باقاعدہ سربراہی اجلاس بلا کر اس مسئلہ پر دوٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس پر مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے، مغربی طاقتیں ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگی کا قرآن کریم کے ساتھ تعلق قائم نہ رہے اور مسلمان قرآن کریم کو اسی طرح نظر انداز کر دیں جس طرح دنیا کی مسیحی اکثریت نے بائبل کو اپنی عملی زندگی سے لاتعلق کر رکھا ہے لیکن ماضی کی طرح آج بھی مغربی دنیا کو اس مہم میں ناکامی کا سامنا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور بے لچک کمٹمنٹ آج بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ بحمد اللہ تعالیٰ بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی دیگر اقوام کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ مسلمان عملی طور پر کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں، فکر و عقیدہ کے حوالے سے ان کی وابستگی، جناب نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور قرآن کریم کے ساتھ آج بھی قائم ہے اور اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جائے سانحہ گیارہ ستمبر پر چند لمحے

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۱۶ ستمبر ۲۰۰۵ء

۱۱ ستمبر کو میں نیویارک میں تھا، اس دن میں نے اپنے میزبان دوستوں مولانا حافظ محمد اعجاز، بھائی برکت اللہ اور بھائی یامین کے ساتھ مین ہیٹن کے اس علاقے کا چکر لگایا جہاں آج سے چار برس پہلے تک ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دو بلند و بالا عمارتیں پورے کروفر کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وہاں ہم نے بے شمار ٹولیوں کو گھومتے اور ان مرنے والوں کی یاد مناتے دیکھا جو چار سال قبل آج کے دن دہشت گردی کا شکار ہو گئے تھے۔ مذکورہ تینوں دوست کوئینز کے علاقے میں واقع دینی درسگاہ دارالعلوم نیویارک سے وابستہ ہیں، انہوں نے ہی مجھے ایئرپورٹ سے وصول کیا اور میرا قیام انہی کے پاس دارالعلوم میں ہے۔

میں نے یہ جگہ کئی بار دیکھی ہے، اسے آباد حالت میں دیکھا ہے اور ویرانی کے بعد کے منظر کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ کوئی سترہ برس پہلے کی بات ہے جب میں نے اس ایک سو دس منزلہ عمارت کی ایک سو ساتویں منزل پر واقع سیرگاہ سے نیویارک کے منظر کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ بادل اس سے نیچے تھے اور بادلوں کی وجہ سے شہر کی کوئی عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ساتھ کچھ اور دوست بھی تھے اور ہم نے عصر کی نماز اسی سیرگاہ میں باجماعت ادا کی تھی جسے دیکھنے کیلئے چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

پھر یہ بلند و بالا عمارت دہشت گردی کا شکار ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئی۔ میں اس وقت پاکستان میں تھا اور میرے بیٹے نے کمپیوٹر کے ذریعے مجھے یہ منظر دکھایا تھا۔ مگر میرے میزبان بھائی یامین اور بھائی برکت اللہ، جن کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے، برصغیر کے کسی بھی حصے سے کوئی عالم دین امریکہ آجائے تو اس کی خدمت اور میزبانی کر کے خوش ہوتے ہیں، انہوں نے بتایا کہ یہ منظر خود انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ دونوں کوئینز کے علاقے سے مین ہیٹن کی طرف آرہے تھے۔ بھائی یامین کہتے ہیں کہ ایک پل سے گزرتے ہوئے میں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر سورج کی روشنی پڑتے دیکھی تو میں نے بے ساختہ کہا کہ آج تو یہ بہت چمک رہا ہے، اس کے بعد میں اونگھنے لگا تو ہمارے ساتھ گاڑی میں موجود ایک طالب علم نے توجہ دلائی کہ وہ دیکھو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو آگ لگ گئی ہے۔ ہم نے پہلا جہاز ٹکراتے نہیں دیکھا، اس کے نتیجے میں بھڑکنے والی آگ دیکھی، ہم ابھی یہ خوفناک منظر دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی رکھنے والے اس ملک میں اس حادثے سے نمٹنے کیلئے کیا صورت اختیار کی جاتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ آگ بلڈنگ کے اندر کسی حادثے کی وجہ سے لگی ہے۔ اتنے میں دوسرا جہاز آیا تو ہمیں خیال ہوا کہ یہ جہاز آگ بجھانے کیلئے آیا ہے، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلڈنگ کے دوسرے حصے سے ٹکرا گیا اور تھوڑی دیر میں دونوں بلڈنگیں بھڑکتے شعلوں میں زمین بوس ہو گئیں۔

یہ حضرات اپنے مشاہدات بیان کر رہے تھے اور میرا ذہن اس بلڈنگ کے حوالے سے پرانی یادیں تازہ کر رہا تھا۔

میں نے اس سانحہ کے ایک سال بعد واشنگٹن سے نیویارک آتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے وقت ایک بلند و بالا پل سے مین ہیٹن کے اس علاقے پر نظر ڈالی جہاں بہت سی بلند عمارتوں کے جلو میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی یہ بلند ترین عمارتیں ہوا کرتی تھیں، اور اس پل سے شہر میں داخل ہونے والوں کی پہلی نظر ان عمارتوں پر پڑتی تھی، مگر سچی بات ہے کہ مین ہیٹن کی بہت سی عمارتوں کے درمیان ان بلڈنگوں کی جگہ خالی دیکھ کر دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور سوگواری کے جذبات نے خاصی دیر تک دل و دماغ کو گھیرے رکھا تھا۔

اس بار امریکہ آنے کا پروگرام بنا تو خیال ہوا کہ میرے اس پانچ سالہ ویزے میں، جو میں نے نائن الیون کے سانحہ سے پہلے لے رکھا تھا، بس اسی سفر کی گنجائش ہے کیونکہ وہ ۲۸ ستمبر کو ختم ہو رہا ہے۔ اور اگلے سال معلوم نہیں اسلام آباد کا امریکی سفارت خانہ مجھے ویزا دے گا یا نہیں، کیونکہ جب علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کو امریکہ کے ویزے سے انکار ہو سکتا ہے تو میرے لیے خوش فہمی اور توقعات کی کون سی کھڑکی کھلی رہ گئی ہوگی۔ اس خیال سے پروگرام میں یہ بات شامل کر لی کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے مقام پر، جسے اب گراؤنڈ زیرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ضرور جانا ہے اور ۱۱ ستمبر کو ہی جانا ہے، تاکہ اس سانحہ میں جاں بحق ہونے والوں کی یاد منانے والوں اور ان کیلئے غم و رنج کا اظہار کرنے والوں میں میرا نام بھی شامل ہو جائے۔ اگرچہ اس بار یہاں تک پہنچنے میں مجھے بہت سے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا اور سفر کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا، مگر بہر حال ۱۱ ستمبر کو مین ہیٹن کی گراؤنڈ زیرو تک پہنچنے اور چار سال قبل مرنے والوں کی یاد منانے والوں میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

----

۵ ستمبر کو رات کراچی پہنچا، ۶ ستمبر کو وہاں سے روانہ ہوا اور تیرہ گھنٹے دوبئی ایئرپورٹ پر گزارنے کے بعد اگلی فلائیٹ ملی جس نے ۷ ستمبر کو صبح ساڑھے سات بجے لندن کے گیٹ وک ایئرپورٹ پر اتار دیا۔ اس طرح وہ سفر جو میں نے گھر سے ۳۰ اگست کی صبح کو لندن کیلئے شروع کیا تھا اور مجھے اسی روز دو بجے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچنا تھا، ۷ ستمبر کی صبح کو گیٹ وک ایئرپورٹ پر مکمل ہوا، اور میں برطانیہ کے مختلف شہروں کے دوستوں کے شدید تقاضوں کے باوجود وہاں دو روز سے زیادہ وقت نہ دے سکا اور ۱۰ ستمبر کو نیویارک کیلئے روانہ ہو گیا، جہاں مجھے رات کو ساڑھے آٹھ بجے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔

میرے ذہن میں خدشہ تھا کہ نائن الیون شروع ہونے سے تین چار گھنٹے قبل نیویارک کے ایئرپورٹ پر پوری ڈاڑھی اور خالص مولویانہ لباس میں اترنے پر کوئی الجھن پیش آسکتی ہے، یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ مجھے ایئرپورٹ پر روک لیا گیا اور تفتیش کے کمرے میں لے جا کر تین افسروں نے، جن میں ایک خاتون بھی تھی، سوال و جواب اور سامان کی تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چونکہ ذہن میں خدشہ پہلے سے موجود تھا اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، اور یہ بھی اطمینان تھا کہ الحمدللہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوں اس لیے بالآخر چھٹی مل ہی جائے گی۔ میں نے تقریباً دو گھنٹے اس تفتیشی کمرے میں گزارے، بہت سے سوالات ہوئے، سامان اور کاغذات کی اچھی طرح چیکنگ ہوئی، ٹیلی فون پر بار بار میرے کوائف اور

سوالات و جوابات سے افسرانِ بالا کو بھی آگاہ کیا جاتا رہا، اور آخر کار پونے گیارہ بجے کے لگ بھگ چھ ماہ کی انٹری کی مہر کے ساتھ مجھے ایئرپورٹ سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ان مراحل سے گزر کر میں ۱۱ستمبر کو گراؤنڈ زیرو تک پہنچ پایا ہوں۔ مجھے ان ہزاروں افراد کی موت کا غم ہے جو چار سال قبل اس مقام پر بے گناہ مارے گئے۔ اگرچہ اس بارے میں بحث ابھی تک جاری ہے کہ اس دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے کون ہیں؟ اور خود مغربی دانشوروں میں اس نتیجے تک پہنچنے والوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے کہ یہ واردات جن کی طرف منسوب کی جارہی ہے، اس نوعیت کی منصوبہ بندی ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اس دہشت گردی کی منصوبہ بندی کے ڈانڈے کہیں اور ملتے ہیں۔ مگر مرنے والے تو مر گئے، ان کے گھر تو ویران ہو گئے، ان کا غم تو سب لوگوں کا مشترکہ غم ہے، لیکن اس دہشت گردی کے ردعمل میں یا اس کے بہانے افغانستان اور عراق میں جو لاکھوں افراد مارے گئے اور جنہیں اسی طرح کی دہشت گردی میں بارود اور آگ میں بھسم کر دیا گیا، وہ بھی تو آخر اسی طرح کے گوشت پوست کے انسان تھے، ان کی یاد کون منائے گا؟

دنیائے اسلام میں امریکہ کا تشخص

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۶ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۴دسمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے تسلیم کیا ہے کہ امریکہ کو اس وقت مسلم دنیا میں اپنے تشخص کا مسئلہ درپیش ہے جسے بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے یہ بات فلاڈیلفیا میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی، انہوں نے کہا کہ عرب ٹی وی مستقل طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اسلام کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ امریکہ مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور وہ ہماری دہشت گردی کے خلاف جنگ کو اسلام کے خلاف جنگ قرار دے رہے ہیں، تاہم میں مسلمانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ امریکی قوم اسلام مخالف نہیں ہے، امریکی قوم تمام لوگوں کے عقائد کا احترام کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ نے ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے مسلمانوں میں اس کا تشخص بہتر ہوا ہے، اس سلسلہ میں سونامی اور پاکستان میں زلزلے کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

مغرب کے حکمرانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو اپنی مخصوص عینک کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے مسائل و مشکلات کا حل اپنے ہی انداز سے تجویز کر دیتے ہیں۔ صدر جارج ڈبلیو بش کا یہ کہنا درست ہے کہ مسلم دنیا میں امریکہ کا تشخص و تعارف مثبت نہیں ہے اور دنیائے اسلام میں امریکہ کے خلاف وسیع پیمانے پر نفرت اور غیظ و غضب کے جذبات پائے جاتے ہیں لیکن اس کی وجہ عرب ٹی وی نہیں ہیں بلکہ اس کے اسباب ان عرب ٹی وی چینلوں کے وجود میں آنے سے بہت پہلے موجود تھے جن کی طرف امریکی صدر نے اشارہ کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑا سبب اسرائیل کی مسلسل ناروا پشت پناہی اور عرب ممالک کے تیل کے چشموں پر فوجی تسلط ہے جس کے

باعث نہ صرف یہ کہ تیل کے وسائل عرب دنیا کے اپنے کنٹرول میں نہیں رہے بلکہ عرب عوام کے شہری حقوق اور متعدّد عرب ممالک کی خود مختاری سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے، جبکہ امریکہ نے افغانستان اور عراق کے خلاف فوج کشی کر کے اور مسلح افواج کے وہاں ڈیرے لگوا کر اپنے خلاف نفرت کے اسباب میں خود اضافہ کر لیا ہے، اس لیے جب تک ان اسباب کا ازالہ نہیں ہو گا نفرت میں کمی کی کبھی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

صدر بش کو غلط فہمی ہے کہ سونامی اور زلزلہ کے متاثرین کی امداد کر کے وہ عالمِ اسلام کو ان اسباب و عوامل سے غافل کر سکتے ہیں جو امریکہ کے خلاف دنیائے اسلام میں نفرت کا باعث بنے ہوئے ہیں، یہ اسباب و عوامل زندہ اور معروضی حقیقت کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہیں اور ان کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے اگر امریکہ دنیائے اسلام میں اپنا تشخص بہتر بنانا چاہتا ہے تو اسے مشرق وسطیٰ اور افغانستان کے حوالے سے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور مسلم دنیا پر مسلط کیے گئے اپنی مرضی کے حکمرانوں کی بجائے عالم اسلام کی حقیقی رائے عامہ اور مسلم امہ کی اکثریت کے جذبات کا احترام کرنا ہو گا، اس کے بغیر دنیائے اسلام میں امریکہ کے خلاف نفرت کے کم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

برطانوی وزیر جیری اسٹکلف کے خیالات

ہفت روزہ ضرب مومن، کراچی --- ۷ جنوری ۲۰۰۶ء

روزنامہ جنگ لندن کے مطابق بریڈ فورڈ میں برٹش مسلم یوتھ فورم کے زیر اہتمام عالمی دہشت گردی کے حوالے سے منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی وزیر جیری اسٹکلف نے کہا ہے کہ برطانوی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کا صحیح آفاقی پیغام پہنچائیں۔ اسلام، جہاد اور دہشت گردی میں واضح فرق کرتا ہے لیکن اس فرق کو واضح کرنے کیلئے اسلام کا صحیح معنوں میں علم رکھنے والے لوگ آگے بڑھیں۔ انہوں نے برطانیہ کے تمام شہروں میں ایسی تقریبات کے ذریعے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیریوں کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خود ارادیت ملنا چاہیے۔

اسلام کی دعوت اور پیغام

جہاں تک غیر مسلموں تک اسلام کا صحیح آفاقی پیغام پہنچانے کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف برطانوی مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے تمام مسلمان مجموعی طور پر اس سلسلہ میں کوتاہی اور غفلت کے مرتکب ہیں۔ اور دنیا کے بعض خطوں میں کچھ مسلمان افراد یا علاقائی اداروں کی محدود سرگرمیوں کے علاوہ نسل انسانی تک اسلام کی دعوت اور پیغام پہنچانے کا کوئی نظم اور اہتمام موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بحیثیت امت دنیا کے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ

دنیا کے ہر خطے میں نسل انسانی کے ہر گروہ اور طبقے تک اسلام کی دعوت اور پیغام کو پہنچانے کا اہتمام کریں۔ دنیا میں اس وقت انسانی آبادی چھ ارب کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے جس میں مسلمانوں کا تناسب ایک چوتھائی یا کم از کم بیس فیصد یقیناً ہے۔ اور اسلام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ عالمی مذہب ہے جو پوری نسل انسانی کیلئے اور قیامت تک کیلئے ہے۔ اس کے ساتھ ہی واضح طور پر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور نسل انسانی نے جب تک کرۂ ارض پر رہنا ہے اسے حضرت محمدؐ کی تعلیمات کی روشنی میں ہی نجات و فلاح کا راستہ مل سکتا ہے۔

ان دو وضاحتوں کے بعد یہ ذمہ داری خود بخود پوری امت مسلمہ کو منتقل ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو صرف اپنے دائرہ تک محدود نہ رکھے بلکہ اسلام کی دعوت، پیغام اور تعلیمات کو نسل انسانی کے ان تمام افراد تک پہنچانے کا اہتمام کرے جو اسلام کے دامن سے وابستہ نہیں ہیں اور جن تک تاحال اسلام کی دعوت اور پیغام نہیں پہنچا۔ بلکہ اس سے یہ مطلب اور نتیجہ اخذ کرنے کیلئے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی غفلت، کوتاہی اور بے پرواہی کی وجہ سے جن لوگوں تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچ سکی وہ دنیا میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی اسلام سے بے خبر ہیں اور اگر وہ اس حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو ان کے کفر اور گمراہی کی ذمہ داری مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اسلام کا پیغام پہنچانے کے دو طریقے ہیں:

- ایک یہ کہ زبان، قلم اور میڈیا کے ذریعے سے لوگوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے متعارف کرایا جائے،
- دوسرا یہ کہ اسلامی معاشرت کا ایسا عملی ماحول اور نمونہ پیش کیا جائے جسے دیکھ کر لوگ اسلام سے متاثر ہوں اور اس کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔

یہ دونوں طریقے آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور ماضی میں اسلام کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں انہی ذرائع سے عام ہوئی۔ بلکہ حضرات صوفیائے کرامؒ اور مشرق بعید کا سفر کرنے والے مسلمان تاجروں کی محنت و ریاضت کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو اسلام سے متعارف کرانے میں یہ دوسرا طریقہ یعنی اسلامی معاشرت کا عملی ماحول اور نمونہ پیش کرنا ہر دور میں زیادہ موثر اور نتیجہ خیز رہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج دنیا میں یہ دونوں طریقے عملی طور پر موجود نہیں ہیں اور چند مستثنیات کے ساتھ غیر مسلموں کو زبان و قلم اور میڈیا کے ذریعے اسلام کی دعوت دینے، یا اسلام کے عملی ماحول کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کرنے اور توجہ دلانے کی کوئی تحریک نظر نہیں آ رہی۔ تبلیغی جماعت کے بہت سے دوستوں کا کہنا ہے کہ ان کی تگ و تاز اور جدوجہد کا اصل مقصد مسلمانوں کو دین کے بنیادی اعمال و اخلاق کی طرف واپس لا کر ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جو دنیا میں اسلام کی عمومی دعوت و تبلیغ کی بنیاد بن سکے۔ ہمارے خیال میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کا مقصد اور ہدف یہی تھا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں دو تبدیلیاں محسوس ہونے لگی ہیں۔ ایک یہ کہ ذریعہ ہی اصل مقصد اور ہدف کی شکل اختیار کر گیا ہے، دوسرا یہ کہ اہداف و مقاصد کے وسیع افق کی بجائے طریق کار کی محدودیت تک نگاہیں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اپنے عملی دائرہ میں ضرورت و افادیت اور نتائج و ثمرات کے باوجود اصل اہداف و مقاصد کی طرف اس تحریک کی پیش رفت کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

جہاد اور دہشت گردی میں فرق

باقی رہی بات جہاد اور دہشت گردی میں فرق کی تو برطانوی وزیر جیری اسٹکلف نے جس پس منظر میں یہ بات کہی ہے اسے سامنے رکھنا ان کے مقصد کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اسلام نے انسانی سوسائٹی میں اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ اور انسانیت کے منافی اقدار کے خاتمے کیلئے جنگ کو جہاد قرار دیا ہے۔ یہ جنگ زبان، قلم، میڈیا اور دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ بوقت ضرورت ہتھیاروں کے ساتھ بھی لڑی جاتی ہے۔ اور جہاں انسانیت کے منافی اقدار کی روک تھام کیلئے دیگر ذرائع موثر ثابت نہ ہوں وہاں اسلحہ اور ہتھیاروں کا استعمال اسلام کے نزدیک ضروری ہو جاتا ہے۔ کائنات کو پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اور پیغمبروں کے ذریعے بھیجی گئی اس کی تعلیمات وہدایات کی پابندی کرنا اسلام کے نزدیک انسانیت کی فطری اور اعلیٰ ترین اقدار ہیں اور انہی پر انسانی سوسائٹی کی نجات کا مدار ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھنا یا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا اور پیغمبروں کے ذریعے اس کی بھیجی ہوئی تعلیمات و ہدایات سے بے پرواہ ہو کر اپنی خواہشات اور محدود و متغیّر عقل کے مطابق زندگی بسر کرنا اسلام کے نزدیک انسانیت کے منافی اقدار و اعمال ہیں۔

یہ اسی طرح ہے جیسے آج مغرب کے فلسفہ وفکر کے مطابق انسانی سوسائٹی کی اجتماعی یا اکثریتی عقل و خواہش کو ہر معاملہ میں آخری اتھارٹی تسلیم کرنا، اور اس کے مقابلہ میں آسمانی تعلیمات سمیت ہر بات کو مسترد اور نظر انداز کرنا انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار و روایات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس فکر و فلسفہ کے فروغ اور بقاو استحکام کیلئے زبان، قلم، میڈیا، لابنگ، معاشی و سیاسی دباؤ، اور دیگر حربوں کے ساتھ ساتھ عسکری طاقت اور تباہ کن فوجی قوت کے استعمال کو بھی مغرب کے نزدیک ایک ناگزیر ذریعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسے ترقی یافتہ تہذیب و تمدن اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ و تحفظ کیلئے طاقت کے استعمال کا نام دیا جارہا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اعلیٰ انسانی اقدار کو رائج کرنے کیلئے طاقت کے استعمال کی ضرورت اور جواز پر اسلام اور مغرب کے درمیان کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ جو اقدار اور روایات انسانی سوسائٹی کیلئے مفید ہوں اور اسے فلاح و نجات کی طرف لے جاتی ہوں ان کیلئے طاقت کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ حسب موقع ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ اعلیٰ انسانی اقدار کے تعین میں اختلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے، جبکہ مغربی فلسفہ وفکر کے نزدیک انسانی سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر اعلیٰ انسانی اقدار تشکیل پاتی ہیں، اور ان کیلئے آسمانی تعلیمات سے انحراف یا کم از کم لاتعلقی ضروری ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدّد ارشادات کی روشنی میں جو جنگ آسمانی تعلیمات کی بالادستی اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کیلئے لڑی جائے وہ جہاد ہے۔ اور جس جنگ کا مقصد نسل، رنگ، علاقہ، یا قومیت کے حوالے سے ایک انسانی گروہ پر دوسرے گروہ کی بالادستی ہو وہ جاہلیت اور فساد ہے۔

دہشت گردی اور جہاد کے درمیان فرق کا ایک پس منظر تو یہ ہے جو اصولی اور نظری ہے اور اسلامی تعلیمات کی

روشنی میں ہے۔ لیکن اس کا ایک پس منظر معروضی اور واقعاتی بھی ہے جس کا مشاہدہ ہم گذشتہ ڈیڑھ صدی سے کر رہے ہیں کہ مغرب آسمانی تعلیمات اور مذہب کیلئے ہتھیار کے استعمال کو مسلسل دہشت گردی قرار دے رہا ہے مگر اپنے فلسفہ و تہذیب کیلئے ہتھیار کا استعمال اس کے نزدیک جائز بلکہ ناگزیر ضرورت ہے۔ مثلاً

- افغانستان میں روسی فوجوں کی موجودگی کے خلاف مسلح جنگ مغرب کے نزدیک جہاد تھی مگر خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ناراضگی کا مسلح اظہار دہشت گردی ہے۔
- کویت پر عراق کی فوج کشی اور قبضہ مغرب کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا اور جب تک مسلح طاقت کے ذریعے یہ قبضہ ختم نہیں کرا لیا گیا مغرب نے چین کا سانس نہیں لیا، مگر بیت المقدس پر اسرائیل کی فوج کشی اور ۱۹۶۷ء میں اس پر جارحانہ قبضہ مغرب کے نزدیک کوئی جرم نہیں، اور اس قبضہ کو جائز تسلیم کرانے کیلئے مغرب اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا ہے۔
- مشرقی تیمور کی مسیحی اکثریت کو حق خود ارادیت کے ذریعے آزادی دلوانے میں اقوام متحدہ کا کردار ایک متحرک اور فعال ادارے کا کردار ثابت ہوا۔ مگر مقبوضہ کشمیر کی مسلم اکثریت کا حق خود ارادیت جنرل اسمبلی کی قراردادوں سمیت اقوام متحدہ کے فریزر میں نصف صدی سے منجمد پڑا ہے۔

مسٹر جیری اسٹکلف سے گزارش ہے کہ جہاد اور دہشت گردی کے درمیان واضح فرق یقیناً موجود ہے اور وہ مسلمانوں کے علم میں بھی ہے مگر اسے گذشتہ ڈیڑھ صدی سے مغرب کے دوہرے اور متضاد کردار نے گڈمڈ کر رکھا ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں کوئی کنفیوژن پایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری زیادہ تر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ کیا مسٹر جیری اسٹکلف مغرب کی قیادت کو اس تضاد اور دوہرے معیار پر نظر ثانی کا مشورہ دینے کی زحمت فرمائیں گے؟

امریکی مفادات اور اسلام آباد کی کمٹمنٹ

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۸ فروری ۲۰۰۶ء

''آن لائن'' کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس نے اپنی حالیہ رپورٹ میں امریکی مفادات کے حوالے سے اسلام آباد کی کمٹمنٹ کو بعض معاملات میں مشکوک قرار دیا اور اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نائن الیون کے بعد انسداد دہشت گردی کی کوششوں میں پاکستان امریکہ کا اہم اتحادی بنا، تاہم بعض اہم امریکی مفادات کے بارے میں اسلام آباد کی کمٹمنٹ میں کچھ شکوک موجود ہیں۔ رپورٹ میں مستحکم پاکستان کو برّاعظم ایشیا میں امریکہ کے مفاد میں بتایا گیا ہے مگر دہشت گردی، افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق کا تحفظ اور اقتصادی ترقی پر رپورٹ میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ امریکی ریسرچ سروس کا کہنا ہے کہ پاکستان میں کافی تعداد میں امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں جو صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں۔ رپورٹ میں پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ۲۶ جون ۲۰۰۶ء کی پریس کانفرنس کا حوالہ

بھی دیا گیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فوجی حکومت ملک میں سیکولر جمہوری قوتوں کو سائیڈ لائن کر رہی ہے اور اس اقدام سے پیدا ہونے والے خلاء کو انتہا پسند پر کر رہے ہیں۔

امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کی رپورٹ کے اس خلاصے کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے اپنی پالیسیوں کے حوالے سے جو یوٹرن لیا تھا اس سے امریکی حکمران مطمئن نہیں ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو اپنا اتحادی قرار دیتے وقت ان کے ذہنوں میں جو ایجنڈا تھا وہ پوری طرح آگے نہیں بڑھا اور بعض معاملات میں امریکی مفادات کے ساتھ کمٹمنٹ کے حوالے سے شکوک و شبہات کی فضا ابھی تک موجود ہے۔

سب سے پہلے تو امریکی مفادات کے ساتھ اسلام آباد کی کمٹمنٹ کا تصور ہی توجہ طلب ہے کہ اسلام آباد بہرحال ایک آزاد اور خود مختار ملک کا دارالحکومت ہے جو عالمی اور علاقائی سطح پر اپنے مسائل اور اپنی ترجیحات رکھتا ہے، اس کا ایک نظریاتی اور تہذیبی تشخص ہے اور بین الاقوامی تعلقات و معاملات میں خود اس کے اپنے مفادات کی ایک فہرست موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کا دارالحکومت ہونے کے ناطے اسلام آباد کی کمٹمنٹ اپنے ملک کے نظریے، تہذیب، مفادات و خود مختاری اور ترقی و استحکام کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کمٹمنٹ کے درجہ کا تعلق ایک آزاد ملک کے دارالحکومت کا کسی اور ملک کے ساتھ عجیب سا لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بدل گئے ہیں اور نوآبادی کی جگہ ''اتحادی'' اور غلامی اور وفاداری کی جگہ ''کمٹمنٹ'' نے لے لی ہے۔

امریکہ نے نائن الیون کے بعد بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سوویت یونین کے بکھرنے پر واحد عالمی طاقت کے دعوے کے ساتھ جس نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان کیا تھا اس کا اصل مقصد ''واحد عالمی حکومت'' تھا۔ امریکہ تب سے عالمی طاقت کے طور پر نہیں بلکہ عالمی حکومت کے طور پر اپنے کردار کو آگے بڑھا رہا ہے اور اسی وجہ سے اسے مختلف دارالحکومتوں سے یہ شکایات پیدا ہو رہی ہیں کہ وہ اس کے مفادات کا پوری طرح تحفظ نہیں کر رہیں اور بعض معاملات میں ان کی کمٹمنٹ مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔ بات صرف اسلام آباد تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے دارالحکومت بھی شکوک و شبہات کی اسی دھند کا شکار ہیں۔

اسلام آباد کی حالت اس حوالے سے سب سے زیادہ قابل رحم ہے کہ ''اسلام'' اس کے نام کا حصہ ہے اور وہ جس ملک کا دارالحکومت ہے اس کے نام کا آغاز بھی ''اسلامی'' سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کیلئے امریکہ کو اپنی وفاداری کا اعتماد دلانا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر اس نے ایٹمی ہونے کا روگ بھی پال رکھا ہے جو آج کی عالمی حکومت اور دیگر عالمی قوتوں کے نزدیک ان کے علاوہ کسی اور کیلئے ایک روگ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جب ایٹم بم کے ساتھ اسلام کا لفظ بھی شامل ہو جائے تو اسلام آباد کا ایٹم بم بہت سے لوگوں کے پیٹوں میں مروڑ کا باعث بن جاتا ہے۔

اسلام آباد کی حالت اس پہلو سے بھی قابل رحم ہے کہ ایک طرف اس ملک کے عوام، سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اسلام آباد نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ ملک کے عوام کو اسلام آباد سے شکوہ ہے کہ

- اس نے اپنے ملک کے عوام کے جذبات واحساسات اور ملک کے دستوری اور نظریاتی تشخص کی قربانی دیتے ہوئے افغانستان پر امریکی حملے کیلئے لاجسٹک سپورٹ مہیا کی جسے بعض زندہ دل بندوق چلانے کیلئے اپنا کندھا فراہم کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔
- اسلام آباد نے افغانستان کے بعد کشمیر کے مسئلے پر بھی یوٹرن لے لیا ہے اور اس کی نئی پالیسیوں کے باعث کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سبوتاژ ہوتی نظر آرہی ہے۔
- اسلام آباد نے ملک میں اسلامی اقدار وروایات کے تحفظ کیلئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بجائے ملک کی تہذیبی پیش رفت اور ثقافتی پیش قدمی کا رخ مغرب کی طرف موڑتے ہوئے ملک وقوم کے تمام ذرائع و وسائل اس کیلئے وقف کر دیے ہیں۔
- ملک کے دینی حلقے شکایت کررہے ہیں کہ ان کی بہترین نوجوان قوت کو سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے مفاد میں استعمال کرلینے کے بعد اسلام آباد اس قوت کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کیلئے امریکہ کے دست وبازو کا کردار ادا کر رہا ہے۔

مگر دوسری طرف امریکہ بھی اسلام آباد سے خوش نہیں ہے اور اسے یہ شکوہ ہے کہ اس نے پاکستان کو ”اتحادی“ ہونے کے صلے میں جو خدمات سونپی تھیں اور جو ایجنڈا اسلام آباد کے سپرد کیا تھا وہ پورا نہیں ہو رہا۔ اسے جن باتوں پر تشویش ہے ان میں دہشت گردی، پاک افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق اور اقتصادی ترقی جیسے مسائل شامل ہیں۔

- دہشت گردی کے خاتمے میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعاون کی سطح یہ ہے کہ پاکستان کی قومی خودمختاری اور بین الاقوامی سرحدوں کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے امریکی فضائیہ پاکستان کی سرزمین پر بمباری کرتی ہے اور اسلام آباد پوری قوم کے سراپا احتجاج ہونے کے باوجود نیاز مندی کے ساتھ واشنگٹن کے آگے سر جھکائے کھڑا ہے۔
- پاک افغان تعلقات کی صورتحال یہ ہے کہ افغانستان میں پاکستان کی حمایتی اور نیاز مند طالبان حکومت کے خاتمے میں اسلام آباد برابر کا شریک تھا۔ اس کے بعد سے کابل کے اسلام آباد اور دہلی کے درمیان معاملات میں جھکاؤ کا رخ ساری دنیا پر واضح ہے۔ مغربی سرحدوں پر پاک فوج کا پہلے جیسا اطمینان اور بے فکری بھی باقی نہیں رہی۔ اسلام آباد کی اتنی بڑی قربانی کے باوجود امریکہ کو پاک افغان تعلقات کے حوالے سے تشویش ہے اور اسے شک کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔
- ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے اور اس معاملے میں مغرب کو مطمئن رکھنے کیلئے اسلام آباد نے پاکستان کے قومی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر کو نظر بندی کی اذیت سے دوچار کر رکھا ہے اور پوری قوم اپنے ہیرو کی اس تذلیل پر

بے چین اور مضطرب ہے۔ مگر امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو شبہ ہے کہ اسلام آباد اس بارے میں بھی واشنگٹن کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔

- مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت کشیدگی کے مسئلے پر اسلام آباد وہاں تک آگے جا رہا ہے جہاں کوئی پاکستانی حکومت اب تک سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آزادی کشمیر کی خاطر لڑنے والوں کی بے وقعتی اور بھارت کے ساتھ اعتماد سازی کے یکطرفہ اقدامات پر پوری پاکستانی قوم سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔ مگر واشنگٹن ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔
- انسانی حقوق کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جب تک ملک میں اسلامی اقدار کا نام لیا جاتا ہے، قرآن و سنت کے احکام کی بات کی جاتی ہے، پردہ حیا اور شرم کی حدود کا ذکر ہوتا ہے اور مغربی ثقافت کی کسی بھی بات کو اسلامی اقدار کے منافی قرار دینے کی بات ہوتی ہے، واشنگٹن کا انسانی حقوق کا ہدف پاکستان میں پورا نہیں کیا جا سکتا۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر امریکہ کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ جذبات صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ کو اصرار ہے کہ اسلام آباد اپنے ملک کے عوام کے جذبات کا احترام کرنے کی بجائے صرف امریکہ کے مفادات کیلئے کام کرے۔ اور پاکستان کے عوام کچھ بھی رائے رکھتے ہوں، اسلام آباد امریکہ کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ پکی رکھے۔ امریکہ کے نزدیک اسی کا نام جمہوریت ہے اور یہی اس کا انسانی حقوق کا معیار ہے۔

باقی رہی بات محترمہ بے نظیر بھٹو کی تو انہیں بہت دیر سے یاد آیا ہے کہ وہ سیکولر جمہوری قوت کی نمائندگی کر رہی ہیں اور انہیں صرف اس وجہ سے سائیڈ لائن کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئی ہیں کہ اس ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دینے، اسلام کو ملک کے سرکاری دین کا درجہ دینے، دستوری طور پر ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضمانت دینے، اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا سہرا اب تک ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سر باندھا جاتا رہا ہے۔ ہمیں ان کے اس اعزاز سے انکار نہیں ہے بلکہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تدوین میں دستور ساز اسمبلی کی قیادت کرنے کے حوالے سے ہم نہ صرف بھٹو مرحوم کے اس اعزاز کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ بھٹو مرحوم نے جمعہ کی سرکاری تعطیل کا اعلان کیا تھا اور شراب اور جوئے پر پابندی کا حکم صادر کیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اسی دستور کے تحت دوبار ملک کی وزیر اعظم رہ چکی ہیں۔ مگر اب نائن الیون کے بعد ان کی یادداشت نے کام کرنا شروع کیا ہے اور انہیں یاد آیا ہے کہ وہ کسی سیکولر جمہوری قوت کی نمائندہ ہیں۔ ہم اس موقع پر محترمہ بے نظیر بھٹو سے صرف یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان کو امریکی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس حد تک آگے نہیں جا سکتیں جہاں تک موجودہ حکومت جا چکی ہے، اس کے باوجود امریکہ اسلام آباد سے مطمئن نہیں۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان
اور مولانا فضل الرحمان خلیل

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳ اپریل ۲۰۰۶ء

دو خبریں بظاہر الگ الگ ہیں مگر خدا جانے مجھے الگ الگ کیوں نظر نہیں آرہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ پاکستان میں امریکہ کے سفیر ریان سی کروکر نے ایک نجی ٹی وی چینل کے پروگرام کیپیٹل ٹاک میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان کا نیٹ ورک ختم ہو چکا ہے اور آئندہ پاکستان میں کوئی ڈاکٹر قدیر پیدا نہیں ہوگا۔ جبکہ دوسری خبر میں بتایا گیا ہے کہ معروف جہادی رہنما مولانا فضل الرحمان خلیل کو گذشتہ روز مسلح افراد نے ان کے ڈرائیور سمیت اغوا کر کے ان پر شدید تشدد کیا اور پھر رات کی تاریکی میں انہیں رسیوں سے جکڑ کر نیم مردہ حالت میں پنڈی گھیپ روڈ (راولپنڈی) پر پھینک دیا جنہیں اردگرد کے لوگوں نے سول ہسپتال پہنچایا اور وہ وہاں زیر علاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازیں، آمین۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان اور مولانا فضل الرحمان خلیل کے نیٹ ورک الگ الگ ہیں اور دونوں میں بظاہر کوئی ربط دکھائی نہیں دے رہا لیکن اپنے پس منظر کے حوالے سے وہ ضرور مماثلت رکھتے ہیں اور یہی مماثلت میرے ذہن کو توجہ دلا رہی ہے کہ کہیں یہ دونوں خبریں کسی ایک ہی معاملہ کے دو مختلف پہلو تو نہیں ہیں؟ ڈاکٹر عبد القدیر خان کے نیٹ ورک کا پس منظر تو یہ ہے کہ وہ ایک ایٹمی سائنس دان ہیں اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، اسلام سے وابستگی میں پختہ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر ان کا دل کڑھتا ہے، انہیں بیرون ملک اپنے شعبہ میں تعلیمی اور تحقیقی پیشرفت کا موقع ملا تو ان کے دل میں خیال آیا کہ ایٹمی توانائی اور اس کی عسکری افادیت سے ان کے اپنے ملک کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا تو معلوم ہوا کہ ان کا ملک اور اس جیسے اور بہت سے ممالک جن کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلمان کا کوئی سابقہ یا لاحقہ موجود ہے ان کیلئے ایٹمی توانائی اور اس کی عسکری افادیت شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کے چند بڑوں نے اپنے سوا دوسروں کیلئے اس کے بارے میں سوچنا تک حرام قرار دے رکھا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے کسی ملک کیلئے اس کا خواب دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان نے دیکھا کہ یہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل سکتا تو انہوں نے انگلیوں کو تھوڑا سا ٹیڑھا کر لیا جو کہ اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں اور وہ اپنے ملک کیلئے تھوڑا سا گھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہیں اس میں اپنے ملک کے حکمرانوں ذوالفقار علی بھٹو، جنرل محمد ضیاء الحق، غلام اسحاق خان اور میاں محمد نواز شریف کی سرپرستی حاصل رہی اور ان سب کی کوششوں سے پاکستان ایٹمی تجربہ کرنے میں کامیاب ہوگیا جو ایٹمی توانائی کے اجارہ داروں کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر پاکستان مسلسل سزا اور مواخذہ کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان کا یہ جرم ہی ان عالمی اجارہ داروں کے نزدیک خوفناک تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک اور الزام آگیا

کہ ڈاکٹر عبد القدیر دنیا کے دیگر ممالک کو بھی یہ گھی حاصل کرنے کیلئے انگلیاں ٹیڑھی کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں اور ایٹمی توانائی کی عسکری افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ الزام فی الواقع درست ہے یا نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن اس چارج شیٹ کے ساتھ ڈاکٹر عبد القدیر کو جس صورتحال سے دوچار کر دیا گیا ہے اس کی ایک جھلک امریکی سفیر کے مذکورہ بیان میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جس کا لہجہ ان کے بیان کے بین السطور کی وضاحت کر رہا ہے کہ ان کے خیال میں ڈاکٹر عبد القدیر خان کو اس حد تک نشان عبرت بنا دیا گیا ہے کہ اب کوئی پاکستانی ڈاکٹر عبد القدیر بننے کا حوصلہ نہیں کر پائے گا۔

اب ذرا ایک نظر مولانا فضل الرحمان خلیل اور ان کے نیٹ ورک کے پس منظر پر بھی ڈال لیجئے۔ ابھی افغانستان کا جہاد شروع نہیں ہوا تھا اور اس کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ فیصل آباد کے ایک نوجوان نے، جو بعد میں مولانا ارشاد شہیدؒ کے نام سے تاریخ کا حصہ بنے، مختلف علماء کرام سے ملاقاتوں میں انہیں اس طرف توجہ دلانا شروع کی کہ ہمارے ہاں جہاد پڑھایا تو جاتا ہے مگر اس کی عملی ٹریننگ نہیں دی جاتی جبکہ ہتھیار مسلمان کا زیور ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے اور جہاد کی عملی تربیت مسلمانوں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ وہ اس وقت مجھے بھی ملتے تھے اور بڑے درد دل کے ساتھ اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ ہمیں اس بارے میں غفلت نہیں برتنی چاہیے اور ملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں کوئی عملی راستہ ضرور نکالنا چاہیے۔ مجھے ان سے ہمدردی تھی، ان کے جذبات کی دل میں قدر تھی اور ان کے اس خیال سے اتفاق بھی تھا۔ مگر ایک تو میں خود کو اس عملی میدان کیلئے موزوں نہیں سمجھتا تھا کہ میری سرگرمیوں کا اصل میدان علمی اور فکری چلا آرہا ہے، اور دوسرا اس وقت کوئی عملی ہدف بھی سامنے نہیں تھا اس لیے فکری مشاورت سے آگے نہ بڑھ سکا اور ہر ملاقات میں ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مناسب وقت اور مناسب میدان کے انتظار کا کہتا رہا۔

اس کے چند برس بعد جہاد افغانستان کا آغاز ہوا تو مولانا ارشاد احمد کو ایک موزوں میدان بھی مل گیا مگر اب ان کے ساتھ دو تین نوجوان اور بھی شریک سفر تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فضل الرحمان خلیل، دوسرے مولانا قاری سیف اللہ اختر اور تیسرے مولانا مسعود کشمیری شہیدؒ تھے۔ ان نوجوانوں نے جہاد افغانستان کیلئے اپنے ملک کے نوجوانوں کو تیار کرنے کیلئے جس جانفشانی اور جرأت و استقلال کے ساتھ کام کیا، ہزاروں نوجوانوں کو جہاد کی ٹریننگ دلوائی اور میدان جنگ میں روسی استعمار کے خلاف لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میں اس کو ایٹمی توانائی کے شعبہ میں ڈاکٹر عبد القدیر اور ان کے رفقاء کی جدوجہد سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا۔ انہیں اس معاملہ میں اپنے بزرگوں کی سرپرستی حاصل تھی کہ جہاد افغانستان کی عملی سرپرستی کرنے والوں میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبد الحقؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ جیسے اکابر شامل تھے۔ اس دور میں میرا ان کے ساتھ رابطہ رہا اور اپنے مذکورہ بالا بزرگوں کی پیروی میں اپنے دائرۂ کار کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے فکر و مشاورت میں ان کے ساتھ اشتراک و ربط میں نے قائم رکھا مگر عملاً میں ان کا ساتھی نہ بن سکا جسے میں اس فارسی شعر کی صورت میں تعبیر کرتا ہوں:

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق

او بصحرا رفت ومادر کوچہ ہار سوا شدیم

اس کے بعد اور بھی بہت سے باہمت نوجوان آگے بڑھے اور اس میدان میں قیادت اور پیشرفت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن میری معلومات کی حد تک اس میدان کے ''السابقون الاولون'' یہی چار پانچ حضرات تھے اور آج پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جہاد کے عنوان سے جو سرگرمیاں جاری ہیں ان کے ''ڈاکٹر عبد القدیر'' یہی لوگ ہیں۔ یہ نوجوان آج کے دور کے نوجوان تھے، ان سے یقیناً غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی، ان کے طریق کار کے بعض پہلوؤں سے مجھ سمیت بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوگا، ان کے طرز عمل اور دائرۂ کار کے بارے میں تحفظات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا خلوص اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے بہتر مستقبل اور مفاد کے ساتھ ان کی وفاداری ہمیشہ شکوک و شبہات سے بالاتر رہی ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی دینی جدوجہد کے مجموعی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ عالمی صورتحال پر ایک نظر ڈالی جائے تو اپنے نتائج اور ثمرات کے حوالے سے ڈاکٹر عبد القدیر کے نیٹ ورک اور مولانا ارشاد احمد شہید کے نیٹ ورک میں مماثلت تلاش کرنا بھی کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

اسی لیے یہ دونوں نشانے پر ہیں اور ''جہاد'' کے لفظ سے بدکنے والوں کے نزدیک ان دونوں کو کسی نہ کسی صورت ختم کرنا ضروری ہوگیا ہے جس کیلئے مسلسل کام ہو رہا ہے۔ اس لیے چاند ماری کرنے والے تو اپنا کام جاری رکھیں گے مگر ملک بھر کے عام مسلمانوں اور دیندار عوام سے میں یہ گزارش کروں گا کہ وہ ڈاکٹر عبد القدیر خان اور مولانا فضل الرحمان خلیل کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں کہ یہ بھی ایک ہتھیار ہے اور جب کوئی اور ہتھیار کارگر نہیں ہوتا تو صرف یہی ہتھیار مومن کے کام آتا ہے۔

مولوی محمد یونس خالصؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۸ جولائی ۲۰۰۶ء

مولوی محمد یونس خالصؒ کی وفات کی خبر قومی اخبارات میں نظر سے گزری، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حالات کے اتار چڑھاؤ کا کرشمہ ہے کہ ان کی وفات کی یہ خبر پاکستان کے بہت سے قومی اخبارات کے ایک کونے میں جگہ پاسکی۔ ورنہ اگر زمانہ ناقدری کا خوگر نہ ہوتا اور لوگوں میں محسن کشی اور احسان ناشناسی اس قدر غلبہ نہ پاچکی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کے قومی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں مولوی محمد یونس خالص کا تذکرہ پاکستان کے ایک محسن کے طور پر کیا جاتا بلکہ امریکہ اور مغرب کا میڈیا بھی ان کا تذکرہ اس طور پر کرتا کہ افغانستان کا وہ عظیم رہنما دنیا سے رخصت ہوگیا ہے جس نے سوویت یونین کو شکست دینے اور سرد جنگ میں مغرب کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا، لیکن احسان ناشناسی بلکہ محسن کشی کے اس دور میں اس انصاف کی توقع کس سے کی جاسکتی ہے!

مولوی محمد یونس خالص شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے بلکہ اکوڑہ خٹک میں جب شیخ الحدیث نے دار العلوم حقانیہ کا آغاز کیا تو ان کے ابتدائی رفقاء میں مولوی محمد یونس خالص بھی شامل تھے۔ وہ انتہائی حوصلہ

مند اور جری علماء میں سے تھے، جب افغانستان میں سوویت یونین نے اپنا قبضہ مستحکم کرنے کیلئے فوجیں اتاریں اور افغانستان کو کمیونسٹ ممالک کے کیمپ میں شامل کرنے کی غرض سے طاقت اور جبر کا راستہ اختیار کیا تو جن حریت پسندوں نے روسی استعمار کی اس عسکری جارحیت کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کیا ان میں مولوی محمد یونس خالص بھی تھے۔ انہوں نے دیگر علماء کرام کے ساتھ مل کر روس کی فوجی جارحیت اور نظریاتی یلغار کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور عملی طور پر جہاد کا آغاز کیا۔

جہاد افغانستان کے ابتدائی سالوں میں جب کسی کو اس جہاد کی کامیابی بلکہ پیش رفت کا یقین نہیں تھا اسے مولویوں کا جنون کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جہادی رہنما اپنی حمایت و معاونت کا سب سے بڑا سرچشمہ عالم اسباب میں پاکستان کے دینی حلقوں اور غیور عوام کو تصور کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر مجاہدین کے کنٹرول تک امریکہ سمیت مغربی ممالک یہ سوچنے کیلئے بھی تیار نہیں تھے کہ یہ جنگ لڑی جاسکتی ہے اور اسے جیتا بھی جاسکتا ہے۔ اس دور کی بات ہے کہ مولوی محمد یونس خالص پاکستان کے مختلف شہروں میں آئے اور ہم نے شیرانوالہ لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، فیصل آباد اور دیگر شہروں میں ان کیلئے علماء کرام کے اجتماعات کا اہتمام کیا تاکہ وہ انہیں جہاد افغانستان کی اہمیت سے آگاہ کر سکیں اور اپنا موقف سمجھا سکیں۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں ہوئیں اور کئی محافل میں شرکت ہوئی۔ میں نے مولوی محمد یونس خالص مرحوم کو آخری بار قندھار میں اس دور میں دیکھا جب طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن ابھی کابل ان کے کنٹرول میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مصالحتی مشن کے سلسلہ میں قندھار آئے ہوئے تھے اور "حرکتِ انقلاب اسلامی افغانستان" کے سربراہ مولوی محمد نبی محمدیؒ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس کے بعد میں ان دونوں بزرگوں کو نہیں دیکھ سکا البتہ اخبارات میں مختلف حوالوں سے ان کی خبریں وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتی رہیں۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں مولوی محمد یونس خالصؒ کی وفات کی خبر پڑھی تو بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہونے لگیں اور افغانستان کے علماء کرام اور مجاہدین کے ایک حوصلہ مند قائد کی تگ و تاز کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں، ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں، ان کی حسنات کو قبولیت سے نوازیں اور ان کی ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے اسباب مہیا کریں جن کو سامنے رکھ کر مولوی محمد یونس خالص اور دیگر جہادی رہنماؤں نے جہادِ افغانستان کی طرف عملی قدم بڑھایا تھا، آمین یارب العالمین۔

سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے خیالات

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۶ ستمبر ۲۰۰۶ء

جمی کارٹر امریکہ کے سابق صدر ہیں اور صدارت کے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی امریکہ کیلئے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے شہر اٹلانٹا (جارجیا) میں "دی کارٹر سینٹر" کے نام سے ایک مرکز ہے جس کے ذریعے وہ اور ان کی اہلیہ روزالن امریکی قوم کی علمی و فکری راہنمائی کیلئے مختلف موضوعات پر تحقیقی و مطالعاتی سرگرمیوں میں مصروف

رہتے ہیں۔ امریکہ میں سابق صدور وائٹ ہاؤس سے تو ریٹائر ہوتے ہیں لیکن عملی زندگی میں بقیہ زمانہ ''شوپیس'' کے طور پر نہیں گزارتے بلکہ علمی اور فکری محاذ پر متحرک ہو جاتے ہیں اور قوم کو راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ رچرڈ نکسن، رونالڈ ریگن، جمی کارٹر اور بل کلنٹن کی دور صدارت کے بعد کی سرگرمیوں اور تگ و دو کو دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ امریکی صدور امریکہ اور امریکی قوم کیلئے دورِ صدارت سے زیادہ مصروف عمل ہوتے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ ریسرچ سینٹر قائم کیے ہیں، وہ اپنی حکومتوں کو مشورے دیتے ہیں، ان کی غلطیوں پر ٹوکتے ہیں، خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور قوم کی بھرپور راہنمائی کرنے کے ساتھ عالمی فورم پر امریکی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہیں اور انہوں نے بین الاقوامی تعلیمی اداروں میں اس حوالے سے بریفنگ کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی جدوجہد کو کامیابی کا رخ اختیار کرتے دیکھ کر جہادِ افغانستان کی کامیابی کی صورت میں ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کے ''خطرے'' کو سب سے پہلے امریکہ کے سابق صدر نکسن نے محسوس کیا، جنہیں واٹر گیٹ اسکینڈل کے نتیجے میں امریکی صدارت سے دستبردار ہونا پڑا تھا اور وہ اپنی مدت صدارت پوری نہیں کر سکے تھے، لیکن ان کا قائم کردہ سینٹر آج بھی امریکہ کے اہم فکری، تحقیقی اور مطالعاتی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ جہاد افغانستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے تو وہ امریکہ اور روس کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کیلئے متحرک ہو گئے۔ یہ تصور سب سے پہلے انہوں نے ہی اجاگر کیا کہ مسلم ممالک میں جہاد کے جذبہ سے سرشار مسلمان امریکہ اور روس دونوں کیلئے خطرہ ہیں اور اس خطرہ سے نمٹنے کیلئے انہوں نے روسی دانشوروں سے براہ راست روابط استوار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اور پھر یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ امریکہ اور سوویت یونین نے جہاد افغانستان کے منطقی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک خودساختہ نتیجہ نکال لیا اور اتنی عجلت سے فیصلے کیے کہ افغان مجاہدین کو افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے باوجود اپنی گیارہ سالہ جدوجہد اور قربانیوں کے منطقی ثمرات حاصل نہ ہو سکے۔ اس سارے عمل کے پیچھے سوچ اور فکر رچرڈ نکسن کی کارفرما تھی جو وائٹ ہاؤس سے ایک اسکینڈل کے ذریعے نکالے جانے کے باوجود اپنے ملک اور قوم کے ساتھ مخلص رہے اور قومی مفادات کیلئے آخر دم تک متحرک اور فعال رہے۔

سابق صدور ہمارے ہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ خود کو گروہی سیاست اور طبقاتی کشمکش سے بالاتر نہیں کر سکتے اور ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز رہنے کے بعد بھی ان کی سوچ اور تگ و دو کا محور اقتدار میں کسی نہ کسی درجے میں دوبارہ شرکت ہی نظر آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ایک سابق صدر تو ایسے نظروں سے غائب ہوئے ہیں کہ جیسے صدارت سے علیحدگی پر سکتہ کی کیفیت نے ہمیشہ کیلئے ان کے دل و دماغ کا حصار کر لیا ہو۔

گذشتہ سال ستمبر کے دوران مجھے اٹلانٹا میں ''دی کارٹر سینٹر'' دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن صرف دیکھنے اور کچھ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ انگریزی زبان پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محرومی نے باقی تمام امکانات کا راستہ روک لیا اور کئی روز تک دل و دماغ پر یہ حسرت چھائی رہی کہ اگر میں انگریزی پڑھ سکتا اور بول سکتا تو ''دی کارٹر سینٹر'' کے تحقیقی ذخیرے اور دستاویزات سے استفادہ کرتا اور اپنی قوم کو یہ بتلاتا کہ زندہ قوموں کے حکمران کس طرح

اقتدار سے محرومی کے بعد بھی اپنے ملک اور قوم کیلئے سرگرم رہتے ہیں اور اقتدار سے علیحدگی کس طرح ان کے قومی جذبات کے نشے کو دوآتشہ کر دیتی ہے۔

جمی کارٹر نے امریکہ اور امریکی قوم کے مسائل پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ قومی مسائل پر وقتاً فوقتاً اہم افراد اور ماہرین کی مشاورت کا اہتمام کرتے رہتے ہیں اور اخبارات میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جمی کارٹر اب سے ربع صدی قبل امریکہ کے صدر تھے اور اب کم و بیش اسی برس کی عمر میں بھی اپنے مشن کیلئے پوری طرح چاق و چوبند ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ سابق امریکی صدور کو اپنی قوم اور ملک کیلئے اس طرح کام کرتے دیکھ کر مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا یاد آجاتی ہے جو انہوں نے مکہ مکرمہ میں ابوجہل اور عمر بن الخطاب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پورے جوش و جذبہ اور حوصلہ و جرأت کے ساتھ کام کرتے دیکھ کر بارگاہِ ایزدی میں اس طرح کی تھی کہ ”یا اللہ! ان میں سے ایک تو مجھے دے دے“۔ میرے دل میں بھی یہ تمنا بلکہ حسرت رہتی ہے کہ اے کاش! کوئی نکسن، کوئی کارٹر، کوئی ریگن اور کوئی کلنٹن ہمارے یہاں بھی ہو۔ مہاتیر محمد کو ملائیشیا کی وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد اس رخ پر چلتے دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی مگر اقتدار کی سیاست ابھی تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی اور موجودہ وزیراعظم ڈاکٹر احمد عبداللہ بداوی کے ساتھ ان کی ”پاور پالیٹکس“ کی کشمکش کی خبروں نے اس خوش کن امید کو دھندلانا شروع کر دیا ہے۔

بات بہت دور نکل گئی ہے اور خلافِ معمول جذبات کی رو میں بہہ کر میں وہ بات ابھی تک شروع نہیں کر سکا جس کیلئے میں نے جمی کارٹر کا تذکرہ کیا ہے۔ دراصل جمی کارٹر کی ایک کتاب اس وقت میرے زیر مطالعہ ہے جس کا انگریزی نام America's Moral Crisis ہے اور جناب محمد احسن بٹ نے ”امریکہ کا اخلاقی بحران“ کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پونے دو سو سے زائد صفحات کی یہ مجلد کتاب ”دارالشعور، ۴۲ مزنگ روڈ، بک اسٹریٹ، لاہور“ نے شائع کی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ کتاب جہاں باشعور امریکیوں کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتی ہے وہاں اسے بش سینئر اور بش جونیئر کے دورِ صدارت میں امریکی پالیسیوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے خلاف چارج شیٹ اور فردِ جرم کا درجہ بھی حاصل ہے۔ جمی کارٹر موجودہ امریکہ کو قومی پالیسیوں اور حکومتی اقدامات کے حوالے سے ماضی کے امریکہ سے مختلف قرار دیتے ہیں اور کسی تامل کے بغیر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ امریکہ اقوامِ عالم کی برادری میں اپنے امتیاز و اختصاص اور مقام و کردار سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جمی کارٹر کی عائد کردہ اس ”فرد جرم“ کی اہم باتوں سے اپنے قارئین کو بھی آگاہ کروں مگر اس کی تمہید طویل ہو گئی۔ لیجئے! آپ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ صدر بش کی پالیسیوں اور کارروائیوں کے بارے میں امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کیا کہتے ہیں:

”انتہائی تنگ نظری پر مبنی مذہبی عقائد کو سیاسی پارٹیوں کا بے لچک ایجنڈا بنا لیا گیا ہے۔ حکومت کے اندر اور باہر موجود لابی کاروں Lobbyists نے آزاد سوچ اور عمل کے قابل تحسین امریکی ایقان Belief کو انتہائی دولتمند شہریوں کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے اور ساری کی ساری دولت صرف اپنے وارثوں کو ہی منتقل کرنے کے حق میں بدل دیا ہے۔“ (ص ۱۹)

”ہمارا ملک بین الاقوامی تنظیموں کی حدود سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکا ہے۔ نیز بہت سے پرانے عالمی معاہدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، جن میں عدالتی فیصلے، ایٹمی اسلحہ کے حوالے سے کیے گئے معاہدے، حیاتیاتی Biological ہتھیاروں پر کنٹرول کے معاہدے، ماحول کے تحفظ کے معاہدے، انصاف کا بین الاقوامی نظام، اور قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کے معاہدات شامل ہیں۔“ (ص ۱۹)

”آج کل واشنگٹن کا منظر مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہے، اور تقریباً ہر معاملے پر سخت جانبدارانہ بنیادوں پر فیصلے کیے جا رہے ہیں۔ کلیدی نوعیت کے قانون سازی کے فیصلوں پر عوامی مباحثہ کرانا اب قصہ ماضی بن چکا ہے۔ بنیادی معاہدے لابی کاروں اور قانون ساز لیڈروں کے مابین ہوتے ہیں، جن میں اکثر پارٹی کے بند کمروں کے اجلاسوں میں ہوتے ہیں کہ جہاں سخت پارٹی نظم حاوی ہوتا ہے۔“ (ص ۲۴)

”جب امریکیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ ذاتی طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کا اپنی ہی صنف کے افراد کے ساتھ جنسی عمل کرنا قابل قبول ہے؟ تو ان کی اکثریت اثبات میں جواب دیتی ہے۔ اب سے بیس برس پہلے لوگوں کی رائے اس سے بہت مختلف ہوا کرتی تھی۔“ (ص ۳۰)

”میرا عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح نجات دہندہ اور خداوند کے بیٹے ہیں۔ پروٹسٹنٹ، رومن کیتھولک، مشرقی آرتھوڈکس، کوپٹس، سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ، اور بہت سے دوسرے مذہبی لوگ بھی بغیر کوئی سنجیدہ سوال اٹھائے ان عقائد کو مانتے ہیں۔ ہم نے اپنے بیپٹسٹ فرقے کی کچھ خاص باتوں کو بھی دل و ذہن میں جذب کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک بپتسمہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اتنے پختہ اور بالغ نظر ہوں کہ یسوع مسیح پر شخصی ایمان لا سکتے ہوں۔ پانی میں غوطہ دینا ہمارے نجات دہندہ کی موت، تدفین اور حیاتِ نو کی علامت ہے۔ ہم کتاب مقدس کو مکمل طور پر خداوند کا ارادہ مانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ یسوع مسیح کے الفاظ و اعمال ہی کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر و تشریح کی جانی چاہیے۔ چنانچہ کتاب مقدس کی اکثر و بیشتر مددگار ثابت ہونے والی انسانی تشریحات کو منزہ عن الخطاء، یا مصدقہ مذہبی ضوابط کا مجموعہ، یا ایمانی احتساب کے ذرائع نہیں مانا جاتا۔“ (ص ۳۲)

”ایوانجیلیکل کی حیثیت سے ہمارا عالمی مشن یہ ہے کہ بغیر کسی تعصب اور امتیاز کے اپنا عیسائی عقیدہ دوسروں تک پہنچائیں۔ ہم یسوع مسیح کی اس ہدایت پر اپنی ذاتی شہادت Witnessing کے ذریعے یا دوسروں کیلئے باقاعدگی کے ساتھ مالی قربانی دے کر عمل کرتے ہیں۔ میری زندگی کے بیشتر حصے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ہمارے بیپٹسٹ چرچ جنوبی بیپٹسٹ کنونشن کے رکن ہوں گے جس کا بنیادی مقصد امریکہ اور دنیا بھر میں ہمارے مشنری کام میں تعاون دینا تھا۔“ (ص ۳۲)

”ہمارا ایک اور پختہ عقیدہ چرچ اور ریاست کی مکمل علیحدگی ہے۔ یہ بہت اہم معاملہ تھا اور ہم نے ایسے عیسائی شہیدوں Martyrs کے بارے میں پڑھا تھا جنہوں نے اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن کسی غیر مذہبی رہنما (سیکولر لیڈر) کو مذہبی آزادی میں دخل اندازی نہیں کرنے دی، اگرچہ کچھ عیسائی افراد کو (بشمول میرے والد کے) عوامی معاملات میں حصہ لینے کی آزادی دی گئی تھی۔ تاہم جانبدارانہ سیاسی دنیا میں چرچ کے داخلے کا تصور ہمیں بہت برا لگتا تھا۔ ہم مذہبی

آزادی، عیسائی عقیدہ نہ رکھنے والوں کیلئے ہمدردی اور خداوند کے سامنے برابری کے حامل تمام انسانوں کے احترام پر ایمان رکھتے ہیں۔"(ص ۳۴)

"جب میں بائبل کلاسوں کو پڑھاتا ہوں تو اپنے عقیدے کے جوہر کی تشریح کی کوشش کرتا ہوں، میں اپنے سامعین کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ عیسائیت کو اپنی روزمرہ زندگی سے جوڑنے پر آمادہ ہوں۔ اگرچہ جدید عیسائی کمیونٹی میں اختلافی مباحث زوروں پر ہیں تاہم میں عموماً ایسے پیغامات چنتا ہوں جو ان اختلافی مباحث سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک اتوار میری کلاس کے شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں بیشتر مہمان تھے۔ میں نے ان سے ان کے مختلف فرقوں میں زیادہ زیرِ بحث موضوعات کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فوراً بتایا، اسکولوں میں لازمی عبادت، مذہبی تعلیم کیلئے سرکاری فنڈز کا استعمال، لیڈروں کی حیثیت سے عورتوں کی سروس (عبادت)، نظریۂ ارتقاء، احکام عشرہ کی عوامی نمائش، مقامی چرچوں کی خود مختاری، عقیدے کی جبری قبولیت، پاسٹروں کی برتری، چرچ اور ریاست کے درمیان سرحدوں کا ختم ہو جانا"۔(ص ۵۳)

"جہاں مذہبی کمیونٹی میں فرقہ واریت، غلبہ و تسلط اور غصہ و نفرت پائی جاتی ہے، وہاں سیکولر، اور حد تو یہ ہے کہ حکومتی گروپوں میں بھی یہی رجحانات موجود ہیں۔ سیکولر ادارے اور افراد بھی ذاتی تعصبات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب عورتوں کے خلاف کھلم کھلا اور عموماً امتیاز برتا جا رہا ہے جو کہ نہایت اشتعال انگیز عمل ہے۔ اس قسم کے مذہبی فیصلوں کی اساس غالباً سفید فام مردوں کی طرف سے کتاب مقدس کی منتخب عبارتیں ہیں، نیز یسوع مسیح اور اولین عیسائی چرچ کے لیڈروں کی تعلیمات اور اعمال کو فراموش کر دینا ہے۔"(ص ۵۴)

"گذشتہ بیس برسوں کے دوران عیسائی بنیاد پرستوں نے یسوع مسیح کے اس فرمان کو کھلم کھلا چیلنج اور رد کیا کہ "قیصر کا کام قیصر پر چھوڑو اور خداوند کے کام کو خداوند پر"۔ بیشتر امریکی اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ عوام سرکاری پالیسی پر اثر انداز ہوں، تاہم وہ اس امر کو درست نہیں سمجھتے کہ کوئی مذہبی گروہ کسی جمہوری حکومت کے کاموں پر کنٹرول پالے، یا سرکاری اہل کار مذہبی معاملات میں دخل انداز ہوں، یا کچھ خاص مذہبی اداروں کے حق میں قوانین یا ٹیکس محاصل کو استعمال کریں۔"(ص ۶۲)

"میں نے پوپ کی دوسرے عیسائیوں کے علاوہ یہودیوں اور مسلمانوں میں تبلیغ کی کوششوں کو سراہا، اور چرچ کو عالمی اہمیت دلوانے کی ان کی جدوجہد کی تحسین کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آزادانہ تبادلۂ خیال کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے عورتوں کو کمتر سمجھنے اور انہیں پادری نہ بنانے کے ان کے فیصلے سے اختلاف کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اولین عیسائی چرچ کیلئے ان کے کردار کی توہین ہے۔"(ص ۶۳)

"مجھ سے پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا کبھی میرے عیسائی عقائد اور صدر کی حیثیت سے میرے دنیاوی (سیکولر) فرائض کے درمیان تصادم پیدا ہوا تھا؟ کچھ معاملات میں ایسا ہوا تھا تاہم میں نے ہمیشہ اپنے اس حلف کا احترام کیا کہ میں "ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین کا تحفظ اور دفاع کروں گا"۔ مثال کے طور پر میرا ایمان ہے کہ یسوع مسیح اسقاط حمل یا سزائے موت کو کبھی قبول نہ کرتے، تاہم میں نے اپنی بہترین اہلیت کے مطابق سپریم کورٹ کے اس نوع کے فیصلوں کی

تعمیل کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے خیال کے مطابق ان کے منفی اثرات کو کم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔" (ص ۶۵)

"۲۰۰۰ء میں جنوبی بیپٹسٹ کنونشن کے لیڈروں نے اپنے اصولوں میں سے اس اصول کو نکال دیا کہ "ریاست مذہب کی کسی بھی صورت Form کی مدد کیلئے ٹیکس عائد کرنے کا حق نہیں رکھتی"۔ اس کے بعد انہوں نے پرائیویٹ اسکولوں کیلئے واؤچر بنائے اور پبلک اسکولوں میں عبادت کو لازمی قرار دینے کیلئے آئین میں ترمیم کا مطالبہ کیا اور چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو کھلم کھلا چیلنج کرنے لگے۔" (ص ۶۸)

"جولائی ۲۰۰۵ء میں سپریم کورٹ کی جسٹس سانڈرا ڈے اوکونر نے اپنی ریٹائرمنٹ کے اعلان کے فوری بعد کہا تھا "میں نے اپنی ساری زندگی میں کانگریس کے ارکان اور عدلیہ کے تعلقات کو اتنا داغدار کبھی نہیں دیکھا جتنا کہ اب ہیں۔۔۔ اور میں یہ دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہوں۔ موجودہ فضا ایسی ہے کہ میں وفاقی عدلیہ کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوں۔" (ص ۷۰)

"۲۰۰۶ء کے صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران صدارت کے دونوں امیدواروں نے ہم جنس پرستوں کی شادی کی مخالفت کی تھی۔ تاہم قانونی طور پر تسلیم شدہ یونینوں کے ذریعے مرد اور عورت ہم جنس پرست جوڑوں کو مساویانہ شہری حقوق دینے کی منظوری دی تھی۔" (ص ۷۴)

"ہم سب خاندانی اقدار اور شادی کی روایت کے استحکام کو انتہائی اہم تصور کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کالج پہنچنے سے پہلے تک میں کسی طلاق یافتہ شخص سے واقف نہیں تھا۔ تاہم اب طلاق خطرناک حد تک عام ہو چکی ہے۔ تمام امریکی بالغوں میں سے ۲۵ فیصد کو کم از کم ایک مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ طلاق کی تعداد میں کمی بیشی مذہبی وابستگی اور عمر کی مناسبت سے مختلف ہے۔ بڑے عیسائی گروپوں میں سے بیپٹسٹ سب سے اوپر ہیں ۲۹ فیصد، جبکہ کیتھولک اور لوتھرن طلاق یافتگان ۲۱ فیصد ہیں۔ ایشیائیوں کے استثناء کے ساتھ صرف ۹ فیصد، پروٹیسٹنٹوں کے سینئر پیسٹر سب سے کم طلاق یافتہ گروپ تھا ۱۵ فیصد۔ بے بی بومرز ۳۴ فیصد کو پہنچ چکے ہیں۔ ۵۳ سال سے ۲۷ سال کی عمر کے درمیان کی عمر والے افراد ۳۷ فیصد، جبکہ بوڑھے افراد میں صرف ۱۸ فیصد طلاق یافتہ ہیں۔ شادی کے تقدس کو لاحق اس خطرے کی وجوہ بہت سی ہیں لیکن بعض لوگ ہم جنس پرستی کو شادیوں کی ناکامی میں بہت زیادہ اضافے کا ایک اہم سبب تصور کرتے ہیں۔" (ص ۷۴)

"نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں انکشاف کیا گیا ہے کہ کینیڈا اور یورپ کے بچے بھی جنسی اعتبار سے امریکی بچوں ہی کی طرح فعال ہیں۔ تاہم مناسب سیکس ایجوکیشن سے محروم امریکی لڑکیاں فرانسیسی لڑکیوں کی نسبت پانچ گنا زیادہ تعداد میں ایک بچے کی ماں ہوتی ہیں، سات گنا زیادہ امریکی لڑکیاں ایک مرتبہ اسقاط حمل کروا چکی ہوتی ہیں۔ اور نیدرلینڈ کی لڑکیوں کے مقابلے میں ۷۷ گنا زیادہ امریکی لڑکیاں سوزاک کا شکار ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی کے ٹین ایجروں کے مقابلے میں ۵ گنا زیادہ امریکی ٹین ایجر "ایچ آئی وی ایڈز" کا شکار ہوتے ہیں۔ (ص ۸۰)

"اگرچہ امریکہ کی خارجہ پالیسی پر بہت سے دوسرے پیچیدہ سیاسی عناصر نے منفی اثر ڈالا ہے، تاہم بنیاد پرستوں نے جذباتی معاملات پر شعلہ بیانی کر کے اور مخالفوں سے مذاکرات سے گریز کر کے امریکی خارجہ پالیسی کی صورت بگاڑ دی

ہے۔ ایک اہم مثال یہ ہے کہ چند امریکی سیاسی لیڈروں نے فیڈل کاسترو کو ایک ولن کے طور پر قبول کر رکھا ہے اور انہوں نے کیوبا جیسے چھوٹے سے، عسکری اعتبار سے بانجھ ملک کو ہمارے ملک کی سلامتی اور ثقافت کو درپیش سب سے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔" (ص ۱۰۳)

"مذہب اور حکومت کا ایک انتہائی عجیب امتزاج، امریکہ کی مشرق وسطی میں پالیسی پر کچھ عیسائی بنیاد پرستوں کا بھرپور اثر ہے۔ امریکہ میں تقریباً ہر شخص بارہ کتابوں پر مشتمل Left Behind سیریز سے واقف ہے جس کے مصنف ٹم لاہے اور جیری بی جینکنس ہیں۔ ان کتابوں نے فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ انہوں نے یہ کتابیں بائبل کی احتیاط سے منتخب کردہ عبارتوں خصوصاً "بک آف ریویلیشن" سے لی گئی عبارتوں کی اساس پر لکھی ہیں اور ان میں دنیا کے ختم ہونے کی منظرکشی کی گئی ہے۔ جب مسیح واپس آئے گا تو سچے ایمان والوں کو آسمان پر اٹھا لیا جائے گا، جہاں وہ خداوند کے ساتھ نیچے رہ جانے والے بیشتر انسانوں کی اذیتوں کا نظارہ کریں گے۔ یہ واقعہ لمحاتی ہوگا اور اس کا وقت پہلے نہیں بتایا جا سکتا۔ میرے لاکھوں ساتھی بپٹسٹ اور دوسرے لوگ ایسے ہیں جو اس نظریے پر لفظاً یقین رکھتے ہیں اور خود کو چند منتخب لوگوں میں شامل سمجھتے ہیں، اور "دہشت و اذیت کے دور" میں نجات کیلئے منتخب نہ کیے جانے والے اپنے افراد خانہ، دوستوں اور ہمسایوں کو چھوڑنے اور ان کی مذمت پر تیار ہیں۔

امریکی حکومت کی پالیسیوں میں ایسے نظریات کا سمویا جانا تشویش کا سبب ہے۔ ان ایمان والوں کو یقین ہے کہ اس Rapture کی جلد آمد اُن کی شخصی ذمہ داری ہے تاکہ بائبل کی پیشگوئی پوری ہو۔ ان کے ایجنڈے میں مشرق وسطی میں اسلام کے خلاف جنگ کرنا اور یہودیوں کا ساری ارض مقدس کو چھین لینا شامل ہے۔ ساتھ ہی سارے عیسائیوں اور غیر یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد کافر (اینٹی کرائسٹ) اس علاقے کو فتح کر لیں گے اور مسیح فتح پائے گا۔ Rapture کے زمانے میں سارے یہودی یا تو عیسائیت قبول کر لیں گے یا انہیں جلا دیا جائے گا۔

انہی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے چند عیسائی لیڈر عراقی جنگ کو بڑھانے میں پیش پیش رہے ہیں اور بار بار اسرائیل کے دورے کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی مدد کیلئے اسے چندے بھی دیتے رہے ہیں اور فلسطینی علاقے کو نوآبادی بنانے کیلئے واشنگٹن میں لابنگ کرتے رہے ہیں۔ یہ دائیں بازو کا مذہبی دباؤ تھا کہ امریکہ نے اسرائیلی بستیاں اور مغربی کنارے کے فلسطینی علاقے میں ہائی ویز کو قبول کر لیا۔ چند اسرائیلی لیڈروں نے یہودیوں کی آخری مصیبت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس امداد کو قبول کر لیا۔" (ص ۱۱۲)

"گھر میں شہری حقوق کی اس فتح کے باوجود امریکہ نے مشرقِ وسطی اور دوسرے خطوں کی انتہائی ظالمانہ حکومتوں کو قبول کیے رکھا اور ان کی مدد بھی کرتا رہا۔ حالانکہ حکومتیں اپنے شہریوں کے انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہی تھیں۔" (ص ۱۱۵)

"گذشتہ چار سو برسوں میں ان حقوق کے تحفظ کیلئے ہمارے ملک کی پالیسیوں میں ڈرامائی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے بیشتر شہریوں نے دہشت گردانہ حملوں کے خوف سے ان عدیم النظیر پالیسیوں کو قبول کر لیا ہے۔ تاہم امریکی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ امریکہ، جسے پہلے انسانی حقوق کے ممتاز ترین چیمپئن کی حیثیت سے تقریباً آفاقی طور پر سراہا جاتا

تھا، اب جمہوری زندگی کے ان بنیادی اصولوں سے متعلق بین الاقوامی تنظیموں کی تنقید کا سب سے بڑا ہدف بن چکا ہے۔
نائن الیون کے حملے کے بعد امریکی حکومت نے غیر ضروری ردعمل ظاہر کرتے ہوئے پورے امریکہ میں ۱۲۰۰ سے زیادہ بے گناہ افراد کو گرفتار کروالیا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی پہلے کسی دہشت گردی سے مربوط جرم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ ان کی شناخت راز میں رکھی گئی اور انہیں اپنے خلاف الزامات سننے یا قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ گرفتار ہونے والے تقریباً سارے افراد عرب یا مسلمان تھے اور بیشتر کو امریکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ شہری آزادیوں کی ایسی پالیسیوں کو قانونی روپ دینے کیلئے "پیٹریاٹ ایکٹ" بہت جلدی میں منظور کیا گیا۔" (ص ۱۱۵)

"افغانستان اور عراق میں جنگوں کے دوران بالغ مردوں کے علاوہ بہت سے کم عمر لڑکوں کو گرفتار کر کے گوانتاناموبے (کیوبا) میں واقع ایک امریکی قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس قید خانے میں ۴۰ ملکوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۵۲۰ افراد کو قید میں رکھا گیا ہے۔ انہیں اس قید خانے میں تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے جبکہ نہ تو ان پر باقاعدہ کوئی الزام عائد کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ کئی امریکی اہلکاروں نے تصدیق کی ہے کہ ان قیدیوں پر جسمانی تشدد کیا جارہا ہے۔" (ص ۱۱۶)

"عراقی میجر جنرل عید حامد مہوش نے اپنے بیٹوں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں بغداد میں امریکی افسروں کو رضا کارانہ طور پر گرفتاری دی، اسے گرفتار کر کے اس پر تشدد کیا گیا اور اسے ایک سبز سلیپنگ بیگ میں بند کر دیا گیا جس میں دم گھٹنے سے وہ ۲۶ نومبر ۲۰۰۳ء کو مر گیا۔" (ص ۱۹۹)

"اتنی ہی پریشان کن وہ رپورٹیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ امریکی حکومت بعض دوسرے ملکوں کی حکومتوں کو دہشت گردی کو روکنے کیلئے جارحانہ پالیسیاں اپنانے پر اکسا رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں جمہوری اصول اور قانون کی حکمرانی خطرے میں پڑ گئے ہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی بڑھ گئی ہے۔ امریکی پشت پناہی سے جابرانہ اقدامات کرنے والی حکومتوں کی کاروائیاں پیٹریاٹ ایکٹ کے تحت ہونے والی کاروائیوں سے بھی بڑھ گئی ہیں۔" (ص ۱۲۰)

"جو کچھ ہو رہا ہے امریکی حکام کو اس کا علم تھا۔ محکمہ خارجہ شام میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے پہلے ہی بتا چکا ہے کہ سابقہ قیدیوں اور حراست میں رکھے جانے والے افراد نے بتایا کہ قیدیوں پر تشدد کے طریقوں میں شامل ہے: بجلی کے جھٹکے لگانا، ناخن کھینچنا، مارنا پیٹنا، چھت سے لٹکانا، ریڑھ کی ہڈی کو بہت زیادہ کھینچنا، کرسی پر بٹھا کر پیچھے جھکانا جس سے قیدی کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سرک جاتے ہیں۔" (ص ۱۲۴)

"اس وقت دنیا بھر میں تقریباً 30,000 (تیس ہزار) ایٹم بم موجود ہیں جن میں سے بارہ ہزار ایٹم بم امریکہ کے پاس ہیں۔ روس کے پاس سولہ ہزار، چین کے پاس چار سو، فرانس کے پاس ساڑھے تین سو، اسرائیل کے پاس دو سو، برطانیہ کے پاس ایک سو پچاسی، اور ہندوستان اور پاکستان کے پاس چالیس چالیس ایٹم بم ہیں۔ اس امر کا یقین کیا جاتا ہے کہ شمالی کوریا کے پاس اتنا نیوکلیئر ایندھن ہے جس سے نصف درجن ایٹم بم بنائے جاسکتے ہیں۔" (ص ۱۲۹)

"گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ایٹمی اسلحہ پر کنٹرول کیلئے جتنے معاہدوں پر مذاکرات کیے گئے ہیں امریکہ ان میں سے تقریباً تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، اور ایٹمی اسلحہ کے عالمگیر پھیلاؤ کا سب سے بڑا مجرم Prime

Culprit بن چکا ہے۔ سابق وزیر دفاع میکنامارا نے مئی، جون ۲۰۰۵ء کے فارن افیئرز میں اپنے خدشات کا یوں اظہار کیا تھا کہ میں امریکہ کی موجودہ ایٹمی اسلحہ پالیسی کو غیر اخلاقی، غیر قانونی، فوجی اعتبار سے غیر ضروری اور ہولناک حد تک خطرناک سمجھتا ہوں۔" (ص ۱۲۹)

"ایک اور تاریخی و بین الاقوامی عہد کو توڑ دیا گیا ہے۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ موجودہ ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائشیں نہ کی جائیں اور نئے ایٹمی ہتھیار نہ بنائے جائیں۔" (ص ۱۳۵)

"اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں کے کسی کنٹرول میں اور زیر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پڑوسی ملکوں ایران، شام، مصر اور دوسرے عرب ملکوں کے لیڈر ایٹمی ہتھیاروں کی مالک برادری میں شامل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔" (ص ۱۳۷)

"موجودہ امریکی پالیسی ان بین الاقوامی معاہدوں کے مؤثر ہونے کیلئے خطرہ بن رہی ہے جن کیلئے تقریباً تمام سابق صدور نے جانفشانی سے مذاکرات کیے تھے۔ عالمی استحکام کو درپیش اس سے بھی بڑا خطرہ پیش بندی کیلئے کی جانے والی جنگ کی پالیسی ہے جس کی پہلے کبھی مثال نہیں ملتی۔ یہ حالیہ فیصلہ نہ صرف امریکہ کی تاریخی پالیسیوں سے انحراف ہے بلکہ ان بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی بھی ہے جن کے احترام کا ہم وعدہ کر چکے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کا دستور خود مختار قوموں کو اپنے انفرادی اور اجتماعی دفاع کا حق دیتا ہے، لیکن صرف مسلح حملے کی صورت میں۔ ہمارے صدر نے ہمارے قریب تین اتحادیوں کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ جنگ کو "آخری چارۂ کار" کے طور پر رد کرتے ہوئے فوجی حملوں میں پہلے کرے گا۔" (ص ۱۴۰)

"دوسرے ملکوں کو "بدی کا محور" قرار دیتے ہوئے انہیں امکانی ہدف قرار دے دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی سفارتکاری کے ذریعے ان کے ساتھ اختلافات کو سلجھانے کے عمومی دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۱ء کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد ہمارے لیے ہر ملک نے جو تقریباً یک زبان ہو کر ہمدردی کا اظہار اور حمایت و امداد کا وعدہ کیا تھا، وہ ہماری اس پالیسی کے اپنانے سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم دہشت گردی کے خطرے کو محدود اور کم کرنے کی اپنی طویل اور اہم ترین کوشش میں نسبتاً اکیلے ہو گئے ہیں۔" (ص ۱۴۱)

"ایک عیسائی اور بین الاقوامی بحران سے حد درجہ متاثر سمجھے جانے والے صدر کی حیثیت سے میں ایک منصفانہ جنگ کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ اور یہ بات واضح ہے کہ عراق پر یکطرفہ حملہ ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔" (ص ۱۴۳)

"ہم اور ہمارے اتحادی برطانوی فیصلہ کر چکے ہیں کہ سویلین ہلاکتوں کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ حقیقی اور مطبوعہ اعداد و شمار میں بہت فرق ہے۔ برطانیہ کے ایک مؤقر جریدے لینسیٹ Lancet نے رپورٹ دی ہے کہ اتحادی فوجیوں (خصوصاً ایئر فورس) نے ایک لاکھ غیر فوجی عراقیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ امریکی سرکاری ذرائع نے صرف چوبیس ہزار کا تخمینہ لگایا ہے۔ یعنی صرف انہی ہلاکتوں تک محدود رکھا ہے جن کی خبریں مغربی ذرائع ابلاغ دے چکے ہیں، اصل تعداد ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔" (ص ۱۴۷)

”ہماری حکومت کا ایک سب سے زیادہ عجیب فیصلہ امریکیوں کے جانی نقصان سے عوام کو لاعلم رکھنا ہے۔ ہمارے لیڈر شاذ ہی زخمیوں کا ذکر کرتے یا ان کی عیادت کرنے جاتے ہیں۔ اور ڈوور ایئر فورس بیس ڈیلاویئر کے مضافاتی قبرستان میں پہنچائے جانے والے تابوتوں کے بارے میں عوام کو خبر نہ ملنے دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ہلاک ہونے والے فوجی جوانوں کی ماؤں اور بیویوں کی جانب سے مقدمات دائر کیے جا چکے ہیں جنہیں ڈوور یا دوسرے فوجی اڈوں پر اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھنے نہیں دی گئیں۔“ (ص ۱۴۶)

”جب امریکہ نے ۲۰۰۵ء کے شروع میں عراق میں جمہوریت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو شیعہ اور کردوں نے سنی منحرفین اور دہشت گرد گروپوں کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود جرأت اور آزادی کے ساتھ وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی تعداد میں ووٹ ڈالے۔ اگلے مراحل یعنی آئین کو تحریر کرنے اور پھر ایک نمائندہ حکومت تشکیل دینے کے حوالے سے میں اس وقت یہ کتاب لکھتے ہوئے تو کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتا، تاہم اس حوالے سے بہت زیادہ تشویش پائی جاتی ہے کہ سنی تعاون کریں گے یا نہیں، اور یہ کہ مذہبی قوانین کتنے غالب ہوں گے؟

حکمران شیعہ جماعتیں مطالبہ کر رہی ہیں کہ شادی، طلاق اور وراثت کے معاملات میں شریعت کو اعلیٰ اتھارٹی ہونا چاہیے۔ اگر عورتوں کے حقوق، جو کہ صدر صدام حسین کے دور میں محفوظ تھے، امریکہ کی سرپرستی اور حفاظت میں قائم ہونے والی نئی جمہوری حکومت کے دور میں ختم ہو جائیں گے تو یہ ستم ظریفی ہوگی۔“ (ص ۱۴۹)

”ایک بنیادی سوال جو آخری حاصل Final outcome کا تعین کرے گا، یہ ہے کہ کیا امریکی لیڈر عراق میں مستقل فوجی اڈوں کے قیام اور معیشت پر غلبہ پانے پر اصرار کریں گے، یا یہ واضح کریں گے کہ ہم نے اپنے فائدے کیلئے مستقل موجودگی کو برقرار رکھنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا؟ ہماری قوم ہمیں درپیش بین الاقوامی چیلنجوں کا بنیادی جواب دینے کے معاملے پر واضح طور پر تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ بات تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ امریکی سرزمین کبھی مکمل طور پر محفوظ نہیں ہوگی۔ امریکہ کو ایسی نسبتاً کمزور تنظیموں کی طرف سے دہشت گردی کا خطرہ رہے گا جو امریکہ کی بے پناہ فوجی قوت کے کسی بھی پہلو کو چیلنج کرنے کی امید نہیں کر سکتیں۔ ہمارا بہترین جواب کیا ہے؟ کیا انسانی حقوق کے تاریخی چیمپئن کا کردار ادا کرنا ہمارے لیے بہتر ہے، یا خطروں کا جواب دینے کیلئے اپنے اعلیٰ ملکی اور بین الاقوامی معیارات کو ترک کر دینا؟“ (ص ۱۵۱)

”اس وقت امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ ماحولیاتی آلودگی پھیلانے والا ملک ہے۔ ہماری حکومت کی طرف سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے انکار عالمی ماحول کے تحفظ کے دو جماعتی تاریخی وعدوں سے انحراف کے سلسلے کی محض ایک اور المناک کڑی ہے۔ خداوند کی دنیا کا تحفظ ہماری ایک ذاتی، سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔“ (ص ۱۶۷)

”یہ بات فخر کیے جانے کے قابل ہے کہ امریکہ میں اوسط خاندان کی سالانہ آمدنی پچپن ہزار ڈالر ہے، لیکن ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے آدھے سے زیادہ لوگ دو ڈالر روزانہ سے بھی کم پر زندہ ہیں، جبکہ ایک ارب بیس کروڑ لوگوں کو صرف ایک ڈالر روزانہ پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ صرف لمحہ بھر کیلئے تصور کریں کہ ہمیں ایک ڈالر روزانہ پر گزارا کرنا ہو تو کیا ہوگا؟ صرف ایک ڈالر کھانے کے لیے، رہائش کیلئے اور لباس کے لیے۔ واضح بات ہے کہ حفظان صحت اور تعلیم کیلئے

کچھ نہیں بچے گا اور ہماری عزت نفس اور روشن مستقبل کی امید کا باقی رکھنا تو مشکل ہو گا۔" (ص ۱۶۶)

"ہمارا پورا معاشرہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تقسیم کالے، گورے یا ہسپانوی کے درمیان ہو، بلکہ یہ تقسیم امیر اور غریب کے درمیان ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگوں کو تو کسی ایک غریب سے بھی واقفیت نہیں ہے۔" (ص ۱۷۰)

یہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی کتاب "امریکہ کا اخلاقی بحران" کے چند اقتباسات ہیں۔ جو نہ صرف گذشتہ ربع صدی کے دوران امریکی پالیسیوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں، بلکہ امریکی قوم کی اجتماعی نفسیات کا بھی اس سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور عالم اسلام اور مغرب کے درمیان اس وقت جو کشمکش جاری ہے اس کا ایک مجموعی منظر بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکی قوم نے چرچ اور ریاست کی علیحدگی اور آسمانی تعلیمات سے لاتعلق جمہوریت اور سیکولرازم کے فلسفے کے ساتھ جس قومی سفر کا اب سے کم و بیش اڑھائی سو برس قبل آغاز کیا تھا، اسے نہ صرف بریک لگ چکی ہے بلکہ "ریورس گیئر" کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ بات ہمارے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے والوں کیلئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خدا کرے کہ ہم تاریخ کے اس نئے موڑ کا بروقت اور صحیح ادراک کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

حدود آرڈیننس کا قضیہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۶ء

حدود شرعیہ کا نفاذ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور مسلم معاشرہ میں جرائم کا تعین اور روک تھام انہی حدود کے حوالے سے ہوتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے دینی حلقوں کا یہ مطالبہ چلا آرہا تھا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی قوانین و احکام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ معاشرتی جرائم کی روک تھام کیلئے ان شرعی حدود کا نفاذ بھی عمل میں لایا جائے جو قرآن و سنت میں بعض سنگین جرائم کیلئے متعیّن صورت میں بیان کی گئی ہیں، مگر اس کی نوبت اس وقت آئی جب ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں عوام کی بے پناہ قربانیوں کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی حکومت نے اس سمت میں پیشرفت کی اور پاکستان قومی اتحاد کی معاونت سے دیگر چند شرعی آئینی اقدامات کے علاوہ حدود آرڈیننس کے عنوان سے شرعی سزاؤں اور حدود کے نفاذ کا بھی اعلان کیا گیا۔

حدود آرڈیننس کے نفاذ کو ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، مگر ان پر عمل درآمد کی کوئی ایسی خوشگوار صورت حال اب تک سامنے نہیں آئی جسے حدود شرعیہ کے مؤثر نفاذ سے تعبیر کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی معاشرہ میں جرائم کی کمی اور ان پر کنٹرول کا مقصد حاصل ہو سکا ہے، حالانکہ یہی حدود شرعیہ سعودی عرب میں نافذ ہیں اور جرائم پر مؤثر کنٹرول کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں اور انہی حدود شرعیہ کے ذریعے سے افغانستان میں طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں اپنی حدود کار میں جرائم پر کنٹرول کا ایسا نقشہ پیش کیا تھا جس کا طالبان کے شدید ترین مخالف بھی اعتراف کرتے ہیں اور متعدّد بین

الاقوامی اداروں کی رپورٹوں میں اسے تسلیم کیا گیا ہے، لیکن پاکستان میں حدود شرعیہ کا قانونی نفاذ ان مقاصد و نتائج کا ذریعہ ابھی تک نہیں بن سکا جو مقاصد و اہداف اسی دور میں افغانستان اور سعودی عرب میں عملاً حاصل ہو چکے ہیں، جبکہ اس کے برعکس حدود آرڈیننس کے خلاف بین الاقوامی اور ملکی سطح پر پراپیگنڈا اور لابنگ کی مہم ایک عرصہ سے جاری ہے اور حکومت پاکستان پر مختلف اطراف سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ ان قوانین کو سرے سے ختم کر دیا جائے یا کم از کم ان میں ایسی ترامیم کر دی جائیں جن سے اس کی برائے نام بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

غلامی آج کے دور میں

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۶ء

اس طرح کے بیسیوں واقعات اور روایات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو کس طرح زندگی کی سہولتوں سے بہرہ ور کیا، ان کیلئے علم کے دروازے کھولے اور انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے، حتیٰ کہ خاندانِ غلاماں کے حکمرانوں کی ایک پوری تاریخ ہے اور علم و فضل اور حکمت و دانش کے ساتھ ساتھ دولت و اقتدار میں وافر حصہ لینے والے مسلم مشاہیر کی تاریخ مرتب کی جائے تو ایسے غلاموں کی ایک بڑی فہرست سامنے آئے گی جن کیلئے یہ غلامی ہی ان سعادتوں کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی یہ بات بہ طور حکم کے نہیں بلکہ مختلف آپشنوں میں سے ایک آپشن کے طور پر تھی اور میری طالب علمانہ رائے کے مطابق اسے برقرار رکھنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں باقاعدہ قید خانے اس انداز سے نہیں ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں افراد کو منظم طور پر سالہا سال تک قید میں رکھا جا سکتا، اس لیے جن قیدیوں کو قید میں رکھنا ضروری ہوتا تھا، ان کیلئے عملی صورت یہی ممکن تھی کہ انہیں تقسیم کر دیا جائے اور وہ ریاست کے قیدی بننے کے بجائے افراد اور خاندانوں کے قیدی رہیں۔

جن لوگوں نے زندگی بھر قید میں رہنا ہے، خود ان کیلئے بھی بہتر صورت یہ تھی کہ انہیں قید خانوں میں ڈالنے کے بجائے افراد اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ قیدی ہونے کے باوجود زندگی کی مناسب سہولتوں اور حقوق سے کسی حد تک بہرہ ور ہو سکیں۔ اس کی عملی شکل آج کے دور میں دیکھنی ہو تو جیل خانوں میں بند قیدیوں اور اچھا کردار رکھنے والے قیدیوں کو پیرول پر مختلف خاندانوں میں نیم قیدیوں کی صورت میں تقسیم کیے جانے والے قیدیوں کا موازنہ کر لیا جائے، یہ بات واضح ہو جائے گی کہ خود ان قیدیوں کیلئے بہتر صورت کون سی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ اعتراض قیدی خواتین کے ساتھ جنسی تعلق کو روا قرار دیے جانے پر کیا جاتا ہے، لیکن اس حوالے سے دیکھا جائے کہ ایک ایسی خاتون جس کی واپسی کے اس دور میں تمام راستے مسدود تھے اور اس نے عمر بھر

قیدی ہی رہنا تھا، اس کیلئے ایک عورت کے طور پر کیا صورت مناسب اور بہتر تھی۔ اسلام نے اس زمانے کے عالمی عرف کے مطابق اس کو ایک آپشن کے طور پر قبول کیا، لیکن اس کے ساتھ حقوق و مفادات کا ایک ایسا نظام بھی قانونی طور پر قائم کر دیا کہ اس جنسی تعلق اور اولاد کی صورت میں وہ عورت آزادی اور دیگر حقوق کی مستحق بھی قرار پاتی ہے۔

چنانچہ میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ اسلام نے غلام اور لونڈی بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس دور کے عالمی عرف کے مطابق اسے جنگی قیدیوں کیلئے ایک آپشن کے طور پر برقرار رکھتے ہوئے اس کی اصلاح اور بہتری کیلئے احکام و قوانین کا ایک پورا نظام فراہم کر دیا جیسا کہ آج کے عالمی عرف کے مطابق جنگی قیدیوں کے بارے میں جنیوا کنونشن کو عالم اسلام نے بھی قبول کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان و فلسطین سمیت جن مقامات پر جہاد کے عنوان سے جنگیں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں، وہاں مجاہدین نے کسی قیدی کو غلام یا لونڈی کا درجہ نہیں دیا اور انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیے جانے والے مجاہدین نے بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں عالمی عرف اور قوانین کا عملاً احترام کیا ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کسی دور میں یہ عالمی عرف بھی تبدیل ہو گیا اور پہلے کی طرح کے حالات دوبارہ پیدا ہو گئے تو اسلام کا یہ آپشن بطور آپشن کے باقی رہے گا اور اس سلسلے میں قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے احکام دوبارہ نافذ العمل ہو جائیں گے۔

اس لیے محترم آصف محمود ایڈووکیٹ اور دیگر دوستوں سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ اسلام کے کسی حکم یا قانون کے بارے میں مغربی پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر استہزا اور طنز کا لہجہ اختیار کرنے کے بجائے اس کے پس منظر سے واقفیت حاصل کریں اور اسلامی احکام کو مغربی فلسفہ و ثقافت اور مغربی معاشرہ کے معروضی تناظر پر پرکھنے کے بجائے ان کے حقیقی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ویسٹرن سوسائٹی کو تہذیب و ثقافت اور سولائزیشن کا حتمی معیار تصور نہ کیا جائے اور اسلامی قوانین و احکام کو انسانی سوسائٹی کے حقیقی مسائل اور ضروریات کے حوالے سے دیکھا جائے تو قرآن و سنت کا کوئی بھی حکم ناقابل فہم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا صحیح شعور عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

حدود آرڈیننس: ایک اعتراض کا ازالہ

۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے عمر بن الخطابؓ ہال میں جمعیت طلباء اسلام کے زیر اہتمام ایک نشست سے خطاب کا کچھ حصہ

ایک اعتراض یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ اس سے جرائم کنٹرول ہوں گے اور معاشرہ میں امن قائم ہو گا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا بلکہ حدود کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور قانون شکنی کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ اس معروضی حقیقت سے انکار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کسی باشعور شخص کو معروضی حقائق سے انکار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہمارے معاشرے میں جرائم کنٹرول نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے اسباب کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔

اس لیے کہ آج کے دور میں ہمارے سامنے یہی قوانین سعودی عرب جرائم میں کنٹرول کرنے کا ذریعہ بنے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ جو حضرات اب سے پون صدی قبل کے سعودی معاشرہ کی صورتحال سے آگاہ ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سعودی عرب کے قیام سے قبل حجاز مقدس میں چوری، قتل، ڈاکہ اور دوسرے جرائم اس قدر عام تھے کہ حج بیت اللہ کیلئے جانے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے بلکہ اس کا نشانہ زیادہ تر وہی بنتے تھے، لیکن شاہ عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے سعودی عرب کے قیام کے بعد اس کا اقتدار سنبھالتے ہی شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور ان پر مؤثر عملدرآمد کا اہتمام کیا تو وہاں جرائم پر نہ صرف یہ کہ کنٹرول حاصل ہوا بلکہ جرائم کی شرح کے حوالے سے سعودی عرب کو آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی آج کے دور کی ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ ہمارے پڑوسی افغانستان میں جب طالبان نے زمام اقتدار سنبھالی اور شرعی قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا تو ان کے پانچ سالہ دور میں ان کے دائرہ اختیار میں جرائم کنٹرول ہوئے جسے بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا گیا، حتیٰ کہ ”لارڈز وار“ کے خاتمہ اور پوست کی کاشت پر پابندی کے حوالے سے طالبان حکومت کی کامیابی کا عالمی اداروں کی باقاعدہ رپورٹوں میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ قوانین اگر سعودی عرب میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور افغانستان میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو پاکستان میں ان کے غیر مؤثر ہونے کی وجہ کہیں اور تلاش کرنی پڑے گی، اس لیے کہ ایک بیج اگر ایک زمین میں پھل دیتا ہے، دوسری زمین میں بھی پھل دیتا ہے لیکن تیسری زمین میں پھل نہیں دیتا تو قصور بیج کا نہیں گنا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یا تو زمین درست نہیں ہے یا اس میں بیج ڈال کر پانی، کھاد اور گوڈی کا اہتمام کرنے والوں کے عمل میں کوتاہی ہے۔

ہمارے خیال میں فرق کا اصل نکتہ یہ ہے کہ سعودی عرب نے حدود شرعیہ نافذ کر کے ان پر عملدرآمد کیلئے قضا کا شرعی نظام فراہم کیا، اس لیے یہ قوانین کامیاب ہوئے۔ طالبان نے بھی افغانستان میں صرف حدود شرعیہ کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قوانین پر مؤثر عملدرآمد کیلئے قضائے شرعی کا عدالتی نظام بھی قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ان قوانین کے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہم نے یہ کیا کہ قوانین تو شریعت اسلامیہ کے نافذ کیے، مگر عدالتی سسٹم وہی پرانا برطانوی نوآبادیاتی دور کا باقی رکھا اور حدود قوانین کو اس سسٹم کے حوالہ کر دیا، جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہنڈا کار کے انجن میں سوزوکی کا گیئر بکس فٹ کر دیا جائے یا چاول چھڑنے والی مشین سے گندم پیسنے کا کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں اگر حدود قوانین مؤثر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے جسے تبدیل کیے بغیر کسی بھی اسلامی قانون کے مؤثر نفاذ کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- جنوری ۲۰۰۷ء

اس کے بعد صدر محترم کے خطاب کے حوالے سے پہلے مرحلہ میں ان کے ان دس سوالات پر ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے خطاب کے دوران "انتہا پسندوں" سے کیے ہیں اور ایک قومی روزنامہ نے انہیں "صدر پرویز کے انتہا پسندوں سے دس سوالات" کے عنوان سے ترتیب وار شائع کیا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ "ہزاروں پاکستانیوں کو گمراہ کر کے افغانستان میں مروانے کا ذمہ دار کون ہے؟"

ہمیں صدر محترم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر ہزاروں پاکستانی جاں بحق ہوئے ہیں البتہ اس عمل کا دورانیہ ہمارے نزدیک گذشتہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ پاکستانیوں کو صدر پرویز مشرف کے بقول "گمراہ کر کے" افغانستان لے جانے اور وہاں مروا دینے کا عمل گذشتہ پندرہ سال سے جاری ہے۔ یہ عمل اس وقت شروع ہوا تھا جب افغانستان میں سوویت یونین نے فوجیں اتاری تھیں اور افغان علماء اور عوام نے روسی افواج کی آمد کو اپنے ملک کی آزادی اور قومی خود مختاری کے خلاف حملہ تصور کرتے ہوئے مزاحمت شروع کی تھی اور جہاد کا فتویٰ دے کر گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا، اس وقت پاکستان کے دینی حلقوں نے اس جدوجہد میں افغان عوام کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ہزاروں پاکستانی وہاں جا کر اس عسکری مزاحمت میں شریک ہوتے تھے جن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نے جام شہادت بھی نوش کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کی حکومت، فوج اور امریکہ سمیت تمام مغربی ممالک پاکستانیوں کے افغانستان جا کر روس کے خلاف لڑنے کو "گمراہ کر کے افغانستان میں مروانے" کا عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے "جہاد" کہا جاتا تھا۔ امریکہ اسے سپورٹ کرتا تھا، دنیا بھر کی مسلمان حکومتیں اس کی حمایت کرتی تھیں، پاک فوج اور آئی ایس آئی اس جہاد کی پشت پر تھیں اور روسی فوجوں کے خلاف افغان عوام کی اس عسکری جدوجہد میں "دہشت گردی" کے جراثیم کا کوئی سراغ نہیں پایا جاتا تھا۔

اس لیے جو لوگ پاکستانیوں کو افغانستان لے جا کر روس کے خلاف مرواتے تھے وہ امریکہ کے خلاف جنگ میں پاکستانیوں کو وہاں لے جانے کو بھی جہاد سمجھتے رہے، انہیں استعماری مقاصد کے حوالے سے روس اور امریکہ میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا اور وہ اپنی اسی پالیسی کے تسلسل پر قائم رہے۔ وہ دراصل یہ فرق نہیں سمجھ پائے کہ روس کے خلاف لڑنا "جہاد" اور اس میں مرنا "شہادت" ہے جبکہ امریکہ کے خلاف لڑنا "دہشت گردی" اور اس میں جان دینا "مروا دینا" ہوتا ہے۔ اس لیے صدر کو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے ان عوامل کو تلاش کرنا چاہیے جو پاکستان کے دینی حلقوں کا صدر پرویز مشرف کے بقول انتہا پسندوں کیلئے اس جہاد اور دہشت گردی کے درمیان فرق کا صحیح ادراک کرنے میں رکاوٹ بنے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کا دوسرا سوال ہے کہ "کیا پاکستان کو نظریاتی اسٹیٹ بنانا چاہیے؟"

صدر محترم سے گزارش ہے کہ "بنانا چاہیے" کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کا مطلب ہم یہ سمجھے ہیں کہ شاید صدر پرویز مشرف پاکستان کے بارے میں از سر نو فیصلہ کرنے جا رہے ہیں کہ اسے نظریاتی ریاست ہونا چاہیے یا سیکولر اسٹیٹ بنا دینا چاہیے؟ حالانکہ یہ فیصلہ پاکستان بننے سے پہلے ہو چکا تھا اور فیصلہ کرنے والے خود قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جنہوں نے اس خطہ کے کروڑوں مسلمانوں کی حمایت سے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا اور اس کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ پھر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے "قرارداد مقاصد" کی صورت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت کا واضح طور پر تعین کر دیا تھا، اس کے بعد اس مسئلہ کو "ری اوپن" کرنا پاکستان کے قیام کے نظریاتی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کرنا ہے اور قیامِ پاکستان کو جائز، اصولی اور منطقی سمجھنے والے کسی شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جنرل پرویز مشرف نے تیسرا سوال یہ کیا ہے کہ "کیا مذہبی تعلیم حکومت چلانے کیلئے کافی ہے؟"

جناب صدر کی خدمت میں عرض ہے کہ اس بات کا آج تک کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عقل و دانش سے بہرور شخص ایسا کر سکتا ہے، اس سلسلہ میں صدر صاحب نے دینی مدارس سے جو شکایات کی ہیں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں اور بے محل ہیں کیونکہ دینی مدارس تو صرف مساجد و مدارس کیلئے امام، قاری اور استاذ مہیا کرنے کی ذمہ داری نبھاہ رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ اس شعبہ میں رجال کار فراہم کرنے کا کام صحیح طریقہ سے جاری رکھ سکیں۔ مگر صدر صاحب کا اصرار ہے کہ ایک مسجد میں امام بننے کیلئے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ امام مسجد کو سائنس دان اور انجینئر بھی ہونا چاہیے اور کسی مدرسہ میں قرآن پاک پڑھانے والے کو قاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی بننا چاہیے۔ ورنہ اگر اسی سوال کو اصل تناظر میں دیکھا جائے تو وہ اس طرح بنتا ہے کہ جو کچھ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جا رہا ہے کیا یہ تعلیم ایک اسلامی فلاحی ریاست کا نظام چلانے کیلئے کافی ہے؟

صدر محترم کا چوتھا سوال ہے کہ "کیا آپ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں؟"

جناب صدر! ہم بلاشبہ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کیلئے پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور مغربی حکومتوں کی پالیسیوں کی تابعداری کر کے کبھی ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ نہیں بن سکتا، اس کیلئے خلفاء راشدینؓ کے طرز حکومت اور نظام حکومت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور صدر پرویز مشرف اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں جس روز انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت اور ریاستی ڈھانچے کو پاکستان میں عملی طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا امریکی بمبار طیاروں کا رخ ان کی طرف بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح اسی "جرم" میں ملا محمد عمر کو امریکی بمباری کا نشانہ بننا پڑا ہے۔

صدر محترم کا پانچواں اور چھٹا سوال یہ ہے کہ "کیا مذہبی انتہا پسندوں نے افغانستان کی بھلائی کا سوچا ہے؟ کیا پیسے جمع کر کے افغانستان کی تعمیر نو کا سوچا ہے؟"

میرے خیال میں صدر محترم کو حقائق سے اس حد تک چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے ورنہ دیگر سینکڑوں اداروں اور ہزاروں اصحاب خیر کے علاوہ "امہ تعمیر نو" اور "الرشید ٹرسٹ" نے افغانستان کے مفلوک الحال عوام کی امداد اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے جو مسلسل خدمات سرانجام دی ہیں ان سے صدر پرویز یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے، لیکن چونکہ

امریکہ بہادر نے ان رفاہی اور تعمیری اداروں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا ہے اس لیے ہمارے صدر محترم کو ان کی خدمات ہی سرے سے دکھائی نہیں دے رہیں۔

صدر محترم کا ساتواں سوال ہے کہ ”کیا اسلام توڑ پھوڑ، نفرتیں پھیلانے کا کام سکھاتا ہے؟“

یقیناً اسلام توڑ پھوڑ اور نفرتوں کا سبق نہیں دیتا اور اگر کہیں اسلام کے حوالے سے ایسا ہو رہا ہے تو وہ بلا شبہ غلط ہے، لیکن پاکستان میں قومیتوں اور زبانوں کے عنوان سے جو نفرتیں موجود ہیں اور ان کیلئے جو قتل وقتال سالہا سال سے جاری ہے انہیں صدر پرویز مشرف کس کھاتے میں ڈالیں گے اور ان کے بارے میں کچھ کہنا انہوں نے کیوں ضروری نہیں سمجھا؟

صدر محترم کا آٹھواں اور نواں سوال یہ ہے کہ ”کیا ہم حضورؐ کی مثال بھول گئے ہیں انہوں نے اپنی مثال سے اسلام پھیلایا تھا اور کیا بزرگانِ دین نے جبر سے اسلام پھیلایا تھا؟“

بالکل درست ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین نے دین پھیلانے اور اسلام کی دعوت دینے میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے، بلکہ اخلاقی برتری اور اصلاحی عمل کے ذریعے اسلام کی دعوت کو عام کیا ہے، لیکن اگر کسی مقام پر کفر وظلم کے کسی گروہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں جناب نبی اکرمؐ صرف اخلاق کے ساتھ کافروں کے سامنے نہیں آئے بلکہ تلوار ہاتھ میں لے کر ان کا مقابلہ کیا ہے اور کافر دشمن کے ساتھ رسول اللہؐ اور بزرگان دین نے کبھی نرمی کا معاملہ نہیں فرمایا۔

صدر محترم کا آخری اور دسواں سوال یہ ہے کہ ”کیا جہالت، پسماندگی اور بھوک کے خلاف جہاد کا سوچا ہے؟“

صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر لاکھوں نادار بچوں کو خوراک اور ہاسٹل کی بلا معاوضہ سہولتیں فراہم کر رہے رہیں اور انہیں مفت تعلیم بھی دے رہے ہیں، اور خود صدر کے بقول یہ کام کوئی بڑی سے بڑی این جی اوز بھی نہیں کر سکتی، تو محدود ترین وسائل رکھنے والے دینی مدارس سے وہ بھوک اور جہالت کے خلاف اس کے علاوہ اور کون سے جہاد کی توقع کر رہے ہیں؟

مذہبی انتہا پسندی کے اسباب اور اس کا علاج

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۰ جنوری ۲۰۰۷ء

ابراہیم کمیونٹی کالج لندن نے میری پاکستان واپسی سے ایک روز قبل لندن کے علماء کرام اور طلبہ کیلئے ”حقوق نسواں اور اسلامی تعلیمات“ کے عنوان پر ایک فکری نشست کا منگل کی شب اہتمام کر رکھا ہے، جبکہ صفدر مرزا صاحب نے ٹونگھم پولیس کے سٹی چیف مارکس بیل کے ساتھ میری تفصیلی ملاقات کا پروگرام بنا لیا۔ موصوف میری قیام گاہ جامعۃ الہدیٰ ٹونگھم میں تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ہمارے درمیان کم و بیش اڑھائی گھنٹے تک گفتگو ہوئی جس میں صفدر مرزا اور جامعۃ الہدیٰ ٹونگھم کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی بھی شریک تھے۔ ساری گفتگو کا احاطہ تو اس کالم میں ممکن

نہیں ہے، البتہ دو تین زیادہ اہم امور کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

برطانیہ کی انتظامیہ کا مسلمانوں کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہاں کے مسلم نوجوانوں کے جذبات اور مبینہ طور پر ان کی انتہا پسندی کو کنٹرول میں رکھنا ہے، تاکہ انتظامی مسائل پیدا نہ ہوں اور اس سلسلے میں مشکلات کم ہوں۔ آج جبکہ میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، میرے سامنے لندن میں شائع ہونے والا ایک اردو اخبار پڑا ہے جس کی اہم خبر یہ ہے کہ برطانوی حکومت لوکل اتھارٹیز کو پانچ ملین پونڈ اس مقصد کیلئے دے رہی ہے کہ وہ نوجوان مسلمانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے روکیں۔ یہ رقم انتہا پسند مسلمان گروپوں کی نشاندہی کر کے ان پر خرچ کی جائے گی، جبکہ لوکل گورنمنٹ کے عملے سے کہا جائے گا کہ وہ دہشت گردی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے پولیس کو معلومات فراہم کریں۔ خبر کے مطابق کمیونٹیز معاملات کے وزیر روتھ کیلی نے کہا ہے کہ لوکل اتھارٹیز کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے سامنے آنا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ لوکل کمیونٹیز کا دلوں اور دماغوں کی جنگ جیتنے میں اہم کردار ہے اور فنڈ سے ان کی مقامی سطح کی مہارت کو فروغ ملے گا۔

ٹونگھم سٹی پولیس کے چیف کی گفتگو کا سب سے اہم نکتہ بھی یہی تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے کیسے روکا جا سکتا ہے اور ہم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جس چیز کو انتہا پسندی قرار دیا جا رہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اشتعال کا سبب بنتی ہے اور اس سے معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، ہمیں اس کے اسباب کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ مبینہ انتہا پسندی دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہے:

1. ایک یہ کہ دنیا میں کسی جگہ بھی مغربی ممالک کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس کا ردعمل ایک فطری عمل ہے جسے سبب دور کیے بغیر روکنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس وقت حالیہ تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانبدار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔
2. دوسری وجہ آج کا میڈیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی خبر آناً فاناً پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے، اور صرف خبر ہی نہیں، بلکہ اس پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے تبصرے اور تجزیے بھی خبر کے ساتھ ہی ذہنوں میں منتقل ہو جاتے ہیں جس سے ردعمل میں بھی "فوری پن" آ جاتا ہے اور اس کے اظہار میں رکاوٹ پیدا کرنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔

اس پس منظر میں آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے۔ البتہ اس ردعمل کے اظہار کو مناسب حدوں کا پابند ضروری کیا جا سکتا

ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاسداری کریں اور اپنی حکومت اور مسلمان بھائیوں کیلئے مشکلات پیدا نہ کریں۔ ٹونگھم کے پولیس چیف سے میں نے کہا کہ یہودی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ فلسطین میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے کسی معاملے کو ناانصافی اور زیادتی تصور کرتے ہیں تو اس پر امریکہ اور برطانیہ سمیت مختلف ملکوں میں اپنے جذبات اور ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، البتہ ان ممالک کے قانون اور حالات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے مسلمان نوجوانوں سے یہی بات کہتے ہیں اور اسی کو درست سمجھتے ہیں۔

پولیس چیف نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمان نوجوانوں میں جذباتی ردعمل کی سب سے بڑی وجہ مغربی ممالک کی ''فارن پالیسی'' کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس کا ایک بڑا سبب میڈیا بھی ہے، اس لیے کہ میڈیا کو کمیونٹی یا حکومت کی مشکلات سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی ترجیحات میں سب سے پہلا نمبر خبریت اور تجسس کو حاصل ہے، لیکن یہ دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو امن وامان قائم رکھنا اور سوسائٹی میں کسی قسم کی کشیدگی کو جنم لینے سے روکنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم کمیونٹی کے رہنماؤں اور مذہبی اداروں سے اس سلسلے میں تعاون چاہیں گے تو آپ کو مطلوبہ تعاون ضرور ملے گا اور ہم بھی آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

مارکس بیل کا دوسرا اہم سوال منشیات کے بارے میں تھا کہ معاشرے میں ہیروئن اور دیگر منشیات کو کنٹرول کرنے کیلئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ میں نے گزارش کی کہ ہمارے ہاں منشیات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کہ ہم شراب کو بھی اسی ممنوعہ نشے کا ذریعہ شمار کرتے ہیں جس کو روکنے کیلئے آپ لوگ ہیروئن وغیرہ کی روک تھام کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں ہر نشہ آور چیز، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو، حرام ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ مسئلہ زیادہ اہم ہے اور ہم اس کیلئے مذہبی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ عقیدے کی قوت اور خوف خدا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کسی کو قانون کا پوری طرح پابند نہیں بنایا جاسکتا۔

پولیس چیف نے بتایا کہ انہوں نے اس بات کا تجربہ کیا ہے، مذہبی رہنماؤں اور چرچوں کے تعاون سے نوجوانوں میں قانون شکنی اور نشہ آور اشیا کے استعمال کے خلاف مہم چلائی ہے جس کے بہت مفید نتائج سامنے آئے ہیں۔ میں نے مارکس بیل کو بتایا کہ چند سال قبل آپ ہی کے شہر ٹونگھم میں مولانا رضاء الحق سیاکھوی، مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور ایک آئرش نومسلم بزرگ حاجی عبدالرحمن کے ہمراہ میں نے اس شہر کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کی تھی اور ان سے اس مسئلے پر بات کی تھی کہ سوسائٹی میں منشیات کے استعمال، بدکاری، ہم جنس پرستی اور بے حیائی کے خلاف ہم مشترکہ طور پر ان کے ساتھ مل کر محنت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ان مسائل کا حل آسمانی کتابوں اور

مذہبی اخلاقیات کی طرف واپسی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ سوسائٹی میں بے حیائی، بدکاری، ہم جنس پرستی اور منشیات وغیرہ کی روک تھام کیلئے آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی ضروری ہے اور ہم اس سلسلے میں مسیحیت کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہیں۔

ٹونگھم کے پولیس چیف نے اس سے اتفاق کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مسیحی مذہبی راہنماؤں اور مسلمان مذہبی رہنماؤں کے درمیان اس مقصد کیلئے رابطے کا اہتمام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے مفید تصور کرتے ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ برطانیہ میں آئندہ حاضری کے دوران، میں بھی ان کوششوں میں شریک ہوں گا اور اس میں دلی خوشی محسوس کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے بھی اس ملاقات میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کی گلوبل دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم ٹونگھم کے مسائل کو صرف یہاں کے حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے حل کر سکیں اور عالمی حالات کو نظر انداز کر دیں، کیونکہ عالمی حالات کا اثر براہ راست مقامی حالات پر پڑتا ہے اور لوکل مسائل کو عالمی تناظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کیلئے مذہبی رہنماؤں، کمیونٹی لیڈرز اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ عوامی نمائندوں اور سیاسی قیادت کو بھی شریک کرنا ضروری ہے تاکہ سب مل جل کر جذبات اور ردعمل کو قابو میں رکھنے اور انہیں درست رخ پر رکھنے کیلئے کردار ادا کر سکیں۔

انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں اظہار رائے پر پابندی لگانے اور جذبات کو دبانے کی پالیسی درست نہیں ہوگی، جیسا کہ سننے میں آ رہا ہے کہ برطانوی حکومت اس قسم کی پابندیوں کے بارے میں سوچ رہی ہے، کیونکہ کسی مسئلے پر فطری طور پر پیدا ہونے والے جذبات اور ردعمل کو اگر بزور روکا جائے گا تو وہ غلط راستہ اختیار کریں گے اور اس سے مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے افہام و تفہیم کے ساتھ ہی ان مسائل کے حل کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

جامعہ حفصہ اور لال مسجد کا سانحہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۷ء

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خونریزی کا وہ المناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصویر بنا دیا ہے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت برے طریقے سے ہوا۔ اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسکین حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دبدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔ چند افراد ضرور ایسے ہوں گے لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسردہ ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں

کے لاشے تڑپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دینی درسگاہ میں ہوا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قحبہ خانہ اور پھر مساج پارلر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں، ان کیلئے اس طرز کی جدوجہد کو سندِ جواز فراہم نہیں کی جاسکتی۔ اس پر ملک بھر کے جمہور علمائے کرام کا کم وبیش اجماع منعقد ہو گیا تھا، مگر اس کی پروا کیے بغیر معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب و عوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے ردعمل میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کا راستہ نکالے۔ لیکن حکومت نے بھی اس کیلئے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترامیم پر نظر ثانی اور فحاشی کے مبینہ مراکز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جا سکتا تھا۔ اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کیلئے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلح تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے، لیکن مولانا عبدالعزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی و منکرات کے سدباب کیلئے صحیح طریق کار پر مبنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سرد مہری کارفرما ہے، وہاں اسلامی نظام کیلئے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل نے وہ خوفناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کیلئے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانون فطرت ہے کہ خلا جس قدر گہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ لپکتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہاد افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد

نے پاکستان سے جاکر افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انہیں ملک و قوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کیلئے مثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انہیں اپنانے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انہیں اپنا حریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کیلئے جو نیا ماحول کھڑا کیا گیا وہ ان کی کردار کشی، توہین، طنز و استہزاء، اور تحقیر و حوصلہ شکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضا میں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو قوت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا، اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات و اقدار کو پامال کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئے، اور وہی غصہ و نفرت مجتمع ہو کر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید کے تصادم اور محاذ آرائی کے طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی و علمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت و ہدایات کو قبول نہ کیا۔ لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر و اقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذباتی رد عمل یہی ہو سکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذ اسلام کیلئے کسی مؤثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنہوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنا دیا اور بات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لال مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورتحال کی سنگینی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۴ جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈکیتی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لال مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد منظم کرنے کیلئے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کیلئے بینک ڈکیتی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے اور اس قسم کے المیے مایوسیوں سے جنم لیا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگہ سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسکین کیلئے متبادل ذرائع اختیار کرتے ہیں، اور یہ متبادل ذرائع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عملداری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سرد مہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرز عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں

اور حکومتی طرز عمل کا رخ تبدیل کرانے کیلئے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقتی مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کیلئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے اور اسلام کی بالادستی اور فحاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے، اور یا پھر اس کیلئے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کیلئے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبہ سے بہرہ ور ہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گذشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے۔ اور اگر حکومت اور دینی جماعتوں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مخلص اور پر جوش نوجوانوں کے جذبات کو مثبت رخ دینے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو لال مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہوگی بلکہ خدانخواستہ ابتدا ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہداء کیلئے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فورسز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنہوں نے اپنی جانیں پیش کیں، وہ ڈیوٹی پر تھے اور فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہداء کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں، اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک و قوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں، آمین۔

آج کے فریڈم فائٹرز، دہشت گرد کیوں؟

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۶ ستمبر ۲۰۰۷ء

مجیب بھائی نے ہمیں بتایا کہ بوسٹن سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک پرانے گاؤں کو پرانے طرزِ زندگی کی نشانی کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہے جو دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ میرے ساتھ مفتی اکرام الحق جوہری اور حافظ شہباز احمد بھی تھے۔ ''سٹور برج'' نام کے اس پرانے گاؤں کو اصلی حالت میں محفوظ رکھ کر اسے میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ بیس ڈالر فی کس داخلہ فیس ہے۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں گزارا۔ گھوڑوں کا اصطبل، لوہار کی دکان، کھیتی باڑی کے پرانے آلات، مرغیوں کا ڈربہ، پرانی گھوڑا گاڑی، دستی نلکا، ایک زمیندار کا مکان، اور چند دوسرے مناظر دیکھے۔ چند عورتیں پرانے لباس میں کام کاج میں مصروف تھیں، پورا جسم لباس میں ڈھکا ہوا اور سر پر بھی بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ایک جگہ چند عورتیں سوت رنگ رہی تھیں۔ ایک صاحب لوہے کے چھوٹے ڈبے بنا رہے تھے۔ غرضیکہ صرف پرانی اشیا کو ہی محفوظ

نہیں کیا گیا بلکہ پرانے لباس اور انداز کے ساتھ کام کرنے کا ماحول بھی بنایا ہوا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ ماحول ایک صدی قبل کا تھا، اس دور کا ایک پرنٹنگ پریس بھی اپنی بلڈنگ اور متعلقہ سامان کے ساتھ موجود ہے، اور سڑکیں اور راستے بھی اسی کیفیت میں ہیں۔

روڈ آئی لینڈ اور میساچیوسٹس کی ان ریاستوں میں دو دن کا قیام خاصا مفید رہا اور بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ مگر میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بوسٹن کو برطانوی استعمار کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ چائے کے کاروبار کا مرکز تھا، اس بندرگاہ پر چائے آتی تھی اور چائے کے کاروبار پر ٹیکس لگائے جانے پر احتجاج شروع ہوا تھا جس نے آگے چل کر تحریکِ آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ اس حوالے سے یہاں ''بوسٹن ٹی پارٹی'' کا نام لیا جاتا ہے جس نے اس تحریک کو منظم کیا اور اسے آزادی کی جدوجہد بنا دیا۔

مجھے بسا اوقات بہت تعجب ہوتا ہے کہ دنیا کی بہت سی مسلح تحریکاتِ آزادی کو دہشت گردی قرار دینے والے امریکی رہنماؤں کو برطانوی استعمار کے خلاف امریکہ کی مسلح جنگِ آزادی کے وہ مراحل آخر کیسے بھول جاتے ہیں جن میں امریکہ کے فریڈم فائٹرز وہی کچھ کرتے رہے جو ان کے بقول آج کے دہشت گرد کر رہے ہیں۔ اگر اس زمانے میں ''دہشت گردی'' کے خلاف کوئی جنگ عالمی سطح پر ہوتی تو اس کا سب سے بڑا ہدف وہی قرار پاتے۔

افغانستان کیلئے دستوری طرزِ حکومت کی تجویز

۲۹ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام ایک سیمینار سے خطاب کا کچھ حصہ

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں حکومتی ڈھانچے اور دستوری نظام کی تشکیل اور قادیانیوں کی حیثیت طے کرنے کے بارے میں ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر جو فیصلے کیے، وہ اسی رخ پر ہوئے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا، بلکہ ہم نے تو افغانستان میں طالبان کی امارت اسلامیہ قائم ہونے کے بعد وہاں بھی اس بات کیلئے کوشش کی ہے کہ کسی طرح وہاں دستوری حکومت کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں خود ایک دور میں قندھار گیا ہوں، امیر المومنین ملا محمد عمر سے ان کے دور اقتدار میں ملاقات کی ہے اور اگرچہ ان سے براہ راست اس مسئلہ پر بات نہیں ہو سکی، لیکن ان کی شوریٰ کے ذمہ دار حضرات سے میں نے بات کی۔ میں اپنے ساتھ قرارداد مقاصد، علماء کے ۲۲ دستوری نکات اور جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا ۱۹۷۰ء کا انتخابی منشور لے کر گیا تھا اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علمائے پاکستان کی طرح قرآن و سنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوامی نمائندگی اور دستوری حکومت کا اہتمام کریں، کیونکہ آج کے دور میں کسی حکومت کے جواز کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کیلئے یہ ناگزیر تقاضے ہیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اجتہادی امور سے ہے اور حالات کے مطابق ایسے معاملات میں کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنے کی گنجائش

موجود ہوتی ہے، اس لیے انہیں اس مشورہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی تھی یا حالات کا جبر تھا کہ معاملات کو اس رخ پر لانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس ہمارے ایک اور پڑوسی ملک ایران میں جب مذہبی قیادت برسر اقتدار آئی اور ابھی تک برسر اقتدار ہے، اس نے اپنے روایتی موقف کو جدید سیاسی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالا، دستوری حکومت اور عوامی نمائندگی کا اہتمام کیا اور باوجودیکہ اہل تشیع کا امامت کا سسٹم اہلِ سنت کے خلافت کے سسٹم کی بہ نسبت زیادہ سخت اور تھیاکریسی کے زیادہ قریب ہے، انہوں نے اسے بھی "ولایتِ فقیہ" کے عنوان سے دستوری نظام کا حصہ بنا دیا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

دستور کی حد تک پاکستان میں ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اگر پاکستان اور ایران کے دساتیر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک اسلامی حکومت کے بارے میں اہل سنت کے نقطۂ نظر اور اہل تشیع کے نقطۂ نظر کا فرق جدید دستوری زبان اور آج کی سیاسی اصطلاحات میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایران میں چونکہ حکومتی طبقات اور حکومتی نظام چلانے والے افراد اس کے مطابق تعلیم و تربیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اس کے مطابق ملک کا نظام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آرہی، مگر ہمارے ہاں مقتدر طبقات اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان اور اس کے دستور کی نظریاتی بنیاد کے حوالے سے ابھی تک تذبذب اور گومگو کا شکار ہیں، بلکہ عوامی دباؤ کے تحت قبول کیے جانے والے اس دستور اور اس کی اسلامی دفعات سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کا دستور اور اس کی اسلامی دفعات قومی زندگی میں عملی پیشرفت کے مواقع سے ابھی تک محروم ہیں۔

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کا انٹرویو

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والے انٹرویو کے منتخب حصے

سوال: یہ جو ہمارے ملک میں اسلام اور سوشلزم کی لڑائی کا دور رہا، آج اسے آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اس لڑائی کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہمارے مغرب اور شمال کی طرف سوویت یونین ایک بڑی طاقت کے طور پر موجود تھا۔ کمیونسٹ چین بھی ہمسائے میں تھا لیکن اس کے عزائم توسیع پسندانہ نہیں تھے۔ جبکہ سوویت یونین نے پہلے مشرقی یورپ میں اور پھر ادھر افغانستان کی طرف پھیلاؤ کی پالیسی اختیار کی۔ اس کے مقابلے میں مغرب کا ایجنڈا یہ تھا کہ یہاں سے کوئی ملک مذہب کی بنیاد پر سوویت یونین کے پھیلاؤ کی مزاحمت کرے۔

سوال: کیا مغرب والوں نے یہاں مذہب کے گہرے اثرات دیکھ کر کمیونزم کو روکنے کیلئے یہ پالیسی اپنائی؟

جواب: مغرب والوں کی یہ سوچ تھی کہ اگر ایشیا میں کمیونزم کو کوئی روک سکتا ہے تو یہ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ادبی حلقوں کے ذریعے سے وہ کمیونسٹ نظریات کے پھیلاؤ کے خلاف مہم اٹھائے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی سے پہلے یہاں ترقی پسند تحریک منظم ہوئی تھی اور وہ اشتراکی نظریات پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اہل مغرب کی اگر یہ اپروچ تھی کہ کمیونزم کو مذہب کے حوالے سے روکا جاسکتا ہے تو یہ ان کا ایجنڈا تھا، لیکن خود یہ ہماری بھی مجبوری تھی۔ اس لیے کہ روس نے وسط ایشیائی ریاستوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور اب وہ افغانستان میں پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ روس نے جو کچھ وہاں کے مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ کیا تھا، وہ ہم یہاں برپا ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے گویا سوشلزم کی مخالفت میں ہم ایک ہوگئے تھے۔ مغرب کا اپنا مفاد تھا، ہمارا اپنا مفاد تھا۔ ہم اس صورت سے دوچار نہیں ہونا چاہتے تھے جو صورت وسط ایشیائی ریاستوں پر روس کے غلبے کے بعد بنی تھی۔ یہ فکری محاذ ابتداء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سنبھالا تھا۔ ہم جمعیت علمائے اسلام والے غیر جانبدار تھے۔

جمعیت ۱۹۵۷ء میں ''جمعیت علماء اسلام پاکستان'' کے نام سے دوبارہ باقاعدہ طور پر منظم ہوئی تھی۔ یہ دراصل جمعیت علماء اسلام ہند کی ہی ایک نئی شکل تھی۔ آزادی سے پہلے ہم نے، جنہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا، برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے دیکھا کہ اب یہاں امریکہ پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہماری ترجیحات کچھ اس طرح تھیں کہ امریکہ روس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

سوال: آپ نے امریکہ کو زیادہ خطرناک کیوں سمجھا؟

جواب: ہم امریکہ کو اس خطے میں برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ ہم نے برطانیہ کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک جنگ لڑی تھی، باقاعدہ مسلح جنگیں بھی لڑیں، قربانیاں دیں، گرفتاریاں دیں، تحریکیں برپا کیں۔ اور مصر کے جمال عبدالناصر سے ہماری قربت بھی اسی وجہ سے تھی کہ ہم عالمی سطح پر امریکہ کو برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ تب دو ہی امکانات تھے کہ امریکہ کی مدد سے روس کے ساتھ لڑائی لڑی جائے، یا پھر روس کی مدد سے امریکہ کے ساتھ لڑائی لڑی جائے۔ لیکن میں اس حوالے سے مولانا مودودیؒ کو کریڈٹ دیتا ہوں کہ انہوں نے کمیونزم کے خلاف ایک بھرپور فکری جنگ لڑی ہے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے جس پر ہمیں سوشلسٹ علماء بھی کہا گیا۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس وقت بائیں بازو کی تائید کرتے تھے۔ بھٹو کے خلاف جب ۱۱۳ علماء کا فتویٰ آیا۔ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے کہا ہم نہیں مانتے ایسے فتووں کو۔ جمعیت علماء اسلام نے اس فتوے کو مسترد کر دیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جمال عبدالناصر نیشنلزم کے قائل تھے اور یہ نیشنلزم مغربی استعمار کے مقابلے میں تھا۔ نیشنلزم کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ترکی میں نیشنلزم بمقابلہ اسلام تھا، ہم اس کی بات نہیں کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم بمقابلہ برطانوی استعمار تھا، ہم اس کی حمایت کرتے تھے۔

سوال: جماعت اسلامی جمال عبدالناصر کے نیشنلزم کی مخالف تھی؟

جواب: ایک ہے اصولی موقف کہ ہم نے نیشنل ازم کو بطور اصول اور نظریے کے نہیں بلکہ بطور حکمت عملی کے لیا۔ متحدہ ہندوستان میں بھی ہم نے نیشنلزم کے تحت آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اگر مسلمان اور ہندو اکٹھے نہ ہوتے تو وہ یہ جنگ

نہ جیت سکتے تھے۔ اگر پہلے ہی باہم لڑ پڑتے تو آزادی کی تحریک آگے بڑھ ہی نہ سکتی۔ ہم نے مذہب کے مقابلے میں نیشنلزم کو کبھی سپورٹ نہیں کیا۔ لیکن نیشنلزم کے نام پر جب استعمار کے خلاف جنگ لڑی گئی ہے تو ہم اس کے سپورٹر رہے ہیں۔ اور یہ تب تک لڑی گئی جب تک افغانستان میں روس نہیں آیا۔ جب تک روس افغانستان کی سرحدوں سے باہر رہا ہماری پوزیشن وہ رہی۔ جبکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جب روس افغانستان میں آکر بیٹھا تو پھر ہم بھی اسی کیمپ میں چلے گئے۔

سوال: روس افغانستان میں آیا تو آپ کو اس کیمپ میں آنا پڑا جس میں مولانا مودودیؒ تھے؟

جواب: جہاد افغانستان کو ان سے زیادہ ہم نے سپورٹ کیا ہے۔ مجھے وہ مکالمہ یاد ہے جو ولی خان اور مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان ہوا تھا۔ جب افغانستان میں روس کے آنے کے بعد فتویٰ جاری ہوا کہ روس کے خلاف لڑنا جہاد ہے تو ان دنوں مولانا عبد اللہ درخواستیؒ نے سرحد کا طوفانی دورہ کیا تھا۔ ساری قبائلی پٹی میں مولانا کے معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ جناب ولی خان نے اعتراض کیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، جو کچھ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں کہ یہ تو امریکہ کی جنگ ہے۔ جواب میں مولانا مفتی محمودؒ نے دو باتیں کہیں، یہ غالباً مردان کے جلسے کی بات ہے۔ مفتی صاحب نے ایک بات یہ کہی کہ یہ جنگ افغانستان کی نہیں بلکہ ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ روس اس سے آگے پاکستان آنا چاہتا ہے کہ اسے گرم پانیوں تک رسائی درکار ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب ہم پر برطانوی استعمار نے قبضہ کیا اور ہم نے یہاں سے ہجرت کی تو افغانستان ہمارا بیس کیمپ بنا تھا، افغانستان والوں نے ہمیں دھکے نہیں دیے تھے۔ آج ان پر بپتا آئی ہے اور وہ ہمارے پاس آئے ہیں تو ہم ان سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ مفتی صاحب نے جناب ولی خان سے کہا کہ تم پٹھان ہو، پٹھانی روایات کو تو قائم رکھو۔ بحیثیت مسلمان ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یوں ہم بھی اس کیمپ میں چلے گئے۔

سوال: اس زمانے میں بائیں بازو کا کہنا یہ تھا کہ روس سے اصل خطرہ ہمارے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، اور اسٹیبلشمنٹ کو ہے۔

جواب: خطرے ان کی طرف بھی تھے لیکن ہمیں تو ازبکستان کی ویران مسجدیں نظر آرہی تھیں کہ مسجدوں کو تالے لگے ہوئے تھے، وہ منظر بھی ہمارے سامنے ہی تھا۔ ہم بھی پہلے یہ باتیں نہیں مانا کرتے تھے، اب جو یہ پردہ اٹھا ہے تو بہت کچھ سامنے آیا ہے۔ میں ۹۰ کے عشرے میں خود تاشقند گیا ہوں اور وہاں جو ماحول میں نے دیکھا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے۔ میں نے سمرقند، تاشقند کے شہر خود دیکھے ہیں۔ میں وہاں وفد کے ساتھ گیا تھا۔ تاشقند کے جس مدرسے میں ہم ٹھہرے وہ چالیس سال تک سیمنٹ کا گودام بنا رہا۔ سمرقند کی مرکزی جامع مسجد جہاں ہم ایک رات رہے وہ پچاس سال تک سینما ہال بنی رہی۔ ہم جانتے تھے کہ افغانستان میں روس کے آجانے سے خطرات تاجروں کو بھی ہیں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بھی ہیں، لیکن ہم نے روسی قبضے میں جانے والے مدرسوں اور مسجدوں کا جو حال دیکھا تھا اسے بھی ہم بھلا تو نہیں سکتے تھے۔ خطرات سب کیلئے تھے کہ روس اگر یہاں آگیا تو کیا ہوگا؟

سوال: آپ نے ان ریاستوں کے جو مسلمان دیکھے وہ کس طرح کے تھے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ وسط ایشیا میں روس کے آنے سے دیندار مسلمان زیرزمین چلے گئے تھے۔ میں تاشقند اور سمرقند دونوں جگہ گیا۔ میرے ساتھ مفتی محمد جمیل شہید، مولانا فداء الرحمن درخواستی، اور مفتی نظام الدین شامزئی شہید بھی تھے۔ وہاں ایک مدرسہ میں ہم استاد ذاکر جان سے ملے، بہت فصیح عربی بولتے تھے۔ مجھے تعجب ہوا، میں نے سوچا کہ ایک زمانے میں ان کے تعلقات جمال عبدالناصر سے رہے ہیں ممکن ہے وہاں جاکر پڑھتے رہے ہوں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ مدرسوں کا قیام غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھلے حصے میں لے گئے جہاں باغیچہ تھا۔ اس باغیچے میں بیس پچیس فٹ زیرزمین ایک غار نما کمرے میں لے گئے اور بتایا کہ ہم یہاں رات کو بارہ سے دو بجے تک قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ہم نے یہیں درس نظامی کا کورس پڑھا تھا۔ اس قسم کے زیرزمین مدرسے آپ کو تاشقند میں بہت ملیں گے۔ داڑھیاں غائب ہوگئی تھیں۔ ہمارا ایک اندازہ تھا کہ وسط ایشیا کی یہ ریاستیں آزاد ہوئی ہیں تو ان کا سب سے بڑا تقاضا کیا ہوگا۔ ہم اس لیے گئے تھے کہ وہ لوگ ہم سے مسجدوں کیلئے امام اور حافظ وغیرہ مانگیں گے۔ لیکن کہیں سے بھی یہ مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ ان کے پاس امام بھی تھے، خطیب بھی تھے۔ البتہ ان کا مطالبہ تھا کہ ہمیں قرآن مجید بھیجو کیونکہ یہاں قرآن کریم رکھنا قانونی طور پر جرم رہا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب اور مصر کے علاوہ ہماری تنظیم مجلس تحفظ ختم نبوت نے بھی بہت بڑی تعداد میں وہاں قرآن مجید بھجوائے اور میں انہی کے وفد میں وہاں گیا تھا۔

ایک واقعہ سے آپ حیران ہوں گے کہ امام بخاریؒ کا مزار خرتنگ میں ہے جو کہ سمرقند سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم وہاں فاتحہ پڑھ کر پلٹ رہے تھے، ہمارے پاس ایک بڑی ویگن تھی۔ اچانک ایک بڑھیا ہماری ویگن کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ کانپ رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی "مصحف شریف، مصحف شریف"۔ ہم نے ترجمان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ اسے کہیں سے خبر ملی ہے کہ آپ لوگ قرآن مجید بانٹ رہے ہیں۔ ہم متذبذب تھے کہ ہمارے پاس قرآن کریم محدود تعداد میں تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ فلاں فلاں مدرسے میں قرآن مجید دینے ہیں۔ ہم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ بضد تھی۔ آخر ہم نے ایک نسخہ دیا تو وہ اسے سینہ سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کہنے لگی کہ ستر سال بعد قرآن مجید کی زیارت نصیب ہوئی ہے، بچپن میں نانی کے ہاتھ میں دیکھا کرتی تھی، حسرت سے سوچا کرتی تھی کہ دوبارہ کبھی زیارت ہوگی یا نہیں۔

دیکھیں، امریکہ روس کے خلاف مزاحمت کرنا چاہتا تھا، لیکن ہمارے اپنے مقاصد تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج امریکہ سمیٹ کرلے گیا کہ وہ طاقتور تھا اور ہم کمزور تھے۔ ہمارے مقامی اونچے طبقوں نے بھی مفادات حاصل کیے۔ رہے ہم، تو ہم اسی کیفیت میں ہیں۔ افغانی بے چارے کل روسی فوجوں سے لڑتے رہے، آج امریکیوں سے نبرد آزما ہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑا۔

سوال: یہ بتائیں کہ مشرف حکومت ہاتھ دھو کر دینی مدرسوں کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟

جواب: جہاد افغانستان کے بارے میں مغرب کو ایک بڑی غلط فہمی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ مجاہدین ہماری وجہ سے لڑ

رہے ہیں، جنگ ختم ہوگئی تو ہم انہیں فارغ کردیں گے۔ مغرب کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ہمارے لیے کام کررہے ہیں جب ہم پیچھے ہٹ جائیں گے تو یہ خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مغرب اپنی جنگ لڑرہا تھا، یہ اپنی جنگ لڑرہے تھے۔ افغانستان سے روس نکل گیا تو امریکہ نے مڈل ایسٹ میں محاذ کھول لیا۔ سوال یہ تھا کہ کل افغانستان میں روس کا آنا غلط تھا تو آج امریکہ کا عراق پر قبضہ کرنے کا کیا جواز ہے؟ یہ لوگ اکڑ گئے کہ ٹھیک ہے ہماری تربیت امریکہ نے کی ہے، اسامہ بن لادن امریکہ کے ساتھ مل کر لڑرہا تھا، لیکن امریکہ کیلئے نہیں لڑرہا تھا بلکہ یہ اس کی اپنی جنگ تھی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جب روس ہٹا تو انہوں نے امریکہ سے کہا کہ تم بھی ہٹو، اس پر امریکہ سے تصادم ہوگیا۔ اس کے بعد امریکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ تو اپنی جنگ لڑرہے ہیں اور اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہیں۔ طالبان بھی کھڑے ہیں، اسامہ بھی کھڑا ہے اور یہ ہمارے مقابلے پر ہیں۔

افغانستان کے جہاد سے پہلے اور بعد کی صورتحال آپ دیکھ لیں۔ دنیا بھر میں مسلمان جہاں کہیں بھی آزادی کی جنگ لڑرہے تھے انہیں جہاد افغانستان سے حوصلہ ملا، تقویت لی۔ مثلاً کشمیر میں مسلمان لڑرہا تھا، الجزائر میں بھی نبرد آزما تھا، فلسطین میں بھی جنگ جاری تھی، اری ٹیریا میں بھی برسرپیکار تھا۔ بوسنیا میں آخر کون لڑا ہے؟ چنانچہ افغانستان کی جنگ کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ جہاد پھیل گیا اور چیچنیا و فلپائن تک بھی اس کے اثرات پہنچ گئے۔ جب مغرب نے دیکھا کہ یہ جنگ ساری دنیا میں پھیل رہی ہے تو اس پر مغرب نے تجزیہ کیا کہ اس کا بیس کیمپ کہاں ہے؟ مغرب اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ساری مہم جوئی کی بنیاد دینی مدرسہ ہے اور یہ اس کی فکری تربیت ہے جس نے جہاد کے نظریے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے "دی انڈی پینڈنٹ" اخبار میں کوئی دس سال قبل ایک تفصیلی رپورٹ چھپی تھی جس کے لکھنے والے نے لکھا کہ شر کے اصل مراکز جنوبی ایشیا کے دینی مدارس ہیں، اور ان میں بھی خاص طور پر دیوبندی مدارس۔ اس رپورٹ پر دو تصویریں شائع کی گئی تھیں۔ ایک دارالعلوم دیوبند کی اور دوسری بستی نظام الدین دہلی کے تبلیغی مرکز کی۔ ان دنوں برمنگھم میں ختم نبوت کی سالانہ کانفرنس ہورہی تھی، خاصا بڑا اجتماع تھا، لوگ پریشان تھے کہ ہمارے خلاف بہت خطرناک رپورٹ چھپی ہے۔ میں نے وہاں یہ کہا تھا کہ آپ لوگ اسے چارج شیٹ سمجھ کر پریشان ہورہے ہیں جبکہ میں اسے کریڈٹ سمجھ رہا ہوں اور خوش ہورہا ہوں اور دی انڈی پینڈنٹ کا شکریہ ادا کررہا ہوں۔ یہ تو تاریخ کا اعتراف ہے، مغرب کو محسوس ہوگیا ہے کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔

مغرب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس ساری فکری لہر کا منبع مدرسہ ہے، لیکن وہ اس مسئلہ پر ایک ڈنڈی مار رہے ہیں۔ وہاں اس مسئلہ پر ایک مذاکرہ ہوا، میں نے اس میں کہا کہ مغرب یہ کہتا ہے کہ یہ مدارس جہاد پڑھاتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم بخاری کی کتاب الجہاد بھی پڑھاتے ہیں، ترمذی کی بھی کتاب الجہاد پڑھاتے ہیں، مغازی بھی پڑھاتے ہیں، اور قرآن کریم کی جہاد والی آیات بھی پڑھاتے ہیں۔ لیکن مغرب یہ نہیں بتاتا کہ جہاد پڑھاتے تو یہ مدارس ہیں مگر سکھایا امریکہ نے ہے۔ وہ اپنے رول کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ ہمیں بالکل انکار نہیں کہ ہم جہاد پڑھاتے ہیں، ہم تو یہ پڑھاتے رہے ہیں اور پڑھاتے رہیں گے۔ لیکن اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جدید اسلحے کی ٹریننگ امریکہ نے دی ہے۔ اسامہ بن لادن کو کمانڈو ٹریننگ کس نے دی اور مجاہدین کو کس نے تربیت دی؟ دنیا بھر میں جہاد کے نام سے جو لڑائیاں لڑی جارہی ہیں، یہ اگر

مدارس نے پڑھائی ہیں تو سکھائی امریکہ نے ہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو پھر ہم برابر کے شریک ہیں۔ اگر امریکہ کے نزدیک افغانستان پر روس کا قبضہ ناجائز تھا تو اسے یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے مسلم ممالک سے نکل جانا چاہیے، اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

افغانستان میں افیون کی کاشت کا مسئلہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۷ء

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۵ نومبر ۲۰۰۷ء کی ایک خبر کے مطابق پاکستان میں منشیات کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس پر قابو پانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان میں افیون کاشت میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے اور اس سال ۴۰ میٹرک ٹن پیداوار ریکارڈ کی گئی ہے۔ یہ افیون ہیروئن کی شکل میں قبائلی سرداروں اور پیشہ ور اسمگلروں کے ذریعے پاکستان میں سپلائی ہوتی ہے اور پھر دنیا کے مختلف ممالک میں سپلائی ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی منشیات کے استعمال میں مسلسل اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔ خبر میں کہا گیا ہے اینٹی نارکوٹکس فورس نے گذشتہ دنوں ایک خاتون اور اس کے ساتھی کو گرفتار کر کے اس سے چار کروڑ روپے کی ہیروئن برآمد کی ہے۔

افغانستان میں افیون کی کاشت، اس سے ہیروئن کی تیاری اور پھر پاکستان میں اور اس کے راستے دنیا بھر میں اس کی سپلائی عالمی سطح پر پریشان کن مسئلہ بنا ہوا ہے، اس پر قابو پانے کی کوئی تدبیر نہیں ہو رہی بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ماضی قریب میں طالبان کے دور حکومت میں یہ مسئلہ وقتی طور پر اس طرح حل ہو گیا تھا کہ امیر المومنین ملا محمد عمر نے پوست کی کاشت پر پابندی لگا دی تھی جس پر بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق افغانستان میں پوست کی کاشت مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ مگر طالبان کی اسلامی حکومت کو طاقت کے زور پر زبردستی ختم کیے جانے کے بعد پھر پرانی صورتحال بحال ہو گئی ہے اور عالمی اداروں کو اسے ختم کرنے میں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے خیال میں آج بھی اس کا حل وہی ہے جو طالبان نے کیا تھا، افغان قوم کا مزاج ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی بالادستی اور حکم و قانون کو قبول نہیں کرتے البتہ شریعت کے حکم پر وہ سب کچھ ترک کر دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر انہیں ان کی شریعت واپس کر دی جائے اور ایک اسلامی حکومت کو آزادی کے ساتھ وہاں کام کرنے کا موقع دیا جائے تو نہ صرف پوست کی کاشت بلکہ سرداروں کی جنگ یعنی "لارڈز وار" پر بھی دوبارہ قابو پایا جا سکتا ہے۔

طالبان اور القاعدہ پر وکالت کی مخالفت کا الزام

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۶ جنوری ۲۰۰۸ء

روزنامہ پاکستان میں ۱۷ جنوری ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق پشاور ہائی کورٹ کے صدر جناب

لطیف آفریدی اور بعض دیگر سرکردہ وکلاء کو مبینہ طور پر القاعدہ اور طالبان کی طرف سے دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "وکالت یہودیوں کا پیشہ ہے، چھوڑ دو ورنہ مار دیں گے"۔ اس پر ردعمل کے اظہار کے طور پر خبر میں بتایا گیا ہے کہ وکالت کا پیشہ یہودیوں کی میراث نہیں ہے اور اسلام میں وکالت کا پیشہ جائز ہے۔

یہ خبر یا خط عین اس وقت منظر عام پر آیا ہے جب ملک بھر کے وکلاء دستور کی بالادستی اور اعلیٰ عدالتوں کے معزول کیے جانے والے ججوں کی بحالی کیلئے تحریک کو منظم کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ۱۸ فروری کو ملک میں عام انتخابات منعقد ہونے یا خدانخواستہ نہ ہونے کے بعد دونوں صورتوں میں وکلاء کی یہ تحریک ملک کے سیاسی مستقبل کی راہیں متعیّن کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی، اور قوم کو اب دستور و قانون کی بالادستی یا شخصی اور طبقاتی حکمرانی میں سے ایک کا بہرحال انتخاب کرنا ہوگا۔ اس لیے ایسے موقع پر وکلاء کو اس انداز میں دھمکیاں دینا اور وکالت کے شرعی جواز اور عدم جواز کی بحث کا ماحول پیدا کرنا ہمارے خیال میں ایسے عناصر ہی کی کارروائی ہو سکتی ہے جو وکلاء کی اس تحریک کو سبوتاژ کرنے اور اس کا رخ حکمرانوں کی بجائے دینی عناصر کی طرف پھیر دینے کے خواہشمند ہیں۔ اور شاید ان کا خیال ہے کہ ایسا کر کے وہ نہ صرف یہ کہ وکلاء کی تحریک کی پیش رفت میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر لیں گے بلکہ دینی حلقوں کی طرف سے اس تحریک کی متوقع حمایت کا راستہ بھی روک سکیں گے۔

جہاں تک بات القاعدہ یا طالبان کی ہے، ہمارے ہاں یہ نام مختلف مقاصد کیلئے اس کثرت کے ساتھ استعمال ہونے لگے ہیں کہ ان کی طرف سے کوئی بات آنے پر یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بات ان میں سے کسی نے کہی ہے یا ان کی آڑ میں کوئی اور گروہ اپنے مقاصد کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ باقی رہی بات "وکالت" کی تو یہ کہنا اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اسلام میں وکالت کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں وکالت کے عنوان سے مستقل ابواب موجود ہیں جن میں وکالت کی شرعی حدود اور اس سے متعلقہ احکام تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

حدیث نبویؐ کی سب سے مستند کتاب بخاری شریف میں وکالت کے بارے میں ایک مستقل باب موجود ہے جس میں امام بخاریؒ نے وکالت کے مختلف پہلوؤں پر پندرہ سے زائد احادیث نبویہؐ پیش فرمائی ہیں۔ البتہ ان میں وکالت کا وسیع تر مفہوم میں ذکر کیا گیا ہے، تجارت میں نمائندہ مقرر کرنے کو بھی وکالت کہا گیا ہے، معاملات کے دیگر شعبوں میں نمائندگی کو بھی وکالت سے تعبیر کیا گیا ہے اور نکاح وغیرہ میں نمائندگی کو بھی وکالت قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے چند روایات درج کی جا رہی ہیں۔

- حجۃ الوداع میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے قربانی کے جانور ذبح کرنے کیلئے حضرت علیؓ کو وکیل بنایا اور ہدایت فرمائی کہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کر کے ان کے چمڑوں وغیرہ کو صدقہ کر دیں۔
- حضرت بلالؓ جناب نبی کریمؐ کے گھر کے معاملات یعنی اخراجات وغیرہ کے نگران اور آپؐ کی طرف سے وکیل تھے۔ انہوں نے ایک بار آنحضرتؐ کی خدمت میں عمدہ کھجوریں پیش کیں، آپؐ نے پوچھا یہ کہاں سے

آئی ہیں؟ حضرت بلالؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس عام کھجوریں تھیں میں نے وہ دو صاع دے کر ان کے بدلے میں ایک صاع عمدہ کھجوریں لی ہیں تاکہ آپ کو اچھی کھجوریں کھلا سکوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو تم نے سود کا سودا کیا ہے۔ ایسی سودی تجارت نہ کیا کرو، اگر ایسا تبادلہ ضروری ہو تو نقدی کے عوض بیچ کر اس کے عوض دوسری چیز لے لیا کرو۔

- نبی کریمؐ کی خدمت میں زنا کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں مرد نے اعتراف کر لیا جبکہ عورت سے دریافت کرنے کیلئے آپؐ نے اس کے قبیلے کے سردار حضرت انیسؓ کو نمائندہ بنایا کہ اس سے جا کر پوچھو، اگر وہ جرم کا اعتراف کر لے تو میری طرف سے اسے سنگسار کر دو۔
- حضرت عمرؓ نے اپنی طرف سے صدقات کی تقسیم کیلئے جن لوگوں کو اپنا وکیل مقرر کر رکھا تھا، ان میں ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی تھے۔
- مسند احمدؒ میں حضرت عروۃ البارقیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے انہیں قربانی کیلئے بکری خریدنے کی غرض سے ایک دینار دے کر بھیجا۔ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خریدیں، ایک بکری پھر ایک دینار میں بیچ دی۔ اور پھر بکری اور دینار لا کر آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ آنحضرتؐ نے بکری کو ذبح کرنے اور دینار کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔
- نبی کریمؐ نے ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ نکاح کیلئے عمرو بن امیہ کو اپنا وکیل مقرر کیا، ابوداؤد شریف کی روایت کے مطابق یہ نکاح ان کی وکالت سے ہوا۔ حضرت میمونہؓ سے نکاح کیلئے حضورؐ نے ابورافعؓ کو وکیل بنایا، جبکہ حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ آپؐ کے نکاح میں ام المؤمنین ام سلمہؓ کی وکالت ان کے فرزند عمر بن ابی سلمہؓ نے فرمائی۔

چنانچہ اسلامی تعلیمات میں وکالت کا لفظ وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں نکاح، تجارت اور دیگر معاملات میں نمائندگی کو بھی وکالت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں کسی کی نمائندگی کے دیگر بہت سے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مختار عام یا مختار خاص کی جو صورتیں ہمارے مروجہ قانونی نظام میں پائی جاتی ہیں، اسلام نے انہیں بھی وکالت ہی کے ضمن میں شمار کیا ہے۔

وکالت کی جو صورت ایک باقاعدہ پیشے کے طور پر ہمارے ہاں مروج ہے اور ہمارے عدالتی نظام کا حصہ ہے، اسے فقہ اسلامی کی اصطلاح میں "وکیلِ خصومت" کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی تنازع یا مقدمہ میں کسی فریق کی نمائندگی کر کے اس کے موقف کو بہتر انداز میں پیش کرنا، فقہ کی کم و بیش تمام بڑی کتابوں میں وکالت کی اس شکل کے جواز کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی مختلف صورتوں کے احکام و ضوابط بیان کیے گئے ہیں اور اس وکالت پر اجرت لینے کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ وکالت کے اس قسم کے جواز کیلئے بہت سے فقہائے کرامؒ نے بخاری شریف کی یہ روایت پیش کی ہے کہ جب نبوت کا

جھوٹا دعوے دار مسیلمہ کذاب اپنے قبیلے کا ایک وفد لے کر مدینہ منورہ آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کی کہ اگر وہ اپنے بعد اسے اپنا جانشین نامزد کر دیں تو وہ یعنی مسیلمہ جناب نبی کریمؐ کی اطاعت قبول کرنے کیلئے تیار ہے۔ جناب نبی کریمؐ اپنی قیام گاہ تشریف لائے اور کھڑے کھڑے یہ فرمایا کہ وہ اگر ان سے کھجور کی ایک ٹہنی کا مطالبہ کرے گا تو میں اسے وہ بھی دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ یہ فرما کر آپؐ نے حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ کو، جو خطیب رسول اللہؐ کہلاتے تھے، فرمایا کہ مسیلمہ کے ساتھ باقی گفتگو میری طرف سے یہ کریں گے۔ گویا آنحضرتؐ نے مسیلمہ کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کیلئے حضرت ثابت بن قیسؓ کو اپنا نمائندہ اور وکیل بنایا۔

امام بیہقیؒ نے السنن الکبریٰ میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ مختلف تنازعات میں اپنی طرف سے وکالت کیلئے اپنے بھائی حضرت عقیلؓ کو بھیجا کرتے تھے۔ اور جب وہ زیادہ بوڑھے ہو گئے تو پھر حضرت علیؓ نے ان کی جگہ اپنے ایک بھتیجے عبد اللہ بن جعفرؓ کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔

اس قسم کی روایات کی بنیاد پر فقہائے کرام نے ''وکیلِ خصومت'' کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اس کیلئے اجرت لینے کو بھی درست قرار دیا ہے۔ البتہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کی اخلاقیات کا ایک امتیازی دائرہ ہے اور حلال و حرام کے اصول و ضوابط ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر کسی بھی شعبے کی مروجہ صورتوں کو مکمل طور پر اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح وکالت کے باب میں بھی اسلامی اخلاقیات کا دائرہ دوسرے نظاموں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ اس شعبے کو مکمل طور پر اسلامی شکل دینے کیلئے ان اخلاقیات کی پابندی کا اہتمام بہرحال ضروری قرار پائے گا۔ مثال کے طور پر ایک پہلو کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ کسی مقدمے میں ایک وکیل کسی بھی فریق کی طرف سے اس کے موقف کی وضاحت کیلئے پیش ہو سکتا ہے اور اسے اس پر معروف طریقے سے فیس لینے کا بھی حق حاصل ہے۔ لیکن جس شخص یا فریق کے بارے میں وکیل کو خود یقین ہو جائے کہ اس نے فی الواقع جرم کیا ہے تو کیا اسے اس جرم کی سزا سے بچانے کیلئے اس کا نمائندہ بننا اور اسے سزا سے بچنے کیلئے از خود مختلف حیلے اور طریقے سکھانا جرم میں معاونت نہیں ہے؟ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۲ میں ہدایت کی ہے کہ بر و تقویٰ (نیکی اور پرہیزگاری) میں ایک دوسرے کی معاونت کرو لیکن اثم و عدوان (گناہ اور ظلم) میں ایک دوسرے کے معاون نہ بنو۔ اس لیے ایک شخص کے مجرم ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کیا جرم میں اس کے ساتھ تعاون نہیں ہے اور کیا یہ طرزِ عمل سوسائٹی میں جرائم میں اضافے کا سبب نہیں ہے؟

اس ایک پہلو پر اپنے تحفظات کے واضح اظہار کے ساتھ ہم اصولی طور پر وکالت کے پیشے کو اسلامی نقطۂ نظر سے ایک جائز پیشہ سمجھتے ہیں اور اگر القاعدہ اور طالبان کے نام پر کسی نے اسے غیر اسلامی قرار دیا ہے تو اس کی حمایت کیلئے ہم تیار نہیں ہیں۔

غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۸ء

- - - -

سوال ۴: سماج میں امن قائم رکھنے کیلئے قانون کی اہمیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ (سیاسی فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے قانون کی پابندی کرنے کی کیا اہمیت ہے؟)

جواب: اسلام سوسائٹی میں امن کو برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے اور رائج الوقت قانون کی پابندی کا حکم دیتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”حاکم وقت اگر تمہاری حق تلفی بھی کر رہا ہو تو اس کی اطاعت کرو“۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان دونوں ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنا، اپیل کرنا اور آواز اٹھانا تو مظلوم کا حق ہے، لیکن قانون سے انحراف اور فیصلوں سے بغاوت کا اسے حق نہیں ہے۔ البتہ مسلم اقتدار کی صورت میں مسلمان حکمران کی طرف سے صریح کفر (کفر بواح) کے ارتکاب پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کو بغاوت کی اجازت دیتے ہیں جس کیلئے فقہائے کرام نے شرط لگائی ہے کہ اگر ”کفرِ بواح“ یعنی صریح کفر کے مرتکب مسلم حکمران کو عوامی بغاوت کے ذریعے تبدیل کر دینے کا غالب امکان نظر آرہا ہو تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ خواہ مخواہ عام لوگوں کو بدامنی کا شکار بنانا اور ان کی جان و مال کو خطرے میں ڈال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم اسلامی ریاست کیلئے ہے۔ غیر مسلم ریاست کیلئے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان یا ملک چھوڑ دیں اور یا اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے وہاں رہیں، لیکن قانون کی پابندی ان کیلئے ضروری ہوگی۔

اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانبدار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اس لیے آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس ردعمل کے اظہار کو مناسب حدود کا پابند ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت، مسلمان بھائیوں اور دیگر برادران وطن کیلئے مشکلات پیدا نہ کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبسہؓ کو قبول اسلام کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر خاموشی کے ساتھ وقت گزارنے اور غلبہ اسلام کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجانے کی ہدایت کی تھی (صحیح مسلم)۔ آپ نے حضرت ابوذر غفاری کو بھی قبول اسلام کے بعد اسی قسم کی ہدایت کی تھی (صحیح بخاری)۔ جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔ ان واقعات سے اس سلسلے میں اصولی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

افغانستان کا مسئلہ: پارلیمنٹ کے اجلاس سے توقعات

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء

- افغانستان میں برطانوی افواج کے کمانڈر بریگیڈیئر مارک اسمتھ نے سنڈے ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ افغانستان میں جنگ جیتنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کی کوئی صورت اختیار کرنا ہوگی۔
- ادھر عراق میں امریکی افواج کے کمانڈر جنرل پیٹریوس نے بغداد میں غیر ملکی میڈیا سے بات چیت کے دوران کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گردوں سے نمٹنے اور بہتر نتائج حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنٹرول ختم کرنا انتہائی مشکل ہے، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ عراق میں حاصل ہونے والے تجربہ کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے لیکن ہر جگہ صورتحال مختلف ہوتی ہے۔
- جبکہ پاکستان میں امریکہ کی سفیر محترمہ این ڈبلیو پیٹرسن نے لاہور میں ایوان صنعت و تجارت کے وفد سے بات چیت کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقات عامہ کی جنگ ہار چکے ہیں اور امریکی پیغام نہیں پہنچا سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ سے متاثرہ علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈالر سالانہ دے رہا ہے لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی

بجائے درآمدی بل کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔

اس فضا میں ۸ اکتوبر کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس اسلام آباد میں طلب کر لیا گیا ہے جس میں قانون کا نفاذ کرنے والے اور حساس اداروں کے سربراہ پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کو ملک میں امن و امان کی صورتحال کے بارے میں بریفنگ دیں گے۔ ملک کی عمومی صورتحال، امن عامہ کے بگڑتے ہوئے حالات اور قومی خود مختاری کے حوالے سے پارلیمنٹ کا یہ مشترکہ اجلاس اس حوالے سے انتہائی خوش آئند ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور پارلیمنٹ کو یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ نازک اور حساس ملکی صورتحال کے بارے میں براہ راست آگاہی حاصل کر کے اس کو بہتر بنانے کیلئے اپنی رائے دے سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سابق وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری کے اس بیان نے پارلیمنٹ کے اس اجلاس کی افادیت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے کہ قومی پالیسی میں تبدیلی کی کوئی توقع نہیں کی جانی چاہیے اس لیے کہ اگر آج میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم ہوتے تو انہیں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنا پڑتا۔

ویسے تو جناب خورشید احمد قصوری کے اس بیان سے پہلے بھی ملک کے ہر عام آدمی کا تاثر یہی ہے کہ ہماری پالیسیاں نہ پارلیمنٹ طے کرتی ہے اور نہ ہی ملک کے اندر تشکیل پاتی ہیں لیکن سابق وزیر خارجہ کے بیان نے اس عمومی تاثر پر مہر تصدیق ضرور ثبت کر دی ہے اور ملک کے عام شہری یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جب قومی پالیسیاں طے شدہ ہیں اور ان میں تبدیلی کسی کے بس میں نہیں ہے تو پھر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس اور اس میں عوام کے منتخب نمائندوں کو بریفنگ کے اس اہتمام کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کے باوجود ہم ۸ اکتوبر کو منعقد ہونے والے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے ناامید نہیں ہیں اور اسے بہر حال بہتری کی طرف ایک قدم سمجھتے ہوئے اس موقع پر عوام کے منتخب نمائندوں کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

- دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی تناظر میں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ جنگ ''دہشت گردی'' کی کوئی تعریف اور اس کا مصداق طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے جس میں کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑنے کا اختیار صرف امریکہ کے پاس ہے اور اس کے فیصلے کے خلاف اپیل کا کوئی غیر جانبدار فورم عالمی سطح پر موجود نہیں ہے۔
- اس جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے اس موقف کو نظر انداز کر دینا دلیل اور دانش کی دنیا میں ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک میں غیر ملکی مداخلت اور فوج کشی کے خلاف آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ دنیا کا کوئی فورم غیر جانبدارانہ ماحول میں ان کی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہے اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور آپشن موجود نہیں ہے کہ وہ ہتھیار اٹھائے رکھیں اور اپنی جانوں پر کھیل کر اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کریں۔
- پاکستان کے اندر خودکش حملوں اور حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے بارے میں ہم بار بار واضح طور پر یہ

کہہ چکے ہیں کہ ہم ان کو جائز نہیں سمجھتے اور ملک کے بے گناہ شہریوں اور نہتے لوگوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس کے اسباب و عوامل سے آنکھیں بند کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں اس لیے کہ جب تک اسباب کو دور نہ کیا جائے ان کے نتائج اور ردعمل کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً سوات کے لوگوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں وہی شرعی نظام دیا جائے جو پاکستان کے ساتھ ریاست سوات کے باقاعدہ الحاق سے قبل ان کے ہاں عدالتوں میں موجود تھا مگر پاکستان میں شامل ہونے کا انہیں یہ صلہ ملا کہ انہیں عدالتی شرعی نظام سے محروم کر دیا گیا۔ حکومت اس بات کو تسلیم بھی کرتی ہے چنانچہ ۴ اکتوبر کو روزنامہ پاکستان لاہور میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق صوبہ سرحد کے سینئر وزیر بشیر احمد بلور نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ دو ماہ کے اندر مالاکنڈ کے اضلاع میں شرعی نظام عدل ریگولیشن ۲۰۰۸ء نافذ کر دیا جائے گا جس کے تحت تمام فوجداری مقدمات کو چار ماہ میں اور دیوانی مقدمات کو چھ ماہ میں نمٹانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس ریگولیشن کا مقصد مالاکنڈ کے سات اضلاع کے عوام کو فوری اور سستے انصاف کی فراہمی ہے۔

یہاں ضمناً جناب بشیر احمد بلور کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا جا رہا ہے کہ کیا فوری اور سستا انصاف صرف مالاکنڈ کے سات اضلاع کی ضرورت ہے اور صوبہ سرحد اور ملک بھر کے دیگر شہریوں کو اس سے محروم رکھنے کا آخر کیا جواز ہے؟ لیکن اس سے ہٹ کر ہم دہشت گردی کے خلاف مبینہ جنگ کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جب سوات کے عوام کے اس مطالبہ کو حکومت درست تسلیم کرتی ہے تو پھر جنگ کو طول دینے اور فوجی آپریشن کے ذریعے سوات کے عوام پر جنگ مسلط رکھنے کا کیا جواز ہے اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟

یہ ایک بات ہم نے مثال کے طور پر عرض کی ہے اور ہماری اصولی گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کے مسائل اور مجبوریاں بھی دیکھی جائیں کیونکہ پاکستان کی پارلیمنٹ ان لوگوں کی بھی نمائندہ ہے اور یہ بات اس کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ کچھ لوگوں نے اگر غلط طرز عمل اختیار کر لیا ہے اور ان کی حرکات سے ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے تو وہ دیکھے کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور انہیں کس طرح اس سے باز رکھا جا سکتا ہے؟ صرف آپریشن اور فوج کشی کر کے پورے علاقے کو تہہ و بالا کر دینا ہی مسئلہ کا حل نہیں ہے اس لیے ہم عوام کے منتخب نمائندوں سے گزارش کریں گے کہ وہ پوری صورتحال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور محض بیرونی طاقتوں کی خواہشات کی تکمیل کی بجائے اپنے ملک کے مفاد اور قومی وقار کی پاسداری کا راستہ اختیار کریں۔

- اس کے ساتھ ہم ایک اور زمینی حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے کہ مغربی اقوام تو صرف اور صرف "بزنس مین" ہیں، عقیدہ اور ایمان کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے وہ اس مسئلہ کو بھی بزنس اور

پیسے کے ذریعے حل کرنا چاہتی ہیں اور روپے پیسے کے سوا انہیں کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ جبکہ پاکستان اور افغانستان کے عوام ایمان اور عقیدہ سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں، روپیہ پیسہ ان کے نزدیک ہر حال میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس جنگ میں عقیدہ سے کمٹمنٹ جس درجہ میں کارفرما ہے اس سے کوئی باشعور شخص بے خبر نہیں ہے۔ ایک طرف ڈالر اور اسلحہ ہے جبکہ دوسری طرف عقیدہ و ایمان اور قومی غیرت ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر کے اس مسئلہ کا جو حل بھی نکالنے کی کوشش کی جائے گی وہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دے گی اور عوام کے منتخب نمائندے یقیناً اس بڑی حقیقت کو نظر انداز نہیں کریں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ۸ اکتوبر کو اسلام آباد کے پارلیمنٹ ہاؤس میں جمع ہونے والے پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کے سامنے اس وقت دو سب سے بڑے چیلنج ہیں:

1. ملک کی سرحدوں کے اندر غیر ملکی حملوں کی روک تھام کر کے قومی خود مختاری کا تحفظ کیسے کیا جائے؟
2. اور ملک اندر خودکش حملوں کے ذریعے بے گناہ عوام کے قتل عام کو کیسے روکا جائے؟

ہم دعاگو ہیں کہ ہمارے منتخب نمائندے ان دو سنگین مسئلوں کا کوئی باوقار حل نکالنے میں کامیاب ہوں لیکن یہ گزارش ضرور کریں گے کہ بریفنگ رپورٹوں کے ساتھ ساتھ معروضی حالات اور زمینی حقائق بھی پیش نظر رکھیں کیونکہ مسئلہ کا صحیح حل تلاش کرنے کیلئے یہ بھی انتہائی ضروری ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ پر بریفنگ

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء

صدر مملکت نے وزیراعظم کی ایڈوائس پر پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ۸ اکتوبر کو طلب کر لیا ہے جس میں حساس و قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہان پارلیمنٹ کے ارکان کو بریفنگ دیں گے، اجلاس میں امن و امان کی صورتحال پر تفصیلی بحث کی جائے گی اور حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ صدر اور وزیراعظم کا یہ اقدام موجودہ حالات میں یقیناً خوش آئند ہے، اس سے جہاں عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومتی اقدامات اور پالیسیوں کے بارے میں تفصیلات جاننے کا موقع ملے گا وہاں حکومت کے ذمہ دار حضرات بھی عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کے جذبات اور تاثرات سے مزید آگاہی حاصل کریں گے۔

ملک میں امن و امان کی صورتحال کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے عنوان سے سرفہرست ہے۔ اور اس جنگ کا پھیلاؤ جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے عوام کے اضطراب میں اضافے کے ساتھ ساتھ قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کے بارے میں سوالات میں بھی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ ”دہشت گردی“ کیا ہے اور اس کے خلاف جنگ کے اہداف و مقاصد کیا ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے گذشتہ

چند روز کے دوران قومی اخبارات کے ذریعے سامنے آنے والی بعض رپورٹوں اور خبروں پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

- ۳۰ ستمبر کو شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی کی طرف سے کرائے جانے والے ایک عالمی سروے کے مطابق دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ اپنے سب سے بڑے ہدف "القاعدہ" کو کمزور کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ ۳۰ میں سے ۲۲ ممالک کے افراد کے مطابق اوسطاً ۲۲ فی صد رائے دہندگان کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی وجہ سے القاعدہ تنظیم کمزور ہوئی ہے جبکہ سروے میں شریک ۵ سے ۳ رائے دہندگان کہتے ہیں کہ اس جنگ کا القاعدہ پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ القاعدہ اس جنگ سے مضبوط ہوئی ہے۔
- ۳۰ ستمبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے لاہور کے ایوان صنعت و تجارت کے کاروباری افراد سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقاتِ عامہ کی جنگ ہار چکے ہیں اور وہاں امریکہ کا پیغام نہیں پہنچا سکے۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ کے متاثرہ علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈالر سالانہ دے رہا ہے لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی بجائے درآمدی بلوں کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔
- ۵ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق عالمی امدادی ادارے ریڈ کراس کے ترجمان مارکوسی نے اسلام آباد میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کو دنیا کا نیا "وار زون" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قبائلی علاقے مکمل میدانِ جنگ بن چکے ہیں، پاکستانی فوج طالبان کے خلاف برسرِپیکار ہے، بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں، فورسز کی بمباری اور جنگجوؤں کے خوف سے اڑھائی لاکھ افراد نقل مکانی کر گئے ہیں اور کئی ہزار افغانستان میں داخل ہونے کے منتظر ہیں، ہزاروں افراد پناہ گزین کیمپوں میں پڑے ہیں اور وادیٔ سوات جہنم میں تبدیل ہو چکی ہے۔
- ۵ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر کے مطابق عراق میں امریکی فوج کے کمانڈر جنرل پیٹریوسی نے کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گردوں سے نمٹنے اور بہتر نتائج حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بغداد میں غیر ملکی میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنٹرول ختم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عراق میں حاصل ہونے والے تجربے کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے تھا لیکن ہر جگہ صورتحال مختلف ہوتی ہے۔
- یکم اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق افغانستان کیلئے یورپی یونین کے سابق اعلیٰ سفارتکار فرانسس

فشال نے عالمی برادری پر زور دیا ہے کہ وہ افغانستان میں تباہی و بربادی سے بچنے کیلئے حکمت عملی پر نظر ثانی کرے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کو مزید تباہی و بربادی سے بچانا وقت کی اہم ضرورت ہے اس لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری افغانستان میں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی سرگرمیوں اور حکمتِ عملی میں تبدیلی لائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں اتحادی افواج کی کاروائیوں کے دوران شہریوں کی ہلاکت کے باعث عوامی غم و غصہ میں اضافہ ہوا ہے جس کے انتہائی منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

- ۴ اکتوبر کو روزنامہ پاکستان میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق مغربی ملکوں کے تمام انٹیلی جنس اداروں کے اہل کار کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک اگلے ۷ برسوں میں بھی افغانستان کو زیر نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ القاعدہ اور اس سے وابستہ لوگ اب بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنے نائن الیون پر حملہ کے وقت تھے۔
- ۶ اکتوبر کو روزنامہ پاکستان نے یہ خبر شائع کی ہے کہ افغانستان میں برطانوی کمانڈر بریگیڈیئر مازک اسمتھ نے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان میں فیصلہ کن فتح ممکن نہیں اس لیے برطانیہ کو طالبان کے ساتھ ممکنہ ڈیل کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز کو دیے گئے انٹرویو میں کمانڈر مازک اسمتھ نے کہا ہے کہ افغانستان میں برطانیہ کا جنگ جیتنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بارے میں عوام کو اپنی توقعات میں کمی کرنا ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں عسکریت پسندی کی سطح کو کم کرنے کیلئے اقدامات کرنا ہوں گے، یہ کام افغان فوج کے ذریعے کیا جا سکتا ہے اور طالبان سے مذاکرات کر کے مسئلہ کا سیاسی حل نکالا جا سکتا ہے۔

گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران شائع ہونے والی بیسیوں خبروں اور رپورٹوں میں سے ان چند خبروں کا ہم نے بطور مثال حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں امریکہ اور اتحادیوں نے گذشتہ ۷ برس میں کیا کچھ حاصل کیا ہے اور مستقبل قریب میں مزید کیا کچھ حاصل ہونے کے امکانات نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس جنگ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ برآمد ہونے والا نہیں تھا اور ہم جنگ کے آغاز میں ہی اس خیال کا اظہار اس کالم میں کر چکے ہیں، اس لیے کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مغالطوں اور فریب کاری پر تھی۔ مغالطوں اور فریب کاری کی اساس پر لڑی جانے والی جنگوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

- دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ دہشت گردی کا کوئی واضح مفہوم اور مصداق طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے۔ کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دینے اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے کیلئے کوئی اصول اور ضابطہ موجود نہیں، بلکہ یہ اختیار اتحادی افواج اور ان کے قائد امریکہ کے پاس ہے کہ وہ جس کو چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف عسکری یلغار کر دیں۔ اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی کہتے ہیں کہ طالبان اور القاعدہ دہشت گرد ہیں اس لیے ان کے خلاف جنگ ضروری ہے جبکہ طالبان اور القاعدہ کا کہنا

ہے کہ وہ افغانستان اور مڈل ایسٹ میں غیر ملکی مداخلت اور غیر ملکی افواج کی موجودگی کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان دونوں کا موقف سن کر غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا فورم دنیا میں موجود نہیں جس پر دونوں فریق اعتماد کرتے ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں سے ہی لڑی جائے گی اور وہی غالب ہوگا جو طاقت اور ہتھیاروں سے دوسرے کو شکست دے گا۔

- امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا ہے اور دنیا کو بھی مسلسل وہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ القاعدہ اور طالبان صرف دو طبقے ہیں جن کو زیر کرنے سے معاملہ حل ہو جائے گا۔ جبکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہ صرف دو طبقے نہیں بلکہ افغان اور عرب عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کو زیر کرنے میں آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی اور نہ ہی آئندہ کبھی اس کا امکان موجود ہے۔
- امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کو غلط طور پر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دہشت گردی محض غربت اور جہالت کی وجہ سے ہے اس لیے اگر مغربی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کر دیا جائے اور چار پیسے دے دیے جائیں تو فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ جبکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ جسے دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے وہ دراصل امریکہ اور مغربی اقوام کی ان مسلسل زیادتیوں، ناانصافیوں اور مظالم کا ردعمل ہے جو وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بالعموم اور فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے خلاف بالخصوص طویل عرصے سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک ان زیادتیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں ہوگا ان کے ردعمل کو روکنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت اسامہ بن لادن کو بتایا جاتا ہے جبکہ وہ اور ان کے گروپ کے افراد نہ غریب ہیں اور نہ ہی ان پڑھ ہیں۔

اس پس منظر میں ۱۸ اکتوبر کو عوام کے منتخب نمائندے اسلام آباد میں صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے جمع ہو رہے ہیں تو ہم اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بالآخر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس اہم ترین قومی مسئلہ پر باہمی تبادلۂ خیالات کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ گزارش بھی کرنا چاہیں گے کہ بلاشبہ پاکستان میں امن و امان کے حوالے سے ہمارے لیے دو بڑے چیلنج ہیں:

1. ایک یہ کہ وطن عزیز کی سرحدوں میں بیرونی مداخلت و حملوں کو روکنے اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔
2. اور دوسرا یہ کہ ملک کے اندر خودکش حملوں میں مسلسل اضافہ اور ان میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کی ہلاکتوں کا کیسے سدباب کیا جا سکتا ہے؟

ہم پاکستان کی سرحدوں کے اندر بیرونی حملوں اور اندرون ملک خودکش حملوں کی یکساں مذمت کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ہیں۔ البتہ یہ درخواست ہم ضرور کریں گے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی اور عالمی تناظر کو بھی سامنے رکھیں اور صورتحال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ملک میں امن و امان کی بحالی، قومی خودمختاری کے تحفظ اور ملکی وقار کیلئے کوئی ٹھوس حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو، آمین یا رب العالمین۔

"دہشت گردی" کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۸ء

صدر مملکت نے وزیراعظم کی ایڈوائس پر پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ۸ اکتوبر کو طلب کر لیا ہے جس میں حساس اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہان پارلیمنٹ کے ارکان کو بریفنگ دیں گے۔ اجلاس میں امن و امان کی صورت حال پر تفصیلی بحث کی جائے گی اور حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ صدر اور وزیراعظم کا یہ اقدام موجودہ حالات میں یقیناً خوش آئند ہے اور اس سے جہاں عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومتی اقدامات اور پالیسیوں کے بارے میں تفصیلات جاننے کا موقع ملے گا، وہاں حکومت کے ذمہ دار حضرات بھی عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کے جذبات اور تاثرات سے مزید آگاہی حاصل کریں گے۔

ملک میں امن وامان کی صورتحال کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ "دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ" کے عنوان سے سرفہرست ہے اور اس جنگ کا پھیلاؤ جوں جوں بڑھتا جارہا ہے، عوام کے اضطراب میں اضافے کے ساتھ ساتھ قومی خودمختاری اور ملکی سالمیت کے بارے میں سوالات میں بھی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ دہشت گردی کیا ہے اور اس کے خلاف جنگ کے اہداف و مقاصد کیا ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے گذشتہ چندروز میں قومی اخبارات کے ذریعے سامنے آنے والی بعض رپورٹوں اور خبروں پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- ۳۰ ستمبر کو شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی کی طرف سے کرائے جانے والے ایک عالمی سروے کے مطابق دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ اپنے سب سے بڑے ہدف "القاعدہ" کو کمزور کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ تیس میں سے بائیس ممالک کے افراد کے مطابق اوسطاً بائیس فی صد رائے دہندگان کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی وجہ سے القاعدہ تنظیم کمزور ہوئی ہے، جبکہ سروے میں شریک ہر پانچ میں سے تین رائے دہندگان

کہتے ہیں کہ اس جنگ کا القاعدہ پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ القاعدہ اس جنگ سے مضبوط ہوئی ہے۔

- ۳۰ ستمبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کی سفیر محترمہ این ڈبلیو پیٹرسن نے لاہور کے ایوان صنعت و تجارت کے کاروباری افراد سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقات عامہ کی جنگ ہار چکے ہیں اور امریکی پیغام نہیں پہنچا سکے۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ کے متاثرہ علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈالر سالانہ دے رہا ہے، لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی بجائے درآمدی بل کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔
- ۵ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق عالمی امدادی ادارے ''ریڈ کراس'' کے ترجمان مارکوسی نے اسلام آباد میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کو دنیا کا نیا ''وار زون'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قبائلی علاقے مکمل میدان جنگ بن چکے ہیں، پاکستانی فوج طالبان کے خلاف برسرپیکار ہے، بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں، فورسز کی بمباری اور جنگجوؤں کے خوف سے اڑھائی لاکھ افراد نقل مکانی کر گئے ہیں، اور کئی ہزار افغانستان میں داخل ہونے کے منتظر ہیں، ہزاروں افراد پناہ گزین کیمپوں میں پڑے ہیں اور وادی سوات جہنم میں تبدیل ہو چکی ہے۔
- ۵ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر کے مطابق عراق میں امریکی فوج کے کمانڈر جنرل پیٹریوس نے کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گردوں سے نمٹنے اور بہتر نتائج حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بغداد میں غیر ملکی میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنٹرول ختم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عراق میں حاصل ہونے والے تجربہ کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے تھا، لیکن ہر جگہ صورت حال مختلف ہوتی ہے۔
- یکم اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق افغانستان کیلئے یورپی یونین کے سابق اعلیٰ سفارت کار فرانسس منشال نے عالمی برادری پر زور دیا ہے کہ وہ افغانستان میں تباہی و بربادی سے بچنے کیلئے حکمت عملی پر نظر ثانی کرے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کو مزید تباہی و بربادی سے بچانا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری افغانستان میں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی سرگرمیوں اور حکمت عملی میں تبدیلی لائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں اتحادی افواج کی کارروائیوں کے دوران شہریوں کی ہلاکت کے باعث عوامی غم و غصہ میں اضافہ ہوا ہے جس کے انتہائی منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

- ۴ اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق مغربی ملکوں کے تمام انٹیلی جنس اداروں کے اہل کار کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک اگلے سات برسوں میں بھی افغانستان کو زیر نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ القاعدہ اور اس سے وابستہ لوگ اب بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنے نائن الیون کے حملوں کے وقت تھے۔
- ۶ اکتوبر کو روزنامہ پاکستان نے یہ خبر شائع کی ہے کہ افغانستان میں برطانوی کمانڈر بریگیڈیئر مازک اسمتھ نے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان میں فیصلہ کن فتح ممکن نہیں ہے، اس لیے برطانیہ کو طالبان کے ساتھ ممکنہ ڈیل کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ برطانوی اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کو دیے گئے انٹرویو میں کمانڈر مازک اسمتھ نے کہا ہے کہ افغانستان میں برطانیہ کا جنگ جیتنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بارے میں عوام کو اپنی توقعات میں کمی کرنی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں عسکریت پسندی کی سطح کو کم کرنے کیلئے اقدامات کرنا ہوں گے۔ یہ کام افغان فوج کے ذریعے کیا جا سکتا ہے اور طالبان سے مذاکرات کر کے مسئلے کا سیاسی حل نکالا جاسکتا ہے۔

گذشتہ ایک ہفتے کے دوران شائع ہونے والی بیسیوں خبروں اور رپورٹوں میں سے ان چند خبروں کا ہم نے بطور مثال حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے گذشتہ سات برس میں کیا کچھ حاصل کیا ہے اور مستقبل قریب میں مزید کیا کچھ حاصل ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس جنگ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ برآمد ہونے والا نہیں تھا اور ہم جنگ کے آغاز میں ہی اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں، اس لیے کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مغالطوں اور فریب کاری پر تھی اور مغالطوں اور فریب کاری کی اساس پر لڑی جانے والی جنگوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

- دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ دہشت گردی کا کوئی واضح مفہوم اور مصداق طے کیے بغیر لڑی جارہی ہے، کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دینے اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے کیلئے کوئی اصول اور ضابطہ موجود نہیں ہے اور یہ اختیار اتحادی افواج اور ان کے قائد امریکہ کے پاس ہے کہ وہ جس کو چاہیں، دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف عسکری یلغار کر دیں۔ اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی کہتے ہیں کہ طالبان اور القاعدہ دہشت گرد ہیں، اس لیے ان کے خلاف جنگ ضروری ہے جبکہ طالبان اور القاعدہ کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان اور مڈل ایسٹ میں غیر ملکی مداخلت اور غیر ملکی افواج کی موجودگی کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان دونوں کے موقف سن کر غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا فورم دنیا میں موجود نہیں ہے جس پر دونوں فریق اعتماد کرتے ہوں، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں سے ہی لڑی جائے گی اور وہی غالب ہوگا جو طاقت اور ہتھیار سے دوسرے کو شکست دے گا۔

- امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا ہے اور دنیا کو بھی مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ القاعدہ اور طالبان صرف دو طبقے یا گروہ ہیں جن کو زیر کرنے سے معاملہ حل ہو جائے گا، جب کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہ صرف دو طبقے نہیں بلکہ افغان اور عرب عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کو زیر کرنے میں آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی اور نہ ہی آئندہ کبھی اس کا امکان موجود ہے۔
- امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کو غلط طور پر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دہشت گردی غربت اور جہالت کی وجہ سے ہے، اس لیے اگر مغربی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کر دیا جائے اور چار پیسے دے دیے جائیں تو فتح حاصل ہو سکتی ہے، جب کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ جسے دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے، وہ دراصل امریکہ اور مغربی اقوام کی ان مسلسل زیادتیوں، ناانصافیوں اور مظالم کا ردعمل ہے جو وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بالعموم اور فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے خلاف بالخصوص طویل عرصہ سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک ان زیادتیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں ہو گا، ان کے ردعمل کو روکنا بھی ممکن نہیں ہو گا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت اسامہ بن لادن کو بتایا جاتا ہے اور وہ اور اس کے گروپ کے افراد نہ غریب ہیں اور نہ ہی ان پڑھ ہیں۔

اس پس منظر میں ۸ اکتوبر کو عوام کے منتخب نمائندے اسلام آباد میں صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے جمع ہو رہے ہیں تو ہم اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بالآخر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس اہم ترین قومی مسئلہ پر باہمی تبادلہ خیالات کریں، لیکن اس کے ساتھ ہم یہ گزارش بھی کرنا چاہیں گے کہ بلاشبہ پاکستان میں امن و امان کے حوالے سے ہمارے لیے دو بڑے چیلنج ہیں: ایک یہ کہ وطن عزیز کی سرحدوں میں بیرونی مداخلت اور حملوں کو روکنے اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ملک کے اندر خودکش حملوں میں اضافہ اور ان میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کا کیسے سدباب کیا جا سکتا ہے؟ ہم پاکستان کی سرحدوں کے اندر بیرونی حملوں اور اندرون ملک خودکش حملوں کی یکساں مذمت کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ہیں، البتہ یہ درخواست ہم ضرور کریں گے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی اور عالمی تناظر کو بھی سامنے رکھیں اور صورتحال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ملک میں امن و امان کی بحالی، قومی خود مختاری کے تحفظ اور ملکی وقار کیلئے کوئی ٹھوس حکمت عملی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

مذکورہ گزارشات راقم الحروف نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے قبل روزنامہ پاکستان میں اپنے کالم کے ذریعے پیش کیں جو ۷ اکتوبر کو شائع ہوئیں، جبکہ اس کے بعد اجلاس کے دوران جیو ٹی وی کے معروف پروگرام ”کیپٹل ٹاک“ کی

دو نشستوں میں مجھے پروفیسر عبدالجبار شاکر، مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی اور مولانا امین شہیدی کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ ان نشستوں میں راقم الحروف نے مختلف سوالات کے جواب میں جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔

سوال: خودکش حملوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: خودکش حملہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو مظلوم قومیں ہمیشہ سے استعمال کرتی آ رہی ہیں۔ یہ ہتھیار جاپانیوں نے بھی استعمال کیا تھا، جنگ عظیم میں برطانیہ نے بھی استعمال کیا تھا اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک فوج نے بھی چونڈہ کے محاذ پر استعمال کیا تھا۔ دوسرے جنگی ہتھیاروں کی طرح یہ بھی میدان جنگ میں استعمال ہو تو جائز ہے، لیکن پرامن ماحول میں اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔

سوال: پاکستان میں خودکش حملوں کے بارے میں علماء کا فتویٰ شائع ہوا ہے کہ یہ حرام ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں خودکش حملوں کو ناجائز کہنے والوں میں خود میں بھی شامل ہوں، اس لیے کہ پاکستان اس حوالے سے نظریاتی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے کہ پاکستان کا دستور قرارداد مقاصد کو اپنی بنیاد قرار دیتا ہے، قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہے، اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے، قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی سے پارلیمنٹ کو روکتا ہے اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ کا وعدہ کرتا ہے، اس لیے جب تک یہ دستوری پوزیشن موجود ہے، پاکستان عملی طور پر کچھ بھی ہو، مگر نظریاتی طور پر بہرحال ایک اسلامی ریاست ہے اور اسلامی ریاست میں حکومت کے خلاف کسی بھی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے۔

سوال: قبائلی علاقہ میں جو فوجی آپریشن اور خودکش حملے ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: اس وقت پاکستان کی مغربی سرحد پر جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ہمارے خیال میں تین قسم کے عناصر ملوث ہیں: وہ انتہا پسند اور جذباتی مسلمان بھی ان میں شامل ہیں جو نفاذ شریعت کے سلسلے میں حکومت کے مسلسل منفی طرز عمل کے باعث ردعمل کا شکار ہو کر ایسا کر رہے ہیں۔ ان کے طریق کار سے ہمیں اختلاف ہے، لیکن ان کا یہ موقف بہرحال درست ہے کہ ملک بھر میں اور خاص طور پر قبائلی علاقوں میں شرعی نظام نافذ کیا جائے۔ دوسرے نمبر پر ان واقعات میں بین الاقوامی محرکات کارفرما ہیں اور مختلف قوتیں اس میں ملوث ہو کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان میں امریکہ، اسرائیل اور بھارت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور تیسرے نمبر پر بہت سے جرائم پیشہ لوگ بھی اس فضا کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد پورا کرنے کیلئے اس میں شامل ہو گئے ہیں جیسا کہ ایسے مواقع پر اس طرح ہوتا ہے، اس لیے اس مبینہ دہشت گردی پر قابو پانے کیلئے ان تمام عناصر کو سامنے رکھ کر صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ہوگا، ورنہ حالات کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

سوال: علمائے کرام اور آپ حضرات اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: ہم اس صورتحال میں ان ناراض حضرات سے بات کرنے کیلئے تیار ہیں جو نفاذ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی منت کریں گے اور ان کو پوری طرح سمجھانے کی کوشش کریں گے، لیکن اس کیلئے پیشگی طور پر ضروری

ہے کہ حکومت بھی اس سلسلے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرے اور اس کا ثبوت دے اور میرے نزدیک اس سنجیدگی کا ثبوت دو صورتوں میں ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ پارلیمنٹ کی سطح پر فیصلہ کیا جائے کہ قبائلی علاقوں کا مسئلہ فوجی آپریشن کی بجائے مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے گا، اور دوسرا یہ کہ سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کیلئے جس "شرعی نظامِ عدل ریگولیشن" کے نفاذ کا حکومت اس علاقے کے لوگوں سے بار بار وعدہ کر رہی ہے اور اس کا کئی بار اعلان ہو چکا ہے، حکومت علامت کے طور پر وہاں کے لوگوں کو اعتماد میں لے کر وہ شرعی نظام عدل ریگولیشن نافذ کر دے۔ جب حکومت یہ دو کام پیشگی کر لے گی تو باقی ماندہ امور کیلئے ہم وہاں جانے اور کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہوں گے۔

اس پس منظر میں پارلیمنٹ نے "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے سلسلے میں مختلف اداروں کی طرف سے دی جانے والی بریفنگ اور اس پر کئی روز کے بحث و مباحثہ کے بعد جو قرارداد متفقہ طور پر منظور کی ہے، وہ کئی حوالوں سے ہمارے لیے اطمینان بخش ہے۔ مثلاً یہ کہ:

- قوم کے منتخب نمائندوں کو اعتماد میں لیا گیا ہے اور انہیں پالیسی سازی میں اصولی طور پر شریک کیا گیا ہے۔
- پارلیمنٹ نے قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کے تحفظ کو اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حکمت عملی اور سٹریٹجی پر نظر ثانی اور اس کی از سر نو تشکیل کو ضروری قرار دیا ہے۔
- ملٹری آپریشن پر مذاکرات کو ترجیح دیتے ہوئے متعلقہ فریقوں سے مذاکرات کیلئے کہا گیا ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق پارلیمنٹ کے ارکان کی بریفنگ اور متفقہ قرارداد کو متوازن بنانے کیلئے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے راہ نماؤں ار جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن نے مؤثر کردار ادا کیا ہے جس کیلئے وہ پوری پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر بھی تشکر و تبریک کے مستحق ہیں اور ہم اس متفقہ قرارداد پر پارلیمنٹ کی تمام جماعتوں کو مبارک بار پیش کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں پارلیمنٹ کی اس متفقہ قرارداد سے "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے حوالے سے پوری قوم کے جذبات واحساسات کی عکاسی ہوئی ہے اور مجموعی طور پر قوم کا موقف دنیا کے سامنے آ گیا ہے، لیکن یہ بہر حال قرارداد ہے جس کو عمل کے دائرے میں لانے کیلئے حکومتی کیمپ اور حکومت کی ترجیحات اور رجحانات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں اور پوری قوم کی نظریں اب حکومت پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کی قرارداد پر عملدرآمد کیلئے کیا اقدامات کرتی ہے اور عوام کے منتخب نمائندوں کا یہ موقف پاکستان کی خود مختاری، سرحدوں کے تقدس، مکمل سالمیت اور امن و امان کے حوالے سے صورتحال کو بہتری کی طرف لے جانے میں کس قدر مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ پاکستان کے حکمران اس نازک مرحلے میں ملک و قوم کی بہتری اور وقار و استحکام کیلئے مؤثر کردار ادا کریں اور وطن عزیز کو اس دلدل سے باعزت طور پر باہر نکالنے میں کامیاب ہوں۔ آمین یارب العالمین۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کا فیصلہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۸ء

پارلیمنٹ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے متعلقہ اداروں کی طرف سے دی جانے والی بریفنگ اور اس پر بحث و مباحثہ کے بعد جو قرارداد متفقہ طور پر منظور کی ہے اس میں جمعیت علماء اسلام پاکستان اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ ترمیم بھی شامل کر لی گئی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف پالیسی کا از سرِ نو جائزہ لے کر قومی سلامتی کیلئے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی، نیز عسکریت اور انتہا پسندی سے نمٹنے کیلئے مذاکرات پہلی ترجیح ہوں گے۔

دہشت گردوں کے خلاف جنگ کے عنوان سے اب تک جو کاروائیاں ہو رہی ہیں ان پر اس حوالے سے ملک بھر میں پریشانی اور اضطراب بڑھتا جا رہا ہے کہ:

- ان کاروائیوں پر بیرونی ایجنڈا حاوی ہے،
- اس میں ملک و قوم کے مفادات، قومی رائے عامہ اور عوام کے جذبات و احساسات کا لحاظ نہیں رکھا جا رہا،
- اور ملک بین الاقوامی طاقتوں کے مفادات کی اس دلدل میں مزید دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اس لیے ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کا مسلسل یہ مطالبہ چلا آ رہا ہے کہ اس پالیسی کا قومی مفادات اور عوامی جذبات کے پیش نظر از سر نو جائزہ لیا جائے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ پارلیمنٹ نے اس سے اتفاق کر لیا ہے اور دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا از سر نو جائزہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، ہم اس پر پارلیمنٹ کے تمام ارکان، حکومتی اتحاد اور خاص طور پر جمعیت علماء اسلام اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائدین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے مطابق ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کا نئے سرے سے جائزہ لے کر قومی مفادات اور عوامی جذبات کے مطابق مضبوط، دوٹوک اور باوقار پالیسی اختیار کی جائے گی۔

پارلیمنٹ کے اجلاس کے موقع پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر سمیت مختلف مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی طرف سے ایک اعلامیہ ارکان پارلیمنٹ کو بھجوایا گیا تھا۔ جبکہ پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے بھی ایک عرضداشت ارکان پارلیمنٹ کی خدمت میں پیش کی تھی جو اسی شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ یہ تحریر اس مسئلہ پر قومی اور دینی حلقوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اس لیے ہم اسے اس تمہید کے ساتھ ”حالات و واقعات“ کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

علماء کرام کی ارکانِ پارلیمنٹ سے دردمندانہ اپیل

الحمد للہ رب العالمین، والصلٰوۃ والسلام علی سیدنا وشفیعنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین، ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، امابعد۔

معزز ارکان پارلیمنٹ اسلامی جمہوریہ پاکستان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان جس نازک صورتحال سے دوچار ہے اور پوری قوم جس تشویش، بے چینی اور فکر میں مبتلا ہے، وہ اہل نظر پر پوشیدہ نہیں۔ بحمد اللہ قومی اسمبلی سینیٹ کے منتخب ممبران اور حکومت کے سرکردہ افراد پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اس نازک صورتحال پر غور کرنے کیلئے جمع ہیں، اس اہم موقع پر ہم اپنی قومی اور شرعی ذمہ داری سمجھتے ہوئے آپ کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کررہے ہیں تاکہ امن وامان کی سنگین صورتحال اور ملک کے موجودہ بحران کے حقیقی اسباب اور حکومتی اقدامات اور خارجی و قومی پالیسیوں کا تنقیدی جائزہ لے کر پارلیمنٹ ملک کو موجودہ بھنور سے نکالنے کیلئے صحیح اور ٹھوس فیصلے کرسکے۔ ہمارے خیال میں اگر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ صوبہ سرحد قبائلی علاقوں اور سوات وغیرہ کے بگڑے ہوئے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کے عوام و خواص درج ذیل طبقات میں منقسم نظر آتے ہیں:

- (الف) مسلمانوں کی بھاری اکثریت جو ہمیشہ پرامن رہی ہے اور اب بھی پرامن اور وطن کی محبت سے سرشار ہے، یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہے اور دشمن کیلئے ہمیشہ ناقابل تسخیر رہی ہے اور علاقے کے علمائے کرام ان میں سرفہرست ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قبائل اپنی قدیم روایات کے تحفظ کو بھی اپنی قومی غیرت وحمیت کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کی بنسبت نماز، روزہ اور ستر وحجاب وغیرہ دینی معاملات کے زیادہ پابند اور ان کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی حکومت دین یا اہل دین کا مذاق اڑائے، یا دین اور اہل دین کو رسوا کرنے یا ان کی قدیم روایات کو پامال کرکے ان پر غیر ملکی حکمرانوں، یا غیر ملکی نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش کرے تو وہ پرامن ہونے کے باوجود اس سے سخت نفرت کرتے ہیں اور غیر ملکی افواج یا غیر اسلامی نظریات کا تسلط ان کیلئے کسی حالت میں قابلِ برداشت نہیں۔ اس وقت وہاں جو بمباری ہورہی ہے، یا تشدد کو روکنے کیلئے جو فوجی آپریشن جاری ہے، اس کا زیادہ تر نقصان اسی مظلوم اور پرامن اکثریت کو پہنچ رہا ہے، جس میں بے گناہ جوان، بوڑھے، عورتیں اور معصوم بچے لقمہ اجل بن رہے ہیں۔
- (ب) محب وطن مسلمانوں کی اس بھاری اکثریت میں بہت سے مخلص مگر مشتعل نوجوان ایسے بھی ہیں جو جامعہ حفصہ اور اپنے علاقوں میں مظلوم مسلمانوں کی شہادت پر اور حکومت کی خلافِ اسلام اور نامعقول

افغان پالیسی پر غم وغصے اور انتقام کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے علماء کرام کے منع کرنے کے باوجود اپنے دینی اخلاص اور علاقائی غیرت کی بنا پر یا اپنے پیارے عزیزوں کی لاشیں دیکھ کر ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور خودکش حملوں کا پاکستان کے اندر ہی وہ راستہ اختیار کر لیا ہے جو حد درجہ خطرناک ہے، حالانکہ علمائے کرام ایسے حملوں کو پہلے ہی حرام قرار دے چکے ہیں جن کا بے گناہ لوگ نشانہ بن جائیں، لیکن مذکورہ بالا اشتعال انگیز اسباب کی بنا پر یہ بپھرے ہوئے نوجوان انتقام کی پیاس کو ایک دوسرے کے خون سے بجھا رہے ہیں۔

- (ج) جب کسی علاقے میں افراتفری، بمباری اور خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے تو سماج دشمن عناصر مثلاً چوروں، ڈاکوؤں کی بن آتی ہے، کبھی وہ اپنے مذموم عزائم کی خاطر غیر ملکی افواج سے مل جاتے ہیں، کبھی ملکی افواج سے اور کبھی ان نوجوانوں کے ساتھ آکر شریک ہو جاتے ہیں جن کو حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ ملکی حالات کی خرابی میں وہاں کے باخبر علمائے کرام اور بااثر حضرات کے بیان کے مطابق ایسے عناصر کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔
- (د) امریکی افواج اپنی معاون نیٹو افواج نیز بھارتی ایجنسیوں کے ساتھ گذشتہ سات سال سے افغانستان پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، اب ان کے اپنے کمانڈروں اور سفارت کاروں نے ان کوششوں کی ناکامی کا مختلف بیانات کے ذریعے اقرار کر لیا ہے۔ ان غیر ملکی افواج نے کھلی آنکھوں نظر آنے والی شرمناک شکست کو فتح یا باعزت پسپائی میں بدلنے کیلئے آخری کوشش یہ کی ہے کہ انہوں نے اپنے ایجنٹوں کو اسلحہ، ڈالر اور افغانی اور پاکستانی کرنسی دے کر ہمارے قبائلی علاقوں میں گھسا دیا ہے اور یہ مصدقہ اطلاعات ہیں کہ جب کچھ ایجنٹ پکڑے گئے یا ان کی لاشیں ملیں تو ان میں سے کئی غیر پختون تھے جو اُن کے غیر مسلم ہونے کی واضح علامت ہے۔ یہ لوگ طالبان کے بھیس میں پاکستانی افواج سے لڑ رہے ہیں اور ان علاقوں میں افراتفری پیدا کرنے کیلئے داخل ہوئے ہیں۔ ایسے ایجنٹوں کی تعداد اب روز بروز بڑھ رہی ہے حتیٰ کہ بعض قبائلی علاقوں کے علماء نے یہ بتایا ہے کہ اب ہمیں اپنے علاقوں میں وہ چہرے بکثرت نظر آ رہے ہیں جنہیں ہم نے ساری زندگی کبھی نہیں دیکھا۔ یہ امریکی و بھارتی ایجنٹ اصل طالبان کو بدنام کرنے کیلئے طالبان کے روپ میں علاقے اور پاکستان کے شہروں میں بھی بم دھماکوں سے بربادی پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔

اگر مذکورہ ساری صورتحال سامنے رکھی جائے تو صاف واضح ہو گا کہ آزاد قبائل کے محب وطن اور پرامن مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس وقت سب سے زیادہ متاثر ہے۔ غیر ملکی افواج کی طرف سے بغیر پائلٹ طیاروں کی بمباری ہو، ان کے میزائلوں کی بارش ہو، یا پاکستانی مسلح فورسز کی کارروائیاں ہوں، ان کا زیادہ تر نشانہ بے گناہ مسلمان بن رہے ہیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرنے والے نوجوان جو کم تعداد میں ہیں وہ تو ویسے ہی اپنا خون دینے کیلئے

تیار ہیں، جبکہ جرائم پیشہ طبقات اور غیر ملکی ایجنٹ اپنے اثر ورسوخ، سازشوں اور غیر ملکی پشت پناہی کی وجہ سے محفوظ رہتے ہیں اور سارا نزلہ عام مسلمان پر گر رہا ہے۔ اس پیچیدہ صورتحال کا ہمارے نزدیک اس کے سوا کوئی علاج نہیں ہے کہ:

1. بمباری، میزائلوں کی بارش اور اندھا دھند فوجی کارروائیاں فوری طور پر بند کی جائیں۔
2. ہر علاقے کے مقامی علماء، دین دار حضرات اور محب وطن عمائدین کو ساتھ ملا کر جرائم پیشہ اور ملک دشمن عناصر اور غیر ملکی ایجنٹوں کو پکڑا جائے اور ان کو سرعام عبرتناک سزائیں دی جائیں۔
3. محب وطن اور پر امن باشندگانِ ملک اور ہتھیار اٹھانے والے نوجوانوں کے جو جائز مطالبات ہیں انہیں فوری طور پر خلوص دل سے اس طرح پورا کیا جائے کہ لوگوں کو یہ اطمینان ہو کہ حکومت یہ کام محض وقت گزاری کیلئے نہیں کر رہی بلکہ پوری سنجیدگی سے یہاں انصاف مہیا کر کے امن و امان قائم کرنے میں مخلص ہے۔
4. اندرون ملک ہر طرح کی خلافِ اسلام پالیسیوں اور اقدامات کا سلسلہ بند کیا جائے۔
5. غیر ملکی طاقتوں کی اطاعت و فرمانبرداری کا رویہ ختم کر کے محب وطن عوام کو ساتھ ملایا جائے اور ان کے تمام جائز مطالبات کو امکانی حد تک پورا کیا جائے۔
6. موجودہ خارجہ پالیسی اور خصوصاً امریکا کے ساتھ کیے جانے والے "تعاون بر خلاف دہشت گردی" کے پر فریب اور شرمناک معاہدے سے جان چھڑانے کا محتاط راستہ جلد از جلد نکالا جائے، جو درحقیقت اپنی ہی سلامتی کا راستہ ہے۔
7. عدلیہ کو آزاد اور بحال کیا جائے کیونکہ فوری انصاف کی فراہمی اور آزاد عدلیہ کے بغیر امن و امان کا قیام ممکن نہیں۔

آخر میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور معاشی بدحالی کے موجودہ طوفان کے مختلف اسباب ہیں، لیکن چار بڑے سبب یہ ہیں:

بد امنی

جسے ختم کیے بغیر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معاشی استحکام کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بدامنی کے سلسلے میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

کرپشن

کرپشن کی یہ دیمک اس وقت ملک کے بالائی طبقات سے لے کر نچلے طبقات تک سرایت کر چکی ہے۔ امانت و دیانت اور سچائی کے ساتھ سیاسی عمل اور کسب حلال کا تصور کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ان اسلامی اخلاق و اوصاف کا احیا ہر

سطح پر ضروری ہے تاکہ کرپشن کا خاتمہ کیا جاسکے اور اس کیلئے ہر سطح پر قانون کی عملداری، دیانتدار انتظامیہ اور آزاد عدلیہ کے ذریعے ہی ناگزیر ہے۔

عیاشانہ طرز زندگی

پاکستان کے بالائی طبقات جس فضول خرچی اور پر تعیش زندگی کے عادی ہوگئے ہیں اس کے واقعات عوام کی زبانوں پر ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ مہلک طرز زندگی ختم کر کے ہر سطح پر سادگی کو فروغ دیا جائے اور ملک و قوم کیلئے جو پیسہ بچایا جاسکتا ہے اسے ہر قیمت پر بچایا جائے۔

فحاشی اور عریانی

پاکستان جو اسلامی اقدار و تعلیمات کے تحفظ و فروغ کیلئے قائم کیا گیا تھا، اب یہاں کے معاشرے پر مغرب کی فحاشی اور بے حجابی سیلاب کی طرح حاوی ہوتی جا رہی ہے اور اس کی ظلمت و نحوست سے بھی ہماری معاشی بدحالی کا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پامال کر کے مسلمان پنپ نہیں سکتے، اس لیے اس کا مؤثر تدارک ضروری ہے۔ مغربی دنیا کو سائنسی اور معاشرتی ترقی رقص و سرود اور فحاشی سے نہیں ملی بلکہ محنت اور ہنرمندی سے حاصل ہوئی ہے۔

تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے یہ تجاویز دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں، ان کا کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ امید ہے کہ معزز ارکان پارلیمنٹ کی حیثیت سے آپ حضرات اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے اپنی ذاتی، گروہی اور سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان پر غور فرمائیں گے۔ اللہ جل شانہ ہمیں اپنے محبوب وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی توفیق نصیب کرے، آمین و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

امریکہ سے پاکستانیوں کی نفرت کے اسباب

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۸ء

روزنامہ امت کراچی ۵ نومبر ۲۰۰۸ء کی خبر کے مطابق لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے پرنسپل آفیسر جناب برائن ڈرہنٹ نے رحیم یار خان میں مسلم لیگی راہنما چوہدری جعفر اقبال سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکی انتظامیہ بھارت کی نسبت پاکستان کو عوامی فلاح اور تعمیر و ترقی کیلئے منصوبوں کیلئے کئی گنا زیادہ امداد دیتی ہے لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ پاکستانی امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ پاکستانی عوام کی تعمیر و ترقی اور فلاحی منصوبوں کیلئے ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کی امداد دیتا ہے جبکہ بھارت کو اس مد میں صرف دس ملین ڈالر دیے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بھی امریکہ کی بعض مقتدر شخصیات کا یہ شکوہ مختلف مواقع پر سامنے آچکا ہے کہ ہم پاکستانیوں پر اتنی رقم خرچ کرتے ہیں اس کے باوجود پاکستانی عوام ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ جب سے یورپ اور

امریکہ نے آسمانی تعلیمات اور مذہبی اخلاقیات سے انحراف کرکے مادہ پرستی کو اپنا مطمح نظر بنا رکھا ہے انہیں ہر معاملہ کو روپے پیسے کے پیمانے میں تولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور تاجرانہ ماحول کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اگر اس ماحول کے کسی بیمار شخص سے بیمار پرسی کے طور پر اس کا حال پوچھا جائے تو وہ جواب اسی زبان میں دیتا ہے کہ ”بیس پیسے فرق ہے یا تیس پیسے بیماری باقی رہ گئی ہے“۔ اسی لیے مغرب کی خالص مادہ پرستی اور تاجرانہ ذہنیت کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ اتنی رقوم خرچ کرنے کے باوجود عالم اسلام اور خاص طور پر پاکستان میں انہیں پذیرائی کیوں حاصل نہیں ہو رہی اور عوام ان سے نفرت کیوں کرتے ہیں، ورنہ اگر تاجرانہ اور مفاد پرستانہ ذہن سے ہٹ کر امریکی راہنما معروضی حالات اور زمینی حقائق کے حوالے سے سمجھنا چاہیں تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ امریکی راہنماؤں کو یہ زمینی حقیقت باور کر لینی چاہیے کہ:

1. پاکستانی عوام صرف ڈالر اور پاؤنڈ کے طلبگار نہیں ہیں بلکہ وہ ایک عقیدہ رکھتے ہیں اور ایک زندہ مذہب کے پیروکار ہیں،
2. وہ خود کو ایک آزاد اور خود مختار وطن کے باشندے سمجھتے ہیں اور آزادی اور خود مختاری کے تقاضوں سے باخبر بھی ہیں،
3. وہ اپنے عقیدہ اور ثقافت کے حوالے سے دنیا بھر میں ایک وسیع برادری رکھتے ہیں اور اس کی خوشی اور غمی میں شریک بھی ہوتے ہیں،
4. وہ قومی وقار اور عزت نفس کا ادراک رکھتے ہیں اور اس کے مجروح ہونے پر انہیں ذہنی اذیت اور دلی دکھ ہوتا ہے۔

اس لیے جب وہ کھلی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ:

- ان کے عقیدہ و دین کو مغرب کی طرف سے طعن و تشنیع اور تحقیر و استہزا کا مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے،
- دنیا بھر میں عقیدہ و دین کی بات کرنے والے مسلمانوں کو آزادی بلکہ زندگی کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے،
- پاکستان کی سالمیت، وحدت، قومی خود مختاری اور اس کی سرحدات کا تقدس امریکی اور مغربی مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے،
- امریکہ اور اس کے اتحادی اسرائیل کی ناجائز پشت پناہی کرکے عربوں اور فلسطینیوں کے جائز اور مسلم حقوق پامال کر رہے ہیں اور بیت المقدس پر یہودیوں کے غاصبانہ تسلط کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،
- عراق اور افغانستان میں امریکی اتحادیوں کی لشکر کشی نے لاکھوں بے گناہ شہریوں کا قتل عام کرکے چنگیز خان کی یاد تازہ کر دی ہے،
- جبکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی اتحادیوں کے مسلح حملوں نے تمام بین الاقوامی اصولوں اور اخلاقیات

کو پامال کر دیا ہے۔

تو انہیں امریکہ بہادر کی طرف سے مسلمان حکومتوں کو دیے جانے والے یہ چند سکے اپنے عقیدہ، آزادی، خود مختاری اور عزت نفس کی قیمت دکھائی دیتے ہیں، جس سے ان کی نفرت میں کمی ہونے کی بجائے مزید اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امریکی راہنماؤں کو یہ بات بہت پہلے اس وقت سمجھ لینی چاہیے تھی کہ پاکستان کے ایک سابق صدر فیلڈ مارشل صدر ایوب خان مرحوم نے "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" (آقا نہیں دوست) کے نام سے اپنی سوانح عمری اور یادداشتیں قلمبند کر کے امریکہ کو پاکستانی عوام کی طرف سے یہ واضح پیغام دے دیا تھا کہ پاکستانی عوام امریکہ کو ایک دوست کے طور پر قبول کر سکتے ہیں لیکن اسے آقا کا درجہ دینے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ مگر امریکی حکمران اس واضح حقیقت سے مسلسل آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور پاکستانی عوام کو ڈالر (اور اب میزائل حملوں) کے ذریعے سے دوست بنانے کے چکر میں ہیں، اس لیے انہیں اب بھی امریکہ سے پاکستانی عوام کی بڑھتی ہوئی نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اس صورتحال میں امریکی راہنماؤں کو کسی ماہر نفسیاتی معالج سے اپنا معائنہ کرانے کے سوا اور کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے؟

صدر بارک اوباما کو
امریکی سینیٹر کا حقیقت پسندانہ مشورہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۹ دسمبر ۲۰۰۸ء کی ایک خبر کے مطابق امریکی سینیٹر جان کیری نے کہا ہے کہ مزید فوج بھیجنے سے افغانستان کا مسئلہ حل نہیں ہو گا بلکہ سیکیورٹی کیلئے افغان قوم کے دل و دماغ کو جیتنا لازمی ہے۔ بوسٹن میں ایک خبر رساں ادارے سے بات چیت کے دوران سینیٹر جان کیری نے کہا کہ وہ نو منتخب صدر بارک اوباما کی انتظامیہ کو یہ تجویز دیں گے کہ افغان پولیس کو جدید اسلحہ سے لیس کر کے تربیت دی جائے کیونکہ یہی مسئلہ کا حل ہے۔

امریکہ کے نو منتخب صدر بارک اوباما کے حوالے سے تسلسل کے ساتھ یہ خبریں آ رہی ہیں کہ وہ مسند صدارت سنبھالنے کے بعد افغانستان کو اپنی توجہات کا مرکز بنائیں گے اور افغانستان میں مزید فوجیں بھیج کر بزعم خویش اس جنگ کو جیتنے کیلئے زور لگائیں گے۔ جبکہ اس جنگ میں بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق امریکی اتحاد کو نہ صرف یہ کہ ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ افغانستان میں طالبان کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے اور خود امریکی ماہرین کے خیال میں افغانستان کے ۷۲ فیصد حصے پر طالبان کو بالادستی حاصل ہے، جس کا حل امریکی حکمرانوں کے نزدیک یہ ہے کہ افغانستان میں مزید امریکی فوجیں بھیجی جائیں اور طاقت کے استعمال میں اضافہ کر کے افغان عوام کو زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔

امریکی سینٹ کے رکن مسٹر جان کیری نے اس پس منظر میں یہ بیان دے کر امریکی انتظامیہ کو بروقت انتباہ کیا ہے اور

حقیقت پسندانہ مشورہ دیا ہے کہ اندھا دھند طاقت کے استعمال میں اضافہ کرنے کی بجائے افغان عوام کے دل و دماغ کو جیتنے کی کوشش کی جائے، اس لیے امریکی حکومت کو اپنے ایک معزز سینیٹر کے اس حقیقت پسندانہ مشورہ پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔

باقی رہی افغان عوام کے دل و دماغ کو جیتنے کی بات تو ظاہر ہے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ان کے عقیدہ و ثقافت اور آزادی و خود مختاری کا احترام کرتے ہوئے انہیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنے فیصلے خود کرنے کا موقع دیا جائے، اس کے بغیر غیور افغانوں کے دلوں تک رسائی آخر کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ اور غلط مغربی مفروضے

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۰ جنوری ۲۰۰۹ء

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے، جو محترم پروفیسر خورشید احمد کا ادارہ ہے، ۳۰ دسمبر ۲۰۰۸ء کو قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے طلبہ اور طالبات کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا، محترمہ پروفیسر شبانہ فیاض کی نگرانی میں طلبہ اور طالبات کا ایک بھرپور گروپ شریک محفل تھا۔ انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر جنرل جناب خالد رحمان اس نشست کو کنڈکٹ کر رہے تھے جبکہ مردان سے قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا ڈاکٹر عطاء الرحمان جو رابطۃ المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل ہیں، اور راقم الحروف نے طلبہ و طالبات سے دینی مدارس کے حوالے سے گفتگو کرنا تھی اور ان کے سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ ڈاکٹر عطاء الرحمان نے ”مدرسہ اصلاحات“ کے حوالے سے اب تک ہونے والی پیش رفت، اس سلسلہ میں دینی مدارس کے موقف اور پروگرام کی وضاحت کی اور متعلقہ سوالات کے جواب دیے۔ جبکہ میں نے ”مدرسہ اور دہشت گردی“ کے عنوان سے دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ کے بارے میں مدرسہ کے موقف اور تاثرات پر معروضات پیش کیں جن کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے۔

میرا تعلق دینی مدارس سے ہے، میں نے اپنی ساری تعلیم بارہ تیرہ برس تک دینی مدارس میں حاصل کی ہے، اس کے بعد کم و بیش چالیس برس سے دینی مدارس میں ہی تدریس کی خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے سب سے بڑے وفاق ”وفاق المدارس العربیہ پاکستان“ کی مجلس عاملہ کا رکن ہوں، اس حیثیت سے دہشت گردی کے خلاف موجودہ عالمی جنگ کے بارے میں اپنے جذبات، موقف اور تاثرات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس سلسلہ میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ یہ جنگ دہشت گردی کی کوئی تعریف طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی ذمہ داری تھی اور اس سے تقاضا بھی کیا گیا کہ اس عالمی فورم پر دہشت گردی کی کوئی واضح تعریف متعیّن کر دی جائے تاکہ دہشت گردی اور آزادی کی جنگ میں فرق کیا جا سکے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس طرح کسی قوم، ملک، گروہ یا فرد کو دہشت گرد قرار دینے اور اس پر چڑھ دوڑنے کا اختیار صرف حملہ آور قوتوں کے پاس ہے۔ اس جنگ کے ایک فریق کو یہ

اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں جسے چاہے دہشت گرد قرار دے اور اس کے خلاف مسلح کاروائی کر ڈالے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک اقوامِ متحدہ کے فورم پر دہشت گردی کی کوئی تعریف طے نہیں کی جاتی، یہ جنگ یکطرفہ ہے اور انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ میں یہ بات اب تک نہیں سمجھ پایا کہ روس کے خلاف افغان عوام کی جنگ کو ''جہادِ آزادی'' تسلیم کیا گیا اور ساری دنیا نے اسے سپورٹ کیا، خود میں بھی اس کے حامیوں میں تھا اور روس کے خلاف افغانستان کے جہادِ آزادی کے دوران خود مورچوں میں بھی گیا ہوں، اب بھی اسے افغان عوام کا جہادِ آزادی سمجھتا ہوں، اس کی بنیاد یہ تھی کہ سوویت یونین نے افغانستان میں مسلح افواج اتار کر افغان قوم کی آزادی اور خود مختاری کو سلب کر لیا تھا حالانکہ وہ اس وقت افغانستان کی ایک تسلیم شدہ حکومت کی دعوت پر آیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر افغانستان میں روسی افواج کی آمد کے خلاف افغان عوام کو مسلح مزاحمت کا حق حاصل تھا اور اس حق کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے تو مڈل ایسٹ، عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج کی آمد اور تسلط کے خلاف ان ملکوں کے عوام کو مسلح مزاحمت کا حق کیوں نہیں ہے اور اسے دہشت گردی کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ میں افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد، اور مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد کے درمیان فرق نہیں سمجھ سکا۔ اور اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہوں کہ اگر روسی فوجوں کے خلاف مسلح مزاحمت جہادِ آزادی تھا تو امریکی فوجوں کے خلاف مسلح مزاحمت جہادِ آزادی کیوں نہیں ہے؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں دینی مدرسہ کو دہشت گردی کا سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے جو معروضی حقائق کے منافی ہے، صرف اس لیے کہ جن کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کی ایک بڑی تعداد نے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے؟ اس جنگ کے میڈیا سیکشن میں ''دینی مدرسہ'' کو ہدف بنا لیا گیا ہے حالانکہ مبینہ دہشت گردی کے گروپوں میں ایک بڑی تعداد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ دہشت گرد ہیں یا نہیں، جن کو بھی دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف کاروائی کی جا رہی ہے ان گروپوں میں تناسب دیکھ لیا جائے کہ دینی مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب کیا ہے۔ عالمی سطح پر اسامہ بن لادن کو مبینہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جاتا ہے جبکہ اسامہ بن لادن اور ان کے پورے نیٹ ورک میں شاید ایک بھی شخص ایسا نہ ملے جو کسی روایتی دینی مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو۔ میرے خیال میں اصل بات اور ہے۔ دینی مدارس کے خلاف مغرب کا اصل غصہ کسی اور حوالے سے ہے جسے دہشت گردی کے ساتھ نتھی کر کے مغرب دینی مدارس کو ان کے کردار سے محروم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دینی مدارس مغرب کے خلاف ایک مورچہ ضرور ہیں لیکن یہ علمی، فکری اور تہذیبی مورچہ ہے جسے مغرب اپنی تمام تر قوت اور قہر سامانیوں کے باوجود سر نہیں کر سکا۔ مغرب نے پوری دنیا میں مذہب کا سوسائٹی کے ساتھ رشتہ ختم کر دیا ہے، مغرب کا سیکولر فلسفہ دنیا میں ہر طرف اپنے تسلط اور بالادستی کا جادو جگا رہا ہے لیکن دنیائے اسلام بالخصوص جنوبی ایشیا کا مسلمان سوسائٹی اور اجتماعیت کے ساتھ اسلام کے تعلق کو منقطع کرنے کیلئے تیار نہیں، اور اسلام ہی کو اپنی قومی و معاشرتی زندگی کی اساس قرار دینے پر مصر ہے، جس کی ایک بڑی وجہ دینی مدارس ہیں۔ مغرب بجا طور پر یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے

مسلمانوں سے اپنا مذہب بیزار سیکولر فلسفہ تسلیم کرانے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کا باعث دینی مدرسہ ہے اس لیے وہ دینی مدرسے کو اس کے کردار سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اس کیلئے اس پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر کے اپنا کام آسان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

چوتھی گزارش یہ ہے کہ مغرب یہ جنگ دو مفروضوں کی بنیاد پر لڑ رہا ہے اور اس سلسلہ میں وہ زمینی حقیقتوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ مغرب کا کہنا ہے کہ اس کے بقول جو لوگ دہشت گردی کر رہے ہیں وہ جہالت کی وجہ سے کر رہے ہیں، اگر ان کے علاقوں میں تعلیم کو عام کر دیا جائے تو دہشت گردی کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مغرب کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ یہ دہشت گردی غربت کی وجہ ہے اور ان غریب لوگوں میں چند ڈالر تقسیم کر کے انہیں دہشت گردی سے روکا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں خود ساختہ مفروضے ہیں اس لیے کہ مبینہ دہشت گردی کا عالمی نیٹ ورک اسامہ بن لادن کا ہے اور اس نیٹ ورک میں شریک لوگ نہ تو جاہل ہیں اور نہ ہی غریب ہیں۔ وہ یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سطح کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مغرب دو معروضی حقیقتوں کو نظر انداز کیے ہوئے ہے:

- ایک یہ کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے وہ ایک عقیدہ رکھتے ہیں، ایک تہذیب سے وابستہ ہیں اور اپنے عقیدے و ثقافت کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے و ثقافت کو خطرے میں دیکھ کر اس کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی جنگ کا طریق کار درست ہے یا نہیں، یہ الگ بحث ہے۔ لیکن اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان کی جنگ ایک عقیدے کیلئے ہے، تہذیب و ثقافت کیلئے ہے اور اس کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ کیلئے ہے۔
- دوسری حقیقت جسے مغرب جان بوجھ کر سامنے نہیں آنے دے رہا یہ ہے کہ مبینہ دہشت گردوں کی ساری جنگ ردعمل ہے۔ اور یہ ری ایکشن عالم اسلام کے بارے میں مغرب کی اس معاندانہ روش کا نتیجہ ہے جو وہ گذشتہ دو صدیوں سے مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ مغرب نے خلافت عثمانیہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اور اس کے بعد فلسطین، عراق اور افغانستان میں جو کچھ کر رہا ہے اس کا ردعمل اور ری ایکشن آخر کسی نہ کسی صورت میں تو سامنے آنا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ فلسطین میں گذشتہ پون صدی سے ہو رہا ہے یہ اگر کسی مغربی قوم کے ساتھ ہو تو اس کا ردعمل بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا۔

اس لیے جب تک ان زمینی حقائق کو تسلیم نہیں کیا جاتا، جنہیں دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کے عقیدہ و ثقافت کا احترام نہیں کیا جاتا، اور جب تک مغرب عالم اسلام کے خلاف اپنے منفی طرز عمل اور معاندانہ روش سے باز نہیں آتا، محض مفروضوں کی بنیاد پر اس مبینہ دہشت گردی کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

پانچویں گزارش یہ ہے کہ افغانستان سے جب روسی فوجیں واپس گئیں اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت پاکستان میں میرے اندازے کے مطابق پچاس ہزار کے لگ بھگ ایسے مجاہدین موجود تھے جنہوں نے

افغانستان کے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے، جنگ کی عملی تربیت حاصل کر چکے تھے اور ہر قسم کے ہتھیار چلانا جانتے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ جب روس کے خلاف جنگ ختم ہوگئی اور یہ ہزاروں مجاہدین پاکستان اپنے گھروں میں واپس آگئے تو قومی سطح پر ان کیلئے کیا پالیسی طے کی گئی؟ میں نے اس وقت دو تین اہم قومی لیڈروں کو اس جانب توجہ دلائی تھی کہ ان مجاہدین کے بارے میں کوئی قومی پالیسی طے کر لی جائے اور انہیں کسی کام پر لگا دیا جائے ورنہ ان کے مختلف گروپ اپنا اپنا کام اور اپنا اپنا راستہ خود طے کریں گے اور اس سے مسائل پیدا ہوں گے۔ میرے نزدیک یہ اس وقت حکومت کا اور قومی سطح کی قیادت کا فریضہ تھا جس سے غفلت کی گئی اور اس کا نتیجہ ہم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مثال موجود ہے، قیامِ پاکستان سے قبل سندھ میں حروں کی مسلح فورس موجود تھی، یہ مجاہدینِ آزادی تھے جو برطانوی استعمار کے خلاف برسرپیکار تھے اور مسلح طور پر چھاپہ مار کاروائیاں کیا کرتے تھے۔ ان کی قیادت موجودہ پیر صاحب آف پگاڑا شریف کے والد محترم حضرت پیر سید صبغت اللہ شہیدؒ پیر آف پگاڑا کر رہے تھے۔ یہ مسلح اور چھاپہ مار تحریک تھی۔ حضرت پیر صبغت اللہ راشدیؒ کو اسی جرم میں باغی قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ اسی لیے سندھ کی قومی تاریخ میں انہیں ''آزادی کا ہیرو'' قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب پاکستان قائم ہوا تو حروں کے ان مسلح دستوں کو پاک فوج کا حصہ بنا کر سنبھال لیا گیا اور ان کی صلاحیتوں کے استعمال کا رخ متعیّن کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد پاکستان کے ان مجاہدین کے بارے میں، جنہوں نے جہاد افغانستان میں حصہ لیا تھا، قومی سطح پر کوئی پالیسی طے کر لی جاتی اور ان کے جذبات اور صلاحیتوں کا کوئی رخ متعیّن کر دیا جاتا تو یقیناً وہ حالات پیدا نہ ہوتے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس سلسلہ میں چھٹی اور آخری گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تناظر میں سب سے بڑا سوال خودکش حملوں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہمارا موقف بالکل واضح اور دوٹوک ہے کہ خودکش حملہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو حالت جنگ میں آخری حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہتھیار عالمی جنگ میں جاپان نے استعمال کیا ہے، برطانیہ کے پولش پائلٹوں نے استعمال کیا ہے، اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاک فوج نے بھی استعمال کیا ہے۔ اس لیے ایک جنگی ہتھیار کے طور پر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن پرامن علاقوں میں اور میدان جنگ سے ہٹ کر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ جس طرح دوسرے جنگی ہتھیار ہیں کہ میدان جنگ میں ان کا استعمال درست ہے اور اس سے ہٹ کر اس کا استعمال درست نہیں ہے، یہی مسئلہ خودکش حملے کا بھی ہے۔

اسی طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان دستوری حوالے سے ایک اسلامی ریاست ہے۔ عملی طور پر کچھ بھی ہو لیکن اس کے دستور میں اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے اور پارلیمنٹ پابند ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں کر سکتی اور ملک کے مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائے گی۔ اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام یا کسی اور مطالبے کیلئے ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اس حوالے سے ایک بات عرض کرنا ضروری ہے کہ سوات اور قبائلی علاقوں کے جو لوگ شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مطالبہ درست ہے بلکہ پورے پاکستان کا یہ حق ہے کہ حکومت ملک میں شرعی قوانین نافذ کرے اور اسلامی نظام کو عملاً بروئے کار لائے۔ نیز اس بات کو ضرور پیش نظر رکھا جائے کہ خاص

طور پر سوات کے لوگوں سے اس حوالے سے بار بار وعدہ خلافی کی گئی ہے بلکہ چند سال قبل نفاذ شریعت ریگولیشن کی صورت میں موجودہ عدالتی نظام پر ہی شرعی عدالتوں کا لیبل چسپاں کر کے ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر وہ اس وعدہ خلافی اور دھوکہ دہی کے خلاف ردعمل کے طور پر انتہا پسندی پر آ گئے ہیں تو ان کا طریق کار غلط ہونے کے باوجود ان کی مجبوری کو سمجھنا چاہیے اور ان اسباب کو دور کرنا چاہیے جو حالات کو اس رخ پر لے آئے ہیں۔

"مشرقِ وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک، تلاشِ امن"

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۶ فروری ۲۰۰۹ء

گذشتہ ماہ کے آخری روز وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی دستور کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کیلئے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک جانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ وفاق کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے فون پر کہا کہ آپ کو اسی روز ۱۱ بجے اسلام آباد میں ایک اہم سیمینار میں شریک ہونا ہے اور سیمینار کی نوعیت کے حوالے سے آپ کی شرکت بے حد ضروری ہے۔ وفاق المدارس کی دستور کمیٹی کا ظہر کے بعد اجلاس طے تھا جس میں مولانا انوار الحق حقانی (اکوڑہ)، مولانا مفتی کفایت اللہ ایم پی اے (مانسہرہ) اور مولانا عطاء اللہ شہاب (گلگت) شامل ہیں۔ مجھے اس کمیٹی کی مسئولیت سونپی گئی ہے چنانچہ ہم نے فون پر باہمی مشورہ کر کے اجلاس کو مغرب کے بعد تک کیلئے مؤخر کیا اور میں ۱۱ بجے اسلام آباد پہنچ گیا۔

اسلام آباد پہنچ کر معلوم ہوا کہ سیمینار اسلام آباد ہوٹل میں "مشرقِ وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک --- تلاشِ امن" کے عنوان سے منعقد ہو رہا ہے جس کا اہتمام جوہر ٹاؤن لاہور کے انٹرنیشنل اسلامک سنٹر نے انٹرنیشنل اسلامک میڈیا فورم کے تعاون سے کیا ہے۔ "انٹرنیشنل اسلامک سنٹر لاہور" ملتان کے جامعہ خیر المدارس کی شاخ ہے، اس کے سربراہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری ہیں۔ جبکہ "انٹرنیشنل اسلامک میڈیا فورم" میڈیا سے تعلق یا دلچسپی رکھنے والے چند نظریاتی دینی کارکنوں کا ایک نوتشکیل یافتہ فورم ہے جس کا قیام چند ماہ قبل لاہور میں عمل میں لایا گیا، اس کے اساسی اجلاس میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا ہے، اس کے اصل محرک جمعیت علماء اسلام کے ایک سرگرم رہنما مولانا قاری عبید اللہ قریشی ہیں جن کا تعلق مانسہرہ سے ہے، وہ ایک عرصہ سے متحدہ عرب امارات کی ریاست شارجہ میں تدریس القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ فورم کی سربراہی مولانا مفتی عبد الرحمان کر رہے ہیں جو راولپنڈی کے سرگرم علماء میں شمار ہوتے ہیں، جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے حوالے سے اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام نے جو رابطہ کمیٹی قائم کر رکھی ہے، اس کے ترجمان ہیں۔

سیمینار میں شرکت کیلئے پاکستان شریعت کونسل کے رہنما جناب صلاح الدین فاروقی آف ٹیکسلا کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا تو مولانا قاری محمد حنیف جالندھری گیٹ پر آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے، ان سے مل کر آگے بڑھا تو پہلی ملاقات انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل جناب خالد رحمان سے ہوئی، اسٹیج کی طرف نظر اٹھی تو جناب خورشید احمد ندیم دکھائی دیے اور کچھ کچھ اندازہ ہو گیا کہ سیمینار کی نوعیت اور سطح کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد

سینیٹر سید مشاہد حسین اور جناب احسن اقبال تشریف لے آئے۔ صوبہ سرحد کے سابق وزیر قاری روح اللہ مدنی، پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر قبلہ ایاز، دعوہ اکیڈمی اسلام آباد کے جناب پروفیسر عبد الجبار شاکر، جمعیت علماء اسلام کے رہنما سینیٹر ڈاکٹر خالد محمود سومرو اور لال مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا عبد الغفار بھی تھوڑے تھوڑے سے وقفے کے ساتھ تشریف لاکر اپنی اپنی سیٹوں پر رونق افروز ہوگئے۔ وفاقی وزیر برائے پارلیمانی امور جناب ڈاکٹر بابر اعوان سب سے آخر میں تشریف لائے، اس کے ساتھ یہ سیمینار کم و بیش اکثر اہم سیاسی و دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مشترکہ فورم کی حیثیت اختیار کر گیا۔

سیمینار کے عنوان سے ظاہر تھا کہ اس میں زیادہ تر گفتگو غزہ کے المیہ اور ممبئی بم دھماکوں کے حوالے سے ہوگی۔ چنانچہ سیمینار کے داعی اور میزبان مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اپنی ابتدائی اور تعارفی گفتگو میں یہ بات واضح کر دی کہ اس بحث و مباحثہ کا دائرہ غزہ سے ممبئی تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں شرکت کیلئے مختلف مکاتب فکر اور علمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کو اس لیے زحمت دی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو سنا جائے، ان پر غور کیا جائے اور مختلف نقطہ ہائے نظر کو سامنے رکھ کر امت مسلمہ کی فکری رہنمائی کے مشترکہ نکات تلاش کیے جائیں۔

- مقررین نے غزہ کی صورتحالِ کا تفصیل سے ذکر کیا، اسرائیلی جارحیت کی مذمت کی گئی، مسلم ممالک کی حکومتوں خاص طور پر عرب حکمرانوں کی سرد مہری کا ماتم ہوا، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی اسرائیل نوازی اور عالمی معاملات میں ان کے دہرے معیار کا شکوہ کیا گیا۔
- ممبئی بم دھماکوں کے مضمرات اور اثرات کا جائزہ لیا گیا اور بھارت کی طرف سے دی جانے والی دھمکیوں پر ردعمل کا اظہار ہوا۔
- سوات، مالاکنڈ اور وزیرستان کی صورتحال کا تذکرہ ہوا اور وہاں فوجی آپریشن کے نتائج پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔
- عالمِ اسلام کی موجودہ معروضی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لائحہ عمل پر بھی گفتگو ہوئی اور متنوع سوچوں کے حامل دانشوروں نے کھل کر اپنے موقف کی وضاحت کی۔

الغرض بدامنی اور تلاشِ امن سے متعلقہ تمام پہلوؤں پر گفتگو ہوئی، سب سے بڑھ یہ کہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو تحمل کے ساتھ سنا گیا اور ایک مشترکہ سوچ کی طرف آگے بڑھنے کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا۔ جناب خورشید احمد ندیم نے اپنا یہ موقف دردِ دل اور منطق و استدلال کے ساتھ پیش کیا کہ موجودہ عالمی حالات میں بالادست قوتوں کے ساتھ مزاحمت حکمت و دانش کے خلاف ہے کیونکہ ان کے خیال میں کسی جگہ بھی مزاحمت کامیاب نہیں ہو رہی، عراق و افغانستان سمیت ہر جگہ مزاحمت کرنے والوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس لیے سرِدست مزاحمت کا راستہ ترک کر کے صلحِ حدیبیہ جیسی صورت اختیار کی جائے اور ایک ایسا وقفۂ امن حاصل کیا جائے جس میں مسلم امہ مقابلے کی پوری تیاری کر سکے، نیز طاقت کا وہ توازن حاصل کیا جائے جس کے ساتھ ان قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن ہو جائے۔

خورشید احمد ندیم صاحب کے اس موقف کا جائزہ لیتے ہوئے راقم الحروف نے یہ سوال اٹھایا کہ مزاحمتی گروہوں کو مزاحمت ترک کرنے کا مشورہ دینے سے پہلے اس امر کا جائزہ لے لیا جائے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس لیے کہ جنوبی ایشیا میں ہمارے اردگرد کا منظر یہ ہے کہ کشمیری عوام گذشتہ ساٹھ برس سے مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں اس لیے ان کا مسئلہ عالمی سطح پر زندہ ہے اور اس پر ہر فورم پر بات ہو رہی ہے۔ جبکہ اسی خطے میں میانمار (برما) کے صوبے اراکان کی مسلم اکثریت کو بھی کشمیریوں جیسی صورتحال کا سامنا ہے، ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے، ہزاروں خاندان جلاوطن ہو کر بنگلہ دیش کے کیمپوں اور دنیا کے مختلف ممالک میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، اراکان کی مسلم اکثریت کو اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کی آزادی نہیں، ان کی جان و مال اور آبرو کو تحفظ حاصل نہیں اور وہ مسلسل ریاستی جبر کا شکار ہیں۔ لیکن ان کا مسئلہ دنیا کے کسی فورم پر موجود نہیں، کوئی ادارہ ان کے حق میں آواز اٹھانے کو تیار نہیں ہے، کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کشمیری عوام ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں جبکہ میانمار اور برما کے مسلمان مزاحمت نہ کر سکنے کی وجہ سے دنیا کی رسمی حمایت سے بھی محروم ہیں؟

میری اس گزارش کے جواب میں سینیٹر سید مشاہد حسین نے فرمایا کہ کشمیر کا مسئلہ اس لیے زندہ ہے کہ ان کے حق میں پاکستان آواز اٹھا رہا ہے۔ مجھے ان کے بعد گفتگو کا موقع نہ مل سکا ورنہ میں یہ عرض کرتا کہ پاکستان بھی کشمیری عوام کے حق میں اس لیے آواز اٹھا رہا ہے کہ کشمیریوں کا جذبۂ حریت زندہ ہے اور وہ اس کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں، ورنہ اگر وہ بھی سپر اندازی اختیار کر لیتے تو ان کا انجام حیدر آباد اور جوناگڑھ سے مختلف نہ ہوتا۔ سید مشاہد حسین نے جناب خورشید احمد ندیم کی گفتگو کے اس پہلو کا جائزہ لیا کہ افغانستان اور عراق سمیت ہر جگہ مزاحمتی گروپوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑ رہی ہے، انہوں نے کہا کہ عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی بلکہ روز بروز حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہو گا کہ مزاحمتی گروپوں کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں ایک سوال اور اٹھایا کہ ہم تلاشِ امن میں یہاں بیٹھے ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ امن کا مفہوم کیا ہے؟ کیونکہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں ریاستی جبر اور بیرونی جارحیت کے خلاف مزاحمت ہو رہی ہے صرف وہیں امن کی ضرورت کی بات کی جا رہی ہے۔ اور جہاں لوگ ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت نہیں کر رہے وہاں امن کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔ اس طرح آج کی بالادست قوتوں کے نزدیک امن کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کے خلاف مزاحمت بدامنی ہے، اور ان کے جبر و ظلم کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لینے کا نام امن ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا ہم بھی اسی امن کی تلاش میں ہیں اور امن کے اسی مفہوم کو سپورٹ کر رہے ہیں؟

بہر حال یہ سیمینار مختلف حوالوں سے بہت خوب رہا، اس کے اہتمام پر سب شرکاء نے قاری محمد حنیف جالندھری اور ان کے رفقاء کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ اس سے باہمی مفاہمت اور ہم آہنگی کو فروغ حاصل ہو گا۔

عالمِ اسلام کے خیالات اور امریکہ

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۹ فروری ۲۰۰۹ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق امریکہ کی وزیر خارجہ محترمہ ہیلری کلنٹن گذشتہ روز جب انڈونیشیا کے دورے پر پہنچیں تو انڈونیشیا کے کئی شہروں میں امریکہ کے خلاف احتجاجی مظاہروں کی صورت میں عوام نے امریکہ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، بلکہ انڈونیشیا کی ایک بڑی مسلمان تنظیم محمدیہ کے سر براہ جناب شمس الدین نے امریکی وزیر خارجہ کے ساتھ دعوت میں شرکت کی دعوت مسترد کر کے امریکہ کو انڈونیشیا عوام کے جذبات سے باخبر کیا۔

اس موقع پر امریکی وزیر خارجہ نے ایک دلچسپ بات یہ کہی کہ ”امریکی حکومت عالم اسلام کے خیالات سے آگاہی حاصل کرے گی“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی حکومت اپنے بارے میں اور امریکی پالیسیوں کے حوالے سے عالم اسلام کے خیالات سے آگاہ نہیں ہے اور اسے یہ آگاہی حاصل کرنے کیلئے از سر نو کسی کوشش کا آغاز کرنا پڑے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی وزیر خارجہ یہ بات کہہ کر عالم اسلام کو بے وقوف بنانے یا خود کو فریب کے ماحول میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس لیے کہ اگر عالم اسلام کے خیالات اور جذبات سے امریکہ واقف نہیں ہے تو اور کون واقف ہے؟

محترمہ ہیلری کلنٹن صرف امریکہ کی وزیر خارجہ نہیں ہیں بلکہ سابق صدر مسٹر کلنٹن کی اہلیہ کی حیثیت سے خاتون اول بھی رہ چکی ہیں، انہوں نے اس دور میں بھی دنیا بھر کے دورے کیے ہیں اور عالم اسلام کے راہنماؤں کے ساتھ متعدّد ملاقاتوں میں وہ شریک رہی ہیں، پھر وہ امریکہ کی دانشور اور باخبر خواتین میں شمار ہوتی ہیں اور ایک عرصہ سے امریکہ کی قومی سیاست میں ان کا کردار چلا آرہا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ یہ فرماتی ہے کہ امریکی حکومت کو ابھی عالم اسلام کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے تو اسے ایک افسوسناک سیاسی لطیفے کے علاوہ اور کیا عنوان دیا جاسکتا ہے؟

- کیا امریکی حکومت کو یہ معلوم نہیں ہے کہ افغانستان، عراق اور پاکستان کے شمالی علاقوں میں خود امریکی فوجوں اور اسلحہ نے کیا قیامت ڈھا رکھی ہے؟
- اور کیا یہ بات بھی اسے ابھی معلوم کرنی ہے کہ فلسطین میں امریکہ کی پشت پناہی اور اسلحہ کے ساتھ اور اس کی ویٹو پاور کے سائے میں اسرائیل نے فلسطینی عوام پر جبر و تشدد اور وحشت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں؟
- کیا امریکہ یہ نہیں جانتا کہ عالم اسلام کی رائے عامہ اس سے کس قدر شدید نفرت کرتی ہے اور کس وجہ سے کرتی ہے؟

اگر اب بھی امریکہ عالم اسلام کو اس طرح کی پر فریب باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے کہ ہم آپ کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ نئی امریکی حکومت نے بھی حالات سے

کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور وہ اس ڈگر پر چلتے رہنا چاہتی ہے جس کے نتائج کسی اور کیلئے خواہ کیسے ہوں خود امریکہ کے مستقبل کیلئے بہرحال بہتر نظر نہیں آرہے۔

قاہرہ میں صدر اوباما کا خطاب

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۹ء

امریکہ کے صدر جناب باراک حسین اوباما نے ۴ جون کو قاہرہ یونیورسٹی میں مسلمانوں سے خصوصی خطاب کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے اور وہ مسلمانوں اور امریکہ کے درمیان غلط فہمیاں دور کر کے منافرت کی وہ فضا ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو مسلم دنیا میں امریکہ کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ صدر اوباما نے اس سے قبل استنبول میں بھی اسی نوعیت کا خطاب کیا تھا اور عالم اسلام کو یہ باور کرانے کیلئے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کی تھیں کہ امریکہ مسلمانوں سے دشمنی اور اسلام سے عناد نہیں رکھتا اور مسلمانوں کو ہر ممکن مدد فراہم کرنے کیلئے تیار ہے۔

جناب باراک حسین اوباما کے اسلامی خاندانی پس منظر اور امریکہ کا پہلا سیاہ فام صدر ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کے بطور صدر انتخاب سے قبل ہی ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں اور ان کے صدر بن جانے کے بعد بھی دنیا کے بہت سے مسلمان انہی توقعات اور امیدوں کے ماحول میں جی رہے ہیں۔ جبکہ یہ بات اہل دانش پر مخفی نہیں ہے کہ امریکہ کا صدر اپنے وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ با اختیار اور طاقتور شخص کہلانے کے باوجود امریکہ کے مجموعی نظام کا صرف ایک حصہ ہوتا ہے اور وہ اگر کوئی بنیادی تبدیلی دل سے چاہے بھی تو اس سسٹم کے اندر رہتے ہوئے اس کیلئے ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ امریکہ کے سیاسی اور معاشی سسٹم میں "پنجۂ یہود" کی کارفرمائی روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس لیے صدر بارک حسین اوباما اگر امریکہ اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے اور عالم اسلام میں امریکہ کے بارے میں پائے جانے والے منفی جذبات کو صلح و اعتماد میں تبدیل کرنے کے عزم میں مخلص ہوں تو بھی موجودہ صورتحال میں اس کے دور دور تک کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ اور اس وقت تک امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان اعتماد کی بحالی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے جب تک:

- مشرق وسطیٰ میں یہودیوں کی خود ساختہ چودھراہٹ، اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اس کے ہاتھوں عربوں بالخصوص فلسطینیوں کے حقوق کی پامالی کی فضا قائم ہے،
- اور امریکہ کے سیاسی و معاشی نظام پر یہودیوں کی اجارہ داری موجود ہے۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ صدر بارک حسین اوباما عالم اسلام کے بارے میں مثبت جذبات رکھتے ہوں گے اور وہ امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان اعتماد کی بحالی کی کوشش میں بھی یقیناً مخلص ہوں گے لیکن اس کیلئے انہیں موجودہ امریکی سسٹم کے پیدا کردہ ماحول اور تناظر سے ہٹ کر زمینی حقائق کی بنیاد پر صورتحال کا جائزہ لینا ہوگا اور عالم اسلام

کی شکایات اور مسائل کو خود عالم اسلام کے جذبات و خیالات کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ کیونکہ اب تک کی صورتحال یہ ہے کہ عالم اسلام کے مسائل اور مشکلات کی فہرست بھی امریکہ خود طے کرتا ہے اور ان مسائل و مشکلات پر عالم اسلام کی جانب سے امریکہ کے ساتھ معاملات طے کرنے کیلئے مسلم دنیا کے نمائندوں کا انتخاب بھی امریکہ ہی کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ مثلاً صدر اوباما نے مسلم دنیا کے حوالے سے اپنے ایجنڈے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ”اگرچہ ماضی میں امریکہ نے اس خطے میں تیل اور گیس ہی پر توجہ مرکوز کی ہے، اب ہم وسیع تر تعلقات چاہتے ہیں، تعلیم کے میدان میں ہم دوطرفہ اشتراک کے پروگراموں کو وسعت دیں گے اور وظائف میں اضافہ کریں گے، ایسے ہی ایک وظیفے کی بدولت میرے والد امریکہ آئے تھے۔ اور ساتھ ہی امریکی طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ وہ مسلم ممالک میں تعلیم حاصل کریں، اس کے بدلے ہم ہونہار مسلم طلبہ کو امریکہ انٹرن شپ دیں گے، دنیا بھر کے اساتذہ اور بچوں کو آن لائن تعلیم اور تربیت کو فروغ دیں گے اور نئے نیٹ ورک قائم کریں گے تاکہ کنساس بیٹھا ہوا ایک بچہ قاہرہ میں بیٹھے ہوئے بچے سے فوری تبادلہ خیالات کر سکے۔ اقتصادی ترقی کے شعبے میں ہم بزنس کے رضاکاروں کی ایک جماعت تیار کریں گے جو مسلم اکثریتی ممالک میں موجود رضاکاروں کے ساتھ مل کر کام کر سکیں اور میں اس سال انٹرپرینیور شپ کے ایک سربراہی اجلاس کی میزبانی کروں گا جس میں یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ تجارتی راہنماؤں، اداروں اور دنیا بھر کی مسلم برادریوں کے ساتھ تعلقات روابط کیسے مضبوط بنائے جائیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم مسلم اکثریتی ممالک میں ٹیکنالوجی ترقی کی امداد کیلئے اور نظریات کے منڈیوں تک منتقلی کے فروغ کیلئے ایک نیا فنڈ قائم کریں گے تاکہ روزگار کے نئے مواقع پیدا ہو سکیں۔ ہم افریقہ، مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں نئے سائنسی مراکز قائم کریں گے اور توانائی کے نئے ذرائع، ماحول کے روزگار ڈیجیٹل ریکارڈ، صاف پانی اور نئی فصلیں اگانے کے پروگراموں میں تعارف کیلئے سائنسی ایلچی تعینات کریں گے۔ اور آج میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ساتھ مل کر پولیو کے خاتمہ کیلئے ایک نئی عالمی کوشش کا اعلان کر رہا ہوں اور ہم زچہ بچہ کی صحت کے فروغ کیلئے بھی مسلم برادریوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہیں، لیکن یہ تمام چیزیں تعارف اور اشتراک کے ساتھ ہی کی جا سکتی ہیں۔“

صدر اوباما کی تقریر کا یہ طویل اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ امریکہ کے نزدیک عالم اسلام کے مسائل کیا ہیں اور انہیں حل کرنے کیلئے وہ کیا کر سکتا ہے؟ لیکن ہم امریکہ کے صدر محترم کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ عالم اسلام کے مسائل ضرور ہیں لیکن امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات کے تناظر میں مسلمانوں کے اصل مسائل یہ نہیں ہیں اور جب تک امریکہ اور مغرب عالم اسلام کے اصل مسائل کی طرف توجہ نہیں دیں گے محض جزوی معاملات میں وقت، رقم اور صلاحیتوں کا کسی بھی سطح پر استعمال اعتماد کی وہ فضا قائم کرنے میں

معاون ثابت نہیں ہوگا جس کی صدر اوباما توقع کر رہے ہیں۔

امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان کشمکش کے اصل مسائل سیاسی اور ثقافتی ہیں کہ:

1. امریکہ اور مغرب انسانی سوسائٹی میں اسلام کے معاشرتی کردار کی نفی کرتے ہوئے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں اسلام سے دور کرنے کیلئے ہر ممکن جتن کر رہے ہیں، جبکہ دنیا بھر کے مسلمان اسلام کے معاشرتی کردار اور اجتماعی زندگی کے بارے میں قرآن وسنت کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔
2. امریکہ اور مغرب عالم اسلام سے معاملات طے کرنے کیلئے مسلم رائے عامہ کے حقیقی نمائندوں سے بات کرنے کی بجائے مسلم دنیا پر اپنی مرضی کی لیڈرشپ مسلط کر کے ان کے ذریعے عالم اسلام کو اپنے ڈھب پر لانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔
3. امریکہ اور مغرب فلسطین اور کشمیر کے مسائل کے حوالے سے عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی فیصلوں کو مسلسل پامال کرتے ہوئے ظلم وبربریت کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔
4. امریکہ اور مغرب طے شدہ پالیسی کے تحت مسلم دنیا کو نہ تو اقوامِ متحدہ کے فیصلہ سازی کے عمل میں شریک کرنے کیلئے تیار ہیں اور نہ ہی عسکری طاقت اور ٹیکنالوجی میں عالم اسلام کو توازن کی پوزیشن میں آنے کا راستہ دے رہے ہیں۔
5. حتٰی کہ امریکہ اور مغرب نے انسانی حقوق، جمہوریت اور اقوام کی خود مختاری کے احترام کے ان اصولوں کے حوالے سے بھی عالم اسلام کے بارے میں الگ معیار قائم کر رکھا ہے جو خود امریکہ اور مغرب کے نزدیک مغربی فلسفہ کی بنیاد ہیں۔
6. نیز عراق اور افغانستان میں امریکی اتحاد نے جو کچھ کیا ہے اور اب پاکستان کی داخلی حدود میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس نے ملتِ اسلامیہ کے جسم کو زخموں سے چور چور کر دیا ہے اور اس کے تسلسل میں ابھی تک کمی کے کوئی امکانات نظر نہیں آ رہے ہیں، وغیر ذٰلک۔

صدر اوباما نے اس خطاب میں اسرائیل کی حمایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ”اسرائیل کے ساتھ امریکہ کے مضبوط رشتوں کے بارے میں سب جانتے ہیں، یہ رشتہ ناقابل تنسیخ ہے، اس کی بنیاد ثقافتی اور تاریخی بندھنوں پر اور اس احساس پر ہے کہ یہودیوں کی ایک وطن کی آرزو کی بنیاد ایک المناک تاریخ پر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر میں یہودی عوام پر صدیوں تک ظلم کیے جاتے رہے اور یورپ میں یہود دشمنی کا انجام نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کی صورت میں نکلا جسے ہولوکاسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ کل میں Buchenwald جاؤں گا، جو ان کمپنیوں کے نیٹ ورک کا حصہ تھا جہاں یہودیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، انہیں اذیتیں دی جاتی تھیں، انہیں گولی ماری جاتی تھی اور

زہریلی گیس سے موت کی نیند سلا دیا جاتا تھا، ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہلاک کیا گیا، یہ تعداد آج کے اسرائیل کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔"

ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ہولو کاسٹ کی تاریخی حیثیت کیا ہے البتہ صدر اوباما محترم سے یہ دریافت کرنے کی جسارت ضرور کریں گے کہ یہودیوں کی وطن کی آرزو پوری کرنے کیلئے فلسطینیوں کو ان کے وطن سے محروم کر دینے کا آخر کیا جواز ہے؟ ہمارے ہاں یہ کام قبضہ گروپ کیا کرتے ہیں جو کسی من پسند خاندان کو مکان کا قبضہ دلانے کیلئے وہاں پہلے سے مکین خاندان کا سامان زبردستی اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور جبراً گھر خالی کرا لیتے ہیں۔ پھر مبینہ ہولو کاسٹ میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل عام کا ذکر تو کیا جاتا ہے لیکن کیا صدر اوباما اس بات کیلئے تیار ہیں کہ

- جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے ہاتھوں
- وسطی ایشیا میں روسی استعمار کے ہاتھوں
- اور عراق و افغانستان سمیت دنیا بھر میں امریکی استعمار کے ہاتھوں

قتل عام کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کرنے کیلئے عالمی سطح پر ایک کمیشن قائم کیا جائے، اور گوانتاناموبے طرز کے ان بیسیوں کیمپوں کے مناظر کو بھی منظر عام پر لایا جائے جن میں گذشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمانوں کو دہشت و بربریت کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔

صدر امریکہ نے اپنے خطاب میں بہت سی باتیں فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک پر بات ہو سکتی ہے مگر ہم نے بطور نمونہ ان میں صرف دو حوالوں سے مختصراً گزارشات پیش کی ہیں، اس طرف توجہ دلانے کیلئے کہ امریکہ اور عالم اسلام میں اعتماد کی بحالی کیلئے اصل ضرورت مصنوعی ماحول سے نکلنے اور زمینی حقائق کی بنیاد پر صورتحال کا جائزہ لینے کی ہے، اس کے بغیر اس حوالے سے کیا جانے والا کوئی کام بھی حالات کا رخ تبدیل نہیں کر سکے گا۔

افغانستان کی صورتحال اور "ہفتہ نامہ امید"

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۶ اگست ۲۰۰۹ء

گذشتہ روز مغرب کی نماز کے بعد دارالہدیٰ (اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ) میں مختصر درسِ حدیث دینے کے بعد سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کے ہاں کھانا کھانے کیلئے جا رہا تھا کہ میزبان نے ایک افغان سٹور کے پاس گاڑی روک لی اور کہا کہ روٹیاں یہاں سے لیتے ہیں ان کی روٹی بہت اچھی ہوتی ہے۔ مجھے اپنے ہاں کے افغانی تندور یاد آ گئے کہ ہمارے ہاں بھی افغانیوں کی روٹی زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ میں بھی ساتھ اتر گیا کہ افغان سٹور دیکھ لوں۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک طرف ریک پر اخبار پڑا نظر آ گیا اور میری نظر وہیں رک گئی۔

یہاں اس طرح کے اخبار سٹوروں پر مفت تقسیم کیلئے رکھے ہوتے ہیں جن میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے لیکن بعض کام کی خبریں اور رپورٹیں بھی مل جاتی ہیں۔ اردو کے درجنوں اخبارات امریکہ کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے

ہیں اور ان سٹوروں کے علاوہ مساجد میں جمعہ کی نماز کے بعد تقسیم ہوتے ہیں۔ میں عام طور پر ان اخبارات کو ایک نظر ڈالنے کیلئے اٹھالیتا ہوں اور اپنے مطلب کی خبریں اور مضامین الگ کر کے محفوظ کرلیتا ہوں۔

یہ ہفت روزہ اخبار فارسی زبان میں ہے جو ''ہفتہ نامہ امید'' کے نام سے واشنگٹن کے الیگزینڈریا (ورجینیا) سے شائع ہوتا ہے۔ محمد قوی کوشان اس کے مدیر مسئول اور ناشر ہیں۔ ہمارے ہاں کے ہفتہ وار میگزین کے سائز کے بارہ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ ۲۷ جولائی ۲۰۰۹ء کا ہے اور اس کا شمارہ نمبر ۸۵۱ ہے۔ بارہ صفحات میں سے کم و بیش ساڑھے چار صفحات اشتہارات پر مشتمل ہیں، باقی صفحات میں افغانستان کی خبریں اور وہاں کے حالات کے جائزہ پر مشتمل مضامین اور رپورٹیں اچھی ترتیب کے ساتھ پیش کی گئی ہیں جن سے افغانستان کی عمومی صورتحال ایک حد تک قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ پورے اخبار میں پاکستان کی ایک ہی خبر ہے جو مولانا صوفی محمد کی گرفتاری کے بارے میں ہے، باقی تمام خبریں اور مضامین افغانستان سے متعلق ہیں۔ اپنے مواد اور ترتیب کے حوالے سے مجھے یہ ایک مکمل اخبار محسوس ہوا اور بہت اچھا لگا، اس لیے اپنے اس تاثر اور استفادہ میں قارئین کو شریک کرنا بھی میں نے مناسب خیال کیا ہے۔

''ہفتہ نامہ امید'' کے صفحہ چہارم پر افغانستان میں والی بال کے کھیل کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور صفحۂ اول پر افغانستان کی ایک قومی والی بال ٹیم کا گروپ فوٹو شائع کیا گیا ہے جس نے ۱۹۵۴ء کے دوران بھارت کے شہر کلکتہ میں ہونے والے والی بال مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ صفحۂ اول پر ہی افغانستان کے صدارتی انتخابات کے ایک امیدوار ڈاکٹر عبداللہ کی حمایت میں چاریکار میں جمع ہونے والے ہزاروں افراد کے ہجوم کی فوٹو شائع کی گئی ہے جو ڈاکٹر عبداللہ کی پگڑی والی تصویر اٹھائے ان کے حق میں مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اخبار میں جناب سرور کائناتؐ کے واقعۂ معراج کے بارے میں دو فارسی نظمیں شائع ہوئی ہیں، ایک محمد طہ کوشان کی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

شبے کہ صاحب دل ہا بداد مہمانی
برآں بلندی بارگاہ عرش رحمانی

جبکہ دوسری نظم عبدالحی آرین پور کی ہے جو نعت نبویؐ کے معروف و مشہور شعر:

حسن یوسف دم عیسٰی ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کی تضمین لگتی ہے اور اس کے چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

خلق خوش، دست کرم، صلہ رحم و ارفاق
ہمہ اسباب بزرگی تو مہیا داری
اے بہ آل تو و اصحاب درود و سلام
امتاں را بہ دل و دیدہ تو مادی داری
یار غارؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ یارنت

بہترین همه و افضل آنها داری
دوست داران حضورت به شفاعت بنواز
تو که با دشمن خود حلم و مدارا داری

اس شمارہ میں جناب عبد القدیر خالق ہروی کے شعری مجموعۂ کلام ''دردِ دل'' پر پروفیسر ڈاکٹر لطیفی کا خوبصورت تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے جس کا آغاز ان دو شعروں سے کیا گیا ہے:

تا خیل رقیباں را در کوئے تو می بینم
در دیده خلد هر دم صد خار مغیلانم
در رهگزرت جاناں یعقوب صفت فائق
بیت الحزنی دارد ای یوسف کنعانم

افغانستان کیلئے صدر امریکہ باراک اوباما کے خصوصی نمائندہ ہالبروک کی افغان علماء کرام کی مجلس شوریٰ کے سربراہ مولوی فضل ہادی شنواری کے ساتھ ملاقات کی رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس میں ملا شنواری نے امریکی رہنما سے شکوہ کیا ہے کہ افغان صدر حامد کرزئی نے سات سال قبل مخالف افغان گروپوں کے ساتھ مصالحت کیلئے جس سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا تھا امریکہ نے اس کی حمایت نہیں کی تھی اور اس کو سپورٹ نہیں کیا تھا، جبکہ افغانستان کے مسئلہ کے حل کیلئے یہ ضروری ہے۔ اس لیے افغانستان کے انتخابات کے بعد نئی حکومت کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ مخالف گروپوں کے ساتھ صلح کیلئے مذاکرات کر سکے، امریکہ کو ان مذاکرات کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس کے جواب میں ہالبروک نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انتخابات کے بعد مخالف گروپوں کے ساتھ مصالحت کیلئے گفتگو کا آغاز کیا جائے گا۔ ہالبروک نے یہ بھی کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرات افغانوں کے اپنے طریقے کے مطابق ہوں اور بیرونی قوتیں ان میں صرف معاون کا کردار ادا کریں۔

ہفتہ نامہ امید میں کیلی فورنیا میں مقیم ایک افغان دانشور عبد الودود ظفری کا دلچسپ تجزیاتی مضمون ''افغانستان، ویتنام، اوباما'' کے عنوان سے قسط وار شائع ہو رہا ہے جس کی ایک قسط اس شمارے میں موجود ہے، اس میں افغانستان کی موجودہ صورتحال کا ویتنام کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے:

- مضمون نگار کا کہنا ہے کہ نتائج بھی اس سے مختلف نہیں ہوں گے۔
- عبد الودود ظفر لکھتے ہیں کہ افغانستان کے عوام ویتنام کے عوام کی طرح ہی ہیں کہ جس طرح وہ اپنی حکومت کو ایک طرح کی استبدادی حکومت سمجھتے ہوئے اس سے خوف کھاتے تھے، انہیں اس سے وحشت تھی، اسے اپنی خیر خواہ حکومت تصور نہیں کرتے تھے۔ ویتنام کے عوام بھی اپنے اصحابِ اقتدار کے طرز حکومت کے باعث ہراس میں مبتلا تھے اور وہ اسے دشمن کی حکومت یا دشمن کی خیر خواہ حکومت سمجھتے ہوئے امریکی طاقت کے سامنے دبے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا خوف اور ناامیدی اس وقت افغانستان میں موجود ہے۔ جس وقت نائن الیون کے واقعہ کے بعد طالبان تیزی سے پسپا ہوگئے تھے افغان عوام نے اس امید پر امریکہ کو

خوش آمدید کہا تھا کہ وہ ان کے شہروں کی آبادی واپس لائے گا، دفتری نظام کو بحال کرے گا اور ان کی معیشت واقتصاد کو از سر نو استوار کرے گا۔ لیکن یہ امید اور خوش فہمی اب ناامیدی بلکہ پریشانی کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ افغانستان میں روس کے سفیر جناب ضمیر کابلوف نے یہ سوال کیا ہے کہ افغان عوام کو اتحادی افواج کی آمد سے کیا حاصل ہوا ہے؟ لوگ جس طرح پہلے فقر و تنگدستی کا شکار تھے اب بھی اسی طرح نادار و فقیر ہیں اور اس کے ساتھ بمباری کا نشانہ بھی بن رہے ہیں۔

- مضمون میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان کے ۷۲ فیصد علاقے میں طالبان مستقل طور پر موجود ہیں جبکہ یہ تناسب صرف ایک سال قبل ۵۴ فیصد تھا۔ نیز طالبان اب کابل کی طرف پیش قدمی کی پوزیشن میں بھی ہیں جبکہ کابل کی طرف جانے والی بڑی شاہراہوں میں سے تین اس وقت طالبان کے زیر اثر ہیں، صرف ایک بڑی شاہراہ ان کے اثر و نفوذ سے خالی ہے۔
- عبد الودود ظفری کا کہنا ہے کہ طالبان اور ویتنام میں البتہ یہ فرق ضرور نظر آتا ہے کہ ویت نام نے امریکی فوجوں کے خلاف جنگ قوم کے عنوان سے لڑی ہے مگر طالبان نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن ویتنام کی بہ نسبت طالبان کو ایک سہولت ایسی حاصل ہے جو ویتنام کو میسر نہیں تھی کہ افغانستان میں پوست کی کاشت جو دنیا میں پوست کی مجموعی پیداوار کا ۹۳ فیصد ہے، وہ بڑھ رہی ہے بلکہ اب دوگنا ہوگئی ہے۔ جبکہ پوست کے کاشتکار جب تک اس بات کا اطمینان حاصل نہ کرلیں کہ طالبان اب دوبارہ نہیں آئیں گے، پوست کی کاشت سے باز آنے والے نہیں ہیں اور یہ بات طالبان کے حق میں جارہی ہے۔
- مضمون میں ''نیوز ویک'' کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ امریکی رائے عامہ افغان جنگ کو مزید بڑھانے کے حق میں نہیں ہے۔ ایک سروے کے مطابق ۷۱ فیصد امریکی عوام کی رائے یہ ہے کہ صدر اوباما کو امریکی معیشت کی بحالی کی طرف توجہ دینی چاہیے، جبکہ ۲۸ فیصد امریکی افغان جنگ میں مزید پیش رفت کی حمایت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف افغان رائے عامہ کا حال یہ ہے کہ عام انتخابات میں حصہ لینے والے بیشتر امیدوار اس جنگ کو ''جنگ اوباما'' قرار دے کر اس کی مذمت کر رہے ہیں۔
- مضمون نگار نے اپنے اس تجزیے میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا امریکہ کے افغانستان سے نکل جانے سے مسئلہ حل ہوجائے گا؟ یہ بات آسان نہیں ہے، امریکہ کے نکل جانے سے افغانستان کی کمزور حکومت ختم ہوجائے گی اور وہی کیفیت پیدا ہوجائے گی جو ۱۹۸۹ء میں سوویت افواج کی واپسی کے بعد رونما ہوئی تھی کہ افغانستان داخلی خانہ جنگی کا شکار ہوگیا تھا۔ پھر جنوبی افغانستان کے پشتون، شمال کے تاجکون کو، جو موجودہ حکومت میں مضبوط حیثیت رکھتے ہیں، اپنا دشمن تصور کریں گے۔۔۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ پاکستان کی پشتیبانی سے وہ آگے آجائیں گے جو ظاہر ہے کہ طالبان ہی ہوسکتے ہیں۔

یہ ہے افغانستان کی صورتحال کے بارے میں ہفتہ نامہ امید کا پیش کردہ ایک ہلکا سا خاکہ، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

صدر قذافی کا جنرل اسمبلی سے خطاب

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---اکتوبر ۲۰۰۹ء

لیبیا کے صدر معمر القذافی نے گذشتہ روز اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا جو ان کے چالیس سالہ دور اقتدار میں اس عالمی فورم پر ان کا پہلا خطاب تھا۔ انہوں نے مغربی ملکوں کی پالیسیوں اور اقوامِ متحدہ کے کردار پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسرائیل کی طرفداری کر رہے ہیں اور انہوں نے عراق اور افغانستان پر ناجائز فوج کشی کی ہے، انہوں نے سوال کیا کہ اگر ویٹیکن میں مذہبی ریاست ہو سکتی ہے تو طالبان کی مذہبی حکومت کو کیوں برداشت نہیں کیا جا رہا۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا شق وار جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ خود اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک اس منشور کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے اقوامِ متحدہ کا منشور خطاب کے دوران پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کو بے عمل ادارہ قرار دیتے ہوئے اس کی جنرل اسمبلی کو لندن کے ہائیڈ پارک کارنر سے تشبیہ دی جہاں صرف تقریریں کی جاتی ہیں اور لوگ آ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

صدر معمر القذافی نے جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا جرأتمندانہ اظہار کیا ہے، ان کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کے باوجود ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے عالم اسلام کی رائے عامہ کی ترجمانی کی ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو اس عالمی فورم کے ذریعے بین الاقوامی حلقوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ خطاب بھی عملاً "ہائیڈ پارک کارنر" ہی کی ایک تقریر ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم صدر قذافی کے اس جرأتمندانہ خطاب کو سراہتے ہوئے ان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان باتوں کی اصل جگہ اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کا سربراہی اجلاس اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل ہے، کیا ہم ان پالیسی ساز فورموں میں اس طرح کا جرأتمندانہ موقف پہنچانے کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے؟

دینی مدارس پر دہشت گردی کا الزام

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۹ء

بلتستان کے دورے کے کچھ تاثرات ابھی باقی ہیں لیکن اس سے قبل ۱۷ اکتوبر کو لاہور کے ایک ہوٹل میں "دینی تعلیم اور عصری تقاضے" کے زیر عنوان منعقد ہونے والے سیمینار کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سیمینار کا اہتمام تحریک اصلاح تعلیم اور صفا اسلامک سنٹر کے سربراہ ڈاکٹر محمد امین نے ایک قومی اخبار کے مذہبی ونگ کے

تعاون سے کیا، اور اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے علاوہ صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان، صوبائی وزیر جیل خانہ جات چودھری عبد الغفور، جسٹس (ر) منیر احمد مغل، معروف صحافی جناب عطاء الرحمان، ڈاکٹر محمد طاہر مصطفٰی، سید افتخار حسین شاہ اور دیگر مقررین کے علاوہ راقم الحروف نے بھی گزارشات پیش کیں۔

سیمینار کے مہمان خصوصی صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان تھے، انہوں نے اپنی گفتگو میں دینی مدارس کے موجودہ کردار اور ان کے بارے میں مختلف اطراف سے کیے جانے والے منفی پراپیگنڈا کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا، ان کی اس فکر انگیز گفتگو کے کچھ حصے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

رانا صاحب نے کہا کہ دینی مدارس کے بارے میں عمومی طور پر یہ تاثر پھیلتا جا رہا ہے کہ وہ دہشت گرد تیار کر رہے ہیں اور دہشت گردی کی جو رو اس وقت موجود ہے وہ ان کی وجہ سے ہے۔

دراصل یہ بات سب سے پہلے امریکہ کی طرف سے کہی گئی تھی جسے لاشعوری طور پر ہمارے ہاں بھی قبول کر لیا گیا ہے، پھر ہمارے میڈیا اور دانش وروں نے بھی وہی کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ جبکہ یہ بات غلط ہے اس لیے کہ ان دینی مدارس کی تاریخ تو صدیوں پرانی ہے جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ابھی ایک عشرے کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے موجودہ ماحول سے پہلے ان مدارس میں دہشت گرد کیوں پیدا نہیں ہو رہے تھے اور اس وقت ان پر یہ الزام کیوں نہیں تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو مذہبی جذبہ کے ساتھ یہ جنگ لڑ سکیں، ایسے افراد ظاہر ہے کہ دینی مدارس سے ہی مل سکتے تھے۔ جبکہ اس وقت پاکستان کے فوجی حکمران کو بھی امریکہ کے ساتھ تعاون کیلئے اس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دینی مدارس سے ایسے افراد کو تلاش کیا گیا اور انہیں تیار کر کے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف صف آراء کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے پورے خلوص اور جذبۂ جہاد کے ساتھ یہ جنگ لڑی اور سوویت یونین کو شکست دی۔ ان لوگوں کے خلوص اور جذبۂ ایمانی میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کے پیچھے جو ماسٹر مائنڈ تھے ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ انہوں نے سوویت یونین کی شکست کے بعد ان مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا اور کہہ دیا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں رہی، اپنی زندگی کا راستہ اور ذرائع خود تلاش کرو۔ انہیں اگر اس وقت فوج میں بھرتی کر لیا جاتا یا قومی پالیسی کے تحت کسی کام پر لگا دیا جاتا تو یہ صورتحال جو آج پیدا ہوئی ہے نہ ہوتی۔ لیکن امریکہ نے انہیں تنہا چھوڑ دیا اور جن پاکستانی اداروں نے جہاد افغانستان میں ان کی پشت پناہی کی تھی وہ پیچھے ہٹ گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شخص نے جدید ترین اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے اور سالہا سال تک اس کے استعمال کا تجربہ بھی کیا ہے، وہ زندگی گزارنے کیلئے اس کے سوا اور کون سا راستہ تلاش کرے گا؟ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس لیے ان مجاہدین کو دہشت گردی کی طرف لے جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں ہے اور نہ ہی وہ انہیں اس مقصد کیلئے تیار کرتے ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ان قوتوں پر ہے جنہوں نے انہیں سوویت یونین کے خلاف جہاد کیلئے استعمال کیا، پھر انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے آزاد اور تنہا چھوڑ دیا۔

جہادِ افغانستان اور افغان طالبان کا پس منظر

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

پاکستان کی موجودہ کشمکش کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے اس فکری اور نظریاتی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ کشمکش اس مقام تک پہنچی ہے۔ یہ فکری اور نظریاتی کشمکش قیامِ پاکستان کے بعد فوراً ہی شروع ہوگئی تھی کہ پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے اور دستوری و قانونی نظام کی بنیاد کیا ہوگی؟

وہ عناصر جنہوں نے برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے داخلے کے وقت سے ہی اس خطے پر برطانوی راج کی مزاحمت کا آغاز کر دیا تھا اور مختلف اوقات، مراحل اور علاقوں میں سراج الدولہؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحریکِ ریشمی رومال تک مسلح مزاحمت، اور اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کے ذریعے برطانوی تسلط سے وطن عزیز کی آزادی کیلئے متحرک کردار ادا کیا تھا، ان کا مقصد اور ایجنڈا یہ تھا کہ مسلمانوں کیلئے اور اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس نئی ریاست میں معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل اسلامی شریعت اور احکام و قوانین کی بنیاد پر ہو، اور پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ملک کے طور پر دنیا میں اپنا کردار ادا کرے۔ سراج الدولہؒ، ٹیپو سلطانؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حاجی شریعت اللہؒ، سردار احمد خان کھرلؒ، تیتومیرؒ، فقیر ایپیؒ، حاجی صاحب ترنگزئیؒ، اور ۱۸۵۷ء کے ہزاروں مجاہدین سمیت ان گروہوں میں سے جس گروہ کو جہاں موقع ملا، اس نے اپنے زیر تسلط علاقے میں اسلامی شریعت کا اجرا و نفاذ کر کے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے مقصد کو واضح کیا۔ حتٰی کہ برصغیر کے بڑے علاقے میں مسلح جدوجہد ترک کر کے جب پُر امن اور عدم تشدد پر مبنی تحریک آزادی کو آگے بڑھایا گیا تو بھی مقصدِ آزادی یہی قرار پایا کہ برطانوی تسلط سے نجات پانے کے بعد مسلم معاشرہ میں اسلامی شریعت کے اجرا و نفاذ کا اہتمام کیا جائے گا۔ چنانچہ مسلم لیگ کا دو قومی نظریہ، مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریکِ خلافت اور مجلسِ احرارِ اسلام کی حکومتِ الٰہیہ اسی جذبہ اور نظریہ کی ترجمان اور عکاس تھی۔

دوسری طرف وہ عناصر اور طبقات جنہوں نے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سالہ، اور باقاعدہ برطانوی راج کے نوے سالہ دور میں، ایک نوآبادیاتی نظام کے کل پرزوں کا کردار ادا کیا تھا، اور اپنے فکر و مزاج کو اسی کے مطابق ڈال کر اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا، پاکستان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں کوئی نظریاتی اور تہذیبی انقلاب ان کے مزاج اور مفادات کے خلاف تھا۔ اس لیے انہوں نے نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے اور اپنا تمام وزن اس کے پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ کیا اور اب تک وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ان عناصر و طبقات کو تین معاملات میں برتری حاصل رہی ہے:

- برطانوی دور میں سیاسی، انتظامی اور معاشی نظم و نسق ان کے ہاتھ میں تھا جو آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہی کے ہاتھ میں رہا۔
- بین الاقوامی رجحانات بالخصوص نئی عالمی استعماری قوتوں کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل چلی آرہی ہے، اس لیے کہ جن قوتوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرا کے اس کے مرکز ترکی کو سیکولر جمہوریہ بنانے میں کامیابی حاصل

کرلی تھی، انہیں اسلام کے نام پر ایک نئے ملک کا قیام اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کسی طرح گوارا نہیں تھی۔ جبکہ سرمایہ دارانہ بلاک اور سوشلسٹ بلاک کے درمیان جاری عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی ضرورت یہ تھی کہ سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی رجحانات بالخصوص ان کے جذبۂ جہاد سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لیے مغربی بلاک نے یہ حکمتِ عملی طے کی مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے تو سوویت یونین کے خلاف فائدہ اٹھایا جائے لیکن ان کے نفاذِ شریعت کے پروگرام کو کسی جگہ بھی کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ سرمایہ دارانہ بلاک کی یہ حکمتِ عملی پاکستان کے ان داخلی عناصر وطبقات کی پشت پناہ بن گئی جو اس ملک میں نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کو باقی رکھنے میں اپنی عافیت محسوس کررہے ہیں۔

- ملک کے تعلیمی نظام پر بھی انہی کا کنٹرول تھا، اس لیے اس بات کا بطور خاص اہتمام کیا گیا کہ ریاستی تعلیمی اداروں میں ایسے رجالِ کار اور افراد تیار نہ ہونے پائیں جو نوآبادیاتی نظام میں کسی قسم کی تبدیلی اور اسلامی شریعت کے احکام وقوانین کے نفاذ واجرا کا ذریعہ بن سکیں۔

اس تناظر میں وہ عناصر وطبقات جو برطانوی تسلط سے آزادی کا اصل مقصد نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ اور اسلامی احکام وقوانین کے اجراو نفاذ کو قرار دیے ہوئے تھے، انہوں نے پُرامن سیاسی، جمہوری اور دستوری جدوجہد کے ذریعے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد کی منظوری سے لے کر، ۱۹۷۳ء کے دستور میں ملک کو اسلامی ریاست قرار دلوانے، اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی ضمانت حاصل کرنے تک، تمام مراحل پُرامن سیاسی اور دستوری جدوجہد کے ذریعے طے کیے۔ انہیں دو سو سالہ تحریکِ آزادی کے شاندار پسِ منظر کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کی اسلام کے ساتھ جذباتی وابستگی اور نفاذِ اسلام کیلئے دینی قوتوں کے متحرک کردار کی پشت پناہی حاصل تھی اور ملک کی رائے عامہ ان کے ساتھ تھی، اس لیے وہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود مسلسل پیشرفت کرتے رہے۔

اس دوران ایک اور اہم واقعے نے نفاذِ شریعت کے حوالے سے حکمران طبقات سے عوام کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ وہ یہ کہ بہاولپور، سوات، قلات، خیرپور اور دیگر ایسی ریاستوں میں جہاں برطانوی استعمار کے تسلط کے دوران عدالتی سطح پر شرعی قوانین کی عملداری موجود تھی، پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق کے ساتھ ہی ان میں شرعی قوانین کا نظام ختم کردیا گیا۔ جس نے عوام اور دینی حلقوں میں اس سوچ کو پختہ کردیا کہ آزادی کے مقصد کے حصول، نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ، اور اسلامی شریعت کی عملداری کیلئے جو کچھ کرنا ہے خود انہی کو کرنا ہے، اور ملک کی رولنگ کلاس سے اس کیلئے کسی حمایت یا سہولت کی توقع عبث ہے۔

اس پسِ منظر میں جب افغانستان میں سوویت یونین کی باقاعدہ افواج کی آمد کے بعد وہاں جہاد کے عنوان سے قومی خودمختاری اور آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو پاکستان کے دینی حلقوں اور عوام کا اس طرف متوجہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ جہادِ افغانستان میں افغان عوام کا ایجنڈا یہ تھا کہ وہ سوویت یونین کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے، جبکہ پاکستان

کے دین کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھنے والوں کا ایجنڈا یہ تھا کہ وہ اپنے افغان بھائیوں کی مدد کے ساتھ ساتھ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد جب افغانستان میں اسلامی شریعت کی عملداری قائم ہوگی تو اس سے پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کرنے والوں کو بھی تقویت ملے گی اور ان کیلئے اپنے مقصد اور منزل کی طرف پیشرفت آسان ہوجائے گی۔ سوویت یونین کی شکست اور عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی کامیابی کی حد تک یہ ایجنڈا عالم اسلام کے بیشتر ممالک اور مغربی استعماری قوتوں کے مفاد میں تھا، اس لیے انہوں نے افغان جہاد کو مکمل طور پر سپورٹ کیا، لیکن یہ طے کر کے کیا کہ سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے تو پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے مگر اس کے نتیجے میں شریعت کے نفاذ کے ایجنڈے کو افغانستان میں پوری قوت کے ساتھ روک دیا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جونہی جہادِ افغانستان نے روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی اور عالمی سطح پر سوویت بلاک کے بکھر جانے کا ہدف حاصل کر لیا، مجاہدین کے بارے میں سرمایہ دارانہ بلاک کا طرزِ عمل تبدیل ہوگیا۔ افغانستان میں مجاہدین کی مستحکم حکومت بنوانے کی بجائے ان کے مختلف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کیلئے کھلا چھوڑ دیا گیا بلکہ اس خانہ جنگی کی حوصلہ افزائی کر کے مجاہدین کو بتدریج کمزور کرتے چلے جانے کی حکمتِ عملی طے کر لی گئی۔ جس کے نتیجے میں تاریخِ انسانی کا یہ اندوہناک المیہ سامنے آیا کہ جن ممالک اور قوتوں نے جہادِ افغانستان کے ثمرات دونوں ہاتھوں سے سمیٹے، انہوں نے جنگ لڑنے اور قربانیاں دینے والے مجاہدین کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ جہاد افغانستان کے نتیجے میں:

- عالمی سطح پر سوویت یونین کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ بلاک کو فتح حاصل ہوئی،
- مشرقی یورپ کی ریاستیں آزاد ہوئیں،
- بالٹیک ریاستوں نے کسی جدوجہد کے بغیر آزادی کی منزل حاصل کر لی،
- وسطی ایشیا کی ریاستوں نے خود مختاری حاصل کی،
- دیوار برلن ٹوٹی اور جرمنی ایک بار پھر متحد ہوگیا،
- پاکستان نے بلوچستان کے ساحلوں تک سوویت یونین کی رسائی کے خوف سے نجات پائی،

مگر ان سب نے جہادِ افغانستان کے ثمرات سے اپنی اپنی جھولیاں بھرنے کے بعد مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا۔ جہادِ افغانستان سے بیرونی قوتوں نے اپنے اپنے مقاصد حاصل کر لیے لیکن جنگ لڑنے اور اس میں لاکھوں جانوں کی قربانی دینے والوں کا اپنا مقصد، کہ افغانستان ایک اسلامی ریاست بنے اور اس میں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو، ادھورا رہ گیا۔ مجاہدین کے مختلف گروپوں کو اکٹھا بٹھانا، ان کا کوئی مشترکہ ایجنڈا طے کرنا اور ان کے مستقبل کی حدود اور دائرۂ کار کا تعین کرنا جہادِ افغانستان میں ان کو سپورٹ کرنے والوں اور ان کو قربانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی ذمہ داری تھی۔ لیکن جب سب نے اپنا اپنا حصہ وصول کر کے گھروں کی راہ لی اور مجاہدین کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تو ظاہر ہے کہ اب مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنا اپنا ایجنڈا خود ہی طے کرنا تھا جو انہوں نے کیا اور اسی کے تلخ نتائج نہ صرف جنوبی ایشیا کے پورے خطے کو بلکہ مجاہدین سے لاتعلقی اختیار کرنے والوں کو بھی بھگتنا پڑ رہے ہیں۔

طالبان کے مختلف گروہوں نے اسی صورتحال کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس پس منظر سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے کردار اور نفسیات کو سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے مجاہدین کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کے کردار کا الگ الگ تجزیہ کرنا بھی موجودہ صورتحال کے صحیح ادراک کیلئے ضروری ہے۔

1. جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کا ایک بڑا حصہ افغانستان کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جنہوں نے سوویت یونین کے فوجی تسلط سے آزادی اور اپنے ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کی بحالی کیلئے جنگ لڑی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جہادِ افغانستان کے نتیجے میں سوویت فوجوں کی واپسی اور مجاہدین کی حکومت قائم ہو جانے کے باوجود جہاد کے اصل مقصد یعنی نفاذِ شریعت کی طرف کوئی مؤثر پیشرفت نہیں ہو رہی بلکہ بدامنی، افراتفری، لاقانونیت اور خانہ جنگی بڑھتی جا رہی ہے، تو وہ اس کے ردعمل میں طالبان کی صورت میں سامنے آئے اور ملک کے ایک بڑے حصے میں پانچ سال تک حکومت قائم کر کے جہادِ افغانستان کے منطقی ہدف کو دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔ اور اب وہ امریکی اتحادی فوجوں کے خلاف اسی طرح جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کے خلاف لڑی تھی اور وہ اسے بھی آزادی اور خود مختاری کی جنگ سمجھتے ہیں۔
2. جہادِ افغانستان میں شامل مجاہدین کا دوسرا بڑا حصہ ان ہزاروں پاکستانی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد وطن واپس آئے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی راہنمائی اور ان کے جذبات و تجربات کو صحیح رخ پر لگانے کیلئے منصوبہ بندی پاکستان کے قومی حلقوں کی ذمہ داری تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید کچھ ذمہ دار حلقوں نے انہیں اس لیے کھلا چھوڑ دیا ہو کہ ان سے کشمیر میں اسی طرح فائدہ اٹھایا جا سکے گا جس طرح افغانستان میں ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، مگر غالباً عالمی قوتوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ جس کے نتیجے میں مجاہدین کے ان گروپوں نے بھی اپنا اپنا ایجنڈا خود طے کیا اور اپنے اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق میدانِ کار منتخب کر لیا۔ بہت سے افراد کی صلاحیتیں فرقہ وارانہ کشمکش کو بڑھانے میں استعمال ہوئیں جبکہ بہت سے گروہوں نے پاکستان کو افغانستان پر قیاس کرتے ہوئے نفاذِ شریعت کیلئے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیا اور ملک کی رولنگ کلاس کا طرزِ عمل اس مسلح جدوجہد کیلئے بتدریج راستہ ہموار کرتا چلا گیا۔ مثلاً سوات میں نفاذِ شریعت کیلئے جب جدوجہد شروع ہوئی تو طالبان کا کہیں بھی کوئی وجود نہیں تھا اور اس تحریک کا پسِ منظر صرف اتنا تھا کہ سوات کے عوام مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں ان کے ریاستی دور کا وہ عدالتی نظام واپس کر دیا جائے جو نہ صرف برطانوی دور میں بلکہ ۱۹۶۹ء تک پاکستان کے دور میں بھی رائج رہا ہے۔ ان کے خیال میں شرعی قوانین پر مبنی وہ عدالتی نظام انہیں سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدہ و مذہب سے بھی مطابقت رکھتا ہے، اس لیے وہی ان کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ ان کا یہ موقف قبول کر لیا گیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعے انہیں یہ نظام مہیا کرنے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن وہ آرڈیننس محض الفاظ کا ہیر پھیر

تھا جس کی حقیقت واضح ہونے کے بعد عوام کے جذبات میں شدت پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ موجودہ حالات تک بات جا پہنچی۔ اس قسم کے ماحول میں جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے پاکستانی مجاہدین کے بعض گروہوں نے نفاذِ اسلام کیلئے شدت پسندی کا راستہ اختیار کیا جس کی ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں نے کبھی حمایت نہیں کی اور خود ہم بھی اس طریق کار کو کھلے بندوں غلط قرار دینے والوں میں شامل ہیں، لیکن اس کے پسِ منظر اور اسباب و عوامل کو نظر انداز کر دینا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

3. جہادِ افغانستان میں شامل مجاہدین کا تیسرا حصہ دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے ان ہزاروں افراد پر مشتمل تھا جنہوں نے سوویت افواج کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ لیا، مگر اس جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے اپنے ملک میں واپس جانے میں ان کے تحفظات تھے اور انہیں خدشہ تھا کہ وطن واپسی کی صورت میں ان کی جان اور آزادی کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ان کیلئے پاکستان ہی پناہ گاہ ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے یہاں رہ جانے کو ترجیح دی اور پاکستان میں آباد ہونے کیلئے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان کا بڑا حصہ پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں آباد ہوا۔ ان کے بارے میں ایک مجموعی پالیسی طے کرنا اور انہیں منظم طریقے سے پاکستانی معاشرے میں ایڈجسٹ کرنا حکومت پاکستان کی ذمہ داری تھی جس کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی اور انہیں بھی اپنے اپنے جذبات اور صلاحیتوں کے اظہار کیلئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مجاہدین کے اسی حصے میں سے القاعدہ وجود میں آئی جس نے مشرقِ وسطی میں امریکی فوجوں کی موجودگی کو بھی اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ افغانستان میں سوویت یونین کی موجودگی کو دیکھتے تھے۔ اور ان کیلئے اس صورتحال کو قبول کرنا مشکل تھا کہ اگر افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج کی موجودگی افغانستان کی قومی خود مختاری اور آزادی کے منافی تھی تو مشرق وسطی میں امریکی افواج کی موجودگی ان ممالک کی قومی خود مختاری کیلئے خطرہ کیوں نہیں ہے؟ اور اگر افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی کی جنگ، آزادی کی جنگ اور جہاد تھی تو مشرقِ وسطی سے امریکی اتحاد کی فوجوں کی واپسی کی جنگ، آزادی کی جنگ اور جہاد کیوں نہیں ہے؟

ہمارے نزدیک افغانستان میں طالبان کا منظرعام پر آنا، پاکستان میں نفاذِ شریعت کیلئے مسلح گروپوں کا متحرک ہونا، اور مشرقِ وسطی میں القاعدہ کا وجود اور قوت حاصل کرنا جہادِ افغانستان کی سپورٹر قوتوں کی اس غفلت، بے پروائی اور لاتعلقی کا منطقی نتیجہ تھا جو انہوں نے سوویت افواج کی افغانستان سے واپسی کے بعد جان بوجھ کر اختیار کر لی تھی، اس لیے اس صورتحال کا صرف مسلح گروپوں کا تنہا ذمہ دار قرار دینا زمینی حقائق اور انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ صورتحال نائن الیون کے المناک سانحہ کے بعد نمودار ہوئی ہے، مگر یہ بات درست نہیں ہے بلکہ خود نائن الیون کا حادثہ بھی انہی اسباب و عوامل کے باعث پیش آیا ہے۔ البتہ نائن الیون کے المناک سانحہ نے ان اسباب و عوامل کو مہمیز دی ہے اور ان کی قوت کار میں اضافہ کیا ہے جس کے بعد صورتحال تیزی کے ساتھ مزید

بگڑتی چلی گئی ہے۔ نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں اور طالبان کی حکومت ختم ہوئی تو مجاہدین کے مختلف گروپوں میں اشتعال کا بڑھنا اور ان میں باہمی تعاون اور ہم آہنگی کا فروغ بھی ایک فطری امر تھا جس کا سب سے زیادہ اثر پاکستان کی داخلی صورتحال پر پڑا۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عالمی قوتوں اور پاکستان کی رولنگ کلاس نے مشترکہ طور پر اس مرحلے میں یہ حکمتِ عملی طے کر لی کہ مجاہدین کے مختلف گروپوں کی شدت اور اشتعال کو کم کرنے کی کوششوں کی بجائے علاج بالمثل کے طور پر اسے مزید بڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے اور وقفہ وقفہ سے مختلف علاقوں میں انہیں اشتعال دلا کر سامنے لایا جائے اور پھر اجتماعی کارروائی کے ساتھ انہیں کچل دیا جائے۔ سوات اور وزیرستان میں یہی کچھ ہوا ہے اور اب جنوبی پنجاب میں اسی قسم کی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارے خیال میں پاکستان میں شدت پسندی اور اس کے ذریعے مختلف طبقات کے درمیان کشمکش کا یہ ماحول اس پس منظر سے ہٹ کر بھی بعض عالمی اور علاقائی قوتوں کی ضرورت ہے جس کیلئے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ مسلح شدت پسندی اور دہشت گردی کراچی میں قومیت اور زبان کے حوالے سے اپنا کام دکھا چکی ہے، بلوچستان میں یہی ایجنڈا قومیت کے نام سے پیشرفت کر رہا ہے، سوات اور وزیرستان میں اس نے شریعت کے نفاذ کا عنوان اختیار کیا ہے، سنی اور شیعہ مسلح تصادم کے پیچھے یہی بیرونی مفادات کار فرما ہیں، اور اب دیوبندی بریلوی کشمکش کو فروغ دے کر پنجاب میں یہ صورتحال پیدا کرنے کی کوشش میں بھی یہی عوامل متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

دینی مدارس پر دہشت گردی کا الزام

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

انتہا پسندانہ جماعتوں کی تنظیم سازی اور ٹریننگ میں دینی مدارس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مدارس قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں اور اسلامی عقائد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کے فروغ اور مسلم معاشرہ میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کی تعلیم و ترغیب دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ مسلح تحریکیں اپنا مقصد اور ایجنڈا اسی کو بتاتی ہیں اس لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تنظیمیں مدارس کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ مذکورہ بالا مقاصد کیلئے ملک میں جو جماعتیں اور افراد پُرامن طور پر اور سیاسی و جمہوری جدوجہد کے ذریعے کام کر رہی ہیں، وہ بھی انہی دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، اور جو لاکھوں علماء کرام، مدرسین اور خطباء و ائمہ ملک بھر میں انتہائی امن و سکون کے ساتھ اور پورے امن و سلامتی کے ماحول میں دینی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں، انہوں نے بھی انہی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

دینی مدارس سے تعلیم پانے والے وہ حضرات جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں پُرامن طور پر تعلیمی اور دعوتی خدمات بجا لا رہے ہیں، اور وہ حضرات جو مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کے درمیان تناسب آٹے اور نمک کا بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انتہا پسندانہ تنظیموں کے قیام میں دینی مدارس کا کوئی کردار ہے، قطعی طور پر درست

بات نہیں ہے۔ بالخصوص مجاہدین کے گروپوں کی تنظیم سازی تو جہادِ افغانستان کے دور میں آئی ایس آئی کے زیر سایہ ہوئی ہے اور اسی کا تسلسل اب بھی چلا آرہا ہے۔ پھر مجاہدین کی ٹریننگ بھی مدارس کے ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ ان کی تنظیم سازی اور لانچنگ کی راہ ہموار کرنے والوں نے ہی ان کی ٹریننگ کے سارے مراحل طے کرائے ہیں۔

پھر ایک اور پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ عالمی سطح پر القاعدہ کے جس نیٹ ورک کو مبینہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت قرار دیا جاتا ہے، اس کے بیشتر ارکان یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں، لیکن ان کی وجہ سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو انتہا پسندی کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح اگر دینی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کی کچھ تعداد اس عمل میں شریک ہے تو اس کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈال دینا بھی انصاف کی بات نہیں ہے۔

برصغیر میں دینی مدارس کے موجودہ آزادانہ نظام کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہوا تھا اور ان کی تاریخ کم و بیش ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے، جبکہ موجودہ شدت پسندی کی تنظیموں کی عمر ربع صدی کے لگ بھگ ہے، اس لیے بھی مدارس کے ڈیڑھ سو سالہ پُرامن کردار کو نظر انداز کر کے انہیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے موجودہ گروپوں کی تنظیم و تشکیل کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔

افغان طالبان اور پاکستانی طالبان

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

طالبان کو ہم دو الگ الگ حصوں میں سمجھتے ہیں:

1. افغانستان کے طالبان کے بارے میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ وہ جہادِ افغانستان کے دوران سوویت افواج کی واپسی کے بعد افغانستان میں پیدا کی گئی افراتفری، خانہ جنگی اور جہاد کے نظریاتی اہداف کو نظر انداز کیے جانے کے نتیجے میں سامنے آئے تھے، اور افغانستان کے ایک بڑے حصے میں منظم حکومت قائم کر کے انہوں نے شرعی نظام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زیر حکومت علاقے میں امن بھی قائم کیا تھا۔ جب کہ افغانستان میں امریکی افواج کی آمد کے بعد ان کا خیال ہے کہ وہ اسی طرح قومی آزادی اور اسلامی تشخص کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے روسی افواج کی موجودگی کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ وہ افغانستان کے مخصوص حالات اور کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہاں کے حالات و ضروریات کو بہتر طور پر سمجھتے ہوئے ان سے نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

البتہ جب ان کی حکومت قائم تھی، اس دوران ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کریں اور دستور سازی اور قانون سازی کے حوالے سے پاکستان کے علماء کرام کی پارلیمانی جدوجہد کو سامنے

رکھ کر اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے دستور و قانون کی تشکیل کے مراحل طے کریں۔ اس وقت ہم نے انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بین الاقوامی معاملات اور ملک کے معاشی و اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل میں ان بین الاقوامی ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی ترویج و تنفیذ میں کردار ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ایسے ماہرین نہ صرف مسلم ممالک میں موجود ہیں بلکہ مغربی دنیا اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں میں بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اب اگر افغانستان میں ان کی دوبارہ حکومت قائم ہوتی ہے جس کے امکانات کا عالمی پریس میں مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے تو ہمارا انہیں یہی مشورہ ہوگا کہ:

- دستوری حکومت تشکیل دیں،
- پاکستان کے دینی حلقوں کی پارلیمانی جدوجہد سے راہنمائی حاصل کریں، اور
- مختلف شعبوں میں ان مسلم ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو نفاذِ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

2. مگر پاکستان میں طالبان کے نام سے کام کرنے والے گروہوں کے بارے میں ہماری رائے یہ نہیں ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ گروہ اگرچہ نفاذِ شریعت کے بارے میں پاکستان کی رولنگ کلاس کے مسلسل منافقانہ رویے کے ردعمل میں نمودار ہوئے ہیں، لیکن ایک تو ان کا طریق کار درست نہیں ہے۔ اور دوسرا ان کی جدوجہد کا فائدہ ان قوتوں کو مل رہا ہے جو پاکستان میں افراتفری اور خانہ جنگی کا ماحول قائم کرنا چاہتی ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ نفاذِ شریعت کے نام پر ایسی الٹی سیدھی حرکتیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں جو رائے عامہ کو نفاذِ شریعت کے عمل اور جدوجہد سے متنفر کرنے کا باعث بنیں۔ پاکستان میں طالبان کے گروہوں نے متعدّد ایسی حرکات کی ہیں جو اس ضمن میں آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے بہت سے طالبان غیر شعوری طور پر اس سازش کا حصہ بنے ہوں، لیکن شعوری طور پر اس مقصد کیلئے استعمال ہونے والوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ پاکستانی طالبان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان قوتوں کے حق اور فائدے میں استعمال ہو رہے ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اور ان کی سرگرمیوں سے ملک اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں نفاذِ اسلام کیلئے قراردادِ مقاصد، علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات، اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کی بنیاد پر سیاسی اور دستوری جدوجہد ہی صحیح راستہ ہے۔ اور طالبان یا اس طرز پر کام کرنے والے تمام گروہوں کو ملک کے جمہور علماء کے موقف اور پالیسی پر واپس آجانا چاہیے۔

جہادِ افغانستان اور پاکستان کے مذہبی حلقے

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

افغانستان میں روسی افواج کی آمد کے بعد جہاد کا اعلان افغانستان کے علماء کرام نے کیا تھا اور پاکستان کی متعدّد دینی جماعتوں اور مدارس کے طلبہ و اساتذہ نے اس کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس میں عملی طور پر شرکت بھی کی تھی۔ یہ حمایت اور تعاون اس بنیاد پر تھا کہ اپنے وطن کی آزادی اور قومی خود مختاری کی بحالی کیلئے افغان عوام کی جنگ نہ صرف ان کا قومی حق ہے بلکہ یہ شرعی فریضہ اور جہاد بھی ہے، اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اس جہادِ آزادی میں ان سے تعاون اور ان کی امداد دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پڑوسی مسلمانوں پر شرعاً واجب ہے۔ وہ جہاد کی فضیلت و اہمیت اور اس کے احکام و مسائل قرآن و سنت اور فقہ میں مسلسل پڑھتے چلے آرہے تھے جن پر عملدرآمد کا انہیں موقع سامنے نظر آرہا تھا۔ نیز مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے تسلط اور عالمِ اسلام کے وسائل اور متعدّد مقامات پر غیر مسلم طاقتوں کے قبضہ اور وہاں کی اکثریتی مسلم آبادی کو آزادی اور اسلامی تشخص سے محروم کر دینے کے تناظر نے انہیں مسلط قوتوں کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبہ سے بھی سرشار کر رکھا تھا، چنانچہ انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔

ابتدا میں افغان علماء کے اس اعلان جہاد اور پاکستان کے دینی حلقوں کی طرف سے ان کی حمایت و تعاون کو دیوانے کا خواب سمجھا گیا اور کھلم کھلا یہ کہا گیا کہ یہ چند مذہبی دیوانے اور بے وقوف ہیں جو ایک عالمی طاقت کے ساتھ ٹکرا کر اپنا سر پھوڑنے جا رہے ہیں۔ مگر ان دیوانوں کی یہ دیوانگی جاری رہی، کم و بیش تین سال تک کیفیت یہ تھی کہ ان مجاہدین نے عام طور پر میسر معمولی ہتھیاروں کے ساتھ فقر و فاقہ کے ماحول میں گوریلا جنگ لڑی۔ انہیں پاکستانی حکومت اور اس کے بعد پاکستانی عوام کی تھوڑی بہت حمایت حاصل تھی۔ اس زمانے میں یہ مجاہدین شیشے کی بوتلوں میں پٹرول اور صابن کا محلول بھر کر مصنوعی بم بنایا کرتے تھے اور انہیں ٹینک شکن ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان تین چار برسوں میں ان مجاہدین کے استعمال میں آنے والے ہتھیار اگر کسی جگہ یادگار کے طور پر محفوظ کیے گئے ہوں تو انہیں دیکھ کر اس دور کی جنگ کے ماحول کا آج بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بے سروسامانی کی جنگ کے نتیجے میں جب افغانستان کے ایک بڑے حصے میں مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنے زیر اثر علاقے قائم کر لیے اور یہ نظر آنے لگا کہ یہ جنگ جاری رہ سکتی ہے تو امریکہ اور دیگر بہت سے ممالک نے اس جنگ میں سوویت یونین کی ہزیمت کے امکانات دیکھ کر اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا اور پھر افغان مجاہدین کے پاس جدید ہتھیاروں اور وسائل کی ریل پیل ہوگئی۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی قیادت سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے بیرونی امداد اور سرمایہ دارانہ بلاک کی معاونت اور حمایت کی حدود طے کرنے کی بجائے انہیں جنگ میں ایک شریک کار کے طور پر قبول کر لیا۔ مجاہدین کے آٹھ مختلف گروپوں کو ملا کر ایک اتحاد قائم کیا گیا اور سرمایہ دارانہ بلاک نے اس جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر افغان مجاہدین کی قیادت کچھ مزید صبر سے کام لے کر بیرونی امداد و تعاون کو انتہائی

ضرورت کی حد تک محدود رکھتے ہوئے پالیسی سازی کے معاملات پر اپنی گرفت قائم رکھتی تو نتائج بہت مختلف ہوتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب کہ ہماری معلومات کے مطابق اس موقع پر افغان مجاہدین کے آٹھ مختلف گروپوں کے متحدہ محاذ کی قیادت میں اس مسئلے پر اختلاف رائے بھی ہوا اور متحدہ محاذ کے سیکرٹری جنرل مولانا نصر اللہ منصور شہید نے سرمایہ دارانہ بلاک کے سامنے افغان مجاہدین کی قیادت کی خود سپردگی کے اس رویے سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ مولانا نصر اللہ منصور شہید کا موقف یہ تھا کہ بیرونی قوتوں سے امداد لی جائے لیکن پالیسی سازی پر اپنا کنٹرول قائم رکھا جائے، مگر وہ اپنے موقف کو منوا نہ سکے اور اتحاد سے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد صورتحال یہ بن گئی کہ افغان مجاہدین اپنے وطن کی آزادی، افغانستان کی قومی خود مختاری، اور ایک شرعی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے لڑ رہے تھے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک سے آنے والے ہزاروں نوجوان اپنے افغان بھائیوں کی امداد اور جہاد میں عملی شرکت کے جذبہ سے لڑ رہے تھے۔ لیکن عالمی قوتیں بالخصوص سرمایہ دارانہ بلاک اس جنگ کے ذریعے سوویت یونین کو شکست دینے کے مقصد کے تحت اس جنگ کو سپورٹ کر رہا تھا اور اسی وجہ سے ایسا ہوا کہ سوویت افواج کی واپسی کے بعد سرمایہ دارانہ بلاک نے اپنا ہدف حاصل کر کے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پہلے دونوں گروہ جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کے حصول کیلئے سرگرداں ہو گئے۔

یہی وہ موقع ہے جب پاکستان میں، جو جہادِ افغانستان کا سب سے بڑا پشت پناہ اور مجاہدین کا بیس کیمپ تھا، حکومتی سطح پر اختلافات پیدا ہوئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اس جنگ کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچانے اور افغان مجاہدین کی حکومت کے قیام اور استحکام تک اس میں عملاً شامل رہنے کا عزم رکھتے تھے، جب کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم اس جنگ کو اسی مرحلہ پر مکمل سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اسی کشمکش کی فضا میں جنیوا معاہدہ نے جنم لیا جو جہادِ افغانستان اور افغان عوام کے بارے میں عالمی قوتوں کی منافقانہ پالیسیوں کا شاہکار تھا اور اس نے افغانستان میں ایک مستحکم حکومت و نظام کے قیام کی بجائے خانہ جنگی اور خلفشار کا نیا ماحول پیدا کیا۔

اسی خلفشار اور خانہ جنگی سے طالبان نے جنم لیا جنہوں نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو کچھ عرصے کیلئے بدامنی اور لاقانونیت سے تو نجات دلا دی لیکن وہ اپنی حکومتی ترجیحات میں ایسی ترتیب قائم نہ کر سکے کہ اپنے اصل اہداف کی طرف مؤثر پیشرفت جاری رکھ سکتے۔ ظاہر بات ہے کہ طالبان کی حکومت کا وجود میں آنا مقامی حالات کا نتیجہ تھا جو عالمی قوتوں کے ایجنڈے اور مفادات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، چنانچہ کچھ عرصہ تک تو ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی اور انہیں عالمی ایجنڈے میں فٹ کرنے کیلئے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش ہوتی رہی، لیکن جب یہ بات طے ہو گئی کہ انہیں عالمی ایجنڈے اور پروگرام میں ایڈجسٹ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے تو ان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

یہ مرحلہ وہ تھا جب افغانستان کے جہاد میں شریک ہونے والے عرب مجاہدین نے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل، بیت المقدس، تیل کی دولت کے استحصال، اور امریکی افواج کی موجودگی کے تناظر میں اپنا ایجنڈا طے کیا اور اس کی طرف پیشرفت کا پروگرام بنایا، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بھی عالمی قوتوں کے مفاد اور ایجنڈے سے متصادم بات تھی۔

افغان طالبان اور عرب مجاہدین کا دائرۂ کار الگ الگ تھا، لیکن نظریاتی اہداف مشترک تھے، اس لیے ایک دوسرے

کے ساتھ ہمدردی، ہم آہنگی اور تعاون کی فضا موجود تھی۔ دوسری طرف یہ دونوں گروہ عالمی استعمار کے پروگرام اور ایجنڈے کیلئے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ مشرقِ وسطی میں اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنا اور افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت کا راستہ روکنا عالمی استعمار کی اولین ترجیحات چلی آرہی ہیں، چنانچہ وہ جنگ جو اس سے پہلے افغان مجاہدین اور سوویت افواج کے درمیان تھی، اب وہی معرکہ افغان مجاہدین، عرب مجاہدین اور امریکی استعمار کے درمیان معرکہ آرائی میں تبدیل ہوگیا۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں مجاہدین کی قیادت کو اپنی ترجیحات کے تعین میں حقیقت پسندانہ طور پر معروضی حالات کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا جو نہیں رکھا جاسکا اور بازی الٹ گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر دونوں جنگیں بیک وقت لڑنے کی بجائے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو مستحکم کرنے کو ترجیح دی جاتی جس کیلئے ایک دستوری حکومت کا قیام، عالمی سطح پر حکمتِ عملی کے ساتھ رائے عامہ کی حمایت کا حصول، اور عالمِ اسلام کی دینی قوتوں کو نظریاتی اور ملی اہداف کیلئے مجتمع کرنا سب سے زیادہ ضروری امور تھے۔ مشرقِ وسطی کی جنگ کو اس وقت تک تھوڑا مؤخر کرلیا جاتا تو یہ ایک بہتر حکمتِ عملی ہوتی، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اور ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہوسکنے کے پیچھے ان دونوں گروہوں کے مجاہدین کے انتہائی خلوص کے باوجود ان دیکھے ہاتھ حرکت میں رہے ہوں گے۔

نائن الیون کے المناک سانحہ نے اس صورتحال میں ڈرامائی تبدیلی پیدا کردی اور وہ کام جو ابھی کئی سالوں میں ہونے تھے، اس کیلئے مہینے اور ہفتے بھی طویل دکھائی دینے لگے۔ اس مرحلہ میں افغان طالبان اور عرب مجاہدین میں سے کسی ایک کو دوسرے کیلئے قربانی دینا تھی اور ہمارے خیال میں اگر یہ قربانی عرب مجاہدین دے دیتے تو افغان طالبان کو سنبھلنے اور عالمِ اسلام میں اپنے بہی خواہوں سے رابطہ و مشاورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کا تھوڑا سا موقع مل جاتا۔ لیکن یہ بھی نہ ہوا اور اپنے عرب مجاہد بھائیوں کی خاطر افغان طالبان نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی حکومت کی قربانی دے دی۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عرب مجاہدین افغان طالبان کیلئے قربانی دیتے تب بھی بالآخر نتیجہ یہی ہونا تھا اور جو کچھ ہورہا ہے اس کا ہونا طے پاچکا تھا۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن ہمارا وجدان یہ کہتا ہے کہ اگر طالبان حکومت اور عالمِ اسلام میں ان کے بہی خواہوں کو باہمی مشاورت و رابطہ اور کوئی راستہ نکالنے کیلئے سنبھلنے کا تھوڑا سا وقت مل جاتا تو نتائج کی شدت کو کم کرنے کے امکانات بہرحال موجود تھے۔ بہرحال اب جو ہونا تھا ہوچکا اور اس کے بعد کے مراحل بتدریج طے ہورہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ افغان قوم کے موجودہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہیں گے اور ان میں نئی کروٹ کے آثار اب افق پر واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس لیے افغان طالبان کو ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرتے ہوئے مستقبل کی نئی منصوبہ بندی اور صف بندی کرنا ہوگی اور دوست دشمن کی پہچان بلکہ نادان اور دانا دوستوں کے درمیان فرق کیلئے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کرنا ہوگا۔

جہاں تک پاکستان کے ان دینی حلقوں کا تعلق ہے جنہوں نے جہادِ افغانستان میں اپنے افغان بھائیوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ شریک کار ہوئے، مختلف مراحل کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کا یہ فیصلہ اور کردار ہمارے خیال میں بالکل درست تھا اور اس پر کسی قسم کی ندامت کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ان

کی قربانیوں سے عالمی سطح پر متحارب دو قوتوں میں سے ایک نے فائدہ اٹھایا اور اپنے مقاصد حاصل کیے، لیکن اگر وہ اس جنگ میں شریک نہ ہوتے اور خاموشی اختیار کر لیتے تو یہی فوائد دوسری عالمی قوت کے پلڑے میں چلے جاتے۔ مجاہدین کے عمل اور قربانیوں سے کسی ایک قوت کو تو فائدہ پہنچنا ہی تھا بلکہ جب بھی کوئی گروہ یا قوت اس قسم کے ماحول میں کوئی کردار ادا کرتی ہے تو لازمی طور پر کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور کسی کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اگر قومیں اپنے فیصلے اس بنیاد پر کرنے لگیں تو شاید ہی کوئی قوم یا طبقہ کسی معرکہ میں کوئی کردار ادا کر سکے۔ فیصلوں کی بنیاد اپنے اہداف پر ہوتی ہے، اس لیے افغان مجاہدین اور ان کے پاکستانی مددگاروں نے جو فیصلہ کیا تھا، عالمی سطح پر اس کا ایک نتیجہ منفی ہے کہ طاقت کا توازن نہیں رہا اور دو قوتوں کے آمنے سامنے رہنے سے کمزور قوتوں کو جو سہارا مل جاتا تھا وہ نہیں رہا اور اب ساری دنیا ایک ہی عالمی طاقت کے رحم و کرم پر ہے، لیکن اس کے فوائد بھی ہوئے ہیں جن کا تذکرہ ہم ابتدا میں کر چکے ہیں کہ اس سے نہ صرف مشرقی یورپ، وسطی ایشیا اور بالٹک ریاستوں کو خود مختاری ملی بلکہ جرمنی کو بھی اتحاد نصیب ہوا ہے۔

باقی رہی بات جہادِ افغانستان کے نظریاتی اہداف کی کہ افغانستان کی قومی خود مختاری بحال ہو اور وہاں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو تو تمام تر خرابیوں اور وقتی ناکامیوں کے باوجود اس کے امکانات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور شاید افغان مجاہدین اپنے ہی ماضی کی ایک روایت دہرانے جا رہے ہیں، محمود غزنویؒ کو سومنات تک پہنچنے کیلئے سترہویں کامیاب حملے سے پہلے سولہ ناکام حملوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن کیا سومنات محمود غزنویؒ کی قدم بوسی سے انکار پر زیادہ دیر قائم رہ سکا تھا؟

دینی مدارس پر چھاپوں کا نیا راؤنڈ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---نومبر ۲۰۰۹ء

جامعہ محمدیہ اسلام آباد اور دیگر متعدّد مدارس پر چھاپوں کے بعد دینی مدارس کے خلاف کاروائی کا ایک نیا راؤنڈ شروع ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ مدارس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں طلبہ کو مبینہ دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور حکمرانوں کے بقول دہشت گرد ان مدارس کو پناہ گاہوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چند ماہ قبل جنوبی پنجاب کے بہت سے مدارس پر چھاپے مارے گئے تھے لیکن ان چھاپوں سے کچھ حاصل نہ ہوا اور اساتذہ و طلبہ کی تفصیلی تلاشیوں کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ان غریبوں کے پاس کتابوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور شب و روز ان کا مشغلہ صرف پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ اب اسلام آباد کے مدارس پر چھاپوں کا نتیجہ بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلا لیکن اس سب کچھ کے باوجود دینی مدارس کے خلاف استعماری قوتوں اور ان کے گماشتوں کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور وہ کسی نہ کسی عنوان سے دینی مدارس کو بدنام کرنے اور ان کے اساتذہ، طلبہ اور منتظمین کو ہراساں کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالتے رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو آواری ہوٹل لاہور میں صفاء اسلامک سنٹر کے زیر اہتمام ''دینی تعلیم اور عصری تقاضے'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں راقم الحروف کو شرکت کا موقع ملا جس میں عنوان کے مختلف

پہلوؤں پر متعدّد اربابِ دانش نے خطاب کیا اور راقم الحروف نے بھی گزارشات پیش کیں، اس موقع پر صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان نے بہت فکر انگیز گفتگو کی جس کا ایک پہلو قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ یہ بات سب سے پہلے امریکہ کی طرف سے کہی گئی تھی کہ ہمارے دینی مدارس میں دہشت گرد تیار ہوتے ہیں اور اب ہمارے ہاں بھی قومی سطح پر لاشعوری طور پر اس سوچ کو قبول کر لیا گیا اور عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس دہشت گرد تیار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے، دینی مدارس دینی تعلیم کیلئے قابل قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں اور ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد میں لڑنے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو دینی جذبہ کے ساتھ لڑ سکیں اس کیلئے پاکستانی حکمرانوں اور اداروں نے دینی مدارس کے طلبہ میں سے افراد کو تیار کرنا شروع کیا، اس لیے کہ دینی جذبہ کے ساتھ وہی لوگ لڑ سکتے تھے جنہوں نے دین کی تعلیم حاصل کی ہے، ان طلبہ نے سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی اور اسے شکست دی، ان مجاہدین کے خلوص اور جذبہ جہاد میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ جہاد کیا۔ لیکن انہیں سپورٹ اور تیار کرنے والوں کے مقاصد میں صرف سوویت یونین کو شکست دینا تھا اس لیے وہ اپنا مقصد حاصل ہو جانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے اور مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا۔ ان مجاہدین سے کہا گیا کہ اب تم اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرو، اگر اس وقت انہیں باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا جاتا یا ان کیلئے قومی سطح پر پالیسی طے کر کے ان کا کوئی پروگرام طے کر لیا جاتا تو صورتحال یہ نہ ہوتی، لیکن انہیں تیار کرنے والے پیچھے ہٹ گئے اور انہیں اپنے مستقبل کا پروگرام طے کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب جس شخص نے جدید ترین اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کی ہے، سالہا سال تک اسے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس نے اس کے سوا کوئی اور کام بھی نہیں سیکھا وہ اپنے مستقبل کا ایجنڈا اس کے سوا کس حوالے سے طے کرے گا؟ اس لیے دہشت گردی کی موجودہ صورتحال کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں بلکہ جہاد افغانستان کے دوران ان مجاہدین کو تیار کرنے والوں پر اور اس کے بعد انہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

یہ اس گفتگو کا خلاصہ ہے جو مذکورہ سیمینار میں صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان نے اس حوالے سے کی ہے۔ ہمیں ان کی اس بات سے مجموعی طور پر اتفاق ہے لیکن ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ اپنے اس حقیقت پسندانہ تجزیے کو کسی ہوٹل کے بند کمرے تک محدود رکھنے کی بجائے ملک کے پالیسی سازوں تک پہنچانے کی کوشش کریں اور دینی مدارس کو بدنام کرنے والوں اور ان کے اساتذہ وطلبہ کو ہراساں کرنے والوں کو بھی یہ بات سمجھائیں کہ وہ مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب و عوامل کا جائزہ لیں اور غریب مدارس پر بلاوجہ غصہ نکالتے رہنے کی بجائے مبینہ دہشت گردی کے اصل محرکات و عوامل کو روکنے کی کوئی صورت نکالیں۔

مولانا حمید الرحمان عباسیؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ء

مولانا حمید الرحمان عباسیؒ کا تعلق ہزارہ کے علاقہ گڑھی حبیب اللہ سے تھا اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے ہوئے بسر ہوا۔ اپنے اساتذہ میں ضلع اٹک کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا نور محمدؒ آف ملہوالی کا نام کثرت سے لیا کرتے تھے، انہی سے حضرت مولانا نور محمدؒ کا نام بار بار سن کر میرے دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اس مقصد کیلئے بطور خاص سفر کر کے ایک رات ملہوالی میں ان کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ بلاشبہ ہمارے دور میں پرانے بزرگوں کے علم و فضل، ورع و تقویٰ، سادگی و قناعت اور عمل و اخلاص کی علامت تھے اور ان حضرات میں سے تھے جنہیں دیکھ کر خدا کی یاد تازہ ہوتی ہے اور جن کی مجلس میں بیٹھ کر ایمان و اخلاص کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔

مولانا حمید الرحمان عباسیؒ شیرانوالہ کے معروف سالانہ دورۂ تفسیر میں ہمارے شیخ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے معاون ہوتے تھے۔ شعبان و رمضان کے دوران مدرسہ قاسم العلوم میں ہونے والے دورۂ تفسیر میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا بڑا حصہ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ پڑھاتے تھے اور ان کی علالت و مصروفیات کی وجہ سے ایک حصہ کی تدریس مولانا حمید الرحمان عباسیؒ کے سپرد ہوتی تھی۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی وفات کے بعد بھی جب تک مولانا عباسیؒ کی صحت نے اجازت دی وہ یہ خدمت مسلسل سرانجام دیتے رہے۔ اس ذوق کے حوالے سے مولانا عباسیؒ کا ایک بڑا کارنامہ ''خلاصہ تفسیر القرآن'' کے عنوان سے ان کا وہ تفسیری سلسلہ ہے جس میں انہوں نے مضامین اور احکام کے حوالے سے قرآن کریم، احادیث نبویہؐ اور مفسرینؒ کے ارشادات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور وہ کئی ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ذخیرہ ''احکام القرآن'' کے حوالے سے فہم قرآن کا ذوق رکھنے والے علماء کرام اور طلبہ کیلئے ایک قیمتی تحفے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا حمید الرحمان عباسیؒ جہادِ افغانستان کے اس دور کے عملی سرپرستوں میں سے ہیں جب میدان میں صرف افغانستان کے علماء و طلبہ تھے اور وہ اپنی پرانی رائفلوں کے ساتھ یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ ہمارے مشاہدہ کے مطابق جہاد افغانستان کے آغاز کے بعد کم و بیش تین سال تک یہ کیفیت رہی ہے کہ ان مجاہدین کا کوئی پرسان حال نہیں تھا اور اس بے سروسامانی کے دور میں انہوں نے افغانستان کے کم و بیش ستر فیصد علاقے کا کنٹرول حاصل کر لیا تو عالمی قوتیں اس جنگ کو سنجیدہ سمجھتے ہوئے اس طرف متوجہ ہوئیں۔ اس بے سروسامانی کے دور میں یہ مجاہدین شیشے کی بوتلوں میں صابن اور پٹرول بھر کر بم بنایا کرتے تھے اور ٹینکوں کو ناکارہ کرنے کیلئے استعمال کیا کرتے تھے۔ افغانستان کے شہر خوست میں کسی زمانے میں اس دور کے مصنوعی اور دیسی ہتھیاروں کی ایک باقاعدہ نمائش گاہ موجود تھی، اگر وہ اب بھی موجود ہے تو اس سے اس دور کی جنگ یا جہادِ افغانستان کے ابتدائی تین چار سالوں کے ماحول کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا حمید الرحمان عباسیؒ اس دور میں ان مجاہدین کیلئے آٹا، چینی، گھی اور دیگر خوردنی اشیاء جمع کر کے وقتاً فوقتاً بھجوایا

کرتے تھے اور مجاہدین کی امداد کیلئے اصحاب خیر کو توجہ دلایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں خوست کی جنگ میں شریک ہونے والوں میں سے ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے، ہمیں دو دو دن تک کھانے کو روٹی نہیں ملتی اور بھوکے پیاسے لڑنا پڑتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا عباسیؒ نے اس دور میں وقفے وقفے سے اشیاء خوردنی کے درجنوں ٹرک وہاں بھجوائے اور مجاہدین کی مسلسل سرپرستی کی۔

مولانا حمید الرحمان عباسی ایک عرصہ تک جمعیت علماء اسلام ضلع لاہور کے امیر رہے، شیرانوالہ میں ان کا کمرہ ہماری جماعتی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا، میرا متحرک جماعتی زندگی کا دور بھی وہی تھا۔ علماء کرام سے رابطہ کرنا، انہیں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کیلئے تیار کرنا، کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرنا، ان کی مالی سرپرستی کرنا اور جماعتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ان کا خاص ذوق تھا۔ اب یہ ذوق کم ہوتے ہوتے نایاب ہوتا جارہا ہے، حتٰی کہ آج کے دینی کارکنوں کو مولانا حمید الرحمان عباسیؒ جیسے بزرگوں اور کارکنوں کے اخلاص، سادگی، قناعت اور جہد مسلسل سے بسا اوقات روشناس کرانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

مولانا عباسیؒ کو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے حلقہ اور ان کے درس قرآن کریم کے سلسلہ سے گہرا شغف تھا اور انہوں نے اسے ہی زندگی بھر اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ دفتر خدام الدین کے ساتھ شیرانوالہ میں ایک کمرہ ان کے تصرف میں تھا، وہی ان کی رہائش گاہ تھی اور وہی ان کا دفتر اور تحریکی و جماعتی مرکز بھی تھا۔ شیرانوالہ کے ساتھ ان کی وابستگی اور وفاداری قابل رشک تھی۔ بعض دوستوں نے کوشش کی بلکہ خود میں نے بھی ایک دوبار پیشکش کی کہ وہ وہاں سے منتقل ہو کر کسی اور علمی مرکز میں زیادہ بہتر انداز تعلیمی خدمات سرانجام دیں لیکن انہوں نے ہر بار سنی ان سنی کر دی اور شیرانوالہ میں ہی آخر دم تک دین و علم کی خدمت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دیوبندی جماعتوں کی خصوصی توجہ کے لیے

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۹ء

۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو لاہور میں جمعیت علماء اسلام (س) پنجاب کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پر دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی ایک درجن سے زائد جماعتوں کی صوبائی قیادتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اجلاس کا مقصد موجودہ ملکی صورتحال اور اس کے تناظر میں علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈے میں مسلسل اضافے کا جائزہ لینا اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ اجلاس میں طے پایا کہ صوبائی سطح پر ایک مجلس مشاورت قائم کی جائے جو باہمی مشاورت اور اشتراک عمل میں اضافہ کیلئے محنت کرے اور جماعتوں کی مرکزی قیادتوں سے رابطہ کر کے انہیں مرکزی سطح پر مشترکہ موقف اور لائحہ عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

راقم الحروف نے اس موقع پر اپنی گفتگو میں گزارش کی کہ مسلکی حوالے سے اور مسلکی دائرے میں اس وقت بہت

سی باتیں سوچنے کی ہیں، اور ان پر باہمی تبادلۂ خیالات کی کوئی صورت ضرور نکلنی چاہیے، ان میں سے فوری نوعیت کی دو تین باتوں کی طرف اس وقت توجہ دلانا چاہوں گا جو فوری توجہ اور سنجیدہ بحث و تمحیص کی متقاضی ہیں:

1. پہلی بات یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ قیامِ پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان میں اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں شروع سے یہ صورتحال چلی آرہی ہے کہ دینی و قومی تحریکوں میں ہمارا ہمیشہ مرکزی کردار رہا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ان تحریکوں میں ہراول دستہ کا رول ادا کیا ہے اور ایک عرصہ تک یہ کیفیت رہی ہے کہ کوئی دینی یا قومی مسئلہ پیدا ہونے پر لوگ ہماری طرف دیکھتے تھے اور ہمارے فیصلے اور موقف کا انتظار کرتے تھے، لیکن آج یہ صورتحال نہیں ہے اور ہم بتدریج اس کردار سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا جائزہ لینا چاہیے اس کے اسباب و عوامل پر غور کرنا چاہیے، اپنی کوتاہیوں کی نشاندہی کرنی چاہیے اور قومی سطح پر اپنے اس تاریخی کردار کی بحالی کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے ماحول میں دینی مدارس پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور نشانے پر صرف دیوبندی مدارس ہیں، ڈرون بموں کے حملے بھی ان پر ہورہے ہیں، چھاپے بھی انہی پر پڑ رہے ہیں اور منفی پروپیگنڈے کا ہدف بھی وہی ہیں۔ اس صورتحال کا تجزیہ کرنا ضروری ہے اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہورہا ہے اور اس میں کہیں ہماری کسی کمزوری اور کوتاہی کا دخل تو نہیں ہے؟ جن امور کو ان مدارس کے خلاف کاروائی کا بہانہ بنایا جارہا ہے ان امور کا کھلے طور پر جائزہ لیا جانا چاہیے اور حقیقت پسندانہ بنیادوں پر تجزیہ و تنقیح کرکے اس بہانے کے ہتھیار کو بیکار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کیلئے دوٹوک موقف اختیار کرنا ہوگا اور تذبذب کے ماحول سے باہر نکلنا ہوگا۔

مثلاً میں اپنا ذاتی موقف عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک افغانستان اور عراق وغیرہ میں جو لوگ امریکی فوجوں کی موجودگی اور تسلط کے خلاف لڑ رہے ہیں وہ مجاہد ہیں، آزادی اور خودمختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ان کی جنگ شرعی جہاد ہے جس کی حمایت اور ان کی ہر ممکن امداد ہماری دینی ذمہ داری ہے، لیکن پاکستان کی حدود کے اندر کسی دینی یا سیاسی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا درست طرز عمل نہیں ہے اور اس طرز عمل کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں یہ بات واضح طور پر کہنا ہوگی اور اس حقیقت کو بھی دوٹوک انداز میں واضح کرنا ہوگا کہ بھارت، اسرائیل اور افغانستان کی ایجنسیاں پاکستان کے اندر اس قسم کی کاروائیوں کا جال بچھائے ہوئے ہیں جن کا مقصد پاکستان کو کمزور کرنا اور دینی مدارس اور دینی قوتوں کو بدنام کرنا ہے، اور اس سب کچھ کا فائدہ عالمی استعمار کو ہورہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر جماعتی طور پر اس سلسلہ میں دوٹوک موقف کا اظہار ہو اور دیوبندی جماعتوں کی قیادتیں مجتمع ہوکر اپنے اجتماعی نقطۂ نظر کا اظہار کریں تو دینی مدارس کے خلاف کاروائیوں کا اہتمام

کرنے والوں کو اس بہانے اور جواز سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

3. تیسری بات یہ ہے کہ عالمی سطح پر یہ کہا جارہا ہے کہ اس وقت دیوبندی ہی عالمی استعمار کے خلاف صف آرا ہیں اور اسی بنیاد پر دیوبندیوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ کہہ کر عالمی استعمار اس بات کا اعتراف کررہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ایجنڈے کی تکمیل میں رکاوٹ صرف دیوبندی ہیں۔ میرے نزدیک یہ الزام فرد جرم نہیں بلکہ کریڈٹ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس طرح برطانوی استعمار اپنے عزائم کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیں سمجھتا تھا اور جس طرح روسی استعمار نے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیں پایا ہے، اسی طرح امریکی استعمار بھی اپنی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہمیں ہی قرار دے رہا ہے۔ یہ تو تاریخی تسلسل ہے اور ہمیں اس الزام پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے کہ ہم استعمار دشمنی میں اپنے اکابر کے راستے پر چل رہے ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ منفی پروپیگنڈے کے ذریعے خود ہماری رائے عامہ کو ہمارے خلاف کیا جارہا ہے اور کردارکشی کی یک طرفہ مہم کے ذریعے مسلم رائے عامہ کو ہم سے متنفر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں بے پرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے اور رائے عامہ کو اپنے بارے میں مطمئن رکھنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس کیلئے تمام ضروری اقدامات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

4. اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ دیوبندیت کے خلاف اس منفی پروپیگنڈے اور کردارکشی کی اس مہم میں کہیں ہماری اپنی کمزوریاں اور نادان دوستوں کی بے وقوفیاں تو دشمن کا ہتھیار نہیں بن رہیں؟ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور ایسی ہر بات سے براءت کا اظہار کرنا ضروری ہے جو کسی بھی درجے میں دشمن کو جواز فراہم کرتی ہو یا اس کے ہاتھ میں بہانے کا ہتھیار بن سکتی ہو۔

بہر حال یہ چند امور ہیں جن کے بارے میں باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ حالات پر نظر رکھنے والے کچھ اہل دانش مل بیٹھیں اور معروضی حالات کا سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرکے ایک بریفنگ رپورٹ مرتب کریں تاکہ یہ بات سامنے آئے کہ کیا ہو رہا ہے؟ کون کیا کررہا ہے؟ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ اور تہہ منظر کے حقائق کیا ہیں؟ جبکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دیوبندی جماعتوں کی مرکزی قیادتیں باہم مل بیٹھنے کا اہتمام کریں اور مشترکہ موقف اور لائحہ عمل کا تعین کر کے اسے رائے عامہ کے سامنے لائیں خدا کرے کہ ہم ایسا کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

فوجوں کے ذریعے دل جیتنے کا فارمولا

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۶ نومبر ۲۰۰۹ء کی خبر کے مطابق افغانستان میں برطانیہ کے سینئر کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل نک پارکرنے، جو افغانستان میں نیٹو افواج کے ڈپٹی کمانڈر بھی ہیں، ایک اخباری انٹرویو میں کہا ہے کہ افغانستان میں طالبان کو شکست دینے کیلئے بہتر جنگی ساز و سامان کی نہیں بلکہ لوگوں کے دل اور ذہن کو جیتنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا افغانستان میں جنگ جیتنے کیلئے مزید اور جدید ہتھیاروں کی ضرورت نہیں بلکہ نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کا اعتماد حاصل کیا جائے اور انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ اتحادی فوج ان کی بہتری کیلئے اقدامات کر رہی ہے۔

برطانوی کمانڈر کا یہ کہنا کہ افغان عوام کا دل اور ذہن جیتنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت ہے، جہاں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اتحادی افواج اپنی تمام تر قہر سامانیوں کے باوجود افغان عوام کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، وہاں اس معروضی حقیقت کیلئے بھی مستند شہادت کا درجہ رکھتی ہے کہ طالبان کے مقابلہ میں اتحادی افواج کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور عسکری جنگ میں انہیں اپنے جیتنے کے امکانات معدوم ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتحادی ممالک کو افغان عوام کے دل و ذہن جیتنے اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوئی نئی حکمت عملی طے کرنے سے پہلے اپنی اس پسپائی کے اسباب کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کی کون سی غلط پالیسیوں نے انہیں یہ دن دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک امریکی اتحاد کی سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ سوویت یونین کے خلاف جہاد افغانستان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد امریکہ نے یہ سمجھ لیا کہ شاید افغان مجاہدین بھی صرف اسی لیے لڑ رہے تھے کہ عالمی سرد جنگ میں امریکہ کو کامیابی حاصل ہو اور سوویت یونین اس کے مقابلہ میں پسپا ہو جائے۔ حالانکہ افغان مجاہدین کے جہاد اور قربانیوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے ملک کی خود مختاری بحال ہو اور افغانستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست بنے۔ امریکہ اور دوسرے ممالک نے جہاد افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر لیے مگر افغان مجاہدین کے اصل مقصد کو نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ اس میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔ اب بھی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ نے افغانستان کی خود مختاری کو اسی طرح یرغمال بنا رکھا ہے جس طرح دو عشرے قبل سوویت یونین نے یرغمال بنایا ہوا تھا اور افغانستان میں شرعی نظام کے نفاذ میں امریکہ اسی طرح رکاوٹ بنا ہوا ہے جس طرح سوویت یونین ایک عرصے تک رکاوٹ بنا رہا۔ چنانچہ افغان مجاہدین کیلئے جن کی قیادت اس وقت طالبان کر رہے ہیں صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ جو جنگ سوویت یونین کے خلاف لڑ رہے تھے اسی جنگ کا انہیں اب امریکی اتحاد سے سامنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ طالبان صرف ایک طبقے کا نام ہے جسے فوجی قوت کے ذریعے شکست دی جا سکتی ہے، وقت نے جلد ہی ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی ہے اور ان پر واضح کر دیا ہے کہ اتحادی فوجوں کا مقابلہ کسی ایک طبقے سے نہیں بلکہ افغان قوم سے ہے، اور ایک عشرے کے بیشتر حصے پر محیط جنگ

کے بعد اب انہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ افغان عوام کو اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے اور ان کے دل و ذہن کو جیتنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم جنرل نک پارکر سے یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ اگر وہ اپنی قیادت کو یہ مشورہ دینے میں سنجیدہ ہیں کہ افغان عوام کو اعتماد میں لیا جائے اور ان کے دل و ذہن جیتنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیں کہ افغان عوام کی عزت نفس، آزادی اور افغانستان کی خود مختاری کا احترام کیا جائے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے کہ افغان قوم ہمیشہ آزاد رہی ہے اور اس کا سب بڑا قومی مقصد اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کے ساتھ بے لچک وابستگی رہا ہے۔

جنرل نک پارکر کا کہنا ہے کہ دل و دماغ جیتنے کیلئے مزید فوجی ساز و سامان کی ضرورت نہیں اور ہم بھی ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ دل و دماغ فوجوں کے ذریعے نہیں جیتے جاتے، امریکی فوجوں نے دنیا کے جس ملک میں وہاں کے عوام کے دل و دماغ جیتنے کیلئے ڈیرے ڈالے ہیں وہاں سے انہیں نفرت کے سوا کچھ نہیں ملا، تو فوجوں کے ذریعے غیور اور حریت پسند افغان عوام کا اعتماد آخر کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

موجودہ حالات اور جنرل حمید گل

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء

دو روز قبل جنرل (ر) حمید گل صاحب نے فون پر مجھے کہا کہ ۸ دسمبر کو راولپنڈی میں کچھ حضرات کو ملک کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں آپ کی آمد بھی ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی محدود سطح کا مشاورتی اجلاس ہوگا لیکن میں جب ۳ بجے کے لگ بھگ راولپنڈی صدر کے فلیش مین ہوٹل کے مین ہال میں داخل ہوا تو وہاں ایک اچھے خاصے قومی سیمینار کا سماں تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ ریٹائرڈ فوجی افسران، سابق سفارتکار اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والے ممتاز حضرات راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی صورت میں کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ اسلام آباد کے مولانا عبد الخالق صاحب علماء کرام کا خیر مقدم کرنے اور انہیں مناسب مقامات پر بٹھانے میں مصروف تھے۔ مجھے انہوں نے ایک طرف کرسیوں کی پہلی رو میں علامہ احمد علی قصوری، علامہ علی غضنفر کراروی، آغا مرتضٰی پویا اور خاکسار راہنما جناب حمید الدین المشرقی کے ساتھ بٹھا دیا۔ سامنے کی رو میں دیگر حضرات کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ اور مولانا انوار الحق حقانی تشریف فرما تھے۔

تقریب کا آغاز جنرل حمید گل کے نام پر شروع کی جانے والی انٹرنیٹ ویب سائیٹ کے باقاعدہ افتتاح سے کیا گیا جس کے بارے میں ان کی صاحبزادی محترمہ عظمٰی گل نے بتایا کہ یہ ویب سائیٹ انہوں نے اپنے والد محترم کو ان کی سالگرہ پر تحفے کے طور پر پیش کرنے کیلئے بنائی ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں افغانستان، کشمیر، جہاد اور اسلامی نظام کے بارے میں جنرل حمید گل کے مضامین کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جنرل حمید گل مائیک پر آئے اور موجودہ علاقائی صورتحال پر شرکاء کو مختصر بریفنگ دی۔ انہوں نے بتایا کہ جو صورتحال اس وقت ملک کو درپیش ہے یہ اس وقت

بھی ہمیں در پیش تھی جب ۱۹۸۷ء میں سوویت یونین نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ افغانستان میں فوجوں کی تعداد بڑھا دی تھی بلکہ پاکستان میں بھی بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے پیچھے روس، افغانستان اور انڈیا کی خفیہ ایجنسیاں تھیں اور ان میں پاکستان کے ہزاروں شہری جاں بحق ہو گئے تھے۔ امریکہ بھی انہی لائنوں پر چل رہا ہے اور افغانستان سے ۱۸ ماہ کے بعد فوجوں کی واپسی شروع کرنے کے اعلان کے بعد اس نے فوجوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے اور ادھر پاکستان میں خودکش بم دھماکوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

جنرل حمید گل نے کہا کہ امریکہ نے افغانستان سے بہرحال جانا ہے، اس سے یہاں کی علاقائی صورتحال میں جو تبدیلیاں آئیں گی ان پر غور کرنا اور ان کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین ہماری ذمہ داری ہے اور اسی مقصد کیلئے آپ حضرات کو زحمت دی گئی ہے۔ انہوں نے ملک کے اندر کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے خودکش بم دھماکوں اور ان میں بے گناہ شہریوں کی قیمتی جانوں کے ضیاع کو افسوسناک قرار دیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں بیرونی عوامل بالخصوص بھارت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل عوامل کو بے نقاب کرے۔ اسی طرح ان عناصر کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے جو انتقام اور بدلے کیلئے فوجی مراکز اور مساجد پر حملے کر رہے ہیں کہ ان کی ایسی کارروائیوں سے پاکستان کمزور ہو رہا ہے، دشمن کو تقویت مل رہی ہے اور دینی حلقے بدنام ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے وزیر داخلہ علماء کرام سے فتویٰ جاری کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ علماء کرام کوئی فتویٰ قرآن و سنت کی روشنی میں ہی دے سکتے ہیں اور انہیں پھر پرویز مشرف کے غیر شرعی اقدامات پر بھی فتویٰ جاری کرنا پڑے گا اور دیگر غیر اسلامی پالیسیاں بھی فتووں کا عنوان بنیں گی۔

جنرل صاحب نے موجودہ صورتحال کی اصلاح کیلئے ہاؤس کے سامنے چند تجاویز پیش کیں جنہیں ہاؤس نے کانفرنس کی طرف سے متفقہ موقف کے طور پر منظور کر لیا۔

1. قبائلی علاقے میں جاری آپریشن اور عسکری گروپوں کی طرف سے جنگ میں دونوں طرف سے فوری طور پر سیز فائر ضروری ہے اور ہم دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر سیز فائر کی یہ اپیل منظور کرتے ہوئے جنگ بند کر دیں۔
2. فریقین میں مذاکرات اور مصالحت کیلئے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور مختلف طبقات کے ممتاز حضرات پر مشتمل وفد تشکیل دیا جائے جو قبائلی علاقوں میں جا کر اس مصالحت کیلئے راہ ہموار کرے۔ اگر حکومت اور فریق ثانی اس تجویز کو منظور کر لیں تو ہم یہ وفد تشکیل دینے اور جانوں پر کھیل کر وہاں جانے کیلئے تیار ہیں۔
3. امریکہ کے ساتھ تعاون و اشتراک پر نظر ثانی کی جائے اور اسے محدود اور مشروط کیا جائے اور تعاون کی شرط کے طور پر امریکہ سے مطالبہ کیا جائے کہ:
   - ایٹمی قوت کے طور پر پاکستان کو بھارت کے برابر درجہ دیا جائے۔

- کشمیر کے معاملات میں بھارت کی مسلسل مداخلت کا نوٹس لیا جائے۔

4. بلوچستان میں عوام کے مشتعل جذبات کو کم کرنے کیلئے پرویز مشرف کے خلاف فوری طور پر ٹرائل شروع کیا جائے۔

5. جن خفیہ معاہدات کے نتیجے میں پاکستان کی حدود میں ڈرون حملے ہو رہے ہیں، بلیک واٹر کے اہلکار بلا روک ٹوک ملک میں مسلح طور پر پھر رہے ہیں اور دیگر اس طرح کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان معاہدات کو منظرِ عام پر لایا جائے اور قوم کو بتایا جائے کہ یہ معاہدات کیا ہیں؟

جنرل حمید گل کا کہنا ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہے جو ان کے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی جوہری قوت کو ختم کر دیا جائے یا کم از کم مشترکہ نگرانی میں دے دیا جائے اور بھارت کی سرحد سے پاکستانی فوجوں کو مغربی سرحد پر منتقل کرا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم نے پاکستان بننے کے بعد مغربی چھاؤنیوں کو خالی کرنے کا حکم دیا تھا اور ساری فوجیں مشرقی سرحد پر بھارت کے ساتھ لگا دی تھیں لیکن اب اس پالیسی کو تبدیل کرانے کیلئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے جس سے مشرقی سرحد پر پاکستان کی پوزیشن کمزور ہوگی اور بھارت کی بالادستی کی راہ ہموار ہوگی۔ اس صورتحال پر نظر رکھی جائے اور اسی طرح ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے مطابق امریکہ کے ڈرون حملے بند کرائے جائیں اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

جنرل صاحب کا کہنا ہے کہ افغانستان سے امریکہ کی واپسی کی صورت میں ہمارے مقتدر حلقوں کی طرف سے اس خوف کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اس سے خطے پر طالبان کا تسلط قائم ہوگا اور پاکستان میں بھی طالبانائزیشن کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہمارے پاس اس کا واضح حل موجود ہے کہ ہم طالبانائزیشن کو روکنے کیلئے پاکستان میں دستور کے مطابق نفاذِ اسلام کی طرف پیشرفت کریں اور سیاسی و جمہوری طریقے سے نفاذِ شریعت کر کے طالبان کے ہاتھ سے یہ ہتھیار چھین لیں۔ کیونکہ افغانستان کے اقتدار میں واپسی کے بعد طالبان کے پاس پاکستان کے معاملات میں دلچسپی اور مداخلت کا یہی بہانہ ہوگا جسے ہم اپنے دستور پر سنجیدہ عملدرآمد کے ذریعے ختم کر سکتے ہیں اور اب ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن باقی نہیں رہا۔ جنرل صاحب نے کہا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام ہمارے دستور کا تقاضا ہے لیکن یہ نفاذِ شریعت قراردادِ مقاصد کے مطابق ہوگا، دستور کی اسلامی دفعات کے مطابق ہوگا اور جمہوری و سیاسی عمل کے ذریعے ہوگا، اور ہمارے حکمران طبقے اگر طالبانائزیشن کا راستہ روکنے میں سنجیدہ اور مخلص ہیں تو انہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔

جنرل حمید گل نے ہاؤس سے اپنی ایک تجویز کی منظوری بھی لی کہ ہمارے مطالبات اور تجاویز پر اگر حکومت کوئی مثبت طرزِ عمل اختیار نہیں کرتی، بالخصوص امریکہ کے ساتھ تعاون پر نظرِ ثانی اور ڈرون حملے بند کرانے میں کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھاتی تو ہمیں قومی سطح پر ایک تحریک منظم کرنا ہوگی جو غیر سیاسی بنیادوں پر ہوگی اور تمام طبقات مل کر امریکی مداخلت کا راستہ روکنے کیلئے سڑکوں پر آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ابھی تحریک کے وقت اور پروگرام کا اعلان نہیں کر رہے، صرف یہ بتا رہے ہیں کہ اگر حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم خود کریں گے اور اگر فی الواقع حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم سرکردہ

حضرات اور راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ قومی تحریک کا پروگرام مرتب کریں گے، اس کیلئے مشترکہ فورم تشکیل دیں گے اور اس کے وقت اور طریق کار کا اعلان کریں گے۔

یہ مختصر سی روداد ہے جنرل حمید گل کے طلب کردہ مشترکہ اجتماع کی، اس کی دیگر تفصیلات و جزئیات کے حوالے سے پھر کسی موقع پر گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

افغانستان کی صورتحال: سابق روسی صدر میخائل گورباچوف کا تجزیہ

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۰ء

افغانستان کی صورتحال کے بارے میں لندن کانفرنس کے موقع پر طالبان سے مذاکرات پر زور دینے کے بعد افغانستان میں اتحادی فوجوں نے دباؤ بڑھا دیا ہے اور طالبان راہنماؤں کی گرفتاریوں کی مہم بھی تیز کر دی گئی ہے۔ لندن کانفرنس کا مقصد خود برطانوی حکومت کے نمائندے نے یہ بتایا ہے کہ افغانستان میں مذاکرات کا فیصلہ طالبان کی قوت کو تقسیم کرنے کیلئے کیا گیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں طالبان کی ۸۰ فیصد اکثریت جنگ کی حامی نہیں ہے اور انہیں الگ کرنے کیلئے مذاکرات کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ لیکن بین الاقوامی ماہرین اور خطہ کے حالات سے واقفیت رکھنے والے عالمی دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ افغانستان میں نیٹو افواج کی ہزیمت پر پردہ ڈالنے کیلئے کیا جا رہا ہے اور اوبامہ انتظامیہ افغانستان سے نکلنے سے پہلے آخری زور لگا کر اپنی پسپائی کے تاثر کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس سلسلہ میں سوویت یونین کے آخری صدر میخائیل گورباچوف نے ایک حالیہ مضامین میں صورتحال کا جائزہ پیش کیا ہے اور روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۱ فروری ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والے ان کے اس مضمون کے چند اقتباسات بطور خاص قابل توجہ ہیں:

- ۱۹۷۹ء میں سوویت قیادت نے افغانستان میں فوجیں اتارنے کے جواز میں کہا تھا کہ وہ وہاں اپنے دوستوں کی مدد کرنے اور انتشار کے شکار ملک میں استحکام پیدا کرنے کیلئے آئے ہیں۔ ہم سے افغانستان جیسے ملک کی پیچیدہ صورتحال کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی اسی لیے ہم جو چاہتے تھے نتائج اس کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔ عدم استحکام میں اضافہ ہوا اور ایک ایسی جنگ گلے پڑ گئی جس کا نہ صرف ہزاروں افراد شکار ہوئے بلکہ خود ہمارے اپنے ملک کو مہلک نتائج بھگتنا پڑے۔
- ۱۱ ستمبر مغربی قائدین کے خواب غفلت سے بڑبڑا کر بیدار ہونے کا ہولناک لمحہ تھا تب بھی مغرب کے فیصلہ سازوں نے جو فیصلے کیے وہ گہری سوچ بچار سے عاری تھے اور جو بعد ازاں غلط ثابت ہوئے۔
- افغانستان میں فوج کی گرفت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے، یہ ایک کھلا راز ہے جس کا خود امریکی سفیر حال ہی

میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں اعتراف کر چکے ہیں۔ میں نے بھی گذشتہ چند ماہ میں بار بار پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب میں ایک ہی بات دہرائی ہے اور وہی میں صدر اوبامہ سے کہنا چاہوں گا کہ جنہیں یہ مصیبت ان کے پیشرو سے ورثے میں ملی ہے اور وہ یہ کہ اس مصیبت کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے سیاسی حل اور افغانستان سے بیرونی افواج کا مکمل انخلا جو قومی مفاہمت کا متقاضی ہے۔

- افغانستان میں اقوامِ متحدہ کے مندوب نے بھی حال ہی میں دیے گئے انٹرویو میں اسی چیز پر زور دیا ہے کہ ’’پورے افغانستان سے بیرونی فوجوں کا مکمل انخلا‘‘ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایسا پہلے کہا اور کیا کیوں نہیں گیا؟

یہ تجزیہ سوویت یونین کے آخری صدر میخائیل گورباچوف کا ہے جنہوں نے افغانستان سے جہاد افغانستان کے بعد روسی فوجوں کے انخلا کا فیصلہ کیا تھا اور جن کے دور میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھی۔

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ جب افغانستان میں سوویت یونین کی فوجیں افغان عوام کے ساتھ برسرپیکار تھیں تب اس وقت کی برطانوی وزیراعظم مسز مارگریٹ تھیچر نے روس کا دورہ کر کے ماسکو میں روسی لیڈروں کو یہ نصیحت کی تھی کہ وہ برطانیہ کے تجربہ سے سبق حاصل کریں جسے افغانستان پر فوج کشی میں عبرتناک ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور اب سوویت یونین کے آخری صدر امریکی صدر کو مشورہ دے رہے ہیں کہ افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کے مکمل انخلا کے بغیر اس مصیبت سے ان کی جان نہیں چھوٹے گی۔

دراصل امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے نائن الیون کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ طالبان شاید صرف ایک گروہ کا نام ہے جسے طاقت کے ذریعے شکست دی جا سکتی ہے، لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ سوویت یونین کی طرح امریکی اتحاد کی جنگ بھی پوری قوم کے خلاف ہے اور یہ مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کو کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔

جہاد، دہشت گردی، جد و جہدِ آزادی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۱۰ء

میں نے عرض کیا کہ یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ جہاں تک پاکستان یا کسی بھی مسلم ملک میں نفاذ شریعت کیلئے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی بات ہے ہم نے ہر موقع پر یہ کہا ہے کہ اسے ہم درست نہیں سمجھتے اور اس کی حمایت نہیں کرتے۔ لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بگل بجانے والوں نے دہشت گردی کی کوئی تعریف عالمی سطح پر طے کیے بغیر یہ اختیار اپنے پاس رکھ لیا ہے کہ وہ جسے چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے کہ اس نے جہاد، دہشت گردی اور قومی آزادی کی جنگ کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے اور ایک ایسا کنفیوژن دنیا بھر میں پیدا کر دیا ہے کہ دہشت گردی کی متفقہ تعریف طے کیے بغیر اسے دور کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے جب ہم سے

دہشت گردی کے خلاف یکطرفہ بات کرنے اور غیر مشروط فتویٰ جاری کرنے کا تقاضہ کیا جاتا ہے تو ہمارے تحفظات ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم جہاد افغانستان، جہاد فلسطین اور جہاد کشمیر کو دہشت گردی کے زمرے میں شامل کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس کی زد میں جہاد اور قومی آزادی کی تحریکات بھی آتی ہوں۔

میں نے وکلاء سے عرض کیا کہ اس سلسلہ میں علماء کرام اور وکلاء دونوں کو کام کرنا چاہیے کہ وہ جہاد، دہشت گردی اور قومی آزادی کی تحریکات کے درمیان فرق کو واضح کریں اور استعماری قوتوں نے جو کنفیوژن پیدا کر دیا ہے اسے دور کرنے کیلئے ہر سطح پر علمی اور فکری طور پر محنت کریں۔ جبکہ میرے خیال میں آزاد کشمیر کے علماء کرام اور وکلاء کی ذمہ داری اس سلسلہ میں زیادہ ہے کہ جہاد، دہشت گردی اور آزادی کی جنگ کو گڈمڈ کر کے استعماری قوتوں نے جو الجھاؤ اور کنفیوژن پیدا کر رکھا ہے اور جسے وہ اپنے مذموم مقاصد کیلئے مسلسل بڑھاتی اور پھیلاتی جا رہی ہیں، کشمیری عوام کی آزادی کی جدوجہد اس سے براہ راست متاثر ہو رہی ہے اور کشمیر کاز کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لیے آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد کو اس کنفیوژن سے نکالنے کیلئے بھی ضروری ہے کہ آزاد کشمیر کے علماء کرام اور وکلاء اس سلسلہ میں کردار ادا کریں اور علمی و فکری دائرے میں جدوجہد کر کے دنیا کو بتائیں کہ جہاد اور آزادی کی جنگ کا دائرہ اور ہے اور دہشت گردی کا دائرہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔

میں نے گزارش کی کہ علماء کرام اور وکلاء کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ باہمی میل جول کا ماحول پیدا کریں اور سوسائٹی میں قانون کی بالادستی، اسلامی قوانین کے نفاذ اور دیگر ملی مقاصد کیلئے طبقاتی معاصرت کے ماحول سے نکل کر مشترکہ جدوجہد کا اہتمام کریں۔

حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اکتوبر ۲۰۱۰ء

حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ سے عام طور پر بہت کم لوگ واقف ہیں، میں نے پہلی مرتبہ انہیں ۱۹۷۶ء میں دیکھا جب میں ایک طالب علم تھا۔ اس وقت اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کیا ہوا تھا، مفتی محمود صاحبؒ نے ایک جلسے میں فرمایا کہ اگر حکومت ہمیں اجازت دے تو ہم اپنے خرچے پر وہاں جہاد کیلئے جائیں گے۔ مفتی صاحبؒ کے بعد ایک نوجوان کھڑا ہوا اور بڑے جوشیلے انداز میں اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ اگر حکومت اجازت دیتی ہے تو میں قبائل کی طرف سے دس ہزار کا لشکر فراہم کروں گا۔ میں نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بعد میں مفتی صاحبؒ سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ نوجوان کون ہیں اور اتنا بڑا دعویٰ کیسے کر رہے ہیں؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا، یہ دے دے گا، یہ وزیروں کا لیڈر ہے۔

مولانا نور محمدؒ نے وانا میں جمعیت کی بنیاد رکھی۔ قبائل کا علاقہ دینی علاقہ ہے، بھٹو صاحب مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں ایک مرتبہ قبائل کا دورہ کیا۔ وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ نے مولانا مرحوم سے ملاقات کی کہ بھٹو صاحب کا استقبال کیسے کیا جائے، انہوں نے فرمایا کہ میں بے مثال استقبال کروں گا لیکن کروں گا جمعیت کے پلیٹ فارم سے۔ جبکہ وہ لوگ

چاہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے استقبال ہو۔ جب بھٹو صاحب ائیر پورٹ پر اترے تو ہر طرف جمعیت کے ہزاروں پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کی مولانا کو پھر سزا بھی دی گئی، انہیں ایک مقدمے میں الجھایا گیا، وانا بازار کو بلڈوز کر دیا گیا اور مولانا سات آٹھ سال تک جیل میں رہے۔

مولانا نور محمد مرحوم نے جہاد افغانستان میں بہت سرگرم کردار ادا کیا اور سب سے پہلے جو کتاب جہاد افغانستان کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کیلئے لکھی گئی وہ مولانا نے ہی لکھی تھی۔ میں بھی اس وقت ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ہمارا جب بھی ان علاقوں کا سفر ہوتا تو ہم مولانا کے پاس ٹھہرتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ ایک مرتبہ میں افغانستان جا رہا تھا تو راستے میں مولانا کے پاس ٹھہرا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے جہاد افغانستان پر ایک کتاب لکھی ہے جو چھپنے کے قریب ہے، انہوں نے اس کا مسودہ مجھے بھی دکھایا۔ کتاب میں نے اسی رات ساری دیکھی اور صبح ان سے عرض کی کہ میں نے ساری کتاب دیکھ لی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کتاب صرف پٹھانوں کیلئے لکھی ہے یا سب کے لیے؟ انہوں نے کہا کہ سب کیلئے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی زبان تو صرف پٹھانوں والی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتی ہے وغیرہ، اس کی زبان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ فرمانے لگے کہ نظر ثانی کون کرے گا؟ میں نے کہا کہ میں کروں گا۔ میں وہ کتاب ساتھ لے آیا اور اس کی زبان کی اصلاح کی اور پھر وہ کتاب چھپی۔ اس طرح ان کی برکت سے مجھے یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جہاد افغانستان پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب پر نظر ثانی کا موقع ملا، اس کتاب پر مقدمہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔

مولانا کے پاس علم بھی تھا، وجاہت بھی تھی اور مقام و مرتبہ بھی تھا۔ آپ قبائل کے لیڈر تھے، اگر کسی ایک شخصیت کا نام پوچھا جائے کہ جس پر تمام وزیر قبائل کو اکٹھا کیا جا سکتا تھا تو وہ نام مولانا نور محمدؒ ہی کا تھا۔ گذشتہ دنوں وہ ایک خود کش حملے میں شہید کر دیے گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر تشریف لائے تو ایک نوجوان ان سے آکر گلے ملا اور گلے ملتے ہی اس نے اپنے آپ کو بم سے اڑا دیا اور مولانا سمیت ۲۳ افراد شہید ہو گئے۔ ان کی موت سے دیگر نقصانات تو ایک طرف، ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب شاید کوئی ایسی شخصیت نہ ملے جس پر سب قبائل کو جمع کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں ارفع و اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

طالبان کا وجود اور ان کے ساتھ مذاکرات

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۰ء

روزنامہ جنگ راولپنڈی میں ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق:

”سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف نے کہا ہے کہ اگر امریکہ طالبان حکومت کو تسلیم کر لیتا تو اسے اسامہ بن لادن کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہوسٹن کی ایشیا سوسائٹی ٹیکس سنٹر میں خطاب کے دوران سابق صدر پرویز مشرف نے کہا کہ عالمی برادری کو طالبان کے حوالے سے حکمت عملی تبدیل کرنے

کی ضرورت ہے، طالبان کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرلینا چاہیے۔ پرویز مشرف نے کہا ان پر ڈبل گیم کا الزام لگتا رہا ہے حالانکہ وہ طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانے کے حامی تھے، انہوں نے کہا کہ دنیا نے طالبان کو تسلیم نہیں کیا جبکہ پاکستان کو انہیں تسلیم کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا، انہوں نے کہا کہ ہمیں طالبان کو تسلیم کر کے ان میں تبدیلی لانی چاہیے، انہوں نے کہا کہ وہ پہلے بھی طالبان کے ساتھ مذاکرات کے حامی تھے لیکن آج طالبان سے مذاکرات کیلئے اٹھایا جانے والا اقدم کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔"

جنرل (ر) پرویز مشرف نے اپنے دور حکومت میں افغانستان اور طالبان کے حوالے سے جو کچھ کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور انہوں نے طالبان کے وجود اور ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد "یوٹرن" لے کر امریکی عزائم کی تکمیل کیلئے پاکستان کو جس طرح تختۂ مشق بنایا اس کے تلخ اثرات پوری قوم بھگت رہی ہے اور خدا جانے کب تک اسے یہ تلخ نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود جنرل (ر) مشرف نے امریکہ کے شہر ہیوسٹن میں کیے جانے والے اپنے اس خطاب میں جس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کی فوری اور سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔

ہم شروع سے یہ کہتے آرہے ہیں کہ افغان قوم اور ان کی دینی و قومی روایات کا پرچم اٹھانے والے طالبان کو طاقت کے زور سے ختم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لشکر کشی اور طاقت کا وحشیانہ استعمال افراد اور گروہوں کے خلاف تو کامیاب ہو جایا کرتا ہے مگر قوموں کے خلاف کوئی لشکر کشی کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ طالبان صرف ایک گروہ نہیں بلکہ افغان قوم کے دینی و قومی جذبہ حریت کی علامت ہیں اور وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ افغان قوم آج بھی طالبان کی پشت پر ہے۔ اس لیے عالمی قوتوں کو چاہیے کہ وہ طالبان کے وجود کو تسلیم کریں اور افغانستان کی قومی خود مختاری کے ساتھ ساتھ افغان قوم کے اسلامی تشخص اور روایات و اقدار کا احترام کرتے ہوئے کسی قسم کی بیرونی مداخلت کے بغیر انہیں اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے دیں کہ اس مسئلہ کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔

کرنل امیر سلطان تارڑ شہیدؒ

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء

کرنل امام کی شہادت اور حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر خودکش حملہ بظاہر دو الگ الگ واقعات ہیں جن میں کوئی جوڑ اور تعلق دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتا لیکن حالات میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے پس منظر پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کراچی میں ہونے والے خودکش حملے سمیت ان تینوں واقعات کے پس منظر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔

کرنل امام نے، جن کا اصل نام کرنل امیر سلطان تارڑ تھا، جہادِ افغانستان میں مجاہدین کو ٹریننگ دینے اور جنگی حکمت عملی سکھانے میں اہم کردار ادا کیا اور افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کم و بیش سب کے

سب ان کی خدمات، قربانیوں اور جدوجہد کے معترف چلے آرہے ہیں۔ سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی کے بعد جب مجاہدین کے مختلف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کی مکروہ سازش کا تانا بانا بنا گیا تو اس خلفشار سے تنگ آکر طالبان کی شکل میں سامنے آنے والے مجاہدین کو منظم کرنے میں بھی کرنل امام شہیدؒ متحرک رہے۔ اس پس منظر کے باعث کرنل امام کو سنجیدہ حلقوں میں اس نظر سے دیکھا جارہا تھا کہ جب اس خطے میں استعماری قوتوں کی واپسی کیلئے کسی محفوظ راستے کی تلاش ہوگی تو جو لوگ خطے میں امن کی واپسی کیلئے اہم رول ادا کرسکیں گے ان میں کرنل امام سرفہرست ہوں گے۔ وہ افغان قوم کے مزاج ونفسیات سے بھی واقف تھے اور پاکستان کی ضروریات و مفادات کو بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس خطے میں بیرونی قوتوں کی دراندازی، بالخصوص بھارت کے مسلسل کردار پر بھی ان کی نظر تھی اور پاکستان اور افغانستان دونوں ملکوں کے ذمہ دار حلقوں میں انہیں قابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان انتہا پسند قوتوں اور عالمی سازشوں کے منصوبہ کاروں کے لیے، جو مصالحت و مفاہمت کا ہر راستہ بند کردینا چاہتے ہیں اور جنہیں اعتدال و توازن کی بات کرنے والے اور امن کی واپسی کیلئے کام کرنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے، کرنل امام اپنی تمام تر جہادی خدمات کے باوجود ان کی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

میرے نزدیک کرنل امامؒ کی شہادت مولانا محمد حسن جان شہیدؒ، حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ آف وانا، اور ڈاکٹر محمد فاروق شہیدؒ کی شہادت کا تسلسل ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو درمیان کے آدمی سمجھے جاتے تھے اور جن سے نہ صرف امن کی واپسی کیلئے مؤثر کردار کی توقع تھی بلکہ یہ لوگ جمہور علمائے اسلام کی تعبیر اور طریق کار کے مطابق نفاذِ شریعت کیلئے بھی مخلص تھے اور عملاً کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کرنل امام شہیدؒ نے بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کرنل امام کو اغوا کرنے والوں نے تاوان نہ ملنے پر شہید کیا ہے یا وہ دورانِ حراست حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئے ہیں، شہید تو وہ دونوں صورتوں میں ہیں۔ اور مجھے جنرل (ر) حمید گل کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کرنل امام "شہیدِ پاکستان" ہیں، جبکہ ان کے بقول ان کی شہادت کے پیچھے اصل ہاتھ بھارت کا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ہم سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد اس خطے کے مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا جس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ یہی بات اگر بین الاقوامی تناظر سے ذرا نیچے اتر کر قومی سطح پر دیکھ لی جائے تو صورتحال کچھ مختلف نہیں۔ راقم الحروف کئی بار یہ بات مختلف فورموں اور مختلف کالموں میں عرض کرچکا ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل سندھ میں "حُروں" کی سرگرمیاں اسی نوعیت کی تھیں، وہ برطانوی تسلط کے خلاف مسلح کارروائیوں میں مصروف تھے اور اگر آج کی اصطلاح استعمال کی جائے تو دہشت گرد، جبکہ ہماری قومی تاریخ کے مطابق وہ مجاہدینِ آزادی تھے اور ہر محب وطن انہیں مجاہدینِ آزادی کے طور پر ہی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جنہیں قیامِ پاکستان کے بعد پاک فوج میں ایڈجسٹ کرلیا گیا تھا۔ مگر افغانستان میں سوویت یونین کی واپسی کے بعد پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مجاہدین کے بارے میں یہ حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی۔ انہیں حکومت پاکستان نے بھی تنہا چھوڑ دیا، پاک فوج نے بھی انہیں کسی عسکری حکمت عملی کا حصہ بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور پاکستان کی وہ دینی

جماعتیں جو انہی مجاہدین کے ذریعے جہادِ افغانستان میں پیش پیش نظر آتی تھیں انہوں نے بھی انہیں نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے ہر گروہ اپنا مستقبل، اپنا ٹارگٹ اور اپنا طریق کار طے کرنے میں آزاد ہو گیا۔ اس سے عالمی قوتوں اور بیرونی مداخلت کاروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور جس طرح ہیلری کلنٹن کے بقول عالمی قوتیں اپنی سطح پر اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں اسی طرح قومی سطح پر ہم سب اس قومی غفلت کے تلخ نتائج کا سامنا کر رہے ہیں۔

آج کی صورتحال اسی قومی اور مجرمانہ غفلت کا منطقی نتیجہ ہے اور اس مخمصے سے نکلنے کیلئے سوچا جانے والا کوئی بھی حل اس پس منظر کو نظر انداز کر کے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ہم ان گروپوں کے ماضی کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، ان کی شدت پسندی کے اسباب کو دور کرنے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہم انہیں بین الاقوامی سازشوں کے جال سے نکالنے میں سنجیدہ نہیں ہیں، اور انہیں ہر حالت میں دشمن قرار دے کر دشمنوں ہی کے حوالے کیے رکھنے کا ہم نے تہیہ کر لیا ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ تلخ نتائج کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات میں تبدیلی محض خواہشات اور اپیلوں یا فتوؤں سے نہیں آیا کرتی، اس کیلئے عملاً کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں "کچھ کرنے" کے ناگزیر تقاضوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

بات ذرا دور نکل گئی ہے لیکن غیر متعلقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ کرنل امامؒ کی شہادت کو اس پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسی صورتحال میں اصلاح، توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر اس رویے کو پسند نہ کرنے والوں کی انتہا پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ دوسری طرف داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر خودکش حملے کے المناک واقعہ کو دیکھ لیجئے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار پر اس سے قبل بھی خودکش حملہ کئی بے گناہ لوگوں کی جان لے چکا ہے اور اب اگرچہ پولیس کی مستعدی اور حفاظتی نظام کے باعث دربار کے اندر تک خودکش حملہ آور کی رسائی نہیں ہو سکی مگر وہ اپنے مقصد میں بہرحال کامیاب ہوا ہے کہ اس نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے عرس کے زائرین کو نشانہ بنایا ہے اور بہت سے لوگوں کی قیمتی جانیں لے لی ہیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اور حضرت سید عبد اللہ شاہ غازیؒ کے مزارات پر ہونے والے خودکش حملوں کے بعد اسے فرقہ وارانہ رنگ دے کر ملک میں بریلوی دیوبندی کشمکش کو ہوا دینے کی جو مہم چلائی گئی تھی اس کا غبار ابھی زمین پر نہیں بیٹھنے پایا تھا کہ لاہور اور کراچی کے ان تازہ دھماکوں نے ملک بھر کے عوام کو دل گرفتہ کر دیا ہے۔

بھلا ہو توہینِ رسالت کے قانون کا کہ ناموسِ رسالتؐ نے ایک بار پھر پوری قوم کو متحد کر دیا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو خانہ جنگی میں بدلنے کی کوششیں دم توڑ گئی ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ توہینِ رسالتؐ کے قانون کے حوالے سے رونما ہونے والی صورتحال نے عالمی قوتوں کے بہت سے مغالطوں کو دور کر دیا ہے۔ مثلاً

- دین کے ساتھ بے لچک وابستگی اور ناموس رسالتؐ پر کٹ مرنے کا جذبہ ان کے نزدیک شدت پسندی اور انتہا پسندی ہے جسے انہوں نے دیوبندیوں کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا اور انہیں کارنر کرنے کیلئے فرقہ وارانہ کشمکش کے فروغ کو عالمی استعمار نے اپنا ہدف بنا لیا تھا۔ مگر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اگر ناموس رسالتؐ پر کٹ مرنے اور دین کے ساتھ بے لچک وابستگی کا نام انتہا پسندی اور شدت پسندی ہے تو اس شدت پسندی میں

پاکستان کا کوئی مسلمان اور کوئی مذہبی فرقہ دوسرے سے کم نہیں ہے۔

- ”صوفی اسلام“ اور ”مولوی اسلام“ میں تفریق کر کے صوفی اسلام کو قابل قبول سمجھا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جنرل (ر) پرویز مشرف کی سرپرستی میں صوفی اسلام کے فروغ کیلئے اعلیٰ سطحی کونسل بھی قائم کر دی گئی تھی مگر حالیہ واقعات نے بتا دیا ہے کہ صوفی اسلام اور مولوی اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس خود ساختہ فرق کا سہارا لینے کی مغربی کوششیں خود کو فریب دینے کے سوا کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں۔
- دینی حمیت و غیرت کو مولوی کے ساتھ مخصوص قرار دے دیا گیا تھا مگر وکلاء، سیاست دانوں اور تاجروں نے ناموسِ رسالتؐ کے حوالے سے جس حوصلہ و جرأت اور محبت و عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے بہت سے لوگوں کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دی ہے کہ مولوی کے علاوہ باقی طبقات کی دین کے ساتھ کمٹمنٹ کو توڑا جا سکتا ہے اور مولوی کے خلاف نفرت پھیلا کر اس معاشرے میں دین کے کردار کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں جس طرح جنوبی ایشیا کے بارے میں عالمی منصوبوں کے ”ماسٹر مائنڈ“ کیلئے ایسے لوگ گوارا نہیں ہیں جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان پل بن سکتے ہیں اور ملک کے اندر بھی مصالحت و مفاہمت کا کردار ادا کر سکتے ہیں، اسی طرح دینی قوتوں کا کسی عنوان پر اتحاد بھی ان کیلئے قابل برداشت نہیں ہے۔ جو قوتیں دینی حلقوں کے اتحاد کو اپنے ایجنڈے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں اور اعتدال و توازن اور صلح و مفاہمت کی بات کرنے والی شخصیات کو ”کباب میں ہڈی“ تصور کرتی ہیں وہی قوتیں کرنل امامؒ کی شہادت اور حضرت سید علی ہجویریؒ کے عرس پر خودکش حملے کی ذمہ دار ہیں۔ استعمال ہونے والے کوئی بھی ہوں، ان کا آپس میں تعارف و رابطہ بھی نہ ہو، اور خواہ انہیں اپنے استعمال ہونے کا شعور بھی نہ ہو، مگر استعمال کرنے والا ماسٹر مائنڈ تو ایک ہی ہے جو دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۱ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳ فروری ۲۰۱۱ء کی خبر کے مطابق صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری نے جاپان کے تین روزہ سرکاری دورے کے موقع پر جاپانی سرمایہ کاروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ”پاکستان میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے دہشت گردی کے خاتمہ میں مدد ملے گی اور عالمی امن کو تقویت حاصل ہوگی۔“

جہاں تک پاکستان میں سرمایہ کاری کیلئے بیرونی سرمایہ کاروں کو توجہ دلانے کا مسئلہ ہے یہ ملکی معیشت کی ایک اہم

ضرورت ہے اور اس کیلئے حکمرانوں کی کوششوں کو ہم سراہتے ہیں لیکن سرمایہ کاری کو دہشت گردی کے ساتھ نتھی کرنے کی بات ہمارے لیے ہمیشہ ناقابل فہم رہی ہے۔ دراصل عالمی قوتوں کو یہ مغالطہ ہے کہ جسے وہ دہشت گردی قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف جنگ کا بگل بجا کر انہوں نے اپنے سارے وسائل میدان جنگ میں جھونک دیے ہیں، اس کی اصل وجہ غربت ہے اور یہ فقر و فاقہ کے مارے ہوئے لوگ ہیں جو دولت کی تلاش میں دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس لیے اگر پاکستان میں سرمایہ کاری کے ذریعے روزگار کی فراہمی کی صورت عام ہو جائے اور لوگوں میں خوشحالی کا ماحول پیدا کیا جا سکے تو اس مبینہ دہشت گردی کا زور کم کیا جا سکتا ہے اور لوگوں کو دہشت گردی اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

ہم نے متعدّد بار یہ عرض کیا ہے کہ یہ بات خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ مبینہ دہشت گردی کے اسباب میں غربت کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں ہے بلکہ جس عمل کو دہشت گردی قرار دے کر اس کے خاتمہ کیلئے عالمی قوتیں کوشاں ہیں اس کی وجہ عقیدہ و ثقافت ہے اور عالمی قوتوں کی وعدہ خلافیاں اور فریب کاریاں اس کا اصل سبب ہیں۔ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی کو اپنے عقیدہ و ثقافت کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں اور ریاستی و معاشرتی معاملات سے مذہب کی بے دخلی کے مغربی فلسفہ کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کے ساتھ تاریخ کی یہ سب سے بڑی دھاندلی ہوئی ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف ان کی قوت سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد جب جہادِ افغانستان کے اصل ایجنڈے یعنی ملک میں نفاذ شریعت کو بروئے کار لانے کا مرحلہ آیا تو مغربی قوتوں نے نہ صرف انہیں یہ حق دینے سے انکار کر دیا بلکہ مغربی ممالک پوری قوت کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے۔ اس شرمناک دھاندلی کے ردعمل میں افغانستان کے لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں جبکہ اردگرد کے بہت سے گروہوں نے غصے اور نفرت سے بھرپور اسی ردعمل میں ہتھیار اٹھا لیے ہیں جسے دہشت گردی قرار دے کر ان کے خلاف عالمی سطح پر جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کیلئے اس صورتحال کے اصل اسباب و عوامل پر پردہ ڈال کر ہتھیار اٹھانے والے گروہوں کے جذبات کو معاشی اسباب کے ساتھ نتھی کرنا اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی اور ظلم کی بات ہے اور ہمارے خیال میں مغربی ملکوں کو مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ اصل حقائق اور اسباب کو ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کر دینا بھی ہے۔

صدر پاکستان سے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مبینہ دہشت گردی کو غربت کے ساتھ نتھی کر کے معاشی سہولتوں کی فراہمی کو اس مسئلہ کا حل بتانا مغرب کی خود فریبی اور مغالطہ کاری ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں کو تو کم از کم اس فریب کاری کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دے کر معروضی حقائق سے منہ نہیں پھیرنا چاہیے۔ پاکستان کے حکمرانوں سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہے کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کا اصل مسئلہ غربت اور افلاس نہیں بلکہ عقیدہ و ثقافت ہے اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو تحفظ و احترام فراہم کیے بغیر مبینہ دہشت گردی کے کمزور پڑنے کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے، اس حقیقت کو عالمی طاقتیں اور ان کے ہمنوا جتنی جلدی سمجھ لیں خود ان کیلئے بہتر ہوگا۔

الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ

روزنامہ اسلام، لاہور---۶ مئی ۲۰۱۱ء

الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ کا نام پہلی بار افغانستان کی پہاڑیوں میں جہادِ افغانستان کے دوران سنا جب افغانستان میں روسی افواج کی آمد اور سوشلسٹ نظریات کے تسلط کے خلاف افغانستان کے مختلف حصوں میں علماء کرام اور مجاہدینِ آزادی نے علمِ جہاد بلند کیا اور افغانستان کی آزادی کی بحالی اور اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے میدانِ کارزار میں سرگرم ہوگئے۔ ابتداء میں یہ مجاہدین کسمپرسی کے عالم میں لڑتے رہے حتیٰ کہ پرانی بندوقوں اور بوسیدہ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ بوتلوں میں صابن اور پٹرول بھر کر ان دستی بموں کے ساتھ روسی ٹینکوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ دنیا انہیں دیکھ کر مجنون سمجھتی رہی، چٹان کے ساتھ سر ٹکرانے اور خودکشی کرنے کے طعنے دیتی رہی مگر ان خدامست لوگوں نے کسی طعنے اور الزام کی پرواہ کیے بغیر سر ٹکرانے کا یہ عمل جاری رکھا۔ مجھے وہ دور اچھی طرح یاد ہے جب شیرانوالہ لاہور کے ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا حمید الرحمان عباسیؒ شب و روز محنت کر کے آٹا، چینی اور دیگر ضروریات جمع کرتے اور جب ٹرک کے برابر سامان ہو جاتا تو اسے افغانستان پہنچانے کا بندوبست کرتے۔

پھر جب دنیا کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ چٹان سے سر ٹکرانے والے آسانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور چٹان کے اپنی جگہ سے سرکنے کا امکان پیدا ہوتا جا رہا ہے تو پوری دنیا اس طرف متوجہ ہوگئی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو سرد جنگ میں سوویت یونین کو شکست دینے کے خواہاں تھے، وہ لوگ بھی تھے جو گرم پانیوں اور خلیج عرب تک سوویت یونین کی رسائی کو روکنا چاہتے تھے، اور وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں تھے جنہوں نے قرآن و حدیث میں جہاد کی اہمیت و فضیلت کا سبق پڑھ رکھا تھا اور تاریخ میں مجاہدین کے کارنامے پڑھ پڑھ کر ان کے دل جہاد میں حصہ لینے کیلئے مچلتے تھے مگر کوئی عملی میدان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان بین الاقوامی کشمکش کا بہت بڑا میدان بن گیا اور مختلف ملکوں اور طبقات کے لوگ جہاد کے اس عمل میں مشغول پائے جانے لگے۔ افغان مجاہدین کی مختلف جماعتیں وجود میں آئیں، ان کے اتحاد تشکیل پائے، بیرونی قوتوں سے ان کے رابطے ہوئے، ہتھیاروں اور رقوم کی ریل پیل ہوئی اور افغانستان مجاہدین کی بھرتی اور ٹریننگ کا عالمی مرکز بن گیا۔

اس دوران میرا بھی افغانستان آنا جانا رہتا تھا، بہت سے مورچوں میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ لڑنا تو میں سرے سے نہیں جانتا اور نہ ہی کسی ہتھیار کی ٹریننگ حاصل کر سکا۔ ایک بار کسی انٹرویو میں مجھ سے سوال ہوا کہ کیا آپ ہتھیار چلانا جانتے ہیں؟ میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ کر کہا کہ یہ میرا ہتھیار ہے اور اس کو چلانا بحمد اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا مورچوں میں جانا دو مقاصد کیلئے ہوتا تھا۔ ایک یہ کہ اس سے مجاہدین کی حوصلہ افزائی ہوتی اور دوسرا اس لیے کہ وہاں سے تازہ معلومات حاصل کر کے قلم کے ذریعے اپنے قارئین کو ان سے آگاہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں جمعیت علمائے اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کا چیف ایڈیٹر تھا اور ایسے مقامات پر آنے جانے کیلئے میرا بڑا ٹائٹل یہی ہوا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً کسی مورچے میں جاتا، ایک دو دن رہتا اور واپسی پر اپنے مضامین کے ذریعے تاثرات و معلومات قارئین

کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اس دور میں میرے بیسیوں مضامین ہفت روزہ ترجمانِ اسلام اور ملک کے دیگر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔

جہادِ افغانستان میں عرب ممالک سے ہزاروں نوجوان شریک ہوئے، ان کے اپنے کیمپ تھے، ان میں بھی جانے کا موقع ملتا تھا۔ اس دوران وہیں سنا کہ سعودی عرب کے ایک انتہائی متمول اور مقتدر خاندان کا ایک نوجوان جہاد میں عملاً شریک ہے اور جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے دونوں محاذوں پر دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ اس نوجوان کا نام اسامہ بن لادن ہے اور وہ شہزادگی کی زندگی ترک کر کے خاکساری کے ذوق کے ساتھ شب و روز کے اعمال میں مصروف ہے۔ یہ یاد نہیں کہ اس دوران اسے دیکھا یا نہیں لیکن اس کی شجاعت اور سخاوت کے واقعات مسلسل سننے میں آتے رہے تا آنکہ عالمی میڈیا نے بھی اسے ایک عظیم مجاہد اور فریڈم فائٹر کے انداز میں جہادِ افغانستان کے ہیرو کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی، جہادِ افغانستان کے اس دور کا اختتام، سوویت یونین کے بکھرنے کا تاریخی عمل، اور جہادِ افغانستان کے منطقی نتیجے کو سبوتاژ کرنے کی سازشیں ایک مستقل موضوع بحث ہیں جس کا صرف ایک پہلو یہ ہے کہ افغان مجاہدین اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک دنیا بھر کے مجاہدین کے بارے میں عالمی پراپیگنڈے کا رخ اس طرح موڑ دیا گیا کہ انہوں نے دراصل امریکہ کی جنگ لڑی ہے اور سرد جنگ میں سوویت یونین کو شکست دینے میں امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی دور کی بات ہے ابھی افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کی تشکیل کے مختلف فارمولے آزمائے جا رہے تھے اور طالبان اور القاعدہ کا دور دور تک کوئی وجود بلکہ آثار تک نہیں تھے، اسلام آباد میں بائیں بازو کے چند دانشوروں کے ساتھ ایک مجلس میں میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ افغان مجاہدین کو امریکہ نے تیار کیا تھا، اس نے انہیں اپنے مقصد کیلئے استعمال کر کے چھوڑ دیا ہے اور افغان مجاہدین نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ جبکہ میرا موقف یہ تھا کہ جہادِ افغانستان کا آغاز افغان علماء اور مجاہدین نے اپنے ملک کی خود مختاری اور نظریاتی تشخص کیلئے کیا تھا اور کم و بیش تین برس تک وہ دیسی ہتھیاروں کے ساتھ فاقہ مستی کے عالم میں لڑتے رہے۔ جبکہ امریکہ اپنا مفاد دیکھ کر اس میں شریک ہوا اور پھر ساری دنیا اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس لیے اس جنگ میں مجاہدین کے اہداف مختلف تھے اور امریکہ کے اہداف الگ تھے۔ ان کے درمیان اشتراکِ عمل تو ہوا جس میں امریکی کیمپ نے اپنا ہاتھ دکھا دیا کہ اپنے مقاصد حاصل کر لیے مگر مجاہدین کے مقاصد و اہداف کو سبوتاژ کرنے میں مصروف ہے۔

جب گفتگو کچھ آگے بڑھی تو میں نے ان دوستوں سے کہا کہ اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں۔ اگر مستقبل کے پروگرام میں یہ مجاہدین امریکی ایجنڈے کا حصہ بن گئے تو میں تسلیم کر لوں گا کہ انہوں نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر آنے والے دور کا نقشہ اس سے مختلف ہوا اور مجاہدین نے امریکی ایجنڈے میں فٹ ہونے سے انکار کر دیا تو آپ دوستوں کو میری بات ماننا ہوگی کہ اس جنگ میں مجاہدین کے اپنے اہداف و مقاصد تھے اور وہ امریکہ کی جنگ لڑنے کی بجائے اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ البتہ جنگ کی ترجیحات کے تعین میں وہ امریکہ سے بازی ابھی تک نہیں جیت پائے کہ امریکہ نے اپنی طاقت، لابنگ، ڈپلومیسی اور میڈیا کے ذریعے انہیں سرِدست کارنر کر دیا ہے۔

اس کے بعد القاعدہ سامنے آئی اور طالبان کا دور دنیا نے دیکھا۔ وہی مجاہدین جو سوویت یونین کے خلاف جہاد میں بظاہر امریکہ کے شانہ بشانہ تھے اب امریکہ کے سامنے کھڑے تھے اور تمام تر جاہ و جلال اور شان و شوکت کے باوجود امریکہ کا سانس پھولتا سب کو دکھائی دے رہا تھا۔ الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ جن دنوں جلال آباد افغانستان میں مقیم تھے میری ان سے ملاقات ہوئی، میں نے ایک رات ان کے کیمپ میں گزاری، ان سے انٹرویو لیا جو قومی اخبارات میں انہی دنوں شائع ہوا۔ خفیہ ادارے کافی عرصہ تک میرا پیچھا کرتے رہے کہ آپ وہاں تک کیسے پہنچے؟ مگر میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں جرنلسٹ ہوں میرے اس سفر کی ساری رپورٹ اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اور میں نے کوئی خفیہ کام نہیں کیا۔ البتہ اپنے سفر کے ذرائع بتانے کا پابند نہیں ہوں اور نہ ہی بتاؤں گا۔

اس دوران جب ''القاعدہ'' تشکیل پائی تو مجھ سے بھی رابطہ کیا گیا مگر میرے کچھ تحفظات تھے۔ میں جہادِ افغانستان کے منطقی نتائج کی تکمیل اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام و استحکام سے پہلے عالمِ اسلام میں کسی بھی اور جنگ کو قبل از وقت سمجھتا تھا اور اپنی اس رائے پر اب بھی قائم و مطمئن ہوں۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی البتہ دنیا کے کسی بھی حصے میں جو مجاہدین خلوص کے ساتھ دین کی سربلندی اور اپنے اپنے ملک کی آزادی و خود مختاری کیلئے میدانِ عمل میں ہیں، میری دعائیں اور نیک تمنائیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ عالمِ اسلام بالخصوص عالمِ عرب میں عالمی استعمار کے استعماری ایجنڈے کے خلاف مزاحمت کی علامت تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اس کیلئے پوری قوت کے ساتھ جنگ لڑی۔ ان کے طریق کار اور ترجیحات سے اختلاف ہو سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھا لیکن ان کے خلوص، ایثار، جدوجہد حبِ دینی، استقامت، عزم و حوصلے اور مسلسل قربانیوں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس پر وہ ہر نیک دل مسلمان کے سلامِ محبت و عقیدت کے حقدار ہیں۔ جہاد کے اس مقدس عمل میں کون کون لوگ کہاں کہاں سے شریک ہوئے، ان کی قربانیوں اور جہد و ایثار کو دیکھیں تو بلاشبہ یہ اس دور میں اسلام کے اعجاز اور جہاد کی کشش کا خوبصورت اظہار ہے۔ میں اس نوجوان کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ایک بار مجھے افغانستان کے ایک مورچے سے واپس پاکستان چھوڑنے آرہا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سترسال ہوگی، میں نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ بتایا کہ مدینہ منورہ کا باشندہ ہوں۔ دریافت کیا کہ کب سے یہاں ہو؟ جواب دیا کہ دو سال سے ہوں۔ پوچھا کہ کب واپسی کا ارادہ ہے؟ کہا کہ جہاد میں کامیابی کے بعد ہی واپس جاؤں گا یا یہیں شہید ہو جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ مدینہ منورہ چھوڑ کر یہاں کیوں آگئے ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ جہاد یہاں ہو رہا ہے، اس کے بعد مجھے اس سے کوئی اور سوال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

یہ نوجوان اسامہ بن لادن نہیں تھا لیکن اپنے جذبے اور قربانی کے حوالے سے وہ بھی ایک اسامہ ہی تھا، اس جیسے اسامہ بن لادن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین کی صفوں میں موجود ہیں۔ اس لیے اسامہ شہید تو ہوا لیکن مرا نہیں، کیونکہ وہ اب گوشت پوست کے کسی انسان کا نام نہیں رہا بلکہ حریت، جہاد اور استقامت کی علامت بن چکا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اسے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور خلوص و ایثار کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو ہر جگہ کامیابی سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اصل دہشت گرد کون؟

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۱۲ مئی ۲۰۱۱ء

مئی کے پہلے ہفتے میں عام طور پر دو حریت پسندوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ ایک سلطان ٹیپو شہیدؒ جس نے مشرقی ہند پر انگریزوں کی یلغار کا مسلسل مقابلہ کیا، بالآخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم کے محاصرے کے دوران جام شہادت نوش کیا اور اس کی شہادت کے بعد اس کی لاش پر کھڑے ہو کر انگریزی فوجوں کے کمانڈر نے کہا تھا کہ ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے“۔ دوسرا تذکرہ مئی کے پہلے ہفتے کے حوالے سے تاریخ میں شہدائے بالاکوٹ کا کیا جاتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جب اپنے جہادی مرکز کو کشمیر منتقل کرنے کے ارادے سے ہزارہ کے راستے کشمیر کی طرف سفر کر رہے تھے تو ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے مقام پر انہوں نے سکھ فوجوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ جبکہ اب ایک تیسرا حریت پسند اسامہ بن لادن شہیدؒ بھی ۲ مئی ۲۰۱۱ء کو مبینہ طور پر ایبٹ آباد میں امریکی چھاپہ ماروں کے ہاتھوں شہید ہو کر مئی کے شہداء کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متمول خاندان بن لادن فیملی کا چشم و چراغ تھا۔ یہ خاندان سعودی عرب میں آل سعود کے شاہی خاندان کے بعد سب سے زیادہ متمول اور بااثر سمجھا جاتا ہے اور اس خاندان کی تجارتی چہل پہل آج بھی وہاں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں کے تسلط کے خلاف جب وہاں کے علماء کرام اور عوام نے علمِ بغاوت بلند کیا تو انہیں ایک مسلمان ملک کی خود مختاری اور نظریاتی تشخص کی بحالی کے ساتھ ساتھ جہاد کے عمل کے احیا کے حوالے سے بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ یہ وہ دور تھا جب افغانستان میں مختلف گروپ سوویت افواج کی مداخلت کے خلاف جہاد کے عنوان سے جنگ کا آغاز کر چکے تھے اور پاکستان کے سرکردہ علماء کرام بالخصوص حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا عبدالحقؒ آف اکوڑہ خٹک پوری بلند آہنگی کے ساتھ ان کی اس جنگ کو شرعی جہاد قرار دے کر ان کے حق میں مسلسل آواز بلند کر رہے تھے۔

مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے، جو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں شاگردوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ رکھتے تھے، پورے قبائلی علاقوں کا تفصیلی دورہ کر کے لوگوں کو جہاد افغانستان کی پشت پناہی اور اس میں شریک ہونے کیلئے تیار کیا۔ جبکہ مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد (اب خیبر پختون خوا) کے بڑے شہروں میں پبلک جلسے منعقد کر کے کھلم کھلا اس موقف کا اظہار کیا کہ افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی کی نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں، اس لیے کہ سوویت یونین کی اگلی منزل پاکستان اور بلوچستان کا ساحل سمندر ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اس نعرے کے ساتھ جہاد افغانستان کیلئے پاکستان بھر میں ایک مستقل محاذ گرم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم سوویت یونین کی یلغار سے بچتے بچتے امریکی یلغار کی زد میں آ گئے ہیں اور اپنے اردگرد مغربی استعمار کے بنائے ہوئے حصار سے نکلنے کا کوئی راستہ سرِدست ہمیں دکھائی نہیں دے رہا۔

اسی دوران بہت سے عرب علماء بھی جہاد افغانستان کی حمایت میں سامنے آئے اور ان کی ترغیب پر ہزاروں عرب

نوجوانوں نے افغان مجاہدین کے ساتھ شریک جہاد ہونے کا راستہ اختیار کیا۔ انہی میں ایک نوجوان اسامہ بن لادن شہیدؒ بھی تھے جو شہزادگی کی زندگی سے دستبردار ہو کر خاک نشینی کے ماحول میں آئے اور افغانستان کی پہاڑیوں میں جہاد کیلئے اپنی جان کے ساتھ ساتھ مال بھی وقف کر دیا۔ ان کے ساتھ سینکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوان آئے اور عرب مجاہدین کے نام سے مجاہدین کا ایک مستقل تشخص سامنے آیا جس میں سعودی عرب کے علاوہ دیگر عرب ممالک کے لوگ بھی شامل تھے اور افغان مجاہدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی مجاہدین اور عرب مجاہدین کی سرگرمیاں جہاد افغانستان کا مستقل حصہ بن گئیں۔

افغانستان سے سوویت یونین کی فوجوں کے انخلا تک امریکہ ان مجاہدین کی پشت پر تھا، پاکستان بھی ساتھ تھا، عرب ممالک بھی پشت پناہ تھے اور دنیا بھر کے ممالک کی حمایت انہیں حاصل تھی۔ مگر سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے ساتھ ہی یہ مجاہدین خود اپنے حمایتیوں اور پشت پناہوں کی نظر میں معتوب ہو گئے اور ان سے جان چھڑانے کیلئے انہیں نظر انداز کر دینے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ انہیں عالمی سطح پر مجاہدین اور حریت پسندوں کا جو اعزاز حاصل تھا وہ ان سے واپس لے کر ان کیلئے دہشت گردی کا تمغہ تجویز کیا گیا اور ان کے مستقبل کا کوئی ایجنڈا طے کرنے کیلئے ان کی سرپرستی اور رہنمائی کرنے کی بجائے انہیں تنہا اور آزاد چھوڑ دیا گیا۔ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر جہاد افغانستان کے حمایتی ممالک اور قوتیں بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان مجاہدین کے مختلف گروپوں کو تنہا چھوڑ دینے کی بجائے ان کے قائدین کو جمع کر کے ان کے مستقبل کی نقشہ گری میں مشاورت اور راہنمائی کا اہتمام کرتے تو دنیا کو آج جیسی صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ لیکن شاید بعض قوتیں یہی کچھ چاہ رہی تھیں جبکہ پوری دنیا کو اس کے تلخ ثمرات بھگتنا پڑ رہے ہیں۔

عرب مجاہدین نے اپنے لیے ایک راستہ منتخب کر لیا کہ وہ عرب ممالک میں مغربی ممالک کی افواج کی موجودگی اور اس کے نتائج و عواقب کا سامنا کریں گے اور جیسے افغانستان میں سوویت یونین کے تسلط کے خاتمہ اور افواج کی واپسی کیلئے انہوں نے جہاد کیا ہے اسی طرح عرب ممالک میں مغربی ممالک کی فوجوں کی موجودگی اور مغربی بلاک کی پالیسیوں کی بالادستی کے خلاف جہاد کریں گے۔ اس جذبہ اور عزم کو انہوں نے ''القاعدہ'' کا نام دیا اور اس کی قیادت کیلئے شیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ کو منتخب کر لیا گیا۔ شیخ اسامہ نے اس مقصد کیلئے خود کو اپنے تمام تر وسائل سمیت وقف کر دیا اور زندگی بھر اس کیلئے سرگرم عمل رہے۔ انہیں اس مشن کیلئے ٹیم اور رفقا بھی مل گئے۔ ان کی ترجیحات اور طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں خود میرے تحفظات بھی تھے اور ہیں کہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام تک کم از کم دس سال تک افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک سب بہی خواہوں کو اپنی توجہ اسی نکتے پر مرکوز رکھنی چاہیے تھی مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اسامہ بن لادن شہیدؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد تھا جبکہ آج تک عالمی سطح پر دہشت گردی کی کوئی تعریف طے نہیں کی گئی اور مغربی قوتوں کے موجودہ طرز عمل نے دہشت گردی، تحریک آزادی اور حریت پسندی کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس فضا میں ہر شخص آزاد ہے کہ جس کو چاہے دہشت گرد قرار دے دے۔ اس افراتفری میں اسامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینے کی کوئی اصولی اور اخلاقی حیثیت نہیں، جو کچھ اس نے کیا ہے، وہ سب لوگ کر رہے ہیں، بلکہ اقوامِ متحدہ کا پرچم تھامے مغربی ملکوں کی فوجیں بھی وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا الزام اسامہ بن

لادن شہیدؒ پر لگایا جا رہا ہے۔

آج اگر کوئی بین الاقوامی کمیشن آزادی اور انصاف کے ساتھ تقابلی جائزہ لے سکے تو اس کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ بڑا دہشت گرد کون ہے اور موجودہ دور میں دہشت گردی کے اسباب و عوامل اور محرکات فراہم کرنے میں سب سے زیادہ کس کا ہاتھ ہے۔ اسامہ بن لادن کو جس ماحول میں شہید کیا گیا ہے اس سے متعلقہ سوالات روز بروز سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں مگر امن، سلامتی، انسانیت اور اخلاقیات کے علمبرداروں کا یہ کردار تاریخ کے دامن سے کبھی محو نہیں ہو سکے گا کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی خود مختاری کو کھلے بندوں پامال کیا گیا اور شہید کیے جانے والے کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کرنے کا عام سا انسانی تقاضا پورا کرنے کا حوصلہ بھی شہید کرنے والوں میں نہیں پایا گیا۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں شہید کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ملی مجلس شرعی کی قراردادیں

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۵ جون ۲۰۱۱ء

اجلاس میں مندرجہ ذیل دو قراردادیں بھی منظور کی گئیں:

- افغانستان میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کا ساتھ دینا، انہیں خفیہ معلومات مہیا کرنا، انہیں سامان رسد پہنچانا، اپنے ہوائی اڈے ان کے سپرد کرنا، ڈرون حملوں پر خاموش رہنا، ذلت آمیز شرائط پر مالی امداد قبول کرنا اور انہیں بلاقید و امتیاز ویزے جاری کرنا، یہ سب جنرل (ر) پرویز مشرف اور اس کے بعد موجودہ حکومت کے وہ اقدامات ہیں جنہوں نے پاکستان کی خود مختاری کا خاتمہ کر کے اسے امریکی کالونی بنانے کی راہ ہموار کی ہے۔ جبکہ سانحہ ایبٹ آباد نے تو کسی خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی اور پاکستان کی خود مختاری پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ عوام و خواص چیخ اٹھے ہیں۔ ہم ملی مجلس شرعی کے علماء کرام اس صورتحال کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور موجودہ سیاسی و عسکری قیادت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے فی الفور دستبردار ہو جائیں جو درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ ہی کی ایک شکل ہے۔ اس سلسلہ میں امریکہ سے ہر قسم کا تعاون ختم کر دیں اور اپنے داخلی معاملات درست کرنے کی طرف توجہ دیں۔ ہمارے نزدیک آئندہ کسی ایسے سانحہ سے بچنے کی واحد مؤثر صورت یہ ہے کہ عوام امریکہ نواز قیادت کا بوجھ سر سے اتار پھینکیں اور امریکی غلامی سے نجات کیلئے قومی خود مختاری کی بحالی کے ایک نکاتی ایجنڈے پر جمع ہو جائیں۔
- ملی مجلس شرعی کے سبھی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کا یہ نمائندہ اجلاس بعض امریکی پادریوں کی

طرف سے علی الاعلان قرآن کریم جلانے، امریکی حکومت کے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے اور اس کے خلاف ایکشن نہ لینے کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتہا پسند اہل مغرب اور ان کے حکمران اسلام و مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں اور ان کے مقدسات کی بے حرمتی کر کے انہیں مشتعل کرتے ہیں تاکہ اگر وہ ردعمل ظاہر کریں تو ان کے خلاف انتہا پسندی اور دہشت گردی کا جھوٹا پروپیگنڈا کیا جا سکے۔ حالانکہ ان کا یہ طرز عمل خود گواہی دے رہا ہے کہ ان میں قوت برداشت موجود نہیں ہے اور وہ خود انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔ ہم مسلم نمائندوں کی حیثیت سے امریکہ کے متعصب اور جنونی پادریوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آئی سی او کے سربراہان اور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی و سلامتی کونسل کے ذریعے ایسے اقدامات کے سدباب کیلئے مؤثر قانون سازی اور ان پر فوری عملدرآمد کو یقینی بنائے۔ اجلاس امریکی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ دریدہ دہن پادریوں کو سخت سزا دے تاکہ آئندہ کسی کو مسلمانوں کی دل آزاری کی جرأت نہ ہو۔

انتہا پسندی اور اس کی خودساختہ تعریف

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۲ جولائی ۲۰۱۱ء

نیویارک سے شائع ہونے والے اردو اخبار ہفت روزہ ’’پاکستان پوسٹ‘‘ کا جون کا آخری شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے اور اس میں انتہا پسندی کے حوالے سے شائع ہونے والی دو خبریں توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ امریکی کانگریس کی ’’ہوم لینڈ سکیورٹی کمیٹی‘‘ نے گذشتہ دنوں اس مسئلہ پر انکوائری کا اہتمام کیا کہ امریکہ کی جیلوں میں محبوس مسلمان قیدیوں میں انتہا پسندی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں ان پر کیسے قابو پایا جائے؟ اس سلسلہ میں ٹیکساس سے کانگریس کی ڈیموکریٹک خاتون ممبر شیلا جیکسن اور نیویارک ڈیپارٹمنٹ آف کمیونیکیشن سروسز کے سابق انسپکٹر برائے کریمینل انٹیلی جنس یونٹ مسٹر پیٹرک ڈینلوے کا ایک مکالمہ بھی اس رپورٹ کا حصہ ہے جس میں مسز شیلا جیکسن کا کہنا ہے کہ مسیحی نوجوانوں میں بنیاد پرستی اور انتہا پسندی پر بھی نظر رکھی چاہیے کیونکہ وہ بھی امریکہ کی بدنامی کا باعث بن سکتے ہیں۔ شیلا جیکسن نے ایک مسیحی نوجوان کا ذکر کیا جو اسقاط حمل کے کلینک کو اڑانا چاہتا تھا اور اس کا یہ اقدام اس امریکی قانون کے خلاف تھا جس کے تحت خواتین کو اسقاط حمل کا حق دیا جاتا ہے۔ شیلا جیکسن نے کہا کہ ہمیں وسیع تر نقطۂ نظر سے سوچنا چاہیے اور تجزیہ بھی کرنا چاہیے کیونکہ عیسائی انتہا پسند بھی امریکہ کے نام کو خراب کر سکتے ہیں اور مسائل کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس پر مسٹر پیٹرک ڈینلوے نے کہا کہ ان کے علم میں یہ بات قطعاً نہیں ہے کہ عیسائی انتہا پسندوں کو

غیر ملکی حکومتوں کی حمایت حاصل ہے یا انہیں بیرونی ممالک سے فنڈز ملتے ہیں۔ جبکہ شیلا جیکسن نے کہا کہ فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ ان کا منصوبہ امریکی قوانین کو سبوتاژ کرنے کا ہے یا نہیں۔

جہاں تک امریکی جیلوں میں قبول اسلام کے واقعات اور مجرموں کے اسلامی تعلیمات کے ذریعے جرم سے اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی بات ہے اس کا رجحان بہت پرانا ہے جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ سیاہ فام امریکی نومسلموں کے معروف لیڈر مالکم شہباز شہیدؒ نے بھی جیل میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ نصف صدی پہلے کا قصہ ہے جب وہ مالکم لٹل کے نام سے چوروں کی ایک ٹولی کے لیڈر کے طور پر جیل میں تھے اور عالیجاہ محمد سے ملاقات کے دوران ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا، پھر مالکم شہباز کے نام سے ایک مبلغ اور داعی اسلام کے طور پر ان کے ساتھ شریک کار ہو گئے تھے۔ عالیجاہ محمد خود بھی نومسلم تھے اور اس بات کے داعی تھے کہ امریکہ میں افریقہ سے لا کر آباد کیے جانے والے سیاہ فاموں کی اکثریت مسلمان تھی اور انہیں زبردستی مسیحی بنایا گیا تھا اس لیے انہیں اسلام کی طرف واپس لوٹ جانا چاہیے جو ان کا اصل مذہب ہے۔ مگر عالیجاہ نے اس کیلئے نبوت کا دعویٰ ضروری سمجھا اور بعض من گھڑت عقائد بھی اسلام میں شامل کر دیے جس سے مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔

مالکم شہباز شہید نے کچھ عرصہ عالیجاہ محمد کے ساتھ ان کے دست راست کے طور پر کام کیا مگر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے دوران انہیں اصل اسلامی عقائد سے آگاہی حاصل ہوئی تو انہوں نے عالیجاہ محمد کے من گھڑت اسلام سے توبہ کر کے ۱۹۶۴ء میں اصل اسلامی عقائد اختیار کر لیے۔ مگر اس کے صرف ایک سال بعد ۱۹۶۵ء میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ نیویارک کے علاقے مین ہیٹن میں ''مالکم شہباز شہید مسجد'' کے نام سے ان کا مرکز آج بھی کام کر رہا ہے جہاں مجھے ایک بار حاضری کا موقع مل چکا ہے۔

آج مالکم شہباز شہیدؒ کے ہزاروں بلکہ لاکھوں پیروکار امریکہ کے مختلف حصوں میں موجود ہیں اور اسلامی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہیں اور اس سب کچھ کی بنیاد جیل پر ہے کہ انہوں نے جیل میں اسلام قبول کیا اور ان کا رخ جرم سے اصلاح کی طرف تبدیل ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ سے امریکی جیلوں میں یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے کہ مسلمان قیدی دینی تعلیمات پر عملدرآمد کی طرف رجوع کر رہے ہیں، ان میں نماز روزے کی پابندی فروغ پا رہی ہے اور حلال و حرام کے فرق کا ذوق بیدار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں میں قبول اسلام کے واقعات بھی بڑھ رہے ہیں جسے امریکی حکام مسلم بنیاد پرستی کے فروغ کا عنوان دے کر اس پر پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کی روک تھام کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ مگر ٹیکساس سے امریکی کانگریس کی خاتون رکن شیلا جیکسن نے بجا طور پر توجہ دلائی ہے کہ مذہب کی طرف واپسی اور مذہبی تعلیمات کے ساتھ کمٹمنٹ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ مسیحیوں میں بھی فروغ پا رہی ہے اور ان میں بھی ایسے انتہا پسند پیدا ہو رہے ہیں جو شدت پسندانہ جذبات رکھتے ہیں اور ان کے اظہار کیلئے راستے تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

دوسری رپورٹ وسط ایشیا کے مسلمان ملک تاجکستان کے بارے میں ہے جہاں کی حکومت نے ۱۸ سال سے کم عمر نوجوانوں پر مساجد اور دیگر مذہبی عبادت گاہوں میں جانے پر پابندی لگا دی ہے کیونکہ اس کے خیال میں اس سے مذہبی

انتہا پسندی کے رجحانات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ تاجکستان وسطی ایشیا کی ان مسلم ریاستوں میں سے ہے جو کم و بیش پون صدی تک کمیونسٹ سوویت یونین کے زیر تسلط رہنے کے بعد جہاد افغانستان کے نتیجے میں آزاد ہوئی ہیں۔ اس ریاست میں مسلمان آبادی نوے فیصد ہے مگر دستوری طور پر یہ سیکولر ریاست ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ تقریباً پون صدی کا عرصہ اور کم از کم تین نسلیں جبری لامذہبیت کا شکار رہنے کے بعد چوتھی نسل میں مذہب کے ''جراثیم'' بالکل ختم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بات کسی اور مذہب کے بارے میں توسچ ہو سکتی ہے بلکہ مشاہدے میں بھی آچکی ہے مگر اسلام کے حوالے سے یہ سوچنا اسلام کے مزاج اور خاصیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، جو جبری لامذہبیت کا سائبان سر سے ہٹتے ہی پورے وسط ایشیا میں آشکارا ہو گیا ہے اور ساری دنیا نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ریاستی جبر و تشدد کے ذریعے زیر زمین چلا جانے والا مذہب پھر سے زمین کے اوپر آگیا ہے اور سیکولر حکومتوں کو اس کا راستہ روکنے کیلئے نوجوانوں کے مسجد میں جانے پر پابندی لگانا پڑ رہی ہے حتیٰ کہ تاجکستان کی حکومت نے قانون نافذ کر دیا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا کوئی نوجوان مسجد، چرچ یا کسی بھی دوسری مذہبی عبادت گاہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

مسئلہ امریکہ میں ہو یا تاجکستان میں یا پھر دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں ہو، یہ سوال سب جگہ مشترکہ ہے کہ جس چیز کو آج کی دنیا نے مذہبی انتہا پسندی کا ٹائٹل دے رکھا ہے اسے کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اور یہ بات بھی سب میں مشترک ہے کہ ہر جگہ اس مقصد میں ناکامی ہو رہی ہے اور تمام تر رکاوٹوں اور دفاعی اقدامات کے باوجود انسانی سوسائٹی میں مذہب کی طرف واپسی بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ آج کی دنیا مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی خود ساختہ تعریف طے کر کے اس کے پیچھے لٹھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیمات کی طرف واپسی کو بنیاد پرستی اور انتہا پسندی، جبکہ استعماری قوتوں کے جبر و استبداد کے خلاف ردعمل کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے حالانکہ یہ دونوں فطری چیزیں ہیں۔ مذہب انسان کی فطری، روحانی اور نفسیاتی ضرورت ہے جس سے انسانی سوسائٹی کو کسی صورت میں دور نہیں رکھا جا سکتا۔ اور جبر و استبداد کے خلاف ردعمل بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اس بات پر کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ جبر کو روکے بغیر اس کے ردعمل کو روکنے کا عمل فطرت کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہوتا ہے۔

جن قوتوں نے جبر، دباؤ، لابنگ اور پراپیگنڈا کے زور پر دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے کا منظر قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن آخر کب تک؟ اگر کمیونسٹ سوویت یونین میں ایک گورباچوف موجود تھا جس نے فطری اور زمینی حقائق پر مصنوعی طور پر ڈالے گئے پردوں کو چاک کر کے اصل منظر کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا تو کیا سرمایہ دارانہ مغرب کی کوکھ بانجھ ہو چکی ہے کہ اس میں ایک گورباچوف کو جنم دینے کی صلاحیت بھی نہیں رہی؟

امریکی دھمکیاں اور قومی خودمختاری

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۱ء

وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں ملک کی سیاسی، مذہبی اور عسکری قیادت نے امریکی الزامات کو بیک آواز مسترد کرتے ہوئے امریکہ کی طرف سے ڈو مور کے مطالبے کو قبول نہ کرنے کا اعلان کیا ہے جو ملک بھر کے عوام کے دلوں کی آواز ہے۔ اس طرح رائے عامہ کے رجحانات و جذبات نے ایک متفقہ قومی موقف کی حیثیت اختیار کرلی ہے جس پر آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے والے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی اور کانفرنس کے تمام شرکا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کانفرنس میں ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی اور اس پر عملدرآمد کیلئے کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ بھی سامنے آیا ہے جو ایک اچھی پیش رفت ہے۔ لیکن اس سے قبل اسی مسئلہ پر پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد اور اس پر عملدرآمد کیلئے قائم کی جانے والی پارلیمانی کمیٹی کی کارکردگی دیکھتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے کہ کہیں آل پارٹیز کانفرنس کی متفقہ قرارداد بھی پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کی طرح نادیدہ قوتوں کی مصلحتوں اور ترجیحات کی نذر نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اس عزم اور فیصلہ پر استقامت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

جہاں تک مذہبی قیادت کا تعلق ہے، ملک کے سرکردہ مذہبی قائدین اب سے ایک ہفتہ قبل لاہور میں جمع ہو کر اس موقف کا اظہار کر چکے ہیں۔ آج کی محفل میں اس کی کچھ تفصیلات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ”ملی مجلس شرعی“ تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل ایک مشترکہ علمی و فکری فورم ہے جو سالہا سال سے مذہبی مکاتب فکر کے درمیان مشترکات کو اجاگر کرنے کیلئے کام کر رہا ہے۔ اس فورم کے تحت ۲۴ ستمبر کو لاہور میں ”اتحادِ امت کانفرنس“ کا اہتمام کیا گیا جو ملی مجلس شرعی کے سربراہ مولانا مفتی محمد خان قادری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جبکہ مجلس کے سیکرٹری جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے کانفرنس کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔

کانفرنس کے شرکا میں جناب سید منور حسن، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا احمد علی قصوری، مولانا عبد المالک خان، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، پروفیسر ساجد میر، صاحبزادہ محب اللہ نوری، مولانا محمد امجد خان، مولانا صاحبزادہ فضل الرحیم اشرفی، مولانا خان محمد قادری، مولانا محمد حنیف جالندھری، پروفیسر حافظ محمد سعید، مولانا امیر حمزہ، مولانا قاری محمد یعقوب شیخ، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، مولانا ڈاکٹر حسین اکبر، سید افتخار حسین نقوی، مولانا عبید اللہ عفیف، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مولانا مفتی محمد طیب، مولانا اللہ وسایا اور مفتی طاہر مسعود کے علاوہ بھرچونڈی شریف کے سجادہ نشین بزرگ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

شرکا کے اسماء گرامی سے ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس تمام مذہبی مکاتب فکر کے سرکردہ رہنماؤں پر مشتمل تھی اور ملک کی مذہبی رائے عامہ کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔ لیکن ملک کے میڈیا نے اس اعلیٰ سطحی نمائندہ کانفرنس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ میں بھی اس کانفرنس میں شریک تھا بلکہ ملی مجلس شرعی کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے کانفرنس کے منتظمین میں سے تھا مگر کانفرنس سے اگلے روز کم و بیش نصف درجن قومی اخبارات دیکھنے کے باوجود مجھے کسی

معروف قومی اخبار میں اس کانفرنس کی خبر پڑھنے کو نہیں ملی، ممکن ہے کہ لوکل ایڈیشنز میں خبر شائع ہوئی ہو جنہیں میں نہیں دیکھ سکا۔ امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ”نیو ورلڈ آرڈر“ جاری کیا تھا، اس کی ایک باقاعدہ شق یہ تھی کہ عالم اسلام میں مذہبی قیادت اور مذہبی موقف کو کسی جگہ بھی قومی منظر پر سامنے نہ آنے دیا جائے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے میڈیا کا یہ رویہ اسی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد تمام مکاتب فکر کے سرکردہ مذہبی رہنماؤں کی اس قومی کانفرنس کے فیصلوں اور مختصر کارروائی کو اس کالم کے ذریعے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کانفرنس میں امریکی دھمکیوں اور قومی خود مختاری کے بارے میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

”ہم پاکستان کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت بحرانی کیفیت میں ہے۔ عوام الناس قتل و غارت گری، دہشت گردی اور مصائب و مشکلات کا شکار ہیں۔ پاکستان کی قومی سلامتی خطرے میں ہے جس کا سب سے بڑا سبب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افغانستان میں مسلح مداخلت ہے اور اب افغانستان میں وہ اپنی ہاری ہوئی جنگ پاکستان پر مسلط کرنا چاہ رہا ہے جس نے صورتحال کو مزید گھمبیر بنا دیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حکمران بھی اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار اور مفادات کیلئے امریکی آلۂ کار بننا قبول کر لیا اور اب رفتہ رفتہ پوری قوم کو امریکی مفادات اور ان کے مکروہ عزائم کی بھینٹ چڑھانے کے درپے ہیں۔ چنانچہ آج کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ امریکی مفادات کے تحفظ کی پالیسی یکسر ختم کر دی جائے، ڈرون حملے فوری طور پر بند کرائے جائیں، بلیک واٹر اور صیہونی و بھارتی ایجنسیوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا نیٹ ورک توڑ دیا جائے، فوجی تربیت اور خفیہ معلومات کے تبادلے کی آڑ میں بلائے گئے امریکی فوجیوں کو واپس بھجوایا جائے، پاکستان سے نیٹو فورسز کی سپلائی بند کی جائے، امریکہ کو دیے گئے فضائی اڈے عملاً خالی کرائے جائیں اور میڈیا کو ان تک رسائی دی جائے۔ نیز پاکستان دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد امریکی جنگ سے فی الفور الگ ہو جائے اور اندرون ملک کے ناراض عناصر سے باہمی مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے۔“

اتحاد بین العلماء کے حوالے سے درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

”ہم پاکستان کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اس امر کا اعلان و اظہار کرتے ہیں کہ ہم سب ایک امت ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایسے تمام اقدامات کی تائید کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں اتحاد و اتفاق بڑھے، اور ایسے سب عوامل اور اقدامات سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں انتشار و تشتّت پیدا ہو اور خلفشار بڑھے۔ بلاشبہ ہمارے درمیان فقہی و کلامی اختلافات

موجود ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے درمیان مشترکات بہت زیادہ ہیں جبکہ اختلافات کم ہیں۔ اور جو اختلافات ہیں انہیں گفت و شنید اور سنجیدہ و پروقار علمی ماحول میں زیر بحث لایا جاسکتا ہے اور انہیں قاطعِ اخوت اور موجبِ فساد نہیں بننا چاہیے۔ ہم اتحاد بین العلماء کی پرزور حمایت کرتے ہیں تاکہ اس اتحاد کے مثبت اثرات عوام الناس تک پہنچیں۔ لہٰذا آج ہم سب اعلان کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان متحد ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی خاص فقہی یا کلامی مسلک سے ہماری وابستگی اسلامی اخوت اور بھائی چارہ کی نفی نہیں کرتی۔ ہم کسی قسم کی فرقہ واریت اور عصبیت کی حمایت نہیں کرتے اور باہم مل کر دین حنیف کی عظمت و سربلندی، پاکستان میں نفاذ شریعت اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کیلئے کوشاں رہیں گے، اور علماء میں انتشار پیدا کرنے والوں کی کوششوں کو باہم مل کر اخلاص اور فراست سے ناکام بنائیں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں گے، اشتعال انگیز اور توہین آمیز تقریر و تحریر سے اجتناب کریں گے اور ایسے اقدامات سے گریز کریں گے جن سے باہم اتحاد و اتفاق کو ٹھیس پہنچے۔ اور اپنی تمام علمی و فکری صلاحیتیں اصلاحِ معاشرہ، اعلاء کلمۃ اللہ اور اتحادِ امت کیلئے صرف کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس عزم و ارادے میں کامیاب فرمائے اور اپنے اس فرمان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔"

ملی مجلس شرعی نے مسلسل دو تین سال کی محنت سے ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام کی جانب سے مرتب کردہ ۲۲ دستوری نکات کی موجودہ دور کے تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام سے دوبارہ توثیق کرانے کے علاوہ موجودہ حالات کی روشنی میں ان میں ۱۵ کے لگ بھگ مزید متفقہ نکات کا اضافہ بھی کیا ہے، جو اسلامائزیشن کی جدوجہد میں ایک اہم علمی پیش رفت ہے۔ یہ نکات اگلے کالم میں پیش کیے جائیں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

افغان طالبان کا مختصر پسِ منظر

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۳۱ جنوری ۲۰۱۲ء

طویل عرصہ سے اس خبر کا انتظار تھا جو آج پڑھنے کو ملی کہ امریکہ کے ساتھ مذاکرات کیلئے افغان طالبان قطر میں اپنا سیاسی دفتر قائم کر رہے ہیں اور اس مقصد کیلئے ان کے نمائندے قطر پہنچ چکے ہیں۔ امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ افغانستان پر فوج کشی کے بعد جب طالبان حکومت کا جبر کے ذریعے خاتمہ کر دیا تھا تو لندن سے ہمارے ایک مخدوم و محترم بزرگ حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی نے اپنے درد بھرے مضمون میں دکھ کا اظہار فرمایا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ہم نے ایک مضمون میں ان سے گزارش کی تھی کہ "سب کچھ ختم ہو گیا" کا تاثر درست نہیں ہے بلکہ ہمارے خیال میں تو کھیل

اب شروع ہوا ہے جس کے آخری نتیجے کیلئے آپ بزرگوں کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم نے اس عرصہ کے بارے میں بھی اپنے اندازے کا ذکر کیا تھا کہ کم از کم سات آٹھ سال کا عرصہ اس کھیل کیلئے درکار ہوگا اس کے بعد آپ اگر یہ بات کہہ سکیں کہ "سب کچھ ختم ہوگیا" تو شاید ہم بھی آپ کی بات سننے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ہمارے اندازے سے بات کچھ لمبی ہوگئی ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ "پاکستانی طالبان" نے جذباتیت اور جلدبازی کا مظاہرہ کر کے نہ صرف "افغان طالبان" کیلئے مشکلات پیدا کیں بلکہ اپنی جدوجہد کو بھی کنفیوژن اور الجھنوں کی نذر کر دیا۔ ورنہ الگ الگ محاذ کھڑے کرنے کی بجائے ساری قوت افغان طالبان کی سپورٹ میں حکمت عملی اور تدبر کے ساتھ صرف ہوتی تو ہمارا پہلا اندازہ شاید غلط ثابت نہ ہوتا اور "سیاسی مذاکرات" کی خبر ہمیں چار پانچ سال پہلے ہی پڑھنے کو مل جاتی۔

میں نے اپنی زندگی کا پہلا سیاسی جلسہ ۱۹۶۲ء میں صدر ایوب خان مرحوم کی طرف سے سیاسی سرگرمیاں بحال ہونے کے بعد گوجرانوالہ میں سنا تھا۔ میرا طالب علمی کا دور تھا اور یہ جلسہ میاں افتخار الدین مرحوم کی یاد میں تعزیتی جلسے کے طور پر ہوا تھا، مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے اس کی صدارت کی تھی اور اس کے مقررین میں شیخ حسام الدین مرحوم اور آغا شورش کاشمیری مرحوم شامل تھے۔ آغا شورش کاشمیری جلسے کے آخری مقرر تھے اور انہوں نے صدر ایوب خان مرحوم کے مارشل لاء کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خطاب کا آغاز اس جملے سے کیا تھا کہ "وہ اتنا عرصہ صدر ایوب بنے بیٹھے رہے اور ہم صبرِ ایوب بنے بیٹھے رہے"۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کا یہ خطیبانہ جملہ ابھی تک کانوں میں گونج رہا ہے اور نائن الیون کے بعد افغانستان کے بعد امریکی اتحاد کی یلغار کے بعد سے ہماری کیفیت بھی کم و بیش یہی چلی آرہی ہے کہ "ہم صبرِ ایوب بنے بیٹھے رہے"۔

ہمیں یہ تو بہرحال یقین تھا کہ افغانستان پر یہ فوج کشی کبھی کامیاب نہیں ہوگی اس لیے کہ افراد اور گروہوں کو طاقت کے زور پر شکست دی جاسکتی ہے مگر قوموں کو شکست دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اور افغانستان میں طالبان کے بارے میں دنیا کو یہی مغالطہ رہا ہے کہ یہ کوئی گروہ ہے جو اپنی بات پر اڑ گیا ہے اور اسے سزا دے کر اپنی بات منوائی جاسکتی ہے۔ مگر بڑی طاقتوں کو یہ بات سمجھنے میں ایک عشرہ صرف کرنا پڑا کہ طالبان کسی گروہ کا نام نہیں بلکہ افغان قوم کی ملی غیرت و حمیت اور اسلام و شریعت کے ساتھ افغانوں کی والہانہ وابستگی نے طالبان کا عنوان اختیار کر رکھا ہے۔ بہرحال "دیر آید درست آید" کے مصداق قطر میں طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کی ابتدا ہو رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ (افغان) طالبان کا وجود عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے ان کے کردار کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔

افغان طالبان کے پس منظر کے بارے میں جو حضرات زیادہ واقف نہیں ان کیلئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی آمد کے بعد مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنے وطن کی آزادی اور اپنے دینی نظریاتی تشخص کے تحفظ کیلئے جہاد کا علم بلند کیا تھا اور انہیں اس میں سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ لڑنے والی عالمی قوتوں کی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ اس جہاد میں افغانستان کے علاوہ پاکستان اور دوسرے ممالک سے بھی ہزاروں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس جہاد کے نتیجے میں روسی افواج نے افغانستان چھوڑ دیا لیکن ان کے جانے کے بعد اس جہاد کے فوائد

مغربی قوتوں نے اپنے دامن میں ڈال کر مجاہدین کے مختلف گروپوں کو آپس میں لڑنے کیلئے تنہا چھوڑ دیا اور افغانستان احمد شاہ مسعود مرحوم، انجینئر حکمت یار اور دوسرے گروہوں کے درمیان خانہ جنگی کا میدان بن گیا۔ اس خانہ جنگی میں افغانستان کی تباہی اور جہاد افغانستان کے منطقی نتائج کو ڈوبتا دیکھ کر مختلف جہادی گروپوں کے مخلص نوجوان قندھار کے ملا محمد عمر کی قیادت میں میدان میں آئے اور انہوں نے افغانستان کو امن فراہم کرنے اور اسلامی شریعت کے نفاذ کو اپنا مشن قرار دے کر اپنی فوج منظم کر کے رفتہ رفتہ افغانستان کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ''امارتِ اسلامی افغانستان'' کے نام سے اپنی حکومت قائم کر لی۔

اس کے ساتھ ہی جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے عرب مجاہدین نے الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ کی قیادت میں مشرقِ وسطیٰ میں امریکی فوجوں اور مغربی ممالک کی اسرائیل نواز پالیسیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور افغانستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ اس پر مغربی ملکوں کو اعتراض ہوا اور طالبان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عرب مجاہدین کی سرگرمیوں سے لاتعلقی کا اعلان کریں اور اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔ اسی دوران نائن الیون کا افسوسناک سانحہ رونما ہوا جس کی ذمہ داری عرب مجاہدین پر ڈال دی گئی اور اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ طالبان حکومت نے اس یکطرفہ مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ عالمی سطح پر غیر جانبدارانہ تحقیقات کا اہتمام کیا جائے، اس کے بغیر وہ اسامہ بن لادن کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس کے بعد اقوامِ متحدہ سے رجوع کر کے دہشت گردی کی کوئی تعریف اور مصداق طے کیے بغیر مبینہ دہشت گردی کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے افغانستان پر فوج کشی کر دی گئی اور طالبان قندھار کا اقتدار چھوڑ کر محاذ جنگ پر چلے گئے۔

تب سے افغانستان میں جنگ جاری ہے اور ایک عشرہ گزر جانے کے بعد بھی طالبان کو نہ تو شکست دی جا سکی ہے اور نہ ہی ان کے ایجنڈے اور عزم میں کوئی تبدیلی لائی جا سکی ہے۔ ابھی چند روز قبل کسی امریکی تھنک ٹینک کے حوالے سے ایک رپورٹ روزنامہ پاکستان میں شائع ہوئی ہے کہ افغان طالبان کو اس بات پر آمادہ نہیں کیا جا سکا کہ وہ افغانستان میں دوبارہ اقتدار میں آنے کیلئے ''سخت قوانین'' کے نفاذ کا ارادہ ترک کر دیں اور اس بات کو بعض امریکی دانشوروں کے ہاں افغانستان میں امریکی افواج کی جنگ کی ناکامی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

بہرحال یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اور جوں جوں مذاکرات آگے بڑھیں گے بہت سے نئے اور پرانے پہلو بے نقاب ہوتے رہیں گے۔ ہم سرِدست طویل انتظار کے بعد سامنے آنے والی اس خبر پر اطمینان اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور اس پر طالبان کے ساتھ ساتھ امریکہ کے اس فیصلے کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے بالآخر زمینی حقائق کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مذاکرات جلد شروع ہوں اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر افغانستان پوری دنیا کیلئے امن کی نوید ثابت ہو، آمین یارب العالمین۔

افغان طالبان کی استقامت کو سلام

ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۱۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۴ جنوری ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی انٹیلی جنس کے ایک ٹاپ سیکرٹ جائزے میں خبردار کیا گیا ہے کہ طالبان نے اقتدار حاصل کرنے اور دوبارہ سخت مذہبی قوانین نافذ کرنے کے مقصد کو ترک نہیں کیا۔ اس جائزے نے اوبامہ انتظامیہ کی طرف سے کابل اور شورش پسندوں کے درمیان امن معاہدہ کرانے کیلئے جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان کی کامیابی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں، صدر بارک اوبامہ کو گذشتہ ماہ پیش کی جانے والی اس

National intelligence estimate

میں یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ گذشتہ برس تیس ہزار امریکی فوجیوں نے سیکیورٹی کے معاملے میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ شاید دیرپا ثابت نہ ہوں۔

امریکہ نے دس برس قبل افغانستان پر جو جنگ مسلط کی تھی اور مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے عنوان سے جو متحدہ محاذ بنادیا تھا وہ اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا ہے اور اتحادی فوجیں افغانستان سے "باعزت" واپسی کی راہیں تلاش کر رہی ہیں۔ جس کیلئے شورش پسندوں (طالبان) اور کابل حکومت (کرزئی ٹولہ) کے درمیان امن معاہدہ کا نیا عنوان اختیار کیا گیا ہے اور اس کیلئے اوبامہ انتظامیہ اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آرہی ہیں۔ لیکن طالبان نے اسے مسترد کر کے امریکہ سے براہ راست گفتگو کا راستہ اپنایا ہے جو بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق مختلف مراحل سے گزر چکی ہیں اور ان مذاکرات کو آگے بڑھانے کیلئے قطر میں طالبان کے باقاعدہ دفتر کے قیام کی خبریں بھی آچکی ہیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادی چاہ رہے ہیں کہ طالبان افغانستان میں دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کی صورت میں شریعت اسلامیہ (سخت مذہبی قوانین) نافذ نہ کرنے کی یقین دہانی کرا دیں جس کیلئے مذکورہ رپورٹ کے مطابق طالبان قیادت تیار نہیں ہے اور افغانستان میں دوبارہ شرعی قوانین نافذ نہ کرنے کی یقین دہانی حاصل نہ ہونے پر امریکی انٹیلی جنس امریکی فوجوں کی (اس کے بقول) اب تک حاصل ہونے والی کامیابیوں کو مشکوک قرار دے رہی ہے۔

افغانستان کے طالبان، ملا محمد عمر حفظہ اللہ تعالیٰ کی قیادت میں افغانستان کی آزادی و خود مختاری اور امارت اسلامی افغانستان میں نظام شریعت اسلامیہ کے مکمل نفاذ کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں جو بحمد اللہ تعالیٰ اپنی منزل کے قریب پہنچتی نظر آرہی ہے۔ یہ طالبان قیادت کے حوصلہ اور تدبر اور عزیمت و استقامت کے ساتھ ساتھ افغان عوام کی حریت پسندی اور اسلامیت کی آئینہ دار بھی ہے۔ ہم افغان طالبان، ان کی قیادت اور ان کے تمام ہمنواؤں کو اس عزیمت و استقامت پر سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد اپنی منزل سے ہمکنار کریں، آمین یا رب العالمین۔

قرآن کریم کی حرمت کے تقاضے

روزنامہ اسلام، لاہور---۹ مارچ ۲۰۱۲ء

آج (۷ مارچ) کا روزنامہ اسلام میرے سامنے ہے اور قرآن کریم کے حوالے سے دو اہم خبریں توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا رہی ہیں۔

ایک خبر یہ ہے کہ سینٹ آف پاکستان نے افغانستان میں قرآن کریم کی توہین کے مرتکب امریکی فوجیوں کو سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ قائدین ایوان نیر حسین بخاری کی پیش کردہ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ایوان بالا اس واقعہ کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے، یہ انتہائی مکروہ فعل تھا جو کہ نیٹو افواج کے سپاہیوں نے کیا ہے، اس واقعہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، امریکہ اور نیٹو ممالک اس واقعہ کی تحقیقات کرائیں اور اس میں ملوث فوجیوں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

افغانستان میں نیٹو فوجیوں کی طرف سے قرآن کریم کی توہین کے سانحہ کے بعد افغانستان میں احتجاج و اضطراب کی جو لہر چل رہی ہے وہ اس بات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ افغانوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت ابھی نہ صرف باقی ہے بلکہ جبر، لالچ اور پروپیگنڈا کے تمام تر ہتھیار استعمال کرنے کے باوجود اس کے درجۂ حرارت میں کوئی کمی نہیں کی جا سکی۔ گذشتہ دنوں ایک امریکی تھنک ٹینک نے اس صورتحال کو انتہائی تشویشناک قرار دیا تھا کہ افغانستان میں طالبان کی اقتدار میں واپسی کے امکانات دوبارہ دکھائی دینے لگے ہیں مگر تمام تر کوششوں کے بعد بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا کہ وہ دوبارہ حکومت میں آ کر سخت قوانین (شریعت اسلامیہ) نافذ نہیں کریں گے اور اس صورتحال کو افغانستان میں اتحادی فوجیوں کی اپنے اہداف کے حوالے سے ناکامی پر محمول کیا جا رہا ہے۔

ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا کہ اتحادی فوجوں کی لشکرکشی اور جبر و تشدد افغانوں کے دینی جذبہ اور قومی غیرت میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکے گا مگر اب دنیا نے بھی ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ افغان قوم آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ برطانوی فوجوں کی یلغار کے وقت تھی اور جہاں وہ روسی استعمار کی لشکرکشی کے وقت کھڑی تھی۔ اب تیسرے راؤنڈ یعنی امریکی استعمار اور اس کے اتحادیوں کی دس سالہ یلغار کے اختتامی مراحل میں بھی افغان قوم کے پائے استقلال میں کوئی لغزش دکھائی نہیں دے رہی اور اس استقامت و عزیمت پر افغان قوم کو سلام عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

جہاں تک سینٹ آف پاکستان کی مذمتی قرارداد کا تعلق ہے، یہ خوش آئند ہے مگر کافی نہیں ہے اس لیے کہ اصل مسئلہ مذمت کا نہیں بلکہ عالمی سطح پر حرمت قرآن کریم، حرمت نبی اکرمؐ اور حرمت انبیاء کرامؑ کے مسئلہ کو اٹھانے کا ہے۔ اور عالمی اداروں کو اس بات کیلئے آمادہ کرنے کا ہے کہ وہ وحی الٰہی، آسمانی کتابوں اور انبیاء کرامؑ کے احترام کو مذاہب کے پیروکاروں کا حق تسلیم کریں اور اس کیلئے عالمی سطح پر قانون سازی کریں۔ مسلم حکومتوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے اور جب تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی طرف عملی پیشرفت نہیں کریں گے اس وقت تک اس قسم کے افسوسناک حادثات پیش آتے رہیں گے جبکہ اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اس مہم میں پیش پیش ہونا

چاہیے۔

دوسری خبر بھی قرآن کریم کے حوالے سے ہے اور وہ یہ کہ پنجاب اسمبلی نے قرآن کریم کو نصاب تعلیم میں باضابطہ طور پر شامل کرنے کی سفارش کی ہے اور یہ سفارش ایک قرارداد کی متفقہ منظوری کی صورت میں کی گئی ہے جو فنکشنل لیگ کی رکن اسمبلی محترمہ عاصمہ ممدوٹ نے پیش کی اور کسی اختلاف کے بغیر ایوان نے اسے منظور کر لیا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ:

"قرآنی تعلیمات کے فروغ اور موجودہ نسل کی قرآن کریم سے آشنائی کیلئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو بطور نصابی کتاب تعلیمی نصاب کا حصہ بنا کر اسے باقاعدہ ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے۔ نیز تدریس قرآن و حدیث کیلئے جامع پروگرام تشکیل دیا جائے اور اس کیلئے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔"

قرآن و سنت کی تعلیم و تدریس اور اپنے شہریوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے ریاستی ذمہ داریوں اور حکومتی فرائض میں شامل ہے اور ایسا قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس سے مسلسل گریز کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ریاستی نظام تعلیم میں قرآن و حدیث کی تعلیمات جزوی طور پر تو کچھ نہ کچھ شامل ہوتی آ رہی ہیں لیکن حکومتوں کی پالیسیوں کے تحت ان میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے، اور یہ المیہ ہمارے ساتھ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو ریاستی ذمہ داریوں میں شامل سمجھنے کی بجائے حکومتی پالیسیوں کے تابع رکھا گیا ہے اور حکومتوں کے رجحانات کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا دائرہ بھی گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔

مسلم شریف (کے باب) کتاب المساجد کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آخری عمر میں ایک خطبہ جمعہ کے دوران ارشاد فرمایا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مرغ نے ان کے سر پر تین ٹھونگے لگائے ہیں جس سے وہ یہ سمجھے ہیں کہ ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پھر اس حوالے سے انہوں نے کچھ خصوصی ہدایات ارشاد فرمائیں اور ان میں "امراء مصار" یعنی مختلف علاقوں کے مسلم حکام کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان علاقائی حکام کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ (۱) شہریوں کو عدل و انصاف فراہم کریں (۲) قرآن و سنت کی تعلیم دیں (۳) اور قومی خزانے سے ان کے حصہ کی صحیح تقسیم کار کا اہتمام کریں۔ یعنی حضرت عمرؓ نے قرآن و سنت کی تعلیم کو مسلم حکمرانوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں محترمہ عاصمہ ممدوٹ کی پیش کردہ یہ قرارداد حکومت پاکستان کو اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی کوشش ہے جس کی متفقہ منظوری پر پنجاب اسمبلی کے تمام ارکان مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور خاص طور پر قرارداد کے دو جملے بہت اہم ہیں جن کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کو باقاعدہ نصابی کتاب کے طور پر ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کیلئے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل وفاقی محتسب اعلیٰ نے ایک حکم جاری کیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اسکولوں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مڈل تک طلبہ اور طالبات کو ناظرہ قرآن کریم پڑھایا جائے۔ لیکن اس حکم پر یہ کہہ کر عملدرآمد سے گریز کیا گیا تھا کہ اس

کیلئے اسکولوں کے پاس وسائل نہیں ہیں اور تعلیم کیلئے سرکاری طور پر مختص کیے جانے والے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے ایک ذمہ دار افسر سے اس مسئلہ پر ہماری بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ملک بھر کے تمام مڈل اسکولوں میں ایک ایک قاری بھی تعینات کیا جائے تو ہزاروں قاریوں کی ضرورت ہوگی اور ان کی تنخواہیں اور مراعات بھی اسی حساب سے درکار ہوں گی جبکہ تعلیمی بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ اس کیلئے دینی مدارس کا شکریہ ادا کیجئے کہ وہ کسی قسم کے سرکاری بجٹ کے بغیر باہمی تعاون کی بنیاد پر ملک بھر کی لاکھوں مساجد کو نہ صرف حافظ و قاری بلکہ عربی درس نظامی کے مدرس و معلم اور مفتی و خطیب بھی فراہم کر رہے ہیں اور اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک میں بھی وسیع پیمانے پر اپنی اس پیداوار کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔

بہرحال ہم پنجاب اسمبلی کی اس متفقہ قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس کیلئے صرف قرارداد اور سفارش کافی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ بل لانے اور اسے اسی طرح متفقہ طور پر پاس کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ارکان اسمبلی کی اس اچھی خواہش کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور نظریۂ عدمِ تشدد

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳۱ مارچ ۲۰۱۲ء

مولانا فضل الرحمان پشاور میں بھرپور "اسلام زندہ باد کانفرنس" کے انعقاد کے بعد اب ۳۱ مارچ کو کنونشن سنٹر اسلام آباد میں شیخ الہند سیمینار کے عنوان سے مورچہ زن ہو رہے ہیں جبکہ مولانا سمیع الحق "دفاع پاکستان کونسل" کے محاذ کو مسلسل گرم رکھے ہوئے ہیں اور گذشتہ روز پارلیمنٹ کے سامنے دفاعِ پاکستان کونسل نے نیٹو سپلائی کی ممکنہ بحالی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر کے ارکان پارلیمنٹ کو عوامی جذبات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

گذشتہ دنوں لاہور میں علمائے کرام کی ایک محفل میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ دینی جماعتوں خاص طور پر مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق کی ان عوامی سرگرمیوں سے مغرب کو ایک ایسا پیغام بروقت مل رہا ہے جس کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ پاکستان کے عوام افغانستان اور پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں مغربی قوتوں کے تمام تر عسکری دباؤ کے باوجود اسلام اور پاکستان کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ پر قائم ہیں اور ملک کے اندر برسر اقتدار قوتوں کی منافقت کی پرواہ کیے بغیر وہ اسلام اور پاکستان کے حوالے سے اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں اس خطہ میں مغرب کی عسکری یلغار سے پہلے تھے اور اس بات نے مغرب کے دانشوروں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی یاد میں ملک کے مختلف علاقوں میں اجتماعات کا انعقاد فکری بیداری کی علامت ہے اور جنوبی ایشیا میں شیخ الہند نے جس فکر اور شعور کی آبیاری کی تھی اس کی طرف دیوبند کے فرزندوں کا رجوع اطمینان دلا رہا ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ اور معروضی سیاست کے تقاضوں کی دھند شاید چھٹنے لگی ہے اور نئی نسل کو دیوبند کے اصل فکر اور مشن سے روشناس کرانے کا ذوق دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا ہے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہند

کی خدمات و افکار کے حوالے سے ایک تاریخی سوال کا جائزہ لینا مناسب سمجھ رہا ہوں کہ کیا مالٹا کی اسارت سے واپسی پر حضرت شیخ الہند نے آزادی کی جنگ سے دستبرداری اختیار کر لی تھی؟ بہت سے دوست جب یہ دیکھتے ہیں کہ چار سال قبل جب حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے حجاز مقدس کی طرف سفر کیا تھا تو وہ برطانوی سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے مطابق ان "جنودِ ربانیہ" کے کمانڈر انچیف تھے جو پورے برصغیر میں انگریزی اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت کیلئے منظم کیے گئے تھے، وہ اس مسلح بغاوت کے منصوبے میں عالمی قوتوں کا تعاون حاصل کرنے کے مشن میں خلافت عثمانیہ کے عہدیداروں سے بات چیت کیلئے حجاز مقدس گئے تھے اور انہوں نے ترک حکمرانوں سے بات چیت بھی کر لی تھی لیکن شریف مکہ کی طرف سے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت نے ساری صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، مولانا عزیر گل اور دیگر رفقاء کے ہمراہ مالٹا کے جزیرہ میں ساڑھے تین سال کے لگ بھگ عرصہ نظر بندی کی حالت میں گزارا۔ لیکن جب وہاں سے واپس ہندوستان واپس آئے تو عدم تشدد کے علمبردار کے طور پر متعارف ہوئے اور انہوں نے آزادئ وطن کیلئے کام کرنے والوں کو پرامن اور عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ان کی سیاسی جدوجہد کے جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کی قیادت میں شیخ الہند کے کم و بیش سب ہی شاگردوں نے آزادی کی تحریک کو عدم تشدد کے دائرے میں آگے بڑھایا بلکہ تشدد کو اپنی تحریک کیلئے سب سے زیادہ نقصان دہ قرار دیا۔

یہ صورتحال دیکھ کر ایک عام اور سطحی ذہن کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا یہ تبدیلی جنگِ آزادی سے دستبرداری تھی اور کیا حضرت شیخ الہندؒ نے عسکری جدوجہد کو ترک کر کے برطانوی اقتدار کو عملاً قبول کر لیا تھا؟ ہمارے اس خطہ کو آج جس صورتحال کا سامنا ہے اس کے پیش نظر اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا اور اس کا جواب تلاش کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میر انقطۂ نظر یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی جانب سے عسکری طریق جدوجہد کو ترک کرنا جنگ آزادی سے دستبرداری نہیں تھی بلکہ صرف مورچے اور طریق کار کی تبدیلی تھی اور انقلاب کیلئے وقت کے سب سے مؤثر ہتھیار کو اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ عدم تشدد کا پرامن راستہ اختیار کرنے کے بعد برطانوی حکمرانوں کے ساتھ عدم تعاون، ترک موالات اور سول نافرمانی کی جو تحریکیں حضرت شیخ الہندؒ کے حلقہ نے اس خطہ میں منظم کیں وہ اس بات کی گواہ ہیں کہ فرنگی اقتدار کو قبول نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کے تسلط کے سامنے سرنڈر ہونے کی بات کی گئی بلکہ فرنگی تسلط اور اقتدار سے گلو خلاصی کیلئے عدم تعاون، عدم تشدد اور رائے عامہ کو منظم و بیدار کر کے اسٹریٹ پاور کو حکمرانوں کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے انہیں پسپائی پر مجبور کیا گیا۔

یہ بات ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب فرانس کے بعد کبھی بھی بالادست قوت کو صرف عسکری جدوجہد کے ذریعے میدان سے ہٹانے کا طریق کار اس سے پہلے کے دور کی طرح مؤثر نہیں رہا، حتیٰ کہ آزادی کی جنگوں میں بھی عسکری مزاحمت کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کی قوت اور اسٹریٹ پاور ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر سامنے آئی ہے بلکہ عسکری مزاحمت کے ذریعے کی جانے والی تحریکات نے بالآخر نتائج وصول کرنے کیلئے سیاسی مذاکرات ہی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس طرح ویت نام میں امریکی تسلط کے خلاف عسکری مزاحمت کرنے والے حریت پسندوں ویت

کانگ نے ایک حد تک عسکری جدوجہد کے بعد مقاصد کے حصول میں کامیابی تک سیاسی مذاکرات اور رائے عامہ کی قوت کے ذریعے ہی رسائی پائی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے عدم تشدد کو اپنا ہتھیار قرار دے کر سیاسی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس راستے سے نہ صرف برصغیر پاک و ہند نے برطانوی استعمار کے تسلط سے نجات حاصل کی بلکہ میں عصر حاضر کی دو اور تحریکوں کا حوالہ بھی دینا چاہوں گا جنہوں نے عدم تشدد اور اسٹریٹ پاور کی پرامن جدوجہد کے ذریعے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ امریکہ میں سیاہ فام آبادی صدیوں سے گوروں کے مظالم کا شکار چلی آرہی تھی حتیٰ کہ اب سے صرف نصف صدی قبل تک سیاہ فاموں کو گوروں کے برابر سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ ووٹ کے حق سے محروم تھے، ہوٹلوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور پبلک بسوں میں قانونی طور پر انہیں مخصوص جگہوں پر بیٹھنا پڑتا تھا اور وہ گوروں کے ساتھ بیٹھنے کے مجاز نہیں تھے۔ اس صورتحال کے خلاف بغاوت کا پرچم ایک مسیحی مذہبی رہنما مارٹن لوتھر کنگ نے بلند کیا اور تحریک کا نقطۂ آغاز بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ثابت ہوا کہ ایک سیاہ فام لڑکی بس پر سوار ہوئی اور سیاہ فاموں کی سیٹوں میں جگہ نہ پاکر سفید فاموں کیلئے مخصوص حصے میں ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئی، اسے وہاں سے ہٹنے کیلئے کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا، اس پر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا جس کے خلاف احتجاج کی تحریک مارٹن لوتھر کنگ کی قیادت میں اس قدر آگے بڑھی کہ سیاہ فاموں نے واشنگٹن ڈی سی میں ملین مارچ کا اہتمام کر کے ۱۹۶۴ء کے دوران امریکی صدر جان ایف کینیڈی کو مجبور کر دیا کہ وہ مارٹن لوتھر کنگ کے ساتھ مذاکرات کریں اور سیاہ فاموں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دینے کا اعلان کریں۔

دوسرا واقعہ بھی ہمارے سامنے کا ہے کہ ایران میں بادشاہت کے خلاف مذہبی طبقے نے بغاوت کی اور عسکری مزاحمت کی بجائے عدم تشدد اور عدم تعاون کے پرامن ہتھیاروں کے ساتھ کم و بیش سترہ سال جدوجہد کر کے ایرانی بادشاہت کو اسٹریٹ پاور کے ذریعے بوریا بستر گول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایرانی انقلاب کی مذہبی حیثیت سے قطع نظر طریق انقلاب کے حوالے سے ایرانی علماء کی جدوجہد کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے تعلیمی اداروں پر توجہ دی، اس کے بعد رائے عامہ کو اپنے حق میں کر کے ہر شہر میں لاکھوں عوام کو بادشاہت کے جبر و ستم کے سامنے لاکھڑا کر دیا اور انقلاب بپا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

یہ سبق دراصل حضرت شیخ الہندؒ کا تھا کہ انہوں نے مالٹا سے واپسی پر علی گڑھ یونیورسٹی کا رخ کیا اور وہاں کے تعلیمی و نظریاتی ماحول کو تبدیل کرنے کی محنت کی جس کے نتیجے میں تحریک آزادی کو مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلوی، اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ جیسے جید علمائے کرام کے ساتھ حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور چودھری افضل حق مرحوم جیسے بیدار مغز راہنما میسر آئے اور دونوں طبقوں کی مشترکہ جدوجہد نے آزادی کی راہ ہموار کی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے دور میں عسکری مزاحمت کا راستہ بھی اختیار کیا جس کی جھلک ہم افغانستان کے جہاد آزادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں کہ افغان مجاہدین نے برطانوی و روسی استعمار کو شکست دینے کے بعد امریکی استعمار کو بھی واپسی کا راستہ تلاش کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے ثمرات ہیں لیکن یہ بات بھی

تحریک شیخ الہندؒ کے قائدین کے پیش نظر تھی کہ جنوبی ایشیا کے دیگر خطوں کے عوام سے وہ توقع رکھنا عبث ہے جو افغانستان میں ہر دور میں پوری ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں آزادی اور نفاذ شریعت کیلئے عدم تشدد کی پرامن تحریک کا راستہ اختیار کیا اور اسی راستہ پر یہ جدوجہد اب تک آگے بڑھ رہی ہے۔ شیخ الہندؒ کی پرامن جدوجہد کا مطلب حالات کو قبول کر لینا اور اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جانا نہیں بلکہ مزاحمت کے جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے تبدیلی کی پرامن سیاسی محنت کرنا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس مزاحمت کیلئے عسکریت کا مظاہرہ ضروری نہیں بلکہ اس معاملے میں عدم تشدد اور رائے عامہ کی قوت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

امن ضروری ہے اور امن کیلئے انصاف ضروری ہے

اپریل ۲۰۱۲ء کے آغاز میں جمعیت علماء اسلام (س) لاہور کے زیر اہتمام ایک سیمینار سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کانفرنس کا عنوان ''سیرۃ النبی اور امنِ عالم'' ہے جس کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کیلئے کھڑا ہوا ہوں لیکن اس سے پہلے آج کی کانفرنس کے مہمان خصوصی مولانا سمیع الحق کے بارے میں کچھ عرض کرنا آج کے حالات کے تناظر میں ضروری سمجھتا ہوں۔ نیٹو سپلائی کی بحالی کو روکنے کیلئے ''دفاع پاکستان کونسل'' کے عنوان سے مولانا سمیع الحق اور ان کے رفقاء جو جدوجہد کر رہے ہیں اور اس بڑھاپے میں مولانا سمیع الحق جس جوش و جذبے کے ساتھ قافلے کی قیادت میں مصروف ہیں وہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس پر مولانا سمیع الحق کی جرأت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق ہمیشہ جہاد افغانستان کے پشتیبان رہے ہیں اور آج بھی مولانا سمیع الحق اس روایت کو پورے حوصلہ کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہیں، اس تناظر میں دو باتیں عرض کر کے اپنے موضوع کی طرف بڑھوں گا۔

مولانا سمیع الحق کو یاد ہوگا کہ جب انہوں نے افغانستان پر امریکی اتحاد کی یلغار سے قبل قوم کو بیدار کرنے کیلئے اکوڑہ خٹک اور اسلام آباد میں مختلف دینی و سیاسی جماعتوں کے مشترکہ اجتماعات کا اہتمام کیا تھا اور امریکی افواج کی آمد آمد کا غلغلہ ہر طرف بپا تھا تو اسلام آباد میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں ایک قبائلی لیڈر نے بھولے بھالے لہجے میں یہ بات کہی تھی کہ ''امریکہ اس علاقہ میں آئے گا تو سہی مگر جائے گا کدھر سے؟'' اس قبائلی لیڈر کی اس بات پر کانفرنس میں قہقہے بلند ہوئے تھے اور بات بہت اچھی لگنے کے باوجود میری سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آ رہا تھا۔ مگر ابھی چند روز قبل ایک امریکی لیڈر کا یہ بیان پڑھ کر اس قبائلی لیڈر کی بات میری سمجھ میں آئی کہ اگر نیٹو سپلائی اسی طرح بند رہی تو امریکی افواج کی واپسی کیسے ہوگی؟

دوسری بات جس کا اس تناظر میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جب امریکی اتحاد کی فوجوں نے افغانستان پر یلغار کی اور

قندھار میں طالبان کی اسلامی حکومت کو جبر و قوت کے ساتھ ختم کر دیا گیا تو ہمارے ایک انتہائی محترم بزرگ نے، جو جنوبی ایشیا کی سطح کی علمی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، ایک مضمون میں بڑی حسرت اور یاس کے ساتھ یہ لکھا کہ ''سارا کھیل ختم ہو گیا ہے''۔ میں نے اس پر ان محترم بزرگ کی خدمت میں زبانی بھی عرض کیا اور اپنے ایک تفصیلی مضمون میں بھی لکھا کہ ''حضرت! کھیل ختم نہیں ہوا بلکہ میرے خیال میں تو اصل کھیل اب شروع ہوا ہے''۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ صرف سات آٹھ سال انتظار کریں اور اس کے بعد فیصلہ کر لیں کہ کھیل ختم ہوا ہے یا جاری ہے۔ میرے خیال میں اتحادی افواج سے نمٹنے کیلئے افغان طالبان کو صرف سات آٹھ سال کا عرصہ درکار تھا جس کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا تھا مگر اندازے سے بات کچھ لمبی ہو گئی ہے اور دس گیارہ سال کا عرصہ اس نتیجے تک پہنچنے کیلئے گزر گیا ہے۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ جلد بازی کر کے بہت سے غیر ضروری محاذ طالبان کے ارد گرد کھول دیے گئے جس کی وجہ سے افغان طالبان کا سفر کچھ لمبا ہو گیا ہے ورنہ اگر نئے نئے محاذ کھولنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جاتا تو یہ حالات جو آج نظر آ رہے ہیں تین چار سال پہلے ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہوتے۔ بہر حال دیر آید درست آید کہ ہونا تو بالآخر یہی تھا کہ افراد، گروہوں اور طبقات کو تو دبایا جا سکتا ہے مگر قوموں کو شکست نہیں دی جا سکتی اور دنیا نے ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ افغان قوم کو شکست نہیں دی جا سکی۔

اس کے بعد میں کانفرنس کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ آج کے عالمی تناظر میں امن عالم کیلئے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ہمیں کیا راہنمائی ملتی ہے اور آج کی دنیا کو امن سے روشناس کرنے کیلئے ہم آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں؟ آج دنیا میں ہر طرف یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ترقی کیلئے امن ضروری ہے، خوشحالی کیلئے امن ضروری ہے، ملکی استحکام کیلئے امن ضروری ہے، قومی وقار کیلئے امن ضروری ہے اور امن کے بغیر ان میں سے کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری باتیں درست ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ امن کے بغیر نہ ترقی ممکن ہے، نہ استحکام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی قومی وقار قائم ہو سکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب کاموں کیلئے تو امن ضروری ہے مگر امن کیلئے کیا چیز ضروری ہے؟ میں اصحاب فکر و دانش کو دعوت دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس بات پر سنجیدگی سے غور کریں کہ امن کیسے قائم ہو سکتا ہے اور امن کیلئے کیا ضروری ہے؟ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ امن کیلئے انصاف ضروری ہے اس لیے کہ انصاف کے بغیر کسی بھی سطح پر امن کا قیام نہیں ہو سکتا، انصاف ہو گا تو امن ہو گا اور اگر انصاف نہیں ہو گا تو امن کسی قیمت پر قائم نہیں ہو سکے گا۔ کسی شہر کی بات ہو یا ملک و قوم کا معاملہ ہو، اقوام عالم کے باہمی روابط ہوں یا امن عالم کی بات ہو، ہر دائرہ میں اور ہر سطح پر اصول یہی ہے کہ انصاف ہو گا تو امن ہو گا ورنہ امن کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔

انصاف کے تقاضوں میں سے ایک بڑا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قانون سب کیلئے یکساں ہو اور قانون کے نفاذ میں کسی فرد یا طبقے کو تحفظ اور استثنا حاصل نہ ہو اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف بطور خاص توجہ دلائی ہے۔ فاطمہ مخزومیہ کا واقعہ مشہور ہے کہ بنو مخزوم کی خاتون فاطمہ نے چوری کی، جرم ثابت ہو گیا اور آنحضرتؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرما دیا۔ اس پر خاندان والوں کو تشویش ہوئی کہ اس سے پورے خاندان کی بے عزتی ہو گی، فاطمہ کا ہاتھ کٹا تو بنو مخزوم جیسے خاندان کی ناک کٹ جائے گی، اس لیے جناب نبی کریمؐ سے سفارش کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سفارش کیلئے

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا انتخاب کیا گیا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کان حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نبی اکرمؐ کے چہیتے نوجوان تھے، منہ بولے بیٹے کے بیٹے تھے، حضورؐ کی گود میں پرورش پائی تھی اور آپؐ کی خصوصی شفقتیں سمیٹنے والوں میں سے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں سفارش کی تو آپؐ نے سخت غصہ اور ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ڈانٹ دیا کہ اتشفع فی حد من حدود اللہ؟ کیا اللہ تعالیٰ کی حدود کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟ اس موقع پر آنحضرتؐ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسامہ بن زیدؓ کو ڈانٹنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسجد نبویؐ میں اس مسئلہ پر عمومی خطاب بھی فرمایا اور اس خطاب میں لوگوں کو خبردار کیا کہ تم سے پہلے قومیں اس وجہ سے برباد ہوتی رہی ہیں کہ کوئی عام اور غریب شخص جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی لیکن اگر کوئی وی آئی پی اور بڑا شخص جرم کا مرتکب ہوتا تو وہ سزا سے بچ جایا کرتا تھا۔ قانون کے نفاذ میں یہ فرق اور تفاوت قوموں کی تباہی کے اسباب میں سے ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے اپنی امت کو اس سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی کسی قوم اور معاشرے میں قانون کے یکساں نفاذ کا ماحول نہیں رہے گا وہاں فساد پھیلے گا اور قوم تباہی سے دوچار ہو جائے گی۔

خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، خود ہی جج

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۷ اپریل ۲۰۱۲ء

پروفیسر حافظ محمد سعید اور مولانا عبد الرحمان مکی کے سروں کی قیمت مقرر کر کے امریکہ اور بھارت نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا ہوگا کہ انہوں نے مبینہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں کوئی پیشرفت کی ہے اور اس سے انہیں اس جنگ میں کوئی فائدہ مل سکتا ہے۔ لیکن اس کے مضمرات اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت نہ اس کا فیصلہ کرنے والے امریکی دانشوروں نے گوارا کی ہے اور نہ ہی اس کا خیر مقدم کرنے والے بھارتی دانشوروں کو اس کی توفیق ہوئی ہے۔ ورنہ عمومی تاثر یہ ہے کہ اسے امریکی حکومت کی طرف سے بوکھلاہٹ کے اظہار کے سوا کوئی اور عنوان دینا مشکل ہے، اس لیے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید اور مولانا عبد الرحمان مکی نہ تو ہتھیار بکف لڑاکے ہیں کہ ان کی مار دھاڑ کی رپورٹیں روز بروز سامنے آ رہی ہوں اور نہ ہی روپوش ہو جانے والے لوگ ہیں کہ وہ لوگوں کو نظر نہ آتے ہوں اور ان کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہو۔ وہ کھلے بندوں پبلک جلسوں سے خطاب کرتے ہیں، پریس سے باتیں کرتے ہیں، سیاسی پارٹیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں اور جمعہ کی نمازوں کی امامت کرتے ہیں۔ گذشتہ جمعہ کو حافظ محمد سعید نے گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ پر نہر کے پاس جماعت الدعوۃ کے نئے مرکز کا افتتاح کیا جسے ''مرکز اقصیٰ'' کا نام دیا گیا ہے اور جمعہ کا خطبہ دینے کے علاوہ ہزاروں لوگوں کی امامت کی۔ پروفیسر عبد الرحمان مکی بھی اسی طرح ایک عرصہ سے عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے آ رہے ہیں اور اب بھی مختلف جلسوں میں ان کے خطابات کا سلسلہ جاری ہے۔

اس صورتحال میں حافظ محمد سعید اور عبد الرحمان مکی کے سروں کی قیمت مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ ان دونوں تک نارمل ذرائع کے ساتھ رسائی میں ناکام ہوگیا ہے اور وہ از خود ہی یکطرفہ طور پر مجرم قرار دے کر ان کی سزا مقرر کر رہا ہے جسے نافذ کرنے کیلئے وہ لاکھوں ڈالروں کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ یہ مضحکہ خیز صورتحال ایک عام شخص کے نزدیک امریکہ کی طرف سے اپنی ناکامی کے کھلے اعتراف کے مترادف ہے جسے بوکھلاہٹ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ جب سے امریکہ نے ”خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی جج“ بن کر سارے فیصلے خود ہی صادر کرنے کی روش اپنا رکھی ہے اس کی طرف سے اس قسم کے فیصلے مسلسل سامنے آرہے ہیں۔

آج سے دس سال قبل جب امریکی اتحاد نے افغانستان پر لشکرکشی کی تھی تو میں ان دنوں برطانیہ میں تھا۔ ایک ٹی وی چینل نے اس سلسلہ میں ہونے والی ایک گفتگو میں مجھے بھی بلوایا اور سوال کیا کہ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ میں پہلے اس بات کی وضاحت چاہوں گا کہ امریکہ اس کیس میں مدعی ہے یا جج؟ جب امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت بین الاقوامی سطح پر ثالثی کیلئے تیار ہے اور طالبان کی طرف سے پیشکش موجود ہے کہ وہ فریقین کیلئے قابل قبول بین الاقوامی ثالثی فورم کے سامنے اپنا مقدمہ لے جانے اور الزامات کا جواب دینے کیلئے تیار ہیں تو پھر یکطرفہ طور پر ان پر فیصلہ مسلط کرنے میں اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے اس وقت اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا اور اس ناکام لشکرکشی کے بعد بھی اس سوال کا جواب کسی جانب سے سامنے نہیں آرہا۔

حافظ محمد سعید کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ ان کے خلاف امریکی اور بھارتی الزامات کی ایک چارج شیٹ ہے جس کا کسی عدالت کے روبرو سامنا کرنے سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا، بلکہ پاکستان کی عدالتوں میں ان الزامات کا سامنا کر چکے ہیں جہاں ان الزامات کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔ مگر امریکہ اور بھارت ان عدالتی فیصلوں کو قبول کرنے سے مسلسل گریزاں ہیں۔ یہ عجیب سی دھاندلی ہے کہ مظلوم ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے کیس میں امریکہ کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ ہماری عدالت کا فیصلہ ہے اور ہم عدالتی فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن حافظ محمد سعید کے بارے میں پاکستانی عدالتوں کے فیصلے ان کے نزدیک ”عدالتی فیصلے“ نہیں ہیں اور وہ انہیں تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اگر ڈاکٹر عافیہ کے بارے میں ایک امریکی عدالت کے فیصلے سے ہٹ کر امریکی حکومت خود کو کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں سمجھتی تو حکومتِ پاکستان پر یہ دباؤ کس لیے ہے کہ وہ پاکستانی عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے امریکی احکامات کی تعمیل کرے، اور وہ جس شخصیت یا جماعت کو دہشت گرد قرار دینے کا اعلان کرے اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر امریکہ کے سامنے پھینک دیا جائے۔

پھر یہ دہشت گرد قرار دینے کی بات بھی خوب ہے کہ ابھی تک عالمی سطح پر دہشت گردی کی کوئی متفقہ تعریف طے نہیں کی جا سکی، حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ نے بھی مطالبے کے باوجود اس سوال کو ابھی تک گول کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والوں کو اس بات کا بھی کامل اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں جسے چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔ اسرائیل فلسطینیوں کے خلاف جو اس کی مرضی ہو کرتا پھرے، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر محاصرے میں گھرے ہوئے لوگوں کی امداد کیلئے آنے والے جہازوں کو روک لے، ایران

کے ایٹمی مراکز پر حملے کی کھلم کھلا دھمکیاں دیتا پھرے اور وحشت و درندگی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے، اس کے باوجود وہ دہشت گرد نہیں ہے، لیکن جن مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو ان کے ملکوں کی مجاز عدالتیں اس قسم کے الزام سے بری الذمہ قرار دے چکی ہوں انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کے سروں کی قیمتیں مقرر کر دی جائیں۔ اگر اس کا نام انصاف ہے اور اس کے ذریعے دنیا میں امن قائم کرنا مقصود ہے تو یہ امن کبھی قائم نہیں ہو گا۔

دنیا میں ہر سطح پر امن کی ضرورت ہے اور یہ ہر قوم اور ملک کی ضرورت ہے، لیکن امن کیلئے انصاف ضروری ہے۔ انصاف ہو گا تو امن ہو گا اور انصاف نہیں ہو گا تو امن محض ایک خواب ہی رہے گا۔ اور انصاف کا مطلب بالادست قوتوں کی اجارہ داری اور من مانی نہیں ہے بلکہ اس کے ہمیشہ سے چلے آنے والے کچھ مسلمہ اصول اور اس کے اپنے دائرے ہیں۔ امریکہ بہادر جب تک اپنی اجارہ داری اور من مانی کو ترک کر کے انصاف کے مسلمہ اصولوں کی طرف واپس نہیں آتا اس قسم کی کاروائیوں سے امن تو کیا بحال ہو گا، خود اس کے اپنے جائز مفادات بھی ہمیشہ خطرات کے بھنور میں چکر کاٹتے رہیں گے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۷ مئی ۲۰۱۲ء

حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کا شمار پاکستان ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا میں علوم دینیہ کی ترویج واشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ وفروغ کا ذریعہ بنیں۔ تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے مولانا عبدالحقؒ کی دینی، علمی، تدریسی اور فکری خدمات جنوبی ایشیا اور اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا میں دینی جدوجہد کی اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جہاد افغانستان کو دیکھا جائے تو اس کی پشت پر مولانا عبدالحقؒ کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے جو بظاہر ایک منحنی سا وجود رکھتے تھے، لیکن علم و فضل اور عزم وہمت کے اس کوہِ گراں کے ساتھ کمیونزم کے فلسفہ ونظام نے سر پٹخ پٹخ کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا اور آج کا مؤرخ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جہاد افغانستان کی علمی، فکری اور دینی اساس مولانا عبدالحقؒ کی شخصیت اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والا تعلیمی ادارہ دارالعلوم حقانیہ ہے جس کے اثرات افغانستان اور وسطی ایشیا کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔

جہاد افغانستان کی علمی وفکری آبیاری میں ہمارے بہت سے بزرگوں کا حصہ ہے، مگر میں تاریخ کے ایک طالب علم اور اس جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر تین شخصیات کو ان سب کا سرخیل سمجھتا ہوں۔ ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت مولانا عبدالحقؒ کا ہے اور ان کے بعد جہاد افغانستان کے علمی وفکری سرپرستوں میں میرے خیال میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا نام آتا ہے جنہوں نے نہ صرف پاکستان کے علماء وطلبہ کو جہاد افغانستان کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا اور افغان مجاہدین کی سیاسی و اخلاقی پشت پناہی کی بلکہ جہاد افغانستان کے خلاف مختلف اطراف سے اٹھائے جانے والے شکوک واعتراضات کا جواب دیا اور جہاد افغانستان کی ہر لحاظ سے پشتیبانی کی۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کی خدمات کو میں ایک اور حوالے سے بھی تاریخ کا اہم حصہ شمار کرتا ہوں، اور وہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی دستوری جدوجہد کا باب ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس شخصیت نے دستور سازی میں سب سے زیادہ سنجیدہ کردار ادا کیا ہے اور دستور سازی کے تمام مراحل میں پوری توجہ اور تیاری کے ساتھ محنت کی ہے، وہ حضرت مولانا عبد الحقؒ ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مرحلہ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ قائد حزب اختلاف تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا صدر الشہیدؒ، مولانا نعمت اللہؒ، مولانا عبد الحکیمؒ، مولانا شاہ احمدؒ نورانی، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور بہت سے دیگر بزرگوں نے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کیلئے محنت کی۔ مگر دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا مطالعہ کیا جائے اور دستور سازی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مولانا عبد الحقؒ کے جداگانہ اور امتیازی کردار کا تذکرہ بہرحال ضروری ہو جاتا ہے۔

مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۷ مئی ۲۰۱۲ء

مولانا سمیع الحق صاحب باہمت اور صاحبِ عزیمت بزرگ ہیں کہ اس بڑھاپے میں مختلف امراض و عوارض کے باوجود چومکھی جنگ لڑ رہے ہیں اور مختلف شعبوں میں اس انداز سے دینی و قومی خدمات میں مصروف ہیں کہ کسی شعبہ میں بھی انہیں صفِ اول میں جگہ نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ دارالعلوم حقانیہ کے اہتمام و تدریس کے ساتھ ساتھ امریکی ڈرون حملوں اور نیٹو سپلائی کی ممکنہ بحالی کے خلاف عوامی محاذ کی عملی قیادت کر رہے ہیں جس میں انہیں ملک کے طول و عرض میں مسلسل عوامی جلسوں اور دوروں کا سامنا ہے، جبکہ قلمی محاذ پر رائے عامہ کی راہ نمائی اور دینی جدوجہد کی تاریخ کو نئی نسل کیلئے محفوظ کرنے میں بھی وہ اسی درجہ میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ اور خود اپنے نام مشاہیر کے خطوط کو آٹھ ضخیم جلدوں میں جمع کر کے جو عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے، اسے دیکھ کر میں خود تحیّر و تعجب کے ساتھ خوشیوں کے سمندر کی گہرائی میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں۔ بحمد اللہ تعالیٰ میرا شمار بھی بے ہمت لوگوں میں نہیں ہوتا، مگر مولانا سمیع الحق کی ہمت کی بلندی پر نظر ڈالنے کیلئے بار بار ٹوپی سنبھالنا پڑ رہی ہے۔

گذشتہ روز میں نے جب اس کتاب پر بلکہ کتابوں کے اس مجموعہ پر نظر ڈالی تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ سارے کام کاج چھوڑ کر اسی کے سامنے دوزانو بیٹھ جانا چاہیے۔ تاریخ میرے مطالعے کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس میں سے اہل حق کی جدوجہد اور خدمات کی تاریخ کے دائرے میں کچھ نہ کچھ کارروائی میں بھی وقتاً فوقتاً ڈالتا رہتا ہوں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق اور ان کے فرزند دلبند مولانا سمیع الحق کے نام وقت کے مشاہیر کے خطوط جن میں سیاست دان، حکمران، علمائے کرام، مشائخ عظام، اربابِ فکر و دانش، مفکرین و مدبرین، وکلاء، صحافی اور دیگر طبقات کی سرکردہ شخصیات شامل ہیں، تاریخ کا ذوق رکھنے والے اسکالروں اور میرے جیسے طلبہ کیلئے اتنا قیمتی اثاثہ ہیں کہ اس کی قدر و قیمت کو الفاظ میں بیان

نہیں کیا جاسکتا۔

خدا جانے اس کے تفصیلی مطالعہ کا وقت کب ملتا ہے، جو بظاہر شوال المکرم کی تعطیلات سے پہلے بہت مشکل دکھائی دے رہا ہے، مگر اس کے سرسری تعارف کیلئے میں نے سردست اس کی پہلی جلد کا انتخاب کیا ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام ان کے معاصر مشاہیر کے خطوط پر مشتمل ہے اور دینی جدوجہد کے ایک پورے دور کا احاطہ کرتی ہے۔ ''مشاہیر'' کے عنوان سے آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی عمومی ترتیب یہ ہے کہ پہلی جلد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام خطوط کیلئے مخصوص ہے، جلد دوم سے جلد پنجم تک حروف تہجی کے لحاظ سے مشاہیر کے مولانا سمیع الحق کے نام خطوط کی چار جلدیں ہیں، جلد ششم افغانستان کے جہاد کے دوران کی اہم رپورٹوں اور جہادی راہ نماؤں کے خطوط اور سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے، جلد ہفتم میں بیرونی ملکوں کے مشاہیر کے خطوط شامل کیے گئے ہیں، جبکہ جلد ہشتم ضمیمہ جات، اضافات اور توضیحات کو سمیٹے ہوئے ہے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام مشاہیر کے خطوط کیلئے مخصوص پہلی جلد پونے سات سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان مشاہیر کی فہرست پر میں نے اس خیال سے نظر ڈالی کہ اس کالم میں تذکرہ کیلئے ان میں سے چند زیادہ اہم بزرگوں کے ناموں کا انتخاب کرسکوں، مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی کہ کوئی نام بھی ایسا نہیں ہے جسے اہمیت کے خانہ نمبر دو میں رکھا جاسکے، البتہ اس حوالے سے مولانا سمیع الحق کا بے حد شکر گزار ہوں کہ حضرت شیخ الحدیث کے نام راقم الحروف کے تین خطوط شامل کرکے ان کے اس نیاز مند و عقیدت مند کو بھی ''خریدارانِ یوسف'' کی اس فہرست میں شریک کرلیا ہے جو میرے لیے اعزاز وافتخار کی بات ہے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کا شمار پاکستان ہی نہیں، بلکہ جنوبی ایشیا کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا میں علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ و فروغ کا ذریعہ بنیں۔ تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے مولانا عبد الحقؒ کی دینی، علمی، تدریسی اور فکری خدمات جنوبی ایشیا اور اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا میں دینی جدوجہد کی اساس کی حیثیت رکھتی ہیں اور افغانستان کو دیکھا جائے تو اس کی پشت پر مولانا عبد الحقؒ کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے جو بظاہر ایک منحنی سا وجود رکھتے تھے، لیکن علم و فضل اور عزم و ہمت کے اس کوہِ گراں کے ساتھ کمیونزم کے فلسفہ و نظام نے سر پٹخ پٹخ کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا اور آج کا مؤرخ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جہاد افغانستان کی علمی، فکری اور دینی اساس مولانا عبد الحق کی شخصیت اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والا تعلیمی ادارہ دارالعلوم حقانیہ ہے جس کے اثرات افغانستان اور وسطی ایشیا کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔

''جہادِ افغانستان'' کی علمی و فکری آبیاری میں ہمارے بہت سے بزرگوں کا حصہ ہے، مگر میں تاریخ کے ایک طالب علم اور اس جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر تین شخصیات کو ان سب کا سرخیل سمجھتا ہوں، ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت مولانا عبد الحقؒ کا ہے اور ان کے بعد جہادِ افغانستان کے علمی و فکری سرپرستوں میں میرے خیال میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کا نام آتا ہے جنہوں نے نہ صرف پاکستان کے علماء و طلبہ کو جہادِ افغانستان کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا، افغان مجاہدین کی سیاسی و اخلاقی پشت پناہی کی، جہادِ افغانستان کے خلاف مختلف اطراف

سے اٹھائے جانے والے شکوک و اعتراضات کا جواب دیا اور جہادِ افغانستان کی ہر لحاظ سے پشتیبانی کی۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کی خدمات کو میں ایک اور حوالے سے بھی تاریخ کا اہم حصہ شمار کرتا ہوں، وہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی دستوری جدوجہد کا باب ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد جس شخصیت نے دستور سازی میں سب سے زیادہ سنجیدہ کردار ادا کیا ہے اور دستور سازی کے تمام مراحل میں پوری توجہ اور تیاری کے ساتھ محنت کی ہے، وہ حضرت مولانا عبد الحقؒ ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مرحلہ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ قائد حزب اختلاف تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا صدر الشہیدؒ، مولانا نعمت اللہؒ، مولانا عبد الحکیمؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور بہت سے دیگر بزرگوں نے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کیلئے محنت کی، مگر دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا مطالعہ کیا جائے اور دستور سازی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مولانا عبد الحقؒ کے جداگانہ اور امتیازی کردار کا تذکرہ بہرحال ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا عبد الحقؒ ہمارے ملی اور قومی محسنین میں سے ہیں اور ان کے نام ان کے معاصر مشاہیر کے یہ خطوط ان کی جدوجہد اور خدمات کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میں ان خطوط کی اشاعت پر مولانا سمیع الحق کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ دینی جدوجہد اور تاریخ کا ذوق رکھنے والے حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

علماء کرام کی شہادتوں کا سلسلہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۸ مئی ۲۰۱۲ء

گذشتہ دو روز سے مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی المناک شہادتؒ پر تعزیتی پروگراموں کا سلسلہ جاری ہے:

- جامعہ نصرۃ العلوم میں طلبہ کے اجتماع میں راقم الحروف نے مولانا شہیدؒ کی دینی و تعلیمی خدمات کا مختصر تذکرہ کیا، انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا، ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی ہوئی اور ان کیلئے دعائے مغفرت کی گئی۔
- ۱۵ مئی کو دار العلوم گجرات میں جمعیت علماء اہل السنۃ کے زیر اہتمام ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔
- دار العلوم جی ٹی روڈ گجرات کے فیکٹری ایریا میں پاک فین کے عقب میں اسی سال شروع ہوا ہے اور مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے ہی شوال المکرم میں اس کا افتتاح کیا تھا۔ پروفیسر مولانا محمد اشفاق اور ان کے فرزند مولانا صہیب اشفاق اس کے منتظم ہیں اور دونوں باپ بیٹا جامعہ نصرۃ العلوم کے فضلاء میں سے ہیں۔ اس تعزیتی نشست میں مولانا شیخوپوری کے حالات زندگی اور خدمات کے تذکرہ کی سعادت حاصل ہوئی اور مختلف علماء کرام نے ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا۔ ہمارے عزیز شاگرد مولانا حافظ محمد عمر عثمانی اس نشست کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔

• ظہر کے بعد مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعیت اہل السنۃ ضلع گوجرانوالہ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا جس میں مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ، مولانا سید محسن شاہؒ، مولانا نصیب خانؒ اور دیگر شہداء کیلئے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے المناک قتل کی شدید مذمت کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ علماء کرام کے قتل عام کے سلسلہ کو روکنے کیلئے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں اور قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ اجلاس جمعیت اہل السنۃ کا انتخابی اجلاس تھا جس کی صدارت مولانا محمد ایوب صفدر نے کی اور اس میں حاجی عثمان عمر ہاشمی کو جمعیت اہل السنۃ کا ضلعی صدر اور بابر رضوان باجوہ کو سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

• اسی روز عصر کے بعد الشریعہ اکادمی میں تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مولانا سید غلام کبریا شاہ نے کی اور اس سے مولانا جمیل احمد گجر، بابر رضوان باجوہ، مولانا حافظ محمد یوسف، حافظ عبد الرشید اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ مولانا نصیب خانؒ، مولانا سید محمد محسن شاہؒ اور مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ سب ہمارے محترم تھے اور سب کی شہادت اور جدائی پر ہم غمزدہ ہیں لیکن مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کی شہادت پر ہمارا صدمہ دوہرا ہے اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھی تھے اور انہوں نے طالب علمی کا ایک دور ہمارے درمیان گزارا ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے دینی تعلیم کا آغاز باغبانپورہ لاہور میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ کے ہاں کیا تھا جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا شیخوپوریؒ نے صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی اور ان کے بچوں کے ساتھ کچھ عرصہ ان کے گھر میں رہے، حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ کی اہلیہ محترمہ ان سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بہت مانوس تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کی اور وہیں دورۂ حدیث کر کے فراغت حاصل کی۔ بعد میں وہ کراچی تشریف لے گئے اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دورۂ حدیث میں بھی شریک ہوئے۔

قرآن کریم کے درس کا ذوق انہوں نے اپنے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ سے پایا اور وہ اس کا مختلف مواقع پر تذکرہ بھی کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اپنے شاگردوں کو بطور خاص اس کی تلقین کیا کرتے تھے کہ جہاں بھی جاؤ درس قرآن کریم کا سلسلہ ضرور قائم کرو، وہ نوجوانوں کیلئے ترجمۂ قرآن کریم اور ہلکی پھلکی عربی گرامر کی تعلیم پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ جبکہ مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہیدؒ آج کے دور میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی اس تعلیمی و فکری جدوجہد کا اہم کردار تھے جو حضرت شیخ الہند نے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر شروع کی تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کی محنت کی جائے اور قرآنی تعلیمات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ مولانا شیخوپوریؒ نے قرآن کریم کے درس کیلئے جو اسلوب اختیار کیا وہ آج کے نوجوان علماء کرام کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

علماء کرام کے اس المناک اور مسلسل قتل عام کے سلسلہ میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ افغانستان میں روس کی شکست اور روسی افواج کی واپسی کے بعد جو نیو ورلڈ آرڈر امریکہ کی طرف سے جاری ہوا تھا اس کی ایک باقاعدہ شق تھی کہ مسلم سوسائٹی میں جو علماء کرام اور دانشور عوام تک رسائی رکھتے ہیں اور جن کی باتیں رائے عامہ پر اثر انداز ہوتی ہیں انہیں عام مسلمانوں سے دور رکھا جائے۔ اس مقصد کیلئے ہی دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز مہم چلائی گئی تھی جو اَب بھی جاری ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دینی تعلیم اور دینی مدارس سے دور کیا جائے۔ لیکن یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ مہم الٹ پڑ گئی، جوں جوں دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا بڑھتا گیا اور کردارکشی کی مہم زور پکڑتی گئی اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور طلبہ و طالبات کی تعداد بھی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ دینی قیادت اور دینی مدارس کی کردارکشی کی اس مہم میں عالمی استعمار کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ علماء کرام کا یہ قتل عام اسی مہم کا ایک اور رخ ہے، بالخصوص کراچی کے بارے میں گذشتہ دو عشروں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ دینی حوالے سے جو شخصیت بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرتی ہے اور جس کے گرد عوام کا ہجوم جمع ہونا شروع ہوتا ہے اسے شہید کر دیا جاتا ہے۔

مولانا انیس الرحمان درخواستیؒ کی شہادت سے لے کر مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کی شہادت تک ہمارے جتنے بزرگ اور ساتھی شہید ہوئے ہیں ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ دین کیلئے ہمہ وقت متحرک تھے اور ان کے گرد علماء کرام کے ساتھ ساتھ عوام بھی جمع ہو رہے تھے۔ یہ آج کے عالمی استعمار کے ایجنڈے کا سب سے اہم ہدف ہے کہ علماء کرام اور خاص طور پر وہ علماء کرام جو دینی و فکری بیداری کا ذریعہ بنتے ہیں اور آج کے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر عوام کی راہنمائی کرتے ہیں انہیں عوام سے دور رکھا جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ استعمار کی یہ مہم بھی ناکامی سے دوچار ہوگی، علماء کرام کی شہادتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن علماء اور عوام کا رشتہ توڑنے کی مذموم کوشش ان شاء اللہ تعالیٰ بالآخر دم توڑ جائے گی بلکہ علماء کرام کی شہادتوں اور ان کے مقدس خون کی برکت سے یہ رشتہ اور مضبوط ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم غمزدہ ضرور ہیں مگر مایوس قطعاً نہیں ہیں اور نہ ہی شہادتوں کا یہ سلسلہ ہمارے حوصلوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جدوجہد ہے جو اپنی روایات کے مطابق آگے بڑھتی رہے گی، اللہ تعالیٰ تمام شہداء کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

طالبان کیلئے امریکی امداد

روزنامہ پاکستان، لاہور--- یکم اگست ۲۰۱۲ء

"اردو نیوز" نے نیٹو کے انٹیگریشن سیل کے ڈائریکٹر میجر جنرل ڈیوڈ ہوک کا یہ بیان شائع کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی وفاداریاں خریدنے کے حوالے سے نیٹو حکمت عملی بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت

صرف ۵ ہزار طالبان جنگجو ہتھیاروں سے دستبردار ہوئے، اس منصوبے کے اثرات ملک میں بہت معمولی رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں امریکی قیادت میں ایک پروگرام تشکیل دیا گیا تھا جس کے تحت افغانستان میں ہتھیار ڈالنے والے طالبان کیلئے تین ماہ کے اندر ۳۶۰ ڈالر ہر ایک جنگجو کو دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسی صفحہ پر شائع ہونے والی دوسری خبر یہ ہے کہ امریکہ کے سیاسی امور کے معروف ماہر اور کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر پال شیلڈن نونے کہا ہے کہ امریکہ افغانستان میں فوجی مہم جوئی اور قبضہ برقرار رکھنے کیلئے ٹیکس دہندگان سے حاصل شدہ رقم افغان جنگ کی آگ میں جھونک رہا ہے۔ ایرانی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ویتنام کی جنگ کی طرح امریکہ افغانستان کی جنگ پر بھی بے پناہ پیسہ ضائع کر رہا ہے۔

امریکہ کی قیادت میں نیٹو افواج نے آج سے دس سال قبل جب افغانستان پر فوج کشی کی تھی تب سے ہم یہ کہتے آرہے ہیں کہ یہ جنگ کبھی کامیاب نہیں ہوگی اس لیے کہ "طالبان" کسی گروہ یا طبقے کا نام نہیں ہے بلکہ افغان قوم کی اسلامی حمیت، قومی غیرت اور خود مختاری کی مستحکم روایت نے طالبان کا عنوان اختیار کر لیا ہے۔ اس لیے یہ جنگ کسی گروہ کے خلاف نہیں بلکہ افغان قوم کے خلاف ہے اور قوموں کو کبھی میدان جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی۔ آج بھی اس مسئلہ کا حل جنگ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک افغان قوم کے جذبہ حریت کا احترام کریں، طالبان کا وجود تسلیم کریں، افغانستان کی خود مختاری کو قبول کریں اور زمینی حقائق کی بنیاد پر جنگ بندی کا راستہ اختیار کر کے طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کے ذریعے افغان قوم کو پوری آزادی کے ساتھ اور کسی قسم کے دباؤ کے بغیر افغانستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا آزادانہ موقع فراہم کریں۔

اس خبر سے ایک اور فائدہ بھی ہوا، ہمیں کافی عرصہ سے افغانستان میں امریکی اتحاد کے خلاف نبرد آزما جنگجو طالبان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے میں مشکل پیش آرہی تھی، میجر جنرل ڈیوڈ ہوک نے یہ بتا کر ہماری مشکل کسی حد تک آسان کر دی ہے کہ پانچ ہزار جنگجو طالبان کا ان کے بقول ہتھیار ڈالنا اگر "صرف" اور "بہت معمولی" ہے اور اسے طالبان کی وفاداریاں خریدنے کی پالیسی کی "بری طرح ناکامی" سے تعبیر کرنا پڑ رہا ہے تو افغانستان میں جنگ لڑنے والے طالبان کی اصل تعداد کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔

حقانی نیٹ ورک اور دفاعِ پاکستان کونسل

روزنامہ وزارت لاہور میں ۱۴ ستمبر ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والے انٹرویو سے انتخاب

وزارت: حقانی نیٹ ورک پر لگنے والے امریکی الزام کے بعد طالبان کا ردعمل کیا ہو گا؟

جواب: یہ حربہ طالبان پر مذاکرات کے حوالے سے دباؤ ڈالنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ مختلف حوالوں سے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے نقشہ میں طالبان کے کردار پر گفتگو چل

رہی ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہی کے ایک حصہ حقانی نیٹ ورک کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں حالیہ امریکی اقدامات کا مقصد اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ مذاکرات کے دوران طالبان کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ مستقبل میں ان کے کردار کو محدود سے محدود تر کیا جا سکے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بے فائدہ بات ہے اس لیے کہ طالبان نے گذشتہ ۱۰ برسوں کی جنگ میں اپنی پوزیشن دنیا سے تسلیم کروالی ہے، لہٰذا فیصلے تو اسی تناظر میں ہوں گے۔

وزارت: دفاع پاکستان کونسل کا مستقبل کیا ہے؟

"دفاع پاکستان کونسل" ایک اچھے مقصد کے تحت عوامی دباؤ کو منظم کرنے کیلئے قائم ہوئی تھی اور اس کا خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ اس کا بنیادی ہدف امریکہ کی مخالفت ہے جو کہ حکومت کے بھی مفاد میں ہے کہ وہ امریکہ کے ساتھ زیادہ اعتماد کے ساتھ بات چیت کر سکے۔ یہ عوامی دباؤ ہماری قومی ضرورت ہے، میرے خیال میں دفاعِ پاکستان کونسل کو نہ صرف اپنا یہ کردار مسلسل جاری رکھنا چاہیے بلکہ خود کو اسی مقصد کیلئے محدود رکھنا چاہیے۔

افغانستان کی صورتحال اور قاضی حسین احمدؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۳ جنوری ۲۰۱۳ء

قاضی حسین احمد ملک میں نفاذ اسلام اور دیگر دینی و قومی تحریکات کیلئے دینی جماعتوں اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان مشترکہ جدوجہد کی راہ ہموار کرنے میں ہمیشہ متحرک رہتے تھے، ان میں بات سننے کا حوصلہ تھا، اس لیے ہم ان سے بعض نازک معاملات پر بھی بے تکلفی سے بات کر لیا کرتے تھے۔ جن دنوں قاضی صاحبؒ کا لندن میں دل کا بائی پاس آپریشن ہوا، میں لندن میں تھا، ان کی بیمار پرسی کیلئے حاضر ہوا تو وہاں مجلس میں افغانستان کی خانہ جنگی زیر بحث تھی، ان دنوں انجینئر گلبدین حکمت یار اور انجینئر احمد شاہ مسعود کے دھڑوں میں سخت جنگ ہو رہی تھی، پروفیسر برہان الدین ربانی افغانستان کے صدر تھے، ان کے ساتھ انجینئر گلبدین حکمت یار کو وزیر اعظم بنایا گیا تھا لیکن انہوں نے وزارت عظمٰی قبول نہیں کی اور ان دونوں دھڑوں کے درمیان جنگ نے بہت تباہی پھیلائی۔ طالبان اسی خانہ جنگی کے ردعمل میں سامنے آئے تھے، میں نے اس مجلس میں قاضی صاحب مرحوم سے کہا کہ انجینئر حکمت یار اور پروفیسر برہان الدین ربانی کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی کے مسلسل جاری رہنے کے ذمہ دار آپ ہیں، قاضی صاحب تھوڑے سے پریشانی ہوئے اور پوچھا، وہ کیسے؟ میں نے کہا کہ یہ دونوں آپ کے سیاسی حلقہ کے لوگ ہیں، سیاسی فکر کے حوالے سے دونوں کا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے، آپ کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ آپ گلبدین حکمت یار کے ساتھ فریق بن کر کھڑے ہو جائیں، آپ ہی ان میں صلح کرانے کی پوزیشن میں تھے لیکن آپ نے حکمت یار کے حق میں فریق بن کر خود کو جانبدار بنا لیا ہے اس لیے اب کون ان میں صلح کرائے گا؟ یہ بات سن کر قاضی صاحبؒ تو خاموش ہو گئے لیکن مجلس کے دوسرے حضرات نے میری بات کی تائید کی۔

بہر حال قاضی حسین احمدؒ ایک فکر مند، حوصلہ مند اور دردِ دل سے بہرہ ور راہ نما تھے، ان کی جدائی ہم سب کیلئے صدمہ کی بات ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اسلامی نظام کی جدوجہد اور اس کی حکمتِ عملی

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۱۳ء

ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورتحال میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے دو ذہن پائے جاتے ہیں:

- ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمانی قوت کے ذریعے اسلام نافذ ہو جائے گا،
- اور دوسرا یہ کہ ہتھیار اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

ایک طرف صرف پارلیمانی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیار اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعے مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف الیکشن، جمہوریت اور پارلیمانی قوت کے ذریعے نفاذِ اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اور ہتھیار اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدمِ جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی شرائط فقہاء کرامؒ نے کیا بیان کی ہیں، اور خاص طور پر جمہور فقہائے احناف کا موقف اس سلسلہ میں کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کیلئے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدوجہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی قیادت نے شاہِ ایران کی قیادت سے انحراف کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہن سازی اور فکری بیداری کی جولانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کیلئے تیار کر کے اسے اپنی قوت بنایا اور اس قوت کے ذریعے ہتھیار اٹھائے بغیر اسٹریٹ پاور اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدوجہد کا طریق کار طے نہیں کر سکتے؟

اگر کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آ رہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدوجہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اَب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کیلئے منظم کی گئی تھی۔ ایک مذہبی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے سیاہ فاموں کی اسٹریٹ پاور کو منظم کیا، پُر امن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو

عشروں میں ایک گولی چلائے بغیر ۱۹۶۴ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کیلئے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے کے مراکز میں گیا ہوں، ان کے راہنماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقف ہوں۔ میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روسی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی محاذوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روسی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوسع اسے سپورٹ کرتا ہوں۔ لیکن پورے شرح صدر اور دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی تصلب اور حمیت و غیرت میں تو بلاشبہ افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں لیکن نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے طریق کار کے حوالے سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہوگا اور مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ اگر پُرامن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ذریعے ”امامت“ کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جا سکتا ہے تو ”خلافت“ کے احیاء و قیام کیلئے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جا سکتی؟

افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: مقاصد و اہداف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۳ء

صدر اوباما نے دوسری مدت صدارت کی پہلی پالیسی تقریر میں ۲۰۱۴ء کے آخر تک افغان جنگ ختم کر دینے کا باضابطہ اعلان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ القاعدہ کو غیر مؤثر بنانے کا ان کا ہدف پورا ہو گیا ہے اس لیے اب جنگ کو مزید جاری نہیں رکھا جائے گا۔

یہ جنگ القاعدہ کے خلاف تھی یا افغان طالبان اس کا اصل ہدف تھے؟ جن افغان طالبان کی حکومت کو نیٹو افواج کی عسکری یلغار کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا ان سے مذاکرات کی مسلسل کوششیں اس جنگ میں امریکہ اور نیٹو افواج کی ”کامیابی“ کی اصل کہانی بخوبی بیان کر رہی ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ جبکہ خطہ سے امریکی اور نیٹو افواج کے بڑے حصے کے انخلا کے بعد صورتحال کیا ہوگی اس کے بارے میں کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہو۔ البتہ پاکستان کی سیاسی اور فکری دانش کے بعض دائروں میں ممکنہ خطرات و خدشات پر جو واویلا بھی شروع ہو گیا ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے بعض دانشوروں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ افغانستان میں افغان طالبان اپنی واپسی کی صورت میں پہلے سے زیادہ طاقتور ہوں گے اور ایک بڑی قوت کے مقابلہ میں فتح کا احساس ان کی قوت کو دو آتشہ کر دے گا۔ اس لیے پاکستان پر ان کے فکر و فلسفہ کے اثرانداز ہونے کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص اس صورت میں کہ پاکستان میں طالبان کے فکر و فلسفہ کے حامل لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور بوقت ضرورت وہ ایک مؤثر قوت کی

صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے ان دانشوروں کو اے این پی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس کے اس متفقہ موقف کے بارے میں بھی تحفظات درپیش ہیں کہ پاکستانی طالبان کی طرف سے مذاکرات کی پیش کش کو قبول کیا جائے اور مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کر کے امن کے قیام کو ترجیح دی جائے۔ حالانکہ اے این پی کی اس اے پی سی کا یہ موقف پوری قوم کی دل کی آواز ہے اور موجودہ حالات کے تناظر میں باہمی جنگ و جدال کی دلدل سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ لیکن دانش کی ایک سطح کو یہ خوف لاحق ہے کہ اس سے طالبان کو اپنی سوچ اور وژن کے مطابق نفاذِ اسلام میں پیشرفت کا موقع مل سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ ہم نے اپنی گزارشات میں ہمیشہ افغان طالبان اور پاکستانی طالبان کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ فرق آج بھی پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔

افغان طالبان جہادِ افغانستان میں روسی استعمار کی شکست اور سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد رونما ہونے والی خانہ جنگی کے ردعمل میں منظر عام پر آئے تھے۔ یہ خانہ جنگی مغربی قوتوں نے جہادِ افغانستان کے ذریعے سوویت یونین کے خلاف اپنے مقاصد کے حصول کے بعد افغانستان کو تنہا چھوڑ دینے کی شعوری یا غیر شعوری پالیسی اختیار کر کے پیدا کی تھی۔ اور اس خانہ جنگی ختم کرنے کی کسی سنجیدہ کوشش کی بجائے افغان مجاہدین کی مغربی اتحادی قوتوں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر اس خانہ جنگی کی عملاً حوصلہ افزائی کی تھی۔ افغان طالبان نے جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول اور افغانستان کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ کیلئے میدان میں قدم رکھا اور کامیابی حاصل کی جسے القاعدہ کی آڑ میں امریکہ اور نیٹو کی فوجوں نے عسکری یلغار کے ذریعے ختم کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ افغانستان پر غیر ملکی جارحیت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور اسی جوش و جذبہ کے ساتھ لڑ رہے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے سوویت یونین کی عسکری جارحیت کے خلاف جنگ لڑی تھی۔

مگر پاکستانی طالبان کا دائرہ اس سے مختلف ہے۔ انہوں نے پاکستان میں نفاذ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھائے اور ان کا آغاز حکومت پاکستان کے ساتھ نفاذ شریعت کے ایسے معاہدات سے ہوا تھا جو ملک کے دستوری فریم ورک کے اندر تھے مگر ان سے کیے گئے وعدوں کو عمداً توڑ دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پہلے صوفی محمد کے ساتھ اور پھر پاکستانی طالبان کے ساتھ کیے جانے والے معاہدوں کی پاسداری کی جاتی تو آج یقیناً یہ صورتحال نہ ہوتی جو ہمارے ان دانشوروں کو پریشان کر رہی ہے۔ ہم نے پاکستانی طالبان کے ہتھیار اٹھانے کی کبھی حمایت نہیں کی اور نہ ہی اب اسے درست سمجھتے ہیں لیکن ان کے اس مطالبہ کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ساتھ مختلف مواقع پر جو معاہدات کیے گئے ہیں ان کی پابندی کی جائے اور ان پر عملدرآمد کیا جائے۔ بلکہ ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ریاست سوات، بہاولپور اور قلات کو پاکستان میں شامل کرتے وقت ان کے عدالتی نظام کے بارے میں جو معاہدے کیے گئے تھے اگر انہیں سرد خانے میں نہ ڈال دیا جاتا تو صوفی محمد یا پاکستانی طالبان اور عسکریت پسندوں کا دور دور تک کوئی وجود نہ ہوتا۔

اس لیے ہم اس تاریخی تسلسل کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے کہ آج کی صورتحال ان مذکورہ معاہدات کی خلاف ورزی کا ردعمل اور منطقی نتیجہ ہے اور اس صورتحال سے نکلنے کیلئے قوم کو بحیثیت قوم ان معاہدات کی طرف واپس جانا ہوگا،

اس کے بغیر ان خطرات و خدشات کے سدباب کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے جس کا ہمارے دانشوروں کی طرف سے اظہار کیا جارہا ہے۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ بعد کی ساری باتیں چھوڑ دیجئے صرف ان معاہدوں کی گرد جھاڑ کر انہیں سامنے لائیے جو سوات، قلات اور بہاولپور کی ریاستوں کو پاکستان میں شامل کرتے وقت کیے گئے تھے اور ان پر عملدرآمد کا اہتمام کرلیجئے، اس ساری شدت پسندی اور عسکریت کی ہوا اکھڑ جائے گی۔

باقی رہی بات نفاذ اسلام کے وژن کی، ہم اپنے محترم دانشوروں کو یاد دلانا چاہیں گے کہ پاکستان بننے کے بعد جمہور علماء اسلام نے علامہ اقبالؒ کا وژن قبول کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ذریعے نفاذ اسلام کا راستہ اختیار کیا تھا اور قادیانیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کرنے کی بجائے ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کرلینے کا فیصلہ بھی اقبالؒ کے وژن پر ہی کیا گیا تھا۔ مگر ہمارے ان مہربان دانشوروں نے جمہور علماء اسلام کے اس اجتہادی فیصلے کا کتنا احترام کیا ہے؟ قرارداد مقاصد، پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ، ناموس رسالتؐ کے تحفظ کا قانون، اور دستور کی دیگر اسلامی دفعات منتخب پارلیمنٹ کے فیصلے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر فیصلے پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سرکردگی میں ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے بعض دانشوروں نے منتخب پارلیمنٹ کے ان جمہوری فیصلوں کے خلاف جو مورچہ لگا رکھا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء کرام تو اقبالؒ کے وژن پر آگئے تھے، انہوں نے اقبالؒ کا وژن قبول کرکے اس کے مطابق جمہوری اسلامی ریاست کا راستہ اختیار کرلیا تھا اور جمہور علماء پاکستان آج بھی اس وژن پر قائم ہیں۔ لیکن حکمران طبقوں اور سیکولر دانشوروں نے عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کے خلاف جو روش گذشتہ ساٹھ برس سے اختیار کررکھی ہے اس کے ردعمل میں اس شدت پسندی اور عسکریت نے جنم لیا ہے جو پوری قوم کیلئے اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک لمحہ کیلئے اس شدت پسندی اور عسکریت کے حامی نہیں ہیں لیکن جس روش نے حالات کو یہاں تک پہنچایا ہے اسے تبدیل کیے بغیر اس پر قابو آخر کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اس شدت پسندی اور عسکریت کے سدباب کیلئے دستور کی اسلامی بنیادوں کو تسلیم کرنے کا اعلان کیجئے اور ان پر خلوص دل کے ساتھ عملدرآمد کا اہتمام کیجئے، شدت پسندی کا راستہ خود بخود بند ہوجائے گا اور ان کیلئے قوم کے اجتماعی فیصلے کے سامنے سرنڈر ہونے کے سوا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا۔

افغان راہنما مولانا جلال الدین حقانی کی اپیل

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۷ اپریل ۲۰۱۳ء

جوں جوں الیکشن قریب آرہے ہیں اہل دین کی تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا ہے کہ قومی سیاست میں حصہ لینے والی دینی جماعتوں یا پاکستان کے اسلامی نظریاتی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں پر یقین رکھنے والی پارٹیوں کے مشترکہ طور پر الیکشن لڑنے کی عوامی خواہش تقریباً دم توڑ گئی ہے اور باہمی سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے ذریعے باہمی محاذ آرائی کو روکنے کے

امکانات بھی معدوم ہوتے نظر آتے ہیں۔

آنے والے عام انتخابات کے بارے میں ہر ذی شعور سیاسی کارکن کا کہنا ہے کہ یہ انتخابات اور ان کے نتائج نہ صرف پاکستان کے مستقبل بلکہ پورے جنوبی ایشیا کی صورت حال کے حوالے سے انتہائی اہم ہوں گے اور خاص طور پر پاکستان کے اسلامی تشخص کے بارے میں عالمی سیکولر قوتوں کے ایجنڈے کی پیش رفت کا مدار اس الیکشن کے نتائج پر ہوگا، اسی وجہ سے ملک کے دیگر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی پاکستان شریعت کونسل کے فورم پر قومی سیاست میں شریک مذہبی جماعتوں سے اپیل کی تھی کہ وہ متحدہ محاذ بنا کر اس الیکشن میں مشترکہ طور پر شریک ہوں یا کم از کم سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے ذریعے مذہبی ووٹ کے تقسیم ہو جانے کے امکانات کو کم سے کم کرنے کا کوئی لائحہ عمل طے کریں مگر یہ گزارش لائق التفات نہیں سمجھی گئی اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جمعیت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کے انتخابی راستے جدا جدا ہیں۔ جمعیت علماء اسلام نظریاتی، جمعیت علماء اسلام مولانا سمیع الحق گروپ، اہل سنت یعنی سپاہ صحابہؓ، جمعیت علماء پاکستان، جمعیت اشاعت التوحید اور جمعیت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے انتخابی امیدواروں کی بڑی تعداد میدان میں ہے اور بیسیوں حلقوں میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں، جس سے مذہبی ووٹ کے تقسیم ہو کر غیر موثر ہو جانے کے ساتھ ساتھ جگ ہنسائی کا سامان بھی فراہم ہو رہا ہے۔ ابھی الیکشن مہم کی شروعات ہیں مگر موبائل فون کے میسج سسٹم پر ایک دوسرے کے خلاف تبصروں اور جملہ بازی کا جو بازار گرم ہو رہا ہے وہ باعث شرم ہونے کی حد تک افسوسناک ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس میدان میں ایک دوسرے کے خلاف کس حد تک آگے جانے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہیں۔

اس لیے جہاں ہم اس درخواست کو دہرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، مولانا عصمت اللہ اور مولانا محمد احمد لدھیانوی کے باہمی رابطہ کے ساتھ ساتھ اس سے قدرے وسیع دائرے میں مولانا ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر، جناب سید منور حسن، علامہ ابتسام الٰہی ظہیر، پروفیسر حافظ محمد سعید اور ان کے رفقاء کے ساتھ بھی باہمی رابطہ و مفاہمت کی کوئی صورت اس حد تک ضرور نکلنی چاہیے کہ مختلف حلقوں میں باہمی محاذ آرائی کے امکانات کو کم سے کم کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ یہ گزارش بھی اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انتخابی مہم کے دوران اپنے مقررین، کارکنوں اور میڈیا کے محاذ پر کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کے خلاف ایسی زبان استعمال کرنے سے روکا جائے جو دینی حلقوں کی خفت اور سیکولر حلقوں کی تقویت کا سامان فراہم کرتی ہو اور اہل دین کیلئے جگ ہنسائی کا باعث بن جائے۔

اس موقع پر افغان مجاہدین کے عظیم راہ نما مولانا جلال الدین حقانی کی ایک سابقہ اپیل کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں جو انہوں نے اسی قسم کے انتخابات کے موقع پر پاکستان کے دینی حلقوں سے ایک مکتوب کے ذریعے فرمائی تھی، یہ خط اس وقت دیگر دینی جماعتوں کے راہ نماؤں کے علاوہ مجھے بھی موصول ہوا تھا، اس میں مولانا حقانی نے جمعیت علماء اسلام کے مختلف دھڑوں کے پس منظر میں لکھا تھا کہ:

> ”پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر علماء کا باہمی برادرانہ اتحاد دینی تقاضوں کی للکار اور وقت حاضر کی اہم پکار ہے جس سے نہ صرف پاکستان میں ملتِ اسلامیہ کی ایک عالمگیر باوقار اسلامی قوت پیدا ہو

جائے گی بلکہ موجودہ پر فتن دور کے بد عقیدہ، بے دین، ملحدین اور اسلام دشمن عناصر کے ناپاک حوصلے پست اور کافرانہ عزائم خاکستر ہو جائیں گے۔

اگر بزرگوارم جیسے حساس، خدا ترس، با اثر علماء ربانیین نے جمعیت کے ان دو ٹکڑوں اور دیگر دینی تنظیموں کے مختلف گروہوں کو یکجا کرنے میں ہماری مدد فرمائی تو بمشیئۃ اللہ تعالیٰ و بفضلہ علماء اسلام کی یہ بکھری ہوئی قوتیں ایک دفعہ پھر متحد ہو کر زندقہ والحاد کے پرستاروں کی سرکوبی کیلئے بنیان مرصوص ثابت ہوں گی۔

خدانخواستہ اگر ہم اس دفعہ بھی آنے والے انتخابات میں حسب روایات سابقہ درون خانہ فرقہ بندی کی خانہ جنگیوں میں مصروف رہے تو پہلے سے کہیں زیادہ جمعیت کی راسخ و مضبوط شخصیت متزلزل ہو کر انتہائی مذموم و مہلک نتائج سے ہمکنار ہو گی۔

اب تو ہمیں ماضی کے تلخ تجربات سے سبق لے کر محض رضائے مولیٰ کی خاطر تمام اختلافات و مشاجرات کو بالائے طاق رکھ کر پورے خلوص وللہیت کے ساتھ یک جسم و جان ہونا چاہیے تاکہ ابھی سے متفقہ طور پر پوری قوت و جانفشانی کے ساتھ آئندہ انتخابات اور دیگر اہم مسائل کیلئے منظم پالیسی کے ماتحت سرگرم عمل ہونے کے قابل ہو جائیں۔"

مولانا جلال الدین حقانی کی یہ اپیل اگرچہ کم و بیش دو عشرے قبل کی ہے لیکن موجودہ حالات میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی ہفتہ قبل یہ اپیل جاری ہوئی ہو۔ اس حوالے سے ہم دو گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

- ایک یہ کہ پاکستان کے داخلی ماحول کے حوالے سے افغان مجاہدین کی ذمہ دار قیادت بھی یہی چاہتی ہے کہ پاکستان کی دینی جماعتیں قومی سیاست میں بھرپور حصہ لے کر اہم کردار ادا کریں اور متحد ہو کر زیادہ سے زیادہ سیاسی قوت فراہم کریں۔
- اور دوسری یہ کہ افغانستان سے امریکی اتحاد کی فوجوں کے انخلاء کے بعد اگلے تین چار برسوں میں افغان مجاہدین کی سب سے بڑی ضرورت بھی یہی ہو گی کہ پاکستان کی دینی جماعتیں بالخصوص جمعیت علماء اسلام متحد ہو کر قومی سیاست میں اہم اور فیصلہ کن پوزیشن حاصل کریں۔ اس لیے اگر ہم اپنے لیے نہیں کر سکتے تو ان غریبوں کی خاطر ہی باہمی رابطہ و مفاہمت کا "کڑوا گھونٹ" بھر لیں، ہو سکتا ہے ہمیں تلخ اور کڑوا لگنے والا یہ گھونٹ ان مظلوموں کیلئے "آب حیات" کا کام دے جائے۔

قطر میں افغان طالبان کا دفتر

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۸ جون ۲۰۱۳ء

قطر میں افغان طالبان کا سیاسی دفتر کھلنے کے ساتھ ہی امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوتا دکھائی دینے لگا ہے اور دونوں طرف سے تحفظات کے اظہار کے باوجود یہ بات یقینی نظر آ رہی ہے کہ مذاکرات بہرحال ہوں گے کیونکہ اس کے سوا اب کوئی اور آپشن باقی نہیں رہا اور دونوں فریقوں کو افغانستان کے مستقبل اور اس کے امن و استحکام کیلئے کسی نہ کسی فارمولے پر بالآخر اتفاق رائے کرنا ہی ہوگا۔ افغان طالبان اور امریکہ کے درمیان مذاکرات کے حوالے سے مختلف خبریں نظر سے گزرتی ہیں تو ذہن امریکہ اور ویت کانگ کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی خبروں کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے جب ویت نام میں امریکہ کی فوج کشی کے بعد وہاں کے حریت پسند گوریلوں نے ”ویت کانگ“ کے عنوان کے تحت طویل جنگ لڑی تھی اور پھر طویل اور تھکا دینے والے مذاکرات کے نتیجے میں امریکہ کی فوجی مداخلت کے خاتمہ، ویت نام کی آزادی اور جنوبی اور شمالی ویت نام کے اتحاد کے مقاصد حاصل کر لیے تھے۔ افغان طالبان کو کم و بیش انہی مراحل کا سامنا ہے اور کسی بھی بڑے ملک کی فوجی مداخلت کے بعد اس سے گلوخلاصی کیلئے ان مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

افغانستان میں امریکی افواج اور نیٹو کی عسکری یلغار کے بعد ہم نے اس وقت بھی عرض کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً یہ گزارش کرتے آ رہے ہیں کہ مداخلت کار قوتوں کو بالآخر طالبان کا وجود تسلیم کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ مذاکرات کی میز سجانا ہوگی، اس کیلئے کوئی لمبی چوڑی فراست درکار نہیں تھی کیونکہ تاریخ کا عمل اسی کو کہتے ہیں اور تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کی رائے اس سے مختلف نہیں ہو سکتی۔

افغان طالبان کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ ایک شدت پسند گروہ ہے جو اسلحہ اور جبر کے زور پر افغانستان کا تسلط اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے جبکہ ہمارا موقف یہ تھا کہ ”طالبان“ صرف ایک گروہ کا نام نہیں بلکہ وہ افغان قوم کی حب الوطنی، خود مختاری اور حمیت اسلامی کی علامت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ایسی قوموں کو میدان جنگ میں کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے مداخلت کاروں کو بالآخر یہی کرنا تھا اور افغان طالبان نے بھی دانش مندی سے کام لیا ہے کہ مذاکرات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے اس سمت پیش رفت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہ مذاکرات ابھی وقت لیں گے، مذاکرات کے دوران بلکہ اس سے پہلے بھی روٹھنے اور منائے جانے کے کئی مراحل درمیان میں آئیں گے بلکہ بعض مناظر مایوسی کے بھی دکھائی دینے لگیں گے، مختلف حوالوں سے ایک دوسرے کے بارے میں بے اعتمادی اور تحفظات کا اظہار ہوگا، یہ مذاکرات کئی بار ٹوٹتے ٹوٹتے جڑیں گے اور جڑتے جڑتے ٹوٹیں گے، لیکن یہ بات اب نوشتہ تقدیر ہے کہ آخر کار یہ مذاکرات منطقی نتیجہ تک پہنچیں گے اور نہ صرف یہ کہ افغانستان مکمل آزادی اور خود مختاری کی منزل سے ہمکنار ہوگا بلکہ امریکہ اور نیٹو افواج بھی کسی نئے ہدف کی تلاش میں خود کو آزاد محسوس کریں گی۔

افغان طالبان افغانستان سے امریکہ اور نیٹو کی افواج کے انخلاء کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں جبکہ اس سے قبل افغان

مجاہدین اپنی سرزمین سے سوویت یونین کی فوجوں کے انخلاء کیلئے جنگ لڑ چکے ہیں۔ اس وقت افغان قوم کے سامنے ہدف یہ تھا کہ سوویت یونین کی فوجیں افغانستان کی سرزمین سے نکل جائیں اور اب اس حریت پسند قوم کا ہدف یہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو کی افواج افغانستان کا علاقہ خالی کر دیں۔ مگر ایک فرق واضح ہے کہ اُس وقت انہیں عالمی برادری حتیٰ کہ امریکہ کی بھی حمایت و امداد حاصل تھی جبکہ اب وہ تنہا ہیں اور کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہونے کیلئے تیار نہیں ہے۔ درپردہ امداد و حمایت کی بات الگ ہے مگر ظاہری منظر یہی نظر آرہا ہے کہ سوویت یونین کے خلاف تو عسکری جنگ کے ساتھ ساتھ سفارتی جنگ میں بھی عالمی برادری ان کی پشت پر تھی مگر امریکہ اور نیٹو کے خلاف جنگ میں میدان جنگ کے علاوہ سفارتی محاذ پر بھی وہ اکیلے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ افغان طالبان کی ذہانت و فراست کا بہت کڑا امتحان ہے اور اگر انہوں نے گذشتہ عشرے کے دوران اپنی کشمکش کے پس منظر اور پیش منظر سے کچھ سبق حاصل کر لیا ہے اور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر حقیقت پسندی کی بنیاد پر حکمت و تدبر کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس امتحان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی جنگ میں پاکستانی عوام بحیثیت قوم ان کی پشت پر کھڑے تھے، حکومت ان کے ساتھ تھی، ریاستی ادارے ان کی پشت پر تھے، علماء کرام خواہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں ان کے حامی و مددگار تھے، دینی مدارس کے طلبہ اور مذہبی جماعتوں کے کارکنوں نے افرادی قوت کا ایک بڑا حصہ انہیں فراہم کر دیا تھا اور مخیر حضرات نے بھی تعاون میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ مگر اس بار صورت حال بہت مختلف ہے حتیٰ کہ علماء کرام اور دینی جماعتیں گومگو کا شکار ہیں۔ افغان طالبان کو اپنے مشن میں بالکل صحیح سمجھتے ہوئے اور ان کی جنگ کو آزادی کی جنگ اور جہاد قرار دیتے ہوئے بھی وہ اس طرح ان کی حمایت نہیں کر پا رہے جس طرح سوویت یونین کے خلاف جہاد میں انہوں نے افغان مجاہدین کی حمایت کی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید قبائلی علاقوں کی صورت حال بھی ہے کہ حکومت پاکستان اور ریاستی اداروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے طرز عمل اور کاروائیوں نے جو حالات پیدا کر دیے ہیں وہ پاکستان کی عوامی رائے کو افغان طالبان کی حمایت میں منظم کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن کر رہ گئے ہیں جبکہ میڈیا تو مجموعی طور پر اس قسم کا کردار ادا کرتا ہی رہتا ہے، اس سے کوئی شکایت کرنا ہی سرے سے فضول اور بے مقصد محسوس ہوتا ہے۔

لیکن کیا پاکستان کی دینی جماعتوں اور علماء کرام کو گومگو کی اسی پوزیشن میں رہنا چاہیے؟ اور ایک جائز مقصد کیلئے صبر آزما جنگ لڑنے والے افغان طالبان کو مذاکرات کی میز پر اسی طرح تنہا چھوڑ دینا چاہیے؟ ہمارے خیال میں اس سوال کا گہری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف ملکی رائے عامہ کو توجہ دلانا اور توجہ دلاتے رہنا شاید ہماری دینی ذمہ داریوں میں بھی شامل ہے۔

ہماری رائے میں اس وقت جن دائروں میں ہم کام کر سکتے ہیں اور ہمیں کام کرنا چاہیے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

- افغان طالبان کو عمومی سیاسی و اخلاقی حمایت مہیا کی جائے اور نہ صرف ملکی رائے عامہ بلکہ عالمی رائے عامہ کو

بھی ان کے جائز موقف کی طرف توجہ دلانے کا اہتمام کیا جائے۔

- بین الاقوامی اداروں اور خاص طور پر عالم اسلام کے بین الاقوامی اداروں میں افغانستان کی آزادی و خود مختاری اور اس کے اسلامی تشخص کی بحالی و تحفظ کیلئے لابنگ اور ذہن سازی کی قابل عمل صورتیں نکالی جائیں۔
- افغان طالبان کی جدوجہد اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کی صورت حال کے فرق کو واضح کیا جائے اور پاکستان کی داخلی کشمکش کی ذمہ داری سے افغان طالبان کو بری الذمہ قرار دینے اور اصل زمینی حقائق کے اظہار کیلئے علمی و فکری محنت کی جائے۔
- مذاکرات کے دوران افغان طالبان کی ایک بڑی ضرورت یہ بھی ہوگی کہ مذاکرات کو صحیح نتائج تک لے جانے کیلئے ان کا عسکری دباؤ کمزور نہ ہونے پائے، اس مقصد کیلئے ان کے ساتھ پاکستان کے علماء کرام، دینی کارکن اور اصحابِ خیر اس فیصلہ کن مرحلہ میں جو بھی تعاون کر سکتے ہوں اس سے گریز نہ کیا جائے۔

افغان طالبان ہمارے بھائی ہیں اور اپنے وطن کی آزادی اور اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے مصروف جہاد ہیں۔ ان کی جنگ جس طرح سوویت یونین کے خلاف جائز تھی اسی طرح نیٹو افواج کی عسکری یلغار کے خلاف جنگ میں بھی وہ ہمارے نزدیک حق بجانب ہیں اور ہمیں اپنے حالات و ظروف کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی حق کا ساتھ دینے کے قابل عمل راستے ضرور نکالنے چاہئیں۔

افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: نئی حکومت کی ذمہ داریاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۱۳ء

نئی حکومتوں نے وفاق اور صوبوں میں اقتدار سنبھال لیا ہے اور اپنے اپنے ایجنڈے کے مطابق وہ مصروف عمل ہو گئی ہیں۔ انتخابات میں مرکزی حکومت اور صوبہ پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کو جو مینڈیٹ ملا ہے وہ خود اس کی اپنی توقعات سے بڑھ کر ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری بھی دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت نئی حکومت کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے ان میں ڈرون حملوں کے ماحول میں ملکی خود مختاری کی بحالی، خودکش حملوں کے حوالے سے ملک میں بدامنی اور قتل و غارت کے روز افزوں واقعات، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کا عذاب سرفہرست ہیں، اور میاں محمد نواز شریف نے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھاتے ہی ان مسائل کے حل کیلئے پیشرفت کا اعلان کیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ مسائل ورثہ میں ملے ہیں اور گزشتہ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں، یہ بات درست ہے لیکن صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ سابقہ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پالیسیوں کا رخ تبدیل کرنا اور قومی پالیسیوں کو صحیح رخ پر چلانا نئی حکومت کی سب سے بڑی ترجیح ہونی چاہیے۔

افغانستان میں طالبان کے ساتھ امریکی حکومت نے مذاکرات کا قطر میں اہتمام کر لیا ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ طالبان بظاہر ایک گروہ کا نام ہے لیکن اس ٹائٹل کے پیچھے دراصل پوری افغان قوم امریکی جارحیت کے خلاف اسی طرح ملکی آزادی اور قومی خود مختاری کی جنگ لڑ رہی ہے جس طرح انہوں نے روسی جارحیت کے خلافت جنگ لڑی تھی اور بالآخر کامیابی حاصل کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ طالبان اور ان کی قیادت میں افغان قوم امریکہ کے خلاف اس جہاد اور جنگ آزادی میں بھی سرخروئی حاصل کرے گی اور افغانستان بالآخر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر دوبارہ نمودار ہو گا، البتہ ابھی اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں اور بہت سی مشکلات کا افغان قوم کو سامنا کرنا پڑے گا۔ البتہ اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ پاکستان کی حکومت اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لے اور نیٹو افواج کو افغانستان سے واپسی کا محفوظ راستہ فراہم کرنے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ افغان قوم کی جنگ آزادی اور جہاد کے فطری اور نظریاتی مقاصد کی تکمیل کو بھی اپنی ترجیحات کا حصہ بنائے۔

امریکہ کی خواہش اور کوشش یہ نظر آ رہی ہے کہ وہ بھی سوویت یونین کی طرح افغان قوم کو باہمی لڑائیوں میں مصروف چھوڑ جائے بلکہ اس کیلئے راستہ بھی ہموار کیا جا رہا ہے۔ حکومت پاکستان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ جہاد افغانستان کے فطری اور نظریاتی مقاصد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے نظریاتی تشخص اور وطن عزیز کی سالمیت و خود مختاری کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے افغان قوم کے مختلف عناصر کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کے فروغ کا اہتمام کرے تاکہ نیٹو افواج کی متوقع واپسی کے بعد وہی صورتحال دوبارہ نہ پیدا ہو جائے جو روسی افواج کی واپسی کے بعد پیدا ہو گئی تھی اور افغانستان کو ایک خوفناک خانہ جنگی کی دلدل میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے حکومت میں شامل ایسے افراد کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے جو ان معاملات کو سمجھتے ہیں اور ان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

اسی طرح ملک کی عمومی سیاست اور مذہبی جدوجہد کے ماحول میں بھی اس مسئلہ کے تناظر میں ہم آہنگی اور مفاہمت کے عمل کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں نے متحدہ مجلس عمل یا اس نوعیت کے کسی متحدہ فورم پر الیکشن میں حصہ لیا ہوتا تو پارلیمنٹ میں ان کی مضبوط لابی کے ساتھ ساتھ مشترکہ انتخابات کے دوران پیدا ہونے والی عوامی بیداری کی لہر بھی آج افغان طالبان کیلئے مضبوط پشت پناہ ثابت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اور ہمارا یہ نقطۂ نظر ہے کہ ایسا نہیں ہونے دیا گیا جس کے مقاصد میں اس نازک مرحلہ میں افغان طالبان کو پاکستانی رائے عامہ کی پشت پناہی سے محروم کرنا بھی شامل تھا، بہرحال اب جو ہونا تھا ہو چکا اسے واپس نہیں لایا جا سکتا، البتہ اس کی کسی حد تک تلافی کی جا سکتی ہے۔

ہمارے خیال میں افغان قوم کو اس وقت ہماری طرف سے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے:

1. ایک یہ کہ نیٹو افواج کی واپسی کے بعد افغان قوم کو متحد رکھنے اور متوقع خانہ جنگی کی روک تھام کیلئے پاکستان کی حکومت اور متعلقہ ادارے مؤثر کردار ادا کریں اور اس کیلئے مضبوط منصوبہ بندی کی جائے۔
2. اور دوسری یہ کہ پاکستان کی دینی قوتیں اور محب وطن سیاسی عناصر مذاکرات کے اس مرحلہ میں افغان قوم اور

طالبان کیلئے مضبوط سیاسی و اخلاقی حمایت کا اہتمام کریں۔

کل کی طرح آج بھی افغانستان کا استحکام پاکستان کی ضرورت ہے اور کل کی طرح آج بھی پاکستان کے فطری حلیف افغانستان کے اسلام دوست اور آزادی پسند عناصر ہیں۔ ان حقائق سے نظریں چرانا پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے اور دینی جماعتوں کو خاص طور پر اس مسئلہ پر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے۔

پاکستانی طالبان کی صورتحال یہ ہے کہ ان سے تمام تر شکایات اور ان کے بارے میں تمام تر تحفظات کے باوجود وہ بہرحال پاکستانی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ:

- ماضی میں ان سے صحیح طور پر ڈیل نہیں کیا گیا، وہ ردعمل کا شکار ہوئے ہیں اور نام نہاد دہشت گردوں کے خلاف مبینہ جنگ میں وہ بہت سی زیادتیوں کا نشانہ بنے ہیں۔
- ان کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو بلاوجہ توڑ دیا گیا ہے اور انہیں اپنے علاقوں میں اپنی مرضی اور عوامی رائے کے مطابق معاشرتی نظام قائم رکھنے اور قانونی نظام قائم کرنے کے حق سے مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے۔
- ان کے مذہب اور مذہبی اقدار کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار بھی بیرونی یلغار کی زد میں ہیں۔

یہ درست ہے کہ انہوں نے ہتھیار اٹھا کر درست کام نہیں کیا اور حکومتی رٹ کو چیلنج کرنا اور مسلح افواج سے نبرد آزما ہونا ان کا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ لیکن اس صورتحال کے اسباب کیا ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے ملک کے شہریوں کو اس انتہائی اقدام کا راستہ دکھایا؟ ان کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا اور ان اسباب و عوامل کا سدباب کرنا ہم سب کی قومی ذمہ داری ہے۔

اسی قسم کی صورتحال بلوچستان کے ناراض عناصر کے بارے میں بھی ہے اور اگر نئی حکومت ان معاملات کو حل کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے ان امور کا بہرحال اہتمام کرنا ہوگا۔ ہماری خواہش ہے کہ:

- امریکہ اور افغان طالبان کے مذاکرات کے پس منظر میں افغانستان کے استحکام اور محفوظ مستقبل کی خاطر پاکستان کے قومی کردار کے تعین کیلئے فوری طور پر قومی سطح پر آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کیا جائے اور تمام سیاسی و دینی جماعتیں مل کر قومی پالیسی کا تعین کریں۔
- پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات کیلئے اس قومی جرگے کو اعتماد میں لیا جائے جو اس سلسلہ میں کچھ عرصہ سے سرگرم عمل ہے اور پاکستانی طالبان کو مستقبل کے حوالے سے تحفظ اور تعاون کا یقین دلانے کے ساتھ ساتھ ماضی میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کا بھی اہتمام کیا جائے۔
- حکومتی سطح سے ہٹ کر سیاسی اور دینی جماعتوں کو اپنے طور پر بھی کسی متحدہ فورم پر جمع ہو کر اس صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنی پالیسی اور ترجیحات کا تعین کرنا چاہیے۔ افغان طالبان ہوں یا پاکستانی طالبان، ان میں سے کسی کو بھی اس نازک مرحلہ میں تنہا چھوڑ دینا اور مناسب راہنمائی سے محروم رکھنا نہ ہمارے دینی مفاد میں

ہے اور نہ ہی اس میں پاکستان کا مفاد ہے۔

ملالہ اور ملالئے

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۱ جولائی ۲۰۱۳ء

اقوامِ متحدہ نے گذشتہ دنوں ''ملالہ ڈے'' منایا اور مختلف ممالک میں اس حوالے سے تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ خود ملالہ یوسف زئی نے بھی ایک بڑی تقریب سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ نوجوانوں کے ہاتھ میں کلاشنکوف کی جگہ قلم اور کتاب پکڑانا چاہتی ہیں۔ یہ خواہش بہت معصوم سی ہے اور ملالہ جیسی بھولی بھالی بچیوں کی زبانوں پر ہی آسکتی ہے، جبکہ مغرب اس بچی کی معصومیت اور اس کی معصوم خواہش کو ایکسپلائیٹ کر کے جو فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے اور کر رہا ہے، محاورے کی زبان میں اس کی ملالہ یوسف زئی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔

آج مولانا محمد شریف چترالی کی کتاب ''تحریکاتِ حریت'' پڑھتے ہوئے ''میوند'' کی جنگ میں برطانوی استعمار کے خلاف لڑنے والی ایک خاتون ''ملالئے'' کا تذکرہ نظر سے گزرا، جی چاہا کہ ملالہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ملالئے کا کردار بھی قوم کی نظر میں رہنا چاہیے، کیونکہ قلم اور کلاشنکوف کا اپنا اپنا میدان ہے اور اپنی اپنی ضرورت ہے۔ توازن دونوں کرداروں کو سامنے رکھ کر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہی توازن اس وقت امت مسلمہ کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ چترالی صاحب کیا لکھتے ہیں:

''قندھار کے قریب واقع میوند کی بستی کے ساتھ غیرت مند افغان مسلمانوں کی جرأت و شجاعت اور جانثاری اور دلیری کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ یہ وہ میدان ہے، جہاں غاصب و ظالم انگریز فوج کے ۱۲ ہزار مسلح جنگجو ملت افغان کے غراتے ہوئے شیروں کے نرغے میں آگئے تھے اور پورے لشکر میں سے صرف ۲۵ آدمی بھیس بدل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس جنگ کا مختصر احوال تاریخ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

کابل اور اس کے اطراف کی طرح جنوبی افغانستان میں بھی انگریز کے خلاف عوامی غم و غصے کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ہرات میں مجاہدین کے دستے جمع ہو گئے اور قندھار پر حملہ کرنے کیلئے منصوبے سوچے جانے لگے۔ پورے ملک کی سطح پر کوئی غیر متنازع اور ولولہ انگیز قیادت نہ ہونے کی وجہ سے ملت افغان کی اجتماعی قوت منتشر تھی، جس سے انگریز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی اثناء میں شمالی افغانستان سے ایک عام کمانڈر اور معمولی حیثیت کے سردار عبدالرحمن خان نے انگریزوں کے خلاف پورے افغانستان کے مسلمانوں کو متحد کر کے فیصلہ کن جنگ کرنے کا اعلان کیا اور اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد اس کی دعوت کا شہرہ پورے افغانستان میں ہونے لگا۔ ہرات کے مجاہدین نے اس دعوت کی خبر سن کر میدان میں آنے کا

فیصلہ کیا اور ہرات میں حکومت کرنے والے محمد ایوب خان کے گورنر کو اعلان جنگ کرنے پر ابھارا۔ اس کے مسلسل انکار اور ٹال مٹول پر مجاہدین نے اس کو قتل کر دیا اور اس کے نائب حفیظ اللہ کی قیادت میں ہرات سے قندھار کی جانب کوچ کیا۔ محمد ایوب خان نے بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۲ ہزار مجاہدین کا قافلہ فراہ اور گرشک کے راستے سے روانہ ہوا جس کے ساتھ راستے میں ادھر ادھر کے دیہات کے مجاہدین بھی ملتے گئے۔ ۲۰ جولائی کو یہ قافلہ قندھار کے قریب میوند کے بے آب و گیاہ اور خشک میدان میں پہنچا۔ قندھار میں متعیّن انگریز فوج کا ۱۲ ہزار کا لشکر قندھار کے کٹھ پتلی حکمران شیر علی کے دستوں اور بھاری توپ خانے کے ساتھ مقابلے کیلئے پہنچا۔

انگریز فوج نے مجاہدین کو میوند کے میدان میں روکنے کا فیصلہ کیا جو ہر لحاظ سے مجاہدین کیلئے تکلیف دہ تھا۔ قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ شیر علی کے بہت سے ساتھی بھی اس قومی جنگ میں شرکت کیلئے مجاہدین کے ساتھ آملے اور انگریزوں کو پہلے ہی مرحلے میں نفسیاتی شکست ہوئی۔ انگریزوں میں مجاہدین پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ مجاہدین کو پانی اور رسد کی مشکلات میں پھنسا کر اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں تھے۔ لیکن مجاہدین نے اس چیلنج کا بھی مقابلہ کیا اور ۶ ہزار مجاہدین نے میوند کے میدان میں ایک پرانی کاریز صاف کر کے مرمت کی جس سے مجاہدین کیلئے پانی جاری ہو گیا۔ انگریز اور مجاہدین آمنے سامنے ہوئے اور انگریزوں نے جنگ سے بچنے کیلئے تمام حربے استعمال کیے لیکن ناکام ہوئے۔ شروع شروع میں چھ دن تک معمولی معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں اور آخر کار ساتویں روز دشمن کے توپ خانے سے آگ برسنی شروع ہوئی۔ صبح سے دوپہر تک جنگ ہوتی رہی اور دونوں جانب کے ۵۰۰ آدمی مقتول اور ۸۵۰ زخمی ہوئے۔ مجاہدین کے کمانڈر حفیظ اللہ نے اچانک اپنی فوج کو "پروت پوزیشن" اختیار کرنے کا حکم دیا اور ان میں سے ۴ ہزار مجاہدین کو مختلف اطراف میں نکلنے کا حکم دیا۔

انگریز یہ سمجھے کہ مجاہدین نے پسپائی اختیار کی ہے، اس لیے انگریزوں نے اپنے سامنے لڑنے والے مجاہدین پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اسی اثناء میں مجاہدین نے تینوں اطراف سے انگریزوں کے عقب پر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور انگریز چاروں طرف سے گھیرے میں آ گئے۔ آگ اور خون کے درمیان سے صرف چھ سو انگریز فرار ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن مجاہدین نے ان کا پیچھا بھی نہ چھوڑا اور ایک باغ کی چار دیواری میں چھپے ہوئے ان انگریزوں کا بھی صفایا کر دیا۔ شیر علی صرف ۲۵ انگریزوں کو افغانیوں کا لباس پہنا کر قندھار پہنچانے میں کامیاب ہوا اور پوری انگریز فوج کے مجاہدین کے ہاتھوں ختم ہونے کی خبر قندھار میں جنرل پریموز کو دی۔

اس جنگ میں بھی افغان خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا، ان خواتین میں سے ایک خاتون "ملالئے"

کے نام سے آج بھی اپنی جرأت و بہادری کی بنا پر مشہور ہے۔ اس خاتون نے مجاہدین کے جھنڈے اٹھانے والے کمانڈر کو شہید ہوتا دیکھ کر فوراً اس کے پاس پہنچی اور اپنی جان کی بازی لگا کر مجاہدین کا جھنڈا اٹھایا اور اسے سرنگوں ہونے نہیں دیا۔ ملالئے جہادی شاعرہ بھی تھی، اس کے دل گرما دینے والے اشعار آج بھی افغانوں کی زبانوں پر ہیں۔ میوند کے میدان میں مجاہدین کا لہو گرمانے کیلئے اس نے یہ شعر پڑھا تھا:

کہ پہ میوند کی شہید نہ شوئی
خدا یگو لالیہ پہ ننگے تہ دی ساتینہ

(اگر تم میوند میں شہید نہ ہوئے تو سمجھو کہ بے غیرتی کی زندگی گزارو گے۔)

یہ خاتون اپنی آرزو اور جذبات کے مطابق میوند ہی میں شہید ہوئی اور وہیں آسودہ خاک ہوئی۔''

افغان طالبان کی سرگرمیاں

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۳ جولائی ۲۰۱۳ء

افغان طالبان اور امریکہ کے مجوزہ مذاکرات اس وقت تعطل کی حالت میں ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ باہمی اعتماد کی فضا قائم کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ وزیر اعظم پاکستان کے مشیر برائے امور خارجہ جناب سرتاج عزیز کا کہنا ہے کہ یہ تعطل عارضی ہے اور ان مذاکرات میں پاکستان کا کردار سرِدست صرف اتنا ہے کہ وہ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کیلئے سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے حالیہ دورۂ کابل کے دوران انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پاکستان افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات بحال کرانے میں مدد دے گا۔

ہم اس سے قبل اسی کالم میں عرض کر چکے ہیں کہ اس قسم کے بہت سے مراحل آئیں گے لیکن چونکہ یہ مذاکرات دونوں فریقوں کی ضرورت ہیں اس لیے بالآخر مذاکرات کی میز سجے گی اور دونوں کسی نہ کسی نتیجے پر بہرحال پہنچیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ان مذاکرات کے حوالے سے ہمیں ایک الجھن شروع سے پریشان کر رہی تھی کہ افغان طالبان کے موقف اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں اوریجنل معلومات کہاں سے حاصل ہوں گی؟ اس لیے کہ افغان طالبان کی طرز پر پاکستانی طالبان کے ٹائیٹل نے بہت سی باتیں خلط ملط کر رکھی ہیں اور خبروں اور تبصروں کے مسلسل اختلاط کے ذریعے خود میڈیا نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہر طرف دھند ہی دھند دکھائی دیتی ہے، اور گاڑی کی ہیڈلائیٹس روشن کرنے کے باوجود کچھ نظر نہیں آرہا کہ سڑک کدھر ہے اور جانا کس سمت ہے۔

طالبان اور جہاد کے عنوان سے متعدّد جرائد ہماری نظر سے گزرتے ہیں مگر ان کی صورت حال بھی یہ ہے کہ کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ افغان طالبان ہی کی نمائندگی کر رہا ہے اور اس کے پس پردہ کچھ اور مقاصد نہیں ہیں۔ اس پس منظر میں ایک اردو جریدہ دیکھنے کو ملا ہے جو ماہنامہ شریعت کے نام سے شائع ہوتا ہے اور اس کی پیشانی پر

"امارتِ اسلامیہ افغانستان کا واحد ترجمان" درج ہے جبکہ اندرونی ٹائیٹل کے ایک چوکھٹے میں یہ عبارت موجود ہے کہ:

"ماہنامہ شریعت امارتِ اسلامیہ افغانستان کا اردو زبان میں واحد اور باضابطہ دینی، ثقافتی اور سیاسی مجلہ ہے جو امارت اسلامیہ کے میڈیا ونگ اور ثقافتی کمیشن کی زیر نگرانی شائع ہوتا ہے۔ ماہنامہ شریعت افغانستان میں جاری کشمکش، حالات و واقعات اور مظلوم مسلمانوں پر روا رکھے جانے والے بھیانک مظالم کا سچا اور چشم دید عکاس ہے۔"

یہ جریدہ دیکھ کر ہمیں اس پہلو سے خوشی ہے کہ انتہائی محدود سطح پر سہی لیکن ایک ایسا اوریجنل ذریعہ میسر آ گیا ہے جس کے ذریعے افغان طالبان کے حوالے سے شائع ہونے والی کوئی خبر یا رپورٹ پڑھ کر یہ تسلی ہوگی کہ یہ افغان طالبان ہی کی خبر اور رپورٹ ہے اور اس کی روشنی میں متعلقہ مسئلہ کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہو جائے گی جو موجودہ حالات میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

ویسے افغان طالبان کو مذاکرات کیلئے آمادہ کرنے اور مذاکرات کی میز پر لانے والوں کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان کو مذاکرات کے ماحول میں لانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں میڈیا کے افق پر پائی جانے والی شدید دھند کو کم کرنے کی بھی کوئی صورت نکالیں۔ کیونکہ جنگ ہو یا صلح جب تک دونوں طرف کی اوریجنل اور صحیح معلومات میسر نہ آئیں، نہ عالمی رائے عامہ کوئی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتی ہے اور نہ ہی عالمِ اسلام کے عوام اور پاکستان کی قومی رائے عامہ کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

اس وقت ماہنامہ شریعت کا جون ۲۰۱۳ء کا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے جو طباعت و کمپوزنگ کے مناسب معیار کے ساتھ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں افغانستان میں افغان طالبان کی عسکری سرگرمیوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مذاکرات کے حوالے سے تجزیاتی مضامین بھی موجود ہیں اور مختلف فکری اور سیاسی پہلوؤں پر تحریریں بھی اس کا حصہ ہیں۔ ہم اپنی دلچسپی کے دو تین موضوعات کے حوالے سے اس جریدہ کے چند مضامین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔"

۲۰۱۴ء کے بعد مغرب کا ممکنہ حملہ" کے عنوان سے جناب اکرم تاشفین نے عالم اسلام پر مغرب کی تہذیبی یلغار اور اس میں مستشرقین کے مسلسل کردار کا تذکرہ کیا ہے اور اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان سے مغربی فوجوں کی واپسی کے بعد اس خطہ میں ثقافتی کشمکش اور مغرب کی تہذیبی یلغار اپنے عروج کو پہنچ جائے گی۔ وہ اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں کہ:

"ذرائع ابلاغ کے ذریعے افغان عوام کے افکار کو مسخر کیا جائے گا، ان کی تہذیب، ثقافت، تاریخ، روایات، افکار، خیالات، شجاعت، بہادری، متانت، سنجیدہ فکری اور علم پسندی کا مذاق اڑا کر اس کی تضحیک کی جائے گی۔ افغانوں کی ثقافت و تاریخ کو جاہلانہ اور وحشیانہ قرار دے کر خود افغانوں کی نظر میں اس کی اہمیت و عزت گھٹا دی جائے گی۔ افغان عوام شروع سے اسلام اور ایمان پر جان چھڑکتے ہیں، ان کی مذہب پسندی کے خاتمہ کیلئے بے حیائی اور فحاشی کا سیلاب بہا دیا جائے گا اور مذہب سے بے گانہ کر کے ان کو آزاد خیال بنا دیا جائے گا۔"

ہمیں اکرم تاشفین صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ”امارتِ اسلامیہ افغانستان“ کے ماحول میں مغرب اور عالم اسلام کے درمیان جاری فکری و ثقافتی جنگ اور تہذیبی کشمکش کا اس درجہ کا شعور موجود ہے اور وہ افغانستان پر اس کے اثرانداز ہونے کے امکانات کا ادراک رکھتے ہیں۔ جناب حسن مومند نے ”روس کو دوبارہ افغانستان میں لانے کی کوشش“ کے عنوان کے تحت ان مبینہ سازشوں کا تذکرہ کیا ہے جو امریکی اتحاد کی فوجوں کے اس خطہ سے نکل جانے کے بعد روس کو افغانستان میں دوبارہ مداخلت کی ترغیب دے رہی ہیں۔ حسن مومند نے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات اس پر ختم کی ہے کہ:

”افغانستان سے امریکہ اور نیٹو کے انخلاء پر روس کو بھی افغانیوں کی طرح خوشی ہونی چاہیے، اس لیے کہ وہ طالبان کو خطرہ نہ سمجھے، طالبان سے مطمئن رہے اور سی آئی اے کی مذموم سازشوں سے بچنے کی کوشش کرے۔“

عبدالقادر سیف صاحب کا ایک مضمون ”اسلام اور کنزیومرازم“ کے عنوان سے ہے جس میں سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے امارتِ اسلامیہ افغانستان کے اعلیٰ سطحی ماحول میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے بارے میں پائے جانے والے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ آخر میں ہم اس جریدہ کے آخری ٹائیٹل کے اندرونی صفحہ پر موجود افغان طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر مجاہد کا یہ پیغام قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو ”افغانستان کا مستقبل“ کا عنوان سے ہے اور ملا محمد عمر لکھتے ہیں:

”امارتِ اسلامیہ حکومتی اجارہ داری کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ افغانستان تمام افغانوں کا مشترکہ گھر ہے جس طرح سب پر اس کی تعمیر اور ترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسی طرح اہلیت و برابری کی شرط پر حکومت میں حصہ لینا بھی ہر ایک کا حق ہے۔ امارت اسلامیہ کی بھرپور کوشش ہوگی کہ اختیارات اور اقتدار ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن میں حکومت داری کی پوری اہلیت ہو جو کرپٹ نہ ہو، وطن کے ساتھ مخلص ہو اور ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے والا ہو۔

امارت اسلامیہ حصول تعلیم کو اپنی قوم کی دنیاوی ترقی اور اخروی سعادت کا باعث گردانتی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ امارت اسلامیہ نے اپنے دور اقتدار میں بجٹ کا بڑا حصہ تعلیم کیلئے مختص کر رکھا تھا اور آج بھی تعلیم و تربیت ان کی اولین ترجیحات میں شامل ہے اور اس کیلئے خصوصی کمیشن بنا رکھے ہیں تاکہ اپنی عوام کو تعلیمی سہولیات فراہم کی جا سکیں۔ لیکن بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اسکول بند کر دیے جاتے ہیں، کچھ کو جلا دیا جاتا ہے یا طلبہ پر زہریلا مواد استعمال کر کے مجاہدین کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام شکست خوردہ دشمن کی خفیہ سازشوں کی ایک کڑی ہے جو مجاہدین کو بدنام کرنے کیلئے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

ہم خواتین کو اسلامی اصولوں، قومی مفادات اور اپنی شرعی ثقافت کے مطابق تمام حقوق دینے کیلئے کمر بستہ ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قابض قوتوں کی آمد کے ساتھ ہی افغان عوام خصوصًا خواتین کو بہت سے مصائب اور تکالیف برداشت کرنا پڑا ہے یہاں تک کہ کئی خواتین مظالم سے تنگ آکر خود کو جلا بیٹھیں اور بعض مظلوم خواتین کو انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا گیا، ان کی عزتیں پامال کی گئیں اور آج بھی یہ جبر مسلسل رکنے میں نہیں آرہا جبکہ امارت اسلامیہ افغانستان میں افغان خواتین پر امن زندگی بسر کر رہی تھیں اور ان تمام مصائب سے محفوظ تھیں"

افغان طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر مجاہد کا یہ پیغام جہاں ان کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے وہاں افغان طالبان کے بارے میں عالمی سطح پر پھیلائے گئے بہت سے شکوک و شبہات کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے اور دانشوروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ افغان طالبان کے موقف اور سرگرمیوں کا اوریجنل معلومات اور زمینی حقائق سے جائزہ لے کر قومی رائے عامہ کی دیانت داری کے ساتھ صحیح راہنمائی کریں۔

افغانستان میں غیر ملکی تسلط کی مدد کی شرعی حیثیت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۳ء

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۲۱ اکتوبر کو آئی این پی کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ:

"ملک کے ممتاز عالم دین مفتی محمد تقی عثمانی نے افغانستان پر غیر ملکی تسلط میں سرکاری اور ہر طرح کی مدد کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے فتویٰ جاری کیا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے حکومت پاکستان اس امر کی مجاز نہیں ہے کہ وہ پڑوسی مسلمان ملک پر غیر مسلموں کے قبضے کو مستحکم کرنے میں غیر ملکی جارح قوت کی مدد کرے۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ معاشی تنگدستی کا خدشہ بھی پاکستان کی کسی حکومت کو اس مفاد پرست پالیسی کیلئے شرعی حجت فراہم نہیں کرتا۔"

فتویٰ کا پورا متن اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن اخبار کی یہ خبر اس بات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ افغانستان پر امریکی اتحاد کی عسکری یلغار، جس کے نتیجے میں امارت اسلامیہ افغانستان کو ختم کر کے اپنی مرضی کی حکومت وہاں مسلط کر دی گئی ہے اور تب سے افغانستان میں جارح قوت کی عسکری کاروائیاں مسلسل جاری ہیں جس کے باعث ہزاروں افغان باشندے جام شہادت نوش کر چکے ہیں، اس کے بارے میں پاکستان کے دینی حلقوں کے جذبات اور موقف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کا یہ فتویٰ صرف ان کی ذاتی رائے نہیں بلکہ پاکستان کے جمہور علماء کرام اور دینی حلقوں کے جذبات اور موقف کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح سوویت یونین کی عسکری یلغار کے مقابلہ میں افغان عوام کی مسلح جنگ شرعی جہاد تھا اسی

طرح امریکی اتحاد کی عسکری جارحیت کے مقابلہ میں افغان عوام کی جدوجہد شرعاً جہاد کا درجہ رکھتی ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت، ریاستی اداروں اور عوام کو جابر و ظالم قوتوں کا ساتھی بننے کی بجائے مظلوم افغان عوام کا ساتھ دینا چاہیے۔

پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات اور مولانا سمیع الحق

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳ جنوری ۲۰۱۴ء

اگلے روز نئے سال کے پہلے دن کی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر اس امید کے بر آنے کی کچھ آس لگ گئی ہے کہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نے جمعیت علماء اسلام (س) پاکستان کے امیر مولانا سمیع الحق سے تفصیلی ملاقات کر کے طالبان کے ساتھ مجوّزہ مذاکرات کے بارے میں ان سے گفتگو کی ہے اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ پاکستانی طالبان کے ساتھ حکومت کے مذاکرات کا ماحول پیدا کرنے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور مذاکرات کی طرف پیشرفت میں کردار ادا کریں۔ مولانا سمیع الحق نے یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے اور ایک انٹرویو میں اس سلسلہ میں حکومت کی پیش کش کو سنجیدہ قرار دیتے ہوئے کردار ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مولانا سمیع الحق قومی سیاست میں ایک عرصہ سے متحرک ہیں، پارلیمنٹ کے اہم ارکان میں ان کا شمار رہا ہے۔ جمعیت علماء اسلام پاکستان (س) کے مرکزی امیر ہیں لیکن طالبان کے ساتھ مذاکرات کے حوالے سے ان کا اصل تعارف یہ ہے کہ وہ شیخ الحدیث مولانا عبد الحق رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند اور دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مہتمم ہیں۔ روسی استعمار کے خلاف جہادِ افغانستان میں دارالعلوم حقانیہ اور حضرت مولانا عبد الحقؒ کا کردار عالمی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اور پاکستان کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا میں جہادی تحریکات اور استعمار کے خلاف مزاحمتی کلچر کے فروغ میں انہیں علمی و فکری مرکز اور پشتیبان کی حیثیت حاصل ہے۔ افغانستان اور اردگرد کے ممالک کے علماء کرام اور مجاہدین کی ایک بڑی تعداد حضرت مولانا عبد الحقؒ کی شاگرد ہے اور مولانا سمیع الحق کے اپنے شاگردوں کی تعداد بھی ان میں کم نہیں ہے۔

جہاد افغانستان کو دنیا بھر میں جہادی تحریکات کا منبع سمجھا جاتا ہے جبکہ جہاد افغانستان کا سب سے بڑا علمی و دینی سرچشمہ دارالعلوم حقانیہ ہے۔ ان جہادی تحریکات میں بہت سی تحریکات اصلاً جہادی ہیں جبکہ بہت سی تحریکات کو دہشت گردی کے الزام کا صحیح یا غلط طور پر سامنا ہے۔ ان کی درجہ بندی آنے والا وقت ہی کرے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم اسلام میں جہادی کلچر کے آگے بڑھنے کا ذریعہ جہاد افغانستان بنا ہے اور جہاد افغانستان کی راہ ہموار کرنے میں جن اداروں اور شخصیات نے کلیدی کردار ادا کیا ہے ان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ اور دارالعلوم حقانیہ کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت مولانا عبد الحقؒ کو میں اس حوالے سے شیخ الہند حضرت محمود حسن دیوبندیؒ کے فکر و عمل کا نمائندہ سمجھتا ہوں کہ ایک طرف انہوں نے استعمار کے تسلّط کے خلاف جہاد کی صرف سرپرستی نہیں بلکہ آبیاری کی اور دوسری طرف پاکستان

کی دستور ساز اسمبلی اور پھر قومی اسمبلی کے منتخب رکن کی حیثیت سے اسلامی اصولوں کے مطابق ملک کے دستور کی تدوین و تشکیل اور قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی میں علمی اور فکری راہ نما کا کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی میں حضرت شیخ الحدیثؒ کے خطابات اور دیگر پارلیمانی سرگرمیوں کی کچھ تفصیلات کتابی شکل میں جمع ہو چکی ہیں جو نفاذ اسلام کی دستوری اور جمہوری جدوجہد کرنے والے علماء کرام اور کارکنوں کیلئے "گائیڈبک" کا مقام رکھتی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحقؒ کی فرزندی اور جانشینی کے اس اعزاز سے ہٹ کر قومی سیاست اور دینی جدوجہد میں مولانا سمیع الحق کا اپنا بھی ایک منفرد اور بھرپور تعارف موجود ہے اور افغان مجاہدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی طالبان کے ساتھ ان کے روابط یا اس سلسلہ میں ان کا مفاہمانہ کردار سب کے سامنے ہے۔ اس پس منظر میں اس عظیم قومی اور دینی خدمت کیلئے مولانا سمیع الحق کا انتخاب نئے سال کی پہلی خوش خبری اور میاں محمد نواز شریف کا صحیح فیصلہ ہے جس پر دونوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس عمل کی جلد اور بھرپور کامیابی کیلئے دعاگو ہوں۔ آمین یارب العالمین۔

اس موقع پر ایک گزارش مولانا سمیع الحق سے اور ایک گزارش پاکستانی طالبان سے کرنا چاہتا ہوں۔

مولانا سمیع الحق سے تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ ایک اعزاز کے ساتھ بہت بڑا امتحان بھی ہے جس کی نزاکتوں اور خطرات و خدشات کو وہ یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہیں، لیکن میں بھی اس میں ثواب کیلئے کچھ حصہ ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاد افغانستان میں جو ان سارے معاملات کا اصل منبع ہے، جن جن اداروں، حلقوں اور شخصیات کا کردار رہا ہے ان کے ساتھ مشاورت کی اہمیت کو لازماً سامنے رکھیں اور خاص طور پر مولانا فضل الرحمن، سید منور حسن، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ، جنرل (ر) حمید گل، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا مفتی عبدالرحیم کے ساتھ مشاورت کا اہتمام کریں تاکہ کسی درجہ میں کوئی خلا باقی نہ رہ جائے۔

جبکہ پاکستانی طالبان سے میری گزارش ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ان کے تمام تر خلوص اور بے پناہ قربانیوں کے باوجود پاکستان کے اندر نفاذِ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھانے کی کبھی حمایت نہیں کی اور اس موقف پر اب بھی پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہوں۔ لیکن جذبۂ جہاد سے بہرہ ور مخلصین کے ساتھ دلی ہمدردی کے باعث الدین النصیحۃ کے جذبہ کے تحت یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی دینی جدوجہد کے دستوری اور پارلیمانی پہلو کا بھی مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ انہوں نے پاکستان کے داخلی حالات اور علاقائی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ملک میں نفاذ اسلام کیلئے دستوری اور پارلیمانی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا تھا، جس پر وہ آخر دم تک قائم رہے اور جس میں انہیں ملک کے جمہور علماء کرام بلکہ تمام دینی مکاتب فکر کی حمایت اور تعاون حاصل تھا، وہ بھی دینی راستہ ہے اور شریعتِ اسلامیہ کے اصولوں کے مطابق راستہ ہے۔ میں آج کے عالمی حالات میں نفاذِ اسلام کی پرامن جدوجہد کا راستہ روکنے کیلئے مختلف ممالک میں استعماری قوتوں کی سازشوں اور ان کے گماشتہ حلقوں کی کارستانیوں کا بحمد اللہ تعالیٰ پوری طرح ادراک رکھتا ہوں اور اس پر لکھتا بھی رہتا ہوں مگر اس کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کیلئے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی دستوری اور پارلیمانی جدوجہد ہمارے لیے صحیح راہ نمائی اور اسوہ فراہم کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ مشکلات کا راستہ ہے، صبر آزما ہے، حوصلہ شکن ہے اور مایوسیوں کے بریکر قدم قدم پر دکھائی دے

رہے ہیں لیکن موجودہ حالات میں قابل عمل راستہ یہی ہے۔ ہمارے پاکستانی طالبان اگر اس پہلو پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور فرمالیں تو ہو سکتا ہے خیر کا کوئی بہتر راستہ نکل آئے!

اسلام کا نظامِ حکومت: تصنیفی کاوشیں

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۹ جنوری ۲۰۱۴ء

حضرت مولانا محمد میاں المعروف منصور انصاریؒ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے تربیت یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے تھے۔ انہوں نے مفکر انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھ آزادیٔ ہند کی تحریک میں ان کے دست راست کے طور پر کام کیا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہ کابل چلے گئے تھے اور وہیں انہوں نے تحریکی جدوجہد کے تانے بانے بُنے۔ جب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ کے ساتھ مل کر آزاد ہند گورنمنٹ تشکیل دی تو مولانا منصور انصاریؒ بھی اس کی کابینہ میں شامل تھے۔

مولانا منصور انصاریؒ نے آزادیٔ ہند کیلئے سیاسی تحریک منظم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے علمی وفکری محنت کی بنیاد بھی ڈالی اور فارسی زبان میں دو عمدہ رسالے ترتیب دیے جن میں عصر حاضر میں ایک اسلامی حکومت کے مجوزہ خدوخال کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مروّجہ نظام ہائے حکومت کے ساتھ اسلام کے نظام خلافت کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ ان میں سے ایک رسالہ ”حکومتِ الٰہی: دستور اساسی امامت امت“ کے نام سے ہے جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا رسالہ ”کتاب اجتماعی انواع الدول و حریت الملل“ کے عنوان سے اسی ضخامت کا حامل ہے۔

یہ دونوں رسالے ان کے فرزند مولانا حامد الانصاری غازی نے اب سے آٹھ عشرے قبل ۱۳۵۰ھ میں بجنور سے شائع کیے تھے اور ان میں مصنف علیہ الرحمۃ نے عالم اسلام کے مفکرین کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے ان کے پیش کردہ خاکہ کے بارے میں اظہار خیال کریں اور اپنی اپنی آراء پیش کریں۔

مولانا منصور انصاریؒ کے اس استفسار پر اس وقت کے علماء کرام نے کچھ لکھا یا نہیں اس کا ہمیں علم نہیں ہے لیکن خود ان کے فرزند مولانا حامد الانصاریؒ نے ”اسلام کا نظام حکومت“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جو اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوھارویؒ کی کتاب ’اسلام کا اقتصادی نظام“ اور حضرت مولانا حامد الانصاریؒ کی کتاب ”اسلام کا نظام حکومت“ سیاسی ذوق رکھنے والے علماء اور طلبہ کیلئے مطالعہ کی اہم کتابیں سمجھی جاتی تھیں جبکہ راقم الحروف نے ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور میں ”اسلام کا اقتصادی نظام“ کی ایک تلخیص پیش کی تھی جو کئی قسطوں میں شائع ہوئی۔

اسلام کے نظام حکومت پر ہمارے معاصر علمی حلقوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور متعدّد اصحاب علم نے

اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر خود ہمارے حلقہ میں اس موضوع پر چنداں توجہ نہیں دی گئی اور تشنگی کا احساس مسلسل باقی رہا۔ اسلامی نظام راقم الحروف کی خصوصی دل چسپی کا موضوع بھی چلا آرہا ہے اور گذشتہ نصف صدی کے دوران میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں جن کا ایک مختصر خلاصہ ”اسلام، جمہوریت اور پاکستان“ کے عنوان سے گذشتہ دنوں شائع ہوا ہے۔ مگر اس پر باضابطہ اور تفصیل کے ساتھ کام کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہی ہے۔ بلکہ میرے خیال میں یہ موضوع اہل علم کے درمیان تفصیلی بحث و مباحثہ کا متقاضی ہے۔ کیونکہ انسانی سوسائٹی کے سیاسی اور تمدنی ارتقاء نے بیسیوں ایسے مسائل کھڑے کر دیے ہیں جن کا حل قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے گہرے مطالعہ اور تجزیہ و تنقیح کے بعد علمی مباحثہ کی صورت میں ہی سامنے لایا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں ممتاز افغان عالم دین مولانا عبد الباقی حقانی دامت فیوضہم کی ایک ضخیم کتاب سامنے آئی ہے جس نے تشنگی کے اس احساس کو خاصا کم کر دیا ہے۔ مولانا عبد الباقی حقانی امارت اسلامی افغانستان میں طالبان حکومت کے اہم عہدہ دار رہے ہیں اور اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب عربی زبان میں ”السیاسۃ والادارۃ فی الاسلام“ کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا سید الأمین انور حقانی اور مولانا شکیل احمد حقانی نے کیا ہے اور مجموعی طور پر کم و بیش سترہ سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ادارہ مؤتمر المصنفین نے شائع کی ہے۔

مولانا عبد الباقی حقانی اس کتاب کی تصنیف کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ایک مقصد یہ تحریر کرتے ہیں کہ

> ”اسلامی حکومت کی بناوٹ (تشکیل) اور چلانے کیلئے قانون کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے حالات کے مطابق حکومت کے بنانے اور چلانے کیلئے طریقہ اور دستور بنائیں۔ خصوصاً ان بھائیوں کیلئے جنہوں نے افغانستان میں عرصہ دراز کے خلاء کے بعد واقعی اسلامی حکومت چلانے کا عزم کیا ہے اور ان حضرات کا ارادہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدینؓ کا طریق کار اپنائیں جو کہ کامیابی اور سعادت کا ذریعہ ہے اور اگر حقیقت میں اسلامی نظام کی حاکمیت کیلئے مجاہدہ کرنے والے یہ طریقۂ کار اپنائیں تو ان شاء اللہ فتح اور کامیابی کا ذریعہ ہوگا۔“

اس کتاب کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے مصنف قرآن و سنت، تاریخ خلفاء راشدینؓ اور فقہ اسلامی کے عظیم ذخیرے پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت کے ایک اہم عہدہ دار کے طور پر ان مشکلات و تجربات سے بھی گزرے ہیں جو آج کے دور میں نفاذ اسلام کے سلسلہ میں کسی بھی حکومت کو پیش آسکتے ہیں۔

کتاب میں اسلامی حکومت کے قیام کی صورتوں، اس کے عملی ڈھانچے اور مختلف شعبوں کی تشکیل اور حکمرانوں کیلئے ضروری اوصاف و شرائط کی وضاحت کے علاوہ ایک رفاہی ریاست کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور فاضل مصنف نے آیات و احادیث، تاریخی واقعات اور فقہی جزئیات کا ایک وسیع خزانہ اس میں جمع کر دیا ہے جو اسلامی نظام کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے والوں کیلئے ضروری بنیادی مواد فراہم کر دیتا ہے اور اس سے اس علمی کاوش کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ نظام اسلام کے خد و خال کو جدید دور کے تناظر میں واضح کرنے کے جس کام کا آغاز ۱۳۵۰ھ میں کابل سے ہوا تھا اس میں یہ وقیع پیش رفت بھی پون صدی کے بعد کابل ہی کے حوالے سے سامنے آئی ہے جو نیک فال ہونے کے علاوہ بہتر مستقبل کی نوید بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب ہر دینی مدرسہ کی لائبریری میں موجود ہونی چاہیے اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کرنے والے ہر عالم دین اور کارکن کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں ملک کی رائے عامہ کو یہ بتا سکے کہ اسلامی نظام کے فوائد و ثمرات سوسائٹی کو کیا حاصل ہوں گے اور جب اسلامی نظام آئے گا تو ملک کے نظام و معاملات میں کیا تبدیلی آئے گی۔ بلکہ ہم اگر دینی مدارس کے اساتذہ کو آمادہ کر سکیں کہ وہ قرآن کریم کے سیاسی احکام و قوانین سے متعلقہ آیات اور خلافت و امارت اور عدل و قضا کے حوالے سے احادیث نبویہؐ کی تدریس میں اس کتاب کو اپنے مطالعہ کیلئے لازم کر لیں تو یہ ایک بڑی تعلیمی خدمت ہوگی۔

ہم مولانا عبد الباقی حقانی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اسلامی نظام حکومت و سیاست کے بارے میں اتنا وسیع علمی ذخیرہ مرتب کر کے ہم طلبہ کیلئے غور و خوض اور بحث و مکالمہ کا کھلا میدان پیش کر دیا ہے۔ لیکن کیا ہم میں غور و خوض کی سکت اور بحث و مکالمہ کا حوصلہ کسی درجے میں باقی بھی رہ گیا ہے؟

موجودہ صورتحال اور افغان طالبان کا موقف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۱۴ء

امارتِ اسلامی افغانستان کی اعلیٰ سطحی قیادت ان دنوں پاکستان کے سرکردہ علماء کرام اور دینی راہ نماؤں کو اپنے موقف اور پالیسیوں کے حوالے سے بریف کرنے کیلئے ان سے رابطوں میں مصروف ہے جو ایک خوشگوار امر ہے اور اس کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ افغان طالبان کے بارے میں عالمی اور علاقائی میڈیا طرح طرح کی خبروں اور تبصروں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے جو عموماً منفی اور کردار کشی پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ خود افغان طالبان کا میڈیا محاذ اس حوالے سے بہت کمزور ہے اور ان کے پاس اس کے وسائل بھی نظر نہیں آتے۔ اس خلا کو کسی حد تک باہمی رابطوں اور میل جول سے پر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے امارت اسلامی افغانستان کی اس تازہ مہم سے ہمیں اطمینان حاصل ہوا ہے اور ہم اس کے جاری رہنے کی امید رکھتے ہیں۔

امارت اسلامی افغانستان کے چند سینیئر راہ نماؤں کے ساتھ ان رابطوں کے دوران راقم الحروف کو بھی گفتگو کا موقع ملا ہے جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

افغان راہ نماؤں کا کہنا ہے کہ انہوں نے بیرونی عسکری جارحیت کے خلاف جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اس کا اعتراف اب عالمی سطح پر بھی ہونے لگا ہے اور یہ رائے عام ہوتی جا رہی ہے کہ نیٹو اتحاد افغانستان میں طالبان کے خلاف اس جنگ میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکا اور اب وہ باعزت واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی مبالغہ نہیں ہے لیکن اب امارت اسلامیہ افغانستان کو ڈپلومیسی اور میڈیا کے محاذ پر جن

مشکلات کا سامنا ہے اس کیلئے پاکستان کے دینی حلقوں کی توجہ اور سرپرستی ضروری ہے۔ مثلاً وسائل کی کمی ان کیلئے اپنی پوزیشن کی وضاحت اور بہی خواہوں کے ساتھ رابطوں میں بڑی رکاوٹ ہے۔ خصوصًا میڈیا کے شعبہ میں غلط پروپیگنڈے کا جواب جس قدر زیادہ ضروری محسوس ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔

ڈپلومیسی کے محاذ پر ان کا کہنا ہے کہ اب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ جانے سے پہلے کسی نہ کسی طرح حامد کرزئی کو افغانستان کے ایک جائز حکمران کے طور پر تسلیم کرا لیا جائے۔ اس کیلئے لوئی جرگہ اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی دینی قیادت کی اہم شخصیات کو مصالحت کے نام پر حامد کرزئی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بٹھا کر کٹھ پتلی حکومت کے امیج کو بہتر بنانے کی کوشش ہو رہی ہیں جو حامد کرزئی کو جائز حکمران کی حیثیت دینے کی چال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ گذشتہ سال کابل میں علماء کرام کی ایک بین الاقوامی کانفرنس اسی مقصد کیلئے منعقد ہوئی تھی جس میں شرکت سے انکار کر کے پاکستان کے سرکردہ علماء کرام نے اس چال کو ناکام بنا دیا تھا۔ اب پھر اسی طرح کا جال پھیلایا جا رہا ہے، اس لیے امارت اسلامی افغانستان کی علماء کرام سے یہ اپیل ہے کہ وہ اس سے ہوشیار رہیں۔ طالبان راہ نماؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ افغان طالبان نے یہ جنگ مظلوموں کے سب سے بڑے ہتھیار "فدائی حملہ" کے ذریعے لڑی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس ہتھیار کی علی الاطلاق مخالفت اور اسے مطلقًا حرام قرار دینے کے فتوے پر ان کے تحفظات ہیں اور وہ اس میں اپنا نقصان محسوس کر رہے ہیں۔

اسی دوران طالبان راہ نماؤں کی طرف سے ایک مفصل تحریری موقف تقسیم کیا گیا ہے جس کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ کالم کا دامن تنگ ہونے کی وجہ سے اس کا صرف ایک حصہ ہم اس میں پیش کر رہے ہیں، مگر اس سے قبل میں اپنی گفتگو کا مختصر خلاصہ بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

راقم الحروف نے عرض کیا کہ جہاں تک افغانستان میں ہونے والے جہاد کا تعلق ہے ہم اسے افغانستان کی قومی آزادی کی جنگ اور شرعی جہاد سمجھتے ہیں۔ روسی استعمار کے خلاف ان کی جنگ بھی شرعی جہاد تھا اور امریکی استعمار کی عسکری یلغار کے خلاف ان کی مزاحمت اور جنگ بھی شرعی جہاد ہے۔ اسی طرح امارت اسلامی افغانستان نے اپنے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں خلفاء راشدینؓ کی روایات کو جس طرح زندہ کیا ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا میں نفاذِ اسلام کے نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے اور ہم اس کی کامیابی کیلئے پر خلوص خواہش کے ساتھ دعا گو بھی ہیں۔

حامد کرزئی کو ہم افغانستان کا جائز حکمران تصور نہیں کرتے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ غیر ملکی فوجوں کے مکمل انخلاء کے بعد افغان عوام اپنی آزادانہ رائے کے ساتھ جو حکومت قائم کریں گے وہی جائز حکومت ہوگی، اس لیے حامد کرزئی یا اس کے نمائندوں کے ساتھ ان معاملات میں کسی بھی درجہ کی یک طرفہ شرکت غیر اصولی بات ہوگی۔

فدائی حملوں کے بارے میں ہمارا شروع سے یہ موقف ہے جس کا ہم کئی بار اظہار کر چکے ہیں کہ یہ مظلوم اور بے بس قوموں کا آخری جنگی ہتھیار ہوتا ہے جو ہر دور میں استعمال ہوتا آ رہا ہے اور آج بھی بے بس مظلوموں کیلئے یہ آخری ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کسی بھی شرعی جہاد یا جائز جنگ میں اس کے استعمال پر ہمیں کوئی اشکال نہیں ہے۔ البتہ پاکستان کے مختلف حصوں میں عام آبادیوں، مساجد، امام بارگاہوں، گرجا گھروں اور مارکیٹوں میں ان خودکش حملوں

کے ذریعے جو تباہی پھیلائی جارہی ہے، اسے ہم شرعاً درست نہیں سمجھتے اور یہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہیں۔ اس لیے پاکستان کا امن و استحکام صرف پاکستانیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اسلام اور عالم اسلام کے بھی مفاد میں ہے اور اس میں بدامنی کا فروغ ملتِ اسلامیہ کیلئے باعث نقصان ہے۔ ہم ان حملوں کے بارے میں واضح تحفظات رکھتے ہیں اور جائز فدائی حملوں اور ناجائز خودکش حملوں کے درمیان فرق قائم رکھنے اور اسے واضح کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کے اندر ہونے والی اس قسم کی کاروائیوں میں افغان طالبان کا کسی درجہ میں بھی کوئی حصہ نہیں ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ امارت اسلامی افغانستان ایسی کاروائیوں کی کسی طرح بھی حمایت نہیں کر رہی، لیکن میڈیا کے یک طرفہ پراپیگنڈے کی وجہ سے اور ناموں کی مشابہت کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پھیلتی جارہی ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے اس فرق کو واضح کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں امارت اسلامی افغانستان کے تحریری موقف میں جو وضاحت کی گئی ہے وہ اطمینان بخش اور خوش آئند ہے، قارئین کرام اسے بھی ملاحظہ فرمالیں:

”آخر میں امارت اسلامیہ کی پالیسی اور طریقہ کار سے اچھی طرح آگاہ کرنے کیلئے یہ چند وضاحتیں ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے پاس کام کے طریقہ کار کیلئے جید علماء کی جانب سے تائید شدہ مرتب اصول اور لائحہ عمل موجود ہے۔ ہر طرح کے مسائل میں تجربہ کار شیوخ اور علماء کرام سے فتوے طلب کیے جاتے ہیں۔ آپس کے مشورے اور اطاعت کے جذبے سے ہر کام انجام دیا جاتا ہے۔ ہمارے فیصلے ہمارے جذبات کے نہیں اصولوں کے تابع ہیں۔ ہم دشمنوں کی سازشوں کی طرف متوجہ ہیں۔ دنیا کے حالات سے خود کو باخبر رکھتے ہیں۔ داخلی و خارجی سیاست میں امور کے بہتر نظم و ضبط کیلئے الگ الگ کمیٹیاں متعیّن کی گئی ہیں۔ ایک دوسرے کے کاموں میں بے جا مداخلت نہیں کی جاتی۔ اپنی بساط کے مطابق ہم نے کوشش کی ہے کہ کام اہل کار افراد کے سپرد کیا جائے۔ علماء کرام اور صاحب نظر لوگوں کے مشورے اور نقطہ ہائے نظر بڑی وسعت قلبی اور دل کی خوشی سے سنتے اور ضرورت کے وقت ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ہمارے طریقۂ کار میں ہر معاملے میں بلاضروری اور بے وقت دست اندازی اور لوگوں کو بے جا تنگ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نہ کسی کو دھمکانے اور نہ تاوان کی غرض سے لوگوں کو اغوا کرنے کو قانونی سمجھتے ہیں۔ اور نہ شک کی بناء پر کسی کے جان و مال کی جانب دست درازی کو جائز سمجھتے ہیں۔ مجاہد کے نام پر بھتہ خوری مجاہد کی شان نہیں سمجھتے۔ بے گناہ انسانوں کا قتل، کثیر آبادی اور مقدس مقامات پر ہدف کی تعیین کے بغیر حملے ہمارا کام نہیں اور نہ ہم کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ عزت، ذلت، کامیابی اور ناکامی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ اس وقت شامل ہوگی جب ہم اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں گے۔ اور اس کے

احکام پر عمل کریں گے۔ اللہ کی مخلوق کو اذیت نہ دیں۔ لہٰذا تمام علماء کرام، صاحب نظر لوگوں اور اہل خیر سے ہماری توقع ہے کہ کچھ خود سر یا دشمن کے انٹیلی جنس اداروں کے پنجوں میں جکڑے ہوئے نام نہاد مجاہدین کی نازیبا حرکتوں کو امارت اسلامیہ کی جانب منسوب نہ کریں۔ تمام وہ اعمال جو شریعت کے اصولوں سے متصادم ہیں ہماری جانب سے اس کی تردید کی جاتی ہے اور اگر ہماری صف میں کوئی ایسا کرے گا تو اسے شرعی سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ ہمارے مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے ان ناپاک امراض سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ایسے نامناسب اور ناجائز امور کی انجام دہی کے بعد اگر کوئی شخص اپنی نسبت امارت اسلامیہ کی جانب کرتا ہے یا محترم امیر المومنین کو اپنا قائد کہتا ہے تو یہ محض نام کا ناجائز استعمال ہے۔ ایسے لوگ امارت اسلامیہ کے مبارک نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو لوگ امارت اسلامیہ سے مربوط ہوتے ہیں وہ امارت اسلامیہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ اور امارت اسلامیہ کی پالیسی یہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے۔ اگر کوئی اس سے سرتابی کرتا ہے تو اس کا امارت اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی امارت اسلامیہ ایسے شخص کو مجاہد کہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم اور آپ کو تمام بے اطاعت، جاہ طلب اور نااہل لوگوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔" (۳۰ دسمبر ۲۰۱۳ء)

دہشت گردی کے خلاف قومی مہم

روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۲۴ جولائی ۲۰۱۴ء

طبیب کسی بھی طریق علاج سے تعلق رکھتا ہو، مریض کا علاج شروع کرنے سے پہلے دو باتیں ضرور چیک کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اسے بیماری کیا ہے اور دوسری یہ کہ اس بیماری کا سبب کیا ہے۔ بیماری اور اس کے سبب کا تعین کیے بغیر کوئی معالج کسی مریض کے علاج کا آغاز نہیں کرتا۔ پھر وہ صرف بیماری کا علاج نہیں کرتا بلکہ سبب کے سدّباب کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ بسا اوقات سبب سے پیچھا چھڑانے کو بیماری کے علاج سے بھی مقدم کرتا ہے، اس لیے کہ جب تک سبب کا خاتمہ نہ ہو کسی بیماری کے علاج کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو پاتی۔

ہم اس وقت قومی سطح پر دہشت گردی کے سدّباب کی جس مہم میں مصروف ہیں اس میں بھی علاج کے اس مسلّمہ اصول اور طریق کار کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جو کہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اور اس سے اصحاب فکر و دانش کی تشویش مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حدود میں حکومت کی رٹ کا قائم ہونا اور دستور کی بالادستی کو تسلیم کیا جانا ہر لحاظ سے ضروری اور ناگزیر ہے۔ اور کسی بھی دینی یا سیاسی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا ملکی سالمیت، قومی وحدت اور ملّی تقاضوں کے منافی ہے۔ افواج پاکستان دستور کی بالادستی اور حکومتی رٹ کیلئے جو کاروائی جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ شمالی وزیرستان میں آپریشن سے متاثرہ بے گھر شہریوں کی دیکھ بھال اور امداد کیلئے قوم کے مختلف اداروں اور طبقات

کی جو سرگرمیاں جاری ہیں، پوری قوم ان کے ساتھ ہے اور اس مشن کی کامیابی کیلئے دعاگو ہے۔ لیکن معاملات کو اس سطح تک لے جانے والے اسباب و عوامل کی طرف کسی ادارے یا طبقے کی کوئی توجہ نظر نہیں آ رہی جو تشویشناک امر ہے اور اہل فکر و نظر سے سنجیدگی اختیار کرنے کا تقاضہ کر رہی ہے۔

بلاشبہ دہشت گردی ایک کینسر ہے جو پورے قومی وجود میں سرایت کرتا جا رہا ہے اور بدقسمتی سے کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور سمیت ملک کے اہم مراکز اس کی زد میں ہیں۔ مگر ہمارے قومی پالیسی سازوں نے قومی جسم کے کینسر زدہ اعضا کو کاٹتے چلے جانے کی پالیسی کے ساتھ کینسر کا سبب بننے والے عوامل کے سدباب کو ابھی تک اپنی پالیسی میں شامل نہیں کیا۔ اس لیے ہم اس قومی کینسر کے علاج کی ریاستی پالیسی کی حمایت کرنے کے باوجود یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت اور دیگر پالیسی ساز اداروں سے گزارش کریں کہ اسباب و عوامل کا سدباب کیے بغیر کینسر کا علاج کینسر زدہ اعضا کو کاٹتے چلے جانے کی صورت میں مسلسل جاری رکھنے کے نتائج پر ضرور غور کر لیا جائے اور اس سلسلے میں پالیسی ترجیحات کا ایک بار پھر جائزہ لے لیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کے شمال مغربی علاقوں سوات، جنوبی وزیرستان اور شمالی وزیرستان وغیرہ میں حکومتی رٹ کو چیلنج اور اس کے جواب میں فوجی آپریشن کے اسباب پر غور کیا جائے تو دو سبب سب سے بڑے اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہادِ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ میں شریک ہونے والے ہزاروں ملکی اور غیر ملکی افراد کو جنگ ختم ہونے کے بعد اپنا ایجنڈا طے کرنے میں آزاد چھوڑ دیا گیا اور کسی قومی پالیسی کا انہیں حصہ نہیں بنایا گیا، جس کی وجہ سے ہر گروہ نے اپنا ایجنڈا خود طے کیا اور آج پوری قوم اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ سوویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد میں جو لوگ شریک ہوئے وہ پاکستانی شہری ہوں یا بیرون ممالک سے آئے ہوں، ان کی آمد اور جہاد میں شرکت خود ہماری ریاستی پالیسی کا حصہ تھی۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں کو جہاد کی تربیت دینے اور اس میں عملاً شریک کرنے کے عمل کے ہر مرحلہ میں ہم ان کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے بعد اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا کہ ہزاروں لوگوں نے ہمارے ذریعہ ہتھیاروں کی ٹریننگ حاصل کی ہے اور انہیں ہتھیاروں تک رسائی بھی میسر ہے۔ اس لیے ان کے مستقبل کے پروگرام اور ایجنڈے میں ان کی راہ نمائی اور نگرانی کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کے چند ہزار مسلح حروں کو تو حکمت عملی کے تحت قومی نظم کا حصہ بنا لیا گیا تھا، لیکن جہاد افغانستان کے بعد ان سے کم از کم دس گنا زیادہ مسلح افراد کے بارے میں کوئی قومی پالیسی طے نہیں کی گئی اور انہیں اس طرح آزاد چھوڑ دیا گیا کہ آج وہ حکومتی رٹ اور دستوری بالادستی کیلئے خطرہ بن گئے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بہرحال کرنا ہوگا اور اس کی روشنی میں اس خطرے سے نمٹنے کی حکمت عملی اور ترجیحات طے کرنا ہوں گی۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے تو ایک موقع پر یہ اعتراف کیا تھا کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد مجاہدین کے گروپوں کو نظر انداز کرنا ہماری غلطی تھی، مگر ہماری قومی قیادت ابھی اس کیلئے تیار دکھائی نہیں دیتی۔ جبکہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر قومی پالیسی کی تشکیل کے بغیر اس مسئلہ کے پائیدار حل کی کوئی صورت کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسرا سبب ہمارے نزدیک نفاذِ شریعت کے اہم قومی تقاضے کو مسلسل نظر انداز کرتے چلے جانا ہے۔ حالانکہ اس مسئلہ میں اصولی طور پر کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔ دستور پاکستان نفاذِ شریعت کی بات کرتا ہے۔ ہماری قومی سیاسی جماعتوں کے انتخابی منشوروں میں اسلامی احکام و تعلیمات کی عملداری کی بات موجود ہے۔ جبکہ ریاستوں کو پاکستان کا باقاعدہ حصہ بناتے وقت اور اس کے بعد مختلف تحریکات کے ساتھ کیے جانے والے معاہدات میں اس کا باقاعدہ وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی عملی صورت سامنے نہیں آرہی۔ اس حوالے سے ایک عذر یہ کیا جاتا ہے کہ نفاذ شریعت کیلئے طالبان کا وژن ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بات درست ہوتی اگر ہم نے دستور میں طے شدہ طریق کار کے مطابق نفاذ شریعت کی طرف پیشرفت کی ہوتی اور منتخب پارلیمنٹ اور دستوری عدلیہ کے فیصلوں پر عملدرآمد کا کچھ نہ کچھ اہتمام کرلیا ہوتا۔ اس صورت میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ پاکستانی قوم کے جمہوری وژن کے مطابق ہم نے نفاذ اسلام کیلئے یہ اقدامات کررکھے ہیں، اس لیے اس کے برعکس کسی وژن کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ نفاذِ اسلام کیلئے پارلیمنٹ کے فیصلوں، دستور کے تقاضوں اور عدالت عظمیٰ کی واضح ہدایات کے باوجود کوئی عملی پیشرفت موجود نہیں ہے۔ مگر نفاذِ شریعت کے مطالبات کو ہم "طالبان کا وژن" قرار دے کر مسترد کرتے چلے جارہے ہیں، یہ بات نہ قرین انصاف ہے اور نہ ہی عقل و دانش اس کا کوئی جواز فراہم کرتی ہے۔

آج بھی نفاذِ شریعت کے حوالے سے طالبان کے مبینہ وژن کو روکنے کا راستہ یہی ہے کہ دستور و پارلیمنٹ نے ملک میں نفاذِ اسلام کیلئے جو فیصلے کر رکھے ہیں ان پر عملدرآمد کا اہتمام کیا جائے۔ اور طالبان کے ساتھ ساتھ پوری قوم کو یہ واضح پیغام دیا جائے کہ دستور و قانون اور عدلیہ و پارلیمنٹ کے فیصلوں کے مطابق نفاذِ اسلام کیلئے عملی اقدامات کا آغاز کیا جارہا ہے۔ اور یہ آغاز عملاً دکھائی بھی دے۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ دستور کے مطابق نفاذ اسلام کو قومی پالیسی کا عملی حصہ بنانے کے اعلان سے ہی نفاذ شریعت کے کسی متبادل وژن کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔

ہم دستور کی بالادستی اور حکومت رٹ کی بحالی کیلئے حکومت اور افواج پاکستان کے ساتھ ہیں اور شمالی وزیرستان سے بے گھر ہونے والے لاکھوں افراد کی بحالی اور دیکھ بھال کیلئے ریاستی اداروں اور قوم کے مختلف طبقات کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ مگر یہ درخواست کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کینسر کا علاج کرتے ہوئے کینسر کے اسباب کے سدّباب اور روک تھام کی بھی کوئی صورت نکالی جائے۔ ورنہ کینسر کا شکار ہونے والے ایک کے بعد دوسرے عضو کو کاٹتے چلے جانے کا آخری نتیجہ بہرحال ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

آج کے مسلم نوجوان کا مقدمہ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۰ ستمبر ۲۰۱۴ء

میری اس گزارش پر بعض دوستوں کو الجھن ہوتی ہے کہ کسی کے بارے میں یک طرفہ بات نہیں کرنی چاہیے اور اگر کسی فرد یا گروہ کے بارے میں کوئی شکایت یا اعتراض ہو تو اس سے بھی پوچھ لینا چاہیے کہ تمہارا موقف کیا ہے؟ اس کا

موقف از خود طے کرنے کی بجائے اس سے دریافت کرنا چاہیے اور اگر وہ کوئی وضاحت پیش کرے تو اسے یکسر مسترد کر دینے کی بجائے اس کا سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے ساتھ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے یہ معاملہ جاری ہے کہ اکابر علماء دیوبند پر گستاخ رسولؐ ہونے کا الزام مسلسل دہرایا جا رہا ہے۔ عبارات پیش کی جارہی ہیں اور فتوؤں پر فتوے جاری ہو رہے ہیں۔ مگر اس حوالے سے خود ان اصحاب عبارات نے جو تحریری وضاحتیں پیش کی ہیں اور اکابر علماء دیوبند نے متنازعہ مسائل پر جو موقف بیان کیا ہے، اسے قبول نہیں کیا جارہا اور یہ کہا جا رہا ہے کہ علماء دیوبند کا موقف وہ نہیں ہے جو وہ خود بیان کرتے ہیں، بلکہ وہ ہے جو معترضین نے ان کی عبارات سے سمجھ رکھا ہے۔

اس تناظر میں آج کا ایک اہم مقدمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو رفتہ رفتہ دنیا کا سب سے بڑا مقدمہ بنتا جا رہا ہے، اور وہ ہے اس نوجوان کا مقدمہ جو خود کو مجاہد کہتا ہے لیکن دنیا نے اسے دہشت گردی کا ٹائٹل دے رکھا ہے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے دنیا میں ہر طرف نہ صرف طاقت کا بے دریغ استعمال ہو رہا ہے بلکہ عالمی سطح پر متحدہ محاذ قائم کر کے یہ عزم ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کو دنیا میں کہیں بھی زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جائے گا۔

آج جی چاہتا ہے کہ اس مجاہد یا دہشت گرد کا مقدمہ خود اس کی زبان میں پیش کروں، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اسے اپنی پوزیشن واضح کرنے یا اپنا موقف اور جذبات پیش کرنے کیلئے ابلاغ اور لابنگ کا کوئی فورم میسر نہیں ہے اور میڈیا کے تمام مؤثر ذرائع کے دروازے اس کیلئے شجر ممنوعہ کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ البتہ یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقف سے یا اس میں سے کسی بات سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ میں اپنا موقف متعدّد تحریروں میں بیان کر چکا ہوں اور ضرورت محسوس ہونے پر پھر بھی کسی موقع پر بیان کر سکتا ہوں۔ اس لیے آج صرف اس نوجوان کی بات کرنا چاہتا ہوں جو ہتھیار بکف ہے اور اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی، اسلام کے غلبہ، کفر و طاغوت کے خاتمہ اور قرآن و سنت کی روشنی میں عدل و انصاف کے قیام کیلئے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے دنیا کے مختلف محاذوں پر صف آرا ہے۔ وہ فلسطین میں بھی ہے، عراق و شام میں بھی ہے، افغانستان میں بھی ہے، کشمیر میں بھی ہے، نائجیریا اور صومالیہ میں بھی ہے، شیشان و ترکستان میں بھی ہے، اور فلپائن و اراکان میں بھی ہے۔ اسے مجاہد کی فریاد کا عنوان دیں یا دہشت گرد کا مقدمہ کہہ لیں آپ کی مرضی ہے۔ لیکن اس کی بات ضرور سنیں اور اس پر غور بھی کریں کہ جس صورت حال سے وہ دوچار ہے اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں اور وہ کون سے حالات ہیں جنہوں نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ:

- میں ایک مسلمان ہوں اور قرآن و سنت پر ایمان رکھتا ہوں۔ مجھے قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و فرامین کی عملداری قائم ہونی چاہیے اور ایک مسلمان حکومت کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میں قرآن و حدیث کو کسی دینی مدرسہ میں پڑھوں، کالج اور یونیورسٹی میں اس کی سہولت میسر آجائے، یا قرآن و سنت کی تعلیمات تک رسائی کا کوئی اور ذریعہ مل جائے، احکام و قوانین اور نظام کے حوالے سے قرآن و سنت کی تصریحات میں مجھے

کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور دنیا میں کہیں بھی چلا جاؤں ان کے معنی و مفہوم میں یکسانیت ہی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب عملاً دیکھتا ہوں تو مجھے یہ عملداری کسی مسلمان معاشرے میں نظر نہیں آتی اور کوئی مسلمان حکومت اس کیلئے تیار دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ مسلمان حکومتیں اس وجہ سے اس کیلئے تیار نہیں ہیں کہ آج کا عالمی نظام ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور مروجہ بین الاقوامی سسٹم اور معاہدات میں اس کی گنجائش موجود نہیں ہے۔

- میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک میں عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ان کی اکثریت اپنے وطن کیلئے جس نظام کو پسند کرے اور جن احکام و قوانین کو نافذ کرنا چاہے، انہیں اس کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی مسلمان ملک کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جا رہا کہ اس کے عوام کی اکثریت خود اپنے ملک میں اپنے دین و مذہب کے احکام و قوانین کا نفاذ کر سکے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ الجزائر اور مصر میں عوام کے اکثریتی فیصلوں کو مسترد کر کے ان پر آمریت مسلط کر دی گئی ہے اور پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے نفاذ اسلام کا دستوری حق حاصل کرنے کے باوجود اس سے محروم ہے، بلکہ سیکولر عالمی فورمز پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کے طے کردہ اس دستور کو ختم کرانے کے درپے ہیں۔
- یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دو مسلمان ملکوں انڈونیشیا اور سوڈان کی تقسیم ہوئی ہے اور غیر مسلم مسیحی آبادی کو اکثریتی مسلم آبادی سے الگ کرنے کیلئے اقوامِ متحدہ کے ذریعے ریفرنڈم کروا کر ان کی الگ ریاستیں قائم کر دی گئی ہیں، لیکن کشمیر میں اقوامِ متحدہ کے باضابطہ فیصلہ کے باوجود اس ریفرنڈم سے عمداً گریز کیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں بین الاقوامی معاہدات اور جنرل اسمبلی کی قراردادیں عالمی استعمار کے سامنے بے بسی کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔
- فلسطین میں وہاں کی قدیمی آبادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے میں اسے نہیں بھول سکتا۔ اسرائیل گذشتہ نصف صدی سے امریکہ اور یورپ کی سرپرستی بلکہ پشت پناہی سے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم وستم کا جو بازار گرم رکھے ہوئے ہے، اس سے عالمی امن کے چودھریوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اور خاموشی کے ساتھ یہ انتظار جاری ہے کہ آہستہ آہستہ فلسطینیوں کی قوت مزاحمت بلکہ ان کا وجود بھی ختم ہو جائے تاکہ پورے مشرق وسطیٰ پر اسرائیل کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور مسلمانوں کے قبلہ اول مسجد اقصیٰ کے بارے میں عالمی استعمار کے ایجنڈے کو مکمل کرنے کی راہ ہموار ہو۔
- مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ فلسطین ہزاروں سال قبل یہودیوں کا وطن تھا اس لیے اس زمین پر ان کا حق ہے، لیکن کوئی یہ بتانے کیلئے تیار نہیں ہے کہ اندلس پر مسلمانوں نے کئی صدیاں حکومت کی ہے، وہاں ان کا حق کیوں نہیں ہے۔ اور بنگلہ دیش کے پڑوس میں اراکان پر صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، آج بھی اس

پٹی میں مسلم آبادی اکثریت میں ہے، لیکن انہیں وہاں کا باشندہ تسلیم نہیں کیا جارہا، اور انہیں بے وطن کرنے کیلئے قتل وغارت اور ریاستی دہشت گردی کا عذاب ان پر مسلط کیا گیا ہے، اس پر اقوامِ متحدہ زبان جمع خرچ سے آگے کیوں نہیں بڑھ رہی؟

- افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس میں میری شرکت کو سراہا گیا۔ مجھے مجاہد قرار دیا گیا، میری حمایت و امداد کیلئے پوری دنیا ایک طرف ہوگئی اور مجھے حریت پسند اور فریڈم فائٹر کے خطابات سے نوازا گیا، لیکن میں نے اسی افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد اور تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو مجھے دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے اور میں دنیا کا سب سے بڑا مجرم قرار پا گیا ہوں۔
- مجھے بتایا گیا کہ افغانستان میں روسی افواج کی آمد جارحیت تھی اور اس کے خلاف مسلح مزاحمت جہاد تھا۔ لیکن مشرق وسطیٰ میں، تیل کے چشموں پر اور اسرائیل کے جبر و تشدد کے تحفظ و دفاع میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجوں کی موجودگی جارحیت کیوں نہیں ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دیا جارہا، صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ فوجیں اس خطہ کی حکومتوں کی دعوت پر آئی ہیں، جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ افغانستان میں روسی افواج کی آمد بھی اس وقت کے افغان حکمران حفیظ اللہ امین کی باقاعدہ دعوت پر معاہدہ کے تحت ہوئی تھی۔
- مجھے یہ کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی نظام کے خلاف ہتھیار اٹھانا جرم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان حکومتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے، لیکن اس سوال کا کوئی بھی جواب نہیں دے رہا کہ بین الاقوامی نظام یک طرفہ جارحیت کا سب سے بڑا ہتھیار بن جائے تو پھر بے بس اور مظلوم قوموں کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کیا چارۂ کار باقی رہ جاتا ہے؟ اور اس عقدہ کا حل بھی کوئی پیش نہیں کر رہا کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کو طاقت کے زور پر مسترد کر دیا جائے تو وہ عوام اپنے فیصلوں کی بحالی کیلئے کیا راستہ اختیار کریں؟
- میرا عقیدہ ہے اور صرف میرا عقیدہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام فقہی مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کا قیام ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی دینی فریضہ ہے، جبکہ عملی صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں اسلامی خلافت یا امارت کے قیام کو برداشت نہیں کیا جارہا۔ بلکہ اوباما اور ٹونی بلیئر جیسے عالمی لیڈر برملا کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو خلافت قائم نہیں کرنے دیں گے۔
- میرا مقدمہ سادہ سا ہے کہ:

1. مسلمان ممالک میں غیر ملکی مداخلت کا سلسلہ بند کر کے ان کے عوام کو اپنے نظام و قوانین کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے اور ان کے اجتماعی فیصلوں کو مسترد کرنے کا مکروہ سلسلہ ختم کیا جائے۔

2. عالمی لیڈر اور حکومتیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف بین الاقوامی معاہدات کی آڑ میں محاذ آرائی ختم کر کے مسلمانوں کے دین اور ثقافت کا احترام کریں اور طاقت کے زور پر مسلم ممالک میں مغربی فلسفہ و تہذیب کو مسلط کرنے سے باز آجائیں۔
3. فلسطین، کشمیر، اراکان اور دیگر ایسے مظلوم خطوں کے مسلمانوں کو ان کے مسلمہ حقوق دلوانے کا اہتمام کیا جائے اور منافقت کا سلسلہ ترک کر کے انہیں عملاً انصاف مہیا کیا جائے۔
4. عراق اور افغانستان سے غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں اور مشرق وسطیٰ کے عوام و ممالک کو آپس میں لڑانے کی مذموم اور شرمناک سازش سے باز رہا جائے۔
5. مسلمان حکومتیں مغربی استعمار کی کاسہ لیسی ترک کر کے ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر اور جذبات کے مطابق اپنی خود مختاری بحال کریں اور ملی حمیت و غیرت کا مظاہرہ کریں۔
6. خلافت اسلامیہ کا قیام ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی دینی فریضہ ہے ور اس وقت پوری امت اس شرعی فریضہ کی تارک اور گنہ گار ہے۔ اس پر توبہ و استغفار کا اہتمام کیا جائے اور خلافت اسلامیہ کے عملی قیام کی طرف موجودہ حالات کی روشنی میں پیش رفت کی جائے۔

مسلمان حکومتیں اور سیاسی قیادتیں اگر اس ایجنڈے پر سنجیدہ ہو جائیں اور عملاً بھی کچھ کریں تو مجھے ہتھیار اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اگر مسلمان حکومتیں بھی کچھ نہ کریں، مسلم ممالک کے عوام کے جمہوری فیصلوں کو بھی قوت کے بل پر سبوتاژ کیا جاتا رہے، اسلام اور اسلامی عقائد و روایات کے خلاف ثقافتی یلغار بھی دن بدن بڑھتی رہے، اور مسلمانوں کی سیاسی قیادتیں بھی "اسٹیٹس کو" پر قناعت کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں، تو پھر مجھے بتایا جائے کہ کیا میں بھی اس موقف اور ایجنڈے سے دست بردار ہو جاؤں؟؟؟

کل کے مجاہد، آج کے دہشت گرد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۴ء

امریکہ بہادر نے مولانا فضل الرحمن خلیل کو بھی دہشت گردی کی عالمی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور ان پر مختلف النوع پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اس میں اس قدر تاخیر کیوں ہوئی ہے؟ کیونکہ مولانا فضل الرحمن خلیل اپنے طالب علمی سے ہی جس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث دیکھے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے مولانا فضل الرحمن خلیل اگر مجھے اپنے ردعمل کے اظہار میں ترجمانی کا موقع دیں تو میں اس کیلئے صرف ایک شعر کے اس مصرعہ پر اکتفا کروں گا کہ

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

مولانا فضل الرحمن خلیل کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، اور اس دور سے جانتا ہوں جب وہ افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف جہاد میں شرکت کیلئے مولانا ارشاد احمد شہیدؒ، قاری سیف اللہ اختر، مولانا مسعود کشمیری شہید، اور سعادت اللہ خان کے ساتھ مل کر دینی مدارس کے طلبہ کو تیار کیا کرتے تھے۔ میں ان چاروں کو پاکستان کے دینی مدارس کے حوالے سے جہاد افغانستان کے ''السابقون الاولون'' کہا کرتا ہوں۔ پھر ان کے ساتھ کمانڈر خالد زبیر شہیدؒ، مولانا مسعود اظہر اور دوسرے حضرات بھی شامل ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ قافلہ بڑھتے بڑھتے لشکر جرار کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ مجھے مختلف اوقات میں ان سے ہر ایک کے ساتھ شریک کار ہونے کا موقع ملا ہے اور متعدّد محاذوں پر جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔

لیکن افغانستان میں روسی استعمار کی مسلح مداخلت کے خلاف مزاحمت کی یہ جنگ خود امریکہ بہادر کے نزدیک جہاد تھی، جنگ آزادی تھی، اور اس میں حصہ لینے والے ''فریڈم فائٹر'' شمار کیے جاتے تھے۔ اس لیے امریکہ اور عالمی رائے عامہ اس کی پشت پر تھی اور نہ صرف ہتھیار اٹھانا جائز تھا، بلکہ نوجوانوں کو اسلحہ کی تربیت دینا اور انہیں جنگجو بنانا بھی کار خیر تصور ہوتا تھا۔ اس لیے کسی کو کوئی پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو کوئی اعتراض یا اشکال تھا۔ بات اس وقت بگڑی جب افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد ان کی جگہ امریکی فوجیں اتریں تو ان فریڈم فائٹرز نے کہا کہ غیر ملکی فوجیں تو غیر ملکی ہی ہوتی ہیں۔ خواہ روس کی ہوں یا امریکہ کی ہوں۔ کیونکہ افغانستان نہ سوویت یونین کا حصہ تھا اور نہ ہی امریکہ کی ریاست تھا کہ ان میں سے کسی کی فوجوں کی آمد کو ملک کا داخلی مسئلہ قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے ان کے ہتھیاروں کا رخ امریکہ کی طرف مڑ گیا اور پلک جھپکتے ہی وہ ''فریڈم فائٹر'' سے ''دہشت گرد'' کے روپ میں آ گئے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف جنگ عروج پر تھی اور نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر سے مجاہدین اس میں شریک ہونے کیلئے دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ ہم بھی سیاسی اور صحافتی محاذ پر ان کی حتی الوسع سپورٹ کر رہے تھے۔ ایک موقع پر روزنامہ اوصاف اسلام آباد کے دفتر میں بائیں بازو کے دو دانش ور دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں اس بات پر بحث ہو گئی کہ پاکستان کے مولوی اور دنیا بھر سے جہاد کے نام پر آنے والے نوجوان کس کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ ہمارے عزیز ترین ساتھی مولانا اللہ وسایا قاسم شہیدؒ بھی میرے ساتھ شریک گفتگو تھے۔ ان دانش ور دوستوں کا کہنا تھا کہ مولوی صاحبان امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں اور اس جنگ کا فائدہ امریکہ کو ہو گا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ تھوڑا سا انتظار کر لیں، جنگ میں کامیابی کے بعد اس خطہ کیلئے امریکہ بہادر نے جو ایجنڈا تجویز کر رکھا ہے، اگر یہ مجاہدین اس ایجنڈے کے کسی خانے میں فٹ ہو گئے اور اس کو انہوں نے قبول کر لیا تو میں آپ کا موقف مان لوں گا کہ انہوں نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر انہوں نے امریکی ایجنڈے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بھی صف آرا ہو گئے تو آپ کو میری یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ ان مجاہدوں نے امریکی امداد و حمایت سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے لیکن امریکہ کی جنگ نہیں لڑی بلکہ اس جنگ میں ان کے اپنے اہداف ہیں جس کیلئے وہ میدان میں اترے ہیں۔

آج منظر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ہم سے یہ غلطی

ہوئی کہ ہم نے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا۔ لیکن میری گزارش ہے کہ یہ غلطی بھی جان بوجھ کر کی گئی اور کچھ عرصہ انتظار ہوتا رہا کہ کیا ان مجاہدین کو امریکہ کے ”نیو ورلڈ آرڈر“ کے کسی خانے میں ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے؟ قارئین کے ذہن میں یہ بات یقیناً ہوگی کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی امریکہ بہادر کچھ عرصہ خاموش رہا ہے جس سے یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ کہیں یہ بھی امریکہ کی کسی حکمت عملی کا حصہ تو نہیں؟ اس دوران کچھ کوششوں کو میں بھی جانتا ہوں جو افغانستان میں طالبان کی حکومت کو امریکہ کے علاقائی اور عالمی ایجنڈے میں ایڈجسٹ کرنے کیلئے کی گئیں۔ اور جب یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ یہ لوگ امریکی ایجنڈے کو قبول کرنے اور اس میں ایڈجسٹ ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں تو انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور آج اس جنگ کا دائرہ افغانستان، عراق اور شام کے علاوہ افریقہ کے ممالک تک وسیع کرنے کے باوجود ان ”دہشت گردوں“ کا دماغ ”درست“ نہیں کیا جا سکا۔ اور وہ بدستور اپنے ہی ایجنڈے پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی سرگرمیوں کا دائرہ تنگ تر کرتے چلے جانے کی پالیسی بتدریج آگے بڑھائی جا رہی ہے۔

ہمارے نزدیک افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد اسے مستحکم ہونے کیلئے کچھ وقت درکار تھا اور عالم اسلام کی دینی قوتوں کی مختلف شعبوں میں مسلسل اور بھرپور مدد اور حمایت کی ضرورت تھی، جس کا منطقی تقاضہ تھا کہ اس دوران کوئی اور محاذ نہ کھولا جائے اور تمام تر توجہات بیس کیمپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے پر مرکوز کر دی جائیں۔ ہم نے دھیمے لہجے میں یہ بات کرتے اور لکھتے بھی رہے مگر نعروں اور ترانوں کی گونج میں دھیمے لہجے کی ایسی باتیں کون سنتا ہے۔ چنانچہ بہت سے دوسرے محاذ کھولنے میں جلد بازی سے کام لیا گیا اور بیس کیمپ بھی ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ مگر اب ”اے کاش ہم ایسا نہ کرتے“ کا ورد کرنے کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟

بہرحال مولانا فضل الرحمن خلیل کو عالمی دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرنے پر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

امریکہ کی نظر میں وہ بدل گئے ہوں گے مگر ہمیں تو وہ اسی جگہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ روسی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان میں کھڑے تھے۔ اور ان کی پشت پر عالم اسلام اور امریکہ بہادر بھی کھڑا تھا۔ وہ تو وہیں کھڑے ہیں، یہ پیچھے والے خدا جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں؟

آرمی پبلک اسکول پشاور کا سانحہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۰ دسمبر ۲۰۱۴ء

۱۶ دسمبر کے سانحۂ پشاور نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور پاکستان کی سیاسی و دینی جماعتیں اپنے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دہشت گردی بلکہ درندگی کے خلاف متحد ہو گئی ہیں۔ ملک کے اخبارات اور میڈیا کے بہت سے

مراکز نے اس دن سانحہ سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے اسباب واثرات کے حوالے سے مضامین اور پروگراموں کا اہتمام کیا تھا، مگر پشاور کے اس المناک سانحہ نے قوم کے غم کو ہلکا کرنے کی بجائے ایک اور قومی سانحہ کے صدمہ سے اسے دوچار کر دیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں اس دن پشاور جارہا تھا، مغرب کے بعد گلبہار کالونی کے ایک ہال میں انجمن خدام القرآن خیبر پختون خواہ کے زیر اہتمام ''سود، یہود اور مظلوم مسلمان'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں شرکت کا ارادہ تھا۔ ظہر کے بعد پشاور روڈ راولپنڈی سے نیوخان کی ویگن پر سوار ہوا تو میرے ساتھ بیٹھے ایک محترم مسافر نے موبائل فون پر ملنے والی اس افسوس ناک خبر سے آگاہ کیا، دل رنج وغم کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ پشاور پہنچنے تک بہت سی تفصیلات مل چکی تھیں اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورا شہر صدمہ اور غم سے دوچار ہے اور کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے میزبانوں سے رابطہ کیا تو وہ بھی مضطرب اور بے چین تھے مگر انہوں نے کہا کہ آپ پشاور ضرور آئیں، آگے کی صورت حال دیکھ لیں گے۔

ویگن موٹروے سے شہر میں داخل ہوئی تو آگے جانے کے راستے بند تھے۔ ڈرائیور نے اس کی خبر دیتے ہوئے تمام مسافروں کو رنگ روڈ کے پل سے آگے ایک پٹرول پمپ پر اتار دیا۔ میرے میزبان انجمن خدام القرآن کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر محسن محبوب تھے، ان سے رابطہ مسلسل جاری تھا، وہ مجھے وصول کرنے کیلئے گاڑی لے کر نکلے مگر کوئی راستہ نہ ملا، پھر موٹر سائیکل لائے اور گلیوں اور چھوٹے راستوں میں سے گھومتے ہوئے گلبہار میں سیمینار کی جگہ تک پہنچا دیا۔ سیمینار کی صدارت تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر حافظ عاکف سعید نے کی اور اس میں ڈاکٹر اسد زمان، ڈاکٹر محبوب محسن، اور دیگر حضرات کے علاوہ صدر اجلاس، اور راقم الحروف نے بھی خطاب کیا۔ پشاور کے سانحہ کا غم محفل میں شرکاء کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ اس درندگی کی مذمت کی گئی، شہداء کیلئے دعا کی گئی اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ملکی سالمیت کے تحفظ، امن وامان کی بحالی اور بحران کے خاتمہ کیلئے دلی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ دعا بھی کی گئی۔

اپنے مضمون کے حوالے سے یہ سیمینار بہت اہم تھا اور اس کی کچھ تفصیلات سے قارئین کو آگاہ کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر معصوم بچوں کے مقدس خون نے قلم روک لیا ہے اور ان کے خاندانوں بالخصوص ماؤں کی آہ وبکا اور دردناک چیخیں کسی بھی اور بات کی طرف سوچنے نہیں دے رہیں۔

اس دہشت گردی کیلئے درندگی سے بڑھ کر کوئی تعبیر ممکن ہو تو وہ بھی ایک مسلمان اور پاکستانی کے جذبات کے اظہار کیلئے کم ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یاد آرہا ہے کہ ایک دور آئے گا جب لوگ بھیڑیے بن جائیں گے، اور جو شخص بھیڑیا بننے سے گریز کرے گا اسے دوسرے بھیڑیے کھا جائیں گے۔ یہ بات بھی بھیڑیا پن ہی ہے کہ کوئی گروہ اپنی بات کہنے کیلئے یا کسی بھی حوالے سے اپنا غصہ نکالنے کیلئے تعلیمی اداروں میں گھس کر اس کے اساتذہ اور طلبہ کو گولیوں سے بھون ڈالے۔

پاکستان میں اسلحہ برداری اور کلاشنکوف کے ذریعے مسائل کا حل نکالنے کی یہ افسوسناک مہم ربع صدی سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔ کراچی میں لسانی بنیادوں پر، بلوچستان میں نسل وقومیت کے عنوان سے، ملک بھر کے مذہبی ماحول

میں سنی شیعہ کشمکش کے نام پر، اور کے پی کے اور اس کے ملحقہ علاقوں میں نفاذ شریعت کے نعرہ کے ساتھ آگ اور خون کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اس کے عنوانات الگ الگ ہیں۔ مگر ایجنڈا ایک ہے اور ''ماسٹر مائنڈ'' بھی ایک ہی ہے جس کا مقصد پاکستان کو خلفشار اور بدامنی سے دوچار کر کے خطہ میں اپنی موجودگی اور تسلط کا جواز باقی رکھنا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس سارے کام کیلئے ایندھن یہیں سے مہیا ہو رہا ہے۔ اور پاکستان کی سالمیت و وحدت پر کی جانے والی اس خوفناک فائرنگ میں کندھا ہمارا ہی استعمال ہو رہا ہے۔

قارئین کو اگر یاد ہو تو ہم نے افغانستان سے روس کی واپسی کے بعد متعدد ذرائع سے یہ چیخ و پکار کی تھی کہ جن ہزاروں نوجوانوں نے جہاد افغانستان میں شرکت کر کے جدید ترین اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے ان کے مستقبل کا ایجنڈا انہیں اعتماد میں لے کر قومی و دینی راہ نماؤں کو طے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر انہیں اپنا ایجنڈا خود طے کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کے تلخ نتائج سب کو بھگتنا پڑیں گے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے سامنے اس وقت بھی تھا، اور ہم نے اپنے کالموں کے ساتھ ساتھ بہت سے سربرآوردہ دینی و سیاسی راہ نماؤں کو ذاتی ملاقاتوں میں بھی توجہ دلائی تھی۔ مگر غریب شخص کی کون سنتا ہے؟

آج ہم جس دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں، اس سے نکلنے کیلئے قومی سیاسی کانفرنس کا انعقاد اور مشترکہ پلان طے کرنے کا فیصلہ خوش آئند ہے۔ اور بعد از خرابیٔ بسیار ہونے کے باوجود امید کا پہلو اس میں بہر حال موجود ہے۔ اس لیے ہم شہداء کے خاندانوں کے رنج و غم بلکہ پوری قوم کے اس مشترکہ صدمہ میں برابر کے شریک ہیں۔ اور قومی کانفرنس کے فیصلوں اور عزائم میں مثبت پیش رفت کیلئے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملک و قوم کو اس خوفناک اور المناک بحران سے نجات دلائیں، آمین یارب العالمین۔

اس حوالے سے ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ میڈیا کے بعض اہل کاروں اور کچھ مسلکی طور پر متعصب راہ نماؤں نے اس سارے سلسلہ کا تعلق دیوبندیت کے ساتھ جوڑنے کیلئے مخصوص پلاننگ کے ساتھ مہم شروع کر رکھی ہے اور اپنی تمام تر حب الوطنی، امن دوستی اور قربانیوں کے باوجود بعض دیوبندی دانش ور بھی دفاعی پوزیشن پر کھڑے دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہمارے خیال میں یہ بھی ہے کہ ہم نے چند سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں تمام دیوبندی جماعتوں، مراکز اور حلقوں کو مجتمع کر کے ایک متفقہ موقف طے کیا تھا، مگر اس کے بعد اسے داخلِ دفتر کر کے پھر سے اپنا الگ الگ راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موقف کی فائلوں کی گرد جھاڑ کر اسے ایک بار پھر ہر سطح پر قوم کے سامنے لایا جائے اور واضح کیا جائے کہ ہم نے اپنا متفقہ موقف اتنے سال قبل واضح کر دیا تھا، اس میں کوئی ابہام نہیں ہے، اور ہم آج بھی قومی وحدت، ملکی سالمیت و خود مختاری، نفاذ شریعت اور دہشت گردی کے حوالے سے قوم کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آخر ہمیں اس موقف کے اظہار میں حجاب کیوں محسوس ہو رہا ہے؟

افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۶ جولائی ۲۰۱۵ء

افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کا ایک دور مری میں مکمل ہوگیا ہے اور مذاکرات کو جاری رکھنے کے اعلان کے ساتھ دونوں وفد اپنے وطن واپس چلے گئے ہیں۔ حکومت پاکستان کا کردار اس میں واضح ہے کہ یہ مذاکرات مری میں ہوئے ہیں اور اس سے قبل پاکستان کی سیاسی وعسکری قیادت کے کابل کے ساتھ مسلسل روابط بھی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

ان مذاکرات کیلئے ایک عرصہ سے تگ و دو کی جارہی تھی اور امید و بیم کے کئی مراحل درمیان میں آئے۔ مگر یہ دونوں فریقوں کو مذاکرات کی میز پر لانے کیلئے محنت والوں کی کامیابی ہے کہ افغان حکومت اور طالبان کے نمائندے میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہیں اور دوبارہ گفتگو کی بات طے کر کے رخصت ہوگئے ہیں۔ مذاکرات میں کون سے امور زیر بحث آئے اور کیا امور طے ہوئے؟ اس سے قطع نظر مل بیٹھنا اور آئندہ مل بیٹھنے کا وعدہ کرنا ہی بہت بڑی کامیابی ہے جس پر دنیا بھر کے امن پسند حلقوں میں اطمینان کا اظہار کیا جارہا ہے۔

اب سے کئی عشرے قبل جب افغانستان میں مذہبی اور سیکولر حلقوں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا تھا اور افغان عوام کی دینی قیادت نے اسلامی اقدار و روایات اور افغان تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے عنوان سے سیکولر قوتوں کے خلاف صف آرائی کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت کا ظاہری منظر صرف اتنا تھا کہ افغانستان کی حدود میں سیکولر عناصر نے اپنے افکار و نظریات کے فروغ اور مغربی تہذیب و ثقافت کی ترویج کیلئے دینی حلقوں کی قائدانہ پوزیشن کو چیلنج کر دیا تھا۔ بقول اقبالؒ

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

کے ایجنڈے پر عمل درآمد شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ملا لوگوں نے بھی افغانستان کے کوہ و دمن کے ساتھ اپنا رشتہ باقی رکھنے کیلئے صف بندی کا پروگرام بنالیا تھا اور دونوں فریق آمنے سامنے آگئے تھے۔ مگر جب سوویت یونین نے افغانستان میں سیکولر حلقوں کو سپورٹ کرنے کی پالیسی اختیار کی تو یہ کشمکش بین الاقوامی رخ اختیار کرتی چلی گئی اور بہت سے مراحل سے گزر کر افغانستان میں سوویت یونین کی باقاعدہ فوج کشی تک جا پہنچی۔ سوویت یونین افغانستان کو وسطی ایشیا کی ان مسلم ریاستوں کے دائرے میں لانا چاہتا تھا جو کمیونسٹ انقلاب کے بعد اس کے زیر تسلط آگئی تھیں، یا افغانستان کو راستہ بنا کر گوادر کے ذریعے گرم پانیوں تک پہنچنے کا ایجنڈا رکھتا تھا، یا دونوں باتیں بیک وقت ایک ایجنڈے کا حصہ تھیں۔ بہرصورت اس کی مزاحمت میں افغانستان کے دینی حلقوں کے ساتھ پاکستان کے دینی حلقے بھی شامل ہوگئے اور جہادِ افغانستان کے عنوان سے ایک ایسی جنگ چھڑ گئی جس میں سوویت یونین کے خلاف عالمی مورچہ رکھنے والا امریکی بلاک بھی شریک ہوگیا اور رفتہ رفتہ یہ جنگ ایک طرح کی بین الاقوامی جنگ بنتی چلی گئی۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ پاکستان کی قومی سیاست میں دینی حلقوں کی سب سے مؤثر اور توانا آواز تھے۔ انہوں نے

اعلان کیا کہ روس افغانستان کے ذریعے بلوچستان میں آنا چاہتا ہے اور گوادر تک رسائی حاصل کر کے گرم پانیوں تک پہنچنے کا ایجنڈا رکھتا ہے اس لیے یہ صرف افغانستان کا نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ بھی ہے، اور اس کی مزاحمت میں ہم بھی افغان مجاہدین کے ساتھ ہیں۔ پھر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے مختلف حصوں سے جہاد کے جذبہ سے سرشار نوجوانوں کی افغانستان میں آمد شروع ہوئی اور طویل جنگ کے بعد روسی افواج کو افغانستان سے واپس جانا پڑا۔

یہاں ضمناً ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کی گردش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ روس کو گوادر تک پہنچنے سے روکنے کیلئے طویل جنگ لڑی گئی جبکہ چین کو گوادر تک رسائی دینے کیلئے ”اقتصادی راہداری“ ہم خود تعمیر کر رہے ہیں۔ شاید اسی کو قرآن کریم میں تلک الایام نداولھا بین الناس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے موقع پر ”جنیوا معاہدہ“ کی صورت میں مغربی دنیا نے اپنے مقاصد تو حاصل کر لیے مگر افغان مجاہدین اور دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین کے بیسیوں گروپوں کو کسی مشترکہ ایجنڈے کے بغیر تنہا چھوڑ دیا گیا۔ جس کا نتیجہ افغانستان میں خانہ جنگی کے ایک نئے دور اور دنیا بھر میں عسکریت کے فروغ کی صورت میں سامنے آیا۔ آج پوری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے جس کا اعتراف سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن خود ایک بیان میں کر چکی ہیں۔

”جنیوا معاہدہ“ کی کوکھ سے جنم لینے والی اس افراتفری کے دور میں افغانستان کی وحدت کو بچانے اور جہادِ افغانستان کے نظریاتی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے طالبان نمودار ہوئے اور اپنے اہداف کے حصول میں وقتی طور پر کامیاب بھی ہوئے۔ مگر افغانستان کی وحدت اور جہادِ افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل جن طاقتوں کے مفاد میں نہیں تھی وہ طالبان حکومت کے خلاف سازشوں کا ایک نیا جال بننے میں کامیاب ہوگئیں۔ اس کے نتیجے میں افغانستان میں سابقہ صورتحال صرف اس فرق کے ساتھ واپس آگئی کہ اب وہاں روسی فوجوں کا نہیں بلکہ امریکی اتحاد کی فوجوں کا تسلط تھا۔ چنانچہ حریت پسند افغان عوام ایک بار پھر اپنے ملک کو غیر ملکی فوجوں کے تسلط سے نجات دلانے کیلئے سرگرم عمل ہوگئے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ امریکی اتحاد بھی اپنی افواج کو افغانستان سے واپس لے جانا چاہتا ہے مگر جانے سے قبل ایک اور ”جنیوا معاہدہ“ کا اہتمام کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا مقصد پہلے ”جنیوا معاہدہ“ کی طرح افغان مجاہدین کو ان کی طویل جدوجہد کے نظریاتی اہداف سے دور رکھنا ہے اور اس خطہ میں اپنے ایجنڈے پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہے۔

افغان طالبان نے میدان جنگ میں تو اپنا وجود بلکہ برتری منوالی ہے مگر اب مذاکرات کی میز پر وہ ایک نئے امتحان سے دوچار ہوگئے ہیں۔ ان کی فراست و بصیرت کو اپنی تاریخ کے سب سے زیادہ خطرناک چیلنج کا سامنا ہے۔ ہماری دعائیں افغان طالبان کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں عسکری میدان کی طرح سیاست و تدبر اور فراست و بصیرت کے محاذ پر بھی کامیابی سے نوازیں۔ اور جہادِ افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل میں فیصلہ کن مدد سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ملا محمد عمر مجاہدؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- یکم اگست ۲۰۱۵ء

گذشتہ ماہ کے دوران افغان طالبان کی طرف سے اس خبر کی تصدیق کر دی گئی کہ ان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور طالبان شوریٰ نے ان کے نائب ملا اختر منصور کو ان کی جگہ نیا امیر چن لیا ہے۔

ملا محمد عمرؒ روسی استعمار کے خلاف افغان جہاد میں شریک رہے ہیں، اس میں زخمی بھی ہوئے تھے اور ان کی ایک آنکھ متاثر ہو گئی تھی۔ لیکن وہ گمنامی کے اندھیروں میں اس وقت ایک چمکدار ستارے کی مانند نمودار ہوئے جب سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان بین الاقوامی طاقتوں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق ایک نئی اور وسیع تر خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ کابل پر قبضے کی بڑی جنگ کے ساتھ ساتھ افغان مجاہدین اور تحلیل شدہ سابقہ سرکاری افغان فوج کے مختلف گروپ افغانستان کے بہت سے علاقوں میں باہم برسرپیکار تھے۔ پورا افغانستان افراتفری کا شکار تھا، سرداروں کی اس جنگ (لارڈز وار) نے افغانستان کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور شاید بہت سی بڑی طاقتیں بھی یہی چاہتی تھیں۔ مگر قندھار کے ایک گمنام طالب علم نے اپنے طالب علم ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور افغان عوام کو لارڈز وار کی نحوست سے نجات دلانے اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل یعنی نفاذ شریعت کو اپنا مقصد قرار دے کر یہ بے سروسامان طلبہ میدان میں نکل آئے۔

طالبان کا ابتدائی ہدف یہ تھا کہ کوئٹہ سے قندھار اور پھر مزار شریف تک کے تجارتی راستے پر علاقائی سرداروں نے جگہ جگہ ناکے لگا کر جبری ٹیکس وصول کرنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اسے ختم کر کے تجارتی گزر گاہ کو محفوظ بنایا جائے۔ چونکہ ابتدائی لشکر کے زیادہ تر شرکاء دینی مدارس کے طلبہ تھے جو جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف جہادی گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے یہ لشکر طالبان کے نام سے معروف ہوا۔ اور پھر چند سو افراد سے شروع ہونے والا یہ لشکر رفتہ رفتہ ایک منظم فوج کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف تجارتی راستہ صاف کیا بلکہ جو علاقے ان کے کنٹرول میں آتے گئے وہاں شریعت اسلامیہ کے مطابق اماراتی نظام قائم کر کے افغان عوام کو اسلامی قوانین کی برکات سے فیض یاب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا مشاہدہ و اعتراف ملا محمد عمرؒ کے پانچ سالہ دور حکومت میں عالمی سطح پر بھی کیا جاتا رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو ''امارتِ اسلامی افغانستان'' کا نام دیا اور دھیرے دھیرے کابل سمیت بیشتر افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

ملا محمد عمرؒ کی حکومت کے تین کارناموں کا آج بھی بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے:

- لارڈز وار کا خاتمہ یعنی سرداروں کی ان علاقائی حکومتوں اور باہمی جنگوں کا خاتمہ جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔
- انہوں نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں عام افغان آبادی کو غیر مسلح کر دیا، یعنی ہر شخص سے اسلحہ واپس لے کر

افغانستان جیسے ملک میں ”ویپن لیس سوسائٹی“ کا عملی نمونہ پیش کیا۔

- ہیروئن بنانے والے پوست کی کاشت جو طالبان کے دور سے پہلے کبھی کنٹرول ہوئی اور نہ ہی ان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک ممکن ہو سکی ہے، بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق ملا محمد عمرؒ کے ایک حکم سے ایسے ختم ہوئی کہ ان کے حکومتی دائرہ میں شامل علاقوں میں ایک پودا بھی کاشت نہ ہونے کا محاورہ بولا جانے لگا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کا حصہ ہیں اور ان کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، جبکہ ہمارے نزدیک ان کے ساتھ ان امور کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔

- شرعی احکام و قوانین کا عملی نفاذ اور عوام کو شریعت اسلامیہ کے مطابق انصاف کی فراہمی۔
- گڈ گورننس اور سادہ و فطری انداز حکمرانی کا ایسا نمونہ کہ بلاشبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی یاد تازہ ہو گئی۔
- امن عامہ اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو کا اس درجہ میں تحفظ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے کابل کے بازاروں میں دکانداروں کو دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز کیلئے مسجد میں جاتے دیکھا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کبھی نہ بھولے گا کہ ایک بار میں چند روز کیلئے کابل گیا ہوا تھا۔ پل خشتی کی جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد بازار کی طرف نکلا تو چند سکھوں کی دکانیں دکھائی دیں۔ میں ایک دکان میں بلا تکلف گھس گیا اور ٹھیٹھ پنجابی زبان میں جب دکاندار کا حال احوال دریافت کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان گفتگو رہی، میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی! یہ مولوی جب سے آئے ہیں آپ کیا تبدیلی دیکھ رہے ہیں؟ اس نے بے تکلفی سے کہا کہ جب سے یہ مولوی آئے ہیں ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ پہلے ہر وقت خوف و ہراس کی کیفیت رہتی تھی، میرے دو بیٹے جوان ہیں، ہم تینوں باری باری آٹھ آٹھ گھنٹے پہرہ دیتے تھے، اور باقی گھر والے سوتے تھے۔ جب سے ان مولویوں کی حکومت آئی ہے ”ایہہ مولبی پہرہ دیندے آ، تے اسی سکھ دی نیند سوندے ہاں“۔ یہ مولوی پہرہ دیتے ہیں اور ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔

مجھے کابل اور قندھار دونوں جگہ ملا محمد عمرؒ سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا ہے اور طالبان حکومت کے متعدّد راہ نماؤں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے کچھ تاثرات اپنے بیسیوں کالموں میں وقتاً فوقتاً قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں، جبکہ اکثر حصہ ابھی ”در بطنِ شاعر“ کی کیفیت میں ہے۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ نے اس سال پندرہ روزہ فکری نشستوں میں میری گفتگو کا عنوان ”میری یادداشتیں“ طے کیا ہے جس کے تحت سال کے دوران ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مجالس میں اپنی جماعتی، مسلکی اور تحریکی سرگرمیوں کی یادداشتیں بشرط صحت و توفیق بیان کروں گا، اور انہیں ریکارڈ کرنے کے بعد قلمبند کرنے کا بھی پروگرام ہے، ان شاء اللہ

تعالیٰ۔ میں نے اس میں جہادِ افغانستان سے متعلقہ یادداشتوں کو ترجیحاً پہلے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس لیے کہ روس کے خلاف جہاد افغانستان کے آغاز سے طالبان حکومت کے خاتمہ تک بحمد اللہ تعالیٰ کم و بیش ہر مرحلہ میں شریک رہا ہوں، جس کے مشاہدات و تاثرات بلاشبہ قوم اور تاریخ کی امانت ہیں۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مجھے یہ امانت پوری دیانت اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ان گزارشات کے بعد امیر المومنین حضرت ملا محمد عمر مجاہدؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے رفقاء اور اہل خانہ کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے رفقاء و متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

جنرل حمید گل مرحوم

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۲ اگست ۲۰۱۵ء

جنرل حمید گل مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی تاریخی جدوجہد اور تگ و دو کے اثرات ایک عرصہ تک تاریخ کے صفحات پر جگمگاتے رہیں گے۔ ان کا تعلق پاک فوج سے تھا اور ان کا نام جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور جنرل اختر عبدالرحمن مرحوم کے ساتھ جہادِ افغانستان کے منصوبہ سازوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ جہاد افغانستان جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور جس کے مثبت و منفی دونوں قسم کے اثرات سے پوری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے یا انہیں بھگت رہی ہے۔

جنرل حمید گل مرحوم کا اس جنگ میں کیا کردار تھا؟ اس کے اظہار کا ایک پہلو یہ ہے کہ جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے جرمنی متحد ہوا اور برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار توڑ دی گئی، تو زندہ دل جرمنوں نے اس کا ایک چھوٹا سا پتھر جنرل حمید گل مرحوم کو بھی اس نوٹ کے ساتھ بھجوایا کہ یہ دیوار چونکہ آپ کی کوششوں سے ٹوٹی ہے اس لیے یادگار اور اعتراف کے طور پر اس ٹوٹی ہوئی دیوار کا ایک پتھر آپ کو بھجوایا جا رہا ہے۔

جہاد افغانستان کی برکت سے نہ صرف جرمنی متحد ہوا بلکہ مشرقی یورپ کو کمیونزم کے تسلط سے نجات ملی، وسطی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئیں اور بالٹیک ریاستوں نے بھی آزادی کا ماحول پایا۔ مگر اسے تاریخ کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جہاد افغانستان میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والے افغان مجاہدین اپنے ہی ملک میں ایک بار پھر غیر ملکی جارحیت سے نبرد آزما ہیں اور ان کی مدد کیلئے دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین اپنے اپنے ملکوں میں دہشت گرد کا خطاب پا کر خود اپنی حکومتوں کے جبر کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کو جہاد افغانستان کے ہیروز میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اگر صرف اسی اعزاز کو سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو جاتے تو تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے کیلئے یہ بات کافی تھی۔ مگر ان کا ہدف صرف تاریخ میں اپنے نام کو

محفوظ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ خود کو اللہ کا سپاہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاں نثار، اسلام کا خدمت گزار، ملتِ اسلامیہ کا غم خوار اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی کارکن سمجھتے تھے۔ اس لیے زندہ دل جرمنوں سے ''خراج کا پتھر'' وصول کرنے کے بعد ان کے قدم رکے نہیں بلکہ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول، پاکستان کو ایک صحیح اسلامی ریاست کی شکل دینے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کے دفاع اور انہیں سپورٹ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور اسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے اللہ کے حضور جا پہنچے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

انہیں جہادِ افغانستان کا منصوبہ ساز کہا جاتا ہے اور اس کے بعد انہیں پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کا خالق بھی بتایا جاتا ہے جبکہ افغانستان و پاکستان کے حوالے سے بہت سی تحریکات کے راہ نماؤں میں وہ صف اول میں دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کے طریق کار، سوچ اور اقدامات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اسلام کی خاطر کیا، ملتِ اسلامیہ کا مفاد سمجھ کر کیا اور اسلامی جمہوری پاکستان کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ کیا۔

میں بھی چونکہ اسی راہ کا مسافر ہوں اور اس سفر میں صحرا نوردی کرتے ہوئے مجھے نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اس لیے جنرل حمید گل مرحوم کے ساتھ رفاقت، ہم آہنگی اور یگانگت فطری بات ہے اور یہ مختلف دائروں میں مسلسل رہی ہے۔ ملاقاتیں بھی رہی ہیں، مشاورت کا سلسلہ بھی وقفہ وقفہ سے موجود رہا ہے، متعدّد تحریکات میں شرکت بھی رہی ہے، اور اہم قومی و دینی مسائل پر مشترکہ موقف کے اظہار کیلئے باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع بھی میسر رہے ہیں۔ جب اکوڑہ خٹک میں افغانستان اور پاکستان کے دفاع کیلئے قومی سطح پر دینی و سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کنونشن حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اور دفاع پاکستان و افغانستان کونسل کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی تو کنونشن کا موقف تحریر کرنے کی ذمہ داری جنرل حمید گل مرحوم اور راقم الحروف کو سونپی گئی تھی۔ ہم دونوں جب اس مقصد کیلئے تنہا ہوئے تو جنرل صاحب نے کہا کہ مولانا! آپ ہی لکھیں، میں اس پر نظر ثانی کرلوں گا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس طرح اس کنونشن کا اعلامیہ مرتب کیا اور اس کی بنیاد پر ایک نئی قومی کونسل وجود میں آئی۔

جنرل صاحب آئی ایس آئی کے سربراہ تھے، انہیں اس منصب سے تبدیل کرکے جب ایک ٹیکنیکل قسم کا منصب دیا گیا تو وہ مستعفی ہوگئے۔ مجھے ان کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا اس لیے کہ سنیارٹی کی فہرست میں ایک دو ٹرم کے بعد ان کے چیف آف آرمی اسٹاف بننے کا چانس دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ استعفیٰ دے چکے تھے اس لیے اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تحریک انصاف ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ایم کیو ایم کے ساتھ ان کا کوئی مثبت تعلق نہیں تھا، جبکہ ان کے استعفیٰ پر سیاست کی اکاس بیل کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مستعفی ہوئے تو ہو ہی گئے البتہ بعد میں جب ہمارے خیال کے مطابق اس چانس کا مرحلہ گزر گیا تو میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ

''جنرل صاحب! اب آپ کو اپنے غصے پر غصہ تو آرہا ہوگا۔''

جنرل صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ جنرل صاحب نظریاتی اور فکری

دنیا کے بھی جنرل تھے۔ عالمی تاریخ اور بین الاقوامی معاملات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے، بروقت بات کہنے کا ذوق رکھتے تھے اور لگی لپٹی رکھے بغیر منہ پر بات کرنے کا حوصلہ بھی ان میں موجود تھا۔ لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں ایک سیمینار تھا جس میں جسٹس سید نسیم حسن شاہ مرحوم نے قرآن و سنت کی بالادستی پر بڑی اچھی گفتگو کی۔ راقم الحروف بھی اس میں شریک تھا۔ جسٹس صاحب مرحوم کے بعد جب جنرل حمید گل مرحوم نے گفتگو کی تو جسٹس مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ جناب والا! جب آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ”قراردادِ مقاصد“ کو دستور کی بالادست دفعہ تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ تحریر فرما رہے تھے تو قرآن و سنت کی بالادستی پر آپ کا یہ عقیدہ کونسے فریزر میں منجمد پڑا تھا جس کا آپ نے آج کے خطاب میں اظہار کیا ہے؟ جنرل حمید گل مرحوم کے اس استفسار پر جسٹس صاحب مرحوم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور میرے دل نے بے ساختہ دعائیں دینا شروع کر دیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کی جدائی سے ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی شناخت کے تحفظ اور ”اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام“ کی جدوجہد کے ایک عظیم جرنیل سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

توبہ، اصلاح، تلافی

روزنامہ اسلام، لاہور--- نومبر ۲۰۱۵ء

سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے گذشتہ دنوں ایک ٹی وی چینل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ عراق پر حملہ کے موقع پر وہاں ناجائز کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کی رپورٹ غلط تھی اور انہیں عراق پر حملہ کے نتیجے میں داعش کے منظم ہو جانے کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس پر معذرت خواہ ہیں۔ ٹونی بلیئر عراق پر امریکی اتحاد کے حملہ کے قائدین میں سے تھے اور انہوں نے سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش اور نائب صدر ڈک چینی کا ساتھ دے کر نہ صرف اس حملہ میں برطانوی فوجوں کو شریک کیا تھا بلکہ وہ اس کا جواز پیش کرنے اور اس کو ضروری قرار دینے کی عالمی سطح پر وکالت بھی کر رہے تھے۔ عراق پر ناجائز کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور ان کا ذخیرہ کرنے کا الزام تھا جس کی عراق کے صدر صدام حسین بار بار تردید کر رہے تھے۔ بلکہ عراق کی حدود میں ایسے ہتھیاروں کی موجودگی کا سراغ لگانے والے بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے مگر بش، ڈک چینی اور ٹونی بلیئر نے پوری دنیا میں آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور جب عراق کی اینٹ سے اینٹ بجانے، دس لاکھ سے زیادہ انسانوں کے قتل عام، اور وہاں اپنی مرضی کی حکومت مسلط کر کے مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملا تو اب اسے رپورٹ کی غلطی قرار دے کر اور ”سوری“ کہہ کر معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ٹونی بلیئر کی اس معافی پر مجھے دو تین اور معافیاں یاد آ رہی ہیں۔ معروف سائنس دان گلیلیو کے ساتھ چرچ نے جو سلوک کیا تھا اس پر صدیوں کے بعد سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ نے کچھ عرصہ قبل کہا تھا کہ ہمیں اس غلطی کا اعتراف

ہے۔ جبکہ گذشتہ صدی کے دوران لیبیا پر اٹلی کے استعماری قبضہ کے دوران وہاں کے عوام پر کیے جانے والے مظالم پر اٹلی کے وزیر اعظم نے چند سال قبل لیبیا کے دورہ کے موقع پر اسی طرح کا سوری کہا تھا۔ اور سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے اگرچہ سوری کا لفظ کہنے کی زحمت نہیں فرمائی مگر یہ اعتراف کیا تھا کہ افغان جہاد کے بعد روسی فوجوں کے واپس چلے جانے پر افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کو کوئی باہمی نظم طے کرائے بغیر اسی طرح کھلا چھوڑ دینا ہماری غلطی تھی۔

ٹونی بلیئر کا کہنا ہے کہ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ عراق پر حملے کے نتیجے میں ''داعش'' جیسی شدت پسند قوت ابھر آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر داعش منظم نہ ہوتی اور پورے مشرق وسطیٰ میں سب بالادست قوتوں کیلئے چیلنج نہ بن جاتی تو عراق پر حملہ درست تھا اور ممنوعہ ہتھیاروں کی موجودگی یا غیر موجودگی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن چونکہ نتائج توقع کے خلاف سامنے آئے ہیں اس لیے عراق پر حملہ کو غلطی کہنا اب مجبوری بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں ہیلری کلنٹن کے اعتراف کا پس منظر بھی اسی طرح کا ہے کہ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کے گروپوں کو آزاد چھوڑ دینا اور ان کے مستقبل کا کوئی نظم اور ایجنڈا طے کیے بغیر ان سے لاتعلق ہو جانا اصلاً تو اس لیے تھا کہ یہ آپس میں لڑتے رہیں اور خطے میں ہماری چودھراہٹ اور بالادستی قائم رہے۔ مگر اس بات کی توقع نہیں کی جا رہی تھی کہ درمیان میں طالبان اٹھ کھڑے ہوں گے جو سارا مزہ کرکرا کر دیں گے اور بجائے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لیے اب یہ احساس ابھر رہا ہے کہ انہیں اس طرح کھلا چھوڑ دینا غلطی تھی۔ ہیلری کلنٹن کے اعتراف اور ٹونی بلیئر کی سوری دونوں کے پیچھے یہی نفسیات کارفرما ہے کہ چونکہ نتائج توقع کے خلاف سامنے آئے ہیں اس لیے اپنے اقدامات کو غلطی تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مگر کیا صرف غلطی کا اعتراف یا سوری کہہ دینا کافی ہے، اور کیا ایسا کرنے والوں پر اپنی غلطیوں کے نقصانات کی تلافی کے حوالے سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ مغربی معاشرہ میں ''تھینکس'' اور ''سوری'' کی روایت ایک اچھی بات سمجھی جاتی ہے مگر اس حوالے سے دو باتیں میرے ذہن میں اکثر گھومتی رہتی ہیں جن کا بسا اوقات اظہار بھی کرتا ہوں:

1. ایک یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کو تھینکس بھی کہا جاتا ہے اور سوری بھی کہا جاتا ہے اور اسے تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے، مگر اپنے مالک و خالق رب العالمین کو تھینکس اور سوری کہنے کا تصور ہی مغربی معاشرہ میں ناپید ہو گیا ہے جو اس سوسائٹی کا اصل المیہ ہے۔
2. دوسری بات یہ ہے کہ کسی کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے کے بعد بھی محض سوری کہہ کر معاملہ نمٹا دیا جاتا ہے جس کے نقصان کا سارا بوجھ اسی غریب کے کھاتے میں پڑ جاتا ہے۔

جبکہ آسمانی تعلیمات اس سے مختلف بات کرتی ہیں۔ بائبل میں توبہ اور معافی کو ''لوٹ آنے'' اور ''رجوع کرنے'' کے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی بھی اس کا حصہ ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے اسے زیادہ وسیع انداز میں بیان کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس رویے کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ تورات کے بہت سے احکام کو چھپا لیتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، قرآن کریم نے کہا ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے مستحق ہیں مگر جو لوگ توبہ کر لیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جبکہ توبہ کیلئے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۶۰ میں تین لفظ استعمال کیے

گئے ہیں تابوا واصلحوا و بینوا

1. اپنے طرز عمل سے توبہ کرلیں،
2. اپنے رویے کی اصلاح کرلیں،
3. گذشتہ غلطی کی تلافی کرتے ہوئے چھپائے ہوئے احکام کو بیان کرنا شروع کردیں۔

اس لیے جب تک ٹونی بلیئر اور ہیلری کلنٹن غلطی کے اعتراف کے بعد اس غلطی کے نقصانات کی تلافی اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کا راستہ نہیں کرتے ان کے ایسے بیانات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳ نومبر ۲۰۱۵ء

جامعہ حمادیہ کراچی کے حضرت مولانا عبد الواحدؒ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ بھی داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت شاہ صاحبؒ ملک کے ان بزرگ اور مجاہد علماء کرام میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف تعلیم و تدریس کی مسند کو آباد کیا بلکہ زندگی بھر نفاذ شریعت کی جدوجہد اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کی محنت میں مصروف رہے۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نامور تلامذہ میں سے تھے اور انہی کی مسند پر بیٹھ کر ایک عرصہ تک حدیث شریف کا درس دیتے رہے جس سے پاکستان، افغانستان اور اردگرد کے دیگر ممالک کے ہزاروں علماء کرام نے فیض حاصل کیا۔ وہ حدیث میں اپنے شیخ حضرت مولانا عبد الحقؒ کے علوم کے وارث و ترجمان، جبکہ تفسیر قرآن میں ایک اور عظیم المرتبت شیخ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے فیوض کے امین تھے۔ اس لیے بخاری شریف کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کے دورہ کی روایت بھی انہوں نے ہمیشہ قائم رکھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں ممتاز عرب اساتذہ سے استفادہ کیا اور امام التابعین حضرت حسن بصریؒ کے تفسیری فیوضات پر گراں قدر مقالہ لکھ کر مدینہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہ بیک وقت اکوڑہ خٹک، شیرانوالہ لاہور، اور مدینہ یونیورسٹی کی متنوع علمی روایات کے جامع تھے اور دینی صلابت کے ساتھ ساتھ توسع اور علمی رواداری کا عملی نمونہ بھی تھے۔

ایک بات میں پہلے بھی کئی بار لکھ چکا ہوں کہ روسی استعمار کے خلاف افغان جہاد کو علمی و فکری آب یاری کا ماحول اکوڑہ خٹک کی برکت سے میسر آیا اور وہی افغان مجاہدین اور ان کے بعد افغان طالبان کی جدوجہد میں پختگی اور سنجیدگی کا باعث بنا۔ اس سنجیدگی اور پختہ فکری کی قدر و قیمت عالم اسلام کے مختلف حصوں میں نفاذ شریعت کی متعدد تحریکات میں افراط و تفریط کا مشاہدہ کرتے ہوئے صحیح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اور اس پر حضرت مولانا عبد الحقؒ کی علمی عظمت، دینی حمیت اور فکری صلابت کے آگے سرنیاز بے ساختہ خم ہوجاتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے اس علمی ورثہ کو سینے کے ساتھ لگانے والے چند گنے چنے افراد میں حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ نمایاں مقام رکھتے ہیں، جبکہ مولانا سمیع الحق اور مولانا انوار

الحق کے ساتھ ان کی زندگی بھر کی رفاقت اپنے شیخ کے خاندان کے ساتھ ان کی بے لوث وفاداری کی علامت ہے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ مستقبل کا کوئی بھی غیر جانبدار مؤرخ جب گذشتہ صدی کے دوران جہاد کے احیاء، خاص طور پر جہاد افغانستان کے پس منظر و نتائج اور دنیا بھر میں اس کے مثبت اور منفی اثرات کا تجزیہ کرے گا تو وہ اس کے علمی و فکری محاذ پر حضرت مولانا عبدالحقؒ، حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی خدمات اور کردار کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ اسی صف بندی کی سیکنڈ لائن کے بزرگ تھے اور ان کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

وہ علماء اور مجاہدین کے صرف استاذ نہیں تھے بلکہ مربی اور پشت پناہ بھی تھے اور صحیح کاموں پر حوصلہ افزائی کے ساتھ غلط کاموں پر ٹوکنے کا ذوق اور معمول بھی رکھتے تھے۔ راقم الحروف کو ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ جامعہ نصرۃ العلوم میں متعدد بار تشریف لائے، حضرات شیخینؒ کے ساتھ گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے جس کی برکات سے ہم بھی مستفید ہوتے رہے۔ مختلف تحریکات اور اجلاسوں میں ان کے ساتھ رفاقت رہی اور بہت سے معاملات میں مشاورت کا تعلق بھی رہا۔ اب وہ نہیں ہیں تو آنکھوں کے سامنے خلا خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ اس غم میں ان کے خاندان کے علاوہ مولانا سمیع الحقؒ دارالعلوم حقانیہ کے اساتذہ و طلبہ اور حضرت مرحوم کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مستفیدین کے ساتھ شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

تین معاصر بزرگوں کے تصنیفی کارنامے

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۲ نومبر ۲۰۱۵ء

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے جنازے پر حاضری نہیں ہو سکی تھی اس لیے ۱۴ نومبر کو مرکز حافظ الحدیث درخواستیؒ، حسن ابدال میں پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس اور سیرت کانفرنس کے بعد میں مولانا عبدالقیوم حقانی کے ساتھ اکوڑہ خٹک چلا گیا۔ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ کے گھر کے ساتھ ان کی تعمیر کردہ مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد ان کے فرزندان، دیگر اہل خاندان اور مسجد کے نمازیوں سے تعزیت کی۔ حضرت مرحوم کی قبر پر حاضری اور دعائے مغفرت کی سعادت حاصل کی اور اس کے بعد دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوا۔ حضرت مرحوم کا اصل خاندان تو دارالعلوم حقانیہ ہی ہے اور تعزیت کا سب سے زیادہ مستحق بھی وہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مادر علمی ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی بھر ان کی تدریسی و تحریکی سرگرمیوں کی جولانگاہ رہا ہے۔ حضرت مولانا سمیع الحق سے ملاقات بلکہ طویل نشست ہوئی، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات پر تعزیت اور دعائے مغفرت کے علاوہ متعدد ملکی و قومی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا اور مولانا سمیع الحق کی تصنیفی سرگرمیوں اور مساعی سے آگاہی حاصل کی۔

میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ اپنے تین معاصر بزرگوں کی محنت دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے بلکہ رشک ہوتا ہے کہ وہ تحریری محاذ پر مستند معلومات اور تاریخ کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب کر کے نئی نسل کے حوالے کر رہے ہیں جو بلاشبہ

ملک وملت پر احسان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق نے جہاد افغانستان اور پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے حوالے سے دستاویزات، خطوط اور خطبات کا خاصا بڑا ذخیرہ محفوظ کر رکھا ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابوں کی صورت میں سامنے آیا ہے اور حال ہی میں مشاہیر کے خطوط و مکتوبات کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ وہ ان دنوں دو موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے شیرانوالہ لاہور میں دورہ تفسیر پڑھا تھا، وہ اور مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ اکٹھے تھے، دونوں نے حضرت لاہوریؒ کے تفسیری افادات قلمبند کیے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیگر تلامذہ کی تحریری کاپیاں بھی انہوں نے حاصل کی ہیں جنہیں سامنے رکھ کر وہ حضرت لاہوریؒ کے تفسیری افادات قلمبند کر رہے ہیں اور تقریباً دس پاروں پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ دوسرا یہ کہ جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ کے دور میں ان کی قائم کردہ وفاقی مجلس شوریٰ نے نفاذ اسلام کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے تھے اور انہیں بعد میں منتخب پارلیمنٹ نے اپنی توثیق کے ساتھ ملک کے دستور و قانون کا حصہ بنا دیا تھا، مولانا موصوف اس کی تفصیلات اور متعلقہ دستاویزات و مباحث جمع کر رہے ہیں اور انہیں مرتب کتابی شکل دے رہے ہیں۔ جو کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کا علمی و تاریخی ریکارڈ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی بھی مسلمان ملک میں نفاذ اسلام کی علمی و فکری بنیاد بن سکتا ہے۔ میں نے مولانا سمیع الحق سے عرض کیا کہ یہ آپ کی ہمت ہے کہ بڑھاپے اور علالت کی اس کیفیت میں بھی اتنا وقیع کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم و ہمت میں اضافہ فرمائیں اور امت کو ان کے وجود و مساعی سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب کریں، آمین یارب العالمین۔

مولانا اللہ وسایا

اس حوالے سے دوسری قابل رشک شخصیت عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہنما مولانا اللہ وسایا کی ہے جنہوں نے اپنی دیگر علمی و تحقیقی خدمات کے ساتھ ساتھ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران قادیانیوں کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے تین سو سے زائد اصحاب قلم کی نگارشات کو ''احتسابِ قادیانیت'' کے نام سے ساٹھ جلدوں میں مرتب کر کے اتنے بڑے علمی و تحقیقی ذخیرہ تک علماء و طلبہ کو رسائی دینے کے علاوہ اسے تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور صحت و سلامتی کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

مولانا عبد القیوم حقانی

اس سلسلہ کے تیسرے بزرگ مولانا عبد القیوم حقانی ہیں جن کی محنت کا دائرہ اکابر اور بزرگ شخصیات ہیں۔ وہ ان کی سوانح اور افادات کو مختلف حوالوں سے جمع کرتے ہیں اور ماہنامہ القاسم کی خصوصی اشاعتوں اور مستقل کتابوں کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ آف کلاچی کی حیات و خدمات اور افادات پر مولانا حقانی کی تصنیف آئی ہے جو اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر شیر علی شاہؒ پر آپ کی کتاب کب آرہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس پر پہلا حق ماہنامہ الحق کا ہے اور اس کے ضخیم نمبر کی تیاری ہو رہی ہے۔

مجلس احرار کی طویل تاریخ کے بارے میں الحاج مرزا غلام نبی جانباز رحمہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ جلدوں پر مشتمل ”کاروانِ احرار“ مرتب کر کے اس قافلہ حریت سے نئی نسل کو روشناس کرایا تھا۔ جبکہ ہمارے یہ تین بزرگ دوست مولانا سمیع الحق، مولانا اللہ وسایا، اور مولانا عبد القیوم حقانی بھی اسی نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور ہمارے جیسے ناکارہ لوگوں کی دعاؤں کا بڑا حصہ سمیٹ لیتے ہیں۔ حضرت مولانا سمیع الحق سے ملاقات کے بعد میں نے رات مولانا عبد القیوم حقانی کے مدرسہ جامعہ ابوہریرہؓ میں گزاری، اساتذہ و طلبہ کی ایک نشست میں چند معروضات پیش کیں، اور صبح نماز فجر کے بعد اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گیا جہاں مجھے بحریہ ٹاؤن کے سفاری کلب میں تنظیم اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ”انسدادِ سود کنونشن“ میں شریک ہونا تھا۔ میرے دورۂ حدیث کے ایک ساتھی مولانا سراج دین ان دنوں عسکری سیون راولپنڈی میں اپنے فرزند حافظ خالد محمود کے پاس رہتے ہیں جو وہاں کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ صبح کا ناشتہ ان کے ساتھ کیا جس سے ان کی بیمار پرسی کا موقع ملا، اللہ تعالیٰ انہیں صحت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

پاک امریکہ تعلقات: حقیقت پسندانہ تجزیہ کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۳ جنوری ۲۰۱۶ء

وفاقی وزیر خواجہ محمد آصف کا کہنا ہے کہ ہم نے جہادِ افغانستان میں فریق بن کر غلطی کی تھی اور پھر جنرل پرویز مشرف کے دور میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر بھی غلطی کی ہے، آئندہ یہ غلطی نہیں دہرائیں گے۔ انہوں نے یہ بات سعودی عرب ایران کشمکش کے تناظر میں کہی ہے۔

جہاں تک اپنی غلطیوں کو محسوس کرنے، ان کا اعتراف کرنے اور آئندہ غلطی نہ دہرانے کے عزم کا تعلق ہے، خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خوش آئند ہے اور قومی سیاست میں اچھی پیش رفت کی علامت ہے کہ حکمران طبقات میں بھی اپنی غلطیوں کے اعتراف کی روایت آگے بڑھنے لگی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں حوالوں سے حالات و واقعات اور اپنے رویوں پر تفصیلی بحث و مباحثہ کی ضرورت ہے تاکہ اس بات کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ ہم نے اصلی غلطی کہاں کی ہے۔

جہاد افغانستان کا پس منظر یہ تھا کہ سوویت یونین نے افغانستان میں اثر و رسوخ بڑھاتے بڑھاتے اپنا نظام و فلسفہ مسلط کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ کیلئے مسلح لشکرکشی بھی کر دی تھی جس کے ردعمل میں افغان علماء کرام اور عوام نے مسلح مزاحمت کا آغاز کیا جو بالآخر ایک بڑی اور بین الاقوامی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ بہت سے پاکستانی راہنماؤں کو یہ خدشہ تھا کہ کمیونسٹ نظام اور اثر و رسوخ کا افغانستان میں استحکام اس کے پاکستان تک وسیع ہو جانے کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح لشکرکشی کی آخری منزل گوادر دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ گوادر جہاں تک سوویت یونین کی رسائی کو روکنے کیلئے طویل جنگ لڑی گئی مگر وہی رسائی چین کو مہیا کرنے کیلئے تجارتی راہداری کی تعمیر میں ہمارے قومی راہنما ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال اس دور میں پاکستان تک کمیونسٹ نظام کی وسعت اور گوادر تک سوویت یونین کی رسائی کے خطرات نے نہ صرف حکمران طبقات کو چوکنا کر دیا تھا بلکہ مذہبی

عناصر بھی متحرک ہوگئے تھے۔ اور ریاستی قوت کے ساتھ مل کر مذہبی حمیت نے جہاد افغانستان میں پاکستانی عوام کی براہ راست شرکت کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

بات یہاں تک رہتی تو سمجھ میں آرہی تھی جیسا کہ اس دور میں مولانا مفتی محمودؒ بار بار یہ کہتے رہے کہ افغان مجاہدین صرف افغانستان کی آزادی کی جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ پاکستان کے اسلامی تشخص اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کیلئے بھی برسرپیکار ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ کی یہ صدا آج بھی پاکستان کے طول و عرض کے مختلف شہروں کی فضا میں گونج رہی ہے کہ پاکستان کے تشخص اور سالمیت کی جنگ افغانستان میں لڑی جا رہی ہے۔ لیکن جب افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی جنگ کو کامیابی کی طرف بڑھتے دیکھ کر امریکی استعمار نے اپنا "پلچ" تلنا شروع کر دیا تو معاملات میں بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ ہمیں یاد ہے کہ جہاد افغانستان میں امریکہ کی عملی دلچسپی اور کردار کے بعد افغان مجاہدین کے آٹھ گروپوں کا اتحاد قائم ہوا اور مولانا نصر اللہ منصور شہیدؒ کو اس کا سیکرٹری جنرل چنا گیا تھا تو مولوی نصر اللہ منصورؒ نے اس بات سے اختلاف کیا تھا کہ امریکہ کو جنگ کی کمان میں حصہ دار بنایا جائے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ حمایت اور امداد قبول کرنے میں حرج نہیں ہے مگر معاملات کو بیرونی کنٹرول میں دے دینا جہاد افغانستان کے مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس اختلاف کی وجہ سے انہیں جہاد افغانستان کا باقی دورانیہ بیرون ملک جلاوطنی کی حالت میں گزارنا پڑا تھا۔ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی اور حضرت صبغۃ اللہ مجددی کی صدارت میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد انہیں افغانستان واپس آنا نصیب ہوا تھا اور اسی دوران وہ جام شہادت نوش کر گئے تھے۔

امریکہ کو جہاد افغانستان میں اس درجہ کا عمل دخل دلوانے میں کن لوگوں کا ہاتھ رہا ہے اور اس کیلئے کس کس سطح پر کام ہوا ہے؟ اس کی تفصیل مناسب موقع پر بیان کی جا سکتی ہے، البتہ اس کے نتائج ہم سب بھگت رہے ہیں اور خدا جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔

ہمیں خواجہ محمد آصف صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی تھی، البتہ یہ غلطی افغان مجاہدین کی حمایت و امداد میں نہیں بلکہ پورے جہاد افغانستان کی باگ دوڑ امریکہ بہادر کے ہاتھ میں دینے کے موقع پر ہوئی تھی۔ اور پھر یہی غلطی ہم نے مشرف دور میں دہرائی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ خود لڑنے کی بجائے امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن کر ہم نے دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ ان عناصر کو بھی اپنا دشمن قرار دے دیا جو امریکہ کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور خطہ میں امریکہ کے خود ساختہ مفادات کی مخالفت کر رہے ہیں، جس سے دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ خود ابہامات اور شکوک و شبہات سے دوچار ہوگئی۔

البتہ وزیر اعظم پاکستان کے مشیر امور خارجہ جناب سرتاج عزیز کی اس بات میں وزن ہے کہ خطہ کی موجودہ صورت حال امریکی پالیسیوں کی وجہ سے رونما ہوئی ہے اور سب کچھ خود امریکہ کا کیا دھرا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ محترم سرتاج عزیز کے اس موقف کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، چنانچہ جہاد افغانستان کے آغاز سے اب تک کی صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ قومی تقاضے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اصل حقائق تک رسائی اور ان کے غیر جانبدارانہ جائزہ کی سوچ اپنائی جائے۔ خدا کرے کہ ہم اس قومی ضرورت کی تکمیل کیلئے اپنی لابیوں اور حلقوں کے

دائروں سے ہٹ کر ملک کے بہتر مستقبل کیلئے کوئی علمی و فکری کام کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

ملا اختر منصور کی شہادت کے بعد!

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۶ مئی ۲۰۱۶ء

امریکی ڈرون حملہ میں افغان طالبان کے امیر ملا اختر محمد منصور کی موت کی تصدیق سے پاکستان کے وزیر داخلہ چودھری نثار علی خان نے یہ کہہ کر گریز کیا ہے کہ جب تک ڈی این اے ٹیسٹ وغیرہ مکمل نہیں ہوتے اس خبر کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مختلف بین الاقوامی ذرائع کے ساتھ ساتھ خود طالبان کے حلقوں میں نئے امیر کے انتخاب کیلئے نظر آنے والی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا منصور کی شہادت کا سانحہ رونما ہو چکا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جبکہ دوسری طرف امریکی صدر باراک اوباما نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ دنیا میں کہیں بھی اپنے تحفظ کیلئے ڈرون حملوں کا حق رکھتا ہے اور ملا منصور شہیدؒ کو قتل کرنے سے اس کا مقصد افغان طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانا ہے۔

ملا اختر محمد منصورؒ کو طالبان کے بانی ملا محمد عمر مجاہدؒ کی وفات کے بعد افغان طالبان کا امیر منتخب کیا گیا تھا۔ جبکہ نئی صورتحال میں ان کے جانشین کے طور پر ملا محمد عمرؒ کے فرزند ملا محمد یعقوبؒ اور مولانا جلال الدین حقانی کے فرزند سراج الدین حقانی کا نام نمایاں طور پر لیا جا رہا ہے اور مختلف تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ جبکہ اس سلسلہ میں مکمل اور صحیح صورتحال سامنے آنے میں شاید ابھی وقت لگے گا۔

یہ بات کم و بیش واضح ہے کہ امریکہ افغان طالبان کو اپنے ایجنڈے پر لانے میں قوت کے بھرپور استعمال کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ان کے امیر کو مبینہ طور پر قتل کر دینے کے بعد بھی وہ اسے اپنی کامیابی قرار دینے کا حوصلہ نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان مارک ٹونر نے اپنی ایک حالیہ بریفنگ میں کہا ہے کہ

"یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حملہ کے بعد طالبان کو شکست ہو گئی ہے۔"

افغان طالبان دراصل روسی جارحیت کے خلاف جہاد افغانستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والے ان عناصر پر مشتمل ہیں جنہوں نے سوویت یونین کی واپسی کے بعد اس خطہ میں نئے امریکی ایجنڈے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ جبکہ امریکہ کی خواہش اور کوشش تب سے یہی ہے کہ اس نے دنیا کی "یک قطبی چودھراہٹ" اور نئی علاقائی تقسیموں کیلئے جو ایجنڈا طے کر رکھا ہے، جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے تمام عناصر اس کے کسی نہ کسی خانے میں فٹ ہو جائیں اور اس ایجنڈے کی تکمیل میں کردار ادا کریں یا کم از کم اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بہت سے گروہ اس کے بعد سے اس ایجنڈے کا حصہ بن چکے ہیں جن کی سرگرمیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ استفادہ کر رہا ہے۔

افغان طالبان اس کیلئے تیار نہیں ہوئے اور وہ افغانستان کی مکمل خود مختاری کے ساتھ جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کے عزم پر بدستور قائم ہیں۔ یہ دونوں باتیں نئے عالمی امریکی ایجنڈے سے مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ

عالمی حلقوں میں یہ سمجھا جارہا ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار نظریاتی اسلامی ریاست نہ صرف دنیا میں استعماری عزائم کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے بلکہ پورے عالم اسلام میں خود مختاری اور اسلامیت کے جذبات کے فروغ کا ذریعہ بھی ثابت ہوگی۔ اسی لیے عسکری کاروائی کے ذریعے افغان طالبان کی حکومت کو ختم کیا گیا اور امریکی اتحاد کی مسلح یلغار کے ذریعے انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کی مسلسل کاروائیاں جاری ہیں۔ مگر افغان طالبان اپنے اس موقف پر قائم ہیں کہ اگر افغانستان پر روسی عسکریت ناجائز تھی تو امریکی اتحاد کی عسکری یلغار بھی ملک کی خود مختاری کے منافی اور ناجائز ہے۔ اور وہ روس کی طرح امریکی عسکری جارحیت کا سامنا بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کیلئے کر رہے ہیں۔

یہ بات اب بحث طلب نہیں رہی کہ امریکی اتحاد عسکری قوت اور عالمی سطح پر کردار کشی کی وسیع تر مہم کے باوجود اور بہت سے عسکری گروہوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اپنے ایجنڈے کا حصہ بنا چکنے کے بعد بھی افغان طالبان کو اپنے ڈھب پر نہیں لا سکا اور نہ ہی انہیں قوت کے ذریعے ختم کر دینے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ یہ مقاصد اب مذاکرات کی میز پر حاصل کرنا چاہتا ہے اور افغان طالبان کے اصولی موقف کی پروا کیے بغیر انہیں زبردستی مذاکرات کی میز پر لانے کیلئے اس قدر بے چین ہے کہ اس کیلئے ڈرون حملوں کے ذریعے پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو داؤ پر لگا دینے میں بھی اسے کوئی حجاب نہیں ہے۔ امریکی صدر کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کسی آزاد اور خود مختار ملک کے اندر ڈرون حملے اس کی سالمیت اور خود مختاری کے منافی ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ افغان طالبان محض ایک عسکری گروہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی قوت ہے جس کی بنیاد اسلام پر بے لچک عقیدہ و ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی مکمل خود مختاری اور آزادی پر ہے جو انسانی حقوق کے اس نام نہاد چارٹر کا بھی تقاضہ ہے جسے امریکی اتحاد نے دنیا بھر میں اپنے تسلط و اقتدار کیلئے ہتھیار بلکہ کھلونا بنا رکھا ہے۔

امریکیوں کی غرض اب صرف یہ رہ گئی ہے کہ جو وہ چاہ رہے ہیں وہ کیوں نہیں ہو پا رہا ہے اور دنیا کے مستقبل کا جو نقشہ انہوں نے طے کر رکھا ہے کچھ لوگ امریکہ کے فریب کا شکار ہو کر اس میں فٹ ہونے سے انکار کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں افغان طالبان نے بامقصد مذاکرات سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی اب انہیں اس کا مورد الزام قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر مذاکرات کا مقصد ان سے اپنی مرضی کی کسی دستاویز پر دستخط لینا ہے تو وہ شاید اس کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے اور نہ ہی انہیں اس کیلئے آمادہ ہونا چاہیے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملا اختر محمد منصورؒ کی شہادت نے دنیا کو ایک بار پھر یہ واضح پیغام دیا ہے کہ خود مختاری افغانستان کا حق ہے اور اسلام افغان قوم کا مستقبل ہے جس سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ٹی وی پروگراموں کے طے شدہ اہداف

روزنامہ اسلام، لاہور--- یکم جولائی ۲۰۱۶ء

رمضان المبارک کے دوران (۱۲ سے ۱۶ رمضان) پانچ دن کراچی میں گزارنے کا موقع ملا۔ ماہ مقدس میں مختلف ٹی وی چینلز کی خصوصی نشریات میں سے جناب انیق احمد کا سنجیدہ اور بامقصد پروگرام "روحِ رمضان" اس سفر کا باعث بنا۔ میں عام طور پر ٹی وی پروگراموں سے گریز کرتا ہوں اور دعوت کے باوجود معذرت کر دیتا ہوں جس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے بہت سے اینکرز کی یہ پالیسی اور طریق کار ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کو بات کہنے کا موقع دینے کی بجائے ان سے اپنی بات کہلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر مذہبی راہ نماؤں کے بارے میں تو یہ بات طے شدہ ہے کہ مذہب کی نمائندگی کیلئے چن چن کر ایسے حضرات کو سامنے لایا جاتا ہے اور ان سے بعض باتیں حیلے بہانے سے اس انداز سے کہلوائی جاتی ہیں کہ مذہب کے نام پر کوئی ڈھنگ کی بات پیش نہ ہو سکے۔ اور جو بات بھی ہو وہ مذہب اور مذہبی اقدار پر عوامی یقین و اعتماد کو کمزور کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بہت اوپر کی سطح پر طے شدہ پالیسی ہے اور اس ماحول میں اگر کوئی سنجیدہ شخص اپنی بات کہنے کی کوشش بھی کرے تو اسے زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ میں خود ایسے متعدّد مراحل سے گزر چکا ہوں جن میں سے چند کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نائن الیون کے بعد جب افغانستان کی طالبان حکومت سے امریکہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ نائن الیون کے سانحہ میں مبینہ طور پر ملوث ہونے کی وجہ سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالہ کر دیا جائے جس پر طالبان یہ کہہ رہے تھے کہ اگر کسی مسلمہ بین الاقوامی فورم پر یہ الزام ثابت کر دیا جائے تو وہ یہ مطالبہ پورا کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس دوران لندن کے ایک ٹی وی کی دعوت پر میں ایک پروگرام میں شریک ہوا۔ محترم لارڈ نذیر احمد بھی اس کے شرکاء میں سے تھے۔ بعض دانش ور حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ جب امریکہ اسامہ کو ملزم سمجھتا ہے اور حوالگی کا مطالبہ کر رہا ہے تو طالبان حکومت کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے۔ جبکہ میرا موقف یہ تھا کہ طالبان حکومت کا یہ موقف بے وزن نہیں ہے کہ محض الزام پر وہ ایسا نہیں کریں گے جب تک کسی مسلمہ بین الاقوامی فورم پر اس کے ثبوت فراہم نہ کر دیے جائیں۔ پروگرام اردو زبان میں تھا اور لائیو تھا۔ ہم سب اردو میں بات کر رہے تھے لیکن میں نے جوں ہی یہ بات زور دے کر کہی کہ امریکہ اس کیس میں مدعی ہے یا جج کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے؟ تو پروگرام کا ماحول یکلخت تبدیل ہو گیا، گفتگو انگریزی میں ہونے لگی، اور میں انگریزی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے خاموش تماشائی بن کر رہ گیا۔

اسی طرح ایک بار مجھے اسلام آباد میں پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں کسی موضوع پر گفتگو کیلئے بلایا گیا۔ میزبان ایک معروف صحافی تھے جو وفات پا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔ انہوں نے پروگرام کا آغاز کیا اور میرا مختصر تعارف کرانے کے بعد گفتگو شروع کر دی۔ گفتگو زیادہ تر علماء کرام کے طرز عمل پر تنقید کے حوالے سے تھی، وہ مسلسل گفتگو کرتے چلے گئے، میں خاموش بیٹھا سن رہا تھا، جب پروگرام کا طے شدہ وقت ختم ہونے کے قریب پہنچا تو میں نے مجبورًا مداخلت کی اور کہا کہ محترم! آپ نے مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنے کیلئے بلایا ہے یا اپنی تقریر سنانے کے لیے؟ یہ تو میں کسی

جگہ بھی ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھ کر سن سکتا تھا، اس پر وہ مجھے موقع دینے پر مجبور ہوئے اور میں بمشکل چند منٹ گفتگو کر پایا۔

تیسرا واقعہ اس سے بھی دلچسپ ہے۔ چند سال قبل میں اپنے بعض تعلیمی پروگراموں کیلئے کراچی میں تھا، ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کی طرف سے دعوت ملی کہ ''اسلامائزیشن کیلئے ہوم ورک'' کے حوالے سے ایک پروگرام ہو رہا ہے، کیا آپ اس میں شریک ہوں گے؟ موضوع میری دلچسپی کا تھا اس لیے میں نے ہاں کر دی۔ جب پروگرام میں پہنچا تو گفتگو کیلئے چند دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ میزبان نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کم و بیش طنزیہ لہجے میں سوال داغ دیا کہ آپ علماء کرام کے پاس نفاذ اسلام کیلئے کوئی ہوم ورک بھی موجود ہے یا ویسے ہی نعرے لگاتے چلے جا رہے ہیں؟ یہ کہہ کر انہوں نے سوال کا رخ ایک مولانا صاحب کی طرف کر دیا جن سے میں متعارف نہیں تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ تھا کہ ان کی اس موضوع پر تیاری نہیں ہے، یا اس موضوع پر وہ مدلل گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ میں ساری تکنیک سمجھ گیا کہ اس سوال پر نامکمل اور مبہم جواب ہی اینکر صاحب کی ضرورت ہے جس کیلئے یہ شریف سے مولانا صاحب قابو کیے گئے ہیں۔ جبکہ اس سوال و جواب کے موقع پر میری موجودگی دکھانا بھی پروگرام والوں کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔

میں نے مداخلت کی اور کہا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ میزبان نے کہا کہ نہیں مولانا آپ سے ہم کچھ اور سوال کریں گے اور اس سوال کا جواب یہ مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے۔ میں اس پر ڈٹ گیا کہ نہیں اس سوال کا جواب تو میں ہی دوں گا۔ میرا اصرار اور ان کا انکار چند لمحے جاری رہا، بہر حال انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے اور میں نے وضاحت کی کہ اسلامائزیشن کیلئے ہمارے پاس اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی متعدّد اجتماعی علمی و فقہی کاوشوں کی صورت میں اس قدر مکمل اور جامع ہوم ورک موجود ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلم ملک نفاذ اسلام کیلئے اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

یہ چند ذاتی واقعات اس لیے عرض کیے ہیں کہ میں ٹی وی چینلز کے پروگراموں میں شریک ہونے سے عام طور پر گریز کرتا ہوں۔ البتہ انیق صاحب کا پروگرام چونکہ سنجیدہ اور بامقصد ہوتا ہے اس لیے اس میں شریک ہونے کیلئے مصروفیات میں سے ہر سال وقت نکالنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس رمضان المبارک میں بھی تین دن کے دوران سحری اور افطاری کے چھ پروگراموں میں شریک ہوا اور مختلف دینی عنوانات پر کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۸ نومبر ۲۰۱۶ء

چند سال پہلے کی بات ہے کہ کراچی میں ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے پروگرام کیلئے مجھے بلایا گیا، پروگرام کا موضوع یہ تھا کہ ''کیا پاکستان میں نفاذ شریعت کا مطالبہ اور جدوجہد کرنے والے حلقوں نے کوئی ہوم ورک بھی کر رکھا ہے یا یہ محض ایک جذباتی نعرہ ہی ہے؟'' اس پروگرام کے اینکر نے انتہائی تیکھے لہجے میں یہ سوال کیا اور محفل میں شریک ایک بزرگ کی طرف رخ پھیر کر ان سے جواب کے متقاضی ہوئے۔ مجھے اس طریق واردات کا پہلے سے اندازہ تھا اور یہ بھی

معلوم تھا کہ جن صاحب سے سوال کا جواب مانگا جا رہا ہے ان کی اس حوالے سے تیاری نہیں ہے، اس لیے میں نے تھوڑی سی سختی کے ساتھ مداخلت کی اور کہا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ چونکہ پروگرام لائیو تھا اس لیے وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکے اور میرا جواب انہیں سننا پڑا۔

میں نے عرض کیا کہ نفاذ شریعت کے حوالے سے پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کا ہوم ورک اور فائل ورک اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں نفاذ اسلام کیلئے پیش رفت ہو تو ہمارا یہ ہوم ورک اس کیلئے بنیادی اور اصولی راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ طالبان کے دور حکومت میں مجھے قندھار جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان کے ذمہ دار حضرات کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ اس سلسلہ میں پاکستان میں اب تک ہونے والے ہوم ورک سے استفادہ کریں اور اسے سامنے رکھ کر افغانستان کے ماحول اور ضروریات کے دائرے میں اسلامائزیشن کی طرف پیش رفت کریں۔ ٹی وی چینل کے مذکورہ پروگرام میں اس حوالے سے میں نے تین کاموں کا ذکر کیا:

1. پرائیویٹ سطح پر مختلف مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی مشترکہ کاوشیں جو ۲۲ دستوری نکات اور اس طرز کی دیگر بہت سی دستاویزات کی صورت میں موجود ہیں اور جن پر تمام مکاتب فکر آج بھی متفق ہیں۔
2. حکومتی سطح پر قیام پاکستان کے بعد علامہ محمد اسدؒ کی راہنمائی میں قائم ہونے والے ادارہ اور اس کے بعد تعلیمات اسلامیہ بورڈ، اسلامی مشاورتی کونسل، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مسلسل محنت اور ان کی وقیع رپورٹیں۔
3. وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ کے متعدّد اہم فیصلے جو نفاذ شریعت کیلئے اصولی اور عملی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

میری طالب علمانہ رائے میں اگر ان تین دائروں کی علمی کاوشوں کو منظم اور مرتب انداز میں سامنے لایا جائے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے بارے میں اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ ہمارے ہاں جو کمی ہے وہ راہنمائی کی نہیں بلکہ عملی اقدامات کیلئے سنجیدگی کی ہے اور ہمیشہ یہ غیر سنجیدگی ہی شرعی قوانین کے نفاذ میں حائل رہی ہے۔

البتہ ان علمی کاوشوں اور اجتہادی مساعی کے وقیع اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں فنی زبان و اسلوب کے ساتھ عوامی انداز میں منتقل کر کے منظم اور مرتب صورت میں سامنے لایا جائے، وہاں اس بات کا خلاء بھی میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان علمی و اجتہادی مساعی کے واقعاتی پس منظر اور مراحل کو بھی واضح کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ علمی و فکری دنیا میں کسی بھی ارتقاء و تبدیلی اور تشکیلِ نو کے سماجی تناظر اور واقعاتی پس منظر کو سمجھے بغیر اس کی افادیت و اہمیت کا پوری طرح ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ الجھن صرف مذکورہ بالا علمی اداروں کے کام میں نہیں بلکہ ہمارے مفتیان کرام کے ان شخصی فتاویٰ کے بارے میں بھی درپیش ہے کہ ماحول، عرف اور تعامل میں تبدیلی کے باعث کسی مسئلہ میں روایتی موقف سے ہٹ کر کوئی رائے اختیار کی جاتی ہے تو وجہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے وہ رائے کنفیوژن کا باعث بن جاتی ہے۔

چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ جیسے اداروں کے علمی اور اجتہادی فیصلوں کے ساتھ ساتھ ان کے واقعاتی پس منظر، سماجی ضرورت اور ضرورت و تعامل کے تقاضوں کو عام فہم انداز میں واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ اور میرے خیال میں تاریخی پس منظر اور واقعاتی ماحول کے مرحلہ وار تذکرہ سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔

شدت پسندی، افغانستان، ضیاء دور

۱۷ جولائی ۲۰۱۶ء کو روزنامہ دنیا لاہور کے ہفتہ وار میگزین میں شائع ہونے والے انٹرویو کے منتخب حصے

سوال: بعض حلقوں کی جانب سے پاکستان میں شدت پسندی کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تسلسل کہا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر گروپ دیوبندی مکتب فکر ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: یہ تاثر بظاہر تو درست دکھائی دیتا ہے کیونکہ جہادی تحریکیں فکری طور پر خود کو اسی کے ساتھ منسوب کرتی ہیں، اس کا بنیادی سبب میرے خیال میں جہاد افغانستان ہے۔ روس کی واپسی اور افغان جہاد کی کامیابی کے بعد عالمی طاقتوں نے اس پوری تحریک کو اس کے منطقی نتائج سے محروم کیا، اسی کا ردعمل ہمیں بعد میں شدت پسندی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ البتہ سید احمد شہیدؒ کے بعد شیخ الہندؒ کے زمانے میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ دیوبند کی تحریک ایک نئی تشکیل کے تحت تعلیمی و تدریسی محنت اور پرامن سیاسی جدوجہد کے دور سے گزری۔ اس کے بعد ایک محدود دائرہ میں اس کی تشکیل نو جہاد افغانستان کے زمانے میں ہوئی کہ روس کی جارحیت کی وجہ سے وہی پرانے جذبات پھر آ گئے، لیکن جہاد افغانستان سے ہٹ کر دوسرے معاملات میں مجموعی طور پر دیوبندی حلقوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

سوال: جہاد افغانستان کو اگر عالمی قوتوں نے منطقی انجام تک نہیں پہنچنے دیا تو کیا مذہبی تحریکوں کا داخلی نظام اتنا کمزور تھا کہ اس کے نتیجے میں ایسے عناصر پیدا ہو گئے جنہوں نے مسلمانوں اور عام شہریوں کی قتل و غارت سے بھی گریز نہیں کیا؟

جواب: یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ جب جہاد افغانستان ختم ہوا تو اس وقت میرے اندازے کے مطابق پینتالیس پچاس ہزار پاکستانی مسلح افراد وہاں سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ اس وقت میں نے بہت سی اہم شخصیات بالخصوص مولانا فضل الرحمان، جنرل حمید گل اور مولانا سمیع الحق سے یہ بات کہی تھی کہ یہ قوت اگر کھلی چھوڑ دی گئی تو مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے اس قوت کا کوئی مصرف تلاش کریں۔ میں نے مثال بھی دی کہ سندھ میں قیامِ پاکستان کے وقت کوئی سات آٹھ ہزار مسلح حُر موجود تھے جنہیں اس نظام میں ایڈجسٹ کر لیا گیا تھا، ورنہ وہ بھی آج ایک مسئلہ ہوتا۔ جہاد افغانستان کے موقع پر بھی میرا

کہنا یہی تھا کہ اگر اس بے پناہ قوت نے اپنا راستہ خود بنایا تو تباہی آئے گی۔ یہی بات کافی عرصہ بعد ہیلری کلنٹن نے بطور امریکی وزیر خارجہ تسلیم کی کہ ہم سے اس معاملے میں غلطی ہوئی کہ افغان جہاد کے بعد مجاہدین کے گروپوں کو آزاد اور تنہا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔

سوال: افغانستان کے طالبان کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب: افغانستان کے طالبان سادہ و مخلص لوگ ہیں اور ان کا تعلق نچلے طبقے کے افراد سے ہے۔ انہوں نے افغانستان کی آزادی اور اسلامی تشخص کیلئے مخلصانہ جنگ لڑی ہے لیکن انہیں مناسب سیاسی راہنمائی میسر نہیں آئی۔ جبکہ ان کے قیام کے فوراً بعد القاعدہ کے عنصر کی وجہ سے خرابی بہت تیزی سے بڑھی۔ میں نے اس وقت بہت سے دوستوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کیلئے طالبان کو مستحکم ہونے دو اور انہیں کام کیلئے وقت دو، کوئی دوسری لڑائی مت چھیڑو مگر یہ بات نہیں سنی گئی۔ القاعدہ کی بے وقت تشکیل اور فوری متحرک ہوجانے کی وجہ سے طالبان حکومت مسائل کا شکار ہوئی۔ اُدھر القاعدہ کی سرگرمیوں اور اِدھر پاکستان میں تحریک طالبان کی تشکیل نے افغان طالبان کا مشن خراب کر دیا۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ افغانستان میں اگر کوئی پرو پاکستان طبقہ ہے تو وہ طالبان ہے۔ لیکن ہم نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے جس کی وجہ سے تعلقات میں دراڑیں پیدا ہوئیں۔ اور آج افغانستان میں ایسے لوگ برسراقتدار ہیں جو بھارت کو اپنے ملک میں کھلی چھٹی دے رہے ہیں۔

سوال: عوامی سطح پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی طبقے کی جانب سے شدت پسندی کے رجحانات اور قتل و غارت کی واضح اور غیر مشروط مذمت نہیں کی جاتی۔ کیا ایسی تنظیموں اور فکر کیلئے نرم گوشہ پایا جاتا ہے؟

جواب: شدت پسندی کی مذمت کرنے میں مذہبی طبقے نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن میڈیا کا رویہ اس معاملے میں انتہائی جانبدارانہ رہا ہے۔ ہمارے ملک اور عالمی میڈیا دونوں کی پالیسی یہ ہے کہ شدت پسندی کو تو اجاگر کیا جائے لیکن سنجیدہ مذہبی قیادت کی جانب سے جب اس کی مخالفت ہو تو اسے دبا دیا جائے۔ میں خود اس رویے کا شاہد ہوں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں دیوبندی مکتب فکر کی پوری قیادت نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شدت پسندی کی مخالفت کی اور اس کی مذمت میں باقاعدہ قرارداد منظور کی گئی۔ وہ قرارداد میں نے اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے لکھی تھی لیکن تمام کوششوں کے باوجود میڈیا نے اسے کسی عام مدرسے میں ہونے والے جلسے کی طرح نظر انداز کر دیا۔

سوال: بعض حلقوں کے نزدیک مذہبی فکر کی جانب سے قومی ریاست کو مسترد کرنے اور عالمی سطح پر خلافت کے قیام کو دینی تقاضا قرار دینے کی وجہ سے شدت پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خیال کہاں تک درست ہے؟

جواب: عمومی دینی حلقے تو قومی ریاست کو قبول کر چکے ہیں۔ کچھ نے اگر نہیں کیا تو اس کیلئے سب کو یکساں طور پر ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی بھی ریاستیں ہیں وہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر کام کر رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس بات کو اس طرح بھی واضح کر دیا تھا کہ خلافت کسی علاقائی حکومت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ آج کی اصطلاح میں ایک

کنفیڈریشن کا نام ہے۔ یعنی امارات اپنی اپنی جگہ قائم ہوں اور خود مختار ہوں جبکہ ان کا ایک مرکز ہو جو کنفیڈریشن کی طرح کا ایک نظام ہو۔

اسی لیے میں اسے افغان طالبان کی عقل مندی کے فیصلوں میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے افغانستان میں حکومت کے قیام کے بعد "خلافت" کا نہیں بلکہ "امارت" کا اعلان کیا۔ جبکہ داعش کی سب سے بڑی بے وقوفی یہی تھی کہ انہوں نے بات ہی خلافت سے شروع کی ہے۔ حالانکہ خلافت جب بھی بنے گی ایک کنفیڈریشن کی طرز پر بنے گی جس میں امارات کو پوری داخلی خود مختاری حاصل ہوگی۔ خلافت راشدہ کے دور کا اگر درست تجزیہ کیا جائے تو وہ نظام کنفیڈریشن ہی کا تھا جس میں صوبوں کو خود مختاری حاصل تھی اور مرکزی حکومت ہر معاملے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

سوال: ضیاء دور کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بعض اچھے اقدامات بھی کیے لیکن ان کی اپروچ ذاتی سطح تک ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ادارے ان کے اقدامات کو سپورٹ نہیں کر سکے۔ دوسری جانب ایک رجحان یہ ہے کہ ان کے کھاتے میں کئی ایسے کام بھی ڈال دیے جاتے ہیں جو ان کی حکومت سے کئی برس پہلے شروع ہوئے تھے۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ انہوں نے بعض اچھے کام کیے لیکن کئی کام دستور کی سطح پر پہلے طے ہو چکے تھے۔ ہماری افغان پالیسی کی تشکیل بھٹو دور میں ہوئی۔ عالمی میڈیا میں اس حوالے سے تفصیلات سامنے آئی ہیں بھٹو کی بلوچستان میں فوج کشی کا ردعمل افغانستان میں ظاہر ہوا۔ اب چونکہ افغانستان میں مزاحمت مذہبی لوگ کر رہے تھے تو ان کا ساتھ یہاں کے مذہبی لوگوں ہی نے دینا تھا، لیکن اس کا سارا الزام جنرل ضیاء الحق پر ڈال دیا جاتا ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی کاوش

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۷ اکتوبر ۲۰۱۶ء

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے بارے میں یہ معلوم کر کے مجھے "میں نے یوں جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کی کیفیت اپنے دل میں محسوس ہونے لگی کہ انہوں نے افغان طالبان اور کمانڈر احمد شاہ مسعود شہیدؒ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ خواہش ایک دور میں مجھے بھی ستاتی رہی ہے اور میں نے اس کا بعض مواقع پر اظہار بھی کیا ہے۔ بلکہ ایک موقع پر قندھار میں حضرت مولانا محمد نبی محمدیؒ کے ساتھ ملاقات کے دوران ان سے عرض کیا تھا کہ روسی جارحیت کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کے تمام گروپوں کو افغانستان کے مستقبل کے بارے میں مل کر فیصلہ کرنا چاہیے اور اب بھی میری رائے یہ ہے کہ اس کے بغیر شاید افغانستان کو موجودہ دلدل سے نہ نکالا جا سکے۔

کمانڈر احمد شاہ مسعود شہیدؒ کے بارے میں یہ بات میں ایک عرصہ قبل لکھ چکا ہوں کہ علماء کرام کے ایک وفد کے

ہمراہ پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کے دور صدارت میں مجھے کابل جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت احمد شاہ مسعود وزیر دفاع تھے۔ انہوں نے مولانا فداء الرحمن درخواستی اور راقم الحروف کو یہ کہہ کر اپنا مہمان بنالیا تھا کہ میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کا شاگرد ہوں اور ان کے دورۂ تفسیر میں خانپور میں شریک ہو چکا ہوں۔ میری اس بات سے بہت سے دوستوں کو شاید اتفاق نہ ہو مگر پورے شرح صدر کے ساتھ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ جن جہادی گروپوں نے روسی جارحیت کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا اور آپس میں متحدہ محاذ بھی بنالیا تھا ان کو دوبارہ اکٹھے ہونا چاہیے اور مل جل کر جہاد افغانستان کے منطقی نتائج کے حصول اور افغانستان کی آزادی و خود مختاری کیلئے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

- - - -

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۸ اپریل ۲۰۱۶ء

- - - -

میں نے ایک مضمون میں افغان طالبان کی قیادت سے یہ عرض کیا کہ وہ نفاذِ اسلام کیلئے پاکستان میں قرارداد مقاصد اور علماء کرام کے ۲۲ متفقہ نکات سے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات تک کے عمل سے استفادہ کریں، اور جو سرکردہ حضرات پاکستان میں سیاسی اور عدالتی شعبوں میں نفاذ اسلام کیلئے مسلسل سرگرم عمل ہیں ان سے راہنمائی حاصل کریں۔ اس پر حضرت قاضی صاحبؒ نے مجھے خط لکھا کہ ”انہیں اپنی نہج پر کام کرنے دو، انہیں ہمارے والی عادتیں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟“ قاضی صاحبؒ کے اس درد بھرے جملہ میں معانی کا ایک جہان آباد ہے۔ میری رائے تو تبدیل نہیں ہوئی اور اب بھی وہی ہے مگر حضرت قاضی صاحبؒ کے اس دردِ دل نے اس قدر متاثر کیا کہ جب بھی موقع ملتا ہے مختلف محافل میں اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں۔

- - - -

پاک امریکہ تعلقات: جبر و مکر کی داستان

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء

وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے گذشتہ دنوں بوسنیا کے دورہ کے موقع پر سرائیوو میں ایک گفتگو کے دوران کہا ہے کہ پاکستان چند سالوں سے مسلسل عالمی دباؤ کی زد میں ہے۔ یہ جملہ انہوں نے کس پس منظر میں فرمایا ہے اور اس عالمی دباؤ کا کون سا دائرہ ان کے سامنے ہے، اس کی تفصیلات تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ البتہ ان کے اس ارشاد سے ہمیں اتفاق ہے کہ پاکستان مسلسل عالمی دباؤ کا شکار ہے، مگر صرف چند سالوں سے نہیں بلکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی یہ ریاست اپنے قیام کے فوراً بعد ہی عالمی دباؤ کے دائرے میں شامل ہوگئی تھی اور تب سے نہ صرف اس دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اس کے دائرے یکے بعد دیگرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ دائرے رفتہ رفتہ ”ریڈ لائنز“ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ عروج پر تھی جس میں اس نوزائیدہ ریاست کو اس تیزی کے ساتھ امریکی کیمپ کا حصہ بنایا گیا کہ اس کا بعض حلقوں میں یہ مطلب لیا جانے لگا کہ شاید پاکستان کے قیام کا مقصد ہی یہی تھا۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان اس خارجہ پالیسی کے ماسٹر مائنڈ تھے۔ جبکہ وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کو اس مہارت کے ساتھ اس ''دامِ ہمرنگ زمین'' میں پھنسایا گیا کہ ان کے تمام تر خلوص و دیانت کے باوجود ایک تلخ سوال ان کی سیاسی بصیرت و فراست کے اس باب کا ہمیشہ کیلئے عنوان بن گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب انہیں امریکہ اور روس دونوں کی طرف سے دورے کی دعوت ملی تھی تو انہوں نے یہ دونوں دعوتیں قبول کر کے توازن قائم رکھنے کی بجائے صرف امریکہ کی دعوت قبول کر کے اپنے ملک کو امریکی کیمپ کے ساتھ وابستہ کیوں کر لیا تھا؟

ہم اس وقت سے امریکی کیمپ کا حصہ چلے آ رہے ہیں حتیٰ کہ روس کے خلاف امریکی معاہدوں سیٹو Seato اور سنٹو Sento کا حصہ رہے ہیں۔ اور ایک مرحلہ میں تو اس حد تک ہم فرنٹ لائن پر آ گئے تھے کہ بڈبیر پشاور کے ایئر بیس سے پرواز کرنے والے جاسوس امریکی طیارے کی نشاندہی ہونے پر روسی وزیر اعظم خردشیف نے اعلانیہ طور پر کہہ دیا تھا کہ ہم نے بڈبیر کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا ہے اور اب وہ ہمارے نشانے پر ہوگا۔ ہم امریکہ اور روس کی اس سرد جنگ میں فریق نہ بننے والے ممالک کی غیر جانبدار تحریک کا رسمی حصہ تو بنے تھے لیکن ہمارا عملی کردار ہمیشہ سے امریکی اتحادی کا رہا ہے اور آج بھی ہم اسی کا حصہ ہیں۔ جبکہ اس دوران:

- پاکستان کی شہ رگ کشمیر کو ایک لاینحل مسئلہ بنانے میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔
- ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران امریکہ نے باہمی معاہدات کی پاسداری سے کھلا انحراف کیا۔
- مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل ہوتے دیکھ کر امریکہ بہادر '' ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنا رہا اور اپنے اتحادی ملک کو تقسیم ہونے سے بچانے کیلئے امریکہ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔
- جہاد افغانستان میں روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے بعد امریکی کیمپ نے اپنے تمام مقاصد حاصل کر لیے مگر افغان مجاہدین اور پاکستان کو ان کی جدوجہد کے منطقی نتائج و فوائد سے محروم کرنے کیلئے ''جنیوا معاہدہ'' کے نام سے مکر و فریب کا جو جال بنا وہ بلا شبہ امریکی منافقت کا شاہکار ہے۔
- پاکستان کی وہ جہادی قوتیں جن کی قربانیوں سے امریکہ نے افغانستان میں پورا فائدہ اٹھایا، مگر بعد میں انہیں بتدریج دہشت گروپوں میں تبدیل کرنے اور انہیں بدنام کرنے کیلئے جو ساز باز کی گئی وہ بھی وقت کے ساتھ واضح ہوتا جا رہا ہے۔

پاکستان سے ہر طرح کی قربانیاں اور مفاد حاصل کرنے اور بدلے میں اسے تذلیل کے سوا کچھ نہ دینے کے بعد بھی ہم امریکہ کے ''فرنٹ لائن اتحادی'' ہیں اور اس کی ہر سزا بھگت رہے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں امریکی پالیسیوں اور طرزِ عمل کو سمجھنے کیلئے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' (آقا نہیں دوست) کو ایک نظر

دیکھ لینا ضروری ہے۔ جبکہ اس حوالے سے حقائق، انکشافات اور دستاویزات کی ایک وسیع دنیا محققین اور تجزیہ نگاہوں کی راہ دیکھ رہی ہے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ امریکہ بہادر اور اس کے اتحادیوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش چلی آرہی ہے جواب شدت اور عروج کی آخری بلندی کو چھوتی دکھائی دینے لگی ہے کہ:

- پاکستان اپنے نظریاتی اور اسلامی تشخص سے دستبردار ہوجائے اور دستور و قانون کے ان تمام حصوں پر نسخ کی لکیر کھینچ دے جو اسلامی احکام و قوانین سے کسی درجہ کا تعلق رکھتے ہیں۔
- پاکستانی قوم اپنے خاندانی نظام اور تہذیبی روایات سے دست کش ہوجائے اور نکاح، طلاق، وراثت، خاندانی ماحول اور باہمی رشتوں کے حوالے سے مغربی تہذیب و ثقافت کی بالادستی کو قبول کرکے اس کا حصہ بن جائے۔
- اسلامی عقائد کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ سے لاتعلق ہوجائے اور تحفظ ناموس رسالتؐ، عقیدۂ ختم نبوت اور مذہبی شعائر کی حرمت و تقدس سمیت تمام مذہبی معاملات کو دستور و قانون کے ماحول سے خارج کردے۔
- ایٹمی قوت کے مقام سے پیچھے ہٹے، اپنی عسکری اور دفاعی صلاحیت و قوت کو آقاؤں کی مقرر کردہ دائروں میں محدود کردے اور خاص طور پر مسلم ممالک کی عسکری قوت و صلاحیت کیلئے مقرر کی گئی ریڈ لائن کو کراس نہ کرے۔
- اقتصادی و معاشرتی ترقی اور خود کفالت کا خواب دیکھنا چھوڑ دے اور ”سی پیک“ سمیت تمام ایسے ترقیاتی پروگراموں پر نظر ثانی کرے جن سے چودھریوں کی چودھراہٹ متاثر ہوتی ہو۔
- پاکستان خود کو عالم اسلام کے وسیع تر دائرے کا شعوری و نظریاتی کردار سمجھنا چھوڑ دے، اپنی تمام تر پالیسیوں کو داخلی و علاقائی دائروں میں محصور رکھے اور ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی تصور سے دستبردار ہوجائے۔ یہ وہی کردار ہے جس کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے افغان طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کیا گیا ورنہ ان سے زیادہ شدت پسند حکومتیں دنیا میں قائم رہی ہیں اور اب بھی ہیں جن کے ساتھ یہ رویہ نہیں اختیار کیا گیا۔

یہ وہ چند پہلو ہیں جو پاکستان پر بڑھتے ہوئے عالمی دباؤ کے مختلف دائرے ہیں، اس کی ایک جھلک ایمنسٹی انٹرنیشنل کی حالیہ رپورٹ میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں پاکستان کے دستور و قانون کی مختلف شقوں کو قابل اعتراض قرار دے کر ان پر نظر ثانی کیلئے زور دیا گیا ہے۔ جبکہ پاکستان کو اپنے تجارتی دائرے میں شامل کرنے کیلئے یورپی یونین کی عائد کردہ شرائط بھی اس صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں اور بین الاقوامی معاہدات کا دباؤ ان سب پر مستزاد ہے۔ ستم کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے کسی مسئلہ پر ان میں سے کسی ملک سے بات کی جائے تو ان کا دوٹوک جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے قومی مفاد کے دائرے میں ہی بات کرسکتے ہیں، ہماری پالیسیاں عوام کے منتخب نمائندے طے کیا کرتے ہیں، ہم اپنے ملک کے دستور و قانون سے باہر نہیں جاسکتے، ہماری تہذیبی اقدار اور قومی روایات ہی ہمارے اصل راہنما ہیں۔ مگر جب پاکستان اور دیگر

مسلم ممالک کی بات ہوتی ہے تو قومی مفاد، منتخب نمائندوں کے فیصلے، دستور و قانون کی بالادستی اور قومی و تہذیبی روایات کی ساری دلیلیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ایک ہی بات حرفِ آخر قرار پاتی ہے کہ وہ کرو جو ہم کہہ رہے ہیں ورنہ ہمارے غیظ و غضب اور کاروائیوں کا نشانہ بنتے رہو جس کا عملی مشاہدہ افغانستان اور عراق میں لاکھوں انسانوں کے قتل عام کی صورت میں کیا جا چکا ہے۔

دوسری طرف ہمارا معاملہ یہ ہے کہ اس دباؤ بلکہ جبر اور دھاندلی کا احساس تو پایا جاتا ہے لیکن ہم اس کا سامنا طبقات کی صورت میں الگ الگ کر رہے ہیں:

- عسکری قوتیں اپنے دائرہ کے دباؤ میں اپنی صلاحیت کے تحفظ کی فکر میں ہیں۔
- معاشی اور اقتصادی حلقے اس دباؤ میں سے اپنے لیے راستے تلاش کر رہے ہیں، حتیٰ کہ شرعی و دستوری تقاضے کے باوجود سودی نظام سے خاتمہ کی کوئی راہ بھی دکھائی نہیں دے رہی۔
- مذہبی اور نظریاتی حلقے اس دباؤ کے مقابلہ میں صرف اپنی حد تک مورچہ زن ہیں۔ جبکہ مغربی ثقافت کی ترویج و اشاعت میں حصہ لینے والوں کیلئے حوصلہ افزائی اور مراعات لیکن دینی اقدار کیلئے کام کرنے والے گروہوں کیلئے خوف وہراس اور کردارکشی کا ایجنڈا کارفرما ہے۔
- سیاسی حلقوں کو سرے سے اس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے، انہیں صرف کرسی چاہیے اور لوٹ کھسوٹ کے مواقع میسر ہونے چاہئیں وہ جس راستے سے ملیں اور جس ذریعہ سے آئیں انہیں اس کے علاوہ اور کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔

میرے خیال اور مشاہدہ میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کے بعد سے ہمارے کسی حکمران کا کوئی سیاسی وژن اور ایجنڈا نہیں ہے۔ بھٹو مرحوم اور ضیاء الحق مرحوم کے سیاسی وژن کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کا وژن بظاہر ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتا ہے، اگرچہ میری رائے میں ایسا نہیں ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ ہمارے یہ دونوں مرحوم لیڈر پاکستان اور عالم اسلام کیلئے ایک واضح ایجنڈا رکھتے تھے جس کیلئے وہ پوری طرح مصروف عمل تھے۔ ان کے بعد اقتدار، کرسی اور لوٹ کھسوٹ کے مواقع کے سوا پاکستان کے سیاسی ماحول میں کسی کا کوئی وژن اور ایجنڈا دکھائی نہیں دے رہا۔

برطانوی نوآبادیاتی دور میں برصغیر کی سینکڑوں ریاستوں نے محدود سی داخلی خودمختاری پر قناعت کر کے باہر اور اوپر کے سارے معاملات برطانوی حکومت کے سپرد کر رکھے تھے۔ مجھے آج کی صورتحال اور ان ریاستوں کی حالت میں اس کے سوا عملی طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا کہ اس دور میں مسلم ریاستوں کو اپنے داخلی ماحول میں شرعی عدالتوں کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کی اجازت حاصل تھی جو کہ اب ہمارے لیے قابل عمل نہیں رہی، اس لیے کہ ہم قانون و تعلیم کے شعبوں میں بھی بیرونی ایجنڈے کے پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس پس منظر میں میاں محمد نواز شریف کے اس ارشاد سے اتفاق کرتے ہوئے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ

پاکستان کے خلاف عالمی دباؤ کا وسیع تناظر میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کا سامنا طبقاتی ماحول نہیں بلکہ قومی ماحول میں کرنا ضروری ہے۔ اگر اس عالمی دباؤ کے متنوع دائروں کے پیچھے ماسٹر مائنڈ اور کنٹرول روم ایک ہے تو اس کا سامنا کرنے کیلئے طبقاتی دائروں سے نکل کر مشترکہ ماسٹر مائنڈ اور کنٹرول روم کا اہتمام بھی وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔

صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا بیان اور امریکی قیادت کی نفسیات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۶ جنوری ۲۰۱۸ء

صدر ٹرمپ کے بیان پر پاکستانی قوم نے جس متفقہ موقف اور ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ قومی وقار اور حمیت کا ناگزیر تقاضہ ہے اور امریکہ کیلئے واضح پیغام ہے کہ بس! اب بہت ہو چکی ہے اور اس سے آگے کوئی بات قابل برداشت نہیں ہوگی۔ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو ان کے بقول گذشتہ پندرہ سال کے دوران تینتیس ارب ڈالر دیے ہیں لیکن پاکستان نے دوغلے پن سے کام لیا ہے اور امریکہ کی توقعات کو پورا کرنے کی بجائے جھوٹ اور فریب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں پاکستانی حکومت کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ یہ مبینہ رقم جو ابھی تک پوری ادا بھی نہیں ہوئی، خیرات یا امداد نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ جنگ کے اخراجات میں امریکہ کا واجب الادا حصہ ہے جسے امداد کا نام دینا درست نہیں ہے اور ہم اس رقم کا پورا حساب رکھتے ہیں، جبکہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جو قربانیاں دی ہیں اور جو اقدامات کیے ہیں انہیں تسلیم نہیں کیا جا رہا۔

اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی، عسکری اور دینی حلقوں کی طرف سے امریکی صدر کے اس بیان کو مسترد کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور پارلیمنٹ بھی اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے رہی ہے۔ پاکستان کی حکومت، مختلف حلقوں اور اداروں کے اس ''ڈپلومیٹک سٹانس'' سے مکمل اتفاق اور اس کی بھرپور تائید کرتے ہوئے ہم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو سے جائزہ لینا چاہتے ہیں جس کا تعلق موجودہ امریکی قیادت کی نفسیات اور ذہنی سطح سے ہے اور اس حوالے سے ایک غیر رسمی مکالمہ کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امریکی اداروں کے بعض افراد کو خود میرے ساتھ ہوا تھا۔

کم و بیش دس سال قبل کی بات ہوگی کہ میں ان دنوں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے نواح میں شمالی ورجینیا کے علاقہ اسپرنگ فیلڈ کے ایک دینی مرکز دارالہدیٰ میں قیام پذیر تھا اور مختلف حوالوں سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا کہ کچھ حضرات ملاقات کیلئے تشریف لائے جو ایشین تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ ہمارا تعلق اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے ہے اور ہم آپ کے ساتھ کچھ مسائل پر گفتگو کیلئے آئے ہیں۔ میں نے خیر مقدم کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں اس کیلئے حاضر ہوں۔ انہوں نے ایک مسئلہ یہ چھیڑا کہ دہشت گردی دنیا بھر میں پھیلتی جا رہی ہے اور اس پر قابو پانے کی کوئی صورت کامیاب نظر نہیں آ رہی، ہم سمجھتے ہیں کہ اس عسکریت اور دہشت گردی کا سرچشمہ وہ جہادِ افغانستان ہے جو سوویت یونین کے خلاف کم و بیش ایک عشرہ تک جاری رہا اور اس میں دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے آکر ہزاروں مسلمانوں نے عملاً حصہ لیا اور وہ اب دنیا بھر میں اس عسکریت کو پھیلانے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کی کیا

رائے ہے؟

میں نے گزارش کی کہ ہمیں اس سلسلہ میں حقیقت پسندی سے کام لینا ہوگا اور معروضی حقائق کی بنیاد پر صورتحال کا تجزیہ کر کے مسئلہ کا حل نکالنا ہوگا ورنہ ہم کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح مداخلت کے خلاف افغان عوام نے قومی خود مختاری اور دینی تشخص کی بحالی کیلئے جہادِ افغانستان کے عنوان سے بغاوت کی تھی جس میں امریکہ اور عالمی برادری نے ان کا ساتھ دیا تھا اور سیاسی و اخلاقی سپورٹ کے ساتھ ساتھ بھرپور مالی و عسکری امداد بھی دی تھی۔ اس جنگ میں پاکستان کا حصہ سب سے بڑا تھا کہ لاکھوں افغان مہاجرین نے پاکستان میں پناہ حاصل کی تھی جبکہ ہزاروں پاکستانی نوجوان اس جنگ میں عملاً شریک ہوئے تھے۔ افغان روس جنگ میں کامیابی اور سوویت یونین کی پسپائی کے بعد جہادی کیمپ کے چاروں فریق (۱) مجاہدینِ افغانستان (۲) امریکہ اور دیگر عالمی حمایتی (۳) پاکستان کی جہادی تنظیمیں اور ان کے پشت پناہ ادارے (۴) مختلف ممالک سے آنے والے ہزاروں مجاہدین باہمی طور پر مغالطوں اور تحفظات کا شکار ہو گئے جس سے سب کا رخ الگ الگ ہو گیا۔ اور اس کے بعد اب تک جو کچھ ہوا ہے، ہو رہا ہے یا ہونے جا رہا ہے اسی کا شاخسانہ ہے۔

امریکہ اور اس کے حواریوں کو یہ مغالطہ تھا کہ ہم نے ان مجاہدین کو پیسے دے کر سوویت یونین کے خلاف ان سے جنگ لڑوائی ہے اور انہیں یہ توقع تھی کہ ان کے اگلے ایجنڈے میں بھی یہ مجاہدین اسی طرح ان کا ساتھ دیں گے، وہ مجاہدین کو کرائے کے سپاہی سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ صورتحال اس کے برعکس تھی، مجاہدین کا اپنا ایجنڈا تھا اور اپنے نظریاتی اور قومی اہداف تھے جو امریکہ کے اگلے علاقائی ایجنڈے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے بلکہ اس سے متصادم تھے۔

دوسری طرف مجاہدین کی بڑی تعداد کا خیال تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغان عوام کی اس جنگ کو آزادی اور خود مختاری کی جنگ سمجھ کر ان کا ساتھ دیا ہے، وہ آج کے امریکہ کو جارج واشنگٹن، ابراہام لنکن اور تھامس جیفرسن کا امریکہ سمجھ رہے تھے جو قوموں کی آزادی اور خود مختاری کا علمبردار تھا اور انہیں سپورٹ کیا کرتا تھا۔ جبکہ وہ امریکہ تو اسی وقت دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا تھا جب امریکہ بہادر نے جاپان پر ایٹم بم برسائے تھے اور کوریا اور ویتنام کو فوج کشی کا نشانہ بنایا تھا۔ بہرحال دونوں طرف کے ان مغالطوں نے جہادِ افغانستان میں شریک فریقوں کے راستے نہ صرف الگ الگ کر دیے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا کر دیا اور یہ محاذ آرائی دن بدن پھیلتی جا رہی ہے۔

میں نے ان حضرات سے گزارش کی کہ اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ جہاد افغانستان جسے دنیا میں عسکریت یا دہشت گردی کی موجودہ ہمہ گیر لہر کا سرچشمہ سمجھا جا رہا ہے اس میں شریک تمام فریق ایک دوسرے کا وجود تسلیم کریں، ایک دوسرے کے کردار کا اعتراف و احترام کریں اور مل بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل نکالیں جو ان کی مشترکہ جدوجہد اور جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اور جس نے پوری دنیا کو بدامنی کی جولانگاہ بنا دیا ہے۔

اس کے ساتھ ایک بات میں نے یہ بھی عرض کی کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی یہ حکمت عملی چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی تنازعہ یا معاملہ میں فریق مخالف سے گفتگو اور مذاکرات کیلئے اصل فریق سے بات کرنے کی بجائے میز کی دوسری طرف بھی اپنی مرضی کے افراد کو بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے معاملات طے نہیں ہو پاتے۔ یہاں یہ حکمت عملی نہیں

چلے گی بلکہ جہاد افغانستان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کیلئے جہاد افغانستان کے اصل فریقوں کو مل بیٹھنا ہوگا، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا اور ایک دوسرے کے کردار کا اعتراف کرنا ہوگا۔ اگر امریکہ اس کیلئے تیار ہے تو اس کی راہ ہموار کرنے کی محنت کی جاسکتی ہے ورنہ وہی کچھ ہوتا رہے گا جو اب ہو رہا ہے۔

یہ ایک مسئلہ تھا، دوسرے دو مسئلوں کی بات پھر کسی وقت عرض کی جائے گی، ان حضرات نے تو اس کے بعد اب تک اس گفتگو کو آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ اس موقع پر ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ امریکہ سے بات کرتے ہوئے اس کی موجودہ قیادت کی نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ملالہ دیوی اور قندوز و کشمیر کے شہداء

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۵ اپریل ۲۰۱۸ء

ملالہ دیوی کی وطن واپسی اور قندوز کے دینی مدرسہ پر امریکی ڈرون حملہ کی خبریں ایک ہی دن قومی اخبارات میں پڑھنے کو ملیں اور ذہن میں ان دونوں خبروں کے باہمی تعلق کے حوالے سے کئی سوالات گردش کرنے لگے۔ دیوی کے درشن میں ہمارے محترم وزیراعظم شریک تھے اور یہ خبریں بھی سامنے آئیں کہ ملالہ نے کہا ہے کہ میں وزیراعظم نہیں بننا چاہتی، جبکہ مستقبل میں وزیراعظم کے عہدہ کے ایک بڑے امیدوار سیاستدان نے کہا ہے کہ وہ اسے وزیر تعلیم بنائیں گے۔

سوشل میڈیا میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بہت کچھ پڑھنے میں آیا اور مجھے تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ایک صدی قبل کا وہ منظر یاد آگیا کہ جب خلافت عثمانیہ کا تیاپانچہ کرنے کے بعد مشرق وسطٰی کے بہت سے خاندانوں کو اس علاقہ کی بندر بانٹ میں شریک کر کے ان کی خاندانی حکمرانی کو جمہوریت کے علمبرداروں نے ان کا حق قرار دے دیا تھا اور ان کے ساتھ باقاعدہ معاہدات کیے تھے کہ یہ خاندان عالمی آقاؤں کے مفادات کی نگہبانی کریں گے اور اس کے بدلے میں یہ آقا ان کی خاندانی حکومتوں کو تحفظ دیتے رہیں گے تو مصر، لیبیا، عراق، یمن اور بعض دیگر علاقوں کے خاندانی حکمران فوجی اور عوامی بغاوتوں کا سامنا نہ کر سکے اور منظر سے غائب ہوگئے۔ جبکہ بعض خاندان بدستور ان معاہدات کے مطابق پوری وفاداری کے ساتھ حکمرانی کر رہے ہیں اور حق الخدمت بھی ادا کرنے میں مصروف ہیں۔ مثال کے طور پر شام کے حکمران خاندان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ موجودہ صدر بشار الاسد کے دادا کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا کہ شام کی سنی مذہبیت اور علمیت کو کارنر کرنے یا کم از کم کنٹرول میں رکھنے کیلئے وہ شام کا نظم سنبھالیں گے۔ ایک مذہبی اقلیت سے تعلق رکھنے کے باوجود اس خاندان کو جس طرح اقتدار میں لایا گیا یہ عالمی حکمرانوں کی چابکدستی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دادا کے ساتھ معاہدہ کے بعد بشار کے والد حافظ الاسد کو شام سونپ دیا گیا اور اس نے شام کو بہرحال اپنے ڈھب پر لگا لیا۔ اب اس خاندان کی تیسری پشت بشار الاسد کی صورت میں اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے اور بالاتر قوتیں اپنے تمام تر اختلافات اور باہمی مفادات کے ٹکراؤ کے باوجود بشار الاسد کے ہر حال میں تحفظ پر نہ صرف پوری طرح متفق ہیں بلکہ عملاً کر بھی رہی ہیں۔

اسی آئینے میں مشرق وسطیٰ کے دیگر خاندانی حکمرانوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے اور تاریخ کے جن طلبہ نے ان خاندانوں کے ساتھ عالمی حکمرانوں کے وہ معاہدات پڑھ رکھے ہیں وہ اس بات پر ان سب کو داد دینے پر مجبور ہیں کہ ایک صدی قبل کے ان معاہدات کے کم و بیش سبھی فریق پوری دل جمعی کے ساتھ نسل در نسل ان کے پابند ہیں اور حقِ وفاداری ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے موقع پر کسی خاندان سے تو اس قسم کا معاہدہ ممکن نہیں تھا البتہ ایک خود ساختہ مذہبی اقلیت کو اس کیلئے تیار کیا گیا اور نوزائیدہ ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دینے کے سارے جتن کیے گئے۔ جس کی ایک جھلک سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے اس تبصرہ میں دیکھی جاسکتی ہے کہ قادیانی گروہ اس ملک میں وہ حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے تاکہ ملک کی کوئی پالیسی اور فیصلہ ان کی منشا کے خلاف طے نہ ہونے پائے۔ مگر پاکستان کا مولوی مشرق وسطیٰ کی مذہبی قیادت سے مختلف نکلا اور یہ ٹیڑھی پسلی والا مولوی اس منصوبے میں کباب کی ہڈی بن گیا، اس نے نہ صرف بھرپور مزاحمت کی بلکہ مسلسل محنت کے ساتھ پوری قوم کو اپنا ہمنوا بنالیا اور شام کی طرح پاکستان میں ایک معمولی مذہبی اقلیت کے ہاتھ میں پورے ملک کی باگ ڈور تھما دینے کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔

اس پس منظر میں ملالہ دیوی کے عالمی پروٹوکول اور اسے دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے ہوئے اس کے منہ سے ملک کا وزیراعظم بننے اور نہ بننے کی باتیں سن کر بسا اوقات ہنسی آنے لگتی ہے کہ ”نوبت بایں جارسید“۔ گذشتہ روز وزیراعظم اور وزیر تعلیم کے حوالے سے مذکورہ خبریں پڑھ کر دوسری جنگ عظیم کے دوران کا ایک لطیفہ ذہن میں تازہ ہوگیا کہ برطانوی فوج کیلئے پنجاب میں جبری بھرتی کے دوران ایک میراثی خاندان کا نوجوان بھی پکڑ کر بھرتی کرلیا گیا تو اس کی ماں فریاد لے کر بھرتی آفس پہنچ گئی اور کہا کہ مجھ غریب عورت کے بیٹے کو آخر کیوں پکڑ لیا گیا ہے؟ بھرتی افسر نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ اس اعزاز کو پسند نہیں کرتی کہ اس کا بیٹا برطانیہ عظمیٰ کی ملکہ معظمہ کی فوج کا سپاہی بنے؟ اس خاتون نے جواب دیا کہ مجھے اس پر اعتراض تو نہیں ہے مگر جب معاملہ اس نوبت تک آپہنچا ہے تو ملکہ معظمہ کو میرا مشورہ ہے کہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اب جرمنوں سے صلح ہی کرلے۔

بہرحال اس فضا میں ملالہ دیوی پاکستان کا چار روزہ دورہ مکمل کرکے اپنے خاندان سمیت وطن واپس سدھار گئی ہے مگر اس کے جاتے ہی قوم کو قندوز کے دینی مدرسہ پر امریکی ڈرون حملہ میں قرآن کریم حفظ کرنے والے سو سے زائد بچوں کی شہادت کی خبر بھی مل گئی ہے جو شاید ملالہ دیوی کو الوداعی سلامی کی کوئی صورت ہو۔ جہاں تک ان معصوم بچوں کی مظلومانہ شہادت کا تعلق ہے وہ اسی تگ و دو کا تسلسل ہے جو غیور و جسور افغان قوم پہلے ایک عرصہ تک سوویت یونین کی فوجی جارحیت اور پھر امریکی اتحاد کی لشکرکشی کا سامنا کرتے ہوئے گذشتہ تین نسلوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور اس باحمیت قوم نے دنیا پر واضح کردیا ہے کہ یہ مزاحمت افغانستان کی سرزمین پر بیرونی جارحیت کے مکمل خاتمہ اور اس کے آئندہ امکانات کے سدباب تک بہرحال جاری رہے گی۔ افغانستان کے ان شہداء کے ساتھ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی جارحیت کا شکار ہونے والے مظلوم کشمیر شہداء کا تازہ خون بھی شامل ہوگیا ہے کہ وہ بھی بھارت کی فوجی جارحیت کا سامنا کررہے ہیں اور اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں۔ ہم قندوز اور مقبوضہ کشمیر کے شہداء کی تازہ ترین قربانیوں پر انہیں خراج

عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور اس سے کشمیر اور افغانستان کی آزادی کی منزل ان شاء اللہ تعالیٰ قریب آئے گی:

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

موجودہ صورتحال میں افغان طالبان کا موقف

روزنامہ انصاف، لاہور--- ۶ جون ۲۰۱۸ء

امریکی وزیر خارجہ مائیک پومیو نے گذشتہ دنوں سینٹ کی خارجہ امور سے متعلقہ کمیٹی کو بریفنگ دیتے ہوئے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کے سلسلہ میں نئی حکمت عملی اختیار کرنے کا عندیہ دیا ہے جس کا بنیادی نکتہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ طالبان کو مذاکرات پر لانے کیلئے ہر ممکن دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور اس سلسلہ میں ان کے بقول افغان طالبان کی صفوں میں ''درست قیادت'' کی شناخت کی ضرورت ہے جو امن مذاکرات میں شرکت کر سکے۔

افغان طالبان کے ساتھ براہ راست مذاکرات کی کوشش اور انہیں بہر صورت مذاکرات کی میز پر لانے کی اس مہم سے اتنی بات تو واضح ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عسکری میدان میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب وہ مذاکرات کی میز پر طالبان کو اپنے ایجنڈے میں سیٹ کرنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ جہاں تک مذاکرات کا تعلق ہے وہ تو اچھی بات ہے کہ ایسے معاملات کا فیصلہ بالآخر مذاکرات کی میز پر ہی ہوتا ہے لیکن اس کیلئے طالبان پر ہر ممکن دباؤ ڈالنے کے ساتھ ان کی صفوں میں ''درست قیادت'' کی شناخت کی بات عجیب ہے۔ گویا امریکہ بہادر مذاکرات کی میز پر طالبان کی نمائندگی کیلئے ایسے لوگوں کو لانے کا خواہشمند ہے جو اس کے مطلب کے ہوں اور اس کے ایجنڈے کو مذاکرات کے فیصلوں کی شکل دینے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق طالبان کی صفوں میں ایسی ''درست قیادت'' کو صرف شناخت نہیں کیا جا رہا بلکہ ایسی قیادت تیار کرنے کی کوششیں بھی ایک عرصہ سے جاری ہیں جو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہیں اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے۔

انہی میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے کچھ مذہبی حلقوں اور علماء سے یہ کہلوایا جائے کہ افغان طالبان جو کچھ کر رہے ہیں وہ شریعتِ اسلامیہ کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں شریعت کا حکم یا تقاضا یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور وہ مذاکرات کی میز پر جو ایجنڈا بھی پیش کریں اسے ان کی مہربانی سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس حوالے سے دنیا کے مختلف حصوں میں ''علماء کانفرنسوں'' کا ایک جال بچھایا جا رہا ہے جن میں سے ایک کانفرنس انڈونیشیا میں ہو چکی ہے اور اس کی خبریں پریس کی زینت بن چکی ہیں۔ اس حوالے سے افغان طالبان کی ''امارتِ اسلامیہ افغانستان'' کی طرف سے دنیا بھر کے علماء اسلام کے نام ایک خط بھجوایا گیا ہے جو ان کے موقف کی وضاحت کرتا ہے مگر عالمی اور علاقائی میڈیا افغان طالبان کے خلاف ہمہ نوع خبروں اور تبصروں کی یلغار کے ماحول میں ان کے موقف کو تھوڑی سی جگہ دینے کیلئے بھی تیار نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ہر لحاظ سے ان کا جائز اور مسلّمہ حق ہے کہ ان کے

موقف کو ان کی زبان میں سامنے لایا جائے اور انہیں یکطرفہ میڈیا یلغار کے ماحول سے نکالا جائے۔ اس خیال سے ہم امارتِ اسلامی افغانستان کے اس مکتوب کو اپنے کالم کا حصہ بنا رہے ہیں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے بارے میں خود کیا کہتے ہیں۔

"قابل قدر علمائے کرام و مشائخ عظام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے امید ہے آپ صحت و عافیت کے ساتھ ہوں گے۔ ہم امارت اسلامی افغانستان کے منسوبین و متعلقین اور تمام افغان عوام کی نمائندگی کے ساتھ نیک تمنائیں اور اسلامی اخوت کی محبتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ افغانستان گذشتہ سترہ سال سے وقت کے سب سے بڑے طاغوت امریکہ کی جارحیت کا شکار ہے۔ امریکہ چاہتا ہے افغانستان اس کی ایک مقبوضہ ریاست بن جائے، وہ یہاں عسکری مراکز اور انٹیلی جنس اڈے قائم کرے تاکہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے سنگم پر واقع اسلامی دنیا کے اہم ترین خطے افغانستان کی اسٹریٹیجک حیثیت استعمال کر کے عالم اسلام کو کمزور اور ختم کرنے کی سازشیں کر سکے۔ اگر امریکہ افغانستان سے متعلق اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے پاکستان، ہندوستان، وسطی ایشیا اور عرب ممالک میں بھی اسلامی فکر، مدارس دینیہ، علمائے کرام اور دین دار مسلمانوں کے مصائب و مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ مذکورہ ممالک کی مسلم آبادی بھی مغربی شیطانی دسیسہ کاریوں کا ہدف بنے گی، لادینیت اور گمراہی زور پکڑے گی، مغرب کی حمایت و تعاون سے سیکولر طبقہ اور فساق و فجار مضبوط ہوں گے، امت مسلمہ کے زوال کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا۔ ماضی قریب کے عظیم مفکرین علامہ اقبال، شکیب ارسلان اور دیگر نے افغانستان کو ایشیا اور اسلامی دنیا کا دل قرار دیا ہے، اگر خدانخواستہ امریکہ مسلم دنیا کا دل اجاڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس طرح امت مسلمہ اور دینی سلسلوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسلام کے سچے پیروکاروں کے خلاف موجود خطرات میں کئی گنا اضافہ ہوگا۔

تاریخ کے اس خطرناک موڑ پر نجات کا راستہ یہ ہے کہ افغانستان میں امریکی جارحیت کے خلاف امارت اسلامیہ افغانستان کی جہادی صف کو مضبوط کیا جائے، اسے جانی، مالی، اخلاقی اور روحانی تعاون اور حمایت بہم پہنچائی جائے۔ للہ الحمد! امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے ۱۷ سال تک ۴۸ کفریہ جارح قوتوں کے خلاف استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے اب بھی برطانیہ اور سوویت یونین کی طرح امریکی جارحیت کو شکست دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں امریکہ

افغانستان میں کامیاب ہونے کیلئے سترہ سالہ دور میں اپنی تمام تر عسکری طاقت آزما چکا ہے۔ وہ اپنے اسلحہ گودام کے تمام تر خطرناک ہتھیار استعمال کر چکا ہے۔ ہر طرح کی حکمت عملیاں بروئے کار لا چکا ہے۔ جب کہ کامیابی کا ابھی کوئی امکان نہیں ہے۔ گذشتہ سال اسلام و عالم اسلام کے سخت دشمن امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے افغانستان کیلئے اپنی نئی حکمت عملی سامنے لائی۔ ٹرمپ کی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر افغانستان میں امریکی درندہ صفت فوج کے سربراہ جنرل نیکولسن نے ۱۸ مارچ ۲۰۱۸ء کو ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:

”امریکہ اس سال طالبان (امارت اسلامیہ) پر مختلف طریقوں سے دباؤ بڑھانا چاہتا ہے۔ ہم طالبان پر عسکری، سیاسی، حتیٰ کہ مذہبی دباؤ بھی ڈالیں گے تاکہ وہ جنگ سے دستبردار ہو جائیں۔ مذہبی دباؤ سے میرا مطلب یہ ہے کہ افغانستان، پاکستان اور کچھ دیگر ممالک کے مسلم علماء کی کانفرنسز منعقد کی جائیں گی، ان کانفرنسوں میں طالبان کے خلاف فتویٰ جاری کر کے ان کے جہاد کی شرعی حیثیت کو اسلامی نکتہ نگاہ سے چیلنج کیا جائے گا۔“

اب جب کہ ان کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ عنقریب کابل، اسلام آباد اور سعودیہ میں بھی ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں گے، ہم علمائے کرام اور مشائخ عظام سے یہ درخواست اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اس جیسی کانفرنسوں میں شرکت محض سے بھی احتراز کیا جائے۔ کیوں کہ سمجھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اگرچہ اس کانفرنس کا موضوع اور عنوان دینی ہے، اس میں عالم اسلام کے مسائل پر بھی بات کی جاتی ہے، اسے مسلم علماء کی مجلس قرار دیا جاتا ہے، مگر اس کا ہدف اور مقصد غلط ہے۔ اس کا اصل محرک اسلام کا شدید مخالف امریکہ ہے۔ وہ چاہتا ہے ان کانفرنسوں کے ذریعے افغانستان میں جاری جہاد کو کمزور کیا جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمائے کرام اس طرح کی کانفرنسوں میں جس نیت سے بھی شریک ہوں، جس مجبوری کی وجہ سے بھی شرکت کریں، دشمن بہرحال آپ کی وہاں شرکت محض سے بھی فائدہ اٹھائے گا۔ ایسے اجتماعات میں علمائے کرام جتنی بھی حق بات کہہ لیں، دشمن اسے کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ دشمن کانفرنس کی انہی باتوں کو اچھال کر پروپیگنڈا کرے گا جو اس کے حق میں ہوں گی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ انڈونیشیا کانفرنس میں کچھ شیوخ کرام نے کتنی اچھی اور معقول باتیں کہیں مگر میڈیا نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ حتیٰ کہ ان پر سرسری تبصرے سے بھی گریز کیا گیا۔ صرف وہی کچھ میڈیا اسکرین پر نمایاں کیا جو امریکی مفاد میں تھا۔ حتیٰ کہ بعد ازاں علماء کو بدنام کرنے کیلئے یہ بات بھی پھیلائی گئی کہ کابل انتظامیہ اور انڈونیشیا حکومت نے علماء کو ڈالروں کے پیکٹ دیے تھے۔ یعنی امریکہ ہر حال میں اپنے شیطانی مقاصد کی

تکمیل چاہتا ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی کانفرنسوں میں شرکت علماء کرام کی معاشرتی ساکھ کو نقصان پہنچاتی ہے جس سے علماء، طلباء، عام مسلمان اور مجاہدین کے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے جن قابل قدر علمائے عظام نے ساری زندگی مدرسہ و مسجد کے استغناء میں گزار دی ہے جو کہ للہ فی اللہ امت مسلمہ کے شان دار مستقبل کیلئے ایک عظیم دینی خدمت ہے، ایسی مجالس میں شرکت سے ان کی سالہا سال کی محنت و مشقت سے قائم ہونے والا شخصی و دینی وقار ضائع ہو کر رہ جاتا ہے، ان کی شخصیت کا احترام کمزور ہو جاتا ہے، نتیجۃً عوام میں ان کا تعارف، حکومتی اور درباری ملا والا بن جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اسلام، مسلمانوں اور خود علمائے کرام کی عزت و توقیر اور خیر و بھلائی اس میں ہے کہ ایسی مجالس سے گریز کیا جائے تاکہ اسلام دشمن قوتیں انہیں اپنے شیطانی اہداف کیلئے استعمال نہ کر سکیں۔ اللہ رب العزت ہم اور آپ سب کو دشمن کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ فرمائے، آمین یارب العالمین۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امارت اسلامیہ افغانستان"

افغان حکومت اور طالبان کے مبینہ مذاکرات: دو اہم موقف

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۳ جولائی ۲۰۱۸ء

۱۲ جولائی کے قومی اخبارات میں اے ایف پی کے حوالے سے شائع ہونے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں او آئی سی کے زیر اہتمام ۱۰۰ کے لگ بھگ مسلم اسکالرز کے ایک اجتماع میں افغان حکومت اور طالبان سے مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا حل نکالنے کی اپیل کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری طرف امارت اسلامیہ افغانستان نے بھی اس سلسلہ میں اپنا موقف جاری کیا ہے، صورتحال کو معروضی تناظر میں صحیح طور پر سمجھنے کیلئے دونوں کا مطالعہ ضروری ہے اس لیے ہم سردست یہ دونوں موقف قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مناسب موقع پر کر دیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

او آئی سی کے زیر اہتمام منعقدہ اسکالرز کانفرنس کا موقف:

"مکہ (اے ایف پی) مکہ مکرمہ میں ہونے والے دو روزہ اجلاس میں ۱۰۰ سے زائد مسلم اسکالرز نے افغانستان میں فوری قیام امن کی اپیل کر دی۔ او آئی سی کی طرف سے منعقد کی جانے والی عالمی کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ ہم سب افغان حکومت کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ امن و استحکام کیلئے افغان حکومت اور طالبان کو امن کیلئے مذاکرات کی میز پر بیٹھنا چاہیے، عسکریت پسندوں کی حکومت کے

خلاف جنگ غیر قانونی ہے، عسکریت پسند ہتھیار پھینک کر قومی دھارے میں شامل ہوں اور افغانستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ او آئی سی افغان حکومت کو ہر قسم کی مدد دے گی۔ تنظیم کے سیکرٹری جنرل یوسف العثیمین نے اجلاس کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فریقین فوری عارضی جنگ بندی کا معاہدہ کریں اور اس کا احترام کرتے ہوئے براہ راست مذاکرات کریں۔

اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے منعقدہ اجلاس کا مرکزی نکتہ افغانستان میں قیام امن کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ سعودی نیوز ایجنسی کے مطابق شاہ سلمان نے دنیا بھر سے آنے والے مسلم اسکالرز کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ سعودی عرب افغان مسئلے کا پر امن حل کیلئے پر عزم ہے۔ سعودی اخبار کے مطابق طالبان نے او آئی سی کی جانب سے مکہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ نظر انداز کر دیا تھا۔" (روزنامہ دنیا، گوجرانوالہ۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۸ء)

افغان طالبان کا موقف:

"سعودی عرب میں علماء کانفرنس کے حوالے سے امارت اسلامیہ کا اعلامیہ

رپورٹیں شائع ہو رہی ہیں کہ افغانستان سے متعلق عنقریب مملکت العربیہ السعودیہ کے جدہ شہر میں کوئی کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔ اس کانفرنس کے بارے میں امارت اسلامیہ افغانستان درج ذیل چند نکات کو قابل توجہ سمجھتی ہے۔

افغانستان میں امریکی محارب غاصبوں کے خلاف موجودہ جہاد اسلام کی نگاہ سے کفری تہاجم کے خلاف فرض عین دفاعی جہاد ہے۔ دین اسلام کے تمام اصول اور فقہی مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محارب کافروں کی تجاوز کی صورت میں مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہوجاتا ہے۔ یہ وہ واضح الٰہی حکم ہے، جس پر ہر باایمان شخص کا کامل یقین ہے۔

افغانستان میں موجودہ جہاد بین الافغانی جنگ یا قتال بین المسلمین نہیں ہے۔ یہ جنگ سترہ سال قبل اس وقت شروع ہوئی تھی، جب امریکہ نے فضائی اور زمینی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے افغانستان پر جارحیت کی اور افغان مجاہد عوام نے اس کے خلاف دفاعی جہاد شروع کیا۔ اسی دن سے افغان عوام کے خلاف اس لڑائی کے تمام منصوبہ بندی، پالیسی، اخراجات اور پیشرفت امریکہ کے ذمہ ہے، اگر بین الافغانی جنگ ہوتی، تو اس پر ڈیڑھ ٹریلین امریکی ڈالر خرچ نہیں ہوتے، اس میں ہزاروں امریکی فوجیں نہیں مارے جاتیں اور ہزاروں زخمی نہیں ہوتیں۔

فی الحال بھی اس جنگ کی نئی پالیسی امریکی صدر ٹرمپ کی جانب سے ڈیزائن اور عملی ہو رہی ہے اور اس میں طول لانے کی خاطر فوجی بجٹ امریکی کانگریس کی جانب سے منظور کیا جا رہا ہے۔ افغان عوام چشم

دیدگواہ کے طور پر مشاہدہ کررہے ہیں کہ ان کے سروں پر امریکی ہیلی کاپٹر، ڈرون اور جیٹ طیارے منڈلا رہے ہیں۔ غاصب امریکی افواج کی موجودگی افغان عوام دیکھ کر رہی ہیں۔ یہ بات حقائق سے بہت بعید ہوگی، جب کسی اور ملک میں افغان مسئلے کو بین الافغانی مسئلہ متعارف کروایا جائے۔

امریکہ کے وہ حواری جو افغانستان میں غاصبوں کی حمایت کررہا ہے، جو اپنے دین، عوام، ملکی اور ملی اقدار کے خلاف لڑ رہے ہیں اور امریکہ ان کا سپورٹ کررہا ہے۔ استعمار کی جانب ان کی موجودگی جنگی ماہیت کو بدل نہیں دے سکتی، کیونکہ وہ مستقل اور خود مختار لوگ نہیں ہے، بلکہ امریکہ کی جانب سے افغانوں پر مسلط کیے جاتے ہیں، امریکی پالیسی کو اپنا رہی ہے، یہ لڑائی ابتداء ہی میں ان کے خلاف شروع ہوئی ہے، وہ مزدور ہیں، جسطرح افغان کمیونسٹوں کی موجودگی نے سوویت یونین کے زمانے میں افغان جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ واضح الہی ارشادات موجود ہیں، کہ اگر کوئی مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دیں، تو ان کے خلاف مقابلہ مقدس جہاد ہے۔

امارت اسلامیہ کوئی باغی یا دہشت گرد گروہ نہیں ہے، بلکہ امارت اسلامیہ 30 ملین عوام کے اسلامی مطالبے اور حریت پسند مزاحمت کا نام ہے۔ امارت اسلامیہ کی عوام میں گہرے جڑیں ہیں۔ اب ملک کا 70 فیصد رقبے پر مجاہدین کی حکمرانی ہے۔ افغانستان میں امارت اسلامیہ کا افغان عوام کی امنگوں کے مطابق خود مختار اسلامی نظام کا ہدف ہے، امارت اسلامیہ شریعت کی روشنی میں عالمی تعلقات، اچھے ہمسائیہ، دوستانہ تعلقات اور اقوام کی مشترکہ پرامن زندگی کا احترام رکھتی ہے اور دنیا کیساتھ مثبت تعلقات چاہتی ہے۔ یہ بہت ناانصافی اور غیر منطقی ہوگا کہ ایک مکمل ملت جو مایہ ناز تاریخ کا حامل ہے، وہ دہشت گردی اور بغاوت سے مسمی ہوجائے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے اور انہیں ایسا عمل نہیں کرنا چاہیے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اگر کوئی بھی صرف امریکی صدر ٹرمپ اور اس کے حامیوں کی خوشی کی خاطر دین کے صریح احکام کو باطل اعلان کرتا ہے اور اللہ تعالی کی راہ کے مجاہد ملت کو باغی اور دہشت گرد کہتا ہے۔ یہ عمل امریکی غاصبوں کیساتھ جارحیت میں تعاون اور ضعیف مسلمانوں کی بیخ کنی ہے اور اللہ تعالی فرماتے ہیں:

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون۔(ھود ۱۱۳)

نیز رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

من مشی مع ظالم لیقویه وہو یعلم انه ظالم، فقد خرج من الاسلام۔(رواہ البیہقی)

افغان عوام کو مملکت سعودیہ کے حکام اور علماء سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ اسلام اور کفر کے درمیان

جنگ میں امریکی غاصبوں کا ساتھ دیں۔ افغان عوام اسلامی اخوت کی وجہ سے امید کرتی ہے کہ سعودی حکومت روسی کے خلاف جہاد کے مانند اس کٹھن حالت میں بھی افغان مستضعف عوام کا ہاتھ تھام کر ان سے تعاون کریں، افغان عوام اب بھی سعودی عرب کے ان امداد کا مشکور ہے، جب روسی جارحیت کے دوران افغان مجاہد عوام کیساتھ کیا گیا تھا۔

جس طرح اسلامی کانفرنس نے کمیونزم کے خلاف جہاد میں افغان عوام کی حمایت کی اور افغان عوام تاحال اس کے احسان کا مشکور ہے۔ موجودہ المیہ بھی میں اس کمیونٹی کو افغان عوام کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا چاہیے اور افغان عوام کے برحق مزاحمت کی حمایت کریں۔

آخر میں مسلمان عوام اور مجاہدین کو تسلی دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے ناصر اور قادر رب تعالی پر یقین ہے، جس طرح اللہ تعالی نے ہمارے جہاد کو انگریز اور کمیونزم کے خلاف کامیاب کیا اور اس وقت کی سپر طاقتیں صفر ہوئیں، ان کی تمام سازشیں ناکارہ ہوئیں، اسی طرح امریکی قیادت میں استعمار بھی ناکام اور ذلیل ہوکر رہیگا، ان کی سازشیں ہماری مشروع مزاحمت پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالے گی اور ان کے خلاف افغان عوام کا موجودہ جہاد کامیابی کی ساحل کی جانب بہت سرخروئی سے پہنچ جائیگا۔ ان شاءاللہ تعالی وماذالک علی اللہ بعزیز

(امارت اسلامیہ افغانستان ۔ ۱۴۳۹/۱۰/۲۵ھ ق ۔ ۱۳۹۷/۴/۱۸ھ ش ۔۔ 2018/7/9م)"

خادم الحرمین الشریفین کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۷ جولائی ۲۰۱۸ء

آج ۱۶ جولائی کے ایک قومی اخبار نے مکہ مکرمہ میں او آئی سی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی مسلم علماء کانفرنس اور دانشوروں کی حالیہ کانفرنس کے حوالے سے خادم الحرمین شریفین شاہ سلیمان بن عبد العزیز حفظہ اللہ تعالی کا ایک بیان شائع کیا ہے جس میں انہوں نے افغانستان میں جلد از جلد امن کے قیام کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے افغان حکومت اور طالبان سے کہا ہے کہ وہ مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا حل نکالیں اور فرمایا ہے کہ افغانستان میں جلد از جلد امن کا قیام سعودی عرب کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ہم اس سے قبل اس کالم میں مذکورہ کانفرنس کے اعلامیہ کے ساتھ ساتھ افغان طالبان کی "امارتِ اسلامیہ افغانستان" کا موقف بھی شائع کر چکے ہیں اور آج سعودی عرب کے محترم فرمانروا کے ارشادات کی روشنی میں انہی کی خدمت میں کچھ مؤدبانہ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

عزت مآب شاہ سلیمان بن عبد العزیز عالم اسلام کی محترم ترین شخصیت ہیں اور ان کے نام کے ساتھ خادم الحرمین

شریفین کا عنوان دیکھتے ہی ہر مسلمان کا سرِ نیاز خود بخود جھک جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ افغانستان میں امن کی خواہش ان سے زیادہ کسے ہو سکتی ہے یا کسے ہونی چاہیے؟ مگر ہم بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ از راہ کرم اس سلسلہ میں امارت اسلامیہ افغانستان کے موقف پر بھی ایک نظر ڈالنے کی زحمت فرمائی جائے تو مسئلہ کا حل جلد از جلد نکالنے میں سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔

افغان طالبان کا موقف یہ ہے کہ ان کی جنگ افغانستان کے کسی طبقہ سے نہیں بلکہ وہ امریکی اتحاد کی افغانستان میں داخل ہونے والی فوجوں کے خلاف اپنے وطن کی آزادی، خود مختاری اور اسلامی تشخص کیلئے اسی طرح لڑ رہے ہیں جس طرح انہوں نے سوویت یونین کے عسکری تسلط کے خلاف جنگ جہادِ افغانستان کے عنوان سے لڑی تھی اور دنیا کے بہت سے دیگر ممالک کی طرح سعودی عرب نے بھی انہیں سپورٹ کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کابل کی موجودہ حکومت کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ وہ بیرونی عسکری قوت کے سہارے قائم ہے اور تمام تر عسکری و مالی امداد کے باوجود اسے افغانستان کے تیس فیصد رقبہ سے زیادہ پر کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ اس لیے وہ مذاکرات کیلئے تیار ہیں لیکن کابل کی حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ وہ اصل فریق یعنی امریکہ کے ساتھ مذاکرات کریں گے اور ان مذاکرات کی پہلی شرط افغانستان سے امریکی اتحاد کی فوجوں کا انخلا ہوگا۔

جبکہ دوسری طرف امریکی حکومت کا موقف اس حوالے سے کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل چند باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اسی سال مارچ کے دوران افغانستان میں امریکی فوجوں کے سربراہ جنرل نیکلسن نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ہم طالبان پر مذاکرات کیلئے دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ مذاکرات کی میز پر آئیں اور اس کیلئے مختلف ممالک میں علماء کرام کی کانفرنسیں منعقد کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں تاکہ طالبان پر مذہبی حوالے سے بھی دباؤ ڈالا جا سکے۔ اس کے بعد جون کے دوران امریکی وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے بھی امریکی سینٹ کی خارجہ امور سے متعلقہ کمیٹی کو بریفنگ دیتے ہوئے یہی بات کہی تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ طالبان میں ”درست قیادت“ کی شناخت کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں جسے مذاکرات کی میز پر لایا جا سکے۔ جبکہ ابھی ماہ رواں کی ۹ تاریخ کو امریکی وزیر خارجہ نے کابل کے ہنگامی دورہ کے موقع پر یہ فرمایا ہے کہ امریکہ طالبان سے مذاکرات کا حصہ بننے کیلئے تیار ہے لیکن طالبان امریکی انخلا کا انتظار چھوڑ دیں۔

اس تناظر میں مسلم حکمرانوں کو اپنے دباؤ کا رخ صرف طالبان کی طرف رکھنے کی بجائے دوسرے فریق یعنی امریکی اتحاد سے بھی بات کرنا ہوگی کہ وہ افغانستان سے فوجوں کے انخلا کے بارے میں ہٹ دھرمی چھوڑ کر اصل فریقین کے درمیان بامقصد اور باوقار مذاکرات کی صورت نکالے ورنہ خالی پانی بلوتے رہنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ امریکہ بہادر کو یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اس نے ویتنام کی جنگ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۵ء تک پینتالیس ہزار سے زیادہ امریکی شہریوں کی جانوں کی قربانی کے بعد وہاں کے جنگجوؤں ”ویت کانگ“ سے براہ راست مذاکرات فوجوں کے انخلا کی شرط پر ہی کیے تھے۔ اور فوجیں نکالنے کے بعد ۱۹۹۷ء میں ویتنام کو جنگی نقصانات کی تلافی کیلئے ۱۴۶ ملین ڈالر کی رقم بھی فراہم کی تھی۔ افغانستان کی یہ جنگ اس سے مختلف نہیں ہے اور اس کیلئے کوئی یکطرفہ الگ معیار قائم کر کے امن قائم نہیں

کیا جا سکے گا۔

امریکی قیادت کو ایک اور بات بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ غیر ملکی فوجوں کی موجودگی پر اصرار کے ماحول میں کیے جانے والے معاہدات دیرپا نہیں ہوتے جس کی واضح مثال اب سے ایک صدی قبل ترکی کے ساتھ طے پانے والا "معاہدہ لوزان" ہے جس میں ترکی سے (۱) خلافت کے خاتمہ (۲) شریعت کی منسوخی (۳) اور ترکی سے باہر خلافت کے زیر حکومت رہنے والے علاقوں سے دستبرداری کی شرائط غیر ملکی فوجوں کے زیر سایہ لکھوائی گئی تھیں۔ مگر ترک عوام نے اسے قبول نہ کرتے ہوئے صرف تین عشروں کے وقفہ سے اسلامی اقدار و روایات کی طرف واپسی کا سفر عدنان میندریس شہیدؒ کے دور میں شروع کر دیا تھا جو اب تک نہ صرف جاری ہے بلکہ مسلسل پیشرفت کر رہا ہے اور حالیہ صدارتی انتخابات کے بعد ترکی اس حوالے سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے طور پر ہماری شروع سے یہ رائے رہی ہے کہ یہ معاہدہ جبری تھا اور "گن پوائنٹ" پر کرایا گیا تھا مگر اب ترکی کے صدر حافظ رجب طیب اردگان نے بھی گذشتہ سال اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ معاہدہ لوزان ترک قوم کی رائے لیے بغیر جبرًا مسلط کیا گیا تھا۔

ہم عزت مآب شاہ سلیمان بن عبد العزیز کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ گزارش کریں گے کہ وہ امریکہ بہادر سے بھی بات کریں اور عالم اسلام کے دیگر حکمرانوں کو ساتھ لے کر معروضی حقائق اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان میں قیام امن کی طرف سنجیدہ پیشرفت کریں۔ ہم جیسے خدام ان کیلئے دعاگو ہوں گے اور جہاں تک ہمارے بس میں ہوا تعاون و خدمت سے بھی گریز نہیں کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شاہ سلیمان مسلم دنیا کیلئے بزرگ باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ڈرتے ڈرتے ہم ان کی خدمت میں اپنی اس عرضداشت کے ساتھ ایک اور بات کا اضافہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا اب معاہدہ لوزان کی طرح مشرق وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کے ساتھ ایک صدی قبل کیے جانے والے دیگر معاہدات پر بھی نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے؟ ہمارے خیال میں یہ امت کی اہم ترین ضرورت ہے مگر یہ درخواست ہم خادم الحرمین الشریفین کے سوا اور کس سے کر سکتے ہیں؟

مولانا جلال الدین حقانیؒ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء

مولانا جلال الدین حقانیؒ کی وفات کی خبر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی گہرے صدمہ کا باعث بنی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور اس کے ساتھ ہی جہادِ افغانستان کے مختلف مراحل نگاہوں کے سامنے گھوم گئے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانیؒ جہاد افغانستان کے ان معماروں میں سے تھے جنہوں نے انتہائی صبر و حوصلہ اور عزم و استقامت کے ساتھ نہ صرف افغان قوم کو سوویت یونین کی مسلح جارحیت کے خلاف صف آرا کیا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں سے افغان جہاد میں شرکت کیلئے آنے والے نوجوانوں اور مجاہدین کی سرپرستی کی اور انہیں تربیت و حوصلہ کے ساتھ بہرہ ور کر کے عالم

اسلام میں جذبۂ جہاد کی نئی روح پھونک دی۔ ان کا وہ دور ہمیں یاد ہے جب وہ انتہائی بے سروسامانی اور کسمپرسی کے عالم میں سوویت یونین کی مسلح فوجوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور سوویت یونین کے مخالفین ابھی صرف تماشہ ہی دیکھ رہے تھے، انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ خدا مست لوگ آخر کس طرح دنیا کی ایک بڑی فوجی قوت کے خلاف اپنی مزاحمت کو جاری رکھ سکیں گے۔ مگر مولوی جلال الدین حقانی، پروفیسر صبغت اللہ مجددی، سید احمد گیلانی، مولوی محمد نبی محمدی، مولوی محمد یونس خالص، مولوی ارسلان رحمانی، کمانڈر احمد شاہ مسعود، انجینئر حکمت یار رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان جیسے دیگر باہمت لوگوں نے صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کی وہ روایات زندہ کر دیں جن کے تذکرے ہم اسلامی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔

سالہا سال تک یہ کیفیت رہی کہ پرانے ہتھیاروں اور خود ساختہ دیسی بموں کے ساتھ وہ روسی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے، بوتلوں میں خاص قسم کے محلول بھر کر انہیں بموں کے طور پر روسی ٹینکوں کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا اور گوریلا جنگ میں ان مجاہدین نے افغانستان کے دیہی علاقوں میں روسی افواج کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ شیرانوالہ لاہور میں ہمارے ایک بزرگ مولانا حمید الرحمان عباسیؒ کا مستقل کام یہ تھا کہ اصحابِ خیر کو توجہ دلا کر ان مجاہدین کیلئے خوراک اور دیگر ضروریات جمع کرتے رہتے اور جب ایک ٹرک کے لگ بھگ سامان جمع ہو جاتا تو خوست کے محاذ پر سپلائی کر دیا کرتے تھے، اسی طرح پاکستان کے بہت سے شہروں کے علماء اور مخیر حضرات مجاہدینِ افغانستان کی امداد کیا کرتے تھے۔ اس دور میں خوست کے محاذ پر جانے والے چند نوجوانوں نے ہمیں بتایا کہ کئی کئی روز تک سادہ روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھانے کو ملتی تھی اور فقر و فاقہ کے ماحول میں وہ مصروف جہاد رہتے تھے۔ امریکہ اور دیگر عالمی طاقتیں یہ دیکھ کر بہت بعد میں اس طرف متوجہ ہوئیں کہ افغانستان کا ایک بڑا حصہ ان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے زیر تسلط آ گیا ہے اور روسی فوجوں کی پشت پناہی کے باوجود کابل حکومت کا کنٹرول چند بڑے شہروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ جب مغربی ملکوں کو ان مجاہدین کی مسلح مزاحمت کی سنجیدگی کا اندازہ ہوا تو وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنے بلکہ ہمارے خیال میں اپنا ”لچ“ تلنے کیلئے میدان میں کود پڑے۔ پھر اسلحہ، دولت اور وسائل کی ریل پیل ہو گئی اور اسی گہما گہمی میں امریکی کیمپ نے افغان جہاد کو ہائی جیک کر کے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ ہم نے دونوں دور آنکھوں سے دیکھے ہیں، وہ دور بھی جب فقر و فاقہ اور خدا مستی کا ماحول تھا اور وہ دور بھی جب وسائل اور اسباب کی فراوانی تھی، دونوں میں بڑا فرق تھا مگر خدا شاہد ہے کہ جن حضرات نے اس فرق سے ذرہ بھر اثر نہیں لیا اور جن کے خلوص و جذبہ میں دولت و اسباب کی فراوانی کوئی تبدیلی نہ لا سکی ان میں مولانا جلال الدین حقانیؒ سرفہرست تھے۔

جہاد افغانستان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جب تک اس کا رخ سوویت یونین کی طرف تھا اور یہ لوگ امریکہ بہادر کے عالمی حریف کے خلاف نبرد آزما تھے، وہ مجاہدین کہلاتے تھے، وائٹ ہاؤس ان کا خیر مقدم کرتا تھا اور امریکی کیمپ کے مسلم ممالک بھی ان کی راہوں میں دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان کے دینی تشخص کی بحالی اور نظامِ شریعت کے نفاذ کو اپنی منزل قرار دیا تو وہ دہشت گرد قرار پائے اور ان کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ افغانستان کو ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت سے پاک ایک خود مختار ریاست بنانے کی

بات کر رہے ہیں، افغانستان کی قومی و تہذیبی روایات کے تحفظ کی بات کر رہے ہیں اور اپنے ملک میں شریعت کے نظام کے نفاذ کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تینوں باتیں آج کی دنیا میں کسی بھی مسلمان ملک کیلئے جرائم کا درجہ رکھتی ہیں، خود ہمارے ہاں پاکستان میں ان تینوں باتوں پر اصرار کرنے والے لوگ دہشت گرد یا کم از کم شدت پسند کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

مولانا جلال الدین حقانیؒ کا یہ بھی ''قصور'' تھا کہ انہوں نے جس طرح افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی جارحیت کو افغانستان کی آزادی پر حملہ تصور کر کے اس کے خلاف مزاحمت کی اور روسی کمیونزم کے نفوذ کو افغانستان کے اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کے منافی قرار دے کر اسے مسترد کر دیا، اسی طرح وہ افغانستان میں امریکی اتحاد کی افواج کی موجودگی اور مغربی فلسفہ و نظام کے تسلط کو بھی افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے وہ سوویت یونین کی فوجوں کی طرح امریکی اتحاد کی فوجوں کے خلاف بھی صف آرا ہو گئے اور اپنے اس موقف پر آخر دم تک قائم رہے۔ انہوں نے امارت اسلامی افغانستان کا ساتھ دیا اور اس کیلئے مسلسل محنت کی، آج ان کی محنت اور جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ امریکہ افغان طالبان سے مذاکرات کی میز پر آنے کا مطالبہ کر رہا ہے اور اس کیلئے ہر جتن کر رہا ہے مگر افغان طالبان جن کے پاس خود امریکی حلقوں کی رپورٹوں کے مطابق افغانستان کے بیشتر علاقوں کا کنٹرول ہے، مذاکرات کی میز سجانے سے پہلے افغانستان سے امریکہ کے مکمل انخلا کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ افغانستان کی آج کی معروضی صورتحال اور زمینی حقائق اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ افغانستان کی مکمل خود مختاری، غیر ملکی مداخلت سے نجات اور نفاذ شریعت کی جنگ لڑنے والے اس جنگ کی طوالت سے خوفزدہ نہیں ہیں کیونکہ جنگیں ان لوگوں کی سرشت میں داخل ہیں، البتہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں مولانا جلال الدین حقانیؒ ان سے جدا ہو گئے ہیں جو بلاشبہ بہت بڑا صدمہ ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور افغان قوم کو ان کے مشن اور جذبات کے مطابق مکمل خود مختاری سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

اس کے ساتھ ایک اور خبر ہمارے خاندان اور متعلقہ دینی حلقوں کیلئے صدمہ کا باعث بنی ہے کہ جمعیۃ علماء برطانیہ کے راہنما اور جامع مسجد برنلی مانچسٹر کے خطیب مولانا عزیز الحق ہزاروی گزشتہ روز راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ہماری بڑی ہمشیرہ کے داماد اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل تھے۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور اہل خاندان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

---

۱۴ ستمبر ۲۰۱۲ء کو روزنامہ وزارت، لاہور میں شائع ہونے والے انٹرویو کا ایک سوال

وزارت: حقانی نیٹ ورک پر لگنے والے امریکی الزام کے بعد طالبان کا ردعمل کیا ہو گا؟

جواب: یہ حربہ طالبان پر مذاکرات کے حوالے سے دباؤ ڈالنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ مختلف

حوالوں سے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے نقشہ میں طالبان کے کردار پر گفتگو چل رہی ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہی کے ایک حصہ حقانی نیٹ ورک کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں حالیہ امریکی اقدامات کا مقصد اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ مذاکرات کے دوران طالبان کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ مستقبل میں ان کے کردار کو محدود سے محدود تر کیا جا سکے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بے فائدہ بات ہے اس لیے کہ طالبان نے گذشتہ ۱۰ برسوں کی جنگ میں اپنی پوزیشن دنیا سے تسلیم کروالی ہے، لہٰذا فیصلے تو اسی تناظر میں ہوں گے۔

افغان تنازعہ کا تاریخی پس منظر اور اس کا نیا راؤنڈ

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۴ ستمبر ۲۰۱۸ء

پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے حالیہ دورۂ افغانستان کے بعد افغان تنازعہ ایک نئے دور میں داخل ہوتا دکھائی دے رہا ہے جس سے امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان مذاکرات کی میز بچھانے کیلئے از سرنو کوششوں کا آغاز ہوگیا ہے۔ اس مرحلہ میں نئی تجاویز اور امکانات کا جائزہ لینے سے قبل اب تک کی مجموعی صورتحال پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری محسوس ہوتا ہے اس لیے ہم اپنے ایک طویل تجزیاتی مضمون کے کچھ متعلقہ حصے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے نومبر/دسمبر ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور ہماری ویب سائیٹ پر ''مذہبی طبقات، دہشت گردی اور طالبان'' کے عنوان سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کے جہادِ افغانستان اور امارتِ اسلامیہ افغانستان سے متعلقہ کچھ حصے درج ذیل ہیں:

یہ گزارشات دوبارہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر افغان تنازعہ کو حل کرانے کی کوشش کرنے والی قوتیں سنجیدہ ہیں تو انہیں اس کے اسباب و عوامل، واقعاتی ترتیب اور زمینی حقائق کو پوری طرح سامنے رکھنا ہوگا ورنہ محض لیپاپوتی سے بالاتر قوتیں کوئی نیا ''جنیوا معاہدہ'' تو شاید اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ میں شامل کر لیں مگر اس سے افغان مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ تنازعہ ختم ہو سکے گا۔ سردست ان قوتوں سے، جو امریکہ اور امارت اسلامیہ افغانستان کے درمیان مذاکرات کیلئے سرگرم عمل ہیں، ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کی کوششوں سے اصولی طور پر اتفاق ہے اور ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ بامقصد اور سنجیدہ مذاکرات کے ذریعے یہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو تاکہ افغان قوم کسی حد تک سکھ کا سانس لے سکے۔ لیکن اس کیلئے ہمارے خیال میں چند فطری اور بنیادی اصولوں کو بہرحال پیش نظر رکھنا ہوگا، مثلاً یہ کہ:

- افغان قوم کی تہذیبی روایات اور دینی اقدار کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے لیے شریعت اسلامیہ کے عملی نفاذ کا فیصلہ کر رہے ہیں، جس کیلئے اگرچہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بے ترتیبی سے کام کیا ہے، لیکن بہرحال ان کی روایتی تہذیب و ثقافت کے تحفظ و تسلسل کو ان کا قومی حق تسلیم کرتے ہوئے ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے اور ان پر بیرونی تہذیب مسلط کرنے سے گریز کرنا اس مسئلہ کے

مستقل حل کیلئے ناگزیر ہے۔

- بین الاقوامی معاہدات میں ان کی جبری شمولیت کے تاثر کو دور کیا جائے اور انہیں اپنی آزاد و خود مختار قومی حکومت کے قیام کے بعد پورے اطمینان اور عوامی اعتماد کے ساتھ ان معاہدات میں شمولیت کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے۔
- اور سب سے بڑی بات کہ امریکی اتحاد افغانستان میں اپنی عسکری موجودگی برقرار رکھنے کی بے جا ضد چھوڑ دے اور اسے اپنی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے افغانستان سے بیرونی فوجوں کی واپسی کی حتمی تاریخ کا واضح اور دوٹوک اعلان کرے۔

ہماری خواہش ہے کہ افغان عوام کو اس مسلسل تکلیف دہ کشمکش سے جلد نجات ملے، مگر یہ ان کے ایمان اور تہذیب کی قیمت پر نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد ان کی قومی خود مختاری، وحدت و سالمیت اور نظریاتی و تہذیبی شناخت کے تحفظ پر ہو کیونکہ اسی صورت میں یہ مسئلہ مستقل اور پائیدار طور پر حل ہو سکتا ہے۔

مولانا سمیع الحق شہیدؒ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء

۱۳ نومبر منگل کو جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ میں حضرت مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی یاد میں تعزیتی سیمینار کا اہتمام تھا جس میں مولانا شہیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ عمومی دینی جدوجہد کی صورتحال بھی گفتگو کا موضوع بنی اور کم و بیش اسی رائے کا اظہار کیا گیا جس کا گوجرانوالہ کے حوالے سے سطور بالا میں ذکر ہوا ہے۔ اس تعزیتی سیمینار میں جمعیت علماء اسلام (س) سیالکوٹ کے امیر حافظ احمد مصدق قاسمی، جماعت اسلامی کے راہنما جناب عبد القدیر راہی اور اہل حدیث راہنما مفتی کفایت اللہ شاکر کے علاوہ راقم الحروف نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرت مولانا سمیع الحق شہیدؒ اہل حق کے جری نمائندہ اور اکابر کی روایات کے امین تھے جن کی المناک شہادت سے ہر باشعور مسلمان دکھی اور غمزدہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کیلئے مولانا سمیع الحقؒ کی جدوجہد اور خدمات کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی ضرورت ہے تاکہ نوجوان علماء کرام اور دینی کارکن ان سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس محفل میں چند پہلوؤں کی طرف مختصراً اشارہ کروں گا۔

- مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی زندگی کا ایک دائرہ یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب مدرس اور محدث تھے، ان کی ساری زندگی تدریس و تعلیم میں گزری اور ہزاروں علماء وطلبہ نے ان سے استفادہ کیا۔
- ان کی جدوجہد کا ایک دائرہ صحافت اور تصنیف و تالیف کا تھا جس کا انہوں نے ماہنامہ الحق سے آغاز کیا اور دینی

لٹریچر میں مختلف حوالوں سے قیمتی اضافہ کرتے چلے گئے۔ فکری الحاد اور نظریاتی گمراہیوں کا مسلسل تعاقب کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی جدوجہد کی یادداشتوں، دستاویزات اور دیگر ریکارڈ کو محفوظ و مرتب کرنے کا جو کام کیا ہے صرف وہ کام ہی کئی اداروں کے کام سے زیادہ وقعت کا حامل ہے۔

- ۱۹۷۳ء کے دستور کی تشکیل و تدوین میں جن شخصیات نے دستور ساز اسمبلی میں سب سے زیادہ کام کیا ان میں حضرت مولانا عبدالحقؒ کا نام نمایاں ہے جبکہ ان کی اس علمی و دستوری جدوجہد کے پس منظر میں مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی شبانہ روز محنت کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔
- ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو ایوان کے اندر مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، پروفیسر غفور احمدؒ اور مولانا عبدالمصطفیٰ ازہریؒ جیسے بزرگوں کی محنت نمایاں تھی مگر ان کی پشت پر مولانا سمیع الحقؒ، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور مولانا عبدالرحیم اشعرؒ جیسے اہل علم تحقیقی خدمات اور پیپر ورک میں مسلسل مصروف رہے اور ان کا اس محنت میں بڑا حصہ ہے۔
- جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں مولانا سمیع الحقؒ اور مولانا قاضی عبداللطیفؒ نے سینٹ آف پاکستان میں قرآن و سنت کی دستوری بالادستی کیلئے "شریعت بل" پیش کیا تو ملک بھر میں اس کیلئے ہر سطح پر جدوجہد منظم ہوئی اور قاضی حسین احمدؒ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ، مولانا معین الدین لکھویؒ، مولانا محمد اجمل خانؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ساتھ ہزاروں علماء کرام اور کارکنوں نے "متحدہ شریعت محاذ" کے پلیٹ فارم پر پورے ملک میں پرجوش تحریک کا ماحول پیدا کر دیا۔
- افغانستان میں سوویت یونین کی لشکرکشی کے بعد افغان قوم کے جہاد آزادی کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور حضرت مولانا عبدالحقؒ نے مجاہدین اور نظریاتی کارکنوں کی جو کھیپ فراہم کی وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے فروغ، اسلامی روایات و تہذیب کے تحفظ اور فکری و اعتقادی فتنوں کے مقابلہ میں جو کردار دارالعلوم دیوبند نے پورے جنوبی ایشیا میں ادا کیا اسی کردار کو وسطی ایشیا کے دروازے پر بیٹھ کر دارالعلوم حقانیہ نے وسطی ایشیا میں پھیلا دیا اور میرے نزدیک دارالعلوم حقانیہ کو دیوبند ثانی قرار دینے کا مطلب یہی ہے۔ جبکہ اس جہاد میں بھی مولانا سمیع الحقؒ کے کردار اور محنت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور اب اسی جہاد افغانستان کو اس کے نظریاتی اہداف اور فطری ثمرات سے محروم کر دینے کیلئے امریکہ کی قیادت میں جو عالمی گٹھ جوڑ مسلسل متحرک ہے اس کے خلاف بھی مولانا سمیع الحق شہیدؒ ایک مضبوط آواز اور رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ امریکی اتحاد جو مقابلہ میدان جنگ میں نہیں جیت سکا اسے وہ مذاکرات کی میز پر اپنے حواریوں کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے، اس چال کو مولانا سمیع الحقؒ اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ ان حالات میں مولانا کی شہادت دینی حلقوں اور جہاد افغانستان کے

نظریاتی اہداف سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بطور خاص بہت بڑا صدمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سمیع الحق شہیدؒ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے ورثاء و متوسلین کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

افغان طالبان کو شاہ محمود قریشی کا مشورہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۱ دسمبر ۲۰۱۸ء

وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی کا کہنا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کا یہ موقف تسلیم کر لیا ہے کہ افغانستان میں امن و امان کے قیام کیلئے مذاکرات ہی مسئلہ کا واحد حل ہیں اور افغان مسئلہ کا کوئی فوجی حل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے افغان طالبان سے کہا ہے کہ انہیں ہتھیار چھوڑ کر مذاکرات کی طرف آنا ہوگا۔

افغان مسئلہ کے فوجی حل کیلئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جو عسکری یلغار کی تھی اس کی ناکامی کا اعتراف خود امریکی جرنیل متعدّد بار کر چکے ہیں اور یہ بات پوری دنیا دیکھ رہی ہے کہ فوجی قوت کے ذریعے افغان عوام کو زیر کرنے کا امریکی منصوبہ بھی کارگر نہیں ہو سکا جبکہ اس سے قبل برطانوی استعمار اور سوویت یونین بھی بھرپور عسکری قوت کے استعمال کے باوجود اپنے اپنے دور میں ناکام رہے ہیں۔ اور افغان عوام کی یہ قومی روایت ایک بار پھر تاریخ کے صفحات میں ثبت ہوگئی ہے کہ انہیں قوت کے زور پر زیر کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے والوں کو بہرحال ان کی غیرت و حمیت اور اسلامیت کا اعتراف کرتے ہوئے باوقار گفتگو کے ذریعے ہی باہمی مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ امریکہ کئی بار یہ تقاضہ کر چکا ہے کہ افغان طالبان مذاکرات کی میز پر آکر بات کریں اور افغانستان میں امن و امان کے قیام کیلئے گفت و شنید کا راستہ اختیار کریں۔ طالبان کو بھی اس سے انکار نہیں ہے البتہ وہ جائز طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ امریکی اتحاد کو مذاکرات سے قبل افغانستان میں اپنے فوجی مشن کو ختم کرنے کا اعلان کر کے فوجوں کی واپسی کا ٹائم ٹیبل دینا ہوگا، اس کے بغیر مذاکرات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ امریکہ اور اس کے اتحادی اس جائز اور معقول شرط کو قبول کرنے کیلئے ابھی تک تیار نہیں نظر آتے جس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنائے بیٹھے ہیں، اور یہ وجہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ جن مقاصد اور اہداف کیلئے انہوں نے افغانستان پر عسکری یلغار کی تھی وہ ان سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں اور وہی مقاصد مذاکرات کی میز پر حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ مذاکرات کے موجودہ عمل میں ہمارے خیال کے مطابق یہی پہلو کسی مثبت پیشرفت میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

سادہ سی بات ہے کہ سوویت یونین کی عسکری جارحیت کے خلاف افغان عوام نے علم جہاد بلند کیا اور اپنی قومی خود مختاری اور اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے میدان عمل میں آئے تو امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ اپنی محاذ آرائی میں اسے مفید سمجھتے ہوئے افغان مجاہدین کی حمایت کی اور انہیں مکمل سپورٹ کیا جس سے افغان مجاہدین کو سوویت یونین کے

خلاف جہاد میں کامیابی حاصل کرنے میں خاصی مدد ملی، البتہ وہ اس فریب کو نہ سمجھ سکے یا سمجھتے ہوئے بھی وقتی سہولت کی خاطر ٹریپ ہوگئے کہ افغان جہاد میں امریکی امداد افغانستان کی قومی خود مختاری اور اسلامی تشخص کی بحالی کیلئے نہیں بلکہ سوویت یونین کے بکھر جانے کی صورت میں اس خطہ میں امریکی اجارہ داری کے قیام کیلئے ہے۔ اور یہیں سے جہاد افغانستان کی صورتحال یکسر تبدیل ہوگئی، جنیوا معاہدہ اس امریکی حکمت عملی کا شاہکار تھا جس نے افغانستان کو ایک نئی خانہ جنگی اور افراتفری سے دوچار کر دیا، اس دلدل سے افغانستان کو نکالنے کیلئے افغان طالبان سامنے آئے اور قومی خود مختاری اور اسلامی تشخص کی شاہراہ پر پھر سے افغان قوم کو گامزن کر دیا، جو نہ صرف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کیلئے بلکہ دنیا کی سبھی استعماری قوتوں کیلئے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ عالمی سطح پر استعماری عزائم رکھنے والے تمام ممالک اور اقوام تمام تر باہمی اختلافات و تنازعات کے باوجود اس نکتہ پر پوری طرح متفق ہیں کہ اسلامی شریعت کو دنیا کے کسی خطہ میں ملکی قانون و نظام کے طور پر برداشت نہیں کیا جائے گا، جبکہ افغان طالبان کی امارت اسلامیہ کا بنیادی ایجنڈا ہی نفاذ شریعت ہے، چنانچہ اس سے ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوگیا جو اب تک جاری ہے۔

اس صورتحال میں جبکہ افغانستان پر امریکی اتحاد کی عسکری یلغار اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکی اور مذاکرات کی میز بچھائی جا رہی ہے، جنیوا طرز کے ایک اور معاہدے کے تانے بانے بنے جا رہے ہیں تاکہ امن و امان تو کسی درجہ میں قائم ہو جائے مگر افغانستان کی مکمل قومی خود مختاری اور افغان قوم کا اسلامی تشخص بدستور ابہام کا شکار رہے اور ان کے گرد سازشوں کا حصار مسلسل قائم رہے۔ اس موقع پر پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کا افغان طالبان کو یہ مشورہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ ہتھیار چھوڑ کر مذاکرات کی میز پر آئیں، کیونکہ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں بنتا کہ وہ امریکہ کی فوجی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے اس کی شرائط کے سامنے سرنڈر ہو جائیں اور جو کامیابی امریکی اتحاد عسکری میدان میں حاصل نہیں کر سکا اسے افغان طالبان خود مذاکرات کی میز پر طشتری میں سجا کر امریکہ بہادر کے حضور پیش کر دیں۔ ہم مذاکرات کے حق میں ہیں اور اسی کو مسئلہ کا حل سمجھتے ہیں لیکن شاہ محمود قریشی کا یہ مشورہ ہمارے نزدیک مذاکرات کیلئے نہیں بلکہ سرنڈر ہونے کا مشورہ ہے جو کسی طرح بھی پاکستان کے شایان شان نہیں ہے اور حکومت پاکستان کو اس پر بہرحال نظرثانی کرنی چاہیے کیونکہ اگر ویت نام کی جنگ میں امریکہ وہاں کے آزادی پسندوں (ویت کانگ) سے ہتھیار رکھوانے کی شرط کے بغیر مذاکرات کر سکتا ہے تو افغان طالبان کے ساتھ موجودہ پوزیشن میں مذاکرات میں آخر کیا چیز مانع ہے؟

شکریہ مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ!

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ دسمبر ۲۰۱۸ء

گذشتہ دنوں افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی کے اعلان پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ کا ایک کالم میں ہم نے شکریہ ادا کیا تو بعض دوستوں نے اس پر الجھن کا اظہار کیا، مگر اب اس سے بڑا ایک شکریہ ادا

کرنے کو جی چاہ رہا ہے اس لیے ان احباب سے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

اے ایف پی کی رپورٹ کے مطابق اپنے حالیہ دورۂ بغداد کے دوران صدر ٹرمپ نے امریکہ کے عالمی پولیس مین کے کردار کے اختتام کا اعلان کیا ہے اور اپنے (۱) سب سے پہلے امریکہ (۲) کثیر القومی اتحادوں اور (۳) مشرق وسطیٰ کی جنگوں سے علیحدگی کے فیصلوں کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ یہ انصاف نہیں کہ سب کا بوجھ ہم برداشت کریں، اب ہم ان کاموں کیلئے فنڈ نہیں دیں گے۔ صدر ٹرمپ نے کہا کہ ہم اس وقت پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں حتیٰ کہ ان ملکوں میں موجود ہیں جن کا کسی نے نام بھی نہیں سنا، یہ مضحکہ خیز صورتحال ہے۔ انہوں نے کہا کہ شام میں امریکی فوج کی تعیناتی میں توسیع کی امریکی جرنیلوں کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔ وائٹ ہاؤس کے مطابق صدر ٹرمپ نے بغداد کا یہ دورہ عراق میں تعینات فوجیوں کو کرسمس کی مبارکباد دینے کیلئے کیا تھا۔

امریکی صدر کے اس بیان کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ویسا ہی خواب جو امریکہ کے سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے صدر جان ایف کینیڈی کے دور صدارت میں واشنگٹن میں سیاہ فام امریکیوں کے ملین مارچ سے خطاب کرتے ہوئے اپنی قوم کو دکھایا تھا اور وہ صرف خواب نہیں رہا تھا بلکہ جلد ہی اس نے تعبیر کا جامہ بھی پہن لیا تھا۔ صدر ٹرمپ جب برسر اقتدار آئے تھے تو ہم نے ایک کالم میں عرض کیا تھا کہ اس قسم کے صاف گو لوگ دو دھاری تلوار ہوتے ہیں جو دونوں طرف چلنے کی یکساں صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس توقع کا اظہار بھی ہم نے کیا تھا کہ اب امریکی پالیسیوں پر پیچیدار ڈپلومیسی کی دھند کم ہوگی اور بہت کچھ صاف دکھائی دینے لگے گا، چنانچہ دھیرے دھیرے اسی طرف بات بڑھتی نظر آ رہی ہے۔

امریکہ نے پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی قیادت کے محاذ پر یورپین قوتوں کے اضمحلال کو دیکھتے ہوئے ان کی جگہ سنبھالنے کا فیصلہ کیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ہیروشیما اور ناگاساکی سے عالمی چودھراہٹ میں دھماکہ دار انٹری کے ساتھ ایک نئی اور سائنٹیفک چودھراہٹ کا آغاز کیا تھا جو کچھ عرصہ تو ریموٹ کنٹرول رہی مگر آہستہ آہستہ اس نے چلمن سرکاتے ہوئے عراق، شام اور افغانستان میں اس چودھراہٹ کا آخری سین بھی دکھا دیا۔ ورنہ جنگ عظیم اول سے پہلے کا امریکہ آج کے امریکہ سے قطعی مختلف تھا اور تاریخ کے ہمارے جیسے طالب علموں کو امریکہ کے ماضی اور حال یعنی جنگ عظیم سے قبل اور بعد کے امریکہ میں مطابقت کے پہلو تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب سے تین عشرے قبل جب میں پہلی بار امریکہ گیا تو جیفرسن کی یادگار اور پینٹاگون کے درمیان چند کلومیٹر کا فاصلہ مجھے صدیوں کا سفر لگا، اور جیفرسن کی یادگار کے سائے میں کھڑا میں سوچتا رہ گیا کہ کیا جیفرسن اسی امریکہ کا صدر تھا اور کیا ابراہام لنکن اور جارج واشنگٹن نے اسی امریکہ کیلئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا؟

یہ سوچنا امریکیوں کا کام ہے کہ گذشتہ پون صدی کی عالمی چودھراہٹ نے انہیں کیا دیا ہے اور ان سے کیا کچھ چھین لیا ہے؟ ان کا یہ سفر مستقبل کیلئے تھا یا وہ اپنے ماضی سے محروم ہونے کے راستے پر سفر کرتے رہے ہیں؟ مگر تاریخ اور سماج کے کسی طالب علم کیلئے یہ بات بہرحال اطمینان کے ایک پہلو کی حیثیت رکھتی ہے کہ امریکی صدر مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ امریکی قوم کے نفع و نقصان کو انصاف کے ترازو پر جانچنے کی سوچ رکھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے سب سے

پہلے امریکہ، کثیر القومی اتحادوں اور مشرق وسطٰی کی جنگوں سے علیحدگی کا جو ایجنڈا پیش کیا ہے اس کی نزاکتوں، حساسیت اور منفی و مثبت اثرات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اور اسی لیے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے سے ہچکچا رہے ہیں۔ مگر کسی امریکی صدر کی یہ بات بھی خوشی کی بات ہے کہ انہیں امریکہ کے عالمی پولیس مین ہونے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہم مزید تفصیلات میں جائے بغیر صدر ٹرمپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور ان سے کسی حد تک یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ شاید موجودہ امریکی قوم کو جنگ عظیم اول سے پہلے کے امریکہ سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔

افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۱۹ء

ایک عرصہ سے کان جو خبر سننے کیلئے ترس رہے تھے آج اس کا آغاز ہو گیا ہے اور امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے افغانستان سے فوجوں کی واپسی کے پروگرام کا اعلان کر دیا ہے، جس کے تحت آدھی امریکی فوج پہلے مرحلہ میں واپس جائے گی اور باقی نصف فوج کی واپسی کا بھی جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں روزنامہ دنیا گوجرانوالہ میں ۲۲ دسمبر کو شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیں جو رائٹرز اور اے ایف پی کے حوالے سے ہے:

> ”امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے افغانستان سے آدھی فوج واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا، انخلا کا عمل آئندہ چند ماہ میں شروع ہو جائے گا۔ جبکہ وزیر دفاع جیمز میٹس شام سے فوج واپس بلانے کے فیصلے پر مستعفی ہو گئے، انہوں نے استعفٰی صدر کو پیش کر دیا۔ امریکی صدر کے فیصلہ نے مغربی اتحادیوں کو پریشانی سے دوچار کر دیا۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے حکام کے حوالے سے بتایا کہ صدر ٹرمپ نے محکمہ دفاع کو حکم دیا ہے کہ افغانستان سے آئندہ مہینوں میں ۷ ہزار کے قریب فوجیوں کو نکال لیں۔ برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹرز کے مطابق افغانستان میں اس وقت موجود ۱۴ ہزار امریکی فوجیوں میں سے ۵ ہزار کو واپس بلایا جائے گا۔ رائٹرز نے ذرائع کے حوالے سے بتایا کہ اس ضمن میں منصوبہ بندی کے زبانی احکامات دیے گئے ہیں، حکام کے مطابق کتنی مدت میں فوجیوں کی تعداد میں کمی کی جائے گی؟ اس حوالے سے ٹائم لائن پر غور کیا جا رہا ہے لیکن یہ عمل ہفتوں یا مہینوں میں مکمل ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ واضح نہیں کہ افغانستان میں باقی بچ جانے والی امریکی فوجی کس طرح مختلف آپشنز جاری رکھیں گے؟ جس میں افغان فوج کی تربیت، زمینی کاروائی میں معاونت اور طالبان سمیت دیگر شدت پسند گروہوں کے خلاف فضائی کاروائیاں شامل ہیں۔ امریکی صدر افغانستان میں اپنے فوجیوں کی موجودگی کے زیادہ حامی نہیں رہے تاہم اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے غیر متوقع فیصلہ کرتے ہوئے افغانستان میں ۳ ہزار اضافی فوجی بھیجنے کا اعلان کیا تھا، جبکہ رائٹرز نے ذرائع کے حوالے سے بتایا ہے کہ صدر ٹرمپ نجی طور پر افغانستان میں امریکی فوج کی موجودگی

پر شکوہ کرتے ہیں اور حال ہی میں انہوں نے اپنے ایک اتحادی سے کہا تھا کہ ہم وہاں اتنے برسوں سے ہیں، ہم وہاں کیا کر رہے ہیں؟ ذرائع کے مطابق اب امریکی فوج میں کمی کے فیصلہ سے لگتا ہے کہ صدر ٹرمپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور ۱۷ سالہ طویل جنگ صدر ٹرمپ کیلئے ناقابل برداشت بن چکی ہے اور کابل اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وزارت دفاع کے حکام نے سی این این کو بتایا ہے کہ صدر ٹرمپ افغانستان سے فوج کا انخلا چاہتے ہیں اور وہ جنوری یا فروری کے آغاز میں سینٹ سے صدارتی خطاب کے دوران فوجیوں کی واپسی کے اعلان کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

یہ خبر اپنے مندرجات کے حوالے سے بہت سے پہلوؤں پر گفتگو کا تقاضہ کر رہی ہے مگر ہم اس مرحلہ میں خوش فہمی یا جذباتیت کے ماحول سے ہٹ کر سرِ دست دو تین گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

1. پہلی گزارش امریکی قیادت سے ہے کہ ہمیں اس کے فیصلہ سے خوشی ہوئی ہے کہ بالآخر زمینی حقائق اور معروضی تقاضوں کا ادراک کر لیا گیا ہے اور امریکی قیادت نے ان کا احترام کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اگرچہ بعد از خرابیٔ بسیار ہے مگر بہرحال خوش آئند ہے کہ ایک طویل اور بے مقصد جنگ کو کسی حد تک بریک تو لگی۔ ہمیں امید ہے کہ امریکی قیادت اس عمل کو مکمل کرنے کیلئے سنجیدگی سے آگے بڑھے گی، اس موقع پر ہمیں خدا جانے کیوں جارج واشنگٹن، ابراہیم لنکن اور جیفرسن کا امریکہ یاد آ رہا ہے جو قوموں کی آزادی، ممالک کی خود مختاری اور انسانی جان کی حرمت و قدر کا علمبردار ہوا کرتا تھا، اور امریکی قیادت سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا ہم اس دور کی طرف امریکہ کی واپسی کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟
2. دوسری گزارش پوری افغان قوم بالخصوص طالبان کی قیادت امارت اسلامیہ افغانستان سے ہے کہ یہ آپ لوگوں کے صبر و حوصلہ، استقامت و عزیمت اور تدبر و دانش مندی کا ثمرہ ہے اور آپ اس پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں، مگر ہمارے خیال میں صبر و استقامت اور حوصلہ و تدبر کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا ہے کیونکہ ہم فقیروں کو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کا ماحول دوبارہ قائم نہ ہو جائے کیونکہ جس طرح زمینی لڑائی میں پسپا ہونے والی فوجیں جاتے جاتے بارودی سرنگیں بچھا جاتی ہیں اسی طرح فکری، سیاسی اور ثقافتی پسپائی کے بعد بھی فکری بارودی سرنگوں کا جال سنبھالنے والوں کیلئے وبالِ جان بن جایا کرتا ہے جس کا ہم پاکستانی سات عشروں کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اس دامِ ہمرنگ زمین سے بچنے کیلئے ہم دو چھوٹی چھوٹی درخواستیں کر رہے ہیں کہ
   - اپنے مستقبل کا جو فیصلہ بھی کریں خدارا قومی تناظر میں کریں،
   - اور ایک مستحکم اور خود مختار اسلامی افغانستان کے ظہور میں آنے تک افغانستان سے باہر کے معاملات میں الجھنے سے خود کو بہرحال بچا کر رکھیں۔

ہماری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی، اللہ تعالیٰ افغانستان کو استحکام، خود مختاری اور اسلامی تشخص کی بحالی کی منزل سے ہمکنار کریں، آمین یارب العالمین۔

3. جبکہ تیسری گزارش ”جان کی اماں پاؤں“ کی تمہید کے ساتھ پاکستانی حکمرانوں اور مقتدر درہ سے ہے کہ خدا کیلئے پاکستان کی اسلامیت اور خود مختاری کے تقاضوں کو آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکالیں۔ اگر اپنے تمام تر ضعف و اضمحلال کے باوجود افغان قوم اپنی اسلامیت اور خود مختاری کا پرچم سربلند رکھ سکتی ہے تو پاکستانی قوم کو اس سے دور رکھنے کیلئے خود اس کی اپنی اسٹیبلشمنٹ رکاوٹ کیوں بنی ہوئی ہے؟

عالمی استعمار کے روبوٹس اور افغان طالبان کا امتحان

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۴ جنوری ۲۰۱۹ء

افغان طالبان کی طرف سے کابل انتظامیہ کے سربراہ اشرف غنی کے ساتھ مذاکرات سے دوٹوک انکار پر اس بات پر اطمینان میں اضافہ ہوا ہے کہ تاریخ کا عمل اگرچہ سست رفتار ہے مگر اس کا رخ صحیح سمت ہے اور دھیرے دھیرے صورتحال واضح ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی طرف سے ایک عرصہ سے افغان طالبان پر یہ دباؤ تھا کہ وہ کابل انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کریں یا کم از کم مذاکرات کے عمل میں اسے شمولیت کا موقع دیں، مگر امارت اسلامیہ افغانستان نے گذشتہ روز حتمی طور پر واضح کر دیا ہے کہ اگلے ماہ سعودی عرب میں اس کے نمائندوں کے مذاکرات براہ راست امریکہ سے ہوں گے اور ان میں کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ کی شمولیت قبول نہیں کی جائے گی۔ افغانستان کی تاریخ، جہاد افغانستان اور امارت اسلامیہ افغانستان سے آگاہی رکھنے والوں کیلئے یہ بات خلاف توقع نہیں بلکہ باعث اطمینان ہے اور وہ اس اصولی موقف پر امارت اسلامیہ افغانستان کی استقامت اور کامیابی کیلئے مسلسل دعاگو ہیں، آمین یارب العالمین۔

اٹھارہ سال قبل جب امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ہمراہ افغانستان پر لشکر کشی کی تھی، ہم نے انہی کالموں میں عرض کیا تھا کہ یہ مہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگی اور اتحادی فوجوں کو بالآخر یہاں سے بے نیلِ مرام واپس جانا پڑے گا۔ اگرچہ ایسا ہونے میں ہمارے اندازے سے زیادہ تاخیر ہوگئی ہے جس کی وجہ بہت سے عسکری گروپوں کی جلدبازی اور بے تدبیری تھی کہ انہوں نے اردگرد غیر ضروری جنگیں چھیڑ کر خود کو مشکل میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ افغان طالبان کیلئے بھی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں اور ان کے اس غلط طرز عمل کی سزا پورے خطہ بلکہ عالم اسلام کو بھگتنا پڑ رہی ہے، مگر اس سب کچھ کے باوجود افغان قوم کی تاریخ اور مزاج کے پیش نظر یہ تو ہونا ہی تھا کہ افغانستان پر عسکری یلغار کرنے والی غیر ملکی فوجیں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے گھر واپس چلی جائیں۔

مغرب کی یہ حکمت عملی برطانوی استعمار کے نوآبادیاتی تسلط میں بھی رہی ہے کہ مسلم ملکوں کے دارالحکومتوں میں ہر

جگہ ’’اشرف غنی‘‘ بٹھا دیے جائیں، جو امریکی استعمار کی بالادستی کے بعد بھی ہر طرف موجود ہیں اور استعماری آقاؤں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں ہر جگہ یہی لوگ پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ لوگ سیاست و حکومت میں بھی ہیں، معیشت و اقتصادیات میں بھی ہیں، میڈیا اور لابنگ میں بھی ہیں اور عسکری دائرے بھی ان کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔ پورے عالم اسلام کی یہی صورتحال ہے۔ البتہ ایک فرق جو تاریخ کے میرے جیسے طالب علموں کو محسوس ہو رہا ہے کہ یورپی استعماری ممالک اپنی نوآبادیوں میں جس کو ’’اشرف غنی‘‘ بناتے تھے اس کی عزت و احترام اور سیکریسی کا خیال رکھتے تھے اور کام لے چکنے کے بعد بھی اسے تحفظ فراہم کرتے تھے، جبکہ امریکی استعمار کی شروع سے یہ پالیسی رہی ہے کہ جس سے کام لے لیا جائے، وہ اسے بے نقاب بھی خود کرتے ہیں اور اس کی تذلیل و تحقیر بھی پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ فلپائن کے مارکوس، ایران کے رضا شاہ پہلوی اور عراق کے صدام حسین کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ کچھ بھی ہو، ایک فائدہ اس کا یہ ہے کہ امریکیوں کی اس افتادِ طبع کے باعث اب ایسے لوگوں کی تلاش کیلئے کسی خاص ریسرچ کا اہتمام نہیں کرنا پڑتا بلکہ استعمال کرنے والے خود ہی بول پڑتے ہیں اور ہر ایسے شخص کو خود اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔

ہم بھی پاکستان میں گذشتہ سات عشروں میں بہت سے ایسے لوگ بھگت چکے ہیں اور خدا جانے اور کتنے بھگتنا پڑیں گے۔ سیاست، معیشت، لابنگ اور میڈیا کے ساتھ ساتھ فکر و دانش میں بھی بہت سے حضرات یہی ’’کیپ‘‘ پہنے ہوئے قوم کی راہنمائی بلکہ نمائندگی کا منصب سنبھالے بیٹھے ہیں اور بے چاری سیدھی سادی پاکستانی قوم انہی کو اپنا نمائندہ اور ترجمان سمجھتے ہوئے چرکے پر چرکے کھائے چلی جا رہی ہے۔

مغرب کی سیاسی قیادت اور اربابِ فکر و دانش سے ہم اس مرحلہ میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ انہیں معروضی حقائق کا ادراک اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور مسلم امہ کے ساتھ ان کے جو معاملات حل طلب ہیں اس کیلئے انہیں حقیقی قیادتوں سے بات کرنا ہوگی اور ’’روبوٹس‘‘ کو درمیان سے ہٹا کر مسلم امہ سے بحیثیت امت معاملات طے کرنا ہوں گے، ورنہ معاملات اسی طرح گڑبڑ رہیں گے اور کوئی مسئلہ بھی صحیح رخ پر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ جناب شوکت عزیز کے دورِ حکومت میں پروٹسٹنٹ مسیحی فرقہ کے عالمی سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری اسلام آباد تشریف لائے تو ہم نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا کہ آرچ بشپ آف کنٹربری تو مسیحی دنیا کے پروٹسٹنٹ فرقہ کے مسلمہ سربراہ ہیں، مگر ان کے سامنے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے والے شوکت عزیز صاحب مسلمانوں کے کون سے مذہبی مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں؟ مذاکرات اصل فریقوں میں ہوں تو وہی نتیجہ خیز ہوتے ہیں ورنہ وہ محض ’’مذاکرات مذاکرات‘‘ کا کھیل بن کر رہ جاتے ہیں۔

دس بارہ سال قبل کی بات ہے میں امریکی ریاست ورجینیا کے علاقہ اسپرنگ فیلڈ کے ایک دینی مرکز دارالہدیٰ میں چند روز کیلئے قیام پذیر تھا، کچھ دوست ملنے کیلئے آئے جو دوسرے ممالک سے آکر امریکہ میں رہائش اختیار کرنے والے امریکی تھے اور اپنا تعلق کسی تحقیقاتی ادارے سے بتا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ سوویت یونین کے خلاف جہادِ افغانستان کے باعث دنیا بھر میں جو غیر ریاستی عسکریت پسندی پھیل گئی ہے اسے کس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ سادہ سی بات ہے کہ جن لوگوں نے یہ صورتحال پیدا کی ہے وہی مل بیٹھ کر اس

کا حل نکالیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ یہ سب کچھ صحیح ہوا ہے یا غلط مگر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سوویت یونین کے خلاف لڑی جانے والی جہاد افغانستان کی جنگ دنیا کے مختلف حصوں میں پرائیویٹ عسکریت پسندی کا باعث بنی ہے اور اسے کنٹرول کرنے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہوں، مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس سارے عمل میں دو فریق بنیادی کردار رکھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر وہ افغان مجاہدین جنہوں نے سوویت یونین کے خلاف یہ جنگ لڑی ہے اور ان کی حمایت و امداد کیلئے دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے مسلمان ہیں، جبکہ دوسرا فریق امریکہ کی قیادت میں انہیں سپورٹ کرنے والے عالمی ادارے اور حکومتیں ہیں۔ ان دونوں کی مشترکہ جدوجہد کی وجہ سے سوویت یونین پسپا ہوا اور افغانستان میں تشکیل پانے والی عسکریت پسندی دنیا بھر میں پھیل گئی، اب اس معاملہ کو کنٹرول کرنے کیلئے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کا وجود اور کردار تسلیم کرنا ہوگا اور اس کے حل کیلئے مشترکہ سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مسلسل عمل میں تو دونوں شریک کار تھے اور ایک دوسرے کا اعتراف و احترام کرتے تھے لیکن اس کے منفی نتائج کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ غیر منطقی بات ہوگی جس کا نتیجہ مثبت نہیں ہوسکتا، اس کا حل صرف یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ان جہادی گروپوں کا وجود اور کردار تسلیم کریں جنہوں نے ان کے تعاون سے سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی تھی اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ ان کے ”کرائے کے سپاہی“ نہیں تھے بلکہ افغانستان کی خود مختاری اور اسلامی نظام کے نفاذ کا اپنا ایجنڈا رکھتے تھے، جنہیں حالات کے تقاضوں نے ان کے ساتھ شریک عمل بنا دیا تھا۔ یہ بات انصاف کی نہیں ہے کہ جنگ جیتنے والے دو گروہوں میں سے ایک فریق تو اپنے سارے ثمرات سمیٹ لے اور فوائد حاصل کرلے مگر دوسرے فریق کو ان کے اہداف و مقاصد سے محروم رکھنے کا طرز عمل اختیار کیے رکھے۔

افغان طالبان اور امارت اسلامیہ افغانستان کا معاملہ اسی نوعیت کا ہے، امریکہ اگر فی الواقع خطہ میں امن چاہتا ہے تو اسے امارت اسلامیہ افغانستان کا وجود تسلیم کرنا ہوگا، ان کے ایجنڈے کا احترام کرنا ہوگا اور کسی ”اشرف غنی“ کو ان کے سامنے میز پر بٹھا دینے کی بجائے ان سے خود بات کرنا ہوگی اور براہ راست معاملات طے کرنا ہوں گے۔ ہمیں اس مرحلہ پر افغان طالبان کی یہ حکمت عملی درست معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حالات کا صحیح ادراک کرتے ہوئے امریکہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ براہ راست اس کے ساتھ مذاکرات کریں گے اور اس کے روبوٹس کو مذاکرات کی کرسی پر نہیں بیٹھنے دیں گے۔ البتہ یہ افغان طالبان کا بہت بڑا امتحان ہوگا کہ وہ کس طرح افغانستان کے تمام طبقات کو اعتماد میں لے کر ایک ایسی قومی حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوسکیں گے جو افغانستان کی خود مختاری، استحکام اور نفاذ شریعت کی ضامن بن سکے، اور اس سلسلہ میں ایسی تمام بے تدبیریوں سے بچنے کی کوشش کریں گے جن کی وجہ سے ان کے پہلے دور میں ”آبیل مجھے مار“ کی صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ ہم افغان طالبان سے امید رکھتے ہیں کہ وہ معروضی حقائق کا اعتراف و ادراک کرتے ہوئے حقیقت پسندی کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے اور افغانستان کی قومی خود مختاری کی بحالی کے ساتھ ساتھ افغان قوم کے اسلامی تشخص کے تحفظ اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کیلئے حکمت و تدبر سے کام لیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب کے ساتھ مسلم امہ کے حل طلب مسائل میں ہر مسئلہ پر بات ہوسکتی ہے، الجھنوں کا حل نکالا

جا سکتا ہے اور تنازعات کو سلجھایا جا سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہر جگہ اور شعبہ میں مذاکرات اصل فریقوں کے درمیان ہوں، امارت اسلامیہ افغانستان اپنے اس اصولی موقف پر تحسین کی مستحق ہے اور اب امریکی قیادت کا امتحان ہے کہ وہ معاملات کو صحیح رخ پر آگے بڑھاتی ہے یا ابھی اس کا موڈ کچھ عرصہ اور مذاکرات کے اس کھیل میں وقت برباد کرنے کا ہے۔

پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۷ فروری ۲۰۱۹ء

گذشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر مختصر سی خبر نظر سے گزری کہ افغانستان کے سابق صدر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ ۹۳ برس کی عمر میں کابل میں انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر نے ذہن میں ماضی کے بہت سے یادگار مناظر ایک ایک کر کے تازہ کر دیے اور دل سے بے ساختہ مجددی صاحب مرحوم کیلئے مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا نکلی، اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

پروفیسر صاحب مرحوم کا تعلق کابل کے معروف روحانی خانوادہ سے تھا اور وہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی بزرگ شخصیات میں سے تھے۔ سوویت یونین کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی میں مجاہدین کے ایک مستقل گروہ کے سربراہ تھے اور جہاد افغانستان کے دوران ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مسلسل متحرک رہے۔ میری ان سے ذاتی نیازمندی تھی اور باہمی رابطہ و تعلق بھی رہا۔ وہ ایک بار ہماری دعوت پر گوجرانوالہ تشریف لائے، مرکزی جامع مسجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا اور ایک میڈیکل کلینک کا افتتاح کرنے کے علاوہ اپنے اعزاز میں دیے گئے بھرپور استقبالیہ میں جہاد افغانستان کے مقاصد اور مجاہدین کی سرگرمیوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔

یہ ایک بزرگ شخصیت کے طور پر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ کا اعزاز تھا کہ افغانستان سے سوویت یونین کے انخلا کے بعد ملک کا نظم و نسق چلانے کیلئے جو عبوری حکومت متفقہ طور پر قائم ہوئی اس کا سربراہ انہیں چنا گیا اور انہوں نے صدر کی حیثیت سے افغانستان کا اقتدار سنبھالا۔ یہ عبوری حکومت چھ ماہ کیلئے ایک معاہدہ کے تحت قائم ہوئی تھی، اس دوران کچھ حضرات نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ ایک اسلامی ریاست کے امیر منتخب ہو گئے ہیں اس لیے انہیں اب اس منصب پر فائز رہنا چاہیے اور مدت گزرنے کے بعد اقتدار کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقع پر انہوں نے پاکستان سے اپنے دوست اور بہی خواہ سرکردہ علماء کرام کو مشاورت کیلئے کابل بلایا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ایوان صدر میں ان کی زیر صدارت طویل مشاورتی اجلاس ہوا جس میں ان سے یہ کہا گیا کہ امیر زندگی بھر کیلئے ہوتا ہے اس لیے وہ خود کو چھ ماہ کی مدت تک محدود نہ رکھیں۔ جبکہ ہم چند دوستوں نے یہ عرض کیا کہ انہیں معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے اور مدت پوری ہوتے ہی اقتدار اس حکومت کیلئے چھوڑ دینا چاہیے جو باہمی اتفاق سے قائم ہو جائے۔ میں نے اس مجلس میں ان سے گزارش کی کہ ایک بزرگ اور محترم شخصیت کے طور پر ان کیلئے تاریخ میں یہ اعزاز کچھ کم نہیں ہے کہ سوویت یونین کی فوجوں کے انخلا کے بعد متفقہ آزاد حکومت کا سربراہ انہیں چنا گیا ہے اور انہیں اپنے اعزاز کو متنازعہ

نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے ہمارے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور مدت گزرتے ہی اقتدار نئے فیصلے کے مطابق پروفیسر برہان الدین ربانیؒ کے حوالے کر دیا۔

پروفیسر صاحب مرحوم کی دعوت پر کابل کے اس دورہ میں دیگر بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی شامل تھے اور ہم دونوں نے اس وقت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود شہیدؒ کی فرمائش پر چند دن کابل میں رکنے کا پروگرام بنالیا۔ اس دوران ہماری ملاقاتیں حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولانا محمد نبی محمدیؒ کے علاوہ مولانا نصر اللہ منصور شہیدؒ سے بھی رہیں جو میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ احمد شاہ مسعود مرحوم کا کہنا تھا کہ وہ حافظ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے شاگرد ہیں اور اپنے استاذ زادہ مولانا فداء الرحمان درخواستی کی میزبانی کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ دورہ ہم نے پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ کی دعوت پر کیا تھا اور ان کے ساتھ ایک یادگار مشاورت ہوئی تھی۔ مجددی صاحب ایک باوقار اور محترم بزرگ تھے جن کے سب خیالات اور پالیسیوں سے اتفاق ضروری نہیں مگر افغانستان کی ایک بزرگ شخصیت کی وفات ہم سب کیلئے صدمہ کا باعث بنی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دنیا کی ضرورت خلفاء راشدین والا اسلام ہے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ مئی ۲۰۱۹ء

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے کچھ عرصہ قبل ایک تقریب میں اپنے دانشوروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:

”اسلام کا مطالعہ کریں اور بطور نظام زندگی اور متبادل سسٹم اسے اسٹڈی کریں۔ لیکن اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتوں کی طرف مت دیکھیں، ایک یہ کہ ہمارے بڑوں نے اسلام کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے، دوسرا یہ کہ اس وقت مسلمان کیسے نظر آ رہے ہیں۔“

برطانیہ ہی کے ایک ممبر پارلیمنٹ جم مارشل نے چند سال پہلے لیسٹر میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”جس اسلام سے ہمارے بڑوں نے متعارف کرایا وہ اور ہے، جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اور ہے، جبکہ دنیا میں اس وقت موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں میں جو اسلام نظر آتا ہے وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔“

اصل بات یہ ہے کہ آج اسلام دنیا کی ضرورت بن گیا ہے اور مروجہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی سسٹم کی ناکامی کے بعد اب آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی طرف رجوع کیے بغیر نسل انسانی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہا، جبکہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی اگر محفوظ حالت میں کسی مذہب کے پاس موجود ہیں تو وہ صرف اسلام ہے، لیکن کنفیوژن اس بات نے پیدا کر

رکھا ہے کہ کتابوں میں جو اسلام ملتا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں اور معاملات سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا کو ضرورت دراصل کتابوں والے اسلام کی ہے، خلفاء راشدین والے اسلام کی ہے، ہماری زندگیوں والے اسلام کی نہیں، کیونکہ ہمارا یہ برائے نام اسلام تو ہمیں مشکلات و مسائل میں سہارا نہیں دے رہا، دنیائے انسانیت کے مسائل کیا حل کرے گا؟

برصغیر کی تحریک آزادی کے عظیم راہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب ماسکو گئے اور کمیونسٹ لیڈروں سے اسلام کے فلسفۂ حیات اور نظام زندگی پر بات کی تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ فلسفہ اور سسٹم دنیا میں کسی جگہ عملاً رائج بھی ہے؟ مولانا سندھیؒ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، اور یہی بات اسلام کے فروغ اور دنیا میں اس کے دوبارہ غلبہ کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

اسلام نام ہے سادگی، قناعت اور جفاکشی کا، اور یہ صرف تصوف کے موضوعات نہیں بلکہ سیاست کے بنیادی ستون بھی ہیں۔ سادگی، قناعت اور جفاکشی کروڑوں روپے کی لاگت سے بنے ہوئے ایوانوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے اجتماعات کر کے ان عنوانات پر دلکش تقریریں کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان اصولوں کو ذاتی اور اجتماعی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کا نام ہے جس کا بہترین نمونہ خلفاء راشدینؓ، حضرت عمر بن عبد العزیز ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے نیک دل حکمران ہیں، اور سیاست و حکومت کا یہی انداز ہے جس کی آج کی دنیا کو ضرورت ہے۔

آج کے دانشور کتابوں میں اس طرز سیاست اور طرز حکومت کو پڑھ کر دنیا کے جغرافیے میں وہ خطے تلاش کرنے لگتے ہیں جہاں اس کی جھلک نظر آتی ہو مگر بدقسمتی سے دنیا کا کوئی مسلمان ملک اس کی جھلک پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک عرصہ کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت نے سادگی، قناعت اور جفاکشی کے ان سنہری اصولوں کو اپنی حکومت اور سیاست کی بنیاد بنا کر دنیا کو کتابوں میں پائے جانے والے خالص اسلام کا عملی نمونہ دکھانا شروع کیا تھا، اس دوران مجھے کابل، قندھار اور جلال آباد میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تھا، ان کا طرز بود و باش اور لوگوں کے ساتھ معاملات کا انداز دیکھا، سچی بات یہ ہے کہ کتابوں والے اسلام کا عملی نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا تھا مگر بوجوہ اس کا تسلسل قائم نہ رہ سکا۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کی چابیاں وصول کرنے کیلئے بذات خود تشریف لے گئے، اس وقت کیفیت یہ تھی کہ کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے، ان کا غلام اونٹ پر سوار تھا اور نکیل امیر المومنین کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تاریخ نے ایک اور منظر بھی دیکھا تھا کہ عیسائی علماء ہاتھوں میں پرانی کتابیں اٹھائے ان میں سے بیت المقدس کے فاتح کی نشانیاں پڑھتے جاتے تھے اور ایک ایک نشانی کو حضرت عمرؓ میں دیکھتے جاتے تھے۔ اور بالآخر سب کے سب پکار اٹھے تھے کہ بیت المقدس کی چابیاں اس کے حوالے کر دو، ہماری کتابوں کے مطابق بیت المقدس کا فاتح یہی ہے۔ آج پھر بیت المقدس فاتح کا منتظر ہے اور وہ فاتح اسی طرز کا کوئی درویش ہو گا جو دنیا کے پروٹوکول اور پرسٹیج کے مصنوعی ضابطوں کو رد کرتا ہوا سادگی، قناعت اور جفاکشی کے ساتھ آگے بڑھے گا اور بیت المقدس پر ایک بار پھر اسلام

کا ہلالی پرچم لہرائے گا۔

مختلف شعبوں میں علماء اور وکلاء کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت

۱۳ جون ۲۰۱۹ء کو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، باغ، آزاد کشمیر میں خطاب سے اقتباس

ایک وکیل محترم نے سوال کیا کہ امریکہ جب افغانستان سے نکلنے کی بات کر رہا ہے تو افغان طالبان اس کیلئے تعاون کیوں نہیں کر رہے ؟ میں نے عرض کیا کہ امریکہ وہاں سے نکلنے سے پہلے افغان طالبان سے اس حکومت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے جو اس نے کابل میں فوجی مداخلت کے نتیجے میں طاقت کے زور سے قائم کر رکھی ہے۔ افغان طالبان یہ بات نہیں مان رہے اور انہیں یہ بات تسلیم نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اگر امریکہ اپنی مسلط کردہ حکومت کو تسلیم کرا کے افغانستان سے جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالواسطہ طور پر افغانستان میں موجود رہنا چاہتا ہے جو افغانستان کی قومی خود مختاری کے منافی ہے۔ اس لیے افغان طالبان کا موقف اس حوالے سے بالکل اصولی اور درست ہے کہ امریکی اتحاد کی فوجیں افغانستان سے غیر مشروط طور پر نکلیں اور افغانستان کے عوام کا یہ حق تسلیم کریں کہ ان کے تمام طبقات باہم مل بیٹھ کر کسی دباؤ اور مداخلت کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

محترم وکیل صاحب نے سوال کیا کہ جب کابل کی موجودہ حکومت افغانوں کی ہی ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے ؟ میں نے گزارش کی کہ سری نگر کی موجودہ حکومت کشمیریوں کی ہی ہے اور بظاہر عوام کے ووٹوں کے ذریعے آئی ہے، اگر بھارت کی حکومت آپ سے کہے کہ آپ سری نگر کی موجودہ حکومت کو تسلیم کر لیں تو وہ کشمیر سے فوجیں واپس لے جائے گا تو کیا آپ اس پیشکش کو قبول کر لیں گے ؟ میرے خیال میں دونوں کا مسئلوں کا یہی ایک حل ہے کہ بیرونی افواج وہاں سے نکلیں اور ان خطوں کے عوام کو مکمل آزادانہ ماحول میں اپنے فیصلے خود کرنے دیں۔ مسلط قوتوں کے نمائندوں کو حکمران تسلیم کر لینے کے بعد ان کے تسلط کا ظاہری خاتمہ کوئی معنی نہیں رکھتا، یہ نوآبادیاتی نظام کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے جس کا عالم اسلام کے بیشتر ممالک میں ہمیں مسلسل سامنا ہے، اور یہ صورتحال حریت پسندوں سے آزادی کی ایک نئی جدوجہد کا تقاضہ کر رہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۸ و ۱۹ جون ۲۰۱۹ء)

کشمیر، افغانستان، صدر ڈونلڈ ٹرمپ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ اگست ۲۰۱۹ء

امریکہ کے صدر جناب ڈونلڈ ٹرمپ کے دو بیانات اس وقت ہمارے ہاں زیادہ تر زیر بحث ہیں، ایک کشمیر کے بارے میں ہے اور دوسرا افغانستان کے حوالے سے، ان دونوں خطوں کے ساتھ ہماری ثقافتی، دینی اور جذباتی وابستگی ہے اس لیے فطری طور پر بحث و مباحثہ میں تنوع اور جذباتیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ صدر ٹرمپ نے وزیراعظم عمران خان کے دورۂ امریکہ کے موقع پر کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ثالثی کی پیشکش کی تھی جسے پاکستان نے تو قبول کر لیا مگر بھارت کی طرف سے مثبت جواب نہیں آیا بلکہ اس کی طرف سے عملی جواب یہ ہے کہ بھارتی دستور میں مقبوضہ کشمیر کی امتیازی حیثیت ختم کرنے کی طرف پیشرفت ہو رہی ہے جس سے بھارتی دستور کی رو سے کشمیر متنازعہ خطہ نہیں رہے گا۔ جبکہ کشمیری عوام پر گذشتہ ستر سال سے بھارتی فوج کے مسلسل بڑھتے ہوئے مظالم پر عالم اسلام خصوصاً پاکستانی قوم مضطرب اور بے چین ہے، مختلف ادوار میں اس سلسلہ میں پیشرفت ہوئی مگر بھارتی ہٹ دھرمی اور اقوام عالم میں اس کے اثر و رسوخ کے باعث معاملہ ہر بار کھٹائی میں پڑتا رہا۔ اب ایک بار پھر اقوامِ متحدہ اور او آئی سی کو اس سلسلہ میں توجہ دلانے اور کشمیری عوام کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کے بھرپور اظہار کیلئے پاکستانی پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہونے والا ہے جو اس سلسلہ میں قومی طرز عمل اور عزم کا اعادہ کرے گا۔

کشمیری عوام ایک جائز مطالبہ پر گذشتہ ستر سال سے جدوجہد میں مصروف ہیں اور مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے واضح فیصلوں اور عالمی برادری کے وعدہ کے مطابق آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق دیا جائے، مگر یہ وعدہ پورا ہونے کی بجائے کشمیری عوام کے خلاف عسکری جارحیت کا تسلسل قائم ہے جو بہرحال عالمی برادری کی انصاف پسندی پر ایک سوالیہ نشان ہے اور اس کا جس قدر جلد نوٹس لیا جائے بہتر ہو گا کہ بھارت نے بالآخر کشمیری عوام کا یہ مسلمہ اور جائز حق دینا ہی ہے۔

دوسری طرف افغانستان کے بارے میں صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان کو دو تین روز میں فتح کر سکتے ہیں مگر اس کیلئے دس ملین لوگوں کا قتل عام ہو سکتا ہے جو وہ نہیں چاہتے، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ یہ مسئلہ مذاکرات کے ذریعے ہی حل کیا جائے جس پر امریکی حکومت کی گفتگو امارت اسلامیہ افغانستان کے ساتھ جاری ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صدر ٹرمپ نے اس بیان میں دونوں طرف پیغام دیتے ہوئے جہاں افغانستان سے یہ کہا ہے کہ وہ اگر امریکی حکومت کی شرائط کے مطابق معاہدے کیلئے تیار نہیں ہوں گے تو کم از کم دس ملین افغان مارے جا سکتے ہیں، وہاں دوسری طرف وہ امریکی قوم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ افغانیوں کو تہہ تیغ کیے بغیر افغانستان کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ہم صدر ٹرمپ کے اس بیان کو اس مفہوم میں لیتے ہیں کہ افغانستان کی سرزمین تو فتح کی جا سکتی ہے لیکن افغان قوم کو فتح کرنا امریکہ کے بس میں نہیں ہے۔

اس پس منظر میں ان مذاکرات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان جاری ہیں اور جس

کے بارے میں امارت اسلامی افغانستان کے نمائندوں کا یہ عندیہ بھی سامنے آچکا ہے کہ کم و بیش ۸۰ فیصد معاملات پر اتفاق ہو چکا ہے اور باقی ۲۰ فیصد امور پر بھی جلد سمجھوتہ ہو جانے کی توقع ہے۔ جبکہ غالباً وہی بیس فیصد امور سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ ہمارے خیال میں امریکہ اس بات پر بضد ہے کہ افغان طالبان کابل کی موجودہ حکومت سے فوری بات چیت کریں جس کیلئے وہ تیار نظر نہیں آتے، جبکہ طالبان کی یہ شرط ہے کہ امریکی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دیا جائے اس کے بعد باقی امور پر گفتگو نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اصل بات وہی ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دینے سے قبل افغان طالبان سے کابل حکومت کا وجود تسلیم کرانا چاہتا ہے جو اس ''امریکی اسٹائل'' کا حصہ ہے کہ دشمن کے ساتھ مذاکرات میں دشمن کی نمائندگی کیلئے بھی امریکہ کی مرضی کے لوگ بیٹھے ہوں اور اقتدار منتقل کرنے کی صورت میں اقتدار وصول کرنے والوں میں بھی امریکہ کی مؤثر نمائندگی موجود ہو۔ اس کی جو تاویل بھی کر لی جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ امریکی اسٹائل ہی نوآبادیاتی نظام کی جدید ترین شکل ہے جسے وہ افغانستان میں بہر صورت قائم رکھنا چاہتا ہے۔

جہاں تک دس ملین افراد قتل کر کے فتح حاصل کرنے کی دھمکی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں، امریکہ بہادر اس سے قبل دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی کی شکست کے بعد اس کا حلیف جاپان ہتھیار نہیں ڈال رہا تھا تو اسے اس پر مجبور کرنے کیلئے امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر کم و بیش دو لاکھ افراد کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لگتا ہے امریکہ کی حالیہ قیادت پر وہی نشہ طاری ہونے لگا ہے، اللہ تعالٰی اس دنیا کی حفاظت فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

امتِ مسلمہ کی حالتِ زار اور اہلِ دین کی ذمہ داری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۶ ستمبر ۲۰۱۹ء

آج عالم اسلام جس المناک صورتحال سے دوچار ہے اس نے ہر دردمند مسلمان کو بے چین و مضطرب کر رکھا ہے اور بظاہر اس دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔

- مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سنگینوں کے حصار میں نہتے عوام ظلم و تشدد کے ایک اور دور سے گزر رہے ہیں،
- روہنگیا مسلمان اپنے وطن اراکان (میانمار/برما) کی شہریت سے محروم ہو کر پڑوسی ممالک میں دربدر خاک چھاننے پر مجبور ہیں،
- فلسطینی مسلمان گزشتہ پون صدی سے اسرائیلی جارحیت کا سامنا کر رہے ہیں اور اپنے وطن کی آزادی اور خود مختاری کی منزل سے کوسوں دور نظر آتے ہیں،
- شام اور یمن میں آپس کی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت نے شہریوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے،

- سنکیانگ کے مسلمانوں کو اپنے ارد گرد کسی کی طرف امید کی نظر سے دیکھنے کی سہولت حاصل نہیں ہے،
- جبکہ عراق، افغانستان اور لیبیا وغیرہ میں استعماری سازشیں عروج پر ہیں۔

مگر عالم اسلام کی قیادتوں کو اس طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے اور وہ اپنی ترجیحات اور مفادات کی دنیا میں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ امریکہ بہادر افغانستان سے فوجیں نکال لینے کے ارادے کا اظہار کرتے ہوئے بھی وہاں کسی نہ کسی صورت میں اپنی ٹانگ پھنسائے رکھنے کے جتن کر رہا ہے، اور اقوامِ متحدہ کشمیریوں کے ساتھ استصواب رائے کرانے کا وعدہ دہراتے ہوئے بھی اس وعدہ کی تکمیل کیلئے کسی پیشرفت پر آمادہ نہیں ہے، جبکہ امت مسلمہ حیرت و اضطراب کے ساتھ اپنی قیادتوں کا منہ دیکھ رہی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آج ہمارے سامنے ایک زندہ حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہے کہ تداعت علیکم الامم تداع الاکلۃ علی قصعتھا دنیا کی قومیں تم مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے تیار دسترخوان پر کوئی میزبان اپنے مہمان کو کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ آج ہم مسلمان دنیا کی قوموں کے سامنے ”تر لقمہ“ کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں اور استعماری عزائم رکھنے والی ہر قوم حسب استطاعت اپنا حصہ وصول کرنے میں مصروف ہے۔ یقیناً یہ اس نوآبادیاتی دور کا منطقی نتیجہ ہے جو مسلم ممالک و اقوام نے گزشتہ دو صدیوں کے دوران مختلف آقاؤں کی غلامی میں گزارا ہے، اور اس دوران سب سے زیادہ زور مسلمانوں کو ایمان و عقیدہ سے محروم کرنے، ان کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کو ختم کرنے، اور ان پر دین و ثقافت کے ذوق و احساس تک سے محروم قیادتیں مسلط کرنے پر رہا ہے، چنانچہ آج اسی نوعیت کی قیادتیں عالم اسلام کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور ہم آزاد کہلانے کے باوجود ”ریموٹ کنٹرول غلامی“ کے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سال حج کے موقع پر میدان عرفات میں اپنے خطبہ کے دوران فضیلۃ الشیخ محمد بن حسن آل شیخ حفظہ اللہ تعالیٰ نے اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہمارے خیال میں سب سے زیادہ قابل غور اور لائق توجہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے مسائل و مشکلات پر قابو پانے کیلئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔

ہماری سیاسی صورتحال یہ ہے کہ ساٹھ کے لگ بھگ حکومتیں اور فوجیں رکھنے کے باوجود ہم اپنے فیصلے خود کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہمارے معاشی وسائل ہمارے کنٹرول میں نہیں ہیں، اور ہماری تہذیب و ثقافت مسلسل یلغار کی زد میں ہے جس کے باعث ہم اپنی نئی نسل کے عقیدہ و ایمان کے حوالے سے بھی عدم تحفظ کا شکار ہو چکے ہیں، بلکہ فکری اور تہذیبی طور پر نئی نسل ہمارے ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ مشکل صورتحال سے اہل دین دوچار ہیں جن کیلئے خدمات سرانجام دینے کا کام کٹھن سے کٹھن تر ہوتا جا رہا ہے کہ دین کی بات کرنا، کسی دینی تقاضے کی طرف حکمرانوں کو توجہ دلانا، اور دینی اقدار و روایات کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھانا بتدریج ”جرم“ سمجھا جانے لگا ہے۔ اور معاملہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا ہے کہ دین کی بات کرنا کالقابض علی الجمر جلتے انگارے کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہو جائے گا۔ مگر ان حالات میں سب سے زیادہ ذمہ

داری بھی اہل دین ہی کی بنتی ہے کہ مایوسی کی دلدل میں دھنستی چلے جانے والی امت کا عالم اسباب میں آخری سہارا بہرحال وہی ہیں اور جو بھی کرنا ہے انہوں نے ہی کرنا ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اکابر کی جدوجہد کا تسلسل موجود ہے، ان کی روایات کا اثاثہ محفوظ ہے اور قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ فقہی احکام و قوانین کا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، ہمیں نہ صرف خود کو اس سنگین صورتحال میں امت کی راہنمائی اور قیادت کیلئے مستعد رکھنا ہے بلکہ نئی نسل کو بھی اس کیلئے تیار کرنا ہے، اور اپنے علمی، دینی اور روحانی ماضی کے ساتھ وابستگی کو مستحکم رکھتے ہوئے رجوع الی اللہ کا بطور خاص اہتمام کرنا ہے کیونکہ اصل قوت وہی ہے اور فیصلے وہیں ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اہل دین کے تمام طبقوں کو اس نازک وقت میں اپنے اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام دیتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

کشمیر اور افغانستان کی تازہ صورتحال پر ایک نظر

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ ستمبر ۲۰۱۹ء

پاکستان کے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ اور امریکہ کی سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر جنرل کینیتھ میکنزی کے درمیان گذشتہ روز جی ایچ کیو راولپنڈی میں ہونے والی ملاقات خطہ کی موجودہ صورتحال بالخصوص کشمیر اور افغان مسئلہ کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے دوررس نتائج کی توقع کی جا رہی ہے۔

افغانستان کے حوالے سے امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان ایک عرصہ سے جاری مذاکرات اچانک ڈیڈلاک کا شکار ہو گئے ہیں اور عین اس وقت جب کہ مذاکرات کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کی خبروں کے ساتھ ساتھ معاہدہ کیلئے صدر امریکہ کے ساتھ افغان طالبان کے وفد کی ملاقات کی تاریخ کا بھی تعین ہو چکا تھا، صدر ٹرمپ نے اچانک مذاکرات روک دینے کا اعلان کر دیا ہے جس سے معاملات ایک ڈرامائی رخ کی طرف مڑ گئے ہیں۔ بین الاقوامی حلقے مذاکرات کی اچانک منسوخی کے اس عمل کو وائٹ ہاؤس، پینٹاگان اور امریکی اسٹیبلشمنٹ کے درمیان معاہدہ کے معاملہ میں انڈراسٹینڈنگ کے فقدان کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں جبکہ صدر ٹرمپ نے یہ کہہ کر اس کا سارا ملبہ طالبان پر ڈال دیا ہے کہ مذاکرات کے آخری مرحلہ میں کابل میں ان کی طرف سے کیا جانے والا حملہ اس کی فوری وجہ بنا ہے۔ حالانکہ اس قسم کے حملے مذاکرات کے دوران امریکی کیمپ کی طرف سے بھی افغان شہریوں اور طالبان کے خلاف مسلسل جاری رہے ہیں، اور ابھی چند روز قبل ایسے ہی ایک حملہ میں بہت سے افغان شہری شہادت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

افغان طالبان سے اصرار کے ساتھ یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ وہ معاہدہ سے قبل جنگ بندی کا اعلان کریں، مگر امارت اسلامیہ افغانستان کا کہنا ہے کہ معاملات کا حتمی طور پر باضابطہ اعلان ہو جانے سے قبل وہ سیزفائر کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی یہ بات دو حوالوں سے قابل توجہ ہے، ایک اس لیے کہ وہ خود امریکی اتحاد یا افغان فورسز سے معاہدہ کے باضابطہ اعلان سے پہلے فائر بندی کا تقاضہ نہیں کر رہے، اور دوسرا اس حوالے سے کہ افغان عوام اس سے قبل

جنیوا معاہدہ کی صورت میں اس چال کا شکار ہو چکے ہیں کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کے معاملات طے کیے بغیر معاہدہ کا اعلان افغانستان کو ایک نئے بحران اور خلفشار میں دھکیلنے کا باعث بن گیا تھا۔ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ اس موقع پر جنرل ضیاء الحق شہیدؒ کا موقف یہ تھا کہ معاہدہ سے پہلے اس کے بعد کے معاملات سیٹ کر لیے جائیں تاکہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کوئی نیا بحران کھڑا نہ ہو جائے، مگر ان کی بات نہیں سنی گئی اور جنیوا معاہدہ کرنے والوں نے من مانی کر کے افغانستان کو خانہ جنگی کی ایک نئی دلدل سے دوچار کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ افغان طالبان کی موجودہ قیادت اس تجربہ کے اعادہ سے بچنا چاہتی ہے اور تمام معاملات طے کرنے کے بعد فائر بندی کا اعلان کرنا چاہتی ہے اور یہ بات ناقابل فہم بھی نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ اور پاکستان دونوں کی سیاسی و فوجی قیادتوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ افغان عوام کو ایک اور "جنیوا معاہدہ" میں یکطرفہ طور پر جکڑ دینے کی بجائے ان کی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انہیں پوری طرح اعتماد میں لیے بغیر کسی ایسے معاہدے کا رسک نہ لیں جو خطہ میں ان کی بحالی کی بجائے کسی نئے خلفشار کا عنوان بن جائے۔

دوسری طرف مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہم آزاد کشمیر کے بزرگ عالم دین اور پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی نائب امیر اول مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کے اس بیان کو انتہائی قابل توجہ سمجھتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو بھارتی جبر و تشدد کی موجودہ سنگین صورتحال سے نجات دلانے اور انہیں اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کے مطابق خودارادیت کا حق دلوانے کیلئے جہاد کے باقاعدہ اعلان کا آپشن بھی زیر غور لایا جائے، یہ بات جہاد کے شرعی احکام کے حوالے سے تو ہماری ذمہ داری بنتی ہی ہے مگر اس لیے بھی سنجیدہ توجہ کی طلبگار ہے کہ آزاد جموں و کشمیر کی موجودہ ریاست جہاد ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی اور جہاد کا وہ شرعی فتوٰی جو ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف ۱۹۴۷ء میں سرکردہ علماء کرام کی طرف سے جاری کیا گیا تھا اور جس پر عملدرآمد کے ذریعے آزاد جموں و کشمیر کے موجودہ خطہ کو آزاد کرایا گیا تھا، اس کا وجود اور تسلسل ابھی جاری ہے اور پیشرفت کا تقاضہ کر رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر، ریاست آزاد جموں و کشمیر کے ذمہ دار مفتیان کرام کا اجلاس طلب کر کے مشترکہ موقف اور سفارشات طے کرے اور پھر اس کی بنیاد پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور تمام مکاتب فکر کے سرکردہ مفتیان کرام کا قومی اجلاس منعقد کر کے مشترکہ لائحہ عمل کا تعین کرے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جہاد کے باضابطہ اعلان کا حق صرف ریاست کو ہے اور پرائیویٹ سیکٹر میں کوئی شخص یا ادارہ اس کا مجاز نہیں ہے، مگر ریاست کا یہ اختیار اور حق اس استحقاق کو کام میں لانے کیلئے ہے، خاموشی اختیار کرنے یا شرعی ضرورت کو نظرانداز کرتے چلے جانے کیلئے نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت آزاد کشمیر اور پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور دونوں کو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

"اسلام کا نظامِ سیاست و حکومت": مولانا عبد الباقی حقانی کی علمی کاوش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۹ء

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی حیثیت سے انسانی معاشرہ کو جن تبدیلیوں اور اصلاحات سے نوازا ان کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور ان سماجی تغیرات و اصلاحات کی سطح صرف دعوت و تلقین کی نہیں تھی بلکہ ان کے مطابق معاشرہ کی از سر نو تشکیل بھی جناب نبی اکرمؐ نے خود فرمادی۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے آخری رسول یہ مشن مکمل کر کے فزت و رب الکعبۃ فرماتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوئے تو آپؐ کی تعلیمات صرف اقوال و ارشادات پر مبنی نہیں تھیں بلکہ ان ہدایات و فرمودات کے مطابق ایک نو تشکیل شدہ مکمل سماجی ڈھانچہ دنیا کے سامنے موجود تھا جسے آپؐ کی تربیت یافتہ جماعت حضرات صحابہ کرامؓ نے ایک صدی کے عرصہ میں دنیا کے تین بر اعظموں تک پھیلا دیا۔ اور وہ "ریاستِ مدینہ" جو نبی کریمؐ کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سنبھالی تھی اس کا دائرہ اگلی صدی کے آغاز تک ایشیا اور افریقہ کے بہت سے علاقوں کا احاطہ کرتے ہوئے یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اور "خلافت" کے عنوان سے دنیا ایک نئے عالمی نظام سے متعارف ہو چکی تھی جس کا تسلسل مختلف اتار چڑھاؤ کے کئی مراحل کے باوجود اب سے ایک صدی قبل تک دنیا کے نقشے پر موجود رہا۔

اس نظام کی بنیاد قرآن کریم کے ارشادات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن پر چلی آرہی ہے جسے عملی شکل میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک آئیڈیل سیاسی، معاشرتی، معاشی اور سماجی ڈھانچہ کے رنگ میں پیش کیا اور فقہاء عظام رحمہم اللہ تعالیٰ ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی علمی و فقہی توجیہات اور عملی تطبیقات کی صورتیں واضح کرتے رہے۔ جیسا کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشیدؒ کے کہنے پر قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" کے عنوان سے اسلام کے معاشی احکام و قوانین کو مرتب و مدون کر کے قانون و دستور کے طور پر ان کے حوالہ کیا جو ایک عرصہ تک قانون کے طور پر نافذ العمل رہا۔ جبکہ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" اور مغل دور حکومت میں "الفتاوٰی الہندیۃ" کے نام سے انتہائی قابل قدر قانونی مجموعے مرتب و مدون ہو کر بطور دستور و قانون نافذ ہوئے اور وہ آج بھی ہمارے علمی و فقہی ذخیرہ کا قابل قدر حصہ ہیں۔

مگر گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران جب عالم اسلام کے بہت سے ممالک استعماری قوتوں کی غلامی کا شکار ہوگئے حتٰی کہ خلافتِ عثمانیہ بھی اب سے ایک صدی قبل ختم ہوگئی تو اسلامی قوانین و احکام کی عصری تقاضوں کے مطابق توجیہ و تعبیر اور تطبیق و تنفیذ میں ریاستی کردار باقی نہ رہا۔ البتہ نجی طور پر اس حوالے سے جس علمی و فقہی جدوجہد کا آغاز امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے آزادانہ اجتہادات و تعبیرات اور مشاورتی اجتہاد کی صورت میں کیا تھا وہ بحمد اللہ تعالیٰ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ عالم اسلام میں بیسیوں علمی و فقہی حلقے اور شخصیات اس دور میں اس کار خیر میں مصروف عمل رہے ہیں اور

آج بھی اس کا تسلسل قائم ہے۔

نوآبادیاتی دور کے ظاہری خاتمہ کے بعد مختلف اسلامی ممالک میں نفاذ شریعت کے عنوان سے اسلام کے سیاسی، معاشرتی، عدالتی اور معاشی احکام و قوانین کی معاشرہ میں دوبارہ عملداری کیلئے بیسیوں تحریکات کا آغاز ہوا جو مدّ و جزر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، مگر عصر حاضر کے سماجی تغیرات اور معاشرتی تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کی تطبیق و تنفیذ کی عملی صورتوں کو از سر نو واضح کرنے اور اس دوران مختلف علمی و فقہی حلقوں میں کی جانے والی علمی، فکری اور فقہی محنت کے نتائج کو اجتماعی شکل دینے کا کام ابھی تشنہ ہے، حالانکہ اس کی ضرورت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔

اس تناظر میں ہمارے فاضل دوست مولانا عبد الباقی حقانی کی ایک علمی کاوش ''اسلام کا نظام سیاست و حکومت'' کے عنوان سے چند سال قبل اردو اور عربی زبانوں میں سترہ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں میں سامنے آئی، جسے ''موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک'' نے شائع کیا ہے، تو نفاذ شریعت کی جدوجہد کے کارکن اور تاریخ و سماجیات کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی اور ایک مضمون میں اس کا اظہار بھی کیا۔ اب اسی کتاب پر نظر ثانی کر کے بہت سے اضافوں کے ساتھ مولانا موصوف نے اسے از سر نو مرتب کیا ہے اور اسے ایک ہزار کے لگ بھگ صفحات کی دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ روز اسلام آباد میں ایک ملاقات کے دوران مولانا عبد الباقی حقانی نے اس کتاب کا نئے سرے سے مرتب شدہ مسودہ دکھایا تو میری خوشی دوچند ہو گئی۔ مولانا موصوف کا تعلق چونکہ افغانستان سے ہے اس لیے میں اس خوشی کی معنویت کو الفاظ میں بیان نہیں کر پا رہا کہ انہوں نے آنے والے دور بالخصوص افغانستان میں ''امارتِ اسلامیہ افغانستان'' کی مسلسل پیشرفت کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کی ناگزیر ضروریات کیلئے کس قدر وقیع، جامع اور متنوع علمی و فقہی ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبولیت و ثمرات اور رضا سے بہرہ ور فرمائیں، اور نہ صرف افغانستان بلکہ پورے عالم اسلام کو اس سے استفادہ کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

البتہ اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ قدیم و جدید فقہی و قانونی ذخیرہ اور عصری نظاموں پر گہری نظر رکھنے والے کچھ اصحاب علم و دانش آگے بڑھیں اور اس سلسلہ میں گذشتہ نصف صدی کے دوران مختلف علمی و فقہی دائروں میں جو وقیع کام ہوا ہے اس پر نظر ڈال کر حضرت امام ابو یوسفؒ اور سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کی سنت کا احیا کرتے ہوئے آنے والے حالات و ادوار کیلئے اسے ایک مرتب دستوری اور قانونی ڈھانچے کی شکل دے دیں تاکہ اسے کسی بھی جگہ موقع میسر آنے پر عملی نظام کے طور پر بروئے کار لایا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی صورت پیدا فرما دیں، آمین یارب العالمین۔

کیا امریکہ مشرقِ وسطیٰ سے نکلنا چاہتا ہے؟

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۹ء

روزنامہ اسلام لاہور میں ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو شائع ہونے والی یہ خبر ملاحظہ فرمائیے:

''امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے مشرق وسطیٰ کو خون آلود مٹی قرار دیتے ہوئے خطے سے نکلنے کا عہد کیا ہے، وائٹ ہاؤس میں خصوصی خطاب کرتے ہوئے صدر ٹرمپ نے کہا کہ امریکہ مشرق وسطیٰ کی خون آلود مٹی چھوڑ دے گا، امریکی صدر نے مشرق وسطیٰ کے تعلقات کی نوعیت تبدیل کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مشرق وسطیٰ میں بہت امریکی سروسز کے ممبران مارے گئے، امریکہ کو اب مزید دنیا کے پولیس مین کے طور پر رہنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم باہر نکل رہے ہیں اور اب کسی اور کو اس خون آلود زمین پر لڑنے دیں، ہماری فوج کی نوکری دنیا کی پولیس کی نہیں ہے۔

ٹرمپ کا کہنا تھا کہ دیگر اقوام لازمی آگے ہیں اور اپنے حصے کے مطابق کام کریں، میں مختلف طریقے سے انتخاب پر قائم ہوں جو امریکہ کو کامیاب کر سکیں، امریکی صدر نے مزید کہا کہ شام سے بڑے پیمانے پر انخلا کے باوجود کچھ فوجی دستے شام کی آئل تنصیبات پر موجود رہیں گے کیونکہ ہم نے تیل کو محفوظ کر دیا ہے اور اسی لیے امریکی افواج کی کم تعداد ایسے علاقوں میں موجود رہے گی جہاں تیل موجود ہے۔

یاد رہے کہ ترکی کی جانب سے شمالی شام میں ۸ اکتوبر سے کرد باغیوں کے خلاف بہار امن (پیس اسپرنگ) کے نام سے فوجی آپریشن شروع کیا گیا تھا، ترکی اپنی سرحد سے متّصل ۳۲ کلومیٹر تک کے شامی علاقے کو محفوظ بنا کر ترکی میں موجود کم و بیش ۲۰ لاکھ سے زائد شامی مہاجرین کو وہاں ٹھہرانا چاہتا ہے اور ترکی کا مطالبہ ہے کہ کرد ملیشیا شمالی شام کی ۳۲ کلومیٹر کی حدود سے باہر چلی جائے اور یہ علاقہ ''سیف زون'' کہلا سکے۔''

یہ خبر پڑھتے ہوئے ایک دفعہ اس خیال سے ہم نے خود کو چیک کیا کہ کہیں نیند کی حالت میں خواب تو نہیں دیکھ رہے؟ پھر یہ شک ہوا کہ شاید صدر ٹرمپ اس گفتگو کے دوران نارمل حالت میں نہ ہوں۔ مگر یہ سوچ کر اصل بات سمجھ آگئی کہ یہ صدر ٹرمپ کی منظم حکمت عملی کا حصہ ہے جس کا ایک مظاہرہ افغانستان سے ان کے نکل جانے کے اعلان کے حوالے سے ہم دیکھ چکے ہیں، کیونکہ اسی نوعیت کے ارادے کا اظہار انہوں نے افغانستان کے بارے میں کیا تھا اور اس کیلئے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کا ایک لمبا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا، مگر جب دیکھا کہ افغانستان سے امریکی افواج کی واپسی ان کے طے کردہ منصوبے اور مستقبل کے عزائم کے حوالے سے نہیں ہو رہی تو اچانک ان مذاکرات کو ختم کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ ہمارے خیال میں ان کے ذہن میں یہ منصوبہ ہے کہ افغانستان سے امریکی اتحاد کی باوردی افواج کی تو

واپسی ہو جائے مگر اس خطہ کا کنٹرول بدستور ان کے بے وردی رضاکاروں کے ہاتھ میں رہے تاکہ ان کے مقاصد اور پالیسیوں کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ مگر افغان طالبان نے اس حکمت عملی کو بھانپ کر حکمت و تدبیر اور حوصلہ و جرأت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جس کے نتیجے میں اب امریکہ بہادر طالبان کے ساتھ مذاکرات کا نیا دور شروع کرنے سے پہلے اپنی حکمتِ عملی کو "میک اپ" دینے میں مصروف ہے۔

اس دوران مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں صدر ٹرمپ کا مذکورہ بالا ارشاد گرامی سامنے آیا ہے تو ہمیں یہ بھی ان کی اسی پالیسی کا تسلسل دکھائی دے رہا ہے جو افغانستان کے حوالے سے ہم دیکھ چکے ہیں بلکہ ابھی دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ شام میں "تیل کی حفاظت" کیلئے کچھ امریکی فوجی دستوں کی مستقل موجودگی کو انہوں نے ابھی سے ضروری قرار دے دیا ہے اس لیے اس سے مشرق وسطیٰ کی صورتحال میں کسی بہتر تبدیلی کی توقعات کی کوئی وجہ کم از کم ہمیں سمجھ میں نہیں آرہی۔

امریکہ بہادر نے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست اور یورپی قوتوں کے متحدہ محاذ کی فتح کے بعد برطانیہ اور دیگر مغربی استعماری قوتوں کے مضمحل ہو جانے کے باعث "عالمی پولیس مین" کا کردار سنبھالا تھا، جس کا آغاز ناگاساکی اور ہیروشیما میں اس کی طرف سے ایٹمی بمباری سے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مغرب کے استعماری عزائم اور ایجنڈے کی قیادت ابھی تک امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے تائیوان، کوریا، جاپان، ویتنام، افغانستان، عراق، شام، فلسطین، بوسنیا، صومالیہ اور دنیا کے دیگر خطوں میں جو کردار اس حیثیت سے سرانجام دیا ہے وہ سب کے سامنے ہے جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ اسے اس کے تناظر اور میک اپ کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس کیلئے صدر ٹرمپ ماضی کے امریکی صدور سے مختلف روپ دکھا کر دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امریکہ بدل رہا ہے، بدلنا چاہتا ہے اور بدلنے کی حکمت عملی بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ "تبدیلی" تقریروں اور رسمی اعلانات سے نہیں آتی، اس کیلئے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے، دوسری طرف کے اصل فریقوں کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے اور عملی اقدامات کرنا پڑتے ہیں۔ اس سب کچھ کیے بغیر تبدیلی کی کوئی بات دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا آخر اور کیا کہلا سکتی ہے؟

مولانا سمیع الحق شہیدؒ اور جہادِ افغانستان

۵ نومبر ۲۰۱۹ء کو دارالعلوم مدنیہ ڈسکہ میں منعقدہ سیمینار سے خطاب کا ایک حصہ

مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی تگ و تاز کا ایک بڑا دائرہ جہادِ افغانستان بھی ہے جس کیلئے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک بلاشبہ علمی و فکری "بیس کیمپ" ثابت ہوا۔ دارالعلوم حقانیہ کو دارالعلوم دیوبند ثانی کہا جاتا ہے جو میرے خیال میں اس حوالے

سے درست ہے کہ جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کے سنگم اکوڑہ خٹک میں بیٹھ کر حضرت مولانا عبد الحقؒ اور دارالعلوم حقانیہ نے دارالعلوم دیوبند کے فیضان کو وسطی ایشیا کی ریاستوں تک پہنچایا، جبکہ روسی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کو علمی و فکری پشت پناہی مہیا کی۔ میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ جب روسی استعمار نے افغانستان کو اپنے اثر و رسوخ کے دائرہ میں شامل کرنے کیلئے فوجیں اتاریں اور اس کے عسکری تسلط کے خلاف علماء افغانستان نے جہاد کا اعلان کیا تو پاکستان میں انہیں علماء کے حلقہ میں سب سے زیادہ تین بزرگوں کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوئی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ، حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ پاکستان میں جہاد افغانستان کے پشتیبان بنے اور اسے مکمل سپورٹ فراہم کی۔ اس سارے عمل میں مولانا سمیع الحقؒ کا کلیدی کردار رہا ہے اور انہوں نے نہ صرف علم و قلم کے ذریعے بلکہ تحریک و سیاست اور رائے عامہ کو منظم و ہموار کرنے میں بھی مسلسل محنت کی۔۔۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ۔ ۷ نومبر ۲۰۱۹ء)

معاہدات: ذمہ داری یا ہتھیار؟

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۷ اپریل ۲۰۲۱ء

امریکہ کے صدر مسٹر جو بائیڈن نے افغانستان سے فوجوں کے انخلا میں یکطرفہ طور پر چار ماہ کی توسیع کا اعلان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ معاہدہ کی مدت کے دوران انخلا مشکل ہے اس لیے اب افغانستان سے امریکی فوجوں کا انخلا مئی کی بجائے ستمبر کے دوران مکمل ہو گا اور وہ بھی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہو گا۔ اس کے ساتھ جرمنی کے وزیر دفاع نے بھی کہا ہے کہ افغانستان سے نیٹو افواج کا انخلا ستمبر میں ہو گا۔

ایک عرصہ سے قطر میں امریکی حکومت اور افغان طالبان کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ چل رہا ہے جس کے ایک مرحلہ میں دنیا نے یہ خوشخبری سنی کہ امریکہ نے افغانستان سے فوجوں کے انخلا کیلئے یکم مئی ۲۰۲۱ء آخری تاریخ مقرر کر دی ہے، اس دوران افغانستان کے مستقبل کا نقشہ طے کرنے کیلئے بین الافغان مذاکرات کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہیں جبکہ اس مسئلہ پر اب تک متعدّد بین الاقوامی کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور ترکی میں بھی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔

افغان مسئلہ کا تاریخی تناظر یہ ہے کہ افغانستان میں ۱۹۷۹ء کے آخر میں روسی افواج کی آمد پر افغان قوم مزاحمت کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی اور افغانستان کی آزادی و خود مختاری کے ساتھ ساتھ اسلامی شناخت کے تحفظ اور شرعی نظام کے عملی نفاذ کیلئے جہاد کے عنوان سے سوویت یونین کی مسلح یلغار کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔ جہاد اور نظام شریعت کے حوالے سے پاکستان سمیت دنیا بھر کی مسلم اقوام و ممالک نے افغان عوام کی اس جدوجہد کا ساتھ دیا، جبکہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ایک عرصہ سے جاری کولڈ وار کے پس منظر میں امریکہ اور اس کے حامی ممالک بھی جہادِ افغانستان کے پشت پناہ بن گئے جس کے نتیجے میں افغان قوم افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے مشن میں سرخرو ہوئی۔ مگر اس کے بعد افغانستان کے مستقبل کی تشکیل میں راستے الگ ہو گئے:

- افغان مجاہدین اور ان کے دنیا بھر کے دینی پشت پناہوں کا موقف یہ تھا کہ افغان قوم کی تہذیب و روایات اور روس کے خلاف جنگ کے شرعی عنوان "جہاد" کے باعث افغانستان میں ایک اسلامی شرعی حکومت کا قیام اس تمام تر جدوجہد کا فطری اور منطقی تقاضہ ہے۔
- جبکہ امریکہ سمیت ان تمام حلقوں کی، جو اسے محض سوویت یونین کے خلاف ایک جنگ تصور کرتے ہوئے شریک ہوئے تھے، مسلسل یہ کوشش ہے کہ افغانستان سوویت یونین کیمپ سے نکلنے کے بعد ایک اسلامی نظریاتی ریاست بننے کی بجائے عالمی سطح پر ان کے کیمپ کا حصہ بن جائے اور ان کے بین الاقوامی مقاصد کیلئے استعمال ہوتا رہے۔ اس ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان سے سوویت افواج کے انخلا کے موقع پر افغانستان کو ایک مستحکم قومی اور نظریاتی حکومتی ڈھانچہ فراہم کرنے سے جنیوا معاہدہ کے ذریعے عمداً گریز کیا گیا جس کے نتیجے میں افغانستان خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔

اور پھر اس نئی صورتحال کے ردعمل میں جہادِ افغانستان کے نظریاتی کارکن طالبان کے عنوان سے سامنے آئے جو مسلسل جدوجہد کے بعد افغانستان پر کنٹرول حاصل کر کے "امارتِ اسلامیہ افغانستان" کے نام سے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ طالبان نے افغانستان کو خانہ جنگی سے پاک کر کے کچھ عرصہ کامیابی کے ساتھ حکومت کی مگر گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد وہ امریکی عتاب کا شکار ہوئے اور امریکہ کی قیادت میں نیٹو افواج نے اس خطہ میں وہی محاذ سنبھال لیا جس کی کمان اس سے قبل سوویت یونین نے کی تھی۔ گویا بیرونی حملہ آوروں کو ملک سے نکالنے کیلئے افغان قوم کی وہی جنگ لوٹ آئی جو روسی افواج کے خلاف تھی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب مدمقابل روس نہیں بلکہ امریکہ تھا۔ البتہ جہاد افغانستان کے اس نئے راؤنڈ کے اہداف اور مقاصد بھی وہی تھے کہ افغانستان کو بہرحال ایک خود مختار، آزاد اور اسلامی ریاست بنایا جائے۔

تاریخ نے اس کے بعد یہ منظر دیکھا کہ افغان قوم کی حریت پسندی اور اسلامیت کو زیر کرنے میں روس کی طرح امریکہ کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور بالآخر اسے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کی میز پر آنا پڑا جس کے مختلف مراحل کے بعد یہ طے پایا کہ امریکہ اور نیٹو افواج یکم مئی ۲۰۲۱ء تک افغانستان سے نکل جائیں گی اور اس دوران بین الافغان مذاکرات کے ذریعے افغانستان کے مستقبل کی نقشہ گری کر لی جائے گی۔ مگر اب امریکہ کی طرف سے اس میں چار ماہ کی توسیع کا اعلان کیا گیا ہے جبکہ افغان طالبان کا یہ موقف سامنے آیا ہے کہ معاہدہ کے بعد سے اب تک کی مدت میں امریکہ اور اس کے سہولت کاروں کا ٹال مٹول کا جو طرزِ عمل مسلسل چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر اس توسیعی مدت کا استعمال بھی وقت گزاری اور امارتِ اسلامی افغانستان کا راستہ روکنے کے اقدامات میں صرف ہوتا نظر آتا ہے، اس لیے وہ توسیع کو مسترد کرتے ہیں اور اگر یکم مئی تک امریکی افواج نے افغانستان سے انخلا مکمل نہ کیا تو وہ معاہدہ سے آزاد ہوں گے اور جو شرائط انہوں نے قبول کی تھیں وہ ان کے پابند نہیں رہیں گے۔ ہمارے خیال میں اس صورتحال میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

1. ایک یہ کہ اصل مسئلہ مدت کا نہیں اعتماد کا ہے، اگر امریکہ اب تک معاہدہ پر عملدرآمد میں سنجیدہ دکھائی نہیں دیا تو اس نے اپنا اعتماد خود خراب کیا ہے، اس کا فائدہ اسے نہیں دوسرے فریق کو ملنا چاہیے اور امریکہ کے سہولت کاروں کو یہ بات بہرحال ملحوظ رکھنی چاہیے۔
2. دوسری بات یہ کہ مسلسل مشاہدات و تجربات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسانی حقوق کی طرح بین الاقوامی معاہدات بھی ذمہ داری کی بجائے ہتھیار کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جو آسمانی تعلیمات سے انحراف اور سارے معاملات انسانی عقل و دانش کے دائرے میں طے کرنے کے فلسفہ کا منطقی نتیجہ ہے کہ عقل کے ساتھ طاقت اور فریب کاری کا جوڑ اپنے لیے ہر بات کا جواز فراہم کر لیتا ہے، جبکہ طاقت سے محروم اقوام و ممالک اس کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں، آج کے عالمی فلسفہ کے تناظر میں دنیا بھر میں ہر سطح پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ بین الاقوامی سطح پر گذشتہ ایک صدی کے دوران ہونے والے معاہدات اور ہمارے ہاں پاکستان میں بھی بالخصوص نفاذ شریعت کے سلسلہ میں کیے جانے والے معاہدات جس کی تازہ ترین مثال ”تحریکِ لبیک پاکستان“ کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ ہے، کو موضوع بحث بنا کر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آئے گی کہ آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر انسانی اخلاقیات ہی اقوام و ممالک کو کسی بات کا پابند بنا سکتی ہیں، ورنہ محض انسانی عقل و دانش طاقت اور فریب کاری کے زور پر اسی قسم کے مناظر دنیا کو مسلسل دکھاتی رہے گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کا راستہ نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

امریکہ کی عالمی چودھراہٹ کا نیا راؤنڈ

روزنامہ اسلام، لاہور --- مئی ۲۰۲۱ء

اخباری اطلاعات کے مطابق امریکی صدر جو بائیڈن نے صدارتی دفتر کے سو دن مکمل ہونے پر کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ دنیا کی قیادت سنبھالنے کیلئے تیار ہے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا کہ افغانستان سے فوجیں واپس بلانے کا یہی وقت ہے، ہمیں پاکستان اور افغانستان کے درمیان اعتماد بحال کرنا ہے، ہم چین کے ساتھ تصادم اور روس کے ساتھ کشیدگی نہیں بڑھانا چاہتے وغیرہ وغیرہ۔

امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمہ اور افغانستان سے روسی افواج کی پسپائی کے بعد ”نیو ورلڈ آرڈر“ کے عنوان سے دنیا کی بلاشرکت غیرے چودھراہٹ کا پہلے سے اعلان کر رکھا ہے جس کے مختلف مراحل سے دنیا کی متعدّد اقوام گزر چکی ہیں، اس لیے ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ دنیا کی قیادت پھر سے سنبھالنے کا یہ اعلان کس مفہوم میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نیو ورلڈ آرڈر کا سلسلہ آگے بڑھتا نہ دیکھ کر عالمی چودھراہٹ کا کوئی نیا فارمولا امریکی قیادت کے

ذہن میں آگیا ہے اور وہ اسے پھر سے دنیا کی قیادت سنبھالنے کی تیاری قرار دے کر نئی صف بندی کی کوشش کر رہی ہے۔ دو عالمی جنگوں کے بعد برطانوی استعمار کے اضمحلال اور عالمی معاملات پر اس کی گرفت کمزور پڑتے دیکھ کر امریکہ نے ناگاساکی اور ہیروشیما میں دو ایٹمی دھماکوں کے ذریعے لاکھوں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر دنیا کی چودھراہٹ کے میدان میں قدم رکھا تھا، اس کے بعد سے امریکہ بہادر اس رخ پر مسلسل آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان اس کا نقطۂ عروج تھا۔

اس تناظر میں صدر جو بائیڈن کا دنیا کی قیادت پھر سے سنبھالنے کا اعلان دنیا کی اقوام کیلئے ایک نیا چیلنج سمجھا جا سکتا ہے اور ہمارے خیال میں مظلوم و مغلوب اقوام کو خاص طور پر اسے اسی مفہوم میں لینا چاہیے۔ اس موقع پر مناسب ہے کہ امریکی چودھراہٹ کے اس دور پر ایک نظر ڈال لی جائے جو اس نے عالمی سیاست میں اپنی دھماکہ خیز انٹری سے شروع کیا تھا اور اب وہ اس کے نئے راؤنڈ کی تیاری میں دکھائی دے رہا ہے۔

- امریکہ نے اسرائیل قائم کر کے عربوں اور فلسطینیوں کے انسانی و شہری اور قومی و مذہبی حقوق کی پامالی کے ساتھ ساتھ ان کے قتل عام اور دربدری کے جس سلسلہ کی پشت پناہی شروع کی تھی وہ ابھی تک جاری ہے۔
- امریکہ بہادر نے جہاں مختلف ممالک میں آمریتوں کو سپورٹ کیا وہاں لاؤس، کمبوڈیا، ویت نام، افغانستان، عراق اور دیگر ملکوں میں فوج کشی کر کے ان اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری کو ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت پامال کیا۔
- اقوامِ متحدہ کا قیام دراصل اقوام و ممالک کے درمیان جنگ کو روکنے اور تنازعات کو نمٹانے کیلئے عمل میں لایا گیا تھا۔ مگر امریکہ نے اس عالمی فورم کو مذہب کے معاشرتی کردار کے خاتمہ، مغربی فکر و فلسفہ کی بالادستی، اور اقوام و ممالک کی خود مختاری سلب کرنے کیلئے انتہائی مہارت کے ساتھ استعمال کیا۔
- خاص طور پر مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام کا راستہ روکنے اور اس کے مقابلہ میں لامذہبیت اور مغربی تہذیب کو سپورٹ کرنے کیلئے اس کی مسلسل اور ہمہ گیر کاروائیاں بھی اب مخفی نہیں رہیں۔
- انسانی حقوق کے ٹائٹل کو مذہب و عقیدہ اور آسمانی تعلیمات سے بغاوت کیلئے ہتھیار بنا دینا امریکہ بہادر کا خصوصی کارنامہ ہے جس کے زخم نسل انسانی ایک عرصہ تک برداشت کرتی رہے گی۔

ایک موقع پر امریکہ میں ہی انسانی حقوق کے موضوع پر ایک محفل میں گفتگو کے بعد کچھ دوستوں نے سوال کیا کہ امریکہ میں انسانی اور شہری حقوق کی پاسداری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ شخصی انسانی و شہری حقوق کی پاسداری میں امریکہ کا ماحول اور نظم باقی دنیا سے بہتر دکھائی دیتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ انسانی و شہری حقوق اور مذہبی و سیاسی آزادی صرف افراد کیلئے ہے یا اقوام و ممالک کا بھی اس حوالے سے کوئی حق ہے؟ اور پھر اپنے شہریوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے دیگر اقوام و ممالک کی خود مختاری اور آزادی کو پامال کرتے چلے جانا انسانی حقوق کی کونسی خدمت ہے؟ چنانچہ اس ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کی قیادت کے نئے راؤنڈ کیلئے صدر جو بائیڈن کے حالیہ اعلان کے اہداف کو سمجھنا

کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اقوام و ممالک کو اس کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

اس موقع پر صدر جو بائیڈن سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جناب صدر! ہم امریکہ اور امریکی قوم کا احترام کرتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ نے برطانوی استعمار کی غلامی سے کس طرح آزادی حاصل کی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ شمال اور جنوب کی خوفناک خانہ جنگی کے بعد امریکی قیادت نے دنیا سے غلامی کے خاتمہ اور محروم و مغلوب اقوام و ممالک کی دادرسی کیلئے کن جذبات و عزائم کا اظہار کیا تھا۔ ہم ابراہام لنکن، جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کے خیالات سے واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ امریکہ کی موجودہ قیادت بھی ان کے خیالات اور اعلانات کو ایک بار پھر پڑھ لے کہ ہم ان کے امریکہ کا احترام کرتے ہیں اور عالمی سیاست میں اس امریکہ کے جائز مقام کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ مگر اس تاریخی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج کا امریکہ وہ نہیں ہے۔ غلامی کے خاتمہ کا پرچم اٹھانے والا امریکہ آج اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری پر سنگینیں تانے کھڑا ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری کا یہ دعویدار آج پوری دنیا میں اہل مذہب بالخصوص مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور آزادی و خود مختاری کیلئے سنگین خطرہ کا روپ دھارے ہوئے ہے، اس لیے ہم صدر جو بائیڈن کے اس اعلان کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ البتہ امریکہ اگر اپنی مذکورہ بانی شخصیات کے عزائم اور اعلانات کی طرف واپس جانے کیلئے سنجیدگی کے ساتھ تیار ہو تو اس کے ساتھ عالم اسلام کے مثبت معاملات کی بات سوچی جا سکتی ہے، ورنہ موجودہ امریکہ جتنی بار بھی عالمی قیادت کے کسی راؤنڈ کا اعلان کرے ملتِ اسلامیہ اور مسلم ممالک کے عوام اس سے کسی خیر کی کوئی توقع وابستہ کرنے کی بجائے اپنی ملی و مذہبی روایات کے تحفظ و دفاع کیلئے مسلسل مصروف کار رہیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امریکہ کا پاکستان سے فوجی اڈوں کا تقاضہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۸ جون ۲۰۲۱ء

۳ جون کو لاہور میں ”ملی مجلس شرعی پاکستان“ اور ۵ جون کو ”عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت“ کے اجلاسوں میں شرکت ہوئی اور مختلف دینی راہنماؤں اور احباب کے ساتھ پیش آمدہ امور پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ اہم عنوانات کم و بیش ملک بھر کے دینی حلقوں میں مشترکہ طور پر درپیش ہیں اور آراء و خیالات میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، البتہ اجتماعی جدوجہد کیلئے علماء کرام اور دینی کارکن ہر جگہ کسی متحرک قیادت کے سامنے آنے کے منتظر ہیں بلکہ بعض حلقوں میں اس سلسلہ میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے کہ عوامی سطح پر قیادتوں کا مشترکہ موقف تو واضح ہے مگر جدوجہد کا رخ اور طریق کار سامنے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ ان مسائل پر ان کالموں میں ہم پہلے بھی متعدّد بار گزارشات پیش کر چکے ہیں، البتہ ایک بار پھر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ افغان طالبان اور امریکہ کے مذاکرات کے نتیجے میں افغانستان سے امریکی فوجوں کے انخلا کے بعد

امریکہ نے پاکستان سے فوجی اڈوں کا جو تقاضہ کیا ہے وہ بھی ایک اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر گیا ہے اور سنجیدہ دینی و سیاسی قیادتوں کی طرف سے اس کی دوٹوک مخالفت کی جا رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی بھی عالمی طاقت کو اپنے ملک میں فوجی اڈے فراہم کرنا قومی خود مختاری کے منافی اور ملکی سالمیت کیلئے چیلنج ہے جسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ہمارا سابقہ تجربہ ہے کہ ہم نے نائن الیون کے بعد امریکہ کو افغانستان میں کاروائی کیلئے صرف راہداری فراہم کی تھی جس کے تلخ اور سنگین نتائج اب تک ہم بھگت رہے ہیں، اس تجربہ کے بعد ملک کا کون محب وطن شخص امریکہ کو فوجی اڈے دینے کی بات آرام سے نہیں سن سکتا۔ بہرحال یہ مسئلہ بھی سنگینی میں دوسرے مسائل سے کم نہیں ہے اور قوم اس حوالے سے واضح اور دوٹوک انکار سننا چاہتی ہے۔

سوویت یونین، افغانستان، امریکی اتحاد

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۴ جولائی ۲۰۲۱ء

یہ اس دور کی بات ہے جب افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی کے بعد امریکہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ نیٹو کے سیکرٹری جنرل نے ''ابھی اسلام باقی ہے'' کا نعرہ لگا کر اپنی جنگ کے اگلے راؤنڈ کی نشاندہی کر دی تھی اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے نئے علاقائی ایجنڈے مختلف عالمی حلقوں میں تشکیل پا رہے تھے۔ اسلام آباد میں لیفٹ کے کچھ دانشوروں کے ساتھ ایک نشست میں یہ بات زیر بحث آگئی کہ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی ہے وہ امریکہ کی جنگ تھی جس میں اسلام اور جہاد کے جذبہ کے ساتھ شریک ہو کر قربانیاں دینے والوں نے امریکہ کی یہ جنگ لڑی ہے۔

میرا نقطۂ نظر مختلف تھا، میں نے عرض کیا کہ اس جنگ کا آغاز امریکہ نے نہیں کیا تھا بلکہ افغان عوام نے سوویت یونین کی فوج کشی کے بعد اپنے وطن کی آزادی اور تہذیبی و اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے یہ جنگ شروع کی تھی جس میں دنیا بھر سے ان کے اس موقف کی حمایت کرنے والے لوگ جہاد کے عنوان سے شریک ہو گئے تھے۔ آغاز کے دو چار سال تک اس جنگ کو مذاق بلکہ جنون سمجھا جاتا رہا مگر افغان مجاہدین کو بے سروسامانی کے باوجود مسلسل آگے بڑھتے دیکھ کر امریکی کیمپ نے اس کو تقویت دینے کا فیصلہ کر لیا جو بڑھتے بڑھتے اس جنگ کو ''ہائی جیک'' کر لینے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس موقع پر سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑنے والے افغان مجاہدین کے آٹھ گروپوں کا اتحاد قائم ہوا جس کے سیکرٹری جنرل حرکت انقلاب اسلامی کے مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ تھے جو میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے، جبکہ افغان گروپوں کو یکجا کرنے میں ایک موقع پر جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ آف اکوڑہ خٹک کا کردار بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ اور اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب کے ساتھ معاملات طے کرنے میں جو کچھ عملاً ہوا، مولانا نصر اللہ منصورؒ کی رائے اس سے مختلف تھی، وہ مکمل خود سپردگی کی بجائے بنیادی معاملات پر اپنا کنٹرول قائم رکھتے ہوئے کچھ شرائط کے ساتھ مغرب کی حمایت و تعاون قبول کرنے کے حق

میں تھے، اور اپنی بات نہ مانے جانے پر انہوں نے جنگ سے لاتعلق ہو کر خود اختیاری جلاوطنی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

اسلام آباد میں لیفٹ کے دانشوروں کے ساتھ مذکورہ نشست میں جب بحث نے طول پکڑا تو میں نے دوستوں سے عرض کیا کہ تھوڑا اور انتظار کر لیں اگر اس خطہ کیلئے امریکہ کے نئے علاقائی ایجنڈے کو افغان مجاہدین نے قبول کر لیا اور اس میں ایڈجسٹ ہو گئے تو میں آپ کا موقف کھلے دل سے تسلیم کر لوں گا کہ افغانوں نے سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ اور اگر وہ امریکہ کے ایجنڈے میں سیٹ نہ ہوئے تو آپ دوستوں کو میری بات ماننا ہوگی کہ افغانوں نے اپنی جنگ لڑی ہے جو افغانستان کی آزادی اور افغان قوم کے اسلامی و تہذیبی تشخص کے تحفظ کی جنگ تھی جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے مسلم مجاہدین جہاد کے شرعی فریضہ کے احیا کے جذبہ کے ساتھ اس میں جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے، جبکہ امریکہ اس میں اپنے مفاد کیلئے شریک ہوا کہ اسے اس میں اپنے سرد جنگ کے حریف روس کی شکست کے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔

البتہ باہمی معاملات کے تعین و تشکیل میں افغان مجاہدین ”دامِ ہمرنگ زمین“ کا شکار ہو گئے چنانچہ ”جنیوا معاہدہ“ کے عنوان سے افغانستان میں مغرب کا نیا کھیل شروع ہوا جس کے نتیجے میں افغانستان کو جہادِ افغانستان کے منطقی ثمرات یعنی نفاذِ شریعت اور غیر ملکی مداخلت سے آزاد قومی خود مختاری سے محروم رکھنے کیلئے خانہ جنگی کے نئے راؤنڈ کا آغاز ہو گیا تو افغان مجاہدین کے انہی گروپوں میں سے نظریاتی اور تہذیبی ایجنڈا رکھنے والے لوگوں نے ”طالبان“ کے نام سے اپنی نئی تشکیل کی۔ اور چونکہ افغان عوام کی اکثریت کیلئے اپنی طویل جنگ کے نظریاتی اور تہذیبی ثمرات سے محرومی بہرحال ناقابل برداشت تھی اس لیے طالبان نے بڑھتے بڑھتے قندھار اور پھر کابل کا کنٹرول حاصل کر کے جہاد افغانستان کے منطقی ثمرات کا رخ متعیّن کر دیا جو اس خطہ کیلئے امریکہ اور نیٹو کے ایجنڈے سے متصادم تھا۔

چنانچہ افغان مجاہدین اور سوویت یونین کے درمیان لڑی جانے والی جنگ طالبان اور امریکہ کے درمیان نئی جنگ کی صورت اختیار کر گئی جبکہ ان دونوں جنگوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں افغان مجاہدین کو دنیا بھر بالخصوص امریکہ اور عالم اسلام کی بھرپور حمایت حاصل تھی مگر طالبان کو یہ جنگ تنہا لڑنا پڑی۔ اور تاریخ ان کے اس کردار کو کبھی اپنے صفحات سے محو نہیں کر سکے گی کہ انہوں نے بیس سال تک تنہا جنگ لڑ کر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج کو یہ کہتے ہوئے واپسی پر مجبور کر دیا کہ ”ہم جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکے“ جو ارشادِ خداوندی تلک الایام نداولھا بین الناس کا مصداق ہے۔ اسے افغان قوم کی سخت جانی کہہ لیجئے یا ان کی اسلام کے ساتھ بے لوث وابستگی اور اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ بے لچک وفاداری کا کرشمہ سمجھ لیجئے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے، البتہ اس کے نتائج و ثمرات کا رخ ایک بار پھر اپنے اپنے مفادات کی طرف موڑنے کیلئے بہت سی طاقتیں کسی نئے ”جنیوا معاہدہ“ کا تانا بانا بننے میں مصروف دکھائی دے رہی ہیں۔

آج اسلام آباد کی مذکورہ نشست میں ہونے والی بحث کا نتیجہ بحمد اللہ تعالیٰ سامنے آگیا ہے کہ افغان قوم نے جہادِ افغانستان میں امریکہ کی جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ امریکہ نے ان کی اس جنگ کو اپنے مقاصد کیلئے ہائی جیک کر لیا تھا جس میں اسے بالآخر ناکامی ہوئی ہے اور افغان قوم اپنی خود مختاری، اسلامیت اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا پرچم آج بھی پورے

عزم و استقامت کے ساتھ تھامے کھڑی ہے، البتہ ان کی زیرلب گنگناہٹ کے یہ الفاظ ہر واقفِ حال کو سنائی دے رہے ہیں کہ

"ہمیں ہمارے دوستوں سے بچالو، دشمنوں سے ہم خود نمٹ لیں گے۔"

طالبان کا دوسرا دور

(۲۰۲۱ء ــ ــ ــ)

افغانستان میں طالبان کا نیا دور: توقعات و خدشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۷ اگست ۲۰۲۱ء

کابل میں طالبان کے پُرامن داخلہ پر اطمینان و مسرت کے اظہار کیلئے آج جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں طلبہ نے قرآن خوانی کا اہتمام کیا، قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی کلاس میں طلبہ نے مکمل قرآن کریم کی قراءت کی اور جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کے شہداء اور مرحوم راہنماؤں کو ایصال ثواب کیا گیا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے درج ذیل خطاب کیا اور بزرگ استاذ مولانا عبد القیوم گلگتی کی پر سوز دعا پر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج ہم مختلف حوالوں سے اطمینان اور خوشی محسوس کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کی تلاوت کے ذریعے اس کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ کابل کسی نئی خونریزی سے بچ گیا ہے اور طالبان نے پُرامن طور پر اس کا کنٹرول سنبھال لیا ہے، اس میں کسی بھی حوالے سے کردار ادا کرنے والے سب لوگ ہمارے شکریہ اور تبریک کے مستحق ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ جس جہاد افغانستان کا آغاز برطانوی استعمار کی فوجی یلغار سے ہوا تھا اور برطانوی فوجوں کو افغان عوام کے جذبۂ حریت کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی، اس کے بعد روسی افواج نے افغانستان کو کنٹرول میں لینے کی کوشش کی تو افغان قوم نے جہادِ افغانستان کے عنوان سے اس کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اسے شکست دی، جبکہ اس کے بعد جہادِ افغانستان کے منطقی نتائج اور تہذیبی و نظریاتی اہداف کو روکنے کیلئے امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں تو افغان قوم نے مسلسل بیس سال کی معرکہ آرائی کے بعد انہیں بھی ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ افغان قوم کا تاریخی اعزاز اور کریڈٹ ہے کہ اس نے کبھی غیر ملکی تسلط قبول نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کیا ہے۔

ان مراحل میں اس بات کی مختلف اقوام کی طرف سے سرتوڑ کوشش کی گئی کہ افغانستان کو وحدت سے محروم کر کے الگ الگ علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے، ہمیں خوشی ہے کہ اس کے باوجود آج افغانستان کی وحدت قائم ہے اور اسے تقسیم کرنے کے منصوبے دم توڑ چکے ہیں۔ افغانستان پر یلغار کرنے والوں نے اپنا پورا زور لگایا کہ بہت سے دیگر مسلم ممالک کی طرح افغان عوام کو بھی اسلامی شریعت کے احکام و قوانین کی عملداری سے دستبردار کرا دیا جائے، اس کیلئے تخویف و تحریص کے تمام حربے اختیار کیے گئے مگر افغان قوم آج بھی اپنے عقیدہ و ایمان اور اسلامی شریعت کے ساتھ وابستگی پر قائم ہے اور شرعی احکام و قوانین کے نفاذ و عملداری کیلئے پُرعزم ہے۔ قابضین کی ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ افغان قوم کو اس کی تہذیب و ثقافت اور روایات سے بے گانہ کر دیا جائے مگر یہ مہم بھی کامیاب نہیں ہو سکی اور خوشی کی بات ہے کہ افغان قوم کی تہذیب و ثقافت اور قومی روایات آج بھی ایک معاشرتی حقیقت کے طور پر دنیا سے اپنا وجود تسلیم کرانے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

ہم نے افغانستان کی وحدت، افغان قوم کی خود مختاری، شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی، افغان تہذیب و ثقافت کے

تسلسل اور غیر ملکی مداخلت سے نجات کیلئے ہمیشہ افغانوں کی حمایت کی ہے اور آج بھی اس پر پورے شعور و ادراک کے ساتھ قائم ہیں اس لیے اس موقع پر خوشی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہم ان خطرات سے خبردار کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو افغان قوم اور اس کے خیر خواہوں کو درپیش ہیں۔

- ہمارے خیال میں اب سب سے پہلا مرحلہ افغانستان میں امن کا قیام، نظم و نسق کی بحالی، اور ملکی سالمیت کا تحفظ ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ امارت اسلامیہ افغانستان کی طرف سے اعلانات اور حکمت عملی اس سلسلہ میں حوصلہ افزا ہے۔
- ہمارے نزدیک قومی وحدت کا ماحول قائم کرنا افغانستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ افغان قوم اور ملک کو زبان، نسل اور علاقہ کی بنیاد پر تقسیم کرنے میں ناکامی کے بعد اب ایسی شرارتوں کا رخ دوسری طرف موڑا جا رہا ہے، مثلاً کل سے سوشل میڈیا پر ایک خبر گردش کر رہی ہے کہ طالبان نے سلفیوں کے مدارس بند کر دیے ہیں اور آج صبح سے ایک خبر چل رہی ہے کہ طالبان نے شیعوں کی عمارتوں سے ان کے جھنڈے اتارنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ افغانستان کی قومی وحدت کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کا ایک نیا رُخ ہے جس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے اور ایسی باتوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔
- اس موقع پر عالمی برادری اور مسلم ممالک کے ساتھ ساتھ پڑوسی ممالک کو بھی اعتماد میں لینے اور اعتماد میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ افغانستان اپنے نئے قومی سفر کا آغاز بہتر انداز میں کر سکے اور کسی کو اس میں دخل اندازی کا موقع نہ ملے۔
- ان حوالوں سے مسلم ممالک کی ذمہ داری سب سے زیادہ بنتی ہے کہ وہ اپنے مثبت اور مؤثر کردار کے ساتھ سامنے آئیں اور تہذیبی اور قومی مقاصد و اہداف کے حصول میں افغان قوم کے معاون بنیں۔
- عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان کے دینی، علمی اور نظریاتی حلقوں کو بھی بیداری، حوصلہ اور حکمت عملی کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور باہمی مشاورت کے ساتھ افغانستان کی تعمیر و ترقی، سلامتی و استحکام اور قومی و دینی روایات کے تحفظ میں افغان قوم کا ساتھ دینا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ افغان قوم کو یہ پیشرفت مبارک کریں اور سب کو اپنا اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

افغانستان کی موجودہ صورتحال اور ہماری ذمہ داری

۲۱ اگست ۲۰۲۱ء کو آسٹریلیا مسجد لاہور میں خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کل افغانستان کی صورتحال دینی اور سیاسی حلقوں میں، تقریباً ہر جگہ زیر بحث ہے اس مناسبت سے دو تین گزارشات میں عرض کرنا چاہوں گا۔

(۱) پہلی بات یہ کہ افغان قوم کی عظمت اور حریت پسندی کو سلام ہو کہ اس نے بیرونی دخل اندازی اور غیر ملکی تسلط کو ہمیشہ کی طرح اب بھی مسترد کر دیا ہے۔ افغانستان پر برطانیہ نے قبضہ کی کوشش کی تھی جب انہوں نے متحدہ ہندوستان پر قبضہ کیا تھا تو برطانیہ کو ناکامی ہوئی تھی۔ پھر روسی فوجیں آئیں، یہ تو ہمارے سامنے کا معاملہ ہے، اور اپنا پورا زور صرف کیا مگر افغانستان نے بحیثیت افغان قوم قبول نہیں کیا، سوویت یونین کی افواج کو ناکام واپس جانا پڑا بلکہ اس کے نتیجے میں خود سوویت یونین بکھر کر رہ گئی۔ تیسرا مرحلہ یہ کہ جب امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں تو افغان قوم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور مزاحمت کی، اتنی شاندار مزاحمت کی کہ روس کے خلاف مزاحمت میں افغان قوم کو امریکی بلاک، عالم اسلام اور بہت سے ملکوں کی حمایت حاصل تھی، ایک لحاظ سے پوری دنیا ان کے ساتھ تھی، روس کے سارے مخالفین ان کے ساتھ تھے، لیکن امریکی اتحاد کی فوجی یلغار کے خلاف مزاحمت میں وہ تنہا تھے، ان کو درپردہ کسی کی حمایت حاصل ہوئی ہو تو ہو لیکن بظاہر پوری دنیا ان کی مخالف تھی بلکہ ان کا نام لینا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی۔ اس پر یہ بات ایک دفعہ پھر واضح ہو گئی کہ افغان قوم خود پر کسی دوسرے کا تسلط قبول نہیں کرتی، یہ تیسرا تاریخی واقعہ ہے، افغان قوم کو اس پر سلام۔

(۲) دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ تقریباً تین پشتوں کی جنگ تھی، اب جب جنگ انتہا کو پہنچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی ہے کہ کابل کسی نئی خون ریزی سے بچ گیا ہے۔ یہ پوری دنیا کیلئے حیران کن بات ہے کہ طالبان کابل میں پرامن طریقے سے داخل ہوئے ہیں، کابل نے مزاحمت نہیں کی اور بغیر کسی لڑائی کے کابل طالبان کے کنٹرول میں آگیا ہے، اس پر خوشی کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاریخ پر نظر رکھنے والے حضرات ہی جانتے ہیں کہ کتنا بڑا معجزانہ واقعہ ہوا ہے کہ کابل کسی مزاحمت کے بغیر سرنڈر ہو گیا ہے۔

جبکہ پورے افغانستان میں ایسی صورتحال ہے کہ افغانیوں نے عمومی طور پر طالبان کی دوبارہ آمد پر مسرت کا اظہار کیا ہے، پھول پیش کیے جا رہے ہیں اور ان کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ افغان قوم کے اجتماعی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے کہ افغان قوم جہاں حریت پسند ہے کہ کسی دوسرے کا تسلط قبول نہیں کرتی، اسی طرح افغان قوم نے غیر ملکی تہذیب اور غیر ملکی نظریات کو بھی مسترد کر دیا ہے۔ اسلام کے ساتھ، شریعت کے قوانین کے ساتھ، افغان قوم کی تہذیب و روایات کے ساتھ افغان قوم کی کمٹمنٹ آج بھی قائم ہے اور اس کا ایک بار پھر اظہار ہو گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرنا چاہیے، طالبان کو مبارکباد دینی چاہیے اور افغان قوم کے ساتھ یکجہتی و ہم آہنگی کا اظہار کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ افغانستان کے روشن مستقبل کے حوالے سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک

یہ کہ افغانستان کو تقسیم کرنے کی بہت دفعہ کوشش ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی کہ تقسیم نہیں ہوا اور افغانستان کی وحدت قائم ہے۔ دوسرا افغان قوم کی شریعت اور اپنی تہذیب کے ساتھ کمٹمنٹ قائم ہے، الحمد للہ۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس جذبے کو سراہا جائے اور افغانستان کی وحدت و سالمیت کو سپورٹ کیا جائے۔

افغانستان اور افغان قوم کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت قومی وحدت کا ماحول قائم کرنا اور قائم رکھنا ہے۔ پہلے بھی افغان قوم کو کئی بار تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی، اب مزید کوششیں ہوں گی، زبان کے حوالے سے، نسل کے حوالے سے، مذہب کے حوالے سے، مسلک کے حوالے سے، فرقے کے حوالے سے، تقسیم کے کئی بیج بوئے جا رہے ہیں۔ میں اپنے بھائیوں سے، اپنے ساتھیوں سے عرض کروں گا کہ افغان قوم کو اپنی وحدت کا ماحول قائم کرنے دیجیے، کسی قسم کی تفریق کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے، نہ مذہبی، نہ مسلکی، نہ سیاسی، نہ لسانی، نہ علاقائی۔ اگر قومی وحدت کا ماحول قائم رہے گا تو شریعت کے ساتھ اور افغان قوم کی روایات کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ قائم ہے، ان کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا، ان شاء اللہ العزیز۔ ہمیں اس وقت ان کیلئے دعا کرنی چاہیے، اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، ان کی قومی وحدت کو سپورٹ کرنا چاہیے، شریعت اور افغان قوم کی تہذیب کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ کو سلام کرنا چاہیے، اور ان کے خلاف کسی قسم کی سازش میں حصہ نہیں بننا چاہیے، شعوری طور پر بھی نہیں اور غیر شعوری طور پر بھی نہیں۔

(۳) تیسری بات، ایک عرصہ سے یہ جنگ چل رہی ہے، نصف صدی تو ہمیں بھی ہو گئی ہے اس جنگ کو دیکھتے ہوئے، کئی پشتوں سے یہ جنگ چل رہی ہے۔ اب یہ ماحول سامنے ہے کہ دنیا بھر سے تنقیدی تبصرے آ رہے ہیں، باقی دنیا تو جو کرتی ہے کرے، مگر افغانستان کے ساتھ، طالبان کے ساتھ، شریعت کے ساتھ اور افغان تہذیب کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے حضرات تو کم از کم اس جال میں نہ پھنسیں۔ سب سے مشکل مرحلہ یہ ہے کہ ہمدردی رکھنے والے دوست بھی جال کا شکار ہو رہے ہیں، کبھی ایک حوالے سے کبھی دوسرے حوالے سے۔ بہت سے حلقے اپنے اپنے فارمولے، اپنی اپنی تجاویز، اپنے اپنے تبصرے پیش کر رہے ہیں، ایک طوفان برپا ہے دنیا میں منفی پراپیگنڈے کا، کردار کشی کا، جس کا ہم بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ میری یہ درخواست ہے اہل دین سے کہ طالبان کو سیٹ ہونے کیلئے وقت دیں۔ ہمارے اپنے اپنے فارمولوں نے ہمارا کیا حشر کر رکھا ہے کہ ہم ان کو مشورہ دیں گے؟ ہم خود ستر سال سے فارمولوں کی جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سب دوستوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے کہ خدا کیلئے اپنے ستر سال کے ناکام تجربے ان کے سر مت تھوپیے، ان کو آزادی سے کام کرنے دیجیے، وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں افغانستان کو بھی، اپنے مستقبل کو بھی، قومی تقاضوں کو بھی، اور شریعت کو بھی ہم سے بہتر سمجھتے ہیں، وہ مبتلیٰ بہ ہیں اور شرعاً مبتلیٰ بہ کی رائے کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

میں برطانیہ کے چیف آف ڈیفنس سٹاف کے اس بیان کا خیر مقدم کروں گا کہ انہوں نے وہی بات کی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں، آج کے اخبارات میں چھپی ہے کہ طالبان کو وقت دیں اور کام کرنے کا موقع دیں۔ میری گزارش ہے کہ روس نے کتنا وقت لیا؟ دس سال۔ امریکہ نے کتنا وقت لیا؟ بیس سال۔ ان غریبوں کو دس سال کا وقت تو دیں کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں، اور دیکھیں کہ اپنی ترجیحات کے مطابق وہ کیا کرتے ہیں۔ میں برطانیہ کے کمانڈر کی اس بات کو سراہوں گا اور سب لوگوں سے درخواست کروں گا کہ ”امارتِ اسلامیہ افغانستان“ کو اپنی قوم کو اعتماد میں لینے کا موقع

دیجیے، اپنے نظام کو مرتب کرنے اور نافذ کرنے کا موقع دیجیے، اور چند سال دیکھیے پھر سارے تبصرے کر لینا، جس نے مثبت کرنا ہے مثبت کر لے، جس نے منفی کرنا ہے منفی کر لے۔ فی الوقت ان کو آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل کی تشکیل کا موقع دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابی نصیب فرمائیں اور ہمیں ان کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام

۲۶ ستمبر ۲۰۲۱ء کو ادارۃ النعمان گوجرانوالہ میں لیکچر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج میں آپ حضرات کو موجودہ معروضی حالات میں اسلام کے قانون و نظام کو کسی بھی سطح پر تسلیم کرنے والی مسلم حکومتوں کی صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جن کے دستور و قانون میں اسلام کا نام شامل ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اور ریاستیں ہیں۔ سعودی عرب، پاکستان اور ایران تو سب کے سامنے ہیں البتہ مراکش میں بھی سربراہ مملکت کو امیر المؤمنین کہا جاتا ہے جس کا پس منظر اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

(۱) سعودی عرب کا باقاعدہ نام ”المملکۃ العربیۃ السعودیۃ“ ہے جو آج سے کم و بیش ایک صدی قبل خلافتِ عثمانیہ کے بکھرنے کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ اس ریاست میں ”آل سعود“ کے زیر اقتدار وہ علاقے شامل ہیں جن میں اس وقت مختلف معاہدات کی صورت میں آل سعود کے دائرۂ اقتدار میں شامل کیا گیا تھا اور ان پر بین الاقوامی طور پر آل سعود کا حق حکمرانی خاندانی اور نسلی بنیاد پر تسلیم کیا گیا تھا، جبکہ آل سعود نے حکمرانی کا حق ملنے کے بعد قرآن کریم کو اپنی مملکت کا ریاستی مذہب اور دستور و قانون کی بنیاد قرار دینے کا اعلان کیا تھا، سعودی عرب کی حکومتی نظام میں الشیخ محمد بن عبد الوہابؒ کا خاندان بھی ”آل شیخ“ کے نام سے ایک معاہدہ کے تحت شریک تھے اور ان کے درمیان تقسیم کار چلی آرہی ہے۔

سعودی عرب کا عدالتی نظام مکمل طور پر قرآن و سنت کے تابع ہے جس کی برکات پورے ملک میں دکھائی دے رہی ہیں، البتہ اب موجودہ ولی عہد شہزادہ محمد نے یہ سوال اٹھا دیا ہے کہ دستور و قانون کی بنیاد قرآن کریم کے ساتھ حدیث و سنت بھی ہے یا صرف قرآن کریم ہی ریاست و حکومت کی اساس ہے۔ بہرحال خاندانی حکومت ہونے کے باوجود اپنے دستور و قانون کے حوالے سے ایک اسلامی ریاست ہے اور حالات میں مختلف تغیرات کے باوجود اسلامی ریاست اور حرمین شریفین کے انتظام و خدمت کے حوالے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت و احترام سے بہرہ ور ہے۔

(۲) پاکستان ایک سیاسی اور عوامی تحریک کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے دوران برطانوی استعمار کے تسلط کے خاتمہ اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر وجود میں آیا تھا، اور اس نئی مملکت کے قیام کی تحریک چلانے والے قائدین نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کیلئے الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری کیلئے کر رہے ہیں، چنانچہ ملک کے باقاعدہ قیام اور مسلم لیگ کو اقتدار منتقل ہونے کے بعد اس کے ریاستی و حکومتی نظام کی تشکیل کا سوال کھڑا ہوا تو اگرچہ سیکولر حلقوں اور لابیوں نے پوری کوشش کی کہ اس نوزائیدہ مملکت کو ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کی حیثیت دے دی جائے مگر دستور ساز اسمبلی نے ”قراردادِ مقاصد“ کی

صورت اس کی نظریاتی بنیاد ہمیشہ کیلئے طے کر دی کہ

(۱) حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔

(۲) حقِ حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوگا، اور

(۳) پارلیمنٹ اور حکومت قرآن و سنت کے احکام کی پابند ہوں گی۔

ان اصولوں کی تشریح تمام مکاتب فکر کے ۱۳۱ اکابر علماء کرام نے متفقہ "۲۲ دستوری نکات" کی صورت میں کر دی جن میں سے بیشتر نکات دستورِ پاکستان کا باقاعدہ حصہ ہیں اور انہی اسلامی دستوری بنیادوں کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ عملی صورتحال شروع سے اب تک اس سے مختلف چلی آرہی ہے اور مقتدر حلقے دستوری صراحتوں کے باوجود عملی طور پر اسلامی احکام و قوانین کو نفاذ و فروغ کا کوئی راستہ نہیں دے رہے۔ البتہ دستوری اساس کے لحاظ سے ہر ایک اسلامی ریاست ہے اور اگر دستور پر تمام ادارے اور طبقے خلوص کے ساتھ عمل کریں تو پاکستان اسلامی ریاست کے طور پر ایک آئیڈیل ملک کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آسکتا ہے۔

(۳) تیسری طرف ایران نے جناب آیت اللہ خمینی کی قیادت سے مذہبی انقلاب کے بعد خود کو "اسلامی جمہوریہ ایران" کی شکل دی اور اسلام کو ریاست کا سرکاری دین اور "اثنا عشری فقہ" کو ملک کا ریاستی مذہب قرار دیا، دستور کے مطابق ملک میں حاکمیت اعلیٰ "امامِ غائب" کی تسلیم کی گئی اور ان کی نمائندگی "ولایتِ فقیہ" کے عنوان سے ملک کے سب سے بڑے فقیہ کرتے ہیں جو اپنے دور میں خمینی صاحب تھے، اور اب جناب آیت اللہ خامنہ ای صاحب کو وہ مقام حاصل ہے جو مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ سمیت تمام ریاستی و حکومتی اداروں کیلئے حکمران اعلیٰ اور فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ نظام حکومت چلانے کیلئے عوام کے منتخب نمائندوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے اور پارلیمنٹ اور حکومتی مناصب عوامی الیکشن کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ گویا ایران میں اہلِ تشیع کے اثنا عشری طبقہ نے اپنے تصورِ امامت کو دستوری اور قانونی حیثیت دے دی ہے جو ان کے دائرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ اس پر سختی سے قائم ہیں۔

(۴) اس پس منظر میں افغانستان اور طالبان پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔ طالبان نے اب سے دو عشرے قبل اپنے دور اقتدار میں افغانستان کو "امارتِ اسلامی افغانستان" کا عنوان دیا تھا جس میں امیر المومنین کے طور پر ملا محمد عمر مجاہدؒ نے کم و بیش پانچ سال حکومت کی جس کے مثبت ثمرات و نتائج اور برکات کا ابھی تک عالمی سطح پر اعتراف کیا جا رہا ہے، اس کے بعد انہیں امریکی اتحاد کے ساتھ بیس سال تک جنگ لڑنا پڑی جس میں سرخرو ہونے کے بعد اب پھر وہ پورے افغانستان میں برسر اقتدار ہیں اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنے اقتدار اور نظام کو حتمی شکل دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس موقع پر میں باقی تفصیلات سے قطع نظر دو باتوں کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

- ایک یہ کہ افغانستان پر طالبان کے کنٹرول اور حکومت کو تسلیم کرنے کی بجائے بین الاقوامی دباؤ کے ذریعے انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ان شرائط اور قیود کو بہرحال تسلیم کریں جو عالمی اداروں نے ان کیلئے طے کر رکھے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ زیادتی اور ناانصافی کی بات ہے، وہ اسلامی عقیدہ اور افغان ثقافت کے ساتھ بے

لچک کمٹمنٹ رکھتے ہیں اور ان کا ایک مستقل "وژن" ہے جسے یکسر مسترد کر دینے کی بجائے معاشرتی تجربہ اور سماجی عملداری کا موقع ملنا چاہئے۔ عالمی قوتیں اپنے نظام اور سولائزیشن کو ہر جگہ مسلط کرنے کیلئے دباؤ، جبر اور مکر کے جو حربے مسلسل استعمال کر رہی ہیں وہ بجائے خود ان کے نظام و ثقافت کے کھوکھلا ہونے کی علامت ہے۔ انہیں اگر اپنی سولائزیشن کے انسانی سماج کیلئے مفید ہونے کا یقین ہے تو اس کا فیصلہ انسانی سماج کو کرنے دیں جو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ متبادل نظام و ثقافت کے طور پر امارت اسلامی افغانستان کو کسی بیرونی مداخلت اور ڈکٹیشن کے بغیر آزادی کے ساتھ اپنا نظام قائم کرنے کا موقع دیں اور کچھ عرصہ انہیں مکمل خود مختاری کے ساتھ اپنے نظام و ثقافت پر عمل کرنے دیں، تاکہ دنیا کے سامنے یہ بات واضح ہو سکے کہ انسانی سماج کی بہتری کیلئے مغرب کا نظام و ثقافت زیادہ کارآمد ہے یا اسلامی نظام و قانون زیادہ مفید ہے۔ یہ فیصلہ خود کرنے کا کسی بھی فریق کو حق حاصل نہیں ہے، جبکہ مغرب یکطرفہ طور پر دھونس، دھاندلی، جبر اور دباؤ کے تمام حربے اختیار کر کے افغانستان میں اسلامی نظام و ثقافت کے نفاذ کا راستہ روکنے پر تُلا بیٹھا ہے۔

- دوسری بات مسلم حکومتوں سے کرنا چاہوں گا کہ اسلام کے عقیدہ و ثقافت کے ساتھ وہ بھی اپنے ایمان و کمٹمنٹ کا دعویٰ کرتے ہیں مگر عالمی دباؤ کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر رہے ہیں، ان کیلئے اپنے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ وابستگی کے اظہار کا طریقہ یہی ہے کہ وہ امارت اسلامی افغانستان کے راستے میں روڑے اٹکانے کی بجائے اسے آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیں، وہ اگر تعاون نہیں کر سکتے تو رکاوٹیں کھڑی کرنے سے گریز کریں، ہمیں یقین ہے کہ اگر امارت اسلامی افغانستان کو کسی قسم کی بیرونی مداخلت اور ڈکٹیشن کے بغیر کم از کم دس سال آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو دنیا کے سامنے اسلامی احکام و قوانین کو آئیڈیل نظام کے طور پر پیش کرنے کا جو خواب بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے پیش کیا تھا وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پڑوس میں امارت اسلامی افغانستان کی صورت میں دنیا ضرور دیکھ لے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۲۱ء)

"دہشت گردی" کے خلاف جنگ میں ناکامی

۱۹ اکتوبر کو شاہدرہ لاہور میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام
"ختم نبوت کانفرنس" سے خطاب کا کچھ حصہ

ہم نے اب سے بیس سال پہلے ایک جنگ شروع کی تھی "دہشت گردی" کے خلاف امریکہ کی قیادت میں اس کے اتحادی کے طور پر۔ وہ جنگ ختم ہو گئی ہے، امریکی اتحاد اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے واپس چلا گیا ہے اور یورپی پارلیمنٹ نے بھی اپنی ناکامی تسلیم کی ہے۔ طالبان یہ کھلم کھلا کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کے ساتھ ہماری لڑائی حالتِ جنگ میں تھی، اب کوئی لڑائی نہیں ہے، اب نیا ماحول ہے، لڑائی ختم ہو گئی۔ سوال یہ ہے اسلحے کی لڑائی تو ختم ہو چکی، اِدھر سے بھی ختم ہو گئی اُدھر سے بھی ختم ہو گئی۔ البتہ تہذیب کی، ثقافت کی، عقیدے کی اور نظریے کی جنگ بدستور جاری ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی، افغانیوں کو ان کی تہذیب و ثقافت اور عقیدہ سے دستبردار کروانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہم اس جنگ میں بھی امریکہ کے اتحادی ہیں؟ جس جنگ میں ہم نے معاہدہ کیا تھا وہ ختم ہو چکی، اب کس بات کا اتحاد ہے؟ میرا ملک کے اسٹیک ہولڈرز سے سوال ہے کہ ہتھیاروں کی جس جنگ میں ہم امریکہ کے اتحادی تھے وہ جنگ ختم ہو گئی۔ اب جنگ عقیدہ و نظریہ، تہذیب و ثقافت اور افغان روایات کی ہے، کیا اس جنگ میں بھی ہم امریکہ کے اتحادی ہیں؟ میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم بحیثیت قوم اس تہذیبی جنگ میں امریکہ کے اتحادی نہیں ہیں بلکہ عقیدہ و مذہب اور تہذیب و نظریہ میں ہم افغان قوم کے ساتھ تھے، ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حکمرانوں سے گزارش ہے کہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرو، اپنی پوزیشن واضح کرو اور قوم کا فیصلہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہتھیاروں کی جنگ میں فیصلہ کرنا آپ کا کام تھا لیکن عقیدے کی جنگ تمہاری نہیں ہماری ہے۔ یہ جنگ ہم لڑیں گے، ثقافت کی جنگ ہم لڑیں گے، نظریے اور عقیدے کی جنگ ہم لڑیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

افغانستان کا بحران اور ہمارا افسوسناک طرزِ عمل

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۲۱ء

روزنامہ اسلام لاہور ۷ نومبر ۲۰۲۱ء کی خبر کے مطابق امارتِ اسلامی افغانستان کے وزیر خارجہ مولوی محمد امیر خان متقی اپنے وفد کے ہمراہ دوحہ پہنچ گئے ہیں جہاں وہ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کے حوالے سے امریکی حکمرانوں سے مذاکرات کریں گے۔ جبکہ اخبار کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات جناب فواد چوہدری نے اسلام آباد میں اے پی پی کے ملازمین کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلحہ کی جنگ تو ختم ہو گئی اب باتوں کی جنگ جاری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ افغانستان کی جنگ ساڑھے تین گھنٹے میں ختم ہو گئی تھی جب کابل کے حکمران بھاگ گئے تھے اور امریکہ جنگ ہار گیا تھا مگر اب باتوں اور بیانیہ کی جنگ جاری ہے۔

ہمارے خیال میں فواد چوہدری نے موجودہ صورتحال کے حوالے سے ایک اہم سوال کا جواب دیا ہے کہ جب تمہاری جنگ ختم ہو گئی ہے تو اب کیا ہو رہا ہے اور امریکہ کے ساتھ مذاکرات کے نئے مرحلہ کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے جس کیلئے دوحہ میں مذاکرات کے ایک اور دور کا آغاز ہو گیا ہے؟ وفاقی وزیر اطلاعات نے اس کی وجہ باتوں اور بیانیہ کی جنگ

کو قرار دیا ہے اور ہمیں اس حد تک ان کی بات سے اتفاق ہے کہ اب جنگ باتوں اور بیانیہ کی ہے، مگر اس سے اگلی بات بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ صرف باتوں کی جنگ نہیں بلکہ نظریات اور تہذیب و ثقافت کی جنگ ہے جس کے ذریعے میدانِ جنگ میں افغان طالبان کے ہاتھوں واضح شکست سے دوچار ہونے والی قوتیں اس جنگ کے مقاصد کو معاشی دباؤ اور نفسیاتی حربوں کے ذریعے حاصل کرنے کے درپے ہیں، اور امریکی اتحاد اس کوشش میں ہے کہ فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت کے غلبہ کا جو ایجنڈا وہ ہتھیاروں کی جنگ میں پورا نہیں کر سکا اس کی تکمیل کیلئے سیاسی، معاشی اور نفسیاتی ہتھیاروں کو بروئے کار لا کر اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر لیا جائے۔

ہمارے نزدیک اس وقت افغان قوم تین بحرانوں سے دوچار ہے جو زیادہ تر مصنوعی ہیں اور امریکہ اور اس کے حواریوں کی پیدا کردہ ہیں:

- افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو افغان قوم کے کسی فیصلہ کے علی الرغم بین الاقوامی معاہدات اور مغرب کے سیاسی شکنجے میں جکڑ لیا جائے تاکہ وہ ان بین الاقوامی معاملات کے بارے میں آزادی کے ساتھ خود کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔
- امارتِ اسلامی افغانستان کو ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ اور اپنے عقیدہ و ثقافت کے مطابق کوئی نظام قائم کرنے سے ہر قیمت پر روکا جائے۔
- افغانستان کو معاشی ناکہ بندی اور بائیکاٹ کے ذریعے ایسے حالات سے دوچار کر دیا جائے کہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر کوئی نظم قائم نہ کر سکے اور سنگین ترین معاشی بحران کو حل کرنے کی بجائے مسلسل بڑھاتے ہوئے افغان قوم کو مغربی فلسفہ و ثقافت کو بہر حال اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

اس مقصد کیلئے نہ صرف یہ کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے بلکہ دنیا کو ان کی معاشی امداد سے دور رکھنے کیلئے ہر قسم کے دباؤ اور حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ امارت اسلامی افغانستان کے اس تقاضے کو بھی بے رحمانہ انداز میں نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ اگر خود افغانستان کے منجمد اثاثے بحال کر دیے جائیں تو وہ کسی اور بیرونی مدد کے متقاضی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ مسلسل ہو رہا ہے، ساری دنیا کے سامنے ہو رہا ہے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جس میں مغربی ملکوں اور استعماری قوتوں کا کردار تو سمجھ میں آتا ہے مگر مسلّمہ مسلم ممالک بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کا طرز عمل کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ المسلم اخو المسلم لا یَظلمه ولا یُسلمه ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم کیلئے کسی اور کے حوالے کرتا ہے۔ جبکہ امت مسلمہ اس وقت خاموش تماشائی دکھائی دے رہی ہے بلکہ جب بھی کسی عملی کردار کا موقع آتا ہے تو اس کا وزن اور جھکاؤ منفی نظر آنے لگتا ہے۔ ان حالات میں مسلم حکومتوں سے کسی خیر کی توقع تو اب نظر نہیں آتی مگر علم و دانش اور رائے عامہ کا وہ میدان ضرور موجود ہے جس میں اربابِ فکر و دانش اگر کچھ کرنا چاہیں تو اس کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

اس لیے ہم اربابِ علم و دانش سے گزارش کریں گے کہ وہ خاموش تماشائی بنے رہنے کی بجائے اپنے کردار کو مؤثر طریقہ سے ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا کریں۔ جبکہ اصحابِ ثروت سے بھی یہی گزارش ہے کہ اس سنگین معاشی بحران میں اپنے افغان بھائیوں کی امداد پر سنجیدہ توجہ دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

افغانستان کی صورتحال: دینی حلقوں کی سرگرمیاں

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۹ دسمبر ۲۰۲۱ء

افغانستان کی صورتحال اور ہماری دینی و ملی ذمہ داریوں کے حوالے سے دینی و سیاسی حلقوں کو توجہ دلانے کیلئے پاکستان شریعت کونسل کی رابطہ مہم جاری ہے، اس سلسلہ میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے تین اجلاسوں کی کارگزاری پیش خدمت ہے۔ تفصیلی گذارشات ۲۲ دسمبر کے اجلاس کے بعد پیش کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(ا)

”لاہور (پ ر) مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور دانشوروں نے افغانستان میں امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کیلئے رابطہ مہم کا فیصلہ کیا ہے اور 22 دسمبر بدھ کو لاہور میں ”آل پارٹیز افغان سیمینار“ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے جو جمعیت علماء پاکستان کے رہنماء مولانا قاری محمد زوار بہادر کی میزبانی میں ان کے ادارہ میں ہوگا۔

یہ اجلاس ۲ دسمبر کو جمعیت علماء اسلام (س) کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی میزبانی میں جامع مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی کی زیر صدارت ہوا جس میں مولانا عبد الرؤف ملک، قاری منصور احمد، قاری محمد زوار بہادر، عبد اللطیف خالد چیمہ، مولانا محمد امین ربانی، رانا مقصود احمد ایڈووکیٹ، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، مفتی شاہد عبید اور دیگر نے شرکت کی۔ اجلاس میں فتح کابل سے لے کر آج تک کی صورتحال کا بغور جائزہ لیا گیا اور اس امر پر مکمل اتفاق کیا گیا کہ امارت اسلامی افغانستان کو اخلاقی و سیاسی اور معاشی مدد فراہم کرنا پوری امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے دنیا بھر میں مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

مولانا زاہد الراشدی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ افغان حکومت اور افغان عوام کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا، امریکہ جنگ کے ذریعے جو ایجنڈا ہار چکا ہے وہ اب معاشی دباؤ کے تحت منوانا چاہتا ہے، لیکن ہم رائے عامہ اور اہم شخصیات کو بیدار کر کے امریکی ایجنڈے کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنا اپنے ایمانی جذبے کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

مولانا عبد الرؤف فاروقی نے اجلاس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور سعودی عرب کو چاہیے کہ سب سے پہلے امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کریں۔ عبد اللطیف خالد چیمہ نے کہا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے گھبرا کر عالمِ کفر نت نئے پینترے بدل رہا ہے۔

اجلاس میں اس بات پر اتفاق کا اظہار کیا گیا کہ پاکستان کیلئے پُرامن اور محفوظ افغانستان کسی نعمت سے کم نہیں ہے

جب کہ مکار دشمن پاکستان اور افغانستان میں قیامِ امن کا دشمن ہے۔ اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ امارت اسلامی افغانستان کی سیاسی و معاشرتی اور اخلاقی حمایت کیلئے ملک بھر میں کیمپین چلائی جائے گی اور ایک وسیع رابطہ کمیٹی تشکیل دے کر اس مہم کو آگے بڑھا جائے گا۔ نیز زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بریفنگ کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے رہنماء علامہ ابتسام الٰہی ظہیر نے اجلاس کے بعد عبد اللطیف خالد چیمہ سے فون پر گفتگو میں اجلاس کے مکمل فیصلوں سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مکمل تائید وحمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ اس وقت مظلوم افغان عوام کو انسانی بحران کا مسئلہ درپیش ہے، ایسے میں ان کے حق میں آواز اٹھانا انسانیت کی بھی بہت بڑی خدمت ہے۔"

(۲)

"پاکستان شریعت کونسل سندھ کی صوبائی شوریٰ نے امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کے رویہ کو افغان عوام کی معاونت میں رکاوٹ قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنے کیلئے دوسری جماعتوں کے تعاون سے رابطہ عوام مہم اور سفرناموں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

صوبائی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس آج جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن، نارتھ کراچی میں امیر سندھ مولانا قاری اللہ داد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مرکزی نائب امیر مولانا رشید احمد درخواستی اور سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے بھی خصوصی شرکت کی جبکہ دیگر شرکاء میں ڈاکٹر سیف الرحمن آرائیں، محمد اسلم شیخ ایڈووکیٹ، مولانا حافظ محمد اکبر، مولانا حافظ اقبال، مولانا قاری حضرت ولی، مولانا احتشام الحق خیری، مولانا مفتی حبیب احمد درخواستی، مولانا شفیق، مولانا مفتی ثناء اللہ محمود، مولانا عبد الوہاب، مولانا عدنان ملکیانوی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

اجلاس میں ایک قرار داد کے ذریعے امارتِ اسلامی افغانستان کے حوالے سے مسلم ممالک کے رویہ کو بطور خاص افسوسناک قرار دیا گیا کہ امارت اسلامی افغانستان کے کنٹرول کے بعد اسے تسلیم نہ کرنا افغانستان کو معاشی طور پر محصور کر دینے اور سفارتی دنیا میں تنہا کرنے کے مترادف ہے جو قطعی طور پر غلط بات ہے۔ جبکہ افغانستان کے اثاثے امریکہ نے منجمند کر رکھے ہیں اور مختلف اطراف سے افغان عوام کی امداد کے راستے بند کر دیے گئے ہیں جس کی سب سے بڑی صورت ان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔

پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور راہنماؤں کے درمیان اس سلسلہ میں مشاورت اور رابطہ کا کام جاری ہے اور ۲۲ دسمبر بروز بدھ کو لاہور میں ایک کل جماعتی سیمینار میں مشترکہ حکمت عملی طے کی جائے گی اور اس کے مطابق ملک بھر میں تمام مکاتب فکر اور طبقات کے راہنماؤں کے ساتھ رابطے قائم کر کے مہم کو آگے بڑھایا جائے گا۔

اجلاس میں اوقاف ایکٹ کے سلسلہ میں حکومتی حلقوں کی طرف سے ترامیم کے وعدہ کی تکمیل کا مطالبہ کیا گیا کہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی طرف سے پیش کردہ ترمیمی اوقاف بل اسمبلی میں پیش کیا جائے۔

اجلاس میں یورپی یونین کی طرف سے ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے قوانین کو تبدیل کرنے کے مطالبہ کو مداخلت فی الدین قرار دیتے ہوئے اسے مسترد کرنے کا اعلان کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے حوالے سے کسی قسم کا بیرونی دباؤ قبول نہیں کیا جائے گا۔"

(۳)

"پاکستان شریعت کونسل نے مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ سے مطالبہ کیا ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری طور پر تسلیم کر کے افغان عوام کو موجودہ سنگین معاشی بحران سے نجات دلانے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کیے جائیں۔ یہ مطالبہ آج پاکستان شریعت کونسل اسلام آباد کے سرکردہ علماء کرام کے مشاورتی اجلاس میں کیا گیا جس کی صدارت مرکزی سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے کی۔ اجلاس میں مسلم وزراء خارجہ کی اسلام آباد میں تشریف آوری کا خیر مقدم کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلم حکومتوں کو امارتِ اسلامی افغانستان کو فوری طور پر تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کی آزادانہ حیثیت اور مسلم ممالک کی خود مختاری کے تحفظ کی طرف بھی سنجیدہ توجہ دینی چاہیے جو عالمی ایجنڈوں کے حصار سے نجات حاصل کرنے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی نے کہا کہ امارتِ اسلامیہ افغانستان کو تسلیم نہ کرنا افغان عوام کے ساتھ تعاون اور سنگین بحران میں ان کا ہاتھ بٹانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے اور مسلم دنیا کے تمام طبقات اور اداروں کو اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم حکمرانوں کو اپنی سوچ اور رویہ میں تبدیلی لانا ہوگی ورنہ وہ مسلم امہ کی نمائندگی کے حوالے سے بارگاہِ ایزدی کے ساتھ ساتھ تاریخ میں بھی سرخرو نہیں ہو سکیں گے۔

اجلاس میں مولانا ثناء اللہ غالب، حافظ سید علی محی الدین، ملک سعید احمد اعوان، مفتی محمد عبد اللہ خان، مولانا عبد الماجد، مفتی خان محمد، سید اعجاز شاہ کاظمی، حافظ سید علی معین الدین، سید سعید الرحمٰن شاہ کاظمی اور دیگر حضرات شریک تھے۔

اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے امریکہ سے مطالبہ کیا گیا کہ افغانستان کے منجمد اثاثے فوری بحال کیے جائیں اور میدانِ جنگ میں اپنی شکست کو مذاکرات کی میز پر فتح میں بدلنے اور معاشی ناکہ بندی کے ذریعے افغان قوم کو مغربی ایجنڈا قبول کرنے پر مجبور کرنے کا طرز عمل ختم کیا جائے۔"

۲۴ دسمبر ۲۰۲۱ء کو "یومِ افغانستان" منایا جائے

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۳ دسمبر ۲۰۲۱ء

امارتِ اسلامی افغانستان کی حمایت و تعاون کی طرف ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کو توجہ دلانے کی مہم بحمد اللہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں لاہور میں مختلف مکاتب فکر کا پہلا اجلاس متحدہ علماء کونسل کے سربراہ مولانا عبد الرؤف

ملک کی دعوت پر ۲۸ اکتوبر کو آسٹریلیا مسجد میں ہوا تھا، اس کے بعد جمعیت علماء اسلام پاکستان (س) کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پر دوسرا اجلاس ۱۸ دسمبر کو مسجد خضراء میں منعقد ہوا، اور تیسرا اجلاس جمعیت علماء پاکستان کے مرکزی راہنما مولانا قاری زوار بہادر کی دعوت پر ۲۲ دسمبر کو جامعہ محمدیہ رضویہ گلبرگ میں ہوا۔ جبکہ ۱۵ دسمبر کو جامعہ انوار القرآن کراچی اور ۱۷ دسمبر کو جامعہ رحمانیہ ھمک اسلام آباد میں پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اجتماعات بھی اسی تسلسل کا حصہ ہیں اور ان اجتماعات کا سلسلہ ملک کے مختلف شہروں میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۲۲ دسمبر کے اجلاس کے حوالے سے جمعیت علماء پاکستان کی جاری کردہ رپورٹ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، ملک بھر کے دینی احباب سے گزارش ہے کہ اس تسلسل کو قائم رکھنے اور اس میں وسعت کیلئے سرگرمی کے ساتھ ہر سطح پر محنت کریں تاکہ ہم افغان بھائیوں کی بروقت اور مؤثر امداد و حمایت کیلئے اپنی ملی و دینی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کر سکیں۔

”ملک بھر کی نمائندہ مذہبی، سیاسی جماعتوں کا ایک اہم اجلاس جمعیت علماء پاکستان کے سینئر راہنما علامہ قاری محمد زوار بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس میں جمعیت علماء پاکستان، جماعت اسلامی پاکستان، جمعیت علماء اسلام (س)، جمعیت علماء اسلام (ف)، پاکستان شریعت کونسل، مرکزی جمعیت اہلحدیث، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام پاکستان، اسلامی جمہوری اتحاد، تحفظ ناموس رسالت محاذ سمیت دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں کے قائدین ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا حافظ زبیر احمد ظہیر، مولانا محمد امجد خان، مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبد الرؤف ملک، مولانا محمد علی نقشبندی، حاجی عبد اللطیف چیمہ، مولانا محمد الیاس چنیوٹی (ایم پی اے)، ڈاکٹر شمس الرحمٰن شمس، حافظ نصیر احمد نورانی، مفتی تصدق حسین، رشید احمد رضوی، مولانا عبد الخالق ہزاروی، قاری جمیل الرحمٰن اختر، مولانا محمد سلیم اعوان، مفتی شاہد عبید، مولانا مجیب الرحمٰن انقلابی، مولانا یاسر رضوان سمیت دیگر راہنماؤں نے شرکت کی۔

ملک بھر کی دینی و سیاسی جماعتوں نے کہا ہے کہ پاکستان میں افغانستان کی صورتحال پر او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کا اجلاس منعقد ہونا خوش آئند اقدام ہے، جس میں مسلم ممالک کی طرف سے افغانستان میں خوراک کی قلت، اشیائے خورد و نوش کا فقدان ختم کرنے سے متعلق اہم اقدامات قابل تعریف ہیں۔

اجلاس میں کہا گیا کہ حکومتِ پاکستان اقوام عالم کا انتظار کیے بغیر امارتِ اسلامی افغانستان کو فوری تسلیم کرے۔

اجلاس میں امریکی حکومت اور اقوام عالم سے مطالبہ کیا گیا کہ امریکہ سمیت تمام دیگر ممالک اور مالیاتی ادارے افغانستان کے منجمد فنڈ فوری بحال کریں تاکہ افغان عوام اپنی مشکلات پر قابو پاسکیں۔

اجلاس نے او آئی سی سمیت دیگر اسلامی تنظیمات اور اسلامی ممالک سے مطالبہ کیا کہ وہ جتنا جلد ممکن ہوسکے افغان عوام کی مشکلات کو ختم کرنے کیلئے اقدامات کریں اور امارت اسلامی افغانستان کو تسلیم کرنے کا فوری طور پر اعلان کریں۔

اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ۲۴ دسمبر جمعۃ المبارک کو یوم افغانستان منایا جائے گا۔ ملک بھر کے خطباء اور ائمہ اسلامی ممالک سمیت اقوامِ عالم سے امارت اسلامی افغانستان کو فوری تسلیم کرنے کا مطالبہ کریں گے۔

اجلاس میں علامہ قاری محمد زوار بہادر کی سربراہی میں ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی جو اسلامی ممالک اور اسلامی تنظیمات سے رابطہ کے انہیں افغان عوام کی مشکلات سے آگاہ کرے گیا ور امریکہ سمیت دیگر ممالک کو خطوط ارسال کرے گی۔ یہ کمیٹی ابتدائی مشاورتی اجلاس ۲۶ دسمبر کو لاہور میں منعقد کر رہی ہے۔

اجلاس میں بھارتی حکومت کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کے عوام پر ظلم و بربریت اور اسرائیل کی طرف سے فلسطینی عوام پر ظلم کی شدید مذمت کی گئی۔

اجلاس میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کی شدید مذمت کرتے ہوئے اشیائے خورد ونوش، پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ، بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافے کو فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔

"عشرہ یکجہتیٔ افغانستان" کا لائحہ عمل

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳۰ دسمبر ۲۰۲۱ء

پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا مفتی محمد رویس خان ایوبی نے نئے عیسوی سن کا آغاز "عشرہ یکجہتی افغانستان" کے عنوان کے ساتھ کرنے کا اعلان کیا ہے جس کیلئے کونسل کا اعلامیہ درج ذیل ہے:

- دنیا کے تمام ممالک، بالخصوص مسلم حکومتیں اور حکومت پاکستان امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو باضابطہ تسلیم کرنے کا فوری اعلان کریں۔
- امریکہ اور دیگر مغربی قوتیں افغانستان کے منجمد فنڈز اور اثاثے بحال کریں اور ان پر عائد پابندیاں ختم کریں۔
- افغانستان کی وحدت و خود مختاری اور افغان قوم کے عقیدہ اور تہذیبی روایات کا احترام کیا جائے۔
- کسی قسم کی بیرونی مداخلت اور دباؤ کے بغیر افغان قوم کو اپنے ملک کا نظام اپنے عقیدہ و ثقافت کی بنیاد پر از خود

طے کرنے کا آزادانہ حق دیا جائے۔

- چار عشروں کی طویل جنگ سے پھیلنے والی تباہی کے بعد افغانستان کی تعمیر نو اور باوقار افغان معاشرہ کی بحالی کیلئے غیر مشروط طور پر بھرپور امداد مہیا کی جائے۔

امیر محترم کے اس اعلان کے حوالے سے احباب کو اس سلسلہ میں کرنے کے ضروری کاموں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

1. پاکستان شریعت کونسل کے تمام احباب اپنے معمولات و مصروفیات کی ترتیب پر نظر ثانی کر کے ان دس دنوں میں اس کام کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کریں اور دیگر ہم خیال جماعتوں کے ذمہ دار حضرات کو بھی توجہ دلا کر اس کام میں شریک کریں، نیز فوری طور پر باہمی مشاورت کے ساتھ ترتیب طے کر لیں۔
2. اپنے اپنے حلقۂ کار میں علماء کرام، دینی و سیاسی کارکنوں، تاجر راہنماؤں، قانون دان حضرات، اساتذہ اور دیگر طبقات سے افغانستان کے حوالے سے پاکستان شریعت کونسل کے موقف اور مطالبات پر دستخط حاصل کریں۔
3. اس دوران اپنے حلقہ کے ایم این اے اور ایم پی اے حضرات سے وفود کی صورت میں ملاقات کر کے ان تک یہ مطالبات پہنچائیں اور انہیں اسمبلی میں اس کیلئے آواز اٹھانے پر آمادہ کریں۔
4. اخباری نمائندوں اور سوشل میڈیا پر متحرک گروپوں اور شخصیات کو ان مطالبات کی حمایت کیلئے تیار کریں۔
5. جہاں اور جس درجہ میں علماء کرام اور دینی و سیاسی کارکنوں کے مشترکہ اجتماعات کا اہتمام کیا جا سکے ان کا انعقاد کریں اور ان کی رپورٹس اخبارات اور سوشل میڈیا کے ذریعے عام کریں۔
6. سات جنوری کو جمعۃ المبارک کے اجتماعات میں اس موضوع پر گفتگو اور مطالبات کی حمایت کیلئے خطباء کرام اور علماء کرام کو توجہ دلائیں۔
7. تاجر اور مخیر حضرات کو اپنے افغان بھائیوں کی امداد و تعاون کی طرف توجہ دلائیں اور پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرؤف محمدی کے ذریعے اس سلسلہ میں کام کرنے والے حضرات سے ان کا رابطہ کرائیں۔
8. دانشور اور کالم نویس دوستوں سے ملاقاتیں کر کے انہیں ان مطالبات کی حمایت کی طرف توجہ دلائیں۔
9. اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام مختلف گروپ بنا کر سفارتخانوں سے رابطہ کریں اور ان تک یہ موقف اور مطالبات باضابطہ طور پر پہنچائیں۔
10. اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ دینی اجتماعات بالخصوص نمازوں کے بعد دعا کا بطور خاص اہتمام کریں کہ اللہ رب العزت ہمارے افغان بھائیوں کو اس بحران سے جلد از جلد نجات عطا فرمائیں اور ”امارتِ اسلامی

افغانستان" کو افغانستان کی تعمیرِ نو اور اسے صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کے مواقع، توفیق اور قبولیت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سودی نظام اور مسلم ممالک

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۲۲ء

روزنامہ اسلام لاہور ۲۲ دسمبر ۲۰۲۱ء کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیں:

"انقرہ (مانیٹرنگ ڈیسک) ترک صدر رجب اردوان نے شرح سود میں اضافے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں وہ کروں گا جو دین کہے گا۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے مطابق ترک صدر رجب طیب اردوان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مجھ سے شرح سود میں اضافے کی کوئی امید نہ رکھی جائے کیونکہ ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں اسلامی تعلیمات کے تحت کام کرتا رہوں گا۔ واضح رہے کہ ترکی کی کرنسی لیرا میں گراوٹ ہو رہی ہے اور ان حالات میں ترک صدر سے شرح سود میں اضافے کا مطالبہ کیا گیا تھا جس پر انہوں نے اعلان کیا ہے کہ شرح سود میں اضافہ نہیں ہو گا۔ ترک صدر کی جانب سے نئے مالیاتی نظام کے اعلان کے بعد دم توڑتے لیرا نے اونچی پرواز پکڑ لی ہے۔ ترک صدر کی جانب سے بینکوں میں پڑے ترک لیرے کی قدر و قیمت کی گارنٹی کا اعلان کیا گیا تھا جس کے بعد صرف چند گھنٹوں میں لیرا کی قدر میں ڈالر کے مقابلہ میں بیس فیصد سے زائد اضافہ ہو گیا۔ ترک صدر کی نئی مالیاتی پالیسی کے تحت اکاؤنٹ ہولڈرز کو لیرا میں کرنسی رکھنے پر ڈالر ایکسچینج ریٹ پر تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ترکش لیرا کی ڈالر کے مقابلہ میں گراوٹ کو بینک کور کریں گے اور بینک ڈیپازٹ تاریخ کے مطابق فرق اکاؤنٹ ہولڈرز کو دیا جائے گا۔"

سود کے بارے میں اس بات پر اب ماہرین کا کم و بیش اتفاق دکھائی دے رہا ہے کہ سودی معیشت دنیا کے معاشی نظام اور ماحول میں عدمِ توازن اور افراط و تفریط کا باعث بنی ہے جس کی وجہ سے غریب اور امیر اقوام و ممالک اور طبقات میں تفاوت بڑھتا جا رہا ہے، جس کا حل سودی سسٹم کو ریورس گیئر لگانے کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ ورلڈ بینک کے ایک سابق ڈائریکٹر کے انٹرویو کے حوالے سے ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں کہ معیشت میں ہوشربا تفاوت کو ختم کرنے اور توازن پیدا کرنے کیلئے ان کے خیال میں شرح سود کو کم سے کم کرنا ضروری ہے جو انہوں نے ایک سوال کے جواب میں "زیرو" بتائی تھی۔

اس کے ساتھ ہی سودی نظام غریب اقوام و ممالک کو عالمی استعماری قوتوں کے معاشی شکنجے میں جکڑنے کا ایک مکروہ جال بھی ہے جس کے ذریعے غریب ممالک کو استعماری پالیسیوں کے سامنے سرنڈر ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثال افغانستان ہے جس سے فوجی انخلا سے قبل امریکہ نے اس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ خود اس کے دور کے

ملازمین کی آٹھ ماہ کی تنخواہیں واجب الادا تھیں جبکہ افغانستان کی مغربی بینکوں میں پڑی رقوم کو منجمد کر دیا گیا ہے۔ اور امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کر کے افغانستان کیلئے بیرونی تعاون و امداد کے قانونی ذرائع مسلسل بند رکھے جا رہے ہیں۔ جس کا اس کے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ افغان قوم کی ہر طرف سے معاشی جکڑ بندی کر کے اسے امریکہ اور یورپی یونین کے عالمی اور علاقائی ایجنڈے کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے جس میں عقیدہ و ثقافت سے دستبرداری بھی شامل ہے۔ یہی حربہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سمیت بہت سے مسلم ممالک کے خلاف ایک عرصہ سے آزمایا جا رہا ہے اور خود ترکی بھی کم و بیش پون صدی تک اس جال میں رہ چکا ہے۔

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اپنی وفات سے چند ہفتے قبل یہ ہدایت کی تھی کہ پاکستان کا معاشی نظام مغربی فلسفہ اور اصولوں پر نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات پر استوار کیا جائے۔ اور اس موقع پر انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ مغربی معاشی نظام نے انسانیت کو تباہی اور جنگوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مگر قائد اعظمؒ کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمارے ارباب حل و عقد نے ملک کے معاشی نظام کو مغربی فلسفہ اور عالمی اداروں کے کنٹرول میں دے دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ ہم بحیثیت قوم عالمی مالیاتی اداروں بالخصوص آئی ایم ایف کے آگے "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور گورنر پنجاب کے بقول آئی ایم ایف نے قرضوں کے عوض ہم سے ہمارا سب کچھ لکھوا لیا ہے۔

عالمی مالیاتی اداروں اور مغرب کے معاشی نظام کے شکنجے سے نکلنے کی بات اس سے قبل ملائشیا کے سابق وزیر اعظم مہاتیر محمد بھی کر چکے ہیں اور جس کیلئے انہوں نے طریق کار اور ترتیب بھی پیش کی تھی مگر مسلم حکومتوں نے اس طرح توجہ دینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ اور اب اس تناظر میں ترک صدر رجب طیب اردوان نے سودی نظام کی خرابیوں کی طرف اسلامی تعلیمات کے حوالے سے توجہ دلائی ہے جو پورے عالمِ اسلام خصوصاً مسلم حکومتوں کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب کے معاشی نظام کی تباہ کاریوں اور اسلام کے معاشی اصولوں کی افادیت کے بارے میں قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم، ڈاکٹر مہاتیر محمد اور ترک صدر رجب طیب اردگان کی باتوں کی طرف توجہ دیے بغیر ہمارے لیے اب اور کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ جس کی مسلم دنیا کے حکمران طبقات سے تو کوئی توقع دکھائی نہیں دے رہی مگر کیا ارباب فکر و دانش اور اصحاب دین و شریعت بھی ملک و ملت اور دین و دانش کے اس ناگزیر تقاضے کو یکسر نظر انداز کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟ اور کیا یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے؟

افغان عوام کے ساتھ یکجہتی کی مہم

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۲ جنوری ۲۰۲۲ء

پاکستان شریعت کونسل کی طرف سے افغان عوام کے ساتھ یکجہتی و ہم آہنگی کے اظہار کیلئے "عشرۂ یکجہتی افغانستان" منانے کا اعلان کیا گیا تھا جو دس جنوری کو مکمل ہو گیا ہے جبکہ امیر محترم مولانا مفتی محمد رویس خان ایوبی نے یہ سلسلہ جنوری

کے آخر تک جاری رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی طرف سے جاری کردہ اعلان درج ذیل ہے۔

"پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا مفتی محمد رویس خان ایوبی نے "عشرہ یکجہتی افغانستان" کے دوران افغان عوام کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کیلئے پاکستان شریعت کونسل کے رہنماؤں اور کارکنوں کی مسلسل محنت اور مختلف دینی و سیاسی حلقوں کی طرف سے حمایت پر اطمینان کا اظہار کیا ہے اور ایک بیان میں کہا ہے کہ مسلسل بارشوں اور موسم کی خرابی کے باوجود یہ مہم افغان عوام کے ساتھ پاکستانی عوام اور دینی حلقوں کی ہم آہنگی کی علامت ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ جمعیت علمائے اسلام پاکستان (مولانا سمیع الحق گروپ) نے اس مسئلہ پر ۱۷ جنوری کو اسلام آباد میں کل جماعتی سربراہی اجلاس طلب کر لیا ہے۔ پاکستان شریعت کونسل کی توجہ دلاؤ مہم کا مقصد بھی یہی ہے کہ ملک کی دینی و سیاسی جماعتیں اس طرف سنجیدہ توجہ دیں اور "امارت اسلامی افغانستان" کی حکومت کو تسلیم کرانے، مغربی ملکوں میں منجمد افغانستان کے اثاثوں کی بحالی، اور افغانستان کی تعمیر نو میں غیر مشروط تعاون کو اپنے ایجنڈے میں شامل کریں۔

مولانا قاضی رویس خان ایوبی نے کہا ہے کہ اگرچہ عشرہ یکجہتی افغانستان ۱۰ جنوری کو مکمل ہو چکا ہے مگر ہم اس مہم کو مسلسل جاری رکھیں گے جس کیلئے ملک بھر میں جماعتی کارکنوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ پورا مہینہ یہ مہم جاری رکھیں اور اس دوران مختلف طبقات کے رہنماؤں سے مطالبات کی حمایت میں دستخط کرانے کے علاوہ وکلاء، تاجروں، ڈاکٹر حضرات اور دیگر طبقات کی تنظیموں سے رابطہ کر کے قراردادیں منظور کرائیں۔ اور اس آواز کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے کی کوشش کریں کہ امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری طور پر تسلیم کیا جائے، مغربی ممالک افغانستان کے منجمد فنڈز اور اثاثے بحال کریں، اور موجودہ سنگین معاشی بحران میں افغان عوام کو ہر قسم کی امداد غیر مشروط طور پر مہیا کی جائے۔

انہوں نے پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرؤف محمدی کے سربراہی میں اسلام آباد میں افغانستان کے حوالے سے پاکستان شریعت کونسل کی ملک گیر سرگرمیوں کو مربوط کرنے، دستخطوں کے ریکارڈ کو محفوظ کرنے اور افغان عوام کی امداد کیلئے مجاز اداروں کے ساتھ عوام کے مختلف طبقات کا رابطہ کرانے کیلئے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جس میں مولانا محمد رمضان علوی، مولانا ثناء اللہ غالب، مولانا حافظ علی محی الدین، سعید احمد اعوان اور مفتی محمد سعد سعدی شامل ہیں۔"

عشرۂ یکجہتی افغانستان کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں احباب نے خاصی محنت کی ہے اور سرکردہ حضرات کی طرف سے اس مہم کی حمایت میں تائیدی دستخط اور بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو مسلسل بارشوں کے باوجود

خاصی حوصلہ افزا رہی ہے، اس کی تفصیلی رپورٹ جنوری کے اختتام پر جاری کی جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ، سر دست دو اہم باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

انٹرنیشنل ختم نبوت مومنٹ پاکستان کے امیر اور پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا محمد الیاس چنیوٹی نے نہ صرف اس جدوجہد کی حمایت کا اعلان کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ انہوں نے پنجاب اسمبلی میں ان مطالبات کی حمایت میں قرارداد کیلئے تجویز باقاعدہ جمع کرا دی ہے۔ اس کے علاوہ پتوکی بار ایسوسی ایشن اور ٹوبہ ٹیک سنگھ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے بھی ان مطالبات کی حمایت کی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ بار کی قرارداد کا متن درج ذیل ہے:

> ”ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ٹوبہ ٹیک سنگھ حکومتِ پاکستان و دیگر اسلامی ممالک سے مطالبہ کرتی ہے کہ افغانستان میں خوراک کے بحران کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور انسانی حقوق و ہمدردی کا خیال کرتے ہوئے افغان حکومت اور عوام کی فوری مدد کریں اور انسانی جانوں کو بچانے میں معاون ہوں۔ نیز یہ کہ حکومتِ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے افغان حکومت کو تسلیم کرے۔ یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ نیٹو اور امریکہ افغانستان کے ضبط کئے گئے اثاثے فی الفور بحال کریں تاکہ لاکھوں افغان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے دوائیوں اور خوراک کی عدم دستیابی سے لقمۂ اجل بننے سے بچ سکیں۔ ڈسٹرکٹ بار اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ موقع ہے کہ دنیا افغان حکومت اور عوام کی مدد کر کے ان کو بین الاقوامی قوانین اور سلامتی کیلئے پابند بنانے کی خاطر ساتھ لے کر چلے۔ نیز ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ٹوبہ ٹیک سنگھ اس سلسلہ میں پاکستان شریعت کونسل کے تمام مطالبات کی حمایت و تائید کرتی ہے۔“

اس تناظر میں پورے ملک میں پاکستان شریعت کونسل سے وابستہ علماء کرام اور دینی کارکنوں کے ساتھ ساتھ اس کے مطالبات کی حمایت کرنے والے تمام سیاسی و دینی راہنماؤں اور کارکنوں سے گزارش ہے کہ وہ پاکستان شریعت کونسل کے ساتھ تعاون کریں:

- دینی و سیاسی راہنما ان مطالبات کی تائید میں بیانات جاری کریں۔
- وکلاء بار ایسوسی ایشن کے فورم سے اس کی حمایت کریں۔
- تاجر تنظیمیں حمایت کے ساتھ ساتھ عملی امداد کیلئے اس سلسلہ میں قائم کی جانے والی ”اسلام آباد کمیٹی“ سے رابطہ کریں۔
- علماء کرام خطبات جمعہ میں افغان بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کا مسلسل اظہار کریں۔
- پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے دوست اس آواز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک مؤثر انداز میں پہنچانے کا اہتمام کریں۔

تاکہ ہم سب مل کر اس نازک وقت اور سنگین بحران میں اپنے افغان بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں،

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ

۱۶ جنوری ۲۰۲۲ء کو جامعہ اسلامیہ محمدیہ فیصل آباد
میں خطاب

رواں تعلیمی سال کے دوران میرا معمول چلا آ رہا ہے کہ بدھ کے روز جامعہ اسلامیہ محمدیہ فیصل آباد میں ظہر تا مغرب حاضری دیتا ہوں، دورہ حدیث کے طلبہ میں بخاری شریف اور حجۃ اللہ البالغۃ کے منتخب ابواب کا سبق ہوتا ہے، اور عصر کے بعد مسجد میں مختصر عمومی بیان ہوتا ہے۔ ۱۲ جنوری کو پاکستان شریعت کونسل فیصل آباد کے احباب نے سرکردہ علماء کرام کو بھی اس موقع پر دعوت دے رکھی تھی اس لیے افغانستان کی تازہ ترین صورتحال اور دینی حلقوں کی ذمہ داری کے عنوان پر گفتگو ہوئی، اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ افغانستان کی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو کی افواج کو اپنی ناکامی کے اعتراف کے ساتھ وہاں سے واپسی کو کچھ عرصہ گزر چکا ہے، امارتِ اسلامی افغانستان نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے جسے پورے افغانستان میں کنٹرول حاصل ہے، امن و امان کی صورتحال پہلے سے کہیں بہتر ہے، اور نئے حکمران بار بار کہہ رہے ہیں کہ انہیں موقع دیا جائے وہ دنیا اور عالمی ماحول کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہیں مگر اس کیلئے ضروری ہے کہ انہیں وقت دیا جائے تاکہ وہ افغان قوم کے تمام طبقات کو اعتماد میں لے کر اپنا نظام طے کر سکیں اور چار عشروں کی طویل اور خوفناک جنگ کے اثرات کو سمیٹتے ہوئے افغان عوام کے عقیدہ و ثقافت کی بنیاد پر مستقبل کی نقشہ بندی کر سکیں۔

مگر دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جا رہا بلکہ معاشی بحران اور سیاسی دباؤ کے ذریعے پیشگی شرائط کے ساتھ انہیں شکست خوردہ قوتوں کے ایجنڈے کے مطابق افغانستان کے مستقبل کا نظام تشکیل دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلم حکومتیں بھی اس معاملہ میں افغان بھائیوں کا ساتھ دینے کی بجائے مغربی قوتوں کیلئے سہولت کاری کا ماحول قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اس معاملہ میں یہ پہلو بطور خاص قابل توجہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغان اسٹیبلشمنٹ کی اپنے دور کی آٹھ ماہ کی تنخواہیں نئی حکومت کے ذمہ واجب الادا چھوڑ کر گئے ہیں، افغانستان کے اثاثے بہت سے مغربی ملکوں میں منجمد کر دیے گئے ہیں، اور افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کر کے دنیا بھر میں ان کے ہمدردوں اور بہی خواہوں پر ان کی امداد و تعاون کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ جسے میں یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ افغان قوم اس وقت شعب ابی طالب میں محصور ہے اور ان کی مخالف اقوام و ممالک نے ان کے معاشی بائیکاٹ کا غیر اعلانیہ معاہدہ کر رکھا ہے جس پر سختی سے عملدرآمد کیا جا رہا ہے، حتٰی کہ جو تھوڑی بہت مدد وہاں جا رہی ہے وہ بھی محاصرہ کرنے والوں کی مرضی اور طریق کار پر موقوف ہے۔

بعض دوست سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور خاص طور پر مسلمان ممالک ایسا کیوں کر رہے ہیں ؟ اس سوال کو سمجھنا ہم سب کیلئے ضروری ہے اور اس کا حقیقت پسندانہ جواب تلاش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں اصل بات یہ ہے کہ سیکولر عالمی قوتوں نے یہ دیکھ کر کہ امت مسلمہ اسلام سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح مذہب کو ذاتی اور اختیاری دائرے میں شامل کر لینے پر آمادہ نہیں ہے، انہوں نے یہ بات حتمی طور پر طے کر لی ہے کہ مسلمانوں کا اسلام "شریعت لیس" ہونا چاہیے یعنی وہ قرآن و سنت کے شرعی احکام و قوانین کے نفاذ کو اپنے ممالک میں ضروری نہ سمجھیں بلکہ اس حوالے سے باقی دنیا کے سیکولر ایجنڈے سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ جس پر مسلم دنیا کے مقتدر حلقے تو شریعت کے بغیر اسلام کو عملاً قبول کر چکے ہیں مگر عالمِ اسلام بحیثیت امت اس کیلئے تیار نہیں ہے۔ شریعت کے احکام و قوانین پر عمل نہ کر سکنا الگ بات ہے اور احکامِ شریعت سے دستبرداری اس سے مختلف چیز ہے۔ یہ اصل کشمکش ہے جس میں عالمی سیکولر طاقتیں ایک طرف ہیں عالمِ اسلام کی رائے عامہ دوسری طرف ہے۔ جبکہ مسلم دنیا کے برسر اقتدار حلقے اپنی پالیسیوں اور طریق کار کے حوالے سے عالمی طاقتوں کے کیمپ میں دکھائی دے رہے ہیں۔ چنانچہ دنیائے اسلام کے دینی حلقے اور دینی مدارس و مراکز بھی سیکولر حلقوں کی طعنہ زنی اور کردارکشی کا ہر سطح پر صرف اس لیے مسلسل نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ ان کے خیال میں عام مسلمانوں کی شرعی احکام کے ساتھ کمٹمنٹ اور وابستگی کا باعث یہ دینی حلقے اور مدارس و مراکز ہیں۔

اس پس منظر میں امارت اسلامی افغانستان اور افغان عوام بھی اسی منفی طرز عمل کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حتیٰ کہ چار عشروں کی طویل جنگ سے تباہ شدہ افغان معاشرہ اور قحط و افلاس کا شکار افغان قوم کو موجودہ معاشی بحران میں انسانی بنیادوں پر غیر مشروط امداد و تعاون کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے جو بلیک میلنگ کی بدترین شکل ہے۔ ان حالات میں پاکستان کے تمام طبقات بالخصوص علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دینی ذمہ داری اور قبر و حشر میں جوابدہی کو سامنے رکھتے ہوئے مظلوم افغان بھائیوں کی جو کچھ بھی ہو سکے امداد کریں جس کی معروضی صورتحال میں عملی صورت یہ ہے کہ:

- امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے مطالبہ کو زیادہ سے زیادہ منظم کیا جائے اور ہر سطح پر آواز بلند کی جائے۔
- قانونی اور اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے ان کی ہر ممکن مالی مدد اور معاشی تعاون کا اہتمام کیا جائے۔
- دنیا پر واضح کیا جائے کہ مغربی ممالک میں افغانستان کے منجمد اثاثوں کی فوری بحالی اور موجودہ معاشی بحران میں افغان قوم کی مدد کا غیر مشروط ہونا بھی انسانیت کا تقاضہ ہے۔
- اور اپنے افغان بھائیوں کیلئے بارگاہِ ایزدی میں دعاؤں کا التزام کیا جائے کہ اللہ رب العزت انہیں اس آزمائش اور امتحان میں بھی سرخروئی سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مسلم وزرائے خارجہ کو اسلام آباد میں خوش آمدید

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ مارچ ۲۰۲۲ء

مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں آمد شروع ہوگئی ہے جہاں ۲۲ و ۲۳ مارچ کو ان کے دو روزہ اجلاس کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ ہم اپنے معزز مہمانوں کو خوش آمدید اور اہلاً و سہلاً و مرحبا کہتے ہوئے اس اجلاس کے حوالے سے چند معروضات ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

مسلم ممالک کے باہمی تعاون کے فورم اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کا وجود تمام تر تحفظات کے باوجود اس لحاظ سے بہرحال غنیمت اور حوصلہ افزا ہے کہ مسلم ممالک کے حکمران وقتاً فوقتاً مل بیٹھ کر اپنے مسائل اور عالمِ اسلام کی مشکلات پر کچھ نہ کچھ غور کر لیتے ہیں اور موقف کا بھی اظہار کرتے ہیں جس سے اس حد تک اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی صف میں ان مسائل و مشکلات کا احساس موجود ہے اور امید رہتی ہے کہ یہ احساس کبھی نہ کبھی ادراک اور عملی پیشرفت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس حوالے سے عالمِ اسلام کی اصل ضرورت کیا ہے؟ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں پاکستان کی سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کا وہ تاریخی تبصرہ یاد آجاتا ہے جب انہوں نے بوسنیا اور سربیا کی کشمکش کے دوران مسلمانوں کے قتلِ عام کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی بے بسی کا اظہار کیا تھا کہ

> ”اب تو کوئی اوتومان ایمپائر (خلافتِ عثمانیہ) بھی نہیں ہے جس کے سامنے ہم اپنے دکھوں کا رونا رو سکیں۔“

یہ بے بسی آج بھی قائم ہے جس کی تازہ ترین صورت آج ہی کے اخبارات میں دیکھی جا سکتی ہے کہ شام کے صدر نے متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا ہے جو امریکہ بہادر کو پسند نہیں آیا اور اس نے کھلم کھلا اس پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ گویا ایک مسلمان ملک کے حکمران کیلئے دوسرے مسلمان ملک کا دورہ کرنے سے قبل امریکہ بہادر کی رضا اور ناراضگی کو دیکھنا ضروری ہے۔

اور یہ بھی عالمِ اسلام کی اسی بے بسی کی ایک واضح شکل ہے کہ افغانستان سے امریکی اتحاد کی افواج اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے واپس جا چکی ہیں اور امارتِ اسلامی افغانستان نے ملک میں امن و اتحاد کو برقرار رکھنے کی مثال قائم کر دی ہے، مگر پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلم ممالک امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم کرنے کیلئے امریکہ بہادر کی پیشانی کی سلوٹیں شمار کرنے میں مصروف ہیں اور اس کی طرف سے ”این او سی“ جاری ہونے کے انتظار میں ہیں۔

مسلم ممالک کے قابل صد احترام وزرائے خارجہ کی خدمت میں ہم اس موقع پر پہلی گزارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ عالمی دباؤ اور بیرونی مداخلت کے اس ماحول سے نکلنا ہے اور اپنے فیصلے آزادانہ ماحول میں خود کرنے کا حوصلہ اور اختیار حاصل کرنا ہے۔ جس کے بغیر ہم عالمِ اسلام کے کسی مسئلہ کو حل کرنے کا کوئی مؤثر راستہ اختیار نہیں کر

سکیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام آباد میں منعقد ہونے والی مسلم وزرائے خارجہ کی یہ کانفرنس اس کا آغاز ''امارتِ اسلامی افغانستان'' کو تسلیم کرنے اور افغان قوم کی خود مختاری اور ان کے عقیدہ و ثقافت کی پاسداری کے مسلّمہ حق کی حمایت کے اعلان کی صورت میں کر سکتی ہے جس کی ہم ان سے بجاطور پر توقع رکھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں دوسرا اہم ترین توجہ طلب مسئلہ دنیا بھر میں اسلاموفوبیا کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی حالیہ قابلِ تحسین قرارداد کو دیگر قراردادوں کی طرح ''داخل دفتر'' کر دینے کی بجائے اس کی بنیاد پر ایک منظم اور مربوط مہم چلانے کا ہے۔ جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی قوتوں اور لابیوں کے پھیلائے ہوئے گمراہ کن شکوک و شبہات کو دور کرتے ہوئے خلافتِ راشدہ کی طرز پر اسلام کی صحیح اور متوازن تعلیمات اور کردار کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مصروفِ عمل اسلامی نظریاتی حلقوں اور مراکز کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ روایتی سفارتی حلقوں، سیکولر لابیوں اور این جی اوز وغیرہ کو اس مہم کا ذریعہ بنانے سے اسلاموفوبیا کی موجودہ صورتحال میں بہتری آنے کی بجائے اس کے مزید بگڑنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

یہ خبر ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ اس کانفرنس کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہے جو کشمیری عوام کے ساتھ ہونے والے مسلسل ظلم کے باعث ان کا اپنا حق ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری بھی ہے، اور اس سے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر ایک بار پھر اجاگر کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ فلسطین، اراکان اور دیگر خطوں کے مسلمانوں کی مظلومیت اور ان کے حقوق کی پامالی بھی مسلم وزرائے خارجہ کی توجہات کی منتظر ہے۔ جبکہ معروضی صورتحال میں مسلم ممالک پر مغربی اداروں اور این جی اوز کی فکری اور تہذیبی یلغار انتہائی فکر انگیز اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ عالمی اداروں، بین الاقوامی لابیوں، مغربی حکومتوں اور سیکولر این جی اوز کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے معاشرتی اور تہذیبی بالخصوص خاندانی نظام و ماحول میں قرآن و سنت کے صریح احکام و قوانین سے دستبرداری کیلئے تیار کیا جائے، جس کیلئے پوری مسلم دنیا میں چند مخصوص حلقوں کے سوا عالمِ اسلام کا کوئی طبقہ تیار نہیں ہے، اور یہ کشمکش دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

مسلم وزرائے خارجہ کو ان مسائل کا نوٹس لیتے ہوئے قرآن و سنت کے ساتھ مسلمانوں کی کمٹمنٹ کا ساتھ دینا چاہیے اور مغربی دنیا کی استعماری قوتوں کو واضح پیغام دینا چاہیے کہ وہ ہمارے دینی، تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں دخل اندازی کے طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔ ان گزارشات کے ساتھ ہم مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس کی کامیابی کیلئے دعاگو ہیں اور اپنے تمام معزز مہمانوں کیلئے خیر سگالی اور محبت کے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں، آمین یارب العالمین۔

سلامتی کونسل اور امارتِ اسلامی افغانستان

روزنامہ اسلام، لاہور--- ۲۸ مئی ۲۰۲۲ء

ایک قومی اخبار نے ۲۶ مئی ۲۰۲۲ء کو یہ خبر شائع کی ہے:

”اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے افغانستان میں طالبان حکومت سے کہا ہے کہ وہ خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق اور ان کی آزادی کو سلب نہ کرے۔ سلامتی کونسل نے افغانستان میں خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعلیم، ملازمت، شخصی آزادی اور معاشرے میں انہیں مساوی حقوق کی عدم فراہمی عالمی برادری کی توقعات پر پورا نہیں اترتیں۔ خواتین ٹی وی میزبانوں کو چہرے کا پردہ کرنے اور انہیں گھر سے بوقت ضرورت ہی باہر نکلنے جیسی پابندیاں باعث تشویش ہیں۔ لہٰذا طالبان حکومت کو چاہیے کہ وہ افغان خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق کا احترام کرتے ہوئے ایسے تمام قوانین کو ختم کرے۔“

اس سے قبل امریکی حکومت کی طرف سے بھی اس قسم کی تنبیہ سامنے آچکی ہے اور اب اسی کو سلامتی کونسل کی طرف سے جاری کیا گیا ہے جو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ توجہ طلب ہے۔

بنیادی حقوق اور مرد و عورت کی مکمل معاشرتی مساوات کے حوالے سے ہم ان کالموں میں بیسیوں مرتبہ اظہارِ خیال کر چکے ہیں اور ہمارا یہ واضح نقطہ نظر ہے کہ بنیادی حقوق اور مرد و عورت کی مساوات کے حوالے سے موجودہ عالمی فلسفہ و نظام کے بارے میں مسلم دنیا کے تحفظات ہیں جن کا تعلق دین و مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت سے بھی ہے اور انہیں نظر انداز کرنا قرآن و سنت پر ایمان رکھنے والے کسی مسلمان کیلئے ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحفظات و شکایات کا اظہار دنیا کے کسی ایک خطے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کے مسلمانوں کی طرف سے ان کا مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے مسلم حکمران بالخصوص او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کے سابق سربراہ مہاتیر محمد بھی عالمی رائے عامہ کو اس طرف بارہا توجہ دلا چکے ہیں اور ان پر نظر ثانی کا مطالبہ کر چکے ہیں۔

ہمارا موقف مختصراً یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے عالمی منشور اور بہت سے بین الاقوامی معاہدات میں دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے مجموعی عقائد اور تہذیبی روایات کو نظر انداز کر کے اس فلسفہ و نظام کی بنیاد صرف یورپ اور امریکہ کے معاشرتی پس منظر اور تجربات پر رکھی گئی ہے، جبکہ مشرقی دنیا بالخصوص مسلم معاشروں کا پس منظر اور تجربات اس سے قطعی مختلف ہیں۔ اور اس طرح مغرب یعنی امریکہ اور یورپ اپنی تہذیب و ثقافت کو اقوامِ متحدہ اور بین الاقوامی معاہدات کے عنوان سے باقی تمام دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہیں جو کسی طرح بھی قرینِ قیاس اور قابلِ قبول نہیں ہیں اور ان پر متعلقہ تمام فریقوں کو اعتماد میں لے کر نظر ثانی کرنا ضروری ہو گیا ہے جس کیلئے اقوامِ متحدہ اور اسلامی تعاون تنظیم دونوں کو کردار ادا کرنا ہو گا۔

مغرب اس معروضی حقیقت کا ادراک کرنے میں بلاوجہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہے کہ مسلم اُمہ دنیا کے کسی خطہ میں اپنے عقیدہ و ثقافت سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہے بلکہ مسلم عوام قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو اپنے معاشرتی ماحول میں نافذ و جاری دیکھنا چاہتے ہیں۔ مغرب کا یہ مغالطہ ابھی تک دور نہیں ہو رہا کہ یورپ اور امریکہ کے لوگ اگر مذہب کے معاشرتی کردار سے دستبردار ہو گئے ہیں تو مسلمانوں کو بھی ایسا کرنا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا اور نہ ہی

مستقبل میں اس کا کوئی امکان دکھائی دے رہا ہے۔ اس لیے مغرب کے پاس اس کے علاوہ اب کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ کم از کم مسلم دنیا کی حد تک "مرغ کی ایک ٹانگ" کی ضد ترک کر کے مسلمانوں کی قیادتوں کے ساتھ مذاکرات کا راستہ اختیار کرے اور پوری دنیا پر اپنا تسلط ہر قیمت پر قائم کرنے کی ہٹ دھرمی چھوڑ کر مسلم عقیدہ و ثقافت کا معاشرتی وجود و کردار تسلیم کرتے ہوئے عالمِ اسلام پر اپنا فکر و فلسفہ مسلط کرنے کے طرز عمل پر نظر ثانی کرے۔

ہمارے نزدیک امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے اور انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی شرائط ہر صورت میں منوا لینے کے موجودہ عالمی رویہ کے پیچھے بھی مغرب کی یہی ضد اور ہٹ دھرمی کارفرما ہے۔ جبکہ اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلم دنیا کے بیشتر حکمران اپنے دین و ایمان کے تقاضوں اور اپنے ملکوں کے عوام کے جذبات و احساسات کی پاسداری کرنے کی بجائے عالمی ایجنڈے کے عنوان سے مغربی فکر و فلسفہ کی بالادستی کیلئے کام کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اقوامِ متحدہ اور اس کی سلامتی کونسل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اداروں سے گزارش کریں گے کہ وہ زمینی حقائق کا ادراک کریں اور مسلم عقیدہ و ثقافت کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت تسلیم کر کے اس کے ساتھ مفاہمت اور مذاکرات کا راستہ اختیار کریں۔ جبکہ مسلم حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ بھی آنکھیں کھول کر ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ مسلم امہ کو دنیا میں کہیں بھی اپنے عقیدہ و ثقافت اور اسلام کے معاشرتی کردار سے دستبردار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اور اس کیلئے عالمی فورم پر مسلم حکمران اپنے دین و عقیدہ اور مسلم امہ کی غالب اکثریت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ذمہ داری ادا کریں کہ مسلم ممالک کے حکمران ہونے کی وجہ سے ان کا فریضہ یہی بنتا ہے۔

دوسری طرف امارتِ اسلامی افغانستان سے بھی ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ تہذیبی ارتقا اور بین الاقوامی معاہدات و مسلّمات کو یکسر نظر انداز کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کی تمام روایات و اقدار کو یکسر مسترد کر دینے کی بجائے خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول پر جو باتیں قابل قبول تھیں انہیں برقرار رکھا تھا، اور جو باتیں عقیدہ اور اصول کے منافی تھیں انہیں مسترد کر دیا تھا۔ آج بھی یہی اصول اختیار کرنا ہوگا کہ جو امور شرعی اجتہاد کے دائرہ میں قبول کیے جا سکتے ہیں ان کے بارے میں رویہ میں لچک پیدا کرنا ہوگی۔ ہم امارتِ اسلامی افغانستان کے علماء کرام کو یاد دلانا چاہیں گے کہ عرف و تعامل کا تغیر مسائل و احکام کے تغیر کا باعث بنتا ہے۔ حتٰی کہ "عموم بلویٰ" بھی ان معاملات میں اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً عورت کے چہرہ کے پردہ کے بارے میں ہی غور کر لیا جائے کہ احناف متقدمین کے ہاں چہرہ اور ہاتھ پردہ میں شامل نہیں ہیں، جبکہ متاخرین نے بھی معاشرتی تغیرات کے باعث انہیں پردہ میں شامل کیا ہے۔ یہ بات ہم نے مسئلہ اور فتویٰ کے طور پر نہیں بلکہ مثال کے طور پر ذکر کی ہے اور ہماری گزارش ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کو

- مذہب اور ثقافت کے معاملات کو باہم گڈمڈ کرنے کی بجائے ہر ایک کو اسی کے دائرے میں ڈیل کرنا چاہیے۔
- اجتہاد کی شرعی حدود میں جن امور کی گنجائش بنتی ہے انہیں یکسر مسترد نہیں کرنا چاہیے، اور

- ایسے معاملات کو روایتی طرزِ عمل کی بجائے افغانستان اور عالمِ اسلام کی سرکردہ علمی شخصیات کی مشاورت سے طے کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ مسلم حکومتوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنے مغرب نوازی کے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں اور امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی بھرپور سیاسی، اخلاقی اور معاشی امداد کا اہتمام کریں، جبکہ اس نازک مرحلہ میں امتِ مسلمہ کے سرکردہ علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی و فکری حوالے سے افغان قوم و قیادت کی معاونت اور راہنمائی کا کردار ادا کریں۔